فضلِ قدیر

ترجمہ

تفسیرِ کبیر



تصنیف

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی

ترجمہ

محقق العصر مفتی محمد خان قادری

مرکز تحقیقات اسلامیہ

فضلِ قدیر

ترجمہ

جلد ۲

تفسیرِ کبیر

تصنیف

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

محقق العصر

مفتی محمد خان قادری مدظلہ العالی

مرکز تحقیقات اسلامیہ

1- جامعہ اسلامیہ لاہور، میلاد سٹریٹ گلشن رحمان ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

نام کتاب .... فضل قدیر ترجمہ تفسیر کبیر

مفاتیح الغیب جز ۲ .... تفسیر سورۃ البقرہ (آیت ۱ تا ۳۴)

تصنیف .... امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (۶۰۶ھ)

ترجمہ .... محقق العصر مفتی محمد خان قادری

اہتمام .... محمد فاروق قادری

ناشر .... مرکز تحقیقات اسلامیہ لاہور

حروف سازی .... اسلامیہ کمپوزنگ سنٹر

صفحات 517

اشاعت اول 2010ء

ملنے کے پتے

☆ فرید بک سٹال اُردو بازار لاہور ☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، کراچی

☆ مکتبہ غوثیہ سبزی منڈی کراچی ☆ مکتبہ برکات المدینہ بہادر آباد کراچی

☆ احمد بک کارپوریشن راولپنڈی ☆ اسلامک بک کارپوریشن راولپنڈی

☆ اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ سیالکوٹ ☆ مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور

☆ مکتبہ جمال کرم دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ تنظیم المدارس جامعہ نظامیہ لاہور

☆ مکتبہ دار العلم دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ نوریہ رضویہ گنج بخش روڈ لاہور

☆ مکتبہ قادریہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ رضوان کتب خانہ گنج بخش روڈ لاہور

☆ قادری رضوی کتب خانہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ نبویہ دربار مارکیٹ لاہور

مرکز تحقیقاتِ اسلامیہ لاہور

جامعہ اسلامیہ لاہور۔1، میلاد سٹریٹ گلشن رحمان ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

042,35300353...0300.4407048

پہلا مسئلہ: کیا معدوم، شی ہوتا ہے	۱۸۶	حرف تنبیہ کے دو فوائد	۱۹۴
جواب	۱۸۷	چھٹا مسئلہ	۱۹۴
دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ پر شی کا اطلاق	۱۸۷	چند مباحث	۱۹۴
ہمارے اصحاب کے دلائل	۱۸۷	پہلی بحث: جمع معرف بالام میں عموم کا فائدہ	۱۹۴
تیسرا مسئلہ: بندہ کا مقدور، اللہ کا مقدور	۱۸۷	دوسری بحث: معدوم سے خطاب	۱۹۵
چوتھا مسئلہ: حادث، اللہ کا مقدور	۱۸۸	سوال و جواب	۱۹۵
پانچواں مسئلہ	۱۸۸	تیسری بحث: تمام عبادات کا حکم	۱۹۵
سوال و جواب	۱۸۸	سوال و جواب	۱۹۵
توحید، نبوت اور آخرت پر دلائل اور تفصیلی گفتگو	۱۸۹	چوتھی بحث: کفار اور حکم عبادت	۱۹۶
آیت ۲۱، ۲۲: یَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ		سوال و جواب	۱۹۶
کی تفسیر	۱۹۱	پانچویں بحث: منکرین تکلیف کے دلائل	۱۹۷
پہلا مسئلہ: التفات کے چند فوائد	۱۹۱	جواب	۱۹۸
پہلا فائدہ: مزید شوق کا سبب	۱۹۱	چھٹی بحث	۱۹۸
دوسرا فائدہ: مکالمہ کا شرف	۱۹۱	چوتھا مسئلہ: بندہ کا حق لازم نہیں	۱۹۹
تیسرا فائدہ	۱۹۲	رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ	
چوتھا فائدہ	۱۹۲	کی تفسیر	۱۹۹
دوسرا مسئلہ: مکی و مدنی سورتوں کی علامت	۱۹۲	پہلا مسئلہ	۱۹۹
تیسرا مسئلہ	۱۹۲	تین مقامات،	۱۹۹
یا زَیْدُ اور اُنَادِیْ زَیْدًا میں فرق	۱۹۲	پہلا مقام، علم کلام کی فضیلت	۱۹۹
ایک اہم نکتہ: حالت ندا و تضرع میں مناسبت	۱۹۳	وجود صانع و خالق پر دلائل	۲۰۱
چوتھا مسئلہ: یا ندا بعید ہے	۱۹۳	صفات الٰہی پر دلائل	۲۰۱
سوال و جواب	۱۹۳	پہلا مقام: ان کی اپنی ذات کے ساتھ بحث	۲۰۴
پانچواں مسئلہ	۱۹۴	دوسرا مقام، اپنے باپ کے ساتھ بحث	۲۰۴

تیسرا مقام، قوم کے ساتھ بحث ۲۰۴
چوتھا مقام، اپنے وقت کے بادشاہ سے مناظرہ ۲۰۵
آخرت و معاد میں ان کی بحث ۲۰۵
تمام باطل فرقوں کا رد ۲۰۶
۱۔ دہریہ کا رد ۲۰۶
۲۔ قادر مختار کے منکرین ۲۰۶
۳۔ شریک باری ماننے والوں کا رد ۲۰۷
۴۔ نبوت پر طعن کرنے والے دو گروہ ۲۰۷
۵۔ حشر و نشر میں اختلاف کرنیوالے ۲۰۸
۶۔ مکلف ہونے پر اعتراض ۲۰۸
دوسرا مقام: اس علم کے لزوم حصول پر دلائل ۲۰۸
دلائل عقلیہ ۲۰۸
دلائل نقلیہ ۲۰۸
احادیث مبارکہ اور نظر و فکر ۲۱۱
مخالف کے مقامات ۲۱۲
پہلا مقام: نظر مفید علم نہیں ۲۱۲
نظر الٰہیات میں مفید نہیں ۲۱۳
پہلی وجہ ۲۱۳
سوال و جواب ۲۱۳
دوسری وجہ ۲۱۴
پہلی دلیل ۲۱۴
سوال و جواب ۲۱۴
دوسری دلیل ۲۱۴
تیسری دلیل: موجب نظر کون؟ ۲۱۵
تیسرا مقام: نظر مفید علم ۲۱۵
چار دلائل ۲۱۵
چوتھا مقام، نظر بذات بد نہیں ۲۱۶
سوال و جواب ۲۱۶
پانچواں مقام، علم کلام پڑھنا بدعت ۲۱۷
آثار صحابہ و تابعین ۲۱۸
ان دلائل کا رد ۲۱۸
جواب ۲۱۸
دوسرا مسئلہ ۲۱۹
خلق کا مفہوم ۲۱۹
تیسرا مسئلہ، وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل ۲۲۱
۱۔ ذوات کے ممکن ہونے سے استدلال ۲۲۱
۲۔ صفات کے ممکن ہونے سے استدلال ۲۲۲
۳۔ اجسام کے حادث ہونے سے استدلال ۲۲۲
۴۔ حدوث اعراض سے استدلال ۲۲۲
۱۔ دلائل انفسی ۲۲۲
سوال جواب ۲۲۲
دلائل آفاقی ۲۲۳
دو وجوہات ۲۲۳
وجودِ باری پر اسلاف کے اعلیٰ دلائل و طرق ۲۲۵
امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ۲۲۷
امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ۲۲۷

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل	۲۲۸
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل	۲۲۹
امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل	۲۲۹
چوتھا مسئلہ	۲۳۰
سوال وجواب	۲۳۰
پانچواں مسئلہ، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کی تفسیر	۲۳۰
معنی لعل میں تاویل	۲۳۱
پانچ تاویلات	۲۳۱
دوسری بحث، عبادت وتقوی کا تعلق	۲۳۲
سوال وجواب	۲۳۲
چھٹا مسئلہ	۲۳۲
آیت ۲۲: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا کی تفسیر	۲۳۳
پہلا مسئلہ	۲۳۳
دوسرا مسئلہ	۲۳۳
تیسرا مسئلہ: پانچ انواع ودلائل کا تذکرہ	۲۳۳
ترتیب کے فوائد	۲۳۴
چوتھا مسئلہ	۲۳۴
زمین کے فراش ہونے کی شرائط	۲۳۴
پہلی شرط	۲۳۴
سکون کے اسباب	۲۳۵
دووجوہات	۲۳۵
دوسری شرط	۲۳۶
تیسری شرط	۲۳۷
چوتھی شرط	۲۳۷
کرّہ نہ ہو	۲۳۷
پانچواں مسئلہ: زمین کے منافع وصفات	۲۳۷
چھٹا مسئلہ: آسمان افضل یا زمین؟	۲۴۱
زمین افضل ہے	۲۴۱
سوال وجواب	۲۴۲
السَّمَآءَ بِنَآءً کی تفسیر	۲۴۳
پہلا مسئلہ	۲۴۳
دوسرا مسئلہ: آسمان کے فضائل	۲۴۳
تیسرا مسئلہ: سماء اوران میں موجود اشیاء کے فضائل	۲۴۵
حرکت شمس کے منافع	۲۴۶
کچھ فوائد چاند	۲۴۷
ایک حکایت	۲۴۸
چاند کی شمس پر فضیلت	۲۴۸
ستاروں کے تین منافع	۲۴۹
ستاروں کی اقسام	۲۴۹
فلاسفہ کا دعویٰ	۲۴۹
چوتھا مسئلہ: آسمان کے چھت ہونے کی تفصیل	۲۵۰
چند سوالات	۲۵۱
کیا واسطہ سے تخلیق، قدرت کے منافی ہے؟	۲۵۱
مدت طویل میں تخلیق کی حکمتیں	۲۵۲
مِنَ الثَّمَرٰتِ میں مِنْ کا معنی	۲۵۳

لفظ "رِزقًا" منصوب کیوں؟	۲۵۳
سوال وجواب	۲۵۳
فَلَا تَجْعَلُوْا اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر	۲۵۴
لَا تَجْعَلُوْا کا تین سے تعلق	۲۵۴
نِد کسے کہتے ہیں؟	۲۵۴
سوال وجواب	۲۵۴
پہلا مسئلہ: ثنویہ اور دو اللہ	۲۲۵
غیر اللہ کی عبادت کرنے والے	۲۲۵
تین فریق	۲۵۵
بُت پرستی کی تاریخ	۲۵۵
بُت پرستوں کی غلط فہمی	۲۵۶
دوسرا مسئلہ: عبادت کا عدم جواز	۲۵۷
سوال وجواب	۲۵۷
تیسرا مسئلہ	۲۵۸
آیت ۲۳،۲۴: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ کی تفسیر	۲۵۹
پہلا مسئلہ: نبوت پہ دلائل	۲۵۹
قرآن کا معجزہ ہونا	۲۵۹
کی فصاحت سات اسباب	۲۶۰
اعجاز قرآن کا طریق ثانی	۲۶۲
دوسرا مسئلہ: نَزَّلْنَا لانے کی حکمت	۲۶۲
تیسرا مسئلہ: السورۃ کا مفہوم قرآن کا حصہ	۲۶۳
سوال وجواب	۲۶۳
چوتھا مسئلہ: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کی تفسیر	۲۶۴
پانچواں مسئلہ، قرآنی چیلنج کی چند صورتیں	۲۶۴
سوال وجواب	۲۶۴
چھٹا مسئلہ، مِنْ مِّثْلِهٖ کی ضمیر	۲۶۵
ساتواں مسئلہ، شہداء سے مراد دو صورتیں	۲۶۶
سوال وجواب	۲۶۶
آٹھواں مسئلہ: لفظ دُوْن کا معنی	۲۶۷
سوال، مِن دُوْنِ اللّٰہ کا متعلق کون؟	۲۶۷
جواب، اس کے متعلق کی دو صورتیں ہیں	۲۶۷
نواں مسئلہ: قول جبر کا بطلان	۲۶۸
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا کی تفسیر	۲۶۹
چند سوالات اور ان کے جوابات	۲۷۰
لَنْ میں تین اقوال	۲۷۰
آخرت پر گفتگو	۲۷۳
آیت ۲۵: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی تفسیر	۲۷۵
آیت کا ربط	۲۷۵
پہلا مسئلہ،	۲۷۵
دو وجوہات	۲۷۵
امکان قیامت پر چار اُمور سے استدلال	۲۷۶
امکان حشر پر شاہد دلائل کی دوسری نوع	۲۸۰
تیسری نوع، آسمانوں پر اس کی قدرت سے	
قدرت حشر پر استدلال	۲۸۱

چوتھی نوع، ثواب وعذاب میں امتیاز	۲۸۱
پانچویں نوع، صحت حشر ونشر پر دنیا میں مردہ کی زندگی سے استدلال	۲۸۲
حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا واقعہ	۲۸۳
منکر حشر ونشر کافر ہے	۲۸۴
دوسرا مسئلہ، جنت ودوزخ کا مخلوق ہونا	۲۸۴
تیسرا مسئلہ: حصول لذت کے مقامات	۲۸۵
الفاظ آیت پہ گفتگو	۲۸۵
بشارت کا حکم	۲۸۵
بشارت کا مفہوم	۲۸۶
اَلَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُو الصَّالِحَات کی تفسیر	۲۸۶
پہلا مسئلہ، اعمال ایمان کا حصہ نہیں	۲۸۶
دوسرا مسئلہ	۲۸۶
تحابط (حبط اعمال کیوں محال ہے؟	۲۸۶
جواب	۲۸۷
دو اقوال	۲۸۸
تیسرا مسئلہ	۲۸۸
چوتھا مسئلہ: لفظ جنت کا مفہوم	۲۸۸
جَنّٰت نکرہ کیوں؟	۲۸۸
سوال وجواب	۲۸۸
جنات کی دوسری قسم	۲۸۹
سوال وجواب	۲۸۹
رزق دنیاوی یا جنتی؟	۲۸۹
دنیاوی رزق	۲۹۰
دو دلائل	۲۹۰
دوسرا قول: جنتی رزق	۲۹۰
اہل معرفت کا قول	۲۹۰
وَاُتُوبِهٖ مُتَشَابِهًا کی تفسیر	۲۹۱
سوال وجواب	۲۹۱
وَلَهُمْ فِيهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی تفسیر	۲۹۱
سوال وجواب	۲۹۲
وَهُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ کی تفسیر	۲۹۲
آیت ۲۶، ۲۷: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحِي اَنْ يَضْرِبَ کی تفسیر	۲۹۳
کفار کا شبہ	۲۹۴
شبہ کی تفصیل اور جواب	۲۹۴
پہلا مسئلہ: شان نزول	۲۹۴
تین اقوال	۲۹۴
دوسرا مسئلہ، حیا کا مفہوم	۲۹۵
پہلی وجہ: صفات الٰہی کے بارے میں قانون	۲۹۶
دوسری وجہ	۲۹۶
تیسرا مسئلہ	۲۹۷
مچھر کا کھجور سے مکالمہ	۲۹۷
مثال کی تفسیر	۲۹۸
ایک اور مثال	۲۹۸
چوتھا مسئلہ: ما کا زائد ہونا	۲۹۹

بَعُوْضَۃً میں دو قرأتیں	۲۹۹
پانچواں مسئلہ	۳۰۰
چھٹا مسئلہ	۳۰۰
ساتواں مسئلہ	۳۰۰
مچھر عجیب مخلوق	۳۰۱
آٹھواں مسئلہ: فَمَا فَوْقَهَا میں دو وجہیں	۳۰۱
پہلے قول پر دو دلائل	۳۰۱
جواب	
نواں مسئلہ	۳۰۲
دسواں مسئلہ: حق کا مفہوم	۳۰۲
گیارہواں مسئلہ	۳۰۲
بارہواں مسئلہ: ارادہ کا مفہوم	۳۰۲
اللہ تعالیٰ اور ارادہ	۳۰۳
تیرہواں، چودہواں، پندرہواں مسئلہ	۳۰۳
ہدایت وگمراہی پر تفصیلی گفتگو	۳۰۴
اللہ کی طرف سے گمراہی کا مفہوم	۳۰۴
معتزلہ کا مؤقف	۳۰۶
دلائل عقلیہ کی تفصیل	۳۰۶
دیگر تاویلات	۳۱۱
۲۔ گمراہ قرار دینا	۳۱۳
۳۔ کھلا چھوڑنا	۳۱۳
۴۔ مراد عذاب دینا	۳۱۴
۵۔ ہلاک وباطل کرنا	۳۱۴
۶۔ جنت سے گمراہ کرنا	۳۱۵
۷۔ گمراہ پایا	۳۱۵
۸۔ کفار کا قول	۳۱۵
سوال جواب	۳۱۶
تین مقدمات	۳۱۶
پہلا مقدمہ: تصورات غیر کسبی	۳۱۶
دوسرا مقدمہ: تصدیقات بدیہیہ غیر کسبی	۳۱۷
تیسرا مقدمہ: تصدیقات غیر کسبی	۳۱۷
مذکورہ تاویلات پر گفتگو	۳۱۷
دو قباحتیں	۳۱۷
یہاں آٹھ تاویلات ہیں	۳۱۸
ہدایت کا مفہوم	۳۲۰
۱۔ دلالت وبیان	۳۲۰
۲۔ دعوت دینا	۳۲۱
۳۔ اللہ کی توفیق	۳۲۱
۴۔ جنت کی طرف رہنمائی	۳۲۲
۵۔ ہدایت بمعنی مقدم ہونا	۳۲۳
۶۔ فیصلہ کر دینا	۳۲۳
جبریہ کا قول	۳۲۴
قدریہ کا انکار	۳۲۴
بندے کا کسب	۳۲۴
سوال وجواب	۳۲۴
تین صورتیں	۳۲۴

جبریہ اور دلائل عقلیہ	۳۲۵	موت اٹل ہے	۳۳۶
سولہواں مسئلہ، سوال	۳۲۵	حضرت یحییٰ بن معاذ رازی کی دعا	۳۳۷
حدیث نبوی ﷺ	۳۲۵	اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا	۳۳۷
جواب	۳۲۵	بارگاہ الٰہی میں دعا	۳۳۸
سترہواں مسئلہ	۳۲۵	آیت ۲۹ ھُوَ الَّذِی خَلَقَ لَکُم مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعاً کی تفسیر	۳۳۸
اہل قبلہ کا اختلاف، فاسق، مومن یا کافر؟	۳۲۵		
اٹھارہواں مسئلہ: میثاق سے مراد	۳۲۶	دوسرا انعام	۳۳۸
اللہ تعالیٰ کے تین عہد	۳۲۷	حکم کا فائدہ	۳۳۸
انیسواں مسئلہ: قطع سے مراد تین چیزیں	۳۲۸	پہلا مسئلہ، اللہ کا فعل غرض سے پاک	۳۳۹
بیسواں مسئلہ، وَیُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ کی تفسیر	۳۲۸	سوال وجواب	۳۳۹
آیت ۲۸: کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ کی تفسیر	۳۳۰	لام میں گفتگو	۳۴۰
		دوسرا مسئلہ: اہلِ اباحت کا استدلال	۳۴۰
انعامات کی تفصیل	۳۳۰	تیسرا مسئلہ: مٹی کھانے کا شرعی حکم	۳۴۱
چار انعامات	۳۳۰	چوتھا مسئلہ	۳۴۱
فاوثم، سے عطف کیوں؟	۳۳۰	ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ کی تفسیر	۳۴۱
سوال وجواب	۳۳۰	پہلا مسئلہ	۳۴۱
پہلا مسئلہ، معتزلہ کا قول	۳۳۱	دوسرا مسئلہ	۳۴۱
جواب	۳۳۲	تیسرا مسئلہ: زمین کی پہلے تخلیق پر استدلال	۳۴۲
دوسرا مسئلہ، کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا سے مراد	۳۳۳	جوابات	۳۴۲
تیسرا مسئلہ، عذاب قبر کے خلاف استدلال	۳۳۴	سوال وجواب	۳۴۳
چوتھا مسئلہ	۳۳۵	چوتھا مسئلہ	۳۴۴
پانچواں مسئلہ، مجسمہ کے استدلال کا رد	۳۳۵	پانچواں مسئلہ، سات آسمانوں کا وجود	۳۴۴
چھٹا مسئلہ: چند اُمور کا ثبوت	۳۳۶		

افلاک کا نو ہونا	۳۴۵	سیدنا جبریل امین کی عمر	۳۵۳
یہ دلائل ضعیف ہیں	۳۴۵	اصناف واقسام ملائکہ	۳۵۳
سوال وجواب	۳۴۵	ا۔حاملین عرش	۳۵۴
پہلا مقدمہ	۳۴۶	۲۔حافلین عرش	۳۵۴
دوسرا مقدمہ	۳۴۶	۳۔اکابر ملائکہ	۳۵۴
اور بھی افلاک ہیں	۳۴۶	اوصاف جبریل	۳۵۴
دو اقوال	۳۴۷	۴۔ملائکہ جنت	۳۵۶
سوال وجواب	۳۴۷	۵۔ملائکہ جہنم	۳۵۶
چھٹا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا علم محیط	۳۴۷	۶۔اولاد آدم پہ مقرر	۳۵۷
آیت ۳۰: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ		۷۔کاتبین اعمال	۳۵۷
کی تفسیر	۳۴۸	۸۔احوال کائنات پر مقرر	۳۵۷
تیسرا انعام	۳۴۸	مددگار فرشتے	۳۵۸
پہلا مسئلہ، ''اِذْ'' میں دو اقوال	۳۴۹	اوصاف ملائکہ	۳۵۸
دوسرا مسئلہ، ''الملك'' کا مفہوم	۳۴۹	سوال وجواب	۳۵۸
تیسرا مسئلہ، ملائکہ پر گفتگو	۳۴۹	ان کی طاعات کی شانیں	۳۵۸
حضرات انبیاء پر گفتگو	۳۵۰	چار صورتیں	۳۵۹
ملائکہ کی حقیقت	۳۵۰	پانچ وجوہات	۳۵۹
دو اقوال	۳۵۰	سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا قول	۳۶۱
جواہر کی اقسام	۳۵۱	پانچواں مسئلہ: ملائکہ سے مراد	۳۶۲
فرشتوں کا عقلاً وجود	۳۵۱	چھٹا، ساتواں مسئلہ	۳۶۲
دلائل عقلیہ	۳۵۲	آٹھواں مسئلہ: خلیفہ کا مفہوم	۳۶۲
چوتھا مسئلہ: کثرت ملائکہ کی تفصیل	۳۵۲	خلیفہ کون اور کیوں؟	۳۶۳
تفصیل مخلوق کی جھلک	۳۵۲	دو وجوہات	۳۶۳

سول وجواب	۳۶۳	تیسرا شبہ، چوتھا شبہ	۳۷۴
"قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا" کی تفسیر	۳۶۴	دوسرا مسئلہ: ملائکہ، معاصی پر قادر ہیں یا نہیں؟	۳۷۴
پہلا مسئلہ	۳۶۴	معتزلی کا رد	۳۷۵
سوال وجواب	۳۶۴	تیسرا مسئلہ: تسبیح اور تقدیس کا مفہوم	۳۷۵
مخالفین کے دلائل	۳۶۵	تسبیح بمعنی تنزیہی	۳۷۶
آٹھ وجوہات	۳۶۵	تسبیح بمعنی تعجب	۳۷۷
دوسرا شبہ، واقعہ ہاروت و ماروت	۳۶۷	حاملین عرش	۳۷۸
دوسری روایت	۳۶۷	تمام کا ثواب بندوں کے لیے	۳۷۹
تیسرا شبہ، ابلیس کا ملائکہ میں سے ہونا	۳۶۸	چوتھا مسئلہ :بِحَمْدِكَ کی تفسیر	۳۸۱
چوتھا شبہ، ملائکہ کو عذاب دیا جانا	۳۶۸	حضرت داؤد علیہ السلام کا اہم قول	۳۸۱
پہلے شبہ کا جواب	۳۶۸	تسبیح سے مراد	۳۸۱
معتزلہ کا جواب	۳۶۹	پانچواں مسئلہ: تقدیس سے مراد	۳۸۲
حکماء کا جواب	۳۶۹	معتزلہ کا موقف	۳۸۳
ملائکہ کا قول	۳۷۰	پہلی وجہ: ملائکہ کے قول	۳۸۳
دوسرے استدلال کا جواب	۳۷۱	چھ وجوہات	۳۸۳
تیسرے استدلال کا جواب		چھٹا مسئلہ: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے متعدد معانی	۳۸۴
اپنی تعریف ہر حال میں منع	۳۷۱	چھ احتمالات	۳۸۴
چوتھے استدلال کا رد	۳۷۱	آیت ۳۱: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کی تفسیر	۳۸۵
پانچویں استدلال کا رد	۳۷۲	تفصیلی وجہ حکمت	۳۸۵
یہ بطور یقین تھا	۳۷۲	پہلا مسئلہ: زبانیں اور لغات توقیفی ہیں	۳۸۵
پانچ دلائل	۳۷۳	ان دلائل کا جواب	۳۸۶
چھٹے استدلال کا رد	۳۷۳	دوسرا مسئلہ: صفات وخواص کا علم	۳۸۶
دوسرا شبہ: واقعہ ہاروت و ماروت	۳۷۳	دو اقوال	۳۸۶
چار وجوہات	۳۷۳	دو وجوہات	۳۸۷

اہل معانی وحقائق کا قول ۳۸۷
عَرَضَهُمْ کی حکمت ۳۸۸
سوال وجواب ۳۸۸
تیسرا مسئلہ ۳۸۸
چوتھا مسئلہ: حضرت آدم علیہ السلام کا نبی ہونا ۳۸۸
دو وجوہات ۳۸۸
سیدنا آدم اس وقت نبی نہ تھے ۳۸۹
تین دلائل ۳۸۹
پانچواں مسئلہ: إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ کی تفسیر ۳۹۰
چار وجوہات ۳۹۰
چھٹا مسئلہ: فضیلت علم ۳۹۱
فضیلت علم اور کتاب اللہ ۳۹۳
چار وجوہات ۳۹۳
قلیل علم اور مخلوق ۳۹۴
قلتِ دنیا پر دلیل ۳۹۵
سات افراد میں فرق ۳۹۵
اُولی الامر، اصحاب علم ۳۹۶
چار اصناف کے درجات ۳۹۶
علماء کے پانچ مناقب ۳۹۷
احادیثِ مبارکہ اور فضیلت علم ۳۹۸
علم حاصل کرنے والا روزہ دار کی طرح ۳۹۸
عالم اور انبیاء کا قرب ۳۹۸
مخلوق روتی ہے ۳۹۹
عابد پر ستر درجے ۳۹۹
خلفاء رسول ۳۹۹
آثار صحابہ اور فضیلت علم ۴۰۰
علماء تین طرح کے ۴۰۰
عالم بامر اللہ کی تین علامات ۴۰۱
عالم باللہ کی تین علامات ۴۰۱
عالم باللہ و بامر اللہ کی چھ علامات ۴۰۲
علم وفکر کے بغیر دل کا مردہ ہونا ۴۰۲
تین اوقات میں نیند اور ہنسی ۴۰۲
۱۔علم و پانی میں پانچ مشابہتیں ۴۰۲
۲۔دنیا کی بہار پانچ چیزیں ۴۰۲
۳۔امام حسن بصری کی پانچ فضیلتیں ۴۰۳
۴۔علم نافع کی پہچان کیسے ہو؟ ۴۰۴
۵۔پانچ چیزوں سے پانچ طلب کرو ۴۰۴
۶۔خواص کے پانچ طبقات ۴۰۴
۷۔علم مال سے سات طرح افضل ہے ۴۰۵
۸۔سات عزتوں کا حصول ۴۰۵
۹۔علماء اور طبقات دوزخ ۴۰۶
۱۰۔آٹھ آدمیوں کی صحبت ۴۰۶
۱۱۔سات طرح کا علم ۴۰۷
کمالات علم ۴۰۸
علم اور سلام الٰہی ۴۰۸
اُمت اور محبت نبوی ﷺ ۴۰۸
۱۲۔مومن اور چھ خصائل ۴۰۹
۱۳۔جنت کا راستہ ۴۰۹

۱۴۔چار سے چار کا حصول	۴۱۰	چیونٹی کا علم وادب	۴۲۷
۱۵۔چار چیزوں کی تکمیل	۴۱۰	سدھایا ہوا کتا اور علم	۴۲۷
۱۶۔قیام دنیا اور چار	۴۱۰	قوت دل اور علم	۴۲۸
۱۷۔مرد چار طرح کے	۴۱۱	علم وعمل کا رشتہ	۴۲۸
۱۸۔چار سے نفرت نہیں	۴۱۱	علم اور خدمت رب	۴۲۸
۱۹۔علماء اور مال	۴۱۱	حکایات متعلقہ فضیلت علم	۴۲۹
فضیلت علم پر عقلی دلائل	۴۱۱	۱۔امام ابو یوسف کا کمال علمی	۴۳۱
علم جنت اور جہالتِ دوزخ	۴۱۲	۲۔حسنین کا اولادِ رسول ہونا	۴۳۱
لذت علم سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں	۴۱۳	۳۔امام اعظم کا فاتحہ خلف الامام	۴۳۲
فضیلتِ علم پر مزید چار نصوص	۴۱۳	۴۔فرزدق کی ذہانت	۴۳۲
سوال وجواب	۴۱۳	۵۔امام اعظم کی دانائی	۴۳۳
تین وجوہات	۴۱۳	۶۔امام ابو یوسف اور احترامِ مسلم	۴۳۳
اہلِ جنت ہونے پر دلالت	۴۱۴	۷۔السلام علیکم اور امن	۴۳۴
عقلی دلیل	۴۱۴	علوم کا انکشاف	۴۳۴
تین اُمور کا علم	۴۱۴	امام اعظم کی علمی بصیرت	۴۳۵
خوف اور حصول جنت	۴۱۴	امام محمد کا علمی کمال	۴۳۷
احادیث طیبہ اور علم	۴۱۹	امام شافعی کا علمی کمال	۴۳۸
اُمت کو پڑھانے والوں کی شان	۴۱۹	امام حسین رضی اللہ عنہ اور اعرابی کی علمی گفتگو	۴۳۸
عالم کی تعظیم	۴۲۰	چند سوالات وجوابات	۴۳۸
موت اور حصولِ علم	۴۲۳	فضیلت علم پر شواہد عقلی	۴۴۱
ہُدہُد اور پانی	۴۲۵	ساتواں مسئلہ: تعریف علم میں اقوال	۴۴۹
یہ میرے بس میں نہیں	۴۲۶	اعتراض وجواب	۴۴۹
نکات متعلقہ فضیلت علم	۴۲۶	معتزلہ اور تعریف علم	۴۵۱
حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ	۴۲۷	فلاسفہ اور تعریف علم	۴۵۱

چار عیوب	۴۵۱
آئینہ میں تین اُمور	۴۵۲
شیخ غزالی کا رد	۴۵۲
تین وجوہات	۴۵۲
علم کی مختار تعریف	۴۵۳
آٹھواں مسئلہ: علم کے مترادف الفاظ کا بیان	۴۵۳
اہم تفسیری نکتہ	۴۵۴
ایک اور راز	۴۵۵
تفسیر معرفت میں اقوال	۴۵۵
حکمت کی تعریف	۴۵۷
نواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ پر معلم کا اطلاق نہیں ہوتا	۴۶۱
آیت ۳۲-۳۳ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا کی تفسیر	۴۶۲
معصیت کا قول کرنے والے	۴۶۲
عصمت ماننے والے	۴۶۲
پہلا مسئلہ: معارف اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں	۴۶۳
جواب	۴۶۳
دوسرا مسئلہ: غیب اور تعلیم الٰہی	۴۶۳
تیسرا مسئلہ: اَلْعَلِيْمُ کی تفسیر	۴۶۳
چوتھا مسئلہ: حکیم کا استعمال	۴۶۴
پانچواں مسئلہ: اشیاء اور علم الٰہی	۴۶۴
سوال وجواب	۴۶۴
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کی تفسیر	۴۶۵
پانچ اقسام کا بیان	۴۶۵
چھٹا مسئلہ: خوف عظیم اور فرحت عظیم	۴۶۵
اللہ تعالیٰ کی خاطر گناہوں سے رکنا	۴۶۶
تین احوال میں نفس کا خیال	۴۶۶
آیت ۳۴: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کی تفسیر	۴۶۷
چوتھا انعام	۴۶۷
پہلا مسئلہ: حکم سجدہ تکمیل تخلیق سے پہلے	۴۶۸
دوسرا مسئلہ: یہ سجدہ عبادت نہ تھا	۴۶۸
دو اعتراضات	۴۶۸
دوسرا طعن	۴۶۸
جواب	۴۶۸
دوسرا قول: سجدہ تعظیمی تھا	۴۶۹
تیسرا قول: سجدہ بمعنی طاعت	۴۷۰
سوال وجواب	۴۷۰
تیسرا مسئلہ: کیا ابلیس فرشتوں میں داخل ہے؟	۴۷۰
ایک اور دلیل	۴۷۱
خازن جنت مراد ہے	۴۷۱
سوال وجواب	۴۷۱
ملائکہ سے ماننے والوں کی دلیل	۴۷۳
چوتھا مسئلہ: انبیاء، ملائکہ سے افضل	۴۷۵
اہل سنت کا مسلک	۴۷۵
ملائکہ انسان سے افضل	۴۷۵
بیس دلائل	۴۷۶
پہلی دلیل کا رد	۴۷۸

حضرت کعب الاحبار کا خوبصورت جواب	۴۷۹
سوال وجواب	۴۷۹
ملائکہ کی متعدد زبانیں	۴۸۰
نوٹ	۴۸۰
پانچویں دلیل: انبیاء اُمتوں سے افضل	۴۸۲
سوال وجواب	۴۸۲
چھٹی دلیل	۴۸۳
ملائکہ اور ثبوت تقوی	۴۸۳
چند سوالات وجوابات	۴۸۳
ملائکہ اور تمناء درجات	۴۸۳
انسانی خواہشات زیادہ ہیں	۴۸۴
ساتویں دلیل	۴۸۴
سوال وجواب	۴۸۶
تین دلائل	۴۸۹
مکلف کی چار انواع	۴۹۰
نوٹ	۴۹۴
سترہویں دلیل: حضرت جبریل اور حضرت محمد ﷺ پر گفتگو	۴۹۵
سوال وجواب	۴۹۶
علوم کی دو اقسام	۴۹۷
فلاسفہ کا اتفاق	۴۹۹
دلائل واعتراضات	۴۹۹
اہم باریک نکتہ	۵۰۱
ملائکہ کی قوت شیاطین سے زیادہ	۵۰۲
حضرات انبیاء علیہم السلام کے افضل ہونے پر دلائل	۵۰۵
چھ دلائل	۵۰۶
مخالفین کا جواب	۵۱۰
پہلی دلیل کا جواب	۵۱۰
دوسری دلیل کا رد	۵۱۰
سوال جواب	۵۱۱
تیسری دلیل کا رد	۵۱۱
آخری دو وجہ	۵۱۲
پانچواں مسئلہ	۵۱۲
جواب	۵۱۳
چھٹا مسئلہ: عقلاء کے دو اقوال	۵۱۴
حکمت پر سات اعتراضات	۵۱۴
چند مباحث	۵۱۶
پہلی بحث	۵۱۶
پہلی تفسیر	۵۱۶
دوسری تفسیر	۵۱۶
دوسری بحث: معصیت اور کفر	۵۱۷
جواب	۵۱۷
ساتواں مسئلہ: تمام فرشتوں کو سجدہ کا حکم	۵۱۷
دو دلائل	۵۱۷
بعض کا انکار	۵۱۷
حکماء کا قول	۵۱۷
تفسیر کا دوسرا جز	۵۱۷

یہ مدنی سورت ہے لیکن آیت 281 حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں نازل ہوئی۔اس کی کل دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیات ہیں۔

[۱] الٓمّٓ ﴿۱﴾

(الف، لام، میم)

الٓمّٓ میں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، الفاظ کا اسماء ہونا

واضح رہنا چاہیے جن الفاظ سے اسماء مرکب ہوتے ہیں، ان کے مسمیات حروف مفردہ ہیں، اس لئے لفظ ضاد مفرد اور یہ معنی مستقل پر دلالت کرتا ہے لیکن اس میں کوئی معین زمانہ نہیں، 'ضرب' کے حرف اول 'ض' کا یہی مفہوم ہے تو ثابت ہوا کہ یہ اسماء ہیں اس لئے بھی کہ ان حروف میں امالہ، تفخیم، تعریف، تنکیر، جمع، تصغیر، وصف، اسناد و اضافت تمام جاری ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ یقیناً اسماء ہی ہیں۔

سوال: امام ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اس کیلئے ایسی نیکی ہے جو دس کے برابر ہے تو میں یہ نہیں کہتا کہ "الٓمّٓ" ایک حرف ہے بلکہ الف، لام اور میم الگ الگ حروف ہیں۔ (سنن ترمذی:۲۹۱۰)

یہ روایت تمہارے بیان کردہ (کہ یہ اسماء ہیں) کے مخالف ہے۔

جواب: انھیں مجازاً حرف فرمایا گیا کیونکہ یہ حروف کے اسماء ہیں، آپس میں دو متلازمین میں سے ہر ایک کا دوسرے پر مجازاً اطلاق معروف ہے۔

حروف کے نام رکھنے کی وجہ، چند فروعات

۱۔ ان کے ناموں میں اہلِ علم نے لطیف معانی کی رعایت بیان کی ہے۔وہ یہ ہے کہ جب اپنے اسماء کی طرح مسمیات الفاظ ہوں گے اور یہ حروف مفرد ہیں اور اسامی کے عدد حروف تین تک چلے جائیں تو پھر اسم کی مسمیٰ پر دلالت ہوتی ہے تو الف کے سوا، مسمیٰ ہر اسم کا صدر ہو سکتا ہے۔تو انہوں نے اس کے مسمیٰ کی جگہ ہمزہ لے لیا کیونکہ الف ساکن ہی ہوتا۔

۲-عامل کے بغیر حکم

ان کا بغیر عامل حکم یہ ہے کہ ان کا آخر ساکن ہوگا جیسے اسماء اعداد۔ مثلاً الف، لام، میم، جس طرح ہم کہتے ہیں: واحد، اثنان، ثلاثہ، جب ان پہ عامل آئے گا تو یہ اعراب پائیں گے مثلاً ھذہ الف (یہ الف ہے) کتبت الفاً (میں نے الف لکھا) نظرت الی الف (میں نے الف دیکھا)۔

اسی طرح ہر اسم کا معاملہ ہے۔ جو مسمیٰ تک پہنچاتا ہے اس لیے کہ ذات لفظ کی وضع ذات معنی کیلئے ہے اور حرکاتِ الفاظ، احوال معانی پر دلالت کرتی ہیں تو جب جوہر معنی مقصود ہوتو پھر لفظ کا حرکات سے خالی ہونا ضروری ہوگا۔

۳-ان کا معرب ہونا

یہ اسماء معرب ہیں اور ان پر سکون ان دیگر اسماء کی طرح ہے جن پر عامل نہ ہونے کی وجہ سے اعراب نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ان کا ساکن ہونا وقف کی وجہ سے ہے نہ کہ مبنی ہونے کی وجہ سے کیونکہ اگر یہ مبنی ہوتے تو یہ کیف، این اور ھؤلاء کی طرح ہوتے نہ کہ دو ساکن کا مجموعہ صاد، قاف، نون۔

دوسرا مسئلہ، سورتوں کے ابتدائی کلمات میں دو اقوال

ارشاد الٰہی الم اور دیگر فواتح سور میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: ان کا علم پوشیدہ اور ایسا راز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص فرمایا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

في كل كتاب سر و سره في القرآن اوائل السور — ہر کتاب کے کچھ راز ہوتے ہیں، اللہ کے راز قرآن میں اوائل سور ہیں

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ان لكل كتاب صفوة و صفوة هذا الكتاب حروف التهجى — ہر کتاب کے منتخبات ہوتے ہیں، قرآن کے منتخبات یہ حروف تہجی ہیں

راز رکھنے کی حکمت

بعض عرفاء نے فرمایا، علم سمندر کی طرح ہے اس سے دریا جاری ہیں اور دریا سے نہریں، نہر سے سوئے پھر اس سوئے سے چھوٹے کھال، اگر دریا، جدول کی طرف بہے تو وہ غرق و فاسد ہو جائے، اگر سمندر نالہ کی طرف بہے تو وہ ختم ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک سے یہی مراد ہے

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا　　اس نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے اپنے اپنے لائق بہہ نکلے　　(پ۱۳الرعد:۱۷)

اللہ تعالیٰ کے ہاں علم سمندر ہیں، اس میں سے انبیاء علیہم السلام کو اس نے علوم کے دریا عطا فرمائے، پھر انبیاء علیہم السلام نے علماء کو علوم کی نہریں عطا کیں، علماء نے عوام کو حسب استعداد کھالوں کی صورت میں علم دیا پھر انھوں نے بقدر طاقت آگے پھیلایا۔

یہی حقیقت ایک روایت میں یوں ہے:

کچھ علماء کے راز ہوتے ہیں اور کچھ خلفاء کے، کچھ انبیاء علیہم السلام کے راز، اور کچھ فرشتوں کے، اس کے اوپر تمام اللہ کیلئے راز ہیں، اگر جاہل لوگ، علماء کے رازوں سے آگاہ ہو جائیں تو انھیں ظاہر کر دیں، اگر علماء، خلفاء کے رازوں سے واقف ہو جائیں تو وہ انھیں پھینک دیں اگر خلفاء، انبیاء علیہم السلام کے اسرار سے آگاہ ہو جائیں تو وہ ان کی مخالفت کریں، اگر حضرات انبیاء علیہم السلام، ملائکہ کے رموز سے آگاہ ہو جائیں تو ان پر تہمت باندھیں، اگر ملائکہ، اللہ تعالیٰ کے راز سے آگاہ ہو جائیں تو حیرانگی میں پڑ جائیں اور جل کر راکھ ہو جائیں۔

اس کا سبب

اس کا سبب یہ ہے کہ کمزور عقلیں اسرار قویہ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، جیسے چمگادڑ نور شمس کی متحمل نہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام کو اسرار نبوت نبھانے کیلئے دوسروں کی نسبت کامل عقل دی گئی ہے۔ علماء کو عوام کی نسبت، اسرار کے لئے اعلیٰ عقل دی گئی ہے، عوام ان اسرار کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اسی طرح علماء باطن کا معاملہ ہے اور وہی حکماء ہیں، ان کی عقلیں وہ کچھ اٹھا سکتی ہیں جس سے علماء ظاہر عاجز ہیں۔

امام شعبی سے ان حروف کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

سر اللہ فلا تطلبوہ　　یہ اللہ تعالیٰ کے راز ہیں ان کا معنی مت پوچھو

امام ابو ظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا، علماء ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔

امام حسین بن الفضل نے فرمایا: یہ متشابہات میں سے ہیں۔

متکلمین کا انکار اور دلائل

اہل کلام و عقائد نے اس قول کا انکار کرتے ہوئے کہا یہ ہرگز جائز نہیں کہ کتاب اللہ میں ایسی چیز ہو جو مخلوق سمجھ ہی نہ پائے،

اس پر آیات، احادیث اور دلائل عقلیہ سے یوں استدلال کیا ہے۔

چودہ آیات قرآنی

اس پر انہوں نے چودہ آیات قرآنی ذکر کی ہیں:

۱۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (پ۲۶، محمد:۲۴) تو کیا وہ قرآن میں سوچتے نہیں یا دلوں پر ان کے قفل لگے ہیں

یہاں لوگوں کو قرآن میں تدبر کا حکم ہے اگر وہ سارا سمجھ نہیں آتا تو پھر تدبر کا حکم کیسے؟

۲۔ ارشاد مبارک ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (پ۵، النساء:۸۲) تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر وہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے

تو نفی تناقص واختلاف کی معرفت کیلئے لوگوں کو قرآن میں تدبر کا حکم کیوں دیا جبکہ مخلوق اس کو سمجھ ہی نہیں پاتی۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (پ۱۹، الشعراء:۱۹۲،۱۹۵) اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے اسے روح الامین لے کر اترا، تمہارے دل پر، کہ تم ڈر سناؤ، روشن عربی زبان میں

اگر قرآن سمجھ ہی نہیں آتا تو اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا منذر (ڈر سنانے والا) ہونا باطل ہو جائے گا، پھر

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (پ، الشعراء:۱۹۴) واضح عربی زبان میں

بتا رہا ہے کہ یہ لغت عرب میں نازل ہوا ہے اس وجہ سے اس کا مفہوم سمجھ میں آنا ضروری ہے۔

۴۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (پ۵، النساء:۸۳) تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے

قرآن سے استنباط، تب ہی ممکن ہے جب اس کے تمام معانی سے آگاہی ہو۔

۵۔ فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (پ۱۴، النحل:۸۹) اور ہم نے تم پر قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے

دوسرے مقام پر الفاظ مبارکہ ہیں:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ (پ۷، الانعام:۳۸) ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا

۶۔ قرآن کی صفت بیان کی:

هُدًى لِّلنَّاسِ (پ۲، البقرہ:۱۸۵) لوگوں کیلئے ہدایت اور راہنمائی

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (پ۱، البقرہ:۲) ہدایت ہے ڈر والوں کیلئے

جو نا معلوم ہو وہ رہبر و ہادی نہیں بن سکتا۔

۷۔ قرآن کے بارے میں فرمایا:

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (پ۲۷، القمر:۵) معراج کو پہنچی ہوئی حکمت

شفا قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (پ۱۱، یونس:۵۷) اور دلوں کی صحت اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کیلئے

یہ تمام صفات کسی غیر معلوم کی نہیں ہو سکتیں۔

۸۔ فرمایا:

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ مُّبِينٌ (پ۶، المائدہ:۱۵) بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور کتاب روشن

۹۔ ارشاد مبارک ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ (پ۲۱، العنکبوت:۵۱) اور کیا یہ انہیں کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے ایمان والوں کیلئے

یہ کتاب کافی کیسے ہو سکتی ہے، اور یہ نصیحت کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر یہ سمجھ ہی نہیں آتی؟

۱۰۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ (پ۱۳ ابراہیم:۵۲) یہ لوگوں کو حکم پہنچاتا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے ڈرائے جائیں

تو یہ بلاغ (حکم پہنچانے والی) کیسے بنے گی، اس کے ساتھ انذار (ڈرانا) کیسے ہوگا جبکہ یہ معلوم ہی نہیں؟

اس آیت کے آخر میں فرمایا:

وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (پ۱۳، ابراہیم:۵۲) اور اس لئے کہ عقل والے نصیحت مانیں

یہ وصف تب ہے کہ یہ معلوم ہو۔

۱۱۔ ارشاد مقدس ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (پ۵، النساء:۱۷۴) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل آئی اور ہم نے تمھاری طرف روشن نور اتارا

اگر اس کا معنیٰ سمجھ نہیں آتا تو یہ برہان اور نور مبین کیسے قرار پائے گی؟

۱۲۔ ارشاد فرمایا:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (پ۱۶، طٰہٰ:۱۲۳،۱۲۴) تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا وہ نہ بہکے نہ بد بخت ہو اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو بیشک اس کیلئے تنگ زندگانی ہے

اگر یہ معلوم نہیں تو اسکی اتباع اور اس سے اعراض کا کیا معنیٰ؟

۱۳۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (پ۱۵، الاسراء:۹) بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے

اگر اس کے معانی معلوم نہیں تو یہ کتاب ہادی کیسے بن سکتی ہے؟

۱۴۔ ارشاد الٰہی ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (پ۳، البقرۃ:۲۸۵) رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اترا اور ایمان والے اور عرض کی کہ ہم نے سنا اور مانا

اور طاعت، معنی سمجھنے کے بعد ہی ممکن ہے لہٰذا قرآن کا مفہوم ہونا لازم وضروری ہے

احادیث مبارکہ

ا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے میں تمہارے اندر جو چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم اس سے تمسک (پکڑ کر) رکھو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

کتاب اللّٰہ و سنتی (سنن ترمذی، ۳۷۸۸) وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے

اگر قرآن کے معنی ہی معلوم نہ ہوں تو اس سے تمسک کیسے ہوگا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر کتاب اللہ کا ماننا لازم ہے، اس میں تمھارے لئے تم سے پہلے اور بعد کی خبریں ہیں اور یہی تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے، یہی قطعی بات کرتا ہے، یہ مذاق نہیں، جس نے اسے چھوڑا اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دے گا، جس نے اس کے علاوہ کی اتباع کی اللہ تعالیٰ اس پر گمراہی مسلط فرما دے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی، ذکر، حکیم اور صراط مستقیم ہے۔ اس کی وجہ سے خواہشات میں ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے اہل علم کبھی سیر نہ ہوں گے، یہ کثرت تلاوت سے پرانا نہیں ہوگا، اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے، جس نے اس کے ساتھ قول کیا وہ سچا، جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ عادل، جس نے اس کے ذریعے جھگڑا کیا وہ کامیاب ٹھہرا، جس نے اس کی دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی رہنمائی پائی۔

دلائل عقلیہ

دلائل عقلیہ یہ ہیں:

ا۔ ایسی شئی جس کا علم نہ ہو اس کے ساتھ ایک دوسرے سے تخاطب وگفتگو ایسے ہی ہے جیسے کسی عربی سے حبشی اپنی زبان میں گفتگو کرے۔ جب یہ جائز نہیں تو یہاں عدم مفہوم کے بغیر تخاطب جائز نہ ہوگا۔

۲۔ کلام وگفتگو سے مقصود افہام اور بات سمجھانا ہوتا ہے جب کلام مفہوم ومعلوم ہی نہیں تو اس کے ساتھ مخاطبت عبث وکم عقلی ہوگی اور یہ بات حکیم ذات کے لائق وشایانِ شاں کہاں؟

۳۔ قرآن کے ساتھ چیلنج اور تحدی ہے اور جو مفہوم ومعلوم ہی نہ ہو، اس کے ساتھ تحدی کا جواز نہیں ہوسکتا۔

مخالفین کے دلائل

متکلمین کے مخالفین نے بھی آیات، احادیث اور عقلی دلائل دیئے ہیں

آیت قرآنی

متشابہ قرآن کا حصہ ہے لیکن وہ (کسی کو) معلوم نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ (پ۳، آل عمران:۷) اور اس کا حقیقی پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے

یہاں ''الا اللہ'' پر وقف ان وجوہات کی بنا پر لازم ہے۔

۱۔ ارشاد گرامی 'وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ' کا عطف اگر الا اللہ پر ہو تو ''يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ'' ماقبل سے منقطع ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں کیونکہ تنہا اس کا کوئی معنی نہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ'' حال ہے کیونکہ پھر اس کا تعلق ماقبل تمام (عبارت) سے ہوگا تو لازماً معنی یہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ہم ایمان لائے جو ہمارے رب کی طرف سے ہے اور یہ بات سراسر کفر ہے۔

۲۔ اگر راسخین فی العلم، تاویل متشابہات سے آگاہ ہوں تو پھر انھیں ان پہ ایمان کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کیونکہ جب وہ اس کے معنی سے آگاہ ہیں تو ان پر ایمان، محکم آیات پر ایمان کی طرح ہی ہوگا، لہٰذا متشابہ پر ایمان کے لئے کوئی مزید مدح نہ بنے گی، حالانکہ یہ مدح ہے۔

۳۔ اگر متشابہات کی تاویل کا جاننا لازمی ہے تو پھر ان کی تاویل طلب کرنے پر مذمت نہیں ہونی چاہیئے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی طلب پر مذمت فرمائی ہے۔ ارشاد مبارک ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ (پ۳، آل عمران:۷) وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑے ہیں

حدیث مبارکہ

دوسرا مسئلہ کے ابتدا میں جو روایات آئی ہیں: مثلاً سیدنا صدیق اکبر کا قول 'لکل کتاب سر الخ' (ہر کتاب کے کچھ راز ہوتے ہیں) یہ بھی ان کے دلائل ہیں

۱۔ یہ بھی مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا بعض علوم مخفی خزانہ ہیں جنہیں ''عارف باللہ'' لوگ ہی جانتے ہیں، جب وہ انھیں ظاہر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے مخالف اس کا انکار کرتے ہیں۔ (مسند الفردوس،۸۰۲)

۲۔ اوائل سُور (سورتوں کے ابتدائی کلمات) کا معنی معلوم نہیں، یہ اکابر صحابہ کا قول ہے لہٰذا اسی کا حق ہونا ضروری ہے۔ سرور عالم ﷺ کا فرمان ہے:

اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی اقتدا کرلو گے ہدایت پاؤ گے (تلخیص الحبیر:۱،۱۹۰)

3 ## دلائل عقلیہ

ہمیں جن اعمال کا مکلف بنایا گیا ان کی دو اقسام ہیں:

۱۔ ہم ان اعمال کی کچھ نہ کچھ عقلاً حکمت سے آگاہ ہیں، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، کیونکہ نماز، خالق کی بارگاہ اقدس میں خالص تواضع، تضرع ہے، زکوٰۃ محتاج وضرورتمند کی حاجت پوری کرنے کی کوشش وجدوجہد ہے، صوم، کسرِ شہوت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ بعض اعمال کی حکمت سے ہم آگاہ نہیں مثلاً افعالِ حج۔ رمی جمرات، صفا ومروہ میں سعی، رمل واضطباع کی عقلاً حکمت سمجھ نہیں آتی۔

اس پر تمام محققین متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا جس طرح پہلی قسم کے افعال کا حکم دینا جائز ہے، اسی طرح دوسری قسم کے افعال کا حکم دینا بھی حسن اور جائز ہے اس لئے کہ قسم اول کی طاعت، کمال انقیاد، فرمانبرداری پہ دلیل نہیں کیونکہ ممکن ہے مکلف اسے عقلی مصلحت کی بنا پر ہی بجالا رہا ہو ہاں قسم ثانی کی طاعت کمال فرمانبرداری اور انتہائی تسلیم پر دلیل ہے اس لئے کہ جب وہ ان کی عقلی مصلحت سے آگاہ ہی نہیں تو اب ان کی بجا آوری محض فرمانبرداری وتسلیم ہی کی وجہ سے ہوگی۔

اقوال کی دو اقسام

جب افعال کی صورت یہ ہے تو اقوال کی دو اقسام کیوں نہیں ہوسکتیں؟

۱۔ اللہ تعالیٰ ہم سے ایسے کلمات سے کلام فرمائے کہ ہم اس کے معنی سے آگاہ ہوں۔

۲۔ اور کبھی ہم ان کے معانی سے آگاہ نہ ہوں۔

تو اس سے مقصود، مکلف کا حاکم کے سامنے انقیاد وتسلیم کا ہی ظہور ہو۔

جبکہ اس میں ایک اور فائدہ بھی ہے، انسان جب کسی معنی سے اچھی طرح واقف ہو تو اس کا اثر دل میں کم ہو جاتا ہے، لیکن جب مقصود سے آگاہ نہ ہو اور قطعاً جانتا ہو کہ کلام فرمانے والا احکم الحاکمین ہے تو انسان کا دل ہمیشہ ہی اس کی طرف متوجہ اور اس میں غور وفکر کرتا رہے گا، مکلف بنانے کا نچوڑ یہ ہے۔

اشتغال السر بذکر اللہ تعالیٰ والتفکر فی کلامہ دل ذکر الٰہی میں اور دماغ وفکر کلام الٰہی میں مشغول رہے

کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہو کہ بندے کے ذہن ودماغ کا اس طرف ہمیشہ متوجہ رہنے میں اس کیلئے عظیم مصلحت ہے اور اسی مصلحت کی تحصیل کیلئے وہ قول وکلام پر ایمان رکھے گا، اس مسئلہ پر فریقین کی گفتگو کا خلاصہ یہی ہے

اوائل سُور میں اکیس اقوال

کیا اوائل سُور کے معانی معلوم ہیں؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے معانی معلوم ہیں۔ پھر ان کے درمیان معانی میں درج ذیل اختلاف ہے۔

۱۔ یہ اسماء سُور ہیں، اکثر متکلمین کا یہی قول ہے، شیخ خلیل اور سیبویہ کا مختار بھی یہی ہے۔

شیخ قفال کہتے ہیں عرب ان حروف کے ساتھ مختلف اشیاء کا نام رکھتے مثلاً حارثہ کے والد کا لام ہے، حارثہ بن لام الطاقی، نحاس (تانبہ) کو صاد، نقدی کو عین، سحاب کو غین، جبل کا نام قاف، مچھلی کا نام نون۔

۲۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ یوں دعا کیا کرتے، یا کھٰیٰعص، یا حم عسق۔

۳۔ یہ اسماء الٰہیہ کے حصص واجزا ہیں، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (الم، حم، ن) ان کا مجموعہ الرحمٰن ہے لیکن ہم باقی کی کیفیت ترکیب سے آگاہ نہیں

۴۔ یہ اسماء قرآن میں سے ہیں، امام کلبی، سدی، اور قتادہ کا قول یہی ہے۔

۵۔ ان میں سے ہر کوئی اللہ تعالیٰ کے کسی اسم یا صفت پر دال ہے، الم کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

الف، اللہ تعالیٰ کے احد، اول، آخر، ازلی، ابدی۔ لام اس کے لطیف، اور میم اس کے مالک، مجید و منان ہونے پر دال ہے۔

کھیعص میں فرمایا یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ثنا کی ہے، کاف، اس کے کافی۔ ھا، اس کے ہادی، عین، عالم او صاد، صادق ہونے پر دال ہے

امام ابن جریر (ت، ۳۱۰) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا، کاف، کبیر و کریم، یا، یجیر (وہ پناہ دیتا ہے) عین، عزیز (غالب) وعدل پہ دال ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور مروی دونوں وجوہ میں فرق یہ ہے پہلی وجہ میں ان حروف میں سے ہر ایک اسم معین کے ساتھ خاص جبکہ دوسری وجہ میں ایسا نہیں ہے۔

۶۔ ان میں سے بعض کی اسماء ذات پر اور بعض کی اسماء صفات پہ دلالت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الم کا معنی یوں بیان کیا

انا اللّٰہ اعلم — میں اللہ سب سے علم والا

المص کے بارے میں بتایا:

انا اللّٰہ افعل — میں اللہ فیصلہ فرمانے والا

الر میں بتایا:

انا اللہ ارٰی میں اللہ دیکھنے والا

اور یہ شیخ ابوصالح اور سعید بن جبیر سے بھی مروی ہے۔

۷۔ ہر ایک صفات افعال پہ دال ہے، الف۔الاءہ، (اس کی نعمتیں) لام، اس کا لطف، میم، اس کا مجد و بزرگی۔ یہ امام محمد بن کعب قرظی کا قول ہے، حضرت ربیع بن انس نے کہا:

ما منها الا فی ذکر الائه و نعمائه ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں پر دال ہے

۸۔ بعض، اللہ کے اسماء پر اور بعض اسماء غیر اللہ پر دال ہیں، حضرت ضحاک نے فرمایا الف، من اللہ (اللہ کی طرف سے) لام، من جبریل (جبریل لائے) میم (محمد پر) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبریل امین کے ذریعے حضرت محمد ﷺ پر اتاری۔

۹۔ ہر حرف اللہ تعالیٰ کے کسی فعل پر دال ہے، الف، اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ سے محبت فرمائی اور انھیں رسول بنایا، لام، مخالفین نے آپ پر ملامت کی، میم، کفار جل اٹھے اور ظہور حق سے ذلیل ہوئے۔

بعض صوفیہ نے فرمایا الف کا معنی انا (میں) لام، لی (میرے لئے) میم کا، منّی (مجھ سے) ہے۔

۱۰۔ یہ معنی شیخ مبرد نے ذکر کیا اور اسے محققین کی عظیم جماعت نے قبول کیا، اللہ تعالیٰ نے ان حروف کا ذکر کفار کے خلاف بطور استدلال کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب انھیں چیلنج کیا کہ مثل قرآن لے آؤ یا دس سورتوں کی مثل یا ایک ہی سورت کی مثل لے آؤ تو وہ لانے سے عاجز ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان حروف کو نازل کیا اور بتایا کہ قرآن تو ان حروف سے مرکب ہے جن پر تم قادر ہو اور تم قوانین فصاحت سے واقف ہو تو تم پر قرآن کی مثل لانا لازم تھا جب تم اس سے عاجز آ گئے تو اس نے اشکار کر دیا۔

انه من عند الله لا من البشر یہ اللہ کی طرف سے ہے نہ کہ بشر کی طرف سے

۱۱۔ شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا، ان حروف کے ذریعے اللہ تعالیٰ گویا بندوں سے فرما رہا ہے ان حروف کو الگ الگ اچھی طرح جان لو حتیٰ کہ جب یہ بصورت مرکب تم پر آئیں تو تم انھیں پہچانتے ہوں جیسا کہ بچوں کو اولاً الگ حروف سکھائے جاتے ہیں اور پھر مرکبات۔

۱۲۔ شیخ ابن روق اور قطرب کا قول یہ ہے جب کفار نے کہا:

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور ڈالو تا کہ تمہیں غلبہ ہو جائے

(پ۲۴، فصلت:۲۶)

تو مسلسل انھوں نے قرآن سے اعراض شروع کیا چونکہ اللہ تعالیٰ ان کا نفع اور اصلاح چاہتے تھے تو ان پر ایسی خبر نازل کی جسے وہ نہ جانتے تھے تاکہ وہ نازل ہونے والے قرآن کو سنیں اور خاموشی اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ حروف نازل کیئے جب وہ سنتے تو متعجب ہو کر کہتے، سنو جو محمد (ﷺ) لایا ہے جیسے ہی متوجہ ہوتے تو قرآن ان پر غالب آجاتا تو یہ ان کے سننے اور نفع حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئے۔

۱۳۔ حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان میں سے ہر حرف قوموں کی مدت واجل پر دال ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا، ابو یاسر بن اخطب، رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گذرا، اس وقت آپ ﷺ سورۃ البقرہ (الم ذالك الكتاب) کی تلاوت فرمارہے تھے پھر اس کے بھائی حیّ بن اخطب اور کعب بن اشرف نے آکر الم کے بارے میں سوالات کیے تمہیں اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کیا حق ہے کہ یہ تم پر آسمان سے نازل ہوا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہاں، یہ اسی طرح نازل ہوا ہے، حیّ بن اخطب کہنے لگا اگر تم نے سچ کہا ہے تو میں اس امت کی عمر سے آگاہ ہو گیا ہوں تو ہم ایسے آدمی کے دین میں کیسے داخل ہو جائیں جس کی امت کی آخری مدت اکہتر (۷۱) سال ہے۔ اس پر سرور عالم ﷺ مسکرائے، کہنے لگا: اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ فرمایا: ہاں المص کہنے لگا یہ پہلے سے اکثر ہے، یہ ایک سو اکسٹھ سال ہیں۔ کیا اس کے علاوہ ہے؟ فرمایا: ہاں! الر۔ کہنے لگا یہ پہلے دونوں سے زائد پر دال ہے، اگر تو سچا ہے تو تیری امت دو سو اکتیس سال (۲۳۱) رہے گی۔ کیا اس کے علاوہ بھی ہے؟ فرمایا: المر۔ کہنے لگا: ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے ہم یہ نہیں جان سکے کہ تمہارے کون سے قول کو اخذ کریں۔

ابو یاسر کہنے لگا میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انبیاء نے اس امت کی ہمیں خبر دی مگر انھوں نے اس کی تعداد نہیں بتائی، اگر محمد اپنے قول میں سچے ہیں تو میں دیکھ رہا ہوں یہ تمام کو جمع کرلیں گے۔ اس پر وہ کھڑے ہو گئے اور کہا ہم پر تمہارا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہم نہیں جان رہے کہ قلیل کو لیں یا کثیر کو؟ اس ارشاد مبارک کی یہی وجہ نزول ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ (پ۳، آل عمران:۷) وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اُتاری

(تفسیر ابن کثیر:۱:۵۱)

۱۴۔ یہ حروف، کلام کے انقطاع اور نئے کلام پہ دال ہوتے ہیں، شیخ احمد بن یحییٰ بن ثعلب کہتے ہیں عرب جب نیا کلام شروع کرتے تو وہ ایسی شئی لاتے جو نئے کلام کے علاوہ ہوتی جس سے وہ مخاطبین پر واضح کرتے کہ کلام اول ختم اور نیا کلام شروع ہو رہا ہے

۱۵۔ امام ابن جوزی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا:

ان هذه الحروف ثناء اثنی الله عزوجل به علی نفسه یہ حروف ثناء ہیں ان سے اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف وثنا کی ہے

۱۶۔ شیخ اخفش کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان حروف بے نقط کے شرف وفضل پر ان کی قسم کھائی، اس لئے یہ کہ مختلف زبانوں میں نازل شدہ کتب کے مبانی اور بنیاد ہیں۔ یہ اسماء حسنیٰ اور صفات الٰہیہ کے بھی مبانی ہیں، انہی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت، ذکر و توحید الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر بعض پر اکتفا کیا اگرچہ کل مراد ہے مثلاً ہم ایک بار کہیں میں نے الحمد پڑھی تو اس سے مراد پوری سورت ہے گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں ان حروف کی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ کتاب وہی ہے جو لوح محفوظ میں ثابت وتحریر ہے۔

۱۷۔ ان حروف کا تکلم اگرچہ ہر ایک کرتا ہے مگر ان اسماء کا مسمّٰی ہونا وہی جانتے ہیں جو تعلم واستفادہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تعلم واستفادہ یہ حروف پڑھے تو یہ غیبی خبر بن گئے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر مقدم کیا تاکہ ابتداء سورت سن کر ہی معلوم ہوجائے کہ یہ معجزہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر شاہد ہے

۱۸۔ شیخ ابوبکر تبریزی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس امت کا ایک گروہ قدمِ قرآن کا قول کرے گا تو اس نے یہ حروف ذکر کیے تاکہ واضح ہوجائے یہ کلام انہی حروف سے مرکب ہے، لہٰذا لازم ہے کہ یہ قدیم نہ ہو۔

۱۹۔ قاضی ماوردی فرماتے ہیں الم سے مرادالم بکم ذالك الكتاب (یہ کتاب تم پر نازل کی گئی) ہے المام بمعنی زیارت، اس کی وجہ یہ ہے کہ جبریل امین اللہ تعالیٰ سے یہ کتاب لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بطور زائر (ملاقاتی) آئے۔

۲۰۔ الف، ابتدا میں ضروری استقامت کی طرف اشارہ ہے اور وہ رعایت وخیال شریعت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر پکے ہوگئے

(پ ۲۴، فصلت:۳۰)

لام، مجاهدات کے وقت حاصل کردہ تواضع اور یہ رعایت طریقت ہے۔ ارشاد مبارک ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انھیں اپنے راستے دکھادیں گے (پ ۲۱، العنکبوت:۶۹)

میم، میں اشارہ ہے کہ بندہ محبت میں اس دائرہ کی طرح ہے جس کی انتہا عین ابتدا اور ابتدا عین انتہا ہوتی ہے۔ اور یہ کلیۃً فنا فی اللہ میں ہے اور یہی مقام حقیقت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ (پ ۷، الانعام ۹۱) اللہ کہو پھر انھیں چھوڑ دو ان کی بیہودگی میں انھیں کھیلتا

۲۱۔ الف کا مخرج اقصی حلق ہے اور یہ حروف کا اول مخرج ہے، لام کا مخرج وسطِ لسان ہے جو وسط مخارج اور میم شفوی ہے جو آخر مخرج ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے۔

لابد وان یکون اول ذکر العبد و وسطه و آخره لیس الا الله تعالیٰ — بندے کے ذکر میں اول، وسط، اور آخر میں اللہ تعالیٰ ہی ہونا چاہیے

جیسے کہ فرمان الٰہی ہے:

فَفِرُّوا اِلَى اللّٰهِ (پ۲۷، الذاریات:۵۰) پس بھاگو اللہ کی طرف

اوائل کا اسماء سُور ہونا

ان اقوال میں سے اکثر محققین کا مختار یہ ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ الفاظ مفہوم و سمجھ نہیں آتے یا سمجھ آتے ہیں۔

اول صورت (سمجھ نہ آنا) ان وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

۱۔ اگر ایسا جائز ہو تو پھر عربی کے ساتھ حبشی زبان میں کلام کرنا جائز ہونا چاہیے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں فرمایا کہ یہ تمام کا تمام ہدایت و رہنمائی ہے اور یہ اس کے معلوم و سمجھ نہ آنے کے منافی ہے اور اگر مفہوم ہیں تو ان سے مراد یہی اسماء القاب ہے یا اسماء معانی، دوسری صورت ان وجوہ پر باطل ہے۔

۱۔ لغت عرب میں یہ الفاظ ان معانی کیلئے وضع نہیں جو مفسرین نے ذکر کیے لہٰذا ان پر ان کا حمل محال ہے۔

۲۔ قرآن لغت عرب میں نازل ہوا لہٰذا انھیں ان معانی پر محمول نہیں کیا جا سکتا جو لغت عرب میں نہ ہوں۔

۳۔ مفسرین نے مختلف معانی بیان کیے اور ان کی بعض پر دلالت دوسرے بعض پر دلالت سے اولیٰ نہیں۔ تو اب تمام پر عمل ہوگا تو یہ بالاتفاق دشوار ہے کیونکہ ہر مفسر نے انھیں ایک ہی معنی پر محمول کیا ہے کسی نے بھی ان تمام پر محمول نہیں کیا۔

یا کسی پر بھی محمول نہیں کریں گے تو جب یہ قسم باطل ٹھہری تو لازماً ان سے مراد اسماء القاب ہیں۔

اسماء القاب یا معانی؟

سوال: یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ ان الفاظ کے معانی نامعلوم ہیں، رہا یہ اعتراض کہ اب عربی کے ساتھ حبشی زبان میں گفتگو جائز ہوگی، اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے، یہ کیوں جائز نہیں ہو سکتی، تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ مشکوٰۃ ذکر کیا جو حبشی لفظ ہے اسی طرح سجیل واستبرق دونوں فارسی ہیں۔

پھر یہ کہنا کہ قرآن تمام بیان وہدایت ہے۔اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجملات، متشابہات پر بھی تو مشتمل ہے اگر وہ اس کے ہدایت وبیان کے منافی نہیں تو یہ کیسے منافی ہوں گے؟

چلو ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ معلوم ومفہوم ہیں لیکن تمہارا یہ قول کہ اسماء القاب یا اسماء معانی ہیں، تب درست ہے جب یہ ثابت ہو کہ یہ کسی معنوی افادہ کے لئے موضوع ہیں اور یہ ثابت نہیں، ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا کسی اور حکمت پر نزول فرمایا ہو جیسے پیچھے شیخ قطرب سے آیا، ابتدا میں جب کفار نے اتفاق کر لیا کہ وہ قرآن کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ابتدا میں یہ حروف پڑھنے کا حکم دیا حتیٰ کہ انھوں نے سنا تو تعجب کرتے ہوئے خاموش ہو گئے پھر قرآن نے ان کی سماعتوں پہ اثر کیا۔

چلو ہم یہ مان لیتے ہیں کہ یہ کسی امر کیلئے وضع ہیں تو یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ اسماء معانی میں سے ہیں۔

اور معترض کا کہنا یہ لغت عرب میں کسی معنی کیلئے ہرگز موضوع نہیں، اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنہا تو کسی معنی کیلئے نہیں لیکن یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ قرینہ مخصوصہ کی وجہ سے یہ معنی معین کا فائدہ دے سکتے ہیں۔اور اس پر دلائل یہ ہیں:

۱۔ حضور علیہ السلام نے بار بار کفار کو قرآن سے تحدی کی، جب آپ نے یہ حروف ذکر کیے تو حالات بتا رہے ہیں کہ ان کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ تھی کہ یہ قرآن انھی حروف سے مرکب ہے جن پر تم قادر ہو۔اگر یہ قرآن کلام بشر ہے تو تمہارا اس کی مثل پر قادر ہونا لازم ہے۔

۲۔ ان حروف کو حساب وکتاب پہ محمول کرنا لوگوں کا معروف طریقہ تھا۔

۳۔ یہ حروف اصول کلام کی وجہ سے عزت وعظمت والے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی باقی اشیاء کی طرح قسم اٹھائی۔

۴۔ کسی بھی اسم واحد کے حروف میں سے ایک حرف پہ اکتفا عربوں کی معروف عادت تھی تو اللہ تعالیٰ نے انھی حروف کے ذریعے اپنے اسماء کی طرف توجہ دلائی۔

متعدد وجوہ سے معارضہ

ہم تمہاری دلیل مانتے ہیں مگر کئی وجوہ اس کے معارض ومخالف ہیں۔

۱۔ ہم کثیر سورتوں کو الم اور حم میں متفق پاتے ہیں جس کی وجہ سے اشتباہ ہوتا ہے حالانکہ اسم علم سے اشتباہ کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔

سوال: بہت سارے لوگوں کا نام محمد ہوتا ہے تو اشتراک، علمیت کے منافی نہیں؟

جواب: ہم نے کہا الم میں کسی معنی کا فائدہ نہیں، اب اگر اسے ہم علم بنا دیں تو تعیین اور ازالہ اشتباہ کے علاوہ کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اس سے یہ مقصد بھی حاصل نہیں ہو رہا تو اسے علم بنانا محال ہے۔

بخلاف نام محمد، وہاں تعیین کے علاوہ بھی کئی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حصول برکت کیونکہ یہ اسم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ صفات شرف میں سے بھی ہے۔ لہٰذا یہاں نام سے تعیین کے علاوہ بھی فائدہ ہوتا ہے۔

بخلاف الم، یہاں تو تعیین کے علاوہ کوئی فائدہ ہی نہیں تو جب اس سے یہ فائدہ ہی حاصل نہ ہوا تو اس کے ساتھ نام رکھنا عبث ہوگا

۲۔ اگر یہ الفاظ اسماء سورتیں ہیں تو ان کا بصورت تواتر منقول ہونا لازم ہوگا کیونکہ یہ اسماء، قوانین اسماء کے مطابق نہیں تو امور عجیبہ کے نقل کے متعدد تقاضے اور دواعی و اسباب ہوتے ہیں خصوصاً جب معاملہ ایسا ہو اس کے اخفا پر نہ رغبت ہو اور نہ خوف، تو جب نقل کے دواعی کثیر ہوں گے تو وہ معلوم بالتواتر ہوگا اور اختلاف ختم ہو جائے گا جب صورت حال ایسی نہیں تو واضح ہو گیا یہ اسماء سور نہیں۔

۳۔ قرآن لغت عرب میں آیا اور عرب دو ناموں کے مجموعہ سے تجاوز نہیں کرتے مثلاً معدیکرب، بعلبک تو وہ تین، چار، پانچ ناموں کا مجموعہ نہیں بناتے، اگر انھیں اسماء سور بنایا جائے تو یہ لغت عرب سے خروج ہوگا جو جائز نہیں۔

۴۔ اگر یہ سورتوں کے اسماء ہیں تو پھر سورتوں کو ان ناموں سے مشہور ہونا ضروری تھا نہ کہ دیگر ناموں سے لیکن وہ تو دیگر ناموں و اسماء سے معروف ہیں، مثلاً سورۃ البقرہ، سورۂ آل عمران۔

۵۔ یہ الفاظ سورتوں میں داخل اور ان کا جزو ہیں، شئی کا جز رتبہ میں شئی سے مقدم ہوتا ہے اور شئی کا اسم، رتبہ میں شئی سے مؤخر، اگر ہم ان حروف کو سورتوں کے اسماء بنائیں تو ایک ہی شئی کا مقدم و مؤخر ہونا لازم آئے گا جو محال ہے۔

سوال: ہم کہتے ہیں صاد، حرف اول (ص) کا اسم ہے جب مرکب بعض مفردات کا نام ہو سکتا ہے تو اسی مرکب کے بعض مفردات اس مرکب کا نام کیوں نہیں ہو سکتے؟

جواب: فرق ظاہر ہے کیونکہ مرکب، مفرد سے مؤخر ہوتا ہے، اور اسم، مسمیٰ سے، اب اگر ہم مرکب کو مفرد کا اسم بنائیں تو اب اس مرکب کا مفرد پر دو طرح سے متاخر ہونا لازم آئے گا اور یہ محال نہیں۔

لیکن جب مفرد کو مرکب کا نام بنائیں تو لازم آئے گا بحیثیت مفرد مقدم ہو اور بحیثیت نام مؤخر ہو اور یہ محال ہے۔

۶۔ اگر یہ اسماء سور ہیں تو لازم تھا کوئی قرآنی سورت ایسے نام سے خالی نہ ہوتی اور یہ چیز حاصل نہیں۔

کچھ جوابات

یہ کہنا مشکاۃ اور سجیل لغت عرب سے نہیں، اس کے دو جواب ہیں۔

۱۔ یہ عربی ہیں البتہ دیگر لغات کے بھی موافق ہیں اور دو لغتوں و زبانوں میں اتفاق ہو سکتا ہے۔

۲۔ ان اسماء کا مسمیٰ پہلے بلاد عرب میں نہ تھا، جب انھیں اس کی معرفت ہوئی تو ان کے اسماء کا بھی پتہ چل گیا اور انھوں نے اس کا اعلان کیا تو یہ الفاظ بھی عربی ہی قرار پائے۔

قول معترض ''جب کتاب میں مجملات، اس کے بیان ہونے کے منافی نہیں'' کا جواب یہ ہے کہ کتاب اللہ میں جو بھی مجمل ہے اس کا بیان عقل، کتاب یا سنت میں ضرور ہوگا تو اب اس کا غیر مفید ہونا لازم نہیں آئے گا تو اب بیان کی وہاں ضرورت پیش آئے گی جس سے مراد الٰہی کی معرفت ممکن نہ ہو۔

معترض کا قول ''یہ کیوں ممکن نہیں'' کہ ان الفاظ سے کفار کا شور سے خاموش کرنا ہو۔

جواب: اگر ان الفاظ سے مقصد یہی تھا تو باقی اور بیانات کا تذکرہ بھی ایسی غرض کیلئے جائز ہو جانا چاہیئے جو بالاتفاق باطل ہے۔

رہی ان کی باقی ذکر کردہ وجوہات تو ہم نے بیان کر دیا تھا کہ الم لغت عرب میں ان معانی کیلئے موضوع ہی نہیں لہٰذا ان میں اس کا استعمال جائز نہیں کیونکہ قرآن لغت عرب میں آیا ہے۔

پھر یہ وجوہات آپس میں متعارض بھی ہیں، لہٰذا بعض کو چھوڑ کر بعض پر عمل کرنا اولیٰ نہیں۔

پھر اگر ہم ان تاویلات کا دروازہ کھول دیں تو تاویلات باطلہ اور دیگر سطحی باتوں کا دروازہ کھل جائے گا جو ہرگز درست نہیں۔

معارضہ اولیٰ کا جواب

معارضہ اولیٰ کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی بُعد اور خرابی نہیں کہ کثیر سورتوں کا نام ایک ہی ہو اور وہ کسی دوسری علامت (خفیہ حکمت) کی وجہ سے ممتاز ہوں۔

دوسرے کا جواب یہ ہے کہ سورت کا نام لفظ معین سے ہونا امور عظیمہ میں سے نہیں تو ممکن ہے یہ حد شہرت و تواتر کو نہ پہنچے ہوں

تیسرے کا جواب یہ ہے تین نام ملا کر اسم واحد بنانے سے کلام عرب سے خروج اس وقت ہوگا جب تم اسے اسم واحد بناؤ مثلاً حضرموت، لیکن اگر غیر مرکب بلکہ اسماء عدد بصورت نثر ہو تو یہ جائز ہوتا ہے کیونکہ شیخ سیبویہ نے جملہ، شعر کے مصرعہ اور حروف معجمہ کو جمع کر کے نام رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔

چوتھے کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی بعید نہیں کہ لقب، اسم اصلی سے زیادہ مشہور ہو جائے تو یہاں یہی صورت ہے۔

پانچویں کا جواب یہ ہے اسم وہ لفظ ہے جو مستقل دلالت کرے اور اس میں زمانہ معین نہ ہو، لفظ اسم کا معاملہ بھی یہی ہے تو اسم اپنی ذات کا بھی اسم ہے جب یہ جائز ہے تو شی کا جز، شئی کا نام واسم کیوں نہیں بن سکتا؟

چھٹے کا جواب یہ ہے کسی کا نام حکمت کے تحت رکھا جاتا ہے۔ کوئی بعید نہیں حکمت بعض سورتوں کے نام کا ہی تقاضا کرے اور بعض کیلئے نہ کرے۔

قول حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے، اس مسلک و مذہب کی مدد میں یہ انتہائی و آخری بات ہے۔

شیخ قطرب کا قول

اس مذہب کے بعد جس کی ہم نے مذکور اقوال میں سے تائید کی شیخ قطرب کا قول ہے، مشرکین ایک دوسرے کو کہتے:

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور ڈالو تا کہ تم غالب ہو جاؤ

(پ ۲۴ ،فصلت:۲۶)

تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حروف سورتوں سے پہلے پڑھتے تو ان سے کچھ سمجھ نہ آتا اور انسان منع کیے جانے والی چیز پر حریص ہوتا ہے تو وہ قرآن کی طرف کان لگاتے اس کی ابتدا و انتہا پر غور وفکر کرتے اس امید پر شاید اس مبہم اور مشکل کلام کا آگے ازالہ ہو جائے تو اس طرح یہ ان کے قرآن سننے کا وسیلہ بنے۔

اس مذہب کی تائید ان دو امور سے ہوتی ہے۔

۱۔ یہ حروف فقط اوائل سورتوں ہی میں ہیں جو بتاتے ہیں شاید ان کا یہی مقصد ہو۔

۲۔ اہل علم کہتے ہیں حکمت، انزال متشابہات میں یہ ہے کہ مخالف کو جب علم ہوگا کہ قرآن متشابہات پر مشتمل ہے تو وہ اس امید پر قرآن میں خوب تدبر و تفکر سے کام لے گا کہ اس میں کہیں میرے قول کی تائید اور میرے مذہب کی نصرت مل جائے گی تو یہی اس کا مطالعہ وتدبیر ان محکمات پر آگاہی کا سبب بن جائے گا جو گمراہیوں سے اسے نکال دے، جب ان متشابہات کا انزال جائز ہے جو ایسے بُرے مقصد و غرض و ضلالات کا وہم پیدا کرے تو ان حروف کا نزول بطریق اولیٰ جائز ہوگا جو ایسی فاسد غرض اور خطا کا وہم پیدا نہیں کرتے۔

اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ پھر انگریز کا عربی کے ساتھ کلام جائز اور اسی غرض کی خاطر ہذیان بیہودہ گوئی بھی جائز ہے اور پھر قرآن کے ہدایت اور بیان ہونے پر بھی طعن آئے گا۔

اس کا جواب

لیکن ہم جواباً کہہ سکتے ہیں یہ کیوں نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ انگریزی میں عربی کے ساتھ گفتگو کرے (اور وہ ایسی مذکورہ مصلحت کو متضمن ہو) تو یہ جائز ہے۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ کلام، افعال میں سے ایک فعل ہے اس کا داعی وتقاضا کبھی افادہ ہوتا ہے اور کہیں افادہ کے علاوہ ان یکون هذیانا۔ (کہ یہ ہذیان ہو)

جواباً ہم کہتے ہیں ہذیان سے مراد اگر فعل کا کلیتہً مصلحت سے خالی ہونا ہے تو معاملہ یوں نہیں (مصلحت اس میں ہے) اور اگر مراد افادہ سے خالی ہونا ہے تو پھر تم یہ کیوں کہتے ہو کہ یہ حکمت پر طعن ہے جب اس وجہ (افادہ) کے علاوہ دیگر وجوہات اس میں موجود ہیں

رہا قرآن کا وصف بیان وہدایت تو وہ ہماری گفتگو کے منافی نہیں کیونکہ جب ان کی غرض وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی کہ وہ کلام الٰہی کی طرف متوجہ ہوں تو ان کا سننا بیان وہدایت کی اعلیٰ صورت ہے۔

یہ سورتوں کے اسماء ہیں

جب انہیں سورتوں کے اسماء مانا جائے تو اس قول پر یہ فروع واحکام ہیں۔

ا۔ ان اسماء کی دو اقسام ہیں:

۲۔ ان میں اعراب آئے گا جب اسم مفرد ہو مثلاً صاد، قاف، نون یا مفرد کے وزن پر مجموعہ ہو مثلاً حم، طس، یٰس، کیونکہ یہ قابیل، ہابیل کے وزن پر ہیں، طسم اگرچہ تین اسماء کا مجموعہ ہے جیسے در ابجد دیہ غیر منصرب ہوگا کیونکہ علمیت وتانیث کا اجتماع ہے

۳۔ کچھ محل اعراب نہ ہونگے مثلاً کھیعص، الر۔

جب تمہیں اس بات کا علم ہو گیا تو اب سنیے۔

ان میں جو مفرد ہیں ان میں دو قرأتیں ہیں:

ا۔ بعض نے انہیں منصوب پڑھا، صاد، قاف، نون تو ان پر زبر، فعل مخفی، اذکر کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے۔

ان پہ تنوین غیر منصرف ہونے کی وجہ سے نہیں آسکتی جیسے پہلے آچکا ہے۔

شیخ سیبویہ نے حم، طس، اور یٰس میں اسی طرح جائز رکھا اگر ان پہ نصب پڑھا جائے۔

شیخ سیرافی نے نقل کیا، بعض قراء نے یٰس کو نون کی فتحہ کے ساتھ پڑھا اور یہ جرِ جوار کی وجہ سے ہوگی بایں طور کہ یہاں باقسمیہ مقدر ہے، یوں بھی کہا: "اللہ لا فعلن" البتہ محل جر میں غیر منصرف ہونے کی وجہ سے مفتوح ہوگی

اس میں وہ بات تاکید پیدا کرتی ہے جو بعض سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف سے قسم اٹھائی ہے۔

۲۔ بعض نے صاد پر کسرہ پڑھا اور اسی کے متحرک ہونے کی وجہ سے جمع ساکنین ہوا۔

پہلی قسم: جن میں اعراب نہیں تو وہ بطور حکایت ہوں گے اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں پہلی صورت پر ہی نقل کیا جائے گا مثلاً دعنی من تمر تان۔

دوسری قسم: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں کی ابتداء میں حروف تہجی کے نصف اسماء رکھے ہیں اور وہ چودہ ہیں، الف، لام، میم، صاد، کاف، ھا، یا، عین، طا، سین، حا، قاف، نون اور یہ انتیس سورتوں کی ابتدا میں ہیں۔

تیسری قسم: یہ ابتدائی کلمات مختلف تعداد میں ہیں حرف واحد ص، ق، ن، دو حروف، طہ، طس، یس، حم، تین حروف، الم، الر، چار حروف المص، المر، پانچ حروف، کھیعص، حمعسق۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کلمات کے اوزان ایک حرف سے لے کر پانچ تک ہی ہیں تو یہاں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے۔

چوتھی قسم۔ ان ابتدائی کلمات کا محل اعراب ہے یا نہیں؟ اگر تو انھیں اسماء سورتیں مانو تو محل اعراب ہے پھر تین صورتیں ہیں مبتدا ہونے کی وجہ سے رفع، قسم کی صورت میں فتح اور جر۔

اور جو انھیں اسماء سورتیں نہیں مانتے ان کے ہاں ان کا کوئی محل اعراب نہیں جیسا کہ ابتدائی جملہ اور مفردات معدودہ محل اعراب نہیں ہوتے۔

[۲] ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾

(وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کسی شک کی جگہ نہیں تو اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کیلئے)

ارشاد الٰہی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ، ذٰلِكَ لانے کی حکمت

سوال: یہاں جس کی طرف اشارہ ہے (کتاب) سامنے اور قریب ہے حالانکہ ذالک، اسم مبہم ہے اس سے تو کسی بعید اور دو کی

طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

جواب دو طرح ہے:

۱۔ ہم کتاب کو ان اسباب کی وجہ سے سامنے وحاضر تسلیم نہیں کرتے۔

شیخ اصم کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کتاب تھوڑی تھوڑی اتاری، سورۃ البقرہ سے پہلے کثیر سورتوں کا نزول ہو چکا اور وہ تمام مکہ میں آئیں ان میں توحید، فسادِ شرک، اثباتِ نبوت اور اثباتِ آخرت پر دلائل تھے تو ''ذالک'' ان سابقہ سورتوں کی طرف اشارہ ہے اور بعض قرآن کو بھی قرآن ہی کہا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَه وَاَنْصِتُوْا (پ۹، الاعراف:۲۰۴) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو

اِنَّا سَمِعْنَا كِتَاباً اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى (پ۲۶، الاحقاف:۳۰) ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ کے بعد اُتاری گئی

واضح ہے انھوں نے کچھ قرآن ہی سنا تھا جو اس وقت تک نازل ہوا تھا۔

۲۔ بوقت بعثت، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ میں تم پر ایسی کتاب نازل کروں گا جسے کوئی مٹا نہ سکے گا، اس کی خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو عطا کی، پھر امت نے آپ سے آگے روایت کیا اس وعدہ کی تائید اس ارشاد سے ہو رہی ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيْلاً (پ۲۹، المزمل:۵) بیشک عنقریب ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالیں گے

یہ سورۂ مزمل میں ہے اور یہ ابتدا میں نازل ہوئی تھی۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا کیونکہ سورۃ البقرہ مدنی ہے اور اس کا اکثر حصہ بنی اسرائیل کے خلاف احتجاج و استدلال ہے، بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اطلاع دی تھی اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر کے ان پر کتاب نازل کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ذالك الكتاب یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کے بارے میں پہلے انبیاء نے اطلاع دی تھی وہ عنقریب اولادِ اسماعیل میں سے آنے والے نبی پر نازل ہوگی۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ وہ لوح محفوظ میں ہے، فرمایا:

وَاِنَّهٗ فِي اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا (پ۲۵، الزخرف:۴) اور بیشک وہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو خبر دی تو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کہنے میں کوئی ممانعت نہیں تا کہ علم ہو کہ یہ وہی کتاب ہے جو لوح محفوظ میں ثبت اور تحریر ہے

۵۔ ذالک کا اشارہ ''الم'' کی طرف ہے جس کا تکلم ہوگیا اور گذر گیا کیونکہ گزرنے والا بعید ہی ہوتا ہے۔

۶۔ جب کوئی شئی مرسل الیہ (جس کی طرف شئی بھجوائی گئی) تک پہنچتی ہے تو اس کا وقوع بعد ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ تم اپنے ساتھی کو کوئی چیز دے کر کہو احتفظ بذلك (اس کی خوب حفاظت کرنا)

۷۔ قرآن چونکہ ایسی عظیم حکمتوں اور علوم کثیرہ پر مشتمل ہے کہ ان تمام کا حصول اور ان پر اطلاع قوتِ بشری پر نہایت دشوار ہے تو قرآن اگرچہ صورت کے اعتبار سے حاضر و سامنے ہے مگر اپنے اسرار و حقائق کی وجہ سے غائب ہے لہٰذا اس کی طرف ایسے اشارہ کیا جا سکتا ہے جیسے کسی بعید و غائب کی طرف ہو۔

قریب و بعید دونوں کیلئے

دوسری وجہ یہ کہ ہم مانتے ہیں کہ کتاب سامنے ہے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ذالک سے اشارہ بعید ہی کی طرف ہوتا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ذالك اور ھٰذا دونوں حروف اشارہ ہیں ان کا اصل ''ذا'' ہے جو حرف اشارہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً (پ۲، البقرۃ:۲۴۵) ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسنہ دے

اور 'ہا' کا معنی تنبیہ ہے، جب شئی قریب ہو تو 'ھٰذا' سے اشارہ کر کے کہا جاتا ہے اے مخاطب متوجہ ہو جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ اس طرح تیرے پاس ہے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔

اور کبھی ذا پر کافِ خطاب اور لام، بمعنی اشارہ بھی تاکید کیلئے لایا جاتا ہے تو ''ذالك'' بن گیا گویا کلام والا، تنبیہ میں خوب اضافہ کر رہا ہے کیونکہ یہاں مشار الیہ مخاطب سے مؤخر ہے۔

یہاں سے واضح ہو رہا ہے کہ ذالک اصل وضع کے اعتبار سے بعید پر دال نہیں بلکہ عرف میں بُعد پر اشارہ کیلئے ساتھ قرینہ کی ضرورت ہوگی تو یہ دابتکی طرح ہے جو عرف میں گھوڑے کیلئے ہے اگرچہ اصلِ وضع میں ہر زمین پہ چلنے والے کیلئے ہے۔

جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو ہم کہیں گے ہم یہاں ذالک کو وضع لغوی پر ہی محمول کریں گے نہ کہ وضع عرفی پر، تو اب اس میں بُعد نہیں ہے، ذالک اور ہٰذا کو اسی مقاربت کی وجہ سے ایک دوسرے کے مقام پر لایا جاتا ہے مثلاً اللہ پاک کا ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ (پ۲۳،ص:۴۵تا۴۸)	یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق، یعقوب قدرت اور علم والوں کو بلاشبہ ہم نے انہیں اعلیٰ بات سے امتیاز بخشا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے اور بلاشبہ وہ ہمارے ہاں چنے اور پسندیدہ ہیں اور یاد کرو اسمٰعیل اور یسع اور ذوالکفل کو اور یہ تمام اچھے ہیں

پھر فرمایا:

هٰذَا ذِكْرٌ — یہ قرآن میرے ساتھ والوں کا ذکر ہے

اور فرمایا:

وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ (پ۲۳،ص:۵۲،۵۳)

اوران کے پاس وہ بیبیاں ہیں کہ اپنے شوہر کے سوا اور کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتیں ایک عمر کی یہ ہے وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے

یہ بھی فرمایا:

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَالِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (پ۲۶،ق:۱۹)

اور آئی موت کی سختی حق کے ساتھ، یہ ہے جس سے تو بھاگتا تھا

ارشاد الٰہی ہے:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (پ۳۰،النازعات:۲۵،۲۶)

تو اللہ نے دنیا و آخرت کے عذاب میں اسے پکڑا بلاشبہ اس میں ڈروالے کیلئے سبق ہے

یہ بھی فرمان الٰہی ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ (پ۱۷،الانبیاء:۱۰۵)

اور بیشک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہیں

پھر فرمایا:

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِيْنَ (پ۱۷،الانبیاء:۱۰۶)

بیشک یہ قرآن کافی ہے عبادت والوں کو

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (پ۱،البقرہ:۷۳)

تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو۔

یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح مردوں کو زندہ فرماتا ہے۔

فرمایا:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى (پ۱۶،طٰہٰ:۱۷)

اور تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ

یعنی ما ھٰذا التی بیمینك　(یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے)۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ، اسم اشارہ مذکر کیوں؟

سوال: اسم اشارہ مذکر کیوں حالانکہ مشارالیہ سورت مؤنث ہے؟

جواب: ہم مشارالیہ مؤنث نہیں مانتے کیونکہ مؤنث مسمّٰی ہے یا اسم، اول باطل کیونکہ مسمی بعض قرآن ہے اور وہ مونث نہیں اور اسم وہ "الم" ہے اور یہ بھی مؤنث نہیں ہاں اس کا دوسرا اسمٰی سورت ہے اور وہ مؤنث ہے لیکن سابق مذکور اسم مؤنث نہیں اور وہ الم ہے نہ کہ سورت۔

مدلول لفظ کتاب

تیسرا مسئلہ، اسماء قرآن کثیر ہیں

ا۔ الکتاب۔ یہ القیام اور الصیام کی طرح مصدر ہے، فعال بمعنی مفعول جیسے لباس بمعنی ملبوس ہے۔ اس پر اتفاق ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

کِتَابٌ اَنۡزَلۡنَاہُ اِلَیۡكَ　(پ۲۳، ص:۲۹)　یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اُتاری

کتاب کے معانی

قرآن مجید میں کتاب کا استعمال کئی معانی میں ہوا ہے۔

ا۔ بمعنی فرض، ارشاد مبارک ہے:

كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِصَاصُ　(پ۲، البقرہ:۱۷۸)　تم پر قصاص فرض ہے

كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ　(پ۲، البقرہ:۱۸۳)　تم پر روزے فرض کئے گئے

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ كِتَابًا مَّوۡقُوۡتًا　بیشک نماز مسلمانوں پر وقت مقررہ پر فرض ہے

(پ۵، النساء:۱۰۳)

۲۔ حجت و برہان، فرمان مبارک ہے:

4

فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ — لاؤ اپنی کتاب اگر تم سچے ہو

(پ۲۳، الصافات:۱۷۵)

یعنی اپنی دلیل لاؤ۔

۳۔اجل، ارشاد مقدس ہے:

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ — اور جو بستی ہم نے ہلاک کی اس کا ایک جانا ہوا نوشتہ تھا

(پ۱۴، الحجر:۴)

۴۔غلام کو مکاتب بنانا، ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ — اور تمہارے ہاتھ کی ملک باندی غلاموں میں سے جو یہ چاہیں کہ کچھ مال کمانے کی شرط پر انہیں آزادی لکھ دو

(پ۱۸، النور:۳۳)

یہ مصدر فعال بمعنی مفاعلہ ہے جیسے جدال، صیام، قتال بمعنی مجادلہ، مخاصمہ، اور مقاتلہ ہیں، کتاب، کتبت الشئ بمعنی جمع سے مشتق ہے، لشکر کو اجتماع کی وجہ سے کتیبہ کہا جاتا ہے۔

کتاب کو بھی کتاب کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ شبہات کے لشکروں کے مقابل لشکر کا درجہ رکھتی ہے یا اس لئے کہ اس میں جمیع علوم جمع ہیں یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں مخلوق پر ذمہ داریاں لازم کیں ہیں۔

لفظ قرآن پر بحث

۲۔ اس کا دوسرا نام القرآن ہے، ارشاد الٰہی ہے:

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ — تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کی مثل نہ لا سکیں گے

(پ۱۵، الاسراء:۸۸)

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (پ۲۵، الزخرف:۳) — ہم نے اسے عربی قرآن اتارا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (پ۲، البقرہ:۱۸۵) — رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُترا

4/4

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے

(پ۱۵،الاسراء:۹)

مفسرین کے دو اقوال

مفسرین کے اس میں دو اقوال ہیں۔

ا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے قرآن اور قرأۃ ایک ہی ہیں جیسے خسران وخسارہ ایک ہیں۔اس پہ دلیل یہ ارشاد مقدس ہے

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پ۲۹،القیامۃ:۱۸) تو جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس کی اتباع میں پڑھو

یعنی جب ہم اس کی تم پر تلاوت کریں تو اس تلاوت کی اتباع کرو۔

۲۔ حضرت قتادہ کا قول،قرآن مصدر ہے،جب حوض میں پانی جمع کرو تو کہو گے قرأت الماء فی الحوض۔(حوض میں پانی جمع ہے)

حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے،حروف جمع ہو کر کلمات،کلمات جمع ہو کر آیات اور آیات جمع ہو کر سورتیں اور سورتیں جمع ہو کر قرآن

ثم جمع فيه علوم الاولين والآخرين پھر اس میں اولین وآخرین کے علوم جمع کر دیئے گئے ہیں

حاصل یہ ہے کہ لفظ قرآن کا معنی تلاوت یا جمع کرنا ہے۔

فرقان کا مفہوم

۳۔ الفرقان،ارشاد مبارک ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اتارا قرآن اپنے بندہ پر

(پ۱۸،الفرقان:۱)

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (پ۲،البقرہ:۱۸۵) ہدایت اور راہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

ا۔ اس لیے فرقان ہے کہ اس کا نزول آہستہ آہستہ اور جدا جدا بیس سال سے زائد عرصہ میں ہوا۔ارشاد مبارک شاہد ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا (پ ۱۵، الاسراء:۱۰۶)
اور قرآن ہم نے جدا جدا کر کے اتارا تاکہ تم اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو اور ہم نے اسے بتدریج رہ رہ کر اُتارا

باقی تمام کتب سماویہ یکبار نازل ہوئیں، اسے تھوڑا تھوڑا اُتارنے کی حکمت سورۃ الفرقان میں ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (پ ۱۹، الفرقان:۳۲)
اور کافر بولے قرآن ان پر ایک ساتھ کیوں نہ اُتار دیا ہم نے یونہی بتدریج اسے اُتارا ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے تمہارے دل کو تقویت دیں

۲۔ فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے قرآن حق و باطل، حلال و حرام، مجمل و بین، اور محکم و مؤول میں فرق کر دیتا ہے۔

۳۔ فرقان کا معنی نجات ہے، حضرت عکرمہ اور سدی کا یہی قول ہے، مخلوق، گمراہیوں کی ظلمتوں میں تھی تو قرآن کے ذریعے اس نے نجات پائی۔ اس ارشاد الٰہی میں مفسرین نے فرقان کا معنی یہی لیا ہے

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (پ ۱، البقرہ:۵۳)
اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور نجات دی کہ کہیں تم راہ پر آؤ

الذکر کا معنی

۴۔ الذکر، التذکرہ، الذکریٰ۔

الذکر، ارشاد مبارک ہے:

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (پ ۱۷، الانبیاء:۵۰)
اور یہ برکت والا ذکر کہ ہم نے اُتارا

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (پ ۱۴، الحجر:۹)
بے شک ہم نے اُتارا یہ قرآن

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (پ ۲۵، الزخرف:۴۴)
اور بیشک وہ شرف ہے تمہارے لئے اور تمھاری قوم کیلئے۔

اس میں دو وجوہ ہیں:

۱۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یاد دہانی ہے جس کے ذریعے اس نے اپنے بندوں کو متوجہ کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد فرمودہ ذمہ داریوں اور اس کے احکام سے آگاہ ہوگے۔

۲- یہ اس پہ ایمان لانے والوں کیلئے ذکر، شرف، اور فخر ہے، یہ حضور ﷺ اور آپ کی اُمت کیلئے سراپا شرف ہے

التذکرہ، قرآن مجید میں ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (پ۲۹، الحاقہ:۴۸) اور بیشک یہ قرآن ڈروالوں کیلئے نصیحت ہے

الذکرٰی، ارشاد فرمایا:

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور سمجھاؤ کہ سمجھانا مسلمانوں کو فائدہ دیتا ہے

(پ۲۷، الذاریات:۵۵)

تنزیل وحدیث

۵- التنزیل- جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ اور بیشک یہ قرآن رب العالمین کا اُتارا ہوا ہے اسے روح الامین لے کر اُترا

(پ۱۹، الشعراء:۱۹۲، ۱۹۳)

۶-الحدیث- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا (پ۲۳، الزمر:۲۳) اللہ تعالیٰ نے اتاری سب سے اچھی کتاب

نام حدیث کی وجہ یہ ہے یہ آپ ﷺ کیلئے جدید اور نیا ہے اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گفتگو کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مکلفین سے خطاب فرمایا ہے:

۷- موعظۃ ارشاد الٰہی ہے:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی

(پ۱۱، یونس:۵۷)

حقیقت میں قرآن ہی موعظت ونصیحت ہے کہ نازل فرمانے والے اللہ تعالیٰ، لانے والے جبریل امین اور حاصل کرنے والے محمد ﷺ ہیں تو اس کے ساتھ موعظت کیوں نہ حاصل ہوگی؟

الحکم والحکمۃ

۸۔ الحکم، الحکمۃ، الحکیم، المحکم۔

قرآن کوحکم قرار دیتے ہوئے فرمایا

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (پ۱۳، الرعد:۳۷) اور اسی طرح ہم نے اسے عربی فیصلہ اتارا

حِکْمَۃً قرار دیتے ہوئے فرمایا

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (پ۲۷، القمر:۵) انتہا کو پہنچی ہوئی حکمت

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (پ۲۲، الاحزاب:۳۴) اور یاد کرو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور حکمت

الحکیم کے بارے میں فرمایا

يٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ (پ۲۳، یٰسین:۱) حکمت والے قرآن کی قسم

المحکم کے بارے میں یہ آیت ہے:

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ (پ۱۱، ھود:۱) یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہیں

معنی حکمت کی تفصیل

معنی حکمت میں دو اقوال ہیں

۱۔ شیخ خلیل کہتے ہیں یہ احکام والزام (پختہ لازم کرنا) سے ماخوذ ہے

۲۔ شیخ مؤرج کے ہاں یہ حکمۃ اللجام سے ہے کیونکہ لگام جس طرح چار پائے کو کنٹرول میں رکھتی ہے اسی طرح حکمت انسان کو بے وقوفی سے بچاتی ہے۔

۹۔ **الشفاء**۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (پ۱۵، الاسراء:۸۲) اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کیلئے شفا ورحمت ہے

وَشِفَاۤءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (پ۱۱، یونس:۵۷) اور یہ دلوں کیلئے شفاء ہے

اس میں دوصورتیں ہیں

۱۔ یہ امراض سے شفا کا ذریعہ ہے

۲۔ یہ مرضِ کفر سے شفا دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفر وشرک کو مرض قرار دیا ہے

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (پ۱، البقرہ:۱۰) ان کے دلوں میں مرض ہے

قرآن سے ہر قلبی شک دور ہو جاتا ہے لہٰذا اسے سراپا شفا کہنا درست ہے

قرآن کا ہدایت وہادی ہونا

۱۰۔ الھدیٰ، الہادی۔ ہدیٰ، قرار دیتے ہوئے ارشاد ہے

هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (پ۱، البقرۃ:۲) اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کے لیے

هُدًی لِّلنَّاسِ (پ۳، آل عمران:۴) لوگوں کو راہ دکھاتی ہے

وَ شِفَاۤءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ اور دلوں کی صحت اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کیلئے

(پ۱۱، یونس:۵۷)

الہادی، اس بارے میں فرمان الٰہی ہے

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بہت سیدھی ہے

(پ۱۵، الاسراء:۹)

جِنّات سے حکایت ہے

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ ہم نے ایک خوبصورت قرآن سنا جو بھلائی کی راہ بتاتا ہے

(پ۲۹، الجن:۱،۲)

۱۱۔ صراط مستقیم۔ ارشاد الٰہی ہے

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ اور بلا شبہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس کی اتباع کرو

(پ۸، الانعام:۱۵۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صراط مستقیم کی تفسیر، قرآن کی ہے

۱۲۔الحبل۔ارشاد مبارک ہے

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا (پ۴ ال عمران:۱۰۳) اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو

حبل کی تفسیر قرآن ہے، حبل کہنے کی وجہ یہ ہے جس طرح رسی پکڑنے والا غرق ہونے اور ہلاکت سے بچ جاتا ہے اسی طرح قرآن سے تمسک کرنے والا آخرت کے عذاب اور دنیاوی عبرت و پریشانی سے بچ نکلتا ہے۔اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو، عصمہ، قرار دیا

ان هذا القرآن عصمة لمن اعتصم به قرآن اسے بچانے والا ہے جو اس سے تمسک کرے

(المستدرک:۲۰۴۰)

اور اس لئے بھی

يعصم الناس عن المعاصي یہ لوگوں کو معاصی و نافرمانی سے روکتا ہے

۱۳۔الرحمۃارشاد الٰہی ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کیلئے شفا اور رحمت ہے (پ۱۵، الاسراء:۸۲)

گمراہیوں اور جہالتوں سے چھٹکارے سے بڑھ کر کون سی رحمت ہوتی ہے؟ اور یہ قرآن سے حاصل ہوتا ہے

۱۴۔الروح۔قرآن مجید میں ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا اور یونہی ہم نے تمھیں وحی بھیجی ایک جانفزا چیز اپنے حکم سے

(پ۲۵، الشوریٰ:۵۲)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ ملائکہ کو ایمان کی جان یعنی وحی دے کر اپنے جن بندوں پر چاہے اُتارتا ہے (پ۱۴، النحل:۲)

روح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حیاتِ ارواح کا سبب ہے، حضرت جبریل امین کو روح کہا گیا۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (پ۱۶ ،مریم:۱۷) تو اس کی طرف ہم نے اپنا روحانی بھیجا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی روح کہا گیا

اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (پ۶ ،النساء:۱۷۱) مریم کی طرف بھیجا اور اس کے یہاں کی ایک روح

۱۵۔القصص،ارشاد الٰہی ہے

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (پ۱۲ ،یوسف:۳) ہم تمہیں سب سے اچھا بیان سناتے ہیں

قصص،اتباع کیونکہ قرآن کی اتباع لازم ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (پ۲۰،القصص:۱۱) اور اس کی ماں نے اس کی بہن سے کہا اس کے پیچھے چلی جا

یا اس لئے کہ قرآن نے سابقہ واقعات وحقائق سے موافقت کی۔ارشاد الٰہی ہے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (پ۳ ،ال عمران:۶۲) یہی بے شک سچا بیان ہے

۱۶۔ البیان۔ التبیان۔ المبین۔ بیان قرار دیتے ہوئے فرمایا

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (پ۴،ال عمران:۱۳۸) یہ لوگوں کو بتانا ہے

تبیان کے حوالہ سے فرمایا

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور ہم نے تم پر یہ قرآن اُتارا جو ہر چیز کا روشن بیان ہے

(پ۱۴ ،النحل:۸۹)

مبین۔اس ارشاد مقدس میں یہی نام ہے

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (پ۱۲ ،یوسف۱) یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں

۱۷۔البصائر۔اس نام کی نشاندہی یہ آیت کررہی ہے

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (پ۹ ،الاعراف۲۰۳) یہ تمہارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولتا ہے

جس طرح بصر (آنکھ) سے نجات کا راستہ دیکھا جاتا ہے اسی طرح قرآنی دلائل سے حق کا راستہ دیکھا جاسکتا ہے

۱۸۔الفصل۔اس آیت مبارکہ میں یہی نام ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (پ۳۰،الطارق:۱۳،۱۴) بلاشبہ یہ ضرور فیصل ہے اور یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں

الفصل کے دو معانی

ا۔ فیصلہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا

۲۔ روز قیامت لوگوں کے درمیان امتیاز کردے گا کچھ لوگوں کو جنت اور کچھ کو دوزخ کی طرف بھیجے گا، جس نے دنیا میں قرآن کو قائد بنایا اسے یہ جنت کی طرف بھیجے گا اور جس نے اس سے روگردانی کر دی اسے دوزخ کی طرف چلادے گا۔

۱۹۔ النجوم۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (پ ۲۷، الواقعہ:۷۵) مجھے قسم ہے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (پ ۲۷، النجم:۱) قسم ستارے کی جب وہ اُترا

اس لئے کہ یہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے

۲۰۔ المثانی۔ ارشاد الٰہی ہے

مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (پ ۲۳، الزمر:۲۳) دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں

کیونکہ اس میں واقعات اور خبریں بار بار لائی گئی ہیں۔

۲۱۔ النعمۃ۔ ارشاد مبارک ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (پ ۳۰، الضحٰی ۱۱) اور اپنے رب کی نعمت کا چرچا کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نعمت کی تفسیر قرآن کی ہے۔

۲۲۔ البرھان۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (پ ۶، النساء:۱۷۴) بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آئی۔

قرآن، برہان (قطعی و آخری دلیل) کیسے نہ ہو تمام فصحاء اس کی مثل لانے سے عاجز ہیں

۲۳۔ البشیر۔ النذیر۔ قرآن کی انہی ناموں کی بنا پر انبیاء علیہم السلام سے مشارکت ہے۔ کیونکہ رُسل کرام کے بارے میں ہے

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ (پ ۶، النساء:۱۶۵) رسول خوشخبری دینے اور ڈر سنانے والے ہیں

حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ہم نے بھیجا آپ کو گواہ، مبشر اور نذیر بنا کر

(پ۲۶، الفتح:۸)

شانِ قرآن حم السجدہ میں یوں بیان کی

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ (پ۲۴، فصلت:۴) یہ بشارت دینے اور ڈرانے والا ہے تو ان میں سے اکثر نے اعراض کیا

یعنی اپنی اتباع کرنے والوں کو جنت کی بشارت اور نافرمانی کرنے والوں کو دوزخ سے باخبر کرتا ہے۔ اسی بنا پر ہم اللہ تعالیٰ اور قرآن کے مشترکہ نام ذکر کیا کرتے ہیں

۲۴۔ القیم۔ اس کا نام یوں ہے

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا (پ۱۵، الکہف۲) عدل والی کتاب تاکہ سخت عذاب سے ڈرائے

دین بھی قیم ہے۔ ارشاد ہے

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (پ۱۰، التوبہ:۳۶) یہ سیدھا دین ہے

اللہ سبحانہ قیوم ہے

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور اوروں کو قائم رکھنے والا ہے (پ۳ البقرۃ:۲۵۵، پ۳ آل عمران۲)

قیم کی وجہ یہ ہے کہ قرآن بیان و افادہ میں قائم بذاتہ ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں

۲۵۔ المہیمن۔ اس نام قرآن کا تذکرہ اس طرح ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ اور اے محبوب! ہم نے تمہاری طرف سچی کتاب اُتاری اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور اس پر محافظ (پ۶، المائدہ:۴۸)

یہ امین سے بنا ہے، قرآن کا نام اسی وجہ سے ہے کہ جس نے بھی قرآن کا دامن پکڑ لیا وہ دنیا و آخرت کے نقصان سے امن پا جائے گا۔ ربِ مہیمن نے، کتابِ مہیمن، نبی امین پہ ایسی اُمت کیلئے نازل فرمائی جو مخلوق پہ اللہ تعالیٰ کے امین و شہداء ہیں،

جیسا کہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (پ۲، البقرۃ:۱۴۳)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب اُمتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو

۲۶۔الھادی۔ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (پ۱۵، الاسراء:۹)

بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے

يَهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ (پ۲۹، الجن:۲)

کہ بھلائی کی راہ بتاتا ہے

اللہ تعالیٰ بھی ہادی ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے وہ نور و ہادی ہے

۲۷۔النور۔اللہ تعالیٰ کا مبارک فرمان ہے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۱۸، النور:۳۵)

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا

قرآن کے بارے میں ہے:

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ

اور اتباع کرتے ہیں اس نور کی جو نبی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے

(پ۹، الاعراف:۵۷)

یہاں مراد قرآن ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور قرار دیتے ہوئے فرمان ہے

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب

(پ۶، المائدہ:۱۵)

یہاں نور سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے

اپنے دین کو نور قرار دیا

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ

چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھا دیں

(پ۲۸، الصف:۸)

اس کے بیان کو نور فرمایا

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ (پ۲۳، الزمر:۲۲)

تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے

تورات کو نور فرمایا

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ (پ۶، المائدۃ:۴۴)

بیشک ہم نے توریت اُتاری اس میں ہدایت اور نور ہے

انجیل کو نور بتایا

وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ (پ۶، المائدۃ:۴۶)

اور ہم نے اسے انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔

ایمان کو بھی نور قرار دیا۔

يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ (پ۲۷، الحدید:۱۲)

دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے۔

۲۸۔الحق۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الباعث، الشہید، الحق بھی ہیں۔قرآن حق ہے

وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ (پ۲۹، الحاقہ:۵۱)

اور بیشک وہ یقینی حق ہے

تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا نام حق رکھا کیونکہ یہ باطل کی ایسی ضد ہے کہ اسے زائل کر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (پ۱۷، الانبیاء:۱۸)

بلکہ ہم حق کو باطل پہ دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجہ نکال دیتا ہے تو جبھی وہ مٹ کر رہ جاتا ہے

زاھق کا معنی، ختم کردینے والا ہے

۲۹۔العزیز۔رب العزت کے بارے میں ہے

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (پ۱۹، الشعراء:۹)

اور بیشک تمہارا رب ضرور وہی عزت والا مہربان ہے

شانِ قرآن میں فرمایا

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ (پ۲۴، فصلت:۴۱)

بلاشبہ یہ کتاب عزیز ہے

نبی ﷺ بھی عزیز ہیں۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے (پ۱۱،التوبہ:۱۲۸)

اُمت بھی عزیز ہے

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں ہی کیلئے ہے۔

(پ۲۸،المنافقون:۸)

تو ربِ عزیز نے ، کتابِ عزیز ،نبی عزیز پر اُمتِ عزیز کیلئے نازل فرمائی

عزیز کے دو معانی

۱۔ القاھر۔ قرآن کی شان بھی یہی ہے کیونکہ یہ دشمنوں پر غالب اور اس سے معارضہ کرنے والے کو پچھاڑ دیتا ہے

۲۔ اس کی مثل کوئی نہ ہو۔(یعنی نادر الوجود)

۳۰۔الکریم۔ ارشاد الٰہی ہے

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ بیشک یہ عزت والا قرآن ہے محفوظ نوشتہ میں

(پ۲۷،الواقعہ:۷۷)

یاد رہے اللہ تعالیٰ نے سات اشیاء کو کریم کہا

۱۔ اپنی ذات اقدس کے بارے میں فرمایا

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (پ۳۰،الانفطار:۶) اے آدمی تجھے کس چیز نے فریب دیا اپنے رب کریم سے

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر بلکہ اس کے برابر و مثل کوئی سخی نہیں۔

۲۔ قرآن کو کریم کہا کیونکہ جو حکمتیں و علوم اس سے مستفاد ہوتے ہیں وہ کسی دوسری کتاب سے حاصل ہو ہی نہیں سکتے

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا

وَجَاءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (پ۲۵،الدخان:۱۷) اور آیا ان کے پاس کریم رسول

۴۔ ثواب کو کریم فرمایا:

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ (پ۲۲ ،یٰسین:۱۱) تو اسے بخشش اور عزت کے ثواب کی بشارت دو

۵۔ عرش کریم ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (پ۱۹ ،النمل:۲۶) اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں وہ بڑے عرش کا مالک ہے

کیونکہ یہ رحمت کا مرکز ہے

۶۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو کریم کہا

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (پ۳۰ ،التکویر:۱۹) یہ قرآن کریم رسول کا قول ہے

اس کا معنی عزیز (عزت والے) ہے

۷۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط کریم ہے

اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (پ۱۹ ،النمل ۲۹) میری طرف ایک عزت والا خط ڈالا گیا۔

تو رب کریم نے کتاب کریم، ملک کریم کے ذریعے نبی کریم پر اُمتِ کریم کیلئے نازل فرمائی۔ جب وہ اس پر عمل کریں گے تو ثواب کریم حاصل کرلیں گے

۳۱۔العظیم۔ ارشاد الٰہی ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (پ۱۴ ،الحجر:۸۷) اور یقیناً ہم نے آپ کو سات آیات دیں جو دوہرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم

۱۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کو عظیم کہا۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (پ۳ ،البقرہ:۲۵۵) وہی ہے بلند بڑائی والا

۲۔ اس کا عرش عظیم ہے۔

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (پ۱۱ ،التوبہ:۱۲۹) وہ بڑے عرش کا مالک ہے

۳۔ اس کی کتاب عظیم ہے

وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (پ۱۴، الحجر:۸۷) اور عظمت والا قرآن

۴- یوم قیامت عظیم ہے

لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ (پ۳۰، المطففین ۵،۶) ایک عظمت والے دن کیلئے جس دن سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے

۵- زلزلہ عظیم

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے

(پ۱۷، الحج۱)

۶- خلق رسول عظیم

وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (پ۲۹، القلم:۴) اور بیشک تمہاری خو بڑی شان کی ہے

۷- علم عظیم

وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا (پ۵، النساء:۴) اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے

۸- کید نساء عظیم

اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ (پ۱۲، یوسف:۲۸) بیشک تمہارا مکر بڑا ہے

۹- فرعونیوں کا جادو عظیم

وَجَآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ (پ۹، الاعراف:۱۱۶) اور وہ بڑا جادو لائے

۱۰- نفس ثواب عظیم

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (پ۲۶، الفتح:۲۹) اللہ نے وعدہ کیا ان سے جو ان میں ایمان اور اچھے کاموں والے ہیں بخشش اور بڑے ثواب کا

۱۱- عقاب عذاب عظیم

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (پ۱، البقرہ:۷) اور ان کیلئے بڑا عذاب

۳۲۔المبارک۔ ارشاد مقدس ہے

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ (پ۱۷، الانبیاء۵۰) اور یہ ہے برکت والا ذکر

اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو مبارک قرار دیا

۱۔حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کا مقام۔ارشادفرمایا

فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (پ۲۰، القصص:۳۰) برکت والے مقام درخت کے پاس

۲۔ زیتون۔اس کے بارے میں فرمان ہے

يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ (پ۱۸، النور۳۵) موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے

کثرت منافع کی وجہ سے ایسا فرمایا

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا

وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا (پ۱۶، مریم:۳۱) اس نے مجھے مبارک کیا

۴۔ بارش

وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا (پ۲۶، ق:۹) اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا

کیونکہ اس میں کثیر منافع ہیں۔

۵۔ لیلۃ القدر۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ (پ۲۵، الدخان:۳) بیشک ہم نے اسے برکت والی رات میں اُتارا

تو قرآن ایسا ذکر مبارک جسے ملک مبارک نے لیلۂ مبارک میں نبی مبارک پہ امت مبارک کیلئے نازل کیا۔

چوتھا مسئلہ، آلم اور ذالك الكتاب کا اتصال

صاحب کشاف لکھتے ہیں، اگر الم کو سورت کا نام قرار دیا جائے تو اس اتصال میں یہ وجوہات ہیں:

۱۔ آلم ،مبتدا، ذالک، مبتدا ثانی اور کتاب خبر پھر یہ جملہ مبتدا اول کی خبر ہے، معنی ہوگا یہ وہ کتاب کامل ہے گویا اس کے مقابل دیگر کتب ناقص ہیں اور یہی اس لائق ہے کہ اسے کتاب کہا جائے جیسے تم کسی کو کہتے ہو۔ھو الرجل یعنی وہ آدمی اچھی خصال میں دوسروں سے کامل ہے

الکتاب، صفت بھی بن سکتی ہے، یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کا وعدہ کیا گیا۔

۲۔ آلم، مبتدا محذوف کی خبر بھی ہو سکتی ہے یعنی هذه الم، ذالك الكتاب خبر ثانی یا بدل جبکہ کتاب کو صفت بنایا جائے هذه الم ایک جملہ جبکہ ذالك الكتاب دوسرا جملہ ہے

۳۔ اگر الم کو بمنزل صوت رکھا جائے تو ذلک مبتدا اور الکتاب اس کی خبر ہے یعنی وہ کتاب جو کتاب کامل کی صورت میں نازل کی گئی یا الکتاب صفت اور مابعد خبر ہے یا مبتدا محذوف ہے ہو، یعنی ان حروف سے وہ کتاب مرکب ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے الم تنزيل الكتاب لا ريب فيه، اب ترکیب ظاہر ہے

لَا رَيْبَ فِيْهِ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: ریب، شک کے قریب بلکہ اس میں اضافہ ہے مثلاً کوئی کہتا ہے رابني امر فلان (مجھے فلاں معاملہ نے شک میں ڈالا) تو اس میں سوء ظن ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

دع ما يريبك الى مالا يريبك — چھوڑ دو جس میں شک ہے اور اپناؤ جس میں شک ہی نہیں

سوال: ریب تو حوادث کے معنی میں مستعمل ہے "ريب الدهر وريب الزمان" (زمانہ کے حوادثات)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ — (پ۲۷، الطور ۳۰) ہمیں ان پہ حوادث زمانہ کا انتظار ہے

غصہ کی وجہ سے دلی اضطراب کو بھی ریب کہا جاتا ہے، شاعر نے کہا:

قضينا من تهامة كل ريب — و خيبر ثم اجمعنا السيوفا

"ہم نے تہامہ اور خیبر میں پریشانی اٹھائی تو پھر ہم نے تلواروں کو جمع کیا"

جواب: ان دونوں میں معنی شک ہے کیونکہ جو ریب زمانہ سے ڈرتا ہے وہ اس میں مشکوک کی طرح ہے۔ اسی طرح دل کا اختلاج بھی یقینی نہیں تو ارشاد الٰہی لاریب فیہ سے مراد ہے کہ یہ کتاب کسی طرح بھی محلِ شک نہیں، مقصود یہ کہ اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں اس کے کلام الٰہی اور معجز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اگر ہم یہ کہیں کہ خصوصاً اس کے معجز ہونے میں کوئی شک نہیں تو اس تاویل آیت کی تاکید اس فرمان کے اقرب ہوگی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا — اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا (پ۱، البقرہ ۲۳)

اعتراضاتِ ملحدین کے جوابات

چند سوالات جو ملحدین نے وارد کئے ہیں

پہلا سوال: اگر تم، یہ مراد لو کہ مخالفین کو اس میں شک نہیں تو غلط کیونکہ اس میں ہمیں شک ہے، اگر مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو شک نہیں تو اس کا کیا فائدہ؟

جواب: مراد یہ ہے کہ یہ کتاب ظہور و وضاحتِ حجت میں یہاں تک ہے کہ کسی کا اس میں شک کرنا مناسب ہی نہیں، اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کیونکہ عرب، فصاحت کے آخری درجہ پر فائز ہونے کے باوجود قرآن کی سب سے چھوٹی سورت کا مقابلہ و معارضہ نہ کر پائے اور یہ بات گواہ بن رہی ہے کہ یہ کتاب ظہورِ حجت میں اس مقام پر ہے کہ کوئی عاقل اس میں شک جائز ہی نہیں سمجھتا۔

دوسرا سوال: یہاں لَا رَیۡبَ فِیۡهِ کیوں کہا یعنی فیہ کو بعد میں لایا گیا جبکہ دوسرے مقام پر

لَا فِیۡهَا غَوۡلٌ (پ۲۳، الصافات:۴۷) اس میں نشہ نہیں

کے الفاظ و انداز ہیں

جواب: اصول یہ ہے کہ سب سے اہم کو مقدم کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد والے اہم کو، اس مقام پہ کتاب سے کلیۃً شک کی نفی اہم ہے، اگر یہاں لا فیہ ریب کہا جاتا تو وہم ہوتا شاید یہاں کوئی اور کتاب ہے جس میں شک ہے حالانکہ یہاں ایسی کوئی کتاب نہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

لَا فِیۡهَا غَوۡلٌ (پ۲۳، الصافات:۴۷) اس میں نشہ نہیں

میں مقصود شراب جنت کو شراب دنیا سے فضیلت دینا ہے کہ وہ عقول کو اس طرح تباہ نہیں کرتا جیسے شراب دنیا کرتا ہے۔

تیسرا سوال: کیسے معلوم ہوا کہ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ سے کلیۃً ریب کی نفی ہے؟

جواب: اس کی قرأت مشہورہ لازماً کلیۃً ریب کی نفی کو مستلزم ہے، اس پہ دلیل یہ ہے لا ریب میں، ماہیت ریب کی نفی ہے اور نفی ماہیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ افراد ماہیت کے ہر فرد کی نفی ہو کیونکہ اگر افراد ماہیت میں سے ایک فرد بھی ثابت ہو جائے تو ماہیت ثابت ہو جائے گی اور یہ نفی ماہیت سے متناقض ہے۔

اسی حکمت و راز کی بنا پر کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمام الٰہ کی نفی ہے

ابوشعثاء نے ''لاریب'' پر رفع پڑھا ہے، یہ ''ریب فیہ'' کی نقیض اور ثبوت فرد واحد کا مفید ہے۔

اور قرأت مشہور سے نفی، تمام افراد کے نفی کو مستلزم ہوگی جس سے تناقص لازم آئے گا۔

دوسرا مسئلہ، فِیْہِ پر وقف

فیہ پر وقف مشہور ہے، لیکن امام نافع و عاصم دونوں ''لاریب'' پر وقف کرتے ہیں لیکن وقف کرنے والوں کے ذہن میں خبر کا ہونا ضروری ہے اس کی نظیر ارشاد الٰہی ہے:

قَالُوا لَا ضَیْرَ (پ ۱۹، الشعراء: ۵۰) وہ بولے کچھ نقصان نہیں

اور عربوں کا قول ''لا بأس'' (اس میں کوئی وجہ نہیں) ہے اور یہ اھل حجاز کے ہاں کثیر ہے تقدیراً یہ عبارت ہوئی لاریب فیہ، فیہ ھدًی واضح رہے پہلی قرأت (''فیہ'' پر وقف) ہی اولیٰ ہے کیونکہ اس قرأت پر خود کتاب سراپا ہدایت ہے جبکہ دوسری میں کتاب سراپا ہدایت نہیں بلکہ اس میں ہدایت (جز) ہے اول اولیٰ ہے کیونکہ قرآن میں بار بار آیا قرآن سراپا نور و ہدایت ہے

ھُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ، ہدایت کی حقیقت

۱۔ دلالت و رہنمائی ہے

۲۔ صاحب کشاف کہتے ہیں الھدٰی، وہ رہنمائی ہے جو مطلوب تک پہنچادے

۳۔ دیگر حضرات کہتے ہیں یہ ہدایت، رہنمائی اور علم کا نام ہے

پہلا قول: (رہنمائی) کی صحت اور دوسرے اور تیسرے قول کے فساد پر دلیل یہ ہے کہ اگر مطلوب تک پہنچانا ''ھدٰی'' میں معتبر ہوتو مطلوب نہ پانے کے وقت حصولِ ہدایت محال ہوگی اس لئے کہ منزل کی طرف رہنمائی، عدم ''اھتدا'' کی صورت میں محال ہو گی حالانکہ وہ محال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنٰھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی اور رہے ثمود انہیں ہم نے راہ دکھائی لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر چاہا (پ ۲۴، فصلت: ۱۷)

یہاں ہدایت و رہنمائی کا اثبات ہے لیکن ''اھتدا'' (ہدایت پالینے) کا نہیں اور اس لئے بھی کہ لغت عرب میں کہا جاتا ہے، ھدیتہ فلم یھتد (میں نے رہنمائی کی مگر وہ منزل نہ پاسکا) اور یہ ہماری تائید ہے۔

صاحب کشاف کے تین دلائل

صاحب کشاف نے تین امور بطور دلیل پیش کئے ہیں

۱۔ ہدایت کے مقابل ضلالت وگمراہی ہے۔ارشاد الٰہی ہے

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی

(پ۱،البقرہ:۱۶)

لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (پ۲۲، سبا:۲۴) یا تو ضرور ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں

۲۔ لفظ مہدی (ہدایت یافتہ) مھتدی کی طرح مقام مدح میں بولا جاتا ہے اگر ہدایت میں مطلوب تک ایصال ورسائی نہ ہوتو مہدی ہونا کوئی مدح نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے ہدایت ہومگر ہدایت نہ پائی ہو۔

۳۔ اھتدی،ھدی کے مطاوع ہے مثلاً ھدیته فاھتدی جیسے کسرته فانکسر (میں نے توڑا وہ ٹوٹ گیا) قطعته فانقطع (میں نے کاٹا وہ کٹ گیا) جیسے ٹوٹ جانا اور قطع ہوجانا،کسر وقطع کولازم ہیں اسی طرح ہدایت پانا بھی لوازم ہدایت میں سے ہے

اول کا جواب

ہدایت دینے اور ہدایت پانے میں بلاشبہ فرق موجود ہے تو ہدایت ورہنمائی کے مقابل گمراہ کرنا اور اھتدا و ہدایت پانے کے مقابل گمراہی ہے تو ہدایت کو گمراہی کے مقابل لانا ہی محال ہے

دوسرے کا جواب

ہدایت سے فائدہ اٹھانے والا ہی مھدی (ہدایت یافتہ) ہوتا ہے اور جو اس سے نفع نہیں اٹھاتا اسے مھدی نہیں کہا جاسکتا اور اس لئے بھی کہ جب وسیلہ مقصود تک نہ پہنچائے تو وہ کالعدم ہوجاتا ہے۔

تیسرے کا جواب

ائتمار،امر کا مطاوع ہے کہا جاتا ہے امرته ائتمر لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امر ہونے کیلئے ائتمار (بجالانا) شرط ہے۔ اسی طرح ہدایت کیلئے لازم نہیں کہ وہ ہدایت یافتہ بنائے پھر یہ اس محاورہ کے معارض ہے ھدیته فلم یھتد (میں نے رہنمائی کی مگر اس نے قبول نہ کی)

خصوصاً ہدی بمعنی علم کے فساد پر یہ بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا وصف ہدی فرمایا اور یہ بلاشبہ بذاتہ علم نہیں تو واضح ہو گیا ہدایت،رہنمائی ہی ہے نہ ہدایت یافتہ اور نہ علم

دوسرا مسئلہ، متقی کا مفہوم

المتقی، اسم فاعل، وقاہ فاتقی سے ہے، وقایہ (بہت زیادہ بچنا) جب یہ جان لیا تو اب سنیے، اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ متقی مقام مدح میں ذکر فرمایا تو جس میں یہ وصف ہوگا وہ بطریق اولیٰ اُمور دنیا میں متقی ہوگا۔ بلکہ وہ ہر اس معاملہ میں متقی ہوگا جس کا تعلق دین سے ہے، یعنی وہ عبادات بجالاتے ہوئے ممنوعات سے بچنے والا ہوگا۔

کیا صغائر سے بچنا تقویٰ میں شامل ہے؟

اس میں اختلاف ہے کیا صغائر سے اجتناب تقویٰ میں شامل ہے؟ بعض نے کہا ہے اسی طرح شامل ہیں جیسے صغائر وعید میں شامل ہیں جبکہ بعض شامل نہیں مانتے تاہم تمام سے توبہ کے لزوم پر کوئی نزاع نہیں، نزاع اس میں ہے کہ جب آدمی صغائر سے نہیں بچتا تو اس پر متقی کا نام آئے گا؟ حضور ﷺ سے مروی ہے:

لا یبلغ العبد درجة المتقین حتی یدع مالا بأس به حذراً مما به البأس (سنن ترمذی، ۲۴۵۱)

بندہ درجہ متقین تک نہیں پہنچتا جب تک وہ کام نہ چھوڑے جن میں کوئی حرج نہیں اس سے ڈرتے ہوئے کہیں یہ حرج والے کاموں سے ہو

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ متقی ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہر اس معاملہ میں بھی ڈرتے ہوں جس کی طرف ان کی خواہش کا میلان ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں، ان تمام کی تصدیق کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

تقویٰ خشیت کا نام ہے، ابتدائے سورۃ النساء میں فرمایا:

یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ (پ۴، النساء:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو

اسی طرح سورۃ الحج کے اول میں بھی ہے۔ الشعراء میں فرمایا:

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ (پ۱۹، الشعراء:۱۰۶) جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا تم کیوں نہیں تقویٰ اختیار کرتے

یعنی کیا تم اللہ سے خشیت نہیں رکھتے؟ اسی طرح حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط، اور حضرت شعیب علیہم السلام نے اپنی اُمتوں سے کہا، سورۃ العنکبوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا

اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ — اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو

یعنی اس سے خشیت وخوف اختیار کرو، اسی طرح فرمان الٰہی ہے:

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (پ۴، ال عمران:۱۰۲) اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (پ۲، البقرۃ:۱۹۷) توشہ ساتھ لو کہ سب سے بہتر توشہ پرہیز گاری ہے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی

(پ۱، البقرۃ۴۸)

یادرہے حقیقت تقوٰی وہی ہے جو ہم نے بیان کردی لیکن قرآن میں غرض اصلی کے طور پر ان چیزوں کے لئے زیادہ آیا ہے۔

۱۔ایمان ۲۔توبہ ۳۔طاعت ۴۔ترک معصیت ۵۔اخلاص

۱۔ التقویٰ بمعنی ایمان۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (پ۲۶، الفتح:۲۸) اور پرہیزگاری کا کلمہ ان پر لازم فرمایا

یہاں توحید مراد ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى وہ ہیں جنکا دل اللہ نے پرہیزگاری کیلئے پرکھ رکھا ہے

(پ۲۶، الحجرات:۳)

قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ (پ۱۹، الشعراء:۱۱) جو فرعون کی قوم ہے کیا وہ نہ ڈریں گے

۲۔ توبہ، ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا (پ۹، الاعراف:۹۶) اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے

یعنی وہ توبہ کرلیں

۳۔ اطاعت، ارشاد الٰہی ہے

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (پ۱۴، النحل:۲) کہ ڈر سناؤ کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں تو میری طاعت کرو

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (پ۱۴، النحل:۵۲) تو کیا اللہ کے سوا دوسرے کی طاعت کرتے ہو؟

وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (پ۱۸، المومنون:۵۲) میں تمہارا رب ہوں میری اطاعت کرو

۴۔ ترک معصیت، ارشاد مبارک ہے:

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (پ۲، البقرہ:۱۸۹) گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو

یعنی اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔

۵۔ اخلاص، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (پ۱۷، الحج:۳۲) تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے

یعنی یہ خلوص دل سے ہے

اسی طرح فرمان الٰہی ہے:

وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (پ۱، البقرہ:۴۱) اور مجھی سے ڈرو

واضح رہے مقام تقویٰ، مقام اعلیٰ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ (پ۱۴، النحل:۲۸) بیشک اللہ ان کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں اور جو نیکیاں کرتے ہیں

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (پ۲۶، الحجرات:۱۳) بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے

تقویٰ کی تفصیل

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چاہے کہ لوگوں میں معزز ہو جاؤں وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرے، جو چاہے میں لوگوں سے طاقتور ہو جاؤں وہ اللہ پر بھروسہ و توکل کرے جو چاہے میں سب سے غنی ہو جاؤں تو وہ جو کچھ اللہ کے قبضہ میں ہے اس پہ زیادہ بھروسہ کرے اس سے جو بندوں کے پاس ہے۔ (المستدرک، ۷۷۰۷)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ہے تقویٰ، معصیت پہ ترکِ اصرار اور طاعت پہ ترک غرور ہے۔

امام حسن بصری نے کہا: تقویٰ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ پہ کسی کو ترجیح نہ دے اور جان لے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا: تقویٰ یہ ہے کہ مخلوق تیری زباں میں عیب نہ پائے، ملائکہ تیرے افعال میں اور مالک عرش تیرے دل میں عیب نہ پائے۔

شیخ واقدی کہتے ہیں: تقویٰ یہ ہے کہ تیرا دل حق تعالیٰ کیلئے اس سے بڑھ کر مزین ہو جیسے تیرا ظاہر مخلوق کیلئے مزین ہے۔

تقویٰ کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے:

ان لا یراک حیث نہاک — وہ ذات تمہیں وہاں نہ پائے جہاں سے اس نے منع فرمایا ہے

یہ بھی بیان ہوئی ہے، متقی وہ ہے جو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ پر چلے، دنیا کو پس پشت ڈال دے اپنے نفس میں اخلاص اور وفا پیدا کرے، حرام و ظلم سے بچے۔

اور اگر متقی کیلئے کوئی اور فضیلت نہ بھی ہو تو ھدًی للمتقین ہی کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا قرآن لوگوں کیلئے ہدایت ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ — رمضان وہ ماہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کیلئے ہدایت ہے (پ ۲، البقرہ، ۱۸۵)

اور یہاں فرمایا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ تو یہ کلمات بتا رہے ہیں متقین ہی انسان ہیں تو جو متقی نہیں وہ گویا انسان ہی نہیں۔

تیسرا مسئلہ، چند سوالات

پہلا سوال: شئی کا ہدایت و رہنمائی ہونا اشخاص کے اعتبار سے مختلف نہیں تو کیا وجہ قرآن کو فقط متقین کیلئے ہدایت بنایا؟ پھر متقی ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور اسے دوبارہ ہدایت نہیں دی جاتی تو قرآن متقین کیلئے بھی ہدایت نہ ہوگا؟

جواب: قرآن مجید جس طرح متقین کیلئے وجود صانع، اس کے دین اور اس کے رسول کے صدق پہ ہدایت و رہنمائی ہے اسی طرح یہ کفار کیلئے بھی ہدایت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بطور مدح متقین کا ذکر کیا تاکہ واضح ہو کہ یہی لوگ اس کی ہدایت سے نفع پاتے ہیں جیسا کہ فرمایا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا (پ ۳۰، النازعات: ۴۵) تم انہی کو ڈراؤ گے جو اس سے ڈرتا ہے

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ (پ ۲۲، یٰسین ۱۱) تم اسے ہی ڈراؤ گے جو نصیحت کی اتباع کرے

حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کیلئے ڈرسنانے اور تنبیہ کرنے والے ہیں لیکن تذکرہ مخصوص لوگوں کا کیا کیونکہ وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار سے فائدہ اٹھانے والے ہیں

جن لوگوں نے یہاں ہدایت کا معنی مقصود پالینا کیا ہے ان پر اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ قرآن کا مقصود تک پہنچانے والا ہونا صرف متقین کے حق میں ہی ہے

دوسرا سوال: تمام قرآن کو ہدایت کیسے فرمادیا حالانکہ اس میں بہت سی آیات مجمل ومتشابہ بھی ہیں، اگر رہنمائی عقل نہ ہو تو محکم، متشابہ سے ممتاز نہ ہو تو حقیقۃً ہدایت عقلی رہنما ہے نہ کہ قرآن، اس وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ہے انھوں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کی طرف بھیجتے وقت بطور نصیحت فرمایا

لا تحتج علیھم بالقرآن فانہ خصم ذو وجھین ان کے سامنے قرآن سے استدلال نہ کرنا کیونکہ اس میں کئی معانی کا احتمال ہے

تو اگر یہ ہدایت ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں نہ فرماتے

پھر یہ کہ تمام فرقِ اسلام قرآن ہی سے استدلال کرتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں قرآن ان آیات سے مالا مال ہے جو بعض مذہب جبریہ اور بعض مذہب قدریہ پر صراحۃً دال ہیں اور ان کے درمیان تطبیق نہایت ہی دشوار ہے تو یہ ہدایت کیسے بن سکتا ہے؟

جواب: چونکہ متشابہ اور مجمل کی مراد عقل کی رہنمائی یا دلیل نقلی سے متعین ہو جاتی ہے لہٰذا یہ تمام ہدایت بن جائے گا

تیسرا سوال: جس پر خود قرآن کی صحتِ حجیت موقوف ہے اس میں قرآن ہدایت نہ ہوگا تو اب اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت، اس کی صفات کی معرفت اور معرفت نبوت میں قرآن کا ہدایت ہونا محال ٹھہرا حالانکہ یہ مقاصد ومطالب سب سے اعلیٰ وافضل ہیں تو جب قرآن ان میں ہدایت نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے مطلقاً ہدایت کیسے فرمادیا؟

جواب: اس کے ہدایت ہونے کیلئے ضروری نہیں کہ یہ ہر شی میں ہدایت ہو بلکہ اس کا بعض اشیاء میں ہدایت ہونا ہی کافی ہے مثلاً یہ معرفت شرائع میں ہدایت ہے یا یہ معقولات کی تائید میں ہدایت ہے۔

یہی آیت اس پہ سب سے قوی دلیل ہے کہ مطلق، عموم کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا وصف ہدایت بغیر کسی قید کے ذکر کیا ہے حالانکہ اس کا معرفتِ ذات الٰہی، صفاتِ الٰہی اور اثباتِ نبوت میں ہدایت ہونا محال ہے تو ثابت ہوا مطلق مفید عموم نہیں

چوتھا سوال: ہدایت کیلئے ضروری ہے کہ بیان وفصاحت میں وہ اسقدر واضح ہو کہ دوسرے کو واضح کردے حالانکہ قرآن کا معاملہ ایسے نہیں کیونکہ مفسرین نے ہر آیت کے تحت آپس میں مخالف اقوال کثیرہ بیان کیے ہیں، جس کا حال یہ ہو وہ تو خود واضح نہیں چہ جائیکہ وہ کسی دوسرے کو واضح کرے تو یہ ہدایت کیسے بنا؟

جواب: جن مفسرین نے اقوال متعارضہ ذکر کئے اور ان میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی ان پہ یہ سوال وارد ہوگا ہم نے تو ان میں سے ایک کو دلیل کی بنیاد پہ ترجیح دی ہے لہٰذا یہ سوال ہم پہ وارد نہیں ہو سکتا۔

چوتھا مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں، "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کا محل رفع ہے کیونکہ یہ محذوف مبتدا کی خبر یا یہ لاریب فیہ سے مل کر ذالک کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور ظرف مقدم 'فیہ' خبر ہے، یہ بطور حال منصوب بھی ہو سکتا ہے اور اس میں عامل اشارہ یا ظرف ہے۔

بلاغت میں پختہ ورسوخ رکھنے والا یہ راستہ اختیار کر کے یوں کہے گا'' آلـم '' مستقل جملہ ہے یا حروف معجم کا طائفہ ہے جو مستقل ہے ''ذالك الكتاب'' دوسرا جملہ ہے لاریب فیہ تیسرا، ''هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ '' چوتھا جملہ ہے ان کی ترتیب میں بلاغت کا جوڑ اور نظم کا حسن ہوتا اگر کوئی حرف عطف ہوتا لیکن یہاں اس کے بغیر بھی حسن ہے کیونکہ یہ ایک دوسرے سے اس قدر متصل ہیں کہ دوسرا پہلے سے متحد ہے اسی طرح تیسرا اور پھر چوتھا

اس کی کچھ تفصیل

اولاً اس پہ تنبیہ کی کہ یہ کلام ذریعہ تحدی وچیلنج ہے پھر اسی طرف یوں اشارہ کیا یہ کتاب انتہائی کامل ہے تو یہ جھت تحدی میں پختگی فرمائی پھر اس کی نفی کی کہ اس میں ریب نہیں ہوسکتا تو یہ کمالِ کتاب پہ شہادت ہوگئی پھر اطلاع دی کہ متقین کیلئے ہدایت ہے اس سے یہ یقین کامل ہوا کہ اس میں شک پھٹک نہیں سکتا

ان چاروں میں اس ترتیب کے بعد ہر ایک میں عظیم نکتہ ہے پہلے میں حذف اور اعلیٰ طریق سے غرض کی طرف اشارہ ہے، دوسرے میں معرفہ کی عظمت ہے، تیسرے میں ریب کو ظرف سے مقدم کرنا، چوتھے میں حذف اور وصف ھاد کی جگہ ھدًی مصدر اور پھر نکرہ لانا خوب ہے۔

[۳] اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

''جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں اور ہماری عطا کردہ روزی سے خرچ کریں''

چند مسائل

پہلا مسئلہ: صاحب کشاف لکھتے ہیں''الذین یؤمنون'' صفت متقین کی مجرور ہے یا اعنی کا مفعول منصوب یا ھم مبتدا کی خبر ہے یا متقین منقطع ہو کر مبتدا اور اولئك علی ھدًی اس کی خبر ہے۔

جب متصل ہو تو متقین پہ وقف حسن غیر تام ہے اور منقطع ہو تو پھر وقف تام ہے۔

دوسرا مسئلہ: بعض نے کہا:اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ متقین کی تفسیر ہے وہ یوں کہ نیکیاں بجالانے والا اور برائیوں کا تارک متقی ہوتا ہے۔اب فعل یا تو فعل قلب ہے:اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ اسی کا بیان ہے یا جوارح کا فعل ہوگا اور اس کی بنیاد نماز، زکوٰۃ اور صدقہ ہے کیونکہ عبادت یا تو بدنی ہوگی اور ان میں نماز سب سے افضل یا مالی ہوگی اور ان میں زکوٰۃ سب سے اعلیٰ، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں یہ نام دیے۔

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ وَالزَّکٰوۃُ قَنْطَرَۃُ الْاِسْلَامِ نماز دین کا ستون اور زکوٰۃ اسلام کا پُل ہے

(المعجم الاوسط للطبرانی:۸۹۳۷)

یا ترک فعل ہے اور یہ نماز میں داخل ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بری بات سے

(پ۲۱، العنکبوت ۴۵)

اقرب ومختار یہی ہے کہ یہ اشیاء متقین کی تفسیر نہ بنیں اس لئے کہ کمال سعادت تب حاصل ہوتی ہے کہ انسان نامناسب کو ترک کردے اور مناسب ہی کرے۔ ترک، تقوٰی ہے اور فعل یا فعل قلب ہے اور وہ ایمان ہے یا فعل جوارح واعضاء اور وہ نماز وزکوٰۃ ہے تقوٰی (ترک) کو فعل ایمان، نماز اور زکوٰۃ پر مقدم کیا ہے۔ کیونکہ دل اس تختی کی طرح ہے جو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ کے نقوش قبول کرتی ہے اور تختی کیلئے اولاً ضروری ہوتا ہے کہ اسے نقوش فاسدہ سے پاک کیا جائے تاکہ اس پہ عمدہ نقوش کو ثبت کیا جاسکے، یہی قول اخلاق میں ہے۔ اسی وجہ سے تقوٰی کو مقدم کیا جو غیر مناسب افعال کا ترک ہے اور اس کے بعد مناسب افعال بجا لانے کا ذکر کیا۔

تیسرا مسئلہ: صاحب کشاف نے لکھا، ایمان، امن سے باب افعال ہے، جب کوئی کسی کی تصدیق کرے تو کہا جاتا ہے امنہ، اور اس کی حقیقت کسی کو تکذیب ومخالفت سے امن دینا ہے، با کے ساتھ متعدی ہونے کی وجہ سے اس کا معنی اقرار واعتراف کو متضمن ہوتا ہے شیخ ابوزید سے جو منقول ہے: ما امنت ان اجد صحابۃ (یعنی میں اعتماد نہیں کروں گا) تو اس کی حقیقت یہی ہے کہ میں امن والا اور اطمینان وسکوں والا ہو جاؤں۔ یؤمنون بالغیب کے دونوں معانی حسن ہیں یعنی وہ حق کا اعتراف کرتے ہیں یا حق پہ اعتماد کرتے ہیں

ایمان کا شرعی مفہوم

اہل قبلہ کا شرعی ایمان کے بارے میں اختلاف ہے اور وہ چار فرقوں میں جمع ہیں۔

پہلا فرقہ: افعال قلوب وجوارح اور اقرار لسان کا نام ایمان ہے، معتزلہ، خوارج، زیدیہ اور محدثین کا یہی موقف ہے۔

خوارج اس پہ متفق ہیں کہ ایمان باللہ، معرفت الٰہی اور ہر اس شی کو شامل ہے جس پہ اللہ تعالیٰ نے دلیل عقلی یا کتاب وسنت سے دلیل نقلی بیان کی ہے، اسی طرح طاعتِ الٰہی کو بھی شامل ہے جو تمام مامور افعال وتروک میں ہے خواہ وہ صغیر ہے یا کبیر، ان تمام کا مجموعہ ایمان ہے، ان میں ایک کو بھی ترک کرنا کفر ہے۔

معتزلہ،اس پر متفق ہیں کہ جب لفظ ایمان با کے ساتھ متعدی ہوتو مراد تصدیق ہوتی ہے،اس لئے کہا جاتا ہے،فلان امن باللہ و برسولہ تو یہاں تصدیق ہی مراد ہے کیونکہ ایمان بمعنی اداء واجبات یوں متعدی نہیں ہوتا، جب کوئی نماز وروزہ کرے تو نہیں کہا جاتا فلان امن ھکذا جبکہ کہا جاتا ہے،فلاں امن باللہ جیسا کہ یوں بھی کہا جاتا ہے صام وصلی للہ تو جب لفظ ایمان با سے متعدی ہوگا تو اس کا معنی اہل لغت والا (تصدیق) ہی ہوگا، ہاں جب مطلق غیر متعدی استعمال ہوگا تو یہ معنی لغوی (تصدیق) سے منقول ہوکر دوسرے معنی میں مستعمل ہوگا۔

معتزلہ کا اختلاف،وہ معنی کیا ہے؟

اس بارے میں ان کا اختلاف ہے

۱۔ ایمان،تمام طاعات کا بجالانا ہے خواہ وہ لازم ہیں یا مندوب،وہ باب اقوال سے ہیں یا افعال یا اعتقادات،یہ واصل بن عطاء، ابوالہذیل اور قاضی عبدالجبار بن احمد کا قول ہے۔

۲۔ ایمان،واجبات کا بجالانا ہے نہ کہ نوافل کا،یہ ابوعلی اور ابوہاشم کا قول ہے

۳۔ ایمان،ہر اس کام سے بچنا ہے جس پر وعید ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مومن ہے جو کبائر سے اجتناب کرے اور ہمارے ہاں مؤمن جو ہر اس کام سے اجتناب کرے جس پہ وعید آئی ہے۔یہ نظام کا قول ہے۔

اور اس کے کچھ اصحاب ہمارے ہاں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مومن کیلئے تمام کبائر سے بچنا شرط قرار دیتے ہیں۔

محدثین کی رائے

انہوں نے دو طریق بیان کئے ہیں

۱۔ معرفت الٰہی،ایمان کامل ہے اور یہی اصل ہے۔اس کے بعد ہر طاعت الگ ایمان ہے اور تمام طاعات تب ایمان بنتیں ہیں جب یہ اصل معرفت پہ مرتب ہوں اور کہتے ہیں ان کا انکار ومخالفت کفر ہے پھر اس کے بعد ہر معصیت کفر ہے، یہ کسی طاعت کو بھی ایمان نہیں کہتے جب تک معرفت واقرار موجود نہ ہو اور کسی معصیت کو کفر نہیں کہتے جب تک انکار ومخالفت نہ ہو کیونکہ فرع اصل کے بغیر نہیں ہوسکتی،یہ عبداللہ بن سعید بن کلاب کا قول ہے

۲۔ ایمان،تمام طاعات کے بجالانے کا نام ہے اور یہ ایمان واحد ہے،انھوں نے تمام فرائض ونوافل کو ایمان کا حصہ وجز کہا ہے،جس نے فرائض میں سے کچھ ترک کیا اس کا ایمان ناقص اور جس نے نوافل چھوڑے اس کا ایمان ناقص نہیں،ان میں بعض نے کہا،ایمان،فرائض کا نام ہے،نوافل کا نہیں۔

دوسرا فرقہ

ایمان، تصدیق قلبی اور لسانی دونوں کا نام ہے، ان کا اختلاف ہے۔

۱۔ ایمان، اقرار باللسان اور معرفت قلبی کا نام ہے، یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور تمام فقہاء کا مذہب ہے، پھر ان میں دو مقامات پر اختلاف ہے

۱۔ اس معرفت کی حقیقت میں اختلاف ہے، بعض نے اس کی تفسیر، اعتقاد جازم کی ہے خواہ وہ اعتقاد تقلیدی ہو یا دلیل کی بنا پر ہو، یہی اکثریت کہتی ہے کہ مقلد مسلمان ہی ہوتا ہے بعض نے معرفت کی تفسیریوں کی کہ ایسا علم جو استدلال سے ثابت ہو۔

۲۔ ثبوت ایمان میں کون سا علم معتبر ہے؟

بعض متکلمین نے کہا کامل طور پر اللہ کی ذات وصفات کا علم ہے پھر جب صفات باری میں خلق کا بہت زیادہ اختلاف ہو گیا اور ہر ایک نے دوسرے کی تکفیر کی تو اہل انصاف نے کہا ہر اس شئی کا علم جس کا دین محمدی ہونا بدیہی ہو یعنی ضروریاتِ دین کا ماننا کافی ہے تو اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا عالم بالعلم، عالم لذاتہ اور اس کے مرئی اور غیر مرئی ہونے کا علم ایمان میں داخل نہیں۔

دوسرا قول: ایمان تصدیق قلبی اور لسانی کا نام ہے۔ یہ بشر بن عتاب مریسی اور ابوالحسن اشعری کا موقف ہے۔ یہاں تصدیق بالقلب سے مراد کلام قائم بالنفس ہے۔

تیسرا قول: صوفیاء کا گروہ کہتا ہے، اقرارِ لسانی اور اخلاص قلبی کا نام ایمان ہے۔

تیسرا فرقہ

ایمان، فقط عمل قلبی کا نام ہے، پھر ان کے دو اقوال ہیں:

۱۔ ایمان معرفت الٰہی بالقلب ہے حتیٰ کہ جسے دلی معرفت الٰہی حاصل ہو گی پھر زبان سے انکار کیا اور پھر اقرار سے پہلے مر گیا تو وہ کامل مومن ہے یہ جہم بن صفوان کا قول ہے، وہ کہتا ہے معرفتِ کتب، رسل اور یوم آخرت، ایمان میں داخل نہیں۔
شیخ کعبی نے اس سے یہ نقل کیا ایمان، اللہ کی معرفت کے ساتھ اس تمام کی معرفت کا نام ہے جس کا دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونا واضح ہو

۲۔ ایمان محض تصدیق قلبی کا نام ہے، یہ حسین بن فضل البجلی کا قول ہے۔

چوتھا فرقہ

ایمان، فقط اقرار لسانی ہے آگے ان کے دو گروہ ہیں:

۱۔ ایمان تو فقط اقرار لسانی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دل میں حصول معرفت ہو، تو ان کے ہاں اقرار کے ایمان بننے کیلئے معرفت شرط ہے نہ کہ ایمان میں داخل، یہ غیلان بن مسلم دمشقی اور فضل رقاشی کا قول ہے اگرچہ کعبی نے غیلان کا قول کہنے سے انکار کیا ہے

۲۔ ایمان محض اقرار لسانی ہے اور یہ کرامیہ کا قول ہے ان کا کہنا یہ ہے منافق ظاہراً مؤمن اور باطناً کافر ہے دنیا میں اس کا حکم مومنین اور آخرت میں کفار والا ہے

ایمان کے شرعی مفہوم میں اقوال کا مجموعہ وخلاصہ یہی ہے

مختار قول

ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، یہاں ماہیتِ تصدیق قلبی کا جاننا ضروری ہے تو سنیے جو کہتے ہیں عالم حادث ہے تو ان الفاظ کا معنی یہ نہیں کہ عالم حدوث سے موصوف ہے بلکہ اس کا مقصود، عالم کا حادث ہونا بیان کرنا ہے۔ ثبوتِ حدوث عالم کا حکم، ثبوت حدوث عالم کا غیر ہے تو یہ ثبوت وانتفا کا حکم ذہنی ایسا معاملہ ہے جس کیلئے ہر لغت میں لفظ خاص ہے، حکم ذہنی واحد ہونے کے باوجود عبارات والفاظ کا اختلاف واضح کرتا ہے حکم ذہنی، علم کا غیر ہے کیونکہ شئ سے جاہل بھی اس پر حکم لگاتا ہے تو واضح ہوگیا حکم ذہنی، علم کا مغایر ہے تو تصدیق بالقلب سے مراد یہی حکم ذہنی ہے

یہاں ایک لفظی بحث رہ جاتی ہے کہ لغت میں مسمیٰ بالتصدیق حکم ذہنی ہے یا وہ صیغہ جو اس حکم ذہنی پہ دال ہے۔

اس پر تفصیلی گفتگو ہم نے اصول فقہ میں کردی ہے جب یہ مقدمہ معلوم ہوگیا تو اب ہم کہتے ہیں ایمان اعتقاد کے ساتھ ان تمام کی تصدیق کا نام ہے جن کا دینِ محمدی ہونا معروف وآشکار ہے۔

اس مذہب کے ثبوت کیلئے ان چار قیود کی محتاجی وثبوت ضروری ہے۔

ثبوت وتذکرہ چار قیود

پہلی قید: ایمان تصدیق کا نام ہے اس پہ یہ دلائل ہیں۔

۱۔ اصل لغت میں اس کا معنی تصدیق ہے اگر عرفِ شرع میں اس کا معنی غیر تصدیق ہو تو لازم آئے گا اس کے ساتھ کلام کرنے والا غیر کلام عرب بول رہا ہے اور یہ قرآن کے عربی ہونے کے منافی ہے۔

۲- لفظ ایمان سب الفاظ سے اکثر مسلمانوں کی زباں پہ جاری ہوتا ہے اگر یہ غیر مسمیٰ اصلی کی طرف منقول ہو جاتا تو اس کی معرفت کے دواعی کثیر تھے تو یہ مشہور ہو کر حد تواتر کو پہنچ جاتا جب ایسا نہیں تو یہ اپنی اصل وضع (تصدیق) پر ہی ہے۔

۳- اس پر اتفاق ہے کہ با کے ساتھ جب متعدی ہو تو اصل لغت پر ہی ہوتا ہے تو لازم ہے جب غیر متعدی ہو تو اس کی بھی یہی صورت ہو

۴- اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی قرآن میں ایمان کا ذکر کیا تو اس کی اضافت دل کی طرف کی

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (پ ۶، المائدہ:۴۱) کچھ لوگ زباں سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور ان کے دل مومن نہیں

وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (پ ۱۴، النحل:۱۰۶) اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہے

كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (پ ۲۸، المجادلہ:۲۲) ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (پ ۲۶، الحجرات:۱۴) ہاں یوں کہو کہ ہم مطیع ہوئے اور ابھی ایمان تمھارے دلوں میں کہاں داخل ہوا

۵- اللہ تعالیٰ نے جس جگہ ایمان کا ذکر کیا عمل صالح کو بھی اس کے ساتھ ملایا اگر اعمال، ایمان میں داخل ہوتے تو یہ محض تکرار ہے

۶- اللہ تعالیٰ نے بہت دفعہ ایمان کے ساتھ معاصی کا ذکر فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (پ ۸، الانعام:۸۲) جو ایمان لائے اور ان کا ایمان ظلم سے ملوث نہ ہو

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (پ ۲۶، الحجرات:۹) اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ پھر اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے

مومن ہونے پر تین دلائل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس پر اس فرمان الٰہی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (پ ۲، البقرۃ:۱۷۸) اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ (جو ناحق مارے جائیں) ان کے خون کا بدلہ لو

سے تین طرح سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ قصاص عمداً قاتل پہ ہے، فرمان ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا "جو بتا رہا ہے کہ قاتل مومن ہی رہتا ہے

۲۔ ساتھ یہ بھی فرمایا:

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ (پ۲، البقرۃ:۱۷۸) تو جس کیلئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی

اور یہ اخوت، اخوت ایمانی ہی ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (پ۲۶، الحجرات:۱۰) اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں

۳۔ ساتھ یہ بھی فرمایا

ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَۃٌ (پ۲، البقرہ:۱۷۸) یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور رحمت ہے

اور رحمت مومن کے لائق ہی ہے

ہمارے مطلوب پر یہ ارشاد بھی شاہد ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا (پ۱۰، الانفال:۷۲) اور وہ جو ایمان لائے اور ہجرت نہ کی

ہجرت نہ کرنے والے کو مومن کہا حالانکہ ترکِ ہجرت پر شدید وعید ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِكَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ (پ۱۴، النحل:۲۸) فرشتے ان کی جان نکالتے ہیں اس حال پہ کہ وہ اپنا برا کر رہے تھے

دوسرے مقام پر ہے:

مَالَكُمْ مِنْ وَّلَایَتِھِمْ مِنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا (پ۱۰، الانفال:۷۲) تمہیں ان کا ترکہ کچھ نہیں پہنچتا جب تک ہجرت نہ کریں

اس کے باوجود انہیں اہل ایمان ہی کہا۔

یہ ارشادات عالیہ بھی شاہد ہیں:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ (پ۲۸، الممتحنۃ:۱) اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِكُمْ (پ۹، الانفال:۲۷) اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے دغا نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں دانستہ خیانت

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحاً (پ۲۸، التحریم:۸) اے ایمان والو! اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کیلئے نصیحت ہو جائے

گناہ سے پاک کو توبہ کا حکم دینا محال ہے

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعاً اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ (پ۸، النور، ۳۱) اور اللہ کی طرف توبہ کرو تمام اے اہلِ ایمان

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مومن گناہگار ہے حالانکہ ہمارا قول یہ نہیں ہاں یہ گناہ گاروں کے علاوہ میں ہے اور ان کے حوالہ سے یہ حجت ہے۔

دوسری قید: ایمان تصدیق لسانی کا نام نہیں، دلیل اس پہ یہ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (پ۱، البقرۃ:۸) اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں

یہاں ان کے مومن ہونے کی نفی ہے اگر ایمان تصدیق لسانی ہی ہوتا تو یہ نفی درست نہ ہوتی

تیسری قید: ایمان مطلق تصدیق نہیں کیونکہ جس نے کسی بُت اور طاغوت کی تصدیق کی وہ مومن نہیں ہو سکتا

چوتھی قید: ایمان کیلئے تمام صفات الٰہی کی تصدیق ضروری نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ایسے لوگوں کو بھی مومن قرار دیا جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کے عالم لذاتہ یا عالم بالعلم کا تصور بھی نہ تھا اگر یہ اور اس جیسی قیودات ثبوت ایمان میں شرط ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے لوگوں کو یہ پوچھے بغیر، تم یہ جانتے ہو کہ نہیں مومن کہنا درست نہ ہوتا۔

سوال: یہاں دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت: جس نے دلیل و برہان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی جب اس کا عرفان تمام ہوا وہ فوت ہو گیا اور اس نے وقت نہیں پایا کہ وہ زباں سے کلمات شہادت کہتا، اب تم اگر یہ فیصلہ دیتے ہو کہ وہ مومن ہے تو تم نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ثبوتِ ایمان میں اقرار لسانی معتبر نہیں اور یہ خلاف اجماع ہے اور اگر تم اس کے غیر مومن ہونے کا فیصلہ دیتے ہو تو یہ باطل ہے

حضور ﷺ کا فرمان ہے

یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان دوزخ سے اسے نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا

تو یہ قلب ایمان سے مالا مال اور معمور تھا تو یہ مومن کیسے نہ ہوگا؟

دوسری صورت: جس نے اللہ تعالیٰ کی دلیل سے معرفت پالی، اور کلمہ شہادت کہنے کا وقت بھی پایا لیکن اس نے زبان سے کلمات نہیں کہے اب اگر تم فیصلہ دو کہ یہ مومن ہے تو خلاف اجماع اور اگر تم غیر مومن کہو تو باطل۔ آپ ﷺ کا فرمان گزرا جس کے دل میں ذرہ ایمان ہے وہ دوزخ سے نکال لیا جائے گا تو زباں کے سکوت سے دلی ایمان کی نفی تو نہیں ہوتی

جواب: شیخ غزالی نے ان دونوں صورتوں میں فرمایا ایسا کوئی اجماع نہیں اور یہ دونوں مومن ہیں۔ زباں سے اعلان نہ کرنا ایمان کے ساتھ دیگر گناہوں کی طرح ہی گناہ ہے

چوتھا مسئلہ: الغیب کی تفسیر

یہ مصدر، قائم مقام اسم فاعل ہے جیسے صوم بمعنی صائم اور زور بمعنی زائر ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ میں دو اقوال ہیں

پہلا قول: شیخ ابو مسلم اصفہانی کا یہی مختار ہے، بالغیب، مومنین کی صفت ہے معنی یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ پر حالت غیب میں بھی ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ وہ سامنے ایمان رکھتے ہیں اور وہ منافقین کی طرح نہیں ہوتے

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (پ۱، البقرہ:۱۴)

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں

اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (پ۱۲، یوسف:۵۲)

یہ میں نے اس لئے کیا کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پیٹھ پیچھے خیانت نہیں کی

لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں:

نعم الصدیق لک فلان بظھر الغیب تمہارا فلاں دوست پشت پیچھے بھی اچھا ہے

یہ تمام اہل ایمان کی مدح ہے ان کا ظاہر ان کے باطن کے موافق اور حال منافقین کے مخالف ہے کیونکہ وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔

دوسرا قول: جمہور مفسرین کا قول ہے، غیب جو حواس سے غائب ہو۔ پھر اس کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ غیب جس پہ دلیل ہے۔

۲۔ جس پہ کوئی دلیل نہیں۔

اس آیت میں متقین کی مدح ہے کہ وہ اس غیب پر ایمان رکھتے ہیں جس پہ دلیل شاہد ہے بایں طور کہ وہ تفکر واستدلال کر کے غیب پر ایمان لاتے ہیں، اس صورت میں ذات الٰہی، اس کی صفات کا علم، آخرت کا علم، نبوت اور احکام شرعیہ کا علم بھی داخل ہے کیونکہ ان علوم کے استدلال سے حصول میں بہت مشقت ہے لہٰذا یہ ان کی ثناء عظیم کا سبب ٹھہرا

دلائل ابو مسلم

شیخ ابو مسلم نے اپنے قول پر ان امور سے استدلال کیا ہے

پہلی چیز: ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (پ۱، البقرہ:۴)
اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں

یہ تمام اشیاء غائبہ پر ایمان ہے اگر "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" میں بھی اشیاء غائبہ ہی مراد ہوں تو معطوف ومعطوف علیہ دونوں ایک ہی ہو جائیں گے جو جائز نہیں۔

دوسری چیز: اگر ہم اسے ایمان بالغیب پر محمول کریں تو لازم آئے گا انسان غیب جانتا ہے اور یہ اس ارشاد الٰہی کے مخالف ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (پ۷، الانعام:۵۵) اسی کے پاس ہیں غیب کے خزانے جنہیں وہی جانتا ہے

اگر ہمارے والی تفسیر کر لو تو یہ اعتراض وارد ہی نہ ہوگا۔

تیسری چیز: لفظ غیب کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا جس پر حضور کا اطلاق ہو سکے تو اب لفظ غیب کا اطلاق ذات وصفات الٰہی پر نہیں ہو سکتا اب اس میں صرف ایمان بالآخرت رہ جاتا ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ ایمان کا رکن اعظم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان ہے تو لفظ کو ایسے معنی پر کیسے محمول کیا جائے گا جس کی وجہ سے اصل خارج ہو جائے اگر آپ ہمارے والے معنی پر محمول کریں تو یہ اعتراض وکمی لازم ہی نہ آئے گی۔

پہلے کا جواب: "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" ایمان غائبات پر اجمالاً مشتمل ہے اس کے بعد ہے

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ اور وہ ایمان لائیں اس پر جو تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا (پ ۱، البقرہ:۴)

اور یہ بعض غائبات پر ایمان کی تفصیل ہے تو یہ تفصیل کا اجمال پر عطف ہے جو جائز ہے جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ (پ ۱، البقرہ:۹۸) اس کے فرشتے اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل

دوسرے کا جواب: اس میں کوئی نزاع نہیں کہ ہم اشیاء غائبہ پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ تخصیص دونوں تفاسیر پر لازم آئے گی۔

سوال: پھر کیا کہو گے بندے غیب جانتے ہیں کہ نہیں؟

جواب: ہم نے بتایا کہ غیب کی دو اقسام ہیں

۱۔ جس کے جاننے پر دلیل ہے۔

۲۔ جس کے جاننے پر دلیل نہیں۔

جس کے جاننے پر دلیل نہیں ایسے غیب کو اللہ سبحانہ ہی جانتا ہے اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا اور جس کے جاننے پر دلیل ہے اس کے بارے میں یہ کہنے کی کوئی ممانعت نہیں۔

نعلم من الغیب مالنا علیہ دلیل ہم وہ غیب جانتے ہیں جس پر ہمارے پاس دلیل ہے

اب کلام بغیر التباس کے مفید ہے۔ اس بنا پر اہل علم کہتے ہیں

الاستدلال بالشاھد علی الغائب احد اقسام الادلۃ شاہد وحاضر سے غائب پر استدلال بھی دلائل کی ایک قسم ہے

تیسرے کا جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ لفظ غیب کا اطلاق اسی پر ہوگا جس پر حضور کا ہے اور دلیل اس پر یہ ہے کہ متکلمین کہتے ہیں: ھذا من باب الحاق الغائب بالشاھد (یہ شاہد کا غائب کے ساتھ الحاق ہے) اور اس غائب سے مراد وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس کی صفات لیتے ہیں۔ واللہ اعلم

پانچواں مسئلہ: مہدی منتظر مراد لینا درست نہیں

بعض شیعہ نے کہا، یہاں غیب سے مراد امام مہدی منتظر ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن وسنت میں وعدہ کیا

قرآن میں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ (پ ۱۸ ،النور:۵۵)

اللہ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ضرور انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسی ان سے پہلوں کو دی

حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: اگر دنیا سے ایک ہی دن رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو طویل فرمادے گا حتیٰ کہ میری اہل بیت سے ایک آدمی آئے گا جس کا نام وکنیت میرے نام وکنیت کے مطابق ہوگی وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسا کہ وہ پہلے سے ظلم وجور سے بھری تھی۔

لیکن واضح رہے مطلق کو بغیر دلیل کے مخصوص کر لینا باطل ہوتا ہے لہٰذا یہ مراد لینا باطل ہوگا۔

چھٹا مسئلہ: تفسیر اقامت صلاۃ

اقامت صلاۃ کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ اقامت سے مراد، اس کے ارکان کو ٹھیک ادا کرنا اور اس کے فرائض، سنن اور آداب میں کمی وخلل سے حفاظت ہے۔

جب لکڑی سیدھی کی جائے تو کہا جاتا ہے **قام العود**۔ (لکڑی سیدھی ہوگئی)

۲۔ اقامت سے مراد، نماز پر دوام وہمیشگی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (پ ۲۹ ،المعارج:۳۴)

اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں

اور فرمایا:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (پ ۲۹ ،المعارج ۲۳)

جو اپنی نماز کے پابند ہیں

جب بازار میں خرید وفروخت میں گرمی ہو تو کہا جاتا ہے **قامت السوق**، (بازار گرم ہے) اقامت صلاۃ کا معنی اس کا خوب و عمدہ ہونا، جب اس پر محافظت کی جاتی ہے تو یہ اس نفقشئی کی طرح ہے جس میں رغبت وشوق ہوتا ہے اور جب اسے ضائع کیا جائے تو یہ اس کھوٹی شئی کی طرح جسے کوئی نہیں لیتا۔

۳۔ نماز کو شوق سے ادا کرنا، اس کی ادائیگی میں کمی و سستی نہ ہو، مثلاً **قام بالامر**، **قامت الحرب علی ساقها** (جوش میں آنا) بطور ضد الفاظ ہیں" **قعد عن الامر**" (وہ کام سے بیٹھ گیا)

۴۔ نماز کی ادائیگی مراد ہے۔ادا کو اقامت، اس لئے کہا کہ قیام اس کا رکن ہے جیسا کہ اسے قنوت، رکوع اور سجود سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔یسبح اذا صلی کیونکہ نماز میں تسبیح موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (پ۲۳، الصافات ۱۴۳) پس اگر وہ تسبیح نہ کہتا

اولیٰ یہ ہے کہ کلام کا حمل اس پر ہو، جس میں ثنا عظیم ہے اور یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب ہم اقامت سے ادائیگی نماز میں دوام اور اس کے ارکان و شرائط میں خلل کا نہ ہونا مراد لیں۔

اور اس لئے بھی کہ لشکر پر مقرر منتظم کو قیم اسی وقت کہا جاتا ہے جب وہ بغیر کمی و کجی کے حقوق ادا کرے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا وصف قائم و قیوم ہے اس لئے کہ اس کا وجود دائمی ہے اور اس لئے بھی کہ مخلوق پہ اس کے رزق کی برسات دائمی ہے

ساتواں مسئلہ: صلاۃ کی لغوی تحقیق

لغت کے اعتبار سے صلاۃ کے کئی معانی بیان ہوئے ہیں:

۱۔ اس کا معنی دعا ہے۔شاعر نے کہا

و قابلها الریح فی دنها و صلی علی دنها و ارتشم

۲۔ شیخ خارزنجی کہتے ہیں ''صلی'' بمعنی نار سے ہے جب عصا کو آگ کے ذریعے سیدھا کیا جائے تو 'صلیت العصا' کہا جاتا ہے تو ''مصلی'' (نمازی) گویا اس کے ظاہر و باطن کو خوب سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا ہے جیسے لکڑی کو سیدھا کرنے کیلئے اسے آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ صلاۃ کا معنی لازم ہونا۔ارشاد الٰہی ہے:

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (پ۳۰، الغاشیہ:۴) جائیں بھڑکتی آگ میں۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (پ۳۰، اللہب:۳) اب دھنستا ہے لپٹ مارتی آگ میں وہ۔

مسابقت میں دوڑنے والے، گھوڑوں میں دوسرے نمبر پر آنے والے کو مصلی کہا جاتا ہے

۴۔ صاحب کشاف کہتے ہیں صلاۃ، صلی سے فعلۃ کے وزن پر ہے جیسے ذکی سے ذکاۃ اور ان کی تعظیم کی وجہ سے واو کے ساتھ صلوۃ، زکوۃ لکھا جاتا ہے اور صلی کا معنی اپنے کولھوں کو حرکت دینا ہے چونکہ نمازی رکوع اور سجدہ میں انہیں حرکت دیتا ہے۔

بعض دعوت دینے والے کو مصلی کہتے ہیں کیونکہ وہ تواضع کرنے میں رکوع اور سجود کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔

صاحب کشاف کا رد

یہاں دو مباحث ہیں۔

پہلی بحث: صاحب کشاف نے جو مادہ بیان کیا یہ قرآن کے حجت ہونے پر بہت بڑے طعن کا ذریعہ ہے اس لئے کہ لفظ صلاۃ ان بڑے اور اکثر الفاظ میں سے ہے جو مسلمانوں کی زبان پر جاری رہتے ہیں اسے "تحريك الصلوين" (سرین کی حرکت) سے مشتق قرار دینا بہت ہی بعید ہے کیونکہ اہل نقل کے ہاں یہ مشہور ہے

اگر ہم یہ کہنا جائز رکھیں کہ صلوٰۃ (نماز) کا اصل یہی تھا پھر یہ مخفی ومٹ گیا اب اسے کوئی کوئی ہی جانتا تھا تو ایسا ہونا دیگر الفاظ میں بھی جائز وممکن ہو جائے گا اگر ہم اسے جائز مان لیں تو ہمیں یہ یقین کہاں سے حاصل ہوگا کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے جو ہم اپنے دور میں ان سے سمجھ رہے ہیں کیونکہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ظاہری حیات میں ان کا کوئی اور معنی ہو اور وہی معنی اللہ تعالیٰ کی مراد تھے ہاں وہ معانی ہمارے دور میں مٹ گئے جیسا کہ لفظ صلاۃ میں ہوا۔ حالانکہ اس بات کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے تو کہنا پڑے گا صاحب کشاف کا بیان کردہ مادہ باطل ہے۔

دوسری بحث: صلاۃ، شرع میں مخصوص افعال کا نام ہے ان میں سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں ہیں، اس کا افتتاح تکبیر تحریمہ سے اور اختتام تحلیل (سلام) سے ہوتا ہے اور اس اسم کا اطلاق فرض ونفل دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس آیت میں مراد فرائض ہیں کیونکہ فلاح کا مدار انہی پر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعرابی کو فرض نماز کی تفصیل بتائی تو اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ ہی کمی کروں گا اور نہ اضافہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو فلاح پا گیا (مسلم:۱۱)

آٹھواں مسئلہ: رزق کی لغوی تحقیق

کلام عرب میں رزق کا معنی (حظ) حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے

وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ (پ۲۷، الواقعہ:۸۲) اور اپنا حصہ یہ بناتے ہو کہ جھٹلاتے ہو۔

یعنی اس معاملہ سے تمھارا حصہ یہ ہے

حظ، آدمی کا وہ مخصوص حصہ جو دوسرے کا نہ ہو

۱۔ بعض نے کہا رزق، جو کھایا یا استعمال کیا جائے لیکن یہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کردہ رزق میں سے خرچ کا حکم دیا ہے

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ (پ۱۳، الرعد:۲۲) ہمارے دیئے سے ہماری راہ میں خرچ کرو

اگر رزق وہی ہے جو کھالیا جائے تو اس کا انفاق کیسے ممکن ہوگا؟

2- بعض نے کہا: رزق، جس کا مالک بنا جائے، یہ بھی باطل ہے کیونکہ انسان یہ دعا کرتا ہے

اللھم ارزقنی ولداً صالحًا و زوجةً صالحةً اے اللہ! مجھے نیک اولاد عطا فرما، مجھے صالح بیوی عطا فرما

حالانکہ وہ نہ اولاد کا مالک ہوتا ہے اور نہ بیوی کا اور یہ بھی دعا کرتا ہے۔

اللھم ارزقنی عقلاً اعیش بہ مجھے ایسی عقل عطا فرما جس سے بہتر زندگی بسر کروں

حالانکہ عقل مملوک وغلام نہیں

پھر چوپایوں کا رزق ہے حالانکہ وہ اس کے مالک نہیں ہوتے

رزق کا شرعی مفہوم

عرفِ شرع میں رزق کے مفہوم میں یہ اقوال ہیں:

۱۔ شیخ ابوالحسین بصری کہتے ہیں، جاندار کی کسی شئی سے حصول نفع پر ایسی قدرت کہ کوئی دوسرا اسے نفع سے روک نہ سکے جب ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں مال بطور رزق دیا تو معنی یہی ہے کہ ہمیں ان سے نفع حاصل کرنے پر قادر بنایا، جب ہم اللہ تعالیٰ سے بطور رزق مانگتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ مال ہمارے لئے ہی خاص ہو، جب ہم چوپایوں کیلئے مانگتے ہیں تو وہ ان کیلئے خاص ہوتا ہے، تو یہ خاص تب ہی بنے گا جب اس سے نفع پر قادر ہوں اور کوئی دوسرا اسے نفع سے منع نہ کر سکے

یاد رہے معتزلہ رزق کی جب یہ تفسیر کرتے ہیں تو یقیناً وہ کہیں گے کہ حرام رزق نہیں ہوگا، جبکہ ہمارے اصحاب کہتے ہیں بعض اوقات حرام بھی رزق ہوتا ہے۔

اہلسنت کے دو دلائل

اس پر اصحاب کے دو دلائل ہیں:

۱۔ لغت میں رزق کا معنی حصہ اور نصیب ہے جیسے اوپر گزرا تو جو حرام سے نفع حاصل کرلے گا وہ حرام اس کے لئے حصہ اور نصیب بنے گا لہٰذا اس کیلئے اس کا رزق بنا لازمی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا اور زمین پہ چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو (پ۱۲، ھود:۶)

کبھی انسان طویل عمر چوری کا مال ہی کھاتا ہے تو اگر یہ رزق نہیں تو یوں کہنا لازم ہونا چاہیئے کہ اس نے اس قدر عمر میں رزق کھایا ہی نہیں

معتزلہ کے دلائل

انہوں نے بھی قرآن وسنت سے کچھ دلائل دیئے ہیں۔

قرآنی دلائل

ان کے قرآنی دلائل یہ ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (پ۱، البقرہ:۳) اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے دیئے ہوئے رزق سے خرچ کرنے والوں کی مدح کی ہے اگر حرام، رزق ہوسکتا ہے تو حرام خرچ کرنے والے بھی مستحق مدح بنیں گے حالانکہ یہ بات بالاتفاق باطل ہے

۲۔ اگر حرام، رزق ہے تو پھر غاصب، غصب کرسکتا ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ (پ۳، البقرہ:۲۵۴) اللہ کی راہ میں ہمارے دیئے میں سے خرچ کرو۔

حالانکہ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ غاصب اس مال سے خرچ نہیں کرسکتا بلکہ اس کا من وعن لوٹانا لازم ہے تو معلوم ہوا حرام رزق نہیں ہوسکتا

۳۔ ارشاد الٰہی ہے:

قُلْ اَرَاَیْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْہُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ (پ۱۱، یونس:۵۹) تم فرماؤ، بھلا بتاؤ تو جو اللہ نے تمہارے لئے رزق اتارا اس میں تم نے اپنی طرف سے حرام وحلال ٹھہرالیا تم فرماؤ کیا اللہ نے اس کی تمہیں اجازت دی؟

تو اس میں واضح کیا ہے جو اللہ کے رزق کو حرام کہے گا وہ اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے والا ہے تو ثابت ہوا حرام رزق نہیں ہوتا۔

سنت سے دلیل

شیخ ابوالحسین نے ''کتاب الغرر''میں اپنی سند کے ساتھ صفوان بن اُمیہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، عمرو بن قرہ نے آکر کہا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ نے مجھ پر شقاوت لکھ دی ہے میرا رزق اس دف بجانے میں ہی ہے لہٰذا مجھے اچھے گانوں کی اجازت دیدو جن میں بے حیائی نہ ہوتو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں یہ اجازت نہیں دے سکتا نہ یہ عزت ہے اور نہ یہ نعمت، اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ بولا، اللہ تعالیٰ نے تیرا رزق بنایا مگر تو نے اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ کی جگہ اسے اپنا لیا جو اس نے حرام فرمایا تھا اگر تو نے آئندہ یہ بات کی تو میں تجھے سخت سزا دوں گا۔

(سنن ابن ماجہ، ۱۸۷)

عقلی دلیل

عقلی طور پر بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مکلف کو حرام سے انتفاع سے منع کیا ہے اور دوسروں کو اس سے نفع اٹھانے سے منع کرنا بھی، اور جو دوسرے کو لینے اور نفع سے منع کرے اسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے اسے رزق دیا ہے کیا تم نہیں جانتے جب بادشاہ نے سپاہیوں کو لینے سے منع کیا ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا ان السلطان قد رزق جندہ مالاً (کہ سلطان نے لشکر کو مال دیا ہے) ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے انھیں رزق دیا اور وہ اس پر قادر تھے نہ تو انھیں لینے سے منع کیا تھا اور نہ ہی انھیں دوسروں کو منع کرنے کا حکم تھا

جواب: اہلسنّت نے جواباً کہا بلاشبہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن یوں تو کہا جاتا ہے، یا خالق المحدثات والعرش والکرسی (اے تمام ممکنات اور عرش وکرسی کے پیدا فرمانے والے) مگر نہیں کہا جاتا، یا خالق الکلاب والخنازیر (اے کتوں وخنزیروں کے پیدا کرنے والے) اسی طرح فرمایا

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (پ۲۹، الانسان:۶) چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے

تو یہاں عباد کا لفظ متقین کیلئے بولا اگرچہ کفار بھی عباد ہیں۔

اسی طرح یہاں زیر بحث آیت میں بطور تعظیم حلال کو رزق کہا اگرچہ حرام بھی رزق بن سکتا ہے

حدیث کے حوالے سے جواب یہ ہے کہ یہ تو ہماری دلیل بن رہی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فاخترت ما حرم اللّٰہ علیك من رزقه تو نے وہ پسند کرلیا جو رزق اللہ تعالیٰ نے تجھ پر حرام کیا تھا۔

تو یہ الفاظ صراحتاً دلیل ہیں کہ حرام بھی رزق بن سکتا ہے۔

عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض لغت کا ہے کہ حرام کا نام رزق ہے یا نہیں اور دلائل عقلیہ کا الفاظ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔واللہ أعلم

نواں مسئلہ: انفاق اصلاً ہاتھ سے مال خرچ کرنا ہے، جب خریدار زیادہ ہوں تو کہتے ہیں ''نفق المبیع نفاقاً'' جب چوپائے کی روح نکل جائے تو کہتے ہیں نفقت الدابة، سوراخ سے نکلنے والی چوہیا کو کہا جاتا ہے ''نافقاء الفارة''

اسی سے نفق (سرنگ) ہے۔

ارشاد گرامی ہے

اَنۡ تَبۡتَغِیَ نَفَقاً فِی الۡاَرۡضِ　(پ۷ الانعام:۳۵)　تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرلو

دسواں مسئلہ: ''وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ'' میں فوائد

ا۔ مِن بعضیہ لایا تا کہ ممنوع اسراف وتبذیر سے لوگوں کو بچایا جائے۔

۲۔ مفعول کو اہمیت کی وجہ سے مقدم کیا گویا فرمایا یہ کچھ مال صدقہ کیلئے خاص کردیتے ہیں۔

۳۔ آیت مذکور کے انفاق میں انفاقِ لازم اور انفاقِ مستحب دونوں داخل ہیں۔

انفاقِ لازم کی اقسام

ا۔ زکوٰۃ۔آیت الکنز میں فرمایا

وَلَا یُنۡفِقُوۡنَھَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ　(پ۱۰، التوبہ:۳۴)　اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

۲۔ اپنے اور اپنے عیال پر خرچ کرنا۔

۳۔ جہاد پر خرچ کرنا۔

انفاق مستحب

یہ بھی انفاق ہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ　اور خرچ کرو اس سے جو ہم نے تمہیں دیا پہلے اس کے کہ تمہیں موت آئے

یہاں بھی صدقہ مراد ہے کیونکہ بعد میں ہے:

فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ　(پ۲۸، المنافقون:۱۰)　کہ میں صدقہ دیتا اور نیکوں میں ہوتا

یہ تمام انفاقات آیت کے تحت آتے ہیں کیونکہ یہ تمام سبب مدح وتعریف ہیں۔

[۴] وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

(یہ لوگ اس پہ ایمان رکھتے ہوں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

آیت کا ربط وتعلق

واضح ہو ارشاد الٰہی "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" ہر اس آدمی کو شامل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا خواہ وہ پہلے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں، لفظ عام کی بعض مخصوص افراد پر دلالت، خاص کی بعض افراد پر دلالت سے ضعیف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عام میں احتمال تخصیص ہوتا ہے جبکہ خاص میں نہیں ہوتا، یہ سورت مدنی ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب" فرما کر شرف وعظمت بخشی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اہل کتاب حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ کا ذکر کیا، "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" کیونکہ خصوصی ذکر میں، ان کی مزید عزت ہے جیسے ارشاد الٰہی ہے

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ (پ۱، البقرہ:۹۸) جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسلوں اور جبرائیل اور میکائیل کا

پھر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر کا ذکر عظمت ان جیسے لوگوں کو دین میں آنے کی ترغیب بھی ہے ذکر خاص بعد از عام کا یہی سبب ہے

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اور مسائل

پہلا مسئلہ: ہمارے اصحاب اور معتزلہ کا اس میں نزاع نہیں کہ جب ایمان با سے متعدی ہو تو مراد تصدیق ہوتی ہے جب ہم کہیں "فلان امن بکذا" تو معنی ہے کہ اس نے فلاں کی تصدیق کی، اس سے یہ مراد نہیں کہ اس نے نماز وروزہ کیا تو یہاں ایمان سے بالاتفاق تصدیق ہی مراد ہے لیکن اس کے ساتھ معرفت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہاں ایمان کا ذکر مقام مدح پر ہے اور شک کے ساتھ تصدیق کرنیوالا کاذب بھی ہوسکتا ہے تو وہ ذم ومذمت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ: انزال وحی اور قرآن کے منزل اور نازل شدہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے یہ اسی طرح ہے کہ کہا جاتا ہے "نزلت رسالة الامير من القصر" (امیر کا پیغام محل سے نازل ہوا) تو نازل نہیں ہوتا البتہ سننے والا پیغام سن کر اوپر سے نیچے لاتا ہے اور امیر کا قول اس کی ذات سے جدا نہیں ہوتا لیکن سامع سن کر اترتا ہے اور وہ اپنے الفاظ میں لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے کلام الٰہی کیسے سنا؟

جب آدمی ایک سے سن کر دوسری جگہ پہنچاتا ہے تو کہا جاتا ہے "فلان ينقل الكلام" (اس نے کلام نقل کیا)

سوال: حضرت جبریل علیہ السلام نے کلام الٰہی کیسے سنا حالانکہ اس کا کلام تمھارے ہاں حروف واصوات سے بالاتر ہے؟

جواب: ۱۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنا کلام سننے کی قوت سمع پیدا کر دی ہو پھر انہیں اس کلام قدیم کی تعبیر کیلئے عبارت والفاظ پر قادر کر دیا ہو۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں اس نظم مخصوص کی کتابت تخلیق کر دی ہو تو وہاں سے حضرت جبریل علیہ السلام نے یہ املا وتحریر حفظ کر لیا ہو۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اس نظم مخصوص کیلئے جسم مخصوص میں ممتاز اصوات تخلیق کر دیئے ہوں تو جبریل علیہ السلام نے وہاں سے سنا اور ان میں یہ علم ضروری وبدیہی تخلیق کر دیا کہ یہی عبارت ہے جو کلام قدیم کے معنی کی صحیح تعبیر ہے۔

تیسرا مسئلہ: نازل شدہ کی تفصیل

"وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" میں جس ایمان کا تذکرہ ہے یہ لازم وفرض ہے کیونکہ آخر میں فرمایا:

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پ۱، البقرہ:۵) وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

۱۔ ثابت ہوا جس میں یہ ایمان نہ ہوگا وہ لازماً کامیاب نہ ہوگا، جب اس کا لازم ہونا ثابت ہوگیا تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا اس کی تفصیل جاننا ضروری ہے کیونکہ آدمی کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ چیزوں کی تفصیل جانے بغیر ان پر عمل کر سکے

۲۔ اگر انہیں وہ تفصیلاً نہیں جانے گا تو ان کا اپنانا اور ان کا قیام اس سے محال ہوگا۔

ہاں اس کا تفصیلی علم بطور فرض کفایہ لازم ہوگا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ احکام کو تفصیلاً جاننا عوام اور ہر آدمی پر لازم نہیں

وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کی تفسیر

اس سے مراد وہ شریعتیں ہیں جو حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے نازل ہوئیں ان پر اجمالاً ایمان لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اب ان کی اطاعت کا حکم نہیں دے رکھا حتیٰ کہ ہم پر ان کی تفصیل کا جاننا ضروری ہو بلکہ اگر ہم ان کی تفصیل سے آگاہ ہوں تو پھر ان تفاصیل پر ایمان بھی لازم ہوگا۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: الآخرۃ، یہ صفت الدار کی ہے ''الدار الآخرۃ'' (اخروی گھر) اس نام کی وجہ دنیا کے بعد اور پیچھے آنے کی ہے بعض نے کہا دنیا آخرت کے مقابل ادنیٰ و گھٹیا ہے۔

دوسرا مسئلہ، یقین کا مفہوم

شی کا ایسا علم جو شک کے بعد ہو اسی وجہ سے آدمی یہ نہیں کہہ سکتا مجھے اپنے وجود کا یقین ہے، آسمان میرے اوپر ہے، کا یقین ہے کیونکہ ایسے علم سے ازالہ وہم نہیں ہو رہا تو یہ امور حادثہ (نئے) کے علم کیلئے ہے خواہ وہ بدیہی ہوں یا نظری و استدلالی، قائل کہہ سکتا ہے میں اس کلام سے یقیناً یہی مراد لے رہا ہوں اگرچہ اس کی مراد کو اس نے مجبوراً جانا ہو۔ آدمی کہہ سکتا ہے مجھے یقین ہے اللہ واحد ہے اگرچہ اس نے اسے استدلال سے جانا ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اشیاء کا یقین ہے

تیسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں آخرت پر یقین رکھنے والوں کی مدح فرمائی ہے، واضح بات ہے کہ صرف وجود آخرت کا یقین کر لینا آدمی کو قابل مدح نہیں بناتا بلکہ وہ اس وقت ہی قابل مدح بنے گا جب وجود آخرت کے یقین کے ساتھ ساتھ حساب و کتاب، سوال و جواب اور اہل ایمان کے جنت اور کفار کے دوزخ جانے کو بھی مانے۔

حضور علیہ السلام سے مروی ہے خوب تعجب و حیرانگی اس پر جو مخلوق ہے پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کرتا ہے، حیرانگی اس آدمی پر جو ابتدائی تخلیق مانے مگر آخرت کا انکار کرے، تعجب اس پہ جو وہاں حشر و نشر کا انکار کرے حالانکہ لوگوں پر دن رات مرنے جینے (سوتے، بیدار ہوتے) دیکھتا ہے، تعجب اس پہ جو جنت اور اس کی نعمتوں پہ ایمان لایا پھر اس نے صرف دار دنیا کیلئے کوشش کی، تعجب اس متکبر و فخر کرنے والے پر جو جانتا ہے کہ اس کا اول

نطفة مذرة و آخره جيفة قذرة بدبودار نطفہ اور اس کا آخر گندا مردار ہے

[۵] اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر اور وہی مراد پالینے والے ہیں''

آیت مبارکہ میں چند مسائل

پہلا مسئلہ، اس آیت کا ربط

اس آیت مبارکہ کا سابقہ آیت سے تین طرح کا تعلق ہے۔

۱۔ اگر ہم ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' سے ابتداء کریں تو جب فرمایا ھدًی للمتقین تو یہاں متقین کو مخصوص کیا کہ کتاب ان کے لئے ہدایت ہے تو سائل کہہ سکتا ہے اس کے ساتھ متقین کو کیوں مخصوص کیا؟ تو اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے لے کر ''وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' تک اس سوال کا جواب ہے گویا فرمایا جو بندہ ایمان، اقامت نماز اور اداء زکوٰۃ میں فلاح ونجات کیلئے مشغول ہے اس کا اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے ابتدا نہ کریں اسے متقین کے تابع سمجھ لیں اور ابتدا اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ سے کرلیں، گویا سوال ہوا کہ کیا سبب ہے کہ ان صفات والے لوگ ہی ہدایت کیلئے مخصوص ہوئے؟

تو جواب ملا دوسروں کو چھوڑ کر ان صفات والوں کا دنیا میں ہدایت اور آخرت میں کامیابی پانا کوئی بعید بات نہیں۔

۳۔ موصول اول: (اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ) کو متقین کی صفت بنالیا جائے اور دوسرے موصول وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ کو مبتدا کی وجہ سے مرفوع تو اب اولئك اس کی خبر ہے

اب ان لوگوں کو فلاح وہدایت کے ساتھ مخصوص کر کے ان اہل کتاب پہ تعریض وطعن کی ہے جو نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ہدایت پر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انھیں فلاح نصیب ہوگی

دوسرا مسئلہ، عَلٰی هُدًی میں معنی غلبہ

عَلٰی هُدًی ''ہدایت پر'' میں ہدایت پر بلند ہونے میں یہ واضح کرنا ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر متمکن اور پکے ہیں، ان کی مثال اس کی ہے جو کسی پر سوار ہو، اس کی نظیر یہ ہے فلان علٰی حق، فلان علٰی باطل (فلاں حق پر اور فلاں باطل پر ہے) اس بات پر یہ کلمات صراحت ہیں جعل الغواية مركباً وامتطى الجهل (اس نے گمراہی کو سواری بنالیا اور وہ جہل پر سوار ہوا)

ان کے ہدایت پہ ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ وہ دلیل سے ثابت پر تمسک کرتے ہیں اور دلیل سے تمسک کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اس پر دوام اختیار کرے اور اسے طعن وشبہ سے محفوظ رکھے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے اولاً نازل کردہ پر ایمان پر ان کی مدح فرمائی اور ثانیاً اس پر اقامت و دوام اور شبہات سے محافظت پر مدح کی اور یہ مکلف پر لازم ہے اس لئے اگر وہ دین پر سخت عمل پیرا اور ڈرنے اور خوف رکھنے والا ہوگا تو وہ ضرور اپنے علم و عمل کا محاسبہ کرے گا اور ان دونوں میں اپنی حالت کا جائزہ لے گا تو جب اپنے نفس کو خلل و نقصان سے محفوظ رکھے گا تو وہ قابل مدح ہوگا بایں طور کہ وہ ہدایت و بصیرت پر ہے

ھُدًی نکرہ لانے کی حکمت

ھدیٰ نکرہ لایا گیا تا کہ یہ ہدایت کی قسم مبہم پر دلالت کرے جن کی کنہ (حقیقت) تک نہ جایا سکتا ہے اور نہ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔محاورہ ہے لو ابصرت فلانا لا بصرت رجلاً (اگر تم فلاں کو دیکھ لیتے تم مرد دیکھتے) حضرت عون بن عبداللہ کہتے ہیں

الھدی من اللہ کثیر ولا یبصرہ الا بصیر ولا یعمل به الا یسیر — اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی کثیر مگر اسے صاحبِ بصیرت ہی دیکھتا ہے، اور اس پر کم ہی عمل کرتے ہیں

کیا تم دیکھتے نہیں آسمانی ستارے ہر کوئی دیکھتا ہے مگر ان سے رہنمائی اہلِ علم ہی پاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ، اُولٰئِکَ میں تکرار کی حکمت

اُولٰـئِکَ، میں تکرار اس تنبیہ کیلئے ہے کہ جس طرح ہدایت کا ان کے ساتھ اختصاص ہے اسی طرح فلاں کے ساتھ بھی ان کا اختصاص ہے، یہ لوگ دوسروں سے انھی دو مخصوص صفات کی بنا پر ممتاز ہیں۔

سوال: یہاں درمیان میں حرف عطف کیوں؟ اور اس میں اور اس آیت میں کیا فرق ہے؟

اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ — یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بدتر اور یہی غافل ہیں

(پ۹،الاعراف:۱۷۹)

جواب: زیر مطالعہ آیت میں یہ الگ الگ خبریں ہیں اس لئے ان کے درمیان عطف ہے بخلاف سوال والی آیت کے، کہ وہاں دونوں خبریں ایک و متفق ہیں کیونکہ ان پر غفلت کی مہر اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ ایک ہی شئی ہے تو دوسرا جملہ پہلے کی تاکید ہے اور عطف سے ان میں جدائی ہو جاتی۔

چوتھا مسئلہ: ھُمْ کے فوائد

ھُمْ، ضمیر فصل ہے اور اس کے دو فوائد ہیں

۱۔ یہ بتا رہی ہے کہ بعد میں خبر ہے نہ کہ صفت۔

۲۔ خبر کا مبتدا میں حصر ہے اگر کہو، الانسان ضاحك (انسان ضاحک ہے) اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان ہی ضاحک ہے ہاں اگر کہو، الانسان هو الضاحك، یہ جملہ بتا رہا ہے کہ انسان ہی ضاحک ہے۔

پانچواں مسئلہ: اَلْمُفْلِحُوْنَ کا معرفہ ہونا

اَلْمُفْلِحُوْنَ کا معرفہ ہونا بتا رہا ہے بلاشبہ متقین وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تمھیں اطلاع ملی ہے کہ وہ آخرت میں فلاح پائیں گے جیسا کہ تمہیں اطلاع پہنچے کہ کسی شہری نے توبہ کر لی تم پوچھو وہ کون ہے بتایا جائے "زید التائب" (زید وہی ہے جس کی توبہ کی خبر ملی تھی)

یا معرفہ ہونا اس پر دال ہے کہ اگر وہ صفت فلاح حاصل ہوئی تو یہی وہ لوگ ہیں جیسے کہ تم ساتھی سے کہو هل عرفت الاسد و ما جبل علیه من فرط الاقدام؟ (تم شیر اور اس کی فطرتی بہادری جانتے ہو) بلاشبہ زید وہی ہے۔

چھٹا مسئلہ: مفلح کا مفہوم

مطلوب پالینے والا مفلح ہوتا ہے گویا اس کے لئے اقسام ظفر کھول دی گئیں اور اس پر اس کا دروازہ بند نہ رہا۔ مفلج، با لجیم کا معنی بھی یہی ہے، اس لفظ کی ترکیب، شق اور فتح پر دال ہے اس لئے کسان کو فلاح، نچلے ہونٹ کا پھٹ جانا، افلح کہلاتا ہے، محاورہ ہے، الحدید بالحدید یفلح (لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے)

الفلاح کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا وصف بیان کیا کہ وہ علم و عمل میں اپنی لازمی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں تو اس کا نتیجہ مطلوب کا پالینا بتایا اور وہ بطور عظمت و تعظیم بلا کمی دائمی نعمتوں کا پانا ہے کیونکہ یہی عبادات کا ثواب مطلوب ہے

ساتواں مسئلہ: ایک طریق سے ان آیات سے وعیدیہ (قائلین یقینی سزا) نے جبکہ دوسرے طریق سے مرجئہ (ہر حال میں معافی کے قائلین) نے استدلال کیا ہے۔

وعیدیہ کا استدلال

ان کا استدلال دو طرح سے ہے:

۱۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، حصر کا مقتضی ہے کہ جس کے نماز و زکوٰۃ میں کمی ہے تو لازم ہے کہ وہ فلاح نہ پائے تو اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تارک نماز و زکوٰۃ پہ یقیناً وعید و سزا ہے۔

۲۔کسی حکم کا وصف پر مرتب ہونا بتلاتا ہے کہ یہ وصف حکم کی علت ہے تو لازم ہے فلاح کی علت فعل ایمان، نماز اور زکوٰۃ ہوں تو جس نے ان میں کمی کی اس کے لئے علت فلاح ثابت نہ ہوگی تو جب علت فلاح حاصل نہیں تو فلاح بھی لازماً حاصل نہ ہوگی

مرجئہ کا استدلال

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں مذکور صفات سے متصف لوگوں پر فلاح کا حکم جاری فرمایا ہے لہٰذا ان اشیاء سے متصف لوگوں کا مفلح ہونا ضروری۔ ہے اگرچہ انھوں نے زنا، چوری اور شرب خمر کا ارتکاب کیا۔

جب اس گروہ میں عفو و معافی ثابت ہے تو دوسروں میں بھی ثابت ہوگا کیونکہ فرق کا کوئی بھی قائل نہیں۔

جواب: دونوں کے استدلال متعارض ہیں لہٰذا یہ ساقط ہیں۔

پھر وعید یہ کا جواب یہ ہے کہ ارشاد الٰہی: "وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" بتا رہا ہے کہ یہی لوگ فلاح میں کامل ہیں تو لازم ہے صاحب کبیرہ فلاح میں کامل نہ ہو

اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ وہ فلاح میں کیسے کامل ہوسکتا ہے جبکہ وہ خلاصی عذاب میں جازم و یقین والا نہیں بلکہ اس کا خائف ہونا ممکن ہے

دوسرے کا جواب یہ ہے سبب واحد کی نفی، نفی مسبب کا تقاضا نہیں کرتی ہمارے نزدیک، اسباب فلاح میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی و عفو بھی شامل ہے۔

تو مرجئہ کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا وصف تقویٰ ہی حصول ثواب کیلئے کافی ہے کیونکہ اس کے ضمن میں معاصی سے بچنا اور ترک واجبات سے بچنا آجاتا ہے

[۶] اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۶

(بلاشبہ جو دانستہ کفر میں پکے ہیں ان کے حق میں برابر ہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے)

اس آیت کے تحت کچھ مسائل نحوی اور کچھ مسائل اُصولی ہیں ہم انہیں انشاء اللہ تفصیلاً بیان کر رہے ہیں۔

اِنَّ میں چند مسائل

پہلا مسئلہ: اِنَّ حرف ہے اور حرف اصلاً عامل نہیں ہوتا چونکہ اس حرف کی فعل کے ساتھ صورۃً اور معناً مشابہت ہے اس مشابہت کا تقاضا ہے کہ یہ عمل کرے

چند مقدمات

یہاں چند مقدمات کا ذکر ضروری ہے۔

پہلا مقدمہ: بیان مشابہت

یہ مشابہت لفظ و معنی میں حاصل ہے، الفاظ میں یوں کہ یہ تین حروف سے مرکب، آخری مفتوح اور افعال کی طرح اسماء کو لازم، ان پر نون وقایہ آتا ہے اِنَّنِیْ، کَاَنَّنِیْ جیسا کہ وہ فعل پر داخل ہوتا ہے۔ مثلاً اَعْطَانِی، اَکْرَمَنِیْ۔

معنی میں مشابہت یوں کہ یہ اپنے اسم میں حصول معنی کا فائدہ دیتے ہیں اور یہ اس کے خبر کیساتھ موصوف ہونے میں تاکید لاتا ہے جیسے کہو 'قَامَ زَیْدٌ'، تو قام سے اسم میں معنی کا حصول ہو رہا ہے۔

دوسرا مقدمہ: چونکہ ان کی افعال کے ساتھ مشابہت ہے لہٰذا ان کے عمل میں بھی لازماً مشابہ ہونگے اور یہ بر بنا دوران ظاہر ہے

تیسرا مقدمہ: یہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع کیوں دیتے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عامل بن چکے ہیں تو مبتدا اور خبر دونوں کو رفع یا دونوں کو نصب یا مبتدا کو رفع، خبر کو نصب یا اس کا عکس کریں گے

اول صورت باطل کیونکہ مبتدا و خبر ان کے داخلہ سے پہلے ہی مرفوع تھے اگر اب بھی مرفوع رہیں تو ان کا اثر تو ظاہر نہ ہوا اور اس لئے بھی کہ یہ عمل فعل کرتے ہیں اور فعل دونوں اسماء کو رفع نہیں دیتا تو اشتراک کا کوئی معنی نہیں رہے گا اور فرع اصل سے اقویٰ نہیں ہوا کرتی

دوسری صورت بھی باطل کہ یہ عمل فعل کے مخالف ہے کیونکہ فعل کسی کو رفع دیئے بغیر کسی کو نصب نہیں دیتا۔

تیسری بھی باطل کیونکہ ایسی صورت میں اصل (فعل) اور فرع (حرف) میں مساوات آجائے گی کیونکہ فعل اولاً فاعل کو رفع پھر مفعول کو نصب دیتا ہے، اگر یہاں حرف کا عمل بھی یہی ہو تو اصل و فرع برابر ہو جائیں گے۔

تو جب تینوں صورتیں باطل تو چوتھی ہی باقی ہے کہ یہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیں، یہ گفتگو بتا رہی ہے کہ یہ حروف اصل میں عامل نہیں ہاں ان میں داخل کر لئے گئے ہیں کیونکہ معاملہ فعل میں منصوب کی مرفوع پر تقدیم، اصل سے اعراض ہے تو یہاں سے آشکار ہو رہا ہے کہ ان حروف کا عامل ہونا بطریق اصل نہیں بلکہ بطریق عارض ثابت ہے۔

دوسرا مسئلہ: بصری کہتے ہیں یہ حروف اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں، کوفی کہتے ہیں ان کا رفعِ خبر میں کوئی دخل و اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ جس بنا پر پہلے مرفوع ہے اسی بنا پر اب مرفوع ہوتی ہے، بصریوں کی دلیل یہ ہے ان حروف کی فعل کے ساتھ مشابہت کاملہ ہے جس کی تفصیل اوپر گذری ہے اور فعل کی رفع و نصب میں تاثیر ہے تو ان کا بھی اسی طرح ہونا لازم ہے

اہل کوفہ کی دلیل دو طرح سے ہے۔

ا۔معنٰی خبریت، خبر مبتدا میں باقی ہے اور اس کی وجہ سے اس کا مرفوع ہونا اولٰی ہے تو خبریت نے رفع دیا، جب خبریت رافع ٹھہری تو اب ان حروف کا رفع دینا محال، اس میں تین مقدمات ہیں۔

ا۔خبریت باقی ہے یہ تو ظاہر ہے کیونکہ خبریت کا معنی، خبر کا مبتدا کی طرف اسناد ہے تو بعد دخول حروف بھی وہ اسناد باقی ہے۔

۲۔خبریت کا تقاضا رفع ہے، اس لئے کہ دخول ان سے رفع کی مقتضی تھی حالانکہ اس وقت عدم حرف مقتضی کا جز نہ تھا کیونکہ عدمِ جز، علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو دخول حرف کے بعد بھی خبریت ہی مقتضی رفع ہے کیونکہ کامل مقتضی موجود ہو اور مؤثر نہ ہو تو یہ کسی مانع کی وجہ سے ہوگا اور یہ خلاف اصل ہے۔

۳۔خبریت کا تقاضا اولٰی ہے، اس کی تفصیل دو وجہ سے ہے۔

ا۔اس کا خبر ہونا وصف حقیقی اور قائم بذاتہ ہے اور یہ حرف اجنبی اور اس کے مخالف ہے اور مخالف ہونے کے ساتھ خبر کا مجاور و متصل نہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان "اِنّ" آ گیا ہے۔

۲۔خبر کی فعل کے ساتھ حقیقی و معنوی مشابہت ہے اور وہ دونوں کی غیر کی طرف اسناد ہے رہا حرف تو وہ فعل کے ساتھ حقیقی معنوی مشابہت نہیں رکھتا کیونکہ اس میں اسناد نہیں تو خبر کی مشابہت فعل کے ساتھ اقویٰ ہے اس مشابہت سے جو حرف کو فعل کے ساتھ حاصل ہے، جب یہ ثابت ہے تو اب خبریت کا تقاضا رفع اولٰی ہوگا اس لئے مشابہت فعل حرف سے اولٰی ہے۔ کیونکہ فعل کے ساتھ اس کی مشابہت زیادہ ہے

۴۔جب رفع دینے میں خبریت اقویٰ ہے تو اب اس حرف کا رافع ہونا محال کیونکہ خبریت اس حرف کی نسبت اولٰی ہے جب بات یوں ہی ہے تو حکم خبریت کا حصول اس حرف کے حصول سے پہلے ہو چکا اب اگر حصول حرف کے بعد، حکم خبریت کو دیں تو یہ تحصیل حاصل ہے جو کہ محال ہے۔

دوسری وجہ: شیخ سیبویہ نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ حرف، عمل میں اصل نہیں تو اس کا عمل کرنا خلاف دلیل ہے اور جو خلاف دلیل ہو اسے بقدر ضرورت ہی لیا جاتا ہے اور ضرورت، اسم میں عمل سے ہی پوری ہوگی لہٰذا لازم ہے کہ یہ خبر میں عامل نہ ہو۔

دوسرا مسئلہ: شیخ انباری نے نقل کیا، کندی فلسفی شیخ مبرد کے پاس آئے اور کہا کلام عرب میں کچھ زوائد وحشو ہے مثلاً عرب کہتے ہیں۔عبداللہ قائم پھر کہتے ہیں "ان عبداللہ قائم" پھر "ان عبداللہ لقائم" حالانکہ ان کا معنی ایک ہی ہے۔

شیخ مبرد نے کہا۔ان کے معانی بھی مختلف ہیں کیونکہ الفاظ مختلف ہیں "عبداللہ قائم" یہ اس کے قیام کی خبر ہے، ان عبداللہ قائم، سائل کا جواب ہے، ان عبداللہ لقائم، منکر قیام کے انکار کا جواب وردہے

شیخ عبدالقاہر نے مبرد کے قول (اِنّ سوال سائل میں آتا ہے) کی صحت پر یوں استدلال کیا ہے قسم کے جواب میں لوگ مبتدا اور خبر لاتے ہیں مثلاً واللہ ان زیدا منطلق اس کی تائید قرآن میں یوں ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ (پ۱۶،الکہف:۸۳)

تم سے ذوالقرنین کا پوچھتے ہیں تم فرماؤ میں تمھیں اس کا مذکور پڑھ کرسناتا ہوں۔ بیشک ہم نے اسے زمین میں قابو دیا

اوراسی سورۃ کی ابتدا میں ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ (پ۱۵،الکہف:۱۳)

ہم ان کا ٹھیک ٹھیک حال تمھیں سنائیں وہ جوان تھے کہ اپنے رب پر ایمان لائے

ایک اور مقام پر فرمایا

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (پ۲۹،الشعراء:۲۱۶)

تو اگر وہ تمہارا حکم نہ مانیں تو فرما دو میں تمھارے کاموں سے بے علاقہ ہوں

سورۃ الانعام میں ہے

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (پ۷،الانعام:۵۶)

کہہ دیجئے مجھے منع کیا گیا ہے اس سے کہ میں انہیں پوجوں جنہیں تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو

سورۃ الحجر میں ہے:

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ (پ۱۴،الحجر:۸۹)

کہہ دیجئے بلاشبہ میں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں

اور دیگر آیات مبارکہ جو سامنے لائی جاسکتی ہیں، جب کفار نے آپ ﷺ سے مجادلہ اور سوالات کئے تو ان کے جواب میں یہ آیات آئیں، اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (پ۱۹،الشعراء:۱۶)

تو فرعون کے پاس جاؤ پھر اس سے کہو ہم دونوں اس کے رسول ہیں جو رب ہے سارے جہان کا

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِينَ (پ۹،الاعراف:۱۰۴)

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔

جادوگروں کے قصہ میں فرمایا

اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ (پ۹، الاعراف:۱۲۵) ہم اپنے رب کی طرف پھرنے والے ہیں۔

ظاہر ہے یہ فرعون کی اس بات کا جواب تھا:

آمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ (پ۱۶، طٰہٰ:۷۱) کیا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں

شیخ عبدالقاہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں تحقیق یہی ہے کہ یہ "اِنَّ" تاکید کیلئے آتا ہے جب خبر ایسے معاملہ کی ہو کہ مخاطب اس کے خلاف گمان نہیں کرسکتا تو وہاں "اِنَّ" کی ضرورت نہیں، ضرورت وہاں ہوگی جہاں سامع کی مخالفت کا خیال ہو اس لئے تم دیکھتے ہو کہ یہ وہاں حسن میں اضافہ کردیتا جب خبر ایسا معاملہ ہو جو بعید ہو۔ ابونواس نے کہا:

علیک بالیاس من الناس ان غنی نفسک فی الیاس

"لوگوں سے مایوسی اپنے اوپر لازم کرو کیونکہ تمہارے نفس کا غنا مایوسی میں ہی ہے"

یہ اس کا اچھا موقع وجگہ ہے۔ اس لئے کہ لوگ اپنے کو لوگوں سے مایوسی کیلئے تیار نہیں کر پاتے

باقی اِنَّ کا مع لام منکر کا جواب بننا، ان زید القائم، جید ہے کیونکہ جب گفتگو منکر کے ساتھ ہو تو تاکید کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے جیسے سامع سے انکار کا احتمال ہے، اسی طرح حاضرین سے بھی انکار کا احتمال ہوتا ہے۔

یادرہے کبھی اِنَّ وہاں بھی لایا جاتا ہے جہاں متکلم موجود کو غیر موجود تصور کرے، مثلاً، انہ کان منی الیہ احسان فعاملنی بالسوء گویا اپنے نفس پر ملامت ہے کہ تو نے غلط گمان کیا تیرا وہم غلط نکلا، حضرت اُم مریم سے باری تعالیٰ نے اس بارے میں حکایت فرمایا:

قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُہَاۤ اُنۡثٰی وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ بولی اے رب میرے یہ تو میں نے لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ جنی (پ۳، آل عمران:۳۶)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا:

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ کَذَّبُوۡنِ (پ۱۹، الشعراء:۱۱۷) عرض کی اے میرے رب میری قوم نے مجھے جھٹلایا۔

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ۔ اہل کلام اور تعریفِ کفر

اہل کلام پر حد وتعریف کفر دشوار ہوگئی اور تحقیقی قول اس میں یہ ہے کہ جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ انھوں نے

یہ کہا اور فرمایا اب اس کی صحت نقل کی معرفت بدیہی ہے یا استدلالی یا خبر واحد ہے، قسم اول وہ چیز جسے حضور ﷺ کا لانا نہایت ہی واضح وبدیہی ہے جو اس کی تصدیق کرے گا وہ مومن اور جو اس کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ ان تمام کی تصدیق نہیں کرتا یا بعض کی کرتا ہے اور بعض کی نہیں کرتا تو یہ کافر ہے۔

تو اب کفر اس کی عدم تصدیق ہے جس کے بارے میں نہایت ہی واضح ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں مثلاً جس نے وجود صانع کا انکار کیا یا اس کے عالم، قادر ومختار ہونے کا یا اس کے واحد ہونے کا یا اس کے نقائص وعیوب سے پاک ہونے کا یا حضور ﷺ کی نبوت کا یا صحت قرآن کریم کا یا ان احکام کا انکار کیا جن کا دین محمدی میں ہونا یقینی ہے مثلاً لزوم صلاۃ وزکوٰۃ، صوم، حج، حرمت سود وغیرہ کا انکار کیا تو یہ کافر ہوگا اس لئے کہ اس نے ایسی چیز کی تصدیق ترک کی جس کا دین محمدی ﷺ ہونا واضح ویقینی تھا۔ (انہیں ہی ضروریات دین کہا جاتا ہے)

لیکن جن چیزوں کا دین سے ہونا استدلال سے جانا جاتا ہے مثلاً اللہ کا عالم بالعلم ہونا یا عالم لذاتہ ہونا، اس کا مرئی یا غیر مرئی ہونا اور وہ اعمال بندوں کا خالق ہے یا نہیں تو یہ آپ ﷺ سے تواتر قطعی سے منقول نہیں کہ ان میں سے ایک قول صحیح ہے اور دوسرا صحیح نہیں بلکہ ان میں کسی ایک قول کی صحت اور دوسرے کا باطل ہونا استدلال ونظر سے ہی معلوم ہوتا ہے تو بالیقین نہ ان کا انکار اور نہ ان کا اقرار، ماہیت ایمان میں داخل ہے لہٰذا یہ موجب کفر نہیں

اور اس پہ دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ماہیتِ ایمان کا حصہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ پر لازم ہوتا کہ آپ کسی کو مومن قرار نہ دیں جب تک اس سے یہ پوچھ نہ لیں کہ تم اس مسئلہ میں حق کسے مانتے ہو، اور اگر ایسا ہوتا تو تمام امت میں اس مسئلہ کے بارے میں قول مشہور اور یہ بطور تواتر منقول ہوتا جب یہ منقول نہیں تو یہ بتا رہا ہے رسول اللہ ﷺ نے اس پر ایمان کو موقوف نہیں کیا جب صورت حال یہ ہے تو ان کی معرفت ایمان کا حصہ نہیں ہوگی اور نہ اُن کا انکار موجب کفر ہے، اسی ضابطہ کی بنا پر امت میں سے کسی کو اور ارباب تاویل میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا اور جو چیز اخبار احاد سے ثابت ہے اس کا معاملہ ظاہر ہے کہ اس پر ایمان وکفر کا موقوف ہونا ممکن ہی نہیں، حقیقت کفر میں ہمارا قول یہی ہے۔

سوال: تم نے جو کچھ ذکر کیا یہ لباس اغیار اور زنار وغیرہ سے باطل ہے کیونکہ یہ پہننا کفر ہے حالانکہ یہ اس ترک تصدیق کے علاوہ ہے جو حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کے بارے میں ہے۔

جواب: یہ اشیاء حقیقت میں کفر نہیں کیونکہ تصدیق اور عدم تصدیق باطنی معاملہ ہے، جس پر مخلوق مطلع نہیں ہو پاتی اور شریعت کا یہ طریقہ ہے کہ ایسی صورتوں میں نفس معنی پر حکم کی بنیاد نہیں رکھتی کیونکہ اس پر اطلاع ہی ممکن نہیں بلکہ اس کی کچھ علامات ظاہر اور

نشانات بتا دیتی ہے اور انھیں متشابہات ظاہرہ کو ہی احکام شرعیہ قرار دیتی ہے لہٰذا لباس اغیار اور شدز نار اسی باب سے ہے کیونکہ ظاہر یہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرے گا وہ ان افعال کا ارتکاب نہیں کرے گا کیونکہ جو یہ پہن رہا ہے وہ بتا رہا ہے کہ اس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نہیں کی لہٰذا اس پر اس کے احکام جاری ہوں گے نہ یہ کہ یہ فی نفسہ کفر ہیں۔اس سلسلہ میں کلام کا خلاصہ یہی ہے۔

دوسرا مسئلہ: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کی تفسیر

الفاظ ماضی کے ساتھ ان کے کفر کی خبر ہے جس شئی کی خبر لفظ ماضی سے ہو اس کا تقاضا ہے کہ وہ شئی اس خبر سے پہلے ہو، جب یہ سمجھ آگئی تو سنیئے ،معتزلہ تمام اخبار ماضیہ مثلاً:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (پ۱ البقرہ:۱۰) بیشک جنہوں نے کفر کیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (پ۱۴ ،الحجر:۹) بیشک ہم نے اتارا یہ قرآن اور بے شک ہم خود اس کے نگہبان ہیں

اِنَّا اَنزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ (پ۳۰ ،القدر:۱) بلا شبہ ہم نے اسے شب قدر میں اتارا

اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحاً اِلٰی قَوْمِہٖ (پ۲۹ ،نوح:۱) بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا

سے اس پر استدلال کرتے ہیں کہ کلام اللہ حادث ہے خواہ یہ کلام حروف و اصوات ہوں یا کوئی اور شئی ، اور اِس طریق پر خبر شئی درست ہوگی جب وہ شئی (جس سے خبر دی جارہی ہے) پہلے ہو کیونکہ قدیم سے غیر کا پہلے ہونا محال ہے جب اس خبر کا قدیم ہونا محال ہے تو یہ حادث ہوگی

قائلین قدیم کا جواب

کلام اللہ کو قدیم جاننے والوں نے دو طرح سے جواب دیا ہے

۱۔اللہ تعالیٰ ازل میں جانتا تھا کہ عنقریب جہاں معرض وجود میں آئے گا، جب اس نے اسے پیدا کر دیا تو علم منقلب ہو گیا جسے پہلے جانتا تھا کہ وہ مستقبل میں ہوگا اب اس کے بارے میں یہ علم ہو گیا کہ وہ ماضی میں پیدا ہو چکا اور اس سے علم الٰہی کا حادث ہونا لازم نہیں آتا، یوں کہنا بھی جائز ہے اللہ تعالیٰ کی خبر ازل میں خبر تھی کہ یہ عنقریب کفر کریں گے، جب ان کا کفر پایا گیا تو اب یہ ان کے کفر سے خبر بن جائے گی تو اس سے خبر الٰہی کا حدوث لازم نہیں آتا۔

۲۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ (پ۲۶، الفتح:۲۷) بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے

جب وہ مسجد حرام میں داخل ہو گئے تو ضروری ہے کہ یہ خبر یوں ہو جائے کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہو گئے ہیں تو اب خبر اول میں تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ واقعۃً مسجد حرام میں داخل ہو گے جب یہ بات جائز ہے تو ہمارے زیر بحث مسئلہ میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا مستدل نے اولاً سوال اول کا جواب یوں دیا کہ شیخ ابوالحسین بصری اور ان کے احباب کے نزدیک تبدیلی معلومات سے علم میں تبدیلی آتی ہے اور یہ کیسے نہ آئے یہ علم کہ عالم موجود نہیں اور عنقریب وجود میں آئے گا اگر وجود عالم کا استحالہ (محال ہونا) باقی رہے تو یہ جہل ہو گا نہ کہ علم، جب صورت حال یہ ہے تو اس علم میں تغیر آئے گا اسی بنا پر معارضہ ساقط ہو جائے گا۔

دوسرے سوال کا جواب یوں کہ اللہ تعالیٰ کی خبر و کلام مخصوص اصوات ہیں تو ارشاد الٰہی 'لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ' کا معنی یہ ہے کہ دخول مسجد کے لئے یہ کلام کیا نہ کہ دخول کے بعد کلام کیا، ہمارے مسئلہ میں اس کی نظیر کچھ یوں کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا، اللہ تعالیٰ نے ان سے صدور کفر کے بعد کلام کیا نہ کہ اس سے پہلے البتہ اگر پہلے مانا جائے تو یہ اعتراف ہو گا جب یہ کلام ہوا اس وقت ازل میں کفر نہ تھا اور یہی مقصود ہے۔

قدیم ماننے والوں نے جواباً کہا اگر ہم مان لیں کہ معلوم میں تبدیلی سے علم میں تغیر آتا ہے تو جب ہم یہ کہتے ہیں عالم عنقریب وجود میں آئے گا تو یہ ازل میں حاصل تھا یا نہ تھا۔ اگر ازل میں حاصل نہ تھا تو صراحۃً جہالت و کفر ہے، اور اگر ہم کہتے ہیں کہ یہ حاصل تھا تو اس کا زوال، قدیم کے زوال کا مقتضی ہو گا اور اس سے اثبات حدوث عالم کا باب بند ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

تیسرا مسئلہ: اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا، الفاظ جمع مع لام تعریف ہے جو بظاہر استغراق و احاطہ کیلئے ہے، اس میں کوئی نزاع نہیں کہ یہاں ظاہر مراد نہیں اس لئے کہ بہت سے کفار اسلام لے آئے، تو ہم نے یہ اصول جان لیا کہ بعض اوقات، اللہ تعالیٰ کلام عام فرماتا ہے، مگر مراد خاص ہوتی ہے یا تو اس لئے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں قرینہ ظاہر تھا کہ یہاں عموم سے خصوص مراد ہے تو عدم تلبیس اور ظہور مقصود کی وجہ سے عموم ہی احسن ہے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ جب شہر میں انسان کے کچھ مخصوص دشمن ہوں تو وہ جب کہتا ہے لوگوں نے مجھے اذیت دی تو اس سے ہر ایک سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ مخصوص لوگ ہی ہیں

یا اس لئے کہ تکلم عام اور ارادہ خاص جائز ہے اگرچہ اس کا بیان متصل نہ بھی ہو لیکن ان کے نزدیک جو وقت خطاب سے تاخیر بیان تخصیص جائز رکھتے ہیں

جب یہ ثابت ہوگیا تو ظاہر ہوا الفاظ عموم سے قطعی طور پر استغراق پر استدلال ممکن نہیں کیونکہ وہاں تخصیص کا احتمال ہوتا ہے اور حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں اس پر واضح قرینہ بھی تھا لہٰذا یہ انداز عموم احسن ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے اگر قرینہ ہوتو ہم اسے جان لیں گے، اور اگر نہیں جان سکتے تو جان لیں گے کہ قرینہ نہیں مگر یہ کلام ضعیف ہے کیونکہ عدم وجدان سے عدم وجود پر استدلال ان ضعیف دلائل میں سے ہے جو مفید ظن ہیں نہ کہ مفید قطعی، اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ معتزلہ کا عمومی وعیدات سے قطعیت وعید پر استدلال نہایت ہی ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

بعض معتزلہ نے دفاع میں یوں حیلہ کیا ہے، اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا یُؤۡمِنُوۡنَ، یہ اس قول ''اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُؤۡمِنُوۡنَ کی نقیض کی طرح ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُؤۡمِنُوۡنَ'' تب سچا ہے جب ان میں ہر ایک ایمان لائے جب یہ ثابت ہے تو یہ جانب ثبوت میں عموم کا مقتضی ہے لہٰذا لازم ہے کہ وہ جانب نفی میں عموم پر موقوف نہ ہو بلکہ اس کے صدق کیلئے یہی کافی ہے کہ ان میں کسی ایک سے صدور ایمان نہ ہو کیونکہ جب ان تمام سے ایک ایمان نہ لایا تو ثابت ہوا جمع سے ایمان کا صدور نہیں ہوا تو واضح ہوا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا یُؤۡمِنُوۡنَ'' کو اپنے ظاہر پہ رکھنے کے لئے یہی کافی ہے کہ ان میں سے ایک ایمان نہ لائے تو اس وقت یہ ظاہر پر کیوں نہیں ہوگا جب کثیر ایمان نہ لائے۔

جواب: اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا، صیغہ جمع ہے، لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بھی جمع ہے جب جمع، جمع کے مقابل ہو تو فرد کی فرد پر تقسیم ہوتی ہے معنی ہو گا ان میں سے ہر ایک ایمان نہیں لائے تو اب کلام مذکورہ (اعتراض) لوٹ آئے گا۔

چوتھا مسئلہ: یہاں مراد کون ہیں؟

اہل تفسیر کا اختلاف ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سے مراد کون ہیں؟

ا۔ رؤساء یہود۔ مخالفت کرنیوالے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے نشاندہی فرمائی کہ جانتے ہوئے حق چھپاتے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے

۲۔ مراد مشرک ہیں، ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ وغیرہ جنہوں نے دلائل واضحہ کے بعد ضد کی اور معرفت کے بعد انکار کیا، اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے

فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُهُمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ (پ ۲۴، فصلت:۴،۵)

تو ان میں سے اکثر نے منہ پھیرا تو وہ سنتے ہی نہیں اور بولے ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جس کی طرف تم ہمیں پھیرتے ہو

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام قوم کے ایمان کے خواہاں تھے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (پ۱۵، الکہف:۶) تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے ان کے پیچھے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں غم سے

اور فرمایا:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (پ۱۱، یونس:۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرو گے یہاں تک کہ مسلمان ہو جائیں

پھر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تاکہ ان سے اس کا طمع ختم کریں اور یہ آپ کی تکلیف کا سبب نہ بنے، مایوسی بھی ایک راحت ہے

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: صاحب کشاف نے کہا سَوَآءٌ بمعنی استوا ہے دیگر مصادر کی طرح یہ بھی صفت بنتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (پ۳ ال عمران:۶۴) ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے

فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (پ۲۴، فصلت:۱۰) اور اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں یہ سب ملا کر چار دن میں

گویا فرمایا: جن لوگوں نے کفر، ضد، ہٹ دھرمی کی ان پر تمہارا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے

دوسرا مسئلہ: سواءٌ کے رفع میں دو اقوال

۱۔ سواء ''اِنَّ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ''ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ'' فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، گویا فرمایا جن لوگوں نے عمداً انکار کیا برابر ہے ان پر تمہارا انذار (ڈرانا) اور عدم انذار، جیسا کہ کہا جائے ان زیدا مختصم اخوہ و ابن عمہ

۲۔ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ، مبتدا اور سواء خبر بمعنی برابر ہے، ان پر تمہارا انذار اور عدم انذار اور جملہ اِنَّ کی خبر۔

دوسری وجہ اولیٰ ہے کیونکہ سواء اسم ہے اسے فعل کا درجہ دینا بغیر ضرورت ترک ظاہر ہے جو جائز نہیں، جب یہ معلوم ہو گیا تو اب جان لیجئے یہ معلوم ہے کہ انذار وعدم انذار کا وصف استوا ہے تو سواء کا خبر ہونا ضروری ہے تو خبر مقدم ٹھہری، اس سے ثابت ہوا کہ مبتدا پر تقدیم خبر جائز ہے اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے

سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ (پ۲۵، الجاثیہ:۲۱) برابر ہے اُن کی زندگی اور موت

شیخ سیبویہ نے قولِ عرب نقل کیا ہے، تمیمی انا ومشنوء من یشنؤك

اہل کوفہ اسے جائز نہیں جانتے ان کے دو استدلال ہیں:

۱-مبتدا ذات اور خبر صفت، ذات کا صفت سے پہلے ہونا حق ہے لہٰذا الفاظ میں اس کا پہلے ہونا توابع اعراب پر قیاس کی وجہ سے لازمی ہے اور علت مشترکہ تبعیت معنوی ہے

۲-خبر کا ضمیر پر مشتمل ہونا ضروری ہے اگر خبر پہلے ہوگی تو اضمار قبل از ذکر لازم ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ خبر وہ لفظ ہے جس کے ساتھ امر معلوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے تو علم سے پہلے اس کی طرف اشارہ ممنوع ہوتا ہے تو اضمار قبل الذکر محال ہے۔

اہلِ بصرہ نے جواباً اول کے بارے میں کہا تمہاری دلیل سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تقدیم مبتدا اولیٰ ہے نہ کہ واجب۔ دوسرے کے بارے میں کہا اضمار قبل الذکر کلام عرب میں واقع ہے۔ فی بیته یؤتی الحکم۔

ارشاد الٰہی ہے

فَأَوۡجَسَ فِي نَفۡسِهِۦ خِيفَةً مُّوسَىٰ (پ۱۶، طٰہٰ:۶۷) تو اپنے جی میں موسیٰ نے خوف پایا

زہیر نے کہا:

من یلق یومًا علی علاقه هرما یلق السماحة منه والندی خلقاً

تیسرا مسئلہ: اس پر اتفاق ہے کہ فعل سے خبر نہیں دی جا سکتی (یعنی فعل مبتدا نہیں بن سکتا) مثلاً جس نے یہ کہا خرج ضرب تو اس کے کلام میں نظم نہیں، بعض نے اس قول کا ان دلائل سے رد کیا ہے۔

۱-ارشاد الٰہی "ءأنذرتهم أم لم تنذرهم" فعل ہے سواء علیهم خبر، اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے:

ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا رَأَوُاْ ٱلۡأٓيَٰتِ لَيَسۡجُنُنَّهُۥ حَتَّىٰ حِينٖ (پ۱۲، یوسف:۳۵) پھر سب کچھ نشانیاں دیکھ دکھا کر پچھلی مت انھیں یہی آئی کہ ضرور ایک مدت تک اسے قید خانہ میں ڈالیں

یہاں بَدَا کا فاعل لیسجننہ ہے

۲-جس سے خبر دی جا رہی ہے ضروری ہے کہ وہ فعل ہو تو فعل مخبر عنہ (جس کی خبر دی جا رہی ہے) بن گیا

سوال: جس سے خبر دی جا رہی ہے کہ وہ فعل ہے وہ تو کلمہ ہے اور کلمہ اسم ہوتا ہے

جواب: تو جس سے خبر دی جا رہی ہے کہ وہ فعل ہے جب وہ فعل فعل نہ ہو بلکہ اسم ہو تو یہ خبر کاذب ہوگی تو تحقیق یہ ہے کہ جس کے فعل ہونے کی خبر دی جا رہی ہے وہ اسم ہوگا یا اسم نہ ہوگا اگر پہلی صورت ہے تو خبر کاذب کیونکہ اسم فعل نہیں ہوتا اور اگر وہ فعل ہے تو مخبر عنہ فعل بن گیا

۳-جب ہم کہتے ہیں فعل سے خبر نہیں دی جا سکتی تو ہم یہ خبر ہی دے رہے ہیں کہ اس سے خبر نہیں دی جا سکتی، اس خبر میں اگر مخبر عنہ اسم ہے تو لازم آئے گا کہ ہم اسم کے بارے میں خبر دے رہے ہیں کہ اس سے خبر نہیں دی جا سکتی تو یہ غلط ہے اور اگر وہ فعل ہے تو پھر فعل ہی مخبر عنہ ہے۔

پھر ان لوگوں نے کہا جب ثابت ہو گیا فعل سے خبر دینے میں کوئی ممانعت نہیں تو اب ہمیں ترک ظاہر کی حاجت بھی نہیں۔

جمہور نحاۃ کی رائے

جمہور نحاۃ اس پر متفق ہیں کہ فعل سے خبر نہیں دی جا سکتی اس لئے یہاں مقدر ضروری ہے، سواء علیھم اِنذارك و عدم انذارك

سوال: اگر کوئی کہے حقیقت چھوڑ کر مجاز لینے میں کوئی اضافی فائدہ ضروری ہے خواہ وہ معنوی ہو یا لفظی تو یہاں فائدہ کون سا ہے؟

جواب: ارشاد الٰہی "سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ" کا معنی یہ ہے کہ تمہارا اِنذار اور عدم انذار اس لئے ان پر برابر ہے کیونکہ ان لوگوں کا کفر پر اصرار، ہٹ دھرمی اور آیات و دلائل سے اعراض اس حالت تک جا پہنچا ہے کہ اب کسی صورت بھی ان سے قبول اسلام کی امید نہیں رہی حالانکہ اس سے پہلے ان کی یہ حالت نہ تھی۔

اگر یہ الفاظ لائے جاتے "سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ انذارك و عدم انذارك" تو یہ معنی و مقصد واضح نہ ہوتا اس سے اب کی حالت تو ان کی واضح ہوتی مگر سابق حالت کا علم نہ آتا جب فرمایا "أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ" تو اس نے بتایا، ان کی یہ حالت اب ہوئی ہے تو اس کے بعد حصول مایوسی اور ان سے امید ختم ہوئی اور ہم واضح کر چکے آیت مبارکہ سے مقصود بھی یہی ہے۔

چوتھا مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں ہمزہ اور ام دونوں معنی استفہام سے اسقدر خالی ہیں کہ معنی استفہام ان سے بالکل جدا ہو چکا ہے، سیبویہ کہتے ہیں یہ حروف استفہام پر اسی طرح جاری رہتے ہیں جیسے حرف ندا، اللھم اغفرلنا- ایتھا العصابہ یعنی یہ استفہام نہ ہونے کے باوجود بصورت استفہام ہیں جیسا کہ یہ حرف ندا نہیں مگر بصورت ندا آتا ہے

فضل قدیر

پانچواں مسئلہ، ءَاَنْذَرْتَهُمْ میں قرأتیں

ءَاَنْذَرْتَهُمْ میں چھ قرأتیں ہیں

۱۔ دوہمزے درمیان الف
۲۔ درمیان الف نہ ہو
۳۔ ہمزہ اولیٰ قوی اور دوسرا بین بین، درمیان الف
۴۔ درمیان الف نہ ہو۔
۵۔ حرف استفہام محذوف
۶۔ ہمزہ حذف اور اس کی حرکت ماقبل ساکن کودی جائے جیساقد افلح

سوال: اگر دوسرا ہمزہ الف بنادیا جائے؟

جواب: صاحب کشاف کہتے ہیں یہ ایسالحن ہوگا جوکلام عرب سے خارج کردے گا۔

چھٹا مسئلہ: اِنذار کا مفہوم

اِنذار، معاصی ونافرمانی پر زجر وتوبیخ کے ساتھ عذاب الٰہی سے ڈرانا، انذار کا ذکر کیا نہ کہ بشارت کا، کیونکہ فعل اور ترک فعل میں انذار کی تاثیر، بشارت کی تاثیر سے اقوٰی ہے کیونکہ انسان کی مشغولیت دفاع نقصان میں حصول نفع میں مشغولیت سے زیادہ شدید ہوتی ہے تو یہ مقام مبالغہ کا ہے لہٰذا ذکر انذار ہی اولیٰ ہے۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ میں دو مسائل

یہاں دو مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: صاحب کشاف نے کہا یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے یا یہ اِنَّ کی خبر ہے اور ماقبل جملہ معترضہ ہے۔

دوسرا مسئلہ: تکلیف مالا یُطاق پر استدلال

اہلسنّت نے اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات سے ''تکلیف مالا یُطاق'' (طاقت سے زیادہ کا حکم) پر استدلال کیا ہے مثلاً ارشاد الٰہی ہے:

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲۲ یٰسین:۷)

بیشک ان میں اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے تو وہ ایمان نہ لائیں گے

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا

(پ۲۹، المدثر:۱۱ تا ۱۷)

اسے مجھ چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا اور اسے وسیع مال دیا اور بیٹے دیئے سامنے حاضر رہتے اور میں نے اس کیلئے طرح طرح کی تیاریاں کیں پھر یہ طمع کرتا ہے کہ میں اور زیادہ دوں ہر گز نہیں وہ تو میری آیتوں سے عناد رکھتا ہے۔ قریب ہے کہ میں اسے آگ کے پہاڑ صعود پر چڑھاؤں

تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ (پ۳۰، الھب:۱)

تباہ ہو جائے ابولہب کے دونوں ہاتھ۔

اس استدلال کی تفصیل یہ ہے

پہلا طریقہ

اللہ تعالیٰ ایک معین شخص کے بارے میں خبر دے رہا ہے کہ یہ ایمان کبھی بھی نہیں لائے گا اب اگر اس سے ایمان صادر ہو تو اللہ تعالیٰ کی سچی خبر کا کذب لازم آئے گا اور کذب ہمارے مخالف کے ہاں بھی قبیح ہے، فعلِ قبیح سے یا جہالت لازم آئے گی یا محتاجی اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ سے محال ہیں اور محال تک کا مقتضی بھی محال ہوتا ہے تو ایسے شخص سے صدور ایمان محال لہٰذا اس کا اسے مکلّف بنانا، مکلّف بالمحال ہی ہے

دوسرا طریقہ

اس کی تفصیل کبھی بصورت علم یوں کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا تو اب اگر اس سے صدور ایمان ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا علم، جہل سے بدل جائے گا، اور یہ محال ہے اور محال کا مستلزم بھی محال ہوتا ہے

تیسرا طریقہ

ہم تیسرے طریق سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وجود ایمان کا، علم بعدم ایمان کے ساتھ پایا جانا محال ہے اس لئے کہ یہ علم تب ہوگا جب معلوم کے مطابق ہو اور علم عدم ایمان تب مطابق ہوگا اگر عدم ایمان حاصل ہو تو اگر ایمان، علم عدم ایمان کے ساتھ پایا گیا تو لازم آئے گا کہ ایمان میں موجود اور معدوم دونوں کا اجتماع ہو جائے اور یہ محال ہے۔ تو ایمان کا حکم، عدم ایمان کے علم کے باوجود ضدین کو جمع بلکہ عدم و وجود کا اجتماع ہے اور یہ تمام محال ہیں تو یہاں حکم محال کا وقوع ہوگا

نقل قدیم

چوتھا طریقہ

ہم چوتھے طریقہ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کا مکلف بنایا جن سے وہ ایمان نہ لانے کی خبر دے رہا ہے، اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر خبر کی تصدیق کی جائے تو اس کی اخبار میں یہ بھی ہے کہ وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تو وہ اس چیز کے مکلف ہوں گے کہ وہ ایمان لائیں اس پر کہ وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے اور یہ نفی واثبات کا مکلف پر جمع کرنا ہے

پانچواں طریقہ

ہم پانچویں طریقہ پر یوں کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کفار کا یہ عیب بیان فرمایا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف فعل کا ارادہ کیا۔

يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ — وہ چاہتے ہیں اللہ کا کلام بدل دیں تم فرماؤ ہرگز تم ہمارے ساتھ نہ آؤ۔ اللہ نے پہلے سے یونہی فرمادیا ہے (پ۲۶، الفتح:۱۵)

اس سے ثابت ہورہا ہے جس چیز کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کے خلاف کا ارادہ، کلام اللہ کو تبدیل کرنا ہے اور یہ ممنوع ہے تو اب ترکِ ارادہ ایمان بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت ہوگا تو ترک ایمان اور فعل ایمان دونوں پر ذمہ ٹھہرا۔

یہی تفصیلات اس مقام پر ذکر کی جاتیں ہیں اور یہ گفتگو معتزلہ کے اصول کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ سلف وخلف محققین نے معتزلہ کے اصولوں سے دفاع اور ان کے قواعد کو مٹانے کیلئے اسی پر اعتماد کیا۔ معتزلہ نے اسے توڑنے کی بڑی کوششیں وجدوجہد کی مگر وہ مطمئن کرنے والی بات نہ کہہ سکے۔ ہم اللہ کی توفیق ومدد سے ان کی وہ تمام گفتگو ودلائل نقل کررہے ہیں جو آخری ہیں۔

معتزلہ کا استدلال

معتزلہ کہتے ہیں اس آیت میں دو مقام ہیں:

پہلا مقام: اس میں بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عدمِ ایمان کا علم اور اس کی خبر، ایمان سے مانع نہیں ہوسکتی۔

دوسرا مقام: اس میں تفصیلاً عقلی جواب کی تردید ہے۔

پہلا مقام میں کئی وجوہ ہیں

۱۔قرآن ایسی آیات مبارکہ سے مالا مال ہے جو بتاتیں ہیں کہ کسی کے ایمان میں رکاوٹ نہیں، ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى — اور کس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا جب ان کے پاس ہدایت آئی (پ۱۵، الاسراء:۹۴)

یہاں استفہام انکاری ہے اور یہ واضح ہے کہ اگر کسی کو گھر میں قید کر لیا جائے کہ اس کا نکلنا ممکن ہی نہ رہے اور پھر کہے تو میری حوائج کو کیوں پورا نہیں کرتا تو ایسی بات نہایت ہی قبیح ہے اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا (پ۵، النساء:۳۹) اور ان کا کیا نقصان اگر وہ ایمان لاتے

ابلیس سے فرمایا:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (پ۸، الاعراف:۱۲) کس نے منع کیا تجھے سجدہ سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی سے کہا:

مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا (پ۱۶، طہ:۹۲) تمہیں کس بات نے روکا تھا جب تم نے انھیں گمراہ ہوتے دیکھا تھا

ارشاد الٰہی ہے:

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (پ۳۰، الانشقاق:۲۰) انہیں کیا ہے یہ ایمان نہیں لائے

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (پ۲۹، المدثر:۴۹) تو انہیں کیا ہوا نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (پ۱۰، التوبہ:۴۳) اللہ تجھے معاف فرمائے کیوں تم نے ان کو اجازت دی

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ — کیوں تم رک گئے جسے اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا (پ۲۸، التحریم:۱)

صاحب بن عباد نے اس بارے میں پوری فصل لکھی جس میں لکھا، اللہ تعالیٰ اسے ایمان کا حکم کیسے دے سکتا ہے حالانکہ اس سے منع بھی کیا ہو؟ وہ کیسے کفر سے منع فرمائے گا جبکہ اس پر شوق دلائے، وہ کیسے ایمان سے پھیر سکتا ہے جبکہ وہ فرماتا ہے اَنّٰى تُصْرَفُوْنَ؟ ان کے اندر افک (تہمت) پیدا کر کے فرمائے اَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ؟ ان میں کفر ایجاد کر کے پھر فرمائے لم تکفرون (تم کفر کیوں کرتے ہو؟) ان میں حق و باطل میں التباس کر کے پھر فرمائے:

لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (پ۳، آل عمران:۷۱) حق میں باطل کیوں ملاتے ہو

ان کا راستہ خود روکے اور پھر فرمائے

لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (پ۴، آل عمران:۹۹) کیوں اللہ کی راہ سے روکتے ہو

ان کے اور ان کے ایمان کے درمیان حائل ہو جائے پھر فرمائے

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا (پ۵، النساء:۳۹) اور ان پر کیا نقصان اگر وہ ایمان لاتے

ان سے رشد و ہدایت ختم کر دے اور پھر فرمائے

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (پ۳۰، التکویر:۲۶) پھر کدھر جاتے ہو؟

انہیں دین سے گمراہ کر دیا حتیٰ کہ انھوں نے اعراض کر لیا پھر فرمائے

فَمَالَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ تو انہیں کیا ہوا نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں

(پ۲۹، المدثر:۴۹)

۲۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

رُسُلاً مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (پ۶، النساء:۱۶۵) رسول خوشخبری دینے اور ڈر سناتے تاکہ رسل کے بعد اللہ کے ہاں لوگوں کا کوئی عذر نہ رہے

اور فرمایا:

وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۱۳۴) اور اگر ہم انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے رسول کے آنے سے پہلے تو ضرور کہتے اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پر چلتے قبل اس سے کہ ذلیل و رسوا ہوتے

جب واضح کر دیا کہ ان کا عذر سوائے اس کے کوئی نہیں جو کہ اس نے ان سے زائل کر دیا تو اگر اللہ کا ان کے کفر کا علم اور ان کے کفر کی خبر، ان کے ایمان سے مانع ہو تو یہ ان کا اعظم عذر اور عذاب سے دفاع کرنے والی سب سے بڑی وجہ ہوگی جب ایسی بات نہیں تو ہم جان لیں گے یہ مانع نہیں

۳۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں سورۂ حم سجدہ میں فرمایا کہ وہ کہتے ہیں

قُلُوْبُنَا فِیْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَ فِیْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہواور ہمارے کانوں میں پردے ہیں (پ ۲۴ حم السجدہ:۶۹)

تو اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول بطوران کی مذمت نقل کیا ہے اگراس کا علم مانع ہوتا تو وہ اس قول میں سچے قرار پاتے تو پھران کی مذمت کیوں کی گئی؟

۴۔اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد گرامی ان کی مذمت میں نازل کیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ یقیناً وہ لوگ جو کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں (پ ۱، البقرہ:۶)

یہ ان کی کفر پر مذمت، زجراور ان کے فعل کی قباحت کا بیان ہے اگران کا ایمان لانا ممنوع ہوتا اور اس پر قادر نہ ہوتے تو وہ مذمت کے مستحق ہرگز نہ قرار پاتے بلکہ وہ معذور ہوتے جیسا کہ نابینا آدمی دیکھنے سے معذور ہوتا ہے

۵۔قرآن کا مقصد نزول یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کی طرف سے ان پر حجت بنے نہ یہ کہ قرآن کو اللہ ورسول کے خلاف کفار حجت بنائیں، اگر اللہ تعالیٰ کا علم وخبران کے ایمان سے مانع ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں جب تم ہمارا کفر جانتے ہو اور اس کی خبر دے رہے ہو تو پھر ہمارا ترک کفر محال ہوگا تو ہم سے محال کا مطالبہ اور ہمیں محال کا حکم کیوں دے رہے ہو؟ اور اگر ثابت ہو جائے کہ علم وخبر مانع ہیں تو یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا جواب نہ اللہ کی طرف سے اور نہ رسول کی طرف سے ہوسکتا ہے

۶۔ارشاد الٰہی ہے

نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ تو کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار۔ (پ ۹، الانفال:۴۰)

اگر مانع کے باوجود ایمان کا حکم دیتا ہے تو وہ کہاں اچھا مولیٰ ہے بلکہ وہ تو برا مولیٰ ہوا اور یہ بات کفر ہے۔تو ان تمام وجوہات سے ثابت ہوا کہ ایمان وطاعت سے کوئی شئی مانع نہیں تو یہ یقین کرنا لازم ہے کہ اللہ کا عدم ایمان سے علم اوراس کے عدم کی خبر دینا ایمان سے ہرگز مانع نہیں

دوسرا مقام: کئی دلائل اس پر دال ہیں کہ عدم ایمان کا علم، وجود ایمان سے مانع نہیں ہوسکتا۔

۱۔اگراس طرح ہو تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شئی پر قادر ہی نہ ہو کیونکہ جس کا وقوع وہ جانتا ہے اس کا وقوع لازم اور جس کے عدم وقوع کا علم ہے اس کا وقوع ممتنع ہوگا اور لازم ہے کہ اس پر وہ قادر نہ ہو کیونکہ جب وہ خود بغیر قدرت واجب الوقوع ہے تو

قدرت حاصل ہو یا نہ وہ واجب الوقوع ہی ہوگا اور جس کی ایسی حالت ہو اس میں قدرت کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ممتنع ومحال پر ویسے ہی قدرت نہیں ہوتی تو لازم آئے گا اللہ تعالیٰ کسی شئی پر بالکل قادر ہی نہیں اور یہ بات کفر ہے تو ثابت ہوا عدم شئی کا علم اس کے امکانِ وجود کے منافی نہیں۔

۲۔علم کا تعلق معلوم کی ذات سے ہے (یعنی اس کے مطابق ہوگا) اس کا علم ممکن ہے تو ممکن اور اگر اس کا علم لازم واجب ہے تو وہ واجب ہوگا بلاشبہ ایمان وکفر بالذات ممکن الوجود ہیں، اگر علم کی وجہ سے یہ واجب الوجود ہو جائیں تو پھر علم، معلوم میں موثر ہو جائے گا اور ہم نے واضح کر دیا یہ محال ہے۔

۳۔اگر خبر وعلم مانع بنتے ہیں تو پھر بندہ کسی شئی پر قادر نہیں رہتا کیونکہ جس کا وقوع اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اس کا وقوع لازم اور واجب پہ قدرت کہاں؟ اور جس کا عدم، علم میں ہے اس کا وقوع ممتنع اور ممتنع پر قدرت نہیں لہٰذا لازم آئے گا بندہ کسی شئی پر قادر ہی نہ رہے، تو اس کی تمام حرکات وسکنات، حرکات جمادات اور حیوانات کی اضطراری حرکات کی طرح قرار پائیں گی لیکن اس کا فاسد ہونا ہم بداہۃً جانتے ہیں کیونکہ ایک آدمی دوسرے کو اینٹ مارتا ہے جس سے وہ زخمی ہوا تو اب ہم اینٹ مارنے والے کی مذمت کرتے ہیں نہ کہ اینٹ کی اور پھر ہم بداہۃً خود گرنیوالی اینٹ اور کسی انسان کے اختیاراً ماری ہوئی اینٹ میں فرق کرتے ہیں، پھر عقلاء، بداھۃً عقل سے تعریف کرنیوالی کی مدح اور طعن کرنیوالے کے ذم میں فرق پاتے ہیں آپس میں ایک دوسرے سے التماس کرتے ہیں، حکم وعتاب کرتے ہوئے کہتے ہیں یہ فعل تم نے کیوں کیا یہ فعل تم نے کیوں چھوڑا؟ تو اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ علم وخبر، فعل وترک سے مانع نہیں۔

۴۔اگر عدم کا علم، وجود سے مانع ہوتا تو کافر کیلئے اللہ تعالیٰ کا حکمِ ایمان، اپنے علم کے اعدام (معدوم کرنا) کا حکم ہوگا تو جس طرح اس کی شان کے یہ ہرگز لائق نہیں کہ وہ بندوں کو اپنی ذات اقدس کے اعدام کا حکم دے اسی طرح اس کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنے عدم کے اعدام کو حکم دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا اعدام معقول ہی نہیں لہٰذا اس کا حکم بے وقوفی اور بے فائدہ ہی ہے تو اس سے معلوم ہوا عدم کا علم، وجود سے مانع نہیں ہوتا۔

۵۔ایمان اپنی ذات وحقیقت کے اعتبار ممکنات وجائزات میں سے ہے اللہ تعالیٰ کا ممکنات وجائزات کو جاننا لازم ہے کیونکہ اگر وہ انھیں اسی طرح نہیں جانتا تو اس کا علم جہالت ہوگا اور ایسا ہونا محال ہے، جب اللہ تعالیٰ، ایمان کو ان ممکنات وجائزات سے ہی جانتا ہے جن کا وجود وعدم ممتنع نہیں اب اگر وہ علم کی وجہ سے لازم، واجب ہو جائے تو لازم آئے گا شئی واحد کا ممکن ہونا اور ممکن نہ ہونا جمع ہو جائے اور یہ محال ہے۔

۶-محال کا حکم دینا بے وقوفی اور عبث ہے، اگر شرع میں، حکم محال ہوسکتا ہے تو یہ تمام انواع سفہ میں ممکن ہوگا تو پھر معجزہ کا اظہار کاذبین کے ہاتھوں اور اباطیل واکاذیب کا انزال بھی ممتنع ومحال نہیں رہے گا اس صورت میں نبوت انبیاء کی صحت اور صحت قرآن پر وثوق واعتماد نہیں رہے گا بلکہ ان تمام کا کذب وسفہ ہونا ممکن ہوگا جب یہ باطل ہے تو ہم پر واضح ہے کہ عدم ایمان کا علم وخبر، ایمان سے مانع نہیں ہوسکتا۔

۷-اس صورت میں اگر حکم محال کا نزول جائز ہو تو نابینا کیلئے مصحف پر نقطے لگانے اور لولے کو ہوا میں اڑنے کا حکم بھی جائز ہوگا، جس کے ہاتھ و پاؤں پابند ہو پہاڑ سے پھینک دیا جائے اسے یہ کہنا جائز ہوگا کہ تو اوپر کیوں اڑ گیا جب ان چیزوں کو عقل تسلیم نہیں کرتا تو ہم نے جان لیا محال کا حکم جائز نہیں تو ثابت ہوا عدم کا علم، وجود سے مانع نہیں۔

۸-اگر ایسا حکم جاری ہوسکتا ہے تو پھر انبیاء کی بعثت جمادات کی طرف، اور ان پر انزال کتب اور انزال ملائکہ جائز ہوتا کہ ان کو ضرورت کے مطابق احکام پہنچاتے رہیں اور اس چیز کا تمسخر ہونا اور دین کو کھیل بنانا نہایت ہی مسلم ہے۔

۹-اگر وجود شئی کا علم، وجوب شی کا مقتضی ہو تو علم، قدرت وارادہ سے مستغنی ہو جائے گا تو لازم ہے اللہ تعالیٰ قادر، صاحبِ ارادہ اور مختار نہ رہے اور یہ فلاسفہ کہتے ہیں جو قول بالموجب کے قائل ہیں۔

۱۰- ایسی آیات موجود ہیں جو "تکلیف مالا یُطاق" کی نفی کرتی ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (پ۳، البقرہ:۲۸۶) اور کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (پ۱۷، الحج:۷۸) تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (پ۹، الاعراف:۱۵۷) اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا

تو حکمِ محال سے بڑھ کر کونسی مشقت وتنگی ہوسکتی ہے؟

تیسرا مقام: معتزلہ کا تفصیلی جواب

معتزلہ نے دو طریق اختیار کئے ہیں

۱-شیخ ابو علی، ابو ہاشم اور قاضی عبد الجبار کا طریق ہے جب ہم کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کے معلوم کے مخالف وقوع ہو تو اس کا علم جہالت میں تبدیل ہو جائے گا تو یہ جواباً کہتے ہیں جو کہتا ہے کہ علم جہالت سے بدل جائے گا یہ قول درست نہیں اسی طرح جو

کہتا ہے کہ نہیں تبدیل ہوگا غلط کہتا۔ ہے ہاں دونوں اقوال سے خاموشی لازم ہے۔

۲۔ یہ طریق شیخ کعبی اور شیخ ابوالحسین بصری کا مختار ہے، علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، جب بندے کا ایمان فرض کیا تو ہم نے جانا ازل میں اللہ تعالیٰ کو علم ایمان حاصل تھا اور اگر واقع میں ایمان کے بدل کفر فرض کیا تو ہم نے جانا ازل میں اللہ تعالیٰ کو ایمان کے بدل کفر کا علم تھا تو یہ ایک علم کو دوسرے علم کے بدلے فرض کرنا ہے نہ کہ علم کا تغیر ہے۔

مذکورہ دونوں جواب جمہور معتزلہ کے پسندیدہ اور معتمد ہیں۔

گمراہیوں کا باعث

یاد رہے یہ مباحث بڑی گمراہیوں کا باعث بنے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ تکالیف و نبوات کے منکرین نے کہا ہم نے اہل جبر کے دلائل کو قاطع و قوی پایا ہے، معتزلہ کے یہ دو جوابات خرافات ہی ہیں، کوئی عاقل ان کی طرف متوجہ ہی نہ ہوگا، معتزلہ کے اس پہ دلائل ہی نہیں ہیں کہ قول جبر کے ساتھ تکالیف کا معاملہ جائز نہیں بلکہ قبیح ہے اور اہل جبر نے اس کا جو جواب دیا وہ انتہائی کمزور ہے، ان دونوں کلاموں کا مجموعہ نفی تکالیف میں قوی کلام قرار پاتا ہے، جب تکالیف کا قول باطل تو نبوات کا قول بھی باطل ٹھہرے گا۔

۲۔ قرآن پر طعن کرنے والوں نے کہا، معتزلہ نے جو آیات کثیرہ سے بتایا کہ ایمان و طاعت سے کوئی مانع نہیں اس میں وہ سچے ہیں اور جو جبریہ نے کہا عدم ایمان کا علم، ایمان سے مانع ہے اس میں یہ سچے ہیں اور ان دونوں کا سچا ہونا بتلاتا ہے قرآن کا نزول عقل کے مخالف اور ضد ہے اور یہ قرآن پر سب سے بڑا طعن اور قوی اعتراض و جرح ہے۔

۳۔ پھر ان میں سے کچھ نے مانا ہے کہ یہ قرآن وہی ہے جو حضور ﷺ لائے، لیکن پھر اس پر طعن کرتے ہیں، روافض میں سے کچھ نے کہا یہ وہ قرآن نہیں جو رسول اللہ ﷺ لائے بلکہ یہ اور ہے اور وہ بدل دیا گیا ہے اور اس پر دلیل یہی ہے کہ یہ ان تناقضات پر مشتمل ہے جو اہلِ جبر و اہلِ قدر کے درمیان بصورت مناظرہ ظاہر ہوتے ہیں۔

۴۔ نظر و استدلال پر طعن کرنے والے مقلدین نے اسی مناظرہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا، اگر ہم دلائل عقلیہ سے استدلال جائز رکھیں تو اس مناظرہ کے سبب تکلیف و نبوت پر طعن لازم آئے گا کیونکہ اہل جبر کی گفتگو، اثبات جبر میں انتہائی قوی ہے اور اہل قدر کی گفتگو اس بیان میں انتہائی قوی ہے کہ جب جبر ثابت ہوگا تو تکلیف بالکل باطل ہو جائے گی تو ان دونوں کے مجموعہ سے قرآن، تکلیف اور نبوت پر بہت بڑے اشتباہ نے جنم لیا تو ثابت ہوا عقلیات کی طرف رجوع کفر و گمراہی پیدا کرتا ہے اسی وجہ سے محاورہ ہے جو علم کلام میں کھو گیا وہ زندیق بن گیا۔

۵۔ ہشام بن حکم نے کہا، اللہ تعالیٰ وقوع اشیاء سے پہلے ان کا علم نہیں رکھتا اور وہ اللہ تعالیٰ پر بدا (پہلے علم نہ ہونا) کا قائل ہے۔
اس نے کہا ارشاد گرامی:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (پ۱، البقرہ:۶) تحقیق جو لوگ کافر ہیں ان کیلئے برابر ہے کہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں

اسی طرح استدلال ہے جیسے کوئی ظنی دلیل سے ہوتا ہے تو یہاں مذکور کے مخالف بھی ہو سکتا ہے، انہوں نے یہ قول سابقہ اشکالات سے فرار کی بنا پر اختیار کیا ہے۔

دونوں جوابات کی تردید

واضح ہو معتزلہ سے مروی دلائل ایسے کلمات ہیں جن کا تعلق واضح جواب سے نہیں بلکہ وہ محض تشنیعات وطعن ہیں، جن دو جوابات پر ان کا اعتماد ہے وہ بھی نہایت ہی ضعیف ہیں، شیخ ابو علی، ابو ہشام اور قاضی عبد الجبار کا قول ''جو انقلاب علم مانتا'' اور جو انقلاب نہیں مانتا، دونوں غلط ہیں، اگر اس سے ان کی مراد دونوں اقسام کے فساد کا حکم ہے تو یہ فساد نفی واثبات کا حکم ہوگا اور اسے عقل پسند نہیں کرتا اور اگر معنی یہ ہے ان دونوں میں سے ایک حق ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ حق اس انقلاب پر دال ہے یا دال نہیں تو اس کے رد کیلئے وجہ استدلال کی تقریر کافی ہے کہ ہم نے یہ بیان کیا کہ عدم کا علم، عدم کے ساتھ ہی حاصل ہوگا اب اگر عدم کے ساتھ وجود حاصل ہو تو یہ وجود وعدم کا اجتماع ہے تو اس تفصیل سے زیادہ واضح گفتگو اور اس سے کم مقدمات نہیں لائے جا سکتے۔

قول کعبی کا رد

شیخ کعبی کا قول بھی انتہائی کمزور ہے اس لئے کہ اگرچہ ہم نہیں جان سکتے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں وجود ایمان کا عالم تھا یا عدم ایمان کا، لیکن ہم یہ تو جانتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا علم ضرور حاصل تھا اور وہی اب ہے، اب اگر دو متضاد میں سے ایک کے علم کے ساتھ دوسری نقیض کا بھی علم ہے تو اجتماع نقیض لازم اور اگر کہا جائے کہ وہ علم باقی نہیں رہا تو یہ تسلیم کرنا ہے کہ علم جہالت سے بدل گیا
دلائل معنوی وعقلی کا ذکر پہلے آ چکا اس سلسلہ میں کچھ امور اقناعیہ (خاموش کر دینے والے) کا ذکر ضروری ہے اور وہ پانچ ہیں

پانچ اُمور اقناعیہ

۱۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں معاذ بن معاذ عنبری سے نقل کیا کہ میں عمرو بن عبید کے پاس تھا، ایک آدمی نے کہا: اے ابوعثمان! اللہ کی قسم آج میں نے کفر سنا، فرمایا، کفر میں جلدی نہ کرو تم نے کیا سنا، میں نے ہاشم کو یہ تلاوت کرتے سنا۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ (پ۳۰، اللہب:۱)

تباہ ہو جائے ابولہب کے دونوں ہاتھ

ذَرْنِىْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ (پ۲۹، المدثر:۱۱ تا ۲۷)

اسے مجھ پر چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ اور اسے وسیع مال دیا اور سامنے حاضر رہتے بیٹے دیے اور میں نے اس اکیلے کی طرح طرح کی تیاریاں کیں پھر یہ طمع کرتا ہے کہ میں اور زیادہ دوں ہرگز نہیں وہ تو میری آیتوں سے عناد رکھتا ہے قریب ہے کہ میں اسے آگ کے پہاڑ صعود پر چڑھا دوں اس نے سوچا اور دل میں کوئی بات ٹھہرائی نظر اٹھا کر دیکھا پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑا پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا پھر بولا یہ تو وہی جادو ہے اگلوں سے سیکھا یہ نہیں مگر آدمی کا کلام کوئی دم جاتا ہے کہ میں اسے دوزخ میں دھنساتا ہوں اور تم نے کیا جانا کہ دوزخ کیا ہے

تک پڑھا اور کہا یہ اُم الکتاب میں نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (پ۲۵، الزخرف ۱تا۴)

روشن کتاب کی قسم ہم نے اسے عربی قرآن اُتارا کہ تم سمجھو اور یقیناً وہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ضرور بلندی و حکمت والا ہے

یہ کفر ہی تو ہے عمرو بن عبید تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، اللہ کی قسم اگر بات اسی طرح ہے تو ابو لہب پر ملامت ختم، ولید پر ملامت ختم، اس آدمی نے سن کر کہا۔ اے ابوعثمان، تم یہ کہتے ہو، اللہ کی قسم معاذ نے یہی کہا تو وہ اسلام کیساتھ داخل ہوا اور کفر کے ساتھ خارج ہوا۔

یہ بھی منقول ہے کہ عمرو بن عبید کے پاس آدمی نے آکر تلاوت کی:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (پ۳۰، البروج:۶۲)

بلکہ یہ بزرگی والا قرآن لوح میں محفوظ ہے

اور کہنے لگا مجھے ''تبت'' کے بارے میں بتاؤ کیا یہ لوح محفوظ میں تھا؟ عمرو نے کہا ایسے نہیں تھا، ہاں یوں تھا وہ ہلاک ہو جائے

جس نے ابولہب والا عمل کیا، آدمی کہنے لگا تو پھر نماز میں ہمیں اسی طرح پڑھنا چاہیے تو اس پر عمرو ناراض ہوئے اور کہا اللہ کا علم شیطان نہیں کہ اور نہ ہی اللہ کا علم نقصان دہ اور نافع ہے تو یہ حکایت بتا رہی ہے کہ عمرو بن عبید کو صحت قرآن میں شک تھا۔

۲۔ قاضی عبدالجبار نے طبقات معتزلہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، ایک آدمی نے آکر ان سے کہا، ابوعبدالرحمٰن، کچھ لوگ زنا، چوری، شراب اور ناحق قتل کر کے کہتے ہیں یہ اللہ کے علم میں تھا تو ہم اس سے چھٹکارا پا نہیں سکتے تو وہ ناراض ہوئے اور پڑھا: سبحان الله العظیم۔ یہ اللہ کے علم میں تھا لیکن اس فعل کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب نہیں دی، میرے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا اللہ تعالیٰ کا علم تمہارے اندر تم پر آسمان سایہ دار اور نیچے زمین کی طرح ہے جس طرح تم میں آسمان اور زمین سے نکلنے کی طاقت نہیں اسی طرح تم علم الٰہی سے نہیں نکل سکتے اور جس طرح آسمان وزمین تمھیں گناہوں پر نہیں ابھارتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم تمہیں اس پر نہیں ابھارتا۔

اہل جبر وقدر نے بہت سی روایات ذکر کیں ہیں، اس روایت سے غرض یہ واضح کرنا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات نہیں فرما سکتے کیونکہ اس میں تناقض وفساد ہے، متناقض اس لئے کہ تم علم الٰہی سے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ صراحۃً جبر اور ماقبل صراحۃً قدر ہونے کی وجہ سے متناقص ہے، فاسد اس لئے کہ ہم نے واضح کر دیا عدم ایمان اور وجود ایمان کا علم آپس میں متنافی ہے باوجود عدم ایمان کے علم، ایمان کا حکم، نفی واثبات کے اجتماع کا حکم وتکلیف ہے رہے آسمان وزمین تو ان کے عمل میں منافات نہیں تو ظاہر ہو گیا ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ جاہل یا متجاہل ہی دے سکتا ہے، منصب رسالت اس سے کہیں بلند ہے۔

۳۔ دو مشہور احادیث

پہلی حدیث: امام بخاری اور امام مسلم: حضرت اعمش از زید بن وھب از حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق مصدوق نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے خلق کو بطن ماں میں چالیس دن نطفہ کی صورت میں پھر اسے علقہ کے طور پر چالیس دن پھر مضغہ کے طور پر چالیس دن رکھتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اسے چار امور کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ اس کا رزق، موت، عمل اور اس کا شقی یا سعید ہونا لکھ دیتا ہے اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں کوئی اہل جنت والے عمل کرے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ ہو تو تقدیر غالب آجائے گی تو اہل دوزخ والے عمل کر کے وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا، اگر تم میں کوئی اہل دوزخ والے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جائے تو اس پر تقدیر کا فیصلہ غالب آئے تو وہ اہل دوزخ والے عمل کر کے دوزخ میں داخل ہو جائے گا۔

(البخاری، ۳۲۰۸)

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں عمرو بن عبید سے نقل کیا اگر تم اعمش سے سنتے تو وہ کہتے یہ جھوٹ ہے، اگر تم زید بن وہب سے سنتے تو وہ کہتے میں نے یہ جواب نہیں دیا اگر تم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھتے تو فرماتے میں نے یہ بات نہیں کی اگر تم رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے تو آپ ﷺ اس کی تردید فرماتے اگر تم اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے وہ فرماتے ہم نے اس پر تم سے میثاق و وعدہ نہیں لیا۔

مناظرہ حضرت آدم وموسیٰ علیہما السلام

دوسری حدیث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا، تم نے لوگوں کو بدبخت بنایا اور انہیں جنت سے نکلوا دیا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام سے نوازا، تم پر تورات نازل کی، کیا تم مجھ پر اللہ کی تقدیر نہیں مانتے؟ کہا مانتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ (البخاری: ۳۴۰۹)

معتزلہ کے اعتراضات

معتزلہ نے اس روایت پر متعدد اعتراضات کئے ہیں:

۱۔ یہ خبر تقاضا کر رہی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم کے صغیرہ کی وجہ سے ان پر ذم کیا اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جاہل کہنا ہے اور یہ ہرگز جائز نہیں۔

۲۔ اولاد، والد کے ساتھ اس قدر سخت الفاظ سے گفتگو نہیں کر سکتی۔

۳۔ ان کے یہ الفاظ، ''تم نے لوگوں کو شقی بنوایا اور جنت سے نکلوایا'' نہیں ہو سکتے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے ہیں لوگوں کی شقاوت اور ان کا جنت سے نکلنا حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نکالا۔

۴۔ حضرت آدم علیہ السلام کا استدلال حجت نہیں بن سکتا اگر یہ حجت ہے تو پھر فرعون، ہامان اور باقی تمام کفار اسی کو بطور حجت پیش کر سکتے ہیں حالانکہ یہ باطل ہے تو اس کا حجت ہونا فاسد ٹھہرا۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کی رائے کو صواب اور درست قرار دیا حالانکہ ہم نے واضح کر دیا کہ یہ صواب نہیں جب یہ حقائق ہیں تو حدیث کو ان امور میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا۔

۱۔ حضور ﷺ نے یہ واقعہ یہود سے نقل کیا نہ تو یہ اللہ تعالیٰ سے ہے اور نہ اپنی طرف سے نقل کیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے بطور حکایت بیان کیا مگر راوی صحابی نے اگلا حصہ ہی سنا تھا تو گمان کر لیا حضور ﷺ نے اپنی طرف سے بیان کیا نہ کہ یہود سے بطور حکایت

۲۔ فرمایا: فحج آدم، آدم منصوب ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام پر غالب آ گئے اور ان کی دلیل حجت بنی اور حضرت آدم کی بات نہ حجت بنی اور نہ ہی عذر۔

۳۔ مختار و معتمد یہی ہے کہ یہاں مناظرہ معصیت پر ذم میں نہیں اور نہ ہی علم الٰہی کو بطور عذر پیش کیا گیا ہے، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ سبب پوچھا جس کی وجہ سے وہ لغزش کا شکار ہوئے اور اس کی بنا پر جنت سے نکلے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا میرا جنت سے نکلنا اس لغزش کے سبب نہ تھا بلکہ اس سبب سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں لکھ دیا تھا کہ جنت سے زمین کی طرف نکالا جائے گا اور مجھے زمین میں خلیفہ بنایا جانا تھا یہی بات تورات میں لکھی گئی تھی تو حضرت آدم علیہ السلام کی دلیل قوی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس میں مغلوب کی طرح ٹھہرے۔

واضح رہے اس مسئلہ میں کلام طویل ہے اور قرآن اس سے مالا مال ہے اور ہم اس تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کامل گفتگو کریں گے، یہاں جو کچھ ذکر ہوا یہی کافی ہے۔

[۷] خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۷

(اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے)

سابقہ آیت سے تعلق

جب پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اس آیت میں وہ سبب بتایا جس کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لائے اور وہ ہے مہر کا لگ جانا

چند مسائل

پہلا مسئلہ: ختم (مہر لگانا) والکتم (ڈھانپنا) دونوں ہم معنی ہیں، کسی شئی کو پختہ اور باعتماد کرنے کیلئے ڈھانپ کر اسے مہر لگائی جاتی ہے تاکہ مخفی ہو جائے اور اس تک کسی کی رسائی نہ ہو یا اس پر کوئی مطلع نہ ہونے پائے، غشاوۃ، (پردہ) غشاء سے فعالۃ کا وزن ہے یہ وزن کسی شئی پر مشتمل ہونے پر دال ہوتا ہے۔ عصابہ، عمامہ۔

دوسرا مسئلہ: ختم کے معانی

اس کے معنی میں لوگوں کا اختلاف ہے جو قائل ہیں کہ بندوں کے افعال کا اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے یہ کلام وگفتگو ان کے مذہب پر ظاہر و واضح ہے۔

دو اقوال

پھر ان کے دو اقوال ہیں:

۱۔ بعض نے کہا کفار کے دلوں میں کفر کی تخلیق، ختم و مہر ہے۔

۲۔ ختم، اس داعیہ کا پیدا کرنا ہے جو قدرت کے ساتھ ملے تو مجموعہ قدرت، وقوع کفر کا موجب بنے۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ کفر پر قادر اس کے ترک پر قادر ہوگا یا نہیں ہوگا، اگر ترک کفر پر قادر نہیں تو کفر پر قدرت موجبِ کفر ہو گی تو کفر پر خلق قدرت، خلق کفر کی مقتضی ہوئی۔

اور اگر ترک کفر پر قادر ہے تو قدرت کی نسبت فعل کفر اور ترک کفر کے ساتھ برابر ہوئی، اب قدرت کا ترک کے عوض، فعل کا ماخذ بننا کسی دوسرے ایسے انضمام پر موقوف ہے جو اس کا مرجع ہو یا موقوف نہیں، اگر موقوف نہیں تو ممکن کا وقوع بلا مرجع لازم، اور اسے جائز قرار دینا ممکن سے موثر پر استدلال فاسد ہونے کا مقتضی ہوگا، جو صانع کی نفی کا تقاضا کرے اور یہ محال ہے۔

اور یا وہ کسی مرجع پر موقوف ہوگا اب وہ مرجع اللہ تعالیٰ کا فعل ہے یا بندے کا فعل یا نہ اللہ کا فعل اور نہ بندے کا، یہ جائز نہیں کہ بندے کا فعل ہو ورنہ تسلسل لازم آئے گا جو باطل ہے یہ بھی جائز نہیں کہ نہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہو اور نہ بندے کا کیونکہ اس سے شئی کی تخلیق بلا موثر لازم آئے گی اور اس سے صانع کے وجود کا قول باطل ٹھہرے گا تو ثابت ہوا کہ قدرت عبد کا مقدور معین کرنے کیلئے جائے صدور بننا اس پر موقوف ہے کہ اس کے ساتھ مرجع منقسم ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔

اب سنئے جب وہ مرجع اس قدرت کے ساتھ ملا تو اب قدرت کی تاثیر اس اثر میں لازم ہوگی یا جائز یا محال و ممتنع، دوسری و تیسری صورت باطل لہٰذا اول ہی صورت ہوگی، وہ جائز اس لئے نہیں ہوسکتی اگر وہ جائز ہو تو عقلاً یہ درست ہوگا کہ وہ مجموعہ قدرت مع مرجع بعض اوقات اس اثر کے ساتھ ہو اور کبھی اس اثر سے جدا ہو البتہ ہم اس کا وقوع فرض کرلیں گے کیونکہ ہر جائز کے فرض وقوع سے محال لازم نہیں آتا تو اس مجموعہ پر کبھی اثر مرتب ہوگا اور کبھی اس پر اثر مرتب نہ ہوگا۔ ایک وقت کا اختصاص جس پر اثر مرتب ہو رہا ہے یہ کسی دوسرے قرینہ کے انضمام پر موقوف ہے یا موقوف نہیں، اگر موقوف ہے تو موثر یہ تمام مجموعہ ہوا جس میں

زائد قرینہ بھی شامل ہے نہ کہ فقط مجموعہ، حالانکہ ہم نے اس کے خلاف اس مجموعہ کو ہی مستقل فرض کیا ہوا تھا، اسی طرح دوسرے مجموعہ میں بھی یہی تقسیم جاری ہوگی کہ وہ قید آخر پر موقوف ہے تو تسلسل جو محال ہے اور اگر موقوف نہیں تو اب کبھی مجموعہ کا حصول، اثر کیلئے جائے صدور ہوگا اور کسی وقت نہ ہوگا حالانکہ ایک وقت دوسرے سے کسی بھی معاملہ میں ممتاز و جدا نہیں تو اس سے ترجیح ممکن بغیر مرجح لازم آئے گی جو محال ہے تو ثابت ہوا اس مرجح کے حصول کے وقت، اثر کے صدور کا جائز ہونا محال ہے، رہا اس کا ممتنع نہ ہونا یہ ظاہر ہے ورنہ مرجح وجود، عدم کا مرجح بن جائے گا جو محال ہے جب دونوں صورتیں باطل ہوئیں تو ثابت ہو گیا بوقت حصول مرجح وجود، قدرت اور اس مرجح کے مجموعہ سے جو اثر ہوگا وہ واجب الوجود ہی ہوگا، اس کے ثبوت سے قول جبر لازم آ جائے گا کیونکہ اس مرجح کے حصول سے پہلے صدور فعل ممتنع تھا اور حصول مرجح کے بعد صدور لازم، جب یہ حقائق تم نے سمجھ لئے تو اب توجہ سے سنیے۔

داعیہ موجب کفر کا دل میں پیدا کرنا، دل پر مہر اور اسے قبول ایمان سے روکنا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ حکم لگایا "لَا يُؤْمِنُوْنَ" (یہ ایمان نہیں لائیں گے) تو اس کے بعد اس کا سبب و موجب بیان فرمایا کیونکہ علت کا علم، معلول کے علم کیلئے مفید ہوتا ہے اور معلول کا علم، علت کے علم کے بغیر کامل نہیں ہوتا۔

یہ ان لوگوں کی گفتگو ہے جو تمام حوادثات کا خالق اللہ تعالیٰ کو ہی جانتے ہیں۔

معتزلہ کی رائے اور دلائل

معتزلہ کہتے ہیں اس آیت مبارکہ کو منع ایمان پر جاری کرنا ہرگز جائز نہیں اور ان کے کچھ دلائل کا تذکرہ آیت اولیٰ کے تحت ہم نے ذکر کئے یہاں کچھ اضافی بات انھوں نے یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی تکذیب و تردید فرمائی جنھوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے اور بوجھ ہیں جو ہمیں ایمان سے روکتے ہیں۔ مثلاً:

وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (پ٦، النساء:١٥٥)

اور ان کا کہنا کہ ہمارے دلوں پر پردہ ہے بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ (پ٢٤، فصلت:٤،٥)

اعراض کریں ان سے اکثر نہیں سنتے اور انہوں نے کہا ہمارے دل پردوں میں ہیں جس طرف ہم کو تم بلاتے ہیں

یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اس دعوے پر طعن و عیب ہے کہ انھیں ایمان سے روک دیا گیا ہے۔

لہٰذا انھوں نے کہا ختم وغشا کو دیگر معانی پر محمول کرنا ضروری ہے۔

متعدد معانی کا تذکرہ

تو انہوں نے اس میں متعدد وجوہات ذکر کیں ہیں

۱۔ جب ان لوگوں نے اعراض کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دلائل سے رہنمائی ترک کر دی حتیٰ کہ یہ ان کیلئے بطور طبع اور مہر لگنے کی طرح ہو گئے تو ان کا حال ایسے لوگوں کے مشابہ ہو گیا جنہیں کسی شئی سے روک و منع کر دیا گیا ہو اس طرح ان کی آنکھوں کا معاملہ ہے گویا وہ مسدود اور بند ہو گئی ہیں کہ کوئی شئی دیکھتی ہی نہیں، گویا ان کے کانوں پر پردے ہیں کہ نصیحت سنتے ہی نہیں، باقی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ ان کا یہ وصف و حال پختہ اور قوی ہونے میں خلقی شئی کی طرح تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ (پ۶، النساء:۱۵۵)
بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو ایمان نہیں لاتے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (پ۳۰، المطففین:۱۴)
ہرگز نہیں ان کے دلوں پر ان کی کمائیوں نے رنگ چڑھا دیا

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ (پ۱۰، التوبہ:۷۷)
تو ان کے پیچھے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا اس دن تک کہ اس سے ملیں۔

۲۔ صحت اضافت کیلئے ادنیٰ نسبت کافی ہوتی ہے اصلاً مہر لگانیوالا شیطان یا کافر ہی ہے مگر چونکہ قدرت اللہ تعالیٰ نے ہی اسے دی ہے تو ختم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی جیسا کہ فعل کی نسبت سبب کی طرف کر دی جاتی ہے

۳۔ انھوں نے جب غور و فکر سے اعراض کیا اور نصیحت کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور یہ تمام اللہ تعالیٰ کے نزول دلائل کے موقع پر ہوا تو جو کچھ انھوں نے کہا اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی کیونکہ ان سے اس کا صدور دلائل کے وقت ہی ہوا جیسے کہ سورۂ برات میں ارشاد ہے

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (پ۱۱، التوبہ:۱۲۵)
بڑھا دی ان کی پلیدی پر پلیدی

یعنی اس کی وجہ سے ان کے کفر میں اور اضافہ ہوا۔

۴۔ وہ کفر میں یہاں تک چلے گئے کہ اب تحصیل ایمان میں فقط جبر وقہر ہی ہوسکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید نہیں کی تا کہ تکلیف کا بطلان لازم نہ آئے تو ترک جبر وقہر کو لفظ ختم سے تعبیر کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ وہ درجہ کفر میں یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ اب جبر کے علاوہ وہ اس سے واپس نہیں آسکتے اور یہ ان کے گمراہی کے آخری گڑھے میں گر جانے کا بیان ہے۔

۵۔ کفار بطور ضد وہٹ دھرمی جو کچھ کہتے یہ اس کا بیان ہے۔

قُلُوْبُنَا فِیْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَ فِیْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِكَ حِجَابٌ (پ ۲۴، فصلت: ۵)

ہمارے دل غلاف میں ہیں جس بات کی طرف تم بلاتے ہو اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان روک ہے

حکایت تحکم وسینہ زوری کی نظیر یوں بھی ہے:

لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ (پ ۳۰، البینہ: ۱)

کتابی کافر اور مشرک اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں تھے جب تک ان کے پاس روشن دلیل نہ آئے

۶۔ کفار کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر کا معنی ان کے خلاف اس کی شہادت ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ان کے دل نصیحت کو محفوظ اور حق قبول نہیں کریں گے اور ان کے کان حق سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں گے جیسے آدمی ساتھی سے کہتا ہے: ارید ان تختم علی ما یقوله فلان۔ (یعنی تو اس کی تصدیق کر کے کہو یہ حق ہے) تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں خبر دی ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس آیت میں بتایا کہ میں اس کا اعلان وشہادت دے رہا ہوں۔

۷۔ بعض نے کہا یہ آیت مخصوص کفار کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا میں بطور عذاب مہر لگا دی جیسے بہت سے کفار پر دنیا میں عذاب آئے، ارشاد الٰہی ہے:

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـئِیْنَ (پ ۱، البقرہ: ۶۵)

اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے کہ تم میں وہ جنہوں نے ہفتہ کو سرکشی کی تو ہم نے ان سے فرمایا ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے

یہ بھی فرمایا

فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (پ ۶، المائدہ: ۲۶)

وہ زمین ان پر چالیس برس تک حرام ہے بھٹکے پھریں زمین میں تو تم ان بے حکموں پر افسوس نہ کھاؤ

اور اسی طرح کے دیگر عذاب جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی اصلاح وعبرت کے لئے دنیا میں ہی بھیج دیئے تو اسی طرح ان پر مہر ختم

لگانے کا بھی معاملہ ہے البتہ اس کی وجہ سے وہ یہاں تک پہنچ گئے کہ بات سمجھتے ہی نہیں تو ان سے تکلیف اسی طرح ساقط ہوگی جیسے مسخ شدہ لوگوں سے ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے تکلیف ساقط فرما دیتا ہے جن کی عقل پوری نہیں ہوتی مثلاً قریب البلوغ، اور ہم اس کے ہرگز منکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ قلوب کفار میں ایسا مانع پیدا فرما دے جو فہم و عبرت سے رکاوٹ بن جائے جبکہ وہ ان کے لئے یہی اصلح و بہتر جانتا ہو جیسا کہ ان کے عقول ختم اور ان کی آنکھیں اندھی فرما دیتا ہے لیکن اس حال میں وہ مکلّف نہیں ہوں گے

۸۔ یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈال دے لیکن وہ ان کے اور ایمان کے درمیان حائل نہ ہو بلکہ یہ بلادت کی طرح انسان کے دل میں، تنکا کی طرح آنکھوں میں اور کانوں میں آواز کی طرح ہو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یوں اس لئے کیا تا کہ ان کے سینے تنگ اور کرب و غم سے بھرپور ہو کر ان کے لئے سزا اور ایمان سے مانع ہوں جیسا کہ اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تو وہ پھرتے ہی رہے۔

پھر یہ فعل بعض کفار کے ساتھ ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور نشان و دلیل ہے جیسا کہ بصورت رجز قوم فرعون پر عذاب نازل ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مدد و معافی مانگی اور یہ تمام اس سے مقید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بندوں کیلئے بہتر و اصلح جانتا ہے

۹۔ ممکن ہے یہ مہر و ختم ان پر آخرت میں ہو جیسا کہ ان کے بارے میں اطلاع دی کہ یہ وہاں اندھے ہوں گے، فرمایا:

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَصُمًّا	(پ۱۵، الاسراء:۹۷)	اور ہم انہیں قیامت کے دن منہ کے بل اٹھائیں گے اندھے اور گونگے اور بہرے

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا	(پ۱۶، طٰہٰ:۱۰۲)	اور ہم اس دن مجرمین کو نیلی آنکھوں کے ساتھ اُٹھائیں گے

یہ بھی فرمایا:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ	(پ۲۳، یٰسین:۶۵)	آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے
لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُوْنَ	(پ۱۷، الانبیاء:۱۰۰)	وہ اس میں رینگیں گے اور وہ اس میں کچھ نہیں سنیں گے

۱۰۔ اسے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ نے نقل کیا: شیخ ابو علی جبائی، اور قاضی عبد الجبار کا مختار بھی یہی ہے اس سے مراد ایسی علامت و نشان ہے جو قلبِ کفار اور ان کی سماعت پر لگایا تا کہ ملائکہ محسوس کر لیں یہ کفار ہیں اور یہ ہمیشہ ایمان نہیں لائیں گے

کوئی بعید نہیں کہ اہل ایمان کے دل میں ایسی علامت ہو جن کے ذریعے فرشتے جانتے ہوں کہ اللہ کے ہاں یہ مومن ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (پ۲۸، المجادلہ:۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے اللہ نے ایمان ان کے دلوں میں ثبت کردیا تو پھر ملائکہ ان سے محبت کرتے ہوئے ان کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں جبکہ علامتِ قلوب کفار سے اللہ کے ہاں ملعون ہونا جان کر ان سے نفرت اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔

اس علامت کا فائدہ

اس علامت کا فائدہ یا تو ملائکہ کیلئے ہے کہ جب وہ اس کے ذریعے ان کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کافر و ملعون ہونا جان لیتے ہیں تو ان سے کفر کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں یا مکلفین کو فائدہ ہے جب انھیں علم ہوگا کہ ایمان لانے کی وجہ سے ان سے تمام اہل آسماں محبت کریں گے تو انہیں ایمان لانے کا شوق ہوگا اور اگر کفر کیا تو ملائکہ اسے جان کر ان سے نفرت اور ان پر لعنت کریں گے تو یہ کفر پر زجر و توبیخ بن جائے گا۔

مُہر: ایمان سے مانع نہیں

انہوں نے کہا کہ یہ مہر کا یوں لگنا، ایمان لانے میں رکاوٹ نہیں بنتا کیونکہ ہر خط پر مہر لگانے کے بعد بھی اسے کھول کر پڑھ سکتے ہیں دوسرا یہ کہ مہر ایسے ہی ہے جیسے کافر کی پیشانی پر کافر لکھ دیا جائے تو یہ ایمان لانے میں رکاوٹ نہیں ہوتا تو ایسے ہی معاملہ یہاں ہے تو اس کافر کے لئے اس علامت کا زائل کرنا یوں ممکن ہے کہ وہ ایمان لے آئے اور کفر ترک کردے۔

قلب و سمع کی تخصیص کیوں؟

یہاں قلب و سمع کو مخصوص کرنے کی وجہ اہل تفسیر نے یہ بیان کی ہے کہ دلائل سمعیہ (شرعیہ نقلیہ) کا فہم و علم سمع سے اور دلائل عقلیہ کا استفادہ قلب سے ہوتا ہے اس لئے انھی کا تذکرہ کیا۔

سوال: غشاوۃ فی البصر (آنکھوں پر پردہ) کا معنی بھی علامت کر لینا چاہیئے تھا؟

جواب: ہم ایسا نہیں کر سکتے، قلب و سمع کی مہر سے علامت و نشان ہم نے مراد لیا تو وہاں لغت کا یہ تقاضا ہے اور کوئی رکاوٹ بھی نہیں تو وہاں یہ معنی لے لیا مگر غشاوۃ کی حقیقت، وہ پردہ ہے جو دیکھنے سے مانع ہو اور حالت کفار اس کے مخالف تھی لہٰذا اسے مجاز پر ہی محمول کیا جائے گا اور وہ ان کے حال کو ایسے لوگوں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جو آنکھوں سے ہدایت کا نفع حاصل کرتے ہیں۔

اس مقام پر تمام اقوال کا مجموعہ یہی ہے۔

تیسرا مسئلہ: لفظ ختم کے قریب المعنیٰ الفاظ

قرآن کریم میں لفظ ختم کے معناً قریب یہ الفاظ بھی وارد ہیں، طبع، کنان، رین علی القلب، وقر فی الاذان، غشاوۃ فی البصر، البتہ آیات میں مختلف انداز میں ان کا ورود و نزول ہے۔

پہلی قسم: ان آیات میں ان اشیاء کے حصول پر دلالت ہے، ارشاد مبارک ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (پ۳۰، المطففین:۱۴) ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ ہے

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ آذَانِهِمْ وَقْرًا (پ۹، الانعام:۲۵) اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے چڑھا دیے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کان بہرے ہیں

وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (پ۱۰، التوبہ:۸۷) اور مہر لگا دی ان کے دلوں پر

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (پ۵، النساء:۱۵۵) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب مہر لگا دی

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (پ۲۴، فصلت:۴) ان سے اکثر روگردانی کرتے ہیں اور نہیں سنتے

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (پ۲۳، یٰسین:۷۰) تاکہ اسے ڈرائے جو زندہ ہیں

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (پ۲۰، النمل:۸۰) بیشک تمہارے سنائے نہیں سنتے مردے اور نہ تمہارے سنائے بہرے پکار سنیں

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (پ۱۴، النحل:۲۱) مردے ہیں زندہ نہیں

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (پ۱، البقرہ:۱۰۷) ان کے دلوں میں بیماری ہے

دوسری قسم: ان میں اس پر دلالت ہے کہ یہ ایمان سے ہرگز مانع ورکاوٹ نہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا (پ۱۵، الاسراء:۹۴) اور کس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (پ۱۵، الکہف:۲۹) جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (پ۳، البقرہ:۲۸۶) اور کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ — تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی

(پ۱۷،الحج،۷۸)

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ (پ۱، البقرہ:۲۸) بھلاتم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے

لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (پ۳، ال عمران:۷۱) حق میں باطل کیوں ملاتے ہو

قرآن ان دونوں اقسام سے خوب مالا مال ہے، ہر طائفہ نے ان سے استدلال کیا ہے تو فریقین کی طرف سے ہونے کی وجہ سے دلائل سمعیہ مقامِ تعارض پر ہیں، رہے دلائل عقلیہ تو ان کی طرف سے اشارہ گزر چکا ہے۔

الغرض یہ مسئلہ مسائل اسلامیہ میں اعظم، اس کے شعبہ جات اکثر اور اس میں شغف اشد ہے۔

امام ابوالقاسم انصاری کا قول

امام ابوالقاسم انصاری سے اس مسئلہ کے حوالے سے تکفیرِ معتزلہ کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا:

لا لانهم نزهوه — ہرگز کافر نہیں کیونکہ ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کا ان سے پاک ومنزہ قرار دینا ہے

پھر اہل سنت کے بارے میں یہی سوال ہوا تو فرمایا

لا لا نهم عظموه — ہرگز کافر نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی خاطر ایسا کہتے ہیں

معنی یہ ہے کہ دونوں فریق کا مقصد ومطلوب، اللہ تعالیٰ کا جلال وکبریائی کا اثبات ہے البتہ اہلِ سنت کی نظر عظمت پر ہوئی تو انھوں نے کہا موجد وخالق ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے سوا کوئی موجد نہیں، معتزلہ کی نگاہ حکمت پہ گئی تو انھوں نے کہہ دیا یہ قبائح بارگاہِ جلال کے شایانِ شاں نہیں۔

ایک اور راز

ہماری رائے میں یہاں یہ راز بھی ہوسکتا ہے کہ اثباتِ الٰہ قول بالجبر کی طرف مجبور کرتا ہے اس لئے کہ اگر فاعل ہونا، داعیہ پر موقوف نہ ہو تو ممکن کا وقوع بلا مرجح لازم آئے گا اور یہ صانع کی نفی ہے اور اگر داعیہ پر موقوف ہے تو جبر لازم، اور اثبات رسول قول بالقدر کی طرف مجبور کرتا ہے۔

بلکہ یہاں اور ایک راز ہے جو ان تمام سے بلند ہے اور وہ یہ ہے اگر ہم فطرت سلیمہ اور عقل اول کی طرف رجوع کریں تو ہم

دیکھتے ہیں جس کا وجود و عدم مساوی ہے تو ان میں سے کس ایک کو مرجح کی وجہ سے ہی ترجیح ہوگی اور یہ جبر کا مقتضی ہے پھر ہم حرکات اختیاریہ اور حرکات اضطراریہ میں نہایت واضح فرق پاتے ہیں، اس طرح مدح کے حسن، قبح کے ذم اور امر و نہی میں یقینی طور پر فرق پاتے ہیں تو اس کا تقاضا معتزلہ کا قول ہے۔

گویا یہ مسئلہ باعتبار علوم ضروریہ و علوم نظریہ باعتبار اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے پیشِ نظر اس کی تعظیم، باعتبار اس کی توحید و تنزیہ اور باعتبار دلائل سمعیہ محل تعارض میں آ گیا ہے تو ان ماخذ، جن کی ہم نے تفصیل بیان کی اور ان اسرار، جن کے حقائق سے ہم نے پردہ اٹھایا، کی وجہ سے مسئلہ نہایت ہی مشکل، غامض اور عظیم بن گیا ہے، لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں وہ ہمیں حق کی توفیق دے اور ہمارا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین یارب العالمین

چوتھا مسئلہ: صاحبِ کشاف کہتے ہیں اگرچہ لفظاً دونوں احتمال ہیں کہ اسماع (ان کا سننا) حکم مہر اور پردہ کے تحت داخل ہو مگر حکم مہر کے تحت ہونا اولیٰ ہے کیونکہ دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے:

وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً (پ۲۵، الجاثیہ:۲۳) اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا

پھر آیت زیر تفسیر میں قراء کا وقف "قُلُوْبِهِمْ" پر نہیں بلکہ "سَمْعِهِمْ" پر ہے یعنی وقف یہ بتا رہا ہے کہ یہ حکم ختم و مہر کے تحت ہے۔

پانچواں مسئلہ: حرف جار کا فائدہ

"وَعَلٰی سَمْعِهِمْ" میں دوبارہ حرف جار "عَلٰی" میں فائدہ یہ ہے اس کے دوبارہ اسماع پر لانے سے دونوں مقامات پہ شدت ختم و مہر پر خوب دلالت ہے۔

چھٹا مسئلہ: قلوب اور ابصار جمع جبکہ سمع واحد کیوں؟

یہاں قلوب، ابصار جمع جبکہ سمع کو واحد لایا گیا ہے اس میں متعدد حکمتیں ہیں۔

۱۔ سمع واحد اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کی سمع واحد ہے جیسا کہ محاورہ ہے "اتانی برأس الکبشین" (وہ میرے پاس دو مینڈیوں کے سر لایا) یعنی ان میں سے ہر ایک کا سر لایا جیسے یہاں لفظ بطن واحد ہے "کلوا فی بعض بطنکم و تعیشوا" (کچھ حصہ پیٹ میں کھاؤ تاکہ زندہ رہ سکو) لیکن یہ اس وقت کرتے ہیں جب التباس کا خوف نہ ہو اور اگر التباس کا خوف ہو مثلاً فرشھم و ثوبھم (ان کے بستر اور کپڑے) سے مقصود جمع ہو تو پھر اسے ترک کر دیتے ہیں۔

۲۔ سمع اصلاً مصدر ہے اور مصادر کی جمع نہیں آتی رجلان صوم، رجال صوم ہی کہا جاتا ہے تو یہاں اصل کی ہی رعایت کی گئی

ہے اس پر اُذن کی جمع بھی دال ہے ارشاد مبارک ہے۔

وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ (پ۲۴،فصلت:۵) اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے

۳۔ یہاں مضاف محذوف ہے اور وہ جمع ہے و علیٰ حواس سمعھم

۴۔ شیخ سیبویہ کا کہنا ہے لفظ سمع واحد لایا جبکہ اس سے پہلے اور بعد کے الفاظ جمع ہیں تو یہ بات بتا رہی ہے کہ اس سے بھی جمع مراد ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (پ۳،البقرہ:۲۵۷) وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتا ہے

عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ (پ۲۹،المعارج:۳۷) دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے

رائی نے شعر کہا:

بھا جیف الحیدی فاما عظامھا فبیض و اما جلد ھا فصلیب

تو یہاں جلد سے جمع،جلود مراد ہے۔

شیخ ابن ابی عبلہ کی قرأت بصورت جمع ہے۔و علیٰ اسماعھم۔

ساتواں مسئلہ: سمع کا بصر سے افضل ہونا

کچھ لوگ کہتے ہیں سمع،بصر سے افضل ہے۔

ا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے تذکرے میں سمع کو بصر سے مقدم فرمایا ہے اور تقدیم فضیلت پر دال ہوتی ہے

۲۔ سمع شرطِ نبوت ہے بصر شرط نہیں،یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے کسی بہرے کو رسول نہیں بنایا البتہ انبیاء میں سے بعض نابینائی میں مبتلا کیے گئے۔

۳۔ سمع کے ذریعے عقل بعض نتائج حاصل کرتی ہے تو گویا سمع معارف عقل کے کمال کا ذریعہ ہے حالانکہ بصر صرف محسوسات کا ہی ذریعہ ہے۔

۴۔ سمع کا تصرف جہات ستہ (چھ) میں ہے جبکہ بصر کا یہ تصرف نہیں۔

۵۔ جب سمع باطل تو نطق بھی باطل جبکہ بطلان بصر سے نطق کا بطلان نہیں ہوتا۔

بعض نے بصر کو سمع پر فضیلت دیتے ہوئے کہا

۱۔ قوتِ باصرہ کا آلہ اشرف وافضل ہے۔

۲۔ قوتِ باصرہ کا متعلق نور جبکہ قوتِ سامع کا متعلق ہوا ہے

آٹھواں مسئلہ: محل علم، قلب

ارشاد مبارک ''خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ'' بتا رہا ہے محل علم قلب ہے، ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو سورۃ الشعراء میں اس ارشاد الٰہی:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ (پ۱۹، الشعراء:۱۹۳) اسے روح الامین لے کر اُترے تمہارے دل پر

کے تحت کی ہے۔

نواں مسئلہ، بصیرت نور قلب

صاحب کشاف کہتے ہیں، البصر، آنکھ کا نور، اس سے دیکھنے والا دیکھتا اور ادراک کرتا ہے جیسا کہ بصیرت نور قلب ہے جس کی وجہ سے غور و فکر کیا جاتا ہے گویا یہ دونوں لطیف جوہر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دیکھنے اور غور کرنے کے دو آلات پیدا فرمائے ہیں

ہم یہاں یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ دیگر معتزلہ ان کی اس گفتگو کو پسند نہیں کرتے، ابصار میں تحقیقی گفتگو کچھ غامض مباحث کی مقتضی ہے جو اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔

دسواں مسئلہ، غِشَاوَۃ کی قرائتیں

غشاوۃ میں نصب و کسر، ضم و رفع، فتح و نصب، غشوۃ، کسر و رفع، فتح، رفع، نصب، اسے عین کے ساتھ عشاوۃ اور رفع پڑھا گیا ہے غشاوۃ، پردہ، اس سے غاشیہ ہے جب عقل زائل ہو جائے تو، غشی علیہ، کہا جاتا ہے، جماع کو غشیان کہتے ہیں۔

گیارہواں مسئلہ: عذاب کا مفہوم

لفظ عذاب وزن اور معنی میں نکال، (عبرت دلانا) کی طرح ہے جب کسی شے سے روکا جائے تو اعذب عن الشئی یا نکل عنه کہا جاتا ہے، اس سے عذب (میٹھا پانی) کیونکہ یہ پیاس کو روک بلکہ اس کا قلع قمع کر دیتا ہے بخلاف نمک وہ پیاس میں اضافہ کرتا ہے، عذب کو عرب نقاخ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ پیاس کو توڑ ڈالتا ہے اسے فرات بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ قلبی اضطراب دور کرنا ہے

پھر اس میں وسعت معنوی آگئی تو ہر تکلیف دہ شے پر عذاب کا اطلاق ہونے لگا اگر چہ وہ نکال و عبرت نہ ہو یعنی اگر چہ وہ ایسی سزا نہ بھی ہو جسکی وجہ سے زیادتی کرنے والا دوبارہ کرنے سے باز نہ آئے۔

عظیم وکبیر میں فرق

عظیم وکبیر میں یہ فرق ہے عظیم، حقیر کی اور کبیر، صغیر کی نقیض ومقابل ہے تو عظیم، کبیر سے اُوپر جبکہ حقیر، صغیر سے کم ہے دونوں کا استعمال جثہ اور حادثات میں ہوتا ہے، مثلاً بڑے جثہ یا خطرناک کو رجل عظیم وکبیر کہا جاتا ہے۔

نکرہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ہیں جنہیں لوگ نہیں جانتے اور وہ آیات اللہ سے اندھے پن کا پردہ ہے اور ان کے لئے بڑے دردناک آلام میں سے عظیم قسم ہے جس کی کیفیت وحقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

بارہواں مسئلہ: عذاب دینا حسن ہے

اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کفار کو عذاب دینا حسن ودرست ہے بعض نے کہا عذاب دینا حسن نہیں تو انہوں نے "وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ عذاب کے مستحق تھے لیکن اللہ کے کرم کی وجہ سے اس پر معافی لازم ہے۔

فریقین کے دلائل

ہم یہاں دونوں فریق کے دلائل ذکر کئے دیتے ہیں:

۱۔ جو عذاب دینے کو جائز نہیں سمجھتے انہوں نے ان اُمور سے استدلال کیا ہے:

۱۔ عذاب دینا یہ جہت نفع سے خالی ہے لہذا اس کا قبیح قرار پانا لازم ہے کیونکہ یہ بلاشبہ ضرر ہے یا اس لیے کہ یہ ہر نفع سے خالی ہے کیونکہ اس کی منفعت اللہ تعالیٰ کے لئے یا کسی اور کے لئے ہے، اول صورت باطل کیونکہ اللہ تعالیٰ نفع وضرر سے پاک و بالاتر ہے بخلاف بندوں کے یہاں جب کوئی غلام کوتاہی کرتا ہے تو انسان اسے سزا دیتا ہے تو اس تادیب سے وہ لذت پاتا ہے کیونکہ دل میں جذبہ انتقام ہوتا ہے اور اسلئے بھی کہ جب اسے سزا ہوگی تو وہ ضرر رساں چیز سے رک جائے گا۔

دوسری صورت بھی باطل کیونکہ یہ نفع جس پر عذاب ہے اسے ہوگا یا اس کے غیر کو، جس پر عذاب ہے اسے نفع محال ہے کیونکہ یہاں اضرار (نقصان دینا) ہے جو انتفاع کا عین نہیں ہوتا اور غیر کیلئے بھی محال ہے کیونکہ رفع ضرر، ایصالِ نفع سے اولیٰ وراجح ہوتا ہے تو ایک شخص کو اس لئے ضرر پہچانا کہ دوسرے کو نفع ہو یہ راجح پر مرجوح کو ترجیح دینا ہے جو باطل ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو نفع عطا کرنا چاہے تو وہ دوسرے کو ضرر کے واسطہ کے بغیر بھی عطا کرنے پر قادر ہے لہٰذا اس اضرار کو واسطہ بنانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو ثابت ہوا عذاب دینا سراپا ضرر ہے جو ہر جہت نفع سے خالی ہے اور یہ بداہت و تقاضا عقل میں نہایت ہی قبیح ہے بلکہ عقول میں یہ اس قبح سے بھی زیادہ قبیح ہے جو ضرر رساں نہیں اسی طرح اس جہل سے جو ضرر رساں نہیں بلکہ اس قبیح کذب سے بھی جو ضرر رساں ہے اور اس جہل سے بھی جو نقصان دہ ہے اس لئے کہ کذب نقصان دہ، ضرر کا

وسیلہ ہے تو جو ضرر کا وسیلہ بنے اس کی قباحت سراپا ضرر سے کم ہوگی تو جب اس کا قبح ثابت تو اس کا صدور اللہ تعالیٰ سے محال ہوگا اس لئے کہ وہ حکیم ہے اور حکیم سے فعل قبیح صادر ہی نہیں ہوتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اس کا عالم ہے کہ کافر ایمان نہیں لاتے جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (پ۱،البقرۃ:۶) بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں

جب یہ ثابت ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ اگر اب کافر کو مکلّف ٹھہرایا تو اس سے نافرمانی کا صدور و اظہار ہوگا اور اگر یہی عصیان، عذاب کا سبب ہے تو یہی مکلّف بنانا ہی اپنے بعد عذاب کا مستحق بنانا ہوگا یہ تمام علت ہوگا یا جز علت۔

یہ مکلّف ٹھہرانا ایسا امر ہے کہ اس کے حصول کے بعد لازماً عذاب کا حصول ہوگا اور جو چیز اپنے بعد نفع سے خالی ضرر لائے وہ قبیح ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تکلیف قبیح ہی ہو اور قبیح کا صدور ذات حکیم سے نہیں ہوتا تو اب دو امور میں سے ایک باقی ہوگا یہ تکلیف باقی ہی نہیں یا پائی گئی ہے مگر اپنے بعد عذاب نہیں رکھتی جو بھی صورت لیں مقصود حاصل ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ مخلوق، انتفاع کیلئے کی ہے یا اضرار کیلئے یا نہ انتفاع کیلئے اور نہ اضرار کیلئے، اگر ان کی تخلیق انتفاع کیلئے ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ انہیں ایسی تکلیف و ذمہ داری نہ سونپے جو انہیں اس کے مقصود کی ضد تک پہنچا دے اور پھر اسے اس کا علم بھی ہو جب وہ ان کے عصیان پر اقدام کا علم رکھتا ہے اور اس کے بعد انہیں مکلّف بناتا ہے تو اب تکلیف ایسا فعل ہے جو عتاب تک پہنچاتا ہے جب ان کے نفع کا ارادہ رکھتا ہے تو لازم ہے کہ وہ انہیں مکلّف نہ بنائے اور جب مکلّف بنایا ہے تو واضح ہے کہ عصیان، استحقاق عذاب کا سبب ہرگز نہیں۔

اور یہ کہنا جائز نہیں کہ ان کی تخلیق نہ تو انتفاع کیلئے ہے اور نہ اضرار کیلئے کیونکہ پھر انہیں حالت عدم میں رکھنا ہی کافی تھا اور پھر اس صورت میں ان کی تخلیق عبث ہوگی۔

یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ ان کی تخلیق اضرار کیلئے ہیں کیونکہ ایسا خالق رحیم و کریم ہرگز نہیں ہوسکتا حالانکہ خالق کے رحیم و کریم ہونے پر عقول اور شرائع تمام کا اتفاق ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے۔

نِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے

تو یہ تمام دلیل ہیں کہ عذاب نہیں ہوگا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ان دواعی و تقاضوں کا خالق ہے جو معاصی کے موجب و مقتضی بنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان معاصی کی طرف جبر کرنے

والا ہوگا' دواعی کا وہی خالق ہے' کیونکہ پہلے بیان کر آئے ہیں صدور فعل ایسی قدرت سے ہے جس کے ساتھ ایک ایسا داعیہ متصل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ہم یہ بھی واضح کر چکے کہ یہ جبر کا موجب وسبب ہے اور کسی مجبور کو عذاب دینا عقول کے نزدیک قبیح ہے۔

اس کی تقریر انہوں نے یوں بھی کی ہے۔

جب اوامر ونواہی شرعیہ دو اشخاص کی طرف آتے ہیں، ان میں سے ایک انہیں قبول اور دوسرا ان کی مخالفت کرتا ہے تو اب ایک کو ثواب اور دوسرے کو عذاب دیا جائے گا اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ایک نے قبول اور دوسرے نے مخالفت کیوں کی؟ جواباً کہا جائے گا قبول کرنے والے نے ثواب پسند کیا اور عذاب سے بچتے ہوئے اطاعت کر لی، دوسرے نے ثواب پسند نہ کیا اور نہ عذاب سے بچنے کی کوشش کی تو اس نے نافرمانی کر دی یا قبول کرنے والے نے نصیحت سنی اور خوب سمجھا تو اطاعت کر لی اور دوسرا نہ متوجہ ہوا اور نہ سمجھا تو مخالفت کر دی۔

اب سوال ہوگا یہ کیسے متوجہ ہو گیا اور بات سمجھ گیا اور دوسرا نہ متوجہ ہوا اور نہ سمجھ پایا؟

ہم جواباً کہیں گے یہ عقلمند، ذہین اور فطین تھا اور دوسرا اکھڑ، جاہل وغبی تھا۔

سوال ہوگا ایک کو ذہانت وفطانت کیوں ملی جبکہ دوسرے کو نہ ملی بلاشبہ یہ فطانت وبلادت احوال طیبہ میں سے ہیں کیونکہ کوئی بھی انسان غباوت وخرق کو نہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی خود انہیں اپناتا ہے، جب تمام تعلیلات کی انتہا ان امور پر ہوگی جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہم میں بطور اضطرار پیدا فرمایا ہے تو ہم جان لیں گے کہ یہ تمام امور، اللہ تعالیٰ کی قضا وتقدیر سے ہی ہیں تو اب ان دو اشخاص اطاعت ومخالفت کرنے والوں میں، کسی حال میں مساوات ممکن نہیں نہ عقل وجہل میں، نہ فطانت وذہانت میں، نہ حزم وخرق میں اور نہ معلم وباعث اور زاجر ہونے میں۔

یہ کہنا بھی ممکن نہیں اگر یہ دونوں ان تمام میں مساوی ہوتے تو طاعت ومعصیت میں بھی مساوی ہوتے کیونکہ اب اشخاص کی طاعت ومعصیت کا سبب ایسے امور ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق وتقدیر سے ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

تو اب کہا جا سکتا ہے یہ کہاں کا عدل، رحمت اور کرم ہے کہ عاصی وہ ہی تخلیق کرے جس کی اس پر اللہ نے تخلیق کی تھی مثلاً فظاظت، جسارت، غباوت، وقساوت، طیش وخرق اور پھر اس پر اسے عذاب ہو تو اس کی تخلیق مطیع کی طرح عقل مند، باشعور، عارف وعالم کی طور پر کیوں نہیں کی گئی، کیا یہ عدل ہے کہ اس کا دل سخت، اس کا غضب قوی، اس کا دماغ شعلہ زن، اس کا غصہ کثیر پھر اسے دوسروں کی طرح کوئی ادب، معلم عالم اور واعظ مبلغ نہیں ملا بلکہ اس کے اخلاق وافعال پر ان کی اضداد مسلط ہیں جن سے اس نے سیکھا پھر اس پہ وہی مواخذہ جو کسی عقل مند، سمجھدار، عاقل عالم، ٹھنڈے دماغ، معتدل مزاج قلبی اور لطیف روح رکھنے والے کی

ہی طرح ہو جسے شفیق مربی اور معلم کامل ملا ہو؟ تو یہ کسی طرح بھی عدل، رحمت اور کرم نہیں ہوگا تو ان وجوہ سے ثابت ہوگیا کہ عتاب کا قول، عقلی فیصلوں کے مخالف ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود اپنے لئے ہی نفع کا مکلّف بنایا ہے، اس کا ارشاد ہے:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا — اور اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر تم نے برائی کی تو وہ بھی تمہارے لیے ہوگی (پ ۱۵، الاسراء:۷)

جب ہم نافرمانی کرتے ہیں تو ہم اپنے ہی منافع فوت کرتے ہیں تو کیا عقل اسے پسند کرے گی کہ حکیم ذات اس پر انسان کی گرفت کرے اور اسے کہے میں تجھے عذاب شدید دوں گا اس لئے کہ تو نے اپنے بعض منافع کو فوت کیا ہے کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حصول نفع، دفع ضرر کی نسبت مرجوح ہے، ہاں یہ تسلیم ہے کہ میں نے اپنی ذات پر ان دونوں مطلوب میں سے ادنیٰ مطلوب فوت وترک کیا تو کیا اس کی وجہ سے تم سب سے بڑے نفع کو فوت کر رہے ہوں، کیا کسی سردار کے شایاں ہیں کہ غلام کو پکڑے اور کہے تو اس پر قادر تھا کہ دینار حاصل کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے اور اس میں میرا کوئی فائدہ اور غرض ہرگز نہ تھی چونکہ تو نے نہ وہ دینار حاصل کیا اور نہ تو نے نفع اٹھایا لہٰذا میں تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا تو ایسے شخص کے بے وقوف ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں تو ایسا فعل احکم الحاکمین کے شایاں کیسے ہو سکتا ہے؟

عذاب دائمی کیوں؟

پھر یہ لوگ کہتے ہیں، ہم عذاب تسلیم کرتے ہیں مگر دائمی عذاب کا قول کیسے؟ یہ اس لئے کہ سب سے سخت دل، سب سے سخت طبیعت کا مالک اور ہر خیر سے دور بندہ، جب کسی اپنے تکلیف پہنچانے والے کو سزا دیتا ہے تو ایک دن یا ایک ماہ یا ایک سال دیتا ہے پھر وہ سیر ہو جاتا ہے اور تھک جاتا ہے اگر وہ اسے دائمی سزا دے تو ہر ایک اسے ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے ہم مانتے ہیں اس نے تجھے نقصان بہت دیا لیکن یہ عذاب کب تک؟ تو یا اسے قتل کر کے آرام پائے یا اسے چھوڑ دے جب ایسی بات کسی انسان سے ہے جو انتقام سے لذت پاتا ہے تو اس ذات سے دوام کیسے ہو سکتا ہے جو تمام سے غنی و مستغنی ہے؟

۶۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کسی سے زیادتی سے منع کیا ہے:

فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا — تو وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے ضرور اس کی مدد ہونی ہے

(پ ۱۵، الاسراء:۳۳)

اور فرمایا

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (پ۲۵ ،الشوریٰ:۴۰) اور برائی کی سزا اس کی مثل برائی ہے

پھر یہ تسلیم کہ بندہ نے ساری عمر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی لیکن اس کی عمر ابدی تو نہیں تو ابدی عذاب ظلم ہوگا؟

۷۔ اگر بندہ ساری عمر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے پھر توبہ کرکے فوت ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے معافی دیتا ہے اس کی دعا سنتے ہوئے تو بہ قبول فرماتا ہے، کیا خیال ہے وہ آخرت میں کریم نہیں رہے گا یا ان سزا یافتہ کی عقول ختم ہو جائیں گی وہ اپنے گناہوں سے کیوں توبہ نہیں کریں گے؟ جب وہ توبہ کرلیں گے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کیوں قبول نہیں فرمائیں گے؟ اور وہ ان کی کیوں پکار نہیں سنیں گے؟ انہیں وہ کیوں ناامید فرمائیں گے؟ کیا وجہ دنیا میں رحمت و کرم اس قدر کہ فرمایا

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ۲۴ ،غافر:۶۰) مجھے بلاؤ میں تمہاری دعا قبول کروں گا

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ (پ۲۰ ،النمل:۶۲) کون مجبور کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے بلاتا ہے

اور آخرت میں اس طرح ہو جائے گا کہ وہ اس کی طرف نہایت ہی شدید تضرع کریں اور وہ یہ فرمائے گا:

اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (پ۱۸ ،المومنون:۱۰۸) چلے جاؤ اور مجھ سے کلام نہ کرو

یہ ایسے دلائل ہیں جو عدمِ عذاب پر قطعاً دال ہیں۔

قرآن پر ایمان رکھنے والے

پھر ان میں سے قرآن پر ایمان لانے والوں نے قرآن میں وارد انواع عذاب کے بارے میں متعدد دلائل سے عذر پیش کیا ہے

۱۔ دلائل لفظیہ سے استدلال مفید یقین نہیں ہاں دلائل عقلیہ، مفید یقین ہوتے ہیں اور مظنون، مقطوع کے مقابل نہیں ہوسکتا، ہمارا قول، دلائل لفظیہ مفید یقین نہیں، اس لئے کہ دلائل لفظیہ جن اصولوں پر مبنی ہیں وہ تمام ظنی ہیں، ظنی پر مبنی ظنی ہی ہوتا ہے

ہمارا قول کہ یہ اصول ظنیہ پر مبنی ہے اس لئے کہ یہ نقل لغات اور نقل نحو وصرف پر مبنی ہیں، اور ان کے رواۃ کا حد تواتر تک پہنچنا معلوم نہیں تو ان کی روایت ظنی ہوگی، پھر یہ تمام عدم اشتراک، عدم مجاز، عدم تخصیص، عدم اضمار، عدم تقدیر و تاخیر پر مشتمل ہیں اور یہ تمام امور ظنی ہیں پھر یہ عدم معارض عقلی پر مبنی ہیں کیونکہ معارض عقلی کی صورت میں ان دونوں کا بیک وقت صدق وکذب

ممکن نہیں، اور نقل کو عقل پر ترجیح دینا ممکن نہیں کیونکہ اصل نقل، عقل ہی ہے، عقل پر طعن، عقل و نقل دونوں پر طعن ہوگا لیکن عدم معارض عقلی ظنی ہے تو جب یہ موجود نہ ہوگا تو ہم وہاں ان ظواہر کے خلاف دلائل عقلیہ کیسے پائیں گے تو ثابت ہوگیا دلائل نقلیہ کی دلالت ظنی ہوتی ہے باقی ظنی، قطعی کے مقابل نہیں آسکتا اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔

۲۔ وعید پر عفو اور درگزر، لوگوں کے ہاں مستحسن اور اعلیٰ ہوتا ہے، شاعر نے کہا:

وانی اذا او عدته او وعدته   لمخلف إيعادی و منجز موعدی

''میں جب وعید سزا یا وعدہ کرتا ہوں تو اپنے وعید کے خلاف اور اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں''

اہم ضابطہ

بلکہ ثبوت وعید پر اصرار گویا برا سمجھا جاتا ہے جب صورت حال یہ ہے تو لازم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے صحیح نہ ہو۔

اور اس کی بنیاد ایک ایسی بات ہے کہ اہلسنّت عمل سے پہلے نسخ فعل جائز مانتے ہیں۔

تفصیل ان کے ضابطہ کی یہ ہے کہ حکم کبھی ایسی حکمت کیلئے جاری کیا جاتا ہے جو نفس مامور بہ (فعل) سے ہی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی وہ حکمت نفس امر سے ہی سامنے آجاتی ہے مثلاً مالک اپنے غلام سے بعض اوقات کہتا ہے فلاں کام کل کرنا اگرچہ وہ فی الحال جانتا ہے کہ وہ اسے کل اس سے منع کر دے گا تو اس حکم سے اس کا مقصود یہ ہے کہ عبد اپنے مالک کی فرماں برداری کا اظہار اور اپنے کو اس کی اطاعت کے لئے تیار کرلے یوں ہی جب اللہ تعالیٰ بندے کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ کل فوت ہو جائے گا تو اہلسنّت کے ہاں یہ درست ہے کہ وہ بندے سے فرمائے صل غداً ان عشت (اگر تو زندہ رہا تو کل نماز پڑھنا) اس حکم سے مقصود فعل کا حصول نہیں کیونکہ یہ محال ہے بلکہ ایسی حکمت تھی جو فقط نفس حکم سے سامنے آجاتی ہے اور وہ حصول فرماں برداری و اطاعت اور ترک سرکشی ہے

جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم کہتے ہیں کہ خبر کا معاملہ ایسے کیوں نہیں ہوسکتا؟ کبھی خبر دینے سے منشا مخبر عنہ (جس سے خبر دی جارہی ہے) ہو اور یہ وعدہ کی صورت میں ہوگا اور کبھی منشاء حکمت نفس خبر ہو نہ کہ مخبر عنہ جیسا کہ وعید کی صورت میں ہے کیونکہ بطور وعید خبر دینا، معاصی پر زجر اور طاعت پر اقدام کے لئے مفید ہے تو جب یہ مقصود ہوگیا تو ممکن ہے مخبر عنہ حاصل ہی نہ ہو جیسا کہ وعید میں ہے تو اب انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا وعدہ بالثواب، حق لازم ہے لیکن اس کا عقاب لازم نہیں کیونکہ اس سے مقصود محض مکلفین کی اصلاح اور ساتھ ان کیلئے رحمت کا معاملہ بھی ہے جیسے والد، اپنی اولاد کو قتل، زہر، انقطاع اور ضرب کی دھمکی دیتا ہے تو اگر اولاد اس کا حکم مان لے تو نفع پاتی ہے اور نہ مانے تو والد کی شفقت پدری، اس کے قتل و عقوبت سے مانع بن جاتی ہے۔

خلافِ وعید کذب نہیں

سوال: ان تمام صورتوں میں یہ کذب ہوگا جو قبیح ہے؟

جواب: ہم نہیں مانتے کہ ہر کذب قبیح ہے بلکہ کذب ضار ونقصان دہ، قبیح ہوتا ہے البتہ کذب نافع ہرگز قبیح نہیں ہوتا، اگر ہم تسلیم کرلیں کہ ہر کذب قبیح ہوتا ہے تو ہم خلف وعید کو کذب مانتے ہی نہیں، کیا تمام عموماتِ قرآن میں تخصیص نہیں ہوتی حالانکہ اسے کوئی کذب کا نام نہیں دیتا۔ کیا تمام متشابہاتِ قرآنی کے ظواہر میں عدول نہیں ہوتا اسے کذب کسی نے کہا؟ تو اس طرح کا معاملہ وعید میں بھی ہے

آیاتِ وعید مشروط ہیں

۳- کیا عاصیوں کے حق میں آیات وعید، عدم توبہ کے ساتھ مشروط نہیں اگرچہ شرائط صریح نص کی صورت میں مذکور نہیں یا ہم کہتے ہیں کہ ان کا معنی یہ ہے کہ عاصی ان انواع عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے تو وقوع والی اخبار کو ہم استحقاقِ وقوع پر محمول کریں گے اس مذہب پر تمام گفتگو کا خلاصہ یہی ہے۔

وقوع عذاب ماننے والے کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے وہ وقوع وثبوت عذاب ہی ہے لہذا اس کا انکار تکذیب رسول ﷺ ہے، رہے شبہات جن سے تم نے نفی عتاب پر استدلال کیا یہ تمام حسن وقبح عقلی پر مبنی ہیں اور اسے ہم تسلیم نہیں کرتے (ہم تو حسن وقبح شرعی ہی جانتے ہیں) واللہ أعلم

[۸] وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

(اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں)

منافقین کا بیان

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں سے منافقین کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تین لوگوں کے بارے میں ذکر کیا ہے، اہل ایمان، کفار، منافقین، ابتدا اہل ایمان سے کی جو مخلص اور باطن وضمائر صحیح ودرست رکھتے ہیں پھر کھلے کفار جو انکار وعناد پر قائم رہے، پھر ان لوگوں کا ذکر آیا جو زباں سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر ان کا باطن اس کے مخالف ہے، یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: نفاق کی حقیقت

نفاق کی حقیقت سے آگاہی کے لئے ایک تقسیم کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

احوالِ قلبی

احوال قلبی چار ہیں:

۱۔ ایسا اعتقادِ مطابق جو دلیل سے حاصل ہو اور یہی علم ہے۔

۲۔ اعتقاد مطابق جو دلیل سے مستفاد نہ ہو یہ اعتقاد مقلد ہے۔

۳۔ اعتقاد غیر مطابق، یہ جہالت ہے۔

۴۔ دل ان تمام سے خالی ہو۔

احوالِ لسانی

احوال لسان تین ہیں۔۱۔اقرار ۲۔انکار ۳۔سکوت

ان کی ضرب سے بارہ اقسام حاصل ہوں گی۔

پہلی قسم: عرفان قلبی حاصل

اب اس کے ساتھ اقرار باللسان یا انکار یا سکوت حاصل ہوگا قسم اول، عرفان قلبی کے حصول کے ساتھ اقرار لسان بھی ہے تو اب یہ اقرار اگر مرضی واختیار سے ہے تو ایسا بندہ بالاتفاق سچا مومن ہے۔

اور اگر یہ اقرار اضطراری ہے مثلاً دل سے جانتا ہے لیکن محسوس کرتا ہے کہ اگر مجھے خوف نہ ہو تو میں اقرار نہ کروں بلکہ انکار کروں تو ایسے شخص کو منافق قرار دینا ضروری کیونکہ یہ دلی طور پر منکر، تکذیب کرنے والا اور زبان سے اقرار وتصدیق کرنے والا ہے تو اسے منافق قرار دینا لازم ہے کیونکہ یہ دلی طور پر منکر اور وجوب اقرار کی تکذیب کرنے والا ہے۔

دوسری قسم: عرفان قلبی کے ساتھ انکار لسانی حاصل

یہ انکار اگر اضطراری ہے تو ایسا بندہ مسلمان ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ — مگر جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہو

(پ ۱۴، النحل:۱۰۶)

اور اگر یہ انکار اختیاری ہے تو بندہ کافر و معاند ہے۔

تیسری قسم: عرفان قلبی حاصل مگر زباں اقرار و انکار سے خالی ہے

تو اب یہ سکوت اضطراری ہے یا اختیاری، اگر اضطراری ہے مثلاً زبانی ذکر پر خوف ہے تو یہ بندہ سچا مسلمان ہوگا یا دلائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علم حاصل لیکن نظر کی تکمیل ہوتے ہی اچانک موت آ گئی تو یہ بھی قطعی مومن ہوگا کیونکہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی لیکن انکار و اقرار کا وقت نہ پایا تو یہ معذور ٹھہرے گا اور اگر یہ سکوت اختیاری ہے مثلاً دلائل سے معرفت الٰہی حاصل ہو چکی لیکن زباں سے اقرار نہیں کر رہا تو یہ صورت محلِ بحث ہے۔

شیخ غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اس طرف ہے کہ یہ مومن ہے، حضور علیہ السلام کا فرمان ہے:

يخرج من النار من كان في قلبه مثقال ذرة من الايمان وہ دوزخ سے نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہوا تو جس کا دل نور ایمان سے معمور ہے تو اسے دوزخ سے کیسے نہ نکالا جائے گا؟

دوسری قسم: قلب میں اعتقاد تقلیدی حاصل ہو

اب اس کے ساتھ اقرار یا انکار یا سکوت ہوگا، پہلی صورت کہ اعتقاد تقلیدی کے ساتھ اقرار ہے اب اگر وہ اختیاری ہے تو یہی وہ مشہور مسئلہ ہے کہ کیا مقلد مومن ہوتا ہے یا نہیں؟ اور اگر اضطراری ہے تو یہ صورت اولیٰ پر ہی متفرع ہوگا اگر ہم صورت اولیٰ میں اسے کافر کہتے ہیں تو یہاں کلام ہی نہیں اور اگر ہم اس میں مؤمن قرار دیں تو یہاں اسے منافق قرار دینا ضروری ہوگا کیونکہ اس صورت میں اگر دل عارف ہو تو یہ شخص منافق ہوگا گویا بوقت تقلید اس کا منافق ہونا اولیٰ ہوگا۔

دوسری صورت جب اعتقاد و تقلید کے ساتھ انکار لسانی ہو تو یہ انکار اگر اختیاری ہے تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں اور اگر اضطراری ہے اور ہم مقلد کو مومن جانتے ہوں تو اس صورت میں ایسے آدمی کو مومن کہنا لازم ہوگا۔

تیسری صورت، اعتقاد تقلیدی مع سکوت خواہ وہ سکوت اضطراری ہو یا کہ اختیاری تو اس کا حکم قسم ثالث کی نوع اول والا ہے جبکہ ہم ایمان مقلد مانیں

تیسری قسم: انکار قلبی کے ساتھ اقرار لسانی یا انکار یا سکوت ہوگا

پہلی قسم: انکار قلبی کے ساتھ اقرار لسانی ہو تو اب یہ اقرار اضطراری ہے تو منافق اور اگر اختیاری مثلاً کسی شبہ کی بنا پر عالم کو قدیم جانتا ہے لیکن اختیاراً زبان سے کہتا ہے کہ عالم حادث ہے تو یہ بعید نہیں کیونکہ جب یہ جائز ہے دل سے عارف ہو لیکن زباں سے

ملِ قدیر

منکر ہوتو یہ کفر عنادی وضدی ہے تو یہ جائز کیوں نہیں کہ آدمی قلباً جاہل ہولیکن وہ زبان سے اقرار کرے؟ یہ قسم بھی نفاق ہے۔

دوسری قسم: انکار قلبی اور انکار لسانی ہوتو یہ کافر ہوگا نہ کہ منافق، کیونکہ اس نے باطن کے مخالف کچھ ظاہر نہیں کیا۔

تیسری قسم: انکار قلبی مع سکوت لسانی بھی کافر نہ کہ منافق کیونکہ اس نے کسی شے کا اظہار ہی نہیں کیا۔

چوتھی قسم: تمام اعتقادات سے خالی قلب کے ساتھ اقرار یا انکار یا سکوت ہے۔

پہلی قسم: اگر اقرار لسانی ہے تو وہ اختیاری ہوگا یا اضطراری، اگر اختیاری ہے اگر بندہ مہلت نظر میں ہے تو کفر لازم نہیں ہوگا لیکن اس کا فعل جائز نہیں کیونکہ اس نے ایسی خبر دی جانتا ہی نہیں کیا اس میں وہ سچا ہے یا نہیں اور اگر وہ مہلت نظر میں نہیں تو یہ محل نظر ہے، اگر اضطراری تو یہ کافر نہ ہوگا کیونکہ جب اس کا توقف مہلت نظر میں ہے اور وہ اپنے پر ترک اقرار کا خوف رکھتا ہے تو اس کا عمل قبیح نہ ہوگا۔

دوسری قسم: قلب خالی مع انکار لسانی کا حکم قسم عاشر کے حکم کے برعکس ہے۔

تیسری قسم: قلب خالی مع لسان خالی، اب اگر یہ مہلت نظر میں ہے تو یہی لازم ہے اور اگر مہلت نظر سے خارج ہے تو اس کی تکفیر لازم اور اسے ہرگز منافق قرار نہیں دیا جائے گا۔

اس مسئلہ میں ممکنہ صورتیں یہی ہیں اس سے واضح ہو رہا ہے کہ نفاق یہ ہے جس کا ظاہر اس کے باطن کے مطابق نہ ہوخواہ باطن ظاہر سے متضاد ہو یا باطن اس سے خالی ہو جو ظاہر ہو رہا ہے تو اب اشکار ہو گیا ارشاد الٰہی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ — کچھ لوگ کہتے ہیں کے ایمان لائے اللہ اور آخرت پر

(پ۱، البقرۃ:۶)

میں مراد منافقین ہیں۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ: کفر اصلی بدتر یا کفر منافق؟

اس میں اختلاف ہے کہ کافر اصلی کا کفر بدتر واقبح ہے یا کفر منافق؟ کچھ کہتے ہیں کافر اصلی کا کفر بدتر ہے کیونکہ یہ جاہل قلبی اور کاذب لسانی ہے لیکن منافق جاہل قلبی اور صادق لسانی ہے۔

دیگر کہتے ہیں منافق بھی کاذب لسانی ہے کیونکہ اس سے اپنے اعتقاد کی خبر دے رہا ہے حالانکہ اس کا اعتقاد ایسا نہیں، اس

لئے ارشادِ الٰہی ہے

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (پ ۲۶، الحجرات:۱۴) اور دیہاتیوں نے کہا ہم ایمان لے آئے فرما دیجیے تم ابھی تک ایمان نہیں لائے بلکہ کہو ہم اسلام لائے اور ایمان ابھی تک ان کے دلوں میں نہیں داخل ہوا

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (پ ۲۸، المنافقون:۱) اور اللہ گواہ ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں

منافق کی مزید برائیاں

پھر منافق میں مزید برائیاں یہ بھی ہیں:

۱۔ یہ تلبیس کا ارادہ کرتا ہے جبکہ کافر اصلی ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔

۲۔ کافر طبع رجال اور منافق طبع ہیجڑے پر ہے۔

۳۔ کافر اپنے لئے جھوٹ پسند نہیں کرتا جبکہ اس سے انکار کرتا ہے اور صدق کو پسند کرتا ہے حالانکہ منافق جھوٹ پسند کرتا ہے۔

۴۔ منافق اپنے کفر کے ساتھ استہزأ کو بھی ملاتا ہے جبکہ کافر اصلی ایسا نہیں کرتا۔

منافق کے کفرِ غلیظ کی وجہ سے فرمایا

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ اور منافقین دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں

(پ ۵، النساء:۱۴۵)

۵۔ حضرت مجاہد کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ابتدأ چار آیات میں اہل ایمان کا ذکر کیا، اس کے بعد دوسرے نمبر پر دو آیات میں کفار کا پھر تیسرے نمبر پر منافقین کا تیرا آیات میں ذکر کیا ہے یہ آگاہ کر رہا ہے کہ منافق جرم میں اعظم ہے۔

لیکن یہ بات بعید ہے کیونکہ کسی کی خبر کا لمبا ہونا اس کے جرم کو اعظم بنانے کا موجب وسبب نہیں ہوتا اگر وہ اعظم ہے تو اس کے وجوہات اس کے علاوہ ہوں گے اور وہ ان کا کفر کے ساتھ کئی معاصی کو ملانا ہے مثلاً مخادعت دھوکہ، استہزٔ او تمسخر، طلب فساد وغیرہ اس کا جواب یوں ممکن ہے کہ ان کی خبر کا کثیر ہونا دلالت کرتا ہے کہ ان کے رفع شر کا اہتمام رفع شر کفار کے اہتمام سے اشد ہے اور یہی بات ان کے کفار سے جرم میں اعظم ہونے کی دلیل ہے۔

تیسرا مسئلہ: دو اُمور پر دلالت

آیت دو امور پر دال ہے

۱۔ یہ بتا رہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت نہیں رکھتا لیکن اس کا اقرار کرتا ہے تو وہ مومن نہیں کیونکہ فرمایا:

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یہ مومن نہیں

حالانکہ کرامیہ کہتے ہیں یہ مومن ہوگا۔

۲۔ یہ اس قول کے اعلان پر دال ہے کہ تمام مکلفین عارف باللہ ہیں اور جو عارف باللہ نہیں وہ مکلّف ہی نہیں ہوگا، اول باطل کیونکہ اگر منافقین عارف تھے اور وہ اقرار بھی کرتے تھے تو اب لازم ہے کہ ان کا اقرار ایمان ہو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھے اور اس کا اقرار بھی کرے وہ یقیناً مومن ہے۔

دوسرا باطل کیونکہ غیر عارف اگر معذور ہے تو اللہ تعالیٰ عدمِ عرفان پر مذمت نہ فرماتا تو بعض مکلفین کا یہ قول باطل ٹھہرا کہ جو ان اشیاء کو نہیں جانتا وہ معذور ہوگا۔

چوتھا مسئلہ: لفظ انسان کا اشتقاق

لفظ انسان کے اشتقاق میں مختلف وجوہات ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انسان نام کی وجہ یہ ہے کہ اس سے عہد لیا گیا لیکن اس پر نسیان آگیا کسی شاعر نے کہا ''سميت انسانا لانك ناسى'' (تیرا نام انسان اس لیے ہے کہ تو بھولنے والا ہے)

شیخ ابو الفتح السبتی نے کہا

يا اكثر الناس احساناً الى الناس	واكثر الناس افضالاً على الناس
نسبت عهدك والنسيان مغتفر	فاغفر فاول ناس اول الناس

۲۔ انسان، اپنے ہم مثل سے مانوس ہوتا ہے۔

۳۔ انسان، ظاہر ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے جیسے یونسون کا معنی يبصرون (وہ دیکھتے ہیں) ارشاد الٰہی ہے:

اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا (پ۲۰، القصص:۲۹) طور کی طرف سے آگ سی دکھائی دی

جیسے مخفی ہونے کی وجہ سے ''جن'' کہا جاتا ہے۔

واضح رہے ہر لفظ کے لئے دوسرے سے مشتق ہونا لازم نہیں ورنہ تسلسل لازم آجائے گا اس بنا پر انسان کو کسی دوسرے سے مشتق ماننا ضروری نہیں۔

پانچواں مسئلہ: منافقین اہلِ کتاب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ یہ آیات منافقین اہل کتاب کے بارے میں ہیں ان میں عبداللہ بن ابی، معتب بن قشیر اور جد بن قیس شامل تھے یہ جب اہلِ ایمان سے ملتے تو ایمان وتصدیق کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہم نے اپنی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعت وصفات دیکھی ہیں حالانکہ وہ خلوت میں ایسا نہ کہتے۔

چھٹا مسئلہ: لفظ مَنْ کا استعمال

لفظ مَن میں تثنیہ، جمع اور واحد کی صلاحیت ہے واحد، ارشاد الٰہی ہے:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ (پ ۷، الانعام:۲۵) اور ان میں وہ جو تیری طرف کان لگاتا ہے

جمع میں استعمال فرمایا:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَيۡكَ (پ ۱۱، یونس:۴۲) اور ان میں وہ جو تیری طرف کان لگاتے ہیں

وجہ یہ ہے کہ یہ لفظاً واحد مگر معنی جمع ہے تو واحد کے وقت لفظ کا اور جمع کے وقت معنی کا اعتبار ہوتا ہے تو زیر تفسیر آیت میں دونوں اُمور حاصل ہیں کیونکہ ارشاد الٰہی 'یقول' لفظ واحد اور 'امنّا' لفظ جمع ہے۔

چند سوالات

پہلا سوال: منافقین، اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے لیکن وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے تو پھر ان کے دعویٰ ایمان باللہ اور یوم اخر کی کیوں تکذیب کی گئی ہے؟

جواب: اگر ہم اس سے منافقین مشرکین مراد لیں تو پھر کوئی اشکال نہیں کیونکہ انکی اکثریت اللہ تعالیٰ سے جاہل اور یوم بعث و آخرت کی منکر تھی

اگر مراد منافقین اہل کتاب ہیں اور وہ یہود ہیں تو اب تکذیب اسلئے کی کہ ان کا اللہ پر ایمان، ایمان نہیں کیونکہ وہ اس کا جسم مانتے ہوئے کہتے ہیں "عزیر ابن اللّٰه" (عزیر اللہ کے بیٹے ہیں) اسی طرح ان کا آخرت پر ایمان نہیں

تو وہ جب کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے تو اس میں کئی گنا ان کا خبث تھا کیونکہ دل میں غلط طریقہ سے ایمان رکھتے اور زباں سے اہل اسلام کو وہم ڈالتے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر تمہاری طرح ہی ایمان رکھتے ہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی

دوسرا سوال: 'وماھم بمؤمنین' اور 'امنا باللّٰہ' میں مطابقت کیسے ہوگی کیونکہ اول شان فعل کا ذکر ہے نہ کہ فاعل کا اور ثانی شان فاعل کا ذکر ہے نہ کہ فعل کا؟

جواب: کسی آدمی نے کہا: فلان ناظر فی المسألة الفلانیة۔ (فلاں نے فلاں مسئلہ میں مناظرہ کیا)

اب اگر تم کہو اس نے اس جگہ میں مناظرہ نہیں کیا تو اس کی یہ تکذیب ہے اگر تم یہ کہو وہ تو مناظرہ کر ہی نہیں سکتا تو اس کی تکذیب میں خوب مبالغہ ہے یعنی اس کا تعلق اس جنس سے ہی نہیں لہذا اس کے بارے میں ایسا خیال کیسے کیا جا سکتا ہے یہاں بھی یہی معاملہ ہے جب انہوں نے کہا ہم اللہ پر ایمان لائے تو اب اگر اللہ تعالیٰ فرماتا: ما امنوا۔ وہ ایمان نہیں لائے تو ان کی تکذیب تھی لیکن جب فرمایا: "وماھم بمؤمنین" تو ان کی تکذیب میں خوب مبالغہ ہے، اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا — وہ نکلنے کا ارادہ کریں گے آگ سے اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے

تو یہ 'وما یخرجون منھا' سے زیادہ بلند و برتر ہے۔

یوم آخرت سے مراد

تیسرا سوال: یہاں یوم آخر سے کیا مراد ہے؟

جواب: ممکن ہے وہ وقت مراد ہے جس کی حد نہیں اور وہ ابدی و دائمی ہے جس کی حد ختم ہی نہیں ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد قیامت کے محدود وقت کا بیان ہو یہاں تک کہ اہل جنت، جنت میں اور اہل نار، نار میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ یہ اوقات محدودہ کا آخری وقت ہوگا، اس کے بعد وقت کی کوئی حد نہیں۔

[۹-۱۰] يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

(یہ فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور اہلِ ایمان کو مگر حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنے کو اور انہیں شعور نہیں، ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا)

منافقین کی چار برائیاں

اللہ تعالیٰ نے یہاں منافقین کے چار برائیاں اور قبائح بیان کئے ہیں:

(i) فرمایا: يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا (وہ فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور اہلِ ایمان کو) تو ان چار چیزوں کا علم ضروری ہے۔

اولاً معنی مخادعت، ثانیاً مخادعة اللّٰه، ثالثاً وہ اللہ کو کیسے دھوکہ دیتے، رابعاً وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ سے کیا مراد ہے؟

پہلا مسئلہ، مخادعت کا معنی

مخادعت (دھوکہ دینا) مذموم ہے تو مذموم کا دوسروں سے ممتاز ہونا ضروری ہے تاکہ اسے کوئی بجا نہ لائے۔

اصلاً اس لفظ میں مخفی ہونے کا معنی ہے خزانہ کو مخدع، گردن کی مخفی جگہ اور رگوں کو اخدعان، جب گوہ بل میں گھس جائے اور بہت ہی کم ظاہر ہو تو کہتے ہیں خدع الضب خدعاً، طریق خیدع و خدع کہا جاتا ہے جب وہ مقصد کے مخالف اور نہ معلوم ہو، اسی سے مخدع ہے۔

خدع کی تعریف

صحیح اور درست کا اظہار کرنا لیکن باطن میں دوسرے کو نقصان اور اس سے چھٹکارے کا تصور ہو یہ عمل کفر میں بمنزل نفاق اور افعال حسنہ میں بمنزل ریا ہے اور یہ تمام دینی تقاضوں کے خلاف ہے کیونکہ دین، استقامت و راستی کو فرض اور دھوکہ و برائی سے اعراض لازم کرتا ہے جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خالصیت لازم کرتا ہے، اس وجہ سے ریاکار کو مدلس کہتے ہیں جب وہ خلاف مراد ظاہر کر رہا ہو، اس سے ہی تدلیس کی اصطلاح ہے کہ راوی ایسے آدمی سے سماع کا وہم پیدا کرتا ہے جس سے اس کا سماع نہیں اور اگر وہ ایسا اعلانیہ کرے تو اسے مدلس نہیں کہا جائے گا۔

دوسرا مسئلہ: وہ اللہ کو دھوکہ کیسے دیتے؟

سوال: اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا دو طرح سے محال ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے رازوں اور بھیدوں سے آگاہ ہے لہٰذا اسے دھوکہ دیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ فعل کر کے اگر ظاہر کریں کہ ان کا باطن خلاف ظاہر تھا تو یہ دھوکہ نہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے بواطن مخفی ہی نہیں تو اسے دھوکہ دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

۲۔ منافقین کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول مبعوث کیا ہے تو ان کا نفاق میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا مقصود ہی نہ تھا تو ثابت ہوا کہ ان الفاظِ آیت کو ظاہر پر رکھنا ممکن نہیں اور اس کی تاویل ضروری ہے۔

وجوہ تاویل

اس کی ۔طرح سے تاویل کی گئی ہے۔

۱۔ حسب سنت، اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر کر کے بطور تعظیم وعزت، مراد رسول ﷺ کو لیا ہے، جیسے ان ارشادات میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ — وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ سے بیعت کرتے ہیں

(پ۲۶، الفتح:۱۰)

اس کے برعکس میں فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ — اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو تو اس میں پانچواں حصہ اللہ کا ہے

(پ۱۰، الانفال:۴۱)

یہاں حصہ رسول کو اپنی طرف منسوب کر دیا، تو جب منافقین نے رسول ﷺ کو دھوکہ دیا تو گویا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ہی دھوکہ دیا

۲۔ بظاہر صورت حال اس طرح تھی کہ وہ ایمان ظاہر کرتے، اور تھے کافر، تو یہاں دھوکہ دینے والے کی طرح صورت تھی اور اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ صورۃً معاملہ یہ تھا کہ ان پہ احکامِ مسلمین جاری کیے حالانکہ اس کے ہاں یہ کفار تھے تو صورۃً اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ تھا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان پر احکامِ اسلام ہی جاری کریں۔

تیسرا مسئلہ: دھوکہ دہی کی غرض

اس دھوکہ دہی کی غرض وفائدہ کا بیان چند طرح سے ہے۔

۱۔ وہ یہ گمان کرتے کہ حضور ﷺ اور اہلِ ایمان، دیگر اہلِ ایمان کی طرح ان کی بھی تعظیم واکرام کریں اس لیے ایمان کا اظہار کرتے اگرچہ باطن اپنا چھپاتے تو دھوکہ سے مقصود حصول احترام تھا۔

۲۔ ان کا مقصود حضور ﷺ کے اور اہلِ ایمان کے راز حاصل کر کے کفار تک پہنچانا ہوتا۔

۳۔ انہوں نے اس ذریعہ سے اپنے اوپر احکامِ کفار مثلاً قتل کے اجراء کو روکا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے، مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ہے یہاں تک کہ وہ "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" پڑھیں۔

۴۔ وہ اموال غنیمت کے حصول کا طمع رکھتے تھے۔

سوال: اللہ تعالیٰ قادر ہے ان کے مکر وفریب سے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی آگاہ کر دے تو ان کا پردہ چاک کر کے کیوں نہ انہیں رسوا کر دیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ ابلیس اور اس کی ذریت کے ختم کرنے پر قادر ہے لیکن اس نے انہیں باقی اور طاقت دے رکھی ہے یا تو اس لیے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو مرضی فیصلہ کرے یا اس میں ایسی حکمت ہے کہ اس پر وہ خود ہی مطلع ہے۔

چوتھا مسئلہ: امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو ما یخادعون اور باقی نے ما یخدعون پڑھا ہے۔ اولین کی دلیل مطابقت لفظی ہے تا کہ لفظ اول کے مطابق ہو جائے۔ دوسروں کی دلیل یہ کہ مخادعت، دو کی طرف سے ہوتی ہے لہٰذا انسان واحد اپنے کو دھوکہ نہیں دیتا

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ کی تفسیر

اس کی تفسیر دو طرح بیان کی گئی ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ کے طور پر سزا دے گا اور یہ حقیقت میں اپنے کو ہی دھوکہ دینے والے ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری نے مفہوم بیان کیا ہے۔

۲۔ اکثر مفسرین نے کہا، اس دھوکہ کا وبال انہی پر ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو دھوکہ کے ضرر سے بچا کر اس کا وبال انہی پر مسلط کر دے گا، جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پ۵، النساء:۱۴۲)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ انہیں غافل کر کے مارے گا

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (پ۱، البقرۃ:۱۴،۱۵)

ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ (پ۱، البقرۃ:۱۳)

تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنو احمق یہی ہیں

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا (پ۱۹، النمل:۵۰)

اور انہوں نے اپنا سا مکر کیا اور ہم نے اپنی خفیہ تدبیر فرمائی

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (پ۳۰، الطارق:۱۵،۱۶)

بیشک کافر اپنا سا داؤ چلتے ہیں اور میں نے بھی تدبیر کی

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (پ۶، المائدہ:۳۳)

یہ جزا ہے ان کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (پ۲۲، الاحزاب:۵۷)

جو لوگ اذیت دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو

باقی مباحث آیت

اس کے بعد آیت سے متعلقہ یہ مباحث ہیں:

۱۔ وما یخادعون از اخدع اور یخدعون یا پرزبر بمعنی یختدعون پڑھا، اور یخدعون و یخادعون کو مجہول بھی پڑھا گیا ہے۔

۲۔ نفس، کسی کی ذات وحقیقت، یہ صرف اجسام کے ساتھ ہی مختص نہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ　　تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے نفس میں ہے　　(پ۷، المائدہ:۱۱۶)

تو ان کی مخادعت سے مراد ان کی ذوات ہیں یعنی اس کا ضرر ان تک ہی محدود رہے گا دوسروں کی طرف تجاوز نہیں کرے گا۔

۳۔شعور، حواس کے ذریعے شی کا علم، حواس، مشاعر انسان کہلاتے ہیں، معنی یہ ہے کہ اس کا ضرر انہیں محسوس کی طرح لاحق ہے مگر غفلت میں گر جانے کی وجہ سے انہیں ہوش ہی نہیں گویا محسوس ہی نہیں ہوتا۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کی تفسیر

مرض ایسی صفت ہے جو جائے صفت سے صادر ہونے والے افعال میں وقوع ضرر کی موجب ہوتی ہے، دل پر اثر خاص اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی طاعت وعبودیت ہے۔ جب دل میں ایسی صفات ہوں گی جو ان اثار کے مانع بنیں گی تو یہ صفات امراض قلب کہلائیں گی

سوال: اضافہ، مزید علیہ (جس پر اضافہ ہوا) کی جنس سے ہوتا ہے یہاں اگر مرض سے مراد کفر وجہل ہے تو فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا بھی کفر وجہل پہ ہی محمول ہوگا تو لازم آئے گا اللہ تعالیٰ فاعل کفر وجہل ہو

معتزلہ کہتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد فعل کفر وجہل نہیں اور دلائل یہ ہیں:

۱۔کفار، قرآن پر طعن کے انتہائی حریص تھے، اگر معنی یہ ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے کہتے جب اللہ تعالیٰ نے خود ہمارے اندر کفر داخل کر دیا ہے تو تم ہمیں ایمان لانے کا کیوں کہتے ہو؟

۲۔اگر اللہ تعالیٰ، فاعل کفر ہو تو معجزہ کا اظہار ید کاذب پہ ممکن ہوگا تو اب قرآن ہی حجت نہ رہا تو اب اس کے معانی وتفسیر میں مشغولیت چہ معنی دارد؟

۳۔اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفر پر ان کی مذمت کی ہے تو ایسی شی پر ان کی مذمت کیسے ہوگی جب ان کے اندر اسے خود پیدا کیا ہے؟

۴۔ ارشاد "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" ہے اگر ان کے اندر کفر، ان کے رنگ اور جسمانیت کی طرح پیدا کیا ہے تو پھر ان کا یہ کیسے گناہ ہے کہ ان پہ انہیں عذاب دیا جائے؟

۵۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ فرمایا "بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ" یہ بھی فرمایا کہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا یہی بے وقوف ہیں، یہ بھی فرمایا جب اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

آیت کی تاویل

جب یہ چیزیں ثابت ہیں تو اب اس آیت کی یہ تاویلات و معانی کرنے چاہئیں۔

۱۔ مرض بمعنی غم، محاورہ ہے، مرض قلبی من امر کذا (فلاں معاملہ کی وجہ سے میرا دل غمگین ہے) معنی یہ ہے کہ منافقین کے دل دن بدن حضور ﷺ کی کامیابی و غلبہ دیکھ کر پریشان ہو گئے اور یہ ان کی ریاست کے زوال میں مؤثر تھا جیسا کہ روایات میں ہے حضور ﷺ حمار پر سوار عبداللہ بن ابی کے پاس سے گزرے۔ کہنے لگا: اپنے حمار کو دور لے جا، اس کی بدبو نے ہمیں تنگ کر دیا ہے۔ ایک انصاری نے عرض کیا: یا رسول اللہ اسے معذور سمجھیں ہم اس کے غلبہ سے پہلے ریاست حاصل کریں گے۔ جب ان پر اس کا غم شدید ہوا تو فرمایا: فزادھم اللہ مرضا یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی تعظیم شان اور غلبہ کے ذریعے ان کے غم میں مزید اضافہ کر دیا

۲۔ ان کا مرض کفر، اضافہ تکالیف کی وجہ سے زیادہ ہوتا گیا جیسا کہ سورۂ توبہ میں ہے:

فَزَادَتْهُمْ رِجْساً اِلٰى رِجْسِهِمْ (پ۱۱، التوبہ:۱۲۵) انہیں اور پلیدی پر پلیدی بڑھائی

حالانکہ سورت کا یہ عمل و ثمر نہیں۔

چونکہ سورت کے نزول پر اس کی مخالفت کی وجہ سے ان کی ناپاکی میں اضافہ ہوتا تو اس لیے یہ فرمایا، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے حوالہ سے ہے۔

اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلاً وَّنَهَاراً فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِىْ اِلَّا فِرَاراً (پ۲۹، النوح:۶) میں نے اپنی قوم کو رات دن بلایا، میرے بلانے نے ان کے فرار میں ہی اضافہ کیا

حالانکہ دعوت و پیغام ایسا فعل نہیں لیکن ان کے فرار کی وجہ سے اضافہ ہوا، اسی طرح فرمایا

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّىْ وَلَا تَفْتِنِّىْ (پ۱۰، التوبہ:۴۹) اور ان میں کوئی تم سے یوں عرض کرتا ہے کہ مجھے رخصت دیجئے اور فتنہ میں نہ ڈالیے

حضورﷺ اگر اسے اجازت نہ دیتے تو فتنہ میں نہ پڑتا۔

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْراً مِّنْهُمْ مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَاناً وَّكُفْراً (پ۶، المائدۃ:۶۴) اور اے محبوب! یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اترا اس سے ان میں بہتوں کو شرارت اور کفر میں ترقی ہوگی

اور فرمایا:

فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُوْراً (پ۲۲، فاطر:۴۲) پھر جب ان کے پاس ڈر سنانے والا تشریف لایا تو اس نے انہیں نہ بڑھایا مگر نفرت کرنا

جب تم کسی کو نصیحت کرو اور وہ نہ سنے اور فساد میں بڑھتا چلا جائے تو تم کہتے ہو میری نصیحت نے اس کے شر میں ہی اضافہ کیا، میرے وعظ نے اس کے فساد میں اضافہ ہی کیا ہے۔

اسی طرح یہاں منافقین کا معاملہ ہے وہ کافر تھے جب انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دینی احکام کی طرف بلایا تو انہوں نے ان شرائع واحکام کا انکار کیا، اس سبب سے ان کے کفر میں اضافہ ہوا تو اب ان کے اضافہ کفر کی نسبت یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونی چاہیے تھی

۳۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً سے مراد اضافۂ الطاف سے ممانعت ورکاوٹ ہے تو اس سبب سے وہ منع ان کیلئے ذلیل کُن ہوا۔

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (پ۲۸، المنافقون:۴) اللہ انہیں مارے کہاں اوندھے جاتے ہیں

۴۔ عرب فتورِ آنکھ کو مرض کہتے ہیں۔ مثلاً جارية مريضة الطرف، جریر نے کہا

ان العيون التي في طرفها مرض قتلننا ثم لم يحيين قتلانا

یہاں مرض، فتورنیت ہے اس لیے کہ ابتداً ان کے دل محاربت و برائی کیلئے قوی تھے پھر ان کی شوکت ٹوٹ گئی تو خوف و کمزوری کی وجہ سے انہوں نے نفاق شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً" یعنی اللہ نے ان کی کمزوری، بزدلی ور ضعف میں اضافہ کر دیا۔ اس بات کی تقویت اللہ تعالیٰ نے یوں کی ہے:

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِأَيْدِيْهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ (پ۲۸، الحشر:۲) اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا کہ وہ اپنے گھر ویران کرتے ہیں اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں

۵۔ مرض کا معنی تکلیف قلب ہے اس لیے کہ جب انسان حسد، نفاق اور مشاہدہ مکروہ میں دائمی مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سبب سے مزاج قلبی بدل کر تکلیف والم میں ہو جاتا ہے۔ اب مرض کا اس معنی پر حمل حقیقت ہی ہے اور یہ باقی دیگر وجوہات ومعانی سے اولیٰ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کی تفسیر

صاحب کشاف کہتے ہیں: الم، الیم جیسے وجع وجیع (اسے درد ہوا اور درد والا ہے) عذاب کی صفت الیم اس محاورہ کے مطابق ہے۔تحیۃ بینھم ضرب وجیع (ان کے درمیان تحفہ دینا ایک قسم کی تکلیف ہے) اس طریق پر محاورہ جد جدہ حقیقت میں الم، مولم کیلئے ہے جیسا کہ جد، جاد کیلئے ہے۔

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ کی تفسیر

یہاں چند مباحث ہیں

۱۔ کذب، شئی کے بارے میں خلاف، واقع خبر دینا ہے، شیخ جاحظ اسے کذب نہیں مانتے جب تک خبر دینے والا یہ نہ جانتا ہو کہ مخبر عنہ (جس کی خبر دی جارہی ہے)، خبر کے مخالف ہے، یہ آیت مبارکہ ان کے خلاف دلیل ہے۔

۲۔ ارشادِ الٰہی: وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ میں تصریح ہے کہ ان کا کذب، عذاب الیم کی علت ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہر کذب حرام ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو" ثلث کذبات" (تین کذب) کے الفاظ روایات میں آئے ہیں وہاں مراد تعریض ہے چونکہ بظاہر صورت کذب کی تھی لہٰذا اس کا نام کذب رکھ دیا گیا ہے۔

۳۔ آیت میں دو قرأتیں ہیں۔

اول، یکذبون، ان کے کذب سے مراد ان کا یہ قول ہے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے)

ثانی، یکذبون، اس کذب سے جو صدق کی نقیض ہے اور اس کذب سے جس میں مبالغہ فی الکذب ہو جیسا کہ صدق میں مبالغہ کیلئے صدق کہا جاتا ہے۔

[۱۱-۱۲] وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

(اور جب ان سے کہا گیا زمین میں فساد نہ کرو تو کہنے لگے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں خبردار وہی فسادی ہیں لیکن وہ شعور نہیں رکھتے)

قباحتوں کی دوسری نوع

یہ قبائح منافقین کی دوسری نوع کا بیان ہے اس کی تفصیل میں متعدد وجوہات ہیں:

۱- لَا تُفْسِدُوْا کا قائل کون ہے؟

۲- فساد فی الارض سے کیا مراد ہے؟

۳- اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْن کہنے والے کون ہیں؟

۴- اصلاح سے کیا مراد ہے؟

پہلا مسئلہ: تُفْسِدُوْا کا قائل کون؟

لَا تُفْسِدُوا فِیْ الْاَرْضِ۔ (زمین میں فساد نہ کرو) بعض نے کہا اس کا قائل اللہ تعالیٰ ہے، بعض نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بعض کے ہاں کچھ اہلِ ایمان ہیں۔

ان تمام کا احتمال موجود ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ قائل ایسا شخص ہو جو دین ونصیحت کیلئے مخصوص ہی نہ ہو۔ اگرچہ اقرب یہی ہے کہ قائل وہ ہی ہو جن کی ان سے ملاقات ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک خبر نفاق پہنچتی مگر وہ قطعی نہ ہوتی تو آپ انہیں نصیحت کرتے تو وہ جواباً کہتے ہیں ہم پکے مومن اور صلاح میں دوسرے اہل ایمان کی طرح ہی ہیں یا کچھ ایسے لوگ جنہیں وہ فساد کا کہتے تو وہ ان کی بات قبول نہ کرتے اور اُلٹا وعظ کرتے ہوئے کہتے "لَا تُفْسِدُوْا"

سوال: کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں خبر نہ دیتے تھے؟

جواب: ہاں آپ کو خبر دیتے مگر جب ان پر عتاب ہوتا تو ندامت کرتے ہوئے اظہارِ اسلام کرتے، ناقلین کو قسمیں اٹھا کر جھوٹا قرار دیتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا:

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ — اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہ کہا اور بیشک ضرور انہوں نے کفر کی بات کہی (پ۱۰، التوبۃ:۷۴)

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ — تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ (پ۱۱، التوبۃ:۹۶)

چوتھا مسئلہ: امام نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو وما یخادعون اور باقی نے ما یخدعون پڑھا ہے۔ اولین کی دلیل مطابقت لفظی ہے تا کہ لفظ اول کے مطابق ہو جائے۔ دوسروں کی دلیل یہ کہ مخادعت، دو کی طرف سے ہوتی ہے لہٰذا انسان واحد اپنے کو دھوکہ نہیں دیتا

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ کی تفسیر

اس کی تفسیر دو طرح بیان کی گئی ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ کے طور پر سزا دے گا اور یہ حقیقت میں اپنے کو ہی دھوکہ دینے والے ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری نے مفہوم بیان کیا ہے۔

۲۔ اکثر مفسرین نے کہا، اس دھوکہ کا وبال انہی پر ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو دھوکہ کے ضرر سے بچا کر اس کا وبال انہی پر مسلط کر دے گا، جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پ۵، النساء:۱۴۲) — بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ انہیں غافل کر کے مارے گا

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (پ۱، البقرۃ:۱۴،۱۵) — ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ (پ۱، البقرۃ:۱۳) — تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنو احمق یہی ہیں

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا (پ۱۹، النمل:۵۰) — اور انہوں نے اپنا سا مکر کیا اور ہم نے اپنی خفیہ تدبیر فرمائی

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (پ۳۰، الطارق:۱۵،۱۶) — بیشک کافر اپنا سا داؤ چلتے ہیں اور میں نے بھی تدبیر کی

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (پ۶، المائدہ:۳۳) — یہ جزا ہے ان کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (پ۲۲، الاحزاب:۵۷) — جو لوگ اذیت دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو

۲۔ جب ہم ''لَا تُفْسِدُوْا'' کی تفسیر منافقین کی کفار کے ساتھ خاطر و مدارات سے کریں تو پھر ان کا قول (ہم اصلاح کرنے والے ہیں) مطلب ہوگا ہماری یہ مدارات، کفار اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی کوشش ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ حکایت فرمایا

اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ہمارا مقصود تو بھلائی اور میل ہی تھا

(پ۵، النساء:۶۲)

تو اب 'اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ' کا معنی ہوگا ہم اُمور نفسیہ میں اصلاح کرتے ہیں۔

علماء کا استدلال

اہل علم نے اس آیت سے استدلال کیا کہ جو ایمان ظاہر کرے اس پہ احکام مومنین ہی جاری کریں گے اور اس کے مخالف پر طعن نہیں کیا جائے گا اور زندیق کی توبہ قبول ہے۔ واللہ أعلم

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ کی تفسیر

تو یہ تین وجہ سے مفسد ٹھہرے۔

۱۔ یہ مفسد ہیں کیونکہ کفر، زمین میں فساد ہے۔

۲۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفران و ناشکری ہے۔

۳۔ ہر ایک کا اپنی خواہش کے مطابق چلنا۔

کیونکہ جب وہ نہ وجود اللہ مانے گا نہ ثواب کا امیدوار نہ عتاب کا تو وہ لوگوں کو پریشان ہی کرے گا۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ نفاق سراپا فساد ہے، اس لیے فرمایا

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ کیا تم چاہتے ہو کہ سربراہ بن کر زمین میں فساد پھیلاؤ

(پ۲۶، محمد:۲۲)

جیسا کہ پہلے تفصیل گزری ہے۔

[۱۳] وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳﴾

(اور جب ان سے کہا گیا ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے تو کہنے لگے ہم بےوقوفوں کی طرح ایمان لائیں یقیناً وہی بےوقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں)

قبائح کی تیسری نوع

یہ قبائح منافقین کی تیسری نوع کا بیان ہے اس لیے کہ جب سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں فساد سے منع فرمایا تو اس آیت میں انہیں ایمان کا حکم دیا کیونکہ حالتِ انسانی کا کمال ان دو امور کے مجموعہ سے ہوتا ہے۔

۱۔ غیر مناسب فعل کا ترک۔تو فرمایا: اٰمِنُوا (ایمان لاؤ)

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اٰمِنُوا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ، ایسا ایمان جو اخلاص سے متصل اور نفاق سے دور ہو۔

سوال: آیت بتا رہی ہے کہ محض زبانی اقرار ہی ایمان ہے اگر یہ ایمان نہ ہوتا تو ذات ایمان، اخلاص کے بغیر حاصل ہی نہ ہوتی۔تو ''اٰمِنُوا'' کے الفاظ حصولِ مطلوب میں کافی تھے اس کے بعد 'كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ' کا ذکر لغو و بے فائدہ ہے۔

جواب: ایمان حقیقی، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ہے جس میں اخلاص ہو البتہ ظاہر میں اقرارِ ظاہر کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔لہٰذا اس کی تائید کیلئے ان الفاظ 'كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ' کی ضرورت تھی۔

دوسرا مسئلہ: الناس کا الف لام

الناس کے الف لام میں دو وجوہات ہیں:

۱۔ یہ عہد کا ہے یعنی جیسے رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ ایمان لائے اور وہ معین لوگ ہیں یا حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی کیونکہ یہ انہی کے ابناء جنس ہیں۔

۲۔ یہ جنسی ہے، یہاں بھی دو صورتیں ہیں

پہلی صورت: اوس وخزرج، اکثر مسلمان ان سے تھے، تھوڑے ان میں منافق تھے تو عموم کا اطلاق اکثر پر ہوتا ہے۔

دوسری صورت: اہلِ ایمان ہی حقیقۃً انسان ہیں کیونکہ یہ ہی انسانیت کو اس کا حق دیتے ہیں اس لیے کہ باقی حیوانات پر فضیلت انسان کی وجہ رہنمائی عقل اور فکر ھادی ہے۔

تیسرا مسئلہ: اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ کا قائل رسول اللہ یا اہلِ ایمان ہیں

پھر کچھ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہم اس طرح ایمان لائیں جیسے بنوفلاں بے وقوف ایمان لایا، رسول اللہ ﷺ اسے نہ جانتے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ (یہی بے وقوف ہیں)

چوتھا مسئلہ: السفه، ہلکاپن، ہوا کسی شئ کو حرکت دے تو کہتے سفهت الریح الشیء، ذوالرمہ نے کہا

جرين كما اهتزت رياح تسفهت　　　　أعاليها مر الرياح الرواسم

ابوحاتم طائی نے کہا:

سفيه الرمح جاهله اذا ما　　　　بدا فضل السفيه على الحليم

بدزباں کو سفیہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ کم عقل ہوتا ہے اور اس کی بات کا وزن نہیں ہوتا، ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا　　　　اور بے عقلوں کو ان کے مال نہ دو جو تمہارے پاس ہیں جن کو اللہ نے تمہاری سرپرستی میں کیا ہے　(پ۴، النساء:۵)

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے

شَارِبُ الْخَمْرِ سَفِيْهٌ　　　　شرابی آدمی بے عقل ہوتا ہے

کیونکہ اس کا عقل کم ہے۔

منافقین، مسلمانوں کو سفیہ اس لیے کہتے کہ منافقین اہل ثروت وحکومت تھے اور مسلمان اکثر فقراء۔

منافقین کے ہاں دینِ محمدی ﷺ باطل تھا اور باطل کو کم عقل ہی قبول کرتا ہے۔

ان اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کو کم عقل قرار دیتے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان وجوہات پر یہ لقب انہیں کو دیا اور اس کا قول ہی حق ہے۔

۱۔ جو دلیل سے اعراض کرے اور دلیل ماننے والے کو سفیہ و بے وقوف کہے وہ خود سفیہ ہوتا ہے۔

۲۔ جس نے اپنی آخرت دنیا کے بدلے بیچ دی وہی سفیہ و پاگل ہے۔

۳۔ جس نے حضرت محمد ﷺ سے دشمنی کی اس نے اللہ کی دشمنی کی اور ایسا شخص بے وقوف ہے۔

پانچواں مسئلہ: یَعْلَمُوْنَ اور یَشْعُرُوْنَ میں فرق

آخر آیت میں فرمایا: "لَا یَعْلَمُوْنَ" اس سے پہلے فرمایا: "لَا یَشْعُرُوْنَ" اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ اس سے آگاہی کہ مسلمان حق پہ اور وہ باطل پہ ہیں۔ امر عقلی نظری ہے، جبکہ نفاق اور اس کے ذریعے بغاوت جو زمین میں فساد کا ذریعہ ہے، بدیہی و ضروری اور محسوس کی طرح ہے۔

۲۔ ذکر سفہ آیا تو یہ جہالت ہے تو اس کے ساتھ ذکر علم نہایت ہی مناسب ہے۔ واللہ اعلم

[۱۴-۱۵] وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

(اور جب وہ اہلِ ایمان سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ الگ ہوتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو استہزاء کرتے ہیں اللہ ان سے استہزاء کرتا اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ بھٹکیں)

قبائح کی چوتھی نوع

یہ قبائح منافقین کی چوتھی نوع کا بیان ہے، جب کوئی قریب ہو کر استقبال کرے تو کہا جاتا ہے۔ لقیتہ ولا قیتہ، امام ابوحنیفہ نے "اذ الاقوا" پڑھا، قالوا اٰمنا، مراد یہ ہے کہ ہم اخلاص قلبی سے ایمان لائے اس پہ دلیل دو وجہ سے ہے۔

۱۔ زبانی اقرار تو ان کا معلوم ہی تھا، اس کے بیان کی ضرورت ہی نہیں مشکوک، اخلاص قلبی تھا لہٰذا ان کی یہی مراد ہونا لازم ہے۔

۲۔ اہل ایمان سے کہنا "اٰمنا" (ہم ایمان لائے) اس سے وہی مراد لینا لازم ہے جو اس کی نقیض و مقابل ہو جس کا وہ اپنے شیاطین سے ذکر کرتے، ان سے وہ تکذیب قلبی کا اظہار کرتے تو لہٰذا یہاں لازم ہے کہ وہ اہل ایمان سے جو کہتے ہیں اس سے مراد تصدیق قلبی ہی ہو

وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ کی تفسیر

صاحب کشاف کہتے ہیں جب تم کسی کے ساتھ جدا ملو تو کہا جاتا ہے خلوت بفلان والیہ، ممکن ہے خلا بمعنی مضی، (گزر گیا) ہو قرون خالیہ (گزرے ادوار) یا خلوت بہ سے ہے جس کا معنی تمسخر کرنا ہے یا خلا فلان بعرض فلان سے ہے۔ (یعنی وہ فلاں کی عزت سے کھیلا)

معنی آیت یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے اہلِ ایمان سے تمسخر کرتے اور ان کے ساتھ اسے بیان کرتے جیسا کہ تم کہتے ہو۔ احمد الیك فلانا واذمه الیك۔

شیاطین، وہ لوگ جو تمرد و سرکشی میں ان کے مثل تھے۔

إِنَّا مَعَكُمْ کی تفسیر

- یہاں دو سوالات ہیں

پہلا سوال: اسکے قائل تمام منافقین ہیں یا بعض؟

جواب: اس میں اختلاف ہے اس لیے کہ جنہوں نے شیاطین کا معنی کبار منافقین کیا وہ یہ کہتے ہیں یہاں مراد چھوٹے منافقین ہیں، وہ ہی جب اہلِ ایمان سے ملتے تو کہتے امنّا اور جب اپنے اکابر سے ملتے تو کہتے انّا معکم تاکہ انہیں اپنے مخالف نہ سمجھیں

جنہوں نے شیاطین سے مراد کفار لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ تمام منافقین کا وطیرہ ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں شیاطین سے مراد ان کے اکابر ہیں خواہ وہ کفار ہیں یا اکابر منافقین، کیونکہ یہی زمین میں فساد پر قادر تھے، رہے اصاغر تو وہ اس پر قادر نہ تھے

دوسرا سوال: اہلِ ایمان سے جملہ فعلیہ میں گفتگو اور شیاطین کے ساتھ جملہ اسمیہ کے ساتھ جس میں اِنَّ برائے تاکید ہے؟

جواب: جس کے ساتھ وہ اہل ایمان سے کلام کرتے اس کا اقویٰ کلام ہونا مناسب نہیں کیونکہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے نہ یہ دعویٰ کہ اس سے ہمیں درجہ کامل مل گیا ہے اس لیے کہ ان کے نفوس مبالغہ پر معاون نہ تھے کیونکہ نفاق اور کراہت سے صادر ہونے والے قول میں مبالغہ کم ہی حاصل ہوتا ہے۔

یا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ایمان میں کمال کا دعویٰ کرنا مسلمانوں میں مروج ہی نہیں باقی اپنوں سے کلام میں تو وہ اپنا اعتقاد بتاتے اور جانتے کہ سننے والے قبول کر رہے ہیں لہٰذا اس میں تاکید ضروری تھی۔

اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ کی تفسیر

یہاں دو سوالات ہیں

پہلا سوال: استہزاء سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ اصلاً الخفة من الهزء سے ہے۔ (دشمن جلد باز) وهزأ يهزأ (اپنی جگہ مرنے والا) ناقته تهزأ (سواری جلدی چلی)

استہزاء کی تعریف یہ ہے کہ ایسی موافقت کا اظہار کہ باطن میں بطریق مذاق و تمسخر برائی موجود ہو تو اب اس کا معنی ہو گا ہم ان کے دین میں موافقت کا اظہار کرتے ہیں تا کہ ہم ان کے عذاب و شر سے بچ جائیں اور ان کے اہم اسرار سے آگاہی پائیں اور ان سے صدقات و غنائم ہڑپ کرتے رہیں۔

دوسرا سوال: اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ کا "اِنَّا مَعَكُمۡ" کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

جواب: یہ اس کی تاکید ہے کیونکہ "اِنَّا مَعَكُمۡ" کفر پر ثبات کا اظہار اور "اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ" اسلام کی تردید ہے۔ نقیضِ شی کا رد اس شی کے اثبات کی تاکید ہوتی ہے۔

یا اس سے بدل ہے کیونکہ جو اسلام کو حقیر کہے گا وہ کفر کو عظیم مانے گا۔

یا یہ نیا جملہ ہے جب انہوں نے "اِنَّا مَعَكُمۡ" کہا تو انہوں نے اعتراض اٹھایا۔ اگر یہ درست ہے تو تم اہلِ اسلام سے موافقت کیوں رکھتے ہو تو جواباً کہا: اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ (ہم تو مذاق کرتے ہیں)

جوابی تذکرہ اشیاء

اللہ تعالیٰ نے جب ان کی کچھ اشیاء کا ذکر کیا تو اب جواباً کچھ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، فرمایا:

اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ (پ۱، البقرۃ:۱۵) اور اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے

یہاں چند سوالات ہیں

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کا یہ وصف کہ وہ استہزاء فرماتا ہے، درست نہیں کیونکہ یہ ثابت ہے کہ استہزاء تلبیس سے الگ نہیں ہو سکتا اور یہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔

اس لیے بھی کہ استہزاء جہل سے جدا نہیں ہو سکتا، ارشاد ہے

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (پ۱،البقرۃ:۶۷)
بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں، فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں

اور جہل اللہ تعالیٰ پہ محال ہے۔

معنیٰ استہزا کی پانچ تاویلات

جواب: مفسرین نے پانچ تاویلات ومعانی بیان کیے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے استہزاء پر جو انہیں سزا دینی ہے اسی کا نام استہزاء رکھ دیا کیونکہ کسی شی کی جزا کو شی کا نام دیا جاتا ہے، ارشاد فرمایا:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (پ۲۵،الشوریٰ:۴۰)
اور برائی کا بدلہ اسی کے مثل برائی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (پ۲،البقرۃ:۱۹۴)
اور جو تم پر زیادتی کرے اس پر اس کی مثل ہی زیادتی کرو جتنی تم پر کی

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پ۶،النساء:۱۴۲)
وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں جبکہ وہ ان کو اس کی سزا دیتا ہے

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ (پ۳،آل عمران:۵۴)
اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے

اللهم ان فلاناً هجاني وهو يعلم أني لست بشاعر فاهجه اللهم والعنه عدد ما هجاني (مسند الفردوس:۲۰۷۱)
اے اللہ فلاں نے میری ہجو کی ہے اور وہ جانتا ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس کی مذمت فرما۔ اے اللہ! جس قدر اس نے میری ہجو کی ہے تو اس کے برابر اس پہ لعنت فرما۔

یعنی اس کی ہجو کی سزا عطا فرما۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے

تكلفوا من الاعمال ما تطيقون فان الله لا يمل حتى تملوا (البخاری:۴۳)
طاقت کے مطابق عمل کیا کرو، اللہ تعالیٰ نہیں ملال فرماتا یہاں تک کہ تم تھک جاتے ہو

۲۔ ان کا مومنین کے ساتھ استہزا ان کی طرف لوٹ آئے گا اور اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا تو گویا اللہ تعالیٰ نے ان سے استہزا کیا ہے نہ کہ حقیقۃً

۳۔ کفار استہزا میں توہین اور حقارت ہے تو ذکر استہزا سے مراد حصول توہین ہے یعنی سبب سے مراد مسبب ہے

۴۔ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ استہزا یہ ہے کہ ان پر دنیا میں ایسے احکام جاری ہوں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے مخالف احکام ہوں جیسا کہ انہوں نے حضور ﷺ اور اہلِ ایمان پر کچھ اور ظاہر کیا حالانکہ ان کے باطن میں اس کے مخالف تھا

تاویل ضعیف

لیکن یہ تاویل ضعیف ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیاوی احکام ظاہر فرمائے تو ساتھ ہی دار آخرت کے معاملات، ٹھکانہ بد اور عقاب عظیم پر بھی واضح دلائل عطا فرمائے تو اب دنیا کے احکام کی مخالفت نہ رہی۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں ان کے ساتھ مذاق کرنے والے کی طرح کا معاملہ کیا ہے دنیا میں یوں کہ:

ان اللّٰه تعالٰى اطلع الرسول على اسرارهم مع أنهم كانوا يبالغون فى اخفائها عنه

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان کے رازوں سے آگاہ کر دیا حالانکہ وہ انہیں بہت ہی چھپاتے۔

اور آخرت میں یوں کہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جب اہل ایمان جنت اور کافر دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جنت کا ایک ایسا دروازہ کھولے گا جو دوزخ کی اس طرف ہے جو منافقین کا مسکن ہوگا جب منافقین دروازہ کھلا دیکھیں گے تو وہ دوزخ سے نکلنے اور جنت میں جانے کیلئے نکل پڑیں گے اہل جنت انہیں دیکھ رہے ہوں گے جیسے ہی وہ دروازہ جنت تک پہنچیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ یہی اس ارشاد گرامی کا معنی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ لَضَاۤلُّوْنَ وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ

(پ۳۰، المطففین: ۲۹-۳۴)

بیشک مجرم لوگ ایمان والوں سے ہنسا کرتے تھے اور جب وہ ان پر گزرتے تو یہ آپس میں ان پر آنکھوں سے اشارے کرتے اور جب اپنے گھر پلٹتے تو خوشیاں کرتے پلٹتے اور جب مسلمانوں کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہکے ہوئے ہیں اور یہ کچھ ان پر نگہبان بنا کر نہ بھیجے گئے تو آج ایمان والے کافروں سے ہنستے ہیں

اور یہ ان کے ساتھ استہزا ہی ہے۔

دوسرا سوال: "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" نیا کلام بغیر عطف کیوں؟

جواب: انتہائی عظمت و فخامت کیلئے کیا۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسا عظیم استہزاء کرے گا کہ ان کا استہزا

اس کے مقابل کالعدم ٹھہرے گا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے اہلِ ایمان سے استہزا کا بدلہ لینے کا مالک ہے، اہل ایمان کو ضرورت ہی نہیں کہ ان سے استہزا کی صورت میں معاوضہ ومقابلہ کریں۔

تیسرا سوال: کیوں نہ اِنَّ اللّٰہ مستھزیٔ بھم، فرمادیا تا کہ 'اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ' کے مطابق جاتا۔

پہلا جواب: یستھزیٔ میں بار بار، وقتاً فوقتاً حدوث وایجاد استہزاء پر دلالت ہے اور یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا وعبرت تھی، فرمایا:

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ (پ۱۱، التوبۃ:۱۲۶) — کیا انہیں نہیں سوجھتا کہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائے جاتے ہیں

اکثر اوقات ان کے رازوں کو آشکار کر کے انہیں رسوا کیا جاتا اور وہ ڈرے رہتے کہیں کوئی اور سورت نہ نازل ہو جائے۔

جیسے فرمایا

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (پ۱۰، التوبۃ:۶۴) — منافق ڈرتے ہیں کہ ان پہ کوئی سورۃ ایسی اُترے جو ان کے دلوں کی چھپی بتا دے تم فرماؤ ہنسے جاؤ اللہ کو ضرور ظاہر کرنا ہے جس کا تمہیں ڈر ہے

وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کی تفسیر

صاحب کشاف کہتے ہیں، جب لشکر میں اضافہ اور اس کے ساتھ طاقت وکثرت والا لاحق ہو جائے تو 'مد الجیش' کہا جاتا ہے، اسی طرح سیاہی میں خوب صلاحیت آجائے تو مد الدواۃ کہتے ہیں۔ جب چراغ اور کوزیت زمین وکھاد سے درست کر دیا جائے تو کہا جاتا ہے: مددت السراج والارض، جب شیطان وسوسہ ڈالے تو 'مدہ الشیطان فی الغی' کہتے ہیں۔ مد، اور امد دونوں ایک ہی ہیں۔

بعض نے کہا مد، کا استعمال شر اور امد، کا خیر میں ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۵۵) — کیا یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ جو ہم ان کی مدد کر رہے ہیں مال اور بیٹوں سے

بعض کا خیال ہے کہ یہ مد بمعنی عمر، املا اور مہلت دینا ہے۔ لیکن یہ دو وجہ سے غلط ہے

۱۔ امام ابن کثیر اور ابن محیصن کی قرأت "وَنَمُدُّهُمْ" ہے اور امام نافع کی قرأت، وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ، واضح کر رہی ہے کہ یہ مدد سے ہے نہ کہ مد سے۔

۲۔ جو مہلت کے معنی میں ہیں وہ بھی مد له، سے ہے جیسے املی له (اس نے اسے ڈھیل دی)

معتزلہ کا مؤقف

معتزلہ کہتے ہیں اس آیت مبارکہ کو ان دلائل کی بنا پر ظاہر پہ محمول کرنا ممکن نہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ (پ۹، الاعراف:۲۰۲) اور ان کے بھائی ان کو سرکشی میں ڈھیل دیتے ہیں۔

یہاں گمراہی کو ان کے ہم مثل کی طرف منسوب کیا گیا۔ تو اسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس سرکشی پر ان کی مذمت کی ہے اگر یہ فعل اللہ تعالیٰ کا ہی ہو تو اس پہ ان کی مذمت کیوں؟

۳۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تو نبوت و قرآن باطل ہیں اس کی تفسیر کا مطالعہ عبث و بے فائدہ ہوگا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے "فِيْ طُغْيَانِهِمْ" میں سرکشی کی نسبت انہی کی طرف سے ہے اگر یہ اللہ کی طرف ہے تو ان کی طرف نسبت کرنا مناسب نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف نسبت واضح طور پر اس لیے کر دی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کا خالق نہیں۔ جب شیاطین کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو مطلقاً ذکر ہوتا ہے نہ کہ مقید۔

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ - (پ۹، الاعراف:۲۰۲) اور ان کے بھائی ان کو سرکشی میں ڈھیل دیتے ہیں

جب معاملہ یونہی ہے تو اب اس کی تاویل میں یہ اقوال ہیں

وجوہ تاویل آیت

پہلی وجہ: یہ شیخ کعبی اور ابو مسلم بن یحییٰ اصفہانی کی تاویل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو الطاف عطا کیے اور منافقوں کے کفر اور اس پر اصرار کی وجہ سے ان کے دلوں میں تاریکی میں اضافہ اور مسلمانوں کے دلوں میں نور کا اضافہ کر دیا اور اسی اضافہ کو مدد قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی کیونکہ ان کے اس فعل کا سبب وہی ہے۔

دوسری وجہ: اسے منع قہر و مجبوری پر محمول کر لیا جائے جیسا کہ محاورہ ہے سفیہ کو جب منع نہ کیا جائے تو وہ مامور ہوتا ہے۔

تیسری وجہ: فعل شیطان کی، نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کیونکہ یہ اسی کی دی ہوئی قدرت، تمکن اور بندوں کے اغوا کی اجازت سے ہے

چوتھی وجہ: شیخ جبائی کہتے ہیں "یَمُدُّھُمْ" کا معنی ان کی عمر لمبی کردی اس کے باوجود وہ اپنی سرکشی میں اندھے رہے۔

لیکن یہ دو وجہ سے ضعیف ہے:

۱۔ ہم نے پیچھے واضح کیا لغت میں "یَمُدُّھُمْ" کی تفسیر طویل عمر نہیں۔

۲۔ ہم یہ معنی تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر اس غرض کیلئے بڑھائی کہ اپنی سرکشی میں اندھے رہیں تو اس پر اعتراض ہو جائے گا

قاضی عبدالجبار نے اس کا جواب یہ دیا کہ طویل عمر سے اللہ تعالیٰ کی غرض سرکشی کی طرف لے جانا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہربانی فرماتے ہوئے باقی رکھا تا کہ وہ اطاعت بجالائیں مگر وہ انکار کرتے ہوئے بہک گئے۔

اس سلسلہ میں 'خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ' کے تحت تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے اس کے اعادہ میں کوئی فائدہ نہیں۔

طغیان کا معنی

طغیان، کفر میں غلو اور سرکشی میں حد سے گزر جانا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (پ۲۹، الحاقہ:۱۱) بیشک جب پانی نے سر اٹھایا تھا

یعنی اندازہ سے زائد۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (پ۱۶، طٰہٰ:۲۴) فرعون کے پاس جا اس نے سر اٹھایا ہے

یعنی زیادتی کرتے ہوئے حد سے گزر گیا۔

حضرت زید بن علی نے "طِغیانهم" کی طا پر زیر پڑھی ہے اس میں دو لغات ہیں۔ لُقیاں، لِقیان۔

عمه، عمیٰ کی مثل ہے۔ البتہ عمی، بصر و رائی میں عام ہے۔ لیکن عمه فقط رائے میں ہے اور وہ تردد و تحیر کا نام ہے کہ علم نہیں کہاں جانا ہے

[۱۶] أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

(یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو کچھ فائدہ نہ دے گی ان کو ان کی تجارت اور وہ ہدایت پانے والے نہیں)

گمراہی خریدنے کا مفہوم

واضح رہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدنے کا معنی یہ ہے کہ گمراہی کو پسند کرلیا اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی۔

سوال: انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے کیسے خریدا جبکہ وہ ہدایت پہ تھے ہی نہیں؟

جواب: ہدایت پہ قادر تھے گویا ان کے قبضہ میں تھی جب اسے ترک کر کے ضلالت کی طرف چلے گئے تو گویا انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی۔

ضلالت، ظلم، اعتدال سے دوری، ہدایت کا گم کردینا، دین میں صواب سے دور ہونا، کیلئے مستعمل ہے۔

فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ۔ انہوں نے اپنی تجارت میں نفع نہ پایا۔

یہاں دو سوالات ہیں

پہلا سوال: خسارہ کی نسبت تجارت کی طرف کی حالانکہ خسارہ اصحابِ تجارت کو ہوا؟

جواب: یہ اسناد مجازی ہے کہ فعل کی نسبت ایسی شی کی طرف کردی جائے جو اس کے ساتھ اسی طرح متلبس و متصل ہو کہ وہ اس کی حقیقت ہی ہو جیسے تجارت مشتری و خریدار سے متلبس و متصل ہے۔

دوسرا سوال: مان لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدنا مجازاً معنی استبدال ہے لیکن ذکر نفع اور تجارت کا کیا معنی؟ جبکہ حقیقت میں بیع ہے ہی نہیں؟

جواب: یہ بات مجازی معنی کو تقویت و حسن دے رہی ہے، شاعر نے کہا:

ولما رأیت النسر عز ابن دأیة ۔۔۔ وعشش فی وکریه جاش له صدری

اسی طرح یہاں جب شرا کا ذکر آیا پھر اس کے ساتھ ان کے خسارے کی تمثیل اور اس کی حقیقت کی تصویر سامنے لانے کیلئے شرا سے متعلقہ اجزا کا ذکر کیا

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ کی تفسیر

معنی یہ ہے کہ تاجروں کے تصرفات میں مطلوب دو اُمور ہوتے ہیں۔۱۔سرمایہ کی سلامتی ۲۔نفع
ان منافقین نے دونوں ضائع کردیے کیونکہ ان کا سرمایہ عقل تھی جو کسی مانع سے خالی تھی جب انہوں نے گمراہ کن عقائد اختیار کر لیے تو یہ اختیار کردہ فاسد عقائد، صحیح عقائد کے حصول وطلب میں مانع اور رکاوٹ بن گئے۔

حضرت قتادہ کہتے ہیں: یہ لوگ ہدایت سے گمراہی، طاعت سے معصیت، جماعت سے فرقہ، امن سے خوف اور سنت سے بدعت کی طرف منتقل ہوگئے۔واللہ اعلم

[۱۷] مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

(ان کی مثل ایسی ہے کہ جس نے آگ روشن کی تو جب اس کا آس پاس سب جگمگا اُٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نہیں سوجھتا)

دو اشیاء پر گفتگو

اس آیت کے الفاظ کی تفسیر سے پہلے دو اشیاء پر گفتگو ضروری ہے۔

۱۔ ضرب المثل سے مقصود دلوں میں اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔جو خود اس شی سے نہیں ہوتا اس لیے کہ مثل سے غرض خفی کی، جلی سے غائب کی شاہد سے تشبیہ ہوتی ہے۔جو اس کی ماہیت پر واقفیت میں پختگی اور حس کو عقل کے مطابق کر دیتی ہے۔اور اس میں نہایت ہی وضاحت ہے کیا تم نہیں دیکھتے جب ایمان پر ترغیب بغیر ضرب المثل ہو تو اس کا دل پہ اس قدر پختہ اثر نہیں ہوتا جیسا کہ اس کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب ایمان کی مثال نور سے دی جائے اسی طرح جب تم محض ذکر کفر سے ڈراؤ تو عقلوں میں اس کی قباحت اسی طرح پختہ نہیں ہوگی جیسا کہ ظلمت سے مثال کے ذریعے ہوتی ہے، جب تم نے کسی معاملہ کی کمزوری بیان کرنی ہو اور اس کی مثال عنکبوت کے جالا سے دو تو یہ اس خبر سے یقیناً زیادہ پُر اثر ہوگی جو محض کمزوری کے ذکر پر مشتمل ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مبین اور دیگر کتب میں اکثر امثال بیان فرمائی ہیں

ارشادِ الٰہی ہے

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ اور یہ مثالیں لوگوں کیلئے ہم بیان کرتے ہیں

(پ۲۸، الحشر:۲۱، پ۲۰، العنکبوت:۴۳)

انجیل کی سورتوں میں سے ایک سورت کا نام 'سورۃ الامثال' ہے۔

آیت مبارکہ اور مسائل

پہلا مسئلہ: مثال کے لیے شرط

المثل، عربوں کے کلام میں بمعنیٰ مثل ہے اور یہ نظیر کہلاتی ہے۔ مَثَلٌ، مِثْلٌ، مثیل جیسے شَبَہٌ، شبہ، شبیہ، پھر ایسے قول کو کہا جاتا ہے جو مشہور ہو اور اس کے ساتھ مثال دی جاتی ہو اور اس کی شرط یہ ہے کہ اس قول میں کسی طرح کی غربت واجنبیت نہ ہو۔

دوسرا مسئلہ، دو مثالیں

اللہ تعالیٰ نے احوال منافقین کی حقیقت بیان کی تو اس کے بعد کشف و بیان میں اضافہ کیلئے دو مثالیں دی ہیں:

۱۔ ان میں سے ایک اس مذکورہ آیت میں ہے۔

چند اشکالات

یہاں چند اشکال ہیں

۱۔ ان کی مثال ایسے لوگوں سے دینے کی وجہ کیا ہے جو نور والے تھے پھر ان سے نور چھین لیا گیا حالانکہ ان کے پاس تو نور تھا ہی نہیں؟

۲۔ جس نے آگ روشن کی اور وہ تھوڑی روشن رہی تو جلانے والے نے اس سے اور اس کی روشنی سے نفع پایا پھر محروم کر دیا گیا لیکن منافقین نے ایمان سے کوئی نفع نہیں پایا تو پھر یہ مثال کیوں؟

۳۔ آگ روشن کرنے والے نے اپنے لیے روشنی حاصل کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا نور لے لیا اور اسے ظلمات میں چھوڑ دیا منافق نے کبھی اپنے لیے خیر طلب ہی نہیں کی اسے جو مایوسی اور حیرت ملی وہ اس کی ذات کی طرف سے تھی پھر وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جواب: وجوہات کیفیت تشبیہ

اہل علم نے کیفیت تشبیہ کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں۔

۱۔ امام سدی کہتے ہیں، جب حضور علیہ السلام مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کچھ منافقین اسلام میں داخل ہوئے مگر پھر منافق ہو گئے تو اب تشبیہ واضح وصحیح ہے۔ کیونکہ پہلے انہیں ایمان کا نور حاصل ہوا پھر دوبارہ نفاق سے اس نور کو باطل کر کے گمراہی عظیمہ میں

گر گئے کیونکہ گمراہی دین سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں کیونکہ راستہ میں ظلمت کی وجہ سے بھٹکنا دنیا میں قلیل ہے لیکن دین سے بھٹک جانا آخرت میں آبدالاباد تک خسارہ پانا ہے۔

۲۔ جو امام سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر یہ درست نہ ہو بلکہ یہ لوگ ابتدا سے لے کر دائمی منافق تھے تو اب دوسری تاویل ہے جس کا ذکر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔

وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کا اظہار کیا تو اس سے ان کے خون محفوظ، ان کے اموال غنیمت بننے سے اور ان کی اولاد گرفتاری سے محفوظ ہوگئی اور یہ غنائم جہاد اور دیگر احکام مسلمین پانے میں کامیاب رہے اور اسی کو انوار ایمان میں سے ایک نور شمار کیا گیا۔ چونکہ یہ ان کے عذاب دائمی کے مقابل قلیل ہے تو انہیں اس آگ جلانے والے سے تشبیہ دی جس نے اس کی روشنی سے قلیل نفع پایا پھر اس سے چھین لی گئی اور وہ دائمی گمراہی اور حسرت ظلمت میں چلا گیا جو نور کے بعد آئی گویا ان کا دنیا کا نفع پانا اس نور کی مانند اور آخر میں ان کا عظیم ضرر، ظلمت کے مشابہ ہے۔

۳۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں منافق کی وجہ تشبیہ نور نہیں بلکہ وجہ تشبیہ آگ جلانے والے سے یہ ہے کہ جب نور زائل ہوگیا تو وہ متحیر ہوگیا، اس کا تحیر جو نور میں تھا اور اس سے زائل ہوگیا وہ زیادہ شدید ہوگا اس کے تحیر سے جو راستہ پر ہمیشہ ظلمت میں چل رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آگ جلانے والے میں نور کا ذکر کر دیا تاکہ اسے ظلمت شدیدہ کہا جا سکے یہ نہیں کہ وجہِ تشبیہ نور و ظلمت کا مجموعہ ہے

۴۔ جو ان کا اظہار اسلام تھا وہ وہم پیدا کرتا ہے کہ یہ باب نور سے ہے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے، اور نور کا جانا یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کفر و نفاق کا ذکر و اظہار کرتے۔

جس نے یہ تاویل کی، اس نے کہا کہ اس مثال کا عطف 'وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ' پہ ہے تو نار (نور) ان کے قول "اٰمَنَّا" (ہم ایمان لائے) کی مثال ہے اور اس کا چلا جانا کفار کے ساتھ یہ کہنا ہے اِنَّا مَعَكُمْ (ہم تمہارے ساتھ ہیں)

سوال: منافق جو کلمہ ایمان ظاہر کر رہا ہے اس کی مثال نور کیوں حالانکہ اقرار کے وقت دل میں مخفی اس کے مخالف ہے؟

جواب: اگر اس قول کے ساتھ وہ اعتقاد و عمل بھی ملا لے تو اسے نور کامل حاصل لیکن جب اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا نور تام نہ ہوا۔ باقی محض ان کے قول کو نور کہہ دیا کیونکہ فی نفسہ یہ قول حق ہے۔

۵۔ ممکن ہے آگ روشن کرنے سے مراد منافق کا، اظہار کلمہ ایمان ہو اور اسے نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا ظاہر مسلمانوں میں مزین اور اس سبب سے ان کے درمیان ممدوح و محترم بنا۔ پھر اللہ تعالیٰ بایں طور ان کا نور لے گیا کہ اس نے

اپنے نبی ﷺ اور اہلِ ایمان کو حقیقت معاملہ سے آگاہ کر کے ان کا پردہ چاک کر دیا تو پھر ان کیلئے اسم ایمان کی جگہ اسم نفاق ظاہر ہو گیا اب وہ ظلمات میں چلے گئے کہ کچھ نظر نہ آئے کیونکہ اس سے پہلے جو نور تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا معاملہ آشکار کر دیا تو وہ ختم ہو گیا

۶۔ جب ان منافقین کے بارے میں بیان ہوا کہ انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدا، اس کی یہ تمثیل ذکر کی جس ہدایت کو انہوں نے بیچا اسے اس آگ کے ساتھ تشبیہ دی جو جلانے والے کے اردگرد روشن ہوئی اور خریدی گمراہی کو اور ان کے دلوں پر مہر لگانے کی اللہ تعالیٰ نے ان سے نور لے جانے اور انہیں ظلمات میں چھوڑ دینے سے تشبیہ دی ہے۔

۷۔ ممکن ہے یہاں روشن کرنے والا ایسی آگ روشن کرنے والا ہو جسے اللہ تعالیٰ پسند ہی نہیں کرتا اور یہاں غرض اس فتنہ کی آگ سے تشبیہ ہو جس کے اٹھانے کا منافقین ارادہ رکھتے تھے کیونکہ جو فتنہ وہ برپا کر رہے تھے اس کی مدت وبقا بہت ہی قلیل تھی کیا تم نے یہ ارشاد نہیں سنا

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے

(پ ۶، المائدۃ:۶۴)

۸۔ حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں، یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی، وہ حضور ﷺ کی آمد کے منتظر اور مشرکینِ عرب کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح مانگتے تھے لیکن جب آپ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو آپ کے ساتھ کفر کیا تو ان کی حضور ﷺ کیلئے انتظار آگ جلانے کی طرح ہے، اور آپ کے ظہور کے بعد، انکار وکفر اس نور کا زوال ہے۔

تیسرا مسئلہ: ایمان وکفر اور نور وظلمت

ایمان کی تشبیہ نور اور کفر کی ظلمت کے ساتھ، کتاب اللہ میں کثیر ہے، وجہ یہ ہے کہ نور، حجت، طریق منفعت اور ازالہ گمراہی کیلئے بڑا ہادی ہے اور دین کے معاملہ میں یہی حال ایمان کا ہے تو جو معاملہ دین میں ازالہ حیرت اور حصول منفعت کا بڑا ذریعہ ہے اسے اس کے ساتھ تشبیہ دی جو معاملہ دنیا میں بڑا ہے۔

اس طرح کی بات کفر کی ظلمت کے ساتھ تشبیہ میں ہے کہ صحیح اور ضروری راستہ سے گمراہ ہو جانے والے پر ظلمت سے بڑھ کر کوئی اسباب حرمان وتحیر نہیں ہوتے اور ادھر معاملہ دین میں، کفر سے بڑھ کر اعظم کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دی، اس آیت کے مقصود کلی میں یہی گفتگو ہوئی ہے۔

کچھ سوالات وجوابات

یہاں تفصیل کیلئے کچھ سوالات وجوابات ہیں۔

پہلا سوال: ارشادِ الٰہی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا کا تقاضا ہے کہ ان کی مثال، آگ روشن کرنے والے کی طرح ومشابہ ہے تو منافقین کی مثال اور آگ روشن کرنے والوں کی مثال کے درمیان وجہ شبہ کیا ہے جس کی بنا پر ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دی گئی؟

جواب: یہاں مثال سے مجازاً مراد قصہ یا صفت ہے جبکہ اس کی شان اور اس میں غرابت ہو گویا فرمایا ان کا قصہ آگ روشن کرنے والوں کے قصہ کی طرح ہے، جیسے فرمایا:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (پ ۱۳، الرعد: ۳۵) واقعہ اس جنت کا کہ ڈر والوں کیلئے جس کا وعدہ ہے

یعنی ہم نے جو واقعات تمہیں بیان کیے ان میں جنت کا قصہ بہت عجیب ہے

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (پ ۱۹، النمل ۵۰) اور اللہ کی شان سب سے بلند

یعنی وہ وصف جس میں عظمت وجلالت ہے

مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ (پ ۲۶، الفتح: ۲۹) ان کی صفت توریت میں ہے۔

یعنی ان کا وصف وشان پُر تعجب ہے۔

جب مثل میں معنی غرابت ہوتا ہے تو کہتے ہیں فلان مثله فی الخیر والشر (فلاں خیر وشر میں عجیب ہے) تو اس سے شان عجیب کیلئے صفت (مثیل) کا اشتقاق ہوا۔

دوسرا سوال: جماعت کو واحد کے ساتھ تشبیہ کیوں؟

جواب: اس کا متعدد طرح سے جواب ہے۔

۱۔ لغت میں الذی، الذین کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے، جیسے فرمایا:

وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا (پ ۱۰، التوبۃ: ۶۹) اور تم بیہودگی میں پڑے جیسے وہ پڑے تھے

یہ اس لیے جائز ہے کہ الذی، ہر مجمل معرفہ کی صفت بنتا ہے اور یہ کلام میں کثرت کے ساتھ ہے، اس لیے بھی کہ یہ صلہ کے ساتھ طویل ہو جاتا ہے لہٰذا تخفیف اس کے مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حذف تعلیل جاری کرتے ہوئے اس کی یا کو حذف کر دیتے ہیں پھر اسم فاعل اور اسم مفعول پر فقط الف لام (بمعنی الذی) پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

۲- مراد آگ روشن کرنے والوں کی جنس ہے یا جماعت یا گروہ آگ روشن کرنے والی۔

۳- یہ قول اقویٰ ہے، منافقین اور ان کی ذوات کی ذاتِ مستوقد (آگ جلانے والا) سے مشابہت نہیں حتیٰ کہ جماعت کی واحد سے تشبیہ لازم آئے، ان کے قصہ کی قصہ مستوقد سے تشبیہ ہے، جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ (پ۲۸، الجمعہ:۵) ان کی مثال جن پر تورات رکھی گئی تھی پھر انہوں نے اس کی حکم برداری نہ کی گدھے کی مثال تھے

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (پ۲۶، محمد:۲۰) دیکھتے ہیں آپ کی طرف ان کا دیکھنا جس پر مردنی چھائی ہو

۴- معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی مثال یہ ہے مثلاً، ارشادِ الٰہی ہے:

يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (پ۲۴، غافر:۶۷) تمہیں نکالتا ہے بچہ

یعنی اس نے تم میں سے ہر ایک کو نکالا۔

تیسرا سوال : وقود، نار، نور اور ظلمت سے کیا مراد ہے؟

جواب: وقودِ نار، آگ اور اس کے شعلوں کا بلند ہونا، نار، لطیف جوہر جو گرم اور جلاتا ہے یہ نار ینور بمعنی نفر ہے کیونکہ اس میں حرکت واضطراب ہے، نور اسی سے مشتق اور یہ اس کی روشنی ہے، المنار، علامت، منارہ، جس پہ اذان دی جائے۔ یا جس پر چراغ رکھا جائے، اس سے نورۃ ہے جو بدن کو پاک کر دیتا ہے، زیادہ روشن کو اضاءۃ اس کے مصداق کا بیان یہ ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (پ۱۱، یونس ۵) وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا

اضاء، لازم ومتعدی ہوتا ہے اضاء القمر الظلمۃ اور اضاء القمر بمعنی قمر کو روشن کر دیا، شاعر نے کہا:

اضاءت لهم أجساهم ووجوههم
دجی اللیل حتی نظم الجزع ثاقبه

شی کا ماحول، اس کا اردگرد اور متصل، دار حولہ، حول، سال، کیونکہ اس میں تغیر آتا ہے حال عن العهد (اس نے وعدہ بدل دیا) حال لونہ (اس کا رنگ بدل گیا) حوالہ، ایک شخص سے حق دوسرے کی طرف پھیر دینا محاولہ، طلب فعل اس کے بعد کہ وہ اس کا طالب نہ تھا، حول، عین کا بدل جانا، حول، انقلاب، ارشادِ الٰہی ہے:

لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (پ۱۶، الکہف:۱۰۸) ان سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے

ظلمۃ، اس سے نور کا عدم، جس کی شان میں منور ہونا ہو، اصل لغت میں مراد نقصان ہوتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

آتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (پ۱۵، الکہف:۳۳) پھل لائے اور اس میں کچھ کمی نہ دی

یعنی اس میں کوئی کمی نہ آئی، محاورہ ہے ''من اشبہ اباہ فما ظلم'' (حق مشابہت میں کمی نہیں آئی)

ظلم، برف کیونکہ اس میں کمی جلدی واقع ہوتی ہے، الظلم، ماء السن، شبنم، تری اور اس کی سفیدی کیونکہ اس کی برف کے ساتھ تشبیہ ہے۔

چوتھا سوال: اضاءت متعدی ہے یا نہیں؟

جواب: دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے ''اضاء ت النار بنفسھا اضائت غیرہ'' اسی طرح ''اظلم الشئ بنفسہ واظلم غیرہ'' (یعنی اس نے اسے تاریک کردیا) یہاں اقرب، متعدی ہونا ہے، ممکن ہے غیر متعدی ہو اور ماحول کی طرف منسوب اور معنی کی بنا پر مونث ہو کیونکہ مستوقد کا ماحول، مقامات اور اشیاء ہوتیں ہیں، اسی کی تائید قرأت شیخ ابن ابی عبلہ ''ضاء'' سے بھی ہو رہی ہے

پانچواں سوال: جب فَلَمَّا اَضَآئَتْ فرمایا تو اب کیوں نہ یہ فرمایا: ذَهَبَ اللّٰهُ بِضَوْئِهِمْ (اللہ تعالیٰ ان کی ضوء لے گیا) جبکہ فرمایا: ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (اللہ ان کا نور لے گیا)

جواب: نور کا ذکر زیادہ موثر و بلیغ ہے کیونکہ ضوء میں زیادتی اور اضافہ پر دلالت ہوتی ہے اگر کہا جاتا۔ ذھب اللّٰہ بضوئھم (اللہ ان کی ضوء لے گیا) تو وہم ہوتا شاید کمال و اضافہ ختم ہوا، لیکن نور باقی رہا حالانکہ غرض ان سے بالکل نور کا ازالہ و نفی ہے کیا تم دیکھتے نہیں اس کے بعد فرمایا

وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (پ۱ البقرہ:۱۷) اور ان کو چھوڑ دیا تاریکیوں میں کہ انہیں کچھ نہیں سوجھتا

اور ظلمت، عدمِ نور ہے پھر ظلمات جمع اور نکرہ ذکر ہوئے پھر یہ کلمات لائے ''لَا يُبْصِرُوْنَ'' جو واضح کر رہے ہیں کہ اب ظلمت خالص ہی رہ گئی

چھٹا سوال: اب کیوں فرمایا: ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ۔ کیوں نہ فرمایا: اَذْهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ؟

جواب: ''اذھب'' اور ''ذھب بہ'' میں فرق ہے اذھب کا معنی اس نے زائل اور چلتا کردیا، ذھب بہ کا معنی زائل کرکے ساتھ لے جانا ہے۔ مثلاً ''ذھب السلطان بمالہ'' (یعنی مال سلطان ساتھ لے گیا) ارشادِ الٰہی ہے:

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ (پ۱۲، یوسف:۱۵) پھر جب اسے بھائی ساتھ لے گئے

اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ (پ۱۸، المؤمنون:۹۱) یوں ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق لے جاتا

معنی یہ ہے کہ اللہ نے ان کا نور لے کر اپنے پاس روک لیا اور اس کی شان عالی یہ ہے:

وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ (پ۲۲،فاطر:۲) اور جو کچھ روک لے تو اس کی روک کے بعد اس کا کوئی چھوڑنے والانہیں

توذھب بہ، اذھاب سے زیادہ مؤثر اور بلیغ ہے۔ شیخ یمانی نے 'اَذْھَبَ اللّٰہُ نُوْرَھُمْ' پڑھا ہے۔

ساتواں سوال: 'وَتَرَكَهُمْ' کا معنی کیا ہے؟

جواب: لفظ ترک کا تعلق جب واحد سے ہو تو اس کا معنی طرح (پھینک دینا) ہے جب تعلق دو سے ہو تو اس کا معنی، چیز بدلنا ہے تو یہ افعال قلوب کی طرح ہے، اسی سے ہے۔ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ، اس کا اصل 'هُمْ فِي ظُلُمَاتٍ' ہے پھر اس پر ترک داخل ہوا تو اس نے دونوں اجزاء کو نصب دی۔

آٹھواں سوال: 'لَا يُبْصِرُوْنَ' کا ایک مفعول کیوں حذف کر دیا گیا ہے؟

جواب: وہ از قبیل متروک ہے اس کا خیال ہی نہیں آتا اور نہ وہ محذوف معنوی ہے گویا یہاں فعل متعدی ہی نہیں۔

[۱۸] صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

(بہرے، گونگے، اندھے تو پھر وہ لوٹنے والے نہیں)

وہ بمنزل اندھے گونگے ہیں

جب ہمیں معلوم ہے کہ وہ سنتے، بولتے اور دیکھتے تھے تو اب ان الفاظ کا حقیقی معنی یہاں مراد نہیں ہو سکتا تو اب باقی یہ رہا کہ ان کے حال کہ وہ شدید عناد، قرآن کے سننے سے اعراض اور رسول اللہ کی طرف سے ظاہر ہونے والے دلائل و آیات میں اس شخص سے تشبیہ ہے جو حقیقۃً نہیں سنتا، جب سنتا نہیں تو وہ قبول کیسے کرے گا اس لیے انہیں بمنزل گونگے قرار دیا جب دلائل سے نفع نہیں اور راہ ہدایت نہیں دیکھتے تو بمنزل اعمٰی و نابینا قرار پائے۔

فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کی تفاسیر

پہلی تفسیر: یہ سابقہ بیان کردہ شی سے رجوع نہیں کریں گے یعنی ان کا نفاق پہ قائم رہنا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے یہ احوال بیان کیے تو یہ اعلان ہے کہ یہ اپنے نفاق پر ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری تفسیر: یہ ہدایت فروخت کرنے اور گمراہی خریدنے کے بعد ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے۔

تیسری تفسیر: مراد ان کا متحیرین کی طرح ہونا ہے جو ایک جگہ ہی پھیرتے رہتے ہیں، نہیں جانتے کہ آگے جانا چاہیے یا پیچھے تو اب وہ ابتدائی جگہ کی طرف کیسے لوٹیں گے؟

[۱۹-۲۰] اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِيٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِينَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

(یا جیسے آسمان سے اُترا پانی کہ اس میں تاریکیاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے، بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اُچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا یقیناً اللہ سب کچھ کر سکتا ہے)

منافقین کی دوسری مثال

یہ منافقین کی دوسری مثال ہے اس میں متعدد طرح سے کیفیت مشابہت بھی ہے۔

۱۔ جب بادل آتے ہیں تو ان میں ظلمات، کڑک اور بجلی ہوتی ہے۔ بادلوں کی ظلمت کے ساتھ ظلمات میں ظلمت لیل اور ظلمت مطر و بارش بھی جمع ہو جاتی ہیں، نزول کڑک کے وقت، خوف موت کی وجہ سے وہ کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں، قریب ہے کہ برق ان کی آنکھیں اُچک لے، جب روشنی ہوتی ہے تو اس میں چلتے ہیں اور جب وہ ختم ہو جاتی ہے تو عظیم تاریکی میں متحیر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ جسے ان تین ظلمات میں برق پہنچی اور پھر وہ ختم ہوگئی تو اب اس کی حیرت شدید

ہو جائے گی اور اس کی آنکھوں میں تاریکی عظیم۔ اس پر اس دوسرے سے اضافہ ہوا تھا جو ظلمت میں ہی تھا، تو حیرت و دین میں جہالت میں منافقین کی ان لوگوں سے تشبیہ دی ہے کیونکہ یہ نہ راستہ دیکھتے ہیں اور نہ ہدایت پاتے ہیں۔

۲۔ بارش اگرچہ نافع ہوتی ہے مگر جب وہ ایسی صورت میں ان نقصان دہ احوال کے ساتھ ہو تو اس سے نفع زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اظہارِ ایمان منافق کیلئے نافع ہے جبکہ وہ باطن کے موافق ہو، جب اس میں اخلاص ختم اور دل میں نفاق ہے تو دین کا سراسر نقصان ہے۔

۳۔ جس پہ یہ اُمور، صواعق و کڑک کے ساتھ نازل ہوں تو وہ اس سے چھٹکارا پانے کیلئے کانوں میں انگلیاں ڈالتا ہے لیکن یہ عمل اللہ تعالیٰ کے ارادہ ہلاک و موت سے نجات نہیں دے سکتا چونکہ عادات میں یہ مسلم ہے تو اللہ تعالیٰ نے حال منافقین کو ان کے خیال کے مطابق تشبیہ دی کہ ان کا مومنین کے سامنے اظہار ایمان، ان کیلئے نافع ہے حالانکہ حقیقت میں معاملہ یوں نہیں ہے جیسا کہ مذکور ہے۔

۴۔ منافقین کی موت و قتل کی وجہ سے جہاد سے فرار کی عادت تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کی ان سے تشبیہ دی جن پر یہ اُمور نازل ہوئے اور انہوں نے اس سے نجات پانے کیلئے کانوں میں انگلیاں دیں۔

۵۔ جن لوگوں نے کانوں میں انگلیاں رکھیں اگرچہ وہ اس وقت موت و ہلاک سے بچ گئے مگر ان کیلئے آگے موت و ہلاکت ہے جس سے کوئی نجات و خلاصی نہ ہوگی اسی طرح حال منافقین کا ہے جس میں یہ داخل ہیں اور عذاب نار سے نجات نہیں پاسکیں گے۔

۶۔ جس کا حال یہ ہو وہ حیرت میں انتہا پر ہوگا کیونکہ یہ تمام ظلمات کا اجتماع اور تمام اقسام خوف کا حصول ہے تو منافقین کو باب دین میں انتہائی حیرت اور دنیا میں نہایت خوف ہے کیونکہ منافق بروقت خیال کرتا ہے اگر میرے باطن سے آگاہی ہوگئی تو قتل کر دیا جاؤں گا تو نفاق کے ہوتے ہوئے اس کے دل سے خوف اور ڈر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

۷۔ صیّب سے مراد ایمان و قرآن ہے۔ ظلمات، گرج اور برق یہ منافقین پہ شاق اشیاء ہیں۔ یہی وہ تکالیف شاقہ ہیں مثلاً نماز، صوم، ترک ریاست، آباء و امہات کے ساتھ جہاد، ترک دین قدیم اور سرور عالم ﷺ کی فرمانبرداری، حالانکہ وہ آپ کی اطاعت سے شدید انکار کرتے ہیں۔

تو جیسے انسان برسنے والی بارش سے ان مذکورہ اُمور کی وجہ سے خوب احتراز کرتا ہے حالانکہ یہ بہت نافع ہوتی ہے اسی طرح منافقین ایمان اور قرآن سے ان امور شاقہ کی وجہ سے احتراز کرتے ہیں۔ "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ" سے مراد یہ ہے کہ جب انہیں منافع حاصل ہوئے مثلاً ان کے اموال و جان کی حفاظت اور غنائم کا حصول تو دین میں شوق کا اظہار کرتے "وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا" جب وہ یہ منافع نہ پاتے تو اب وہ ایمان کو ناپسند اور اس کا شوق نہ رکھتے، یہ وجوہ تشبیہ ظاہر ہیں۔

سوالات وجوابات

یہاں کچھ سوالات وجوابات ہیں۔

پہلا سوال: ان دونوں مثالوں میں ابلغ واکمل کون سی ہے؟

جواب: دوسری تمثیل، کیونکہ یہ کثرت حیرت اور سختیوں کی شدت پر خوب دال ہے، اسی وجہ سے تم نے دیکھا اس میں اھـــون (آسان) سے اغلظ (زیادہ سخت) میں وہ شامل ہوئے ہیں۔

حرف شک سے عطف کیوں؟

دوسرا سوال: دونوں تمثیلات میں حرف شک کے ساتھ عطف کیوں؟

جواب: متعدد طرح سے ہے۔

۱۔ ''او'' اصل میں دو یا زیادہ اشیاء کا شک میں مساوی ہونے پہ دال ہوتا ہے پھر اس میں وسعت لائی گئی ہے لہٰذا یہ بطور مجاز غیر شک میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''جالس الحسن او ابن سیرین'' (تم امام حسن بصری یا امام محمد بن سیرین کی صحبت میں بیٹھو) یعنی اچھی صحبت کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، اس سے ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِماً اَوْ کَفُوراً (پ۲۹، الانسان:۲۴) اور ان میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کی بات نہ سنو

یعنی اثم او کفور دونوں لزومِ عصیان میں برابر ہیں۔ اسی طرح ارشادِ الٰہی ''اَوْ کَصَیِّبٍ'' ہے معنی یہ ہے کہ کیفیت منافقین ان دو قصوں کی کیفیت کے مشابہ ہے۔ ان میں سے جو بھی مثال دو، درست ہے، اگر دونوں سے دو تب بھی، درست ہے۔

منافقین دو طرح کے ہیں

۲۔ اَو، کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا کہ منافق دو طرح کے ہیں، بعض کو اصحابِ نار اور بعض کو اصحاب مطر (بارش) کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے:

وَقَالُوْا کُوْنُوْا هُوداً اَوْ نَصَارٰی (پ۱، البقرۃ:۱۳۵) اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَاهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتاً اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (پ۸، الاعراف:۴) اور کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کیں اور ان پر ہمارا عذاب رات میں آیا یا جب وہ دوپہر کو سوئے تھے

اَوْ بمعنی بَلْ

۳۔ او بمعنی بل۔ بلکہ ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ — اور ہم نے اسے لاکھ بلکہ زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا

(پ۲۳، الصافات:۱۴۷)

او بمعنی واو

۴۔ اَو بمعنی واوَ ہے گویا فرمایاوَ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ، اس کی نظیر یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ — کہ کھاؤ اپنی اولاد کے گھر یا اپنے باپ کے گھر یا اپنی ماں کے گھر

(پ۱۸، النور:۶۱)

شاعر نے کہا:

وقد زعمت لیلی بأنی فاجر — لنفسی تقاها أو علیها فجورها

یہی تمام صورتیں اس ارشادِ عالی میں بھی موجود ہیں:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً — پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت

(پ۱، البقرۃ:۷۴)

علماء بیان کے دو اقوال

تیسرا سوال: صَیِّب، ظلمات، رعد، برق اور صواعق کے ساتھ کسے تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب: یہاں علماء بیان کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ تشبیہ مفرق (مفرد کی مفرد کے ساتھ) ہے، معنی یہ کہ یہ مثال ان اُمور سے مرکب ہے اور ممثل بھی ان امور سے مرکب ہوگا ممثل کی ہر چیز مثل کے جز کے مشابہ ہوگی تو یہاں دین اسلام کو صیب (بارش) کے مشابہ قرار دیا کیونکہ قلوب، دین اسلام سے اسی طرح حیات پاتے ہیں جیسے بارش سے زمین۔ اس دین میں شبہات کفار کو ظلمات اور اس میں وعد اور وعید کو رعد و برق کے ساتھ اور اہلِ اسلام کی طرف سے کفار کو پہنچنے والی آزمائش کو صواعق کے مشابہ کہا۔

معنی یہ ہوا یا ان کی مثال بارش والوں کی طرح ہے اور مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرح ہیں جنہیں آسمان اس حالت پر کر دیتا ہے

دوسرا قول: یہ تشبیہ مرکب ہے جس میں ایک جملہ کو دوسرے جملہ کے ساتھ کسی امر میں مشابہت دی جاتی ہے۔ اگر چہ ہر ایک جملہ کے احاد کی دوسرے کے احاد سے مشابہت نہ ہو، یہاں مقصود دنیا و دین میں منافقین کی حیرت کی تشبیہ ان لوگوں کی حیرت کے ساتھ ہے جن کی آگ روشن ہونے کے بعد بجھ چکی اور ان کی حیرت کے ساتھ جنہیں آسمان نے رعد و برق کے ساتھ تاریک رات میں پکڑ لیا۔

سوال: تشبیہ مفرق میں یوں ہو سکتا ہے کہ مضاف حذف کر دیا جائے جیسے او کمثل ذوی صیب تو کیا تشبیہ مرکب میں ایسا کہا جا سکتا ہے؟

جواب: اگر ارشادِ الٰہی: یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ میں اگر یہ تقاضا نہ ہو کہ اس کی طرف ضمیر لوٹے تو اس میں مقدر ماننے کی ضرورت ہی نہیں

چوتھا سوال: صیّب کیا ہے؟

جواب: اڑنے والی بارش۔ تو صاب یصوب اترنے کو کہا جاتا ہے۔ سر جھکانے کو 'صوب راسه' کہا جاتا ہے، بعض نے صاب بمعنی قصد لیا ہے۔ صیب سے مطر جود (نفع والی بارش) ہی مراد ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے:

اللهم اجعله صيباً هنيئاً (سنن ابن ماجہ:۳۸۹۰) اے اللہ اسے جود و نفع والی بارش بنا

سحاب کو بھی صیب کہہ دیا جاتا ہے۔ شماخ نے کہا: وأسحم دان صادق الوعد صيب

نکرہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش کی شدید ہلاک کرنے والی قسم مراد ہے جیسے کہ تمثیل اول میں نار نکرہ تھی۔ أو كصائب بھی قرأت ہے، لیکن "صیب ابلغ" ہے، اور اسی سے مراد یہ سایہ فگن آسمان ہے۔

پانچواں سوال: "مِنَ السَّمَآءِ" کا کیا فائدہ حالانکہ بارش آسمان کی طرف سے ہی ہوتی ہے؟

جواب: دو طرح پر ہے:

۱۔ اگر کہا جاتا: او كصيب فيه ظلمات (یا بارش جس میں ظلمات ہیں) تو اس میں احتمال تھا کہ ممکن ہے بارش آسمان کی بعض جوانب سے ہوئی ہے جبکہ بعض سے نہیں ہوئی جب 'من السماء' کہا تو یہ واضح کر رہا ہے تمام آفاق سے بارش ہوئی جیسا کہ لفظ صیّب میں ترکیب و تنکیر سے کئی مبالغے ہیں جو اسی عموم کی تائید کر رہے ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، بارش ان بخارات سے ہوتی ہے جو کرہ ہوا کی طرف بلند ہوتے ہیں اور وہاں شدت ہوا کی وجہ سے وہ جم جاتے ہیں جو وہاں سے بارش کی صورت میں اترتے ہیں تو یہی بارش ہے۔

اس مذہب کارد

لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں اس مذہب کا رد کرتے ہوئے واضح کہا کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوۡرًا (پ۱۹، الفرقان:۴۸) اور ہم نے آسمان سے پاک پانی نازل کیا

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡ بَرَدٍ (پ۱۸، النور:۴۳) اور اتارتا ہے آسمان سے اس میں جو برف کے پہاڑ ہیں ان میں سے کچھ اولے

چھٹا سوال: رعد و برق سے کیا مراد ہے؟

جواب: رعد، آواز جو بادلوں سے سنی جاتی ہے، اجرام سحاب آپس میں ٹکراتے اور چلتے ہیں جب انہیں ہوائیں چلاتی ہیں تو ان میں ارتعاش آنے کی وجہ سے آواز پیدا ہوتی ہے، بادلوں سے نکلنے والی چمک برق کہلاتی ہے جب چمک پیدا ہو تو کہا جاتا ہے: برق الشئ

ساتواں سوال: صیب، بارش اور بادل دونوں میں جو بھی مراد ہو تو اس کی ظلمات کیا ہیں؟

جواب: ظلماتِ سحاب یہ ہیں کہ جب بادل ہر طرف سے برستے ہیں تو ان کا برسنا اور ان کا آپس میں متصل ہونا، گھٹا باندھ کر آنا ظلمت ہے اور پھر ان کے ساتھ رات کی تاریکی بھی شامل ہے، ظلمت مطر (بارش) اس کا تکاثف و گہرا ہونا اور مسلسل برسنا ہے اس کی ایک ظلمت بادلوں کا سایہ کرنا اور رات کی تاریکی ہے۔

آٹھواں سوال: بارش، رعد و برق کا محل کیسے ہوگئی اس کا محل تو سحاب ہیں؟

جواب: مطر اور سحاب کے درمیان تعلق و اتصال شدید ہے، لہٰذا ان کے احکام ایک دوسرے پہ جاری کیے جاسکتے ہیں۔

نواں سوال: ظلمات کی طرح رعود و بروق (جمع) کیوں نہ کہا؟

جواب: اجتماع ظلمات کے وقت ظلمات کی مختلف انواع ہوتی ہیں، لہٰذا اسے جمع لایا گیا مگر رعد و برق کی نوع واحد ہی ہوتی ہے لہٰذا سحابِ واحد میں انواع رعد و برق ممکن نہیں لہٰذا انہیں جمع ذکر نہیں کیا جاسکتا۔

دسواں سوال: یہ تمام نکرہ کیوں ہیں؟

جواب: مراد ان کی انواع ہیں گویا یوں کہا جارہا ہے "ظلمات داجیة" (اندھیر برپا کرنے والی تاریکیاں) "رعد قاصف"

(گرجدار آواز) ''برق خاطف'' (اچک لینے والی چمک)۔

گیارھواں سوال: یَجْعَلُوْنَ کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟

جواب: اصحاب صیّب کی طرف ہے اگرچہ لفظاً مذکور نہیں مگر معناً موجود ہیں، یَجْعَلُوْنَ محل اعراب میں نہیں کیونکہ یہ جملہ نیا ہے، اس لیے کہ جب رعد و برق کا ذکر ہوا جو شدت وھول پر دال ہیں تو گویا سوال ہوا ایسی کڑک کے وقت ان کا حال کیا ہوگا؟ تو بتایا گیا یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَھُمْ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ۔ (وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں) پوچھا چمک کے وقت کیا حال ہوگا؟ تو بتایا:

یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ (پ۱، البقرۃ:۲۰) قریب ہے کہ ان کی آنکھیں اُچک لے

بارھواں سوال: جب انگلیوں کے سر کانوں میں ٹھونسے جاتے ہیں تو کیوں نہ یہ فرمایا کہ وہ انگلیوں کے پورے داخل کرتے ہیں؟

جواب: اگرچہ ذکر انگلی کا ہے مگر مراد اس کا کچھ حصہ ہی ہے، جیسے اس ارشادِ الٰہی میں ہے:

فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا (پ۶، المائدۃ ۳۸) تو ان کا ہاتھ کاٹو

یہاں بھی ہاتھوں کا بعض اور حصہ ہی مراد ہے۔

تیرھواں سوال: صاعقہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: گرج دار آواز جس سے شعلہ نار نکلتا ہے تو یہ لطیف نار قوی جس پہ پڑتی ہے اسے ختم کر دیتی ہے البتہ قوی ہونے کے ساتھ جلدی بجھ جاتی ہے۔

احاطہ سے کیا مراد ہے؟

چودھواں سوال: اللہ کا کفار کے احاطہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ بطور مجاز ہے، معنی یہ ہے کہ وہ اس سے باہر نہیں جیسے محاط محیط سے باہر حقیقۃً نہیں ہوسکتا۔

احاطہ میں تین اقوال

اس میں تین اقوال ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کا عالم ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (پ۲۸، الطلاق:۱۲) اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

۲۔ ان پہ قادر وکنٹرول فرمانے والا ہے:

وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ (پ۳۰، البروج:۲۰) اور اللہ ان کے پیچھے سے انہیں گھیرے ہوئے ہے

۳۔ انہیں ہلاک فرمائے گا، ارشادِ الٰہی ہے:

اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (پ۱۳، یوسف:۶۶) مگر یہ کہ تم گھر جاؤ

پندرہواں سوال: خطف سے مراد کیا ہے؟

جواب: جلدی سے اُچک لینا۔ حضرت مجاہد کی قرأت طا کے کسرہ سے ہے "یخطِف" لیکن فتح افصح ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے "مختطف" پڑھا، امام حسن بصری "یخطف" یا خا پر زبر، اصل "یختطف" ہی ہے، دونوں پہ کسرہ بھی آیا ہے۔ حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہما نے خطف سے "یخطف" پڑھا حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے "یتخطف" کو اسی ارشاد الٰہی سے لیا۔

وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (پ۲۱، العنکبوت:۶۷) اور ان کے آس پاس والے لوگ اُچک لیے گئے

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ کی تفسیر

یہ تیسرا جملہ ہے گویا یہ اس سوال کہ، وہ ظہور برق وخفا کی دونوں حالتوں میں کیا کرتے، کا جواب دیا جا رہا ہے۔ مقصود منافقین پر شدت امور کی، اصحاب صیّب کی شدت کے ساتھ تشبیہ دینا ہے اور وہ کس قدر تحیر میں اور اس سے جھل میں ہیں کہ کیسے بجالائیں اور کیسے چھوڑیں، جب وہ برق میں تھوڑا سا وقفہ پاتے ہیں حالانکہ ساتھ آنکھیں اچک جانے کا خوف بھی ہے تو وہ اس وقفہ کو ہی فرصت سمجھتے ہوئے کچھ قدم چلتے ہیں پھر جب وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے تو اس حرکت پر کھڑے اور پابند ہو جاتے ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ رعد کی گرج میں اس قدر اضافہ کرے کہ وہ انہیں بہرے کر دے اور چمک میں اتنا اضافہ کر دے کہ وہ انہیں اندھا کر دے۔

اضاء متعدی ہے کہ جب ان کیلئے راستہ روشن کرتا ہے تو اس پر چلتے ہیں تو مفعول محذوف ہے یا غیر متعدی ہے یعنی جب ان کیلئے روشنی ہوتی ہے تو وہ راستہ نور میں چلتے ہیں، اس کی تائید شیخ ابن ابی عبلة کی قرأت "کلما ضاء" بھی کرتی ہے

لفظ كُلَّمَا اور اِذا کی حکمت

سوال: اَضَآءَ کے ساتھ كُلَّمَا اور اَظْلَمَ کے ساتھ اِذا کیوں؟

جواب: وہ امکان مشی وچلنے پر حریص تھے جیسے ہی وہ فرصت پاتے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن توقف وقیام میں ایسا نہ تھا۔ اظلم کا غیر

متعدی ہونا اقرب ہے اور یہی ظاہر ہے، قاموا کا معنی کھڑے ہونا اور اپنی جگہ ثابت رہنا، اسی سے، قامت السوق، پانی جم جائے تو قام الماء، شاء کا مفعول محذوف ہے کیونکہ جواب اس پر دال ہے، معنی یہ ہوگا اگر اللہ تعالیٰ ان کے سمع وابصار کو لے جانا چاہے تو وہ لے جائے

مشہور سوال: لو، کا استعمال

یہاں ایک مشہور سوال ہے لو شیئ کی نفی، دوسرے کی نفی کی وجہ کیلئے آتا ہے، بعض نے اُس کا انکار کرکے کہا یہ صرف ربط کیلئے آتا ہے اس پر اس آیت وحدیث سے استدلال کیا، ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (پ۹، الانفال:۲۳) اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیتا اور اگر دیتا جب بھی انجام کار منہ پھیر کر پلٹ جاتے

اگر یہ کلمہ دوسرے کے انتفاء کی وجہ سے شیئ کی نفی کرتا تو یہاں تناقض لازم ہوجائے گا کیونکہ ارشادِ الٰہی:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرً لَّاَسْمَعَهُمْ اور اگر اللہ ان میں بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیا

کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان میں خیر نہیں جانتا اور نہ وہ سناتا ہے۔

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ اگر سنا دیتا جب بھی منہ پھیر کر پلٹ جاتے

یہ بتارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سنایا اور وہ نہ پھرے لیکن عدم تولی (نہ پھرنا) خیر ہے تو لازم آئے گا کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ خیر بھی جانے اور خیر نہ بھی جانے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

نعم الرجل صهيب لو لم يخف الله لم يعصه صہیب خوب ہیں اگر اللہ کا خوف نہ بھی ہوتا وہ گناہ نہ کرتے

تو اب ان کے قول پہ لازم آئے گا انہیں خوف الٰہی بھی ہے اور نافرمانی بھی کی اور یہی تضاد ہے تو اس سے واضح ہورہا ہے کہ کلمہ لو معنی ربط کا فائدہ دیتا ہے۔ واللہ أعلم

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: کیا معدوم، شی ہوتا ہے؟

بعض نے اس سے استدلال کرتے ہوئے کہا معدوم بھی شی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شی پر قدرت کا اثبات کیا اور موجود پر قدرت نہیں ہوتی ورنہ ایجاد موجود کا استحالہ لازم آتا ہے تو جس پر قدرت ہوئی وہ معدوم ہے لہذا معدوم بھی شی ٹھہری۔

جواب: اگر یہ کلام درست ہوتو لازم آئے گا جس پر اللہ تعالیٰ قادر نہیں وہ شی نہیں تو موجود پر جب اللہ تعالیٰ قادر نہیں تو لازم آئے گا موجود شی ہی نہ ہو۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ پر شی کا اطلاق

شیخ جہم نے اس آیت سے یہ استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ شی نہیں کیونکہ یہ بتا رہی ہے کہ ہر شی مقدورِ الٰہی ہے حالانکہ اللہ مقدر نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ وہ شی نہیں

انہوں نے یوں بھی استدلال کیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (پ۲۵، الشوریٰ:۱۱) اس جیسا کوئی نہیں

اگر اللہ تعالیٰ شی ہوتا تو وہ اپنی مثل ہوتا تو یہ ارشاد 'لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ' جھوٹ قرار پائے گا، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ شی ہی نہ ہوتا کہ اس آیت سے تناقض نہ ہو

یاد رہے یہ اختلاف اسم میں ہے کیونکہ موجود و معدوم کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہمارے اصحاب کے دلائل

ہمارے اصحاب نے دو وجہ سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ ارشادِ الٰہی ہے

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ (پ۷، الانعام:۱۹) تم فرماؤ سب سے بڑی گواہی کس شی کی ہے تم فرماؤ اللہ گواہ ہے

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (پ۲۰، القصص:۸۸) سوائے اس کی ذات کے ہر شی ہلاک ہونے والی ہے

مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ میں داخل ہی ہوتا ہے لہٰذا لازم ہے کہ اس (اللہ) پر شی کا اطلاق ہو۔

تیسرا مسئلہ: بندہ کا مقدور، اللہ کا مقدور

ہمارے اصحاب نے اس آیت سے استدلال کیا کہ بندہ کا مقدور، اللہ تعالیٰ کا مقدور ہے شیخ ابوعلی اور ابو ہاشم نے اس سے اختلاف کیا، وجہ استدلال یوں ہے کہ بندہ کا مقدور شی ہے اور یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہر شی اللہ تعالیٰ کی مقدور ہے تو لازماً بندہ کا مقدور، اللہ تعالیٰ کا مقدور ہوگا۔

چوتھا مسئلہ: حادث، اللہ کا مقدور

اس آیت سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا کہ حادث، حالت حدوث میں اللہ تعالیٰ کا مقدور ہوتا ہے، معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے، ان کا کہنا ہے فعل سے پہلے استطاعت محال تو شی حدوث سے پہلے پہلے مقدور ہوگی بعد میں نہیں۔ ہمارے اصحاب کا استدلال یہ ہے کہ حادث حال وجود میں شی ہے اور ہر شی مقدور ہے، اس دلیل کا تقاضا ہے کہ باقی کا مقدور ہونا، اس کا ترک عمل ہے تو معمول بہ میں نزاع رہا کیونکہ حال بقا، مقدور ہے اس معنی کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اس کے اعدام پر قادر ہے، رہا حال حدوث تو محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اعدام پر قادر ہو کیونکہ اول زمان وجود میں اس کا اعدام محال ہے تو اب قدرت صرف اس کے ایجاد پر ہوگی۔

پانچواں مسئلہ: تخصیصِ عام جائز ہے اور یہ دلیل عقلی کی بنا پر ہی جائز ہے، تو 'وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر' کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی ذات پر بھی قادر ہو تو پھر اس میں دلیل عقل نے تخصیص کی۔

سوال: جب لفظِ کل، کل کیلئے موضوع ہے یہاں واضح ہے کہ یہ کل پر صادق نہیں تو یہ کذب ہوا اور قرآن پر طعن کا سبب بھی ٹھہرے گا

جواب: لفظِ کل جس طرح مجموع و تمام میں مستعمل ہے اس طرح مجازاً اکثر کیلئے بھی آتا ہے چونکہ لغت میں مجازاً مشہور ہے تو اب اس میں لفظ کا استعمال کذب نہ ہوگا۔ واللہ أعلم

توحید، نبوت اور آخرت پر دلائل اور تفصیلی گفتگو

توحید پہ دلائل

[۲۱-۲۲] يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

(اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ اس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی نازل فرمایا اور اس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل نکالے تو اللہ تعالیٰ کیلئے جان بوجھ کر برابر نہ ٹھہراؤ)

ان آیات میں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: التفات کے چند فوائد

اللہ تعالیٰ نے تین فرقوں، مومنین، کفار اور منافقین کے احکام پہلے بیان کیے اب انہیں خطاب ہے، یہ باب التفات ہے، جس کا ذکر، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ، کے تحت آچکا ہے التفات میں چند فوائد ہیں۔

پہلا فائدہ: مزید شوق کا سبب

اس میں سامعین کو اور تحریک وشوق دلانا ہے جیسے تم اپنے ساتھی سے تیسرے کے بارے میں بتاؤ فلاں کا یہ یہ کارنامہ ہے پھر تم اس تیسرے سے مخاطب ہو کر کہو تمہارا فرض ہے کہ اپنے امور میں صحیح راستہ اختیار کرو تو غیبت سے حضور کی طرف انتقال تیسرے کیلئے مزید تحریک کا سبب بنے گا۔

دوسرا فائدہ: مکالمہ کا شرف

گویا اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے میں نے اپنے اور تمہارے درمیان اولاً رسول کو واسطہ بنایا اب میں تمہارے اکرام وقربت میں اضافہ کرتے ہوئے بلاواسطہ تم سے مخاطب ہوں تاکہ تمہیں دلائل پر تنبیہ وآگاہی کے ساتھ میرے ساتھ مکالمہ ومخاطبہ کا بھی شرف مل جائے

تیسرا فائدہ: اس میں اشارہ ہے کہ بندہ جب عبودیتِ رب میں مشغول ہوتا ہے تو وہ دائما ترقی کرتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں ہے کہ اسے غیبت سے حضور کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔

چوتھا فائدہ: سابقہ آیات، ان کے احوال کی حکایت تھیں اور ان آیات میں امر و تکلیف ہے تو ان میں کلفت و مشقت ہے لہٰذا اس کلفت کے مقابل راحت ضروری ہے اور وہ راحت یہ ہے کہ تمام کا بادشاہ درمیان سے پردہ واسطہ اٹھا کر مخاطبہ کا شرف عطا کرے جیسے جب بندے کو تکلیف شاقہ ہوتی ہے تو اگر اسے مولیٰ سے بالمشافہ عرض کرنے کا موقعہ ملے تو وہ عرض کرے گا میں تجھ سے یہی چاہتا ہوں کیونکہ ایسے خطاب کی وجہ سے وہ شاق چیزیں لذیذ بن جاتیں ہیں۔

دوسرا مسئلہ: مکی و مدنی سورتوں کی علامت

حضرت علقمہ اور حسن بصری سے ہے جہاں قرآن میں یٰاَیُّھَا النَّاسُ، سے خطاب ہے وہ مکی اور جہاں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمنوا، سے ہے وہ مدنی ہے۔

قاضی عبدالجبار کہتے ہیں۔ انہوں نے جو کہا اگر اس پر دلیل نقلی ہے تو مسلّم اور اگر اس کا سبب مدینہ میں کثرت مومنین بنسبتِ مکہ ہے تو یہ ضعیف قول ہے اس لیے کہ جائز ہے مومنین کو کبھی ایک صفت سے اور کبھی اسم جنس سے مخاطب کیا جائے، کبھی غیر مومن کو عبادت کا حکم دیا جائے جیسے مومن کو عبادت پہ دوام اور اس میں اضافہ کا حکم دیا جاتا ہے تو خطاب تمام کیلئے ممکن ہے۔

تیسرا مسئلہ: الفاظ، اغلب طور پہ جن امور پر دال ہوتے ہیں وہ الفاظ ہوتے ہیں یا غیر الفاظ، الفاظ یہ ہیں مثلاً اسم، فعل، حرف، یہ تینوں الفاظ ہر ایک ایسی شی پر دال ہے کہ وہ فی نفسہ لفظ مخصوص ہے، غیر الفاظ جیسے حجر، سما، ارض، لفظ ندا کو کسی اور شی پر دلیل نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ایسا لفظ ہے جو برائے تنبیہ ہوتا ہے۔

یَا زَیْدُ اور اُنَادِیْ زَیْدًا میں فرق

جنہوں نے "یَازَیْدُ" کی تفسیر "اُنادی زیداً یا اخاطبُ زیدًا" (میں نے زید کو مخاطب کیا) کی ہے یہ ان دلائل سے غلط ہے

۱۔ "اُنادی زیداً" یہ خبر ہے اس میں صدق و کذب کا احتمال ہے لیکن "یازید" میں ان دونوں کا احتمال نہیں۔

۲۔ یازید کا تقاضا ہے کہ یہ فی الحال زید منادیٰ ہے حالانکہ "اُنادی زیداً" میں یہ تقاضا نہیں۔

۳۔ یازید کا تقاضا یہ ہے کہ زید اسی خطاب سے مخاطب ہے لیکن "اُنادی زیداً" میں یہ تقاضا نہیں کیونکہ یہ منع نہیں کہ اس سے دوسرے انسان کو بتائے کہ میں زید کو آواز دے رہا ہوں۔

۴۔ انا دی زیداً، نداسے خبر ہے اور ندا کی خبر، ندا کا غیر ہے ندا ہے یا زید تو اب ''انادی زیداً'' یا زید، کا غیر ہے۔

توان دلائل سے اس قول کا فساد آشکار ہوگیا۔

ایک اہم نکتہ: حالت نداو تضرع میں مناسبت

یہاں ہم ایک اہم نکتہ ذکر کرنا چاہ رہے ہیں سب سے مرتبہ میں اقویٰ، اسم، اور سب سے کمزور حرف، ہے بعض کا خیال ہے کہ اسم، حرف سے محبت نہیں کرتا، اسی طرح موجودات میں سب سے بڑا، حق تعالیٰ، اور ضعیف ترین، بشر ہے۔

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفاً (پ۵، النساء:۲۸) اور آدمی کمزور بنایا گیا

ملائکہ نے کہا: ان دونوں کے درمیان مناسبت کیا ہے؟

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (پ۱، البقرۃ:۳۰) تو ایسے کو بنائے گا جو زمین میں فساد کرے گا

تو بتایا گیا کہ کبھی اسم، حرف کے ساتھ بصورت حالتِ ندا محبت کرتا ہے تو اسی طرح بشر، حالِ نداو تضرع میں خدمتِ رب کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (پ۸، الاعراف:۲۳) اے رب ہمارے ہم نے اپنا آپ بُرا کیا

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ۲۴، غافر:۶۰) اور کہا تمہارے پروردگار نے مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا

چوتھا مسئلہ: یاندابعید ہے

یاحرف ہے اس کی وضع اصلاً ندا بعید کیلئے ہے، اگر چہ اس کا استعمال ندا قریب کیلئے بھی ہوتا ہے لیکن اس کے سبب کا اہم ہونا ضروری ہے، ندا قریب کیلئے ''اَی'' اور ''ھمزہ'' ہے، پھر اسکا استعمال ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جو بھول اور غفلت کا شکار ہو جائیں اگر چہ قریب ہوں لیکن انہیں بمنزل بعید سمجھا جاتا ہے۔

سوال: دعا کرنے والا یا اللہ، یارب کیوں کہتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہے؟

جواب: یہ اپنے آپ کو قربِ الٰہی اور منازل مقربین کے مقام سے بطور تواضع اور اپنے نقائص کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے دور سمجھتا ہے تا کہ دعا قبول ہو جائے کیونکہ اس کا ارشاد ہے:

انا عند المنكسرة قلوبهم من أجلي (الحلیۃ لابی نعیم ۲:۳۶۴) میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل میری خاطر ٹوٹتے ہیں

فضل قدیر

یا اس لیے کہ دعا کرنے والے کیلئے سب سے اہم معاملہ قبولیت دعا ہی ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ: ایّ یہ الف لام اور ندا کے درمیان آتا ہے جیسے ذو اور الذی، اسماء اجناس اور معارف کو جملوں کے وصف کیلئے آتے ہیں، ای اسم مبہم ہوتا ہے لہذا یہ اپنے ابہام کے ازالہ کا محتاج ہوتا ہے لہذا ضروری ہے کہ اس کے بعد اسم جنس یا اس کا قائم مقام ہوتا کہ ندا کا مقصد حاصل ہو، حرف ندا، ایّ میں یا اس کے تابع اسم میں عمل کرے گا مثلاً یا زید الظریف البتہ ایّ استقلال زید کی طرح مستقل نہیں تو یہ صفت و موصوف سے جدا نہ ہوگا۔

حرف تنبیہ کے دو فوائد

رہا کلمہ تنبیہ جو صفت و موصوف کے درمیان لایا جاتا ہے، اس کے دو فوائد ہیں۔

۱۔ حرف ندا کے معنی میں تاکید۔

۲۔ ایسی جگہ اسکا وقوع جو مستحق اضافت ہے۔

کتاب اللہ میں، ندا اس طریق پر کثرت سے ہے کیونکہ ان تاکیدات و مبالغات سے یہ مستقل قرار پاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ندا فرماتے ہیں یہ بصورت اوامر و نواہی، وعد و وعید، سابقہ لوگوں کے بڑے واقعات ہیں اور یہی چیزیں ہیں جنہیں غفلت سے نکل کر اور بیدار ہو کر سننا لازم ہے حالانکہ وہ غافل ہوتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ انہیں ابلغ اور پختہ طریق سے ندا دی جائے۔

چھٹا مسئلہ: ارشادِ الٰہی "یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو عبادت کا حکم دیا ہے اگر اس خطاب سے کچھ کو خارج رکھا جائے تو یہ عموم میں تخصیص ہوگی۔

چند مباحث

یہاں چند مباحث ہیں

پہلی بحث: جمع معرف باللام میں عموم کا فائدہ

جمع معرف بالام، مفید عموم ہوتی ہے، اس میں امام اشعری، قاضی ابو بکر اور ابو ہاشم کا اختلاف ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کی تاکید مفید عموم، لفظ سے درست ہوتی ہے، مثلاً ارشادِ الٰہی ہے:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (پ۱۴، الحجر:۱۵) تو جتنے فرشتے تھے سب کے سب سجدے میں گرے

اگر یہ اصلاً عموم کیلئے نہ ہوتا تو کُلُّھُمْ اس کی تاکید نہ بنتا بلکہ وہ بیان ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر ایک کا "اَلنَّاس" سے استثناء درست ہے، اور استثناء اس سے نکالتا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو وہ داخل ہی رہتا تو لفظ "اَلنَّاس" کا مفید عموم ہونا لازم ہے اور اس کی تفصیل اصول فقہ میں دیکھیے۔

دوسری بحث: معدوم سے خطاب

جب ثابت ہوا ارشادِ الٰہی "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" اس دور میں موجود تمام لوگوں کو شامل ہے کیا بعد کے لوگوں کو بھی شامل ہے یا نہیں؟ اقرب یہی ہے کہ انہیں شامل نہیں کیونکہ یا ایھا الناس، خطاب مشافہۃ ہے اور ایسا خطاب معدوم کے ساتھ جائز نہیں ہوتا پھر جو بعد ہوں گے وہ اس وقت موجود نہ ہوں گے، اور جو موجود نہیں وہ انسان نہیں اور جو انسان نہیں وہ "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" میں کیسے داخل ہوں گے؟

سوال: اس سے لازم آ رہا ہے کہ کوئی خطاب بھی بعد میں آنے والوں کیلئے نہ ہو اور یہ بات قطعی طور پر باطل ہے؟

جواب: اگر اس پر کوئی الگ دلیل نہ ہوتی تو معاملہ اسی طرح تھا لیکن ہم تو اتر سے دین محمدی میں سے جانتے ہیں کہ یہ خطابات تا قیامت آنے والے لوگوں کو شامل ہیں لہٰذا اس مستقل دلیل کی بنا پر ہم انہیں عام مانتے ہیں۔

تیسری بحث: تمام عبادات کا حکم

سوال: ارشاد "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ" یہ تمام کو عبادت کا حکم ہے کیا اس میں تمام کیلئے تمام عبادات کا حکم ہے؟

جواب: حق یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے اس لیے کہ "اُعْبُدُوْا" کا معنی ہے کہ اس ماہیت عبادت کو وجود میں لاؤ، جب تم اس کا ایک فرد بھی وجود میں لے آؤ گے تو تم ماہیت میں داخل ہو گئے کیونکہ ماہیت کا ایک فرد بھی ماہیت پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے کہ یہ عبادت، ایسی عبادت سے عبارت ہے جس کے ساتھ اس عبادت کی قید ہے تو جب مرکب پایا گیا تو اس کی دونوں قیود بھی ہوں گی تو افراد عبادت میں سے ایک فرد بجالانے والا عبادت ہی کرنے والا ہے تو جس نے عبادت کی اس نے 'اُعْبُدُوْا' کا کامل تقاضا پورا کر دیا جب معاملہ اسی طرح ہے تو پھر ایسی صورت میں اس سے ذمہ داری کا ختم ہونا بھی ضروری ہے۔

اگر ہم اسے عموم پہ دال مانیں تو ہم کہیں گے حکم عبادت کیلئے اس کا عبادت ہونا ضروری ہے کیونکہ حکم کا کسی وصف پر مرتب ہونا وصف کے علت ہونے پر دال ہوتا ہے خصوصاً جبکہ وصف مناسب حکم ہو تو یہاں عبادت کا عبادت ہونا مناسب حکم ہے اس لیے کہ عبادت، اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اس کیلئے اظہار خضوع کا نام ہے اور یہ تمام عقول میں جائز و مناسب ہیں جب ثابت ہو گیا اس کا عبادت ہونا اس کے حکم کی علت ہے تو لازم ہے کہ ہر عبادت کا حکم ہو کیونکہ جب علت ہو گی تو حصول حکم ہر صورت لازم ہوگا

چوتھی بحث: کفار اور حکم عبادت

سوال: یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا۔ یہ حکم کفار کو شامل نہیں کیونکہ انہیں ایمان کا مامور ٹھہرانا ممکن نہیں جب یہ محال ہے تو انہیں عبادت کا حکم بھی محال ہوگا۔ ان کا ایمان کے سلسلہ میں مامور ہونا یوں ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اگر غیر عارف باللہ تعالیٰ کی حالت میں ہے تو اب محال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عارف باللہ بنیں کیونکہ صفت کا علم اور ذات سے جہالت محال ہوتی ہے تو اگر حکم اس حالت میں ہے تو حکم ایسی حالت کو شامل ہے جو محال ہے کہ اس کے اس امر سے مامور ہونے کی معرفت ہو اور یہ تکلیف مالا یُطاق ہے اور اگر حکم حالت معرفت باللہ تعالیٰ کی حالت میں ہے تو یہ محال ہے کیونکہ یہ تحصیل حاصل اور یہ ممکن نہیں۔

تو ثابت ہوا کافر تحصیل معرفت پر مامور نہیں تو جب یہ محال ہے تو اسے حکم عبادت بھی محال ہے کیونکہ انہیں یا تو معرفت سے پہلے عبادت کا حکم ہے تو محال کیونکہ بغیر معرفت کسی کی عبادت ممتنع ہوتی ہے یا حکم عبادت، معرفت کے بعد ہے تو اب حکم عبادت، امر معرفت پر موقوف ہوگا تو جب امر معرفت ممتنع ہے تو امر عبادت بھی ممتنع ہوگا۔

اسی خطاب کا اہلِ ایمان کو بھی شامل ہونا محال ہوگا کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں پھر انہیں عبادت کا حکم تحصیل حاصل ہوگا جو محال ہے۔

جواب: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حکم عبادت، حصولِ معرفت کے ساتھ مشروط ہے جیسے حکم زکوٰۃ، ملک نصاب کے ساتھ مشروط ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں معرفت بدیہی وضروری چیز ہے (یعنی وہ ہر ایک کو حاصل ہے)

لیکن جو یہ قول نہیں کرتے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں معارف ضروری و بدیہی نہیں، امر عبادت حاصل اور عبادت بغیر معرفت ممکن نہیں اور کسی شی کا حکم اس شی کے ساتھ اسے بھی بجالانے کا حکم ہوتا ہے جو اس کے ضروریات میں سے ہو مثلاً طہارت، پانی کے ساتھ ہی ہوتی ہے تو اب پانی کا حاضر کرنا لازم ہے، دہریہ کی تصدیق رسول، تقدیم معرفت الٰہی کے بغیر درست نہیں ہوگی لہٰذا اس پر معرفت لازم، بے وضو آدمی کی نماز، تقدیم طہارت کے بغیر درست نہیں تو طہارت لازم، کسی کی امانت، سعی کے بغیر واپس نہیں ہوسکتی تو سعی لازم۔

یہاں بھی کفار کو عبادت کا حکم درست ہے مگر اسے بجالانے کیلئے اولاً ایمان ضروری پھر عبادت لازم، باقی تحصیل معرفت کا حکم محال ہے اس پر ہم نے اصول میں خوب گفتگو کی ہے اور یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ

یہ کلام اگرچہ اس میں تام ہے کہ وہ چیز جس میں علم اس پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ، علم کے بعد ہی اس کا حکم دے گا کیونکہ یہ دیگر صفات میں جاری نہیں ہوسکتی تو اس کے ساتھ حکم کا ورود کیوں جائز نہیں؟

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں تو یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حکم اہل ایمان کو شامل ہے، یہ کہنا کہ یہ حکم تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں اگر یہ بات متعذر ہے تو ہم حکم کو عبادت پہ دوام یا اس میں اضافہ پر محمول کرلیں گے اور واضح ہے کہ عبادت میں اضافہ بھی عبادت ہی ہوتا ہے تو اُعبدوا کی تفسیر عبادت میں اضافہ، درست ہے۔

پانچویں بحث: منکرین تکلیف کے دلائل

کچھ لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکالیف و ذمہ داریوں کا حکم آ ہی نہیں سکتا، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ حکم تکلیفی بندے کی طرف کس حالت میں متوجہ ہوگا جب اس کے دواعی فعل یا ترک برابر ہوں گے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح ہوگی اگر پہلی صورت لیں تو یہ محال کیونکہ حال برابری میں حصول ترجیح محال کیونکہ برابری اور ترجیح میں تضاد ہے تو ان کا اجتماع محال ہوگا تو دواعی کے بوقت برابری کسی فعل کی تکلیف، تکلیف مالا یطاق ہوتی ہے۔

اگر دوسری صورت لیں تو راجح کا وقوع یقینی ہوگا کیونکہ مرجوح جب راجح کے مساوی ہوگا تو اس کا وقوع ممتنع ہوتا ہے ورنہ ممکن کا وقوع بغیر مرجح لازم آئے گا۔ جب وہ حالت برابری میں ممتنع الوقوع ہے تو حالت مرجوحیت میں بطریق اولیٰ ممتنع ہوگا تو جب مرجوح کا وقوع ممتنع ہے تو راجح کا لازماً وقوع ہوگا۔ کیونکہ اس سے نقیضین سے خروج ہوسکتا ہے جب یہ ثابت ہے تو اگر تکلیف راجح کیلئے ہے تو اب لازم الوقوع کے ایجاد کی تکلیف و ذمہ داری لازم آئے گی اور اگر تکلیف وقوع مرجوح کی ہے تو یہ ممتنع الوقوع کی تکلیف ہوگی تو دونوں صورتوں میں تکلیف مالا یطاق لازم آرہی ہے۔

۲۔ جس کے بارے میں حکم تکلیفی وارد ہے، اس کے وقوع کا اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا یا اسکے عدم وقوع کا یا دونوں کا علم نہ تھا، اگر اول صورت ہے تو لازم الوقوع کا عدم ممتنع، تو اس کے حکم کا فائدہ ہی کوئی نہیں، اگر اس کا عدم وقوع علم میں تھا تو اب اس کا وقوع ممتنع اور عدم لازم ہوگا تو اس کا حکم دینا ممتنع کو واقع کرنے کا حکم ہوگا او اگر وہ نہ ان کا وقوع جانتا ہے اور نہ عدم وقوع، تو یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جہالت کا قول ہے جو محال ہے اور اس لیے بھی کہ اگر معاملہ یوں ہی ہو تو پھر مطیع و عاصی میں امتیاز نہیں رہے گا تو اب طاعت میں کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا۔

۳۔ حکم تکالیف کا ورود فائدہ کیلئے ہوگا یا فائدہ کیلئے نہ ہوگا، اگر فائدہ کیلئے ہے تو وہ عابد کو ہوگا یا معبود کو۔

معبود کیلئے ہونا محال ہے کیونکہ وہ بالذات کامل ہے اور کامل لذاتہ، غیر کی وجہ سے کامل نہیں ہوتا، اس لیے بھی کہ ہم بداہۃً جانتے ہیں کہ الٰہ دہر و زمانہ سے بلند ہے اس کا بندے کے رکوع و سجود سے نفع حاصل کرنا محال ہے۔

یا فائدہ عابد کیلئے ہوگا، یہ بھی محال ہے کیونکہ تمام فوائد، حصولِ لذت اور دفع آلام میں منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ بندے کیلئے بغیر

کسی واسطہ مشقات وتکالیف کےان کے مہیا کرنے پر قادر ہےتو ان تکالیف کوواسطہ بنانا عبث ہےاور عبث کام کی حکیم ذات کی طرف نسبت کرنا ہی جائز نہیں۔

۴۔ عبد اپنے افعال کا موجد نہیں کیونکہ یہ ان کی تفاصیل نہیں جانتا اور جو شئی کی تفصیلات سے آگاہ نہ ہووہ اس کا موجد نہیں ہوسکتا جب عبد خود اپنے افعال کا موجد نہیں اب اگر اسے ایسے فعل کا حکم ہے جس کی تخلیق ہو چکی تو اب یہ تحصیل حاصل ہوگی اور اگر ایسے فعل کا حکم ہے جو تخلیق نہیں ہوا تو محال کا حکم ہوگا جو باطل ہے

۵۔ تکلیف سے مقصود، تطہیر قلوب ہے اس پر آیات قرآنی شاہد ہیں اگر ہم کسی انسان کے بارے میں فرض کریں کہ اس کا دل دائمی طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح مشغول ومستغرق ہے کہ اگر وہ ان افعال ظاہرہ میں مشغول ہو تو اس کی معرفت الٰہی کے استغراق میں عارض ورکاوٹ ہوں گے لہٰذا اس سے تکالیف ظاہرہ کا سقوط ضروری ولازم ہوگا کیونکہ فقہاء امت اور اہلِ قیاس کہتے ہیں کہ جب تکالیف سے مقصود وحکمت حاصل ہو جائے تو احکام معقولہ کی اتباع لازم ہوتی ہے نہ کہ احکامِ ظاہرہ کی

جواب: پہلے تین شبہات کا دو طرح جواب ہے

ا۔ اس شبہ والوں نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ عدمِ تکلیف کا اعتقاد لازم ہے یہ خود ایسی تکلیف ہے جو تکلیف کی نفی کر رہی ہے تو یہ تضاد وتناقض ہے

۲۔ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہر عطا احسن ہے خواہ وہ بصورت تکلیف مالایُطاق (طاقت سے بڑھ کر) ہے یا اس کے علاوہ ہے کیونکہ وہ خالق ومالک ہے اور مالک کے فعل پر اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

چھٹی بحث: اہل تفسیر کہتے ہیں یہاں حکمِ عبادت اگر چہ عام ہے جو تمام لوگوں کو شامل ہے لیکن جو حکم ہی نہیں پاتے وہ اس سے مخصوص ہوں گے مثلاً بچہ، دیوانہ، غافل اور ناسی، اسی طرح جو قادر نہ ہو، ارشادِ الٰہی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (پ۳، البقرۃ:۲۸۶) کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا مگر اس کے مقدور بھر

بعض نے کہا: غلام بھی مخصوص ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے موالی کی طاعت لازم کی ہے تو ان کی خدمت میں مشغولیت عبادت رب سے رکاوٹ ہوگی، طاعت مولیٰ کے لزوم پر دال امر، وجوب عبادت کے امر سے خاص ہے اور خاص، عام سے مقدم ہوتا ہے، اس کی تفصیل اصول فقہ میں ملاحظہ کریں۔

چوتھا مسئلہ: بندہ کا حق لازم نہیں

قاضی عبدالجبار کہتے ہیں آیت مبارکہ بتا رہی ہے کہ عبادت کا سبب یہی ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ہم پر انعام فرمایا، ہمارے اصحاب نے اسی آیت سے اس پر استدلال کیا کہ بندہ اپنے فعل پر ثواب کا حق دار نہیں بنتا کیونکہ جب اس کا ہمیں پیدا کرنا اور انعام فرمانا، لزوم عبادت کا سبب ہے تو اب ہمارا اس کی عبادت میں مشغول رہنا اپنے ذمہ لازم کی ادائیگی ہے اور انسان جب اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے تو وہ اس پر کسی شی کا استحقاق نہیں رکھتا تو لازماً بندہ اپنی عبادت پہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کا حق دار نہیں ہوتا

رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادتِ رب کا حکم دیا تو اس کے ساتھ ہی وجودِ صانع پہ دلیل ذکر کی اور وہ ان مکلفین اور ان سے پہلے لوگوں کی تخلیق ہے، یہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول، نظر و استدلال سے ہی ہوتا ہے۔

حشویہ نے اس طریق پر طعن کرتے ہوئے کہا، علم کلام میں مشغولیت بدعت ہے، ہمارے مذہب کے اثبات میں دلائل نقلیہ و عقلیہ ہیں۔

تین مقامات

یہاں تین مقامات ہیں

علم کلام کی فضیلت

پہلا مقام: اس علم کی فضیلت چند طرح سے ہے۔

۱۔ علم کا شرف، معلوم کے شرف کی بنا پر ہوتا ہے جیسے جیسے معلوم اعلیٰ ہوگا اور اس کا علم بھی اس قدر اعلیٰ قرار پائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، تمام صفات سے اشرف ہیں تو لازم ہے اس سے متعلق علم بھی سب سے اعلیٰ ہو۔

۲۔ علم، دینی ہوتا ہے یا غیر دینی، بلاشبہ علم دین، دوسرے علوم سے اشرف ہے، علم دینی، علم اصول ہے یا اس کے علاوہ، جو اس کے علاوہ ہے اس کی صحت علم اصول پر موقوف ہوگی کیونکہ مفسر، کلام اللہ تعالیٰ کے معانی سے بحث کرتا ہے اور یہ صانع، مختار و متکلم کے وجود کی فرع ہے، محدث، کلام رسول ﷺ سے بحث کرتا ہے یہ ثبوت نبوت محمدی ﷺ کی فرع ہے، مجتہد، احکام

اللہ کی بحث کرتا ہے اور یہ ثبوت توحید و نبوت کی فرع ہے لہٰذا ثابت ہوا یہ تمام علوم، علم الاصول کے محتاج ہیں ظاہر ہے علم الاصول ان سے مستغنی ہے لہٰذا علم الاصول کا اشرف ہونا ضروری ہے۔

۳۔ بعض اوقات شی کا شرف اس کی ضد کی خساست اور کمینہ پن سے ظاہر ہوتا ہے تو جیسے جیسے اس کی ضد خسیس ہوگی وہ اشرف ہوگا، علم الاصول کی ضد، کفر و بدعت ہے اور یہ دونوں اشیاء میں اخس اور نہایت ہی پست ہیں لہٰذا لازم ہے کہ علم الاصول اشرفِ اشیاء ہو

۴۔ شی کا شرف بعض اوقات موضوع کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف شدت حاجت کی بنا پر، اور کبھی اس کے دلائل کی قوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ علم الاصول ان تینوں پر مشتمل ہے اس لیے کہ علم ہیئت، علم طب سے افضل ہے کیونکہ علم ہیت کا موضوع، علم طب کے موضوع سے افضل ہے اگرچہ طب اس سے افضل ہے کیونکہ طب کی طرف شدت حاجت، ہیت سے زیادہ ہے، علم حساب ان دونوں سے افضل ہے کیونکہ علم حساب کے براہین قوی ہیں۔

علم الاصول اس میں مطلوب، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کی معرفت ہے اور معدومات و موجودات کے اقسام معلومات کی معرفت ہے، بلاشبہ یہ بات اشرف الامور ہے۔

رہی علم الاصول کی ضرورت تو وہ شدید ہے کیونکہ اس کی ضرورت دین میں ہوگی یا دنیا میں، دین میں تو شدید ہے کیونکہ جو مذکورہ اشیاء کی معرفت پالے گا وہ ثواب عظیم اور ملائکہ کے ساتھ لاحق ہو جائے گا اور جو ان سے جاہل رہا وہ مستحق عذاب اور شیاطین کے ساتھ شامل۔

دنیا میں حاجت یوں ہے کہ کائنات کے مصالح، صانع بعث و نشر اور قیامت پر ایمان سے، منظم و باضابطہ بنتے ہیں، اگر ان چیزوں پر ایمان نہ ہو تو جہاں میں قتل اور فتنے برپا ہو جائیں۔

قوت براہین، تو اس علم کے براہین مقدماتِ یقینیہ اور تراکیب یقینیہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ قوت کا آخری درجہ ہے تو ثابت ہوا یہ علم تمام جہات سے شرف و فضل پر مشتمل ہے لہٰذا یہ لازماً تمام علوم سے اشرف ہوگا۔

۵۔ اس علم کو نسخ و تغیر عارض نہیں ہو سکتا اور نہ یہ مختلف اُمم اور علاقوں کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے بخلاف دیگر علوم، تو اس کا اشرف ہونا ضروری ہے۔

۶۔ اس علم کے مطالب و براہین پر مشتمل آیات، ان آیات سے اشرف ہیں جن میں مطالب فقہیہ کا بیان ہے اس لئے کہ سورۂ اخلاص

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (پ۳۰، الاخلاص:۱) اے محبوب کہہ دیجئے وہ اللہ ایک ہے

اور سورۃ البقرہ کی آخری آیات

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ (پ۳، البقرۃ:۲۸۵) رسول ایمان لائے جو اُتارا گیا

اور آیت الکرسی کی فضیلت میں جو کچھ وارد ہے، وہ

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ (پ۲، البقرہ:۲۲۲) وہ آپ سے حیض کے بارے پوچھتے ہیں

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اے ایمان والو جب تم قرض کا معاملہ کرو

(پ۳، البقرۃ:۲۸۲)

کے بارے میں وارد نہیں ہے۔

۷۔ احکام شرعیہ میں وارد آیات چھ صد سے کم ہیں باقی تمام بیان توحید و نبوت اور اقسامِ مشرکین اور بُت پرستوں کے رد میں ہیں اور قصص میں وارد آیات سے مقصود، اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت کی معرفت ہے، جیسے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ تحقیق ان کے قصص میں تمہارے لیے عبرت ہے اے عقل والو (پ۱۳، یوسف:۱۱۱)

یہ واضح کر رہا ہے کہ یہ علم افضل ہے۔

وجودِ صانع وخالق پہ دلائل

وجود صانع وخالق پر دلائل سے قرآن خوب مالا مال ہے۔

۱۔ یہ دلائل خمسہ جن کا ذکر یہاں آیات میں ہے،

۱۔تخلیق مکلفین، ۲۔ان سے پہلوں کی تخلیق، ۳۔آسمان کی تخلیق،

۴۔زمین کی تخلیق، ۵۔ زمین کی طرف آسمان سے نازل پانی سے پھلوں کی تخلیق

قرآن مجید میں، آسمانوں اور زمین کے جن عجائبات کا ذکر ہے اس سے مقصود بھی معرفت صانع ہی ہے۔

صفاتِ الٰہی پہ دلائل

صفت علم باری تعالیٰ، ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ تحقیق اللہ پر زمین وآسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں

پھر اس کے بعد متصل فرمایا

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۤءُ وہی رحموں میں تمہاری صورت بناتا ہے جیسے چاہتا ہے

(پ۳، آل عمران:۵،۶)

یہ بعینہ متکلمین کی دلیل ہے کیونکہ یہ احکام، افعال اوران کے اتقان ونظم سے علم صانع پر استدلال کرتے ہیں یہاں صانع سبحانہ نے ارحام میں تصویر صورتوں کو اپنے عالم اشیاء ہونے پہ دلیل بنایا ہے، اور فرمایا:

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ کیا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا اور وہ ہر باریکی جانتا خبردار ہے

(پ۲۹، الملک:۱۴)

یہ بعینہ یہی دلیل ہے، فرمایا

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ (پ۷، الانعام:۵۹) اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی انہیں وہی جانتا ہے

یہ اس کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا عالم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مغیبات کے بارے میں جو جو خبر دی ہے اس کے مطابق ہی اشیاء کا وقوع ہوا ہے اگر وہ غیوب کا عالم نہ ہوتا تو اشیاء کا وقوع اس طرح نہ ہوتا۔

صفت قدرت، اللہ تعالیٰ کا مختلف پھلوں اور مختلف حیوانات کا پیدا کرنا ہے حالانکہ طبائع اربعہ میں یہ تمام برابر ہیں یہ واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے نہ کہ اس کی ذات پہ کچھ لازم ہے۔

صفت تنزیہہ پہ یہ دال ہے کہ وہ جسم نہیں اور نہ ہی کسی محل کا محتاج ہے، ارشادِ الٰہی ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (پ۳۰، الاخلاص:۱) اعلان کر دو وہ اللہ ایک ہی ہے

کیونکہ مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور محتاج حادث، احد ذات کیلئے ضروری ہے کہ وہ جسم نہ ہو، جب جسم نہیں تو وہ محل کا محتاج بھی نہیں

صفت توحید پر یہ ارشاداتِ الٰہیہ دال ہیں

لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (پ۱۷، الانبیاء:۲۲) اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو ضرور وہ تباہ ہو جاتے

اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا (پ۱۵، الاسراء:۴۲) جب تو وہ عرش کے مالک کی طرف کوئی راہ ڈھونڈ نکالتے

وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (پ ۱۸، المؤمنون:۹۱) اور ضرور ایک دوسرے پر اپنی تعلّی چاہتا

ثبوتِ نبوت پر، یہ ارشادِ الٰہی دلیل ہے

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (پ ۱، البقرۃ:۲۳) اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اُتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ

ثبوتِ آخرت ومعاد، پہ یہ ارشادِ الٰہی شاہد ہے

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (پ ۲۳، یٰسین:۷۹) کہہ دیجئے وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ پیدا فرمایا۔

اگر تم علم کلام کا مطالعہ کرو تو تم اس میں انہی دلائل کی تفصیل، انہی کا دفاع اور ان پہ وارد شدہ اعتراض وشبہات کا جواب پاؤ گے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ علم کلام کی مذمت ان دلائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیے یا وہ ان دلائل پر اعتراض وشبہات کے دفاع پر مشتمل ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی عاقل ایسی بات نہ کہہ سکتا ہے اور نہ اسے پسند کر سکتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل کی حکایت ملائکہ اور اکثر انبیاء علیہم السلام سے کی ہے، ملائکہ نے کہا تھا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (پ ۱، البقرۃ:۳۰) کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا

گویا ان کی مراد یہ تھی کہ ایسی شی کا پیدا کرنا قبیح ہے اور قبیح عمل، ذات حکیم کے مناسب نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دیا

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (پ ۱، البقرۃ:۳۰) میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

مراد یہ کہ جب میں تمام معلومات کا عالم ہوں تو ان کی تخلیق وتکوین میں جو حکمت میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے، بلاشبہ یہ مناظرہ ہی تھا، رہا اللہ تعالیٰ کا ابلیس کے ساتھ مناظرہ تو وہ بڑا ہی واضح ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام میں پہلے سیدنا آدم علیہ السلام ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی فضیلت یوں ظاہر کی کہ ملائکہ پہ ان کا علم آشکار کیا تو یہ استدلال ہی ہے، سیدنا نوح علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کفار کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا۔

یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (پ ۱۲، ہود:۳۲) اے نوح تم ہم سے جھگڑے اور بہت ہی جھگڑے

واضح ہے یہ مجادلہ، تفاصیل احکام شرعیہ میں نہیں بلکہ توحید ونبوت میں ہی تھا تو اس علم میں نصرتِ حق کیلئے مجادلہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اس بارے میں احاطہ طویل ہے، ان کے یہ مقامات ہیں۔

پہلا مقام: ان کی اپنی ذات کے ساتھ بحث

ارشادِ الٰہی ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (پ ۷، الانعام:۷۶)

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تارا دیکھا بولے اسے میرا رب ٹھہراتے ہو پھر جب وہ ڈوب گیا بولے مجھے خوش نہیں آتے ڈوبنے والے

یہی متکلمین کا طریقہ ہے کہ وہ بھی حدوث وتغیر سے استدلال کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے اس پہ ان کی مدح فرمائی۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَا اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (پ ۷، الانعام:۸۳)

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کواس کی قوم پر عطا فرمائی

دوسرا مقام: اپنے باپ کے ساتھ بحث

ارشادِ الٰہی ہے

يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (پ ۱۶، مریم:۴۲)

اے میرے باپ کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ تیرے کام آئے

تیسرا مقام: قوم کے ساتھ بحث

کہیں قولاً اور کہیں فعلاً، قولاً کے بارے میں ہے

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (پ ۱۷، الانبیاء:۵۲)

یہ مورتیاں کیا ہیں جن کے آگے تم آسن مارے ہو

فعلاً کے بارے میں ہے

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (پ ۱۷، الانبیاء:۵۸)

توان سب کو چورا کر دیا مگر ایک کو جوان سب کا بڑا تھا کہ شاید وہ اس سے کچھ پوچھیں

چوتھا مقام: اپنے وقت کے بادشاہ سے مناظرہ

ارشادِ مبارک ہے

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ (پ۳، البقرۃ:۲۵۸) میرا رب جو زندہ کرتا اور موت دیتا ہے اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور موت بھی دیتا ہوں

جو فطرت سلیمہ رکھتا ہے وہ جان لے گا کہ یہ تمام علم کلام انہی دلائل کی تفصیل اور ان پر وارد سوالات و معارضات کا دفاع ہیں۔

یہ ان کی تمام بحث مبدا (اللہ تعالیٰ) کے بارے میں ہے۔

آخرت و معاد میں ان کی بحث

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ (پ۳، البقرۃ:۲۶۰) اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں عرض کیا کیوں نہیں بلکہ چاہتا ہوں میرے دل کو قرار آجائے تو کہا چار پرندے پکڑو

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا توحید و نبوت میں فرعون کے ساتھ مناظرہ ملاحظہ کرو، توحید کے بارے میں ان کے اکثر دلائل بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہی ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں حکایت فرمائی:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (پ۱۶، طٰہٰ:۴۹،۵۰) بولا کہ تم دونوں کا خدا کون ہے اے موسیٰ! کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شی کو اس کے لائق صورت دی اور پھر ہدایت دی

یہی دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوں بیان کی:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ (پ۱۹، الشعراء:۷۸) وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا

اسی سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے

رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ (پ۱۹، الشعراء:۲۶) رب تمہارا اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا

یہ وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (پ۳، البقرۃ:۲۵۸) میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے

جب فرعون نے اس پر اکتفا نہ کیا اور دیگر کا مطالبہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (پ۱۹، الشعراء:۲۸) رب ہے مشرق اور مغرب کا

یہ وہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی:

فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (پ۳، البقرۃ:۲۵۸) تحقیق میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال

یہ تمام گفتگو اس پر شاہد ہے کہ ان دلائل کا بیان حضرات معصومین علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ وہ عقول سے استفادہ کے ساتھ سا اسلاف سے منقول دلائل سے استدلال کیا کرتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت پر معجزہ سے استدلال کیا۔

اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ (پ۱۹، الشعراء:۳۰) کیا اگرچہ میں تیرے پاس کوئی روشن چیز لاؤں

اور یہی وہ استدلال ہے کہ معجزہ صدق پر دال ہوتا ہے

تمام باطل فرقوں کا رد

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا توحید و نبوت اور معاد پر دلائل بیان فرمانا اس قدر ظاہر ہے کہ محتاجِ بیان ہی نہیں، قرآن ان سے خوب معمور ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹکراؤ کفار کے تمام فرقوں سے ہوا۔

ا۔دہریہ کا رد

جو کہتے ہیں:

وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ (پ۲۵، الجاثیۃ:۲۴) اور ہمیں نہیں ہلاک کیا مگر زمانے نے

تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام دلائل باطل قرار دیے۔

۲۔قادر مختار کے منکرین

تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو انواعِ نباتات اور اصنافِ حیوانات پیدا فرما کر ان کا رد کر دیا حالانکہ یہ تمام طبائع اور تاثیر افلاک میں برابر ہیں تو یہ عمل دلیل ہے کہ قادر موجود ہے۔

۳۔شریک باری ماننے والوں کارد

یہ شریک علوی یا سفلی ہوگا، شریک علوی مثلاً کواکب، عالم میں موثر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کو خلیل علیہ السلام کے ذریعے باطل کیا

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیۡهِ الَّیۡلُ جب اس پر رات چھائی

شریک سفلی، نصاریٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ اور بت پرست، بتوں کو الٰہ مانتے، تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کے دلائل کی تردید کی:

۴۔نبوت پر طعن کرنے والے دو گروہ

نبوت پر طعن، کرنے والے دو گروہ ہیں۔

۱۔ اصل نبوت میں طعن کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان سے بیان کیا:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا (پ۱۵، الاسراء:۹۴) کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا؟

۲۔ نبوت مانتے مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر طعن کرتے، مثلاً یہود و نصاریٰ۔ قرآن ان کی تردید سے مالا مال ہے۔ پھر ان کے طعن مختلف صورتوں پر تھے، کبھی قرآن پر طعن، تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً (پ۱، البقرۃ:۲۶) بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کیلئے کسی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔

کبھی معجزات کی طلب کی صورت میں طعن:

وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا (پ۱۵، الاسراء:۹۰) اور بولے کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ بہادو

کبھی کہتے قرآن تدریجاً کیوں نازل ہو رہا ہے، بیک وقت کیوں نہیں نازل ہو جاتا گویا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت تھی، تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (پ۱۹، الفرقان:۳۲) بات اس طرح ہے تاکہ ہم آپ کے دل کو تقویت دیں۔

۵۔حشر ونشر میں اختلاف کرنے والے

اللہ تعالیٰ نے اس پر حجت اور منکرین کے ابطال میں انواع کثیرہ سے دلائل دیئے ہیں۔

۶۔مکلف ہونے پر اعتراض

اس میں کوئی فائدہ نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا   اگر تم بھلائی کرو اپنا بھلا کروگے اور اگر برا کروگے تو اپنا

(پ۱۵ ،الاسراء:۷)

کبھی کہا جبر ہی حق ہے اور یہ تکلیف کے منافی ہے اس کا جواب یوں دیا:

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (پ۱۷ ،الانبیاء:۲۳)   اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا

ہم نے اس مقام پر مختصر اشارات کیے ہیں کیونکہ ان کی تفصیل اسی کتاب میں مذکور ہے جب یہ ثابت ہے کہ یہ حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کا طریقہ ومعمول ہے تو واضح ہو گیا ان پر طعن کرنے والا کافر ہوگا یا جاہل

دوسرا مقام: اس علم کے لزوم حصول پر دلائل

علم کلام کا حصول لازم ہے اس پر دلائل نقلیہ وعقلیہ ہیں۔

دلائلِ عقلیہ

بعض کی تقلید دیگر کی تقلید سے اولیٰ نہیں تو اب تمام کی تقلید جائز ہوگی تو تقلید کفار لازم آئے گی۔

یا بعض کی تقلید لازم اور بعض کی لازم نہ ہوگی تو لازم آئے گا آدمی بعض کی تقلید کا مکلف ہو اور بعض کا نہ ہو لیکن اس پر یہ اشکار نہ ہوگا کہ وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی کیوں تقلید کر رہا ہے؟

یا تقلید اصلاً ہی نہ ہوگی اور یہی مطلوب ہے۔ جب تقلید باطل ٹھہری تو اب طریقِ نظر وفکر ہی باقی ہے۔

دلائل نقلیہ: اس پر یہ آیات واخبار بھی دلائل ہیں:

۱۔ ارشادِ الٰہی ہے:

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (پ ۱۴، النحل:۱۲۵)

اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہے

بلاشبہ یہاں حکمت سے برہان وحجت ہی مراد ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کا، حکم دلیل و برہان کے ساتھ مزین کرنے کا حکم ہے۔ الفاظ ارشاد 'وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ' سے فروع شرع میں مجادلہ مراد نہیں کیونکہ جو نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہے اس کے ساتھ فروعات شرع میں گفتگو اور غور و خوض کا کیا فائدہ؟ اور جو نبوت کا قائل ہوگا وہ فروعات میں مخالف ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا معلوم ہوا اس جدال کی ضرورت توحید و نبوت میں ہے تو گویا اس میں جدال کا حکم پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم ہے۔

فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (پ ۳، آل عمران:۳۱)

میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بیشک تمہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی بہتر ہے

(پ ۲۱، الاحزاب:۲۱)

لہٰذا وہاں ہمیں جدال کا ہی حکم ہے۔

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (پ ۱۷، الحج:۳،۸)(پ ۲۱، لقمان:۲۰)

اور کچھ لوگ وہ ہیں کہ اللہ کے بارے بے جانے بوجھے جھگڑتے ہیں

اس میں بغیر علم، جدال کی مذمت ہے جو تقاضا کر رہا ہے کہ علمی جدال مذموم نہیں بلکہ ممدوح ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام سے حکایت فرمائی:

يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (پ ۱۲، ہود:۳۲)

بولے اے نوح تم ہم سے جھگڑے اور بہت ہی جھگڑے

۳۔ اللہ تعالیٰ نے نظر و فکر کا حکم دیا ہے

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ (پ ۵، النساء:۸۲)

تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (پ ۳۰، الغاشیۃ:۱۷)

تو کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ

اور عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق و انفس میں دکھائیں گے

(پ ۲۴، فصلت:۵۳)

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا (پ۱۳، الرعد:۴۱) کیا انہیں نہیں سوجھتا کہ ہم ہر طرف سے ان کی آبادی گھٹاتے آرہے ہیں

قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (پ۱۱، یونس:۱۰۱) فرمادیجئے دیکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ کیا وہ زمین وآسمان کی بادشاہی میں نہیں دیکھتے

۴۔ اللہ تعالیٰ نے تفکر کی مدح کی فرمائی ہے، ارشادِ مقدس ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ (پ۲۳، الزمر:۲۱) بیشک اس میں عقلمندوں کیلئے دھیان کی بات ہے

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ (پ۳، آل عمران:۱۳) بیشک اس میں عقلمندوں کیلئے ضرور دیکھ کر سیکھنا ہے

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی (پ۱۶، طہٰ:۵۴،۱۲۸) بیشک اس میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں

پھر اعراض کرنے والوں کی یوں مذمت کی۔

وَكَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ (پ۱۳، یوسف:۱۰۵) اور کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ اکثر لوگ ان پر گذرتے ہیں اور ان سے بے خبر رہتے ہیں

لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا (پ۹، الاعراف:۱۷۹) اور وہ دل رکھتے ہیں جن میں سمجھ نہیں

۵۔ اللہ تعالیٰ نے تقلید کی مذمت فرمائی، کفار سے یوں حکایت کی، کہتے ہیں:

اِنَّا وَجَدۡنَا اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ (پ۲۵، الزخرف:۲۳) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں

بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا (پ۲۱، لقمان:۲۱) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا

بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفۡعَلُوۡنَ (پ۱۹، الشعراء:۷۴) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا

اِنۡ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡلَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَیۡهَا (پ۱۹، الفرقان:۴۲) قریب تھا کہ یہ ہمیں ہمارے خداؤں سے بہکا دیں اگر ہم ان پر صبر نہ کرتے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد سے حکایت یوں کی:

لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا (پ۱۶، مریم:۴۶) بیشک اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھراؤ کروں گا اور مجھ سے زمانہ دراز تک بے علاقہ ہو جا

یہ تمام آیات لزومِ نظر وفکر، استدلال و تفکر پر اور مذمتِ تقلید پر شاہد ہیں تو جو نظر و استدلال کا داعی ہوگا وہ قرآن اور طریق انبیاء علیہم السلام پر ہوگا اور جو تقلید کی دعوت دے گا وہ قرآن کے مخالف، طریقِ کفار پر ہوگا۔

احادیثِ مبارکہ اور نظر و فکر

اس پر کثیر احادیث بھی شاہد ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ امام زہری، حضرت سعید بن مسیب سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں بنو فزارہ کے ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: میری بیوی نے کالے رنگ کا بچہ جنا ہے۔ فرمایا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہے؟ عرض کیا: ہاں۔ اس کا رنگ کیا ہے؟ عرض کیا: سرخ۔ فرمایا: کیا ان میں اور رنگ کا ہے؟ عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: وہ کیسے ہوگیا؟ یہ کہنے لگا ممکن ہے اس میں خاندانی اثر ہو۔ فرمایا: یہاں بھی تو ایسا ہو سکتا ہے۔ (البخاری، ۵۳۰۵)

واضح رہے یہی قیاس والزام سے استدلال ہے۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابنِ آدم نے میری تکذیب کی اور میری تکذیب نہیں کرنی چاہیے تھی، ابن آدم نے مجھے برا کہا اور اسے مجھے برا نہیں کہنا چاہیے تھا، میری تکذیب یہ ہے کہ اس نے کہا: وہ مجھے دوبارہ نہیں لوٹا سکتا جیسا کہ اس نے مجھے ابتداً پیدا کیا، حالانکہ مجھ پر پہلے پیدا کرنا دوبارہ لوٹانے سے زیادہ آسان نہیں؟ اس نے مجھے برا یوں کہا کہ وہ کہتا ہے اللہ کی اولاد ہے حالانکہ میں اللہ یکتا ہوں۔ صمد ہوں نہ میں نے کسی کو جنا نہ مجھے کسی نے جنا اور نہ کوئی میری مثل ہے۔ (البخاری: ۴۹۷۴)

غور کیجیے پہلے مقام میں اللہ تعالیٰ نے ابتداً کی قدرت سے دوبارہ لوٹانے کی قدرت پر کس طرح استدلال کیا ہے اور دوسرے مقام میں احدیت سے جسمانیت، والد اور مولود ہونے کی نفی پر استدلال کیا ہے۔

۳۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ — جو اللہ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ اس سے ملاقات پسند کرتا ہے اور جو اللہ سے ملاقات ناپسند کرے اللہ اس سے ملاقات ناپسند کرتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے ہر کوئی موت کو ناپسند کرتا ہے تو یہ اللہ کی ملاقات سے ہی ناپسندیدگی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ مومن اللہ سے ملاقات پسند کرتا ہے تو اللہ اس کی ملاقات اور کافر، اللہ سے ملاقات ناپسند کرتا ہے تو اللہ اس سے ملاقات پسند نہیں فرماتا۔ (البخاری: ۶۵۰۷)

تو یہ تمام شواہد بتا رہے ہیں کہ دلائل میں نظر وفکر کا حکم ہے۔

مخالف کے مقامات

یادر ہے مخالفین کے بھی مقامات ہیں:

۱۔ نظر، مفید علم نہیں۔

۲۔ مفید علم نظر، مقدور نہیں۔

۳۔ اس پر اقدام جائز نہیں۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تعلیم نہیں۔

5 یہ عمل بدعت ہے۔

پہلا مقام: نظر مفیدِ علم نہیں

مخالفین نے اس پر یہ دلائل دیے ہیں:

۱۔ ہمارے غور وفکر کے بعد ایک اعتقاد ہمیں حاصل ہوتا ہے تو یہ اعتقاد، علم ہے اب یہ یا تو ضروری ہے یا نظری۔

اول باطل کیونکہ انسان جب اپنے اعتقاد پر تامل کرتا ہے کہ یہ اعتقاد علم ہے مثلاً اس کے اعتقاد میں ہے کہ واحد، دو کا نصف ہے، سورج روشن ہے، آگ جلاتی ہے تو اب اول، دوسرے سے اضعف ہے جو واضح کر رہا ہے کہ ضعف اول، کو عارض ہو رہا ہے، ثانی صورت بھی باطل کیونکہ فکر ثانی میں، کلام اول کی طرح ہے تو تسلسل ہوگا جو محال ہے۔

۲۔ جب اہلِ علم کو دیکھتے ہیں وہ مطالعہ ولغت سے ایک فکر کا اعتقاد کرتے ہیں اور اس کے علم ہونے کا جزم کر لیتے ہیں پھر اس پر یا دوسروں پر اشکار ہوتا ہے کہ یہ تو جہل تھا تو وہ اس سے رجوع کرتے ہیں۔ جب صورت اول میں یہ مشاہدہ ہے تو ممکن ہے دوسرا حاصل شدہ اعتقاد بھی علم نہ ہو لہٰذا بطریق نظر وفکر حاصل کردہ عقائد کی صحت کا جزم ویقین ممکن نہ ہوگا۔

۳۔ اگر مطلوب کا شعور ہے تو اس کی طلب محال کیونکہ تحصیلِ حاصل محال ہے اور اگر اس کا شعور نہیں اور ذہن اس سے غافل ہے اور غافل شدہ شی کی طرف ذہن کا متوجہ ہونا محال ہے۔

۴۔ یہ علم کہ نظر مفید علم ہے ضروری ہے یا نظری، اگر ضروری ہے تو تمام عقلاء کا اس میں اشتراک لازم حالانکہ ایسا نہیں اور اگر نظری ہے تو لازم آئے گا شی کی جنس شی کا افراد میں سے ایک فرد سے اثبات ہو اور یہ محال ہے کیونکہ جب ماہیت میں نزاع ہے تو اس فرد میں بھی نزاع ہوگا تو اثبات الشئ بنفسہٖ لازم آئے گا اور یہ محال ہے اس لیے کہ جب وہ اثبات کیلئے وسیلہ ہے تو

اس کا پہلے معلوم ہونا ضروری ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ مطلوب ہے تو لازم ہے پہلے وہ معلوم نہ ہو تو اب نفی و اثبات کا اجتماع لازم جو محال ہے۔

۵۔ مقدمہ واحد، نتیجہ نہیں دیتا بلکہ دو مقدموں کا مجموعہ نتیجہ دیتا ہے لیکن دونوں کا دفعاً ذہن میں حاضر ہونا محال ہے کیونکہ ہمارا تجزیہ ہے جب ہم ایک کی طرف نفس کو متوجہ کرتے ہیں تو اس وقت کسی اور معلوم کی طرف توجہ کرنا محال ہے۔

نظر الٰہیات میں مفید نہیں

بعض نے یہ تو مانا کہ نظر، مفید علم ہے لیکن انہوں نے کہ: الٰہیات میں یہ مفید نہیں اور اس پہ دو وجہ سے استدلال کیا۔

پہلی وجہ: حقیقت الٰہ متصور نہیں جب حقیقت متصور نہیں تو اب اس کی تصدیق محال ہو گی نہ تو اس کی ذات کی اور نہ کسی صفت کے ثبوت کی تصدیق ہو گی۔

بیان اول یوں ہے کہ بشر کو یہ معلوم ہے کہ واجب الوجود کی ذات محل وجہت سے منزہ اور وہ علم وقدرت کے ساتھ متصف ہے، وجوب وتنزیہ، قید سلبی ہے تو حقیقت یہ نفس سلب نہیں تو اب اس سلب کا علم اس کی حقیقت کا علم نہ ہو گا، رہا علم وقدرت سے موصوف ہونا تو اس سے مراد ذات کا ان صفات کی طرف منسوب کرنا ہے اور یہ انتساب بھی ذات نہیں تو اس انتساب کا علم بھی اس کی ذات کا علم نہ ہوا۔

بیان ثانی یوں ہے کہ تصدیق، تصور پر موقوف ہے جب تصور مفقود تو تصدیق بھی ممتنع ہو گی۔

سوال: کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ذات اقدس اگر چہ حقیقتِ مخصوصہ کے اعتبار سے متصور نہیں لیکن لوازم کے اعتبار سے متصور ہے۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ شی جسے وجوب، تنزیہ ودوام لازم ہے تو اس متصور پہ حکم جاری ہو جائے گا۔

جواب: کیونکہ ہم کہتے ہیں یہ امور معلومہ، نفسِ ذات ہیں یہ محال ہے یا ذات سے خارج امور ہیں، جب ذات نہیں جانتے تو ممکن نہیں کہ ہم یہ جان لیں کہ وہ ان صفات سے متصف ہے، اب اگر وہ تصور جو ان صفات کے انتساب کیلئے شرط ہے تو یہ بھی دیگر صفات کے اعتبار سے ہو گا۔ تو اس میں کلام ہو گی تو تسلسل لازم جو محال ہے۔

دوسری وجہ: ہمارے ہاں اشیاء میں سب سے ظاہر ہماری اپنی ذات اور حقیقت ہے جس کی طرف ہم انا کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں۔ لوگ اس کی ماہیت میں حیران وسرگردان ہیں۔ بعض نے کہا مراد یہ جسم ہے، بعض نے مزاج، بعض نے اجزا داخلہ بعض نے کہا نہ داخل نہ خارج ہے، جب سب سے ظاہر شی کا حال یہ ہے تو اس شی کا حال کیا ہو گا جو مناسبت کے اعتبار سے ہمارے اور ہمارے احوال سے تمام اشیاء سے بعید ہے۔

دوسرا مقام: نظر مفید علم مگر ہم قادر نہیں

اس پر ان کے دو دلائل ہیں

پہلی دلیل: تصورات کا حصول، غیر مقدور ہے تو تصدیقات بدیہیہ غیر مقدور ہوں گی تو تمام تصدیقات غیر مقدور ٹھہریں۔

تصورات غیر مقدور ہیں۔ کیونکہ ان کے حصول کا طالب اگر انہیں جانتا ہے تو ان کا حصول محال کیونکہ تحصیل حاصل محال ہے اور اگر ان سے غافل ہے تو ان کا طالب نہیں بن سکتا کیونکہ شئ سے غافل اس کا طالب نہیں ہوسکتا۔

سوال: ممکن ہے وہ من وجہ معلوم ہوں اور من وجہ مجہول؟

جواب: جو وجہ معلوم ہوگی وہ اس وجہ کے غیر ہوگی جو معلوم نہیں ورنہ صدق و کذب کا شئ واحد پر صدق ہوگا جو محال ہے تو اب ہم کہتے ہیں وجہ معلوم کا حصول، تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال اور غیر معلوم وجہ کا حصول مغفول (غفلت شدہ) ہونے کی وجہ سے ہوگا کیونکہ وہ مطلوب ہی نہ ہوگا۔

ہمارا قول، تصورات جب غیر کسبی ہیں تو اب تصدیقات بدیہیہ کا کسبی ہونا محال ہوگا کیونکہ قضیہ بدیہیہ میں موضوع و محمول ذہن میں آنے سے لازم ہوگا کہ محض ان دونوں کے حصول سے ذہن کو ایک کی نسبت دوسرے سے نفی و اثبات کا جزم ہو یا لازم نہ ہوگا، اگر لازم نہیں تو قضیہ بدیہیہ نہ ہوگا بلکہ مشکوکہ ہوگا اور اگر لازم ہے تو ان دونوں تصورات کے حصول پر تصدیق لازم الحصول ہوگی اور ان کے عدمِ حصول پر ممتنع الحصول ہوگی۔ اور جو نفی و اثبات میں واجب الدور ہو حالانکہ وہ نفیًا و اثباتًا مقدور نہ ہو تو لازم ہے وہ بھی اسی طرح ہو تو ثابت ہوا تصدیقات بدیہیہ غیر کسبی ہیں۔

ہم نے جو کہا تصدیقات جب کسبی نہیں تو تصدیقات میں سے کوئی شئ بھی کسبی نہ ہوگی کیونکہ جو تصدیق بدیہی نہیں ضروری ہے کہ وہ نظری ہو تو اب دو صورتیں ہیں کہ ان تصدیقات بدیہیہ کے حضور کے وقت وہ واجب الزوم ہوگی یا واجب نہ ہوگی، اگر وہ واجب الزوم نہیں تو ان مقدمات کے صدق سے مطلوب کا صدق لازم نہیں تو یہ استدلال یقینی نہیں بلکہ ظنی یا اعتقاد تقلیدی ہوگا، اور اگر واجب اللزوم ہے تو وہ نظریات انؔ قضایا ضروریہ کے ساتھ نفیًا اثباتًا واجب الدور ہوں گے تو اب لازم ہے کہ ان نظریات میں سے کوئی بھی بالکل عبد کے مقدور میں نہ ہو۔

دوسری دلیل: انسان کسی شئ کو وجود دینے پر تب قادر ہوسکتا ہے کہ اس کیلئے مطلوب کو غیر مطلوب سے ممتاز کرنا ممکن ہو، علم، جہل سے یوں ممتاز ہوتا ہے کہ وہ معلوم کے مطابق ہوتا ہے اور جہل مطابق نہیں ہوتا اور یہ اس وقت معلوم ہوگا جب معلوم کے بارے میں صحیح علم ہو تو اب کسی شئ کے ایجاد کا علم اس وقت ممکن ہوگا جب آدمی اس شئ کا عالم ہوگا لیکن یہ محال کیونکہ تحصیل حاصل محال ہے لہٰذا لازم ہے کہ بندہ ایجادِ علم اور ایجادِ طلب علم پر قادر نہ ہو۔

تیسری دلیل: موجب نظر کون؟

موجب نظر، ضرورت عقل ہے یا نظر یا سمع؟ اول باطل ہے کیونکہ ضروری میں عقل شرط نہیں ہے، وجوب فکر ونظر کا معاملہ ایسا نہیں بلکہ کثیر عقلاء اسے بُرا جانتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے صاحب کو جہل تک پہنچا دیتی ہے لہٰذا اس سے احتراز ضروری ہے ثانی بھی باطل اس لیے کہ جب اس کے وجوب کا علم ہوا تو وہ نظری ہوگا تو اب قبل از نظر، وجوب نظر کا علم ممکن نہ ہوگا۔ تیسری صورت بھی باطل اس لیے کہ قبل از نظر، معرفت وجوب نظر پر متمکن نہ ہوگا اور بعد از نظر اس کا ایجاب ہی ممکن نہیں کیونکہ اس میں کوئی فائدہ ہی نہیں، جب یہ تمام صورتیں باطل ہیں تو وجوب کی نفی ثابت ہوگی۔

تیسرا مقام: نظر مفید علم مگر

نظر مفید علم اور مقدور مکلّف ہے مگر اللہ تعالیٰ کا اس کے بارے میں حکم دینا قبیح ہے، اس کا بیان ان دلائل سے ہے:

پہلی دلیل: نظر، اکثر امور میں صاحب نظر کو جہل تک لے جاتی ہے تو جو اس کی طرف اقدام کرتا ہے وہ اکثر جہالت تک جاتا ہے جس کا معاملہ یوں ہو وہ قبیح ہوتا ہے لہٰذا لازم ہے کہ فکر قبیح ہو اور اللہ تعالیٰ کسی قبیح کا حکم نہیں دیتا۔

دوسری دلیل: ہم میں ہر کوئی ناقص، ضعیف الخاطر اور شبہات کثیرہ متعارضہ کا محل ہے لہٰذا حق و باطل میں امتیاز کیلئے ہم عقل پہ اعتماد کیسے کریں؟ جب ہم اصحاب مذاہب کو دیکھتے ہیں ان میں ہر ایک مدعی ہوتا ہے کہ حق ہمارے اور باطل مخالف کے ساتھ ہے۔ اگر وہ تعصب وہٹ دھرمی سے بالاتر ہو کر انصاف سے بھی کام لیں تو دلائل متعارض پاتے ہیں تو یہ واضح کر رہا ہے کہ ان حقائق کا ادراک عقل کر ہی نہیں سکتی۔

تیسری دلیل: مدارِ دین اگر حقائقِ دلائل میں نظر پر ہو تو لازم آئے گا کوئی انسان ایمان پر ایک گھڑی بھی پختہ نہ رہے اس لیے کہ صاحب نظر کے دل میں مقدمات دلیل دین کے کسی بھی مقدمہ پر سوال پیدا ہو سکتا ہے تو اس میں سوال پیدا ہوتے ہی وہ مقدمہ اس کے ہاں مشکوک ہو گیا، جب دلیل کے ایک مقدمہ میں شک ہو گیا تو نتیجہ ظنی ہوگا کیونکہ مظنون، مفید یقین نہیں لہٰذا لازماً انسان ہر ساعت، دین سے خارج ہوگا کیونکہ اس کے دل میں سوالات ومباحث ضرور پیدا ہوں گے۔

چوتھی دلیل: زدِ عام ہے جس نے کیمیاء کے ذریعے مال طلب کیا وہ مفلس ہو گیا اور جس نے کلام کے ذریعے دین طلب کیا وہ زندیق ہوا تو اس سے واضح ہو رہا ہے کہ علمِ نظر کا دروازہ کھولنا جائز نہیں۔

چوتھا مقام: نظر بالذات بد نہیں

نظر بذاتہ قبیح نہیں لیکن واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کا حکم ہمیں نہیں دیا، اس پر دلیل یہ ہے کہ مطالب کے دلائل کا علم ضروری تعلیم و تعلم سے مستغنی ہوگا یا نہ ہوگا بلکہ حصول کیلئے تامل، تدبر اور استفادہ کا محتاج ہوگا اول صورت باطل ورنہ تمام لوگوں کے لیے ان کا حصول لازم ہوگا اور یہ مکابرہ اور سینہ زوری ہے۔

اور اس لئے بھی کہ ہمارا تجربہ ہے۔

سب سے ذکی شخص کیلئے اس علم کا حصول سالہا، اساتذہ اور کتب کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر دوسری صورت ہے تو لازم ہوگا یہ علم کسی انسان کو ممارست شدیدہ اور مباحث کثیرہ کے بغیر حاصل ہی نہ ہو۔

تو اگر دین کا مدار اس پر ہے تو لازم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کسی انسان کے صحتِ اسلام کیلئے پہلے ان مسائل کے بارے پوچھیں اور اسے ان دلائل سے کامل طور پر آگاہ کریں، اگر رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہوتا تو مشہور ہوتا۔ جب یہ مشہور نہیں بلکہ بتواتر مشہور و منقول یہ ہے کہ آپ ﷺ اس شخص کے مسلمان ہونے کا اعلان فرماتے جو بالبداہت جانتا کہ اس کے دل میں ایسی کوئی شئی نہیں، تو معلوم ہوگیا یہ چیز صحت دین کیلئے معتبر ہی نہیں۔

سوال: معرفت اصول دلائل، اکثر عقلاء کو حاصل ہوتی ہے محتاجی محققین کیلئے ہوتی ہے تاکہ شبہات کا ازالہ کیا جائے ہاں یہ چیز صحتِ اصلِ دین میں معتبر نہیں۔

جواب: یہ بات ضعیف ہے کیونکہ دلیل زیادتی نقصان کو ہرگز قبول نہیں کرتی، اس لیے کہ دلیل جب دس مقدمات پر مبنی ہو اگر آدمی کو ان تمام مقدمات کی صحت کا جزم ہو تو وہ دلیل کی ایسی معرفت رکھے گا کہ اس سے زائد نہیں ہوسکتی کیونکہ اس سے جو زائد ہے وہ اس دلیل کے تحقق و ثبوت میں اگر معتبر ہے تو ہمارا قول باطل ہوگا کہ دلیل فقط دس مقدمات پر مشتمل ہے اور اگر وہ معتبر نہیں تو اس کا علم دلیل سے زائد نہ ہوا بلکہ وہ علم منفصل ہوگا تو ثابت ہوا کہ دلیل زیادتی کو قبول نہیں کرتی۔

اسی طرح وہ نقصان بھی قبول نہیں کرتی اس لیے کہ ان میں سے اگر نو مقدمات یقینی اور دسواں ظنی ہے تو مطلوب کا یقینی ہونا محال ہوگا کیونکہ ظنی پر مبنی بطریق اولیٰ ظنی ہوگا تو واضح ہوا کہ دلیل نہ زیادتی قبول کرتی ہے اور نہ نقصان۔

اس کے بطلان سے سوال بھی باطل ہوگیا اس کی مثال یہ ہے جب انسان بارش، کڑک اور چمک دیکھتا ہے جبکہ ہوا صاف ہو تو وہ کہتا ہے سبحان اللہ۔

کچھ نے کہا سبحان اللہ اس پر دال ہے کہ اس قائل نے اللہ تعالیٰ کو دلیل سے جانا۔ لیکن یہ باطل ہے اس لیے کہ وہ عارف

باللہ تب ہوگا جب اسے اس دلیل سے جانے کہ اس حادث کیلئے موثر ضروری ہے پھر دلیل کے ساتھ جانے کہ اس میں مؤثر، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

اور یہ دوسرا مقدمہ تب درست ہے جب دلیل کے ساتھ یہ جانے کہ یہ تخلیق وحدوث کی نسبت فلک، نجوم، طبع اور علت موجبہ کی طرف محال ہے اور اگر اس کا بطلان دلیل سے نہیں جانتا تو یہ اس دوسرے مقدمہ کا بغیر دلیل قائل ہوگا تو اب یہ مقدمہ تقلیدی ہوگا اور اس پر مبنی بھی تقلیدہوگا نہ کہ یقین لہٰذا تمہارے قول کا فاسد ہونا ثابت ہوگیا۔

پانچواں مقام: علمِ کلام پڑھنا بدعت

علم کلام کا حصول بدعت ہے اس پر قرآن، احادیث، اجماع اور اقوال اسلاف وحکماء موجود ہیں۔

قرآن میں ارشادِ الٰہی ہے

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (پ۲۵، الزخرف:۵۸) — انہوں نے یہ نہ کہی مگر ناحق جھگڑے کو، بلکہ وہ جھگڑالو لوگ ہیں

اس میں جدال کی مذمت ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (پ۷، الانعام:۶۸) — اور (اے سننے والے) جب تو انہیں دیکھے جو ہماری آیات میں پڑتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے جب تک اور بات میں پڑیں

یعنی جب آیات الٰہیہ میں خوض وجدال کریں تو ان سے اعراض کرلو۔

حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا

تَفَكَّرُوْا فِي الْخَلْقِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي الْخَالِقِ — مخلوق میں غور کرو مگر خالق میں غور وفکر مت کرو۔

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

عَلَيْكُمْ بِدِيْنِ الْعَجَائِزِ — بوڑھی خواتین کا دین قبول ولازم رکھو۔

یہ بھی فرمایا:

اِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَاَمْسِكُوْا — جب تقدیر کا تذکرہ آئے تو خاموشی اختیار کرو۔

(المعجم الکبیر للطبرانی:۱۴۲۷)

دلیل اجماع یوں ہے کہ صحابہ نے کبھی بھی کلامی گفتگو نہیں کی لہٰذا یہ علم بدعت اور حرام ہے باقی صحابہ کا اس میں گفتگو نہ کرنا ظاہر ہے کیونکہ ان میں سے کسی کے بارے میں منقول نہیں کہ انہوں نے ان اشیاء پر استدلال کی کوشش کی ہو بلکہ وہ اس میں مشغول ہونے سے شدید انکار کرتے جب یہ ثابت ہے تو اس کا بدعت ہونا ثابت لہٰذا یہ حرام ہے۔

آثار صحابہ و تابعین

۱۔ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بدعات سے بچو۔ پوچھا: اے ابوعبداللہ! بدعات کیا ہیں؟ فرمایا: اہلِ بدعت، اللہ تعالیٰ کے اسماء، صفات اور کلام میں گفتگو کرتے ہیں اور اس میں خاموشی اختیار نہیں کرتے جس پر صحابہ اور تابعین نے خاموشی اختیار کی۔

۲۔ حضرت سفیان بن عیینہ سے علم کلام کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا: سنت کی اتباع کرو اور بدعت سے بچو۔

۳۔ حضرت امام شافعی نے فرمایا: شرک کے علاوہ بندے کا ہر گناہ میں مبتلا ہونا اس سے بہتر ہے کہ وہ علم کلام پڑھے۔ فرمایا: اگر کسی آدمی نے دوسرے کو علمی کتب دینے کی وصیت کی اگر ان میں کتب کلام ہیں تو وہ داخل نہ ہوں گی۔

اگر کسی نے علماء کیلئے وصیت کی کہ انہیں یہ انعام دو تو علم کلام والا عالم اس میں شامل نہ ہوگا۔ واللہ أعلم

نظر و استدلال کے مخالفین کے دلائل یہی ہیں۔

ان دلائل کا رد

جواب: یہ شبہ کہ نظر مفید علم نہیں فاسد ہے کیونکہ جو شبہ ذکر ہوا وہ بدیہی نہیں بلکہ نظری ہے تو انہوں نے نظر کی بعض انواع واقسام کے ذریعے اس کے کل کی نفی ہے اور اس میں تناقض ہے۔

یہ شبہ کہ نظر غیر مقدور ہے، فاسد ہے کیونکہ وہ اس شبہ سے استدلال پر قادر و مختار ہوئے لہٰذا ان کا کہنا باطل کہ نظر اختیاری نہیں

یہ شبہ کہ نظر پہ اعتماد قبیح ہے یہاں بھی تناقض ہے کیونکہ لازم آئے گا کہ ان کا یہ شبہ وارد کرنا قبیح ہو۔ یہ شبہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں دیا، باطل کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام نظر و استدلال کا طریق ہی لے کر آئے ہیں۔

ارشادِ گرامی

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا (پ۲۵، الزخرف:۵۸) انہوں نے یہ نہ کہی مگر ناحق جھگڑنے کو

اس سے مراد باطل کیلئے بحث ہے اور یہ مراد لینا ضروری ہے تاکہ اس فرمان اور ارشاد الٰہی

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (پ۱۴ ،النحل:۱۲۵) اوران سے بہتر طریقہ سے بحث کرو

میں موافقت ہوجائے۔

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (پ۸ ،الانعام:۶۸) اور جب تو انہیں دیکھے جو ہماری آیات میں پڑتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے

اس کا جواب یہ ہے کہ خوض، نظر نہیں بلکہ شی میں خوض سے مراد ہٹ دھرمی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی مخلوق میں غور کرو مگر خالق میں نہ کرو، تو مخلوق میں غور اس لیے تھا کہ خالق کی معرفت نصیب ہو اور یہی مطلوب ہے۔

ارشادِ عالی، بوڑھی خواتین کا دین اختیار کرو۔ اس سے مراد بھی یہی ہے کہ تمام اُمور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو اور تمام اُمور میں اس پر اعتماد کرو۔

آپ کے فرمان ''تقدیر پر خاموشی اختیار کرو'' سے استدلال ضعیف ہے کیونکہ جزئی کی نفی، کلی کی نفی کیلئے مفید نہیں۔

اجماع، اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ صحابہ نے متکلمین کے الفاظ نہیں بولے تو تسلیم لیکن اس سے علم کلام پر طعن نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ انہوں نے الفاظ فقہاء استعمال نہیں کیے۔ تو اس سے فقہ کا رد نہیں ہوتا، اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو دلیل سے نہیں جانا تو تمہارا یہ قول نہایت ہی غلط ہے۔

رہا اسلاف کا علم کلام کے خلاف تشدد تو اس میں اہل بدعت پر انکار و تردید ہے۔

مسئلہ وصیت سے یوں معارضہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی نے ہر اس کیلئے وصیت کی جو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال، انبیاء و رسل کا عارف ہے تو اس میں فقیہہ شامل نہ ہوگا کیونکہ وصایا کا مدار عرف پر ہوتا ہے اسی پر مسئلہ کا اتمام ہو رہا ہے۔ واللہ أعلم

دوسرا مسئلہ: عبادت کی حقیقت کیا ہے اس کی تفصیل ''ایاك نعبد'' کے تحت آچکی ہے۔

خلق کا مفہوم

خلق کا معنی، شیخ ازہری صاحب تہذیب نے ابن الانباری سے نقل کیا، تقدیر و تسویہ، اس پہ انہوں نے آیت، شعر اور لغت سے استشہاد کیا۔

آیت مبارکہ ہے

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۱۴) تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے

خالقین بمعنی مقدرین، دوسرے مقام پہ ہے۔

وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (پ۲۰، العنکبوت:۱۷) اور تم نرا جھوٹ گھڑتے ہو

یعنی تم نے کذب کو تخلیق کیا۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ (پ۷، المائدۃ:۱۱۰) اور جب تو مٹی سے بناتا

زہیر نے کہا

ولأنت تفری ما خلقت وبعض القوم يخلق ثم لا يفری

کسی دوسرے نے کہا

ولا يئط بأيدی الخالقين ولا أيدی الخوالق الا جيد الأدم

لغۃً یوں تائید ہے جب جوتا برابر کیا جاتا ہے تو کہتے میں خلق النعل، جن باتوں کی تصدیق نہیں کی جاتی انہیں عرب احادیث الخلق، کہتے ہیں، اس سے ارشادِ الٰہی ہے:

اِنْ هٰذَا اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ (پ۱۹، الشعراء:۱۳۷) یہ نہیں مگر وہی اگلوں کی ریت

مقدرِ خیر کو خلّاق، خلیق بمعنی لائق گویا خیر اس سے صادر ہوا، نازک اور صاف پتھر کو "خلقاء" کیونکہ ملامت ونرمی استواء اور خشونت اختلاف ہے۔ کپڑا جب پُرانا ہو جائے تو نرم اور کریذیں سیدھی ہو جاتی ہے تو اسے 'اخلق الثوب' کہتے ہیں تو ثابت ہوا کہ خلق، تقدیر اور استوا کا نام ہے۔

قاضی عبدالجبار نے کہا خلق فعل بمعنی تقدیر ہونا، لغت اس کا تقاضا نہیں کرتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے بلکہ کتاب اللہ میں اس کے خلاف تصریح ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۱۴) تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (پ۷، المائدۃ:۱۱۰) اور جب تو مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا

لیکن اللہ تعالیٰ جب کوئی فعل کرے گا تو وہ اس کے انجام اور کیفیت مصلحت سے آگاہ ہوگا تو اس کا فعل یقیناً ایسا ہی ہوگا لہٰذا اس اسم کا اس کے ساتھ اختصاص ہے۔

ان کے استاذ ابو عبداللہ بصری نے کہا، اسم خالق کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر محال ہے کیونکہ تقدیر وتسویہ فکر، نظر اور حساب کا نام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔

جمہور اہلِ سُنّت وجماعت کا مؤقف ہے کہ خلق سے مراد ایجاد وانشاء ہے اس پر ان کا استدلال اہل اسلام کے اس قول سے ہے

لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰہُ — اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنیوالا نہیں

اگر خلق بمعنی تقدیر ہو تو یہ قول ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔

تیسرا مسئلہ: وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور یہ اس کے وجود کی معرفت پر موقوف ہے، مگر اس کے وجود کا علم بدیہی نہیں بلکہ نظری ہے۔ لہٰذا اس کے وجود پر دلائل کا ذکر ضروری ہے۔

ہم نے کتب عقلیہ میں واضح کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا طریق اثبات یا امکاں ہے یا حدوث یا ان دونوں کا مجموعہ پھر یہ تمام جواہر ہوں گے یا اعراض، تو وجود باری تعالیٰ پر دال مجموعہ طُرق چھ ہی ہیں۔

۱۔ ذوات کے ممکن ہونے سے استدلال

اس کی طرف یوں اشارہ ہے۔

وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (پ۲۶، محمد:۳۸) اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو

سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے یوں حکایت فرمائی:

فَاِنَّھُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (پ۱۹، الشعراء:۷۷) بیشک وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے پروردگارِ عالم کے

یہ بھی فرمایا:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (پ۲۷، النجم:۴۲) اور یہ کہ بیشک تمہارے رب ہی کی طرف انتہا ہے۔

یہ بھی ارشادِ الٰہی ہے:

فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (پ۲۷، الذاریات:۵۰) تو اللہ کی طرف بھاگو

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ　(پ۱۳، الرعد:۲۸)　سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے

۲۔صفات کے ممکن ہونے سے استدلال

اس کی طرف یوں اشارہ ہے

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ　(پ۱۴، النحل:۳)　اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً　(پ۱، البقرہ:۲۲)　وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا

اس کی مزید تفصیل آ رہی ہے۔

۳۔اجسام کے حادث ہونے سے استدلال

اس کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول میں اشارہ ہے۔

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ　(پ۷، الانعام:۷۶)　میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا

۴۔حدوث اعراض سے استدلال

یہ طریق افہام خلق کے زیادہ قریب ہے اور یہ دو اُمور ہیں۔۱۔دلائل انفسی۔ ۲۔دلائل آفاقی

کُتب الٰہیہ اکثر طور پر انہی دو ابواب پر مشتمل ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے انہی دو اُمور کو جمع فرمایا ہے۔

۱۔دلائلِ انفسی

ہر آدمی بداہۃً جانتا ہے کہ وہ پہلے موجود نہ تھا اب موجود ہوا ہے اور جو بھی عدم کے بعد موجود ہو تو اس کیلئے موجد کا ہونا ضروری ہے اور وہ موجد خود آدمی نہیں ہوسکتا، نہ والدین اور نہ باقی لوگ۔ کیونکہ مخلوق کا ایسی تخلیق و ترتیب سے عاجز ہونا بداہۃً معلوم ہے لہٰذا ایسے موجد کا ہونا ضروری ہے جو اِن موجودات کے مخالف ہو حتیٰ کہ اس سے ان اشخاص کی ایجاد درست ہو۔

سوال: البتہ یہ سوال کوئی اٹھا سکتا ہے کہ ممکن ہے طبائع موسم، افلاک اور نجوم مؤثر ہوں؟

جواب: یہ سوال چونکہ ممکن تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے بعد ان کے موجود و حادث ہونے کا ذکر کیا، فرمایا

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً　(پ۱، البقرہ:۲۲)　اس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا

۲-دلائلِ آفاق

دلائلِ افاق سے یہی مراد ہے کہ اس میں احوال عالم کے تغیرات مثلاً رعد، ریاح، سحاب اور اختلاف موسم اس میں شامل ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اجسامِ فلکیہ اور اجسامِ عنصریہ، جسم ہونے میں مشترک ہیں تو بعض کا بعض صفات کے ساتھ اختصاص مثلاً تصاویر، اشکال ومحلات، یہ جسمیت یا دیگر ان کے لوازم کی وجہ سے نہیں ورگرنہ ان صفات میں تمام کا اشتراک لازم۔لہٰذا یہ کسی امر منفصل کی وجہ سے ہے۔اب اگر وہ امر جسم ہے پھر یہ بحث لوٹ آئے گی۔ان اجسام کے درمیان یہ مؤثر ہونے کیلئے کیوں مختص ہے؟اور اگر وہ امر جسم نہیں تو وہ موجب و مجبور ہوگا یا مختار، اول باطل ورنہ بعض اجسام کا بعض صفات اختصاص اس کے برعکس سے اولی نہ ہوگا۔لہٰذا اس کا قادر ہونا ضروری ہے تو اس دلیل سے ثابت ہوگیا کہ تمام اجسام ایک ایسے مؤثر و قادر کی طرف محتاج ہیں جو نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ وجود صانع پہ حدوث اعراض سے استدلال، ثبوت امکان اعراض وصفات، کے بعد ہی کافی ہوسکتا ہے۔جب یہ معلوم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے انواعِ ادلہ میں سے یہ دلیل اپنی کتاب کے ابتدا میں دو وجوہ کی بنا پہ بیان کی۔

پہلی وجہ: یہ طریق چونکہ اذہان وافہام مخلوق کے زیادہ قریب اور عقول سے زیادہ متصل ہے، قرآن میں جو دلائل مذکور ہیں لازم ہے کہ وہ دقت (مشکل) سے بہت دور اور افہام کے زیادہ قریب ہوں تا کہ ان سے ہر خاص و عام نفع حاصل کر سکے لہٰذا ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے ابتداء کتاب میں ذکر فرماتے۔

دوسری وجہ: دلائلِ قرآنیہ سے غرض ومقصد مجادلہ و جھگڑا نہیں بلکہ ان سے غرض، قلوب میں عقائد صحیحہ کا حصول ہے اور یہ نوع دلائل اس باب میں باقی طُرق سے اقویٰ ہے کیونکہ اس نوع دلائل سے جیسے یہ معلوم و فائدہ ہے کہ خالق کا وجود ہے اسی طرح یہ ہم پر خالق کی نعمتوں پر بھی دال ہے اس لیے کہ ہمارا وجود و حیات عظیم انعام ہے، اور نعمتوں کا تذکرہ محبت کے لزوم، ترکِ تنازع اور حصولِ اطاعت کا سبب ہے اسی سبب باقی انواع سے اس نوع دلائل کا ذکر اولیٰ ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے بارے میں اسلاف کے اعلیٰ دلائل وطُرق

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں اسلاف کے بہت ہی خوبصورت اور اعلیٰ طُرق و دلائل ہیں۔

۱۔امام جعفر رضی اللہ عنہ کی دلیل

منقول ہے کسی زندیق نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پاس وجودِ صانع کا انکار کیا، تو فرمایا، تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے؟ کہنے لگا ہاں۔ فرمایا کیا تو کبھی اس کے طوفان میں گرا؟ کہنے لگا ہاں۔ ایک دن ایسی مہلک ہوا چلی کہ اس نے کشتیاں توڑ دیں اور ملاحوں کو غرق کر دیا، میں کشتی کے تختہ کے ساتھ لٹک گیا پھر وہ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو میں تلاطمِ امواج میں چلا گیا انہوں نے مجھے ساحل سمندر پر پھینک دیا۔ فرمایا پہلے تیرا اعتماد کشتی و ملاح پر تھا، اس کے بعد تختہ پہ کہ وہ تجھے نجات دے گا، جب یہ تمام اشیاء غرق ہو گئیں تو کیا اس کے بعد تو نے اپنے کو ہلاکت کے سپرد کر دیا یا سلامتی کا امیدوار رہا؟ کہنے لگا: میں سلامتی کا امیدوار تھا۔ فرمایا:

مِمَّنْ کُنْتَ تَرْجُوْھَا؟ — تو نے کس سے اُمید وابستہ کی؟

تو جواب میں خاموش ہو گیا، آپ نے فرمایا:

اِنَّ الصَّانِعَ ھُوَ الَّذِیْ کُنْتَ تَرْجُوْہُ فِیْ ذٰلِکَ الْوَقْتِ وَھُوَ الَّذِیْ اَنْجَاکَ مِنَ الْغَرَقِ — صانع وہی ذات ہے جس سے اس وقت تو نے اُمید باندھی تھی اور اسی نے غرق ہونے سے تجھے بچالیا۔

تو اس پر

لَاَسْلَمَ الرَّجُلُ عَلٰی یَدِہٖ — آپ کے ہاتھ پر وہ شخص مسلمان ہو گیا۔

۲۔ کتاب دیانات العرب میں ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمران بن حصین سے پوچھا: تمہارے کتنے خدا ہیں؟ کہنے لگے، دس۔ پوچھا جب تم پر غم، مصیبت اور کوئی بڑی مشکل آ پڑے تو ان میں سے مدد کون کرتا ہے؟ عرض کیا، اللہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَالَکَ مِنَ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہ — تمہارا کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

۳۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دہریہ (منکرین خدا) پر تلوار تھے اس لیے دہریہ ان کے قتل کے ہمیشہ درپے رہتے، ایک دن آپ مسجد میں بیٹھے تھے تو مسلح جماعت ان پر حملہ آور ہونے لگی تاکہ انہیں شہید کر دیا جائے، آپ نے فرمایا: مجھے ایک مسئلہ کا جواب دو اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ کہنے لگے: پوچھو۔ فرمایا: تم اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہو جو کہے میں نے کشتی دیکھی جس

پر لوگ سوار تھے ۔ بوجھ سے مالا مال اور وہ سمندر کی موجوں میں ہے اور ہوائیں بھی مخالف چل رہی تھیں ۔ لیکن وہ صحیح راستہ پر چل رہی ہے حالانکہ اسے چلانے والا نہ ملاح ہے اور نہ ہی کوئی محافظ ہے ۔ کیا عقل اسے ممکن مانتا ہے؟ کہنے لگے اسے عقل ہرگز قبول نہیں کرتا ۔ فرمایا: یا سبحان اللہ ۔

إِذَا لَمْ يَجُزْ فِي الْعَقْلِ سَفِينَةٌ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ مُسْتَوِيَةٌ مِنْ غَيْرِ مُتَعَاهِدٍ وَلَا مُجْرِي فَكَيْفَ يَجُوْزُ قِيَامُ هٰذِهِ الدُّنْيَا عَلَى اخْتِلَافِ أَحْوَالِهَا وَتَغَيُّرِ أَعْمَالِهَا وَسِعَةِ أَطْرَافِهَا وَتَبَايُنِ أَكْنَافِهَا مِنْ غَيْرِ صَانِعٍ وَ حَافِظٍ؟

جب عقل ایسی کشتی نہیں مانتا کہ وہ سمندر میں بغیر محافظ وملاح کے چلتی ہو تو وہ اس ساری دنیا کا قیام باوجودیکہ اس کے احوال میں اختلاف، اس کے اعمال میں تغیر، اس کی اطراف میں وسعت اور اس کے کناروں میں تخالف ہے عقل بغیر کسی صانع اور محافظ کے کیسے مان لے گی؟

اس پر تمام رونے لگ گئے اور کہا تم سچ کہتے ہو، اپنی تلواریں نیام میں کر کے توبہ کر لی ۔

۴ ۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی دلیل

امام شافعی رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا جو صانع پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا: شہتوت کا پتہ ۔

طَعْمُهَا وَلَوْنُهَا وَرِيْحُهَا وَطَبْعُهَا وَاحِدٌ عِنْدَكُمْ؟

کیا مانتے ہو اس کا ذائقہ، رنگ، خوشبو اور طبع ایک ہی ہے؟

کہنے لگا: ہاں ۔ فرمایا:

تأكلها دودة القز فيخرج منها الابريسم والنحل فيخرج منها العسل والشاة فيخرج منها البعر، ويأكلها الظباء فينعقد في نوافجها المسك فمن الذي جعل هذه الأشياء كذلك مع أن الطبع واحد؟

اسے ریشمی کیڑا کھائے تو ریشم بنائے، شہد کی مکھی کھائے تو شہد، بکری کھائے تو مینگنی، ہرن کھائے تو اس کی ناف میں کستوری پیدا ہو، یہ اشیاء بنانے والا کون ہے؟ حالانکہ طبع واحد ہے

انہوں نے اس دلیل کی خوب تعریف کی اور ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے، ان کی تعداد سترہ تھی ۔

۵ ۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک بار یہی سوال ہوا تو فرمایا: والد بیٹا چاہتا ہے مگر بیٹی ہو جاتی ہے یا بیٹی چاہتا ہے تو اس کے برعکس بھی ہوتا ہے جو صانع پر ہی دلیل ہے ۔

۶۔امام احمد رضی اللہ عنہ کی دلیل

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے ایسے محفوظ قلعہ سے استدلال کیا جو ہر طرف سے بند اور اس میں کوئی سراخ نہ ہو اس کا ظاہر پگھلی چاندی اور اس کا باطن خالص سونے کی طرح ہو لیکن اس کی دیوار پھٹے تو وہاں سے حیوان، سننے، دیکھنے والا سامنے آجائے تو فاعل کا ہونا ضروری ہے، یہاں قلعہ سے انڈہ اور حیوان سے بچہ مراد ہے۔

۷۔امام مالک رضی اللہ عنہ کی دلیل

ہارون الرشید نے امام مالک رضی اللہ عنہ سے وجود باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اختلافِ اصوات، مترنم نغمات، تفاوت لغات ولسان سے استدلال کیا۔

۸۔ ابونواس سے کسی نے یہی پوچھا تو اس نے کہا:

تأمل في نسبات الأرض وانظر | إلى آثار ما صنع المليك

عيون من لجين شاخصات | وأزهار كماء الذهب السبيك

على قضب الزبر جد شاهدات | بأن الله ليس له شريك

۹۔ ایک اعرابی سے صانع کے وجود پر دلیل پوچھی گئی تو کہنے لگا:

البعرة تدل على البعير وروث على الحمير، وآثار الأقدام على المسير، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج وبحار ذات أمواج

مینگنی، اونٹ پر، لید، گدھے پر، قدموں کے نشان چلنے والے پر دال ہوتے ہیں، تو برجوں والا آسمان، گہرے راستوں والی زمین اور موجوں والے سمندر

کیا یہ تمام حلیم، علیم وقدیر صانع پر دلیل نہیں؟

۱۰۔ ایک طبیب سے کسی نے پوچھا تم نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ کہنے لگے:

باهليلج مجفف أطلق، ولعاب ملين أمسك

سخت نزلہ بہتا ہے اور نرم تھوک روکا رہتا ہے

۱۱۔ کسی دوسرے نے کہا:

عرفته بنحلة بأحد طرفيها تعسل، والأخر تلسع! والعسل مقلوب اللسع

میں نے اسے شہد کی مکھی سے پہچانا کہ اس کی ایک طرف میں شہد جبکہ دوسری میں زہر جو شہد کے برعکس ہے

۱۲۔ وجود باری تعالیٰ کا علم بدیہی ہے۔یعنی دلیل کا محتاج ہی نہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (پ۲۵، الزخرف:۸۹۷) اگر ان کفار سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (پ۲۴، غافر:۸۴) پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو بولے ہم ایک اللہ پر ایمان لائے اور جو اس کے شریک کرتے ہیں اس کے منکر ہوئے

چوتھا مسئلہ: قاضی عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ" (اس نے تمہیں پیدا کیا) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مستحق عبادت خالقیت کی وجہ سے ہی ہے جب اس نے بندوں پر عبادت لازم کی تو اس کی وجہ واضح کی کہ کس وجہ سے عبادت لازم ہے؟

سوال: وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا) اس میں کیا فائدہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا انہیں تخلیق کرنا ان پر عبادت کے لزوم کا تقاضا تو نہیں کرتا؟

جواب: دو وجہ سے ہے۔

۱۔ اگرچہ بات یوں ہی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا ہے کہ جیسے تمہیں اس نے پیدا کیا اسی طرح تم سے پہلے لوگوں کو بھی اسی نے پیدا کیا کیونکہ طریق علم واحد ہے۔

۲۔ پہلے لوگ اِن کے اصول کی طرح ہیں تو اصول کی تخلیق، فروع اور شاخوں پر بھی انعام کی طرح ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ان پر عظیم انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ میں تم پر حالتِ وجود میں ہی انعام کر رہا ہوں بلکہ تمہارے وجود سے ہزارہا سال پہلے سے تم پر انعام کر رہا ہوں کیونکہ میں تمہارے اصول و آباء کا بھی خالق ہوں۔

پانچواں مسئلہ: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کی تفسیر

یہاں دو مباحث ہیں

۱۔ بحث اول لعلّ، اُمید و خوف کیلئے آتا ہے۔ مثلاً، لعل زید یکرمنی (شاید زید میرا احترام کرے) ارشادِ الٰہی ہے:

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۴۴) شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرے

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (پ۲۵، الشوریٰ:۱۷) شاید قیامت قریب ہی ہو

پھر فرمایا

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا جو اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کی جلدی مچا رہے ہیں اور مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا جنہیں اس پر ایمان ہے وہ ڈر رہے ہیں (پ۲۵، الشوریٰ:۱۸)

اُمید وخوف، انجام سے جہالت کی وجہ سے ہوتے ہیں اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہے۔

معنی لعلّ میں تاویل

لہٰذا "لَعَلَّ" کے معنی میں یہ تاویلات ہوسکتی ہیں:

پہلی تاویل: "لعل" کا معنی (امید) بندوں کی نسبت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت۔ تو ارشادِ الٰہی "لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے موسیٰ وہارون علیہما السلام فرعون کے ایمان کی اُمید رکھو باقی انجام سے اللہ تعالیٰ ہی آگاہ ہے۔

دوسری تاویل: ملوک اور بڑوں کی عادت یہ ہے کہ وہ لوگوں سے وعدہ میں "لَعَلَّ" عسیٰ وغیرہ پر ہی اکتفا کر کے انہیں نبھاتے ہیں یا کامیابی کا اشارہ یا مسکرا دینا یا بنظر شفقت دیکھنا بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔

تو جب لوگ ان میں سے کسی پر مطلع ہوجاتے ہیں تو طالب کو مطلوب پانے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا تو کلام اللہ میں لفظِ "لَعَلَّ" بھی اسی طریق پر آیا ہے۔

تیسری تاویل: "لَعَلَّ" بمعنی "کَیْ" (تاکہ) ہے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں لعل، بمعنی 'کی' نہیں ہوتا مگر لعل، کسی کو طمع دلانے کیلئے آتا ہے کریم ورحیم ذات جب کسی کو امید وطمع دلائے تو یہ اس کا امید دلانا قائم مقام حتمی وعدہ کے ہوتا ہے اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ کلام اللہ میں "لَعَلَّ" بمعنی "کَیْ" ہے۔

چوتھی تاویل: اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے ساتھ وہی کیا کہ اگر کوئی غیر کرتا تو حصول مقصود کی امید لازمی ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جب خیر وشر پر قدرت دی، انہیں رہنمائی کیلئے عقول دے کر ان کے عذر ختم کر دیے تو جو بھی دوسرے کے ساتھ ایسا کرے گا وہ اس سے حصول مقصود کا امیدوار ہوگا تو لفظ "لَعَلَّ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی کیا ہے اگر کوئی دوسرا کرتا تو یہ امید کے حصول میں لازم ہوتا۔

پانچویں تاویل: شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "لَعَلَّ" تکرار شی سے ماخوذ ہے مثلاً قول عرب "عللاً بعد نهل" تو اس میں لام تاکید، لام لقد کی طرح ہے، تو لعل کا اصل عل ہے۔ مثلاً علك أن تفعل كذا یہ لعلك کے معنی میں ہے تو جب اس کی حقیقت تکرار وتاکید ہے تو یہ قول "افعل كذا لعلك تظفر بحاجتك" معناً کا معنی یہ ہے تم یہ کرو کیونکہ تمہارا فعل بجالانا تمہاری طلب میں تاکید وقوت پیدا کرے گا

دوسری بحث: عبادت وتقویٰ کا تعلق

سوال: جب عبادت تقویٰ ہے تو اب "اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" کا معنی یہ بنا۔"اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ لَعَلَّكُمْ تَعْبُدُوْنَ" (اپنے رب کی عبادت کروتا کہ تم عبادت گزار بنو) یا مفہوم یہ ہو جائے گا اپنے رب کا تقویٰ اختیار کروتا کہ تقویٰ والے بن جاؤ، تو یہ تکرار ہے۔

جواب: دوطرح سے ہے:

۱۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ عبادت، نفس تقویٰ ہی ہے بلکہ عبادت ایسا فعل ہے جس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اِتقاء، نقصان دہ اشیاء سے احتراز و بچنا ہے اور عبادت، حکم شدہ فعل کا بجالانا ہے تو نفس فعل، بعینہ نقصان دہ سے احتراز نہیں بلکہ احتراز کا موجب وسبب ہے تو گویا فرمایا: تم اپنے رب کی عبادت کروتا کہ تم اس سے اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ جب نفس فعل کو اتقاء کہا جاتا ہے تو یہ مجاز ہے کیونکہ اتقاء، ذریعہ حصول اتقاء کا غیر ہوگا لیکن چونکہ ان دونوں میں اتصال ہے اس وجہ سے ایک کا اطلاق دوسرے پہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو پیدا فرمایا تا کہ تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اطاعت کریں جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (پ۲۷، الذاریات:۵۶) اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کیلئے ہی پیدا کیا ہے

تو گویا اللہ تعالیٰ نے عبادتِ رب کا حکم دیا جس نے انہیں اس غرض (عبادت) کیلئے پیدا کیا ہے، یہ تاویل اصولِ معتزلہ کے زیادہ مناسب ہے۔

چھٹا مسئلہ: شیخ ابوعمرو "خلقکم" کو ادغام۔ شیخ ابوسمیفع "خلق من قبلکم" اور امام زید بن علی نے "والذین من قبلکم" پڑھا ہے، صاحب کشاف کہتے ہیں۔ یہاں موصول ثانی "والذین" کو اول وصلہ کے درمیان بطور تاکید داخل کیا گیا ہے۔ جیسے جریر نے اس شعر میں کہا:

یا تیم تیم عدی لا أبا لکموا

یہاں دوسرا تیم اول اور اس کی طرف منسوب کے درمیان ہے

[۲۲] اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

(وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور چھت کو آسمان بنایا اور آسمان سے پانی اُتارا اس کے ذریعے تمہارے کھانے کو کچھ پھل پیدا کیے تو تم جان بوجھ کر اس کے شریک نہ ٹھہراؤ)

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اَلَّذِیْ، یہ اپنے صلہ سے مل کر محلِ نصب میں ہے بطور وصف "اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ" یا بطور مدح و تعظیم یا یہ بطور مبتدا مرفوع ہے اور اس میں نصب بطور مدح ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: کلمہ "اَلَّذِیْ" کی وضع اس مفرد کیلئے ہے جس کا صلہ، جملہ معلومہ ہوتا ہے۔ مثلاً "ذهب الرجل الذی ابوه منطلق" تو "ابوه منطلق" جملہ معلومہ ہے۔ جب ہم اس جملہ معلوم سے اس آدمی کا تعارف چاہتے ہیں تو اس پر "اَلَّذِیْ" داخل کرتے ہیں۔ اہلِ لغت کے قول "اَلَّذِیْ" اس وصف کیلئے آتا ہے جس کا تعارف جملہ ہو، کا یہی معنی ہے، جب یہ ثابت ہے تو "اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً" کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اللہ نے زمین، فراش اور آسمان چھت بنایا گیا ہے۔ اس ارشادِ الٰہی کا یہی مفہوم ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ۲۱، لقمان:۲۵، الزمر:۳۸)	اگر تو ان سے پوچھے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا کون ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ

تیسرا مسئلہ: پانچ انواع دلائل کا تذکرہ

یہاں اللہ تعالیٰ نے پانچ انواع دلائل کا تذکرہ کیا ہے۔ دو نفسی اور تین آفاقی۔

پہلے کا ذکر خَلَقَکُمْ (تمہیں پیدا کیا) دوسرے کا تمہارے آباء و امہات کو پیدا کیا۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ۔ تیسرے زمین فراش، چوتھے آسمان چھت پانچویں آسمانوں و زمین کے مجموعہ سے حاصل اُمور، جس کا ذکر یوں ہے: "وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ"

ترتیب کے اسباب

اس ترتیب کے یہ اسباب ہیں۔

انسان کے سب سے قریب، اس کی ذات ہے انسان کا دوسرے کے احوال سے اپنے احوال سے آگاہ ہونا زیادہ اظہر ہے، جب استدلال سے غرض افادہ علم ہے تو جو دلالت میں اظہر ہوگا وہ افادہ میں زیادہ قوی ہوگا اور اس کا ذکر بھی پہلے ہوگا تو اس وجہ سے انسان کا اپنا ذکر پہلے لایا پھر دوسرا مرتبہ اس کے آباؤ واحباب اور تیسرے مرتبہ پر زمین کا ذکر آیا کیونکہ زمین، آسمان سے انسان کے زیادہ قریب ہے اور انسان، آسمان سے احوالِ زمین سے زیادہ آگاہ ہے۔ آسمان سے بارش اور اس کی وجہ سے ثمرات سے پہلے آسمان کا ذکر آیا کیونکہ یہ آسمان وزمین کی اولاد کی طرح ہیں اور اثر، موثر کے بعد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر آسمان وزمین کے بعد کیا۔

۲۔ مکلفین کو زندہ اور قادر پیدا کرنا تمام نعمتوں کی اصل ہے باقی زمین، آسمان اور پانی سے نفع، حصولِ خلق، حیات، قدرت و خواہش کے بعد ہی ہوگا لہٰذا اصل کا ذکر فرع سے پہلے ہونا ضروری تھا۔

۳۔ زمین وآسمان میں وجود صانع پر جو دلائل ہیں وہ انسان میں حاصل ہیں بلکہ انسان میں ایسے دلائل ہیں جو ان دونوں میں نہیں ہیں کیونکہ انسان میں حیات، قدرت، آرزو اور عقل ہے اور ان تمام پر قدرت، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں رکھتا تو جب وجوہ دلائل انسان میں اتم ہیں تو اس کا مقدم کرنا اولیٰ ہے، جیسے ہم نے ترتیب کا سبب ذکر کیا۔

اب ہمیں ان تینوں کے منافع کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔

چوتھا مسئلہ: یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس نے زمین کو فراش بنایا، اس کی نظیر یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا — یا وہ جس نے زمین بسنے کیلئے بنائی اور اس کے بیچ میں نہریں نکالیں (پ۲۰، النمل:۶۱)

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا (پ۲۵، الزخرف:۱۰) — وہ جس نے تمہارے لیے زمین کا بچھونا بنایا

زمین کے فراش ہونے کی شرائط

زمین کا فراش ہونا ان اُمور سے مشروط ہے۔

پہلی شرط: یہ ساکن ہو اس لیے کہ اگر یہ متحرک ہے تو اس کی حرکت مستقیم ہوگی یا دائری، اگر مستقیم ہے تو زمین کا ملاً ومطلقاً

ہمارے لیے فراش نہ ہوگی کیونکہ جو بلند جگہ ہوگا لازم ہے کہ وہ زمین تک نہ پہنچ پائے کیونکہ زمین خود نیچے جانے والی ہے اور انسان بھی نیچے آ رہا ہوگا، زمین انسان سے اثقل ہے جب دو ثقیل نیچے آئیں تو اثقل ان میں تیز ہوتا ہے۔اور آہستہ چلنے والا تیز کے برابر نہیں ہوسکتا۔تو لازمی ہے انسان زمین تک نہ پہنچ پائے تو ثابت ہوا اگر زمین ہاویہ (نیچے جانے والی) ہے تو یہ فراش نہ ہوگی۔

اگر اس کی حرکت دائری ہے تو پھر بھی ہم اس سے نفع نہ پاسکیں گے کیونکہ حرکت زمین مثلاً مشرق کی طرف ہے اور انسان مغرب کا ارادہ رکھتا ہے۔بلاشبہ حرکت زمین زیادہ تیز ہے تو لازم ہے انسان اپنی جگہ پر ہی باقی رہے اور اپنی منزل پر نہ پہنچ پائے حالانکہ بندہ پہنچتا ہے تو معلوم ہوا زمین متحرک نہیں نہ دائری اور نہ مستقیم تو یہ ساکن ہے۔

سکون کے اسباب

اس کے سکون کے اسبابِ وجوہ میں اختلاف ہے:

۱۔ جانب سفل میں زمین کی انتہا نہیں، جب صورت حال یہ ہے تو نیچے اترنے کی جگہ بھی نہیں لہٰذا یہ نازل نہ ہوگی لیکن یہ وجہ فاسد ہے کیونکہ تمام اجسام کا متناہی ہونا ثابت ہے۔

۲۔ اجسامِ متناہی ماننے والے کہتے ہیں زمین کرہ نہیں بلکہ نصف کرہ کی طرح ہے۔اس کا حدب (خم) فوق جبکہ سطح اسفل ہے اور یہ سطح پانی اور ہوا پر ہے۔شان ثقیل یہ ہوتی ہے کہ جب وہ پھیلتی ہے تو وہ پانی و ہوا پر قطعی کی طرح ہوتی ہے۔جب وہ پھیلتی ہے تو وہ گردش کرتی ہے۔اور جب جمع کی جاتی ہے تو گڑ جاتی ہے لیکن یہ دو وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔:وقوف ماء اور ہوا کے سبب میں اسی طرح کی بحث ہے جو وقوفِ ارض کے سبب میں ہے۔

۲۔زمین کی ایک جانب میں پھیلاؤ کیوں ہے حتیٰ کہ وہ پانی پر کھڑی اور متحدب (خم) ہوگئی ہے؟

۳۔ جو کہتے ہیں کہ سکون ارض کا سبب، تمام جوانب سے فلک کی کشش ہے تو بعض سے کشش بعض سے اولیٰ نہیں ہے۔لہٰذا یہ وسط میں ہے لیکن یہ دو وجہ سے باطل ہے۔

پہلی وجہ:اصغر،انجذاب وکشش میں اکبر سے تیز ہوتا ہے تو اس ذرہ کا کیا حال ہے جو فلک کی طرف نہیں جاتا؟

دوسری وجہ:انجذاب میں اقرب اولیٰ ہوتا ہے تو اوپر کی طرف پھینکا گیا ذرہ انجذاب میں اولیٰ ہوگا تو لازم ہے کہ وہ واپس ہی نہ لوٹے؟

۴۔ جو کہتے ہیں سبب سکون، تمام جوانب سے فلک کا دفاع ہے جیسے کچھ مٹی چکی کے سراخ میں ڈالی جائے اور پھر اسے بصورت دائرہ تیز گھمایا جائے تو تمام جوانب سے دفاع کی وجہ سے وہ مٹی وسطِ چکی میں رہتی ہے اس طرح زمین کا معاملہ ہے۔

لیکن یہ وجہ پانچ وجہ سے باطل ہے۔

۱۔ جب دفاع قوت میں اس قدر ہے تو ہم میں سے کوئی بھی اسے محسوس کیوں نہیں کرتا؟

۲۔ یہ دفاع کیسا ہے کہ وہ بادل اور ہواؤں کی حرکت کو مقرر جہت میں کیوں نہیں کر دیتا؟

۳۔ کیا وجہ ہے کہ اس کے مغرب کی طرف انتقال کو مشرق کی طرف انتقال سے زیادہ آسان کیوں نہیں بناتا؟

۴۔ لازم ہے کہ ثقیل جس قدر اعظم ہو اس کی حرکت کم ہو کیونکہ بڑے جسم پر دباؤ چھوٹے جسم کی نسبت کم ہوتا ہے۔

۵۔ لازم ہے کہ نازل ثقیل کی ابتداء حرکت انتہا کی حرکت سے زیادہ ہو کیونکہ ابتدا میں وہ فلک سے زیادہ بعید ہے۔

۵۔۔ زمین طبعاً وسط فلک کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ ارسطو اور اس کے اتباع کا قول ہے لیکن یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ اجسام، جسمیت میں مساوی ہیں، بعض کا ایسی صفت کے ساتھ اختصاص جو اس حالت کا مطالبہ کرتی ہے لازم ہے کہ یہ ممکن و جائز ہو لہٰذا وہ فاعل مختار کی محتاج ہوگی۔

۶۔۔ شیخ ابو ہاشم کہتے ہیں زمین کے نصف اسفل میں بلند ستون ہیں اور نصف اعلیٰ میں اس کے برعکس معاملہ ہے تو دونوں اطراف سے اعتماد کا دفاع وجہ سکون ہی ہے۔

اس پر سوال یہ ہے کہ ہر نصف کا ایسی صفت کے ساتھ مخصوص ہونا فاعل مختار کی وجہ سے ہی ہوگا لہٰذا ثابت ہوا کہ زمین کا سکون، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے۔

اب ہم کہتے ہیں، زمین کا مشاہدہ کرو وہ ٹھہری ہوئی ہے نہ اس کے اُوپر کوئی علاقہ ہے اور نہ اس کے نیچے ستون ہے۔

اُوپر کوئی علاقہ نہیں اس پر ہمارا مشاہدہ شاہد ہے علاوہ ازیں اگر یہ کسی علاقہ سے معلق ہے تو یہ علاقہ کسی اور علاقہ کی طرف محتاج ہوگا اور یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا اس وجہ سے ثابت ہوا کہ نیچے بھی کوئی سہارا نہیں تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی ممسک (تھامنے والا) ہے جس نے اسے اپنی قدرت اور اختیار سے روک رکھا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (پ۲۲، فاطر:۴۱)

بیشک اللہ روکے ہوئے ہے زمین اور آسمانوں کو کہ جنبش نہ کریں اور اگر وہ ہٹ جائیں تو انہیں کون روکے اللہ کے سوا

دوسری شرط: زمین ہمارے لیے فراش تب ہے اگر پتھر کی طرح سخت نہ ہو۔ ورنہ اس پر سونا اور چلنا بدن کیلئے تکلیف دہ ہوگا، اسی طرح اگر زمین سونے کی ہوتی تو اس میں زراعت دشوار ہو جاتی اور نہ اس پر مکانات بنائے جاسکتے کیونکہ اس کا توڑنا اور حسب منشا بنانا دشوار ہو جاتا اور نہ ہی یہ زمین نرمی میں پانی کی طرح ہے کہ بندہ اس میں دھنس ہی جائے۔

تیسری شرط: نہ ہی یہ انتہائی لطیف وشفاف ہے کیونکہ شفاف پر روشنی ٹھہرتی نہیں اور جس کا معاملہ یوں ہو وہ کواکب وشمس سے گرم نہ ہوتی اور یہ نہایت ہی ٹھنڈی رہتی تو اللہ تعالیٰ نے اسے غبر آلود بنایا تا کہ اس پر روشنی ٹھہرے اور یہ گرم ہو، تا کہ اصحاب زندگی کیلئے فراش بن سکے۔

چوتھی شرط: یہ پانی سے اُوپر ہو کیونکہ طبع زمین کا تقاضا یہی ہے کہ پانی میں ڈوبی ہوئی ہو لہٰذا سمندر کا محیط زمین ہونا ضروری ہے اور اگر زمین اس صورت میں ہوتی تو یہ ہمارے لیے فراش نہ بنتی، اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت میں تبدیلی کردی اور اس کی بعض جوانب کو پانی سے باہر نکالا جیسے بڑے بڑے جزائر تا کہ یہ فراش بن سکے۔

کرہ نہ ہو

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فراش بننے کیلئے اس کا کرہ نہ ہونا بھی شرط ہے۔ اس آیت سے انہوں نے اس کے کرہ نہ ہونے پر استدلال کیا لیکن یہ استدلال بہت بعید ہے کیونکہ کرہ جب بہت بڑا ہو تو اس کا ایک جز جائے قرار میں سطح کی طرح ہی ہوتا ہے، اس بات کو پختہ کرنے والی بات یہ ہے کہ پہاڑ زمین کے کیل ہیں لیکن ان پہ قرار ممکن ہے تو پھر زمین پر بطریق اولیٰ قرار ہو سکتا ہے۔ واللہ أعلم

پانچواں مسئلہ: زمین کے منافع وصفات

۱۔ اس سے اشیاء پیدا ہوتی ہیں مثلاً معدنیات، نباتات، حیوانات، آثار علوی، سفلی، جن کی تفصیل اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

۲۔ اس سے تو چیزیں گاڑی ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے ابدان مرکبات میں تماسک پیدا ہو جاتا ہے۔

۳۔ زمین کے ٹکڑوں کا مختلف ہونا بعض نرم، بعض سخت، بعض ریتلی، بعض پتھریلی وغیرہ ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ — اور زمین کے مختلف قطعے ہیں اور پاس پاس ہیں

(پ۱۳ الرعد:۴)

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا — اور جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں تھوڑا ہی نکلتا ہے

(پ۸، الاعراف:۵۸)

۴۔ زمین کے رنگ مختلف ہیں سرخ، سفید، سیاہ، راکھ رنگ، غبر آلود جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ (پ۲۲، فاطر:۲۷)
اور پہاڑوں میں راستے ہیں سفید اور سرخ مختلف رنگ کے اور کچھ کالے سیاہ

۵۔ پودوں کیلئے اس کا پھٹ جانا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (پ۳۰، الطارق:۱۲)
اور زمین کو کھلتی ہے

۶۔ آسمان سے نازل شدہ پانی کا خزانہ ہونا، اسی طرف ارشادِ الٰہی میں اشارہ ہے:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْکَنّٰہُ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۱۸)
اور ہم نے ایک اندازہ پر آسمان سے پانی اتارا اور پھر اسے زمین میں ٹھہرایا اور بیشک ہم اس کے لے جانے پر بھی قادر ہیں

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ (پ۲۹، الملک:۳۰)
اور تم فرماؤ بھلا دیکھو اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں دھنس جائے تو وہ کون ہے جو تمہیں نگاہ کے سامنے پانی لا دے

۷۔ چشمے اور بڑی بڑی نہریں اس میں ہیں، ارشاد فرمایا:

وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْھٰرًا (پ۱۳، الرعد:۳)
اور اس میں لنگر اور نہریں بنائیں

۸۔ اس میں معدنیات اور جنگلات ہیں، اسی طرف اس ارشاد میں اشارہ ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ (پ۱۴، الحجر:۱۹)
اور ہم نے زمین پھیلائی اور اس میں لنگر ڈالے اس میں ہر چیز اِندازے سے اگائی

اس کے بعد تمام کا ذکر و بیان یوں کیا:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (پ۱۴، الحجر:۲۱)
کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسے معلوم اندازے سے ہی اُتارتے ہیں

۹۔ مخفی اشیاء جنہیں دانہ اور گٹھلی سے نکالتی ہے، ارشادِ مبارک ہے:

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی (پ۷، الانعام:۹۵)
اور بتحقیق اللہ گٹھلی اور دانے کو چیرنے والا ہے

یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۱۹، النمل:۲۵)
جو زمین کی چھپی چیزیں نکالتا ہے

پھر زمین کریمانہ طبیعت کی مالک ہے اس میں تم ایک دانہ ڈالتے ہو وہ تمہیں سات سو دانے فراہم کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ — اس دانے کی طرح جس نے سات بالیاں اگائیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں (پ۳، البقرۃ:۲۶۱)

۱۰۔ مردگی کے بعد اس کا زندہ ہونا، ارشاد فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا — اور کیا وہ نہیں دیکھتے ہم خشک زمین کی طرف پانی بھیجتے ہیں پھر اس سے کھیتی نکالتے ہیں (پ۲۱، السجدۃ:۲۷)

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ — اور ان کیلئے ایک نشانی مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے اناج نکالا تو اس میں سے وہ کھاتے ہیں (پ۲۳، یٰسین:۳۳)

۱۱۔ اس پر چوپایوں کا پایا جانا جن کے رنگ، اور تخلیق مختلف ہے، اس طرف یوں اشارہ ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ — اس نے آسمان بنائے بے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں اور زمین میں لنگر ڈالے کہ تمہیں لے کر نہ کانپے اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے (پ۲۱، لقمان:۱۰)

۱۲۔ اس میں نباتات ہیں جن کے رنگ، ذائقے اور خوشبو و مہک مختلف ہیں ان میں سے بعض انسان کی خوراک، بعض چوپاؤں کی خوراک ہیں، جیسا کہ فرمایا:

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ — تم کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ (پ۱۶، طٰہٰ:۵۴)

جو انسان کی خوراک ہیں ان میں بعض طعام، بعض سالن، بعض دوا، بعض پھل، ان میں کچھ میٹھے اور کچھ کھٹے ہیں، ارشادِ الٰہی ہے

وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِىْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ — اور اس میں روزیاں مقرر کیں چار دن میں ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو (پ۲۴، فصلت:۱۰)

ان میں بعض انسان کیلئے لباس کا کام دیتے ہیں کیونکہ کپڑا نباتیہ ہوگا مثلاً روئی اور قطن یا حیوانیہ ہوگا اور وہ صوف، اون چمڑا اور ریشم اور یہ ان حیوانات سے پیدا ہوتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں پھیلایا ہے تو کھانا بھی زمین ہے اور لباس بھی زمین ہے، اور فرمایا:

وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُونَ — اور پیدا فرمائے گا جو تم نہیں جانتے

اس میں ایسے کثیر منافع کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد تمام قبائح و برائیوں کیلئے زمین کو ساتر و پردہ بنا دیا ہے، فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا — اور کیا ہم نے تمہارے زندوں اور مردوں کیلئے زمین کو جمع کرنے والی نہ بنایا

(پ ۲۹، المرسلات:۲۵،۲۶)

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ (پ ۱۶، طٰہٰ:۵۵) — ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے

پھر زمین و آسمان کے منافع کو یوں جمع فرما کر فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ — اور تابع کر دیا تمہارے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

(پ ۲۵، الجاثیۃ:۱۳)

۱۳۔ اس میں مختلف پتھر ہیں، چھوٹے پتھروں میں زینت کی اس قدر صلاحیت ہے کہ انگوٹھیوں کے نگینے بنتے ہیں اور بڑے پتھر مکانات کی زینت کیلئے ہیں۔ ان کثیر پتھروں کو دیکھو جن سے آگ نکلتی ہے اور ان یاقوتی سرخ پتھروں کو بھی دیکھو جو نادر ہیں پھر اس حقیر میں کثیر نفع اور اس قدر اعلیٰ میں قلتِ نفع بھی دیکھو۔

۱۴۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں اعلیٰ معدنیات رکھی ہیں مثلاً سونا، چاندی پھر اس پر غور کرو کہ انسان دقیق صنعتیں اور بڑے کارخانے، سمندر کی تہوں سے مچھلی کا حصول، پرندوں کو ہوا سے پکڑتے ہیں مگر سونا، چاندی کی ایجاد سے عاجز ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے وجود میں فقط ثمنیت کا فائدہ ہے اور یہ فائدہ نادر ہونے کی صورت میں ہی حاصل ہوگا۔ تو ان کی ایجاد پر قدرت سے یہ حکمت باطل ہو جاتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا دروازہ بند کر دیا تا کہ اس حکمت کا اظہار اور اس نعمت کا بقا ہو اور اس لیے کہ جس میں مخلوق کیلئے مضرت نہ ہو اس میں انہیں قدرت دے دی مثلاً نحاس سے مجسمہ مشابہ، ریت سے آئینہ بنا سکتے ہیں۔

جب کوئی عاقل ان لطائف و عجائب میں غور و فکر کرے گا تو وہ ان تدابیر میں ایک ایسے صانع کو ماننے کی طرف مجبور و محتاج ہوگا جو حکیم، قادر، علیم ہو اور وہ کفار کے قول سے بلند و بالاتر ہو۔

۱۵۔ بہت سارے پہاڑوں اور زمین پر درخت ہوتے ہیں جو مکانات، چھت اور لکڑی جلانے کے کام آتے ہیں اور ان کی روٹی و سالن تیار کرنے میں شدید حاجت ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دلائلِ زمین اور اس کے منافع ایسے الفاظ میں بیان فرمائے ہیں کہ کوئی بلیغ وہاں نہیں پہنچ سکتا اور ہر فصیح اس سے عاجز ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں لنگر اور نہریں بنائیں اور زمین میں ہر قسم کے پھل دو دو طرح کے بنائے

(پ۱۳، الرعد:۳)

انہار میں کچھ تو عظیم ہیں مثلاً نیل وسیحون، جیحون، فرات ان میں بعض چھوٹی ہیں اور بہت ہی زیادہ ہیں تمام کی تمام میٹھا پانی لاتی ہیں جو پینے، زراعت اور دیگر فوائد کے لیے ہوتا ہے۔

چھٹا مسئلہ: آسمان افضل یا زمین؟

بعض نے کہا: ان دلائل کی بنا پر آسمان افضل ہے:

۱۔ آسمان ملائکہ کی عبادت گاہ ہے اور اس میں کوئی جگہ نہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔

۲۔ جب سیدنا آدم علیہ السلام سے معصیت کا صدور ہوا تو انہیں جنت سے اتر جانے کا حکم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے پڑوس میں معصیت کرنے والا نہیں رہ سکتا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا (پ۱۷، الانبیاء:۳۲) اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے

(پ۱۸، الفرقان:۶۱)

حالانکہ زمین کے بارے میں ایسی کسی شی کا ذکر نہیں کیا۔

۴۔ اکثر مقامات پر زمین سے آسمان کا ذکر مقدم کیا گیا ہے۔

زمین افضل ہے

کچھ لوگوں نے ان دلائل کی بنا پر کہا زمین افضل ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ایک حصہ کو برکت والا قرار دیا۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا یقیناً سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کیلئے مقرر ہوا وہ مکہ میں ہے

(پ۴، آل عمران:۹۶)

۲۔ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ — برکت والے مقام میں پیڑ سے

(پ۲۰، القصص:۳۰)

۳۔ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ — مسجد حرام تک جس کے گرد اگرد ہم نے برکت رکھی

(پ۱۵، الاسراء:۱)

۴۔ ارضِ شام کو بابرکت قرار دیا:

مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا — زمین کے مشارق ومغارب جس میں ہم نے برکت رکھی

(پ۹، الاعراف:۱۳۷)

۵۔ تمام زمین کو برکت دی، فرمایا:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ — فرمایئے کیا تم اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا

(پ۲۴، فصلت:۹)

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا — اور اس میں اس کے اوپر سے لنگر ڈالے اور اس میں برکت رکھی

(پ۲۴، فصلت:۱۰)

سوال: خالی میدان اور مہلک جنگلات میں کیا برکت ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ وحشی جانوروں کی آماجگاہ اور چراگاہیں بنتی ہے، جب ضرورت ہو تو لوگوں کے بھی مساکن بنتے ہیں، انہی برکات کی بنا پر فرمایا:

وَفِي الْاَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (پ۲۶، الذاریات:۲۰) — اور یقین والوں کیلئے زمین میں نشانیاں ہیں۔

یہ آیات ونشانیاں اگرچہ غیر مومنین کو بھی حاصل ہیں لیکن ان سے نفع، اہلِ ایمان ہی حاصل کرتے ہیں لہٰذا ان کے شرف کی وجہ سے آیات برائے ''موقنین'' فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

۶۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیاء کرام کو زمین سے ہی پیدا کیا، جیسے فرمایا:

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ (پ۱۶، طٰہٰ:۵۵) — ہم نے زمین سے ہی تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے

لیکن آسمان سے کسی شئی کو پیدا نہیں کیا، اس لیے ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (پ۱۷، الانبیاء:۳۲) اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا

۷۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو یوں بھی عزت بخشی کہ آپ کیلئے تمام روئے زمین کو سجدہ گاہ اور اس کی مٹی کو پاک کرنے والی بنا دیا

السَّمَاءَ بِنَاءً کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں متعدد مقامات پر آسمانوں اور زمین کا ذکر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا زمین و آسمان کا کثرت کے ساتھ ذکر، ان کی عظمتِ شان پر دال ہے اور اس پر بھی دال ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اسرارِ عظیم اور حکمت بالغہ رکھی ہے جس تک مخلوق کے عقول وافہام کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

دوسرا مسئلہ: آسمان کے فضائل

فضائل آسمان میں متعدد صورتیں ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو ان اشیاء کے ساتھ مزین کیا۔

۱۔ مصابیح (ستارے)، ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (پ۲۹، الملک:۵) اور بیشک ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا

۲۔ قمر۔

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا (پ۲۹، نوح:۱۶) اور ان میں چاند کو روشن کیا

۳۔ شمس۔

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (پ۲۹، نوح:۱۶) اور سورج کو چراغ بنایا

۴۔ عرش۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (پ۱۱، التوبۃ:۲۹) عظیم عرش کا رب

۵۔ کرسی۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (پ ۳، البقرۃ:۲۵۵) اور وسیع ہے اس کی کرسی زمین و آسمان پر

۶۔ لوح۔

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (پ ۳۰، البروج:۲۲) لوح محفوظ میں

۷۔ قلم۔

ن وَالْقَلَمِ (پ ۲۹، القلم:۱) قلم

ان سات میں سے تین ظاہر اور چار مخفی ہیں لیکن دلائل سمعیہ، آیات و احادیث سے ثابت ہیں۔

- اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے جو نام ذکر کیے ہیں وہ ان کی عظمت پر دال ہیں۔

۱۔ سماء، ۲۔ سقف محفوظ، ۳۔ سبع طباق، ۴۔ سبع شداد۔ پھر ان کا انجام ذکر کیا:

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (پ ۳۰، المرسلات:۹) اور جب آسمان میں رخنے پڑیں

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (پ ۳۰، التکویر:۱۱) اور جب آسمان جگہ سے کھینچ لیا جائے

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ (پ ۱۷، الانبیاء:۱۰۴) جس دن ہم آسمان کو لپیٹیں گے۔

یوم تکون السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (پ ۲۹، المعارج:۸) جس دن آسمان گلی چاندی جیسا ہوگا۔

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (پ ۲۷، الطور:۹) اور جس دن آسمان خوب ہلے گا۔

فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (پ ۲۷، الرحمٰن:۳۷) گلاب کے پھول جیسا بالکل سرخ ہو جائے گا۔

دو مقامات پر اس کے مبدا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (پ ۲۴، فصلت:۱۱) پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا۔

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (پ ۱۷، الانبیاء:۳۰) اور ان کفار نے یہ خیال نہ کیا کہ آسمان اور زمین بند تھے اور ہم نے انہیں کھولا

یہ چیزیں ان دونوں کے حادث و فنا ہونے پر دال ہیں کہ اللہ سبحانہ نے ان دونوں کی تخلیق کامل حکمت کے ساتھ کی ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (پ۲۳، ص:۲۷)
اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنائے یہ کافروں کا گمان ہے

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو قبلۂ دعا بنایا تو اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر چہرے کو متوجہ کیا جاتا ہے تو آسمان منزل انوار، محل صفا، اضواء و طہارت ہے اور خلل وفساد سے محفوظ ہے۔

۴۔ بعض نے کہا: آسمان زمین دو صفات پر ہیں۔ آسمان مؤثر ہیں مگر متاثر نہیں، زمین متاثر ہے مؤثر نہیں۔ اور مؤثر، قابل اثر (متاثر) سے افضل ہوتا ہے۔ اسی سبب اکثر مقامات پر آسمان کا زمین سے ذکر، مقدم ہوا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اکثر مقامات پر آسمان کا ذکر بطور جمع اور زمین کا بطور واحد ہے اس لیے کہ آسمان کا کثیر ہونا ضروری تاکہ اس سبب سے ان کا مختلف کے ساتھ اتصال ہو لیکن زمین یہ تو اثر قبول کرنے والی ہے۔ تو زمین کا واحد ہونا ہی کافی ہے۔

۵۔ آسمان کے رنگ میں غور کرو اور اس میں حسن تدبیر پر نظر ڈالو، ہر رنگ، رنگوں میں شدید، نظر کے موافق اور اس کیلئے تقویت کا باعث ہے۔ حتیٰ کہ اطباء نظر کی تکلیف میں نیلا رنگ دیکھنے کا کہتے ہیں تو دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کا رنگ نیلا فرمایا کہ دیکھنے والی آنکھیں نفع حاصل کریں، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس رنگ کو سب سے زیادہ نافع بنایا اور یہ روشن کرنے والا اور اس کی صورت، افضل اور یہ متدیر ہے، اسی لیے فرمایا:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (پ۲۶، ق:۶)
اور کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے ہم نے کیسے بنایا اور اُسے سنوارا اور اس میں رخنہ نہیں ہے

یعنی اس میں فصول وسوراخ نہیں اگر زمین کو نہ احاطہ کرنے والا چھت ہوتا تو اس میں فصول ہوتے۔

تیسرا مسئلہ: سماء اور ان میں موجود اشیاء کے فضائل

ان میں موجود، شمس، قمر اور نجوم ہیں، شمس کے طلوع وغروب میں غور وتامل کرو اگر یہ نہ ہو تمام عالم باطل و برباد ہو جائے، لوگ اپنی زندگی و معیشت میں کیسے سعی کریں گے، اس کے طلوع میں تو نفع ظاہر ہے،

لیکن غروب کے نفع میں تامل ضروری ہے۔ اگر اس کا غروب نہ ہو تو لوگوں کو آرام حاصل نہ ہو اور نہ قرار حالانکہ وہ سکون وقرار کے محتاج ہیں تاکہ حصولِ راحت قوت ہاضمہ کو تقویت اور غذا کا اعضاء تک حصول ہو، ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَالَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِراً (پ۱۱، یونس:۶۷) وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ چین پاؤ اور دن بنایا تمہاری آنکھیں کھولتا۔

اگر غروب نہ ہوتو حرص انہیں عمل کی مداومت پہ اُبھارے گی، تو فرمایا:

وَجَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاساً وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشاً (پ۳۰، النباء:۱۰،۱۱) اور ہم نے رات کو پردہ پوش اور دن کو روزگار کیلئے بنایا

۳۔ اگر غروب نہ ہوتو زمین سورج کی چمک سے تپ جائے گی حتیٰ کہ اس پر ہر جاندار چل نہ پائے گا اور پودے ہلاک ہو جائیں گے، ارشاد فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِناً (پ۱۹، الفرقان:۴۵) اے محبوب آپ نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ کیسے پھیلایا سایہ اور اگر چاہتا تو اسے ٹھہرایا ہوا کر دیتا

تو سورج، حق تعالیٰ کی حکمت کے تابع ہو کر وقت مقررہ پر طلوع اور وقت مقرر پر غروب ہو جاتا ہے تو یہ بمنزل چراغ ہے جو گھر والوں کی ضرورت کے مطابق ہی جلایا جاتا ہے پھر بجھا دیا جاتا ہے تا کہ وہ قرار و آرام پائیں۔

تو نور و ظلمت متضاد ہونے کے باوجود، اصلاحِ عالم میں معاون ہیں، یہ تمام اس کے طلوع و غروب میں تھا۔

رہا اس کا ارتفاع اور اس کے بعد ڈھلنا، تو اسے اللہ تعالیٰ نے چار موسموں کا سبب بنایا ہے۔ موسم سرما میں شجر و نباتات میں حرارت و گرمی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے مادہ ثمرات و پھل بنتا ہے۔ ہوا کو نرم اور بادل و بارش کو کثیر کر دیتا ہے جو باطن میں حرارت غریزیہ پیدا کر کے حیوانات کے ابدان کو تقویت دیتا ہے، موسم ربیع و بہار میں طبائع کو متحرک، سرما میں پیدا شدہ مواد کو ظاہر کرتا ہے، پودے اگتے ہیں تو درخت و نباتات منور و روشن ہو جاتے ہیں اور حیوانات، جفتی کیلئے بھڑک اٹھتے ہیں، گرما میں ہوا سخت گرم سے پھل پکتے، ابدان کے فضلات کھلتے، روئے زمین خشک اور وہ عمارات اور مکانات کیلئے تیار ہو جاتی ہے، موسم خزاں میں خشکی اور ٹھنڈک، ابدان کو آہستہ آہستہ سردی کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ اگر یہ انتقال یکدم ہوتا تو ابدان ہلاک و فاسد ہو جاتے۔

حرکتِ شمس کے منافع

حرکت شمس کے منافع کے بارے میں ذرا غور کرو، اگر وہ ایک ہی جگہ کھڑا رہے تو اس جگہ گرمی شدت اختیار کر جائے گی اور باقی مقامات ٹھنڈے رہیں گے لیکن وہ ابتداء نہار میں مشرق سے طلوع اور طرف مغرب کے محاذات پر اس کا وقوع ہوتا ہے پھر وہ گھومتے ہوئے مرحلہ وار غروب تک جاتا ہے تو وہ جوانب شرقیہ میں چمکتا ہے کوئی جگہ تنگی و کھلی ایسی نہیں جو شعاع شمس سے حصہ نہ پائے

پھر گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر سورج مشرق میں کھڑا رہے تو امیر آدمی اپنا مکان فقیر کی چھت سے بلند بنالے گا تو اب فقیر کو روشنی نہیں ملے گی لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر امیر، غریب سے نور شمس روک لے تو میں فلک کو چکر دوں گا کہ فقیر اس سے روشنی حاصل کرلے۔

خطِ استواء سے سورج کے جھک جانے اور میلان کے منافع بھی دیکھو کہ اگر کواکب کیلئے میل میں حرکت نہ ہو تو تاثیر ایک ہی جگہ کیلئے مخصوص ہو جائے گویا تمام اطراف حاصل ہونے والے منافع سے خالی ہو جائیں، اس کا قریبی متشابہ الاحوال ہوگا اور وہاں قوت کیفیت واحدہ کیلئے ہوگی اب اگر گرم ہے تو رطوبات فنا اور وہ تمام آگ بن جائیں اور ان میں تولد کی صلاحیت ختم، تو کواکب کی گزرگاہ ایک کیفیت پر اور جو خط غیر محاذی پر ہیں وہ دوسری کیفیت پر اور جو متوسط ہے وہ کیفیت متوسط پر ہوگی تو کسی جگہ ہمیشہ سردی اور وہاں ہوا اور عجاجت ہو اور دوسری جگہ دائمی گرمی جو جلا دینے والی ہو، کسی جگہ بہار اور کسی جگہ خزاں، اس میں پھل نہیں پکیں گے، اگر حرکات مسلسل نہ ہوں اور کواکب آہستہ حرکت کریں تو میل کا نفع قلیل اور تاثیر میں شدید اضافہ تو یہ میل نہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔

اگر کواکب کی رفتار اس سے تیز ہو تو منافع کا حصول نہ ہوگا اور نہ ہی وہ کامل ہوں گے لیکن جب وہاں میل ہو اور وہ پوری مدت حرکت کی حفاظت کرے پھر وہ ضرورت کے مطابق دوسری جانب منتقل ہو اور ہر جانب اس کا فیض ہو تو اس کی تاثیر کامل اور منافع کثیر ہوں گے، پاک ہے وہ ذات جو خالق، حکمت کاملہ سے مدبر اور غیر محدود قدرت کا مالک ہے۔

کچھ فوائد چاند

چاند، اسے آیۃ اللیل کہا جاتا ہے۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ نے اس کے طلوع اور غائب ہونے کو مصلحت قرار دیتے ہوئے کسی وقت میں اس کے طلوع کو مصلحت اور دوسرے وقت میں اس کے غروب کو مصلحت فرمایا ہے۔ اس کے غروب میں دشمن سے بھاگنے والے کیلئے نفع ہے۔ رات اسے مخفی کردیتی ہے تاکہ طالب اسے نہ پاسکے۔ لہٰذا وہ نجات پاتا ہے، اگر تاریکیاں نہ ہوں تو اسے دشمن پکڑ لے، متنبی کے اس قول کا یہی مفہوم ہے۔

وكم لظلام الليل عندي من يد　　　تخبر أن المانوية تكذب

اور اس کے طلوع میں ان گم کردہ اشیاء والے کیلئے نفع ہے جنہیں تاریکیوں نے چھپالیا ہوتا ہے اور چاند انہیں ظاہر کردیتا ہے۔

ایک حکایت

حکایت ہے کہ ایک اعرابی اپنے اونٹ سے غافل ہو کر رات کو سو گیا اور اونٹ گم ہو گیا، جب چاند طلوع ہوا اس نے اونٹ پالیا اب اس نے چاند کی طرف دیکھ کر کہا: اللہ تعالیٰ نے تجھے صورت و نور دیا تو بروج میں گھومتا ہے جب وہ چاہتا ہے تجھے روشن اور جب چاہتا ہے تجھے بے نور کر دیتا ہے۔ میں اس سے زیادہ تیرے لیے دعا نہیں کر سکتا اگر تو نے مجھے سرور دیا تو اللہ تعالیٰ تجھے بھی نور دے۔ پھر اس نے یہ اشعار کہے:

ماذا أقول وقولی فیك ذو قصر — وقد كفيتنى التفصيل والجملا

ان قلت لازلت مرفوعا فأنت كذا — لو قلت زانك ربی فهو قد فعلا

عربوں میں کچھ لوگ چاند کی مذمت کرتے اور کہتے، چاند، اجل کو قریب، چور کو ذلیل، بھاگنے والے کو گرفتار، عاشق کو ذلیل، مشکیزوں کو پرانا، نوجوانوں کو بوڑھا، ذکر دوستوں میں نسیان، قرض کو قریب اور وقت کو قریب کر دیتا ہے۔

چاند کی شمس پر فضیلت

کچھ ان دلائل کی بنا پر چاند کو شمس سے افضل قرار دیتے ہیں:

۱۔ قمر مذکر جبکہ شمس مونث ہے، لیکن اس نے اس پر یوں طعن کیا:

فما التأنيث لاسم الشمس عيب — ولا التذكير فخر للهلال

(شمس کا مونث ہونا عیب نہیں اور نہ ہی ہلال کا مذکر ہونا فخر والی بات ہے)

۲۔ کہا جاتا ہے، قمران" تو شمس کو تابع قرار دیا۔

بعض شمس کو قمر پر فضیلت دیا کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس پر شمس کو مقدم کیا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (پ۲۷، الرحمٰن:۵) سورج اور چاند حساب سے ہیں

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (پ۳۰، الشمس:۱،۲) اور سورج اور اس کی روشنی کی قسم اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے

مگر یہ دلیل لوٹ جاتی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (پ۲۸، التغابن:۲) تم میں کوئی کافر ہے اور کوئی مومن

لَا یَسْتَوِیْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (پ۲۸، الحشر:۲۰) دوزخ والے اور جنت والے برابر نہیں

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ (پ۲۹، الملک:۲) اسی نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (پ۳۰، الشرح:۶) یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (پ۲۲، فاطر:۳۲) ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے

ستاروں کے منافع

رہے ستارے ان میں کثیر منافع ہیں:

پہلا نفع: یہ شیاطین کے بھگانے کا کام دیتے ہیں۔

دوسرا نفع: قبلہ کی ان سے معرفت ہوتی ہے۔

تیسرا نفع: مسافر سمندروں، جنگلوں و بیابانوں میں ان سے رہنمائی لیتے ہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (پ۷، الانعام:۹۷) اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم خشکی اور تری کی تاریکیوں میں سیدھی راہ پاؤ۔

ستاروں کی اقسام

ستاروں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ غاربہ، جو طلوع نہیں ہوتے۔ جیسے کواکب جنوبیہ

۲۔ طالعہ، جو غروب نہیں ہوتے۔ جیسے کواکب شمالیہ

۳۔ کبھی طلوع اور کبھی غروب ہوتے ہیں۔

ان میں ثوابت، سیارات، شرقیہ اور غربیہ بھی ہیں اور ان میں طویل گفتگو ہے۔

فلاسفہ کا دعویٰ

فلاسفہ اجرامِ فلکی اور ابعاد کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

فدع عنك بحراً ضل فيه السوابح — تو سمندر کی بات چھوڑ دے کیونکہ اس میں تیرنے والے گم ہو جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَداً اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (پ۲۹، الجن:۲۶،۲۷) — غیب جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے

یہ بھی فرمان ہے:

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (پ۱۵، الاسراء:۸۵) — اور تمہیں تھوڑا علم ہی دیا گیا ہے

وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ (پ۱۲، ھود:۳۱) — اور میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہوں

مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ (پ۱۵، الکہف:۵۱) — نہ میں نے آسمان اور زمین کو بناتے وقت انہیں سامنے بٹھالیا تھا اور نہ خود ان کے بناتے وقت

مخلوق تو اپنی ذات اور صفات کی معرفت سے عاجز ہے تو وہ سب سے بعید اشیاء کی معرفت پر کیسے قادر ہو سکتی ہے؟

عرب معرفت حقائق سے دور ہونے کے باوجود یہ مانتے تھے۔ان میں سے ایک نے کہا:

و اعرف ما في اليوم والامس قبله — ولكنني من علم ما في غد عمي

(میں آج اور پچھلے کل کے بارے میں جانتا ہوں مگر آئندہ کے حوالہ سے اندھا ہوں)

لبید کہتے ہیں:

فو الله ما تدري الضوارب بالحصى — ولا زجرات الطير ما الله صانع

چوتھا مسئلہ: آسمان کے چھت ہونے کی تفصیل

اللہ تعالیٰ نے جب زمین پیدا کی تو یہ مانند صدف اور اس میں امانت شدہ قیمتی موتی حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی حاجات سے واقف تھے، تو فرمایا: اے آدم! میں نے تجھے اس زمین کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں بنایا تو یہ تمہارے لیے ماں کی مثل ہے۔ فرمایا:

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا اور ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو خوب پھاڑا

(پ ۳۰، عبس ۲۵، ۲۶)

اے میرے بندو! غور کرو تمہارے ہاں معزز شی سونا و چاندی ہے تو اگر میں زمین کو سونے اور چاندی سے بنا دیتا تو کیا اس سے یہ منافع حاصل ہوتے؟ پھر دنیا کے قید خانہ ہونے کے باوجود میں نے اس میں یہ اشیاء پیدا کی ہیں تو جنت کا سماں کیا ہوگا؟ حاصل یہ ہے کہ زمین تمہاری ماں بلکہ ماں سے بھی زیادہ شفیق ہے کیونکہ ماں ایک رنگ کا ہی دودھ پلاتی ہے لیکن زمین تو ان گنت رنگوں کی غذائیں دیتی ہے۔ فرمایا:

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ ہم نے اسی سے تمہیں پیدا کیا اور اسی کی طرف لوٹائیں گے (پ ۱۶، طہٰ: ۵۵)

یعنی ہم نے تمہیں ماں کی طرف لوٹا دیا اور یہ دھمکی نہیں کیونکہ انسان کو ماں کی طرف لوٹانا دھمکی نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے تمہاری جننے والی ماں کا مقام، زمین کے مقام سے بہت تنگ تھا پھر تم بطن اُم میں نو ماہ رہے وہاں نہ بھوک تھی اور نہ پیاس تو کیا صورت ہوگی جب تم بطن اُم کبریٰ میں داخل ہوگے، ہاں شرط یہ ہے اس اُمِ کبریٰ کے بطن میں اسی طرح سے داخل ہوں، جس طرح تم بطن اُم صغریٰ میں تھے کیونکہ جب تم بطن اُمِ صغریٰ میں تھے تو تم سے کسی لغزش کا صدور بھی نہیں ہوا چہ جائیکہ تم سے کبیرہ کا صدور ہوتا بلکہ تم وہاں اللہ تعالیٰ کے اسقدر مطیع تھے کہ جب اس نے تمہیں ایک دفعہ دنیا میں جانے کا حکم دیا تو تم اپنے رب کی طاعت میں سر جھکائے دنیا میں آگئے لیکن آج وہ ستر دفعہ نماز کی طرف بلاتا ہے لیکن تم اس کی طرف چلتے بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب آسمان وزمین کا ذکر کیا تو ان کے درمیان جو نکاح جیسا رشتہ ہے وہ بھی بیان کیا کہ آسمان سے زمین پر پانی نازل ہوتا ہے اور زمین کے بطن سے بنی آدم کیلئے اشیاء اور مختلف ثمرات حیوانات کی نسل کی طرح نکلتے ہیں تا کہ وہ اپنے اندر کے، مافوق اور ماتحت کے احوال پہ غور کر کے یہ معرفت حاصل کر سکیں کہ ان اشیاء میں سے کسی شی کی تکوین و تخلیق پر کوئی قادر نہیں سوائے اس ذات کے جو ان سے ذات وصفات میں مختلف ہے اور وہ صانع حکیم سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اقدس ہی ہے۔

چند سوالات

یہاں چند سوالات بھی ہیں:

کیا واسطہ سے تخلیق، قدرت کے منافی ہے؟

پہلا سوال: تمہاری کیا رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ثمرات کو بطور عادت و معمول حصولِ ماء کے بعد پیدا فرما دیتا ہے یا اس پانی

میں طبیعتِ مؤثر اور زمین میں طبیعتِ قابلہ پیدا کر دی ہے کہ جب دونوں کا اجتماع ہو تو اس قوت سے حصول اثر ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے؟

جواب: بلاشبہ دونوں صورتوں اور اقوال میں صانع و حکیم کا ہونا ضروری ہے، تفصیل کچھ یوں ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ابتداءً بغیر واسطہ ان ثمرات کی تخلیق پر قادر ہے کیونکہ ثمر کا مفہوم فقط یہی ہے کہ ایسا جسم جس کے ساتھ طعم، لون، خوشبو اور رطوبت قائم ہو، جسم، ان صفات کے قابل ہوتا ہے اور یہ تمام صفات ابتداءً ہی مقدوراتِ الٰہیہ میں سے ہے۔ کیونکہ مقدوریت کیلئے مصحح یا تو حدوث ہے یا امکان یا دونوں، تو تمام صورتوں میں لازم ہے کہ ابتداً ہی بغیر واسطہ اللہ تعالیٰ جسم میں ان اعراض کی تخلیق پر قادر ہو۔

اس دلیل عقلی کی تائید دلائل نقلیہ میں سے یہ دلیل نقلی بھی کرتی ہے۔

حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطہ ثواب پانے والوں کیلئے انعامات جنتی کی تخلیق کی ہے۔

البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ابتداً اس کا تخلیق پہ قادر ہونا، اجسام میں قابلیت اور قوی مؤثرہ کے واسطہ سے تخلیق پر قدرت کے منافی نہیں قول متاخرین ظاہراً اس کا انکار ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس پر دلیل کا ہونا ضروری ہے۔

مدت طویل میں تخلیق کی حکمتیں

دوسرا سوال: جب اللہ تعالیٰ ان ثمرات کی تخلیق پر بلا واسطہ قادر ہے تو انہیں ان وسائط کے ذریعے اس قدر مدت طویلہ میں تخلیق کی کیا حکمت ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے فیصلہ فرمائے۔ ہاں اہلِ علم نے تفصیل کے ساتھ کئی حکمتیں تحریر کی ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ نے عام معمول پر ہی معاملہ رکھا بایں طور کہ ترتیب و تدریج کے ساتھ یہ عمل کیا کیونکہ جب مکلفین ثمرات کے حصول کیلئے کھیتی باڑی اور باغبانی میں مشقت اٹھاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اپنے کو محنت میں ڈالتے ہیں تو اس سے وہ جان لیتے ہیں کہ دنیاوی منافع کے حصول کیلئے انہیں کس قدر تکالیف برداشت کرنا پڑ رہی ہیں تو ہمیں اُخروی منافع کیلئے ان تکالیف دنیا سے کم تکالیف اٹھالینا کہیں اولیٰ ہے کیونکہ یہ دنیاوی منافع سے کہیں اعظم و اہم ہیں۔

یہ اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر استعمال دوا شفا پر قادر ہے۔ لیکن وہ توفیق کے مطابق معمول و عادات پر معاملہ جاری رکھتا ہے اس لیے کہ جب ضررِ مرض سے بچنے کیلئے کڑوی ادویات کا کھانا برداشت کرے گا تو ضررِ عذاب سے بچنے کیلئے تکالیف کو بطریق اولیٰ برداشت کرے گا۔

۲۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں بغیر وسائط پیدا فرما دے گا تو قادر حکیم کی بنسبت علم ضروری و بدیہی حاصل ہو جاتا تو یہ تکلیف و ابتلاء کے

منافی کی طرح ہوتا، جب اس نے ان وسائط کے ذریعے ان کی تخلیق کی تو اب مکلف قادر کی طرف نسبت میں نظر دقیق اور فکر غامض کا محتاج ہوگا جس سے وہ ثواب کا مستحق بنے گا۔اس لیے یہ قول ہے:

لولا الاسباب لما ارتاب مرتاب — اگر اسباب نہ ہوتے تو شک والا، شک نہ کرتا

۳۔ اس میں ملائکہ اور اہل بصیرت کیلئے عبرتیں اور صائب افکار ہیں۔

تیسرا سوال: ارشادِ الٰہی، وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً کا تقاضا ہے نزولِ بارش آسمان سے ہو حالانکہ بات یوں نہیں، بارش تو ان بخارات سے بنتی ہے جو زمین سے اٹھ کر ہوا کے طبقہِ بارد میں پہنچتے ہیں وہاں وہ ٹھنڈک کی وجہ سے جمع ہونے کے بعد برستے ہیں اور یہی بارش ہے۔

جواب: اس کا کئی وجوہ سے جواب ہے:

۱۔ سماء کو بلندی کی وجہ یہ نام ملاتو جو بھی ہم سے بلند ہے وہ سما کہلاتا ہے تو جب بادلوں سے بارش ہوتی ہے تو یہ سماء سے ہی ہوئی۔

۲۔ ان اجزا ارطبہ کا زمین کی گہرائی سے اڑانے والا محرک فرما رہا ہے "انزل من السماء ماء" (اس نے آسمان سے پانی نازل کیا)

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہی حق ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ بارش آسمان سے آئی ہے جب ہمارے علم میں یہ بات آ گئی ادھر ہم اسے بادلوں سے اترتے دیکھتے ہیں تو ہم پہ یوں ماننا لازم ہے کہ وہ اسے آسمان سے بادلوں میں اور بادلوں سے زمین پر نازل کرتا ہے۔

مِنَ الثَّمَرٰتِ میں مِن کا معنی

چوتھا سوال: مِنَ الثَّمَرٰتِ میں مِن کا کیا معنٰی؟

جواب: دو طرح پر ہے:

۱۔ من، تبعیض کیلئے ہے کیونکہ ماء اور رزق نکرہ ہیں اور بعض اُوقات نکرہ سے معنی بعض مراد ہوتا ہے گویا فرمایا ہم آسمان سے کچھ پانی اتار کر، اس کے سبب بعض ثمرات پیدا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہارے لیے کچھ رزق بن جائے۔

۲۔ یہ بیان کیلئے ہے، جیسے انفقت من الدارھم انفاقاً (میں نے دراہم خرچ کیے)

لفظ "رِزْقًا" منصوب کیوں؟

سوال: لفظ "رِزْقًا" منصوب کیوں؟

جواب: اگر مِنْ، بعضیہ ہے تو اس کا نصب مفعول فیہ کی وجہ سے ہوگا اور اگر بیانیہ ہے تو یہ رِزْقًا اَخْرَجَ" کا مفعول بہ ہوگا۔

پانچواں سوال: آسمانی پانی سے پھل بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے تو ثمر یا ثمار نہیں فرمایا بلکہ ثمرات کیوں فرمایا؟

جواب: تا کہ دنیاوی ثمر و پھل کی قلت پر تنبیہ اور آخرت کے معاملہ کی عظمت پہ دلالت ہو۔ واللہ أعلم

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر

یہاں چند سوالات ہیں:

پہلا سوال: فَلَا تَجْعَلُوْا کا تعلق کس سے ہے؟

لَا تَجْعَلُوْا کا تین سے تعلق

جواب: اس کا جواب تین طرح پر ہے:

۱۔ اس کا تعلق حکم عبادت سے ہے، یعنی اپنے رب کی عبادت کرو اور اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ کیونکہ عبادت کی اصل اور اساس باری تعالیٰ کی توحید ہی ہے۔

۲۔ لعلّ کے ساتھ، معنی ہوگا تمہیں اس نے پیدا کیا تا کہ اس کے عتاب سے ڈرو اور اس کیلئے شریک نہ بناؤ کیونکہ اس کا شریک بنانا سب سے بڑھ کر عتاب کا سبب ہے۔

۳۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا، کے ساتھ، یعنی جس ذات اقدس نے تمہارے لیے یہ دلائل ظاہرہ وغالبہ تخلیق فرمائے اس کے شریک مت بناؤ۔

نِد کسے کہتے ہیں؟

دوسرا سوال: ند کسے کہتے ہیں؟

جواب: نزاع کرنے والا مثل، جب کوئی کسی سے نفرت کرے تو کہا جاتا ہے نادوت الرجل، یہ ندند ودًا اذا نفر سے ماخوذ ہے گویا ندین (دوند) میں سے ہر کوئی دوسرے سے نفرت ومخالفت کرتا ہے۔

سوال: کفار یہ ہرگز نہیں کہتے تھے کہ بت، اللہ سے تنازعہ کرتے ہیں؟

جواب: جب وہ ان کی عبادت کرتے اور ان کا نام الٰہ رکھتے تو ان کا حال ان کی طرح ہو جاتا جو انہیں الٰہ اور اللہ تعالیٰ سے تنازعہ پہ قادر مانتے تو یہ لفظ ان پہ بطور ''تھکم'' ہیں جیسا کہ لفظ ند بطور ''تھکم'' اور اس کے ساتھ ان پر طعن ہے کہ انہوں نے کثیر انداد بنا دیے حالانکہ اس کا ایک بھی ند نہیں۔

شیخ محمد بن سمیفع نے "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ نِدًّا" پڑھا ہے۔

تیسرا سوال: وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا کیا معنی ہے؟

جواب: تم اپنی کمال عقل کی وجہ سے جانتے ہو کہ ان اشیاء کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا درست نہیں لہٰذا ایسا قول نہ کرو کیونکہ جاننے والے کے قبیح قول کا قبح و برائی سب سے قبیح ہوتا ہے۔

یہاں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: ثنویہ اور دوالہ

کائنات میں ایسا کوئی نہیں جو کسی کو وجود، قدرت، علم اور حکمت میں اللہ تعالیٰ کے برابر و شریک بناتا ہو یہ آج تک کائنات میں نہیں ہوا، ہاں ثنویہ دوالہ مانتے ہیں۔

۱۔ حکیم، جو خیر کرتا ہے۔

۲۔ سفیہ، جو شر کرتا ہے۔

غیر اللہ کی عبادت کرنے والے

البتہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کے لائق تو کثیر لوگ مانتے ہیں۔

پہلا فریق: ستاروں کی عبادت کرنیوالے صائبہ کہتے ہیں، ستاروں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور یہ اس عالم میں مدبر ہیں لہٰذا ہم پر ان کی عبادت لازم ہے اور ستارے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

دوسرا فریق: نصاریٰ، یہ حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں

تیسرا فریق: بتوں کی عبادت کرنے والے۔

بُت پرستی کی تاریخ

واضح رہے بُت پرستی کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں، اس لیے کہ تاریخ بتاتی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ہیں جنہوں نے بُت پرستوں کا رد کیا۔

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (پ ۲۹ نوح:۲۳)

اور بولے ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو اور ہرگز نہ چھوڑنا وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو

تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول وعقیدہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے موجود تھا اور یہ دین اب تک موجود ہے بلکہ اکثر اہلِ جہاں اس قول پر قائم ہیں، جس دین و مذہب کا یہ حال ہو اس کا بدیہی طور پہ فاسد ہونا محال ہے لیکن اس بات کا علم بدیہی ہے کہ یہ تراشہ ہوا پتھر نہ میرا خالق نہیں اور نہ آسمانوں وزمین کا خالق ہے لہٰذا جماعت عظیم کا اس پر اتفاق محال ہے لہٰذا بت پرستوں کی غرض و مقصد اس کے علاوہ ہوگی اور اس کے بارے میں اہلِ علم کی مختلف آراء ہیں۔

بُت پرستوں کی غلط فہمی

۱۔ ابو معشر جعفر بن جعفر بن محمد نجومی بلخی نے بعض کتب میں لکھا، متعدد اہلِ چین و ہند، اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کو مانتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا جسم وصورت ہے جو دیگر صورتوں سے بہت خوبصورت ہے، اسی طرح ملائکہ کی بھی صورتیں خوبصورت ہیں اور یہ تمام، آسمان کی وجہ سے ہم سے حجاب میں ہیں لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کی خوبصورت تماثیل وفوٹو اس خیال پر بنائیں جو الٰہ وملائکہ کی ذہن میں صورتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے قرب کیلئے ان کی عبادت کریں، اگر یہ قول درست ہے تو بت پرستی کا سببِ اعتقادِ مشابہت ہوا۔

۲۔ اکثر اہلِ علم نے لکھا، لوگوں نے جب دیکھا اس کائنات کے احوال میں، تغیرات احوال کواکب وسیارگان سے مربوط و وابستہ ہیں کیونکہ سورج کے سمت رأس کے قرب وبعد سے مختلف موسم اور متخالف احوال جنم پاتے ہیں جب انہوں نے باقی کواکب کے حوالہ سے تحقیق کی تو ان کا یہ اعتقاد بنا کہ دنیا میں سعادت ونحوست کا تعلق ان کی لوگوں پر طلوع کی کیفیت سے وابستہ ہے، اس اعتقاد کے بعد انہوں نے ان کی تعظیم میں خوب مبالغہ سے کام لیا۔

بعض نے ان کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کرلیا کہ یہ لذاتہ واجب الوجود ہیں اور یہی جہانوں کے پیدا کرنے والے ہیں۔

بعض نے کہا: یہ خود تو الٰہ اکبر کی مخلوق ہیں لیکن باقی کائنات کے خالق یہی ہیں۔

تو فریق اول نے یہ عقیدہ بنالیا کہ یہی حقیقۃً الٰہ ہیں۔

فریق ثانی نے کہا، یہ اللہ تعالیٰ اور بشر کے درمیان وسائط ہیں۔ لہٰذا یہ تمام ان کی عبادت وخضوع میں مصروف ہوگئے۔

پھر انہوں نے دیکھا اکثر اوقات کواکب آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں تو ان کیلئے انہوں نے بت بنائے تو ان ظاہری اجرام کی عبادت اس لیے شروع کردی کہ غائب اجسام کا قرب مل سکے، جب طویل مدت گزر گئی تو کواکب کا تذکرہ ختم ہوگیا اب

محض ان تماثیل کی عبادت رہ گئی اور یہ بھی حقیقۃً کواکب کی عبادت کرتے ہیں۔

۳۔ اصحاب الاحکام نے طویل مدت پہلے ہزار اور دو ہزار سال سے کچھ اوقات مقرر کیے اور یہ گمان کیا کہ جو اس وقت خاص طریقہ سے طلسم اپنائے گا وہ احوال مخصوصہ میں سعادت، نحوست اور دفع آفات سے پائے گا، تو جب طلسم کا مظاہرہ کرتے تو اس کی خوب تعظیم بجالاتے کیونکہ ان کا اس میں نفع کا اعتقاد تھا تو تعظیم میں مبالغہ کرتے کرتے عبادت بن گئی، جب اس عمل کی مدت طویل ہوئی تو معاملہ کی ابتدا بھول ہی گئے اور اصل معاملہ سے جاہل ہونے کی وجہ سے ان کی عبادت کرنے لگے

۴۔ جب ان میں سے کوئی اپنا بڑا آدمی مرتا جس کے مقبول دعا ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول شفاعت کا عقیدہ رکھتے تو اس کی صورت کا بُت بنالیتے اور اس اعتقاد سے ان کی عبادت کرتے کہ یہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے، اس ارشادِ الٰہی میں اس قول کی نشاندہی ہے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (پ۱۱، یونس:۱۸) اللہ کے ہاں ہمارے لیے یہ سفارشی ہیں

۵۔ ممکن ہے انہوں نے نماز و طاعت کیلئے محراب بنائے، اس کی طرف سجدہ کیا کرتے نہ کہ اس کیلئے کرتے جیسے ہم قبلہ کی طرف کرتے ہیں نہ کہ قبلہ کو، طویل مدت گزرنے کے بعد بعض جہال نے ان محرابوں کی ہی عبادت تصور کرلیا۔

۶۔ شاید یہ مجسمہ (اللہ تعالیٰ کا جسم مانتے) تھے تو انہوں نے ان میں اللہ تعالیٰ کا حلول مان لیا تو اس تاویل کی بنا پر ان کی عبادت کی ان صورتوں میں سے کسی ایک وجہ پر مذکور قول وعقیدہ کو محمول کیا جاسکتا ہے تاکہ اس کا بطلان عقلاً واضح ہو سکے۔

دوسرا مسئلہ: عبادت کا عدمِ جواز

سوال: جب بت پرستوں کا مذہب وہی صورتیں ٹھہریں جن کا ذکر ہوا تو اثباتِ خالق عالم سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ ان بتوں کی عبادت جائز ہی نہیں؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کا مخلوق ہونا بیان کردیا تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہ دونوں باقی اجسام کے ساتھ جسم ہونے میں شریک ہیں تو اب کسی مخصص وراجح کی وجہ سے ہر ایک کی مخصوص شکل، صفت اور اخبار ہوگی، وہ مخصص اگر جسم ہے تو وہ کسی اور مخصص کی طرف محتاج ہوگا تو ضروری ہے کہ وہ جسم نہ ہو، جب یہ ثابت ہوا تو ہم کہتے ہیں جنہوں نے کہا بت پرستی کی وجہ اعتقادِ شبہ ہے تو جب ہم نے آیت کے حوالہ سے نفی جسمیت کردی تو اس کا قول باطل ٹھہرا۔

دوسرا قول یہ تھا کہ کواکب عالم میں مدبر و متصرف ہیں جب ہم نے واضح کردیا ہر جسم اپنے اوصاف میں فاعلِ مختار کا محتاج ہوتا ہے تو ان کواکب کا الٰہ ہونا باطل ہوگیا اور ثابت ہوا یہ عبد ہیں نہ کہ رب۔

تیسرا قول: اصحاب طلسمات کا یہ بھی باطل ہے کیونکہ طلسمات کی تاثیر کواکب کی قوتوں کی وجہ سے ہوگی جب ہم نے کواکب کا حادث ہونا دلائل سے اشکار کر دیا تو ہمارا قول ثابت اوران کا قول باطل ٹھہرا۔

چوتھا اور پانچواں قول، عقلاً اس پر کوئی اعتراض نہیں اور نہ یہ محال ہے۔ ہاں شرع نے منع کر دیا تو اب اس سے رکنا لازم ہے

چھٹا قول، اس کی بنا بھی تشبیہ پر ہے اور سابقہ دلائل میں آچکا کہ عالم ایسے صانع ومختار کا محتاج ہے۔ جو جسمیت سے پاک ہو تو تمام تاویلات پر بت پرستی کا قول باطل ہے۔ واللہ أعلم

تیسرا مسئلہ: واضح رہے یونانیوں نے خروج اسکندر سے پہلے ایسے ہیکل بنانے کا ارادہ کیا۔ جو قوٰی روحانیہ اور اجسام نیرہ کے نام سے معروف تھے اور انہوں نے الگ الگ انہیں اپنا معبود بنالیا، ہیکلِ علت اولیٰ ان کے ہاں امر الٰہی ہے، ہیکل عقل صریح، ہیکل سیاست مطلقہ، ہیکل نفس وصورت تمام دائرہ ہیں۔ ہیکل زحل مسدس، ہیکل مشتری مثلث، ہیکل مریخ مستطیل، ہیکل شمس مربع، ہیکل زہرہ مثلث اس کا جوف مربع، ہیکل عطارد مثلث اس کا جوف مستطیل اور ہیکل قمر مثمن تھا۔

اہلِ تاریخ کا خیال ہے عمرو بن لحی جب اپنی قوم کا اور اس کے طبقات کا رئیس وسربراہ بنا تو وہ بیت الحرام کا متولی ٹھہرا۔ اس نے بلقاء کا سفر کیا تو کچھ لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا، اس کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا، یہ ایسے ارباب ہیں کہ ہم ان سے مدد طلب کر کے مدد پاتے ہیں، ان سے بارش طلب کر کے بارش پاتے ہیں، ان سے اس نے کہا، ان میں سے ایک ہمیں بھی دے دو تو انہوں نے معروف بت ہبل اسے دیا، جسے وہ مکہ لایا اور اسے کعبہ کے اندر فٹ کر کے لوگوں کو اس کی تعظیم کی طرف دعوت دی۔ اور یہ بادشاہ سابور ذوالاکناف کے دور کی بات ہے۔

واضح رہے مشہور بتکدوں میں 'غمدان' ہے جسے ضحاک نے شہر صنعاء میں زہرہ کے نام پر بنایا اور اسے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے تباہ کیا تھا۔

ان میں سے نوبہار بلخ ہے جسے منوشہر بادشاہ نے اسم قمر پر بنوایا۔

پھر قبائل عرب کے معروف بت ہیں مثلاً، دومۃ الجندل میں بنوکلب کا بت تھا، سواع بنو مذیل، یغوث، بنو مذحج، یعوق، ہمدان، نصر، سرزمین حمیر میں ذوالکلاح، اللات، طائف میں ثقیف کا، مناۃ، یثرب میں خزرج، عزیٰ، اطراف مکہ میں کنانہ، اساف اور نائلہ صفا ومروہ پر تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت قصی۔

ینھاھم عن عبادتھا ویدعوھم الی عبادۃ اللہ تعالٰی لوگوں کو بتوں کی عبادت سے روکتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتے

اسی طرح حضرت زید بن عمرو نفیل کہا کرتے

اربا و احدا أم ألف رب أدين اذا تقسمت الأمور

تركت اللات والعزى جميعا كذلك يفعل الرجل البصير

(کیا رب ایک ہی ہے یا ہزار رب پر، میں ایمان لاؤں معاملات میں مَیں نے لات وعزیٰ کو چھوڑ دیا ہر صاحب بصیرت آدمی یوں ہی کرے گا)

[۲۳-۲۴] وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۳﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۲۴﴾

(اور اگر تمہیں شک ہو اس پر جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اُتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ لاسکو (اور ہم فرما دیتے ہیں) کہ تم ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں کافروں کیلئے تیار کر رکھی ہے)

ان آیات میں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: نبوت پہ دلائل

اللہ تعالیٰ نے اثبات صانع پر دلائل قاہرہ قائم کیے اور اس کے شریک کے قول کا ابطال فرمایا، اس کے بعد اب نبوت پر دلائل کا ذکر لایا گیا۔

اس سے فرقہ تعلیمیہ کے اس قول کا فساد واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، رسول کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے، اس سے حشویہ کا یہ قول بھی رد ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت قرآن واخبار سے حاصل ہوتی ہے۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، قرآن کے معجز ہونے پر قائم ہے تو قرآن کے معجز ہونے پر دلائل ذکر کیے۔

قرآن کا معجز ہونا

اعجاز قرآن کا بیان دو طرق سے ہوسکتا ہے

لفظ تدبر

پہلا طریق: قرآن کا حال تین میں سے ایک سے خالی نہیں یا تو یہ باقی فصحاء کے کلام کے مساوی ہوگا یا ان کلامِ فصحاء سے اتنا زائد واعلیٰ کہ وہ خلاف عادت نہیں یا اتنا زائد جو خلاف عادت ہے۔ پہلی دونوں قسمیں باطل ہیں لہٰذا تیسری صورت ہی ہوگی، ان دونوں کو باطل ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے اگر قرآن اس طرح ہوتا تو لازم تھا یہ فصحاء اس کی مثل سورت بنا لاتے خواہ اجتماعی طور پر یا انفرادی سطح پر، اگر تنازعہ کا اور عدم قبولیت کا خوف ہوتا تو گواہ وحکام ان شبہات کا ازالہ وفیصلہ کر دیتے۔

اور یہ پہلو احتجاج واستدلال کا اعلیٰ وآخری درجہ ہے کیونکہ یہ فصحاء، معرفت لغت اور قوانین فصاحت کو کامل طور پر جانتے تھے اور وہ آپ کے معاملہ کو تمام کاوش سے باطل کرنا بھی چاہتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے اس کیلئے جان ومال قربان کر دیے اور بہت مشقتیں وہلاکتیں برداشت کیں، ان میں حمیت وتعصب بھی تھا وہ تو حق قبول نہ کرتے چہ جائیکہ باطل قبول کر لیتے۔

یہ تمام چیزیں لازم کرتی ہیں کہ وہ اس کے مقابل لانے کی کوشش کرتے جو اس پر قدح وطعن ہوتا اور معارضہ (مثل لانا) طعن وقدح میں سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے تو جب وہ مقابل سورت تک نہ لاسکیں تو ان کا عجز آشکار ہو گیا تو ثابت ہوا کہ قرآن ان کے اقوال کے مثل نہیں، اس کے اور ان کے اقوال کے درمیان تفاوت بھی معمولی نہیں تو یہ ایسا تفاوت ہوگا جو خلاف عادت ومعمول ہے تو ضروری ہے قرآن معجز ہو، اس مذکور دلیل کی تفصیل یہی ہے۔

واضح ہوا اللہ تعالیٰ نے جیسے معرفت توحید میں تقلید پر اکتفا نہیں فرمایا اسی طرح معرفت نبوت میں بھی تقلید پر اکتفا نہیں کیا۔

یاد رہے قرآن میں بظاہر ایسی کثیر وجوہ جمع ہیں جو اس کی فصاحت کی کمی پر دال ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فصاحت کے اس درجہ ومقام پہ ہے جس سے آگے فصاحت کوئی درجہ متصور نہیں تو یہی اس کے معجز ہونے پر دال ہے حالانکہ کمی کے اسباب یہ ہو سکتے تھے۔

کمی فصاحت کے اسباب

پہلا سبب: فصاحت عرب اکثر طور پر وصف مشاہدات میں ہے، مثلاً وصف اونٹ، گھوڑا، جاریہ، بادشاہ، ضرب، طعن، وصف حرب، وصف ڈاکہ، حالانکہ قرآن میں ان میں سے کوئی شی بھی نہیں تو ضروری تھا اس میں کوئی ایسا فصیح لفظ نہ ہوتا جس پہ عرب متفق ہیں

دوسرا سبب: اللہ تعالیٰ نے طریق صدق وسچائی اختیار فرمایا اور تمام قرآن میں جھوٹ سے احتراز کیا، جو شاعر جھوٹ چھوڑ کر صدق اختیار کرتا ہے اس کے اشعار کا درجہ کم اور وہ شاعر اعلیٰ نہیں رہ جاتا، تم دیکھو حضرت لبید بن ربیعہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما نے اسلام لانے کے بعد جو اشعار کہے ان کا درجہ کم ہے، یہی وجہ ہے اسلامی اشعار عمدگی میں اشعار جاہلی کی طرح نہیں تو اللہ تعالیٰ نے کذب اور لاف زنی سے احتراز کرتے ہوئے تمام قرآن کو فصیح نازل کیا جیسا کہ تمہارے سامنے ہے

تیسرا سبب: پورے قصیدہ میں کلام فصیح اور اشعار فصیح ایک یا دو اشعار ہی ہوتے ہیں باقی کا یہ درجہ نہیں لیکن قرآن کا معاملہ یوں نہیں یہ تو تمام کا تمام معجز ہے کیونکہ مخلوق اس کی مثل لانے سے عاجز ہے۔

چوتھا سبب: جب کوئی کسی کے بارے میں فصیح شعر کہتا ہے جب وہ دوبارہ کہتا ہے تو اس شی کے وصف میں کلام ثانی، کلام اول کی طرح نہیں ہوتا، قرآن میں تکرار کثیر ہے اس کے باوجود ہر کلام فصاحت کی انتہا پر ہے اور اس میں ہرگز کوئی کمی و تفاوت نہیں

پانچواں سبب: قرآن میں لزومِ عبادات اور تحریمِ برائیوں کا بیان ہے اس طرح اعلیٰ اخلاق، ترکِ دنیا اور ترجیح آخرت کا شوق دلایا ہے اس طرح کے احکامات تو فصاحت میں کمی کا موجب وسبب بنتے ہیں۔ حالانکہ قرآنی فصاحت میں کوئی کمی نہیں۔

چھٹا سبب: اہلِ علم کہتے ہیں، خوشی، ذکر نساء اور صفات خیل میں امرأالقیس کے اشعار، بوقت خوف، نابغہ کے، اعشیٰ کے بوقت طلب اور وصف خمر میں، زہیر کے بوقت رجاء و رغبت خوب اشعار ہوتے ہیں، بالجملہ ہر شاعر کا کلام کسی ایک فن میں خوب ہوتا ہے جبکہ اس فن کے علاوہ میں اس کا کلام کمزور ہوتا ہے لیکن قرآن تمام فنون کے اعتبار سے فصاحت کے آخری درجہ پہ ہے، تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ نے ترغیب وشوق میں فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ (پ۲۱، السجدۃ:۱۷)

تو کسی نفس کو نہیں معلوم جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کیلئے چھپا رکھی ہے

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ۚ (پ۲۵، الزخرف:۷۱)

اور اسی میں وہ کچھ ہے جو دل چاہے اور آنکھ لذت حاصل کرے

ترہیب وخوف میں فرمایا:

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ (پ۱۵، الاسراء:۶۸)

کیا تم اس سے نڈر ہوئے کہ وہ خشکی ہی کا کوئی کنارہ تمہارے ساتھ دھنسا دے

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ (پ۲۹، الملک:۱۶،۱۷)

کیا تم اس سے نڈر ہوگئے جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے جبھی وہ کانپتی ہے یا تم نڈر ہوگئے جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تم پر پتھراؤ کرے

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (پ۱۳، ابراہیم:۱۵) اور ہر سرکش ہٹ دھرم نامراد ہے

وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (پ۱۳، ابراہیم:۱۷) اور اسے ہر طرف سے موت آئے گی

زجر و توبیخ میں جو کہا وہاں تک وہمِ بشر نہیں جاسکتا۔فرمایا:

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ (پ۲۰، العنکبوت:۴۰) تو ان میں ہر ایک کو اس کے گناہ پر ہم نے پکڑا

ایسی نصیحت فرمائی جس سے آگے نہیں جایا سکتا۔

أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ (پ۱۹، الشعراء:۲۰۵) بھلا دیکھو تو کچھ برس ہم انہیں برتنے دیں

الٰھیات کے حوالہ سے فرمایا:

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَى وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ (پ۱۳، الرعد:۸) اللہ جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کے پیٹ میں ہے اور پیٹ جو کچھ گھٹتے اور بڑھتے ہیں

ساتواں سبب: قرآن، تمام علوم کی اصل ہے، علم کلام تو تمام قرآن میں ہے، علم فقہ تمام کی تمام قرآن سے ماخوذ ہے یہی معاملہ اصول فقہ، علم نحو، لغت، علم زہد، آخرت کا علم اور مکارم اخلاق کا ہے۔

جس نے ہماری کتاب دلائل الاعجاز کا مطالعہ کیا اس پر آشکار ہوگا کہ قرآن تمام اقسامِ فصاحت میں آخری درجہ پر فائز ہے۔

اعجازِ قرآن کا طریق ثانی

قرآن، فصاحت میں حدِ اعجاز پہ ہے یا حدِ اعجاز پر نہیں، اگر اول صورت ہے تو معجز اور اگر دوسری صورت ہے تو ایسی حالت میں اس سے معارضہ ممکن، لیکن معارضہ ممکن اور اس کے اسباب و دواعی بھی کثیر ہونے کے باوجود فصحاء کا معارضہ نہ کرنا یہ بھی خلافِ عادت ہے تو اس سے بھی اس کا معجز ہونا ثابت، تو واضح ہوا قرآن تمام وجوہ کی بنا پر معجز ہے اور یہ طریق ہمارے ہاں صواب کے اقرب ہے

دوسرا مسئلہ: نَزَّلْنَا لانے کی حکمت

نَزَّلْنَا، فرمایا جو تنزیل سے ہے نہ کہ انزال سے کیونکہ مراد بتدریج نزول ہے اس جگہ مناسب لفظ یہی تھا اس لیے کہ مخالفین کہتے تھے اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے اور لوگوں کے کلام کے مخالف ہے تو اس طرح تھوڑا تھوڑا، سورت سورت حسب حوادثات و واقعات اور اس طریقہ پر نازل نہ ہوتا جس پر ہم خطباء اور شعراء کو پاتے ہیں کہ جیسے جیسے نئے حالات اور مختلف ضروریات سامنے آتے ہیں وہ وقتاً فوقتاً متفرق طور پر کچھ نہ کچھ کہتے ہیں یہی وجہ ہے شاعر کا دیوان شعری بیک وقت سامنے نہیں

آجاتا، اسی طرح خط وکتابت والوں کے خطوط وخطبات فی الفور ظہور پذیر نہیں ہوتے، اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔تو وہ اسے تمام طریقوں کے مخالف طریق پر نازل کرتا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اور کفار نے کہا قرآن ان پر ایک ساتھ کیوں نہ اتارا

(پ۱۹، الفرقان:۳۲)

اللہ تعالیٰ نے یہاں قرآن کا معجز ہونا بیان کیا اور ساتھ شبہات کا ازالہ بھی کر دیا، تفصیل یوں ہے کہ تدریجاً نازل ہونے والا قرآن جنس مقدورات بشر میں سے ہے یا نہیں؟ اگر اول صورت ہے تو فصحاء پر تدریجاً اس کی مثل یا اس کے قریب لانا لازم اور اگر دوسری صورت ہے کہ وہ مقدورِ بشر سے نہیں تو تدریجاً نزول کے باوجود وہ معجز ہی ٹھہرے گا۔

عبدنا، کی قرأت عبادُنا بھی ہے، مراد ذات رسول ﷺ اور آپ کی امت ہے۔

تیسرا مسئلہ: السورۃ کا مفہوم قرآن کا حصہ

اگر اس کا واؤ اصلی ہے تو یہ نام ''سور المدنیة'' (شہر کی دیوار) سے ہے کیونکہ جس طرح دیوار شہر کا احاطہ کرتی ہے سورہ بھی قرآن کا محدود حصہ ہوتی ہے یا جس طرح دیوار اشیاء شہر کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سورہ بھی متعدد فنون علمی پر محیط ہوتی ہے۔

یا سورہ بمعنی رتبہ سے مشتق ہے۔سورۃ، منازل و مراتب کی مانند ہے جن پر قاری کو بلندی وارتقا نصیب ہوتا اور یہ بھی طوال، اوساط اور قصار ہوتیں ہیں یا رفعت شان اور دین میں جلالت مقام کی وجہ سے ہے۔

اگر واؤ اصلی نہیں بلکہ ہمزہ سے بدلا ہے تو اس کا معنی ٹکڑا ہے، قرآن کا حصہ، یہ شئ کا بقیہ اور اس سے زائد کو کہا جاتا ہے۔

سورتوں میں تقسیم اور ٹکڑے بنانے کا فائدہ

سوال: قرآن کو سورتوں میں تقسیم اور ٹکڑے بنانے کا کیا فائدہ؟

جواب: چند فوائد ہیں

۱۔ وہی فائدہ ہے جس کیلئے مصنفین اپنی کتب کو ابواب وحصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۲۔ جب جنس کے تحت انواع ہوں تو ہر نوع کے افراد دوسروں سے احسن ہوں گے۔

۳۔ جب قاری کوئی سورہ یا باب ختم کر کے دوسرے میں شروع ہوگا تو اسے خوب خوشی ملے گی اور اس کا حصول بہتر ہوگا بخلاف اس کے کہ کتاب طویل ہو مثلاً مسافر جب جان لیتا ہے کہ میں نے میل اور فرسخ طے کر لیا تو اس کیلئے سفر اور آسان ہو جاتا ہے

۴۔ جب حفظ کرنیوالا سورہ حفظ کرے گا وہ محسوس کرے گا میں نے کتاب اللہ سے ایک مستقل حصہ پالیا ہے اپنے اندر وہ عزت اور وہ قابل رشک محسوس کرے گا، یہی وجہ ہے کہ نماز میں سورتِ تامہ کی قرأت افضل ہے۔

چوتھا مسئلہ: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کی تفسیر

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ قرآن اور اس کے سورتوں کی ترتیب، اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ طریق پر ہی ہے بخلاف کثیر محدثین کے ان کا قول ہے کہ قرآن کی یہ ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ چیلنج کہیں ایک سورہ کا ہے اور کہیں تمام قرآن کا۔

پانچواں مسئلہ: قرآنی چیلنج کی چند صورتیں

۱۔ ارشاد ہوتا ہے

فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (پ ۲۰، القصص:۴۹)

اللہ کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو

۲۔ فرمانِ الٰہی ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (پ ۱۵، الاسراء:۸۸)

تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کی مثل نہ لاسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار ہو

۳۔ فرمایا:

فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (پ ۱۲، ہود:۱۳)

تم فرماؤ ایسی بنائی ہوئی دس سورتیں لے آؤ

۴۔ فرمایا:

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

ایک سورۃ اس کی مثل لا کر دکھاؤ

اس کی نظیر یوں ہے کہ کوئی شخص اپنے ساتھی کو تصنیف کا چیلنج کرے، اس کی مثل لے آ، اس کے نصف، چوتھائی یا اس کے ایک حصہ کی مانند ہی لکھ لا یہ چیلنج اور ازالہ عذر کی انتہا اور آخری درجہ ہے۔

سوال: ارشادِ الٰہی فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، سورۃ الکوثر، سورۃ العصر اور سورہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کو شامل ہے۔ اور ہم بداہۃً یہ

جانتے ہیں ان کی مثل یا ان کے قریب ممکن ہے، اگر تم جواباً کہو کہ ان سورتوں کی مثل انسانی طاقت وقدرت سے خارج ہے تو یہ مکابرہ، (میں نہ مانوں) ہے اور ایسے مکابرات پر ڈٹ جانا دین پر تہمت کا ذریعہ ہے۔

جواب: اس وجہ سے ہم نے دوسرا طریق اختیار کیا تو ہم کہتے ہیں اگر یہ سورہ فصاحت میں حد اعجاز پر ہے تو مقصود حاصل اور اگر معاملہ یوں نہیں تو قرآن کی تردید پر شدید دواعی واسباب کے باوجود ان کا معارضہ سے رک جانا معجز بنتا ہے تو دونوں صورتوں میں قرآن کا معجز ہونا ثابت ہو جائے گا۔

چھٹا مسئلہ: مِنْ مِّثْلِهٖ کی ضمیر

مثلہ، کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے اس میں دو صورتیں ہیں۔

۱۔ یہ "مما نزلنا علی عبدنا" میں 'ما' کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم ایسی سورہ لاؤ جو فصاحت وحسنِ نظم میں اس کی مثل ہو۔

۲۔ یہ عبدنا کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی وہ آدمی سورہ لائے جو ہمارے عبد کی طرح بشر امی ہو، نہ اس نے کتاب پڑھی اور نہ علماء سے سیکھا

اول حضرت عمر، ابن مسعود، ابن عباس، حسن رضی اللہ عنہم اور اکثر محققین سے مروی ہے اور اسکی ترجیح پر یہ دلائل ہیں۔

۱۔ یہ باقی ان آیات کے مطابق ہے جو باب چیلنج میں وارد ہیں خصوصاً جو سورۂ یونس میں ہے:

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (پ ۱۱، یونس ۳۸) ایک سورت اس کی مثل لے آؤ

۲۔ بحث نازل شدہ میں ہے، اسی لیے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا اور اگر تم شک میں جو ہم نے نازل کیا

تو ضمیر کا اسی طرف لوٹنا ضروری ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ معنی یہ ہے اگر تم قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کرنے میں شک کرتے ہو تو اسکی مثل لے آؤ اور اگر ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹتی ہے تو یوں کہا جاتا اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ نزولِ قرآن میں شک کرتے ہو تو ان کی مثل قرآن سے لاؤ۔

۳۔ اگر ضمیر قرآن کی طرف ہوتی تو اس کا تقاضا ہوگا کہ وہ قرآن کی مثل سے عاجز ہیں خواہ اجتماعی یا انفرادی ہو خواہ وہ امی ہوں یا عالم فاضل۔ اور اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو تو اس کا تقاضا یہ نہ ہوگا البتہ یہ کہ عاجزین میں سے کوئی ایک امی ہو کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل واحد شخص امی ہی ہو سکتا ہے اور اگر وہ جمع ہو جائیں اور وہ عالم ہوں تو یہ مثل محمد نہ ہوں گے کیونکہ جماعت مثل واحد نہیں ہوا کرتی اور قاری وعالم، امی کی مثل نہیں ہوتا تو اب صورت اول میں اعجاز بلاشبہ اقویٰ ہے۔

۴۔ اگر ہم ضمیر قرآن کی طرف لوٹائیں تو اس کا معجز ہونا فصاحت میں کمال شان کی وجہ سے ہوگا اور اگر ہم اسے حضور ﷺ کی طرف لوٹائیں تو قرآن کا معجز ہونا تب کامل ہوگا جب آپ ﷺ کا اُمی اور علم سے دور ہونا ثابت ہوگا، اگرچہ یہ بھی اعجاز ہے مگر اس کا اتمام تب ہوتا ہے جب حضور ﷺ میں ایک نقص وکمی مانی جائے، تو اول صورت ہی اولیٰ ہے۔

۵۔ اگر ہم ضمیر حضرت محمد ﷺ کی طرف لوٹائیں تو اس سے یہ وہم پیدا ہوسکتا ہے کہ جو حضور کی طرح امی نہیں اس سے مثل قرآن کا صدور ہوسکتا ہے۔ اگر ہم قرآن کی طرف رکھیں تو اس میں یہ دلالت ہوگی کہ اُمی وغیر اُمی دونوں سے صدورِ مثل قرآن محال ہے لہٰذا یہی صورت اولیٰ ہوگی۔

ساتواں مسئلہ: شہداء سے مراد دو صورتیں

شہداء سے مراد دو صورتیں ہیں:

۱۔ مراد بُت ہیں، جن میں وہ الوہیت کا دعویٰ رکھتے تھے گویا ان سے کہا جارہا ہے اگر معاملہ یوں ہے جو تم کہتے ہو کہ یہ عبادت کے مستحق ہیں کیونکہ یہ نفع ونقصان دیتے ہیں تو تم حضور ﷺ کے ساتھ تنازعہ میں کس قدر حاجت شدید اور پریشانی میں ہو تو اس سے جلدی خلاصی کیلئے ان سے مدد طلب کرو اور اگر وہ مدد نہیں کرتے تو جان لو تم ان کے الٰہ ونافع اور ضار ہونے کا باطل دعویٰ رکھتے ہو۔

تو اب کلام سے دو طرح حجت ہوگی:

۱۔ ان کے الٰہ ہونے کا ابطال۔

۲۔ اعجازِ قرآن کے انکار کا ابطال اور اس قول کا ابطال کہ یہ قرآن گھڑتے ہیں۔

۲۔ شہدا سے مراد ان کے اکابر اور انکار محمدی میں ان کے موافقین ہیں، مفہوم یہ ہوگا۔ اپنے اکابرین اور رؤساء کو بلاؤ تاکہ وہ معارضہ قرآن میں تمہاری مدد کریں اور وہ تمہارے حق میں یا خلاف فیصلہ کرسکیں کہ کیا ممکن ہے اور کیا متعذر ہے۔

سوال: کیا لفظ شہداء کو بیک وقت دونوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا دشوار ہے تو ان میں کونسی صورت اولیٰ ہے؟

جواب: اول صورت ممکن ہے کیونکہ شہداء، شہید بمعنی حاضر وگواہ کی جمع ہے لہٰذا اس سے معین وناصر مجازاً مراد لیا جاسکتا ہے۔ ان کے بت اور ان کے اکابرین اس میں مشترک ہیں کہ وہ ان کے معاونین وانصار ہیں، جب ہم لفظ کو اس مفہوم مشترکہ پر محمول کریں گے تو تمام ہی اس میں داخل ہوجائیں گے۔

رہی دوسری صورت تو اس میں اکابر پر حمل اولیٰ ہے اس لیے کہ لفظ شہداء کا اطلاق ظاہراً اسی پر ہوتا ہے جو واقعہ دیکھے اور شاہد

وگواہ بن سکے اور یہ بات صرف ان کے اکابرین میں ہی پائی جاتی ہے، اگر ہم اسے بتوں پر محمول کریں تو شہداء کا اطلاق ان پر بطور مجاز ہوگا۔ یایوں کہا جائے بلاؤ جنہیں تم اپنے شہداء مانتے ہولیکن مقدر ماننا خلاف اصل ہے۔

اگر ہم اول صورت لیں تو کلام درست کیونکہ معنی یہ ہوگا بلاؤ تم جو تمہاری گواہی دے کیونکہ انکار پہ تمہارا اتفاق ہے، مذہب پر متفق لوگ موافقت کی وجہ سے ایک دوسرے کے گواہ بن جاتے ہیں تو اب شھداء کم کی اضافت درست ہوگی اور اس لیے بھی کہ عرب میں فصاحت میں تنازعہ کرنے والوں پر کچھ اکابر تھے جو فیصلہ کرتے کہ ان میں اعلیٰ کون ہے جب یہ ثابت ہے تو کلام کو حقیقت پر محمول کرنا مجاز پر حمل سے اولیٰ ہے۔

آٹھواں مسئلہ: لفظ دون کا معنی

دون، شی کا ادنیٰ مقام، الشئ الدون (حقیر گھٹیا) جب کتب کو جمع کیا جائے تو 'دون الکتب' کہا جاتا ہے کیونکہ شی کو جمع کرنا اسے ایک دوسرے کے قریب کرنا ہے، جب کسی کا درجہ تھوڑا کم ہو تو کہا جاتا ہے ''ھذا دون ذلك دونك ھذا'' اس کا اصل 'خذہ من دونك' ہے یعنی جو تیری جگہ کے قریب ہے تو نے اسے مختصر کر دیا ہے پھر یہ لفظ تفاوت احوال کیلئے بطور مجاز استعمال ہونے لگا۔ مثلاً ''زید دون عمرو فی الشرف والعلم'' (زید شرف وعلم میں عمرو سے کم ہے) پھر اس میں وسعت ہوئی اور ہر اس میں استعمال ہونے لگا جو ایک حد سے دوسری حد تک تجاوز کر جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ نہ بنائیں مومن دوست کافروں کو سوائے مومنوں کے

(پ۳، آل عمران:۲۸)

یعنی مومنین کی دوستی، کافروں کی دوستی کی طرف تجاوز نہ کرے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا متعلق کون

سوال: من دون اللہ کا متعلق کون ہے؟

جواب: اس کے تعلق کی دوصورتیں ہیں۔

۱۔ اس کا متعلق شھداء کم ہے اور اس میں دو احتمال ہیں:

۱۔ معنی یہ ہوا کہ بلاؤ انہیں جنہیں تم نے خدا کے علاوہ الٰہ بنا رکھا ہے اور تم یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ وہ روز قیامت تمہارے حق میں گواہی دیں گے کہ تم حق پر تھے۔

اس طرح انہیں خوب ذلیل کرنا ہے کہ فصیح و معجز قرآن کے مقابل اس جماد و پتھر کو لا ؤ جو بولنے پر قادر نہیں۔

۲۔ اُدْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور اہلِ ایمان کے علاوہ کو بلاؤ تا کہ وہ گواہی دیں کہ تم اس کی مثل لا سکتے ہو، اس میں نرمی اور اشارہ ہے کہ ان کے شہداء جو فصاحت کے شہسوار ہیں ان کی طبائع سلیمہ کبھی بھی جھوٹی شہادت پر تیار و راضی نہ ہوں گی۔

۲۔ اس کا متعلق ،اُدْعُوْا، ہے معنی یہ ہے کہ بلاؤ تم اللہ کے علاوہ گواہ یعنی تم اللہ کی شہادت پیش کرتے ہوئے تم یہ نہیں کہہ سکتے۔اللہ گواہ ہے ہمارا دعویٰ حق ہے جیسا کہ اپنے دعویٰ کی صحت پر گواہی لانے سے عاجز آدمی کہتا ہے، تم لوگوں میں سے ایسے گواہ لاؤ جن کی شہادت سے حکام کے ہاں دعادی ثابت ہوتے ہیں یہ ان کے عجز وانقطاع کا بیان ہے کہ اب ان کے پاس یہ بات بھی باقی نہیں رہی کہ وہ کہہ سکیں ،اللّٰه يشهد انا لصادقون۔ (اللہ گواہ ہم سچے ہیں)

نواں مسئلہ: قول جبر کا بطلان

قاضی کہتے ہیں یہ تحدی و چیلنج قول جبر کو کئی وجوہ سے باطل قرار دے رہا ہے۔

۱۔ یہ اس پر مبنی ہے کہ مثل قرآن اس سے متعذر ہے جس سے فعل کا صدور درست ہے، جو عبد کے فاعل ہونے کی نفی کرتا ہے اس کیلئے اثباتِ تحدی اصلاً ممکن نہیں اور اس قول میں قرآن کے معجز ہونے پر استدلال باطل ٹھہرے گا۔

۲۔ قرآنی مثل کا متعذر رہونا، جبریہ کے قول کے مطابق قدرت موجبہ کے فقدان کی وجہ سے ہوگا۔اور اس میں کسی کا معجز ہونا اور معجز نہ ہونا برابر ہے لہٰذا جبریہ کے مطابق تحدی کا قول ہی درست نہیں۔

۳۔ جو کچھ بندے کا ہے اس کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے تو اللہ تعالیٰ کا بندوں کو چیلنج کرنا درحقیقت اپنے کو ہی چیلنج کرنا ہے حالا کہ وہ خود مثلِ قرآن پر بلاشبہ قادر ہے لہٰذا اس قول پر لازماً اعجاز کا ثبوت نہ ہوگا۔

۴۔ معجز ہونا بتا رہا ہے کہ یہ خلاف عادت و معمول ہے، جبریہ کا قول ہے کہ عادت بھی بندے کا فعل نہیں تو فرق نہ رہا۔ لہٰذا معجز کے ساتھ استدلال درست نہ ہوگا۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ نے بطور حجت فرمایا کہ قرآن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے میرے دعویٰ نبوت کی تصدیق کی ہے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو یہ اعجاز میں داخل نہ ہوتا حالانکہ جبریہ کے قول پر یہ فرق ہی نہیں کیونکہ وہاں عادی وغیر عادی افعال تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہیں۔

جواب: تحدی سے مطلوب، مخالف کا قصداً مثل لانا ہے یا اس سے اس کا اتفاقاً وقوع ہے، دوسری صورت باطل ہے کیونکہ اتفاقات، انسان کے بس میں نہیں تو اول صورت ثابت، جب معاملہ یوں ہے تو ثابت ہوا تحدی قبول کرنا اس پر موقوف ہے کہ انسان کے دل میں اس کا قصد ہوگا، اب یہ قصد اگر انسان سے ہی ہے تو تسلسل لازم جو محال اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو لزومِ جبر، اور جو اعتراضات انہوں نے اٹھائے وہ تمام ان پر وارد ہوں گے اور ان کی تمام گفتگو باطل ٹھہرے گی۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا کی تفسیر

یہ آیت مبارکہ قرآنی اعجاز پر چار وجہ سے شاہد ہے

پہلی وجہ: تواتر سے ثابت ہے کہ عرب رسول اللہ ﷺ سے انتہائی عداوت اور آپ کے معاملہ کو باطل قرار دینے میں انتہائی حریص تھے کیونکہ ان کا وطن و خاندان چھوڑنا اور مال و جان خرچ کرنا اس پر اقوی دلیل ہے پھر اس کے ساتھ ٹھونک بجا کر یہ اعلان ملایا جائے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا
اور اگر تم نہ لا سکے اور تم ہرگز نہ لا سکو گے

تو اگر ان کی طاقت و قدرت میں قرآنی مثل یا اس کی سورہ کی مثل لانا ممکن ہوتا تو ضرور لے آتے جب وہ نہ لائے تو قرآن کا معجز ہونا واضح ہوگیا۔

۲۔ حضرت محمد ﷺ ان کے ہاں اگرچہ معاملہ نبوت میں متہم تھے لیکن وفورِ عقل و فضل اور معرفت فہم معاملات میں آپ ﷺ ان کے ہاں معروف و مسلم تھے، اگر آپ کے دعویٰ نبوت میں اتہام کا خطرہ لاحق ہوتا تو کبھی بھی آپ اس قدر انتہائی درجہ کا چیلنج انہیں نہ کرتے بلکہ تمام امور پر آنے والی ذلت و رسوائی پر خائف و پریشان ہوتے، تو آپ ﷺ ایسا کہنے سے بچتے، اگر آپ ﷺ کو ان کی معارضہ سے عاجزی اور حالتِ اضطراری کی معرفت نہ ہوتی تو اس انتہائی درجہ کا چیلنج آپ ہرگز نہ کرتے

۳۔ اگر حضور ﷺ کو اپنی صحتِ نبوت کا یقین نہ ہوتا تو اس قدر یقینی خبر نہ دیتے کہ یہ قرآن کی مثل لا ہی نہیں سکتے کیونکہ اگر آپ کو صحتِ نبوت کا قطعی علم نہ ہوتا تو اس کے خلاف کا جواز و امکان تھا، وقوعِ مخالف کی صورت میں آپ ﷺ کا کذب سامنے آ جاتا، جھوٹا اور بات گھڑنے والا کبھی بھی کلام میں قطعیت اور جزم کا اظہار نہیں کر سکتا، جب آپ ﷺ نے جزم و یقین کا اظہار کیا تو اس سے واضح ہوگیا کہ آپ اپنے معاملہ میں قطعی یقین رکھتے ہیں۔

۴۔ اس خبر کا وقوع بھی اسی بیان کے مطابق ہوا کیونکہ حضور ﷺ کی ظاہری حیات سے لے کر ہمارے دور تک کوئی وقت دین اور اسلام کے مخالفین سے خالی نہیں رہا اور اس معارضہ کے اسباب و دواعی بھی شدید رہے، حرص شدید کے باوجود کبھی معارضہ نہ ہوا

یہ آیت مبارکہ ان چار وجوہ پر مشتمل ہے جو قرآن کے معجز ہونے پہ دال ہیں، اس میں ان جہال کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کتاب اللہ حجت واستدلال پر مشتمل ہی نہیں۔

چند سوالات

یہاں چند سوالات ہیں

پہلا سوال: ان سے سورۃ لانے کی نفی لازم ہے تو کیوں نہ 'اِذَا' لایا گیا جو وجوب پہ دال ہے بخلاف اِنۡ یہ تو شک کیلئے آتا ہے؟

جواب: دو طرح پر ہے۔

۱۔ یہاں گفتگو ان کے گمان کے مطابق ہے وہ اپنی فصاحت اور قدرتِ کلام پر بھروسہ کی وجہ سے ابھی تک معارضہ۔ عاجزی کا جزم ویقین نہیں رکھتے تھے۔

۲۔ یہ ان کی تذلیل ہے جیسے کوئی مقابل پہ غالب وقوی ہو اور کہے اگر میں تجھ پر غالب آ جاؤں حالانکہ وہ اپنا غلبہ جانتا ہے تو ایسا ذلیل کرنے کیلئے کہہ رہا ہے۔

دوسرا سوال: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا، فرمایا کیوں نہ فَاِنۡ لَمۡ تَاۡتُوۡا بِہٖ فرمایا؟

جواب: یہ جملہ "فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِنۡ مِّثۡلِہٖ وَلَنۡ تَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِنۡ مِّثۡلِہٖ" سے مختصر ہے۔

تیسرا سوال: وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا، کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ معترضہ ہے لہٰذا اس کا کوئی محل نہیں۔

چوتھا سوال: باب نفی میں لفظ 'لَنۡ' کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: لَا اور لَنۡ 'نفی مستقبل میں بھائی ہیں البتہ 'لن' میں تاکید وتشدید ہے مثلاً دوست سے کہو میں تمہارے پاس کل نہیں ٹھہروں گا اگر وہ نہ مانے تو تم کہو گے لَنۡ اقیم غدا (میں ہرگز نہیں ٹھہروں گا)

لَنۡ میں تین اقوال

کلمہ لن میں تین اقوال ہیں

۱۔ اس کا اصل لَا اَنۡ ہے، شیخ خلیل کا یہی قول ہے۔

۲۔ اصل 'لَا' ہے الف، نون سے بدل گیا ہے، شیخ فراء کا یہی قول ہے۔

۳۔ یہ حرف ناصبہ ہے، نفی مستقبل میں تاکید کیلئے آتا ہے، شیخ سیبویہ کا یہی قول ہے، خلیل سے بھی ایک روایت یہی ہے۔

پانچواں سوال: ان کے مثلِ سورت لانے کی نفی کو آگ سے بچنے کے ساتھ مشروط کرنے کا کیا معنی؟

جواب: جب معارضہ سے ان کا عجز ظاہر ہوا تو ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کا صدق آشکار ہو گیا، جب ان کے ہاں آپ کا معاملہ صحیح ٹھہرا پھر انہوں نے عناد رکھا جس کی وجہ سے وہ مستحق عذاب نار ٹھہرے تو نار سے بچنا، ترکِ عناد کا موجب ٹھہرا، یعنی موثر کو اثر کا نام دیا یعنی ''فَاتَّقُوا النَّارَ'' (آگ سے بچو) کو ''عناد ترک کرو'' کے قائم مقام رکھ دیا ہے۔

یہ ایجاز ہے جو فنِ بلاغت سے تعلق رکھتا ہے، اس میں خالت عناد کی شناعت وہول کا بھی اظہار ہے کہ اتقاءِ نار (آگ سے بچنا) کو اس کے قائم بنایا تو پھر نار کی صفت وحالت کا تذکرہ کیا۔

چھٹا سوال: وقود سے کیا مراد ہے؟

جواب: ایندھن، جس سے آگ جلائی جائے، مصدر کی صورت میں ضمہ کبھی فتح بھی ہے، شیخ سیبویہ کہتے ہیں ہم نے عرب کو یہ کہتے سنا، وقدنا النار وقوداً عالیًا '' پھر کہا اکثر وقود ہے اور اس سے مراد لکڑی ہے۔ شیخ عیسیٰ بن عمر نے تسمیہ مصدر قرار دیتے ہوئے اس پر ضمہ پڑھا۔ محاورہ ہے فلان فخر قومه وزين بلده (فلاں قوم کا فخر اور اپنے علاقہ کی زینت ہے)

ساتواں سوال: الذی، کے صلہ کا معلوم ہونا لازم ہوتا ہے لیکن انہیں کیسے معلوم کہ آخرت کی آگ میں لوگ اور پتھر جلائے جائیں گے؟

جواب: ممکن ہے پہلے انہوں نے اہلِ کتاب سے سن رکھا ہو یا رسول اللہ ﷺ سے یا اس آیت سے پہلے سورۂ تحریم میں ارشاد ہے:

نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (پ۲۸، التحریم:۶) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں

آٹھواں سوال: کیا وجہ سورۂ تحریم میں نار کو نکرہ اور یہاں معرفہ لایا گیا ہے؟

جواب: سورۂ تحریم کی آیت مکہ میں نازل ہوئی جس سے انہیں اس آگ مذکور کا علم ہو گیا پھر جب یہ مدینہ میں آئی تو معرفہ لایا تاکہ واضح ہو جائے کہ معلوم آگ ہی مراد ہے۔

نواں سوال: ''وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ'' کا کیا معنی ہے؟

جواب: یہ آگ دوسری آگ سے جدا وممتاز ہے یہ تو لوگوں اور پتھر سے جلتی ہے یہ چیز دو طرح اس کی قوت پر دال ہے:

ا۔ جب لوگ باقی آگوں میں کسی کو جلاتے ہیں یا پتھر کو گرم کرتے ہیں تو پہلے کسی ایندھن سے آگ جلاتے ہیں اور اس شی کو جلانے کیلئے پھینکتے ہیں یہ آگ (اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا صدقہ اس سے ہمیں اپنی پناہ میں لے لے) تو جل ہی اس سے رہی ہے جس کا جلانا ہے۔ یعنی انسان ایندھن بنے گا۔

۲۔ شدید گرمی جو پتھر کو پگھلادے۔

دسواں سوال: کیوں الناس کو پتھر کے ساتھ لایا اور پتھر کو ان کے ساتھ ایندھن بنایا؟

جواب: کفار نے اپنے کو دنیا میں پتھروں کے ساتھ یوں ملایا انہیں بُت تراشا، انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا اور ان کی عبادت و پرستش کی۔ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ — تم اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو

(پ۱۷ ، الانبیاء:۹۸)

مذکور آیت اس کی تفسیر بن رہی ہے کیونکہ اس میں ''دون اللّٰہ۔ الناس اور حجارہ کے معنی میں اور حصب جہنم، وقود کے معنیٰ میں ہے۔

جب کفار نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ پتھروں کو اپنا معبود بنایا اور مانا کہ یہ ہمارے شفیع اور شہداء ہوں گے اور یہ ہمیں اپنی شفاعت کے ذریعے چھڑالیں گے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہی عذاب بنادیا اور یہ ہی ان کیلئے جہنم میں آگ بن گئے تاکہ ان کی حسرت وافسوس میں خوب اضافہ ہو۔

اسی کی مثل کفار کا وہ معاملہ ہے کہ انہوں نے سونا چاندی بخل کرتے ہوئے جمع کیا۔اس کے حقوق ادا نہ کیے تو اس دن انہیں پگھلاکر ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔

بعض نے حجارہ سے مراد کبریت لیا لیکن یہ بلادلیل تخصیص ہے بلکہ اس میں فساد بھی ہے۔کیونکہ یہاں مقصد آگ کی عظمت اور بڑائی ہے اور حجارہ کبریت کا جلنا تو امر عادی ہے تو کبریت کے ساتھ جلنا قوت نار پر دال نہ ہوگا، اگر ہم اسے باقی پتھروں پر ہی محمول کریں تو اب آگ کا معاملہ بڑھا ہوا ہوگا کیونکہ باقی پتھر آگ کو ٹھنڈا کرتے ہیں گویا فرمایا: وہ آگ اپنی قوت میں اس درجہ ہوگی ابتداءً ہی وہ ان پتھروں کو جلائے گی جو نارِ دنیا کو بجھادیتے ہیں۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ، کے الفاظ بتارہا ہے کہ یہ مذکورہ آگ کفار کیلئے تیار ہے، لیکن یہاں ایسی کوئی چیز نہیں جو یہ بتائے کہ وہاں کوئی دوسری آگ ہوگی جو مسلمان فاسقوں کیلئے ہوگی

آخرت پر گفتگو

[۲۵] وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ
فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

(اور خوشخبری دو ان کو جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل دیا جائے گا کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کیلئے ان باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے)

آیت کا ربط

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے توحید ورسالت کے بارے میں کلام فرمایا، ان دونوں کے بعد اب آخرت کی تفصیل، کافر پر عتاب اور مطیع کا ثواب بیان کیا، اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جب وہ کسی آیت میں وعید وعذاب بیان فرماتا ہے تو اس کے بعد آیت وعدو بشارت بھی لاتا ہے۔

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: حشر ونشر کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر صحتِ دین کا مدار ہے، اس مسئلہ میں بحث، اس کے امکان کے حوالہ سے ہے یا اس کے وقوع میں، اس کا امکان تو عقل ونقل دونوں ثابت ہے، رہا وقوع تو وہ فقط نقل وشرع پر موقوف ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اپنی کتاب میں ذکر کیا اور کئی وجہ سے حق واضح کیا۔

پہلی وجہ: بہت سے مقامات پر حشر ونشر کے بارے میں منکرین کا انکار نقل کیا اور اللہ تعالیٰ نے بغیر دلیل کے فرمایا اس کا وقوع یقینی وقطعی ہے اور یہ طریق اس لیے جائز ہے کہ جو چیز صحتِ نبوت رسول ﷺ پر موقوف نہیں اسے دلیل نقلی سے ثابت کرنا ممکن ہے اور یہ مسئلہ اسی طرح کا ہے لہٰذا اس کا اثبات نقل سے جائز ہے، اس کی مثال یوں دیکھو۔ فرمایا نار، کفار کیلئے اور جنت، ابرار

کیلئے ہے اور اس پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی لہٰذا دعویٰ پر اکتفا کرلیا۔

رہا اثباتِ صانع اور اثباتِ نبوت تو یہاں فقط دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس پر دلیل بھی ذکر کی۔ وجہ فرق وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی، سورۃ النحل میں فرمایا:

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ‌ۙ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ‌ؕ بَلٰى وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (پ۱۴، النحل:۳۸)

اور یہ لوگ بڑے سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جائے اللہ اسے اُٹھائے گا نہیں، کیوں نہیں اس کا سچا وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے

سورۃ التغابن میں فرمایا:

زَعَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ يُّبۡعَثُوۡا‌ ؕ قُلۡ بَلٰى وَرَبِّىۡ لَـتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَـتُنَـبَّـؤُنَّ بِمَا عَمِلۡتُمۡ‌ؕ (پ۲۸، التغابن:۷)

کافر کہتے ہیں کہ وہ ہرگز نہیں اٹھائیں جائیں گے فرمایئے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے پھر تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں بتایا جائے گا

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے امکانِ حشر و نشر کو اس بناپر ثابت کیا کہ وہ ایسے اُمور پر قادر ہے جو حشر و نشر کے مثل و مشابہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ کئی وجوہ سے بیان کیا ہے، سب سے جامع طریق سورۃ الواقعہ میں ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا اصحاب شمال کہتے ہیں

اَئِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ (پ۲۷، الواقعۃ:۴۷-۴۸)

کیا جب ہم مر جائیں اور ہڈیاں مٹی ہو جائیں تو کیا ضرور ہم اٹھائے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی

اس کے جواب میں فرمایا

قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِيۡنَ وَالۡاٰخِرِيۡنَ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ اِلٰى مِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ (پ۲۷، الواقعۃ:۴۹-۵۰)

تم فرماؤ یقیناً اکٹھے کیے جائیں گے اگلے اور پچھلے ایک جانے ہوئے دن کی میعاد پر۔

امکانِ قیامت پر چار اُمور سے استدلال

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے امکان پہ چار اُمور سے استدلال فرمایا:

۱۔ ارشاد فرمایا:

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ (پ۲۷، الواقعہ:۵۸،۵۹)

تو بھلا دیکھو تم جو منی گراتے ہیں کیا تم اس کا آدمی بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں؟

وجہ استدلال یوں ہے، منی ہضم کے فضلہ سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اطراف اعضاء میں ہلکے پیدا ہونے والے ذرات کی طرح ہے اسی وجہ سے جماع سے تمام اعضاء لذت پاتے ہیں کیونکہ اس سے سب کو کشادگی وانحلال ملتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ قوت شہوت کو بقیہ پر مسلط فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ تمام اجزاء طلبیہ کو جمع کرتی ہے۔ حاصل یہ کہ وہ اجزا بہت زیادہ متفرق تھے۔ اولاً اطراف عالم میں پھر انہیں اللہ تعالیٰ نے اس حیوان کے بدن میں جمع کیا جو اس حیوان کے اجزا میں متفرق تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے برتن منی میں جمع کر دیا پھر اسے اللہ تعالیٰ نے قرار رحم کی طرف ماء دافق کی شکل میں نکالا، جب یہ اجزا متفرقہ جمع ہوئے تو شخص بنا، جب یہ موت سے بکھر جائیں گے تو انہیں دوبارہ جمع کرنا کیوں محال ہوگا؟ اس دلیل کی تشریح یہی ہے اور اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں متعدد جگہ کیا ہے، سورۃ الحج میں فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ (پ۱۷، الحج:۵،۷)

اے لوگو اگر تم دوبارہ جی اٹھنے میں شک کرتے ہو تو ہم نے تمہیں مٹی سے بنایا ہے

سورۃ المومنون میں مراتب خلقت کے بعد فرمایا:

ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (پ۱۸، المومنون:۱۵،۱۶)

پھر تم اس کے بعد ضرور مرنے والے ہو اور پھر تم سب قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اور سورۃ لَآ اُقْسِمُ میں فرمایا:

اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی (پ۲۹، القیامۃ:۳۷،۳۸)

کیا وہ ایک بوند نہ تھا اس منی کا کہ گرائی جائے پھر خون کی پھٹک ہوا تو اس نے پیدا فرمایا اور پھر ٹھیک کیا

سورۃ الطارق میں فرمایا:

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یَّخْرُجُ (پ۳۰، الطارق:۵،۸)

آدمی کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ٹپکتے ہوئے پانی سے

۲۔ ارشاد فرمایا:

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (پ۲۷، الواقعہ:۶۳،۶۷)

یہ بتاؤ جو تم بوتے ہو کیا اسے اگاتے تم ہو یا ہم اگانے والے ہیں

وجہ استدلال کچھ یوں ہے، دانہ اور اس کی اقسام، طویل، ان میں شق ہوتا ہے مثلاً چاول اور جو۔ گول، مثلث، مربع اور اس کی مختلف اشکال ہیں، جب اس کا وقوع تر زمین میں ہو پانی و مٹی کا غلبہ ہوتو نظر عقل میں ضروری ہے کہ وہ متعفن و فاسد وخراب ہو جائے کیونکہ ان میں سے ہر ایک حصولِ تعفن کا سبب ہے اور دونوں کے اجتماع کی صورت میں بطریق اولیٰ ایسا ہوگا، جب وہ فاسد نہیں ہوتا بلکہ محفوظ رہتا ہے تو جیسے ہی رطوبت بڑھے گی تو دانہ دو حصوں میں ہو جائے گا اور اس سے دو ورق نکلیں گے، اگر دانہ مطول ہے تو اس کے سر میں سوراخ ہوگا اور اس سے طویل ورق نکلے گا جیسا کہ کھیتی میں مشاہدہ ہے۔

گٹھلی میں بہت سختی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگ اس کے پھاڑنے سے عاجز ہوتے ہیں جب تر زمین میں دبتی ہے تو اللہ کے حکم سے پھٹ جاتی ہے، کھجور کی گٹھلی اپنی پشت کے نقرہ سے پھٹتی ہے تو اس کا مجموع دو نصف ہو جاتا ہے تو ایک نصف سے جز صاعد نکلتا ہے دوسرے سے جز ہابطہ، صاعد اوپر چلا جاتا ہے اور ہابط، زمین کی گہرائی میں، حاصل یہ کہ چھوٹی سی گٹھلی سے درخت نکلتے ہیں ان میں سے ایک خفیف و صاعد اور دوسرا ثقیل و ہابط حالانکہ عناصر ایک، گٹھلی، پانی ہوا و مٹی کی طبیعت ایک ہے تو کیا یہ قدرت کاملہ اور حکمت شاملہ پر شہادت نہیں تو ایسی قدرت والا مختار۔ اجزا کے جمع اور انہیں جوڑنے سے کیسے عاجز ہوگا؟ اس کی نظیر سورۃ الحج میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (پ۱۷، الحج:۵)

اور تو زمین دیکھے مرجھائی ہوئی پھر جب ہم نے اس پر پانی اُتارا تو تروتازہ ہوئی اور اُبھر آئی

۳۔ ارشادِ الٰہی ہے:

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ (پ۲۷، الواقعہ:۶۸،۶۹)

ذرا بتاؤ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے اُتارا یا ہم ہیں اتارنے والے

۱۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پانی طبعاً جسم ثقیل ہے، ثقیل کا اُوپر جانا خلافِ طبع معاملہ ہے۔ ضروری ہے کوئی ایسا قادر و قاہر ہو جو اس کی طبع کو ختم اور اس کی خصوصیت کو باطل کر دے اور نیچے آنے اور نزول کی شان والے کو صعود اور بلندی کی طرف لے جائے۔

۲۔ یہ ذرات مائیہ، متفرق ہونے کے بعد جمع ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ہوائیں انہیں لئے اڑتیں ہیں۔

۴۔ یہ ضرورت اور زمین کی خشکی کے مطابق نازل ہوتے ہیں۔

یہ تمام، جواز حشر و قیامت پر شاہد ہیں۔

۱۔ صعود ثقیل اس لیے کہ یہ تبدیلی طبیعت ہے، جب یہ جائز ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ حیات ورطوبت تراب و ماء سے ظاہر ہو؟

۲۔ جب ذراتِ مائیہ کے متفرق ہونے کے بعد ان کے جمع پر قادر ہے تو اجزاءِ ترابیہ کے متفرق ہونے کے بعد اس کا جمع کیوں ناجائز ہوگا؟

۳۔ ہواؤں کا چلنا، جب ان ہواؤں کے چلانے پر قادر ہے جو ہم جنس اجزاء کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتی ہیں تو یہاں یہ کیوں جائز نہیں؟

۴۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی حاجت کیلئے سحاب پیدا کیے تو یہاں مکلفین کو دوبارہ پیدا کرنے کی ضرورت بطریق اولیٰ ہے تا کہ وہ اپنے ثواب وعتاب کو حاصل کر سکیں۔

واضح رہے اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کو اپنی کتاب میں دوسری جگہ سورۃ الاعراف میں دلیل توحید کے طور پر ذکر کیا، فرمایا:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ — یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر استوا فرمایا (پ۸، الاعراف:۵۴)

اس کے بعد دلیل حشر ذکر کی:

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ — اور وہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے (پ۸، الاعراف:۵۷)

۴۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ — ذرا بتاؤ وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو اس کا درخت کیا تم نے پیدا کیا یا ہم ہیں پیدا کرنے والے (پ۲۷، الواقعہ:۷۱،۷۲)

وجہ استدلال یوں ہے، نار اُوپر جانے والی اور درخت نیچے جانے والا ہے، آگ لطیف، درخت کثیف، آگ نوری اور درخت ظلماتی، آگ گرم وخشک، درخت ٹھنڈا وتر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے درخت کے اندر اجزاء نورانیہ وناریہ روک کر اپنی قدرت سے ان اشیاء مخالفہ کو جمع کر رکھا ہے جب وہ اس سے عاجز نہیں تو حیوانات کی ترکیب وتالیف سے وہ کیسے عاجز ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰسین میں اس دلیل کو یوں بیان کیا:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا — جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی (پ۲۳، یٰسین:۸۰)

اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ماء اور آگ کا معاملہ ذکر کیا، لیکن سورۃ النحل میں ہوا کا ذکر کیا، فرمایا:

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (پ النمل: ۶۴)

یا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھاتا ہے یا وہ جو خلق کی ابتدا فرماتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا

سورۃ الحج میں زمین کا ذکر کیا:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً (پ۱۷ الحج: ۵)

اور تو زمین کو مرجھائی ہوئی دیکھے گا

گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: عناصر اربعہ تمام احوال میں امکانِ حشر ونشر پر شاہد ہیں

امکان حشر پر شاہد، دلائل کی دوسری نوع

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میں اولاً ایجاد پر قادر ہوں تو دوبارہ لوٹانے پر بطریق اولیٰ قادر ہوں گا، اس دلیل کی پختگی عقلاً ظاہر ہے۔

اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر کیا مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (پ۱ البقرۃ: ۲۸)

بھلا تم کیسے خدا کے منکر ہو گئے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں موت دے گا پھر زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے

سورۃ الاسراء میں فرمایا:

وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا قُلْ كُونُوا حِجَارَةً قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (پ۱۵ الاسراء: ۴۹، ۵۱)

اور بولے کیا ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیا سچ مچ نئے بن کر اٹھیں گے تم فرماؤ پتھر ہو جاؤ کہہ دیجئے وہی ہے جس نے پہلی مرتبہ پیدا فرمایا

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (پ۲۰ العنکبوت: ۱۹)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا اللہ کیونکر خلق کی ابتدا فرماتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا

سورۃ الروم میں ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَى (پ۲۱ الروم: ۲۷)

اور وہی ہے کہ اول بناتا ہے اور پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ تمہاری سمجھ میں اس پر زیادہ آسان ہونا چاہیے اسی کیلئے سب سے برتر شان ہے

سورۂ یٰسین میں فرمایا:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ (پ۲۳ یٰسین:۷۹) فرمادیجیے انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو بنایا۔

تیسری نوع: آسمانوں پر اس کی قدرت سے قدرت حشر پر استدلال

یہ استدلال متعدد آیات میں ہے، سورۃ الاسراء میں فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (پ۱۵ الاسراء:۹۹) اور کیا وہ نہیں دیکھتے وہ اللہ جس نے زمین اور آسمان بنائے ان لوگوں کی مثل بنا سکتا ہے

سورۂ یٰسین میں ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (پ۲۳ یٰسین:۸۱) اور کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے ان جیسے اور نہیں بنا سکتا کیوں نہیں وہی ہے پیدا کرنے والا اور جاننے والا

سورۂ احقاف میں ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (پ۲۶ الاحقاف:۳۳) کیا انہوں نے نہ جانا کہ وہ اللہ جس نے آسمان اور زمین بنائے اور ان کے بنانے میں نہ تھکا، قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے کیوں نہیں وہ یقیناً سب کچھ کر سکتا ہے۔

سورۂ ق میں فرمایا

أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا (پ۲۶، ق:۱۱) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا:

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (پ۲۶، ق:۱۵) تو کیا ہم پہلی بار بنا کر تھک گئے بلکہ وہ نئے بننے سے شبہ میں ہے

چوتھی نوع: ثواب وعذاب میں امتیاز

وقوع حشر پر یوں استدلال کہ نیک کیلئے ثواب، عاصی کیلئے عذاب اور دونوں میں امتیاز ہے، متعدد آیات میں ہے:

سورۂ یونس میں ہے

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعاً وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ (پ۱۱، یونس:۴)

اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے اللہ کا وعدہ سچا ہے بیشک وہ پہلی بار بناتا ہے پھر بنانے کے بعد دوبارہ بنائے گا کہ ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے

سورۂ طٰہٰ میں ہے

اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (پ۱۶، طہٰ:۱۵)

بیشک قیامت آنیوالی ہے اور قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں کہ ہر جان اپنی کوشش کا بدلہ پائے

سورۂ ص میں فرمایا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (پ۲۳، ص:۲۷،۲۸)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ درمیان ہے بیکار نہ بنایا یہ کافروں کا گمان ہے تو کافروں کی خرابی ہے آگ سے کیا ہم ایمان والوں اور اچھے کام کرنیوالوں کو ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا ہم پرہیز گاروں کو شریر اور بے حکموں کے برابر ٹھہرائیں گے

پانچویں نوع: صحت حشر و نشر پر دنیا میں مردہ کی زندگی سے استدلال

۱۔ سیدنا آدم علیہ السلام کا ابتداءً پیدا کرنا۔

۲۔ گائے کا واقعہ، فرمایا:

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (پ۱، البقرۃ:۷۳)

ہم نے کہا کہ بعض کو بعض سے مس کرو اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے

۳۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (پ۳، البقرۃ:۲۶۰)

اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے

۴۔ ارشاد فرمایا:

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (پ۳،البقرة:۲۵۹) یا اس طرح جو گذرا ایک بستی پر جو اپنی چھتوں کے بل تباہ پڑی تھی

حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے امکان پر بعینہ وہی استدلال کیا جو جواز حشر پر کیا۔ فرمایا:

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (پ۱۶،مریم:۹) اور میں نے تو تجھے اس سے پہلے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا

قصہ اصحاب کہف میں ارشاد فرمایا:

لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا (پ۱۵،الکہف:۲۱) تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں

واقعہ حضرت ایوب علیہ السلام میں فرمایا

وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ (پ۱۷،الانبیاء:۸۴) ہم نے اسے اس کے گھر والے اور اتنے ہی اور عطا کیے

یہ واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مدت کے بعد زندگی دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ، مردوں کا زندہ ہونا۔ فرمایا

وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ (پ۱۷،الحج:۶) اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے

دوسرے مقام پہ ہے

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي (پ۷،المائدۃ:۱۱۰) اور جب تو میرے حکم سے مٹی جیسی صورت پرند کی بنا تا پھر اس میں پھونک مارتا تو وہ میرے حکم سے اڑنے لگتی

اسی میں یہ فرمایا:

أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (پ۱۶،مریم:۶۷) کیا آدمی کو یاد نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اسے بنایا اور وہ کچھ نہ تھا

یہ ان اصولی دلائل کی طرف اشارہ ہے جن کا تذکرہ، اللہ تعالیٰ نے صحتِ عقیدہ حشر پر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ہر دلیل کی ممکن تفصیل مذکورہ آیات کی تفسیر میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

منکر حشر و نشر کافر ہے

اللہ تعالیٰ نے کتاب میں تصریح کی ہے کہ حشر و نشر کا منکر کافر ہے، دلیل یہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ

(پ۱۵، الکہف:۳۵-۳۷)

اپنے باغ میں اپنی جان پر ظلم کرتا ہوا چلا گیا بولا مجھے گمان نہیں کہ یہ کبھی فنا ہو اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف بھی گیا تو ضرور اس سے بہتر جگہ پاؤں گا پلٹنے کی اس کے ساتھی نے اسے الٹ پھیر کرتے ہوئے جواب دیا کیا تو اس کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے بنایا

وجہ لزوم کفر یہ ہے کہ اس شی کا وجود فی نفسہ ممکن ہے اگر اس کا وجود ممتنع ہوتا تو اس کا وجود ابتداءً کیسے پایا گیا؟ جب یہ پہلی مرتبہ موجود ہے تو واضح ہو گیا یہ فی ذاتہ ممکن الوجود ہے اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے درست و صحیح نہیں تو یہ دلالت کرے گا کہ وہ عاجز ہے کہ وہ فی نفسہ جائز الوجود کی ایجاد پر قادر نہیں یا اس کی جہالت پر کہ اس کیلئے ہر مکلّف کے اجزاء کا دوسرے کے اجزاء بدن سے ممتاز کرنا دشوار ہے، اللہ تعالیٰ کے عاجز و جاہل ہونے کا قول کے ساتھ ساتھ اثبات نبوت بھی درست نہ ہوگا تو یہ قطعی طور پر کفر کا موجب و سبب ہوگا۔ واللہ أعلم

دوسرا مسئلہ: جنت و دوزخ کا مخلوق ہونا

آیات صاف بتا رہی ہیں کہ جنت و دوزخ مخلوق اور پیدا ہو چکی ہیں، نار اس لیے کہ اس کی حقیقت یوں بیان کی اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ '(یہ کفار کیلئے تیار ہے) یہ تصریح ہے کہ وہ پیدا ہو چکی، جنت کے بارے میں ایک اور آیت میں فرمایا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ '(متقین کیلئے تیار ہے) اور اس لیے بھی کہ یہاں فرمایا:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور بشارت ہے ایمان والوں کیلئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

یہ عملاً ملکیت اور حصول ملکیت کی اطلاع ہے۔ حصولِ ملکیت فی الحال، حصولِ مملوک فی الحال کا مقتضی ہے تو یہ شاہد ہے کہ جنت و نار پیدا ہو چکیں ہیں

تیسرا مسئلہ: حصول لذت کے مقامات

حصولِ لذت کے مقامات مسکن ہے یا مطعم (کھانا) یا منکح (جماع)، مسکن کا بیان، جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں، مطعم کا بیان، كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ۔ اور جماع کا بیان، وَلَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ میں فرما دیا، ان اشیاء کے حصول کے ساتھ اگر خوفِ زوال بھی ہو تو خوشی، کڑوی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے خوف زوال کو یوں زائل کر دیا۔ وَهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ تو یہ آیت مبارکہ کمالِ نعمت و سرور پر شاہد ہے اب ہم الفاظِ آیت پر گفتگو کرتے ہیں۔

الفاظ آیت پہ گفتگو

ارشاد ہوا: وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا۔ یہاں چند سوالات ہیں:

سوال اول: اس امر (بَشِّرْ) کا عطف کس پر ہے؟

جواب: کئی طرح سے ہے۔

۱۔ یہاں امر کا عطف امر پر نہیں کہ اعتراض ہو یہاں جملہ کا عطف جملہ پر ہے اور وہ ہے ثواب مومنین کا عطف عقاب کافرین پر۔ محاورہ ہے، زید یعاقب بالقید والضرب وبشر عمراً بالعفو والاطلاق۔ (زید کو قید و ضرب کی سزا اور عمر کو معافی آزادی کی بشارت دو)

۲۔ اس کا عطف "فَاتَّقُوْا" پر ہے جیسے کہو، یا بنی تمیم احذروا عقوبة ما جنیتم و بشر یا فلان بنی اسد باحسانی الیھم۔ (اے بنو تمیم اپنی زیادتی پر سزا سے ڈرو اور اے فلاں، بنی اسد کو میرے احسان کی بشارت دے دو)

۳۔ حضرت زید بن علی اس کا 'اُعِدَّتْ' پر عطف کرتے ہوئے اسے مجہول 'وَبُشِّرَ' پڑھا کرتے۔

بشارت کا حکم

دوسرا سوال: وَبَشِّرْ (بشارت دو) یہ کس کو حکم ہے؟

جواب: فقط رسول اللہ ﷺ بھی ہو سکتے ہیں یا ہر کوئی جیسے فرمان نبوی ﷺ ہے۔ مساجد کی طرف تاریکی میں چل کر آنے والوں کو روز قیامت نورِ کامل کی بشارت دو، تو یہاں کوئی ایک مراد نہیں بلکہ ہر کوئی مراد ہو سکتا ہے۔ یہ صورت احسن واکمل ہے کیونکہ اس میں اس معاملہ کی ایسی عظمت و رفعت ہے کہ یہ اس لائق ہے کہ ہر بشارت پر قادر اس کی بشارت دے۔

بشارت کا مفہوم

تیسرا سوال: بشارت کیا ہے؟

جواب: ایسی خبر جو خوشی کی لہر پیدا کر دے، اس لیے فقہاء کہتے ہیں جب مالک غلاموں سے کہے جو فلاں کے آنے کی مجھے بشارت دے گا وہ آزاد ہے اگر انہوں نے الگ الگ بشارت دی تو اول آزاد کیونکہ اس کی خبر نے اسے خوشی وسرور عطا کیا اگر بشارت کی جگہ خبر کا لفظ ہوتا تو تمام آزاد ہو جاتے کیونکہ خبر تو تمام نے دی ہے، اسی سے بشر بمعنی ظاہر جلد ہے، صبح کی پہلی روشنی کو تباشیر صبح کہا جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ جس کے ساتھ استہزا کیا جائے اس پر زائد استہزا کیلئے یہ کلام ہے جیسے کوئی دشمن سے کہے: ابشر بقتل ذریتك ونهب مالك۔ (تجھے تیری اولاد کے قتل اور تیرے مال کی چوری کی بشارت)

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اعمال ایمان کا حصہ نہیں

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اعمال، ایمان میں داخل نہیں کیونکہ پہلے ایمان کا ذکر پھر اس پر عمل صالح کا عطف ہے جو غیریت لازم کرتا ہے ورنہ یہ تکرار ہوگا جو خلاف اصل ہے۔

دوسرا مسئلہ: کچھ لوگوں نے اس آیت کو اپنے ظاہر پہ رکھتے ہوئے کہا: جو ایمان لایا اور اعمال صالح کیے وہ جنتی ہے۔ جب یہ سوال ہوا کہ جس نے ایمان اور اعمال صالح لانے کے بعد کفر کیا تو جواب دیا یہ محال ہے کیونکہ فعل ایمان وطاعت لازماً ثواب دائمی کا اور فعل کفر، عقاب دائمی کا مستحق بناتا ہے اور ان دونوں کا اجتماع محال ہے اور تحابط (حبط) اعمال کا قول بھی محال ہے، تو اب صورت یہی ہے کہ یہ تمہارا فرض کرنا ہی محال ہے۔

تحابط (حبط اعمال) کیوں محال ہے؟

اس کی چند وجہیں ہیں:

۱۔ دونوں استحقاق آپس میں متضاد ہوں گے یا متضاد نہ ہوں گے، اگر دونوں متضاد ہیں تو عارض کا عروض زوال باقی سے مشروط ہوگا اور اگر زوال باقی کی شرط عروض عارض ہے تو دور لازم جو محال ہے۔

۲۔ جانبین میں منافات ہے تو باقی کے زوال عارض کی وجہ سے دفاع عارض، قیام باقی سے اولیٰ نہیں۔ اب اگر دونوں کا وجود اکٹھا پایا جائے تو محال یا دونوں ساقط تو اب محابطہ کا قول باطل۔

۳۔ دونوں استحقاق یا تو برابر ہوں گے یا مقدم اکثر یا اقل ہوگا اگر دونوں برابر ہیں مثلاً کہا جائے کہ ثواب کا استحقاق دس اجزا پر ہے تو عتاب کے دس اجزا کا استحقاق ہوگا، ہم کہیں گے اجزا عتاب میں سے ہر ایک کا استحقاقِ ثواب کے استحقاق کے اجزاء میں سے ہر ایک کے ازالہ کیلئے مستقل ہے جب صورت حال یہی ہے۔

تو اب اس جز کی اس جز کے ازالہ میں تاثیر اس سے اولیٰ نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے جز کی تاثیر کا ازالہ کرے اور اسی طرح کا معاملہ دوسرے جز کی تاثیر کا ہے تو اب عارض اجزا میں سے ہر ایک سابقہ اجزا میں سے ہر ایک کے ازالہ میں مؤثر ہوگا تو اس صورت میں ہر علت کیلئے معلولات کثیرہ اور ہر معلول کیلئے علل کثیر کا ہونا لازم آئے گا اور یہ تمام محال ہے یا بغیر مخصص کے عارض اجزا میں سے ہر ایک باقی ایک کے ساتھ مختص ہوگا یہ محال ہے کیونکہ ممکن کی ایک طرف کو دوسری طرف پر بلا مرجح، ترجیح محال ہوتی ہے

اور اگر مقدم اکثر ہے تو عارض، بعض اجزا باقی کو ہی زائل کرے گا تو بعض اجزا باقی کا زائل ہونا دیگر اجزا کے زوال سے اولیٰ نہیں تو اب تمام زائل ہوں گے یہ محال ہے کیونکہ زائل، ناقص سے ہی زائل ہوتا ہے یا بلا مخصص بعض زوال کیلئے متعین ہوں گے اور یہ محال ہے یا کوئی بھی زائل نہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے۔ پھر یہ عارض جب بعض اجزا باقی کو زائل کر رہا ہے تو عارض باقی رہے گا یا زائل ہو جائے گا، عارض کی بقا کا قول کسی عاقل نہیں کیا اور اس کے زوال کا قول باطل ہے اس لیے کہ دوسرے کے ازالہ کیلئے دونوں کی تاثیر اجتماعی ہوگی یا بطور ترتیب، اول صورت باطل کیونکہ مزیل کیلئے حالت ازالہ میں موجود ہونا ضروری ہے تو اگر دونوں، زوال اجتماعی طور پر ہے تو دونوں ازالہ کرنے والوں کا اجتماعی طور پر موجود ہونا ضروری ہے تو لازم آئے گا کہ وہ اس وقت موجود ہوں جب وہ حالتِ عدم میں ہوں اور یہ محال ہے۔

اور اگر بطور ترتیب ہے تو مغلوب کیلئے غالب ہو جانا محال ہے۔

اگر مقدم اقل ہے تو اس کے زوال میں مؤثر بعض اجزا عارض ہیں اور یہ محال ہے کیونکہ جب تمام ازالہ کی صلاحیت رکھتے ہیں تو بعض کا مخصوص کرنا ترجیح بلا مرجح جو محال ہے۔

اگر تمام ازالہ میں مؤثر ہیں تو معلول واحد کیلئے مستقل علتوں کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ بھی محال ہے۔

ان دلائلِ عقلیہ سے قول احباط کا فساد ثابت ہو گیا

جواب: جواب میں دو اقوال متعین ہیں

پہلا قول: جنہوں نے موافاۃ کا اعتبار کیا ہے یعنی شرط حصول ایمان یہ ہے کہ کفر پر موت نہ ہو، اگر آدمی کفر پر مرا تو ہم جان لیں گے کہ وہ اولاً بھی کفر ہی پر تھا اور یہ قول واضح طور پر ساقط ہے۔

دوسرا قول: بندہ طاعت پر ثواب کا اور معصیت پر عقاب کا عقلاً لازماً مستحق نہیں ہوتا اور یہی اہل سنت و جماعت کا قول اور ہمارا مختار ہے، اس سے ان ظلمات سے خلاصی پائی جا سکتی ہے۔

تیسرا مسئلہ: معتزلہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ طاعت ثواب کی موجب ہے کیونکہ بشارت کا معنی یہ ہے کہ انہیں بطریق وقوع، حصول جنت ہے اور جب آیت کا حمل وقوع پر ممکن نہیں تو پھر استحقاقِ وقوع پر حمل لازم ہے اس لیے کہ وقوع کو مجازاً استحقاقِ وقوع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

چوتھا مسئلہ: لفظ جنت کا مفہوم

جنت، گلستان، جو کھجور اور ایسے درختوں پر مشتمل ہو جو گھنے سایہ دار اور ان کی ٹہنیاں آپس میں ملی ہوں، یہ الفاظ ج ن، ستر وخفا کیلئے آتے ہیں گویا ان کے گھنے اور سایہ دار ہونے کی وجہ سے جنت کہا گیا۔ جنه اذا ستر سے یہ مصدر بمعنی سترۃ واحد ہے، دار الثواب کا نام جنت ہے کیونکہ وہ مخفی ہے۔

جَنّٰت نکرہ کیوں؟

سوال: جنات، نکرہ اور النار معرفہ کیوں؟

جواب: اول اس لیے کہ جنت تمام دار ثواب کا نام ہے اور وہ کئی ایسے جنات و باغات پہ مشتمل ہے جو عمل کرنے والوں کے حسب درجہ و مرتبہ ہیں تو ہر طبقہ کیلئے ان میں سے جنات ہیں، النار معرفہ ہونے کی وجہ ان کا جنس ہونا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں کے باغ میں پانی جاری اور انجیر و انگور ہیں تو یہ ان اجناس کی طرف اشارہ ہے جو علم مخاطب میں ہے یا اس سے ان انہار کی طرف اشارہ ہے

فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ (پ۲۶ محمد:۱۵)

اور اسی میں بہتے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی نہ بدلیں اور ایسی دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلا

جنّات کی دوسری صفت

"کُلَّمَا رُزِقُوْا" یہ جنات کی دوسری صفت ہے لہٰذا محذوف کی خبر یا نیا جملہ ہے کیونکہ جب کہا جائے ان کیلئے جنات ہیں تو سامع کے دل میں سوال آئے گا کہ ان جنات کے ثمرات، دنیاوی ثمرات کی طرح ہے یا نہیں؟ تو یہ اس کا جواب ہے۔

یہاں چند سوالات ہیں

پہلا سوال: مِنْ ثَمَرَةٍ کیا بن رہا ہے؟

جواب: دو طرح سے ہے۔

۱۔ یہ اس قول کی طرح ہے: کلما اکلتُ من بستانك من الرمان شیئاً حمدتك (میں نے جب بھی تیرے باغ سے کوئی انار کھایا میں نے تیری تعریف کی) "من ثمرة، من الرمان" کی جگہ ہے تو 'من' پہلا اور دوسرا ابتداغایت کیلئے ہیں کیونکہ رزق کی ابتدا جنات سے اور جنات سے رزق کی ابتدا پھل سے ہے اور یہاں اس تفسیر پہ ثمرة سے مراد ایک سیب یا ایک انار نہیں بلکہ مراد انواعِ پھل میں سے ایک نوع ہے۔

۲۔ مِنْ ثَمَرَةٍ بیان ہے جیسے 'رأیت منك اسدا ترید انت اسد' (میں نے تجھ سے شیر دیکھا یعنی تو شیر ہے) تو اب ثمرة سے اس کی نوع یا ایک فرد بھی لینا درست ہے۔

دوسرا سوال: اہل جنت کا یہ کہنا کیسے درست ہے یہ جو، اب ہمیں دیا جارہا ہے یہ وہی ہے جو ہم پہلے تناول کر چکے حالانکہ معاملہ ایسے نہیں؟

جواب: چونکہ وہ ماہیت میں متحد ہیں اگرچہ عدد میں تغایر ہے تو یہ کہنا درست ہوگا یہ تو وہی ہیں یعنی ماہیت کے اعتبار سے کیونکہ وحدت نوعیہ، کثرت افراد کے منافی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے جب بیٹے کی باپ کے ساتھ خوب مشابہت ہو تو اسے اب کہہ دیا جاتا ہے

رزق دنیاوی یا جنتی؟

تیسرا سوال: آیت بتا رہی ہے جنت میں دیے گئے رزق کو انہوں نے دوسرے رزق کے ساتھ مشابہت دی تو وہ رزق کونسا ہے دنیاوی یا جنتی؟

جواب: دو طرح سے ہے

دنیاوی رزق

۱۔ وہ رزق دنیاوی ہے، اس پہ یہ دو دلائل ہیں

پہلی دلیل: انسان، مالوف سے اُنس اور معلوم کی طرف راغب ہوتا ہے تو جب آدمی غیر مانوس چیز دیکھتا ہے تو وہ اس سے طبعاً نفرت کرتا ہے، جب اسے اپنی مانوس و معلوم چیز ملتی ہے اور وہ پہلی معلوم سے زیادہ اعلیٰ و اشرف ہو تو اس کی خوشی و فرحت دوبالا ہو جاتی ہے تو اہل جنت نے جب انار دنیاوی دیکھا تھا جب انہیں آخرت میں ملا، اسے انہوں نے دنیاوی سے کہیں اشرف و اطیب پایا تو ان کی فرحت، اس دنیا میں دیکھیں گے انار سے کہیں عظیم و دوبالا ہوگی۔

دوسری دلیل: ارشاد گرامی 'کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا' تمام دفعات کو شامل ہونے کی وجہ سے پہلی دفعہ کو بھی شامل ہے تو جب انہیں پہلی دفعہ جنتی پھل دیا گیا تو انہوں نے کہا ہمیں تو یہ پہلے دیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے جنتی رزق انہیں ملا ہی نہیں حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ مشابہت دیتے لہٰذا اسے دنیاوی رزق پر ہی محمول کرنا لازم ہے۔

دوسرا قول: جنتی رزق

جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی وہ بھی جنتی ہیں اور مراد ان پھلوں کا آپس میں متشابہ ہونا ہے، ان میں مشابہت کے حصول میں اختلاف ہے، دو اقوال ہیں:

۱۔ تمام اوقات میں قدر و درجہ کے ثواب میں مساوات مراد ہے حتیٰ کہ نہ اضافہ ہوگا اور نہ کمی۔

۲۔ منظر و مشاہدہ میں مساوات ہے دوسرا گویا اول ہی ہے۔ امام حسن بصری سے اسی طرح مروی ہے۔

پھر اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں جیسے اشتباہ دیکھنے میں ہے اسی طرح کھانے میں ہے۔ مثلاً جب کوئی آدمی کسی میں لذت پاتا ہے اور وہ اسے بھا جاتی ہے تو اس کا دل اس سے متعلق ہو جاتا ہے جب اسے بالکل اسی طرح کی شئی میسر آجاتی ہے تو اسے انتہائی لذت محسوس ہوتی ہے۔

بعض نے کہا یہاں اگرچہ دیکھنے میں تشابہ ہے مگر ذائقہ میں وہ مختلف ہوں گے۔ امام حسن کا بیان ہے جنتی کیلئے ایک کھانا لایا جائے گا اور وہ اس سے کھائے گا پھر دوسرا لایا جائے گا تو وہ کہے گا یہ تو وہ پہلا ہی ہے فرشتہ کہے گا تم کھاؤ اس کا رنگ ایک ہے مگر ذائقہ مختلف ہے۔

اہل معرفت کا قول

اہل معرفت کی زباں میں تیسرا قول یہ ہے کہ کمال سعادت فقط، معرفت ذات و صفات و افعال الٰہی ہے یہ ملائکہ کرو ہیو

ملائکہ روحانیہ، طبقات ارواح اور عالم سموات سے افضل ہے۔

یعنی لازم ہے کہ روح انسانی اس آئینہ کی طرح ہو جو عالم قدس کے محاذی ہے پھر یہ معارف، دنیا میں حاصل ہوتے ہیں لیکن اس میں کمال لذت وخوشی حاصل نہیں کیونکہ علائق بدنیہ ان سعادات ولذات کے ظہور سے آڑے آجاتے ہیں جب یہ عوارض زائل ہو جاتے ہیں تو سعادتِ عظیمہ اور قابل رشک کا حصول ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ انسان موت کے بعد سعادت روحانیہ پاتا ہے تو وہ کہتا ہے یہ وہی ہے جو دنیا میں حاصل تھیں۔ ہاں دنیا میں لذت، فرحت اور سرور اس سے وہ نہ تھا جو اب علائق کے زوال کے بعد آخرت میں حاصل ہوا ہے۔

وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا کی تفسیر

یہاں دو سوالات ہیں:

پہلا سوال: اُتُوۡا بِهٖ، کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟

جـــــواب: اگر مشبہ بہ رزقِ دنیا ہے تو اس شی کی طرف جو دنیا و آخرت میں دی گئی۔ یعنی ان کی وہ نوع متشابہ لائی گئی جس سے آخرت میں حاصل ہونے والا اس کے مشابہ تھا جو اس سے دنیا میں حاصل تھا اور اگر مشبہ بہ رزقِ جنت بنائیں تو جنتی شی کی طرف لوٹے گی یعنی جنتی نوع لائی گئی جو ایک دوسرے کے مشابہ تھی۔

دوسرا سوال: وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا، کا نظمِ کلام میں محل کیا ہے؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت سے متشابہ رزق کا دعویٰ نقل کیا: قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا (اور وہ دیے گے جو آپس میں مشابہ ہے)

وَلَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی تفسیر

ان کی طہارت سے مراد ان کے ابدان کا حیض، استحاضہ اور جمیع غلاظتوں سے پاک ہونا، ان کے ارواح کا خصائلِ ذمیمہ خصوصاً خواتین کے نقص سے پاک ہونا، ہم نے الفاظ کو تمام پر حمل کیا۔ کیونکہ دونوں اقسام، قدر میں مشترک ہیں۔

اہل اشارہ و معرفت کہتے ہیں، ان مسائل پر بھی دلالت ہے۔

خاتون کو جب حیض آتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے مباشرت سے منع کر دیا، ارشادِ الٰہی ہے

قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ پس کہہ دیجئے وہ ناپاکی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو (پ۲،البقرہ:۲۲۲)

جب ان سے اس نجاست کی حالت میں مقاربت منع تھی جس میں وہ معذور ہیں تو جنت میں ازواج کو پاک کر دیا گیا کیونکہ نجاسات معاصی میں ملوث ہونے کی صورت میں ان سے مقاربت بطریق اولیٰ منع ہوتی کیونکہ اس میں وہ معذور نہیں تھیں۔

۲۔ جس نے بیوی سے ہمبستری کی وہ اس مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا جس میں ہر نیک وفاسق داخل ہوسکتا ہے تو جس نے ازالۂ شہوت کا حرام طریقہ اپنایا وہ اس جنت میں داخل کیسے ہوسکتا ہے جس میں صرف پاک ہی ٹھہریں گے۔

یہی وجہ ہے جب سیدنا آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔

جس کے کپڑے پر ذرہ نجاست ہو اس کے ساتھ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں نماز درست نہیں تو جس کے دل میں دنیاوی عظیم معاصی ہوں اس کی نماز کیسے مقبول ہوگی؟

یہاں دو سوالات ہیں

پہلا سوال: موصوف (ازواج) کی طرح صفت (مطہرۃ) جمع کیوں نہیں؟

جواب: دونوں لغات فصیح ہیں، النساء فعلن، النساء فعلت، اسی سے حماسۃ کا شعر ہے:

واذا العذاری بالدخان تقنعت واستعملت نصب القدور فملت

معنی وجماعۃ ازواج مطھرۃ (ان کیلئے ازواج مطہرہ کی جماعت ہے)، امام زید بن علی کی قرأت مطہرات ہی ہے، امام عبید بن عمیر نے مطھرۃ یعنی متطھرہ پڑھا۔

دوسرا سوال: کیوں نہ طاھرۃ کہہ دیا؟

جواب: لفظ مطھرۃ، میں یہ اشارہ ہے کہ ان کو پاکیزہ فرمانے والی، ذات اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ اس میں ثواب کی عظمت کا بیان ہے گویا فرمایا یہ رہا ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اہلِ ثواب کیلئے انہیں مزین فرمایا۔

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ کی تفسیر

معتزلہ کہتے ہیں یہاں خُلد سے مراد ثبات لازم اور نہ ختم ہونے والی دائمی بقا ہے اور اس پر انہوں نے آیت اور اشعار سے استدلال کیا ہے، آیت مبارکہ یہ ہے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۳۴) اور ہم نے تم سے پہلے کسی کیلئے دنیا میں ہمیشگی نہ بنائی تو کیا اگر تم انتقال فرماؤ تو یہ ہمیشہ رہیں گے؟

انسان نے خُلد کا انکار کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو طویل عمر دی تو منفی، مثبت کا غیر ہوتا ہے، لٰہذا خُلد، بقاء دائمی کا نام ہے امرأالقیس کا شعر ہے

وهل يعمن الا سعيد مخلد قليل هموم ما يبيت بأوجال

اہلسنّت کہتے ہیں خُلد، ثباتِ طویل ہے خواہ وہ دائمی ہو یا نہ ہو، ان کا استدلال آیت و عرف ہے، آیت قرآنی یوں ہے:
خَالِدِيْنَ فِيهَا اَبَدًا (وہ اس میں دائمی اور ہمیشہ رہیں گے)
اگر دوام، مفہومِ خُلد میں داخل ہے تو لفظ ''اَبَدًا'' تکرار ہوگا۔

عرف یہ ہے کہ جب کہا جاتا ہے حبس فلان فلاناً حبساً مخلداً اسی طرح وقف ناموں میں لکھا جاتا ہے وقف فلان وقفاً مخلداً تو اس میں کلام ہے کہ یہ خلد دائمی ثواب پر دال ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا: عقل دوام پر ہی دال ہے کیونکہ اگر اس سے دوام لازم نہ ہو تو پھر ثواب کا انقطاع جائز ہوگا تو خوفِ انقطاع اسی نعمت کو اہل ثواب پر کڑوا کر دے گا کیونکہ جب نعمت بڑی ہو تو اس کے انقطاع کا خوف بھی دل میں عظیم ہو جاتا ہے انقطاع کا تقاضا یہی ہوگا کہ اہلِ ثواب سے غم و حسرت کسی صورت جدا نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم

[۲۶-۲۷] اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

(تحقیق اللہ حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، رہے کافر تو وہ کہتے ہیں ایسی مثال سے اللہ کا کیا مقصود ہے وہ بہت ساروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت ساروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا اور فساد پھیلاتے زمین میں وہی نقصان میں ہیں)

نقل قدیر

کفار کا شبہ

جب قرآن کا معجز ہونا بیان کیا تو اس پہ کفار کی طرف سے وارد کردہ شبہ ذکر کیا جو وہ اس کے معجز ہونے کے منافی پیش کیا کرتے پھر اس کا جواب دیا۔

شبہ کی تفصیل اور جواب

شبہ کی تفصیل یوں ہے، قرآن میں شہد کی مکھی، دوسری مکھی، عنکبوت اور چیونٹی کا ذکر ہے، ان اشیاء کا تذکرہ کلام فصحاء کے مناسب ہی نہیں ہوتا تو قرآن ان پر مشتمل ہونے سے فصیح نہیں رہتا چہ جائیکہ وہ معجز ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا ان اشیاء کا چھوٹا ہونا فصاحت کیلئے عیب ناک نہیں جبکہ ان کا تذکرہ اعلیٰ حکمتوں پر مشتمل ہو، اس میں اسی کے ماقبل آیات سے ربط و تعلق کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اس آیت میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: شانِ نزول

شانِ نزول میں مختلف اقوال ہیں:

پہلا قول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے جب یہ آیت نازل ہوئی:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ — اے لوگو! مثال بیان کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سنو

(پ۱۷، الحج:۷۳)

اس میں ان کے بتوں پر طعن پھر ان کی عبادت کو عنکبوت کے گھر کے ساتھ تشبیہ دی تو یہود نے کہا: مکھی اور عنکبوت کی کیا قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مثال بیان کرے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

دوسرا قول: منافقین نے آگ، ظلمات اور رعد و برق کے ساتھ مثالوں پر طعن کیا۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا (پ۱، البقرۃ:۱۷) ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے آگ جلائی۔

تیسرا قول: یہ طعن مشرکین کی طرف سے تھا۔

شیخ قفال کہتے ہیں یہ تمام احتمالات ممکن ہیں۔ یہود اس لیے کہ آخر آیت میں ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ — اور اس سے بے حکمے ہی گمراہ ہوتے ہیں اور وہ جو اللہ کے عہد کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں

اور یہ یہود کا عمل و حال ہے کیونکہ بعد میں وفاء عہد کا ذکر بنی اسرائیل کے ساتھ ہی ہے۔

کفار و منافقین کا ذکر سورۃ المدثر میں یوں ہے:

وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ — اور دل کے روگی اور کافر کہیں اس اچنبھے کی بات میں اللہ کا کیا مطلب اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے (پ۲۹، المدثر:۳۱)

جن کے دلوں میں مرض ہے سے مراد منافقین اور اہلِ کفر سے مراد مشرکین کیونکہ سورت مکی ہے تو دونوں کو وہاں جمع کر دیا، جب یہ واضح ہے تو سنیے۔

ان تمام کا احتمال یہاں قائم کیونکہ کفار، منافقین اور یہود، ایذاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متفق تھے ابتدا سورت سے لے کر یہاں تک یہود، منافقین اور مشرکین کا ذکر آیا اور یہ تمام کافر ہیں۔

شیخ قفال کہتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے اس آیت کا نزول بغیر سبب، ابتداءً ہی ہو کیونکہ فی ذاتہ اس کا مفہوم و معنی مفید و مستقل ہے

دوسرا مسئلہ: حیا کا مفہوم

حیا، بدنی اس تغیر و ٹوٹنے کو کہا جاتا ہے جو انسان کی مذمت اور عیب لگنے کی بنا پر ہو، اس کا اشتقاق حیاۃ سے ہے کہا جاتا ہے حی الرجل جیسے نسی، خشی، شظی الفرس اذا اعتلت هذه الاعضاء، جب انسان کو حیا کی وجہ سے تغیر اور ٹوٹنا عارض ہوتا ہے تو زندگی کڑوی اور قوت ٹوٹ جاتی ہے محاورہ ہے، فلان هلك حياء من كذا، مات حياء، رایت الهلاك فی وجهه من شدة الحياء، ذاب حياء (وہ حیا کی وجہ سے ہلاک ہو گیا، فلاں حیا کی وجہ سے پگھل گیا)

جب حیا کا معنی یہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ محال ہے کیونکہ ایسا تغیر، بدن کو لاحق ہوتا ہے اور اس کیلئے جسم کا ہونا ضروری ہے۔

البتہ احادیث میں یہ لفظ باری تعالیٰ کیلئے آیا ہے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰہ تعالٰی حیی کریم یستحی اذا رفع العبد الیہ یدیہ أن یردھما صفراً حتی یضع فیھما خیراً (سنن ابی داؤد،۱۴۸۸)

اللہ تعالیٰ صاحبِ حیا وکرم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ ان میں خیر رکھ دیتا ہے

جب معاملہ یوں ہے تو اس میں تاویل لازم ہے اور وہ دو طرح سے ہے۔

پہلی وجہ: صفاتِ الٰہی کے بارے میں قانون

ایسے مواقع پر قانون یہی ہے ہر وہ صفت جو بندوں کی اجسام کے ساتھ مخصوص ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا وصف بیان ہو تو اس سے مراد اس کی ابتدا نہیں بلکہ اس کا ثمر ہوگا مثلاً حیا جب انسان کو عارض ہوتی ہے تو اس کی ابتدا وانتہا ہوتی ہے۔ ابتدا یہ کہ انسان کو قباحت کی طرف منسوب کر دینے کی وجہ سے تغیر جسمانی لاحق ہوتا ہے؟ انتہا یہ کہ انسان اس فعل کو ترک کر دے تو لفظ حیا جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں آئے تو یہاں وہ خوف مراد نہیں جو حیا کا مبدا و مقدمہ ہے بلکہ مراد ترک فعل ہوگا جو حیا کی غایت ومنتہا ہے، اسی طرح غضب کا معاملہ ہے اس کی علامت ومقدمہ، دمِ قلب کا جوش اور خواہش انتقام ہے اور اس کی غایت پر غضب کا انزال ہے جب اللہ تعالیٰ کیلئے وصف غضب ذکر کریں گے تو مراد خواہش انتقام اور دلی خون کا جوش نہیں بلکہ اس کی غایت انزال عقاب مراد ہوگا، اس مسئلہ میں قانون کلی یہی ہے۔

دوسری وجہ: ممکن ہے یہ بات کفار کے کلام میں ہو انہوں نے یوں کہا: ربِ محمد، مکھی اور عنکبوت کی مثال لانے سے حیا کرے۔ تو اس کے جواب میں بطور موافقتِ سوال ذکر کر دیا اور فن بدیع کا اصول یہی ہے۔

قاضی عبدالجبار کہتے ہیں جس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پہ اثباتاً جائز نہیں تو اس کا اطلاق اس پر بطریق نفی بھی جائز نہیں۔

اس لیے کہ یہ وہم پیدا کرے گا کہ جس کی نفی کی جارہی ہے یہ اس کیلئے جائز تھا، باقی اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بارے میں فرمایا:

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (پ۳، البقرۃ:۲۵۵) نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (پ۳۰، الاخلاص:۳) نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور وہ نہ کسی سے پیدا ہوا

یہ صورۃً نفی ہے نہ کہ حقیقۃً، اسی طرح یہ ارشاد گرامی

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ (پ۱۸، المؤمنون:۹۱) اللہ نے کوئی بچہ اختیار نہ کیا

وَهُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ (پ۷، الانعام:۱۴) اور وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے

جو قرآن میں وارد ہے اس کا اطلاق ہر جگہ جائز نہیں تو جب بھی اس کا اطلاق کریں گے ساتھ اس کا محال ہونا بھی ذکر کیا جائے گا لیکن قائل یہ کہہ سکتا ہے کہ ان صفات کی اللہ تعالیٰ سے نفی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ تو ان کے انتفاء کی صدق خبر ان کے جواز کے لزوم کا سبب ہوگی تو اب یوں کہا جا سکتا ہے ان کی نفی کی خبر اس کے اطلاقِ صحیح پر دال ہوگی۔

تو ہم کہیں گے یہ بات ممنوع ہے کیونکہ ذکر میں نفی کی تخصیص، ثبوت غیر پر دال نہیں بلکہ اس کے ساتھ اگر ایسا لفظ بھی متصل کر دیا جائے جو انتفاء صحت پر دال ہو تو یہ احسن ہوگا تو اب یہ بیان میں مبالغہ ہوگا تو جب اس کا غیر احسن نہیں تو وہ قبیح قرار دیا جائے گا

تیسرا مسئلہ: ضرب الامثال عقلاً امور مستحسنہ میں سے ہے، اس پر یہ دلائل شاہد ہیں۔

۱۔ عرب وعجم کا اس پر اتفاق ہے، عربوں کے ہاں یہ طریقہ معروف ہے وہ احقر اشیاء کے ساتھ مثال دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً ذرہ سے مثال اجمع من ذرة، اضبط من ذرة، واخفى من الذرة، مکھی سے مثال، أجرأ من الذباب، (مکھی سے زیادہ بہادر) اخطاء من الذباب (مکھی سے زیادہ غلط) اطيش من الذباب، اشبه من الذباب بالذباب، والح من الذباب۔ (مکھی سے بڑھ کر چمٹنے والا) بندر کی تمثیل، اسمع من قراد، اصغر من القراد، اعلق من القراد، اغم من قراد، ادب من قراد، مکڑی کی تمثیل، اطير من الجراد، احطم من جرادة، افسد من جرادة، اصفى من لعاب الجراد، پتنگے کی تمثیل، اضعف من فراشة، اطيش من فراشة، اجهل من فراشة، مچھر کی تمثیل، اضعف من بعوضة، اعز من مخ البعوضة، كلفني مخ البعوضة (یہ تکلیف مالا یطاق میں کہا جاتا ہے)

عجم کے عمل پر کتاب کلیلہ ودمنہ اور دیگر کتب شاہد ہیں۔

مچھر کا کھجور سے مکالمہ

بعض کتب میں ہے مچھر نے بلند کھجور سے اڑنے کا ارادہ کیا تو کہا، اے کھجور مجھے روک لے میں اڑنے لگا ہوں۔ کھجور نے کہا: اللہ کی قسم مجھے تیرے بیٹھنے کا علم وشعور ہی نہ ہوا تو مجھے تیرے اڑنے کا شعور کیسے ہو سکتا ہے؟

۲۔ حقیر اشیاء کے ساتھ مثالیں انجیل عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہیں۔ مثلاً ملکوت سماء کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے کسی قریہ میں عمدہ صاف گندم بوئی۔ جب لوگ سو گئے اس کے دشمن نے آ کر گندم کے درمیان زوان بو دیا، جب کھیتی اُگی اور پھل دیا تو اس پر زوان کا غلبہ ہو گیا۔ غلاموں نے مالک سے پوچھا: ہمارے سردار کیا تم نے اپنے قریہ میں صاف عمدہ گندم نہیں بوئی تھی؟ کہنے لگا: کیوں نہیں۔ پوچھا پھر یہ زوان کہاں سے آ گیا؟ کہا اگر تم اب زوان کو اکھیڑو تو ساتھ گندم بھی جائے گی تو دونوں کو کٹنے تک پالو، کاٹنے والوں سے کہا: زوان کو گندم سے چن لو اور اسے گانٹھوں میں باندھ کر آگ سے جلا دو اور گندم کو ذخیرہ میں لے جاؤ

مثال کی تفسیر

اب میں تمہیں اس مثال کی تفسیر سے آگاہ کرتا ہوں۔ عمدہ گندم بونے والے سیدنا ابوالبشر، قریہ یہ جہاں ہے، عمدہ صاف گندم ہم ابناء ملکوت ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طاعت بجالانے والے ہیں، دشمن جس نے زوان بویا ابلیس ہے، زوان وہ معاصی ہیں جنہیں ابلیس اور اس کے ساتھی بوتے ہیں، کاٹنے والے ملائکہ جو لوگوں کو موت تک چھوڑتے ہیں جب وقت آجاتا ہے تو اہلِ خیر کو اللہ کے ملکوت کی طرف اور اہل شر کو دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں، جیسے زوان چن چن کر جلا دیا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رسل وملائکہ اس کی سلطنت سے غافلوں اور تمام گنہ گاروں کو چن چن کر جہنم میں ڈالتے ہیں اور وہاں وہ چیخ و پکار کرتے ہیں نیک وصالحین وہاں اپنے رب کے ملکوت میں ہوتے ہیں مگر کسی کے کان ہیں تو لگائے تو اسے سنائی دے گا۔

ایک اور مثال

ایک اور مثال جو ملکوت سماء کے مشابہ ہے ایک رائی کا دانہ، جو کہ سب سے چھوٹا ہے لے کر اپنے قریہ میں بوتا ہے جب وہ اُگ کر بڑا ہوا حتیٰ کہ وہ اس قدر بقول کی طرح بلند ہو گیا کہ آسمانی پرندے نے آکر اس کی شاخوں پہ گھونسلا بنالیا۔

تو اسی طرح ہدایت کا معاملہ ہے جو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اجر وعظمت میں اضافہ کر کے اس کا ذکر بلند فرما دیتا اور اس کی اقتداء کرنے والا نجات پا جاتا ہے اور فرمایا چھلنی کی طرح نہ بنو جس سے اچھا آٹا نکل جاتا ہے اور وہ چھان روک لیتی ہے اسی طرح تم منہ سے حکمت نکالتے ہو اور تم دلوں میں کھوٹ وحسد رکھتے ہو۔

فرمایا تمہارے دل ان پتھروں کی طرح ہیں جنہیں آگ پکاتی نہیں، انہیں پانی نرم نہیں کرسکتا اور نہ انہیں ہوائیں اڑاتیں ہیں، فرمایا اپنے ذخائر تہہ خانوں میں جمع نہ کرو وہ فاسد ہو جائیں گے اور نہ جنگلوں میں ورنہ انہیں ہوا اور چور لے اڑیں گے ہاں اپنے ذخائر اللہ تعالیٰ کے ہاں جمع کرو۔

فرمایا: جب ہم زمین کھودتے ہیں وہاں کیڑے پاتے ہیں جن پر لباس اور وہاں ان کا رزق ہوتا ہے نہ وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور نہ فصل کاٹتے ہیں، ان میں سے بعض بند، پتھر اور لکڑی کے اندر ہوتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا رزق ولباس کون دیتا ہے؟ تم کیوں بات نہیں سمجھتے۔ فرمایا: بھڑوں کو نہ چھیڑو وہ تمہیں ڈسیں گیں، بے وقوفوں سے مخاطب نہ ہوں وہ تمہاری بے عزتی کریں گے۔

تو واضح ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان حقیر اشیاء سے مثالیں بیان کی ہیں۔

عقلی طور پر بھی تقاضا یہی ہے کیونکہ خیال کی طبع میں حکایت وتشابہ ہے جب محض معنی کا تذکرہ ہو تو عقل اس کا ادراک کر لیتا ہے مگر خیال کا تنازعہ رہتا ہے جب معنی کے ساتھ تشابہ کا ذکر آجائے تو عقل، خیال کی معاونت سے اسے پالیتی ہے تو دوسری صورت بلاشبہ اکمل ہے۔

پھر یہ بھی سامنے ہے کہ جب انسان معنی ذکر کرتا ہے۔ تو اس پر بات کماحقہ واضح نہیں ہوتی جب اس کی مثال سامنے آجائے تو وہ خوب واضح وآشکار ہو جاتا ہے۔

جب مثال دینا، بیان ووضاحت میں مفید ہے تو اس کتاب مقدس میں اس کا تذکرہ ہوگا جس کا مقصد ہی وضاحت وبیان ہے۔

رہا ان کا یہ سوال کہ ان حقیر اشیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مثالیں بیان کرنا مناسب نہیں، یہ سراپا جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی صغیر وکبیر کو پیدا کیا ہے اور ہر مخلوق میں اس کا حکم عام ہے اس لیے کہ تمام کو اس نے پختہ کیا تو صغیر کسی کبیر سے اخف نہیں اور عظیم کسی صغیر سے مشکل واصعب نہیں جب تمام بمنزل واحد ہیں تو کبیر کو صغیر پر کسی طرح بندوں کیلئے مثال بنانے میں اولویت نہیں بلکہ قصہ میں مناسب کا اعتبار ہوگا، جب اس کے مناسب مکھی اور عنکبوت ہے تو انہی کی مثال بیان ہوگی نہ کہ ہاتھی واونٹ کی

تو جب اللہ تعالیٰ نے ان کی بتوں کی عبادت اور عبادت رحمٰن سے ان کی دشمنی کی شناعت وقباحت کے بیان کا ارادہ فرمایا تو مکھی کی مثال ہی مناسب تھی کہ ان بتوں سے مکھی کے نقصان کا ازالہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور بیت العنکبوت کی مثال دی تاکہ آشکار ہو جائے کہ ان بتوں کی عبادت اس سے بھی کمزور واضعف ہے، ایسی مثال میں، جس کی مثال دی گئی ہو وہ اضعف ہوتا ہے جبکہ مثال اقویٰ واوضح ہوگی۔

چوتھا مسئلہ: ما کا زائدہ ہونا

شیخ اصم کہتے ہیں "مَثَلًا مَّا" میں ما زائدہ ہے جیسے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ میں ما زائدہ ہے۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں، معاذ اللہ، قرآن میں زائد ولغو کوئی شئی نہیں، اصح، ابو مسلم کا قول ہی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سراپا ہدایت وبیان قرار دیا اور لغو ہونا اس کے منافی ہے۔

بَعُوْضَةً میں دو قرأتیں

لفظ "بَعُوْضَةً" میں دو قرأتیں ہیں:

۱۔ اس پر نصب ہو تو ، ما، میں دو صورتیں ہیں۔

۱۔ یہ مبنی ہو یعنی جب اسم نکرہ سے متصل ہو تو اس میں ابہام واشتراک ہوتا ہے جو خصوصیت کے منافی ہے مثلاً ایک آدمی، ساتھی سے کہتا ہے، اعطنی کتاباً (مجھے کتاب دو) اس نے ایک کتاب دی تو وہ کہہ سکتا ہے میں نے دوسری کتاب طلب کی تھی اور میں نے یہ نہیں مانگی اور اگر اس نے کہا: اَعْطِنِیْ کِتَابًا مَّا، تو اب اس کا یہ کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ اس کا معنی ہے مجھے کوئی سی کتاب دے دو اور وہ اس نے دے دی۔

۲۔ ما نکرہ ہو تو اس کی اسم جنس کے ساتھ تفسیر کرنا مقام صفت پر ہے۔

۲۔ اگر بعوضۃ پر پیش پڑھیں تو پھر بھی، ما، میں دو صورتیں ہوں گی۔

۱۔ ما، موصولہ اس کا صلہ جملہ ہوگا عبارت ہے، ہو بعوضۃ، مبتدا کو حذف کر دیا گیا جیسے یہاں ہے۔

تَمَاماً عَلَی الَّذِیْ اَحْسَنَ (پ۸، الانعام ۱۵۴) پورا احسان کرنے کو اس پر جو نیک ہے

۲۔ یہ استفہامیہ ہو جب فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا، تو بعد میں گویا فرمایا: مَا بَعُوْضَۃٌ فَمَا فَوْقَھَا (کیا مچھر اور اس سے بھی بڑھ کر سے وہ مثال بیان کرتا ہے)

بلکہ اس سے بھی کم کی مثال کثرت کے ساتھ دے سکتا ہے، محاورہ ہے، فلان لا یبالی بما وھب ما دینار و دینار ان (یعنی وہ کثرت کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہبہ کرتا ہے)

پانچواں مسئلہ: صاحب کشاف کا کہنا ہے، ضرب المثل کی اصل "ضرب اللبن" (اینٹ بنانا) اور ضرب الخاتم (مہر لگانا) ہے

چھٹا مسئلہ: بعوضۃ پر نصب، مثلاً سے عطف بیان ہے یا یضرب کا مفعول اور مثلاً حال نکرہ مقدم یا یہ یضرب کا مفعول ثانی ہے اور معنی جعل کو متضمن ہے، یہ تب ہے جب ما صلہ یا ابہامیہ ہو، اگر یہ "بعوضۃ" کی تفسیر ہے تو اس کے تابع ہوگا، مفسِر، مفسَّر دونوں مل کر عطف بیان یا مفعول ہوں گے اور مثلاً حال مقدم لیکن "بعوضۃ" کا مرفوع ہونا خبر مبتدا کی وجہ سے ہوگا اگر ما موصلہ یا معرفہ یا استفہامیہ ہو تو معاملہ بڑا واضح ہے لیکن اگر ابہامیہ ہو تو یہ جواب ہوگا گویا پوچھا گیا "مَاھُوَ" (وہ کیا ہے؟) تو جواب دیا: بعوضۃ (وہ مچھر ہے)

ساتواں مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں بعوض، بعض سے بمعنی قطع ہے مثلاً بضع، عضب اسی سے بعض الشی (شی کا حصہ) بعوض، فعول کے وزن پر صفت جیسے قطوع، ہاں اس پر اسم کا غلبہ ہو گیا، بعض نے کہا: اس کا اشتقاق، بعض الشی بمعنی قلت جثہ و چھوٹا پن ہے اور اس لیے بھی کہ شی کا بعض اس کے کل سے قلیل ہوتا ہے۔ اول وجہ قوی ہے۔

مچھر عجیب مخلوق

فرماتے ہیں، مچھر اللہ تعالیٰ کی عجیب مخلوق میں سے ہے یہ بہت ہی چھوٹا ہے، اسکی سونڈھ انتہائی چھوٹی پھر اس کے باوجود یہ مجوف ہوتا ہے اس کی سونڈھ اس قدر چھوٹی اور اس کی جوف ہونے کے باوجود ہاتھی اور بھینس کی جلد میں چوب دیتا ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی آدمی اپنی انگلی حلوہ میں داخل کردے حالانکہ وہ کس قدر سخت ہیں یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سونڈھ کے سر پر زہر رکھا ہے

آٹھواں مسئلہ: فَمَا فَوْقَهَا میں دو وجہیں

۱۔ اس سے مراد وہ اشیاء ہوں جو جثہ میں مچھر سے بڑی ہیں مثلاً مکھی، عنکبوت، حمار، کلب کیونکہ لوگ، اللہ تعالیٰ کے ان تمام کی مثال بیان کرنے کا انکار کرتے تھے۔

۲۔ اس سے مراد وہ اشیاء ہیں جو مچھر سے چھوٹی ہوں، محققین نے ان دلائل کی بنا پر اس قول کو اختیار کیا ہے۔

۱۔ اس تمثیل سے مقصود بتوں کی تحقیر ہے تو جس قدر مشبہ بہ (جس سے تشبیہ دی جائے) حقیر ہوگا اس معاملہ میں اس سے مقصود اکمل طور پر حاصل ہوگا۔

۱۔ یہاں غرض یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے حقیر شی کی مثال لانا ممتنع نہیں تو ایسے مقام پر لازم ہے کہ دوسری شی، حقارت میں پہلی شی سے کہیں زیادہ حقیر ہو جیسے کہا جاتا ہے۔ فلاں حصول دینار اور دینار سے مافوق (کم) میں خوب ذلت برداشت کرتا ہے تو یہاں مراد قلت ہے کیونکہ دینار سے کم میں ذلت اٹھانا حصولِ دینار کی ذلت سے زیادہ ہوتی ہے۔

۱۔ شی جیسے جیسے چھوٹی ہوگی اس کے اسرار پر اطلاع مشکل ہوگی تو جب وہ نہایت ہی چھوٹی ہوگی تو اس کا کامل علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہوگا تو چھوٹی چیز کی تمثیل، کمالِ حکمت پر دلالت کیلئے شی کبیر کی تمثیل سے اقویٰ قرار پائی۔

پہلے قول پر دو دلائل

اول قول (مچھر سے بڑی اشیاء مراد ہیں) والوں نے دو وجہ بیان کی ہیں:

لفظ فوق بلندی پر دال ہے جب کہا جاتا ہے یہ فلاں سے فوق ہے تو اس کا معنی شی کا بڑا ہونا ہے، منقول ہے ایک ایسے آدمی نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی مدح کی جس پر مخالفت کا اتہام تھا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

...دُوْنَ مَا تَقُوْلُ وَفَوْقَ مَا فِیْ نَفْسِكَ

جو تو نے کہا میں اس سے کم اور جو تیرے دل میں ہے اس سے بلند ہوں

یعنی جو تیرے دل میں میرے بارے میں غلط رائے ہے اس سے بھی بلند و بری ہوں۔

...قدیر

۲۔ مچھر سے بھی کم کی مثال کیا ہوگی، جبکہ یہ سب سے چھوٹا ہے؟

جواب: اول وجہ کا یہ ہے، ہر شی میں ثبوت صفت، دوسری شی میں ثبوت سے اقوی ہوتا ہے تو اقوی اس صفت میں اضعف سے فوق ہوگا محاورہ ہے ''ان فلانا فوق فلان فی اللوم والدناءة'' (فلاں، کمینگی اور دناءت میں فلاں سے فوق ہے) یعنی اس میں ملامت و کمینگی زیادہ ہے، اسی طرح جب کہا جاتا ہے کہ یہ صغر و چھوٹے پن میں فوق ہے تو اس کا صغر میں زیادہ ہونا لازم ہوگا۔

دوسرے کا جواب یہ ہے کہ مچھر کے پر کی مثال، مچھر سے کم کی مثال ہے متعدد مقامات پر رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی مثال مچھر کے پر سے ہی دی ہے۔

نواں مسئلہ: اَمّا، حرف، معنی شرط میں ہے، اسی لیے اس کے جواب میں 'فا' لائی جاتی ہے یہ تاکید کا فائدہ دیتا ہے جب تم نے زید کے جانے کا بتانا ہے اگر تم اس میں تاکید لانا چاہو کہ وہ بہر صورت چلا گیا ہے تو کہو، اما زید فذاھب جب یہ ثابت ہے تو سنیئے دو جملوں کو اما کے ساتھ لانے میں اہل ایمان کی عظیم تعریف اور یہ واضح کرنا ہے کہ یہی حق ہے اور کفار کی عظیم مذمت و تذلیل ہے

دسواں مسئلہ: حق کا مفہوم

الحق، ایسی ثابت شی جس کے انکار کی گنجائش ہی نہیں، جب کوئی معاملہ لازم و ثابت ہو تو کہا جاتا ہے، حق الامر و حقت کلمة ربك، پختہ بنا ہوئے کپڑے کو ثوب محقق کہا جاتا ہے۔

گیارھواں مسئلہ: ماذا، میں دو وجہ ہیں، ذا، اسم موصول بمعنی الذی تو یہ دو کلمات ہیں، یا یہ ما کے ساتھ دو کلمات سے مرکب ہو کر اسم واحد ہوا تو کلمہ واحد ہوگا، اب اس میں دو وجہ ہیں۔

۱۔ یہ بطور مبتدا مرفوع اور اس کی خبر ذا مع صلہ ہے۔

۲۔ یہ منصوب المحل ہے جیسے کہو، ما اراد اللہ

بارھواں مسئلہ: ارادہ کا مفہوم

ارادہ ایسی ماہیت جسے عاقل محسوس کرے اور اس کے اور علم، قدرت، الم و لذت کے درمیاں بداہۃً فرق پائے، جب معاملہ یوں ہے تو ماہیت ارادہ کی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

متکلمین کہتے ہیں ارادہ ایسی صفت ہے تو جواز کی ایک طرف کو دوسری طرف پر وقوع میں نہیں بلکہ ایقاع میں راجح کا تقاضا کرے۔ اسی آخری قید سے قدرت سے احتراز ہے۔

اللہ تعالیٰ اور ارادہ

اللہ تعالیٰ کے مرید (ارادہ والا) ہونے میں اختلاف ہے حالانکہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پہ جائز ہے نجاریہ کہتے ہیں اس میں سلبی معنی ہے کہ وہ مغلوب نہیں اور نہ مجبور۔

بعض کے قول میں یہ امر ثبوتی ہے، پھر ان کا اختلاف ہے شیخ جاحظ، کعبی اور ابوالحسن بصری کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا علم ایسے فعل پر مشتمل ہے جس میں مصلحت یا فساد ہے، اس علم کو وہ داعی یا صارف کا نام دیتے ہیں۔

ہمارے اصحاب، شیخ ابوعلی، ابوہاشم اور ان کے اتباع کہتے ہیں یہ علم سے زائد صفت ہے پھر اس صفت میں تقسیم ہے یہ ذاتیہ ہے تو یہ نجاریہ کا قول ثانی ہے اور یا یہ معنویہ ہوگی۔

اور یہ معنی اگر قدیم ہے تو یہ اشاعرہ کا قول ہے یا حادث، یہ حادث اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، یہ کرامیہ کا قول ہے یا کسی اور جسم کے ساتھ قائم ہے، یہ قول کسی کا نہیں یا موجود ہے لیکن محل میں نہیں، یہ قول ابوعلی، ابوہاشم اور ان کے اتباع کا ہے۔

تیرھواں مسئلہ: اِنَّهُ الْحَقُّ، کی ضمیر مثل کی طرف ہے یا "اَنْ يَّضْرِبَ" کی طرف۔ ان کے قول، مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا، سے مراد اس کا حقیر جاننا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول حضرت عبداللہ بن عمرو العاص کے بارے میں ہے یاعجبا لابن عمرو هذا

چودھواں مسئلہ: مثلاً پر تمیز کی وجہ سے نصب ہے، محاورہ ہے "غث ماذا أردت بهذا جوابا؟ جس آدمی نے ردی اسلحہ اٹھا رکھا ہو تو اسے کہا جائے تم اس سے کیا نفع حاصل کرو گے؟ یا یہ حال ہے، ارشاد الٰہی ہے:

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (پ ۸، الاعراف:۷۳) یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے

پندرھواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے ان کا کفر اور کلام اللہ کا حقیر جاننا ان الفاظ میں بیان کیا۔

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا اللہ کا اس مثال سے کیا مقصود؟

تو اس کا جواب دیا:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا بہت ساروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت ساروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے

ہدایت وگمراہی پر تفصیلی گفتگو

یہاں ہم ہدایت وگمراہی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں تا کہ یہ مقام اصل قرار پائے ان تمام معانی کیلئے جو ایسی آیات میں ہیں۔

اولاً ہم اضلال پر کلام کرتے ہیں۔اضلال، ہمزہ کبھی فعل غیر متعدی کو متعدی بنانے کیلئے آتا ہے مثلاً خرج، متعدی نہیں لیکن اخرج، متعدی ہے اور کبھی ہمزہ متعدی کو غیر متعدی بناتا ہے مثلاً کببته فاکب، (میں نے اسے اوندھا کیا تو وہ ہو گیا) کبھی محض وجدان (پالینے) کیلئے آتا ہے، عمرو بن معدیکرب سے منقول ہے اس نے بنوسلیم سے کہا: قاتلناکم فما اجنبناکم وھاجیناکم فما افحمناکم واسألناکم فما ابخلناکم۔ یعنی ہم نے تم سے قتال کیا ہم نے تمہیں نہ بزدل پایا ہم نے تمہاری ہجو کی شعر نہ کہنے والا پایا اور نہ بخیل۔

مثلاً، اتیت ارض فلان فاعمرتھا یعنی اسے ہم نے آباد پایا۔مخیل نے کہا:

تمنى حصين أن يسود خزاعة　　　فأمسى حصين قد أذل وأقهرا

یعنی اسے ذلیل ومقہور پایا گیا۔

سوال: یوں کہنا کیوں جائز نہیں کہ ہمزہ فقط غیر متعدی کو متعدی ہی بناتا ہے جو تم نے مثالیں دیں۔ کببته فاکب (میں نے اسے اوندھا کیا تو وہ جھک گیا) تو یہاں مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اس نے اپنے نفس کو چہرہ کے بل جھکا دیا کیونکہ ذکر تو فعل ہوتا ہے اور مفعولین محذوف ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں، رہا قول قاتلناکم فما اجبناکم تو اس سے مراد یہ ہوسکتی ہے ہمارے قتال نے تمہارے بزدل بنانے میں اثر نہیں کیا ہماری ہجو نے اور ہم نے تمہاری خاموشی پر اثر نہیں کیا اور یہ تاویل اشتراک کو بھی ختم کر رہی ہے

اللہ کی طرف سے گمراہی کا مفہوم

جب یہ ثابت ہے تو ہم کہتے ہیں "اضله الله" کے مفہوم کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ اسے اللہ نے گمراہ بنا دیا۔

۲۔ اسے اللہ نے گمراہ پایا۔

پہلی صورت میں الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس سے گمراہ کر دیا، اس میں دو صورتیں ہیں۔

۱۔ اسے اللہ تعالیٰ نے دین سے گمراہ کر دیا۔

۲۔ اسے اس نے جنت سے گمراہ کر دیا۔

اول صورت کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دین سے گمراہ کر دیا، تو دین سے گمراہ کر دینے کا معنی لغت میں ترک دین کی دعوت اور اس کی نظر میں دین کا بد ہونا ہے یہی وہ گمراہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی طرف منسوب کیا، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (پ۲۰،القصص:۱۵) تحقیق وہ دشمن ہے کھلا گمراہ کرنے والا

دوسرے مقام پر شیطان کے حوالہ سے فرمایا:

وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ (پ۵،النساء:۱۱۹) میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور ضرور اُمیدیں دلاؤں گا

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا (پ۲۴،فصلت:۲۹) اور کافر بولے اے ہمارے رب دکھا ہمیں وہ دونوں جن اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تو ہم انہیں اپنے پاؤں تلے ڈالیں

فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ (پ۱۹،النمل:۲۴،پ۲۱،العنکبوت:۳۸) شیطان نے ان کے اعمال ان کو خوش نما کر کے دکھائے اور ان کو سیدھے رستے سے روک دیا

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ (پ۱۳،ابراہیم:۲۲) اور شیطان کہے گا جب فیصلہ ہو چکے گا بیشک اللہ نے تم کو سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے جو تم کو وعدہ دیا تھا وہ میں نے تم سے جھوٹا کیا اور میرا تم پر کوئی قابو نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میری مان لی

اسی طرح اس گمراہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرعون کا طرف یوں کی:

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى (پ۱۶،طٰہٰ:۷۹) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور راہ نہ دکھائی

تمام اُمت کا اس پہ اتفاق ہے کہ گمراہی کا یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے جائز ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ کفر کی دعوت دیتا ہے اور نہ اس کی رغبت بلکہ اس سے منع اور اس پر زجر وعتاب کی وعید فرماتا ہے۔

جب لغت میں اضلال کا اصل مفہوم یہی ہے اور اس معنی کی اللہ تعالیٰ کی طرف بالاجماع نفی ہے تو اس سے یہ بھی سامنے آ گیا کہ ان الفاظ کو اپنے ظاہر پر نہ رکھنے پر بھی اجماع ہے، اسی وجہ سے اہل جبر وقدر نے تاویل کی ضرورت محسوس کی۔

اہل جبر نے یوں معنی کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں گمراہی کو پیدا کیا، انہیں ایمان سے روکا اور ان کے اور ایمان کے درمیان

آڑ بن گیا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اصل لغت میں اس کا حقیقی معنی یہی ہے کیونکہ اضلال کا معنی کسی شی کو گمراہ کر دینا ہے جیسا کہ اخراج و ادخال شی، کو داخل و خارج کر دینا ہے۔

معتزلہ کا مؤقف

معتزلہ کہتے ہیں یہ تاویل نہ تو لغت کے اعتبار سے درست ہے اور نہ عقلی دلائل کی بنا پر، لغوی کا بیان کئی دلائل سے ہے۔

۱۔ جو کسی کو راستہ سے جبراً قہراً روکتا ہے تو اسے لغت میں "اَضَلَّہٗ" نہیں بلکہ مَنَعَہٗ مِنْہُ یُصْرَفُہٗ عَنْہُ" کیا جاتا ہے، اَضَلَّہٗ عَنِ الطَّرِیْقِ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس پہ ایسا شبہ وارد کیا جائے جو اس پہ راستہ اسی طرح گڈمڈ کر دے کہ وہ منزل تک نہ پہنچ پائے

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس و فرعون دونوں کو "مُضِلّ" (گمراہ کرنے والے) قرار دیا حالانکہ وہ بالاتفاق اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ضلالت پیدا نہیں کر سکتے، جبریہ کے ہاں اس لیے کہ عبد، ایجاد پر قادر ہی نہیں، قدریہ کے ہاں اس لیے کہ عبد ایسی نوع کے ایجاد پر قادر نہیں جب بالاتفاق نفیِ خالقیت کے باوجود یہاں لفظ مُضِلّ، حقیقت پر ہے تو ہم نے جان لیا کہ لفظ مُضِلّ، کی وضع لغت میں خالقِ ضلالت کیلئے نہیں۔

۳۔ اضلال، ہدایت کے مقابل ہے تو جس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ میں نے ہدایت دی لیکن اس نے ہدایت نہ پائی اس طرح اس کی صحت بھی ضروری ہے کہ میں نے اسے گمراہ کیا مگر گمراہ نہ ہوا، جب معاملہ یوں ہے تو اضلال کا خلقِ ضلالت پر حمل محال ہوگا

دلائل عقلیہ کی تفصیل

دلائل عقلیہ کا بیان ان وجوہات سے ہے:

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے میں گمراہی پیدا کرے پھر اسے ایمان کا مکلف ٹھہرائے تو یہاں اجتماع ضدین کا مکلف بنانا ہے جو بیوقوفی اور ظلم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (پ۲۴، فصلت:۴۶) اور تیرے رب نے کسی بندے کے ساتھ ظلم نہ کیا

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (پ۳، البقرۃ:۲۸۶) وہ ہر نفس کو اس کی وسعت کے مطابق ہی تکلیف دیتا ہے

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (پ۱۷، الحج:۷۸) اور نہ بنائی تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی

۲۔ اگر اللہ تعالیٰ جہالت کا خالق اور مکلفین پر معاملات گڈمڈ کرنے والا ہو تو بندے کی ذمہ داریوں کی تفصیل و بیان کرنے والا نہ ہوتا حالانکہ اُمت کا اتفاق ہے کہ ان کی تفصیل و وضاحت فرمانے والا وہی ہے۔

۳۔ اگر اللہ تعالیٰ بندوں میں گمراہی پیدا اور ایمان سے روک دے تو نزول کتاب اور ان کی طرف بعثتِ رسل میں کوئی فائدہ ہی نہیں کیونکہ جس کا حصول ممکن نہیں اس کے حصول کیلئے کاوش عبث و پاگل پن ہوتا ہے۔

۴۔ متعدد آیات میں بہت بڑا تضاد سامنے آجائے گا مثلاً

فَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ	(پ۳۰، الانشقاق:۲۰)	تو کیا ہوا انہیں ایمان نہیں لاتے ؟
فَمَالَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ	(پ۲۹، المدثر:۴۹)	تو انہیں کیا ہوا نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں؟
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا	(پ۱۵، الاسراء:۹۴)	اور کس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر صرف یہی کہنے لگے اللہ نے کیا آدمی کو رسول بنا کر بھیجا؟

یہ تمام آیات آشکار کر رہی ہیں کہ اللہ کی ذات ایمان لانے میں کوئی رکاوٹ نہیں البتہ رکاوٹ اِن کا یہ انکار ہے کہ انسان کو رسول کیوں بنایا گیا، ارشاد ہوتا ہے

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ	(پ۱۵، الکہف:۵۵)	اور لوگوں کو کس چیز نے اس سے روکا کہ ایمان لاتے جب ہدایت ان کے پاس آئی اور اپنے رب سے معافی مانگتے۔
كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ	(پ۱، البقرۃ:۲)	اللہ کا تم کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی دی
اَنّٰى تُصْرَفُوْنَ		تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟
اَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ		تم کہاں بھاگتے ہو؟

اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں دین سے گمراہ اور ایمان سے دور کیا ہوتا تو یہ آیات باطل ہو جائیں گی۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے لشکر کی اس پر مذمت فرمائی کہ وہ لوگوں کو دین سے گمراہ اور حق سے دور کر دیتے ہیں، اپنے بندوں اور رسول کو ان الفاظ میں اس سے پناہ کا حکم دیا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ	(پ۳۰، الناس:۱تا۴)	تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب ہے سب لوگوں کا بادشاہ سب کا خدا اس کے شر سے جو دل میں برے خطرے ڈالے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (پ۳۰، الفلق:۱) تم فرماؤ میں اس کی پناہ لیتا ہوں جو صبح کو پیدا کرنیوالا ہے

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ (پ۱۸، المؤمنون:۹۷) اور تم کہو اے میرے رب تیری پناہ شیطان کے وسوسوں سے

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (پ۱۴، النحل:۹۸) اور جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو دین سے گمراہ کرتا ہے جیسے شیاطین گمراہ کرتے ہیں تو وہ بھی انہیں کی طرح مستحق مذمت ہوتا اور اس سے بھی انہیں کی طرح پناہ مانگنا لازم ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو اکثر مخلوق کی گمراہی کی وجہ سے اپنا دشمن جاننا لازم ہوتا جس طرح اسی بجہ سے شیطان کو اپنا دشمن ماننا لازم ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مذمت اکثر ہوگی کیونکہ ابلیس کا گمراہ کرنا حصولِ ضلالت میں اپنے وجود و عدم میں برابر ہے بخلاف اللہ تعالیٰ کی گمراہی یہ ضلالت میں بہر صورت مؤثر ہوگی تو اس سے لازم آجائے گا ابلیس تمام قبائح و برائیوں سے پاک اور یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو اب کلیۃً تمام مذمت ابلیس سے ختم اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جائے گی۔ حالانکہ اس کی ذات اقدس ظالموں کے اس قول سے بالاتر و پاک ہے

۶۔ اللہ تعالیٰ نے دین سے گمراہ کرنے کی نسبت اپنے سے علاوہ کی طرف کی اور اس وجہ سے ان کی مذمت فرمائی، ارشاد فرمایا:

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۷۹) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہدایت نہ دی

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (پ۱۶، طٰہٰ:۸۵) اور ان کو سامری نے گمراہ کیا

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (پ۸، الانعام:۱۱۶) اے سننے والے زمین میں اکثر وہ ہیں کہ اگر تو ان کی پیروی کرے تو تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (پ۲۳، ص:۲۶) تحقیق جو اللہ کی راہ سے بہکتے ہیں ان کیلئے سخت عذاب ہے اس پر کہ وہ حساب کے دن کو بھول بیٹھے

ابلیس سے یوں حکایت کی:

وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ (پ۵، النساء:۱۱۹) میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور ضرور انہیں آرزوئیں دلاؤں گا اور ضرور انہیں کہوں گا

تو اب انہوں نے حقیقۃً لوگوں کو دین سے گمراہ کیا یا اللہ ہی نے انہیں گمراہ کیا یا گمراہی اللہ تعالیٰ اور ان کی طرف یعنی دونوں کی طرف سے مشترکہ ہے، اگر گمراہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ یہ، تو لازم آئے گا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایسی چیز منسوب کی اور انہیں عیب لگایا اور ان کی مذمت کی جو انہوں نے کیا ہی نہیں حالانکہ اللہ اس سے بلند ہے، اگر اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے میں ان کے ساتھ شریک ہے تو ایسے فعل پر ان کی مذمت کیسے جائز ہوگی جس میں خود ہی برابر طور پر شریک ہے، جب دونوں صورتیں فاسد ٹھہریں تو خلق کی ضلالت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کرنا ہی درست ہوگا۔

اکثر آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے گمراہی کی نسبت عاصیوں کی طرف کی ہے، فرمایا:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (پ ۱، البقرۃ:۲۶) اور اس سے صرف بے حکمے ہی گمراہ ہوتے ہیں

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (پ ۱۳، ابراہیم:۲۷) اور اللہ ظالموں پر گمراہی مسلط کر دیتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (پ ۶، المائدۃ:۶۷) اور اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ اور اللہ حد سے بڑھنے والے اور شک لانیوالے کو یونہی گمراہ کرتا ہے (پ ۲۴، غافر:۳۴)

جو گمراہی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اگر یہ وہی ہے جس پر یہ لوگ ہیں تو اب ثابت کیلئے اثبات ہوگا اور یہ محال ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے اُلوہیت کی نفی یوں کی ہے کہ جن کی وہ عبادت کرتے یہ حق کی طرف سے ہادی نہیں۔

اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى تو کیا جو حق کی راہ دکھائے تو اس کے حکم پر چلنا چاہیے یا اس کے جو خود ہی راہ نہ پائے جب تک راہ نہ دکھایا جائے۔ (پ ۱۱، یونس:۳۵)

ان اشیاء سے ربوبیت کی نفی کی کہ یہ ہادی نہیں اور اپنی ربوبیت ثابت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہادی ہے، اگر اللہ تعالیٰ حق سے گمراہ کرتا ہو تو وہ گمراہی میں ان کے برابر ہوا تو پھر ان کی اتباع سے منع کیوں کیا بلکہ خود گمراہی کا زیادہ پھیلانے والا ہوگا کیونکہ بُت جسطرح ہادی نہیں، گمراہ بھی نہیں کر سکتے اور اللہ تعالیٰ تو ہادی ہونے کے ساتھ گمراہ کرنے والا بھی ہو جائے گا۔

۹۔ اللہ تعالیٰ نے یہ گمراہی ان کے عمل پر بطور سزا و عقوبت ذکر کی ہے اگر مراد وہی گمراہی ہے جس پر وہ تھے تو یہ ان پر اسی عمل کی سزا ہے جس میں وہ ملوث، مستغرق اور لذت و سرور پا رہے تھے اگر ایسا جائز ہے تو پھر زنا کی سزا، زنا اور شرب خمر کی سزا کا کیا معنی؟ شرب خمر جائز ہونا چاہیے، حالانکہ یہ جائز نہیں۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی

وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ (پ۱، البقرۃ:۲۶،۲۷)

اور اس سے بے حکمے ہی گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں

واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ گمراہی ان پر اس وقت مسلط کرتا ہے جب وہ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ کر نافرمان بن جاتے ہیں، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا گمراہ ہونا ان کے فاسق اور ناقضِ عہد ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ گمراہی، ان کے فسق ونقض عہد کے بنا پر ہے۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب، اضلال (گمراہ کرنا) کی کتاب میں تفصیل دی ہے کہ یہ بطور آزمائش وامتحان ہے یا بطور سزا وعقوبت، ابتلاء کے حوالہ سے فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَاۤ اَصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (پ۲۹، المدثر:۳۱)

اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے ہی کیے اور ہم نے یہ گنتی نہ رکھی مگر کافروں کی جانچ کیلئے۔

تو یہاں واضح کیا کہ اس کا بندے کو گمراہ کرنے، کا معنی یہ ہے کہ وہ بطور آزمائش آیتِ متشابہ یا عملِ متشابہ نازل کرتا ہے جس سے غرضِ حقیقت معروف ومعلوم نہیں ہوتی، اس سے گمراہ وہ ہوگا جو مقصود سے آگاہ نہیں اور نہ ہی بطریق حکمت اس میں غور وخوض کرے گا بلکہ مجمل باطل کی تفصیل میں شبہات سے استدلال کرے گا، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (پ۳، آل عمران:۷)

ہاں وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو

بطور عقوبت وعبرت یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (پ۲۴، غافر:۷۱)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی کھولتے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں دہکائے جائیں گے پھر ان سے فرمایا جائے گا کہاں گئے وہ جو تم شریک بناتے تھے اللہ کے مقابل، کہیں گے وہ تو ہم سے گم گئے بلکہ ہم پہلے کچھ پوجتے ہی نہ تھے اسی طرح اللہ کافروں کو گمراہ کرتا ہے

تو بیان کر دیا کہ اللہ کا اضلال و گمراہی ان دو معانی میں ہی محدود ہے، جب اضلال کی تفسیر ان میں سے ایک ہے تو لازم ہے کہ دفعِ اشتراک کی وجہ سے ان دو اقوال کے علاوہ کے ساتھ تفسیر نہ ہو، تو ثابت ہوا کہ اضلال کو کفر و گمراہی کی خلق پر محمول کرنا جائز نہیں، جب یہ ثابت ہو گیا تو اب ہماری سنیے۔

ہم نے پہلے واضح کیا اضلال کا لغوی معنی، باطل کی طرف دعوت، اس کی ترغیب اور اس کے قبائح و برائیوں کو مخفی رکھنے کی کاوش ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔ جو تاویل جبریہ نے کی اسے ہم نے باطل قرار دیا لہٰذا دیگر تاویلات کی ضرورت ہے۔

دیگر تاویلات

۱۔ جب کوئی کسی حصول شی کے وقت اپنے اختیار سے گمراہ ہو حالانکہ اس شی کا اس کی گمراہی میں کوئی دخل نہیں تو اس شی کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے اسے گمراہ کر دیا، اللہ تعالیٰ نے بتوں کے بارے میں فرمایا:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

اے میرے رب تحقیق بتوں نے بہت سارے لوگ بہکا دیے

(پ ۱۳ ابراہیم: ۳۶)

یعنی ان بتوں کے سبب یہ گمراہ ہوئے۔

وَلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا

نہ یغوث، یعوق اور نسر کو اور یقیناً انہوں نے بہتوں کو بہکایا

(پ ۲۹ نوح: ۲۳، ۲۴)

یعنی بہت سے لوگ ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا

(پ ۶ المائدۃ: ۶۴)

اور اے محبوب یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اُترا اس سے ان میں بہتوں کو شرارت اور کفر میں ترقی ہو گی

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا (پ ۲۹ نوح: ۶)

تو میرے بلانے سے ان کا بھاگنا ہی بڑھا

یعنی میری دعوت و تبلیغ نے ان کے فرار میں ہی اضافہ کیا۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ

تم نے ان کو ٹھٹھا بنا لیا یہاں تک کہ میری یاد بھول گئے

(پ ۱۸ المؤمنون: ۱۱۰)

حالانکہ انہوں (انبیاء) نے حقیقتِ نسیان پیدا نہیں کیا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتے اور اس کی طرف دعوت دیتے رہے لیکن ان سے ان کا مذاق، نسیان کا سبب بنا تو بھلانے کی نسبت ان کی طرف کر دی۔

سورۂ برأت میں فرمایا:

وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (پ۱۱، التوبۃ:۱۲۴، ۱۲۵)

جب کوئی سورت اُترتی ہے تو ان میں سے کوئی کہنے لگتا ہے کہ اس نے تم میں کس کے ایمان کو زیادہ کیا ہے تو وہ جو ایمان والے ہیں ان کے ایمان کو اس نے زیادہ کیا اور وہ خوشیاں رہے ہیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے انہیں اور پلیدی پلیدی بڑھا دی

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ شرائع اور احکام پر مشتمل سورت کا نزول لوگوں کے احوال واضح کر دیتا ہے کچھ اس سے اصلاح کر لیتے ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا اور کچھ اس کے خلاف فساد برپا کرتے تو ان کے کفر میں اضافہ ہوتا ہے تو اب اضافہ ایمان اور اضافہ کفر کی نسبت سورت کی طرف کر دی کیونکہ جیسے اس کے نزول پہ لوگوں کی اصلاح ہو رہی ہے اس طرح اس سے لوگ فساد بھی برپا کر رہے ہیں، تو اسی طرح ہدایت واضلال کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر دی گئی ہے جبکہ یہ دونوں ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مثال بیان کرنے سے پیدا ہوئے ہیں، سورۃ المدثر میں فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا (پ۲۹، المدثر:۳۱)

اور ہم نے یہ گنتی صرف کافروں کی جانچ کیلئے رکھی تا کہ کتاب والوں کو یقین آئے ایمان والوں کا ایمان بڑھے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ بندوں کے امتحان کیلئے جہنم کے فرشتوں کا ذکر کیا ہے تا کہ مخلص اور متذبذب میں امتیاز ہو جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی اصلاح کریں اور کفار فساد، تو اضافہ ایمان اور اس کی ضد کفر میں اضافہ کو مبتلا لوگوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا: لِيَزْدَادَ اور يَقُوْلُ پھر اس کے بعد فرمایا:

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (پ۲۹، المدثر:۳۱)

اس مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے اور اللہ اسی طرح جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے

تو ان کے اِضلال وہدایت کی اپنی طرف نسبت کی جبکہ پہلے ان دونوں کی نسبت اہل ایمان و کفار کی طرف تھی تو اللہ تعالیٰ

نے واضح کر دیا کہ اِضلال کا مقصد امتحان ہے، عرف میں محاورہ ہے "امرضني الحب (یعنی میں سبب محبت بیمار ہوا) قد افسدت فلانة فلاناً (فلاں، فلانہ کی وجہ سے برباد ہوا) حالانکہ بعض اوقات اس فلانہ کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا، شاعر نے کہا:

دع عنك لومي فان اللوم اغراء

(میری ملامت کو ترک کر دے کیونکہ ملامت دھوکہ ہے)

یعنی ملامت کیا جانے والا ملامت سے دھوکہ کھاتا ہے اسی معنی سے اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز ہے بایں طور کہ کفار ان آیات کے سبب گمراہ ہوئے جو امتحانات پر مشتمل تھیں، اس آیت مبارکہ میں جب کفار نے کہا: ان امثال کی ضرورت اور ان میں کیا فائدہ ہے؟ تو ان پر امتحان سخت ہو گیا تو یہ اضافت خوبصورت قرار پائی۔

۲۔ گمراہ قرار دینا

اِضلال سے مراد گمراہ قرار دینا ہے، محاورہ ہے اضلہ یعنی اس نے فلاں کا نام گمراہ رکھا اور اس پر گمراہی کا حکم لگایا جب کوئی کسی کو کافر کہے تو کہا جاتا ہے، اکفر فلان فلاناً، کمیت کا یہ شعر پڑھو۔

وطائفة قد أكفروني بحبكم　　　وطائفة قالوا مسيء ومذنب

(کچھ لوگوں نے مجھے تمہاری محبت کی وجہ سے کافر کہا اور کچھ نے گنہگار و برا کہا)

طرفہ کہتے ہیں

وما زال شربي الراح حتى أضلني　　　صديقي و حتى ساء ني بعض ذلكا

مراد یہ کہ اس نے مجھے گمراہ کہا۔ اسی وجہ کو قطرب اور کثیر معتزلہ نے اختیار کیا، بعض اہل لغت نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا جب کسی کو گمراہ کہنا ہو تو ضللته تضليلاً اسی طرح جب فاسق و فاجر کہنا ہو فسقته و فجرته کہا جاتا ہے۔

جواب: اس کا جواب یوں ہے کہ جب وہ خود گمراہ ہو چکا ہے تو اس پر گمراہی کا حکم لگایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ حکم اس کے گمراہی کے لوازم میں سے ہے اور ملزوم کا اطلاق لازم پر مجازِ مشہور ہے اور یہ مستعمل بھی ہے کیونکہ جب آدمی دوسرے کو کہتا، فلاں ضال (فلاں گمراہ ہے) تو پوچھا جا سکتا ہے تو نے اسے کیوں گمراہ بنا دیا تو معنی ہے کہ یہ نام تو نے اس کا کیوں رکھا اور یہ حکم اس پر کیوں لگایا تو اب اس صورت میں اضلال کا معنی حکم لگانا اور نام رکھنا ہے۔

۳۔ کھلا چھوڑنا

اضلال کا معنی کھلا چھوڑنا ہے یعنی قہر و جبر سے منع نہ کرنا، جب کسی کو گمراہی میں کھلا چھوڑ دیا جائے تو کہا جاتا ہے اضلہ جب باپ اولاد کی تربیت پر توجہ نہ دے تو کہا جاتا ہے، أفسد فلان ابنه وأهلكه ودمر عليه، اسی کی مثل عربی کا شعر ہے:

اضاعونی وأی فتی أضاعوا لیوم کریهة وسداد ثغر

اپنی تلوار سیلابی زمین میں خراب وزنگ آلود ہونے تک چھوڑ دے، اسے کہا جاتا ہے افسدت سیفك واصدأته

۴- مراد عذاب دینا ہے

ضلالت واضلال سے مراد عذاب اور عذاب دینا ہے دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (پ۲۷،القمر:۴۷،۴۸)

اور مجرم گمراہ دیوانے ہیں جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر گھسیٹے جائیں گے اور فرمایا جائے گا چکھو دوزخ کی آنچ

یہاں کفار کے بارے میں بتایا کہ یہ روز قیامت ضلال میں ہوں گے اور وہ وہاں عذاب ہی ہے، دوسرے مقام پر فرمایا:

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ ثُمَّ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَیْئًا كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِیْنَ (پ۲۴،غافر:۷۱)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں دہکائے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا کہاں گئے وہ جن کو تم شریک بناتے تھے اللہ کے مقابلہ میں، کہیں گے وہ تو ہم سے گم ہو گئے بلکہ ہم پہلے کچھ پوجتے ہی نہ تھے اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے کافروں کو

یہاں بھی ضلال کی تفسیر عذاب سے ہی فرمائی۔

۵- ہلاک وباطل کرنا

اِضلال سے مراد ہلاک کرنا اور باطل کرنا ہے، ارشادِ الٰہی ہے

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (پ۲۶، محمد:۱)

جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے عمل برباد کر دیے

یعنی ان کے اعمال کو باطل وہلاک کر دیا جب پانی دودھ سے مل جائے تو کہا جاتا ہے۔ ضل الماء فی اللبن۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ میں نے پانی کو ہلاک وکالمعدوم کر دیا، جب میت کو قبر میں دفن ومخفی کر دیا جائے تو کہا جاتا ہے۔اضل القوم میتهم، نابغہ نے کہا

وآب مضلوه بعین جلیة وغودر بالجولان حزم ونائل

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَقَالُوْا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (پ۲۱،السجدة:۱۰)

تو بولے کیا جب ہم مٹی میں مل جائیں گے تو کیا پھر نئے بنیں گے

یعنی جب ہم دفن کردیتے ہیں تو ہمارے اشخاص مخفی ہو جاتے ہیں، اس مفہوم کی بنا پر معنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہلاک و معدوم کر دیا تو اس وجہ سے اِضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز ہو گی۔ یہ پانچ وجوہ اس صورت میں ہیں جب اِضلال سے دین سے گمراہ کرنا مراد ہو۔

۶۔ جنت سے گمراہ کرنا

اگر اِضلال سے مراد جنت سے گمراہ کرنا ہو، تو معتزلہ کہتے ہیں یہی حقیقی معنی ہے یہ تاویل نہیں بلکہ الفاظ کا اپنے ظاہر پر حمل ہے کیونکہ آیت کریمہ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کر دیا ہے اس میں یہ نشاندہی کوئی نہیں کہ اس نے انہیں کس سے گمراہ کیا ہے، ہم اسے اسی پہ محمول کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں طریق جنت سے گمراہ کر دیا ہے اور قرآن میں اس جنس سے جو بھی ہے اسے اسی پر محمول کریں گے، شیخ الجبائی کا یہی مختار ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (پ۱۷، الحج:۴)

جس پر لکھ دیا گیا ہے کہ جو اس کی دوستی کرے گا تو یہ ضرور اسے گمراہ کر دے گا اور اسے عذاب دوزخ کی راہ بتائے گا

یعنی اسے جنت اور اس کے ثواب سے گمراہ کر دیا۔

یہ تمام گفتگو تب ہے جب ہم ہمزہِ اضلال کو تعدیہ کیلئے مانیں۔

۷۔ گمراہ پایا

یہاں ہمزہ تعدیہ کیلئے نہیں بلکہ وجدان کیلئے ہے جیسے ابتدا میں گزرا جب کسی کا اونٹ گم ہو جائے تو کہتے ہیں، اَضَلَّ فُلَانٌ بَعِيْرَہٗ، (فلاں نے اونٹ گم پایا) اب اللہ تعالیٰ کے اضلال کا معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ پایا۔

۸۔ کفار کا قول

ارشادِ الٰہی "يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا" قول و کلام کفار کا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اس مثال سے کیا ارادہ کرتا ہے جس میں کوئی فائدہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: اس سے تو بہت سے لوگ گمراہ اور بہت سے ہدایت پانے والے ہیں تو انہوں نے یہ بات بطور استہزاء و مذاق کہی تو یہ کفار کا قول ہے تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

اس سے فاسق ہی گمراہ ہوں گے

یہ معتزلہ کی گفتگو کا خلاصہ ہے۔

جبریہ کہتے ہیں ہم نے تمہاری گفتگو سنی، اس کو جس عمدگی کے ساتھ، حسنِ ترتیب اور قوت سے تم نے بیان کیا ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ہم کیا کریں تمہارے تین دشمن ہیں جوان وجوہات حسنہ اور اعلیٰ دلائل سے تم پہ تشویش پیدا کرتے ہیں۔

۱۔ مسئلة الداعی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم و جہل، ہدایت دینے اور گمراہ کرنے پر قادر ان میں سے کیوں ایک کرتا ہے دوسرا کیوں نہیں کرتا؟

۲۔ مسئلة العلم۔ اس کی تفصیل ارشادِ الٰہی 'خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'۔ (پ۱ البقرۃ ۷) کے تحت گزری۔

ہم ان دو کے جواب میں تمہاری گفتگو کو قوی و کافی نہیں پاتے اور ہم بلاشبہ جانتے ہیں کہ تم اپنے ان جوابات میں جو کمزوری ہے ان سے خوب آگاہ ہو، ہم نے انصاف سے کام لیتے ہوئے تمہارے حسن کلام کا اعتراف کیا تم بھی انصاف سے کام لیتے ہوئے اعتراف کرلو کہ ان دو دلائل کا تمہارے پاس جواب نہیں کیونکہ محض تکرار اور تغافل عقلاء کے مناسب نہیں ہوتا۔

۳۔ اگر فعل عبد، اسی کی ایجاد ہے تو اسے وہی حاصل ہوگا جس کا وہ قصد کرے گا اب کوئی آدمی حصول علم اور ہدایت طلب کرتے ہوئے جہالت و گمراہی سے خوب بچے گا تو اب عبد کیلئے جہل و اضلال کیسے حاصل ہوگا باوجودیکہ اس نے تحصیلِ علم و ہدایت کا ہی ارادہ کیا تھا۔

سوال: جواباً اگر یہ کہا جائے کہ عبد پر ایمان، کفر اور جہل، علم کے ساتھ مشتبہ ہوگیا تو اس سے جہالت کے بارے میں اس نے گمان کرلیا کہ یہ علم ہے تو اس نے اس کے وقوع کا ارادہ کیا تو اسے جہالت ہی حاصل ہوگی۔

جواب: ان کا جہالت کو علم گمان کرنا خطا ہے اگر وہ اس نے اولاً اسے اختیار کیا تو یہ اپنے لیے جہالت و خطا اختیار کرنا ہے اور یہ ممکن نہیں اگر ہم کہیں کہ اس پر دوسرے ظنِ مقدم کی وجہ سے اشتباہ ہوگیا تو لازم آئے گا ہر ظن سے پہلے ظن ہو یہ سلسلہ غیر محدود تک جائے گا جو محال ہے

تین مقدمات

۴۔ تصورات غیر کسبی ہیں، تصدیقات بدیہی غیر کسبی اور تصدیقات تمام غیر کسبی، یہ تین مقدمات ہیں۔

پہلا مقدمہ: تصورات غیر کسبی

تصورات کے غیر کسبی ہونے کا بیان یوں ہے کہ جو ان کے اکتساب کا ارادہ کرے گا تو وہ ان کا تصور کرنے والا ہوگا یا نہیں ہوگا اگر تو یہ ان کا تصور رکھتا ہوگا تو ان کی تحصیل تصور محال ہوگا کیونکہ تحصیل حاصل محال ہے اور اگر یہ ان کا تصور نہیں رکھتا تو اس کا ذہن ان سے غافل ہوگا، شی سے غافل کا اسے طلب کرنا محال ہوتا ہے۔

دوسرا مقدمہ: تصدیقات بدیہیہ غیر کسبی

تصدیقات بدیہیہ غیر کسبی ہیں کیونکہ اطراف تصدیق کا حصول اس تصدیق کے جزم ذہنی کیلئے کافی ہوگا یا کافی نہ ہوگا، اگر صورت اول ہے تو تصدیق بطور وجوب نفی واثبات ان دونوں تصورات کے درمیان محدود ہوگی اور جب یہ حال ہو تو وہ مقدور نہیں ہوگی اور اگر دوسری صورت ہے تو تصدیق، بدیہی نہ رہی بلکہ اس کا حصول کسی پر موقوف ہوگا۔

تیسرا مقدمہ: تصدیقات غیر کسبی

تمام تصدیقات کا غیر کسبی ہونا یوں ہے کہ یہ نظریات اگر ان بدیہیات سے واجب اللزوم ہوں تو یہ بدیہات مقدور نہ ہوں گے لہٰذا یہ نظریات بھی غیر مقدور ہوں گے اور اگر یہ ان بدیہیات سے واجب اللزوم نہیں تو ان بدیہیات سے ان نظریات پہ استدلال ممکن نہیں تو ان نظریات سے حاصل اعتقادات علوم نہ ہوں گے بلکہ یہ مقلد کے حاصل اعتقاد ہوں گے حالانکہ اسی میں ہماری گفتگو ہی نہیں۔

تو ثابت ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف اہتدا و اضلال (ہدایت و گمراہی) کی عدم نسبت میں تمہاری گفتگو ان عقلی قطعی دلائل کے معارض ومخالف ہے جن کا جواب نہیں۔

مذکورہ تاویلات پر گفتگو

اب ہم ان مذکور تاویلات پر گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں۔

تاویل اول ساقط ہے اس لیے کہ انزالِ متشابہات کا تحریک دواعی میں اثر ہے یا اس میں ان کا کوئی اثر نہیں؟ اگر اول صورت ہے تو تمہارے قول پر دو قباحتیں لازم آ رہی ہیں۔

دو قباحتیں

۱۔ ہم نے، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ، کی تفسیر میں واضح کیا تھا، جب ترجیح حاصل ہوگی تو بلاشبہ وجوب کا حصول ہوگا اس لیے کہ استوا اور اس وجوب کے درمیان کوئی واسطہ نہیں جو نقیض سے مانع ہو تو جب انزال متشابہات نے ترجیح میں اثر ڈالا اور یہ ثابت ہے کہ ترجیح کے حصول پر وجوب کا ثبوت ہے تو اب جبر لازم اور تمہارا قول باطل۔

۲۔ تسلیم ترجیح حدِ وجوب تک نہیں پہنچاتی البتہ مکلف کیلئے عذر و علت کا ازالہ ہونا چاہیے تو ان متشابہات کا مکلف پر انزال ہوا اور ان میں جانب ضلالت کو جانب ہدایت پر ترجیح ہے جو مکلف کے طاعت پہ عدمِ اقدام کیلئے عذر ہے تو یہ قباحت لازماً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی یا ان کا اثر جانب ہدایت سے جانب ضلالت کی طرف اقدام پر اثر نہ ہوگا، ان متشابہات کی نسبت

ان کی گمراہی کے ساتھ صریر باب (دروازے کی آواز) اور نعیق غراب (کوے کی آواز) کی سی ہوگی تو جیسے ان کی گمراہی ان اُمور اجنبیہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے اسی طرح ان کی نسبت ان متشابہات کی طرف بھی ہرگز نہیں کی جا سکتی، اب ان کی تاویل باطل ٹھہرے گی۔

دوسری تاویل: اس سے مراد نام اور حکم ہے اگرچہ یہ انتہائی بُعد ہے لیکن اشکال باقی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کا نام رکھا اور اس پر حکم جاری کیا تو اگر مکلف وہ بجا نہیں لاتا تو اللہ تعالیٰ کی خبرِ صادق، کاذب اور اس کا علم، جہالت قرار پا جائے گا یہ محال ہے جو محال کی طرف پہنچانے والا ہو وہ بھی محال ہوگا تو اسے مکلف کا بجا نہ لانا محال اور بجالانا واجب ولازم، اور یہی چیز ہے جس سے تم بھاگے تھے اسی کے ساتھ یقیناً ملاقات ہوگی، یہاں بحث ان دو مشہور جوابات پر ہوئی ہے لیکن ہر عاقل بداہۃً ان کی کمزوری وسقوط سے آگاہ ہے۔

تیسری تاویل: جو تخلیہ (کھلا چھوڑنا) اور ترک منع ہے یہ اس صورت میں اضلال (گمراہ کرنا) ہوگا جب والد کیلئے اولاد کو منع کرنا اولیٰ واحسن ہو، اگر اولاد کا یہ حال ہو کہ اگر اسے والد منع کرے تو اس سے پہلے سے بھی عظیم فساد ہو یا ہو جائے تو ایسی صورت میں کوئی بھی نہیں کہے گا، اضلہ وافسدہ، (والد نے انہیں گمراہ کیا) یہاں معاملہ اس کے خلاف ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ مکلف کو جبراً منع کرے تو پہلے سے بھی بڑا فساد برپا ہوگا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکلف کو خراب کیا کہ اس نے ضلالت سے منع نہ کیا حالانکہ اگر وہ منع فرماتا تو عظیم فساد لازم آجاتا۔

چوتھی تاویل: یہ شیخ قفال نے اعتراض اٹھایا کہ ہم ضلال بمعنی عذاب تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ارشادِ گرامی

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (پ۲۷، القمر:۴۷) یقیناً مجرم گمراہ اور دیوانے ہیں

یہاں ضلال سے دنیا میں حق سے اعراض اور سعر اُخروی عذاب مراد ہو سکتا ہے اور یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ، سُعُر کا صلہ ہو، ارشاد الٰہی

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ ثُمَّ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَیْـًٔا كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِیْنَ (پ۲۴، غافر:۷۱)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں دہکائے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا کہاں گئے وہ جن کو تم شریک بناتے تھے اللہ کے مقابلہ میں، کہیں گے وہ تو ہم سے گم ہو گئے بلکہ ہم پہلے کچھ پوجتے ہی نہ تھے اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے کافروں کو

ضَلُّوْا عَنَّا کا معنی وہ باطل ٹھہرے اور آج کے دن ان سے کوئی نفع نہ ہوا جن سے شفاعت کے ہم امیدوار تھے پھر کَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ، اس کا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ روز قیامت اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے۔

یہ معنی بھی ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ذلیل کیا کہ انہیں قبول حق کی توفیق نہ ہوئی، ان کی باطل سے محبت اور تدبر سے اعراض تھا، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا، روز قیامت آئے تو ان کے وہ اعمال باطل قرار پائے جن سے وہ دنیا میں نفع کی اُمید رکھتے تھے۔

پانچویں تاویل: ہلاک کرنا، یہ اس مقام کے مناسب نہیں کیونکہ ارشاد الٰہی ہو يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، اِضلال کے بمعنی اہلاک سے مانع ہے

چھٹی تاویل: کہ طریق جنت سے گمراہ کیا یہ ضعیف ہے کیونکہ فرمان ہے يُضِلُّ بِهٖ یعنی ان آیات قرآن کے سببِ سماع سے گمراہی ہوئی اور طریقِ جنت سے گمراہی کا سبب ان کا آیات کا سماع نہیں بلکہ اُن کا برائیوں پر اقدام ہے لہٰذا اس معنی پہ محمول نہیں کیا جاسکتا۔

ساتویں تاویل: يُضِلُّهٗ کا معنی اسے گمراہ پایا، ہم نے واضح کردیا ہے کہ اس معنی پر کوئی دلیل نہیں اور پھر یہاں اِضلال حرف با سے متعدی ہے حالانکہ اِضلال بمعنی وجدان حرف با سے متعدی نہیں ہوتا۔

آٹھویں تاویل: یہ تاویل اس آیت میں تفکیک نظم (جدائی) پیدا کرے گی، يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، کلامِ کفار اور "مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ" کلام اللہ ہوگا اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں بلکہ درمیان میں واوٗ ہے جو عطف ہی کا کام دیتا ہے۔ (جو بتاتا ہے کہ کلام ایک ہی ہے)

پھر یہاں چلو یہ مفہوم ہوگیا لیکن سورۃ المدثر میں الفاظ ہیں:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہے

یہ ارشادِ الٰہی بلاشبہ اِضلال کے حوالہ سے ہی ہے۔

ہدایت کا مفہوم

لفظ ہدایت کئی معانی میں آتا ہے

۱۔ دلالت و بیان، ارشاد الٰہی ہے

اَوَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا (پ۲۱، السجدۃ:۲۶) کیا انہیں اس پر ہدایت نہ ہوئی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے ہلاک کیے

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ (پ۱، البقرۃ:۳۸) بہر حال جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے جو میری ہدایت کا پیرو ہوا

یہ بات تبھی درست ہے جب ہدایت بیان سے عبارت ہو۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (پ۲۷، النجم:۲۳) وہ تو بالکل گمان اور نفس کی خواہشوں کے پیچھے ہیں حالانکہ یقینی طور پر ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے بیان و ہدایت آئی

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (پ۲۹، الانسان:۳) ہم نے اسے راہ دکھائی حق پر چلنا یا ناشکری کرنا

یعنی وہ شکر کرے یا کفر، ہدایت، دونوں حالتوں میں اسے حاصل ہے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (پ۲۴، فصلت:۱۷) ہم نے ثمود کو ہدایت دی تو انہوں نے سوجھنے پر اندھے ہونے کو پسند کیا

ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ (پ۸، الانعام:۱۵۴) پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی پورا احسان کرنے کو جو نیکوکار ہے اور جو ہر چیز کی تفصیل، ہدایت اور رحمت کو کہیں وہ اپنے رب سے ملنے پر ایمان لائیں۔

اور یہ بات کسی مومن سے نہیں کہی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے مخالفین سے حکایت کی۔

وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ (پ۲۳، ص:۲۲) اور خلاف حق نہ کیجئے اور ہمیں سیدھی راہ بتائیے

یعنی ہمارے رہنمائی کریں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الۡهُدَی الشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ ؕ وَ اَمۡلٰی لَهُمۡ (پ۲۶، محمد:۲۵)

تحقیق وہ جو ہدایت کے واضح ہونے کے بعد پیچھے پلٹ گئے شیطان نے انہیں فریب دیا اور انہیں دینا میں مدتوں رہنے کی امید دلائی۔

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ (پ۲۴، الزمر:۵۶)

کہ کہیں کوئی نفس یہ نہ کہے کہ ہائے افسوس ان کوتاہیوں پہ جو میں نے اللہ کے بارے میں کی۔

یہ کفار سے مخاطبت وگفتگو ہے:

۲۔ **دعوت دینا**، ارشادِ الٰہی ہے:

وَ اِنَّکَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (پ۲۵، الشوریٰ:۵۲)

اور یقیناً تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو

یعنی تم دعوت دیتے ہو

وَّ لِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ (پ۱۳، الرعد:۷)

اور ہر قوم کیلئے راہنما ہے

یعنی ایسا داعی جو اسے گمراہی یا ہدایت کی دعوت دے۔

۳۔ **اللہ کی توفیق**، جو الطاف ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔

یہ اہل ایمان کو، ان کے ایمان پہ جزا، اس پر معاونت اور طاعت الٰہی میں اضافہ کی صورت میں ہے تو یہ ان کیلئے بطور ثواب ہے۔ اس کی ضد کفار کیلئے کہ ان سے یہ توفیق چھن جاتی ہے تو باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی مگر وہ گمراہ قرار پاتے ہیں، اس معنی پر دلیل یہ ارشاداتِ الٰہی ہے:

وَ الَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی (پ۲۶، محمد:۱۷)

اور جنہوں نے توفیق پائی اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا

وَ یَزِیۡدُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًی (پ۱۶، مریم:۷۶)

جنہوں نے توفیق پائی اللہ اور ان کی ہدایت میں اضافہ کرے گا

وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (پ۳، آل عمران:۸۶)

اور اللہ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِينَ (پ ۱۳، ابراہیم: ۲۷)

اللہ ایمان والوں کو حق بات پر ثابت رکھتا ہے دنیا اور آخرت میں اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (پ ۳، آل عمران: ۸۶)

کیسے اللہ اس قوم کو ہدایت دے جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اور وہ اس بات پر شاہد ہیں رسول حق ہیں اور ان کے پاس واضح نشانیاں آئیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا

یہاں اطلاع ہے کہ انہیں ہدایت نہ دی اور ان کے پاس بینات و دلائل آئے تو یہ ہدایت بہر صورت بیان کے علاوہ ہے۔

وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ (پ ۲۸، التغابن: ۱۱)

جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت و توفیق فرما دے گا

أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ (پ ۲۸، المجادلۃ: ۲۲)

یہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرما دیا اور اپنی طرف سے روح سے ان کی مدد کی

۴۔ جنت کی طرف رہنمائی، ارشادِ الٰہی ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (پ ۶، النساء: ۱۷۵)

بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کی رسی مضبوط تھامی تو عنقریب اللہ ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی راہ دے گا

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (پ ۶، المائدۃ: ۱۵،۱۶)

تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب جو اللہ کی مرضی پر چلا اللہ اسے اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے اپنے حکم سے اور انہیں سیدھی راہ دکھاتا ہے

وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ (پ ۲۶، محمد: ۴-۶)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اللہ ہرگز ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا جلد انہیں راہ دے گا اور ان کے کام بنا دے گا اور جنت میں داخل کرے گا

شہادت وقتل کے بعد ہدایت، جنت کی طرف ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَات یَھْدِیھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ تَجْرِیْ مِن تَحْتِھِمُ الْاَنْھَارُ (پ۱۱،یونس:۹۰)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اللہ ان کو ان کے ایمان کی برکت سے ہدایت دے گا (ان کیلئے جنت ہے) جس کے نیچے نہریں جاری ہیں

شیخ جبائی نے یہی تاویل کی ہے۔

۵۔ ہدایت بمعنی مقدم ہونا

کسی کو کوئی آگے کرے تو کہا جاتا ہے: یھدی فلان فلاناً، ھدی کا لفظ ھدایۃ الطریق سے ماخوذ ہے کیونکہ دلیل، دلوں کو آگے کرتی ہے، عرب کہتے ہیں، اقبلت ھوادی الخیل (گھوڑوں کے چلانے والے آئے) گردنوں کو مقدم ہونے کی وجہ سے، ھوادی الخیل، کہا جاتا ہے۔

۶۔ فیصلہ کردینا

یھدیُ اس نے ہدایت دی، کا معنی اس نے فیصلہ کردیا۔ ان المؤمن مھتد، (مومن ہدایت یافتہ ہے) اس نام کی وجہ یہ ہے کہ ھداہ (اس نے ہدایت دی) کا اصلی معنی ہے کہ اس نے اسے ہدایت یافتہ بنایا۔ اس لفظ کا اطلاق بعض اوقات فیصلہ و نام رکھنے پر ہوتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیرَۃٍ وَلَا سَائِبَۃٍ (پ۷،المائدۃ:۱۰۳) اللہ نے مقرر نہیں کیا کان چرا اور نہ بجار

یعنی نہ اس نے اس کا حکم دیا اور نہ اسے مشروع کیا، فرمایا:

اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ (پ۳،آل عمران:۷۳) یقیناً ہدایت، اللہ کی ہی ہدایت ہے

یعنی ہدایت وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہدایت قرار دے۔

مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ (پ۱۵،الاسراء:۹۷) جس کو اللہ نے ہدایت دی وہی ہدایت یافتہ ہے۔

یعنی جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کا حکم نافذ کرے وہی ہدایت یافتہ ہونے کا مستحق ہوگا۔

معتزلہ نے یہ وجوہ و معانی ذکر کیے ہیں، ہم نے ان پر مسئلہ اِضلال کے تحت گفتگو کی ہے۔

جبریہ کا قول

جبریہ کہتے ہیں یہاں ایک اور معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ہدایت بمعنی خلق ہدایت وعلم ہو، ارشادِ الٰہی ہے:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (پ۱۱، یونس:۲۵) اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف پکارتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے

قدریہ کا انکار

قدریہ ان وجوہات کی بنا پر اسے ناجائز کہتے ہیں۔

۱۔ لغۃً اس شخص کے بارے میں ھداہ الیہ (اس نے ہدایت دی) کہنا صحیح نہیں جو کسی کو جبراً سلوک طریق پر اُبھارے البتہ اسے ردہ الی الطریق المستقیم، حملہ الیہ اور جرہ الیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن ھداہ الیہ نہیں کہا جاسکتا۔

۲۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہو تو امر ونہی، مدح وذم اور ثواب وعتاب باطل ٹھہریں گے۔

بندے کا کسب

سوال: اللہ تعالیٰ کی تخلیق تسلیم ہے لیکن کسب عبد کا ہے؟

جواب: کسب دو وجہ سے مردود ومدفوع ہے۔

۱۔ اس حرکت (کسب) کا وقوع اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہوگا یا اس کی تخلیق سے نہ ہوگا، اگر اس کی تخلیق سے ہی ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق فرمادیا تو اب بندے کا اسے بجانہ لانا محال ہوگا، جب تک اس کی تخلیق نہیں ہوتی تو اسے بندے کا بجا لانا محال تو اب اس پر مذکور اشکالات وارد ہوں گے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے نہیں بلکہ بندے کی ہے تو یہی اعتزال ہے

تین صورتیں

۲۔ اگر تخلیق، اللہ تعالیٰ کی اور کسب بندے کا ہے پھر تین میں سے ایک صورت ضرور ہوگی۔

یا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے تخلیق کیا پھر بندے نے اس کا کسب کیا یا بندے نے اس کا کسب پہلے کیا پھر اس کی اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی یا دونوں کا وقوع اکٹھا ہوا۔

اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق فرمادی تو اب بندہ اس کے کسب پر مجبور ہوگا تو لازم ہونا لوٹ آئے گا۔

اور اگر بندے کا کسب پہلے ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق پر مجبور ٹھہرے گا۔

اور اگر دونوں اکٹھے ہیں تو اب یہ چیز دونوں کے اتفاق کے بعد ہی ہو سکتی ہے لیکن یہ اتفاق ہمارے علم میں ہی نہیں تو اس اتفاق کا حصول لازماً نہ ہوگا۔

پھر یہ بھی کہ اس اتفاق کا حصول، دوسرے اتفاق کے بغیر نہ ہوگا کیونکہ یہ بھی بندے کا کسب و فعل ہے اور یہ سلسلہ غیر محدود ہوگا جو محال ہے۔

یہ معتزلہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

جبریہ اور دلائل عقلیہ

جبریہ کہتے ہیں ہم نے اس پر دلائل عقلیہ دیئے ہیں جن میں احتمال و تاویل کی گنجائش نہیں کہ ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ، جو تم نے دلائل نقلیہ بیان کیے ہیں ان میں اقوال کی گنجائش ہے قاطع اور یقینی کا مقابلہ، محتمل وظن نہیں کرسکتا لہٰذا ہمارے قول کی طرف رجوع لازم ہے۔ وباللّٰہ التوفیق

سولھواں مسئلہ: سوال: ہدایت یافتہ کو یہاں کثیر قرار دیا حالانکہ دوسرے مقام پر ان کی صفت، قلیل ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (پ۲۲، سبا:۱۳) اور کم ہیں میرے بندے شکر والے

اور فرمایا ایمان اور نیک اعمال والے

وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ (پ۲۳، ص:۲۴) وہ تھوڑے ہیں

حدیث نبوی: لوگ ان سو اونٹوں کی طرح ہیں جو سواری نہیں بن سکتے۔ دوسری میں ہے۔ الناس اخبر قلة۔

جواب: ۱۔ اہل ہدایت اپنی نسبت سے کثیر ہیں، یہاں ان کی صفت قلیل بیان ہوئی وہاں اہل ضلال کی نسبت سے ہے۔

۲۔ قلیل، ہدایت یافتہ حقیقت میں کثیر ہیں اگرچہ صورۃً قلیل ہیں لہٰذا حقیقت کے پیش نظر انہیں کثیر قرار دیا۔

سترھواں مسئلہ: شیخ فراء کہتے ہیں: فاسق، فسقت الرطبة من قشرها سے ہے (یعنی کھجور اپنے چھلکا سے نکلی) گویا فاسق، طاعت سے نکل جاتا ہے، چوہیا کو فویسقة کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نقصان کیلئے نکلتی ہے۔

اہل قبلہ کا اختلاف: فاسق، مومن یا کافر؟

اہل قبلہ کا اختلاف ہے کہ فاسق مومن ہے یا کافر؟ ہمارے اصحاب کے ہاں مومن، خوارج کے ہاں کافر اور معتزلہ کے ہاں نہ مومن نہ کافر۔

مخالفین نے ان ارشادات عالیہ سے استدلال کیا ہے۔

بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ (پ۲۶، الحجرات:۱۱) مسلمان ہو کر فاسق کہلانا کتنا ہی برا نام ہے

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (پ۱۰، التوبۃ:۶۷) یقیناً منافقین ہی پکے بے حکمے ہیں

حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّهَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ (پ۲۶، الحجرات:۷) اللہ نے تمہیں ایمان پیارا کر دیا اور تمہارے دلوں میں اسے آراستہ کر دیا اور کفر، حکم عدولی اور نافرمانی تمہیں ناگوار کر دی گئی

یہ مسئلہ نہایت طویل ہے، علم کلام میں اس پر تفصیلاً گفتگو موجود ہے۔

اٹھارہواں مسئلہ: میثاق سے مراد

اس میں اختلاف ہے کہ، اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ، میں میثاق سے کیا مراد ہے؟

۱۔ اس میثاق سے وہ حجج ودلائل مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی صحت توحید اور صدقِ رسل پر قائم فرمائے ہیں، جب ان دلائل سے توحید وغیرہ کا ماننا لازم ہے تو یہی استدلال میثاق وعہد قرار پایا اس لیے یہ قول درست ہے۔

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ (پ۱، البقرہ:۴۰) اور تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا

۲۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جو اس آیت میں بیان ہوا، وہ مراد ہو۔

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَهُمۡ نَذِیۡرٌ لَّیَکُوۡنُنَّ اَهۡدٰی مِنۡ اِحۡدَی الۡاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ نَذِیۡرٌ مَّا زَادَهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا (پ۲۲، فاطر:۴۲) اور انہوں نے اللہ کی قسم کھائی انہی قسموں میں جد کی کوشش ہے۔ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ضرور کسی نہ کسی گروہ سے زیادہ راہ پر ہوں گے پھر جب ان کے پاس ڈر سنانے والا آیا تو اس نے انہیں نہ بڑھایا مگر نفرت کرنا

جب انہوں نے اپنا حلف پورا نہ کیا تو اس کو نقض عہد و میثاق قرار دے دیا۔

اول تاویل، میں عموم ہے کہ وہ ہر گمراہ و کافر کو شامل ہے لیکن دوسری تاویل، حلف وقسم اٹھانے والوں کے ساتھ ہی مخصوص ہوگی، لہٰذا پہلی تاویل دو وجہ سے دوسری پر راجح ہے۔

۱۔ اول صورت میں آیت کا اجرا عموم پر ہوگا جبکہ دوسری صورت میں تخصیص لازم ہوگی۔

۲۔ اول صورت میں ان پر مذمت لازم آرہی ہے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا وہ عہد توڑا جو اس نے پختہ کیا ان دلائل کے ساتھ

جو نفسی و آفاقی اور ثابت و واضح ہیں اور ان کے ابہامات کو دور کیا، عقول میں دلائل رکھے، حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا اور ان پر کتب نازل کر کے معاملہ کو موکد و پختہ کیا۔

دوسری صورت میں مذمت اس لیے لازم آ رہی ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر لازم کردہ امر کو ترک کر دیا اور یہ واضح ہے کہ ان کی مذمت اول صورت میں اولیٰ ہے۔

۳۔ شیخ قفال کہتے ہیں ممکن ہے یہاں آیت میں مقصود اہلِ کتاب کے لوگ ہوں کیونکہ ان کے انبیاء پر نازل کردہ کتب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا عہد و میثاق تھا، ان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کی اُمت کا معاملہ آشکار کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا۔

۴۔ بعض نے کہا: یہاں میثاق سے مراد وہی ہے جو لوگوں سے پشت آدم سے نکالنے کے وقت لیا۔ جبکہ وہ عالمِ خلق میں تھے، اس ارشاد الٰہی سے یہی مراد ہے۔

وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (پ ۹، الاعراف:۱۷۲) اور انہیں خود پر گواہ کیا کیا میں تمہارا رب نہیں سب نے کہا کیوں نہیں

متکلمین کہتے ہیں، یہ قول ساقط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں پہ اس عہد و میثاق سے حجت نہیں پکڑتا جس کا انہیں شعور نہیں جیسا کہ ان پر اس چیز پر مواخذہ نہیں کہ جس کا علم ان کے دلوں سے سہو و نسیان کی صورت میں ختم ہو چکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ ان پر وہ کیسے طعن فرمائے گا؟

۵۔ اللہ تعالیٰ کے تین عہد

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق سے تین عہد لئے ہیں:

۱۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم سے لیا، یہ اس کی ربوبیت کا اقرار ہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ (پ ۹، الاعراف:۱۷۲) اور جب تیرے رب نے اولاد آدم سے عہد لیا

۲۔ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے کہ وہ رسالت و پیغام پہنچاتے ہوئے دین کو غالب کریں اور اس میں تفرقہ نہ پڑنے دیں

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ (پ ۲۱، الاحزاب:۷) اور جب ہم نے نبیوں سے پختہ عہد لیا

۳۔ یہ علماء کے ساتھ مخصوص ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (پ۴،آل عمران:۱۸۷) اور جب اللہ نے عہد لیا ان سے جن کو کتاب دی گئی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کر دینا اور نہ چھپانا

صاحب کشاف کہتے ہیں، 'میثاقہ' کی ضمیر عہد کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ کا وعدہ انہوں نے قبول کر کے پختہ عہد کیا، توثیق کے معنی یہی درست ہے جیسا کہ میعاد و میلاد کا معنی وعدہ وولادت ہے۔

یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی آیات، کتب اور رُسل کے ذریعے عہد کو پختہ فرمایا۔

اُنیسواں مسئلہ: قطع سے مراد تین چیزیں

وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ" سے مراد میں اختلاف ہے، یہ چند معانی مذکور ہیں۔

۱۔ اس سے مراد رحم و حقوق قربات کا قطع ہیں جن کے ملانے و نبھانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے ارشادِ الٰہی ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (پ۲۶، محمد:۲۲) تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان قرابت کو ختم کر ڈالا، اس تاویل کے مطابق آیت کا حکم خاص ہوگا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اپنا تعلق اہلِ ایمان سے جوڑیں لیکن انہوں نے اہلِ ایمان سے تعلق توڑ کر کفار سے جوڑ لیا، تو یہاں اس ارشادِ الٰہی سے یہی مراد ہے۔

۳۔ انہیں لڑائی، تنازعہ اور فتنہ پروری سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ انہی کاموں میں مشغول رہے۔

بیسواں مسئلہ: وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ کی تفسیر

مختار یہی ہے کہ یہاں فساد سے وہی مراد ہے جو دوسروں تک پہنچے نہ کہ اپنے تک، اور یہ مراد اظہر ہے کہ یہ طاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روکنا ہے کیونکہ زمین پر کامل اصلاح طاعت سے ہی ہے کیونکہ التزام احکام شرعیہ سے انسان پر تمام لوازم کا لزوم اور دوسروں کے ساتھ زیادتی کا ترک لازم ہو جاتا ہے، اسی سے آپس میں ظلم ختم اور ظلم کے زوال سے عدل آ جاتا ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرعون سے حکایت کیا۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (پ۲۴، غافر۲۶) میں خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا یا زمین میں فساد چمکائے

پھر اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی کہ جن کے یہ اعمال ہیں وہ خاسر ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وہی گھاٹا پانے والے ہیں۔

اس خسران میں یہ صورتیں ہیں:

۱۔ وہ انعاماتِ جنت سے محروم کیونکہ جنت میں ہر ایک کیلئے اہل ومنزل ہے اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت کرلی تو اسے پالے گا اور اگر اس کی نافرمانی کی تو اسے اہل ایمان پالیں گے، ارشادِ فرمایا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (پ۱۸، المومنون:۱۰-۱۱) یہی لوگ وارث ہیں کہ فردوس کی میراث پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے

اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (پ۲۵، الشوریٰ:۴۵) یقیناً خسارے میں وہ ہیں جو اپنی جانیں اور اپنے گھر والے ہار بیٹھے قیامت کے دن

۲۔ اپنی کی ہوئی نیکیوں سے محروم کہ کفر کی وجہ سے وہ ضائع ہوگئیں، ان پر نہ کوئی اجر ملا اور نہ خیر۔

اگر آیت یہود کے بارے میں ہو تو ان کے اپنی شریعت کے مطابق اعمال اور اگر منافقین کے بارے میں ہو تو پھر ان کے ظاہری اعمال جو خلوص دل سے نہ تھے تو تمام اعمال ضائع ٹھہرے۔

۳۔ وہ کفر پر اس خوف کی وجہ سے مصر تھے کہ کہیں دنیاوی فوائد ولذات ختم نہ ہوجائیں تو وہ ان سے ختم ہوگئیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کی اجازت ملی یا ان کی موت آگئی۔

شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، الغرض خاسر عام ہے اس کا اطلاق ہر اس عمل پہ ہے جس پر جزا نہ ہو جس طرح آدمی محنت و تصرف کرے مگر کچھ حاصل نہ ہو تو اسے خاب و خسر کہا جاتا ہے یہ اسی طرح ہے کہ آدمی نے دوسرے کو شی دی اور اس کے مقابل کچھ نہ لیا جو اس کے قائم مقام بنتا، اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کفار کو خاسرین قرار دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (پ۳۰، العصر:۲،۳) یقیناً انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (پ۱۶، الکہف:۱۰۳،۱۰۴) تم فرماؤ کہ ہم بتائیں کہ سب سے بڑے ناقص عمل کن کے ہیں ان کے جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں محو ہوگئی

[۲۸] كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۸﴾

(بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے)

انعامات کی تفصیل

یہاں تک اللہ تعالیٰ نے توحید، نبوت اور آخرت پہ دلائل کا تذکرہ کیا۔اب یہاں سے لے کر ''يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ'' (پ۱، البقرۃ:۴۰) تک ان انعامات کی تفصیل ہے جو تمام انسانوں پر ہیں اور وہ چار ہیں۔

چار انعامات

۱۔ زندگی کی نعمت۔

اس آیت میں اس کا تذکرہ ہے، واضح رہے ارشادِ الٰہی 'كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ' اگرچہ بصورت سوال خبر ہے مگر مراد الزاماً جواب اور خاموش کروانا ہے۔کیونکہ عظمتِ نعمت، معصیتِ منعم کی عظمت پر دال ہوتی ہے مثلاً والد کا انعام، اولاد پر عظیم ہوتا ہے وہ اسے پالتا، سکھاتا اور اس کیلئے متعدد اچھے امور بجالاتا ہے تو اب والد کی معصیت بھی اعظم ہوگی تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے عمل کفر کو عظیم قرار دیا۔بایں طور کہ ان پر ہونے والی عظیم نعمتوں کا ذکر کیا تاکہ انہیں کفر کی طرف اقدام پر زجر ہو اور ایمان لانے کا شوق ہو تو اللہ تعالیٰ نے انہی نعمتوں سے جو اصل نعمت ہے، احیاء (زندگی) اس کا ذکر کیا تو یہی مقصود کلی ہے۔

فا و ثم، سے عطف کیوں؟

سوال: کیا وجہ ہے اول کا عطف، فا سے اور دیگر کیلئے ثم لایا گیا؟

جواب: احیاء اول کبھی بغیر تاخیر، موت کے بعد ہوتا ہے اور موت، احیا سے متراخی و موخر ہوتی ہے، احیاء ثانی، موت سے ظاہراً متراخی ہوگی اگر اس سے روز محشر اٹھانا مراد لیا جائے۔

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: معتزلہ کا قول

معتزلہ کہتے ہیں یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفر بندوں کی طرف سے ہے۔ اس پر یہ دلائل ہیں:

۱۔ اگر ان میں کفر کا خالق اللہ تعالیٰ ہوتا تو، کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ (تم اللہ سے کفر کیوں کرتے ہو؟) کہنا بطور توبیخ درست نہ ہوتا جیسا کہ یہ کہنا درست نہیں تم کالے کیوں نہیں، تم سفید، صحت منداور بیمار کیوں نہیں؟ کیونکہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہی ہیں۔

۲۔ جب ان کی اولاً تخلیق شقاوت ونار کیلئے ہے اور ان کی تخلیق سے کفر اور نار میں وقوع کا ارادہ ہے تو اب انہیں بطور توبیخ یہ کہنا کیسے درست ہوگا۔ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ؟ (تم کیسے کفر کرنے لگے)

۳۔ کسی حکیم کا ان کیلئے یہ کہنا معقول کیسے ہوسکتا ہے، کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ" جبکہ اس نے ان میں خود کفر پیدا کیا ہو اور وہ یہ کہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا (پ۱۵، الاسراء:۹۴) اور لوگوں کو کس بات نے ایمان لانے سے روکا

جبکہ انہیں ایمان سے خود روک رکھا ہو۔

فَمَا لَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (پ۳۰، الانشقاق:۲۰) تو کیا ہوا انہیں کہ ایمان نہیں لاتے

فَمَا لَهُمۡ عَنِ التَّذۡكِرَةِ مُعۡرِضِیۡنَ (پ۲۹، المدثر:۴۹) تو انہیں کیا ہوا نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں

حالانکہ انہیں اعراض خود کروایا ہو۔

اَنّٰی تُؤۡفَكُوۡنَ تم کہاں بھاگتے ہو

فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ اور کہاں جاتے ہو

حالانکہ جھوٹ وانصراف ان میں خود پیدا کر رکھا ہو

اسی طرح کا کلام تو بطریق اولیٰ تمسخر و مذاق سمجھا جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ بندوں پر بطور حجت ہو۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے جب بندوں سے فرمایا: کیف تکفرون باللّٰہ تو یہ کلام بندوں پر بطور حجت اور بطور طلب جواب ہے یا نہیں؟ اگر یہ اس معنی کی طلب کیلئے نہیں تو اس کے ذکر میں فائدہ کیا تو یہ خطاب عبث قرار پائے گا اور اگر یہ بندوں پہ بطور حجت ہے تو وہ کہہ سکتا ہے میرے حق میں یہ کثیر امور موجب وسبب کفر ہیں۔

۱۔ تمہیں میرے کفر کا علم ہے اور کفر کا علم موجبِ کفر ہے۔

۲۔ تم نے میرے کفر کا ارادہ کیا اور یہ ارادہ موجبِ کفر ہے۔

۳۔ تم نے میرے اندر کفر پیدا کیا اور میں تمہارے فعل کے ازالہ کی قوت ہی نہیں رکھتا۔

۴۔ تم نے میرے اندر ایسی قدرت پیدا کی جو موجب کفر ہے۔

۵۔ تم نے میرے اندر ارادہ پیدا کیا جو موجب کفر ہے۔

۶۔ تم نے میرے لیے قدرت پیدا کی جو ایسے ارادہ کی موجب ہے جو موجب کفر ہے۔

پھر جب یہ چھ اُصول حصولِ کفر کیلئے حاصل ہیں، ایمان بھی ان کے حصول پر موقوف ہوگا کہ یہ تمام مفقود ہوں تو عدم ایمان کیلئے بارہ اسباب درکار ہوں گے ان میں سے ہر ایک ایمان سے مستقل مانع ہوگا تو ان کثیر اسباب کی موجودگی میں یہ کہنا کیسے معقول ہے۔ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہ

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا: تم ان سے کہو تم اس اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو جس نے تم پر یہ عظیم نعمت زندگی وحیات کی۔

لیکن اہلِ جبر کے مطابق تو یہ کافر پہ نعمت الٰہی بنتی ہی نہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کافر کے ساتھ کر رہا ہے وہ تو کفر کی طرف لے جانے اور آگ میں جلانے کیلئے ہے تو ایسی صورت میں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت کیسے بنے گی؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی دوسرے کو زہر آلود فالودہ کا پیالہ دے تو اس کا ظاہر اگرچہ لذیذ و نعمت محسوس ہو رہا ہے، لیکن اس کا باطن مہلک ہے اسے کوئی بھی نعمت نہیں کہہ سکتا۔ اور یہ مسلم ہے کہ عذاب دائمی اس زہر سے کہیں اشد ہے تو کافر پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت نہ ہوئی تو اس نے اپنے رسول ﷺ کو کیسے حکم دے دیا کہ انہیں فرماؤ تم اس ہستی کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو جس نے تم پر یہ عظیم نعمت کی ہے؟

جواب: بحث کے وقت ان دلائل کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ اس پر مدح، ذم، امر و نہی اور عذاب و ثواب کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اسی شبہ کے مقابل ہم نہایت ہی معتمد گفتگو بطریق احسن کر سکتے ہیں۔

۱۔ کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا اب اگر ہو جائے تو اس کا علم، جہالت بن جائے گا جو محال ہے اور مستلزمِ محال، محال ہی ہوتا ہے تو اس کا وقوع محال ٹھہرا باوجودیکہ وہ فرما رہا ہے: کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ

۲۔ پھر کفر پر قدرت اگر ایمان کیلئے صلاحیت رکھتی ہے تو اب اس کا ایمان کیلئے معین طور پر جائے صدور بننا کسی مرجح کے بغیر

محال ہوگا، وہ مرجح اگر بندہ ہے تو سوال لوٹ آئے گا اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرجح حاصل نہ ہوگا تو حصول کفر محال ہے اور اگر حصول مرجح ہو گیا تو لازم تو ایسی صورت میں یہ قول کیسے معقول ہے،
كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ

یادر ہے معتزلی اگر کلام طویل کرے اور دلائل کو مدح وذم کی طرف لے جائے تو اس کے مقابل ان دونوں کو لاؤ کیونکہ یہ ان کی بنیادیں ہلا دیں گے اور ان کے شبہات کو اڑا کر رکھ دیں گے، وباللہ التوفیق۔

دوسرا مسئلہ: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا سے مراد

تمام کا اتفاق ہے کہ "وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا" سے مراد ہے کہ تم مٹی اور نطفہ تھے کیونکہ ابتداخلقتِ آدم مٹی سے ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر باقی تمام اولاد کی خلقت نطفہ سے ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ مُردہ کا اطلاق جماد پر حقیقت ہے یا مجاز، اکثریت اس پر ہے کہ یہ مجاز ہے اس لیے کہ موات (بنجر زمین) کو میت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک دوسرے میں کوئی ان کا دخل نہیں کیونکہ میت کو موت لاحق ہوتی ہے ضروری ہے کہ وہ ایسی صفت پر ہو کہ وہ عادۃً زندہ ہو۔لہٰذا اس میں گوشت ورطوبت کا ہونا ضروری ہے

اولین کہتے ہیں یہ اس معنی میں حقیقت ہے اور یہی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا، یہ اپنے آباء کے اصلاب میں اموات ومردہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پھر پیدا کیا پھر لازمی موت انہیں دی پھر موت کے بعد زندہ کیا تو یہ دوحیات و زندگیاں اور دواموات ہوئیں۔

اور ان کا استدلال اس ارشادِ الٰہی سے ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (پ۲۹، الملک:۲)

اس نے موت اور زندگی کو تمہاری جانچ کیلئے پیدا کیا کہ تم میں کسی کا کام زیادہ اچھا ہے

تو موت، حیات سے مقدم ہے اور یہی اموات ہے تو شاہد ہے کہ میت کا اطلاق موات پہ بطور حقیقت ہے۔

لیکن اول قول اقرب ہے کیونکہ جماد کو اموات کہا جاتا ہے نہ کہ میت تو ایک کا دوسرے کی جگہ استعمال بطور تشبیہ ہے، جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (پ۲۹، الانسان:۱)

تحقیق آدمی پر ایک وقت وہ گذرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا انسان مذکور شی نہ تھا تو اس نے اسے حیات دی اور اسے سمیع وبصیر بنایا مجازاً کہا جاتا ہے "فلان میت الذکر، هذا امر میت، هذه سلعة میتة جب اس کا طالب وذاکر نہ ہو، مخبل سعدی نے کہا:

وأحییت لی ذکری وما خاملا ولکن بعض الذکر أنبه من بعض

تو معنی آیت "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" اسی طرح ہے کہ تم گمنام تھے اور تمہارا ذکر تک نہ تھا کیونکہ کوئی شی ہی نہ تھے "فَاَحْیَاکُمْ" تمہیں اس نے خلق کرکے سمیع وبصیر بنایا۔

تیسرا مسئلہ: عذاب قبر کے خلاف استدلال

کچھ لوگوں نے اسی آیت سے عذاب قبر کے خلاف استدلال کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا، انہیں ایک دفعہ دنیا میں زندہ کیا پھر انہیں آخرت میں زندہ فرمائے گا تو یہاں حیاتِ قبر کا ذکر نہیں، اسی میں تاکید یہ ارشادِ گرامی کرتا ہے:

ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تُبْعَثُوْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۱۵،۱۶) پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو پھر تم ضرور قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے

ان دو حالتوں کے درمیان حیات وزندگی کا ذکر نہیں۔

اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اثباتِ عذاب قبر والے اس ارشاد سے استدلال نہیں کرسکتے۔

قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ (پ۲۴، غافر:۱۱) کہیں گے اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو بار مردہ کیا اور دو بار زندہ کیا

کیونکہ یہ کفار کا قول ہے، اور اس لیے کہ بہت سے اہلِ علم نے سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلنے کو حیات کہا ہے یہاں یہ فرمان ہوا:

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی (پ۹، الاعراف:۱۷۲) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے کہا کیوں نہیں

تو اس صورت میں دو حیات اور دو موتیں بن جاتی ہیں، حیات قبر کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

جواب: اس آیت میں عدمِ ذکر حیات قبر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حاصل ہی نہ ہو البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حیات قبر کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ "یُحْیِیْکُمْ" میں حیات دائمی کا تذکرہ نہیں ورنہ "ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ" کہنا درست نہ ہوگا اس لیے کہ ثُمَّ تراخی کا تقاضا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بغیر تراخی کے حیات دائمہ کے بعد حاصل ہے اگر آیت کو

اس طریق سے حیات قبر پر دلیل بنائیں تو بھی قریب (درست) ہے۔

چوتھا مسئلہ: امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ، سے مراد عموم واکثریت ہے ورنہ بعض کی تین دفعہ موت ہے، جیسا کہ حکایت ہے:

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (پ۳، البقرۃ:۲۵۹)

یا اس طرح جو گزرا ایک بستی پر اور وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر بولا اسے کیونکر زندہ کرے گا اللہ اس کی موت کے بعد تو اللہ نے سو برس مردہ رکھا پھر زندہ کیا

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ (پ۲، البقرۃ:۲۴۳)

اے محبوب کیا تو نے نہ دیکھا تھا جو اپنے گھروں سے نکلے تھے اور ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو اللہ نے ان سے کہا مر جاؤ پھر انہیں زندہ کیا

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (پ۱، البقرۃ:۵۵،۵۶)

تو تم کو کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر مرنے کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کیا۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی (پ۱، البقرۃ:۷۳)

ہم نے کہا اس مقتول کو گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ اسی طرح مردے کو زندہ کرے گا

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا (پ۱۵، الکہف:۲۱)

اور اسی طرح ہم نے ان کی اطلاع کر دی کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شبہ نہیں۔

واقعہ حضرت ایوب علیہ السلام میں ہے:

وَاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (پ۱۷، الانبیاء:۸۴)

اور ہم نے اسے اس کے گھر والے اور اتنے ہی ساتھ عطا کیے۔

تو اللہ تعالیٰ نے ان کی موت کے بعد زندہ کر کے ان کے اہل کو لوٹا دیا۔

پانچواں مسئلہ: مجسمہ کے استدلال کا رد

مجسمہ نے ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (پھر تمہیں اس کی طرف لوٹایا جائے گا) سے یہ استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ مکان میں ہے لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کے حکم سے لوٹیں گے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اہل قبور کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرے گا

اور یہ رجوع اللہ تعالیٰ کی ہی طرف ہے باقی، اِلَیْہِ (اس کی طرف) اس لیے کہا کہ یہ رجوع ایسی جگہ کی طرف ہے یہاں دوسرے کا حکم نہیں چلتا، محاورہ ہے، رجع أمرہ الی الأمیر۔ یعنی ایسی جگہ کہ دوسرے کا حکم نافذ نہیں ہوسکتا۔

چھٹا مسئلہ: چند امور کا ثبوت

یہ آیت ان اُمور پہ دال ہے:

۱۔ یہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی زندگی اور موت دینے پر قادر نہیں لہٰذا اہلِ طبع کا یہ قول باطل ٹھہرا کہ حیات وموت میں، افلاک، کواکب، عناصر ومزاجات مؤثر ہیں جیسا کہ کچھ لوگوں سے منقول ہے:

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (پ۲۵، الجاثیۃ:۲۴) مگر یہی ہماری دنیا کی زندگی کہ مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کیا مگر زمانے نے

۲۔ حشر ونشر کی صحت پہ دلیل ہوتے ہوئے بتا رہی ہے کہ دلیل عقل اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو پہلی دفعہ بعد از موت پیدا کیا ہے تو دوسری دفعہ بھی اس کا پیدا کرنا لازماً درست ہوگا۔

۳۔ یہ تکلیف، ترغیب وترہیب پہ بھی دال ہے۔

۴ یہ جبر وقدر پہ دال ہے جس کی تفصیل گزر چکی۔

۵۔ یہ دنیا سے بے رغبتی پہ دال ہے، فرمایا:

فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا

موت اٹل ہے

یعنی موت اٹل ہے پھر بتایا موت ہی نہیں بلکہ اس کی طرف لوٹنا ہے، موت کا اٹل ہونا یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا کہ اس نے نطفہ کے بعد زندگی، احسن صورت، انسانیت، کامل عقل، مختلف النوع منافع ونقصانات سے جانچنے والا، اموال و اولاد اور محلات وقصور کا مالک بنایا پھر موت کی صورت میں یہ تمام زائل کردیے اور اب کسی شی کا مالک نہ رہا اور نہ دنیا پہ کوئی خبر رہی نہ اثر، مدت طویل قبر میں رہا، ارشاد فرمایا:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (پ۱۸، المؤمنون:۱۰۰) اور ان کے آگے ایک آڑ ہے قیامت کے دن تک

آواز دو، جواب نہیں دے سکتا، بلاؤ کلام نہیں کر سکتا پھر اس کے قریبی قبر پر نہیں آتے حتیٰ کہ اہل واولاد بھول جاتی ہے،

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی کی دُعا

شیخ یحییٰ بن معاذ رازی کہتے ہیں

یمر أقاربی بحذاء قبری کان أقاربی لم یعرفونی

(میری قبر کے پاس سے میرے قریبی یوں گزرتے ہیں کہ گویا وہ مجھے جانتے ہی نہیں)

یہ بھی عرض کیا: الٰہی، مجھے قبر میں دفن کر کے جنازہ میں آنے والے لوگ واپس ہو گئے، اس پر مسافر، اجنبیت کی وجہ سے روتا ہے اہلِ محبت کنارہ قبر سے پکار رہے ہیں، دشمن جزع کے وقت اس پر ترس کھا رہے ہیں اور دیکھنے والوں پر اس کا حیلہ وعجز مخفی نہیں میری اُمید سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم وہی کہیں جو تو کہتا ہے، میرے ملائکہ اس تنہا کو دیکھو جس سے قریبی دور ہو گئے تنہا ہے، اس کے محبین نے جفا کی اب یہ ہم سے قریب اور لحد میں اجنبی ہے، دنیا میں مجھ سے مانگنے والا اور میری ماننے والا، اس گھر میں آتے وقت میرے احسان کا امیدوار تھا، اے قدیم الاحسان وہاں مجھ پر احسان فرمانا اور اے وسیع مغفرت والے میری جو تیرے بارے میں امید ہے وہ عطا کر دینا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا

اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا تو یہ لابدی وضروری یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ صور پھونکنے کا حکم دے گا۔

فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی فَاِذَا ھُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ (پ۲۴،الزمر:۶۸)

تو بیہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں اور جتنے زمینوں میں مگر جسے اللہ چاہے گا پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا پھر وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے

یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّھُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (پ۲۹،المعارج:۴۳)

جس دن قبروں سے جھپٹتے ہوئے نکلیں گے گویا وہ نشانوں کی طرف لپک رہے ہوں گے

پھر بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا، ارشادِ الٰہی ہے:

وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا (پ۱۵،الکہف:۴۸)

اور سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش ہونگے

تو تمام خضوع وخشوع کی حالت میں کھڑے ہوں گے۔ فرمایا

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا اور سب آوازیں رحمٰن کے حضور پست ہو کر رہ جائیں گی

(پ ۱۶، طہٰ ۱۰۸)

بارگاہِ الٰہی میں دعا

بعض نے یہ دعا کی، ہمارے اللہ، جب ہم قبور سے غبار آلود سروں کے ساتھ اٹھیں، شدت خوف سے ہمارے چہرے متغیر ہوں، ہولِ قیامت سے ہمارے سر جھکے ہوں، طویل قیامت کی وجہ سے ہمارے بطون بھوکے، ہمارے جسم اہلِ موقف کے سامنے ننگے، بوجھ ہماری پشتیں توڑ رہے ہوں، ہم اپنے گناہوں پہ نادم اور معاملات پر پریشان ہوں تو ہم سے اعراض فرما، ہمارے مصائب میں اضافہ نہ فرما، اے عظیم رحمت والے، اے وسیع مغفرت والے اپنی رحمت و مغفرت میں ہمیں شامل فرما۔

[۲۹] هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے بنایا پھر آسمان کا قصد فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے)

دوسرا انعام

یہ دوسرا انعام ہے جو تمام مکلفین پر ہے، اللہ تعالیٰ نے کیا ہی خوبصورت ترتیب سے بیان کیا کیونکہ زمین و آسمان سے نفع حصولِ حیات و زندگی کے بعد ہی ہو سکتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے حیات کا ذکر کیا اس کے بعد آسمانوں اور زمین کا تذکرہ لایا۔

حکم فائدہ:

خَلَقَ کی تفسیر اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ کے تحت آچکی

ارشادِ الٰہی "لَكُمْ" واضح کر رہا ہے کہ خلق کے بعد مذکور ہمارے دین و دنیا کے نفع کیلئے ہے، دنیا میں یوں کہ ہم اپنے ابدان کو درست رکھ سکیں تا کہ طاعات کی بجا آوری پر قوت رہے۔

دین میں یوں کہ ان اشیاء کے ساتھ استدلال و اعتبار کریں۔

"مَافِی الْاَرْضِ" میں تمام منافع کو جمع کر دیا، ان میں سے بعض حیوانات، نباتات، معدنیات اور جبال سے متصل ہیں بعض کا تعلق ان حرفتوں اور امور کے ساتھ ہے جن کا استنباط عقلاء نے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ان کی خلقت تمہارے نفع کیلئے ہے جیسا کہ فرمان ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ　　اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کیا

(پ ۲۵، الجاثیہ:۱۳)

گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تم اللہ سے کیسے کفر کر سکتے ہو جبکہ تم اموات تھے اس نے تمہیں زندگی دی، تم اللہ سے کفر کیسے کر سکتے ہو کہ اس نے تمہارے لیے آسمانوں و زمین میں تمام کا تمام تمہارے نفع کیلئے پیدا کیا یا یوں کہا جائے گا تم اللہ تعالیٰ کی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کا انکار کیسے کرتے ہو۔ جبکہ تمہیں اس نے موت کے بعد زندہ کیا اور تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے تو وہ تمہارے دوبارہ زندہ کرنے سے کیوں عاجز ہے؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان منافع کو مختلف سورتوں میں بیان کیا، مثلاً فرمایا:

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا　　(پ ۳۰، عبس:۲۵)　　کہ ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا

سورہ "امر اللہ" کی ابتدا میں فرمایا

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ　　(پ ۱۴، النحل:۵)　　اور چوپاؤں کو تمہارے لیے پیدا کیا

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا فعل غرض سے پاک

اہلِ سُنّت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فعل ہر غرض و فائدہ سے بالاتر ہوتا ہے اس لیے کہ اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو تو لازم آئے گا اس سے اللہ تعالیٰ کو کمال حاصل ہو تو جو دوسرے سے کمال حاصل کرے وہ ذات میں ناقص ہوتا ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے فعل کی غرض و فائدہ ہے ہاں وہ اسے نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کیلئے ہے؟

جواب: ۱۔ فائدہ دوسرے کو ہونا، کیا اس کا اللہ تعالیٰ کیلئے ہونے سے اولیٰ ہے یا اولیٰ نہیں؟ اگر اولیٰ ہے تو اللہ تعالیٰ کو نفع ہوا تو اب اعتراض باقی، اگر دوسری صورت ہے تو دوسرے کیلئے غرض مذکور کا حصول اللہ تعالیٰ کی غرض نہیں تو وہ اس میں مؤثر نہ ہوگا۔

۲۔ جس کا فعل کسی غرض کی بنا پر ہو وہ اس فعل کے واسطہ کے علاوہ اس حصول غرض سے عاجز ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر عجز محال ہے

۳۔ اگر اس کے فعل کی غرض ہو تو اگر وہ غرض قدیم ہے تو وہ فعل کا قدیم ہونا ضروری اور اگر وہ حادث ہے تو اس غرض کیلئے فعل کسی اور غرض کیلئے ہوگا جس سے تسلسل لازم جو محال ہے۔

۴۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فعل کسی غرض کیلئے ہو تو وہ مکلفین کی مصلحت ہی ہو سکتی ہے۔ تو اگر اس کا فاعل ہونا اس (مصلحت) پر موقوف ہے تو وہ ایسا فعل نہ کرتا جو مکلفین کے حق میں نقصان دہ ہے۔ حالانکہ ایسا اس نے کیا مثلاً اسے ایمان کا مکلف بنایا جس کے ایمان نہ لانے کو وہ جانتا ہے۔

لام میں گفتگو

اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً — جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا تمہارے لیے پیدا کیا۔

اور

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ — اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کیلئے پیدا کیا۔

(پ۲۷، الذاریات:۵۶)

میں لام پہ گفتگو کرتے ہوئے اہلِ سُنّت نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو فعل کیا، اگر اسے کوئی اور کرتا تو اس شی کی کوئی غرض ضرور ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے اس مشابہت کی وجہ سے لفظ غرض "لکم" استعمال فرمایا۔

دوسرا مسئلہ: اہلِ اباحت کا استدلال

اہلِ اباحت نے اس ارشادِ الٰہی

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً — تمہارے لیے پیدا کیا جو زمین میں ہے تمام

سے اس پر استدلال کیا کہ ہر شی ہر ایک کیلئے ہے لہٰذا کوئی شی کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

لیکن یہ ضعیف ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کل کا کل کے ساتھ مقابل بیان کیا اس سے مراد، فرد کا فرد سے مقابلہ ہوتا ہے اور تعین و تخصیص کیلئے الگ دلیل ہوگی، فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ استدلال کیا کہ منافع میں اصل اباحت ہے جسے ہم نے اصول فقہ میں بیان کر دیا ہے۔

تیسرا مسئلہ: مٹی کھانے کا شرعی حکم

بعض اہل علم نے کہا کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ مٹی کھانا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے زمین نہیں بلکہ جو کچھ اس میں ہے وہ پیدا کیا ہے لیکن اس پر یہ کہا جا سکتا ہے ان میں وہ بھی شامل ہیں جو زمین کا حصہ اور اس کے اندر ہیں تو اس سے دونوں مراد ہیں مثلاً معدنیات اس کا حصہ ہیں، اسی طرح عروق زمین اور اس طرح کی دیگر اشیاء بھی اس کا حصہ ہی ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی شی کا ذکر دوسرے سے نفی کا حکم نہیں ہوتا۔

چوتھا مسئلہ: ارشادِ مقدس 'خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا' بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاجت سے پاک و بالاتر ہے ورنہ وہ ان تمام اشیاء کو اپنے لیے بناتا نہ کسی دوسرے کیلئے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ، کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: کلام عرب میں کبھی استوا کا معنی سیدھا کھڑا ہونا ہے جس کی ضد ٹیڑھا ہونا ہے اور جب یہ صفت اجسام ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خود آیت مبارکہ اس مفہوم کے خلاف ہے الفاظ میں 'ثُمَّ اسْتَوٰى' جو تراخی کا تقاضا کرتا ہے اگر مراد استوا سے بلند مکان سے تو یہ بلندی و علو پہلے حاصل ہوتا، اگر یہ اولاً حاصل تھا تو یہ، خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ سے متاخر کیوں ہوتا۔ حالانکہ ثُمَّ اسْتَوٰى کے الفاظ تاخیر کا تقاضا کر رہے ہیں۔

یہ ثابت ہونے کی بنا پر یہ تاویل لازم ہے اور اس کی تفصیل یوں ہے استوا کا معنی استقامت اور سیدھا ہونا، جب لکڑی سیدھی ہو تو 'استوی العود' کہا جاتا ہے۔ جب کوئی نشانے کا ارادہ کرے اور دوسری کسی طرف وہ متوجہ نہ ہو تو 'استوٰی الیہ' کہا جاتا ہے۔ اس سے بطور استعارہ ہے، ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ یعنی زمین کے بعد اس نے آسمان پیدا کیا اور ان کے درمیان کوئی زمانہ نہیں زمین کی تخلیق کے بعد اس نے کسی اور شی کا ارادہ نہیں فرمایا۔

دوسرا مسئلہ: ارشادِ مبارک، هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ' کی تفسیر یہ آیت مبارکہ ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآىٕلِیْنَ (پ۲۴، فصلت:۹-۱۰)

تم فرماؤ کہ تم لوگ اس کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو وہ سارے جہاں کا رب ہے اور اس میں اس کے اوپر سے لنگر ڈالے اور اس میں برکت رکھی اور اس میں اس کے لینے والوں کی روزیاں مقرر کیں یہ سب ملا کر چار دن، پوچھنے والوں کو ٹھیک جواب

یعنی دو دنوں میں تقدیر ارض اور دوسرے دنوں میں تقدیر اقوات کیا جیسے کوئی کہے میں کوفہ سے مدینہ طیبہ بیس دنوں میں اور مکہ تیس دنوں میں گیا تو اس کی مراد تمام وقت کا بیان ہے، پھر دوسرے دو دنوں میں آسمان تخلیق فرمایا تو اس کا مجموعہ چھ دن ہوئے اس کا بیان یوں کیا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (پ۹، الاعراف:۵۴)

اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا

تیسرا مسئلہ: زمین کی پہلے تخلیق پر استدلال

بعض ملحدین نے کہا، یہ آیت بتا رہی ہے کہ زمین کی تخلیق، آسمان کی تخلیق سے پہلے ہے اس طرح یہ آیت بھی

اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ (پ۲۴ فصلت ۹-۱۱)

کیا تم اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا

سورۃ النازعات میں ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (پ۳۰، النازعات:۲۷-۳۰)

کیا تمہاری سمجھ کے مطابق تمہارا بنانا مشکل یا آسمان کا اللہ نے اسے بنایا اس کی چھت اونچی کی پھر اسے ٹھیک کیا اس کی رات کی اندھیری کی اور اس کی روشنی چمکائی اور اس کے بعد زمین پھیلائی

تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ زمین کی تخلیق، آسمان کی تخلیق کی بعد ہے۔ (یعنی آیات میں بظاہر تعارض ہے)

جوابات

اہل علم نے متعدد دلائل سے اس کا جواب دیا ہے۔

۱۔ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی مگر اسے، تخلیقِ آسمان کے بعد پھیلایا گیا، کیونکہ ''تدحیہ'' پھیلانے کو کہا جاتا ہے۔

سوال: یہ امر دو وجہ سے مشکل ہے۔

۱۔ زمین جسم عظیم ہے اس کے پھیلاؤ کا اس کی تخلیق سے جدا ہونا محال تو جب اس کا پھیلاؤ تخلیق آسمان کے بعد ہے تو اس کی تخلیق بھی یقیناً تخلیقِ آسمان سے متاخر ہوگی۔

۲۔ ارشادِ الٰہی

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے تمام پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا

واضح کررہا ہے کہ زمین کی تخلیق اور جو کچھ اس میں ہے کی تخلیق، آسمانی تخلیق سے مقدم ہے لیکن زمینی اشیاء کی تخلیق تو پھیلاؤ سے پہلے ممکن نہیں تو اس آیت کا تقاضا یہی ہے کہ زمین کا پھیلاؤ بھی آسمانی تخلیق سے پہلے ہو تو اب تضاد ثابت ہے۔

جواب: ارشادِ باری تعالیٰ

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا (پ۳۰، النازعات:۳۰) اور اس کے بعد زمین کو پھیلایا

کا تقاضا یہ ہے کہ آسمان کی تخلیق، زمین سے پہلے ہے لیکن اس کا یہ تقاضا نہیں کہ آسمان کا تسویہ، خلق زمین سے پہلے ہے تو اب تناقض ختم۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمان

أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقاً أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا کیا تمہارا پیدا کرنا مشکل یا آسمان کا اللہ نے اسے بنایا اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے ٹھیک کیا (پ۳۰، النازعات:۲۷، ۲۸)

کا تقاضا یہ ہے کہ آسمان کی تخلیق اور اس کا تسویہ زمین کے پھیلاؤ سے پہلے ہو لیکن زمین کا پھیلاؤ تخلیقِ ذات زمین کو لازم ہے کیونکہ ذات آسمان اور اس کا تسویہ ذات زمین سے مقدم ہے تو اب سوال پھر لوٹ آئے گا۔

۳۔ جواب صحیح یہ ہے کہ ثُمَّ اس آیت میں ترتیب کیلئے نہیں یہاں صرف متعدد انعامات کیلئے آیا ہے۔ جیسے کوئی آدمی دوسرے سے کہے۔ کیا میں نے تجھے عظیم نعمتیں عطا نہیں کیں، تیری قدر بلند کی پھر تیرا دشمنوں سے دفاع کیا، ممکن ہے بعض اوقات ذکر میں مؤخر شی مقدم ہوتی ہے جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔ واللہ أعلم

فضل قدیر

چوتھا مسئلہ: فَسَوّٰهُنَّ میں ضمیر مبہم ہے سبع سموات اس کی تفسیر ہے مثلاً ربه رجلاً اس کا فائدہ یہ ہے کہ مبہم کو جب واضح کیا جاتا ہے تو وہ اولاً واضح ہونے سے زیادہ اعظم و منظم ہوتا ہے کیونکہ جب اس میں ابہام تھا تو نفوس اس پر اطلاع کے خواہاں ہوتے ہیں تو اس کے بعد بیان، بیماری کے بعد شفاء کا درجہ رکھتا ہے۔

بعض کے نزدیک ضمیر سماء کی طرف ہے اور سماء معنی جنس میں ہے بعض نے اسے سماءۃ کی جمع کہا، راجح وجہ اول ہے۔

تسویہ کا معنی ان کی خلقت کا درست، ٹیڑھ پن اور نقص و عیب سے خالی ہونا اور ان کی تخلیق کا مکمل کرنا ہے۔

پانچواں مسئلہ: سات آسمانوں کا وجود

یہاں قرآن یہ بتا رہا ہے آسمان سات ہیں، اصحاب ہیئت کہتے ہیں ہمارے سب سے قریب کرہ قمر ہے اس سے اوپر کرہ عطارد پھر کرہ زہرہ پھر کرہ شمس پھر کرہ مریخ پھر کرہ مشتری پھر کرہ زحل ہے۔

اسی ترتیب کی معرفت دو طریق سے ہے۔

۱۔ الستر، وہ یہ ہے کہ کوکب اسفل جب ہماری آنکھوں کے سامنے اور کوکب عطارد کے درمیان گزرتا ہے تو وہ دونوں ایک ہی کوکب کی طرح ہو جاتے ہیں تو ساتر، مستور سے غالب ہونے کی وجہ سے ممتاز ہو جاتا ہے مثلاً سرخی مریخ، صفرہ عطارد، بیاض زہرہ اور زردی مشتری اور کدورت زحل۔

جیسا کہ قدماء نے قمر کو کواکب ستہ کو بے نور، کوکب عطارد اور کوکب زہرہ کو، زہرہ و مریخ کو بے نور کرتے پایا، اسی ترتیب کا لحاظ اس پہ دال ہے کہ شمس، قمر سے فوق ہے کیونکہ قمر اس کی وجہ سے بے نور ہو جاتا ہے لیکن اس سے اس کا باقی سیارگان کے تحت یا فوق ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس سے ان میں کوئی بھی بے نور نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کے بوقت طلوع باقی کواکب مضمحل ہوتے ہیں تو اب انہوں نے دو طریق بیان کیے ہیں۔

۱۔ بعض نے کہا، انہوں نے زہرہ کو صحیفہ شمس پر تل کی طرح دیکھا لیکن یہ ضعیف ہے اس لیے کہ بعض نے یہ خیال کیا کہ چہرہ شمس پہ تل ہے جیسا کہ وجہ قمر پر محو ہے۔

۲۔ اختلاف منظر، قمر، عطارد اور زہرہ میں محسوس ہوتا ہے لیکن مریخ، مشتری اور زحل میں نہیں ہوتا ہے لیکن حق شمس میں بہت ہی کم تو شمس ان دونوں کے درمیان ہوا، اکثریت کا یہی قول ہے البتہ ابو ریحان نے فصول فرغانی کی تلخیص میں لکھا اختلاف منظر صرف قمر میں محسوس ہوتا ہے تو یہ تمام وجوہ باطل اور موضع شمس کا مشکوک ہونا باقی رہ گیا۔

افلاک کا نو ہونا

اصحاب رصد گاہ اور ارباب ہیئت کہتے ہیں افلاک نو ہیں، سات جن کا ذکر اوپر آیا آٹھواں جس میں ان کواکب کا اثبات ہے اور نواں، فلک اعظم جو ہر دن ورات میں تقریباً پورا چکر کاٹتا ہے۔

آٹھویں فلک کے اثبات پر دلیل یہ دی کہ ہم ان کواکب ثابتہ کیلئے سست حرکت پاتے ہیں اور یہ ثابت ہے کہ کواکب کی حرکت اپنے فلک کی بنا پر ہی ہوتی ہے حالانکہ دیگر افلاک جو ان سیارگان کے حامل ہیں ان کی حرکت تیز ہے لہٰذا ایک اور جسم کا ہونا ضروری ہے جس کی حرکت سست ہو اور ان ثوابت کا حامل ہو۔

یہ دلائل ضعیف ہیں

یہ دلائل کئی وجوہ سے کمزور ہیں:

۱۔ یہ کیوں ممکن نہیں کہ یہ کواکب کسی دوسرے جسم میں مرکوز ہوئے بغیر خود ہی متحرک ہوں اور اس احتمال کو فاسد ثابت نہیں کیا جاسکتا، جب تک مختار کا فساد ثابت نہ ہو ورنہ اس کے بغیر لایعنی بات ہوگی۔

۲۔ ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں لیکن یہ کیوں جائز نہیں کہ یہ کواکب سیارگان کے ممثلات میں مرکوز ہوں اور سیارگان اپنے حوامل میں مرکوز ہوں تو اب آٹھویں آسمان کے اثبات کی ضرورت ہی نہیں۔

۳۔ یہ کیوں جائز نہیں کہ یہ فلک، فلک قمر کے تحت ہو تو اب یہ سیارات کے کروں کے تحت ہوگا نہ کہ ان کے اوپر

سوال: ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ سیارات، ان ثوابت کو بے نور کر دیتے ہیں اور تکاسف (بے نور ہونا) لازماً مکسوف کے تحت ہوتا ہے

جواب: یہ سیارات، منطقہ کے قریب ثوابت کو بے نور کرتے ہیں رہے قطبین کے قریب ثوابت تو انہیں ایسا نہیں کرتے۔

تو کیوں ممکن نہیں کہ منطقہ سے قریب یہ ثوابت آٹھویں اس فلک میں مرکوز ہوں جو کرّہ زحل سے اوپر ہے اور قطبین سے قریب ثوابت جو سیارات سے بے نور نہیں ہوتے کرہ قمر کے تحت کسی اور کرہ میں مرکوز ہوں اور اس احتمال کا دفاع وازالہ ممکن نہیں پھر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ افلاک نو ہیں جیسے تمہاری تحقیق ہے لیکن دسویں فلک کی نفی پر تمہارے پاس کونسی دلیل ہے؟ زیادہ سے زیادہ تم یہی کہو گے کہ رصد کی دلالت صرف اسی پر ہے اور عدم دلیل عدم مدلول پہ دال نہیں اور اسے محقق وثابت یہ بات کرتی ہے کہ ان میں سے بعض محققین نے کہا، مجھ پر آج تک ابھی یہ واضح نہیں ہوا ہے کہ کرۂ ثوابت، کرۂ واحدہ ہے یا وہ مختلف کرات پر مشتمل ہے۔

میں کہتا ہوں یہ احتمال ثابت و واقع ہے کیونکہ جس نے بھی کرۂ ثوابت کی وحدت پر استدلال کیا اس نے یہی کہا کہ ان کی حرکات متشابہ ہیں۔

جب صورت حال یہی ہے تو یہ کرۂ واحد ہی میں مرکوز ہوں گے اور یہ دونوں مقدمات غیر یقینی ہیں۔

پہلا مقدمہ: ان کی حرکات اگر چہ حساً واحد ہیں لیکن ممکن ہے کہ حقیقۃً ایک نہ ہو کہ مثلاً ان میں سے ایک بالفرض چھتیس ہزار سال میں دور مکمل کرے جبکہ دوسرا اس مدت سے ایک سال کم میں کرے جب اس کمی اور نقصان کو ان تمام سالوں پر تقسیم کریں تو یہ ہزار میں تیسرا اور دو سو میں سے ایک جز ہوگا اور اتنی سی کمی بلکہ اس کے سوا اور ہزار سال کی کمی بھی محسوس ہی نہیں ہوتی تو جب اس میں احتمال ہے تو ان ثوابت کی حرکات کا برابر ہونا قطعی نہ رہا۔

دوسرا مقدمہ: حرکات ثوابت کا مقدار حرکت میں برابر ہونا ان تمام کے کرہ واحدہ میں مرکوز ہونے کا موجب نہیں اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ متخالف کروں میں مرکوز ہوں اگر چہ مقادیر حرکت میں برابر ہوں، یہ معاملہ یوں ہی ہے جیسا کہ ممثلات اکثر کواکب میں ان کا قول ہے کہ یہ حرکات میں فلک ثوابت کے برابر ہیں تو اس طرح کا معاملہ یہاں ہے۔

میں کہتا ہوں اس قائل نے جو احتمال ذکر کیا ہے یہ فلک ثوابت سے ہی مختص نہیں۔ ممکن ہے جرم متحرک حرکت یومیہ میں واحد نہ ہو بلکہ وہ کثیر اجرام ہوں اور ان میں حرکات مختلف ہوں لیکن تفاوت قلیل ہو ہماری عمریں اور رصد گاہیں ان کے ادراک کیلئے کافی نہ ہوں یا وہ مساوی ہوں لیکن ان کا مساوی ہونا ان کی وحدت کا متقضی نہیں۔

اور بھی افلاک ہیں

بعض اصحاب ہیئت کہتے ہیں ان نو کے علاوہ بھی افلاک ہیں کیونکہ کچھ نے کرہ ثوابت کے اوپر اور فلک اعظم کے نیچے ایک کرہ مانا ہے ان کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ سائنس دان، میل اعظم کو مختلف المقدار پاتے ہیں تو جس کی رصد گاہ اقدم ہے وہ مقدار میل کو اعظم پاتا ہے مثلاً بطلیوس نے لح یا، پایا (جو 549 سے عبارت ہے) زمانہ مامون کے دور میں لح لۂ ہے (اس کا عدد 63 بنتا ہے) پھر مامون کے بعد دقیقہ میں تناقض ہوا تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ سائنس دان ان دونوں کا میل کبھی کم پاتے ہیں اور کبھی زیادہ، یہ تب ممکن ہے جب کرہ الکل اور کرہ ثوابت میں ایک اور کرہ ہو جس کے دونوں قطب کرہ کل کے قطبین کے گرد دَور کریں اور کرہ ثوابت کے دونوں قطب اس کرہ کے دونوں قطب اس کرہ کے دونوں قطبوں کا چکر کاٹیں تو کبھی اس کا ایک قطب جانب شمال نیچے

اور کبھی جانب بلند ہوگا تو اس سے لازم آیا کہ؟ نہار منطقہ بروج پر منطبق ہو اور اس سے کبھی جنوب کی طرف جدا ہو جبکہ قطب فلک ثوابت جنوب کی طرف ہو اور کبھی شمال کی طرف ہو جیسے کہ اب ہے۔

۲۔ اصحاب رصدگاہ، مقدار رفتار شمس میں بہت پریشان ہیں اس کی تفصیل کتب نجوم میں ہے حتیٰ کہ بطلیموس نے ابرخیس سے نقل کیا کہ انہیں اس میں شک تھا کہ اس کا چکر برابر اوقات میں ہوتا ہے یا مختلف اوقات میں، انہیں کے بعض اقوال میں یہ ہے کہ یہ مختلف ہیں اور بعض میں مساوی ہے، لوگوں کے سبب اختلاف میں دو اقوال ہیں۔

پہلا قول: ان کا قول ہے جو اوج شمش کو متحرک مانتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اس جہت سے حرکت شمس میں اختلاف ہے اوج سے دور ہونے کی وجہ سے وہ نقطہ اعتدال سے مختلف ہے تو اس کی وجہ سے رفتار شمس کے وقت میں اختلاف ہے۔

دوسرا قول: اہل ہند، چین، بابل، قدماء روم کی اکثریت، مصر، شام کا قول یہ ہے اس میں سبب، فلک بروج کا انتقال، ارتفاع قطب اور انحطاط کی بنا پر ہے۔

ابرخیس سے منقول ہے کہ وہ اس رائے کو قبول کرتا ہے، باریاء سکندرانی نے لکھا، اصحاب طلسمات بھی اسے مانتے ہیں، نقطہ فلک بروج اپنی جگہ سے آگے ہو تو آٹھ درجے پیچھے جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں ابتدا حرکت کب، حوت سے اول حمل کا درجہ ہے۔

واضح رہے یہ خبط و پریشانی واضح کر رہا ہے کہ عقول بشری ان اشیاء کا ادراک نہیں کرسکتیں اور اس کا کامل و محیط علم، ان کے خالق و فاطر کا ہی ہے لہٰذا دلائل سمعیہ پر اکتفاء لازم ہے۔

سوال: کیا کوئی ایسی نص ہے جو بتائے کہ آسمان سات ہی ہیں ان سے زائد نہیں؟

جواب: حق یہی ہے کہ مخصوص عدد کا ذکر، نفی زائد پر دال نہیں ہوا کرتا۔

چھٹا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا علم محیط

ارشادِ الٰہی ''وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' واضح کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کا زمین اور آسمان ''وَمَا فِيهِمَا'' اور عجائب و غرائب کا پیدا کرنا تبھی ممکن ہے کہ وہ ان تمام جزئیات و کلیات کا علم محیط رکھتا ہو، اس سے چند اور مسائل آشکار ہو جاتے ہیں۔

۱۔ قول فلاسفہ کی تردید کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کا علم نہیں رکھتا، تو متکلمین کا قول درست ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے جزئیات کا علم رکھنے پر یوں استدلال کیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان اجسام کا بطورِ احکام و اِتقان خالق و فاعل ہے اور اس طرح ہر فاعل کا

اپنے فعل کا علم ہونا ضروری ہے اور یہی دلیل اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان کی ہے وہ یوں کہ پہلے اس نے آسمانوں وزمین کی تخلیق ذکر کی پھر اس پر اپنا عالم ہونا متفرع کیا جس سے واضح ہو گیا متکلمین کا یہ مذہب اور استدلال قرآن مجید کے مطابق ہے

۲۔ قول معتزلہ کی تردید کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ شی بطور تقدیر وتحدید خالق، اس فعل اور اس کی تفصیل کا علم ضروری ہے کیونکہ خالق ہی کسی قدر کے ساتھ مخصوص کرتا ہے اور یعنی قدر کی تخصیص کیلئے ارادہ ضروری ہے ورنہ مرجح کے بغیر ترجیح ہوگی اور ارادہ، علم کے ساتھ مشروط ہے۔لہٰذا ثابت ہوا خالق شئی، اس کی تفصیل سے آگاہ ہوتا ہے، اب اگر بندہ اپنے افعال کا مرجح ہو تو یہ ان کا اور ان کی تفصیل، عدد، کمیّت وکیفیت سے ضروری آگاہ ہوگا جب اسے یہ علم حاصل نہیں تو آشکار ہو گیا کہ وہ خود موجد نہیں

۳۔ معتزلہ کا کہنا ہے جب ہم مذکور آیت اور، وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ، دونوں کے سامنے لاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا بذاتہ عالم ہونا آشکار ہوتا ہے۔

جواب: ارشادِ الٰہی:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (پ۱۳، یوسف ۷۶) ہر علم والے سے اُوپر علم والا ہے

عام ہے۔جبکہ:

اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (پ۶، النساء:۱۶۶) وہ اس نے اپنے علم سے اُتارا

خاص ہے اور خاص، عام سے مقدم ہوتا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم

[۳۰] وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۚ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

(اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں بولے کیا اِسے بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا ہم تیری حمد کرتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں)

تیسرا انعام

یہ آیت مبارکہ سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی عزت وعظمت کی تفصیل پر مشتمل ہے تو یہ تمام اولاد آدم پر انعام عام ہے تو یہ یہاں ذکر کردہ نعمتوں میں سے تیسری ہے۔یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: "اِذْ" میں دو اقوال

۱۔ یہ بطور صلہ زائد ہے کیونکہ ایسا تکلم عربوں کی عادت ہے اور قرآن کا نزول لغت عرب میں ہے۔

۲۔ حق یہ ہے کہ قرآن میں ایسا کوئی کلمہ نہیں جس کا معنی نہ ہو۔ یہ محذوف "اُذْکُر" (یاد کرو) کی وجہ سے منصوب ہے معنی یہ ہے انہیں یاد دلاؤ جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا۔

تو "اُذْکُر" کو دو اُمور کی وجہ سے محذوف کر دیا۔

۱۔ معنی معروف ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (پ۲۶، الاحقاف:۲۱) اور یاد کرو عاد کے ہم قوم کو جب اس نے ان کو سرزمین احقاف میں ڈرایا

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ (پ۲۳، ص:۱۷) اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ (پ۲۲، یٰسین:۱۳،۱۴) اور ان سے نشانیاں بیان کرو اُس شہر والوں کی جب ان کے پاس آئے فرستادے (رسول) جب ہم نے ان کی طرف دو بھیجے۔

اور تمام قرآن کلمہ واحد کی طرح ہے اور ممکن ہے ان مقامات کا نزول اس سورت سے پہلے ہو لہٰذا اسی کا ذکر دیگر تصریحات کی وجہ سے ترک کر دیا۔

صاحب کشاف کا کہنا ہے اس کا 'قالوا' کی وجہ سے منصوب ہونا بھی ممکن ہے۔

دوسرا مسئلہ: الملك کا مفہوم

الملك، کا معنی رسالت و پیغام، الکنی الیہ کا معنی ہے اس نے مجھے فلاں کی طرف بھیجا۔ المالکہ اور "الالوکۃ" کا معنی بھی پیغام رسانی ہے۔ اصل ہمزہ کے ساتھ ملائکہ ہے، ہمزہ حذف کر کے اس کی حرکت ماقبل کو دی تا کہ کثرت استعمال کی وجہ سے خفت ہو جائے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں، الملائك، اصل ملائك کی جمع ہے جیسے شمال کی جمع شمائل ہے، تا، تانیث جمع کی وجہ سے ہے

تیسرا مسئلہ: ملائکہ پر گفتگو

کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ملائکہ پر گفتگو انبیاء علیہم السلام سے مقدم ہونی چاہئے اور اس کی دو وجوہات ہیں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر ایمان سے پہلے ملائکہ پر ایمان کا ذکر کیا ہے۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (پ۳، البقرۃ:۲۸۵) اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِبْدَءُوْا بِمَا بَدَاَ اللّٰهُ بِهٖ اسی سے ابتدا کرو جس سے اللہ نے ابتدا کی

(النسائی:۲۹۶۱)

۲۔ فرشتہ، تبلیغ وحی و شریعت میں اللہ تعالیٰ اور رسول کے درمیان واسطہ ہے لہٰذا وہ رسول سے مقدم ہوگا۔

حضرات انبیاء پر گفتگو

دوسرا قول یہ ہے کہ انبیاء پر گفتگو، ملائکہ سے پہلے ہونی چاہئے کیونکہ وجودِ ملائکہ کی معرفت عقلاً نہیں شرعاً ہے۔تو نبوت میں کلام، ملائکہ میں کلام کی اصل ہے لہٰذا نبوات میں گفتگو اولاً ضروری ٹھہری

تو یوں کہنا اولیٰ ہے کہ واقع میں فرشتہ کا نبی سے پہلے شرف و مرتبہ ہے لیکن ہمارے اذہان وافکار اور عقول میں نبی کے بعد ہے

واضح رہے عقلاء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عالم علوی کو شرف و مرتبہ وہاں وجود ملائکہ کی وجہ سے ہے جس طرح عالم سفلی کا مرتبہ وجود انسان سے ہے۔

ملائکہ کی حقیقت

باقی ملائکہ کی حقیقت اور ماہیت میں اختلاف ہے، ضبط مذاہب یوں ہے کہ ملائکہ یہی ذوات ہیں جو قائم بنفسہ ہیں پھر یہ ذوات متحیزہ (محتاجِ محل) ہیں یا نہیں؟

اول، اگر ملائکہ متحیز ہیں تو یہاں چند اقوال ہیں۔

پہلا قول: یہ لطیف وہوائیہ اجسام ہیں جو مختلف اشکال میں ظاہر ہوسکتے ہیں اور ان کا مسکن آسمان ہے مسلمانوں کی اکثریت کا یہی قول ہے۔

۲۔ بُت پرستوں کی جماعت کا قول ہے کہ حقیقت میں ملائکہ، کواکب ہی ہیں جو سعادت ونحوست سے متصف ہیں کیونکہ یہ کواکب کو زندہ ناطق مانتے ہیں، سعادت دینے والے ملائکہ رحمت اور نحوست پہنچانے والے ملائکہ عذاب کہلاتے ہیں۔

۳۔ مجوسی اور ثنویہ کہتے ہیں، یہ عالم ان دو اصلی ازلی اشیاء سے مرکب ہے۔نور، ظلمت، اور یہ دونوں حقیقت میں جوہر، شفاف، مختار قادر، صورت ونفس میں متضاد اور فعل وتدبیر میں مختلف ہیں، جوہر نور، فاضل، خیر، صاف، صاحب خوشبو، کریم النفس اور آسانی ہے، نقصان دہ نہیں۔ نفع مند ہے، مانع نہیں، زندہ مگر بوسیدہ نہیں ہوتا اور جوہرِ ظلمت اس سے متضاد ہے۔

جوہر نور، اولیاء کو جنتا ہے جو ملائکہ ہیں بطور نکاح نہیں بلکہ جس طرح حکیم سے حکمت اور، چراغ سے روشنی ہوتی ہے، جوہر ظلمت، اعداء پیدا کرتا ہے جو شیاطین ہیں یہ بھی بطور نکاح نہیں بلکہ جیسے بے وقوف سے پاگل پن کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ ان کے اقوال ہیں جو ملائکہ کو متحیز ہ اور اجسام مانتے ہیں۔

دوسرا قول: ملائکہ ایسی ذوات ہیں جو خود بخود قائم ہیں لیکن متحیز ہ اور اجسام نہیں تو یہاں دو اقوال ہیں۔

۱۔ جماعت نصاریٰ کہتی ہے ملائکہ درحقیقت نفوس ناطقہ، ابدان سے بطور حسن وخیر جدا ہیں اور یہ نفوس مفارقہ اگر صافیہ وخالص ہوں تو ملائکہ اور اگر خبیثہ اور گندے ہوں تو شیاطین۔

۲۔ فلاسفہ کا قول یہ ہے جواہر قائم بنفسہا ہیں اور ہرگز متحیز ہ نہیں اور یہ ماہیت میں بشری نفوس ناطقہ کے مخالف ہیں اور یہ ان سے قوت میں اکمل اور علم میں اکثر ہوتے ہیں اور یہ نفوس بشری کیلئے اسی طرح ہیں جیسے شمس، روشنی کیلئے ہے۔

جواہر کی دو اقسام

ان جواہر کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ ان میں سے بعض کا اجرامِ فلکیہ اور کواکب کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو نفوس ناطقہ کا ہمارے ابدان کے ساتھ ہے۔

۲۔ کچھ کا تدبیرِ افلاک سے تعلق نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت، معرفت اور اس کی طاعت میں مشغول ہوتے ہیں یہی ملائکہ مقربین ہیں اور ان کی نسبت آسمان میں تدبیر کرنے والوں کے ساتھ اس طرح ہے جیسے ان مدبرین کی ہمارے نفوس ناطقہ سے ہے

ان دونوں اقسام کے وجود پہ فلاسفہ متفق ہیں:

بعض نے ان کے علاوہ بھی انواعِ ملائکہ ثابت کی ہیں اور وہ زمینی ملائکہ ہیں جو اس عالم سفلی کے احوال میں تدبیر کرتے ہیں، اس عالم کے مدبرات اگر خیر ہیں تو ملائکہ اگر شریر ہیں تو شیاطین، ملائکہ کے بارے میں مذاہب کی تفصیل یہی ہے۔

فرشتوں کا عقلاً وجود

اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ عقلاً فرشتوں کا وجود ثابت ہوسکتا ہے یا ان کے ثبوت کا طریقہ سمع وشریعت ہی ہے۔فلاسفہ کہتے ہیں عقلی طور پر وجود ملائکہ پر دلائل موجود ہیں، ہمارے ان دلائل میں اُن کے ساتھ بڑے ہی اہم وعمیق مباحث ہیں۔

دلائل عقلیہ

بعض نے کچھ دلائل عقلیہ مسکتہ (خاموش کروادینے والے) ذکر کیے ہیں ہم ان کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

۱۔ ملک سے مراد ایسا زندہ ناطق ہے جو میت نہیں کیونکہ، تقسیم عقلی تین وجود کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ زندہ چیز ناطق ومیت دونوں ہوگی، یہ انسان ہے یا میت ہوگی ناطق نہ ہوگی یہ بہائم یا وہ ناطق ہوگی مگر میت نہ ہوگی یہ فرشتے، بلاشبہ سب سے اخس وکم درجہ میت غیر ناطق کا ہے، اوسط درجہ ناطق میت کا اور اعلیٰ درجہ ناطق کا ہے جو میت نہیں، جب حکمت الٰہیہ کا تقاضا سب سے کم اور اوسط درجہ کی تخلیق ہے تو اشرف واعلیٰ درجہ کی تخلیق بطریق اولیٰ اس کا تقاضا ہوگا۔

۲۔ فطرت گواہ ہے عالم سمٰوات، اس عالم سفلی سے اعلیٰ ہے، اس کی یہ گواہی بھی ہے کہ زندگی، عقل اور نطق اپنے اضداد اور مقابل سے اشرف ہیں تو عقلاً یہ بات بعید ہے اس عالم مکر وظلمانی میں حیات، عقل اور نطق حاصل ہوں مگر اس عالم ضوء اور نور وشرف میں یہ حاصل نہ ہوں۔

۳۔ اصحاب مجاہدات نے ملائکہ کو بطور مشاہدہ ومکاشفہ بھی ثابت کیا ہے۔ اصحاب حاجات وضروریات نے انہیں ایک اور جہت سے ثابت کیا وہ یوں کہ انہوں نے علاج نادر وغریب، معجونات کی ترکیب اور صنعت تریاق کے استخراج میں مشاہدہ کیا، ان دلائل میں سے سچے خواب بھی ہیں۔

یہ اسی آدمی کیلئے دلائل مسکت ہیں جس نے سن تو رکھا ہے مگر تجربہ نہیں ہوا اور تجربہ ومشاہدہ اور اس اسرار سے واقف کیلئے یہ قطعی ہیں۔

رہے دلائل شرعیہ ونقلیہ تو اثبات ملائکہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کا کوئی اختلاف نہیں بلکہ ان کا وجود ان کے درمیان متفقہ ہے۔ واللہ اعلم

چوتھا مسئلہ: کثرت ملائکہ کی تفصیل

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے آسمان چیختا ہے اور اسے چیخنے کا حق ہے اس میں ایک قدم جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ سجدہ یا رکوع میں نہ ہو۔

تفصیل مخلوق کی جھلک

منقول ہے اولاد آدم، جنات کا دسواں حصہ اور جنات واولاد آدم حیوانات خشکی کا دسواں حصہ اور یہ تمام، پرندوں کا دسواں

2

حصہ پھر یہ تمام حیوانات سمندری کا دسواں پھر یہ تمام ملائکہ موکلین ارض کا دسواں، پھر یہ تمام ملائکہ سماء دنیا کا دسواں پھر یہ تمام، تیسرے آسمان کے ملائکہ کا دسواں اسی ترتیب سے ساتویں آسمان کے ملائکہ کا حال ہے۔ یہ تمام مل کر، ملائکہ کرسی کے مقابل بہت ہی قلیل ہیں۔ پھر یہ تمام مل کر سرادقات عرش کی (جن کی تعداد چھ لاکھ ہے) کے ایک سرداق کے ملائکہ کا دسواں حصہ ہیں، سرداق کے طول، عرض اور سمک کا، اگر آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے تمام سے مقابلہ کیا جائے تو یہ اس کے مقابل نہایت ہی قلیل شئی اور حقیر قدر ہوں گے اور وہاں قدم کی جگہ نہیں یہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ رکوع یا قیام نہ ہو اور وہ تسبیح وتہلیل کی آواز رکھتے ہیں

پھر یہ تمام مل کر عرش کے محافظ ملائکہ کے سامنے ایسے ہیں جیسے قطرہ سمندر کے سامنے ہوتا ہے۔ ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے

پھر ان کے ساتھ ملائکہ لوح ہیں جو حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ساتھی ہیں اور وہ ملائکہ سیدنا جبریل علیہ السلام کے لشکر ہیں یہ تمام اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے والے، تابعدار اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف، اس کے ذکر سے ان کی زبانیں تر رہتی ہیں، اس کی تعظیم میں دیگر مخلوق سے سبقت لے جانے والے ہیں، اس کی عبادت سے انکار نہیں بلکہ دن رات عبادت سے تھکتے نہیں۔ نہ تو ان کے اجناس شمار ہو سکتی ہیں اور نہ ان کی مدت عمر اور نہ ان کی کیفیت عبادت، ان تمام کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے، اللہ جل جلالہ کے ملکوت کی حقیقت کچھ یوں ہے، جیسا فرمانِ الٰہی ہے:

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ (پ ۲۹، المدثر:۳۱) اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا

سیدنا جبریل امین کی عمر

بندہ نے بعض کتب تذکیر میں پڑھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقعہ پہ بازار کی طرح جگہ پر ملائکہ کو ایک دوسرے کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا، تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے بتایا: میں نہیں جانتا، البتہ انہیں تخلیق کے وقت سے دیکھ رہا ہوں، ان میں سے کسی کو بھی میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ پوچھا: تمہاری تخلیق کب ہوئی؟ بتایا: میں نہیں جانتا، ہاں اس قدر جانتا ہوں اللہ تعالیٰ ہر چار لاکھ سال بعد ایک ستارہ پیدا فرماتا ہے، جب سے میں پیدا ہوا ہوں وہ ستارہ چار لاکھ دفعہ پیدا ہو چکا ہے۔ تو پاک ہے وہ ذات جس کی قدرت اتنی عظیم اور اس کا کمال اس قدر بالا ہے۔

اصناف واقسام ملائکہ

یاد رہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ملائکہ کی اصناف واقسام اور اوصاف کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً اصناف کا تذکرہ کچھ یوں ہے

3/3

۱۔حاملین عرش

ارشادِ الٰہی ہے:

وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (پ۲۹،الحاقۃ:۱۷) — اور اس دن تمہارے رب کا عرش آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائیں گے

۲۔حافین عرش

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (پ۲۴،الزمر۷۵) — اورتم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کیے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بولتے ہیں

۳۔اکابر ملائکہ

انہی میں سیدنا جبریل اور میکائیل صلوات اللہ علیہما بھی ہیں،فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَ مَلَآئِكَتِهِ وَ رُسُلِهِ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيكَالَ فَاِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ — اور جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا

(پ۱،البقرۃ:۹۸)

اوصاف جبریل علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے اوصاف بیان کیے۔

پہلا،یہ انبیاء کیلئے صاحب الوحی ہیں،ارشاد مبارک ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ (پ۱۹،الشعراء:۱۹۳،۱۹۴) — اسے روح الامین لے کر اُترا تمہارے دل پر

دوسرا،اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر قرآن میں باقی ملائکہ سے پہلے فرمایا:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ (پ۱،البقرۃ:۹۷) — کہو جو کوئی دشمن ہے جبریل کا

پھر حضرت جبریل صاحب وحی و علم،حضرت میکائیل صاحب ارزاق و اغذیہ،علم جو کہ روحانی غذا ہے یہ جسمانی غذا سے افضل ہے لہٰذا سیدنا جبریل یقیناً حضرت میکائیل سے افضل ٹھہرے

۳۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے سے دوسرا بتایا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ بے شک اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک ایمان والے

(پ۲۸، التحریم:۴)

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام، روح القدس رکھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں فرمایا:

اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (پ۷ المائدۃ:۱۱۰) جب میں نے پاک روح کے ساتھ تیری مدد کی

۵۔ اللہ کے دوستوں کی مدد اور اس کے دشمنوں کی سرکوبی مع ہزار ملائکہ کرتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ چھ صفات بیان کیں:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ (پ۳۰، التکویر:۱۹تا۲۱) بیشک یہ عزت والے رسول (جبریل) کا پڑھنا ہے جو قوت والا ہے مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے امانت دار ہے

ان کی رسالت کا عالم یہ ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ کے رسول ہیں تو تمام انبیاء و رسل ان کی اُمت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے اکرام کا یہ عالم کہ انہیں ہی اپنے اور اشرف بندوں انبیاء کے درمیان واسطہ بنایا ان کی قوت یہ ہے کہ شہر مدائن کو قوم پہ آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر اُلٹا کر دیا، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ بھی مقام ہے کہ اس مقام میں انہیں اپنا ثانی بنایا

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ بے شک اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک ایمان والے

(پ۲۸، التحریم:۴)

ان کا مطاع و مخدوم ہونا یہ ہے کہ یہ تمام ملائکہ کے امام و مقتدا ہیں۔

ان کا امین ہونا یوں بیان ہوا:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ اسے روح الامین لے کر اترا تمہارے دل پر تا کہ تم ڈرانے والوں میں سے ہو جاؤ (پ۱۹، الشعراء:۱۹۳)

اکابر ملائکہ میں حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل صلوات اللہ علیہما بھی ہیں، ان دونوں کا وجود احادیث سے ثابت ہے، حدیث میں ہے حضرت عزرائیل علیہ السلام موت کا فرشتہ ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ (پ۷،الانعام:۶۱)
یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو فرشتے ہمارے اس کی روح قبض کرتے ہیں

بتارہا ہے کہ قبض روح متعدد ملائکہ کے سپرد ہے تو ممکن ہے ملک الموت اس جماعت کے سربراہ ہوں قبض روح جن کے سپرد ہے، ارشادِ مقدس ہے:

وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَ اَدْبَارَھُمْ (پ۱۰،الانفال:۵۰)
اور کبھی تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی جان نکالتے ہیں مار رہے ہیں ان کے منہ اوران کی پیٹھوں پر

حضرت اسرافیل علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں ہے کہ یہ صاحب صُور ہیں، فرمانِ الٰہی ہے:

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی فَاِذَا ھُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ (پ۲۴،الزمر:۶۸)
صور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جو آسمانوں میں اور جتنے زمینوں میں ہیں مگر جسے اللہ چاہے پھر وہ دوبارہ پھونکے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے

۴۔ ملائکۂ جنت

ارشادِ مبارک ہے:

وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ (پ۱۳،الرعد:۲۳،۲۴)
اور فرشتے ہر دروازے سے ان پر یہ کہتے ہوئے آئیں گے سلامتی ہو تم پر تمہارے صبر کا بدلہ تو پچھلا گھر کیا ہی خوب ملا

۵۔ ملائکۂ جہنم

ارشادِ الٰہی ہے:

عَلَیْھَا تِسْعَۃَ عَشَرَ وَ مَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً (پ۲۹،المدثر:۳۱)
ان پر انیس داروغہ ہیں۔ اور ہم نے دوزخ کے داروغہ نہ کیے مگر فرشتے

ان کے سربراہ کا نام، مالک ہے، ارشادِ مبارک میں ہے:

وَ نَادَوْا یٰمٰلِکُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّکَ (پ۲۵،الزخرف:۷۷)
اور وہ پکاریں گے اے مالک تیرا رب ہمیں تمام کر چکے۔ (موت دیدے)

ان کا اجتماعی لشکر بھی ہے، ارشاد ہے

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (پ۳۰، العلق:۱۷،۱۸) اب پکارے اپنی مجلس کو، ابھی ہم سپاہیوں کو بلاتے ہیں

۶۔ اولادِ آدم علیہ السلام پہ مقرر

اس ارشاد میں ہے

عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (پ۲۶، ق۱۷،۱۸) ایک داہنے طرف بیٹھا ہے ایک بائیں کوئی بات وہ زباں سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو

لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (پ۱۳، الرعد:۱۱) آدمی کیلئے بدلی والے فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے کہ بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (پ۷، الانعام:۶۱) اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے

۷۔ کاتبینِ اعمال

ارشادِ مبارک ہے

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (پ۳۰، الانفطار:۱۰تا۱۱) اور بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں۔ معزز لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرو۔

۸۔ احوالِ کائنات پر مقرر

ان ارشاداتِ عالیہ میں، یہی مراد ہیں

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (پ۲۳، الصافات:۱) قسم ان کی باقاعدہ صف باندھیں

وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا (پ۲۶، الذاریات:۴) قسم ان کی جو بکھیر کر اڑانے والیاں

وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا (پ۳۰، النازعات:۱) قسم ان کی کہ جان کھینچیں

مددگار فرشتے

حضرت ابنِ عباس نے فرمایا: کراماً کاتبین کے علاوہ کچھ فرشتے ہیں جو درختوں کے پتوں کا گرنا بھی لکھتے ہیں جب کسی کو جنگل میں کوئی پریشانی لاحق ہو تو یوں کہے:

اَعِیْنُوْا عِبَادُ اللّٰہِ یَرْحَمُکُمُ اللّٰہ — اللہ کے بندوں میری مدد کرو اللہ تم پر رحم فرمائے۔

(مجمع الزوائد:۱۰۴/۱۷)

اوصافِ ملائکہ

یہ چند اوصافِ ملائکہ ہیں

ا۔ ملائکہ، اللہ تعالیٰ کے رسل و پیغامبر ہیں، ارشادِ الٰہی ہے

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (پ۲۲، فاطر:۱) فرشتوں کو رسول بنانے والا

سوال: ارشادِ الٰہی:

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (پ۱۷، الحج:۷۵) اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول

جواب: یہاں من بیانیہ ہے نہ کہ بعضیہ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے ان کا قرب، ان کا یہ قرب مکانی اور جہتی نہیں تو اب یہ قرب شرف میں ہی ہوگا۔ یہاں یہی مراد ہے۔

وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ (پ۱۷، الانبیاء:۱۹) اور اس کے پاس والے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے

بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۶) بلکہ عزت والے بندے ہیں۔

یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۰) دن رات اس کی پاکیزگی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔

۳۔ان کی طاعات کی شانیں

ان کی طاعات کے بیان میں چند صورتیں ہیں۔

پہلی صورت۔ان سے نقل کیا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (پ۱، البقرہ:۳۰) ہم تیری حمد بیان کرتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بولتے ہیں

وَاِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ (پ۲۳ الصافات:۱۶۵،۱۶۶) اور بیشک ہم پَر پھیلائے حکم کے منتظر ہیں اور بیشک ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں

تو اللہ تعالیٰ کذب سے پاک ہے لہٰذا ان کا دائمی عبادت میں ہونا ثابت ہے۔

دوسری صورت: اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں اس کے حکم کو فی الفور بجالانا۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ (پ۱۴ الانبیاء:۳۰) تمام ملائکہ نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا

تیسری صورت: یہ اللہ تعالیٰ کے حکم و وحی کے مطابق ہی کرتے ہیں، فرمایا:

لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَ هُمۡ بِاَمۡرِهٖ يَعۡمَلُوۡنَ (پ۱۷ الانبیاء:۲۷) بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اُسی کے حکم پر کاربند ہوتے ہیں

چوتھی صورت: ان کی طاقت کا بیان چند وجوہ سے ہے۔

پہلی وجہ: حاملینِ عرش آٹھ ہیں انہوں نے عرش و کرسی کو اٹھا رکھا ہے، کرسی جو عرش سے اصغر ہے وہ سات آسمانوں سے اعظم ہے، ارشاد ربانی ہے

وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ (پ۳ البقرۃ:۲۵۵) اُس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان و زمین

اس سے ان کی قوت و طاقت کا اندازہ لگاؤ۔

دوسری وجہ: بلندی و علوِ عرش کا احاطہ، وہم نہیں کرسکتا، اس پر یہ الفاظ مبارکہ شاہد ہیں۔

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِيۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ (پ۲۹ المعارج:۴) ملائکہ اور جبریل اس کی بارگاہ کی طرف عروج کرتے ہیں وہ عذاب اُس دِن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے

اس کے باوجود ملائکہ اپنی طاقت پر لمحہ واحد میں اُتر آتے ہیں۔

تیسری وجہ: ارشادِ گرامی ہے

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ (پ ۲۴، الزمر:۶۸)

اور صور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں مگر جسے اللہ چاہے پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔

تو صاحب صور اس قدر قوت والا ہے کہ اس کی واحد پھونک سے آسمانوں وزمین کی ہر شئی بے ہوش ہو جائے گی اور دوسری پھونک سے وہ زندہ ہو جائیں گے تو اس سے ان کی قوت کی معرفت حاصل کرلو۔

چوتھی وجہ: حضرت جبریل علیہ السلام قوت میں اس قدر ہیں کہ آل لوط پر پہاڑ اور شہر انہوں نے بیک وقت اٹھا لئے۔

پانچویں وجہ: ان کے خوف کا تذکرہ چند وجوہ سے ہے:

۱۔ یہ کثرت عبادت اور لغزشوں سے محفوظ ہونے کے باوجود اس قدر ڈرتے ہیں گویا ان کی عبادت، معاصی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (پ ۱۴، النحل:۵۰) اپنے اوپر اپنے رب کا خوف کرتے ہیں

وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُونَ (پ ۱۷، الانبیاء:۲۸) اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے

حَتّٰى إِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (پ ۲۲، سباء:۲۳)

یہاں تک کہ جب اذن دے کر ان کے دلوں کی گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا ہی بات فرمائی وہ کہتے ہیں جو فرمایا حق فرمایا اور وہی ہے بلند بڑائی والا

تفسیر میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جب وحی کیلئے کلام فرماتا ہے تو اسے اہلِ آسمان پتھر پر گھنٹی کی آواز کی طرح سن کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا: کہتے ہیں حق فرمایا اور وہ ''عَلِيٌّ كَبِيرٌ'' (بلند وبڑا) ہے۔

۳۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اور ان کے ساتھ جبریل امین علیہ السلام بھی تھے، آسمان کا کنارہ پھٹا، جبریل امین خوفزدہ ہوئے اور ان کا بعض دوسرے بعض میں سمٹ کر زمین کے قریب ہو گیا تو اچانک ایک فرشتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا: یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارا رب عز وجل تمہیں سلام فرماتا ہے اور تمہیں اس بات کا اختیار دیتا ہے

اَنْ تَكُوْنَ نَبِيًّا مَلِكًا وَ بَيْنَ اَنْ تَكُوْنَ نَبِيًّا عَبْدًا کہ تم نبی سلطان بن جاؤ یا نبی عبد

حضور ﷺ نے بتایا: حضرت جبریل علیہ السلام نے ہاتھ سے تواضع کا اشارہ کیا۔ میں نے جان لیا یہ میری خیر خواہی کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: میں نبی عبد بنناہی پسند کرتا ہوں۔ تو میں نے کہا: جبریل میں نے تجھ سے پوچھنے کا ارادہ کیا لیکن میں نے تمہارا حال دیکھا جس نے مجھے سوال سے منع کر دیا۔ جبریل یہ کیا معاملہ تھا؟ بتایا یہ اسرافیل علیہ السلام تھے انہیں جس دن سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس وقت سے یہ اس کے سامنے حاضر ہیں اور آنکھ تک نہیں اٹھاتے۔ رب تعالیٰ اور ان کے درمیان ستر انوار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے اگر یہ اس کے قریب ہوں تو جل جائیں، ان کے سامنے لوح محفوظ ہے جب اللہ تعالیٰ اسے کسی آسمانی یا زمینی شئ کا حکم دیتے ہیں تو وہ لوح ان کی پیشانی سے قریب آجاتی ہے اور یہ اس پر نظر کرتے ہیں اگر وہ میری ذمہ داری ہوتو مجھے کہہ دیتے ہیں اگر ذمہ داری میکائیل کی ہوتو اسے اگر عزرائیل ملک الموت کی ہوتو اسے کہہ دیتے ہیں، میں نے پوچھا: جبرئیل تمہاری ذمہ داری کونسی ہے؟ بتایا: ہواؤں اور لشکروں پر میرا کنٹرول ہے۔ پوچھا: میکائیل کی ذمہ داری کیا ہے؟ بتایا: ان کی ذمہ داری میں نباتات ہیں۔ میں نے پوچھا: ملک الموت کی ذمہ داری؟ بتایا: قبض نفوس۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید یہ قیام قیامت کیلئے آئے ہیں تو جو خوف آپ نے میرے اندر ملاحظہ کیا وہ قیام قیامت کا ہی تھا۔

(شعب الایمان:۱:۱۷۷)

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا قول

کلام اللہ اور کلام رسول ﷺ کے بعد وصف ملائکہ میں سب سے اعلیٰ وافضل کلام سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ہے انہوں نے ایک خطبہ میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بلند آسمان کو پھاڑا اور جدا کر کے انہیں طبقات ملائکہ سے بھرا، ان میں سے بعض سجدہ میں ہیں بعض رکوع میں ہیں کہ اٹھتے ہی نہیں۔ بعض صفوں میں کھڑے ہیں وہاں سے ہٹتے نہیں، تسبیح کرتے ہیں، تھکتے ہی نہیں، ان پر نیند، تھکاوٹ وسستی، غفلت، نسیان کا غلبہ نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض رسل کی طرف وحی الٰہی کے امین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور حکم کو نافذ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض بندوں کے محافظ ہیں، ابواب جنت کے دربان ہیں، ان میں سے کچھ کے قدم ارض سفلی پر، ان کی گردنیں سماء علیا سے بلند، ان کے ارکان واعضا، اقطار سے خارج، قوائم عرش کے برابر ان کے کاندھے، اُن کی آنکھیں جھکی ہوئیں، اپنے پروں سے ڈھانپے ہوئے ان کے اور ان کے نیچے والوں کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے ہیں وہ اپنے رب کا خیال تصور کے ذریعے نہیں کرتے نہ ان پر صفات مصنوع جاری ہوئیں، اپنے رب کو نہ جگہ میں محدود کرتے ہیں اور نہ ہی نظائر سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

پانچواں مسئلہ: ملائکہ سے مراد

اس میں اختلاف ہے کہ اس ارشادِ الٰہی:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً — جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں

میں ملائکہ سے تمام مراد ہیں یا ان میں سے بعض؟

حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد مبارک ان ملائکہ سے فرمایا: جو ابلیس کے ساتھ بطور محارب آتے تھے اس لئے کہ اللہ نے جب زمین پر جنات کو ٹھہرایا تو انہوں نے اس پر فساد کیا، خون بہایا اور ایک دوسرے کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملائکہ کے ساتھ بھیجا تو ابلیس نے انہیں اور ان کے لشکروں کو قتل کیا اور انہیں پکڑ کر سمندر کی طرف دھکیل دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً — میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں

اکثر صحابہ و تابعین کا مؤقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی تخصیص جماعت ملائکہ سے فرمایا اس لئے کہ لفظ ملائکہ میں عموم ہے لہٰذا تخصیص خلاف اصل ہوگی۔

چھٹا مسئلہ: جاعل جعل سے ہے جس کے دو مفعول اور یہ مبتدا و خبر پر آتا ہے اور وہ "فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" ہیں اس کا مفہوم ہے۔ مصیر فی الارض خلیفة

ساتواں مسئلہ: آیت میں ارض سے ظاہراً مراد مشرق تا مغرب تمام زمین ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن سابط رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا، فرمایا: زمین مکہ سے پھیلائی گئی ہے، ملائکہ بیت اللہ کا طواف کرتے اور یہ سب سے پہلے طواف کرنے والے ہیں اور وہ بھی یہی سرزمین ہے جس کے بارے میں فرمایا "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" لیکن اول قول ظاہراً اقرب ہے۔

آٹھواں مسئلہ: خلیفہ کا مفہوم

بعد میں آنے والا اور قائم مقام خلیفہ کہلاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (پ۱۱ یونس:۱۴) — پھر ہم نے ان کے بعد تمہیں زمین میں جانشین کیا

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ (پ۸ الاعراف:۶۹) — اور یاد کرو جب اُس نے تمہیں جانشین کیا

خلیفہ کون اور کیوں؟

یہاں خلیفہ سے مراد کون ہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام اور

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا — کیا تو زمین میں فساد کرنے والے کو بنائے گا؟

سے مراد ان کی اولاد ہے وہ خود مراد نہیں۔

۲۔ اولادِ آدم علیہ السلام۔

جنہوں نے کہا:

سیدنا آدم علیہ السلام ہیں ان کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ نام ان کا کیوں رکھا؟

اس کی دو وجہ بیان ہوئی ہیں۔

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے جب جنات کو زمین بدر کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر ٹھہرایا تو وہ اپنے سے پہلے جنات کے خلیفہ ٹھہرے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیفہ کا نام اس لئے دیا کہ اس نے انہیں مکلفین میں اپنے نفاذ حکم میں قائم مقام بنایا۔ یہ حضرت ابن مسعود و ابن عباس اور سدی سے مروی ہے۔ یہ رائے اس ارشادِ گرامی سے بھی مؤید ہے۔

اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ — بے شک ہم نے تجھے زمین میں نائب کیا تو لوگوں میں سچا حکم کر (پ۲۳، ص:۲۶)

جنہوں نے اولادِ آدم مراد لیا، ان کے ہاں خلیفہ نام کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بعد ہیں، امام حسن کا یہی قول ہے اس میں تاکید اس ارشادِ عالی سے ہوتی ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰۤئِفَ الْاَرْضِ — وہ ذات جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا۔

لفظ خلیفہ، واحد و جمع کو بھی شامل اور مذکر و مؤنث کو بھی۔ اس کی قرأت قاف کے ساتھ خلیقہ بھی ہے۔

سوال: اس میں کیا فائدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً، حالانکہ اس کی ذات اقدس مشورہ کی محتاجی سے منزہ ہے؟

جواب: دوطریق سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ جب وہ اس راز سے آگاہ ہوں گے تو وہ یہی سوال کریں گے تو مصلحت یہی تھی کہ وہ اس کے جواب سے آگاہ ہوں تو اس نے انہیں اس واقعہ سے آگاہ کیا تا کہ وہ سوال کریں اور اس کا جواب بھی پائیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنے بندوں کو مشورہ کی تعلیم دی۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: جمہور اعظم علماء دین کا اتفاق ہے کہ تمام ملائکہ، تمام ذنوب و گناہوں سے پاک ہیں اس کا مخالف حشویہ میں سے ہے، ہمارے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (پ۲۸،التحریم:۶) وہ اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں حکم کیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں

البتہ یہ آیت ملائکہ جہنم کے ساتھ مخصوص ہے، اگر ہم عمومی دلیل سے تمسک کریں تو فرمایا:

یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (پ۱۴،النحل:۵۰) اپنے اوپر اپنے رب کا خوف کرتے ہیں اور جو حکم دیا جائے وہی کرتے ہیں

یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کے کلمات تمام مامورات اور ترک منہیات کو شامل ہیں کیونکہ شئی سے ممانعت اس کے ترک کا حکم ہوتا ہے

سوال: اس پہ کیا دلیل کہ 'یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ' عموم کے مفید ہیں؟

جواب: مامورات کی ہر شئی سے استثناء درست ہے اور استثناء کلام کو اس سے نکال دیتا ہے۔لولاعلا خل جیسا کہ اصول الفقہ میں ہم نے بیان کر دیا ہے۔

۲۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (پ۱۷،الانبیاء:۲۶،۲۷) بلکہ عزت والے بندے ہیں بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہی اسی کے حکم پر کاربند ہیں

یہ ملائکہ کے معاصی سے بری ہونے اور تمام امور میں حکم و وحی الٰہی کے مطابق ہی بجالانے پہ تصریح و نص ہے۔

۳۔ ملائکہ سے انسان پر معصیت کا طعن نقل ہوا اگر وہ خود عاصی ہوتے تو یہ طعن مناسب نہ ہوتا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا وہ دن رات اللہ کی تسبیح سے تھکتے نہیں تو جو اس شان کا مالک ہو اس سے صدور معصیت محال ہے۔

مخالفین کے دلائل

مخالفین نے چند دلائل بیان کیے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے حکایت کیا:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ — کیا تو اسے بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خون بہائے اور ہم تیری تسبیح و حمد اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں

یہ تقاضا کر رہا ہے کہ ان سے گناہ کا صدور ہوا، اس پہ آیت کی دلالت چند طرح سے ہے۔

پہلی وجہ: ان کا قول، اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا، (کیا تو زمین میں بنائے گا) اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے اور یہ اعظم گناہ ہے۔

دوسری وجہ: انہوں نے اولاد آدم پر فساد اور قتل کا طعن کیا یہ غیبت ہے جو کبائر میں شامل ہے۔

تیسری وجہ: اولاد آدم پر طعن کے بعد خود اپنی مدح کی وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ دوسری جگہ ہے۔

وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ — اور بیشک ہم پر پھیلائے حکم کے منتظر ہیں اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں (پ ۲۳، الصافات: ۱۶۵، ۱۶۶)

اور اس میں حصر ہے گویا انہوں نے دوسروں سے تسبیح وغیرہ کی نفی کر دی، یہ عُجب، خود پسندی و غیبت ہے اور یہ مہلک ذنوب میں سے ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تین مہلکات ہیں اور ان میں خود پسندی بھی ہے۔

ارشادِ الٰہی بھی ہے:

فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ — تو آپ اپنی جانوں کو پاکیزہ نہ کہو (پ ۲۷، النجم: ۳۲)

چوتھی وجہ: ان کا قول، لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا، معذرت کے مشابہ ہے اگر گناہ نہ تھا تو معذرت کا کیا معنیٰ؟

پانچویں وجہ: ارشادِ الٰہی:

اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ — ان اسماء کے بارے مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو

(پ۱، البقرۃ:۳۱)

نشاندہی کررہا ہے کہ اولاً وہ قول میں جھوٹے تھے۔

چھٹی وجہ: ارشادِ مقدس

اَلَمۡ اَقُلۡ لَّـكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ (پ۱، البقرۃ:۳۳) — میں تمہیں نہیں کہتا تھا بیشک میں زمینوں اور آسمانوں کے پوشیدہ کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو

بتارہا ہے کہ ملائکہ اس واقعہ سے پہلے (اللہ تعالیٰ کا عالم ہونا) نہ جانتے تھے اور وہ اس کے تمام معلومات کے عالم ہوئے میں تشکیک کا شکار تھے۔

ساتویں وجہ: ان کا علم کہ یہ فساد وخون بہائیں گے انہیں وحی سے حاصل ہوا یا یہ ان کا اجتہاد تھا، اول صورت بعید اگر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کیا تھا تو اس کلام کے اعادہ میں کیا فائدہ؟ تو ثابت ہوا یہ ان کا اجتہاد ہی تھا، دوسرے پر بطور ظن ردوقدح ہرگز جائز نہیں، ارشادِ الٰہی ہے۔

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ (پ۱۵، الاسراء:۳۶) — اور اس چیز کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغۡنِىۡ مِنَ الۡحَـقِّ شَيۡـئًا (پ۱۱، یونس:۳۶) — بیشک گمان حق کا کوئی کام نہیں دیتا۔

آٹھویں وجہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے، اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ سے فرمایا جو محاربہ جنات میں ابلیس کا لشکر بن کر آئے تھے۔اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً۔ ملائکہ نے جواباً کہا: اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا۔ پھر انہوں نے اللہ کا غضب دیکھا تو کہنے لگے: سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ

امام حسن اور قتادہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے جب تخلیق آدم کا ارادہ کیا تو ملائکہ نے آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کرے وہ جو بھی مخلوق پیدا کرے گا ہم اس سے مکرم ومعظم ہوں گے۔ جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرما کر انہیں ملائکہ پہ فضیلت دی

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھائے پھر سب کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ

(پ ۱، البقرۃ:۳۱)

یعنی اگر تم اس قول میں سچے ہو کہ میں جو بھی مخلوق پیدا کروں تم اُس سے افضل ہوں گے تو اب فرشتے توبہ کی طرف لوٹے اور قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ بولے پاکیزگی ہے تجھے ہمیں کوئی علم نہیں

بعض روایات میں یہ ہے جب انہوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ بھیجی جس نے انہیں جلا دیا

دوسرا شبہ، واقعہ ہاروت وماروت

انہوں نے واقعہ ہاروت و ماروت سے بھی استدلال کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں فرشتے ہیں۔ ان دونوں نے جب اہلِ زمین کو معاصی کا مرتکب پایا تو ان پر معترض ہوئے اور انہیں بہت برا کہا اور اہلِ زمین کے خلاف دعا کی، اللہ نے فرمایا: اگر میں تمہیں اولادِ آدم کی طرح شہوات وخواہشات میں مبتلا کردوں تو تم بھی یوں نافرمانی کرو گے۔ عرض کیا: اگر آپ ہمیں مبتلا کریں گے تو ہم ایسا نہیں کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین پر اُتار کر اولادِ آدم جیسی خواہشات میں ڈالا، وہ زمین پہ آکر ٹھہر گئے، اللہ تعالیٰ نے ستارہ زہرہ کو اور اس پہ مقرر فرشتہ کو بھی زمین پر اترنے کا حکم دیا، زُہرہ نے خوبصورت عورت کی اور فرشتہ نے مرد کی صورت اختیار کرلی، زہرہ نے ایک گھر میں اپنے کو مزین کر کے ان دونوں کو اپنے ہاں دعوت دی۔ اس فرشتہ نے اس خاتون کے گھر بت نصب کردیا، دونوں اس کے گھر آئے اور اسے برائی کی دعوت دی۔ خاتون نے کہا: میں یہ کام نہیں کروں گی البتہ اگر تم شراب پیو تو پھر تیار ہوں۔ کہنے لگے: ہم شراب نہیں پئیں گے۔ پھر شہوت نے غلبہ کیا تو شراب پی لی اور اسے برائی کی دعوت دینے لگے۔ خاتون کہنے لگی: ایک کام رہ گیا؟ میں اپنے جسم پر اس کے بغیر قدرت نہیں دوں گی۔ پوچھا: وہ کونسا کام ہے؟ اس نے کہا: اس بت کو سجدہ کرو۔ کہنے لگے: ہم اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرسکتے۔ پھر شہوت غالب آگئی تو کہنے لگے: سجدہ کر لیتے ہیں پھر توبہ کرلیں گے۔ تو دونوں نے بت کو سجدہ کردیا۔ زہرہ اور فرشتہ آسمان پر اپنی جگہ چلے گئے۔ اب انہیں سمجھ آیا کہ سارا کچھ ہمارے ساتھ اولادِ آدم پر طعن وعیب کی وجہ سے ہوا ہے۔

دوسری روایت

دوسری روایت میں ہے، زُہرہ اہل زمین میں سے فاحشہ عورت تھی۔ انہوں نے اس سے شراب پینے، قتل نفس اور سجدہ بُت

کے بعد برائی کی اور اسے اسم اعظم سکھا دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اوپر آسمان پر جانا تھا، اس عورت نے وہ کلمات پڑھے تو وہ آسمان پر چلی گئی اللہ تعالیٰ نے اسے مسخ فرما کر زُہرہ ستارہ بنا دیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو ان کے فعل کی قباحت سے آگاہ کیا اور انہیں تاخیر سے عذابِ آخرت اور فی الفور عذاب دنیا میں اختیار دیا تو انہوں نے عذابِ دنیا کو ترجیح دی۔ اللہ نے انہیں کنواں بابل میں اوندھے منہ قیامت تک لٹکا دیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے اور اس کی دعوت دیتے ہیں۔ انہیں سوائے جادو سیکھنے والے کے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ بقول ان کے اسی طرف اس ارشادِ الٰہی میں اشارہ ہے:

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ (پ۱، البقرۃ:۱۰۲) اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنتِ سلیمان کے زمانہ میں

تیسرا شبہ: ابلیس کا ملائکہ میں سے ہونا

ابلیس، ملائکہ، مقربین میں سے تھا پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور کفر کیا جو واضح کر دیتا ہے جنس ملائکہ سے گناہ کا صدور ہوسکتا ہے

چوتھا شبہ: ملائکہ کو عذاب دیا جانا

اس ارشادِ الٰہی:

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (پ۲۹، المدثر:۳۱) اور ہم نے دوزخ کے داروغہ نہ کئے مگر فرشتے

سے یوں انہوں نے استدلال کیا یہ بتا رہا ہے کہ ملائکہ کو عذاب دیا جائے گا کیونکہ اصحاب نار وہی کہلائیں گے جنہیں عذاب دیا جائے گا، جیسا کہ فرمان ہے:

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یہ دوزخ والے ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے

پہلے شبہ کا جواب

پہلی وجہ یہ تھی کہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ پہ اعتراض کیا اور یہ اعظم گناہ ہے تو گزارش یہ ہے کہ ان کے اس سوال سے غرض یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ غافل ہے لہٰذا اسے توجہ دلائی جائے کیونکہ ایسا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے اور یہ نہ ہی اللہ تعالیٰ کے فعل پر انکار ہے بلکہ اس سوال سے مقصود یہ اُمور ہیں

۱۔ انسان جب کسی دوسرے کے صاحب حکمت ہونے کے بارے میں یقین رکھتا ہو تو وہ جب اسے کوئی ایسا فعل کرتے دیکھتا ہے جس کی حکمت سے وہ آگاہ نہیں تو وہ پوچھتا ہے کیا آپ یہ کرو گے؟ گویا وہ اس کے کمال حکمت وعلم پر متعجب ہو کر کہتا ہے ایسی نعمت کسی فسادی کو عطا کرنا ان امور میں سے ہے کہ عقول اس کی حکمت تک نہیں پہنچ پاتیں، جب تم ایسا کر رہے ہو اور میں جانتا ہوں آپ کا فعل کسی گہری حکمت اور عمیق راز کی وجہ سے ہی ہے جس پر تو ہی مطلع ہے تو وہ تیری بڑی حکمت اور اعلیٰ علم کیا ہے؟ تو فرشتوں کا " اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا " کہنا گویا یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم اور احاطہ حکمت پر تعجب ہے جو تمام عقلاء سے مخفی ہے؟

۲۔ طلب جواب کیلئے اشکال وارد کرنا ممنوع نہیں گویا انہوں نے کہا: ہمارے اللہ تو حکیم ہے تیرا کوئی بھی کام لغو نہیں ہوتا معروف یہ ہے کہ کسی بے وقوف کو پاگل پن پر قادر کرنا بھی بے وقوفی ہی سمجھا جاتا ہے، جب تو ان مفسد و قاتل لوگوں کو پیدا کرے گا، تیرا ان کے حال سے آگاہ ہوتے ہوئے انہیں پیدا کرنا اور انہیں اس پر قدرت دینا اور انہیں نہ روکنا بے وقوفی کا وہم پیدا کرتا ہے حالانکہ تیری ذات اقدس حکیم کامل ہے تو اب دونوں چیزوں کا اجتماع کیسے ممکن ہے؟ گویا ملائکہ نے علمِ جواب کیلئے یہ سوال کیا۔

معتزلہ کا جواب

یہی معتزلہ کا جواب ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ آیت واضح کر رہی ہے ملائکہ، اللہ تعالیٰ سے فعل قبیح کا صدور جائز نہیں مانتے اور یہ اہل عدل کے مذہب کے مطابق ہے اور اس جواب میں دو چیزیں تاکید پیدا کر رہی ہیں۔

۱۔ ملائکہ نے فساد اور قتل کی نسبت مخلوق کی طرف کی ہے نہ کہ خالق کی طرف۔

۲۔ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا:

وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیری پاکیزگی بولتے ہیں

اور تسبیح، اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کو اوصافِ اجسام اور تقدس، اس کے افعال کو اوصاف ذم اور کم عقلی سے پاک قرار دینا ہے۔

۳۔ حکماء کا جواب

شرور اگرچہ اس عالم سفلی میں ہیں مگر یہ لوازم خیرات کے طور پر ہیں اور خیرات، شرور پر غالب ہیں تو شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کا ترک شر کثیر ہوتا ہے تو ملائکہ نے ان شرور کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بیشک جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے

یعنی عالم سفلی سے حاصل ہونے والی خیرات، ان سے حاصل شرور سے اکثر ہیں تو اس صورت میں تقاضا حکمت ان کی ایجاد ہے نہ کہ ان کا ترک، یہ جواب حکماء کا ہے۔

۴۔ ملائکہ کا یہ سوال اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں بطور مبالغہ ہے اس لئے کہ عبد مخلص اپنے مولیٰ کی شدت محبت کی وجہ سے یہ ناپسند کرتا ہے کہ اس کا کوئی نافرمان عبد ہو

۵۔ ملائکہ کا قول

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کیا تو بنائے گا اس زمین میں جو فساد کرے گا

گذارش تھی کہ زمین یا اس کا کچھ حصہ انہیں دیدے اگر اس میں حکمت ہو۔ گویا انہوں نے کہا: اے ہمارے اللہ تو زمین ہمیں دے دے نہ کہ انہیں جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا (پ۹، الاعراف:۱۵۵) کیا تو اس کام پر ہلاک فرمائے گا جو ہمارے بے عقلوں نے کیا

یعنی ہمیں ہلاک نہ فرما، تو ملائکہ کے جواب میں فرمایا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے

یعنی میں تمہاری صلاحیت اور ان زمین پر متمکن کئے جانے والوں کی صلاحیت سے خوب آگاہ ہوں تو ملائکہ کیلئے آسمان اور ان کیلئے زمین منتخب کی اس لئے کہ وہ ان کی مختلف ادیان کیلئے صلاحیت سے آگاہ ہے تاکہ ان میں ہر فریق اسے اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے پسند فرمایا ہے۔

۶۔ ملائکہ نے وہ حکمت پوچھی باوجود فساد وقتل کے انہیں کیوں پیدا کیا جا رہا ہے؟

۷۔ شیخ قفال کہتے ہیں ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے کی اطلاع دی تو انہوں نے اتجعل فیھا کہا تو یہ بطور استفہام، ثبوت وایجاب ہے یعنی یقیناً تو اسے کرے گا، جریر نے کہا:

ألستم خير من ركب المطايا و أندى العالمين بطون راح

(تم بہتر ہو سواروں سے اور کائنات میں سخی ہو)

یعنی تم ہی اسی طرح ہو، اگر یہاں استفہام ہوگا تو یہ مدح نہ ہوگی۔

تو ملائکہ نے کہا: تو یہ بتائے گا باوجودیکہ ہم تیری تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ تو جو کرے گا وہ درست وسراپا حکمت ہوگا تو ان کے کہنے پر فرمایا:

اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، گویا کہا: جو تم کرتے ہو بہتر ہے کیونکہ تم نے میری حکمت پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے تم صرف ان کے ظاہری فساد وقتل ہی سے آگاہ ہو ان کے باطن سے تم آگاہ نہیں ہو۔ اور میں ان کے ظاہر وباطن دونوں سے آگاہ ہوں تو میں ان کے باطنی ایسے مخفی اسرار اور کامل حکمتوں سے آگاہ ہوں جن کا تقاضا ان کی خلقت وایجاد ہے۔ و اللہ اعلم

دوسرے استدلال کا جواب

دوسرا استدلال ان کا یہ تھا کہ ملائکہ نے اولادِ آدم کی غیبت کا ارتکاب کرتے ہوئے ان کا ذکر نامناسب طریق سے کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ محل اشکال، ان کا فساد وقتل پر اقدام ہے تو جو سوال کرے گا اس پہ لازم ہے کہ وہ محل اشکال کا ذکر کرے نہ کہ دوسرے محل کا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اولادِ آدم کے یہی دو پہلو ذکر کیے۔ ان کی عبادت اور توحید پر کسی شئی کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ محل اشکال ہی نہیں تھے۔

تیسرے استدلال کا جواب: اپنی تعریف ہر حال میں منع نہیں

تیسرا استدلال یہ تھا کہ ملائکہ نے اپنی تعریف کرتے ہوئے عُجب پسندی اور تزکیۂ نفس کا اظہار کیا اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی تعریف ہر حال میں ممنوع نہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (پ ۳۰، الضحیٰ:۱۱) اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو

پھر ممکن ہے ان کے قول "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" میں اپنی تعریف مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ یارب ہم نے سوال تیری حکمت پر اعتراض کیلئے نہیں کیا کیونکہ ہم تو تیری تسبیح وتحمید کرتے ہوئے تیری اُلوہیت اور حکمت کے معترف ہیں گویا اس سے ان کی غرض یہ بیان کرنا ہے ہمارا سوال حکمت واُلوہیت پر اعتراض نہیں بلکہ تفصیلاً اس حکمت سے آگاہ ہونا ہے۔

چوتھے استدلال کا رد

چوتھا استدلال یہ تھا، ان کا قول "لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" معذرت کے مشابہ ہے جو بتاتا ہے کہ پہلے گناہ ہوا ہے۔

جواب: ہمیں تسلیم کہ اولیٰ یہی تھا کہ ملائکہ سوال نہ اٹھاتے، جب انہوں نے اولیٰ کام کے خلاف کیا تو یہ ترک اولیٰ پر معذرت ہے۔ (اور ترک اولیٰ گناہ نہیں ہوتا)

سوال: کیا ملائکہ کے بارے میں ارشادِ الٰہی نہیں:

لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ (پ۱۷، الانبیاء:۲۷) اور بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے

تو اب یہ سوال بھی اذن الٰہی سے ہوا تو جب یہ اس میں ماذون تھے تو اب معذرت کیسی؟

جواب: عام کو کبھی تخصیص عارض ہو جاتی ہے یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔

پانچویں استدلال کا رد

ملائکہ کا فساد و فسق کی خبر دینا وحی سے تھا یا بطور اجتہاد وظن؟

جواب: اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے بعض نے کہا یہ بطور ظن، دو وجہ سے ہے۔

۱۔ حضرت ابنِ عباس اور کلبی سے منقول ہے کہ انہوں نے سیدنا آدم علیہ السلام کے زمین پر آباد ہونے سے پہلے زمین پر آباد جنات پر قیاس کیا۔

۲۔ ملائکہ کو اس کی خلقت کا جب علم ہوا کہ وہ عناصر اربعہ سے مرکب اور اس میں شہوت و غضب بھی ہے تو شہوت و خواہش سے فساد اور غضب و غصہ سے قتل کا مرض وجود میں آتا ہے۔

یہ قول بطور یقین تھا

بعض نے کہا: ان کا یہ قول بطور یقین و وحی ہے اور یہ حضرت ابنِ مسعود اور متعدد صحابہ سے مروی ہے اور اس پر ان کے دلائل یہ ہیں

پہلی دلیل: جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا:

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں

تو انہوں نے عرض کیا: وہ خلیفہ کیسا ہوگا؟ تو بتایا اس کی اولاد ہوگی جو زمین میں فساد و حسد کرتے ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرے گی

تو اس پر ملائکہ نے عرض کیا:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ کیا تو اسے بنائے گا جو زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آگاہ کر دیا تھا کہ زمین میں ایسی کثیر مخلوق ہوگی جو اس میں فساد و قتل کرے گی۔

تیسری دلیل: حضرت ابن زید کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ پیدا کیا تو ملائکہ بہت ڈر گئے تو عرض کیا: ہمارے رب یہ آگ کس کیلئے پیدا کی ہے؟ فرمایا: مخلوق میں سے جو میری نافرمانی کرے گا اور اس وقت مخلوق، ملائکہ کے سوا کوئی نہ تھی تو زمین پہ مخلوق کہاں؟ جب فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں

تو ملائکہ کو علم ہوا نافرمان ان میں سے ہوں گے

چوتھی دلیل: لوح محفوظ پر جب قلم نے تاقیامت احوال لکھے تو شاید انہوں نے وہاں مطلع ہو کر یہ معلوم کر لیا۔

پانچویں دلیل: خلیفہ کا معنی یہ ہے کہ وہ حکم و قضا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہو، حاکم اور قاضی کی طرف رجوع تنازع وتظالم کے وقت ہی ہوتا ہے تو وجود خلیفہ کی خبر بطریق التزام، وقوع فساد و شر کی ہی خبر ہوئی۔

اہلِ تحقیق کا کہنا یہ ہے، یہ بات ملائکہ نے بطور ظن کہی، باطل ہے اس لئے کہ دوسرے پر ایسا اعتراض اٹھانا جو جھوٹ سے محفوظ نہ ہو، منافی عصمت وطہارت ہے۔

چھٹے استدلال کا رد

اُن کا چھٹا استدلال بعض روایات سے ہے، لیکن وہ تمام احاد ہیں۔ لہٰذا وہ ہمارے بیان کردہ دلائل کے سامنے لائی ہی نہیں جاسکتیں

دوسرا شبہ: واقعہ ہاروت و ماروت

قصہ ہاروت، ماروت سے شبہ وارد کرنا ان وجوہات سے باطل ہے:

پہلی وجہ: انہوں نے واقعہ میں یہ ذکر کیا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے فرمایا تھا اگر میں اولادِ آدم کی طرح تمہیں دنیا میں مبتلا کر دوں تو تم بھی میری نافرمانی کا ارتکاب کرو گے۔ انہوں نے کہا: اگر تو ہمارے ساتھ ایسے کرے تو ہم تیری نافرمانی نہیں کریں گے۔ ان کا ایسا کہنا، اللہ تعالیٰ کی تکذیب اور اسے جاہل قرار دینا ہے جو صریح کفر ہے حالانکہ فرقہ حشویہ تک تمام لوگ مانتے ہیں کہ زمین پہ آنے سے پہلے وہ معصوم تھے۔

دوسری وجہ: واقعہ میں یہ ہے کہ انہیں عذابِ دُنیا اور عذابِ آخرت میں اختیار دیا گیا، یہ باطل ہے بلکہ اولیٰ یہ تھا کہ انہیں توبہ اور عذاب میں اختیار دیا جاتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان دونوں میں اختیار دیا جنہوں نے طویل عمر اس کے ساتھ شرک اور اس

کے انبیاء علیہم السلام کے ایذا کا ارتکاب کیا۔

تیسری وجہ: مذکورواقعہ میں یہ بھی ہے کہ وہ اس حالت میں بھی جادو سکھا رہے ہیں جب کہ وہ عذاب میں تھے اور وہ اس کی طرف دعوت دے رہے تھے جبکہ وہ اپنی معصیت پہ سزا بھگت رہے تھے۔

چوتھی وجہ: یہ کیسے مان لیا جائے فاجر، عورت، گناہ کے بعد آسمان پہ چلی جائے اور اسے اللہ تعالیٰ روشن ستارہ بنا کر اس کی قدرو منزلت کرے کیونکہ اس نے قسم اٹھائی ہے:

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ تو قسم ہے ان کی جو الٹے پھریں سیدے چلیں تھم رہیں

(پ۳۰، التکویر:۱۵،۱۶)

لہٰذا یہ واقعہ نہایت ہی کمزور وغلط ہے اس کے انتہائی کمزور ہونے پر ہر عقل سلیم، شاہد ہے رہا جادو سکھانے کا معاملہ تو اس آیت کی تفسیر میں انشاءاللہ اس پر گفتگو آ رہی ہے۔

تیسرا شبہ: ابلیس ملائکہ میں سے تھا، عنقریب ہم واضح کریں گے یہ ملائکہ میں سے نہیں تھا۔

چوتھا شبہ: اِرشادِالٰہی:

وَ مَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (پ۲۹، المدثر:۳۱) اور ہم نے نہیں بنایا دوزخ کے داروغہ سوائے فرشتوں کے

یہ ملائکہ کے عذاب میں ہونے پہ دلیل نہیں۔ اسی طرح یہ ارشادِالٰہی:

اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ (پ۱، البقرۃ:۳۹) یہ دوزخ والے ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے

بھی ان کے عذاب پہ دلیل نہیں، یہ بات تو کسی اور دلیل سے ثابت ہو سکتی ہے۔ سابقہ آیت

وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (پ۲۹، المدثر:۳۱) اور ہم نے دوزخ میں فرشتوں کو مقرر کیا ہے

سے دوزخ کے خازن، اس میں متصرف اور مدبر ومنتظم فرشتے مراد ہیں۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ: ملائکہ، معاصی پر قادر ہیں یا نہیں؟

اس میں اختلاف ہے کہ ملائکہ معاصی پر قادر ہیں یا نہیں؟ جمہور فلاسفہ اور کثیر جبریہ کہتے ہیں ملائکہ خیرات محض ہیں لہٰذا یہ ہرگز شرور وفساد پر قدرت نہیں رکھتے۔

جمہور معتزلہ اور کثیر فقہاء کہتے ہیں یہ دونوں امور پر اختیار رکھتے ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ملائکہ نے کہا: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا۔ ان کا یہ قول خواہ معصیت ہے یا ترک اولیٰ، دونوں صورتوں میں ان کا مختار ہونا ثابت ہے۔

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ — اور ان میں جو کوئی کہے میں اللہ کے سوا معبود ہوں تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے (پ۱۷، الانبیاء:۲۹)

اس کا یہ تقاضا ہے کہ ان پر یہ زجر وممانعت ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے:

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (پ۹، الاعراف:۲۰۶) وہ اس کی عبادت میں تکبر نہیں کرتے

ترک تکبر پہ مدح تبھی جائز ہوگی جبکہ وہ ترک تکبر پر قادر ہوں۔

۳۔ اگر وہ ترک خیرات پہ قادر ہی نہیں تو ان کے بجالانے پر قابل مدح کیسے ہو سکتے ہیں جو ترک شئ پر قادر ہی نہیں بلکہ وہ مجبور ہو وہ اس شی کی بجا آوری پر قابل ستائش و مدح نہیں ہوا کرتا۔

معتزلی کا رد

ایک معتزلی نے بھی اس سے استدلال کیا ہے میں اسے کہتا ہوں کیا ثواب و جزا۔ اللہ پہ لازم نہیں؟ اس پر لازم ہونے کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ اسے ترک کرتا ہے تو اس کے ترک سے جہالت لازم آئے گی یا حاجت و ضرورت اور یہ دونوں محال ہیں تو محال تک پہنچانے والا بھی محال ہی ہوتا ہے تو اب یہ ترک اللہ تعالیٰ سے محال ہوگا، جب ترک محال تو فعل لازم تو اب اللہ تعالیٰ پر ثواب وعوض لازم اور اس کا ترک محال حالانکہ اللہ تعالیٰ اس فعل پہ ممدوح ہے تو ثابت ہوگیا محالِ ترک، حصول مدح میں مانع نہیں تو وہ معتزلی خاموش ہوگیا کوئی جواب نہ دے سکا۔

تیسرا مسئلہ: تسبیح اور تقدیس کا مفہوم

"وَ نَحْنُ" کا واؤ حالیہ ہے جیسے محاورہ ہے

اتحسن الی فلان و انا احق بالاحسان — تو نے فلاں پر احسان کیا حالانکہ میں احسان کے زیادہ لائق تھا

تسبیح، اللہ تعالیٰ کا عیب ونقص سے پاک ہونا ہے اسی طرح تقدیس کا مفہوم ہے۔ یہ سبح فی الارض اور قدس فی الارض

(وہ زمین پر چلا اور دور چلا گیا) سے ماخوذ ہیں، دور ہونے سے مراد اگر عیب سے دوری ہو تو تسبیح اور خیر سے دوری مراد ہو تو لعنت تو ہم کہتے ہیں عیب سے دور ہونے میں، ذات، صفات اور افعال میں بے عیب ہونا بھی داخل ہے۔

ذات میں یوں بے سبب کہ وہ امکاں کا محل نہ ہو۔

نفی امکان، نفی کثرت کو ستلزم، نفی کثرت جسمانیت وعرض ضد وند، حصول واحد اور وجوب ذاتی کو ستلزم ہے۔

صفات میں یوں ہے کہ وہ جہل سے منزہ ہے تو وہ تمام معلومات کو محیط اور تمام مقدورات پر قادر ہوگا اور اس کی صفات تمام تغیرات سے منزہ و بالاتر ہوں گی۔

افعال میں یوں کہ اس کے افعال کی غرض، حصول منافع اور ازالہ نقصانات نہیں، وہ کسی دوسری شئی کی وجہ سے کامل نہیں اور نہ کسی کے عدم سے اس کا نقص ہوتا ہے لہٰذا وہ تمام موجودات ومعدومات سے بے نیاز و مستغنی، ان کے اعدام پر اور موجودات کے ایجاد پر قادر ہوگا۔

اہلِ ذکر کہتے ہیں، تسبیح قرآن میں کبھی معنی تنزیہ اور کبھی بمعنی تعجب آتا ہے۔

تسبیح بمعنی تنزیہ

اول کی متعدد صورتیں ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ میں نظیر وشریک سے بری ہوں۔

هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ — وہ اللہ واحد قہار ہے

۲۔ میں آسمانوں اور زمین میں مدبر ہوں۔

سُبْحَانَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ — پاک ہے زمین وآسمان کا پروردگار

۳۔ میں تمام جہانوں کی تدبیر کرنے والا ہوں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ — عالمین کا رب پاک ہے

۴۔ میں ظالموں کے قول سے منزہ ہوں۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (پ۲۳، الصّٰفّٰت:۱۸۰) — پاکیزگی تمہارے رب، عزت والے رب کی ان ظالموں کی باتوں سے

۵۔ میں تمام سے مستغنی وبے نیاز ہوں۔

سُبْحَانَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ (پ۱۱، یونس:۶۸) وہ پاک و بے نیاز ہے

۶۔ میں ایسا بادشاہ ہوں کہ میرے سوا ہر شئی میرے تابع اور کنٹرول میں ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ پاک ہے جس کے ہاتھ پر چیز کا قبضہ ہے

(پ۲۳ یٰسین:۸۳)

۷۔ میں ہر شئی کا عالم ہوں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ عَالِمِ الْغَیْبِ (پ۱۸، المومنون:۹۱) اللہ ان چیزوں سے پاک جو وہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں غیب کو جاننے والا ہے

۸۔ میں بیوی و اولاد سے پاک ہوں۔

سُبْحَانَهٗ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ (پ۶، النساء:۱۷۱) اللہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو

۹۔ میں ان کفار کے قول و بات سے بری ہوں۔

سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عَمَّا یَصِفُوْنَ وہ اس سے پاک اور بلند ہے جن کے ذریعے وہ شریک ٹھہراتے ہیں، جو وہ کہتے ہیں، جو وہ منسوب کرتے ہیں

تسبیح بمعنی تعجب

بمعنی تعجب کی بھی کئی صورتیں ہیں:

۱۔ میں نے ہی نہایت قوی چوپائے کمزور انسان کے تابع کر دیے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا (پ۲۵، الزخرف:۱۳) پاک ہے جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا

۲۔ میں نے جہان پیدا کیا اور میں تھکاوٹ و سستی سے منزہ ہوں۔

سُبْحَانَهٗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا پاک ہے جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے

۳۔ میں عالم ہوں لیکن کسی معلم کی تعلیم اور کسی رہبر کی رہنمائی سے نہیں:

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (پ۱، البقرۃ:۳۲) پاک ہے تو ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا

۴۔ میں ہی ستر سال کے گناہ ایک لمحہ کی توبہ سے زائل کر دیتا ہوں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ (پ۲۶، ق:۳۹) اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرو سورج نکلنے سے پہلے

پھر فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہو تو تسبیح کرو

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (پ۲۲، الاحزاب:۴۲) صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو

اگر مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہو تو یوں تسبیح کرو۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۸۷) تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں ظالم ہوں

اگر تم رضا حق چاہو تو یوں تسبیح کرو:

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۱۳۰) رات اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو کہ اس کی رضا حاصل ہو

اگر تم آگ سے نجات چاہو تو یوں تسبیح کرو

سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (پ۴، آل عمران:۱۹۱) تو پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا

اے بندو! میری تسبیح پر دوام اختیار کرو مثلاً سبحان اللہ، اگر تم میری تسبیح نہیں کرو گے تو نقصان تمہارا ہے اس لئے کہ تسبیح کرنے والے بہت ہیں۔

حاملینِ عرش

ان میں سے حاملینِ عرش ہیں

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ (پ۲۴، فصلت:۳۸) اگر انہوں نے تکبر کیا تو تیرے رب کے پاس پاکیزگی بولنے والے ہیں

ان میں سے ملائکہ مقربین ہیں۔

قَالُوْا سُبْحَانَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا (پ۲۲، سبا:۴۱) وہ عرض کریں گے پاکیزگی ہے تجھ کو تو ہمارا مولیٰ ہے

ان میں باقی ملائکہ ہیں۔

قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِيْ لَنَا (پ۱۸،الفرقان ۱۸) پاکیزگی ہے تجھ کو ہمیں سزاوار نہ تھا

ان میں سے حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں جیسا کہ حضرت ذوالنون یونس علیہ السلام نے پڑھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ (پ۱۷،الانبیاء:۸۷) نہیں تیرے سوا کوئی معبود تو پاک ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ (پ۹،الاعراف:۱۴۳) تو پاک ہے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں

صحابہ تسبیح کرتے ہیں:

سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (پ۴،آل عمران:۱۹۱) تو پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا

بلکہ تمام اشیاء تسبیح کرتی ہیں ان میں سے حشرات، دواب اور ذرات بھی ہیں، فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (پ۱۵،الاسراء:۴۴) ہر شئی اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے

اسی طرح حجر، شجر، ریت، پہاڑ، رات، دن، ظلمات، انوار، جنات، نار، زمان، مکاں، عناصر، ارکان، ارواح واجسام بھی تسبیح کرتے ہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ (پ۲۷،الحدید:۱) تسبیح کرتے ہیں اللہ کی تمام آسمان والے

تمام کا ثواب بندوں کے لیے

پھر فرمایا: اے بندو! میں تمام اشیاء کی تسبیح سے مستغنی ہوں اور ان اشیاء میں زندگی نہیں لہٰذا انہیں اس تسبیح پر ثواب کی حاجت بھی نہیں تو کیا ان کی تسبیحات کا ثواب ضائع ہو جائے گا حالانکہ یہ بات میرے شایانِ شان ہی نہیں، اس لئے فرمان ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہ بنائے (پ۲۳،ص:۲۷)

اس لئے میں ان اشیاء کا ثواب تمہیں عطا کرتا ہوں تا کہ ہر ایک معلوم کر لے جو میری اطاعت میں محنت کرتا ہے میں تمام جہان کو اس کی خدمت میں لگا دیتا ہوں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تم عبودیت کے ساتھ مجھے یاد کرو تا کہ اس سے تمہیں نفع ہو نہ کہ مجھے

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ (پ۲۳،الصافات:۱۸۰) پاک ہے تمہارا رب، عزت والا رب

کیونکہ جب تم تسبیح کرو گے تو میں تمہیں معاصی سے پاک کردوں گا۔

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلاً (پ۲۲،الاحزاب:۴۲) اور صبح وشام اس کی پاکیزگی بولو۔

مجھے قرض دو اگرچہ میں غنی ہوں۔

وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (پ۲۷،الحدید:۱۸) اور وہ جنہوں نے اللہ کو اچھا قرض دیا

لیکن ایک پر تمہیں دس عطا کروں گا۔

مَنْ ذَالَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ (پ۲،البقرۃ:۲۴۵) ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے تو وہ اس کیلئے کئی گنا بڑھا دے

میرے معاون بنو اگرچہ میں تمہاری معاونت سے غنی ہوں۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۲۶،الفتح:۴) اور اللہ کے لشکر زمین اور آسمانوں میں ہیں

پھر مجھے لشکروں کی ضرورت بھی نہیں۔

وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ (پ۲۶،محمد:۴) اللہ چاہتا تو خود ان سے بدلہ لیتا

البتہ جب میری مدد کرو گے تو میں مدد تمہاری کروں گا۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (پ۲۶،محمد:۷) اگر تم دین خدا کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا

تو میرے ذکر پر دوام اختیار کرو۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (پ۲،البقرۃ:۲۰۳) اور اللہ کا ذکر کرو گنے ہوئے دنوں میں

اور مجھے تمہارے ذکر کی حاجت نہیں اس لئے کہ تمام میرے ذاکر ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ۲۱،لقمان:۲۵) اگر آپ ان سے پوچھیں آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا فرمایا وہ ضرور کہیں گے اللہ نے

البتہ جب تم میرا ذکر کرو گے تو میں تمہارا ذکر کروں گا۔

تم میری خدمت کرو:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ
اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو

اس لئے نہیں کہ میں تمہاری خدمت کا محتاج ہوں ہاں میں ہی مالک ہوں۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۴، آلِ عمران:۱۸۹) اور زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ کیلئے ہی ہے

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (پ۱۳، الرعد:۱۵) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کرتی ہے۔

ہاں ان ایام قلیلہ میں تم میری خدمت کرو تا کہ تم کثیر راحتیں پاسکو۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ
(پ۷، الانعام:۹۱) اللہ کہو پھر انہیں چھوڑ دو

چوتھا مسئلہ: بِحَمْدِكَ کی تفسیر

صاحب کشاف کا کہنا ہے ''بِحَمْدِكَ'' حال ہے یعنی تیری تسبیح کرتے ہیں اس حال میں کہ تیری حمد کرتے ہیں اور تسبیح تیری تحمید سے ملی ہوتی ہے تو مفہوم کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تو تیری حمد کرتے ہیں یعنی ہماری تسبیح، تیرے استحقاق کے بغیر نہیں بلکہ تیری ذات اپنی حمد و جلال کی وجہ سے مستحق تسبیح ہے۔

۲۔ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اس لئے اگر بصورت توفیق ہم پر تیرا انعام نہ ہو تو ہم اس پر قادر نہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا اہم قول

جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں تیرے شکر پر کیسے قادر ہو سکتا ہوں؟ میں تو تیری نعمتوں کے شکر تک، تیری نعمت کے بغیر پہنچ ہی نہیں پاتا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کی۔

اَلْاٰنَ قَدْ شَكَرْتَنِيْ حَيْثُ عَرَفْتَ اَنَّ كُلَّ ذٰلِكَ مِنِّيْ
اب تو نے شکر کیا اس لئے کہ تم نے یہ حقیقت پالی کہ ہر شئے میری طرف سے ہی ہے۔

تسبیح سے مراد

یہاں تسبیح سے کیا مراد ہے؟ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، منقول ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بوقت صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ عرض کیا: میرے والدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ فدا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ کو کونسا کلام زیادہ پسند ہے؟ فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کیلئے منتخب کیا: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ (مسلم:۲۷۳۱)

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے، حضور ﷺ جماعت کروا رہے تھے ایک مسلمان نے منافق کو دیکھا تو کہا: رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور تو ادھر بیٹھا نماز نہیں پڑھ رہا۔ منافق نے کہا: جا تو اپنا کام کر۔ مسلمان نے کہا: میں محسوس کرتا ہوں تجھ پہ ایسا آدمی گزرے گا جو تجھے سیدھا کر دے گا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے۔ فرمایا: تو ادھر بیٹھا ہے، رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں۔ تو اس نے وہی سابقہ جملہ دہرایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی مرمت کی اور کہا: میرا طریقہ یہی ہے۔ پھر مسجد میں جا کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا نبی اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میں ابھی فلاں پر گزرا۔ آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور وہ بیٹھا ہوا تھا میں نے اس سے کہا: رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور تو ادھر بیٹھا ہے۔ کہنے لگا: جا اپنا کام کر۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے اس کی گردن تو نہیں اڑا دی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے تاکہ جا کر اسے قتل کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عمر واپس آؤ، تمہارا غضب عزیز اور تمہاری رضا حکمت ہے، آسمان پر کچھ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ایسے ہیں جن کی نماز کی وجہ سے وہ فلاں کی نماز سے غنی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ان کی نماز کونسی ہے؟ آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی تو حضرت جبریل علیہ السلام آ گئے۔ بتایا: یا نبی اللہ صلی اللہ علیک وسلم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ سماء کی نماز کے بارے میں تم سے پوچھا؟ فرمایا: ہاں! کہنے لگے انہیں میری طرف سے سلام کہو اور بتاؤ اہلِ سماء دنیا تا قیامت حالت سجدہ میں یہ کہہ رہے ہیں:

سُبْحَانَ ذِیْ الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ — پاک ہے وہ جو ملک وملکوت کا مالک ہے

دوسرے آسمان والے تا قیامت حالت قیام میں کہہ رہے ہیں۔

سُبْحَانَ ذِیْ الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوْتِ — پاک ہے جو عزت و جبروت کا مالک ہے

تیسرے آسمان والے تا قیامت حالت رکوع میں یہ کہہ رہے ہیں۔

سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ — پاک ہے وہ ذات جو ہمیشہ زندہ جاوید ہے

تو یہ ملائکہ کی تسبیح ہے۔

۲۔ نُسَبِّحُ، کا معنی "نُصَلِّی" تسبیح بمعنی صلاۃ ہے۔ حضرت ابنِ عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔

پانچواں مسئلہ: تقدیس سے مراد

تقدیس، بمعنی تطہیر، اسی سے ہے "ارض مقدسة" (پاک سرزمین) تقدیس سے کیا مراد ہے؟ اس کے یہ معانی بیان ہوئے ہیں

۱۔ نقدس لك نطهرك یعنی ہم تیرے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں جو تیرے علو وعزت کے لائق ہیں۔

۲۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، ہم تیری رضا کیلئے اپنے نفوس کو ذنوب وخطایا سے پاک رکھتے ہیں۔

۳۔ یہ شیخ ابو مسلم کا قول ہے، ہم اپنے افعال کو ذنوب سے پاک رکھتے ہیں تا کہ وہ تیرے لئے ہی ہو جائیں۔

۴۔ ہم اپنے دلوں کو تیرے غیر کی طرف متوجہ ہونے سے پاک رکھتے ہیں تا کہ وہ تیری معرفت کے انوار میں ہی مستغرق رہیں۔

معتزلہ کا مؤقف

معتزلہ کہتے ہیں یہ آیت مقدسہ عدل پر کئی وجوہات سے دال ہے۔

پہلی وجہ: ملائکہ کے قول

وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ اور ہم تسبیح حمد کے ساتھ اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں میں افعال کی نسبت انہوں نے اپنی طرف کی ہے اگر یہ افعال الٰہیہ ہوتے تو ان پر اپنی مدح کرنے کا کوئی معنی نہیں اور نہ ہی انہیں فساد وقتل پہ فضیلت ہوتی کیونکہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں۔

دوسری وجہ: اگر فساد وقتل اللہ تعالیٰ کے فعل ہیں تو لازماً جواب یہ ہوتا میں مالک ہوں جو چاہوں کروں۔

تیسری وجہ: ارشادِ مبارک اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ فساد وقتل سے برأت کا اعلان ہے لیکن اپنے فعل سے برأت محال ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ: جب فحش، قبح، جور وظلم اور فساد تمام اس کے عمل وخلقت ہیں تو تسبیح وتقدیس کا کیا معنی؟

پانچویں وجہ: ارشادِ گرامی کہ "اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" مذہب عدل پر دال ہے اس لئے کہ اگر وہ خالقِ کفر ہوتا تو ان کی تخلیق کفر کیلئے ہوگی تو اب جواب یہ ہوتا ہاں ان کی تخلیق فساد وقتل کیلئے ہی ہے لیکن وہ اس جواب پر خوش نہیں تو یہ مذہب بھی ساقط۔

چھٹی وجہ: اگر فساد وقتل، اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں تو یہ انسانوں کے الوان واجسام کی طرح ہوتے تو جیسے ان پر کوئی تعجب نہ تھا اسی طرح فساد وقتل پر بھی تعجب نہ ہوگا۔

جواب: ان وجوہات کا، مسئلہ داعی وعلم سے معارضہ ان کا جواب ہے جو تفصیلاً گذر چکا۔ واللہ اعلم

چھٹا مسئلہ: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ کے متعدد معانی

سوال: ارشاد، اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ ان کے مذکور سوال کا جواب کیسے بنتا ہے؟

جواب: سوال میں متعدد احتمالات ہیں:

پہلا احتمال: سوال بطور تعجب ہوتو "اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" اس طرح جواب ہوگا۔ فرمایا: تم ان کے فساد وقتل پر تعجب نہ کرو اس کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں صالحین ومتقین بھی ہوں گے اسے تم نہیں جانتے۔

دوسرا احتمال: ان کا سوال بطور غم ہوتو جواب یوں ہوگا کہ تم مفسدین کی وجہ سے غم نہ کرو ان میں جانتا ہوں متقین ہوں گے اور ایسے لوگ بھی:

لَوْ اَقْسَمَ عَلَیَّ لَاَبَرَّہٗ   اگر وہ کسی معاملہ میں میری قسم اٹھالیں گے تو میں اسے پوری کروں گا

تیسرا احتمال: یہ سوال طلب حکمت کیلئے ہوتو جواب یوں ہوگا تمہارا اس معاملہ میں بطور اجمال ہی حکمت کا جاننا کافی ہے نہ کہ بطور تفصیل بلکہ بعض اوقات تفصیل جاننا تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔

چوتھا احتمال: سوال بطور التماس ہو کہ ہمیں ہی زمین پر رہنے دیا جائے تو جواب دیا میں اس کی مصلحت سے آگاہ ہوں کہ تم آسمان پر رہو نہ کہ زمین پر۔

پانچویں وجہ: پانچویں وجہ یہ ہوسکتی ہے جب ملائکہ نے کہا "نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور وہ یہ تھا کہ تمہارے ساتھ ابلیس ہے اور اس کے دل میں حسد، تکبر اور نفاق ہے۔

چھٹی وجہ: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ"، جب تم نے یہ کلمات کہے تو تم نے اپنی مدح کے ساتھ اپنے آپ کو ہی بڑا سمجھا۔ گویا تم نے اس کلام کے ساتھ اپنی تسبیح کی نہ کہ میری۔ اب تم صبر کرو تا کہ انسان تمہارے سامنے آجائیں جو میری بارگاہ میں یوں کہیں گے

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا   (پ۸، الاعراف:۲۳)   اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ — اور وہ جس کی مجھے آس لگی ہے کہ میری خطائیں بخشے گا

(پ۱۹، الشعراء:۸۲)

وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ — اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما

(پ۱۹، النمل:۱۹)

[۳۱] وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

(اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھائے پھر سبکو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ)

تفصیلی وجہ حکمت

ملائکہ نے جب تخلیقِ آدم، ان کی اولاد اور انہیں زمین پہ ٹھہرانے کی حکمت پوچھی تو اللہ تعالیٰ نے ''اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ'' سے بطور اجمال حکمت بیان فرمائی۔ اب اس مجمل کا مزید بیان وتفصیل ہے تو یہاں حضرت آدم علیہ السلام کی ایسی فضیلت بیان کی جو انہیں معلوم نہ تھی بایں طور کہ حضرت آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی پھر ملائکہ سے سوال کیا تاکہ ان پہ حضرت آدم علیہ السلام کا علم میں فضل اور ملائکہ کی کمی ظاہر ہو جائے تو اس جواب تفصیلی سے جواب اجمالی میں قوت وتائید پیدا ہوگی۔ یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: زبانیں اور لغات توقیفی ہیں

امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ، جبائی اور کعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں تمام زبانیں ولغات توقیفی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ ومعانی کا علم ضروری تخلیق کیا اور ان الفاظ کو ان معانی کیلئے وضع کیا۔ ان کا استدلال 'و علم آدم الاسماء کلھا' سے ہے، ہم نے اس سے استدلال کی تفصیل بصورت سوال وجواب اصول الفقہ میں بیان کر دی ہے۔

شیخ ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں لغت اصطلاحی کا پہلے ہونا ضروری ہے اصطلاح کے وضع سے پہلے ہونے پر ان کے دلائل یہ ہیں

۱۔ اگر علم ضروری یوں حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ اس معنی کیلئے وضع فرمایا تو یہ علم اب عاقل کو حاصل ہوگا یا غیر عاقل کو، عاقل کیلئے اس کا حصول جائز نہیں اس لئے کہ اگر علم ضروری یوں حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ فلاں معنی کیلئے وضع کیا ہے تو اب اللہ کی صفات بداھۃً معلوم ہو جائیں گی اور اس کی ذات، استدلال سے معلوم ہے اور یہ محال ہے، غیر عاقل کیلئے

بھی حصول جائز نہیں اس لئے کہ عقلاً ان لغات کے ساتھ حصول علم بعید ہے پھر غیر عاقل کیلئے ان میں عجیب حکمتیں کہاں؟ لہٰذا توقیف کا قول فاسد ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے خطاب فرمایا اس سے لازم آ رہا ہے کہ اس تکلم سے پہلے لُغت زبان تھی۔

۳۔ ارشاد، وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا میں تعلیم اسماء کا بیان ہے جو بتا رہا ہے کہ ان کی تعلیم سے پہلے اسماء تھے۔ جب معاملہ یوں ہی ہے تو اس تعلیم سے پہلے لغات کا حصول ہوگا۔

۴۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے علم اسماء کے ساتھ ملائکہ کو چیلنج کیا تو ملائکہ کا یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ ان اسماء کے مسمیات کی تعیین میں صادق ہیں ورنہ ان کے صدق کا علم حاصل نہیں ہوگا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان اسماء کی وضع ان مسمیات کیلئے اس تعلیم سے مقدم ہو۔

ان دلائل کا جواب

پہلے کا جواب: یہ کہنا کیوں جائز نہیں کہ تخلیق علم ضروری سے مراد یہ ہے کہ ان اسماء کو ان مسمیات کیلئے واضع نے وضع کیا ہے ہاں یہ تعین نہیں کہ واضع اللہ تعالیٰ ہے یا لوگ ہیں؟ اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ صفات تو بداہۃً معلوم اور ذات دلیل سے معلوم ہو

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عاقل میں یہ علم پیدا نہیں کیا البتہ یہ کہنا کیوں ناجائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر عاقل میں اسے پیدا کیا اور عقلاً اسے بعید قرار دینا ہی بعید ہے۔

دوسرے کا جواب: یہ ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے خطاب کسی اور طریق پر کیا ہو مثلاً بصورت تحریر وغیرہ

تیسرے کا جواب: یہ ہے کہ بلاشبہ ان الفاظ کے معانی کیلئے وضع کا ارادہ الٰہی اس تعلیم سے مقدم تھا تو اسماء کی طرف نسبت تعلیم کیلئے یہ کافی ہے۔

چوتھے کا جواب: انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب آ رہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دوسرا مسئلہ: صفات وخواص کا علم

پہلا قول: کچھ اہلِ علم کہتے ہیں: وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا، سے واضح کیا کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی صفات، نعوت اور خواص کا علم عطا فرمایا۔ دلیل یہ ہے کہ اسم کا اشتقاق 'سِمَةٌ' یا 'سُمُوٌّ' سے ہے اگر سمة سے ہو تو اسم کا معنی علامت ہے اشیاء کی صفات، نعوت اور خواص ہی اس کی ماہیت پہ دال ہوتے ہیں تو اسماء سے یہ صفات وغیرہ مراد لینا درست ہوگا۔

اور اگر یہ 'سُمُوٌّ' "(بلند) سے ہو تو معاملہ پھر بھی یہی ہے اس لئے کہ شی پر دلیل، شی پر بلند شئی کی طرح ہوتی ہے کیونکہ

دلیل کا علم مدلول کے علم سے پہلے ہوتا ہے تو دلیل حقیقت میں بلند ہوئی، تو اسم سے لغۃً صفت مراد لینے میں کوئی ممانعت نہیں باقی اہلِ نحو نے لفظ اسم کو چند الفاظ مخصوصہ کیلئے مخصوص کر دیا ہے لیکن نحوی عرف بعد کا اور نیا ہے لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

جب یہ تفسیر حسب لغت ممکن ہے تو اس کا مراد ہی ہونا لازم ہے نہ کہ کوئی دوسری تفسیر، اور وجوہ و دلائل یہ ہیں:

پہلی وجہ: حقائق اشیاء کی معرفت میں فقط اسماء اشیاء جاننے سے فضیلت ہے، کلام کو ایسی فضیلت کے اظہار پر محمول کرنا جو مزید فضیلت کو لازم ہو اولیٰ ہوتا ہے اس سے جس میں یہ نہ ہو۔

دوسری وجہ: تحدی و چیلنج اس سے ممکن و جائز ہوتا ہے کہ سامع کیلئے بھی اس پر کسی نہ کسی صورت میں قدرت ہو مثلاً اگر آدمی لغت و فصاحت کا عالم ہے تو اسے یہ کہنا درست ہے فصاحت میں میرے مثل کلام لاؤ، لیکن کوئی عرب، حبشی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم میری زبان میں کلام کرو اس لیے کہ محض عقل ان لغات کو حاصل نہیں کر سکتی بلکہ ان کے حصول کا ذریعہ تعلیم ہی ہے ہاں تعلیم کے بعد ان کا علم آ جاتا ہے، ورنہ نہیں، رہے حقائق اشیاء تو عقل انہیں حاصل کر سکتی ہے لہٰذا ان کے ساتھ تحدی درست ہے۔

دوسرا قول: مشہور یہی ہے کہ یہاں تمام اجناس حوادثات کے نام مراد ہیں جو اولاد آدم میں مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، رومی، انگریزی وغیرہ میں ہیں۔ سیدنا آدم کی اولاد ان لغات اور زبانوں میں گفتگو کرتے حضرت آدم کے وصال کے بعد ان کی اولاد اکناف عالم میں پھیل گئی تو ہر ایک نے کسی متعین زبان میں گفتگو کی تو وہاں وہی زبان رائج ہو گئی، مدت طویل اور ہر دور میں موت کی وجہ سے زبانیں بھول گئیں، اولاد آدم میں مختلف زبانوں کی تبدیلی کا سبب بھی یہی ہے۔

اہلِ معانی و حقائق کا قول

اہلِ معانی کا قول یہ ہے کہ ''وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ'' میں حذف ماننا ضروری ہے تو مراد یہ ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مسمیات کے اسماء کا علم دیا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اسماء کے مسمیات کا علم دیا، اول اولیٰ ہے کیونکہ آگے ارشاد:

أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ — بتاؤ مجھے ان کے اسماء

فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ — جب انہوں نے ان کے اسماء بتائے

یعنی فقط یہ نہیں کہا ان کے بارے میں مجھے بتاؤ بلکہ ان کے اسماء کی بات کی۔

عَرَضَهُمْ کی حکمت

سوال: جب اللہ تعالیٰ نے انہیں جمیع مسمیات کے انواع کا علم دیا تو ان میں غیر ذوی العقول بھی تو ہیں تو عَرَضَهُمْ کہا عَرَضَهَا کیوں نہ فرمایا؟

جواب: ان میں ملائکہ، انسان اور جنات شامل ہیں اور یہ اہل عقل ہیں، ان کے اکمل ہونے کی وجہ سے انہیں غلبہ دے دیا، اس لئے کہ معمول یہی ہے کہ کامل جب غالب ہوں تو انہیں ناقص پر غلبہ دیا جاتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: کچھ نے ارشاد اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ'' سے تکلیف مالا یطاق پر استدلال کیا لیکن یہ ضعیف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عجز سے آگاہ ہوتے ہوئے ان کی بے بسی ظاہر کرنے کیلئے پوچھا تھا اور اس پر یہ الفاظ مبارک شاہد ہیں:

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو

چوتھا مسئلہ: حضرت آدم علیہ السلام کا نبی ہونا

معتزلہ کا کہنا یہ ہے حضرت آدم علیہ السلام سے علم اسماء کا اظہار ایسا معجزہ ہے جو اس وقت سے ان کی نبوت پر دلیل ہے، اقرب و مختار یہی ہے کہ ان کی بعثت حضرت حوا علیہا السلام کی طرف ہوئی تھی، لیکن یہ بھی بعید نہیں کہ ان کی بعثت ان ملائکہ کی طرف ہو جن کو چیلنج دیا گیا کیونکہ یہ تمام اگرچہ رُسل ہیں مگر رسول کی طرف بھی بعثتِ رسول ہوسکتی ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت حضرت لوط علیہ السلام کی طرف ہے۔

اس پہ ان کا استدلال یہ ہے کہ انہیں علم اسماء کا حصول، خلاف معمول و عادت ہے لہٰذا اس کا معجزہ ہونا ضروری ہے جب یہ معجزہ ہو تو حضرت آدم علیہ السلام کا اس وقت سے نبی ہونا ثابت ہے۔

سوال: کوئی یہ کہہ سکتا ہے یہ تسلیم نہیں کہ انہیں علم کا حصول خلاف عادت ہوا، اس لئے کہ انہیں لُغات کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے جنہیں نہیں دیا انہیں وہ حاصل نہیں تو یہ خلاف عادت نہیں۔

پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کیا ملائکہ یہ جانتے تھے کہ ان اسماء کی وضع فلاں مسمیات کیلئے ہے یا نہیں جانتے تھے؟ اگر وہ جانتے تھے تو پھر انہیں بیان کرنے پہ قدرت تھی تو اب معارضہ لاحق ہو جائے گا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ان پہ فضیلت و کمال ظاہر نہ ہوگا۔

اور اگر وہ یہ جانتے ہی نہ تھے تو انہیں کیسے معلوم ہوگیا حضرت آدم علیہ السلام ان مسمیات میں سے ہر ایک کے بیان اسم میں سچے ہیں تو اس سوال کا جواب دو وجہ سے ہوسکتا ہے۔

پہلی وجہ: ممکن ہے ان انواع لغات میں سے ہر نوع ملائکہ کیلئے الگ الگ لغت ہو اور ہر نوع دوسرے کی لغت و زبان سے آگاہ نہ ہو، تمام اصناف ملائکہ وہاں موجود نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے تمام لغات کو ان پر بیان کیا، ہر صنف ملائکہ نے اپنی اپنی لغت کے حوالہ سے انہیں درست پایا تو اس طریق سے ان کی اصابت انہیں معلوم ہوگئی البتہ وہ ان تمام لغات کی معرفت سے عاجز تھے لہٰذا یہ علم معتبر قرار پایا۔

دوسری وجہ: یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بتادیا ہو اس سے پہلے کہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے سن کر ان کے صدق پر استدلال کیا تو جب انہوں نے ان سے یہی اسماء سنے اور ان کا صدق پالیا تو انہوں نے اس کا معجز ہونا پہچان لیا۔

ہاں اتنا تسلیم ہے کہ ان پہ خلاف عادت فعل کا ظہور ہوا تو ممکن ہے یہ بابِ کرامات یا بابِ ارہاصات میں سے ہو اور یہ دونوں اس موقعہ پر جائز ہیں لیکن اب اس مسئلہ پر گفتگو ان دونوں میں کلام کی فرع ہوگی۔

سیدنا آدم اس وقت نبی نہ تھے

کچھ لوگوں نے کہا: اس وقت حضرت آدم علیہ السلام قطعاً نبی نہ تھے، ان کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: اگر وہ اسی وقت نبی تھے تو پھر معصیت کا صدور ان سے نبوت کے بعد ہوگا اور یہ درست نہیں تو لازم ہے اس وقت وہ نبی نہ ہوں، یہ لزوم یوں ثابت کہ ان سے لغزش کا صدور بالاتفاق اس واقعہ کے بعد ہوا تھا اور اس لغزش کا تعلق کبائر سے ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ عنقریب آرہی ہے۔ کبیرہ کا ارتکاب دوری، تحقیر اور لعنت کا موجب ہوتا ہے اور یہ تمام انبیاء علیہم السلام کے حوالہ سے ممکن و جائز نہیں لہٰذا یہ ماننا لازم ہے کہ یہ لغزش قبل از نبوت ہے۔

دوسری دلیل: اگر حضرت آدم علیہ السلام اس وقت رسول تھے تو ان کی بعثت کسی کی طرف تھی یا نہیں تھی؟ اگر وہ کسی طرف مبعوث تھے تو وہ ملائکہ ہوں گے یا انسان یا جنات، اول صورت باطل اس لئے کہ معتزلہ کے ہاں ملائکہ، انسانوں سے افضل ہیں تو جائز نہیں کہ کم درجہ والے کو اعلیٰ و اشرف کی طرف رسول بنایا جائے کیونکہ رسول متبوع جبکہ اُمت تابع ہوتی ہے تو کم درجہ والے کا متبوع و اشرف بننا خلاف اصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آدمی اپنے ہم جنس کی بات کو زیادہ قبول کرتا ہے، اس لئے فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (پ ۷، الانعام:۹) اور اگر ہم نبی کو فرشتہ کرتے تو جب بھی اسے مرد ہی بناتے

یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی انسان کی طرف مبعوث ہوں اس لئے کہ اس وقت حضرت حوا علیہا السلام ہی تھیں اور انہوں نے مکلف ہونے کی معرفت براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پائی نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے واسطہ سے، ارشادِ الٰہی شاہد ہے:

وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (پ۸، الاعراف:۱۹) اور تم دونوں اس درخت کے قریب مت جانا

تو یہ حکم ان دونوں کو براہِ راست ہے اس میں سیدنا آدم علیہ السلام واسطہ نہیں بنائے گئے۔

یہ بھی جائز نہیں کہ ان کی بعثت جنات کی طرف ہو کیونکہ آسمانوں پہ کوئی جن تھا ہی نہیں۔

اور یہ بھی جائز نہیں کہ ان کی بعثت کسی کی طرف نہ ہوئی ہو کیونکہ رسول بنانے کا مقصد تبلیغ ہے اور یہاں مقصد تبلیغ ہی نہیں وہاں کسی کو رسول بنانے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ وجہ زیادہ قوی نہیں۔

تیسری دلیل: ارشادِ الٰہی ہے:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (پ۱۶، طٰہٰ:۱۲۲) پھر چن لیا اس کو اس کے پروردگار نے

یہ فرمان واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لغزش کے بعد منتخب کیا ہے لہٰذا یہ کہنا لازم ہے کہ لغزش سے پہلے منتخب نہ تھے۔ جب ولادت کے وقت منتخب ہی نہ تھے تو لازم ہے کہ رسول نہ ہوں اس لئے کہ رسالت اور انتخاب آپس میں متلازم ہیں کیونکہ انتخاب کا معنی ہی انواع واقسام شرافت کے ساتھ مخصوص کرنا ہے تو جسے بھی اللہ تعالیٰ رسول بناتا ہے اسے ان سے مخصوص فرمادیتا ہے۔ اس لئے ارشادِ مقدس ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (پ۸، الانعام:۱۲۴) اللہ بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے۔

پانچواں مسئلہ: اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کی تفسیر

ارشادِ الٰہی ''اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ'' کے معنی میں متعدد تفاسیر بیان ہوئی ہیں:

پہلی وجہ: معنی یہ ہے مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ، اگر تم یہ جانتے کہ بتانے میں تم سچے ہو۔

دوسری وجہ: مجھے خبر دو اور حق وسچ ہی کہو تو یہ اب ان کے قصور وعجز پر بیان کردہ تنبیہ میں تاکید ہے۔ جب ان کے اندر یہ بات پختہ ہوجائے گی کہ اگر وہ بتاتے ہیں تو وہ سچے نہ ہوں گے اور نہ ہی انہیں اس پر قدرت ہے تو وہ جان لیں گے کہ یہ ان کیلئے مشکل ہے

تیسری وجہ: اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو کہ مخلوق میں ایسی کوئی عبادت نہیں کرسکتا جس کی تمہارے اندر صلاحیت واستعداد ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔

چوتھی وجہ: اگر تم اس اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ہر مخلوق سے زیادہ علم والے ہو تو مجھے ان کے اسماء کی خبر دو۔

چھٹا مسئلہ

فضیلتِ علم

یہ آیتِ مبارکہ علم کی فضیلت آشکار کر رہی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام میں اپنے کمال حکمت کا اظہار فرمایا تو وہ ان کے علم کے ذریعے فرمایا: اگر کائنات میں علم سے بڑھ کر کوئی شئی اعلیٰ ہوتی تو پھر علم کے بجائے اس شئی کے ذریعہ ان کی فضیلت سامنے لائی جاتی۔

فضیلت علم اور کتاب اللہ

فضیلتِ علم پہ کتاب، سنت اور دلائل عقلیہ کثیر ہیں کتاب اللہ نے کئی طرح سے اسے بیان کیا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو حکمت فرمایا اور پھر حکمت کو عظمت دی جو شانِ علم کی عظمت پر دال ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم کو حکمت قرار دینا کچھ یوں ہے۔ حضرت مقاتل نے کہا، قرآن میں حکمت کی تفسیر ان چار معانی سے ہے:

پہلی وجہ: مواعظ قرآن، سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ — اور جو نازل کیا گیا تمہاری طرف کتاب اور دانائی

(پ۲، البقرۃ:۲۳۱)

سورۂ نساء میں فرمایا:

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ — اور اللہ نے تم پر کتاب اور دانائی اتاری۔

(پ۵، النساء:۱۱۳)

دونوں جگہ مواعظ مراد ہیں، اسی طرح آلِ عمران میں ہے:

دوسری وجہ: حکمت بمعنی علم وفہم، ارشادِ الٰہی ہے:

وَ اٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (پ۱۶ مریم:۱۲) اور اسے ہم نے بچپن میں ہی حکمت و علم دیا

سورۂ لقمان میں ہے:

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (پ۲۱ لقمان:۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی

یہاں مراد فہم و علم ہے، الانعام میں ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ — یہ وہ لوگ ہیں جن کو کتاب وحکمت ہم نے عطا کی

(پ۷،الانعام:۸۹)

تیسری وجہ: حکمت بمعنی نبوت۔سورۃ النساء (54) میں فرمایا:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ — ہم نے آل ابراہیم کو کتاب ونبوت عطا کی

یہاں نبوت مراد ہے،سورۂ ص میں فرمایا:

وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ (پ۲۳،البقرۃ:۲۰) اور ہم نے اسے حکمت عطا کی

سورۃ البقرہ میں فرمایا:

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ (پ۲،البقرۃ:۲۵۱) اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت عطا کی

یہاں بھی نبوت مراد ہے:

چوتھی وجہ: حکمت سے قرآن مراد ہے،فرمایا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (پ۱۴،النحل:۲۵) اپنے رب کے راستہ کی طرف قرآن کے ساتھ بلاؤ

دوسرے مقام پر ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا — جس کو دانائی دی گئی اس کو خیر کثیر عطا کی گئی

(پ۳،البقرۃ:۲۶۹)

یہ تمام معانی دراصل علم ہی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

قلیل علم اور مخلوق

پھر اس پر بھی غور کیجئے،اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو علم قلیل ہی عطا کیا ہے،ارشادِ مبارک ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (پ۱۵،الاسرا:۸۵) اور جو تمہیں علم دیا گیا تھوڑا ہے

اور تمام دنیا کو بھی قلیل قرار دیا ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (پ۵،النساء:۷۷) کہہ دیں دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے

جسے اس نے قلیل بتایا ہم اس کی تعداد وکیت کا ادراک نہیں رکھتے تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے جسے وہ کثیر قرار دے؟

قلتِ دنیا پر دلیل

قلت دنیا اور کثرت حکمت پر دلیل عقلی یوں ہے کہ دنیا کی قدر، تعداد اور مدت تمام متناہی اور محدود ہے اور علم کی قدر، تعداد اور مدت اور اس پر حاصل سعادتوں کی حد ہی نہیں یہ تمام فضیلت علم ہی کو آشکار کر رہی ہے۔

دوسری دلیل: ارشادِ الٰہی ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کہہ دیں کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں؟

(پ ۲۳، الزمر: ۹)

سات افراد میں فرق

اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں سات افراد کے درمیان فرق واضح کیا ہے، خبیث وطیب میں۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ (پ ۷، المائدۃ: ۱۰۰) اور کہہ دیجئے پاک اور ناپاک برابر نہیں

یعنی حلال وحرام میں فرق ہے۔

اندھے اور بینا میں فرق یوں بیان کیا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ (پ ۷، الانعام: ۵۰) کہہ دیجئے کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟

روشنی اور تاریکی میں فرق ان الفاظ میں کیا:

اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ (پ ۱۳، الرعد: ۱۶) کیا تاریکی اور روشنی برابر ہیں؟

اس طرح جنت ودوزخ اور ظل وحرور میں فرق کیا، اگر تم غور کرو تو معلوم ہو جائے گا یہ تمام عالم وجاہل کا ہی فرق ہے۔

تیسری دلیل: ارشادِ مقدس ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور صاحب حکم کی

(پ ۵، النساء: ۵۹)

اُولی الامر، اصحابِ علم

یہاں اصح قول کے مطابق اُوْلُـو الامــر سے اہلِ علم ہی مراد ہیں اس لئے کہ بادشاہوں پر اہلِ علم کی اطاعت لازم ہے اور معاملہ اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔

پھر یہ مرتبہ بھی ملاحظہ کرلیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دو مقامات پہ عالم کو دوسرے مرتبہ پر ذکر کیا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ (پ۳، آلِ عمران:۱۸)
اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ملائکہ اور عالموں نے

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (پ۵، النساء:۵۹)
حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول اللہ کا اور ان کا جو تم میں حکم والے ہیں

پھر اللہ تعالیٰ نے عزت و اکرام میں اضافہ کرتے ہوئے دو آیات میں عالم کو پہلے مرتبہ میں بیان کیا:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ (پ۳، آلِ عمران:۷)
اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے اور پختہ علم والے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِىْ وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (پ۱۳، الرعد:۴۳)
اور کہہ دیجئے کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے

چوتھی دلیل: ارشاد فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (پ۲۸، المجادلۃ:۱۱)
بلند فرمائے درجات اللہ نے ایمان والوں اور جن کو علم عطا کیا گیا ان کے

چار اصناف کے درجات

یاد رہے اللہ تعالیٰ نے چار اصناف کے درجات ذکر کئے ہیں۔

۱۔ صاحبِ ایمان اہلِ بدر۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (پ۹، الانفال:۲،۴)
بیشک مومنین وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں ان کیلئے درجات ہیں ان کے رب کے پاس

۲۔ مجاہدین۔

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ فضیلت دی اللہ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر (پ۵، النساء:۹۵)

۳۔ صالحین۔

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَاُولٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلٰى اور جو اس کے حضور ایمان کے ساتھ آئے اور اچھے کام کیے تو انہیں کے درجے اونچے ہیں۔ (پ۱۶، طہٰ:۵۷)

۴۔ اہلِ علم۔

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔ (پ۲۸، المجادلۃ:۱۱)

تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کے، دیگر اہلِ ایمان پر درجات، مجاہدین کے گھروں میں رہ جانے والوں پر درجات، صالحین کے درجات ذکر کیے اور پھر اہلِ علم کو تمام اصناف پر درجات میں فضیلت دی۔ لہٰذا اہلِ علم کا تمام لوگوں سے افضل ہونا لازم ہے۔

۵۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا بیشک بندوں میں سے علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ (پ۲۲، فاطر:۲۸)

علماء کے پانچ مناقب

اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں اہلِ علم کے پانچ مناقب بیان کیے ہیں۔

۱۔ ایمان

وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ (پ۳، آل عمران ۷)

۲۔ توحید و شہادت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ گواہی دی اللہ نے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، فرشتوں اور علم والوں نے (پ۳، آل عمران:۱۸)

۳۔ تضرع وزاری

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ اور روتے ہوئے ٹھوڑی کے بل گرتے ہیں (پ۱۵، الاسراء:۱۰۹)

۴۔ خشوع

اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا (پ۱۵،الاسراء:۱۰۷) بیشک وہ جنہیں اس کے اترنے سے پہلے علم ملا جب ان پر تلاوت کیا جاتا ہے ٹھوڑی کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔

۵۔ خشیتِ الٰہی

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (پ۲۲،فاطر:۲۸) بیشک علماء ہی اس کے بندوں میں سے اللہ سے ڈرتے ہیں

آحادیثِ مبارکہ اور فضیلتِ علم

۱۔ حضرت ثابت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے نارِ جہنم سے آزاد کردہ لوگ دیکھنا چاہتا ہے تو وہ طلبہ کو دیکھ لے۔ قسم بخدا۔ جب طالبِ علم دروازۂ علم کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم کے بدلے جنت میں ایک شہر آباد کیا جاتا ہے وہ زمین پر چلتا ہے تو زمین اس کیلئے استغفار کرتی ہے وہ رات اور دن اس حالت میں گزارتا ہے کہ اس کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں اور آتشِ جہنم سے آزادی کا پروانہ ملنے پر فرشتے گواہ ہیں

علم حاصل کرنے والا روزہ دار کی طرح

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو غیر اللہ کیلئے علم طلب کرتا ہے تو دنیا سے کوچ سے پہلے اس کے پاس ایسا علم آجاتا ہے جو خدا کیلئے بن جاتا ہے اور جو خدا کی رضا کیلئے علم حاصل کرے تو وہ روزہ دار اور رات قیام کرنے والے کی طرح ہے اگر کوئی شخص علم کا ایک باب سیکھ لے تو اس کیلئے راہِ خدا میں جبلِ ابُوقبیس کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے

عالم اور انبیاء کا قرب

۳۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو احیاءِ اسلام کی خاطر علم حاصل کرتے ہوئے موت آجائے تو جنت میں اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان ایک درجہ کا فرق ہے۔ (سنن دارمی:۳۵۴۰)

۴۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندوں کو اٹھائے گا اور ان میں علماء کو الگ اور ممتاز فرمائے گا اور حکم دے گا کہ میں نے تمہارے سینوں میں اپنا نور اس لیے رکھا ہے کہ میں تمہیں جانتا ہوں اور تمہیں علم کی دولت سے اس لیے سرفراز نہیں کیا کہ تمہیں عذاب دوں۔ جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا۔

(مسند الفردوس:۸۰۵۹)

مخلوق روتی ہے

۵۔ معلّمِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب معلّم خیر کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس پر آسمان کے پرندے، زمین کے چوپائے اور پانی کی مچھلیاں روتیں ہیں۔

(سنن ترمذی، ۲۶۸۵)

۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے عالم کی اقتداء میں نماز اُدا کی، گویا اُس نے نبی کی اقتداء میں نماز ادا کی۔

عابد پر ستر درجے

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم، عابد محض پر ستر درجے افضل ہے اور ہر درجے کے درمیان گھوڑ سوار کی ستر سالہ مُسافت کا فرق ہے، اس لیے کہ شیطان لوگوں کے درمیان بدعت پھیلانا چاہتا ہے تو عالم اسے دیکھ کر زائل کر دیتا ہے اور عابد اپنی عبادت میں مصروف رہتا ہے اور بدعت کی طرف عدم توجہ سے اس کو نہیں پہچانتا۔

(الترغیب والترہیب، ۵۷۰۱)

خلفاءِ رسول

۸۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے خلفاء پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ عرض کیا گیا: آپ کے خلفاء کون لوگ ہیں؟ فرمایا: جو میری سُنّت کو زندہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔

۹۔ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص اِس خیال سے گھر سے نکلے کہ علم کا ایک باب سیکھ کر لوگوں کو باطل سے حق کی طرف اور ضلالت سے ہدایت کی طرف بلائے گا تو اس کا یہ عمل چالیس سالہ عبادت کے برابر ہوگا۔

۱۰۔ حضرت علی اُلمرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے کسی ایک آدمی کو ہدایت عطا کر دے تو یہ تمہارے لیے پُورے رُوئے زمین سے بہتر ہے۔

(البخاری، ۳۰۰۹)

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اس نیت سے علم حاصل کرے کہ اسے رضائے خدا کیلئے لوگوں میں بیان کرے گا تو اُسے ستّر انبیاء کرام کے برابر ثواب ملے گا۔

۱۲۔ حضرت عامر جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز طالب علم کی سیاہی اور شہید کا خون تولا جائے گا تو دونوں برابر ہوں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ علماء کی سیاہی راجح اور بھاری ہوگی۔

۱۳۔ حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جلوہ افروز تھے، تین آدمی آئے ایک نے مجلس میں جگہ دیکھی وہیں بیٹھ گیا اور دوسرا ان کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا واپس چلا گیا۔ جب آپ نے خطاب ختم کیا تو فرمایا: میں تمہیں تین آدمیوں کے بارے میں خبر دیتا ہوں۔ ایک نے اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کی اسے پناہ مل گئی، دوسرے نے اللہ تعالیٰ سے حیاء کی اس سے حیاء کی گئی، تیسرے نے اللہ تعالیٰ سے مُنہ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اعراض فرمایا

(مُسلم، ۲۱۷۶)

آثار صحابہ اور فضیلتِ علم

۱۔ استاذ عالم، والدین کی بہ نسبت شاگرد پر زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ کیونکہ والدین بچے کی دُنیا کی آگ اور آفت سے حفاظت کرتے ہیں اور عالم آخرت کی آگ اور مشکلات سے بچاتا ہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا: آپ رضی اللہ عنہ نے یہ علم کیسے حاصل کیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: بہت سوال کرنے والی زبان اور سمجھدار دل کے ساتھ۔

۳۔ بعض عُلماء فرماتے ہیں کہ نادانوں کی طرح سوال کیا کرو اور داناؤں کی طرح یاد کیا کرو۔

۴۔ حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا: بیٹا! علم حاصل کرو، اگر تمہارے پاس مال ہے تو علم جمال بن جائے گا اور اگر مال نہیں تو علم ہی مال ہے۔

۵۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس طرح جہالت کی گفتگو میں بھلائی نہیں اِسی طرح علم کے متعلق خاموشی اختیار کرنے میں خیر نہیں۔

علماء تین طرح کے

۶۔ بعض محققین فرماتے ہیں، علمآء تین طرح کے ہوتے ہیں

۱۔ عالم باللہ مگر عالم بامراللہ نہ ہو۔

۲۔ عالم بامراللہ مگر عالم باللہ نہ ہو۔

۳۔ عالم باللہ بھی ہو اور عالم بامراللہ بھی۔

اول وہ بندہ ہے جس کے دل پر معرفتِ الٰہیہ نے اس قدر غلبہ کیا کہ وہ نُورِ جلال اور صفاتِ کبریاء میں مستغرق ہوجانے کی وجہ سے ضروری مسائل سے زائد علم حاصل نہ کرسکا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس نے حلال وحرام کو پہچانا۔ احکام کا علم حاصل کیا لیکن جلالِ الٰہی کے اسرار سے بے بہرہ رہا۔

تیسرا آدمی عالمِ معقولات و عالمِ محسوسات کے درمیان حد مشترک پر بیٹھا ہے کبھی وُہ ازرُوئے محبت خدا کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی ازروئے شفقت ورحمت مخلوق کے ساتھ۔ جب وہ خالق سے مخلوق کی طرف آتا ہے تو ان کا ایک فرد بن جاتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ معرفت الٰہی نہیں رکھتا اور جب جلوت سے خلوت میں آتا ہے تو ربّ قدّوس کی عبادت ومناجات اور ذکر وفکر میں اس طرح مشغول ہوتا ہے جیسے وُہ مخلوق سے بالکل ناواقف ہے۔ یہ مرسلین وصدیقین کا طریق ہے۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے مراد بھی یہی ہے علماء سے سوال کرو؟ حکماء سے اختلاط ومیل جول رکھو اور کبراء کی مجلس لازم کرلو۔

(المعجم الکبیر۔۲۲،۳۲۴)

علماء سے مراد جو احکامِ شرع سے واقف ہیں لیکن عالم باللہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بوقتِ ضرورت ان سے فتویٰ لینے اور سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور حکماء سے مُراد علماء باللہ ہیں جو اوامر ونہی کا (زائدازضرورت) علم نہیں رکھتے۔ اِن سے اختلاط کا حکم دیا گیا ہے اور کبراء سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کے عالم ہیں۔ جن کی مجلس اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ ان کی مجلس میں دارین کی سعادتیں اور منفعتیں ہیں۔

عالم بامرِ اللہ کی تین علامتیں

حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، تینوں قسم کے علماء کی تین تین علامتیں ہیں۔

۱۔ ذکرِ لسانی کی دولت سے بہرہ ور ہو لیکن ذکرِ قلبی کی دولت سے محروم ہو۔

۲۔ خدا تعالیٰ کی بجائے مخلوق کا خوف غالب ہو۔

۳۔ ظاہر میں لوگوں سے حیا کرے لیکن باطن اور دل میں ربّ الناس (لوگوں کے رب) سے حیا نہ کرے۔

عالم باللہ کی تین علامات

۱۔ذکر ۲۔خوف ۳۔حیا کی دولت سے مالا مال ہو

ذکر سے مُراد ذکرِ قلبی ہے نہ کہ ذکرِ لسانی، خوف سے مراد خوفِ ریا ہے نہ کہ خوفِ معصیت اور حیا سے مُراد وساوس وخطراتِ قلب سے حیا ہے نہ کہ ظاہری حیا۔

عالم باللہ و بامر اللہ کی چھ علامتیں

اللہ تعالیٰ اور امرِ الٰہی کے عالم میں چھ چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔تین عالم باللہ والی اور دُوسری تین یہ ہیں:

۱۔ عالم غیب اور عالم شہادت کے درمیان حدِ مشترک پر قیام کرتا ہو۔

۲۔ پہلی دو قسموں کا معلم ہو۔

۳۔ پہلے دو فریق اس کے محتاج ہوں اور وہ ان سے بے نیاز۔

علم و فکر کے بغیر دل کا مردہ ہونا

۲۔ حضرت شیخ فتح الموصلی فرماتے ہیں: کیا مریض کھانا پینا اور دَوا ترک کر دے تو مر نہیں جائے گا؟ یہی حال دل کا ہے۔یہ علم و فکر اور حکمت کے بغیر مر جاتا ہے۔

۳۔ حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میری مجلس میں لوگ آتے ہیں تو اُٹھ کر جاتے وقت تین قسموں پر منقسم ہوتے ہیں:

۱۔کافر محض ۲۔مومن محض ۳۔منافق محض

یہ اس لیے کہ میں تفسیر قرآن میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں جو تصدیق نہ کرے وہ کافر محض اور جس کا دل تنگ ہوتا ہے وہ منافق محض ہے اور جو اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرتا ہے تو وہ مومن محض ہے۔

تین اوقات میں نیند اور ہنسی

نیز فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو تین قسم کی نیند اور تین قسم کی ہنسی ناپسند ہے۔پہلی نیند نمازِ فجر کے بعد، دُوسری نمازِ عشاء سے پہلے اور تیسری دورانِ نماز۔تین قسم کی ہنسی، پہلی جنازہ کے پیچھے، دوسری قبرستان میں، تیسری مجلسِ ذکر میں۔

علم و پانی میں پانچ مشابہتیں

۴۔ بعض حضرات نے ارشادِ باری تعالیٰ ’فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ‘(تو پانی کا بہاؤ جھاگ اٹھالایا) میں سَیْل کی تفسیر علم سے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پانچ وجہ سے علم کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

۱۔ پانی کی طرح علم بھی آسمان سے اُترتا ہے

۲۔ زمین کی اصلاح پانی سے ہوتی ہے تو مخلوق کی اصلاح علم سے ہوتی ہے۔

۳۔ پانی کے بغیر شگوفوں میں شادابیاں اور رعنائیاں نہیں آتیں تو علم کے بغیر مخلوق میں اعمال وطاعات جیسی خوبیاں پیدا نہیں ہوتیں

۴۔ بارش کا پانی رعد وبَرق کی فرع ہے۔اس طرح علم وعدہ ووعید کی فرع ہے۔

۵۔ بارش نافع بھی ہوتی ہے اور نقصان دہ بھی اسی طرح علم نافع بھی ہے اور ضار ونقصان دِہ بھی۔علم باعمل نفع رساں ہے اور علم بےعمل ضرر رساں ہوتا ہے

بہت سے وعظ وتذکیر کرنے والے خدا تعالیٰ سے غافل ہیں، خدا سے ڈرانے والے خداوندِ قدوس پر جری ہیں اور بہت سے لوگوں کو خُدا کے قریب کرتے ہیں لیکن خود دور ہیں بہت سے خدا کی طرف دعوت دینے والے اللہ تعالیٰ سے راہِ فرار اختیار کیے ہوئے ہیں اور بہت سے کتاب اللہ کی آیات کی تلاوت کرنے والے آیاتِ الٰہی سے بھاگے ہوئے ہیں۔

۲۔دنیا کی بہار پانچ چیزیں

دُنیا کی بہار پانچ چیزوں سے ہے۔

ا۔علماء کے علم ۲۔حکمرانوں کے عدل ۳۔تاجروں کی امانت ۴۔اصحابِ حرفت کی خیرخواہی

۵۔عابدین کی عبادت سے۔

ان کی مناسبت سے ابلیس نے پانچ پرچم لیے اور ہر ایک کے پہلو میں ایک پرچم نصب کر دیا۔حسد کا علم، علم کے پہلو میں، ظلم کا عدل کے، خیانت کا امانت کے، ملاوٹ کا خیرخواہی کے اور ریاکاری کا پرچم عبادت کے پہلو میں۔

۳۔امام حسن بصری کی پانچ فضیلتیں

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ، تابعین پر پانچ وجہ سے فضیلت رکھتے ہیں۔

ا۔ آپ کسی چیز کا حکم دینے سے پہلے خود اس پر عمل کرتے۔

۲۔ کسی چیز سے منع کرنے سے پہلے خود اس سے باز رہتے۔

۳۔ آپ کے پاس موجود علم ومال میں سے جس نے بھی سوال کیا، آپ نے بخل سے کام نہ لیا۔

۴۔ اور دولتِ علم کی موجودگی میں لوگوں سے بے نیاز رہتے

۵۔ آپ کا ظاہر وباطن یکساں تھا۔

۴۔علم نافع کی پہچان کیسے ہو؟

اگر آپ علم کے متعلق معلوم کرنا چاہیں کہ نافع ہے یا نہیں تو اپنے نفس میں پانچ خصلتیں پیدا کرو

۱۔ قلّت مؤنت ومشقت کیلئے فقر سے محبت۔

۲۔ طلبِ ثواب کیلئے طاعت سے محبت۔

۳۔ طلبِ فراغت کیلئے دُنیا میں زہد سے محبت۔

۴۔ اصلاحِ قلب کی طلب میں حکمت سے محبت۔

۵۔ مناجات ربّ العزّت کی طلب میں خلوت سے محبت۔

۵۔پانچ سے پانچ طلب کرو

پانچ چیزوں سے پانچ چیزیں طلب کرو۔

۱۔ تواضع میں عزت نہ کہ مال وخاندان میں۔

۲۔ کثرت کی بجائے قناعت میں غنا۔

۳۔ دُنیا کی بجائے جنت میں امن۔

۴۔ کثرت کی بجائے قلت میں راحت۔

۵۔ منفعت کثرتِ روایت کی بجائے علم پر عمل۔

۶۔خواص کے پانچ طبقات

شیخ عبداللہ ابنِ مُبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اِس اُمّت میں خواص کی وجہ سے ہی فساد پیدا ہوا ہے اور وُہ خواص پانچ طبقات ہیں

۱۔ علماء جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔

۲۔ زُہاد جو کہ اہلِ زمین کیلئے ستون کا حکم رکھتے ہیں۔

۳۔ غازی جو کہ زمین پر خدا تعالیٰ کا لشکر ہیں۔

۴۔ تاجر جو کہ خدا کی زمین پر خدا کے امین ہیں

۵۔ حکمران جو کہ راعی ونگہبان ہیں۔

جب عالم، دین چھوڑ دے اور مال اُٹھائے تو جاہل کس کی اقتدا کرے؟

جب زاہد، دُنیا کی طرف راغب ہو جائے تو توبہ کرنے والا کس کی اقتدا کرے؟

جب غازی ہی لالچی اور ریاکار بن جائے تو دُشمن پر کامیابی کیسے حاصل ہو؟

جب تاجر، خائن ہو جائے تو امانت کیسے حاصل ہوگی؟ اور

جب راعی و چرواہا ہی بھیڑیا بن گیا تو رکھوالی کس طرح ہوگی؟

۷۔علم مال سے سات طرح افضل ہے

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: علم سات طرح مال سے افضل ہے۔

۱۔ علم انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت ہے اور مال فرعونوں کی۔

۲۔ علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا جب کہ مال کم ہو جاتا ہے۔

۳۔ علم عالم کی حفاظت کرتا ہے جب کہ خود مال کو حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ علم اپنے صاحب کے ساتھ قبر میں جاتا ہے جب کہ مال دنیا میں رہ جاتا ہے۔

۵۔ علم صرف اہلِ ایمان کو ملتا ہے جبکہ مال اہلِ ایمان واہلِ کُفر دونوں کو نصیب ہوتا ہے۔

۶۔ تمام لوگ اپنے دینی معاملات میں صاحبِ علم کے محتاج ہوتے ہیں نہ کہ صاحبِ مال کے۔

۷۔علم صراط (جہنم کے پُل) پر گزرتے وقت آدمی میں قوت وتوانائی پیدا کرتا ہے جبکہ مال پُل عبُور کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے

۸۔سات عزتوں کا حصول

حضرت فقیہ ابولیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں؛ عالم کے پاس بیٹھنے سے علم نہ بھی آئے تو پھر بھی سات عزتیں حاصل ہوتی ہیں

۱۔ متعلمین کی فضیلت۔

۲۔ اتنی مدّت گناہوں سے حفاظت۔

۳۔ بہ نیتِ علم پر نزول رحمت سے حصہ ونصیب۔

۴۔ حلقۂ علم پر نزولِ رحمت سے حصہ ونصیب

۵۔ علمی گفتگو سننے پر اطاعت کا ثواب۔

۶۔ جب کسی مسئلہ میں غور وفکر کرے گا اور سمجھ نہ آنے پر تنگ دل ہوگا تو یہ غم بارگاہِ خداوندی میں حضوری کا وسیلہ بن جائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہیں مَیں ان کے قریب ہوں''

۷۔ وہ عالم کی تعظیم وتکریم اور فاسق وفاجر کی تذلیل ورُسوائی ملاحظہ کرے گا تو اس کی طبیعت علم کی طرف راغب ہوگی اسی لیے سیّد الرّسل ﷺ نے صالحین کی مجلس اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

۹۔علماء اور طبقاتِ دوزخ

بزرگ فرماتے ہیں کہ جو علماء علم کے معاملہ میں بخل سے کام لیں اور ان کی خواہش ہو کہ اس پر کوئی دوسرا واقف نہ ہو تو یہ جہنم کے پہلے طبقہ میں ہوں گے۔

جو علماء علم کے سلسلہ میں سلطان کی طرح بن جاتے ہیں کہ جب اُن کے حق سے کوئی چیز رد کی جائے تو غضبناک ہوجاتے ہیں ایسے لوگ دوزخ کے دُوسرے طبقے کے مستحق ہیں۔

جو علماء اپنے علمی نکات اور علمی گفتگو اصحابِ ثروت وفراخی کے سامنے بیان کرتے ہیں لیکن فقراء کو اس کا اہل نہیں جانتے۔ ایسے علماء جہنم کے تیسرے طبقہ کے لائق ہیں۔

جو علماء تکبر کریں وعظ کریں تو درشتی کریں اور اگر انہیں نصیحت کی جائے تو تیوری چڑھائیں وہ جہنم کے چوتھے طبقہ میں جبکہ جو علماء خود مفتی بن جائیں اور غلط فتاویٰ جاری کریں وہ پانچویں طبقے میں جائیں گے۔

جو علماء بعض ملحدین کا کلام سیکھ کر دین سے ملا دیں وہ دوزخ کے چھٹے طبقے میں گریں گے۔

جو علماء لوگوں کی توجہ بننے اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے خواہاں ہونگے تو وہ آتشِ آخرت کے ساتویں طبقے میں پڑیں گے۔

اللّٰھم اعذنا من النّار   اے اللہ ہمیں اس عذاب سے پناہ عطا فرما

۱۰۔آٹھ آدمیوں کی صحبت

حضرت فقیہہ ابولیث سمرقندی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں، آٹھ قسم کے آدمیوں کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ آٹھ چیزوں میں اضافہ فرماتا ہے:

۱۔ اغنیاء کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ دُنیا کی محبت ورغبت میں۔

۲۔ فقراء کے پاس حاضری سے تقسیمِ الٰہی پر اللہ تعالیٰ کی رضا وشکر میں۔

۳۔ سلاطین کی بارگاہ میں رونق بننے سے اللہ تعالیٰ سے تکبر وقساوت میں۔

۴۔ عورتوں کی ہم نشینی سے اللہ تعالیٰ شہوت وجہالت میں اضافہ کر دیتا ہے

۵۔ بچوں کی سنگت ورفاقت سے لہو ومزاح میں۔

۶۔ فساق کے ساتھ بیٹھنے سے گناہوں پر جرأت اور تاخیرِ توبہ میں۔

۷۔صالحین کی صحبت سے رغبتِ عبادت میں۔

۸۔اور علماء کی خدمت سے علم وورع میں اضافہ ہوگا۔

۱۱۔سات طرح کا علم

اللہ تعالیٰ نے سات اشخاص کو سات طرح کا علم عطا فرمایا:

حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کا علم دیا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (پ۱۔البقرۃ:۳۱) اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے

حضرت خضر علیہ السلام کو علم فراست:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (پ۱۵،الکھف:۶۵) اور اسے اپنا علمِ لدنی عطا کیا

حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم تعبیر رؤیا:

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ (پ۱۳، یوسف:۱۰۱) اے میرے رب بیشک تو نے مجھے ایک سلطنت دی اور مجھے کچھ باتوں کا انجام نکالنا سکھایا

حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو زرہ سازی کا علم:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (پ۱۷،الانبیاء:۸۰) اور ہم نے اسے تمہارا پہنا وا بنانا سکھایا

حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیاں سکھائیں:

قَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی

(پ۱۹،النمل:۱۶)

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو تورات وانجیل کا علم بخشا:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (پ ۳۔ال عمران:۴۸) اور اللہ تعالیٰ اسے سکھائے گا کتاب وحکمت اور تورات اور انجیل

حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو توحید وشرع کے علم سے ممتاز فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (پ۵، النساء:۱۱۳) اور تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (پ۱، البقرۃ:۱۶۴) اور اُنہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (پ۲۷، الرحمٰن:۱،۲) رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا

کمالاتِ علم

حضرت آدم علیہ السلام کا علم حصولِ سجدہ وسلام کا سبب بنا۔ حضرت خضر علیہ السلام کا علم حضرت موسیٰ و یوشع علیہما السلام کا معلم بننے کا باعث بنا، حضرت یوسف علیہ السلام کے علم نے آپ کو آپ کے اہل سے ملایا اور حکومت دلوائی، حضرت داؤد علیہ السلام کا علم، فضیلت وریاست کا ذریعہ بنا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے علم کی برکت سے غلبہ وملکہ بلقیس کو پایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا علم، ان کی والدہ سے اتہام کے ازالہ کا باعث بنا اور حضرت سید الانبیاء علیہ وعلیٰ جمیع الانبیاء الصلوٰۃ والسلام کا علم سعادتِ عظمیٰ وجودِ شفاعتِ (کبریٰ) کا امتیاز و اختصاص پا کر سب پر برتر ہوا۔

علم اور سلام الٰہی

پھر ہم کہتے ہیں کہ مخلوقات کا علم رکھنے والے کو ملائکہ سلام کرتے ہیں تو خالق و مالک کی صفات کا علم رکھنے والا ملائکہ کی طرف سے سلام کیسے نہ پائے گا؟

بلکہ خود ربّ العزت اس پر سلام کے تحفے بھیجتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (پ۲۳، یٰسین:۵۸) ان پر سلام ہوگا مہربان رب کا فرمایا ہوا

اُمت اور صحبت نبوی ﷺ

حضرت خضر علیہ السلام کو علم فراست کی برکت سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی صحبت میسر آتی ہے تو اے اُمتِ مصطفیٰ! کیا تم علم حقیقت کی وجہ سے اپنے حبیب وکریم نبی رحیم ﷺ کی صحبت نہ پاؤ گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ توان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء (علیہم السلام)

(پ۵، النساء:۶۹)

حضرت یوسف علیہ السلام علم تعبیر کی وجہ سے دُنیا سے رہائی پا سکتے ہیں تو کیا کتاب اللہ کے معانی و تفسیر کا عالم قید خواہشات سے نجات نہ پائے گا؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھادے۔

(پ۱۱، یونس:۲۵)

اِسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اُوپر بطور نعمت الٰہی اس طرح ذکر فرمایا:

وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ (پ۱۳، یوسف:۱۰۱) اور تو نے مجھے کچھ باتوں کا انجام نکالنا سکھایا

اے عالم! تو اللہ تعالیٰ کا احسان کیوں یاد نہیں کرتا کہ اس نے تجھے اپنی کتاب کی تفسیر کا علم عطا کیا۔ اس سے بڑھ کر کون سا عطیہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے کلام کا مفسر، اپنا ہم نام (عالم) اپنے نبی کا وارث، خلق کا داعی، عباد اللہ کیلئے واعظ، اہلِ وطن کیلئے چراغ، جنت و ثواب کی طرف لوگوں کا قائد اور نار و عتاب سے ڈرانے والا بنایا۔

حدیث شریف میں ہے علماء سردار ہیں، فقہاء قائد اور ان کی مجالس اضافہ درجات کا سبب ہیں

۱۲۔ مومن اور چھ خصائل

مومن اپنے اندر چھ خصلتیں پا کر طلب علم شروع کرتا ہے:

۱۔ مومن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرائض کی ادائیگی کا حکم دیا ہے جو علم کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے۔

۲۔ گناہوں سے بچنے کا حکم ہے جس کیلئے ان کا علم ہونا ضروری ہے۔

۳۔ نعمتوں پر شکر کا حکم ہے جو کہ علم کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوسکتا۔

۴۔ مخلوق میں انصاف کرنے کا حکم ہے جو علم کے بغیر ناممکن ہے۔

۵۔ رنج و بلا پر صبر کا حکم، علم کے بغیر اس پر قدرت نہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شیطان سے عداوت کا حکم دیا اور اس پر علم کے بغیر قادر نہیں ہوسکتا

۱۳۔ جنت کا راستہ

جنت کا راستہ چار لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۔ عالم ۲۔ زاہد ۳۔ عابد ۴۔ مجاہد

۱۔ عالم جب اپنے دعوے میں راست ہوتا ہے تو حکمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

۲۔ زاہد جب اپنے زُہد میں صادق ہوتا ہے تو امن کی دولت پاتا ہے۔

۳۔ عابد جب عبادت میں سچا ہوتا ہے تو خوفِ الٰہی سے مشرف ہوتا ہے۔

۴۔ اور مجاہد جب اپنے کردار میں راسخ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے تعریف وثناء سے نوازتا ہے۔

۱۴۔چار سے چار کا حصول

چار چیزوں سے چار چیزیں طلب کرو:

۱۔مکان سے سلامتی ۲۔ساتھی سے عزت ۳۔مال سے فراغت ۴۔علم سے منفعت

جب مکان سے سلامتی نہ ملے تو اس سے جیل بہتر ہے۔

جب ساتھی سے عزت حاصل نہ ہو اس سے کتا بہتر ہے۔

جب مال سے فراغت وقناعت نہ ملے تو اس سے پتھر ڈھیلے اچھے ہیں۔

اور جب علم سے منفعت نصیب نہ ہو، تو اس سے موت افضل ہے۔

۱۵۔چار چیزوں کی تکمیل

چار چیزیں چار چیزوں کے بغیر ناممکن ہیں:

۱۔دین تقویٰ کے بغیر ۲۔قول فعل کے بغیر ۳۔مروّت تواضع کے بغیر ۴۔علم عمل کے بغیر

دین بلا تقویٰ سبب خطرہ ہے، قول بلا فعل یاوہ گوئی وضیاع ہے، مروّت بلا تواضع شجر بلا ثمر ہے اور علم بلا عمل بادل بلا مطر (بارش) ہے۔

۱۶۔قیام دنیا اور چار

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا، دُنیا چار قسم کے لوگوں کے ساتھ قائم ہے

۱۔ عالم کے ساتھ جو اپنے علم پر عمل کرے۔

۲۔ جاہل کے ساتھ، جو کسی سے پوچھتے وقت حیا محسوس نہ کرے۔

۳۔ غنی کے ساتھ جو بخل سے کام نہ لے۔

۔ فقیر کے ساتھ، جو دُنیا کے بدلے آخرت نہ بیچے۔

جب عالم علم پر عمل نہیں کرتا تو جاہل علم کی تحصیل سے نفرت کرتا ہے اور جب غنی بخل سے کام لیتا ہے تو فقیر اپنی آخرت کو دُنیا کے بدلے بیچتا ہے۔ایسے لوگوں کیلئے ستر بار ہلاکت وتباہی ہو۔

۱۷۔مرد چار طرح کے

شیخ خلیل فرماتے ہیں،مرد چار طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ جاننے والا آدمی اور وہ اپنی دانست سے بھی واقف ہو یہ عالم ہے اس کی اتباع کرو۔

۲۔ آدمی علم رکھتا ہو لیکن اپنے علم سے واقف نہ ہو یہ سویا ہوا ہے اسے بیدار کرو۔

۳۔ آدمی جانتا نہ ہو اور اپنی نادانی سے واقف ہو یہ رشد وہدایت کا طالب ہے اس کی رہنمائی کرو۔

۴۔ آدمی علم سے عاری ہو اور اپنی اس بے خبری سے بھی غافل ہے،یہ شیطان ہے اس سے پرہیز کرو۔

۱۸۔چار سے نفرت نہیں

شریف ومعزز آدمی کو چار چیزوں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے اگرچہ وہ امیر ہی کیوں نہ ہو۔

۱۔ مجلس میں کھڑے ہو کر اپنے والد کا استقبال کرنے سے۔

۲۔ مہمان کی عزت کرنے سے۔

۳۔ اپنے عالم استاذ کی خدمت بجالانے سے۔

۴۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے متعلق اپنے سے بڑے عالم سے سوال کرنے سے۔

۱۹۔علماء اور مال

علماء جب حلال مال جمع کرنا شروع کردیں تو عوام مشتبہ مال کھانا شروع کردیتے ہیں۔

عالم جب مشتبہ مال جمع کرنا شروع کردیتا ہے تو عوام حرام خوری تک پہنچ جاتے ہیں۔

عالم جب حرام خوری کی حد پر پہنچ پاتا ہے تو عوام کفر کے گڑھے میں جاگرتے ہیں،یعنی حرام کو حلال جاننے لگتے ہیں۔

فضیلت علم پر عقلی دلائل

اُمور چار طرح کے ہیں

۱۔ جسے عقل پسند کرے لیکن وہ خواہش کو ناپسند ہو۔

۲۔ جسے خواہش پسند کرے لیکن عقل کو ناپسند ہو۔

۳۔ جسے عقل وخواہش دونوں محبوب جانیں۔

۴۔ جسے دونوں ناپسند سمجھیں۔

پہلی قسم دُنیا کی مشکلات اور بیماریاں ہیں۔ دوسری قسم تمام گناہ ہیں۔ تیسری قسم علم ہے اور چوتھی قسم جہالت ہے۔ علم بمنزل جنت اور جہالت بمنزل دوزخ ہے۔ عقل و خواہش جس طرح آگ کو ناپسند کرتی ہیں اسی طرح جہالت کو بھی، جنت جس طرح عقل و خواہش دونوں کے نزدیک پسندیدہ ہے، اسی طرح علم بھی پسندیدہ ہے۔

جہالت کو پسند کرنے والا گویا موجود آتش پر راضی رہتا ہے اور علم میں مشغول موجودہ جنت پر راضی ہے۔ علم اختیار و حاصل کرنے والے کو کہا جاتا ہے تونے اپنے مقام کی تیاری کر لی ہے لہٰذا جنت میں بسیرا کرو اور جہالت پر اکتفا کرنے والے سے کہا جاتا ہے: تونے اپنا ٹھکانا دوزخ بنانے کی خواپنائی ہے لہٰذا دوزخ میں داخل ہو۔

علم جنت اور جہل جہنم

علم جنت اور جہل جہنم ہے علم کے جنت اور جہل کے دوزخ ہونے پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ کمالِ لذت، محبوب کے پالینے پر ہوتی ہے۔ محبوب سے بُعد و دوری میں شدید الم و تکلیف ہے۔ زخم اس لئے تکلیف دیتے ہیں کہ بدن کا ایک جُز بدن کے اجزا میں سے اپنے محبوب اجتماعی اجزاء سے دور ہو جاتا ہے۔ جو اس اجتماع کے ازالے کا تقاضا کرے تو اس نے محبوب کے بُعد اور اس کے ازالے کا تقاضا کیا ہے لہٰذا یہ یقیناً تکلیف دہ ہے۔ آگ میں جلنا اس سے کہیں زیادہ درد و اَلم کا موجب ہے کیونکہ زخم میں ایک معین جُز دوسرے معین جُز سے جُدا ہوتا ہے۔ جب آگ تمام اجزاء میں گھس جاتی ہے اور اس میں اجزا میں تفریق زیادہ ہوں گی تو الم بھی سخت تر ہوگا، لذت، محبوب کے پالینے کو کہتے ہیں۔ کھانے کی لذت بدن کے موافق غذا کھانا ہے اسی طرح نظر کی لذّت ایسی اشیاء کے دیکھنے اور ادراک کرنے میں ہے جن کی نظر مشتاق ہوتی ہے تو یقیناً اس چیز کا ادراک لذتِ نظر قرار پائے گا۔ اس تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ محبوب کے ادراک اور پالینے کو لذت، اور مکروہ کے ادراک کو الم و تکلیف کہتے ہیں۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں جس قدر ادراک گہرا اور اشد ہوگا اور مدرَک و معلوم اشرف اکمل، خوبصورت اور باقی رہنے والا ہو گا۔ بلاشبہ علم کا محل رُوح ہے جو کہ بدن میں اشرف ہے لہٰذا ادراک عقلی زیادہ گہرا اور اشرف ہوگا جیسا کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کی تفسیر میں ذکر کیا جائے گا لیکن معلوم بہرحال اشرف ہے کیونکہ معلوم اللہ ربُّ العزّت اور اس کی تمام مخلوقات، ملائکہ و افلاک، عناصر و جمادات، نباتات و حیوانات اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام و اوامر اور تکالیف ہیں اور ان سے بڑھ کر اشرف کون ہوگا؟

لذت علم سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی لذت وکمال سے بڑھ کر کوئی لذت وکمال نہیں ہے اور جہالت کے نقصان وشقاوت سے بڑھ کر کوئی نقصان وشقاوت نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ہم میں سے کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو اگر وہ معلوم ہوتو ہم جواب باصواب دے کر فرحت وسرور پاتے ہیں اگر نہ آتا ہو، تو حیا کی وجہ سے سر جھکا لیتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ علم سے حاصل ہونے والی لذّت تمام لذّات میں اکمل ہے اور جہالت کی شقاوت سب سے بڑی شقاوت ہے۔

فضیلت علم پر مزید نصوص ودلائل

ہم یہاں فضیلتِ علم پر مزید کچھ ایسے دلائل ذکر کرنا چاہتے ہیں جو بھول گئے تھے تو یہاں ذکر میں کوئی حرج نہیں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ وَ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (پ۳۰، العلق:۱تا۵)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے۔ پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔

سوال: آیات میں باہمی مناسبت ہونی چاہئے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اور اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الاكرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں کون سی مناسبت ہے؟

جواب: وجہ مناسبت یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کا ابتدائی حال بیان فرمایا کہ وہ علقہ تھا جو اشیاء میں سب سے زیادہ خسیس ہے اور آخری حالت میں وہ عالم بن گیا۔ اور یہ بلند ترین مرتبہ ہے گویا فرمایا جارہا ہے: اے انسان! تو ابتداءً خسیس ترین درجے میں تھا اور انتہاءً شریف مرتبے پر جاگزین ہوگیا یہ سب علم کی برکت ہے اور یہ اُسی وقت ہوسکتا ہے کہ علم سب سے اشرف مرتبہ ہو اور اگر کوئی اور چیز علم سب سے اشرف ہوتی تو اس جگہ اس چیز کا ذکر زیادہ موزوں تھا۔

دوسری وجہ:

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے کریم ہے جس نے قلم سے سکھایا

اُصولِ فقہ میں یہ ضابطہ ہے کہ جب حکم کسی وصف پر لاگو ہوتو وصف اس حکم کی علّت ہُوا کرتا ہے۔ اس اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کو اکرمیّت (سب سے بڑا کریم) کا مستحق وصف، علم کی عطا پر قرار دیا ہے اگر علم اپنے ماسوا سے اشرف نہ

فضل قدیر

ہوتا تو اس کا فائدہ دیگر اشیاء کے فائدے سے اشرف نہ ہوتا۔

تیسری وجہ: ارشادِ ربُّ العزت ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اور اللہ سے بندوں میں سے وُہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں

یہ آیت کئی طرح سے فضیلت علم پر دلالت کرتی ہے۔

۱۔اہلِ جنت ہونے پر دلالت

اہلِ خشیّت ، اہلِ جنّت ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

جَزَآءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ رَبَّهٗ

ان کا صلہ ان کے رب کے پاس بسنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ اس کیلئے ہے جو اپنے رب سے ڈرے

یہ آیت کریمہ بھی اس پر دلیل ہے:

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (پ۲۷،الرحمٰن:۴۶)

اور جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرے اس کیلئے دو جنتیں ہیں

نیز حدیث قدسی میں ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم میں اپنے بندے پر دو خوف جمع نہیں کروں گا اور نہ دو امن۔ اگر وہ دنیا میں مجھ سے بے خوف رہا تو آخرت میں خوفزدہ ہوگا اور اگر دُنیا میں ڈرتا رہا تو آخرت میں پُر امن رکھوں گا۔

عقلی دلیل

واضح ہو کہ اس مقدمہ کے اثبات پر عقلی دلیل بھی ممکن ہے یہ کہ عالم باللہ پر خداوندِ قدوس سے ڈرنا لازم ہے کیونکہ نامعلوم چیز سے ڈرنا محال ہے۔ پھر ذات کا علم خوف کیلئے کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ مزید تین اُمور کا علم ضروری ہے۔

تین اُمور کا علم

۱۔ علم بالقدرۃ، (قدرت کا علم) اس لئے کہ بادشاہ کو علم ہو کہ لوگ اس کے افعال قبیحہ پر واقفیت رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وُہ ان افعال سے باز نہیں آتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ لوگوں میں اس کے ازالہ کی قدرت نہیں ہے۔

۱۔ جس کا خوف ہو اس کا عالم ہونا معلوم ہے کیونکہ شاہی خزانے میں نقب زنی کرنے والا بادشاہ کی قدرت تسلیم کرتا ہے لیکن بادشاہ کو اپنی کارگزاری سے ناواقف جانتے ہوئے بے خوف ہوتا ہے۔

۲۔ جس کا خوف ہو اُس کے حکیم ہونے کا علم۔ بادشاہ کا غلام، اس جرم کی روک تھام پر بادشاہ کی قدرت تسلیم کرتا ہے۔ اپنے افعال قبیحہ پر بادشاہ کی اطلاع بھی مانتا ہے لیکن پھر بھی بے خوف رہتا ہے کیونکہ سلطان ایسے افعالِ قبیحہ کو پسند کرتا ہے۔ اگر چور، بادشاہ کی افعال بد سے آگاہی مانتا ہو اور اس کی ممانعت پہ قدرت بھی اور یہ بھی جانتا ہو کہ بادشاہ حکیم ہے اسے بُرے افعال ہرگز اچھے نہیں لگتے۔

یعنی یہ تینوں علوم ہوں گے تو دل میں خوف پیدا ہوگا۔

اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ بندہ خدا سے اُس وقت ڈرے گا جب یہ جان لے گا کہ خدا تعالیٰ جمیع معلومات کا عالم، تمام مقدورات پر قادر اور منکرات و محرمات کو ناپسند کرتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خوف، علم باللہ کے لوازم سے ہے

خوف اور حصول جنت

ہمارے اس دعویٰ کی دلیل کہ ''خوف حصولِ جنت کا سبب ہے'' یہ ہے کہ

جب بندے کیلئے لذّتِ عاجلہ و دنیا ظاہرہ ہو اور یہ لذّت عاجلہ امرِ الٰہی کے خلاف ہو اور ایسا کرنا منفعت و نقصان دونوں پر مشتمل ہو تو اس صورت میں عقل صریح جانبِ راجح کو جانب مرجوح پر ترجیح کا فیصلہ کرے گی اور جب بندہ نورِ ایمان سے معلوم کرے گا کہ لذّت عاجلہ آئندہ کے عذاب کے مقابلہ میں حقیر ہے تو یہ ایمان، لذّتِ عاجلہ سے فرار کا سبب بنے گا۔ اس کو خشیت کہتے ہیں اور بندہ جب محظور و ممنوع کو چھوڑ کر واجب کو بجالائے گا تو مستحقِ ثواب ہوگا۔ ان شواہد عقلیہ ونقلیہ سے ثابت ہو گیا کہ عالم باللہ خائف ہوتا ہے اور خائف اہلِ جنت سے ہے۔

۲۔ ظاہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جنّت کے اہل صرف علماء ہیں کیونکہ ''اِنَّمَا'' کلمہ حصر ہے جو بتا رہا ہے کہ خشیّتِ الٰہی فقط علماء کو حاصل ہے اور دوسری آیت:

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (پ۳۰ البینۃ:۸) یہ اللہ سے ڈرنے والے کیلئے ہے

دلالت کرتی ہے کہ جنّت صِرف اہلِ خشیّت کیلئے ہے اور جنّت کا اہلِ خشیت کیلئے ہونا غیر کیلئے حصولِ جنت کے منافی ہے۔ اور دونوں آیتوں کے مجموعے سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ جنت فقط اہل علم ہیں۔

اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس آیت میں تخویف شدید ہے کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ کی خشیت علم باللہ کے لوازم سے ہے اور عدم خشیت کو علم باللہ نہ ہونا لازم ہے۔

اس دقیق نکتہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو علم قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے وہ خشیت پیدا کرتا ہے اور یہ طرح طرح کے علمی مجادلے اگرچہ انتہائی دقیق وغامض ہوں اگر ان سے خشیت پیدا نہ ہوتو یہ علم مذموم کا حصہ ہیں۔

۳۔ ایک قرأت میں اس طرح ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءَ (اسمِ جلالت پر پیش اور علماء پر زبر) اس قرأت کے مطابق معنی یہ ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر خشیت جائز ہوتی تو وہ علماء سے ڈرتا کیونکہ یہ جائز وناجائز میں تمیز کر سکتے ہیں۔ بخلاف جاہل کے کہ وہ حلال وحرام میں امتیاز نہیں کر سکتا تو اس کی طرف توجہ اور پرواہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح یہ آیۂ کریمہ علماء کی انتہائی تعظیم اور ان کے منصبِ رفیع پر دلالت کرتی ہے۔

۴۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْماً (پ۱۶، طٰہٰ:۱۱۴) اور عرض کرواے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما

یہ آیتِ مُبارکہ علم کی نفاست، علوِ مرتبہ اور پسندیدہ خداوندی ہونے کی بڑی قوی دلیل ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادتِ علم کے سوال کا حکم فرما رہا ہے نہ کہ غیر کو۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص علم پر اکتفا کرتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کرتے اور یہ نہ کہتے:

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً (پ۱۵، الکہف:۶۶) کیا میں تمہارے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تم مجھے سکھا دو گے نیک بات جو تمہیں تعلیم ہوئی

۵۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اتنی وسیع وعریض مملکت کے حکمران تھے کہ یہاں تک عرض کرتے ہیں:

وَهَبْ لِیْ مُلْكاً لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ (پ۲۳، ص:۳۵) اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی کو لائق نہ ہو

اس کے باوجود حکومت پر فخر نہیں کرتے بلکہ علم پر فخر فرماتے ہیں، آپ نے اعلان فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (پ۱۹، النمل:۱۶) اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہر چیز میں سے ہم کو عطا ہوا

جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا منطق الطیر (پرندوں کی بولی) پر فخر فرمانا حسن قرار پاتا ہے تو ایک عبدِ مومن کا معرفت ربّ العالمین پر فخر کرنا بھی حسن بلکہ احسن ہوگا۔ اس لئے کہ آپ نے منطق الطیر کے علم کو اُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ' پر مقدم کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات بیان فرمائے تو اس میں بھی علم کو مقدم ذکر کیا۔

وَدَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ وَ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا

اور داؤد اور سلیمان کو یاد کرو۔ جب کھیتی کا ایک جھگڑا چکاتے تھے اور ان دونوں کو حکومت اور علم عطا کیا (پ۱۷، الانبیاء:۷۸،۷۹)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے احوالِ دُنیا کے متعلق تذکرہ فرمایا: اس سے پتہ چلتا ہے کہ علم تمام اشیاء میں اعلیٰ واشرف ہے۔

۶۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہُدہُد پرندہ انتہائی ضعیف اور موردِ عتاب ہونے کے باوجود حضرت سُلیمان علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے:

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ

میں وہ بات دیکھ آیا ہوں جو حضور نے نہ دیکھی (پ۱۹، النمل:۲۲)

اگر علم اشرف اشیاء نہ ہوتا تو ہُدہُد جیسے پرندے کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں ایسی بات کرنے کی قطعاً گنجائش نہ ہوتی۔ اِسی وجہ سے دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جب عالم بن جاتا ہے تو علم کی وجہ سے اس کی بات بادشاہوں پر نافذ العمل ہوتی ہے یہ سب علم کی برکت ہے۔

۷۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ایک لمحہ کا تفکر ساٹھ سالہ عبادت سے افضل ہے اس تفصیل کی دو جہتیں ہیں:

۱۔ تفکّر خدا تک پہنچاتا ہے اور عبادت ثوابِ خدا تک، خدا تعالیٰ تک پہنچانے والی چیز ثوابِ خدا تک پہنچانے والی چیز سے افضل ہوگی۔

۲۔ تفکّر دل کا عمل ہے اور عبادت دیگر اعضاء و جوارح کا۔ چونکہ دل جوارح سے افضل ہے اس لئے اس کا عمل بھی جوارح کے علم سے افضل ہے اس وجہ کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ

اور میری یاد کیلئے نماز قائم رکھ (پ۱۶، طٰہٰ:۱۴)

کہ صلوٰۃ کو ذکرِ قلب کا وسیلہ قرار دیا ہے اور مقصود، وسیلہ کی نسبت اشرف ہوتا ہے اس سے واضح ہوگیا کہ علم دوسری اشیاء سے افضل واشرف ہے۔

۸- ارشاد رب العزت ہے:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (پ۵ ،النساء:۱۱۳)
اور تمہیں سکھا دیا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے

علم کا نام عظیم رکھا ہے اور حکمت کا خیرِ کثیر اور حکمت علم ہی ہے نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (پ۲۷، الرحمٰن:۱،۲) رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا

نعمت علم کو دیگر نعمتوں پر مقدم کرنا اس کے اشرف ہونے کی دلیل ہے۔

۹- تمام آسمانی کتابیں علم کی فضیلت بیان کرتی ہیں۔ تورات میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ حکمت کو عظیم جانو، اس لیے کہ میں کسی بندے کے دل میں حکمت اس لئے ڈالتا ہوں کہ اس کی بخشش ہو جائے تم حکمت حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ پھر اسے خرچ کرو تا کہ دُنیا و آخرت میں میری کرامت پا سکو۔

زبُور میں ہے: اے داؤد! بنی اسرائیل کے احبار و رہبان سے فرماؤ کہ اتقیاء کے ساتھ مذاکرہ رکھیں۔ اتقیاء نہ ملیں تو علماء سے علماء بھی میسر نہ ہوں تو عقلاء کے ساتھ، کیونکہ ایسا نہیں ہوتا کہ میں کسی کی ہلاکت کا ارادہ کروں اور ان میں تقویٰ، علم اور عقل کے مرتبوں سے کوئی مرتبہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ تقویٰ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ تقویٰ علم کے بغیر ناممکن ہے جیسا کہ خشیت علم کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور دو صفتوں سے متصف چیز ایک صفت سے موصوف چیز سے اشرف ہوتی ہے۔ عالم کو عاقل پر مقدم کرنے میں بھی یہی راز ہے کہ عالم ضروری طور پر عاقل ہوگا اور عاقل بعض اوقات عالم نہیں ہوتا۔ عقل بمنزلہ بیج کے ہے اور علم درخت کی مانند اور تقویٰ پھل کی مثل

انجیل کی سُورہ نمبر ۱۷ میں ہے۔ ایسے شخص کیلئے تباہی ہے جس نے علم کی بابت سُنا اور اسے طلب نہ کیا۔ اسے جاہلوں کے ساتھ بُری طرح آگ میں اکٹھا کیا جائے اور علم طلب کرو اور سیکھو۔ اس لئے کہ علم اگر تجھے سعادت مند نہیں کرے گا تو شقی بھی نہیں بنائے گا اور اگر تمہیں رفعت و بلندی نہ دے گا تو ذلیل بھی نہیں کرے گا اگر نفع نہیں دے گا تو نقصان بھی نہیں کرے گا۔ یہ نہ کہو کہ ہمیں ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو ہم علم حاصل کر کے اس پر عمل نہ کر سکیں بلکہ یہ کہو ہمیں اُمید ہے کہ علم حاصل کر کے اس پر عمل کریں گے۔ علم، عالم کا شفیع ہے اور اللہ تعالیٰ کے کرم کے ذمہ لازم ہے کہ عالم کو رُسوائی نہ ہو۔ قیامت کے دن اعلان ہوگا۔ اے گروہِ علماء! تمہارا اپنے رب کے بارے میں کیا گمان ہے؟ علماء عرض کریں گے۔ ہم اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے اُمیدوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے ایسا کر دیا۔ میں نے کسی شر کے ارادے سے تمہیں حکمت سے نہیں نوازا تھا۔ بلکہ خیر کے ارادے سے

تمہیں حکمت سے سرفراز کیا تھا۔ میری رحمت سے میرے نیک بندوں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

مقاتل بن یسار فرماتے ہیں میں نے انجیل میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اے عیسیٰ! علماء کی تعظیم کرو۔ ان کی فضیلت کو پہچان لو کیونکہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق میں اس طرح فضیلت رکھتے ہیں جس طرح سورج تمام ستاروں پر۔ جس طرح آخرت دُنیا پر اور جس طرح مجھے ہر شئے پر فضیلت ہے۔

احادیثِ طیبہ اور علم

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علماء سے فرمائے گا: میں نے تمہارے سینوں کو علم سے اس لئے لبریز نہیں کیا تھا کہ تمہیں عذاب دوں تم جو کچھ بھی کر چکے ہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔

(مسند فردوس:۸۰۵۹)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ راور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال شریف سے قبل بڑا وسیع اور فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ مدینہ طیبہ میں آپ کا آخری خطبہ تھا اس میں فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے علم حاصل کیا، علم میں تواضع اختیار کی اور اللہ کے بندوں کو علم سکھایا تو جنت میں ثواب کے اعتبار سے افضل اور منزل کے اعتبار سے اس سے اشرف کوئی نہیں ہوگا۔ جو بھی نفیس ورفیع درجہ ہوگا عالم کا اس میں حظ وافر اور بلند مقام ہوگا۔

(مسند حارث:۱،۳۲۱)

۳۔ اُمت کو علم پڑھانے والوں کی شان

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سونے کے منبر رکھے جائیں گے ان پر چاندی کے قُبے ہوں گے۔ موتیوں یاقوت اور زمرّد سے مرصّع ہوں گے۔ ان پر سندس و استبرق کے ریشمی پردے ہوں گے۔ پھر رحمٰن اکبر کی طرف سے منادی ندا دے گا۔ خدا کی رضا کیلئے اُمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک علم پہنچانے والے کہاں ہیں؟ ان منبروں پر جلوہ افروز ہو جائیں۔ ان پر کوئی خوف نہیں یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائیں۔ (حلیہ لابی نعیم:۵۵۰۷)

۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اُمتِ محمدیہ میں علماء وحکماء ہیں گویا وہ فقیہہ ہیں انبیاء کی طرح ہیں قلیل رزق پر خدا تعالیٰ سے راضی رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے قلیل عمل پر راضی رہے گا اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے پر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

۵۔عالم کی تعظیم

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے قدم طلب علم میں خاک آلود ہوں گے اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو آگ پر حرام کردے گا۔اور اس پر مقرر دونوں فرشتے (کراماً کاتبین) اس کیلئے استغفار کرتے ہیں۔اگر طلبِ علم کے دوران اس کی اَجل آجائے تو مرتبۂ شہادت پاتا ہے اس کی قبر ''رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ'' (باغات جنت میں سے ایک باغ) ہوتی ہے۔قبر کو حدِ نگاہ تک وسعت مل جاتی ہے اس کے پڑوس میں دائیں بائیں آگے پیچھے چالیس چالیس قبریں نُور سے معمور کردی جاتی ہیں۔عالم کی نیند عبادت، اس کا مذاکرۂ علمی تسبیح، اس کا سانس لینا صدقہ ہے اس کی آنکھ کا ہر ہر قطرہ جہنم کی آگ کو بُجھا سکتا ہے پس جس نے عالم کی توہین کی اس نے علم کی توہین کی، جس نے علم کی توہین کی اس نے نبی کی توہین کی، جس نے نبی کی توہین کی اس نے جبرئیل کی توہین کی، جبرئیل کی توہین کرنے والا خدا کی توہین کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت کے روز ذلیل ورُسوا کرے گا۔

۶۔ رسُولِ معظم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں بڑے جواد (سخی) کی خبر نہ دوں؟ عرض کیا گیا: ضرور ارشاد فرمائیں۔فرمایا: سب سے بڑا جواد اللہ تعالیٰ ہے اور مخلوق میں سب سے بڑا جواد میں ہوں اور میرے بعد جواد عالم ہوگا جو علم کی اشاعت کرے گا قیامت کے دن اسے اٹھایا جائے گا تو وہ اکیلا ہی ایک جماعت ہوگا اور وہ آدمی جواد ہے جو راہِ خدا تعالیٰ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوجائے۔

۷۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: جس نے مومن سے دُنیاوی تنگی کو دُور کیا اللہ تعالیٰ اس سے اُخروی تنگی دُور فرمائے گا اور جس نے تنگ دست پر آسانی پیدا کی اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں آسانی فراہم فرمائے گا۔اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے جو شخص طلبِ علم کی خاطر کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے جو لوگ کسی مسجد میں تلاوت کلامِ الٰہی اور درس و تدریس کیلئے جمع ہوتے ہیں تو اُن پر سکینہ نازل ہوتی ہے۔اُنہیں رحمتِ خداوندی ڈھانپ لیتی ہے۔ملائکہ کرام سایہ فگن ہو جاتے ہیں اور ان کا تذکرہ خود ربّ العزت اپنے پاس مخلوق کے سامنے کرتا ہے۔ (مسلم:۲۶۹۹)

۸۔ آقائے دو عالم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تین قسم کے لوگ شفاعت کریں گے۔

۱۔انبیاء علیہم السلام ۲۔علماء ۳۔شہداء

راوی کہتا ہے کہ بلند مرتبہ نبوت و شہادت کے درمیان واسطہ ہے۔ (سنن ابن ماجہ:۴۳۱۳)

۹۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرو کیونکہ خدا کی رضا کیلئے علم حاصل کرنا

خشیت ہے اس کی طلب عبادت، اس کا مذاکرہ تسبیح، اس کی بحث جہاد، اس کی تعلیم صدقہ اور اس کے اہل پر علم خرچ کرنا قربت ہے اس لئے کہ حلال وحرام کی معرفت جنت کے راستوں کیلئے مینارۂ نور، وحشت میں انیس، وحدت میں جلیس، خلوت میں ہمراز، بیماری وتنگدستی میں رہنما، دشمنوں کے مقابلہ میں ہتھیار اور اختلاف کے وقت دین ہے۔ اللہ تعالیٰ علم کی وجہ سے اقوام کو بلندی عطا کر کے سراسر خیر میں داخل فرما دیتا ہے۔ انہیں ہادی وقائد بنا دیتا ہے کہ ان سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ بھلائی کیلئے پیشوا بنا دیتا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلا جاتا ہے۔ ان کے افعال کی پیروی کی جاتی ہے اور ان کی آراء پر گفتگو ہوتی ہے فرشتے ان کی حلقہ نشینی کے خواہش مند ہوتے ہیں اپنے پَر ان سے ملاتے ہیں اپنی نماز ودُعاء میں ان کیلئے استغفار کرتے ہیں یہاں تک کہ ہر رطب ویابس، سمندر کی مچھلیاں ودیگر جانور، جنگل کے درندے اور پرندے آسمان اور اس کے ستارے بھی ان کے حق میں دُعا گو رہتے ہیں کیونکہ علم اندھیرے سے نکالنے والا اور قلوب کی حیات ہے۔ ظلمت میں آنکھوں کا نور، صورتِ ضعف میں بدن کی قوت اور دور دراز کے لوگوں کو احرار کی منازل، سلاطین کی مجالس اور دنیا وآخرت کی سعادات ودرجات تک پہنچانے کا سبب ہے۔

علم میں تفکر روزوں کی طرح ہے اور اس کی تکرار نمازوں کے برابر ہے اسی کے ذریعے خدا تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کی جاتی ہے۔ اس کی بزرگی وتوحید کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ صلہ رحمی کی جاتی ہے اور حلال وحرام کی پہچان کی جاتی ہے۔

(الترغیب والترہیب:۵۲۰۱)

۱۰۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے سوا سب عمل ختم ہو جاتے ہیں:

۱۔صدقہ جاریہ ۲۔علم جس سے نفع پایا جاتا ہو ۳۔نیک اولاد جو اس کے حق میں دُعائے خیر کرتی رہتی ہے۔

(مسلم:۱۶۳۱)

۱۱۔ رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سوال کرو ''النّاس'' سے کرو۔ عرض کیا گیا ''النّاس'' (کامل لوگ) کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: اہلِ قرآن۔ عرض کیا گیا: ان کے بعد۔ فرمایا: اہلِ علم۔ عرض کیا گیا: پھر فرمایا: حسین چہرے والے۔ راوی کہتا ہے اہلِ قرآن سے مراد اس کے معنی ومفہوم پر گہری نظر کے حامل لوگ ہیں۔

۱۲۔ سیّد السادات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بھلائی کا حکم دیا اور بُرائی سے منع کیا وہ اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے دُنیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے زہر ہے جو بندوں کو قتل کرتی ہے۔ دُنیا سے اس قدر زہر لو جس قدر ادویات میں

فضل قدیر

استعمال کیلئے لیا جاتا ہے تاکہ تم نجات پاسکو

راوی کہتا ہے کہ اس میں علماء بھی داخل ہیں کیونکہ یہ بتاتے ہیں یہ حرام ہے اس سے اجتناب کرو اور یہ حلال ہے اسے حاصل کرو

۱۳۔ ایک روایت میں ہے عالم (بالتبع) نبی کا درجہ رکھتا ہے لیکن اس کی طرف وحی نہیں آتی۔

۱۴۔ مَعْدِنُ الْبَرَکَات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: عالم بن یا متعلم یا سامع یا محبّ علم پانچواں نہ بن تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہے۔ (المعجم الصغیر للطبرانی-۷۸۶)

راوی کہتا ہے دوسری حدیث میں ہے آدمی عالم اور متعلم ہی ہیں باقی سب احمق ہیں۔ان میں بھلائی کی کوئی بات نہیں۔

(کشف الخفاء ۲۸۴۶)

ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ سامع اور محبّ بمنزل متعلم ہیں۔

ایک اعرابی نے اپنے بیٹے کو کیا اچھی نصیحت کی ہے کہ تو نوچنے والا درندہ، خناس بھیڑیا یا رکھوالا کُتا تو بن جا لیکن ناقص انسان ہرگز نہ بننا۔

۱۵۔ رُوحِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ہاتھ پر عالم تکیہ لگائے تو اللہ تعالیٰ ہر قدم کے بدلے غلام آزاد کرنے کا ثواب لکھ دیتا ہے اور جو کسی عالم کے سر پر بوسہ دے تو اسے ہر بال کے بدلے ثواب ملے گا۔ (مسند فردوس:۵۹۱۷)

۱۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سلطانِ دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عزیز ذلیل ہو، غنی فقیر ہو جائے یا جاہل عالم کا مذاق اڑائیں تو اس پر زمین و آسمان اور اس میں بسنے والی مخلوقات سب گریہ کرتے ہیں۔ (ایضاً،۲۱۰۳)

۱۷۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاملینِ قرآن اہلِ جنّت کے رہنما، شہداء ان کے قائد اور انبیاء علیہم السلام ان کے سردار ہیں۔

(حلیہ لابی نعیم،۶۵۰۶)

۱۸۔ حدیث شریف میں ہے علماء جنت کی کنجیاں اور انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ انسان کنجی نہیں بنتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس علم ہے جو چابی کا کام دیتا ہے اس پر دلیل یہ ہے جو شخص خواب میں اپنے ہاتھ میں چابی دیکھے تو اس کی تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اسے علم دین کی دولت نصیب ہوگی۔

۱۹۔ حدیث شریف میں ہے تمام مخلوق پر خواہ وہ غافل ہو یا بالغ ہو یا نابالغ چوبیس گھنٹوں میں اللہ تعالیٰ کی ایک ہزار رحمت نازل ہوتی ہے جن سے نوسو ننانوے رحمتیں علماء و طلباء اور مسلمانوں کیلئے ہیں اور باقی ایک رحمت دوسرے لوگوں کیلئے۔

۲۰۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے پوچھا! کون سا عمل بہتر ہے؟ جبریلِ امین نے عرض کی: علم۔فرمایا: اس کے بعد؟

جبرئیل امین علیہ السلام نے جواب دیا: عالم کی زیارت۔ فرمایا: اس کے بعد؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے جواب دیا: عالم سے ملاقات۔ پھر فرمایا: رضائے خداتعالیٰ کیلئے علم حاصل کرے اور اس کا مقصود اپنی اور لوگوں کی اصلاح ہو اور دنیا کا مال مقصود نہ ہو تو میں اس کیلئے جنت کا ضامن ہوں۔

۲۱۔ رُوحِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس آدمیوں کی دُعا قبول ہوتی ہے۔

۱۔عالم ۲۔مُتعلِّم ۳۔صاحبِ حُسنِ خلق ۴۔یتیم ۵۔غازی ۶۔حاجی ۷۔مسلمانوں کا خیرخواہ،

۸۔والدین کی فرمانبردار اولاد ۹۔مریض ۱۰۔خاوند کی خدمت گار بیوی

۲۲۔ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: علم کیا چیز ہے؟ فرمایا: عمل کا رہنما۔ عرض کیا گیا: عقل کیا ہے؟ فرمایا: خیر کا قائد۔ عرض کیا گیا: ہویٰ (خواہش) کیا ہے؟ فرمایا: گناہوں کی سواری۔ عرض کیا گیا: مال کیا ہے؟ فرمایا: متکبّرین کی چادر۔ عرض کیا گیا: دُنیا کیا ہے؟ آخرت کا بازار۔

موت اور حصول علم

۲۳۔ فخرِ آدم و بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم عصر کے وقت ایک آدمی سے گفتگو فرمارہے تھے۔ اس دوران وحی نازل ہوئی کہ اس کی عمر ایک گھنٹہ باقی رہ گئی ہے۔ آپ نے اس آدمی کو بتایا تو وہ مضطرب ہوکر عرض کرنے لگا مجھے فرمائیں کہ اس عرصہ میں کونسا عمل میرے زیادہ موافق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحصیلِ علم میں مصروف ہوجا۔ وہ تحصیل علم میں مصروف ہوگیا تو مغرب سے قبل اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

راوی کہتا ہے کہ اگر علم سے افضل کوئی اور چیز ہوتی تو اس چیز کو اپنانے کا حکم دیا جاتا

۲۴۔ ایک مشہور روایت میں ہے علماء کے علاوہ تمام لوگ مردہ ہیں۔

۲۵۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے انتقال کے بعد سات چیزیں جاری رہتی ہیں۔

۱۔پڑھایا ہوا علم ۲۔جاری کی ہوئی نہریں ۳۔کُھدوایا ہوا کنواں ۴۔تعمیر کی ہوئی مسجد

۵۔ورثہ میں چھوڑا ہوا قرآن پاک ۵۔نیک اولاد جو پس مرگ دُعا کرتی رہے ۸۔صدقہ جاریہ

۲۶۔ رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علماء کے پاس اس وقت بیٹھو جب وہ تمہیں پانچ چیزوں کی طرف بلائیں۔

۱۔شک سے یقین کی طرف ۲۔تکبر سے تواضع کی طرف ۳۔عداوت سے خیرخواہی کی طرف

۴۔ریا سے اخلاص کی طرف ۵۔اور رغبتِ دنیا سے زہد کی طرف

فضل قدیر

۲۷۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی: اے علی! توحید کی حفاظت کرنا کیونکہ یہ میرا سرمایہ ہے، عمل کے پابند رہنا کیونکہ یہ میری حرفت ہے، نماز قائم رکھنا کیونکہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یادالٰہی میں مصروف رہنا کیونکہ یہ میرے دل کی بصیرت ہے اور علم کو بروئے کار لانا کیونکہ یہ میری میراث ہے۔

۲۸۔ حضرت ابوکبشہ انصاری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا میں چار طرح کے آدمی ہیں۔

۱۔ ایک آدمی جسے اللہ تعالیٰ علم اور مال دونوں سے نوازتا ہے اور وہ علم کے مطابق عمل کرتا ہے

۲۔ دوسرے آدمی کو علم نصیب ہوتا ہے لیکن دولت سے محروم رہتا ہے، وہ کہتا ہے اگر اللہ تعالیٰ مجھے فلاں کی طرح مال دیتا تو وہ بھی اس کی طرح راہِ خدا میں خرچ کرتا، یہ دونوں آدمی اجر میں برابر ہیں۔

۳۔ تیسرا جسے اللہ تعالیٰ مال دیتا ہے اور علم نہیں دیتا یہ مال کو راہِ حق میں خرچ کرنے کے بجائے باطل میں خرچ کرتا ہے۔

۴۔ چوتھا آدمی جسے اللہ تعالیٰ نہ علم دیتا ہے اور نہ مال دیتا ہے، وہ کہتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ مجھے تیسرے آدمی کی طرح مال دیتا تو میں بھی اس کی طرح خرچ کرتا تو یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ (سنن ترمذی، ۲۳۲۵)

علم اور آثارِ صحابہ

۱۔ کمیل بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھلی فضا کی طرف لے گئے۔ جب صحرا میں پہنچے، کافی دیر آرام کرنے کے بعد فرمایا: اے کمیل بن زیاد یہ قلوب برتن ہیں۔ بہتر دل وہ ہے جو خوب یاد رکھے۔ لہٰذا میں جو کہتا ہوں یاد رکھنا۔ لوگ تین طرح کے ہیں:

۱۔ عالمِ ربانی ۲۔ متعلم راہِ نجات کا سالک ۳۔ احمق کمینے لوگ جو ہر بلانے والے کی اتباع کرتے ہیں۔ ہر طرف چلنے والے کی طرف میلان کرتے ہیں۔ نہ انہوں نے نورِ علم سے روشنی پائی اور نہ انہوں نے کسی مضبوط بہ اعتماد سے پناہ لی۔ اے کمیل! علم مال سے بہتر ہے، علم تیری حفاظت کرتا ہے اور مال کی تجھے حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے، مال کے زوال سے مال کی صنعت بھی زائل ہو جاتی ہے۔ اے کمیل! علم زینت ہے جس کے ساتھ انسان آراستہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعے انسان طاعت کماتا ہے۔ وَجَمِیْلُ الاحدوثۃ بعد وفاتہٖ مرنے کے بعد ذکرِ خیر باقی رہتا ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم۔

۲۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آدمی گھر سے نکلتا ہے تو اس پر تہامہ پہاڑ کے برابر گناہ ہوتے ہیں۔ جب وہ علمی گفتگو سنتا ہے اُس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اور گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو جب وہ گھر کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے

تمام گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے تم علماء کی مجالس سے دوری اختیار نہ کرو۔ کیونکہ فرش زمین پر مجالس علماء سے افضل کوئی جگہ نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک وحکومت اور علم کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے علم کو اختیار فرمایا۔ آپ کو مال اور ملک بھی دے دیا گیا۔

ہدہد اور پانی

۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کی ضرورت، علمی وجہ سے ہی پیش آئی جیسا کہ نافع بن ارزق سے روایت ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے پانی طلب کرنے کیلئے ہدہد کو کیوں اختیار فرمایا اس لئے ہدہد کیلئے یہ زمین آئینہ کی مانند ہے اور وہ ظاہر کی طرح باطن کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ نافع نے عرض کیا: جب یہ جال میں پھنستا ہے تو ایک انگشت زمین کے نیچے کی طرف نہیں دیکھ پاتا۔ آپ نے فرمایا: اِذْ جَاءَ الْقَدَرُ عَمِيَ الْبَصَرُ (جب تقدیر آجاتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے)

۵۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جنت دس ہزار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ جس سے نوسو ننانوے حصے ایسے لوگوں کے نصیب میں ہیں جنہوں نے امرِ الٰہی کو سمجھا۔ ان میں ثواب کی تقسیم عقل کے لحاظ سے ہوگی اور ایک حصہ ضعیف، فقیر، صالحین کیلئے

۶۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا: اے بیٹے! ادب کو لازم کرلو کیونکہ یہ مرادوں کے حصول کی دلیل، وحشت میں انس، غربت میں ساتھی، حضر میں ہم مجلس، وسائل ٹوٹ جائیں تو وسیلہ، عدم مال کی صورت میں تمنا، خسیس کیلئے رفعت، شریف کیلئے کمال اور بادشاہ کیلئے جاہ وجلال ہے۔

۷۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: علماء کے قلم کی آواز تسبیح ہے۔ علم کی کتابت اور اس کی طرف نظر عبادت ہے، دوات سے روشنائی کا کپڑا کو لگنا اسی طرح ہے جیسے شہداء کے لباس کے ساتھ خون لگ گیا ہو اور جب کوئی قطرہ زمین پر گرتا ہے تو وہ نور بن کر چمکتا ہے۔ عالم جب قیامت کے روز قبر سے اُٹھے گا تو اہلِ محشر نظریں اٹھا کر اس کے جمال کا مشاہدہ کریں گے اور صدا بلند ہوگی یہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے جو انعاماتِ الٰہیہ سے سرفراز ہوا ہے اور اس کا حشر انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس گروہ کے ساتھ ہوا ہے۔

۸۔ کلیلہ ودمنہ میں ہے جن لوگوں کے حقوق میں کمی نہ کی جائے گی اس کے زیادہ حقدار تین لوگ ہیں:

۱۔عالم ۲۔سلطان ۳۔اخوان

جس نے عالم کی توہین کی اس نے اپنا دین تباہ کرلیا۔ جس نے سلطان کی توہین کی اس نے دنیا برباد کرلی اور جو اپنے بھائیوں کی بے حرمتی کرے اس کی مروت کا جنازہ نکل گیا۔

۹۔ سقراط نے علم کی فضیلت میں کہا: جس طرح تم دوسری اشیاء میں خدام پا سکتے ہو علم کے معاملہ میں خادم پانے پر قدرت نہیں بلکہ خود علم کی خدمت کرنا ہوگی اور کوئی شخص تم سے علم سلب نہیں کر سکتا۔

یہ میرے بس میں نہیں

ایک حکیم و دانا سے کہا گیا: مت دیکھو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کہا گیا: مت سنو۔ اس نے کان بند کرلیا۔ پھر کلام کرنے سے روکا گیا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر کہا گیا: علم حاصل نہ کرو۔ اسنے جواباً کہا: یہ میرے بس میں نہیں ہے۔

عالم سے اگر جُرم سرزد ہو جائے تو سزا سے بچنے کی تدبیر نکال سکتا ہے۔ مثلاً چوری ہو تو کہہ سکتا ہے یہ مال میرے پاس امانت تھا تو اب ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے، شراب پینے پر کہہ سکتا ہے میں نے اسے سرکہ جانا، زنا کی صورت میں، میرا اس سے نکاح ہے

بعض علماء نے فرمایا: اپنے بھائیوں کے دلوں کو اپنے بصیرت افروز بیان سے زندہ رکھو۔ جس طرح کہ تم بنجر زمین کر کھیتی باڑی کے ذریعے زندہ کرتے ہو اس لئے کہ نفس کا لذّات وشہوات سے دُور رہنا بنجر زمین آباد کرنے سے کہیں افضل ہے۔

شاعر کہتا ہے:

وفی الجهل قبل الموت موت لاهله

و اجسامهم قبل القبور قبور

و ان امرأ لم یحیی بالعلم میت

و لیس له حتی النشور النشور

۱۔ جاہل موت طاری ہونے سے پہلے ہی مُردہ ہیں اور ان کے جسم قبروں میں داخل ہونے سے پہلے ہی خود قبروں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

۲۔ علم کے ذریعے حیاتِ جاوداں سے بے بہرہ رہنے والا سراسر مُردہ ہے۔ یوم النشور کو اسے نہیں اُٹھایا جائے گا۔

نکات متعلقہ فضیلت علم

جہالت کی صورت میں اگر گناہ ہو جائے تو اس کے زوال کی اُمید نہیں ہوتی اور بصورت علم زوال کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش واقع ہوئی تو آپ نے استغفار کی اور یہ علم کے پیشِ نظر تھا اور شیطان نے گمراہی اختیار کی اور ہمیشہ کیلئے گمراہ ہی رہا اس کی گمراہی کا سبب جہالت تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ

حضرت یوسف علیہ السلام کو وزیر کی ضرورت پیش آئی تو بارگاہِ رب العزت میں عرض کی۔ جبرائیل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ فلاں کو وزیر بنا تو آپ نے کہا کہ وہ انتہائی خستہ حالت میں ہے یہ وزارت کا اہل کیسے ہوسکتا ہے؟ جبرائیل امین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وزارت کیلئے اُس کو منتخب فرمایا ہے اس لئے کہ آپ کی برأت کی گواہی (جھولے میں) اس نے دی تھی اور کہا تھا:

وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ — اور اگر ان کا کرتہ پیچھے سے چاک ہوا تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے (پ۱۲، یوسف:۲۶)

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کی گواہی دے وہ آپ کی حکومت میں شریک ہوسکتا ہے تو جو دین قویم کی برہان مستقیم کے ذریعے حفاظت کرے وہ خداوندی احسان و تحسین کے لائق کیوں نہ ہوگا۔

چیونٹی کا علم و ادب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ — ایک چیونٹی بولی: اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں چلی جاؤ۔

(پ۱۹، النحل:۱۸)

گویا چیونٹی کہہ رہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام معصوم ہیں اور یہ بات ناجائز ہے کہ ایک معصوم کسی بری الذمہ کو سزا دے اور یہ ممکن ہے کہ سہواً تمہیں روند ڈالیں کہ تمہارے حال کی طرف ان کی توجہ نہ جائے اور "وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ" انبیاء کرام علیہم السلام کی معصیت سے تنزیہہ اور بالاتر ہونے کی طرف اشارہ ہے جب یہ چیونٹی ایک مسئلہ کا علم رکھنے کی وجہ سے ریاست تامہ کی مستحق بن سکتی ہے تو جو آدمی موجودات و معدومات اشیاء کی حقیقتوں سے واقف ہو وہ دنیا و آخرت کی ریاست کا والی کیوں نہ بنے گا؟

سدھایا ہوا کتا اور علم

سدھایا ہوا کتا بسم اللہ پڑھ کر چھوڑ دیا جائے تو اس کا کیا ہوا شکار بھی پاک ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ علم کی نسبت کتے کی طرف ہوگئی تو علم کی برکت سے نجس چیز بھی پاک ہوگئی اور یہاں تو نفس و روح اصل فطرت کے اعتبار سے طاہر ہیں لیکن معصیات کی آلائش سے آلودہ ہوچکے ہیں جب یہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے علم سے متصف ہوں گے تو ہمیں بارگاہِ خداوندی سے اُمید واثق ہے کہ پلید دل پاک ہوجائے گا اور مردود مقبول بن جائے گا۔

قوت دل اور علم

دل اعضاء میں رئیس ہے۔ یہ ریاست، اسے قوت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہڈی اس سے سخت ہے۔ نہ بڑا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے کہ ران کا حجم اس سے کئی درجے زیادہ ہے نہ تیزی کی وجہ سے ہے کیونکہ ناخن اس سے تیز ہیں لہٰذا دل کی ریاست محض علم کی وجہ سے ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ علم اشرف الصفات ہے۔

چہارم: تحصیلِ علم فقط اس صورت میں گراں محسوس ہوگی جب تم دنیا سے فرطِ محبت کا شکار ہو گے۔ اس لئے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے تمہیں دو چیزیں دی ہیں۔ ایک سوادِ عین اور دوسری سُوَیداءِ دل۔ ظاہر ہے کہ سواد، سویداء کی نسبت بڑھ کر ہے کیونکہ سَوَاد مکبّر اور سُوَیداء مصغر ہے جب تم سوادِ عین (آنکھ کی پتلی) پر دنیا کی ایک چھوٹی سی چیز رکھ لو تو تمہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تو جب سویداء دل پر ساری دُنیا رکھ لو تو دل کو کیا سوجھے گا؟

علم وعمل کا رشتہ

ایک حکیم نے کہا کہ دل میت ہے اس کی روح علم ہے۔ علم میت ہے اس کی زندگی طلب پر موقوف ہے۔ طلب ایک ضعیف سی چیز ہے اس کی قوت تکرار علم میں ہے جب یہ مدارست سے قوت پالے تو ابھی محجوب ہے اس کا اظہار مناظرہ و بحث سے ہوگا۔ جب یہ مناظرہ کے ذریعے ظاہر ہو تو ابھی عقیم (بانجھ) ہے عمل کی صورت میں اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا جب علم وعمل میں رشتۂ ازدواج قائم ہوگا تو توالد وتناسل کی صورت میں ایک ابدی ملک جنم لے گا جس کی کوئی انتہا نہیں۔

علم اور خدمتِ رب

ایک آدمی کسی بادشاہ کی ملازمت اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بادشاہ نے کہا تم میری خدمت کے اہل نہیں ہو۔ جاؤ پہلے علم حاصل کرو پھر آنا۔ وہ شخص تحصیلِ علم میں مصروف ہوگیا اور اس سے خوب محظوظ ہوا۔ بادشاہ نے پیغام بھیجا کہ اب تم میری خدمت کے اہل بن چکے ہو، علم چھوڑ کر چلے آؤ۔ اس نے جواب دیا: جب تم مجھے اپنی خدمت کے اہل نہیں سمجھتے تھے تو میں تمہاری خدمت کے اہل تھا۔ اب میں رب العزت کی خدمت کا اہل بن چکا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے میں جہالت کی وجہ سے سمجھتا تھا کہ دروازہ فقط آپ کا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ دروازہ صرف اور صرف خداوندِ قدوس کا ہے۔

حکایات متعلقہ فضیلتِ علم

۱-امام ابو یوسف کا کمال علمی

خلیفہ ہارون الرشید کے پاس فقہاء موجود تھے جن میں قاضی ابو یوسف علیہ الرحمۃ بھی تھے ایک آدمی نے آکر دعوٰی کیا کہ اس نے رات میرا مال اخذ کرلیا ہے اور پکڑنے والے نے بھری مجلس میں مال پکڑنے کا اعتراف بھی کرلیا تو تمام فقہاء نے بیک زبان کہا اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے قاضی ابو یوسف علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس نے اخذ (پکڑنے) کا اعتراف کیا ہے نہ کہ سرقہ (چوری) کا۔ ہاتھ کاٹنے کیلئے اعترافِ سرقہ شرط ہے۔ تمام فقہاء کرام نے آپ کی تائید کی پھر لینے والے سے پوچھا گیا۔ کیا تو نے اس کا مال چرایا ہے؟ اس نے اعتراف کرلیا کہ میں نے چوری کی ہے پھر تمام فقہاء نے ہاتھ کاٹنے کا فتوٰی دیا تو قاضی ابو یوسف علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا کیونکہ پہلے اس نے مال پکڑنے کا اعتراف کیا تو اس پر ضمان لازم ہوگئی اب یہ چوری کا اقرار کر کے مال کی ضمان ساقط کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا دوسرا اقرار قابلِ قبول نہیں اس پر تمام فقہاء انگشت بدندان رہ گئے۔

۲-حسنین کا اولادِ رسول ہونا

محدث شعبی کہتے ہیں کہ میں حجاج بن یوسف کے پاس بیٹھا تھا اس دوران فقیہ خراسان حضرت یحیٰی بن یعمر کو بلخ سے بیڑیوں میں جکڑ کر لایا گیا۔ حجاج نے پوچھا: کیا تم (حضرت امام) حسن اور (حضرت امام) حسین (رضی اللہ عنہما) کو ذریتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہو؟ تو انہوں نے جواباً کہا: ہاں سمجھتا ہوں۔ حجاج نے کہا: اس پر واضح ثبوت پیش کرو ورنہ تمہارا جوڑ کاٹ دیا جائے گا۔ حضرت یحیٰی نے فرمایا: اے حجاج! میں قرآن سے ثبوت پیش کرتا ہوں۔ محدث شعبی فرماتے ہیں کہ میں یحیٰی کی اس جرأت مندی اور اندازِ تخاطب ''یا حجاج'' پر بڑا متعجب ہوا۔ حجاج نے کہا: یہ آیت کریمہ پیش نہ کرنا: نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآئَکُمْ۔ حضرت یحیٰی نے فرمایا: اس کے علاوہ واضح دلیل قرآنِ حکیم سے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ (پ۷، الانعام:۸۴)

اور ان سے پہلے نوح کو راہ دکھائی اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو (یہاں تک کہ) زکریا اور یحیٰی اور عیسیٰ کو

اس آیت کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت قرار دیا گیا ہے۔ بتاؤ آپ کا باپ کون تھا؟ تو حجاج کافی دیر سر جھکائے مبہوت بیٹھا رہا۔ پھر کہنے لگا: ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ میں نے یہ آیت پڑھی ہی نہیں تھی اور حکم دیا کہ ان کی بیڑیاں کھول دو اور اتنا مال دے دو۔

نضل قدیر

۳۔امام اعظم اور فاتحہ خلف الامام

اہلِ مدینہ کی ایک جماعت امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے فاتحہ خلف الامام پر مناظرہ کرنے کیلئے آئے تا کہ آپ کو اس مسئلہ میں خاموش و شرمندہ کر کے طعن و تشنیع کریں۔آپ نے فرمایا: میں تمام سے مناظرہ نہیں کروں گا۔تم میں سے جو بڑا ہو وہ بات چیت کرے۔ انہوں نے ایک عالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہماری طرف سے یہ مناظر ہیں۔آپ نے پوچھا: کیا یہ تم میں بڑا عالم ہے؟ کہنے لگے: جی! یہی بڑے ہیں۔آپ نے فرمایا: کیا اس کے ساتھ مناظرہ تمام کے ساتھ مناظرہ ہے؟ بولے: جی سب کے ساتھ۔آپ نے فرمایا: اس پر اعتراض سب پر اعتراض ہوگا؟ سب نے اثبات میں جواب دیا۔آپ نے فرمایا: کیا میرا اس کے ساتھ مناظرہ اور الزام حجت تمام کے ساتھ مناظرہ والزامِ حجت ہے؟ انہوں نے تسلیم کرلیا کہ تمام کے ساتھ مناظرہ اور الزام حجت ہے۔آپ نے فرمایا: وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ ہم نے اسے اپنا امام تسلیم کرلیا ہے۔اس کا قول ہمارا قول ہوگا۔تو امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا: جب ہم نماز میں ایک امام مقرر کرلیتے ہیں تو اس کی قرأت ہماری قرأت ہوئی اور وہ ہماری نیابت ونمائندگی ہی کرتا ہے اس پر تمام فقہاء نے الزام کا اقرار کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی۔

۴۔فرزدق کی ذہانت

فرزدق شاعر نے کسی کی ہجو و مذمت میں یہ شعر کہا:

لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِیْ عَلٰی بَابِکُمْ

کَمَا ضَاعَ دُرٌّ عَلٰی خَالِصَۃٍ

(جس طرح خالصہ کے گلے میں موتی لٹکانا اسے ضائع کرنے کے مترادف ہے اسی طرح تمہارے دروازے پر میرا موتیوں جیسا شعر بے کار ہے)

خالصہ بڑی ظریفہ، ادیبہ سلیمان بن عبدالملک کی عشقیہ بیوی تھی اور سلیمان کی مروانی سلاطین میں ہیبت مسلم تھی خالصہ نے سلیمان سے شکایت کی۔سلیمان نے فرزدق کو حاضر دربار کرنے کا حکم دیا کہ اسے بیڑیوں میں جکڑ کر ذلت ورسوائی کے ساتھ لایا جائے۔جب حاضر کیا گیا تو وہ شدت ہیبت کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔سلیمان نے پوچھا: کیا یہ شعر تمہارا ہے؟:

لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِیْ عَلٰی بَابِکُمْ

کَمَا ضَاعَ دُرٌّ عَلٰی خَالِصَۃٍ

فرزدق نے کہا: میں نے اس طرح نہیں کہا، میرے کسی بدخواہ نے اسے بدل دیا ہے۔ میں نے تو اس طرح کہا تھا۔

لَقَدْ ضَاءَ شِعْرِیْ عَلٰی بَابِکُمْ

کَمَا ضَاءَ دُرٌّ عَلٰی خَالِصَۃٍ

(تمہارے دروازے پر میرا شعر اس طرح چمکتا ہے جس طرح کہ خالصہ کے گلے کے موتی ہیں)

خالصہ پسِ پردہ گفتگو سن رہی تھی اس سے ضبط نہ ہوسکا پردے پھلانگتی ہوئی بسر محفل آگئی اور اپنے گلے کا قیمتی ہار فرزدق کے گلے کی زینت بنادیا جس کی قیمت لاکھ سے زائد تھی۔ فرزدق جب رخصت ہوگیا تو سلیمان نے حاجب کے ذریعے ایک لاکھ میں وہ ہار خرید کر پھر خالصہ کے گلے میں ڈال دیا۔

۵۔ امام اعظم کی دانائی

ایک دن منصور نے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کو طلب کیا۔ محدث ربیع جن کو امام صاحب سے عداوت تھی۔ منصور سے کہنے لگے: اے امیر المؤمنین! یہ آپ کے دادا (حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما) کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ استثناءِ منفصل کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے اور یہ ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ربیع کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کی گردنوں میں آپ کی بیعت نہیں ہے۔ منصور کہنے لگا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا کہ آپ کے سامنے بیعت کرلیں اور گھر جا کر انشاء اللہ کہہ لیں تو بیعت باطل ہوگئی۔ منصور ہنس دیا اور کہنے لگا: اے ربیع! امام ابوحنیفہ کے متعلق اس قسم کی باتوں سے بچو۔ بعد میں ربیع نے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے میرا خون مباح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے فرمایا: ابتداء تمہاری تھی میں نے تو صرف دفاع کیا ہے۔

۶۔ امام ابویوسف اور احترام مسلم

یہ حکایت بھی ملتی ہے کہ حضرت امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ذمی کے قاتل مسلمان کے قتل کا حکم دیا۔ زبیدہ خاتون رحمۃ اللہ علیہا جو کہ مسلمانوں کی بڑی خیر خواہ تھیں، نے پیغام بھیجا کہ مسلمان کو قتل نہ کرنا۔ جب امام ابویوسف اور دیگر فقہاء خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تشریف فرما تھے تو خلیفہ وقت نے مسلمان کے قتل کا حکم دیا۔ قاضی ابویوسف فرمانے لگے: میرا فتویٰ بھی یہی ہے لیکن میں قتل کا حکم اس وقت دوں گا جب مقتول کے ورثاء اس بات پر عادل گواہ پیش کریں کہ مقتول قتل کے دن جزیہ دینے والوں میں سے تھا۔ ورثاء گواہ پیش نہ کرسکے اس طرح ایک مسلمان قتل ہونے سے بچ گیا۔

۷-السلام علیکم اور امن

غضبان نے ایک دن حجاج کے کسی دشمن سے کہا کہ تو حجاج کو ہلاک کردے قبل اس کے کہ وہ تیرا کام تمام کردے۔ یہ بات حجاج تک پہنچ گئی۔ پھر غضبان حجاج کے پاس آکر کہنے لگا: تم السلام علیکم کا کیا جواب دیتے ہو؟ حجاج نے کہا: وعلیکم السلام۔ پھر حجاج سمجھا کہ اس نے تو امان لے لی ہے۔ کہنے لگا: اے غضبان تجھے تباہی ہو تو نے میرے سلام کے جواب کی صورت میں امان حاصل کرلی ہے۔ اگر میں نے وعلیکم السلام نہ کہا ہوتا تو تُو آج کے بعد ٹھنڈا پانی نہ پیتا۔

اے صاحبِ عقل! اس صورت میں علم کا فائدہ دیکھو۔ اللہ کیلئے ہی علم اور علماء کی خوبی ہے اور جہالت و جہلاء پر حیف صد حیف

۸۔ عبدالملک بن مروان کو کسی شاعر کا یہ شعر سنایا گیا:

وَمِنَّا سُوَيْدٌ وَالْبَطِيْنُ وَقَعْضَبٌ

وَمِنَّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ شَبِيْبٌ

عبدالملک نے اسے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو عبدالملک نے پوچھا: کیا تو نے یہ کہا ہے؟ وَمِنَّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ شَبِيْبٌ

شاعر کہنے لگا: میں نے امیر کی را پر ضمہ نہیں بلکہ فتحہ پڑھا ہے یعنی وَمِنَّا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ شَبِيْبٌ۔ یعنی تمہیں ندا کی ہے اور تم سے استغاثہ کیا ہے۔ عبدالملک کا غصہ فرو ہو گیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک شاعر علم کی برکت سے جان سلامت لے کر گھر کو لوٹا

۹۔ حاکم وقت ابو مسلم نے سلیمان بن کثیر سے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے کہا ہے کہ یا اللہ! ابو مسلم کا چہرہ سیاہ کردے۔ اس کی گردن کاٹ دے اور مجھے اس کا خون پلا۔ سلیمان کہنے لگے: ہاں! میں نے ایسا کہا ہے۔ میں نے تو انگوروں کا ایک گچھا دیکھا تھا۔ اس کے متعلق کہا تھا۔ ابو مسلم نے اس کی بات کو پسند کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔

۱۰۔علم کا انکشاف

ایک شخص امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: میں نے قسم کھائی تھی جب تک میری بیوی مجھ سے بات نہیں کرے گی، میں اس سے گفتگو نہیں کروں گا، اور میری بیوی نے بھی حلف اٹھالیا کہ جب تک میں اس سے گفتگو نہ کروں، وہ مجھ سے بات نہ کرے گی ورنہ اتنا صدقہ اس کے ذمہ لازم ہے اور اتنا صدقہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ فقہاء اس مسئلہ میں حیران ہیں۔ حضرت سفیان ثوری نے فتویٰ دیا ہے کہ جو بھی بات کرے گا حانث ہو جائے گا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ جاؤ اپنی بیوی سے کلام

کرلو۔ کسی پر بھی کفارہ لازم نہیں آتا۔ اس آدمی نے یہ فتویٰ سفیان ثوری کو جا سنایا۔ وہ سخت ناراض ہوئے آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ حرام کو مباح قرار دے رہے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا: وہ کیسے؟ سفیان ثوری نے اس شخص سے کہا: ان سے دوبارہ سوال کرو۔ اس شخص نے سوال دہرایا۔ آپ نے وہی جواب دیا۔ حضرت سفیان نے دلیل طلب کی۔ آپ نے فرمایا: خاوند کے حلف کے بعد خاوند کی موجودگی میں بیوی نے قسم کھائی تو خاوند سے کلام کرلی اس طرح خاوند سے قسم ساقط ہوگئی۔ اب خاوند بات کرے تو عورت کی قسم ساقط ہو جائے گی اس پر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے: آپ پر جن علوم کا انکشاف ہوتا ہے ہم ان علوم سے غافل ہیں۔

۱۱۔ امامِ اعظم کی علمی بصیرت

ایک شخص کے گھر میں چور داخل ہوئے تمام سامان باندھ لیا اور مالک مکان سے قسم لی کہ اگر اس نے کسی کو بتایا تو اس کی بیوی کو تین طلاقیں۔ صبح وہ اپنا سامان بکتا دیکھتا ہے لیکن بولے تو بیوی جاتی ہے۔ مشورہ کیلئے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا: اپنے امام مسجد اور اہلِ محلّہ کو بلاؤ۔ جب وہ آئے تو آپ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اس کا سامان بھی مل جائے اور بیوی بھی بچ جائے؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: تمام اہلِ محلّہ کو ایک جگہ جمع کرو اور ایک ایک کو باہر نکال کر اس سے پوچھو: کیا یہ تیرا چور ہے؟ جو چور نہیں ہوگا اس کے متعلق یہ نفی کرتا رہے گا اور چور پر خاموش رہے گا۔ اس سے سمجھ لینا کہ یہ چور ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بصیرت سے مسروقہ مال بھی مل گیا اور حلف بھی نہ ٹوٹا۔

۱۲۔ امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوس میں ایک نوجوان رہائش پذیر تھا۔ آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا: فلاں بنت فلاں بنت فلاں سے نکاح کا خواہشمند ہوں۔ میں نے پیغامِ نکاح بھیجا تو انہوں نے اس قدر حقِ مہر طلب کیا جو میری بساط سے باہر ہے۔

آپ نے فرمایا: حیلہ کرلو۔ قرض لے کر نکاح کرلو اللہ تعالیٰ آسانی پیدا فرمائے گا۔ پھر آپ نے اتنا قرض دے دیا اور شادی سے کچھ عرصہ بعد فرمایا: تم کسی دور دراز سفر کا ارادہ ظاہر کرو اور کہو کہ میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اس نوجوان نے اس طرح کیا۔ بیوی کے والدین نے لڑکی کو بھیجنے سے انکار کر دیا اور شکایت لے کر آپ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے فرمایا: اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ پوچھنے لگے: پھر کوئی تدبیر بتا دیں۔ آپ نے فرمایا: تم نے اس سے جو مہر لیا ہے وہ واپس کر دو۔ انہوں نے تسلیم کرلیا۔ آپ نے نوجوان کو بتایا تو وہ کہنے لگا: میں تو اس سے زائد رقم لوں گا۔ امام صاحب فرمانے لگے اس پر اکتفا کرو ورنہ میں کسی آدمی کیلئے قرض کا اقرار کر کے تمہارے پیچھے لگا دوں گا اور جب تم قرض ادا نہ کرو گے۔ شہر سے باہر قدم نہیں رکھ سکو گے۔

فضل قدیر

وہ عرض کرنے لگا: اللہ اللہ بخدا ایسا نہ کیجئے کہیں میرے سسرال والے سُن نہ لیں، میں حق مہر پر ہی اکتفا کرتا ہوں، زائد رقم نہیں لوں گا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے علم کی برکت سے دونوں گھرانوں کے معاملات میں حائل شدہ رکاوٹ دور ہوگئی

۱۳۔ لیث بن سعد فرماتے ہیں: ایک شخص امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگا: میرا لڑکا نیک کردار نہیں ہے۔ میں زرِ کثیر خرچ کر کے اس کیلئے لونڈی خریدتا ہوں تو وہ آزاد کر دیتا ہے اور اگر بھاری رقم صرف کر کے نکاح کرتا ہوں تو طلاق دے دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے سوق النخاسین (بازار) میں لے جاؤ۔ جس لونڈی کو پسند کرے اسے خود خرید کر اس کے نکاح میں دے دو۔ اگر وہ طلاق دے گا تو تمہاری مملوکہ ہی رہے گی اور اگر آزاد کرنا چاہے گا تو اس کا اسے اختیار نہیں ہے۔ حضرت لیث کہتے ہیں: قسم بخدا مجھے آپ کا جواب اتنا پسند نہیں آیا جس قدر فی الفور جواب دینا پسند ہے۔

۱۴۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص حلف اٹھاتا ہے کہ وہ رمضان المبارک میں دن کے وقت اپنی بیوی سے ہمبستری کرے گا اور تمام فقہاء اس کے جواب میں عاجز ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ رمضان المبارک میں اپنی بیوی کے ساتھ سفر پر چلا جائے تو دن کے وقت صحبت کرے حانث نہیں ہوگا۔

۱۵۔ ایک شخص حجاج بن یوسف کے پاس آیا اور شکایت کی کہ میرے چار ہزار درہم چوری ہو گئے ہیں۔ حجاج نے پوچھا: تمہیں کسی پر شک ہے۔ کہنے لگا کہ کسی پر بھی نہیں۔ حجاج نے کہا کہ شاید تمہاری بیوی نے ایسا کیا ہو۔ وہ کہنے لگا: سبحان اللہ! میری بیوی ایسا نہیں کر سکتی۔ حجاج نے عطار کو بہترین خوشبو تیار کرنے کیلئے کہا کہ ایسی خوشبو پہلے کسی کے پاس نہ ہو۔ جب خوشبو تیار ہو گئی تو مدعی کو بلا کر کہا: یہ خوشبو لے جاؤ اور اسے خود ہی لگانا، کسی اور کو نہ دینا۔ پھر اپنی پولیس کو اس خوشبو کی پہچان کرائی اور حکم دیا کہ جامع مسجد اور دیگر مساجد کے دروازوں پر بیٹھ جاؤ، جس آدمی سے یہ خوشبو آئے اسے پکڑ لو۔ سپاہی ایک میڈیوں والے شخص کو پکڑ لائے۔ حجاج نے پوچھا: یہ خوشبو کہاں سے لی ہے؟ بولا: خود تیار کروائی ہے۔ حجاج نے قتل کی دھمکی دی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ فلاں عورت (مدعی کی بیوی) سے لی ہے۔ حجاج نے مدعی کو بلا کر کہا: اس نے تمہاری بیوی کی وساطت سے تمہارے چار ہزار درہم چرائے ہیں۔ جاؤ اسے حسنِ ادب سکھاؤ۔ پھر چور سے چار ہزار درہم لے دیئے۔

۱۶۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ سے کہا کہ جعفر بن عیسیٰ کے پاس ایک لونڈی ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ اس بات کا جعفر کو بھی علم ہے اور اس نے حلف اٹھا رکھا ہے کہ وہ نہ اسے بیچے گا نہ ہبہ کرے گا اور نہ ہی آزاد کرے گا اور اب وہ اپنی قسم سے نکلنا چاہتا ہے اور آپ نے فرمایا: نصف بیچ دے اور نصف ہبہ کر دے۔

۱۷۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا علمی کمال

امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں ایک رات سو رہا تھا کہ میرا دروازہ کھٹکا۔ میں نے کہا: دیکھو دروازے پر کون ہے؟ پتا چلا کہ خلیفہ ہارون الرشید بلا رہے ہیں۔

میں اس آدمی کے ساتھ چلتا ہوا خلیفہ کے پاس پہنچا تو کہنے لگا: ایک مسئلہ کی خاطر تمہیں تکلیف دی ہے۔ میں نے اُم زبیدہ سے کہا ہے کہ میں امام عادل ہوں اور امام عادل جنتی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگی: تم امام عاصی ہو اور اپنے لیے جنت کی گواہی دے کر خدا تعالیٰ پر جھوٹ بول رہے ہو، اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہو اور میں تم پر حرام ہو چکی ہوں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، میں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! کیا معصیت کے وقت یا بعد میں کبھی تمہارے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا ہے؟ امیر المؤمنین نے کہا: قسم بخدا میں بہت ڈرتا ہوں۔ تو میں نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جنتی ہو بلکہ ایک کی بجائے دو کے مستحق ہو۔ قرآنِ کریم میں ہے

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ (پ ۲۷، الرحمٰن: ۴۶)

اور جو اپنے رب کے حضور کھڑا (حساب) ہونے سے ڈرے اس کیلئے دو جنتیں ہیں

تو خلیفۂ وقت انتہائی تعظیم بجالائے۔ جب میں گھر کو لوٹا تو دنا نیر و دراہم سے چھلکتا ہوا طبق میرے آگے آگے تھا۔

۱۸۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رات کے وقت خلیفہ ہارون الرشید کا پیامبر آیا۔ کہنے لگا: جلدی چلیں خلیفۂ وقت یاد فرماتے ہیں۔ آپ خلیفہ کے محل کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر السلام علیکم کہا تو خلیفہ نے اپنے قریب کرلیا اور رات کو بلانے کی وجہ بیان کی کہ ہمارے گھر سے زیور چوری ہو گیا اور میں نے اپنی خاص لونڈی کو متہم ٹھہرایا ہے اور حلف اٹھایا کہ اگر اس نے سچ نہ بولا تو قتل کردی جائے گی اور اب مجھے ندامت ہو رہی ہے۔ اس حلف سے نکلنے کی کوئی صورت فرمائیں۔ آپ نے لونڈی سے کہا: کیا تو نے زیور چرایا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: پھر جو میں کہتا ہوں اس کو ذہن نشین رکھنا اور اس میں کمی بیشی نہ کرنا۔ جب خلیفۂ وقت بلا کر دریافت کریں کیا تو نے چوری کی ہے؟ تو کہہ دینا میں نے چوری کی ہے اور جب کہیں کہ لا زیور کہاں رکھا ہے؟ تو کہہ دینا میں نے چوری نہیں کی۔ جب امام ابو یوسف خلیفہ کے پاس تشریف لائے تو کہا لونڈی کو بلا کر سوال کرو۔ پوچھا گیا: کیا تو نے چوری کی ہے۔ اس نے اعتراف کرلیا۔ جب مال حاضر کرنے کا حکم ہوا تو چوری سے انکار کردیا۔ تو قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کے اقرار یا انکار میں ایک بات سچی ہے لہٰذا آپ قسم سے بری الذمہ ہو چکے ہیں۔ اس طرح چاند جیسی لونڈی قتل ہونے سے بچ گئی۔ خلیفۂ وقت نے حکم دیا کہ ایک لاکھ درہم ان کے گھر پہنچا دو۔ خدام نے عرض کیا:

بیت المال کا انچارج موجود نہیں ہے، صبح حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ خلیفہ نے فرمایا: انہوں نے ہمیں رات کو آزاد کیا ہے ان کا صلہ کل تک مؤخر نہیں کر سکتے اور فوراً دست بدست ایک لاکھ درہم حاضر کرنے کا حکم دیا۔

۱۹۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی کمال

خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے امام شافعی اور بشر مریسی کا مناظرہ ہو رہا تھا۔ بشر مریسی نے کہا: اہلِ شرق و غرب کا ایک بات پر اتفاق معلوم کرنا ناممکن ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آپ کو معلوم ہے کہ اس شخص کی خلافت پر اہلِ شرق و غرب کا اتفاق ہے اس نے ڈرتے ہوئے اعتراف کر لیا اور اس بات پر مناظرہ ختم ہو گیا۔

۲۰۔ امام حسین اور اعرابی کی علمی گفتگو

ایک اعرابی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حاجت پیش کرتے ہوئے کہنے لگا: میں نے آپ کے جدِّ امجد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جب تم سوال کرو تو چار قسم کے آدمیوں سے سوال کرو۔

۱۔ عربی شریف سے ۲۔ کریم آقا سے ۳۔ حاملِ قرآن سے ۴۔ حسین و جمیل سے۔ عرب تو وہ آپ کے جدِّ بزرگوار کے صدقے سے شریف بنے ہیں۔ کرم آپ کی سیرت و عادت ہے۔ قرآن آپ کے گھر میں نازل ہوا ہے اور باقی رہا وجہ صبیح و حسین، میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے اگر تمہیں کسی کو دیکھنے کا شوق ہو تو حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو دیکھو۔ آپ نے فرمایا: تمہاری حاجت کیا ہے؟ اس نے اپنی حاجت زمین پر لکھ دی۔ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے والدِ ماجد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ آدمی کی قیمت اس کی خوبی کے مطابق ہوتی ہے اور اپنے جدِّ معظم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بھلائی معرفت کے مطابق ہوتی ہے۔ میں تین چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہوں اگر ایک جواب صحیح ہوا تو ایک تہائی مال اور دو صحیح ہوئے تو دو تہائی مال اور تینوں صحیح ہوئے تو سارا مال دے دیا جائے گا اور ابھی آپ کے پاس عراق سے مہر لگی تھیلی آئی تھی۔ وہ اعرابی کہنے لگا: سوال کیجئے اور اللہ تعالیٰ ہی نیکی کی قوت دینے والا ہے اور وہی برائی سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ آپ نے پوچھا:

سوال: کون سا عمل افضل ہے؟

جواب: اعرابی نے جواب دیا: ایمان باللہ۔

سوال: آدمی کیلئے ہلاکت سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے؟

جواب: وثوق باللہ، اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ۔

سوال: آدمی کی زینت کس چیز میں ہے؟

جواب: علم کے ساتھ حلم۔

سوال: اگر علم کی دولت نہ ہو تو پھر؟

جواب دیا: مال معه کرم۔ مال، سخاوت کے ساتھ۔

آپ نے فرمایا: اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر کس کا درجہ ہے؟

بولا: فقر مع الصبر۔ فقر، صبر کے ساتھ۔

امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر یہ بھی نہ ہو تو؟

اعرابی نے جواباً کہا: آسمان سے بجلی آئے اور اسے جلا کر خاکستر کر دے۔ اس پر امام حسین رضی اللہ عنہ مسکرا دیئے اور دنانیر سے بھری تھیلی انہیں دے دی۔

فضیلتِ علم پر شواہدِ عقلیہ

ہم کہتے ہیں کہ علم کا صفتِ شرف وکمال اور جہل کا وصفِ نقصان وقبیح ہونا عقلاء کے نزدیک معلوم ومسلم امر ہے اس لیے کہ جب کسی عالم سے کہا جائے: اے جاہل! تو وہ بہت تکلیف محسوس کرتا ہے اور اگر کسی جاہل کو کہا جائے: اے عالم! تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اگر چہ وہ جانتا ہے کہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ علم لذاتہٖ محبوب وشریف ہے اور جہل لذاتہٖ نقصان۔ اور علم جہاں ہوتا ہے تو صاحبِ علم معظم ومکرم ہوتا ہے حتیٰ کہ حیوانات انسان کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ احترام واحتشام کرتے ہیں اور کچھ ڈرتے بھی ہیں۔ خواہ حیوان انسان سے کتنا ہی بڑا ہو۔

اسی طرح ایک والیٔ حکومت اپنے سے بڑھ کر صاحبِ علم وعقل والی کو دیکھتا ہے تو بطیبِ خاطر جھک جاتا ہے اور علماء جب کہ ان سے عناد نہ ہو وہ اپنے سے کم علم لوگوں کے فطرۃً رئیس ہوتے ہیں۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معاندین آپ کے قتل کا ارادہ لے کر آتے۔ جب آپ کو دیکھتے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں آپ کا رعب ودبدبہ ڈال دیتا اور وہ ہیبت زدہ ہو کر منقاد ومطیع ہو جاتے۔ شاعر کہتا ہے۔

لو لم تكن فيه أياتٌ مبيّنة

كانت بداهته تنبئك عن خبر

''اگر آپ کی کوئی اور نشانی نہ ہو تو آپ کو دیکھ لینا اور زیارت ہی بتادے گی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول برحق ہیں علیہ الصلوٰۃ والسلام''

یہ بات بلاشبہ ثابت ہے کہ انسان تمام حیوانات سے اشرف ہے اس کی یہ فضیلت قوت ودبدبہ کی وجہ سے نہیں ہے اس لیے کہ بہت سے جانور قوت میں انسان کے برابر بلکہ بڑھ کر ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فضیلت نورانیہ اور لطیفۂ ربانیہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کی وجہ سے یہ حقائقِ اشیاء کا ادراک اور عباداتِ الٰہی میں اشتغال کے لائق ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اور میں نے جن اور آدمی اسی لیے ہی بنائے ہیں کہ میری بندگی کریں (پ۲۷، الذاریات:۵۶)

نیز جاہل، گہری تاریکی میں غرق ہے اور عالمِ ملکوت کے اقطار میں محوِ پرواز اور معقولات کے بحار میں غوطہ زن ہوتا ہے موجود ومعدوم اور ممکن ومحال کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر ممکن کے جوہر وعرض پھر جوہر کی مرکب وبسیط کی طرف تقسیم معلوم کرتا ہے پھر ہر ایک کی انواع، انواعِ انواع کی طرف اس طرح اجزا اور اجزاءِ اجزا کی طرف تقسیم میں مبالغہ کرتا ہے کہ کون سی چیز میں غیر کے ساتھ شریک ہے کون سی چیز میں ممتاز ہے۔ ہر چیز کے معلول وعلت، مؤثر واثر، ملزوم ولازم، کلی وجزی اور کثرت ووحدت کو

پہچانتا ہے حتیٰ کہ اس کی عقل ایک کتاب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس میں جمیع معلومات اپنی اقسام وتفاصیل کے ساتھ مندرج ہوتی ہیں۔ اس درجہ سے بڑھ کر اور سعادت کون سی ہو سکتی ہے۔ پھر عقل اس وصف سے اتصاف کے بعد جاہل نفوس کو عالم بنا دیتی ہے اور یہ نفس عالم ارواح میں سورج کی طرح تابانی دکھاتا ہے اور تمام نفوس کیلئے حیات ابدیہ کا سبب بن جاتا ہے کہ پہلے یہ کامل تھا تو اب مکمل بن چکا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (پ ۱۴ النحل: ۲) ملائکہ کو وحی دے کر اپنے امر سے اتارتا ہے

مفسرین نے اس روح کی تفسیر علم اور قرآن سے کی ہے جس طرح بدن روح کے بغیر، میت اور فاسد ہے اسی طرح علم بغیر روح میت ہے اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا اور یونہی ہم نے روح کو اپنے حکم سے تیری طرف وحی کیا

یہ علم روح الروح، نور النور اور لب اللب ہے۔ اس سعادت کے خواص سے ہے کہ یہ سعادت باقی رہتی ہے اور فنا وتغیر سے محفوظ و مامون ہوتی ہے کیونکہ تصورات کلیۂ متغیر و زوال پذیر نہیں ہوتے اور جب یہ سعادت فی ذاتہٖ انتہائی جلیل ہے اور ابدالآبدین ودہر الداہرین تک باقی رہتی ہے تو لامحالہ تمام سعادتوں سے اکمل واتم قرار پائے گی۔

نیز انبیاء کرام علیہم السلام دعوت الی الحق کیلئے مبعوث ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے (پ ۱۴ النحل: ۱۲۵)

ایک مقام پر فرمایا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ کہہ دیجیے یہ میرا رستہ ہے میں دعوت دیتا ہوں اللہ کی طرف علی وجہ بصیرت میں اور میرے ماننے والے

پھر ابتداء واقعہ کو لے لو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (پ ۱، البقرہ: ۳۰) میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

ملائکہ عرض کرتے ہیں:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (پ ۱، البقرہ: ۳۰) بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا جو زمین میں فساد پھیلائے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (پ ۱، البقرہ: ۳۰) مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے

اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دیگر صفات جلال قدرت، ارادہ، سمع، بصر، وجود، قدم اور مکان و جہت سے استغنا کی بجائے صفت علم کو جواب کے طور پر ذکر فرمایا اور انہیں خاموش کر دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام صفاتِ جمال و کمال انتہائی شرافت و کمال والی ہیں۔ لیکن صفتِ علم دیگر صفات کی نسبت اشرف ہے پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر فرمایا تو آپ کو مسجود ملائکہ اور دنیا میں خلیفہ بنا دیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے اس استحقاق کا سبب علم ہے۔ فرشتے تسبیح و تہلیل پر فخر کرتے تھے۔ تسبیح و تقدیس پر فخر اس صورت میں درست ہوگا۔ جب اس کے ساتھ علم بھی ہو کیونکہ علم کے بغیر ان کا حصول یا تو نفاق کا درجہ ہوگا یا تقلید محض کا اور نفاق اخس المراتب ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ بیشک منافق دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہیں

(پ ۵، النساء: ۱۴۵)

اور ایسی تقلید، مذموم ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ملائکہ کی تسبیح و تقدیس علم کی وجہ سے ہی باعثِ افتخار بنتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام پر اسمِ معصیت واقع ہوا۔ کیونکہ آپ سے ایک مسئلہ میں خطاء اجتہادی ہوئی اور اس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا اور جو چیز جس قدر زیادہ پر خطر ہوگی اسی قدر پر رونق و مشرف ہوگی۔ یہ چیز بھی فضیلتِ علم اور جلالتِ علم کو عیاں کر رہی ہے۔ نیز حضرت آدم علیہ السلام نے علم کی وجہ سے ہی توبہ و رجوع کیا، خطا پر اصرار و استکبار ترک کیا تو اجتباء و برگزیدگی کی خلعت سے نوازے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال ملاحظہ ہو۔ آپ ابتداء ہی میں طلبِ علم میں مشغول نظر آتے ہیں۔

اللہ عزوجل نے فرمایا:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا (پ ۷، الانعام: ۷۶) پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تارا دیکھا

پھر ستاروں سے چاند کی طرف اور چاند سے سورج کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کا تفکر ایک شی سے دوسری شی کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ آپ دلیل باہر اور برہان ظاہر سے مقصود تک پہنچ گئے اور شرک سے بیزاری و اعراض کا یوں اعلان فرمایا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (پ ۷، الانعام: ۷۹) میں نے اپنا منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان و زمین بنائے ایک اس کا ہو کر اور میں مشرکوں سے نہیں ہوں

اور جب آپ اس مرتبہ پر فائز ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کی مدح فرمائی اور کس طرح احسن انداز سے آپ کی

خوبی کا ذکر فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۷، الانعام:۷۵)

اور اس طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی

کسی مقام پر آپ کے درجات رفیعہ کو اس طرح ظاہر فرمایا:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ (پ۷، الانعام:۸۳)

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر عطا فرمائی ہم جسے چاہیں درجوں بلند کریں

پھر اللہ تعالیٰ مَبدء کی معرفت کے بعد معاد کی معرفت کا ذکر فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُـحْيِ الْمَوْتٰى (پ۳، البقرہ:۲۶۰)

اور جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب مجھے دکھادے تو کیونکر مُردے جلائے گا

اور جب آپ تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے۔ تاج نبوت وقباءِ رسالت زیب تن کرتے ہوئے تعلیم واتمام والزام حجت میں مشغول ہوگئے۔ کبھی اپنے چچا سے کہتے ہیں:

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ (پ۱۶، مریم:۴۲)

کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے

اور کبھی قوم سے خطاب کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ

یہ وہ مورتیاں ہیں جن کیلئے تم آسن مار کے بیٹھتے ہو

اور کبھی بادشاہِ وقت کے سامنے اعلانِ حق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ (پ۳، البقرہ:۲۵۸)

اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا تھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں۔

حضرت صالح، حضرت ہود اور حضرت شعیب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کے حالات کا مطالعہ کرو کس طرح اول تا آخر تعلیم وتعلم اور ارشادِ خلق کیلئے دلائل میں نظر وفکر میں مشغول رہے۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مکالمہ اور وجوہ دلائل ہیں اور ہمارے آقا ومولیٰ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال شریفہ پر محبت والفت کی نظر ڈالو اللہ تعالیٰ کس طرح بار بار علم کو بطور احسان ذکر فرماتا ہے

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (پ۳۰، الضحیٰ: ۷،۸)

اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کر دیا

اِس میں احسان علم کو احسان مال پر مقدم فرمایا

ایک مقام پر فرمایا:

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ

تم (از خود) نہیں جانتے تھے کتاب کیا ہے؟ اور نہ ہی ایمان جانتے تھے

پھر فرمایا:

مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا

تم اس سے پہلے اسے نہ جانتے تھے اور نہ ہی تمہاری قوم

نیز آپ کی طرف پہلی وحی ہی یہ نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (پ۳۰، العلق: ۱۔۴)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے، پڑھو تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا

اور رسول اللہ ﷺ ہمیشہ یہ دعا مانگتے: اے اللہ!

اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ

مجھے اشیاء کی حقیقتیں دکھادے جس طرح کہ وہ ہیں

اگر ہمارے ذکر کردہ دلائل عقلیہ ونقلیہ سے کسی انسان پر شرف علم ظاہر نہیں ہوتا تو اس کیلئے کسی چیز کا بھی ظاہر ہونا محال ہے نیز اللہ تعالیٰ نے کتاب حکیم میں علم کے کئی اسماء شریفہ ذکر فرمائے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (پ۲، البقرہ: ۲۴۷)

بیشک اللہ نے اسے تم پر چن لیا اور اسے علم اور جسم میں کشادگی زیادہ دی۔

اس میں علم کو جسم پر مقدم رکھا۔ ظاہر ہے کہ تمام نعمتوں سے مقصود سعادت بدنیہ ہے اور سعادتِ بدنیہ سعادت مالیہ سے اشرف ہے تو جب سعادتِ علمیہ سعادتِ بدنیہ سے اشرف ہوگی تو لامحالہ سعادتِ مالیہ پر شرف وفوقیت رکھے گی۔

حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

فضل قدیر

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ　مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردے بیشک میں حفاظت والا علم والا ہوں　(پ۱۳، یوسف:۵۵)

آپ نے یہ نہ فرمایا: میں حسیب ونسیب ہوں یا فصیح وصبیح ہوں۔

حدیث شریف میں ہے کہ آدمی کا اپنی دو چھوٹی چیزوں پر دارومدار ہے۔

۱۔دل　۲۔زبان۔زبان سے گفتگو ہوتی ہے اور مقابلہ ومقاتلہ دل سے

شاعر کہتا ہے:

لسان الفتٰی نصف و نصف فوادہٗ

فلم یبق الّا صورۃ اللّحم والدّم

(نوجوان کا نصف زبان ہے اور نصف دل ہے اس کے ماسواسب خون اور گوشت سے مرکب ایک صورت ہے)

اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کے بارے میں عذابِ جہل کو عذابِ نار پر مقدم کرتے ہوئے فرمایا:

كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ　ہاں ہاں بیشک وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم ہیں۔پھر بیشک انہیں جہنم میں داخل ہونا ہے　(پ۳۰، المطففین:۱۵،۱۶)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ علوم کا مطالعہ تین ذرائع سے ہوتا ہے:

۱۔متفکر دل　۲۔تعبیر کرنے والی زبان　۳۔تصویر کشی کرنے والا بیان

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لفظِ علم میں عین علو کی، لام لطف کی، اور میم مروت کی ہے۔

اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ علوم دس طرح کے ہیں:

۱۔　علمِ توحید، اَدیان کیلئے　۲۔　علمِ سر، رَدِّ شیطان کیلئے

۳۔　علمِ شریعت، ارکان کیلئے　۴۔　علمِ فراست، برہان کیلئے

۵۔　علمِ سیاست، سلطان کیلئے　۶۔　طب، ابدان کیلئے

۷۔علمِ رؤیا بیان کیلئے　۸۔علمِ نجوم، ازمان کیلئے

۹۔　علمِ مبارزت، فرسان (سواروں) کیلئے　۱۰۔　علمِ حقیقت، رحمٰن کیلئے

نیز علم کی مثال پانی سے بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ جل وعلانے فرمایا:

وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (پ۱،البقرۃ:۲۲) اور آسمان سے پانی اتارا

پانی چار طرح کے ہیں:

۱۔چشمے کا پانی ۲۔کنوئیں کا پانی ۳۔بارش کا پانی ۴سیلاب کا پانی

اسی طرح علوم بھی چار طرح کے ہیں:

۱۔علم توحید ۲۔علم فقہ ۳۔علم زُہد ۴۔علم بدعات

۱۔ علم توحید چشمے کی طرح ہے اسے حرکت دینا ناجائز ہے ورنہ گدلا ہو جائے گا۔اس طرح کیفیت ذات باری تعالیٰ کی معرفت طلب کرنا ناجائز ہے ورنہ کفر تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔

۲۔ علم فقہ کنوئیں کے پانی کی طرح ہے اوراستنباط کے ذریعے بڑھتا ہے جس طرح کہ کنوئیں کا پانی کھودنے سے زیادہ ہوتا ہے

۳۔ علم زہد بارش کے پانی کی طرح ہے جب اترتا ہے تو صاف وشفاف ہوتا ہے لیکن غبارے گدلا ہو جاتا ہے اسی طرح علم زہد صاف ہے جو کہ (خواہش) وطمع کی آلودگی سے مکدّر ہو جاتا ہے۔

۴۔ علم بدعت، یہ سیلاب کے پانی کی طرح ہے جو زندوں کو مارتا ہے اور مخلوق کو تباہ کرتا ہے اور یہی حال بدعات (خصوصاً اعتقادی بدعات) کا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

ساتواں مسئلہ: تعریف علم میں اقوال

۱۔ امام ابوالحسن اشعری کہتے ہیں جس کے ذریعے جانا جائے وہ علم ہے،بعض اوقات فرماتے جس کی وجہ سے کوئی ذات عالم بن جائے۔

اعتراض: عالم ومعلوم،علم سے ہی پہچانے جاتے ہیں توان دونوں سے 'علم کی تعریف' دَور ہے جو جائز نہیں۔

جواب: انسان کو اپنی ذات،تکلیف اور نفس کا علم ضروری وبدیہی ہے، یہ علم کہ وہ ان اشیاء کا عالم ہے یہ اصل علم کا علم ہے اس لیے کہ ماہیت، ماہیت مقیدہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کا یہ جان لینا کہ علم کا علم ہے ضروری ہے تو دور ساقط، اس کی مزید تفصیل اس باب میں انشاءاللہ تعالیٰ اپنے مختار قول کے تحت کریں گے۔

۲۔ قاضی ابوبکر کہتے ہیں کہ معلوم جس حال میں ہے اس کی معرفت علم ہے،بعض اوقات کہتے ہیں:علم،معرفت ہی کا نام ہے۔

اول پر اعتراض یہ ہے معرفت معلوم۔یہ علم کی معلوم کے ساتھ تعریف ہے لہٰذا یہاں بھی دور لازم ہے تو معرفت موافق معلوم ہی ہوگی اس کے بعد،جس حال پر ہے، کا تذکرہ زائد ہے۔

دوسرے پر اعتراض ہے کہ علم معرفت ہی ہے اس میں کئی طرح سے خلل ہے۔

پہلا خلل: اگر علم، نفس معرفت ہے تو شی کی تعریف بنفسہٖ لازم آرہی ہے جو محال ہے۔

دوسرا خلل: معرفت، التباس کے بعد حصول علم کا نام ہے اس لیے کہ معرفت، پہلے جہالت کا تقاضا کرتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہے۔

۳۔ استاذ ابواسحاق اسفرائنی کہتے ہیں: تفصیل معلوم علم ہے، بعض اوقات حقائق کا اظہار اور بعض اوقات تبیین کو علم کہتے لیکن یہ قول بھی ضعیف ہے۔ علم، تبیین ہے یہ تو ایک لفظ کو دوسرے انھیٰ لفظ سے تبدیل کرنا ہے اور اس لیے بھی کہ تبیین اور استبان بتارہے ہیں کہ خفاء کے بعد ظہور ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم پر فٹ نہیں آتی۔ تبیین المعلوم کو معلوم قرار دینے پر وہی اعتراضات ہوں گے جو قاضی ابوبکر کے قول پر ہوئے۔

۴۔ استاد ابوبکر بن فورک کہتے ہیں جو اس کے ساتھ متصف ہو اس کا فعل پختہ و مضبوط ہوتا ہے لیکن یہ بھی ضعیف ہے اس لیے کہ واجبات کے وجوب اور محالات کے امتناع کا علم احکام فعل کا مفید نہیں ہوتا۔

۵۔ شیخ قفال نے کہا: معلوم کا اثبات جس حال میں ہو، بعض اوقات معلوم جس حال میں ہو اس کا تصور علم کہلاتا ہے۔ سابقہ اعتراضات ان پر بھی وارد ہوں گے۔

۶۔ امام الحرمین کہتے ہیں: ماہیت علم کے تصور اور دوسرے سے امتیاز کے حوالہ سے ہم یہ کہتے ہیں ہمارے اندر بداہتہً یہ بات موجود ہے کہ ہم بعض اشیاء کا اعتقاد رکھتے ہیں اب شی میں ہمارا اعتقاد جازم ہوگا یا جازم نہیں ہوگا۔ اگر اعتقاد جازم ہے تو وہ مطابق واقع ہے یا مطابق نہیں۔ اگر مطابق ہے تو اگر سبب و موجب موضوع و محمول ہیں تو یہ علم بدیہی اور اگر موجب ان علوم ضروریہ کی ترکیب ہے تو علم نظری اور یا کوئی سبب نہیں تو یہ مقلد کا اعتقاد۔ اگر جزم مطابق واقع نہیں تو یہ جہل ہے۔

اور اگر جازم نہیں تو ان کی دونوں اطراف مساوی ہیں تو شک اگر ایک طرف دوسری سے راجح ہے تو راجح ظن اور مرجوح وہم، لیکن اس تعریف میں بھی چند طرح خلل ہے۔

پہلا خلل: یہ تعریف تب کامل ہے جب ہم یہ دعویٰ کریں کہ ماہیت اعتقاد کا ہمیں علم بداہتہً حاصل ہے، جب یہ بات کہنا جائز ہے تو ہم یہ دعویٰ کیوں نہیں کرسکتے کہ ماہیت علم کا علم بدیہی ہے۔

دوسرا خلل: علم کی تعریف اس کے اضداد کی نفی سے ہے اور ان اضداد کی معرفت، معرفت علم سے اقویٰ نہیں کہ عدم کو معرفت نقیض کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہاں بھی شی کی تعریف، بنفس شئی یا اخفی کے ساتھ تعریف لازم آجائے گی۔

تیسرا خلل: علم کبھی تصور اور کبھی تصدیق ہوتا ہے، تصور کو جزم، تردد، قوت اور ضعف لاحق ہی نہیں ہوتے جب صورت حال یہ ہے تو علوم تصوریہ اس تعریف سے خارج ہو جائیں گے۔

معتزلہ اور تعریف علم

معتزلہ کہتے ہیں: علم وہ اعتقاد ہے جو سکون نفس کا متقاضی ہو۔ کبھی وہ یہ کہہ دیتے ہیں علم وہی ہے جو سکون کا تقاضا کرے۔ لفظ سکون یہاں اگرچہ مجازاً ہے مگر جب مقصود ظاہر تو اب اس کا ذکر منافی مقصود نہیں۔

اہلِ سُنَّت کہتے ہیں: اعتقاد بطور جنس، علم کے مخالف ہے لہٰذا علم کو اعتقاد کہنا درست نہیں۔ لیکن معتزلہ کہہ سکتے ہیں بلاشبہ علم اور اعتقاد کے درمیان جو قدر مشترک ہے ہماری مراد وہی قدر ہے۔

اہلِ سُنَّت فرماتے ہیں اس سے علم الٰہی خارج ہو جائے گا کیونکہ وہاں سکونِ نفس کی بات نہیں کی جا سکتی۔

فلاسفہ اور تعریف علم

فلاسفہ کہتے ہیں: نفس میں معلوم کے مطابق صورت حاصلہ کا نام، علم ہے۔ اس تعریف میں یہ عیوب ہیں۔

پہلا عیب: لفظ صورت کا اطلاق علم پر بلاشبہ مجاز ہے۔ تلخیص حقیقت یہ بنی کہ جیسے آئینے میں صورت آتی ہے اسی طرح ذہن میں صورتِ معلوم ہوتی ہے۔

لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ جب ہم پہاڑ و سمندر کا تصور کرتے ہیں اگر دونوں ذہنوں میں آجائیں تو ذہن میں پہاڑ اور سمندر آجائے گا یہ محال ہے، اگر یہ ذہن میں خود حاصل نہیں ہوتے ان کی فقط صورت حاصل ہوتی ہے تو اب معلوم صورت ہوئی تو جس شئی کی یہ صورت ہے وہ لازماً معلوم نہ ہوگی اگر کوئی کہے ذہن میں صورت اور اس کا محل آجاتا ہے تو ذہن میں پہاڑ اور سمندر آجانے والا اعتراض لوٹ آئے گا۔

دوسرا عیب: الفاظ تعریف کا معلوم کے مطابق ہونا سے دور لازم آرہا ہے۔

تیسرا عیب: فلاسفہ کے ہاں کئی معلومات خارج میں موجود ہوتی ہیں اور کبھی موجود نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں ایسی معلومات اعتباریہ کو صور ذہنیہ اور معقولات ثانیہ کا نام دیتے ہیں تو اب اس قسم میں مطابقت، معقول ہی نہیں۔

چوتھا عیب: بعض اوقات ہم معدوم کا تصور کرتے ہیں اور یہاں یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ صورت عقلیہ، معلوم کے مطابق ہے اس لیے کہ مطابقت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں امر ثبوتی ہوں، معدوم نفی محض ہے وہاں مطابقت کا تحقق محال ہے۔

فضل قدیر

شیخ غزالی نے تعریف علم کے بارے میں فلاسفہ کی گفتگو کی وضاحت کرتے ہوئے کہا یہ باطنی بصیرت کا ادراک ہے۔ جسے ہم بصر ظاہری پر قیاس کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ بصر ظاہری کا معنی صرف یہ ہے مرئی، قوت باصرہ میں اسی طرح طبع ہوتی ہے جیسے آئینہ میں صورت کا نقش ہوتا ہے۔ جیسے بصر، مبصرات کی صورت اخذ کرتی ہے یعنی اس میں ان کی مثال جاگزیں ہوتی ہیں نہ کہ ان کا نفس عین کیونکہ عین (ذات) نارتو آنکھ میں بھی نہیں ہوتا بلکہ اس کی مثال ہوتی ہے جو اس کی صورت ہے، اسی طرح عقل کا معاملہ بھی آئینہ کی طرح ہے اس میں بھی معقولات منقش ہوتی ہیں۔ صُور معقولہ سے مراد ان کے حقائق اور ماہیات ہیں۔

آئینہ میں تین اُمور

اور آئینہ میں تین امور ہوتے ہیں۔ لوہا اور اس کا شفاف ہونا اور اس میں منقش صورت۔ اسی طرح جوہر آدمی مثل لوہا، اس کا عقل صقالت اور معلوم، صورت کی طرح ہوتا ہے۔

شیخ غزالی کا رد

لیکن غزالی کی تمام گفتگو ساقط و مردود ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ بصر ظاہری کا معنی فقط یہ ہے کہ قوت باصرہ پر صورت مرئی کا انطباع ہوتا ہے یہ ان وجوہات پر باطل ہے۔

پہلی وجہ: انہوں نے ابصار کی تعریف میں مبصر اور باصر کا ذکر لایا۔ یہ دور ہے۔

دوسری وجہ: اگر ابصار اس انطباع کا نام ہے تو پھر ہم نقطہ ناظر کی مقدار کے علاوہ کسی کو نہ دیکھ سکیں گے کیونکہ عظیم کا انطباع صغیر میں نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خارج میں شئ عظیم کے ابصار کے لیے صورت صغیر، منطبعہ شرط ہے تو ہم کہیں گے شرط، مشروط کا غیر ہوتی ہے تو ابصار، صورت منطبعہ کا غیر ہوگی۔

تیسری وجہ: ہم مرئی کو اس کے حال میں رکھتے ہیں اگر مرضی صورت منطبعہ ہے تو ہم اسے حیز و مکان میں نہ دیکھ سکیں گے ان کا کہنا عقل میں صُور معقولات منطبع ہوتیں ہیں۔ یہ بھی ضعیف ہے اس لیے عقل میں جو حرارت کی صورت مرتسم ہوتی ہے وہ ماہیت میں حرارت کے مساوی ہوگی یا نہ۔ اول صورت میں لازم آئے گا عقل تصور حرارت کے وقت حار و گرم ہو کیونکہ حار کا معنی ہی حرارت سے متصف ہونا ہے اگر دوسری صورت ہے تو اب ذہن میں ایسی ماہیت کا ہی حصول ہوگا جو ماہیت ہوگا جو ماہیت میں حرارت کے مخالف ہے اور یہ باطل ہے۔

ان کا کہنا، آئینہ میں صورتوں کا مرتسم ہونا درست نہیں تمام فلاسفہ کا اتفاق ہے کہ صورت مرئی آئینہ میں منطبع نہیں ہوتی۔ لہٰذا غزالی کی تفصیل نہ ان کے قول کے مطابق ہے اور نہ ان کے اصولوں کے موافق، لہٰذا یہ تمام تعریفاتِ علم باطل ٹھہریں۔

علم کی مختار تعریف

یاد رہے کسی شی کی تعریف سے عجز کبھی مطلوب میں بہت ہی زیادہ خفا کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی شی کے نہایت ہی واضح و آشکار ہونے کی وجہ سے کہ اس سے کوئی زیادہ معروف شئی نہیں ہوتی جس سے اس کی تعریف کی جائے۔ تعریف علم سے عجز اس دوسری وجہ سے ہے۔ حق یہی ہے کہ ماہیتِ علم، تصور بدیہی کی شکل میں آشکار و متصور ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف کی ضرورت ہی نہیں

اس پر دلیل یہ ہے کہ ہر آدمی بدیہی طور پر اپنے آپ کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں آسمان پہ نہیں اور نہ ہی سمندر کی تہوں میں۔ اور اسے ان اشیاء کے عالم ہونے کا علم بدیہی ہے، ان علوم سے اپنی ذات کے متصف ہونے کا علم ہے۔ ایک شئی کی دوسری شی کی طرف نسبت کرنے کا۔ عالم، بالیقین دونوں اطراف کا عالم ہوتا ہے جب اس منسوب کرنے کا علم بدیہی حاصل ہے تو ماہیت علم کا علم ضروری بھی حاصل ہوگا تو جب معاملہ یوں ہے تو علم کی تعریف محال ہے ہاں اس قدر گفتگو یہاں کافی ہے باقی تحقیقات کتب منطق میں موجود ہے

آٹھواں مسئلہ، علم کے مترادف الفاظ کا بیان

علم کے مترادف الفاظ کی تعداد تیس ہے:

۱۔ ادراک۔ ملاقات و وصول، محاورہ ہے: ادرك الغلام (غلام پالیا) ادرکت الثمر (پھل حاصل ہوگیا) ارشاد الٰہی ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا:

اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (پ۱۹، الشعراء:۶۱) ہم تو پالیے گے

تو قوت عاقلہ، جب ماہیت معقول تک پہنچ کر اسے حاصل کر لیتی ہے تو یہ قوت اس جہت سے ادراک کہلاتی ہے۔

۲۔ شعور۔ یہ بغیر پختگی کے ادراک ہے۔ یہ قوت عاقلہ تک معلوم کے پہنچنے کا اول مرتبہ ہے گویا یہ ادراک متزلزل ہوا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ''شعر کذا'' نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ کہا جاتا ہے: یعلم کذا

۳۔ التصور۔ جب قوت عاقلہ معنی پالے اور تمام کا ادراک کرے تو یہ تصور ہے۔

واضح رہے تصور کا لفظ صورت سے ہے، صورت کی وضع اس حالت جسمانی کے لیے ہے جو جسم متشکل کو حاصل ہوتی ہے۔ مگر لوگوں نے جب خیال کیا کہ حقائق معلومات، قوت عاقلہ میں اس حالت پہ ہوتے ہیں جس طرح شکل و ہیئت، مادہ جسمانی میں حلول کر جاتے ہیں تو انہوں نے اس تاویل کی بنا پر لفظ تصور کا اطلاق کیا ہے۔

۴۔ الحفظ۔ جب صورت عقل میں حاصل ہو کر اسی طرح خوب مستحکم اور پختہ ہوگئی کہ اگر وہ زائل ہو جائے تو قوت عاقلہ اسے واپس لے آئے اسی حالت کو حفظ کہا جاتا ہے، جب حفظ میں ضعف کے بعد تاکید و پختگی ہے تو بالیقین علم الٰہی کو حفظ نہیں کہہ سکتے دوسری وجہ یہ ہے کہ حفظ کی محتاجی کیلئے زوال کا جائز ہونا ضروری ہوتا اور یہ چیز علم الٰہی میں محال ہے تو اسے حفظ کا نام نہیں دیا جاسکتا

۵۔ التذکر۔ عقل میں صورت محفوظ جب زائل ہو جائے اور ذہن اسے لوٹانے کا ارادہ کرے تو یہ ارادہ تذکر کہلاتا ہے۔

یاد رہے لفظ تذکر میں ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تذکر ذہن کا محو اور مٹی ہوئی صورت کو واپس لانا ہے اب اگر اس صورت کا شعور ہے تو وہ ذہن اس سے غافل ہوگا جب غافل ہے تو اس کے لوٹانے کا طالب ہونا محال اس لیے کہ جو متصور ہی نہیں۔اسے طلب کرنا محال ہوتا ہے۔

تو دونوں صورتوں میں مذکور تذکر کی واپسی کی طلب محال ہے حالانکہ ہم اپنے اندر یہ بات پاتے ہیں کہ ہم اسی صورت کو طلب بھی کرتے ہیں اور اسے پاتے بھی ہیں۔

ان اسرار میں جب عاقل ڈوب کر خوب غور کرتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم اس تذکر کی کنہ پا ہی نہیں سکتے حالانکہ لوگوں کے ہاں یہ بڑی آشکار و ظاہر شئی ہے تو ان اشیاء کے بارے میں کہا جاسکتا ہے جو عقول و اذہان پہ تمام سے مخفی اور مشکل ہیں۔

۶۔ الذکر۔ صورت زائلہ کی واپسی کا جب ارادہ کیا ہو اور وہ اس طلب کے بعد لوٹ کر حاضر ہوگی تو اس وجدان کا نام ذکر ہے اب اگر پہلے ادراک کا زوال نہ ہوتا تو ایسے ادراک کو ذکر نہ کہا جاتا۔اس لیے شاعر نے کہا:

فاللہ یعلم أني لست أذکرہ و کیف أذکرہ اذ لست أنساہ

(تو اللہ جانتا ہے کہ میں نے اسے یاد نہیں کیا اور میں اسے یاد کروں جبکہ میں اسے بھولا ہی نہیں ہوں)

تو شاعر نے حصولِ نسیان کو حصول ذکر کیلئے شرط قرار دیا اور قول کو ذکر قرار دیا کیونکہ یہ نفس میں حصولِ معنی کا سبب بن رہا ہے،ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (پ۱۴،الحجر:۹) ہم نے قرآن کو اُتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں

اہم تفسیری نکتہ

یہاں اہم تفسیری نکتہ ہے ارشاد الٰہی ہے:

فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (پ۲،البقرہ:۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا

بندہ کیلئے یہ حکم حالت نسیان میں ہے یا زوالِ نسیان کے بعد۔

اگر اول صورت ہے تو وہ حالت نسیان میں غافل ہے تو اس حالت میں یہ حکم اسے کیسے ہو سکتا ہے اور دوسری صورت ہے تو وہ ذاکر ہے اور ذکر حاصل اور تحصیل حاصل محال تو انسان کو اس بات کا حکم کیسے دے دیا؟ اور یہی اشکال اس فرمان الٰہی کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (پ۲۶، محمد:۱۹) جان لو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

فاعلم، (یقین رکھو) میں تو جواب یہ ہے کہ یہاں حکم معرفت توحید کا ہے اور اس کا تعلق باب تصدیق سے ہے۔ لہٰذا اس پر اشکال نہیں ہاں ذکر، تو تصورات میں سے ہے۔ لہٰذا یہاں اشکال قوی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یاد پہ قدرت پاتے ہیں۔ اور جب یہ ممکن ہے تو جو کچھ تم نے بصورت اعتراض کہا یہ ضروریات میں تشکیک پیدا کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ جواب کا مستحق ہی نہیں۔ ہاں یہ کہنا باقی رہ جاتا ہے کہ تذکر کی کیفیت کیا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کیفیت سے ہم آگاہ نہیں۔

ایک اور راز

بلکہ یہاں ایک راز ہے کہ جب تم یاد و ذکر کی ماہیت جاننے سے عاجز ہو حالانکہ یہ تمہاری صفت ہے تو تمہارے لیے مذکور (اللہ تعالیٰ) کی کنہ و حقیقت سے آگاہی کیسے ممکن ہو سکتی ہے حالانکہ وہ مناسبت کے اعتبار سے تم سے سب سے دور ہے تو پاک ہے وہ ذات جس نے سب سے ظاہر کو سب سے مخفی کر دیا تاکہ اس کے ذریعے اس کی کنہ سے عاجز اور اپنی شرح کو انتہائی کوتاہ مانے اور اس کی تقادیر کے اسرار کے مطالعہ سے اس کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کرے۔

۷۔ تفسیر معرفت میں اقوال

المعرفت۔ اس لفظ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں

۱۔ معرفت، ادراکِ جزئیات اور علم ادراکِ کلیات ہے۔

۲۔ کچھ کہتے ہیں معرفت، تصور اور علم، تصدیق ہے اور یہ عرفان کو علم سے اعظم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ہماری یہ تصدیق کہ تمام محسوسات کی نسبت واجب الوجود کی طرف ہے۔ بداہتہً معلوم ہے۔ رہا واجب کی حقیقت کا تصور وہ انسانی طاقت سے باہر ہے دوسری بات یہ ہے کہ جب تک کسی کا وجود معلوم نہ ہوگا اس کی ماہیت، طلب ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس پر ہی کہا جاتا ہے کہ ہر عارف عالم ہوتا ہے مگر ہر عالم، عارف نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے عارف وہی شخص کہلا سکتا ہے جو علم کے میدانوں میں طاقت بشری

کے مطابق مستغرق، ان کی ابتداء سے انتہاء تک اور ان کے مبادی سے غایات تک کا علم رکھنے والا ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اس کی ذات کی کنہ اور اس کی الوہیت راز پانا محال ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس نے کسی شی کا ادراک کیا اور اس کا اثر اپنے اندر محفوظ کر لیا پھر اس شی کو اس نے دوبارہ جان کر معلوم کر لیا یہ وہ پہلی ہی چیز ہے جس کا ادراک ہوا تھا اسے معرفت کہا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے: میں نے اس آدمی کو پہچان لیا، یہ وہی ہے جسے میں نے فلاں موقع پر دیکھا تھا۔

کچھ لوگ ارواح کو قدیم، کچھ انہیں ابدان سے مقدم مان کر کہتے ہیں۔ انہیں جب صُلب آدم علیہ السلام سے نکالا گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور ربوبیت کا اعتراف واقرار کیا۔ جب ان کا ظلماتی بدن سے تعلق بنا تو یہ اپنے مولیٰ کو بھول گئیں تو جب انہوں نے ظلمت بدن اور جسم کی کھائی سے نجات پائی تو انہوں نے اپنے رب کی معرفت پائی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم اس کی عارف تھیں تو بالیقین اسی ادراک کو عرفان کہا جاتا ہے۔

۸۔ الفهم۔ شئ کا الفاظ مخاطب سے تصور۔ افہام فہم سامع تک معنی کا لفظ کے ساتھ اتصال ہے۔

۹۔ الفقه۔ کسی کے خطاب کی غرض کا علم، جب کوئی کسی کی غرض وغایت پالیتا ہے تو کہتا ہے فقهت کلامك (میں نے تمہارا کلام سمجھ لیا ہے) کفار قریش صاحب شبہات وخواہشات تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں منافع عظیمہ سے واقف نہ ہو پائے تو ارشاد الٰہی ہوا:

لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا (پ ۱۶، الکهف: ۹۳) کوئی بات سمجھتے معلوم نہ ہوتے

یعنی وہ مقصود اصلی اور غرض حقیقی سے آگاہ نہ ہوئے۔

۱۰۔ العقل۔ یہ صفات اشیاء مثلاً حسن وقبح اور کامل وناقص کا علم ہے، جب تمہیں ان اشیاء میں موجود منافع اور خسارہ کا علم ہوگا تو ان میں موجود نفع اسے بجالانے کا داعی وسبب بن جائے گا، اسی طرح اگر ان میں ضرر رسانی ہے تو وہ اس کے ترک کا داعی و سبب ہوگا تو یہ علم بھی فعل سے مانع اور کبھی اس کے ترک سے مانع ٹھہرا تو یہی علم، عقال ناقہ (اونٹنی کی نکیل) کی طرح قرار پایا، اسی لیے جب کسی صالح سے عقل کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا اشیاء کے خیر وشر کا علم ہے پوچھا عاقل کون؟ فرمایا:

مَنْ عَقَلَ عَنِ اللّٰهِ اَمْرَهٗ وَ نَهْيَهٗ جو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی پہ رک جائے

اس کے مقام کے لائق یہی گفتگو ہے۔ تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

۱۱۔ الـدرایة ۔ جو کسی حیلہ وطریقہ سے معرفت حاصل ہو، یہ مقدمات کی تقدیم اور استعمال رؤیت ہے۔اس کی اصل دریت الصید والدریة۔ ہے کیونکہ اس سے نشانہ کا علم ہوتا ہے، ذریعہ اصلاح شعر کو مدری کہا جاتا ہے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا فکروحیلہ کرنا محال ہے۔

۱۲۔ الحکمة۔ یہ ہر خوبصورت علم اور عمل صالح کا نام ہے۔ یہ علم عملی بھی نظری علم سے خاص ہے اس کا استعمال بجائے علم کے عمل میں زیادہ ہے۔ پختہ عمل کو کہا جاتا ہے:أحکم العمل احکامًا حکم بکذا حکمًا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے مراد یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کیلئے دنیاوی اور اُخروی نفع پیدا کردیا ہے اور بندوں کی حکمت بھی یہی ہے۔

حکمت کی تعریف

تعریف حکمت مختلف الفاظ سے کی گئی ہے، مثلاً

۱۔ مَعْرِفَةُ الْاَشْيَاءِ بِحَقَائِقِهَا — اشیاء کو ان کے حقائق کے ساتھ جاننا

اس میں یہ اشارہ ہے کہ ادراکِ جزئیات بڑا کمال نہیں کیونکہ یہ ادراکات بدل جاتے ہیں البتہ ادراکِ ماہیئت تبدیل وتغیر سے محفوظ رہتا ہے۔

۲۔ اَلْاِتْيَانُ بِالْفِعْلِ الَّذِیْ عَاقِبَتُهٗ مَحْمُوْدَةٌ — اس فعل کو بجالانا جس کا انجام اچھا ہو۔

۳۔ اَلْاِقْتِدَاءُ بِالْخَالِقِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی فِی السِّيَاسَةِ بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ — بقدرِ طاقت انسانی اپنے خالق کی تدبیر کی اقتدا کرنا۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کے علم کو جہالت سے، اس کے فعل کو ظلم سے، اس کی سخاوت کو بخل سے اور اس کے حلم کو سفہ سے پاک مانے۔

۱۳۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ۔اہل علم کے نزدیک یقین یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ شئی یوں ہی ہے اور اس کا خلاف محال ہے تو اب اس اعتقاد کا سبب بداہت فطرت ہوگا یا عقل۔

۱۴۔ الذھن۔ نفس کی قوت جو غیر حاصل کو، حاصل کرلے، تفصیل کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو تحقیق وعلم اشیاء سے خالی پیدا کیا، ارشاد الٰہی ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا (پ۱۴، النحل:۷۸) — اور اللہ نے تمہیں ماؤں کے بطن سے اس طرح نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے

اللہ تعالیٰ نے چونکہ اسے اپنی عبادت وطاعت کیلئے پیدا کیا، فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کیلئے پیدا کیا

(پ۲۷، الذریات:۵۶)

اور طاعت کیلئے علم شرط ہے، دوسرے مقام پہ فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (پ۱۶، طہٰ:-۱۴۱) میرے ذکر کیلئے نماز قائم کرو

تو واضح ہو گیا حکمِ طاعت کی غرض علم ہے تو علم کا ہر حال میں ہونا ضروری قرار پایا۔ تو ضروری تھا نفس ان معارف و علوم کے حصول پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ نے اسے حواس عطا فرمائے جو ان کے حصول پر اس کے معاون بن جائیں، سماعت کے بارے میں فرمان ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (پ۳۰، البلد:۱۰) اور اسے دو اُبھری ہوئی چیزوں کی راہ بتائی

بصر کے بارے میں ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ — ہم عنقریب اپنی اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور ان کے نفوس میں (پ۲۵، فصلت:۵۳)

فکر کے حوالہ سے فرمایا:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (پ۲۶، الذریات:۲۱) اور خود تم میں تو کیا سوجھتا نہیں تمہیں

جب یہ قویٰ معاون بنتے ہیں تو جاہل روح، عالم بن جاتی ہے، اس ارشادِ باری تعالیٰ کا یہی مفہوم ہے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (پ۲۷، الرحمٰن:۱،۲) رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا

حاصل یہ ہے کہ ان معارف کے حصول کی نفس استعداد، ذہن ہے۔

۱۵۔ الفکر۔ روح کا تصدیقات موجودہ سے تصدیقات متحضرہ کی طرف منتقل ہونا ہے، بعض محققین نے کہا: فکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسلسل اس سے نزول علوم کے بارے میں تضرع کرتی ہے۔

۱۶۔ الحدس۔ فکر کا عمل تب تام ہوتا ہے کہ وہ مجہول کے اطراف کے درمیان نسبت کو پالے تاکہ نسبت غیر معلوم معلوم ہو جائے۔ اس لیے کہ نفس، حالت جہالت میں گویا تاریکی میں کھڑا ہے اس کے چلانے کیلئے کسی قائد کی ضرورت ہے جو طرفین کے درمیان میں ہے اور اسے ان دونوں کے ساتھ خصوصی نسبت ہے تو ان دونوں کی طرف نسبت سے دو مقدمے

سامنے آئیں گے تو ہر مجہول وغیرہ کا علم دو معلوم مقدمات کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ دو مقدمات دو گواہوں کی طرح ہیں۔

شرع میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے اسی طرح عقل میں دو گواہ لازم ہیں اور یہی مقدمات آدمی کو نتیجہ تک پہنچا دیتے ہیں تو نفس کی اس متوسط کو پانے کی استعداد حدس کہلاتی ہے۔

۱۷۔ الذکاء۔ یہ حدس کی شدت، کمال اور انتہائی درجہ پر ہوتا ہے، اس لیے کہ ذکاء فیصلہ کر گزرنا اور حق کو جلدی پالینا ہے۔ اس کا اصل ہے ذکت النار (آگ کا خوب جلنا) ذکت الریح (ہوا کا تیز چلنا) شاۃ مذکاۃ (تیز چھری سے ذبح بکری)۔

۱۸۔ الفطنۃ۔ اشارہ کردہ بات کو پالینا۔ یہی وجہ ہے اس کا استعمال اکثر حوائج اور رُموز کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۔ الخاطر۔ حصول دلیل کی طرف نفس کا حرکت کرنا۔ حقیقت میں وہ معلوم ہی دل میں خاطر اور نفس میں حاضر ہوتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: یہ میرے بعد آیا ہے چونکہ نفس اس معنی خاطر کا محل ہوتا ہے اس لیے اسے خاطر کہا تو یہ حال کا محل پر اطلاق ہے۔

۲۰۔ الوھم۔ اعتقادِ مرجوح۔ بعض اوقات اشخاص جزئیہ جسمانیہ کے غیر محسوس اُمور جزئیہ کے حکم کو وہم کہا جاتا ہے، مثلاً خلوص مال پر عیب اور موذی پر عداوت کا حکم لگانا۔

۲۱۔ الظن۔ اعتقادِ راجح۔ جب قبول اعتقاد، قوت وضعف کی وجہ سے منضبط نہیں اسی طرح مراتب ظن کا بھی حال ہے اس لیے اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے قلبی اعتقاد کی دونوں اطراف میں سے ایک کا راجح ہونا اور دوسری طرف کا جواز ہو، پھر ظن پر جو قوت میں متناہی ہے علم کا اطلاق ہوتا ہے لہٰذا ظن کا بھی علم پر اطلاق ہوگا جس طرح بعض مفسرین نے اس ارشاد الٰہی کے تحت کہا:

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (پ۱، البقرۃ:۴۶) وہ لوگ جنہیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین تھا

ظن کے اطلاقِ علم پر انہوں نے دو وجہ ذکر کی ہیں:

۱۔ اس پر توجہ دلانا ہے کہ اکثر لوگوں کا دنیاوی علم، اُخروی علم کی نسبت اس طرح ہے جیسے ظن مشابہ علم۔

۲۔ علم حقیقی دنیا میں فقط انبیاء اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (پ۲۶، الحجرات:۱۵) وہ جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر پھر تردد کا شکار نہ ہوئے

یاد رہے اگر ظن، قوی دلیل کی بنا پر ہے تو اسے قبول اور قابلِ تعریف قرار دیا جائے گا، اس علم کے احوال کا اکثر مدار اسی پر ہے

اور اگر دلیل کمزور ہے تو اس کی مذمت ہوگی، ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (پ۲۷، النجم:۲۸) بیشک گمان حق کو کوئی کام نہیں دیتا

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (پ۲۶، الحجرات:۱۲) بعض گمان گناہ ہے

۲۲۔ الخیال ۔غیبت کے بعد محسوس کی صورتِ باقی کا نام ہے۔خواب اور بیداری میں اس صورت کو خیال کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔الطیف الوارد من صورۃ المحبوب خیالاً ۔ہاں طیف صرف حالت نیند ہی کی صورت کا نام ہوگا۔

۲۳۔البداھت۔ ابتدأ نفس میں بلا فکر حصول کا نام ہے، مثلاً ہمیں یہ علم ہے۔واحد، دو کا نصف ہے۔

۲۴۔ الاولیات۔ یہ بھی بعینہٖ بدیہات ہیں۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ ذہن اولاً ہی محمول قضیہ موضوع کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے اور اس میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جو دوسری شئی کے توسط سے ہے وہ متوسط ہی اولاً محمول ہوتا ہے۔

۲۵۔ الرؤیۃ۔ فکر کثیر کے بعد حاصل معرفت ہے اور یہ روی سے مشتق ہے۔

۲۶۔ الکیاسۃ۔ نفس کا نفع کے استنباط پہ قادر ہونا۔اسی لیے حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ عقل مند وہی ہے جو اپنے نفس کو سمجھے اور موت کے بعد کی تیاری کرے

اس لیے کہ موت کے بعد انسان کو جو خبر ملتی ہے اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔

۲۷۔ الخبرۃ ۔بطریق تجربہ حصول معرفت ۔حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وجدت الناس أخبر تقله ۔عرب کا قول ناقۃ خبرۃ ۔(عمدہ دودھ والی) گویا خبر عمدہ معرفت ۔یہ بھی ممکن ہے جملہ اس کی عمدگی پر دال ہو۔

۲۸۔ الرائ ۔ان مقدمات میں دل کا احاطہ جن سے مطلوب کی امید ہو، کبھی نتیجہ خبر قضیہ کو رای کہہ دیا جاتا ہے۔رائے، فکر کیلئے صانع کے آلہ طرح ہے، اس لیے محاورہ ہے: ''ایاك والرأی الفطیر، دع الرای نصب '' (رائے ترک کر کے صواب پالو)

۲۹۔ الفراسۃ ۔خُلق ظاہر سے خُلق باطن پہ استدلال۔اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ استدلال کے صدق پہ توجہ دلائی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (پ۱۴، الحجر:۷۵) بیشک اس میں فراست والوں کیلئے نشانیاں ہیں

تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ (پ۳، البقرۃ:۲۷۳) تم ان کی پیشانیوں سے انہیں پہچان لوگے۔

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (پ۲۶، محمد:۳۰) اور ضرور تم انہیں بات کے اسلوب سے پہچان لوگے

یہ فرس السبع الشاۃ (بکری کو درندے نے اچک لیا) سے ہے۔گویا فراست، معرفت کا اُچک لینا ہے۔

اس کی دوصورتیں ہیں، ایک یہ کہ انسان کے دل میں بلاسبب بات آجاتی ہے یہ الہام بلکہ وحی کی قسم ہے، اسی بات کو حضور ﷺ نے یہاں مراد لیا ہے:

اِنَّ فِیْ اُمَّتِیْ لَمُحَدَّثِیْنَ وَاِنَّ عُمَرَ لَمِنْهُمْ — میری اُمت میں سے کچھ الہام پاتے ہیں اور عُمر ان میں سے ہیں

تو اسے دل میں بات ڈالنا کہا گیا ہے۔

دوسری فراست کی صورت سیکھی گئی ہوتی ہے اور وہ اشکال ظاہرہ سے اخلاق باطنہ پر استدلال ہے، اہلِ معرفت نے ارشادِ الٰہی

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ — تو کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس پر اللہ کی طرف سے گواہ آئے (پ۱۲، ہود:۱۷)

کے تحت کہا ہے: بینة۔ قسم اول ہے جو صفائی جو ہر روح کی طرف اشارہ ہے اور شاهد۔ دوسری قسم ہے جو اشکال سے احوال پر استدلال ہے۔

نواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ پر معلم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

ارشادِ الٰہی:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، کی اس پر دلالت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلم کہا جائے کیونکہ لفظ معلم جس طرح متعارف ہے کہ جو تعلیم و تلقین سے حاصل کرے اس حوالہ سے اس کا اطلاق اللہ پہ محال ہے۔ جیسے مدرس کو ہر حال میں معلم نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ اگر کسی نے متعلمین کیلئے وصیت کی تو اس میں مدرس شامل نہ ہوگا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی بغیر کسی قید معلم نہیں کہا جاسکتا اگر یہ معروف معنی نہ ہوتا تو معلم کا اطلاق اللہ تعالیٰ پہ خوبصورت بلکہ لازم تھا کہ صرف اس کے کیلئے ہی یہ لفظ استعمال ہو۔ اس لیے کہ معلم وہ ہوتا ہے جو دوسرے میں علم پیدا کردے اور یہ قوت و قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

[۳۲-۳۳] قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

(بولے پاکیزگی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے، فرمایا اے آدم بتادے انہیں (سب اشیاء کے) نام جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتادیے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں زمین و آسمان کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو)

معصیت کا قول کرنے والے

جولوگ یہ مانتے ہیں کہ ملائکہ نے ''اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا'' کہہ کر معصیت کا ارتکاب کیا ان کا کہنا یہ ہے جب انہوں نے اپنے سوال کو خطا پایا تو اس سے رجوع کرتے ہوئے توبہ کی اور اپنی خطا پر معذرت چاہتے ہوئے کہا:

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا پاک ہے تیری ذات ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا

عصمت ماننے والے

جوان سے معصیت نہیں مانتے انہوں نے ''قَالُوْا سُبْحٰنَكَ'' میں دو وجہیں بیان کی ہیں:

۱۔ انہوں نے یہ بطور اعتراف عجز و تسلیم کہا کہ وہ سوال کردہ اشیاء کا علم نہیں رکھتے۔ اس لیے کہا: ہم نہیں جانتے مگر تو نے جو ہمیں سکھایا جب تو نے یہ ہمیں سکھایا ہی نہیں تو اسے ہم کیسے جانیں؟

۲۔ ملائکہ نے ''اَتَجْعَلُ فِيْهَا'' اس لیے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ بتادیا تھا گویا انہوں نے عرض کیا: جب تو نے ہمیں بتادیا یہ زمین پر فساد اور خون بہائیں گے تو ہم عرض کرتے ہیں: کیا تو انہیں بنارہا ہے جو زمین میں فساد پھیلائیں گے۔ رہے یہ اسماء تو نے ہمیں ان کے بارے جب آگاہ ہی نہیں کیا تو انہیں کیسے جان سکتے ہیں؟

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: معارف اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں

اہل سنت نے ارشادالٰہی 'لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا' سے اس پہ استدلال کیا ہے کہ معارف، اللہ تعالیٰ کی ہی مخلوق اور پیدا کردہ ہیں۔

معتزلہ کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ ہمیں ان کا علم اس کی طرف سے ہی ہے خواہ تعلیم سے یا قیام دلیل سے ہے۔

جواب: تعلیم دوسرے میں حصولِ علم کا نام ہے جیسے تسوید، دوسرے میں حصول سیاہی ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تعلیم افادہِ امر ہے جس پہ علم مرتب ہے بشرطیکہ شرط حاصل اور مانع کی نفی ہو، اس لیے محاورہ: علمته فما تعلم ۔ جس امر پر علم مرتب ہے وہ نصبِ دلیل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے اس لیے کہ وجود علم میں موثر، ذات دلیل نہیں بلکہ نظر فی الدلیل ہے اور نظر بندے کا فعل ہے لہٰذا علم کا حصول تعلیم الٰہی سے نہ ہوا تو یہ، لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، کے متضاد ہے۔

دوسرا مسئلہ: غیب اور تعلیم الٰہی

اہلِ اسلام نے اسی آیت سے یہ بھی استدلال کیا کہ غیوب کی معرفت تعلیمِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں اور انہیں علم نجوم، کہانت اور عرافہ کے ذریعے نہیں حاصل کیا جا سکتا، اس کی نظیر یہ ارشاد الٰہی ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (پ۷، الانعام:۵۹)

اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں اسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (پ۲۹، الجن:۲۶،۲۷)

وہ غیب کو جاننے والا ہے اور کسی پر غیب کو ظاہر نہیں کرتا مگر رسولوں میں سے جسے منتخب کر لے

کوئی نجومی، معتزلی سے کہہ سکتا ہے جب تم نے تعلیم کی تفسیر نصبِ دلائل سے کی ہے تو میرے ہاں حرکاتِ نجوم ایسے دلائل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس علم کے احوال کیلئے پیدا کیا، جب میں ان سے استدلال کرتا ہوں تو یہ بھی تعلیمِ الٰہی سے ہی ہوگا۔

یہاں یہ کہنا بھی ممکن ہے جب ملائکہ معرفتِ غیوب سے عاجز ہیں تو اس سے ہمارا عجز بطریق اولیٰ ہوگا۔

تیسرا مسئلہ: اَلْعَلِیْمُ کی تفسیر

یہ علم میں صفت بطور مبالغہ تامہ ہے، حصول مبالغہ تامہ کیلئے تمام معلومات کا احاطہ ضروری اور یہ شان صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہے۔ بالیقین علیم کامل وہی ہے اس لیے بطور حصر فرمایا:

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ بلاشبہ تو ہی علیم وحکیم ہے

چوتھا مسئلہ: حکیم کا استعمال

حکیم کا استعمال دو صورتوں پر ہوتا ہے:

۱۔ بمعنی علیم، تو یہ صفات ذات میں سے ہوگا، اس تفسیر پر ہم کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ازلاً حکیم ہے۔

۲۔ وہ ایسے فعل کا فاعل ہو جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اب یہ صفاتِ فعلیہ میں سے ہوگا۔ اب ہم اُسے ازلاً نہیں کہہ سکتے۔

اقرب یہاں دوسرا معنی ہی ہے ورنہ تکرار لازم آجائے گا۔

گویا ملائکہ نے کہا تو تمام معلومات کا عالم ہے تیرے لیے تعلیمِ آدم ممکن ہے اور تیرا یہ فعل سراپا حکمت وصواب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔ ملائکہ کی حکیم سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنانا نہایت ہی درست فیصلہ ہے۔

پانچواں مسئلہ: اشیاء اور علم الٰہی

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام سے اسماء کے نام بتانے کا فرمایا اور انہوں نے بتا دیے جب بتا چکے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا کہ میں ہی جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کے غیب

اس غیب سے مراد اللہ تعالیٰ کا تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے ان کے احوال سے آگاہ ہونا ہے۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ان کا علم رکھتا ہے، اس سے ہشام بن الحکم کا یہ مذہب باطل قرار پا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وقوعِ اشیاء سے پہلے ان کا علم نہیں رکھتا۔

سوال: ایمان، علم کا ہی نام ہے تو ارشادِ مبارک "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" بتا رہا ہے کہ بندے غیب کا علم رکھتے ہیں تو پھر اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کیوں فرما دیا ہے یہ تو بتا رہا ہے کہ علم غیب میرے لیے ہی ہے اور میرے سوا ہر کوئی علم غیب سے خالی ہے

اس کا جواب 'اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ' کے تحت آچکا ہے۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کی تفسیر

(میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو)

اس کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ امام شعبی نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے نقل کیا: اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ سے مراد ملائکہ کا قول، اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا اور وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے مراد ہے جو ابلیس نے اپنے اندر تکبر اور سجدہ نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

۲۔ یہ الفاظ اِنِّىْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر ہے یعنی میں ان امور غائبہ اور اسرار مخفی کو جانتا ہوں جن کے بارے میں ظاہراً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی مصلحت ہی نہیں چونکہ میں اسرار غیبی کا علم رکھتا ہوں لہٰذا ان کی تخلیقی مصلحت سے بھی خوب آگاہ ہوں۔

۳۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، ملائکہ نے ان کی خلقت عجیب پائی تو کہنے لگے: ہو جائے گا جو وہ چاہے گا، ہمارا رب جو بھی خلق فرمائے ہم اس کے ہاں اس مخلوق سے معزز ہی ہوں گے۔ لیکن یہ قول انہوں نے مخفی رکھا۔

یہ بھی ممکن ہے اس قول کو انہوں نے آپس میں مخفی رکھا مگر بعض نے دوسرے سے کہہ دیا۔ لیکن دوسروں سے مخفی رہا گویا ایک فعل میں اظہار بھی ہے اور خفا بھی۔

۴۔ پانچ اقسام کا بیان

حکماء کا قول ہے، اقسامِ اشیاء پانچ ہیں۔ شئی خیر محض یا شر محض یا دونوں کا اجتماع، امتزاج کی صورت میں دونوں کا اعتدال پہ ہونا یا خیر کا غلبہ یا شر کا غلبہ۔ خیر محض کی ایجاد، حکمت کا تقاضا ہے جس میں خیر کا غلبہ ہے، اس کی ایجاد بھی حکمت کا تقاضا ہے کیونکہ خیر کثیر کو شر قلیل کی وجہ سے ترک کر دینا شر کثیر ہے۔

ملائکہ نے شر و فساد کا تذکرہ کیا جو انسان سے حاصل ہونے والی خیرات کے مقابل شر قلیل ہے تو فرمایا: اِنِّىْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی میں جانتا ہوں کہ ان کا خیر ان کے شرور پہ غالب ہے لہٰذا حکمت ان کے ایجاد و تکوین کا تقاضا کر رہی ہے۔

چھٹا مسئلہ، خوف عظیم اور فرحت عظیم

اس آیت میں خوف عظیم اور فرحت عظیم ہے، خوف یوں کہ اللہ تعالیٰ پر احوالِ ضمائر و قلوب سے بھی کوئی شئی مخفی نہیں۔ لہٰذا آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے باطن کی طہارت پر خوب محنت کرے، اس کا یہ وطیرہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ان گناہوں کو ترک کرے

جن پہ مخلوق مطلع ہوتی ہے اوران گناہوں کوترک نہ کرے جن پہ خالق مطلع ہے، یہ احادیث اسی معاملہ کوخوب اجاگر کررہی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر گناہوں سے رکنا

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روز قیامت کچھ لوگوں کولا کر جنت لے جانے کاحکم ہوگا۔جب وہ جنت کے قریب پہنچ کراس کی خوشبو پائیں گے،اس کے محلات اوراہل جنت کیلئے اللہ تعالیٰ کے تیارکردہ انعامات دیکھ لیں گے۔آواز دی جائے گی انہیں واپسی لاؤان کا جنت سے کوئی حصہ نہیں تووہ ایسے موقعہ پرحسرت والوں کی طرح حسرت لیے واپس لوٹیں گے۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے: کاش تو ہمیں اپنے دوستوں کیلئے تیارکردہ انعامات وثوابات دکھانے سے پہلے دوزخ میں داخل فرمادیتا تو یہ ہمارے اُوپر معاملہ آسان ہوتا۔آواز دی جائے گی تمہارے لیے یہی میراارادہ تھاتم جب تنہا ہوتے توبڑے بڑے دعوؤں سے میرامقابلہ کرتے اورجب تم لوگوں میں ہوتے توبڑی محبت، عجزاورریاکاری کرتے،ان سے ملتے حالانکہ دلوں میں اس کے خلاف مخفی ہوتا،تم لوگوں سے ڈرتے مگرمجھ سے نہ ڈرتے،تم لوگوں کوبڑا سمجھتے اورمجھے بڑانہ سمجھتے،تم نے لوگوں کی خاطرمعاصی چھوڑے مگرمیری خاطرنہیں چھوڑتے حالانکہ میں تمہیں سب سے زیادہ دیکھنے والا تھا۔آج میں تمہیں دردناک عذاب چکھارہاہوں اورتم پرمیں نے اپنی نعمتیں حرام کردی ہیں۔ (المعجم الاوسط،۵۴۷۸)

۲۔ سلیمان بن علی علیہ الرحمۃ نے حضرت حمید طویل رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: مجھے نصیحت کیجئے۔فرمایا: اگرتم نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی یہ خیال کرتے کہ وہ تجھے دیکھ رہاہے توتونے بہت بڑی جسارت کی اوراگرتیراخیال یہ تھا کہ وہ نہیں دیکھ رہاتویہ تونے کفرکیا

۳۔تین احوال میں نفس کا خیال

شیخ حاتم اصم فرماتے ہیں: تین احوال میں اپنے نفس کوپاک رکھو

۱۔ جب تم اعضاسے کام کرنے لگوتم یادکرواللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہاہے

۲۔ جب تم بات کرنے لگوتوخیال رکھواللہ تعالیٰ سن رہاہے۔

۳۔ جب تم کچھ نہیں کررہے ہودل سے فعل کررہے ہوتویادرکھواللہ تعالیٰ جان رہاہے۔اس کافرمان ہے:

اِنَّنِیْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۴۶) میں تمہارے ساتھ ہوں سن رہاہوں اوردیکھ رہاہوں

۴۔ یادرہے،اسرارِحکمت الٰہی پرکوئی مطلع نہیں۔ملائکہ کی نظرفسادقتل پرپڑی توانہوں نے بشرکوحقیر جانا،ان کی نظرابلیس کی

طاعت پر گئی تو اسے عظیم سمجھا۔لیکن تمام غیوب جاننے والا ہی یہ جانتا ہے کہ اگرچہ ان میں فساد و قتل ہے لیکن اس کے بعد کہیں گے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (۸پ، الاعراف:۲۳) ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا

ابلیس اگرچہ طاعات بجالا رہا ہے لیکن وہ بعد میں یہ کہے گا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ میں اس سے کہیں بہتر ہوں

عقل کو چاہئے وہ اپنی رائے پر ہی ڈٹی نہ رہے بلکہ ہمیشہ خوف و خشیت دامن گیر رہے۔تو ارشاد الٰہی اِنِّـىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ کا مفہوم یہ ہوا کہ میری ذات، ظاہر، باطن، واقع اور متوقع سب جانتی ہے۔میں یہ بھی جانتا ہوں جسے تم عابد و مطیع جان رہے ہو وہ کفر کا مرتکب ہو جائے گا اور جسے تم فاسق و بعید جان رہے ہو وہ میری اطاعت بجالائے گا تو خلق کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جہالت کے حجاب سے نکل جائے اور نہ ہی ان پر دستار عجز کا پھاڑنا ممکن ہے کیونکہ یہ اس کے علم کی کسی شئی کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے علم غیب اور عجز ملائکہ کے ثبوت میں انسان کی کمال عبودیت اور آسمانی باشندوں میں سے زیادہ عبادت گزار کا کفر آشکار کیا ہے تاکہ کوئی اس کے عمل سے دھوکہ نہ کھائے اور وہ معرفتِ اشیاء کو حکمت خالق کے سپرد کر دیں اور اس کی مصنوعات و تخلیقات پر زبان و دل سے کبھی معترض نہ ہو۔

[۳۴] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

(اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کفار میں سے تھا)

چوتھا انعام

یہ تمام انسانوں پہ ہونے والے انعامات میں چوتھی نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ کو مسجودِ ملائکہ بنا دیا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کیلئے تخصیص فرمائی پھر انہیں علم کثیر دیا پھر اتنا علم کہ ملائکہ ان کے درجہ علم کے سامنے عاجز آ گئے اور اب ان کا مسجود ملائکہ ہونا بیان ہو رہا ہے۔

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: حکم سجدہ تکمیل تخلیق سے پہلے

ملائکہ کو حکم سجدہ، اللہ تعالیٰ کی تخلیق آدم علیہ السلام کی تکمیل سے پہلے ہوا، دلیل یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (پ ۲۳ ص:۷۱،۷۲) میں مٹی سے انسان بناؤں گا جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گرنا

ظاہراً آیت نشاندہی کررہی ہے جیسے ہی ان میں زندگی آئی تو وہ مسجود ملائکہ ہوئے کیونکہ 'فَقَعُوْا' کی فا تعقیب پہ دال ہے۔

اس صورت میں انہیں تعلیمِ اسماء اور اس بارے میں ملائکہ سے ان کا مناظرہ مسجود ملائکہ بننے کے بعد ہوا۔

دوسرا مسئلہ: یہ سجدہ عبادت نہ تھا

اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے یہ سجدہ، سجدۂ عبادت نہ تھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کیلئے سجدۂ عبادت کفر ہے اور کفر کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے بعد اختلاف ہے۔ تین اقوال ہیں:

۱۔ یہ سجدہ بارگاہ الٰہی میں ہی تھا مگر آدم علیہ السلام قبلہ کی طرح تھے۔

دو اعتراضات

کچھ لوگوں نے اس پہ دو طرح سے طعن کیا ہے:

پہلا طعن: یہ نہیں کہا جاسکتا میں نے قبلہ کیلئے نماز پڑھی، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے میں نے قبلہ رخ نماز ادا کی۔ اگر وہ اس سجدہ کیلئے قبلہ تھے تو پھر، اُسْجُدُوْا اِلٰی آدَمَ (آدم کی طرف سجدہ) ہوتا، حکم ان الفاظ میں نہیں۔ بلکہ فرمایا: اُسْجُدُوْا لِآدَمَ (آدم کیلئے سجدہ کرو) تو بلاشبہ آدم علیہ السلام فقط قبلہ نہ تھے۔

دوسرا طعن: ابلیس نے کہا تھا: (کیا تو اسے دیکھتا ہے جسے تو نے مجھ پہ فضیلت دی ہے) یعنی مسجود ہونا بتارہا ہے کہ یہ ساجد سے افضل ہے، اگر آدم صرف قبلہ ہی تھے تو یہ بلند درجہ انہیں حاصل ہی نہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی طرف نماز ادا فرماتے تو اس سے کہاں لازم کہ کعبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو جائے۔

جواب: طعن اول کا جواب یہ ہے، جس طرح یہ کہنا، میں نے قبلہ رخ نماز ادا کی درست ہے اسی طرح صلیت للقبلة (میں نے

قبلہ کیلئے نماز پڑھی) کہنا درست ہےاور یہ بات قرآن واشعار سے ثابت ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (پ۱۵،الاسراء:۷۸) اور نماز قائم رکھو سورج ڈھلنے کے لئے۔

حالانکہ نماز اللہ تعالیٰ کیلئے ہے نہ کہ زوال کیلئے۔ جب یہاں جائز ہے تو صلیت للقبلة، کیوں نا جائز کیونکہ نماز اللہ کیلئے ہوتی ہے نہ کہ قبلہ کیلئے۔

اشعار سے ثبوت یوں ہے کہ حضرت حسان کہتے ہیں:

ما كنت اعرف ان الامر منصرف عن هاشم ثم منها عن ابی حسن

أليس أول من صلى لقبلتكم واعرف الناس بالقرآن والسنن

تو ان الفاظ "صلى لقبلتكم" مقصود پر نص ہیں۔

دوسرے طعن کا جواب یہ ہے کہ ابلیس نے ان کی تکریم کا شکوہ کیا اور ضروری نہیں وہ تکریم فقط مسجود ہونے کی وجہ سے ہی ہو بلکہ اس کے ساتھ دیگر امور بھی ہو سکتے ہیں۔

دوسرا قول، سجدہ تعظیمی تھا

یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کیلئے بطور تعظیم وتحیہ تھا یہ ان کی طرف سے ان پر سلام کی طرح ہے۔ اُمم سابقہ میں ایسا تھا جیسے مسلمان آج آپس میں سلام کہتے ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے:

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (پ۱۳، یوسف:۱۰۰) اور وہ ان کے سامنے سجدہ میں گر پڑے

کے تحت کہا: لوگوں کے درمیان اس وقت تحیہ سلام ایک دوسرے کو سجدہ تھا۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ فرمایا: معاذ! یہ کیا؟ عرض کیا: یہود اپنے سرداروں اور علماء کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے نصاریٰ کو اپنے راہبوں کو سجدہ کرتے دیکھا تو پوچھا یہ کیا: انہوں نے بتایا: یہ تحیۃ الانبیاء ہے۔ فرمایا: انہوں نے اپنے انبیاء پر جھوٹ بولا ہے۔ (المستدرک، ۷۳۲۵)

حضرت ثوری نے سماک بن ہانی سے بیان کیا: جاثلیق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو اس نے سجدہ کا ارادہ کیا۔ فرمایا: اللہ کو سجدہ کرو نہ کہ مجھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اگر غیر اللہ کیلئے میں سجدہ کا حکم دیتا تو بیوی کو خاوند کے عظیم حق کی وجہ سے سجدہ کا حکم دیتا۔ (سنن ابوداؤد، ۲۱۴۰)

تیسرا قول، سجدہ بمعنی طاعت

سجود کا لغوی معنی ہے اطاعت و خضوع۔ شاعر نے کہا:

ترى الأكم فيها سجداً للحوافر

(یعنی چھوٹے چھوٹے پہاڑ اونٹوں کے پاؤں تلے روندے گئے)

اسی لیے ارشادِ الٰہی ہے:

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (پ۲۷، الرحمٰن:۶) اور ستارے اور درخت طاعت بجالاتے ہیں

قول اول ضعیف ہے۔ کیونکہ مقصد سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کا اظہار ہے محض انہیں قبلہ بنانا تعظیم حال پر اس قدر مفید نہیں۔ قول ثالث بھی ضعیف ہے بلاشبہ عرفِ شرع میں سجدہ زمین پر پیشانی رکھنا ہے لہٰذا اہل لغت کے ہاں بھی یہی معنی ہوگا کیونکہ اصل تو یہی ہے کہ معنی میں تبدیلی نہ ہو۔

سوال: سجود عبادت تو غیر اللہ کیلئے جائز نہیں؟

جواب: ہم سجود کو عبادت نہیں مانتے۔ تفصیل یہ ہے کہ بعض اوقات فعل، قول کی طرح مفید ہے مثلاً ہمارا کسی کیلئے قیام کرنا اس کی عظمت پر دال ہے حالانکہ قیام بھی عبادت ہی ہے۔ جب یہ ثابت ہے تو انسان کا زمین پر گرنا اور اس پر پیشانی لگانا، تعظیم کی ہی صورت ہے۔ اگرچہ عبادت نہیں جب معاملہ یونہی ہے تو ممکن ہے ملائکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طریقہ سے کرتے ہوں گے کہ اس کی رفعت و عظمت کا خوب اظہار ہو۔

تیسرا مسئلہ، کیا ابلیس فرشتوں میں داخل ہے؟

۱۔ یہ جن ہے تو لازم کہ ملائکہ، میں سے نہ ہو، اس کے جن ہونے پر دلیل ارشادِ الٰہی ہے:

اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (پ۱۵، الکہف:۵۰) مگر ابلیس جو جنوں میں سے تھا

تو کچھ لوگوں نے یہ خیال کیا ہے جب یہ جن ہے تو یہ ملائکہ میں شامل نہیں ہوسکتا کیونکہ جن، ملائکہ کے مخالف جنس ہے۔

لیکن یہ بات ضعیف ہے اس لیے جن، اجتنان بمعنی ستر سے ماخوذ ہے۔ مخفی ہونے کی وجہ سے بچے کو جنین کہا جاتا ہے۔ جنت بھی مخفی ہے۔ جنون، عقل کو ڈھانپ لینا۔ جب یہ ثابت ہے تو ملائکہ آنکھوں سے مستور ہوتے ہیں لہٰذا ان پر لغۃً لفظ جن کا اطلاق درست ہے تو واضح ہوگیا اس قدر دلیل مفید مقصود نہیں۔

ایک اور دلیل

جب ابلیس کا جن ہونا ثابت تو لازماً یہ ملائکہ میں سے نہ ہوگا، ارشادِ الٰہی ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَٰؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ (پ ۲۲، سبا: ۴۰، ۴۱)

جس دن انہیں وہ جمع کر کے فرمائے گا فرشتوں سے کہا انہوں نے تمہاری عبادت کی وہ عرض کریں گے تیری ذات پاک ہے تو ہی ہمارا مولیٰ ہے نہ کہ یہ بلکہ انہوں نے جنات کی عبادت کی

اس آیت نے تو ملک و جن میں واضح فرق کر دیا ہے۔

خازن جنت مراد ہے

سوال: ہم ابلیس کا جن ہونا نہیں مانتے، ارشادِ الٰہی 'كَانَ مِنَ الْجِنِّ' کا مفہوم ہے کہ یہ خازن جنت تھا، یہ بات ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ کیوں جائز نہیں کہ کان من الجن کا معنی ہو کہ ہو گیا جن جس طرح كَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ یعنی وہ کافر ہو گیا۔ ہم مان لیتے ہیں یہ بتا رہا ہے وہ جن ہے لیکن تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس کا جن ہونا ملائکہ سے ہونے کے منافی ہے، جو تم نے بطور دلیل آیت ذکر کی ہے اس کے معارض آیت موجود ہے، فرمان الٰہی ہے:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (پ ۲۳، الصافات: ۱۵۸) اور اس میں اور جنوں میں رشتہ ٹھہرایا

اس لیے کہ قریش کہتے ہیں: ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں تو آیت بتا رہی ہے کہ ملک کا نام جن ہے۔

جواب: كَانَ مِنَ الْجِنِّ، سے خازن جنت مراد لینا جائز نہیں۔ اس لیے کہ۔

إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (پ ۱۵، الکہف: ۵۰) سوائے ابلیس کے کہ قوم جن سے تھا

بتا رہا ہے کہ ترک سجدہ کی علت اس کا جن ہونا ہے اور ترکِ سجود کی علت خازن جنت قرار دینا ممکن نہیں۔ لہٰذا "كَانَ مِنَ الْجِنِّ" (جن ہو گیا) باطل ٹھہرے گا۔

ہم کہتے ہیں یہ خلاف ظاہر ہے اور اس کی طرف رجوع مجبوراً ہی ہوتا ہے۔ رہا یہ ارشادِ الٰہی:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (پ ۲۳، الصافات: ۱۵۸) اس میں اور جنوں میں رشتہ ٹھہرایا

ممکن ہے بعض کفار نے جنات کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا ہو جیسا کہ بعض نے ملائکہ کو قرار دیا۔

پھر ہم نے یہ بھی بیان کیا کہ لغۃً ملک، جن ہے لیکن عرفاً غیر ملائکہ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ مثلاً لفظ دابۃ لغت واصل کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والا ہے البتہ عرف میں بعض کے ساتھ مخصوص ہے تو اس آیت کو لغت اصلی پر اور ہمارے والی آیت کو عرف حادث پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ابلیس کی اولاد ہے جبکہ ملائکہ کی نہیں۔ اولادِ ابلیس پر یہ ارشادِ الٰہی شاہد ہے جس میں اس کے بارے میں ہے:

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ — کیا تم نے اس اور اس کی اولاد کو میرے سوا مدد گار بنالیا

(پ۱۵، الکھف:۵۰)

اولاد ہونے پر یہ تصریح ہے۔

ملائکہ کی اولاد نہ ہونے پر یہ دلیل ہے کہ اولاد مذکر مونث سے حاصل ہوتی ہے جبکہ ملائکہ میں مونث نہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ (پ۲۵، الزخرف:۱۹) — اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے بندے ہیں عورتیں ٹھہرایا کیا ان کے بناتے وقت وہ حاضر تھے ان کی گواہی لکھ لی جائے گی

یہاں ان کے مونث ہونے کی تردید ہے جب مونث ہونے کی نفی ہے تو بالیقین توالد ختم تو اولاد کی نفی ثابت۔

۳۔ ملائکہ، معصوم ہیں جیسے گزر چکا، ابلیس معصوم نہیں لہٰذا ضروری ہے یہ ملائکہ میں سے نہ ہو

۴۔ ابلیس کی تخلیق آگ سے ہے جبکہ ملائکہ کا معاملہ ایسا نہیں ابلیس کے آگ سے ہونے پر دلیل یہ ارشاد ہے، ابلیس سے حکایت کرتے فرمایا:

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ — مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا

اور جنات کی تخلیق آگ سے ہے، ارشاد مبارک ہے:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ — یہ جنات میں سے تھا

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (پ۱۴، الحجر:۲۷) — اور جن کو اس سے پہلے بنایا بے دھوئیں کی آگ سے

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (پ۲۷، الرحمٰن:۱۴،۱۵) — اس نے آدمی کو بجتی مٹی سے بنایا اور جن کو آگ کی بو سے پیدا کیا

ملائکہ کی تخلیق آگ نہیں بلکہ نور سے ہے۔امام زہری رحمہ اللہ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے،انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ملائکہ کی تخلیق نور سے اور جنات کی آگ سے ہے۔ (مسلم،۲۹۹۶)

دوسری بات یہ ہے کہ مسلم طور پر مشہور ہے کہ ملائکہ روحانی ہیں۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تخلیق ریح یا روح سے ہے۔

۵۔ ملائکہ رسل ہیں۔ارشاد الٰہی ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (پ۲۲،فاطر:۱) فرشتوں کو رسول کرنے والا

اور اللہ کے رسل،معصوم ہوتے ہیں۔ارشاد الٰہی ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (پ۸،الانعام:۱۲۳) اللہ درست جانتا ہے جہاں رسالت کو رکھے۔

جبکہ ابلیس کو یہ مرتبہ حاصل نہیں تو وہ لازماً ملائکہ میں سے نہیں ہوسکتا۔

ملائکہ سے ماننے والوں کی دلیل

ابلیس کو ملائکہ سے ماننے والوں کے دو دلائل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ملائکہ سے مستثنیٰ کیا اور استثناء کا تقاضا ہے کہ اسے ان میں سے نکالا گیا ہے اور یہ بات لازم کر رہی ہے کہ یہ ملائکہ میں سے ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کلام عرب میں استثناء منقطع معروف ہے،ارشادِ الٰہی ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (پ۲۵،الزخرف:۲۶،۲۷) جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے فرمایا: میں بیزار ہوں تمہارے معبودوں سے سوائے اس کے جس نے مجھے پیدا کیا

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (پ۲۷،الواقعہ:۲۵،۲۶) اور اس میں نہ سنیں گے کوئی بیکار بات اور گناہکاری ہاں یہ کہنا ہوگا: سلام سلام

لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا اور مسلمان کی شان نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہزار ہا ملائکہ میں جنّ تھا مگر غلبہ کی وجہ سے یہ ان میں شامل رہا پھر اسے مستثنیٰ کیا گیا۔ تو یہ انہی میں سے ایک ہوا۔

اس لیے کہ یہ دونوں باتیں خلاف اصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف بوقت مجبوری رجوع کیا جاتا ہے۔ جو دلائل تم نے ملائکہ سے ہونے کی نفی پر بیان کیے ہیں ان میں عمومات پر ہی اعتماد ہے۔ اگر ہم اسے ملائکہ میں شامل کریں تو تمہارے معتمد عمومات میں تخصیص ہوگی اور اگر ہم کہیں وہ ملائکہ میں سے نہیں تو استثناء کو استثناء منقطع ماننا ہوگا۔

یہ بات معلوم ہے کہ کتاب اللہ میں عمومات میں تخصیص، استثناء سے استثناء منقطع مراد لینے سے بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا ہمارا قول ہی اولیٰ ہے:

دوسرا یہ کہ استثناء ثنی اور صرف سے مشتق ہے۔ معنی صرف تب متحقق ہوتا ہے اگر صرف نہ ہوتا تو یہ اس میں داخل ہوتا اور شئی غیر جنس میں داخل نہیں ہوا کرتی تو اس میں معنی استثناء کا تحقق محال ہوگا۔

رہی یہ بات کہ وہ جن ہو کر ملائکہ میں سے ایک تھا اس بارے میں گزارش یہ ہے کہ کثیر کا حکم قلیل پر تب جاری کرنا جائز ہوتا ہے جب قلیل کا کوئی اعتبار نہ ہو اور وہ قابل التفات ہی نہ ہو، جب وہ اسقدر ہو کہ ساری بات کا اسی واحد کے ساتھ تعلق ہو تو پھر دوسروں کا حکم اس پر جاری نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اگر ابلیس ملائکہ میں داخل نہیں تو یہ حکم الٰہی اس کیلئے کیسے ہوگا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ — اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا سجدہ کرو آدم کو

جب وہ حکم میں شامل ہی نہیں تو اس کا ترک سجدہ، تکبر، معصیت و بغاوت کیسے بن گیا؟ اور وہ مذمت وعتاب کا مستحق کیسے قرار پا گیا ہے؟ حالانکہ یہ تمام امور یہاں اس کیلئے حاصل ہیں تو واضح طور پر خطاب اسے بھی شامل ہے اور خطاب شامل ہونے کی صورت یہی ہے کہ وہ ملائکہ میں ضرور شامل ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملائکہ میں سے تو نہیں البتہ انہیں میں یہ رہا۔ طویل مدت ان کے ساتھ بسر کی تو اسی وجہ سے خطاب اسے شامل تھا۔

پھر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ اگرچہ وہ اس حکم میں داخل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کسی اور حکم کے ذریعے سجدہ کا حکم فرمایا جو قرآن میں منقول نہیں۔ دلیل یہ ارشاد ہے:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ — تجھے کس نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا

جواب: اول کا جواب یہ ہے کہ اتصال ومخالطت وجہ شمول نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اصول فقہ میں ہے خطاب مذکر، مونث کواور خطاب مونث مذکر کوشامل نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان دونوں اصناف میں کس قدر شدت اتصال ہے۔

پھر یہ بھی سامنے رہے جب شدت مخالطت ملائکہ اور ابلیس کے درمیان، ابلیس پر اختصاص لعنت سے مانع نہیں تو اس حکم کو ملائکہ سے اختصاص سے کیسے مانع ہوگی۔

دوسرے سے جواب یہ ہے کہ حکم کا کسی وصف پر جاری ہونا اس وصف کے علت بننے کو آشکار کرتا ہے، جب

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ — اور ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو

کے بعد فرمایا:

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ — اس نے انکار کیا اور تکبر کیا

اس کا بعد میں لانا بتا رہا ہے کہ یہ انکار اسی حکم کی مخالفت کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی دوسرے حکم کی وجہ سے۔

دونوں طرف کے دلائل میرے مطالعہ میں یہی ہیں باقی امور کے حقائق سے اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے۔

چوتھا مسئلہ، انبیاء، ملائکہ سے افضل

ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت نے اللہ تعالیٰ کے ملائکہ کو سیدنا آدم علیہ السلام کیلئے سجدہ کے حکم سے استدلال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ملائکہ سے افضل ہیں۔ لہٰذا یہاں ہم اس مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

اہل سنت کا مسلک

اکثر اہلِ سُنّت کا مسلک یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ملائکہ، انبیاء سے افضل ہیں۔ جمہور شیعہ کا بھی یہی مئوقف ہے۔ اسی قول کو ہمارے اہلسنت متکلمین میں سے امام ابوبکر باقلانی اور ہمارے فقہاء میں سے امام ابو عبداللہ حلیمی نے مختار قرار دیا ہے، ہم دونوںؒ کے دلائل ذکر کیے دیتے ہیں۔

ملائکہ انسان سے افضل

ملائکہ کو انسان پر فضیلت دینے والوں کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: ارشاد الٰہی ہے:

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ — اور اس کے پاس والے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۱۹،۲۰) — رات دن اس کی پاکیزگی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے

اس آیت مبارکہ سے استدلال دو طریقوں سے ہے۔

پہلا طریق: یہاں 'عندہ' سے مکان وجہت مراد نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کیلئے محال ہے بلکہ مراد قُرب وشرف ہے، جب یہ آیت ملائکہ کی شان میں ہے تو ہم پہ واضح ہو رہا ہے کہ قرب وشرف کی یہ نوع انہیں ہی حاصل ہے کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔

سوال: اس پر کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا قرب آخرت میں ہر ایک مومن کیلئے بیان کیا ہے۔

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ (پ۲۷، القمر:۵۵) سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور

اور دنیا کے حوالہ سے بھی رسول اللہ ﷺ نے اللہ رب العزت سے بیان کیا:

اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ لِاَ جْلِیْ میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل میری خاطر ٹوٹتے ہیں

اور اس میں عظمت وشان زیادہ ہے۔ حدیث بتا رہی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہے۔

جس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا بندے کے پاس ہونا یہ بندے کا اللہ کے پاس ہونے سے کہیں زیادہ تعظیم پہ مشتمل ہے۔

دوسرا طریق: اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ملائکہ میری عبادت سے تکبر نہیں کرتے تو لازم ہے کہ ان کے غیر بھی تکبر نہ کریں۔ اب اگر بشر ان سے افضل ہے تو یہ دلیل تام نہیں بنتی۔ اس لیے کہ جب سلطان اپنی رعیت کو اپنی طاعت کا کہتا ہے تو وہ کہتا ہے میری طاعت سے تو بادشاہ بھی تکبر نہیں کرتے تو ان مساکین میں کون ہے جو میری طاعت سے سرکشی اختیار کرے گا تو یہ استدلال اقویٰ سے اضعف سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔

سوال: کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ملائکہ کی قدرت وقوت میں بشر سے زیادہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں تو صحتِ استدلال کیلئے اسی قدر تفاوت کافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: ملائکہ، شدت وقوت، آسمانوں اور زمین پر غلبہ، بڑھاپے، مرض اور طول عمر سے بے خوف ہو کر بھی ایک لحہ میری عبودیت ترک نہیں کرتے تو اپنی انتہائی ضعف، مرض، بڑھاپا اور دیگر انواع آفات میں واقع ہونے والے بشر کو بدرجہ اولیٰ ہماری عبادت سے سرکشی نہیں کرنی چاہیے۔ تو صحتِ استدلال کیلئے اتنا تفاوت کافی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے تفاوت میں نزاع بھی نہیں۔ نزاع تو کثرت ثواب پانے میں ہے تو اس کیلئے دلیل چاہیے؟ علاوہ ازیں متبادر یہی ہے جو ہم نے ذکر کیا

تیسری دلیل: عبادات ملائکہ، عبادات بشر سے مشکل ہیں لہٰذا ان پر ثواب بھی عبادات بشر سے زیادہ ہوگا عبادات مشکل ہونے کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: ان کا میلان سرکشی اور تمرد کی طرف اشد ہے۔لہٰذا ان کی طاعت زیادہ دشوار ہے، تمرد کی طرف میلان کے اشد ہونے پر دلیل یہ ہے جو عبد آفات سے محفوظ اور طلب حاجات سے بے نیاز ہے وہ نعمتوں اور لذتوں کی طرف زیادہ مائل ہوگا اس سے جو حاجات میں مستغرق ہے تو وہ عبادت مولیٰ میں اور التجا میں مضطرب کی طرح ہوگا، اس لیے ارشاد الٰہی ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (پ۲۱، العنکبوت:۶۵)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں ایک اسی پر عقیدہ لاکر پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں

اور یہ حقیقت ہے کہ ملائکہ آسمانوں میں ہیں جو باغات، بساتین اور مقامِ عیش و راحت میں، وہ مرض و فقر سے بے خوف ہیں ان تمام اسباب انعام کے باوجود تخلیق سے وہ عبادت میں مشغول، خوف و ڈرنے والے گویا قیدی ہیں وہ جنتی نعمتوں اور لذتوں کی طرف متوجہ ہی نہیں بلکہ وہ طاعات شاقہ کی طرف متوجہ، خوف شدید اور فزع عظیم سے متصف ہیں گویا اولاد آدم علیہ السلام اس طرح ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔ چہ جائیکہ اس قدر طویل زمانہ ایسے ہو جائے، اس میں قوت حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے انہیں تمام جنت میں آزادی تھی۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (پ۱، البقرہ:۳۵)

اور کھاؤ بلا روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے

اور ایک درخت سے منع کر دیا لیکن وہ نفس پر کنٹرول نہ رکھ سکے حتیٰ کہ وہ شر میں داخل ہو گئے تو یہ بات بتا رہی ہے کہ ملائکہ کی طاعات بشر سے سخت ہیں۔

دوسری دلیل: مکلّف کا ایک نوع عبادت سے دوسری نوع کی طرف انتقال، ایک گلستان سے دوسری گلستان کی طرف جانا ہے ایک ہی نوع پر اقامت، مشقت اور ملال پیدا کرتی ہے۔اسی سبب کتب کو ابواب و فصول میں تقسیم کیا جاتا ہے حتیٰ کہ کتاب اللہ بھی سورتوں، احزاب، اعشار، اخماس پر مشتمل ہے۔ملائکہ میں سے ہر کوئی ایک ہی عمل پر ہمیشہ قائم ہے اور دوسرے کی طرف نہیں جا سکتا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۰)

دن رات اس کی پاکیزگی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے

وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (پ۲۳، الصافات:۱۶۵،۱۶۶)

بیشک ہم پر پھیلائے اس کے حکم کے منتظر ہیں اور بیشک ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں

جب بات یہی ہے تو ان کی عبادت میں انتہائی مشقت ہے، جب یہ ثابت ہو گیا تو لازماً ان کی عبادات افضل ہوں گی حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُھَا زیادہ مشقت والی عبادات افضل ہوتی ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

اِنَّمَا اَجْرُکَ عَلٰی قَدْرِ نَصَبِکَ تمہاری مشقت کے مطابق ہی تمہیں اجر ملے گا۔

عقل کا تقاضا بھی ہے بندہ اپنے مولیٰ کی رضا کی خاطر جس قدر تکلیف برداشت کرتا ہے اسی قدر وہ قابل تعظیم وتقدیم ہونا چاہئے

سوال: کوئی دو طرح سوال کرسکتا ہے۔

۱۔ ہمیں تسلیم ان کی مشقت کثیر ہے لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لازم طور پر ان کا ثواب بھی اکثر ہے۔اس لیے ہمارے بعض صوفیاء مجاہدہ میں اس قدر مشقتیں اور تکالیف اٹھاتے ہیں کہ کسی نبی نے ان میں سے بعض بھی نہیں اٹھائیں حالانکہ ہم قطعی طور پر جانتے ہیں نبی ان سے افضل ہے۔

بلکہ ہندوستان کے عابدین، زہاد اور راہبوں کے بارے میں منقول ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور تواضع ایسی ایسی مشقتیں برداشت کرتے ہیں جو کسی نبی وولی سے منقول نہیں۔حالانکہ ہم انہیں مطلقاً کافر ہی کہتے ہیں تو واضح ہو گیا عبادت میں کثرتِ مشقت زیادہ ثواب کا موجب نہیں،تفصیل یہ ہے:

کثرتِ ثواب کی بنا اسباب وارادے پر ہی موقوف ہے دو آدمی ایک ہی فعل کریں اور وہ ظاہر میں برابر بھی ہو مگر ایک ثواب عظیم کا اور دوسرا ثواب قلیل کا مستحق ہو اس لیے کہ ایک کا اخلاص دوسرے سے اکثر اور اشد تھا تو اب کثرت ومشقت،عبادات میں فضیلت کی موجب نہ ٹھہریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم عباداتِ ملائکہ کو اشق اور زیادہ مشکل نہیں مانتے۔

پہلی دلیل کا رد

آسمانوں کا خوبصورت باغات کی طرح ہونا تسلیم ہے لیکن یہ کیوں کہتے ہو کہ پاکیزہ مقامات پہ عبادت روی مقامات پر عبادات سے اشق ومشکل ہوتی ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں پر اسباب نعمت موجود تھے مگر ان کا تمام کو ترک کر کے عبادت کرنا اشق تھا۔

لیکن یہاں یہ بطور معارضہ کہا جاسکتا ہے کہ جب نوع واحد عبادت ان کی عادت بن گئی تو اب وہ اس مجبور کی طرح ہیں جو

اس کے مخالف کر ہی نہیں سکتا اس لیے کہا جاتا ہے: العادۃ طبعتہ ۔(عادت بھی پانچویں طبیعت ہے) تو اب یہ عبادت نہایت ہی آسان ہوگی اس لیے آپ ﷺ نے صوم وصال سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

اَفْضَلُ الصَّوْمِ صَوْمُ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ افضل روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے

(صحیح البخاری:۱۹۷۶)

اور وہ یوں تھا کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن روزہ نہ رکھتے۔

تیسری دلیل: عبادات ملائکہ دائمی ہیں لہٰذا وہ افضل ٹھہریں، عبادات دائمی ہونے پر دلیل یہ ارشاد ہے۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۰) دن رات اس کی پاکیزگی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے

اس بنا پر اگر ان کی عمریں، بشری عمروں کے برابر ہی ہوں تو ان کی طاعات، دائمی اور اکثر ہوں گی تو اس وقت کیا صورت ہوگی جبکہ کل بشر کی عمروں کی ملائکہ کی عمروں کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں جیسا کہ صفات ملائکہ میں گزرا ہے۔

حضرت کعب الاحبار کا خوبصورت جواب

سوال: اس آیت کے بارے میں ایک سوال سامنے آتا ہے شعب الایمان میں عبداللہ بن حارث بن نوفل سے ہے میں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم اللہ تعالیٰ کا ارشاد جانتے ہو:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۰) دن رات اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے اور سستی نہیں کرتے

پھر اس کا فرمان ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (پ۲۲، فاطر:۱) فرشتوں کو رسول کرنے والا

تو کیا رسالت ان کی اس تسبیح میں مانع ورکاوٹ نہیں بنتی؟

ایک اور جگہ فرمان ہے:

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ان پر لعنت ہے اللہ کی فرشتوں اور سب آدمیوں کی

(پ۲، البقرۃ:۱۶۱)

تو یہ لعنت میں مشغول ہوتے ہوئے تسبیح کیسے کریں گے؟

تو حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کی تسبیح، ہمارے سانس لینے کی مانند ہے جیسے ہمارا سانس لینا ہمارے کام میں

رکاوٹ نہیں اسی طرح ان کا تسبیح کرنا دیگر اعمال سے مانع نہیں ہوتا۔

سوال: ہمارے نزدیک کوئی کہہ سکتا ہے سانس لینا، مانع کلام نہیں اس لیے کہ آلہ تنفس اور ہے اور آلہ کلام اور، لیکن لعنت و تسبیح دونوں کا تعلق کلام سے ہے تو دونوں کا اجتماع حالت واحدہ میں محال ہے۔

ملائکہ کی متعدد زبانیں

پہلا جواب: اس میں کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے لیے متعدد زبانیں تخلیق فرما دے، بعض کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں، اور بعض کے ساتھ دشمنانِ خداوند پر لعنت کریں۔

دوسرا جواب: لعن، دھتکارنا اور دور کرنا، تسبیح ثناء الٰہی میں ڈوب جانا ہے بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی ثنا اس کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غیر مناسب اعتقاد رکھنے والے کو دور ہی مانا جائے تو اب لعنت، تسبیح کے لوازمات میں سے ٹھہری۔

تیسرا جواب: الفاظ 'لَا یَفْتُرُوْنَ' کا مفہوم یہ ہو کہ وہ عبادات کے اوقات مناسبہ میں ادائیگی کے عزم سے نہیں تھکتے جیسے کہا جاتا ہے فلاں ہمیشہ جماعت کی پابندی کرتے کرتے اس سے تھکتا نہیں تو اس سے مراد اس کا ہر وقت ان میں مشغول رہنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا یہ دائمی عزم مراد ہوتا ہے کہ وہ انہیں ان کے اوقات میں ادا کرے گا جب ان کی عبادات کا دائمی ہونا ثابت ہے تو ان کا افضل ہونا ان وجوہات سے لازم ہے۔

۱۔ دائمی عمل نہایت مشکل ہوتا ہے لہٰذا وہ افضل ہوگا جیسا کہ دوسری دلیل کے تحت گزر چکا ہے۔

۲۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اَفْضَلُ الْعِبَادِ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَ حَسُنَ عَمَلُہٗ — افضل بندہ وہ ہے جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں

(سنن ترمذی:۲۳۳۰)

ملائکہ ایسے بندے ہیں جن کی عمریں لمبی اور اعمال خوبصورت ہیں لہٰذا ان کا افضل العباد ہونا لازمی ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ (کشف الخفا:۱۵۷۶) شیخ اپنی قوم میں، اُمت میں اس کے نبی کی طرح ہوتا ہے۔

نوٹ: محدثین نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے (مترجم قادری)

اس کا فرمان کا تقاضا ہے کہ انسانوں میں ایسے لوگ ہوں جو امت میں نبی (ملائکہ) کی طرح ہوں تو یہ چیز بھی بتا رہی ہے کہ ملائکہ انسان سے اعلیٰ و افضل ہوتے ہیں

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام۔ حضرت لقمان اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کی عمریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل تھیں تو پھر ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا لازم ہوگا۔ حالانکہ یہ بالاتفاق باطل ہے۔ لہٰذا ان کا قول باطل ہے اور امت میں بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عمر اور مشقت کرنے والے پاتے ہیں مگر ان کا درجہ اس نسبت سے بھی زیادہ کم اور دور ہے جو عرش کا تحت الثریٰ کے ساتھ ہے۔

تو تحقیق ہماری یہ ہے کہ کثرت ثواب کا مدار دواعی و اسباب اور مقاصد پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے کہ انسان سے اطاعت قلیل کا صدور ایسے طریق پر ہو کہ اسے ثواب کثیر مل جائے اور کسی سے طاعات کثیرہ ایسے ہوں کہ ان پر ثواب قلیل ہو۔

۴۔ وہ تمام عبادات میں تمام سے اسبق و آگے ہیں، دینی کوئی معمول ایسا نہیں جس میں وہ امام و مقدم نہ ہوں بلکہ وہی طرق دین کے آباد کنندہ اور اس کے ابتدا کرنے والے ہیں تو عبادت میں سبقت تفضیل و تعظیم ہی ہے۔

اولاً: اس پر اجماع ہے۔

ثانیاً: ارشاد الٰہی ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ

جو سبقت لے گئے وہ تو سبقت ہی لے گئے وہی مقرب بارگاہ ہیں (پ۲۷، الواقعہ:۱۰)

ثالثاً: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

جس نے اچھے کام کی بنیاد رکھی اسے اس کا اجر اور جو اس پر عمل پیرا ہوگا اس کا ثواب قیامت تک ملے گا (مسلم:۱۰۱۷)

اس کا تقاضا یہ ہے کہ ملائکہ کو وہ تمام ثواب حاصل ہو جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے پھر ملائکہ کے ثواب میں ایسا اضافہ بھی ہے جو عبادات و افعال انہوں نے تخلیق بشر سے پہلے بجا لائے۔

سوال: کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوں اس لیے کہ وہ پہلے بشر ہیں جنہوں نے عبادت الٰہی کی سُنّت جاری کی۔ وہی اول ہیں جنہوں نے کفار کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ حالانکہ یہ بات بالاتفاق باطل ہے لہٰذا تمہاری ذکر کردہ دلیل باطل ہے۔

تحقیقی بات ہماری بیان کردہ ہی ہے کہ کثرت ثواب کا مدار نیت پر ہے ممکن ہے بعد والے کی نیت زیادہ صاف ہو تو وہ اپنے سے پہلے سے ثواب کا زیادہ مستحق ٹھہرے۔

فضل قدیر

پانچویں دلیل: انبیاء اُمتوں سے افضل

ملائکہ کے حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف رسول ہونے پر دلیل یہ ارشادات عالیہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (پ۲۷،النجم:۵) انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقتور نے

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ اسے روح الامین لے کر اترا تمہارے دل پر

(پ۱۹،الشعراء:۱۹۳،۱۹۴)

رسول، اُمت سے افضل ہوتا ہے یہ قیاس سے ثابت ہے کہ انسان، انبیاء اپنی اپنی امتوں سے افضل ہیں تو یہاں بھی معاملہ اسی طرح ہونا چاہیے۔

سوال: عرف یہ ہے کہ جب سلطان کسی نمائندہ کو جماعت عظیم کی طرف بھیجے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور ان کے اُموران کے سپرد کرے تو یہ نمائندہ اس جماعت سے افضل ہوگا لیکن جب کسی ایک کو ایک کی طرف بھیجے تو پھر رسول کا مرسل الیہ سے اشرف واعلیٰ ہونا ضروری نہیں ہوتا مثلاً بادشاہ اہم معاملہ میں کسی غلام کو اپنے وزیر کی طرف بھیجتا ہے تو اب وہ غلام اس وزیر سے تو افضل نہ ہوگا۔

جواب: حضرت جبرائیل علیہ السلام تو تمام انبیاء ورسل کی طرف مبعوث ہیں سائل کے بیان کردہ قانون سے لازم آرہا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ان تمام سے افضل ہوں۔

یاد رہے اس بیان کردہ کی تفصیل اس طریق پر بھی ممکن ہے ملائکہ، رسل ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (پ۲۲،فاطر:۱) فرشتوں کو رسول بنانے والا

اب دو میں ایک صورت ہوگی۔ فرشتہ دوسرے فرشتہ کی طرف رسول ہوگا یا انسانی نبی کی طرف ہوگا۔ دونوں صورتوں میں رسول اور رسل اس کی امت بنیں گے۔ باقی رسول بشر، رسول تو ہے مگر رسل اس کی اُمت نہیں تو وہ رسول افضل ہوگا جس کی اُمت رسل ہیں اس رسول سے جس کی اُمت رسل نہیں تو اس جہت سے فرشتہ نبی سے افضل ہوگا۔

اور یوں بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت لوط علیہ السلام کی طرف بعثت ہے تو وہ حضرت لوط علیہ السلام سے افضل ہوں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان انبیاء کی طرف بعثت ہے جو ان کے لشکر میں شامل تھے تو آپ ان سے افضل ٹھہرے۔

سوال: بادشاہ جب نمائندہ کوکسی علاقہ میں بھیجتا ہے تو وہ اس کو وہاں کے لوگوں پر حاکم، ان کے امور پر متولی اوران کے احوال میں متصرف بنا تا ہے اور کبھی یہ مقصد نہیں وہ فقط انہیں بعض امور کی اطلاع کیلئے جاتا ہے نہ وہ حاکم ہوتا ہے نہ ہی اور متولی اور نہ متصرف

اول صورت میں رسول کا ان لوگوں سے افضل ہونا لازم ہے اور دوسری صورت میں ان کا لوگوں سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا امتوں کی طرف مبعوث ہونے کا تعلق اول صورت سے ہے لہٰذا وہ بالیقین لوگوں سے افضل ہوں گے، تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ملائکہ کی انبیاء کی طرف بعثت کا تعلق اول صورت سے ہے حتیٰ کہ وہ انبیاء سے افضل ہو جائیں۔

چھٹی دلیل: ملائکہ بشر سے اتقیٰ (زیادہ تقویٰ والے) ہیں لہٰذا وہ افضل ہی ہوں گے، ملائکہ اتقیٰ کس طرح ہیں؟ وہ زلات اور ان کی طرف میلان سے مبرہ ہیں، ان کے خوف وڈر دائمی ہیں ارشاد الٰہی ہے:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ　(پ۱۴، النحل:۵۰)　اپنے اوپر اپنے رب کا خوف کرتے ہیں

وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ　(پ۱۷، الانبیاء:۲۸)　اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں

خوف واشفاق، معصیت پر عزم کے منافی ہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام گو وہ افضل البشر ہیں مگر وہ لغزش سے مبرا نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ہم میں سے ہر کوئی معصیت یا اس کا ارادہ کرتا ہے سوائے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام۔

تو ثابت ہوا ملائکہ کا تقویٰ اشد ہے لہٰذا ان کا بشر سے افضل ہونا لازمی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ　(پ۲۶، الحجرات:۱۳)　بیشک اللہ کے ہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے

ملائکہ اور ثبوتِ تقویٰ

سوال: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ تو انسانوں سے خطاب ہے یہ ملائکہ کو شامل نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ وقایہ (بچنا) سے ہے اور ملائکہ میں شہوت ہی نہیں لہٰذا ان کیلئے ثبوت تقویٰ ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلا جواب: کرامت وعزت کا تقویٰ پر مرتب ہونا بتا رہا ہے کہ علتِ کرامت تقویٰ ہے تو جہاں تقویٰ زیادہ ہوگا وہاں کرامت وفضیلت بھی زیادہ ہوگی (خواہ وہ ملائکہ ہوں یا انسان)

ملائکہ اور تمناءِ درجات

دوسرا جواب: ملائکہ میں عدم خواہش ہم تسلیم نہیں کرتے ہاں ان میں کھانے پینے اور مباشرت کی خواہش نہیں لیکن بعض

خواہشات کی نفی سے ہر خواہش کی نفی نہیں ہوتی بلکہ تقدم و بلندی درجات کی تمنا ان میں ہو سکتی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَ يَسۡفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (پ۱، البقرہ:۳۰)

کیا ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں

وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۹)

اور ان میں سے جو کہے میں اللہ کے سوا معبود ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے

سوال: مذکور ارشاد نبوی بتا رہا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے اتقی ہیں لہٰذا وہ حضرت محمد ﷺ سے بھی افضل ہوں گے اور یہ باطل ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے، تقویٰ کی زیادتی سے فضل میں اضافہ لازم نہیں۔

تحقیقی بات ہماری بیان کردہ ہی ہے کہ ممکن ہے ایک انسان سے کبھی معصیت کا صدور نہ ہوا اور اس سے ایسی عبادات کا صدور ہو جس سے وہ ثواب کے صد اجزا کا مستحق ٹھہرے۔ دوسرا انسان ہے جس سے معصیت کا صدور ہوا لیکن وہ ایسی عبادت بجا لاتا ہے کہ جس پر ثواب ہزار اجزا ہے تو سو اجزا ثواب کے مقابل ہوں گے سو اجزاء عتاب کے تو صد ثواب باقی رہ گیا تو دوسرا انسان، معصیت کے صدور کے باوجود اس انسان سے افضل ٹھہرا جس سے کبھی معصیت کا صدور نہیں ہوا۔

دوسرا ہم تقویٰ ملائکہ کے اشد ہونے کو نہیں مانتے، اس لیے کہ تقویٰ وقایہ (پرہیزگاری) سے مشتق ہے اور معصیت کا تقاضا اولادِ آدم میں اکثر ہے لہٰذا متقین کا تقویٰ ملائکہ سے اکثر ہوگا۔

انسانی خواہشات زیادہ ہیں

ملائکہ میں ریاست کی خواہش ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمیں نقصان دہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ خواہش تو انسان کو بھی حاصل ہے اور اسے دیگر بطن وفرج کی خواہشات بھی حاصل ہیں جب یہ ضعیف ہے تو اب اولاد آدم کو طاعات سے پھیرنے والی خواہشات اکثر ہوئیں لہٰذا متقین کا تقویٰ، ملائکہؑ سے اکثر و اشد ہونا لازم ہے۔

ساتویں دلیل: ارشاد الٰہی ہے:

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ (پ۶، النساء:۱۷۲)

مسیح اللہ کا بندہ بننے سے کوئی نفرت نہیں کرتا اور نہ ہی مقرب فرشتے

وجہ استدلال یوں ہے کہ ''وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' اول کی تاکید ہے اور ایسی تاکید ذکر افضل کے ساتھ ہوا کرتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس لکڑی کو نہ دس آدمی اٹھا سکتے ہیں اور نہ صد، یہ نہیں کہا جاتا کہ اسے نہ دس اٹھا سکتے ہیں اور نہ ایک، یہ کہا جاتا ہے کہ اس عالم کی خدمت بجالاتا ہے یوں نہیں کہا جاتا کہ اس کی خدمت وزیر ہی بجانہیں لاتا بلکہ چوکیدار بھی بجالاتا ہے۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے آیت یہ بتا رہی ہے کہ ملائکہ مقربین حضرت مسیح علیہ السلام سے افضل ہیں لیکن اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ ان مقربین سے بھی افضل ہوں جو حضرت مسیح علیہ السلام سے افضل ہیں مثلاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ الحتصر اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہونا ثابت ہوجائے تو پھر ان کا مقصود حاصل ہوجائے گا تو جب تک اس پر دلیل نہ آئے ان کا مقصود حاصل نہیں ہوسکتا جبکہ خصوصاً تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت مسیح علیہ السلام سے افضل ہیں۔

ہم تو کسی ایسے ایک مسلمان کو نہیں جانتے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سے افضل ہونے کا قائل ہو

ہم ایک اور بات کہتے ہیں وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ، میں واؤ عطف، مطلق جمع کیلئے ہے تو مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہ تو حضرت مسیح نے تکبر کیا اور نہ ملائکہ مقربین نے، رہا حضرت مسیح پر ملائکہ کا افضل ہونا اس پر یہاں دلالت ہی نہیں، جو مثالیں تم نے دی ہیں دعویٰ کلی کے ثبوت کیلئے کافی نہیں پھر یہ دیگر مثالوں کے مخالف ہیں۔ مثلاً اس پر میری کسی نے مدد نہ کی نہ زید نے اور نہ عمر نے تو اب یہاں عمرو کا افضل ہونا لازم نہیں، ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ — اور نہ حرم کو بھیجی ہوئی قربانیاں اور نہ جن کے گلے میں علامتیں آویزاں ہیں (پ۶، المائدۃ:۲)

جب مثالوں کا آپس میں اختلاف ہے تو ان پر اعتماد درست نہیں پھر تحقیقی بات یہ ہے جب کہا جاتا ہے کہ اس لکڑی کو نہ ایک اٹھا سکتا ہے اور نہ دس تو ہمیں اس بات کا پہلے علم ہوتا ہے کہ دس ایک سے اقوی اور زیادہ طاقتور ہیں تو یقیناً ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ دوسرے کا ذکر بطور مبالغہ ہے لیکن مبالغہ، مذکور طریق سے آیا نہ کہ محض الفاظ سے۔

آیت مبارکہ میں ''وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' سے بیان مبالغہ کا تب ہمیں علم ہوگا کہ پہلے ہم یہ جانتے ہوں کہ ملائکہ مقربین حضرت مسیح علیہ السلام سے افضل ہیں تو اب اس آیت سے ثبوت مطلوب پر استدلال اس پر موقوف ہے کہ اس دلیل سے پہلے اس کا علم ہو حالانکہ ثبوت مطلوب اس آیت کی دلالت پر موقوف ہے تو یہاں دور لازم آرہا ہے جو باطل ہے۔

ہم مانتے ہیں یہ مفید تفاوت ہے لیکن تمام درجات میں مفید تفاوت نہیں بلکہ بعض کے بارے میں ہے لیکن بعض کے بارے میں نہیں ہے کچھ تفصیل یوں ہے؛

جب یہ کہا جاتا ہے اس عالم نے قاضی کی طاعت سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی سلطان کی طاعت سے تو اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سلطان، قاضی سے بعض امور مثلاً قدرت، قوت اور غلبہ میں افضل ہے مگر اس پر دلالت نہیں کرتا کہ قاضی سے علم، زہد اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خشوع کے حوالہ سے بھی افضل ہے۔

جب یہ ثابت ہے تو اس کے پیش نظر کہتے ہیں فرشتے قدرت وگرفت میں بشر سے افضل ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے قوم لوط کے تمام شہروں کو اکھاڑ لیا اور کسی انسان میں تو یہ طاقت نہیں لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فرشتے اضافی خشوع وعبودیت کی بنا پر بشر سے کثرت ثواب میں افضل ہیں۔

کمال تحقیق یہاں یہ ہے کہ جس فضیلت میں اختلاف ہے وہ کثرت ثواب ہے اور یہ عبودیت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور عبودیت انتہائی تواضع وخضوع کا نام ہے، بندے کا اللہ تعالیٰ کیلئے انتہائی تواضع سے متصف ہونے کے یہ مناسب نہیں کہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے فائدہ سے خارج کرنا ہوگا، رہا کسی کا قدرت شدید اور غلبہ عظیم کے ساتھ متصف ہونا یہ سرکشی اور ترک عبودیت کے مناسب ہے۔

نصاریٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ اور کوڑھے اور اندھوں کو بینائی دیتے دیکھا تو انہوں نے اسی قدرت کو دیکھ کر انہیں عبودیت (بندہ ہونے) سے نکال دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے اس قدرت کے باوجود میری طاعت وعبادت سے کبھی تکبر وانکار نہیں کیا اور نہ ہی ملائکہ مقربین نے جو قدرت، قوت، گرفت اور عوالم سموات وارض پر غلبہ میں ان سے زیادہ ہیں تو اس طریق سے دلالت آیت اس پر ہوگی کہ ملائکہ، بشر سے شدت اور گرفت میں افضل ہیں لیکن اس کی اس پر دلالت نہیں کہ وہ بشر سے کثرت ثواب میں افضل ہیں۔

یا یوں کہا جائے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہا کہ یہ بغیر باپ کے ہیں تو ان سے یہاں کہا جارہا ہے ملائکہ کا نہ باپ اور نہ ہی ماں، تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ عجیب معاملہ ہے اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی عبدیت سے تکبر کرنے والے نہیں

سوال: آیت میں اس پر دلالت ہے کہ حضرت مسیح اور ملائکہ کے درمیان عبودیت میں فرق ہے نہ کہ قدرت، قوت اور گرفت میں اس لیے کہ ان کا وصف مقرب بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف قرب مکانی اور جہتی نہیں ہوتا بلکہ درجہ اور منزلت ہے تو جب انہیں مقرب فرمایا تو معلوم ہوا کہ ان کے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان درجات فضل کا تفاوت ہے نہ کہ قوت وگرفت کا۔

جواب: اگر تمہارا اس سوال سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا ہی وصف مقربین بیان کیا تو اس پر دال نہیں ہوتا کہ ماسوا سے اس کی نفی ہے

اگر تمہارا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف مقرب بیان کیا لہٰذا تفاوت بھی لازماً اسی اعتبار سے ہوگا تو یہ بھی باطل ہے اس لیے کہ ممکن ہے حضرت مسیح علیہ السلام اور مقربین طاعت میں صفت قرب میں مشترک ہوں لیکن دیگر امور کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہو تو یہاں ان امور طاعت میں صفت قرب میں مشترک ہوں لیکن دیگر امور کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہو تو یہاں ان امور میں ہی تفاوت مقصود ہو۔

دوسرا سوال: ہم اس آیت کی وجہ سے مان لیتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام فضیلت میں تمام مجموعہ ملائکہ سے کم ہیں لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فضیلت میں ہر فرشتہ سے کم ہیں۔

تیسرا سوال: ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان آیات سے انہیں مخاطب فرمایا ہو جن کا عقیدہ تھا کہ ملائکہ، بشر سے افضل ہوتے ہیں تو ان کے اعتقاد کے مطابق کلام ہوا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (پ۲۱، الروم:۲۷) اور یہ تمہاری سمجھ میں اس پر زیادہ آسان ہونا چاہیے

۸۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے یہ حکایت کیا:

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (پ۸، الاعراف:۲۰) تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے

تو اب اگر حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے ہاں یہ مسلم نہ تھا کہ فرشتے بشر سے افضل ہیں تو ابلیس انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب نہ ہوتا اور نہ ہی حضرت آدم و حوا علیہما السلام اس سے دھوکہ کھاتے۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ابلیس کا قول ہے لہٰذا دلیل نہیں۔ جواباً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی صحت مانی ورنہ وہ دھوکہ نہ کھاتے تو حضرت آدم علیہ السلام کا اعتقاد حجت ہے اس لیے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ممکن ہے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ جان کر خطا کی اس لیے کہ لغزش سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نبی ہی نہ تھے تو اس وقت فرشتہ کے ان سے افضل ہونے سے یہ لازم کب آتا ہے، کہ نبی بننے کے بعد بھی وہ افضل ہے۔

یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیت کی اس پر دلالت ہے کہ ملائکہ بعض پسندیدہ اوصاف میں بشر سے افضل ہیں لیکن تم نے یہ کیسے استدلال کیا کہ وہ بشر پر ثواب میں افضل ہیں اس لیے کہ قدرت، قوت، حسن و جمال عناصر کی وجہ سے جو کدورتیں ہوتیں ہیں ان سے پاک وصاف ہونے میں ملائکہ کے بشر سے افضل ہونے میں کوئی اختلاف ہی نہیں کیونکہ ملائکہ کی تخلیق نور اور آدم کی مٹی سے ہے، تو حضرت آدم علیہ السلام اگرچہ کثرت ثواب میں ان سے افضل تھے مگر مذکور امور میں وہ ان سے مساوات چاہتے ہوں تو اس وجہ سے انہیں دھوکہ ہو گیا

ارشادگرامی "اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ" میں بھی احتمال ہے کہ یہاں مراد یہ ہے تم دونوں بدل کر فرشتے بن جاؤ گے تو اب تمہارا استدلال درست ہوا۔

لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں نہی ملائکہ اور خالدین کے ساتھ مختص ہونہ کہ ان دونوں کے ساتھ۔ اور یہ یوں ہو جیسے ہم دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم نے تجھے منع نہیں کیا مگر یہ کہ تم فلاں ہو۔ تو اب معنی یہ ہے فلاں کو منع کیا گیا ہے نہ کہ مخاطب کو۔ تو یہاں یہی ہوگا کہ مخاطب بدل کر فلاں ہو جائے۔ جب ابلیس کی غرض دونوں کو شبہ ڈالنا تھا تو انہیں اس وہم میں ڈال دینا شبہ کو پختہ کر دیتا ہے کہ انہیں تو منع کیا ہی نہیں گیا، منع تو دوسرے کو کیا گیا ہے۔

چلو ہم تسلیم ہے آیت دلالت کرتی ہے کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں تو تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ فرشتے حضرت محمد ﷺ سے بھی افضل ہیں؟ یہ اس لیے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ حضرت محمد ﷺ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں تو ملائکہ کے مفضول ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ افضل سے بھی افضل ہوں۔

۹۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (پ۷، الانعام:۵۰)

تم بتاؤ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں کہ میں غیب جانتا ہوں اور تم سے یہ کہوں میں فرشتہ ہوں۔

سوال: یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ "لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ" میں مراد یہ ہو کہ میں کثرت علوم اور شدت میں فرشتہ نہیں ہوں، اس احتمال و معنی کی صحت پر یہ دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: کفار نے نبی سے اُمور عظیمہ کا مطالبہ کیا تھا مثلاً آسمان پر چڑھنے، پہاڑ کو منتقل کرنا، اموال عظیمہ کا حاضر کرنا تو ان اُمور کا حصول، علوم کثیرہ اور قدرت شدیدہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

دوسری دلیل: ارشاد:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ

بتادو میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں

بتا رہا ہے کہ نبی نے اعتراف کیا کہ وہ تمام مقدورات پر قادر نہیں۔ "وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ" بتا رہا ہے کہ انہیں اعتراف ہے کہ وہ تمام معلومات کے عالم نہیں۔ "وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ" اس کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ جس طرح میں تمام مقدورات پر

قدرت اور تمام معلومات کے علم کا دعویٰ نہیں کرتا اسی طرح میں فرشتوں کی قدرت اور ان کے علوم کی مثل کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔

تیسری دلیل: ارشادالٰہی "وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ" میں نفی صورت مراد نہیں کیونکہ اس سے غرض حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں صفاتِ ملائکہ کے مثل کی نفی ہے اور اس کے صدق کیلئے یہ کافی ہے کہ اس میں ان کی مثل اشیاء نہیں اور اس کی صفات ہر لحاظ سے ان کے مساوی نہیں نہ ہی اس پر دلالت ہے کہ تمام صفات کے حوالہ سے ان میں تفاوت ہے اس لیے کہ کل میں مساوی نہ ہونا اور ہوتا ہے اور کل میں اختلاف کا حصول اور ہوتا ہے۔

۱۰۔ ارشادالٰہی ہے:

مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (پ ۱۲ یوسف:۳۱) یہ تو جنسِ بشر سے نہیں یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے

سوال: یہ کیوں جائز نہیں کہ یہاں صورت و جمال میں تشبیہ مراد ہو؟

جواب: اولیٰ یہ ہے کہ سیرت میں تشبیہ ہو نہ کہ صورت میں اس لیے کہ الفاظ ہیں "اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ"، تو تشبیہ ملک کریم کے ساتھ ہے تو ملک، سیرت اعلیٰ سے ہی کریم ہوگا نہ کہ محض صورت کی وجہ سے۔ تو ثابت ہوا یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کی ملک کے ساتھ تشبیہ، بشری تقاضوں مثلاً شہوت اور طلب خواہش کی نفی اور اس کی ضد حالت ملک مثلاً غض بصر، نفس کا محرمات کی طرف میلان سے بری ہونے کا اثبات ہے۔ تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ تمام عقلاء مرد، خواتین، مسلمان، کافر کا اس پہ اجماع ہے کہ ملائکہ کیلئے درجات بشر پر ایک مخصوص فائق درجہ ہے۔

سوال: خاتون کا قول:

فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (پ ۱۲، یوسف:۳۲) تو یہ ہیں وہ جن پر تم مجھے طعنہ دیتی تھیں

تصریح ہے کہ قول خواتین اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ" کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کی بڑھائی تھی نہ کہ سیرت، اس لیے کہ اس خاتون کا آپ سے شدت عشق پر ظہور عذر کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن میں کمال تھا نہ کہ آپ کا کمال زہد و ورع کیونکہ یہ تو اس شدت عشق کے مناسب ہی نہیں۔

ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملائکہ کے ساتھ، خواہشات سے اعراض میں تشبیہ دی تو کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ملائکہ سے ثواب میں کم ہونا لازم ہے؟ اس لیے کہ اس میں تو کوئی نزاع ہی نہیں کہ ملائکہ میں طعام و اُمور نکاح وغیرہ کی طرف التفات، بشری التفات سے کم ہے لیکن کیا اس سے تم یہ کہہ سکتے ہو اس وجہ سے ان کے کثرت ثواب میں اضافہ کی وجہ سے اور فضیلت حاصل ہو جاتی ہے؟

اگر تم یہ استدلال کرو۔ کہ کم معصیت والے کا افضل ہونا لازم ہے تو اس پر گفتگو پیچھے آچکی ہے۔

گیارھویں دلیل: ارشاد مبارک ہے:

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا اور ان کو اپنی بہت مخلوق سے افضل کیا

(پ۱۵ الاسراء:۷۰)

مکلف کی چار انواع

مخلوق الٰہی مکلّف ہیں یا غیر مکلّف۔ بلاشبہ مکلّف دوسروں سے افضل ہیں، مکلف کی چار انواع ہیں۔ ملائکہ، انسان، جنات، اور شیاطین۔ بلاشک انسان، جنات سے افضل ہیں اب اگر یہ ملائکہ سے بھی افضل ہوں تو لازم آئے گا انسان تمام مخلوقات سے افضل ہو تو اب ارشاد الٰہی، وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا، میں کیا فائدہ باقی رہ جائے گا؟ بلکہ پھر تو یہ کہنا مناسب تھا:

وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى جَمِيْعِ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ہم نے انہیں اپنی تمام مخلوق پر فضیلت دی

جب یہ نہیں فرمایا تو واضح ہو گیا ملائکہ انسان سے افضل ہیں۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام دلیل خطاب سے تمسک ہے اس لیے کہ یہ تصریح کہ انسان، کثیر مخلوق سے افضل ہے اس پر دال نہیں کہ باقیسے بھی افضل ہونے پر دلیل خطاب کی ضرورت ہے۔

یہ بھی تسلیم ہے کہ جنس ملائکہ، جنس اولاد آدم سے افضل ہیں۔ لیکن ایک مجموعہ کے دوسرے مجموعہ پر افضل ہونے سے یہ لازم نہیں کہ مجموعہ اول کا ہر فرد دوسرے مجموعہ کے ہر فرد سے افضل ہو مثلاً ہمارے پاس دس غلام ہیں جو قیمت سو دینار میں مساوی ہیں، ان کے ساتھ ایسے دس اور آملے جن میں ایک کی قیمت دو صد دینار باقی نو میں سے ہر ایک کی قیمت ایک دینار ہے تو مجموعہ پہلا، دوسرے مجموعہ سے افضل ہے۔ لیکن دوسرے مجموعہ میں ایک ایسا بھی ہے جو مجموعہ اول کے ہر فرد سے افضل ہے اسی طرح کا معاملہ زیر بحث مسئلہ میں بھی ہے۔

الفاظ مبارکہ ''وَفَضَّلْنٰهُمْ'' سے ممکن ہے۔ مراد یہ ہو کہ ہم نے انہیں کرامت و عزت میں فضیلت دی جس کا ذکر ابتدا آیت میں ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ تو یہاں کرامت سے حسنِ صورت، خوب ذکاوت، اعمالِ عجیبہ پر قدرت نظافت و طہارت میں مبالغہ مراد ہو۔ اگر معاملہ یہی ہے تو ہم مانتے ہیں ملائکہ ان اُمور میں بشر سے کہیں زائد ہیں لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ثواب میں بشر سے اکثر ہیں۔

ارشادالٰہی:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (پ۲۱ لقمان:۱۰) اس نے آسمان بغیر ستونوں کے بنائے جوتم دیکھتے ہو

کا یہ تقاضا نہیں کہ وہاں نہ نظر آنے والے ستون ہیں، اسی طرح ارشادالٰہی ہے:

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ (پ۱۸، مومن:۱۷) اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کی پوجا کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں

یہ تقاضا نہیں کہ وہاں کوئی دوسرا اللہ ہے اور اس پر برہان موجود ہے، اسی طرح کا معاملہ یہاں بھی ہے۔

بارہویں دلیل: حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب کسی لیے طلب مغفرت کی دعا کی تو پہلے اپنے لیے کی اور پھر دیگر اہل ایمان کیلئے کی ہے، حضرت آدم کی دعا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (پ۸، الاعراف:۲۳) اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ہے:

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا (پ۲۹، نوح:۲۸) مجھے بخش دے اور میرے والدین اور اسے جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ (پ۱۳، ابراہیم:۴۱) اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔

رَبِّ ھَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (پ۱۹، الشعراء:۸۳) اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عرض ہے:

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِاَخِیْ (پ۹، الاعراف:۱۵۱) اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے بھائی کو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ سے فرمایا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (پ۲۶، محمد:۱۹) اے محبوب اپنے لئے اور عام مسلمان اور مرد اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ — تا کہ اللہ تمہارے سبب تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ بخشے (پ۲۶، الفتح:۲)

لیکن ملائکہ نے اپنے لیے کبھی طلب مغفرت کی دعا نہیں کی۔ ہاں وہ اہل ایمان بشر کیلئے دعا کرتے ہیں۔ یہ ارشادات عالیہ یہی بیان کرر ہے ہیں۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ — معاف فرما دے جو توبہ کرتے اور تیری راہ کی اتباع کرتے ہیں اور انہیں عذاب دوزخ سے بچا (پ۲۴، غافر:۷)

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — اور وہ مغفرت مانگتے ہیں اہل ایمان کے لئے

اگر ملائکہ طلب مغفرت کے محتاج ہوتے تو اپنے سے ابتدا کرتے اس لیے کہ اپنی ذات سے رفع ضرر سب سے مقدم ہے۔

فرمان نبوی ہے، اخراجات میں:

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ ثُمَّ بِمَنْ تَعُوْلُ (مسلم،۹۹۷) — اپنے آپ سے ابتدا کرو اور پھر جس کی ذمہ داری تم پر ہے۔

تو یہ حقیقت آشکار ہو رہی ہے کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے: یہ وجہ یہ نہیں بتاتی کہ ملائکہ سے کبھی لغزش نہیں ہوئی اور انسانوں سے ہوتی ہیں۔ لیکن ہم پہلے واضح کر آئے ہیں کہ اس میں تفاوت، فضیلت میں تفاوت لازم نہیں کرتا۔

کچھ اہل علم کا کہنا یہ ہے کہ ملائکہ انسان کیلئے جو طلب مغفرت کی دعا کرتے ہیں یہ ان کی بشر پر اس طعن پہ معذرت ہے۔

انہوں نے کہا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (پ۱، البقرۃ:۳۰) — کیا تو اسے بنائے گا جو زمین میں فساد پھیلائے گا

تیرھویں دلیل: ارشاد مبارک ہے:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ — بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں معزز لکھنے والے (پ۳۰، الانفطار:۱۰،۱۱)

یہ تمام اولاد آدم مکلفین کے حوالہ سے ہے حتیٰ کہ اس میں حضرات انبیاء علیہم السلام بھی شامل ہیں۔

تو یہ دو وجہ سے اس پر دلیل ہے کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں۔

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے انہیں اولادِ آدم کے محافظ بنایا۔ مکلف کی معصیت سے حفاظت کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ خطاو زلل سے محفوظ اور زیادہ دور ہو تو یہاں ثابت ہو رہا ہے ملائکہ، بشر سے معاصی سے بہت دور اور طاعات میں بہت قریب ہیں اور اس بات کا تقاضا فضیلت میں اضافہ ہی ہے۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابت کو انسان کی طاعت کے حق میں اور ان کے معاصی کے خلاف دلیل بنایا۔ اس کا تقاضا ہے کہ ملائکہ کے قول کو انسانی قول پر فضیلت حاصل ہو، اگر انسان کا درجہ برابر ہوتا تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے یہ کہنا کہ حافظ کیلئے لازم ہے کہ وہ محفوظ سے زیادہ محفوظ ہو۔ یہ بعید ہے کیونکہ بعض اوقات بادشاہ اپنی اولاد پر اپنے غلام کو حافظ مقرر کرتا ہے تو وہاں حافظ کا محفوظ سے اشرف ہونا لازم نہیں۔

ان کی شہادت بشر پر دلیل ہے۔ یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ شاہد بعض اوقات مشہود علیہ (جس پر گواہی ہے) سے کم درجہ رکھتا ہے

چودھویں دلیل: ارشادِ مقدس ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (پ ۳۰، النبأ:۳۸)

اور جس دن جبرائیل کھڑا ہوگا اور سب فرشتے پرباندھے کوئی نہ یہ بول سکے گا مگر جسے رحمٰن نے اذن دیا اور اس نے ٹھیک بات کہی

یہاں ملائکہ کے بیان احوال سے مقصود، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کی تفصیل ہے اگر مخلوق میں کوئی اور گروہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا بیان بہتر کرسکتا تو اس مقام پر اس کا ذکر اولیٰ تھا۔ پھر جس طرح ذکر ملائکہ سے آخرت میں اپنی عظمت بیان کی اسی طرح دنیا میں بھی ذکر ملائکہ کے ساتھ بیان کی۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (پ ۲۴، الزمر:۷۵)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کیے ہوئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بولتے ہیں۔

سوال: کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بات بلاشبہ بعض امور ملائکہ کے بشر پر بلندی و زائد ہونے پر دال ہے لیکن یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حالت اضافی ان کی قوت، شدت اور گرفت ہی ہے۔

یہ اسی طرح کا معاملہ ہے کہ سلطان جب بیٹھتا ہے تو اس کے اردگرد اطراف عالم کے ملوک خشوع و خضوع کے ساتھ بیٹھتے ہیں اس سے عظمت سلطان اجاگر ہوتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ وہ سلطان کے ہاں اپنی اولاد سے زیادہ اشرف و معزز

نقل قدر

ہوجائیں، یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔

پندرھویں دلیل: ارشاد الٰہی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (پ۳، البقرہ: ۲۸۵) اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتے اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو

اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے صحت ایمان کیلئے ان اشیاء پر ایمان ضروری ہے، پہلے اپنی ذات کا ذکر کیا دوسرا مرتبہ پر ملائکہ، تیسرے پر کتب پھر چوتھے پر انبیاء کو لایا گیا اسی طرح اس ارشاد میں بھی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (پ۳، آل عمران: ۱۸) گواہی دی اللہ نے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ (پ۲۲، الاحزاب: ۵۶) اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر

تقدیم ذکری، تقدیم درجہ پہ دلیل ہوتی ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ عرفاً یہ بات قبیح ہے کہ ادنیٰ کا ذکر اشرف سے مقدم کیا جائے تو لازماً شرعاً بھی یہ قبیح ہے۔ عرف میں یہ فعل قبیح ہے اس پر یہ شعر شاہد ہے:

عمیرۃ ودع ان تجھزت غادیاً کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیاً

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ شعر سن کر فرمایا: اگر تم اس میں اسلام کو مقدم کرتے تو بہتر ہوتا۔

پھر جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان معاہدات لکھے گئے تو تقدیم اسم پر اختلاف ہوا۔ اسی طرح سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان معاہدہ کے وقت بھی ہوا تو اس سے واضح ہوجاتا ہے تقدیم ذکری، مزید شرف پر دلیل ہوتی ہے۔

جب عرف میں یہ ثابت ہے تو لازماً شرع میں بھی اسی طرح ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے اہل اسلام اچھا جانیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔ (مسند احمد: ۳۷۹)

نوٹ: یہ روایت موقوف ہے (مترجم قادری)

تو ثابت ہوا ذکر میں ملائکہ کی رسل سے تقدیم، ان کی تقدیم فضیلت پر دلیل ہے۔

سوال: کوئی یہ اشکال اٹھا سکتا ہے کہ یہ دلیل ضعیف ہے کیونکہ اگر سہارا واؤ ہے تو یہ ترتیب پر دال نہیں اور اگر تقدیم ذکر پر ہے تو پھر سورۃ تبت کا سورۃ قل ھو اللہ پر تقدم اس کے مخالف و متضاد ہے۔

۱۶۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ (پ۲۲،الاحزاب:۵۶) بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے پر

یہاں صلوات ِملائکہ کو حضور ﷺ کیلئے بطور تشریف وعزت بیان کیا ہے جو واضح کر رہا ہے ملائکہ نبی سے افضل ہیں۔

کوئی کہہ سکتا ہے یہ بات اگلے الفاظ کے مخالف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ اے اہل ایمان تم بھی ان پر درود بھیجو۔

یہاں اہل ایمان کو نبی پر صلاۃ کا حکم ہے تو اہل ایمان کا حضور ﷺ سے افضل ہونا لازماً متصور نہیں تو یہی بات ملائکہ کی ہے۔

سترہویں دلیل، حضرت جبریل اور حضرت محمد ﷺ پر گفتگو

حضرت جبریل امین علیہ السلام حضرت محمد ﷺ سے افضل ہیں۔ دلائل یہ ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (پ۳۰،التکویر:۱۹،۲۲) جو قوت والا ہے مالک عرش کے حضور عزت والا وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے امانت دار ہے اور تمہارے صاحب مجنون نہیں

یہاں جبریل امین کی چھ صفات کا تذکرہ ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معزز و اکرم ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قوت والے ہیں تو اب اللہ تعالیٰ کے ہاں قوت سے مراد ان کی طاعات پہ ایسی قوت ہے جو کسی دوسرے میں نہیں۔

۴۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکین ہیں۔

۵۔ عالم سموات میں انہیں کا حکم چلتا ہے۔

۶۔ تمام خدمات میں امین اور تمام انواع خیانات سے مبرا اور معصوم ہیں۔

حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کی ان صفات کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کی۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ اور تمہارے ساتھی دیوانہ نہیں

اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صفات فضل، میں جبرئیل امین کے مساوی یا قریب ہوتے تو جبریل کی ان صفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت آپ کے منصب میں نقص، شان میں تحقیر اور حق کا ابطال ہے اور ایسی بات کرنا اللہ تعالیٰ کے بارے میں جائز ہی نہیں تو یہ آیت بتا رہی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی درجہ ہے کہ وہ مجنون نہیں اور یہ بتا رہا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان فضل و درجہ میں کوئی نسبت ہی نہیں۔

سوال: کوئی اگر سوال اٹھائے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ یہ تمام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں نہ کہ جبریل امین کی۔

جواب: ارشاد الٰہی:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ آپ نے اسے افق مبین پر دیکھا

اسے باطل قرار دے رہا ہے۔

سوال: ہم سب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مجنون نہ ہونے کے علاوہ بھی بے شمار صفات ہیں لیکن اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر نہیں فرمایا تو ان فضائل کے یہاں عدمِ ذکر سے ان کا بالاجماع عدم، لازم نہیں آتا۔

یوں کہا جائے کہ جب حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس مقام پر مذکور صفت کے علاوہ بھی بے شمار فضائل ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان فضائل کی بنا پر حضرت جبریل علیہ السلام سے افضل ہیں جس طرح یہاں حضرت جبریل علیہ السلام کی چھ صفات ذکر ہوئیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ (بلکہ آٹھ) صفات کا یوں تذکرہ فرمایا:

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (پ ۲۲، الاحزاب:۴۵،۴۶)

اے غیب کی خبریں بتانے والے بیشک ہم نے تمہیں بھیجا گواہ و ناظر خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا

(۱) نبی ہونا، (۲) رسول ہونا، (۳) شاہد ہونا، (۴) مبشر ہونا، (۵) نذیر ہونا

(۶) اللہ کی طرف اسی کے حکم سے داعی ہونا، (۷) سراج، (۸) منیر

الغرض دو اشخاص میں سے کسی کے الگ اوصاف کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے سے ان اوصاف کی نفی ہے۔

اٹھارویں دلیل: فرشتے انسان سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور زیادہ علم والا دوسرے پر افضل ہوتا ہے لہٰذا فرشتے افضل ہوں گے

یہ قول کہ فرشتے انسان سے زیادہ علم والے ہیں، پر دلیل یہ ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام، حضرت محمد ﷺ کے معلم ہیں۔ارشاد الٰہی ہے

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰى (پ۲۷،النجم:۵) انہیں سخت قوتوں والے طاقتور نے سکھایا

اور معلم کا متعلم سے زیادہ علم والا ہونا ضروری ہے۔

علوم کی دو اقسام

پھر علوم کی بھی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم: علوم جنہیں بذریعہ عقل حاصل کیا جاتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم ان میں کوتاہی نہیں ہوسکتی نہ حضرت جبریل علیہ السلام سے اور نہ حضرت محمد ﷺ سے اس لیے کہ یہاں تقصیر جہل ہے اور یہ معرفت الٰہی میں رکاوٹ ہے۔

رہا مخلوقاتِ الٰہیہ کی کیفیات، ان میں موجود عجائبات کا علم، عرش، کرسی، لوح وقلم، جنت ودوزخ، طبقات آسمانی، انواع اور مشاہدہ زیادہ ہے تو ان کا علم بھی اکثر واتم ہوگا۔

دوسری قسم: علوم جن تک رسائی سوائے وحی الٰہی کے کسی کی نہ ہو نہ حضرت محمد ﷺ اور نہ کسی نبی علیہ السلام کو۔ ہاں ان کا علم حضرت جبریل امین کے واسطہ سے ہوگا تو اب حضور ﷺ کو حضرت جبریل امین پہ فضیلت دینا محال ہے۔حضرت جبریل امین، اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان واسطہ رہے تو یہ تمام سابقہ شرائع اور موجودہ شریعت کے عالم ہیں اور یہ شرائع ملائکہ اور ان کے احکام وذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہیں اور حضرت محمد ﷺ ان سے آگاہ نہیں۔

تو ثابت ہوا حضرت جبریل علیہ السلام حضرت محمد ﷺ سے علم زیادہ رکھتے ہیں، اس ثبوت کے بعد لازم کہ جبریل امین آپ سے افضل ہوں، ارشاد الٰہیہ ہے

قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کہہ دیجیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں

(پ۲۳،الزمر:۹)

سوال: ملائکہ کا بشر سے زیادہ علم والا ہونا ہم تسلیم نہیں کرتے۔دلیل یہ ہے کہ ملائکہ نے اس کا اعتراف کیا، حضرت آدم علیہ السلام ان سے علم زیادہ رکھتے ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

نقل قدیر

نَبِّئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ　اے آدم آگاہ کرا نہیں ان کے ناموں سے

(پ ۱، البقرة: ۳۳)

چلو ہم علمی اضافہ مان لیتے ہیں لیکن یہ کثرت ثواب کا تقاضا نہیں کرتا ہم صاحب بدعت کو دیکھتے ہیں وہ علم کے کثیر دقائق کا احاطہ کیے ہے مگر وہ کسی ثواب کا مستحق نہیں چہ جائے اس کا ثواب دوسروں سے اکثر ہو۔ اس کا سبب پیچھے متعدد دفعہ بیان کرتے آئے ہیں کہ کثرت ثواب، افعال میں اخلاص کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ملائکہ کا اخلاص بشر سے اکثر ہے۔

اُنیسویں دلیل: ارشاد گرامی ہے:

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ　اور جس نے ان میں سے کہا کہ میں اللہ کے سوا معبود ہوں تو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں گے

(پ ۱۷، الانبیاء: ۲۹)

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ملائکہ بلندی اور علو درجہ میں اس قدر بلند ہیں اگر یہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت کریں تو یہ صرف اور صرف دعویٰ اُلوہیت ہی کریں گے لیکن کسی اور شی مثلاً اتباع شہوت میں دعویٰ نہیں کریں گے اور یہ چیز ان کے انتہائی مقام پر دلیل ہے

سوال: یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے انتہائی مقام میں تو کوئی نزاع ہی نہیں پھر یہ بھی مسلم کہ وہ اگر مخالفت کریں گے تو دعویٰ اُلوہیت میں ہی کریں گے اور یہ اس لیے کہ ان کے علوم کثیر، قوتیں شدید ہیں اور وہ خواہش بطن وفرج سے مبرا ہیں۔ جس کا معاملہ اسی طرح کا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت اس طریقہ پہ کرے گا جو تم نے بیان کیا لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے یہ چیز، اس پر لیل ہے کہ ملائکہ، بشر سے ثواب میں زیادہ درجہ رکھتے ہیں اور محل نزاع یہی بات ہے۔

بیسویں دلیل: حضور ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ سے بیان کیا:

وَاِذَا ذَكَرَنِيْ عَبْدِيْ فِيْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاٍ خَيْرٍ مِنْ مَلَائِهٖ　اور جب میرا بندہ مجھے مجلس میں ذکر کرتا ہے میں اس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں

سوال: یہ تو خبر واحد ہے پھر یہ بتاتی ہے کہ ملأ ملائکہ، ملأ بشر سے اعلیٰ ہے اور ملأ بشر سے مراد عوام ہیں نہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام و ملائکہ کے عام بشر سے افضل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ انبیاء سے بھی افضل ہوں۔

یہ تمام دلائل نقلی وسمعی اور شرعی تھے

فلاسفہ کا اتفاق

یاد رہے فلاسفہ کا اس پر اتفاق ہے، ارواح سماویہ اور ملائکہ، ارواحِ ناطقہ بشریہ سے افضل ہیں اس بارے میں ان کے دلائل عقلیہ یہ ہیں۔اب انشاء اللہ تعالیٰ ان کا ذکر کریں گے۔

پہلی دلیل: ملائکہ کی ذوات بسیط ہیں اور کثرت سے مبرا ہیں لیکن بشر، نفس اور بدن سے مرکب ہے اور نفس قویٰ کثیرۃ ہے۔اسی طرح بدن اجزا کثیرہ سے مرکب ہے، بسیط، مرکب سے افضل ہوتا ہے اس لیے کہ مرکب کے اسباب عدم، بسیط کے مقابل اکثر ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی فردانیت، اس کے صفاتِ جلال اور نعوت کبریائی میں سے ہے۔

اعتراض: اس پہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہم بسیط کا مرکب سے افضل ہونا نہیں مانتے اس لیے کہ جانب روحانی امر واحد جبکہ جانب جسمانی دو اامور، روح اور جسم ہیں تو اس کا روح کے اعتبار سے عالم روحانیات اور انوار سے تعلق ہے اور جسم کی وجہ سے عالم جسمانیات سے ہے تو یہ روحانی وجسمانی کے اجتماع کی وجہ سے لازماً محض روحانی اور محض جسمانی سے افضل ہوگا اسی راز کی وجہ سے بشر اول کو مسجود ملائکہ بنایا گیا۔

ایک اور طریق سے یوں کہا جاسکتا ہے ارواح ملکی علائق جسمانی سے جدا و مجرو ہیں تو ان کا مقامات نورانیہ میں استغراق یوں ہوگا کہ وہ اس عالم جسمانی کے تدبیر سے دور و غافل ہوں گے، لیکن نفوس بشری نبویہ یہ دونوں جہانوں کو جمع کرنے پہ قادر ہیں تو ان کی بلندی معارف وعوالم قدس میں دائمی ترقی ہوگی کہ یہ تدبیر عالم سفلی سے دور نہ ہوں گے اور نظم عالم اجسام کی طرف ان کا التفات عالم اروح میں ان کے استعمال سے مانع نہیں تو ان نفوس کی قوت، دونوں جہاں میں تدبیر اور دونوں اجناس کے احاطہ کی وجہ سے کامل ہوگی لہٰذا ان کا اشرف واعظم ہونا لازمی ہے۔

دوسری دلیل: جواہر روحانیہ اس خواہش سے مبرا ہوتی ہے جو خون بہانے کا منشا بنتی ہے لیکن ارواح بشریہ میں وہ موجود ہے تو منبع شر سے خالی، شر میں مبتلا سے اشرف ہوتیں ہے۔

اعتراض: بلاشبہ موانع اور عوائق کے باوجود طاعت پر دوام زیادہ اخلاص پر دلیل ہے اس دوام سے جس میں یہ موانع وعوائق نہ ہوں یہ چیز نشان دہی کر رہی ہے کہ مقام بشر محبت میں اعلیٰ واکمل ہے۔

پھر روحانی کی طاعتِ خالق، اللہ کے دشمن شیاطین پر قہر کا موجب نہیں ہوتیں لیکن جب ارواح بشری خالق کی طاعت بجا لاتے ہیں تو اس طاعت سے قوی شہوانیہ وغضبیہ جو شیاطین انس میں ہیں پر قہر ٹوٹتا ہے لہٰذا ان کی طاعات اکمل ہیں۔

فضل قدیر

پھر ظاہر یہ ہے کہ درجات روحانیات، لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا کہنے پر اکمل ہے اس لیے جب انہوں نے کہا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (پ۱، البقرۃ:۳۰) کیا تو اسے بنائے گا جو زمین میں فساد پھیلائے گا

تو اس کی وجہ فقط انکسار تھا جو لغزش سے حاصل ہوا اور یہ انکساری بشر میں اکمل ہوتی ہے اس لیے حضور ﷺ نے اپنے رب کا فرمان بیان کیا:

لَاَنِیْنُ الْمُذْنِبِیْنَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ زَجْلِ الْمُسَبِّحِیْنَ گناہگاروں کا رونا مجھے تسبیح ملائکہ کی جھنکار سے زیادہ محبوب ہے (شعب الایمان،۵:۴۵۲)

تیسری دلیل: روحانیات، طبیعات بالقوہ سے مبرا ہیں۔ جو کچھ ان سے انواع اور اشخاص کے حوالہ سے ممکن ہے تمام کا صدور بالفعل ہے حالانکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا معاملہ یوں نہیں۔

اس لیے حضور ﷺ کا فرمان ہے، میں دن رات میں اللہ تعالیٰ سے سو دفعہ استغفار کرتا ہوں اور میں (ذاتی طور پر) نہیں جانتا میرے ساتھ کیا، کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ (مسلم،۲:۲۷۰)

قرآن مجید میں ہے:

مَاكُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (پ۲۵، الشوریٰ:۵۲) اس سے پہلے اپنی عقل سے تم کتاب جانتے تھے اور نہ ہی احکامِ شرع کی تفصیل

بلاشبہ فعل کامل، فعل بالقوۃ سے اشرف ہوتا ہے۔

اعتراض: ہم ان کا فعل تام ہونا تسلیم نہیں کرتے، بعض امور میں وہ بالقوۃ ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے ان کی افلاک کیلئے تحریکات، تعقلات کو قوۃ سے فعل کی طرف لانے کیلئے ہیں تو یہ تحریکات ان کی نسبت ان تحریکات کی طرح ہیں جو ان اروح کو عارض ہیں جو تعقلات کو قوۃ سے فعل کی طرف لانے کے قوی فکری اور تخیلی رکھتے ہیں۔

چوتھی دلیل: روحانیات کا وجود ابدی اور یہ تغیر و قوت سے مبرا ہیں لیکن نفوس ناطقہ بشریہ کا معاملہ یوں نہیں۔

اعتراض: یہ دونوں مقدمے ہم نہیں مانتے کیا یہ روحانیات اپنی ذوات میں ممکن الوجود نہیں اور مادہ کے اعتبار سے واجب الوجود ہیں تو یہ حادث ہوئے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے مگر ارواح بشریہ کا حادث ہونا ہم نہیں مانتے بلکہ یہ بعض کے نزدیک ازلی ہیں اور وہ

کہتے ہیں یہ ارواح سرمدی طور پر موجود، عرش کے نیچے سایہ کی طرح اپنے رب کی حمد کرتی ہیں البتہ مبدئ اول نے انہیں عالم اجسام اور مقامات مادیات کی طرف اترنے کا حکم دیا جب وہ ان اجسام سے متعلق ہوئیں تو ان کی عاشق ہوگئیں اور ان کے ساتھ اُلفت ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان اظلال میں اکمل اور اشرف (انبیاء) کو اس جہاں میں بھیجا تا کہ ارواح کو ان سکنات سے خلاصی دلوائیں۔ صاحب کلیلہ دمنہ کے باب الحمامہ میں یہی موجود ہے۔

پانچویں دلیل: روحانیات، نوری، علوی اور لطیف ہیں جبکہ جسمانیات ظلماتی، سفلی اور کثیف ہیں۔ بداہتہً عقل شاہد ہے کہ نور، ظلمت سے اشرف، علوی سفلی سے بہتر اور لطیف کثیف سے اکمل ہوتے ہیں۔

اعتراض: یہ تمام مادہ کی طرف اشارہ ہے، ہمارے نزدیک شرف کا سبب حکمِ رب العالمین کی فرمانبرداری ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (پ۱۵ الاسراء:۷۵) تو فرما دو روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے

شرفِ مادہ کی بنا پر شرف کا دعویٰ، پہلے لعنتی کی دلیل ہے پھر اسے جو کچھ قرار دیا گیا وہ سب کے سامنے ہے۔

چھٹی دلیل: روحانیات سماویہ کو جسمانیات پر، قوی علم و عمل کے سبب فضیلت حاصل ہے۔

علم، تمام حکماء کا اتفاق ہے۔ روحانیات سماویہ، مغیبات کا احاطہ اور امور مستقبل پر اطلاع رکھتے ہیں اور ان کے علوم فطری فعلی دائمی ہیں جبکہ علوم بشری کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

عمل یہ دائمی عمل خدمت میں رہتے ہیں، دن رات تسبیح کرتے ہیں تھکتے نہیں۔ ان کی آنکھوں کو نیند، عقول کو سہو۔ اور ان کو غفلت عارض نہیں ہوتی۔ ان کا طعام تسبیح، ان کا پینا تقدیس اور تمہید و تہلیل، ان کا سانس ذکر اللہ، ان کی خوشی، خدمت اللہ یہ علائق بدنیہ سے خالی، ان میں قوی شہوانی و نفس کا کوئی حجاب نہیں، ایک دونوں اقسام میں سے دوسری کیسے ہوسکتی ہے؟ جو کچھ تم نے ذکر کیا اس میں کوئی نزاع ہی نہیں۔

اہم باریک نکتہ

ہاں اہم نکتہ دقیق یہاں ہے کہ لطیف غذائیں تناول کرنے والے ان سے وہ لذت نہیں پاتے جو کثیر دن بھوک میں مبتلا شخص لذت پاتا ہے تو ملائکہ ان درجات عالیہ پر دوام کی وجہ سے لذت نہیں پاتے جیسے بشر پاتے ہیں جو اکثر اوقات علائق جسمانیہ اور حجاب ظلمانی میں ہوتے ہیں تو لذت کا یہ اضافہ بشر کی خصوصیات میں سے ہے اس فرمان الٰہی سے ممکن ہے مراد یہی ہو۔

فضل قدیر

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (پ ۲۲، الاحزاب: ۷۲)

بیشک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اٹھا لی

اس لیے کہ منافی چیزوں میں ابتلاء کے بعد مناسب کا ادراک، دائمی مناسب کے ادراک سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے اس لیے اطباء کا قول ہے حرارت ظاہری بخار میں اندرونی بخار سے اشد ہوتی ہے لیکن جب یہی حرارت دائمی ہو جائے تو اس کا شعور ختم، تو یہ حالت ملائکہ کو حاصل نہیں، ان کے کمالات دائمی ہیں اور وہ باقی اجسام کو حاصل نہیں کیونکہ وہ ادراک کی قوۃ استعداد سے خالی ہوتے ہیں تو اب ایسی شئی نہیں جو سوائے بشر کے اس امانت کو اٹھانے کی قوت دے۔

ساتویں دلیل: روحانیات کو تبدیلی اجسام اور انقلاب اجرام پہ قوت ہوتی ہے اور یہ قوت جنس مزاجیہ میں سے نہیں کہ اسے تھکاوٹ و بوجھ محسوس ہو۔ پھر تم نے پودوں کی ابتدائی حالت بھی دیکھی کہ وہ لطیف سی کونپل پتھر کو شق اور سخت زمین کو پھاڑ دیتی ہے، یہ قوۃ نباتیہ ہے جو قوی سماویہ کی جواہر سے انہیں حاصل ہوتی ہے تو پھر خود ان قوی سماویہ اور روحانیات کا عالم کیا ہوگا جو اجسام سفلیہ میں تبدیلی انقلاب جیسا تصرف کرتی ہیں ان پر بوجھ کا اٹھانا مشکل نہیں۔ انہیں پہاڑوں کو حرکت دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہوائیں ان کی تحریک سے چلتی ہیں۔ سحاب ان کے تصرف سے آگے پیچھے چلتے ہیں، اسی طرح پہاڑوں میں زلزلے ان کی طرف سے آتے ہیں، شریعت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

ارشاد الٰہی ہے

فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا (پ ۲۶، الذاریات: ۴)

پھر حکم کے تقسیم کرنے والیاں

اور عقلیں بھی اسی پر دال ہیں لیکن ارواح سفلیہ کا معاملہ یوں نہیں لہٰذا یہ ایک دوسرے کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں؟

ملائکہ کی قوت شیاطین سے زیادہ

یہ جو قول ہے کہ شیاطین اور ارواح خبیثہ بھی اس پر قادر ہیں ہم اسے نہیں مانتے۔ اگر تسلیم کر لیں تو اسمیں نزاع نہیں کہ ملائکہ کی قدرت ان پر اشد اور اکمل ہے۔

اس لیے بھی کہ ارواح طیبہ ملکیہ، عالم سفلی کے مصالح اور مناظر میں تصرف کرتے ہیں اور ارواح خبیثہ کے قوتیں، شرور میں تصرف کرتی ہیں تو یہ برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

اعتراض: کوئی بعید نہیں کہ نفوسِ بشریہ میں سے کوئی کامل، قوی نفس، اجرام عنصری میں تبدیلی وانقلاب پہ قادر ہو تو ایسے نفس کے عدم پر کیا دلیل ہے۔

آٹھویں دلیل: روحانیات کو جلالِ انوار الٰہی سے ایسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو انہیں ایسی خیرات کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس عالم کے نظم تک محدود ہیں اس میں شر وفساد کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا بخلاف اختیارات بشریہ دونوں جہات علو وسفل اور خیر وشر کے درمیان ہیں اور ان کا خیرات کی طرف میلان، ملائکہ کے تعاون سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے ہر انسان کی رہنمائی فرشتہ ہی کرتا ہے۔

اعتراض: یہ بات بتا رہی ہے کہ ملائکہ اپنی خدمات پہ مجبور کی طرح ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو دونوں میں اختیار ہے تو مختار، مجبور سے افضل ہوا کرتا ہے۔

لیکن یہ ضعیف ہے اس لیے کہ تردد تب تک رہتا ہے۔ جب تک صدورِ فعل محال ہو، جب فعل کو ترجیح حاصل ہوگی تو وہ موجب وواجب بن جاتا ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کیلئے خیرات بالقوۃ ہوئیں، البتہ ملائکہ کے واسطہ سے وہ عمل وفعل میں آئیں لیکن ملائکہ کی خیرات تو بالفعل ہی ہیں لہٰذا یہ دونوں ایک نہیں۔

نویں دلیل: روحانیات، ہیاکل کے ساتھ مختص اور یہ سیارات سبعہ ہیں، باقی ثوابت وافلاک، ابدان کی طرح، کواکب، قلوب اور ملائکہ ارواح کی طرح ہیں، تو ارواح کی نسبت دوسرے ارواح کی طرف ابدان کی ابدان کی طرف نسبت کی طرح ہے پھر ہمیں یہ علم ہے کہ احوال افلاک کے اختلافات، اس جہاں کے اختلاف احوال کے حصول کے مبادی ہیں اس لیے کہ حرکات کواکب سے مختلف اتصالات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تسدیس، تثلیث، تربیع، مقابلہ، مقاربہ اسی طرح مناطق افلاک کبھی وہ ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں، اسی کو رتق (کھولنا) کہا جاتا ہے تو اب عمارت عالم باطل اور وہ مناطق ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو عمارت اس عالم علوی غالب سے عالم سفلی کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

اس طرح ارواح عالم سفلی کا معاملہ ہے خصوصاً مباحث حکمیہ اور علوم فلسفہ اسی پر دال ہیں کہ اس عالم کے ارواح، عالم علوی کے ارواح کے معلومات، اور ان ارواح کے کمالات معلول ہیں ان ارواح کی نسبت ان ارواح کے ساتھ اس چھوٹے شعلہ کی، بلکہ سورج کے اور پانی کے قطرے کے سمندرِ اعظم کے مقابل ہے تو یہ سفلی آثار ہیں جبکہ علوی مبداء ومعاد ہیں تو ان میں مساوات کا قول درست نہیں چہ جائے سفلی کو اعلیٰ کہا جائے۔

فضل قدیر

اعتراض: تم نے جوذکر کیا اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، بصورت تسلیم ابھی بحث باقی ہے اس لیے کہ جیسے گز رامحرومی کے بعد حصول لذت اس دائمی حصول سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے اور یہ حالت صرف بشر کو ہی حاصل ہے۔

دسویں دلیل: روحانیات فلکیہ، اس عالم کی روحانیات کے لیے مبادی ومعاد ہیں مبدا، صاحب مبدا سے اشرف ہوتا ہے اس لیے کہ ہر کمال جو صاحب مبدا کو حاصل ہوتا ہے وہ مبدا سے ہی مستفاد ہوتا ہے اور مستفید واجب سے کم درجہ رکھتا ہے اسی طرح معاد کا مبدا سے اشرف ہونا ضروری ہے تو عالم روحانیات عالم کمال ہے تو مبدا، معاد اور مصدر ومرجع وہی ہیں۔

پھر ارواح اپنے عالم سے اتر کر بدن سے متصل ہوتے ہیں تو یہ اجسام کی میل سے میلے ہوئے پھر اخلاق ذکیہ اور پسندیدہ اعمال کی وجہ سے پاک ہوئے حتیٰ کہ جدا ہو کر وہ اپنے عالم اول میں پہنچے نزول نشاۃ اول اور صعود نشاۃ ثانیہ ہے تو معلوم ہوا روحانیات اشخاص بشریہ سے اشرف ہیں۔

اعتراض: تمہاری گفتگو تب ثابت ہو سکتی ہے جب معاد اور حشر کی نفی ہو ورنہ نہیں۔

گیارہویں دلیل: کیا تمام انبیاء کا اس پر اتفاق نہیں کہ وہ معارف وعلوم میں وحی کے بعد ہی گفتگو کرتے ہیں تو یہ اعتراف ہے کہ ان کے علوم ملائکہ سے مستفاد ہیں۔

کیا اس پر اتفاق نہیں کہ ملائکہ نے دشمنوں کے مقابل انبیاء علیہم السلام کی مدد کی۔ مثلاً قوم لوط کے شہروں کو اٹھا کر پھینکا اور بدر کے دن۔

پھر یہ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی کرتے ہیں جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا واقعہ ہے۔

جب ان تمام میں اتفاق ہے پھر تم کس بنا پر انبیاء کو ملائکہ پر فضیلت دیتے ہو جبکہ خود تصریح کرتے ہو کہ ان تمام امور میں انبیاء، ملائکہ کے محتاج ہیں۔

بارہویں دلیل: عقلی تقسیم بتاتی ہے کہ زندہ، خیر محض ہوں گے یا سراپا شر یا دونوں کا اشتراک، خیر محض ملائکہ، سراپا شر، شیاطین، دونوں میں متوسط، انسان۔

پھر انسان ناطق وصاحب موت ہیں اور اس کے دونوں جانب دو اقسام بھی ہیں۔

۱۔ ناطق مگر ان پر موت نہیں، فرشتے۔

۲۔ ان پر موت ہے مگر ناطق نہیں، چوپائے۔

یہ عملی تقسیم بتا رہی ہے کہ بشر کمال کے متوسط درجہ اور فرشتے کمال کے اعلیٰ درجہ پر ہیں تو اب انسان کو افضل ماننا عقلی تقسیم کا اُلٹ اور ترتیب وجود میں تنازعہ کھڑا کرنا ہے۔

اعتراض: افضل سے مراد کثرت ثواب ہے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ملائکہ کا ثواب زیادہ ہے۔

اس مسئلہ میں وجوہ عقلیہ کا خلاصہ یہی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے افضل ہونے پر دلائل

دوسرا موقف یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں؟

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کا حکم دیا، جیسے واضح ہو چکا کہ وہ قبلہ کی طرح نہ تھے بلکہ سجدہ انہیں کیلئے تھا، جب یہ ثابت ہے تو لازماً حضرت آدم علیہ السلام ان سے افضل ہوں گے۔ کیونکہ سجدہ تو رفع و بلندی کی انتہا ہے، اشرف کو ادنیٰ کیلئے انتہائی تواضع کا حکم عقلاً قبیح و بدتر ہے مثلاً یہ نہایت ہی قبیح ہے کہ امام ابوحنیفہ کو اس آدمی کی خدمت کا کہا جائے جو فقہ کا نہایت ہی قلیل علم رکھتا ہو تو یہ بات واضح کر رہی ہے حضرت آدم علیہ السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا اور یہاں خلافت سے ولایت وحکومت مراد ہے، ارشاد الٰہی ہے۔

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (پ۲۳،ص:۲۶) اے داؤد بیشک ہم نے تجھے زمین پر نائب بنایا تو لوگوں میں سچا حکم کرو

اور یہ مسلمہ بات ہے کہ بادشاہ کے ہاں اعلیٰ منصب یہی ہے کہ اس کا نائب ولایت وتصرف میں اس کے قائم مقام اور اس کا خلیفہ ہو، یہ حضرت آدم علیہ السلام کے تمام مخلوق سے اشرف ہونے کی دلیل ہے، یہ ارشادات عالیہ اسی کی تائید وتاکید کر رہے ہیں۔ فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (پ۱۷،الحج:۶۵) اور تمہارے تابع کیا جو کچھ زمین میں ہے

پھر اسی عموم کی تاکید فرمائی

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا — پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے تمام

(پ۱، البقرۃ:۲۹)

تو حضرت آدم علیہ السلام منصب خلافت میں اس درجہ پر ہیں کہ دنیا ان کے بقا کا سامان اور آخرت ان کی جزا کی مملکت ہے ان پر تکبر کی وجہ سے شیاطین ملعون ٹھہرے۔ جن ان کی رعایا، ملائکہ ان کی طاعت وسجود اور تواضع میں ہیں پھر بعض ملائکہ ان کے اور ان کی اولاد کے محافظ، بعض انہیں رزق پہنچانے والے، بعض ان کی لغزشوں پر استغفار کرنے والے ہیں پھر ان مناصب عالیہ کے باوجود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (پ۲۶، ق:۳۵) — اور ہمارے ہاں اس سے کہیں زائد ہے

تو اب اس کمال وجلال کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

تیسری دلیل: سیدنا آدم علیہ السلام کا علم ان سے زیادہ، اور زیادہ علم والا افضل ہوتا ہے ان کے اعلم (زیادہ علم والا) ہونے پر دلیل یہ ہے کہ جب ملائکہ سے اسماء کے بارے میں پوچھا:

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (پ۱، البقرۃ:۳۲) — بولے تیری ذات پاک ہے ہمیں نہیں علم مگر تو نے جو ہمیں سکھایا بلاشبہ تو ہی علم وحکمت والا ہے

تو اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ (پ۱، البقرۃ:۳۳) — اے آدم انہیں ان کے نام بتاؤ جب انہوں نے ان کے نام بتا دیے فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا

یہ آیات نشاندہی کر رہی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جن اشیاء کے عالم تھے ملائکہ ان کا علم نہ رکھتے تھے اور زیادہ علم والے کے افضل ہونے پر دلیل یہ فرمان الٰہی ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ — بتا دیجئے کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں؟

(پ۲۳، الزمر:۹)

چوتھی دلیل: ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (پ۳، آل عمران:۳۳) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل کو عمران کی آل کو سارے جہانوں سے

اللہ کے علاوہ ہر کوئی عالم میں شامل ہے، پہلے گزرا عالم سے علم ہے تو جو اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر نشان و دلیل ہے وہی عالم ہے بلاشبہ ہر حادث وجود اللہ تعالیٰ پر دلیل ہے تو ہر حادث عالم ہے، تو ارشاد الٰہی:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (پ۳، آل عمران:۳۳) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل کو عمران کی آل کو سارے جہانوں سے

کا معنی یہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام و نوح علیہ السلام کو تمام مخلوق میں منتخب فرمایا ہے، بلاشبہ ملائکہ مخلوق میں شامل ہیں تو یہ آیت مبارکہ نشاندہی کر رہی ہے کہ ان انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے افضل کیا ہے۔

سوال: اس پر اس ارشاد الٰہی سے اشکال وارد ہو سکتا ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (پ۱، البقرۃ:۴۷) اے اولاد یعقوب یاد کرو بڑا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر تمہیں فضیلت دی

کیونکہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ملائکہ اور حضرت محمد ﷺ سے بھی افضل ہوں تو اسی طرح کا معاملہ آیت مذکورہ کا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ (پ۳ آل عمران:۴۲) اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا

یہ ان انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہے جو یہود کے اسلاف تھے، جب وہ موجود تھے تو اس وقت حضرت محمد ﷺ اس زمانہ میں موجود نہ تھے، جب آپ موجود نہ تھے تو اس وقت عالمین میں سے نہ ہوئے کیونکہ معدوم عالمین میں شامل نہیں، جب معاملہ یوں ہے تو اس وقت کے لوگوں میں سے ان کا انتخاب و افضل ہونے سے یہ لازم نہیں کہ وہ حضرت محمد ﷺ سے بھی افضل ہوں، حضرت جبریل امین اس وقت موجود تھے، جب فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (پ۳، آل عمران:۳۳) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل کو عمران کی آل کو سارے جہانوں سے

تو اس سے لازم آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت جبریل علیہ السلام سے افضل ومنتخب فرمایا ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رہے وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ "میں دلیل کی بنا پر تخصیص ہوسکتی ہے مگر مذکورہ آیت کے حوالہ سے کوئی ایسی دلیل نہیں جو ترک ظاہر کی موجب وسبب ہو لہٰذا اسے عموم پر ہی رکھنا لازم ہے۔

پانچویں دلیل: ارشاد الٰہی ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۱۰۷) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا

ملائکہ، عالمین میں شامل ہیں تو حضرت محمد ﷺ ان کیلئے بھی رحمت ہے لہٰذا حضرت محمد ﷺ کا ان سے افضل ہونا ضروری ہے

چھٹی دلیل: عبادتِ بشر، اشق ومشکل ہے لہٰذا ان کا افضل ہونا ضروری ہے۔ان کی عبادت اشق ہونے پر دلائل یہ ہیں۔

۱۔ آدمی کے اندر شہوت وخواہش ہے جو اسے برائی کی دعوت دیتی ہے حالانکہ فرشتوں میں ایسی کوئی خواہش نہیں۔ معارض و مخالف کے موجود ہوتے ہوئے فعل بجالانا اس سے مشکل ہے یہاں ایسا کوئی مخالف نہ ہو۔

سوال: ملائکہ کے اندر بھی خواہش ہے جو انہیں برائی کی طرف لے جاتی ہے اور وہ خواہش ریاست وملکوت ہے۔

جواب: ہمیں یہ تسلیم ہے، واقعۃً معاملہ یونہی ہے لیکن بشر میں تو انواع شہوات کثیر ہیں مثلاً خواہش بطن۔ خواہش فرج و ریاست، ملائکہ میں خواہش ریاست کے علاوہ کوئی اور خواہش موجود ہی نہیں، تو زیادہ خواہشات میں مبتلا کی عبادت وطاعت اس سے اشق ہوگی جو واحد خواہش میں مبتلا ہے۔

۲۔ ملائکہ صرف نصوص پر عمل کرتے ہیں، ارشاد فرمایا:

لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (پ۱، البقرۃ:۳۲) ہم نہیں جانتے مگر وہ جو تو نے علم دیا

لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۲۷) بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں

لیکن بشر میں اجتہاد وقیاس کی قوت بھی ہے، ارشاد فرمایا

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ (پ ۲۸، الحشر:۲) تو عبرت حاصل کرو اے نگاہ والو

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا میں فیصلے کے وقت اجتہاد سے کام لوں گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصویب فرمائی اور اجتہاد پہ عمل کا نص سے اشق ہونا واضح ہے۔

۳۔ بشر کیلئے شبہات، ملائکہ کی نسبت زیادہ ہیں اس لیے کہ قوی شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ افلاک اور انجم، اسی عالم کے حوادث کا سبب ہیں تو بشر اس شبہ کے ازالہ کا محتاج ہے جبکہ ملائکہ محتاج نہیں کیونکہ وہ عالم سموات میں رہتے تھے وہ مدبر و صانع کی طرف اسباب عالم محتاج ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۴۔ شیطان، ملائکہ کو وسوسہ نہیں ڈال سکتا حالانکہ وسوسہ بشر پر مسلط ہے یہ بہت بڑا تفاوت ہے جب یہ ثابت تو بشر کی طاعت اشق ہوئی تو لازم ہے ان کا ثواب بھی نص کی وجہ سے زیادہ و اکثر ہو۔ فرمان نبوی ہے:

اَفْضَلُ الْعِبَادَاتِ اَحْمَزُهَا (کشف الخفاء:۴۵۹) افضل عبادات زیادہ مشقت والی ہوتیں ہے

عقلاً بھی یہی ہے ہم جانتے ہیں جسے خواتین کی طرح میلان نہ رہا ہو گر وہ زنا سے رُکتا ہے تو اس کی وہ فضیلت نہیں جو رغبت شدید اور شوق عظیم رکھنے کے باوجود اس سے رُکتا ہے، اسی طرح کا معاملہ یہاں ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو عقلمند بنایا مگر ان میں خواہش نہیں، بہائم کو بلا عقل شھوات کے ساتھ پیدا کیا، انسان میں دونوں جمع کر دیں اب انسان بہائم سے کئی درجے بلند ہے کہ اس کی حد بھی نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی بسبب شہوت، ملائکہ سے کم ہو۔ پھر آدمی کو دیکھتے ہیں جب اس کی خواہش عقل پر غالب آ جائے اور خواہش کے مطابق عمل کرے نہ کہ بمطابق عقل تو اب اس کا درجہ چوپایہ سے کم ہو جاتا ہے ارشاد الٰہی میں اس کی نشاندہی ہے:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (پ ۹، الاعراف:۱۷۹) وہ چوپایوں کی طرح ہیں جبکہ ان سے بھی بدتر ہیں

اسی وجہ سے آدمی دوزخ میں جائے گا اور چوپائے وہاں نہیں جائیں گے تو اب یہ قول لازم ہے کہ جب اس کا عقل خواہش پر غالب ہو، وہ نفس کی خواہش کے تابع نہ رہے اور وہ صرف اور صرف عقل کے تابع ہو کر عمل بجالائے تو اب ایک طرف کا اعتبار کرتے ہوئے وہ ملائکہ سے افضل ہوگا۔

۸۔ ملائکہ محافظ اور اولادِ آدم محفوظ، محفوظ، محافظ سے اشرف و معزز ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے اولادِ آدم، اللہ تعالیٰ کے ہاں ملائکہ سے اشرف ہو۔

۹۔ منقول ہے شب معراج براق پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری کی تو رکاب حضرت جبریل امین نے پکڑی تھی۔

نقل قدیر

یہ آشکار کر رہا ہے کہ حضرت محمد ﷺ جبریل امین سے افضل ہیں۔ اسی طرح جب آپ ﷺ بعض مقامات (سدرہ) پر پہنچے تو حضرت جبریل علیہ السلام پیچھے رہ گئے اور کہا:

لَوْ دَنَوْتُ اَنْمِلَةً لَاَ حْتَرَقْتُ — اگر میں ایک پورا آگے جاؤں تو میں جل جاؤں

۱۰۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے میرے دو وزیر آسمانوں پر اور دو وزیر زمین پر ہیں، آسمانوں پر حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہم السلام، زمین پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، یہ روایت بتا رہی ہے کہ حضرت محمد ﷺ بادشاہ کی طرح ہیں اور حضرت جبریل و میکائیل ان کے وزیر کی مانند تو لازم ہے حضرت محمد ﷺ فرشتوں سے افضل ہوں۔ (سنن ترمذی، ۳۶۸۰)

یہ بشر کے ملائکہ سے افضل ہونے پر دلائل ہیں۔

مخالفین کا جواب

جو ملائکہ کو افضل مانتے ہیں انہوں نے ان دلائل کا یہ جواب دیا ہے۔

پہلی دلیل کا جواب

پہلے گزرا کچھ لوگوں کا قول ہے سجدہ سے مراد تواضع ہے نہ کہ زمین پر پیشانی رکھنا، بعض نے زمین پر پیشانی رکھنا مانا مگر کہا، سجدہ اللہ تعالیٰ کیلئے تھا اور حضرت آدم قبلہ تھے، ان دونوں صورتوں میں کوئی اشکال نہیں۔ اگر مان لیا جائے سجدہ حضرت آدم کیلئے ہی تھا تو یہ تو نہیں کہتے کہ اشرف کا حقِ شریف میں ایسا کرنا ناجائز ہے۔

اس لیے کہ بعض اوقات حکمت کا تقاضا اشرف کی کثرتِ حُب اور طاعت و فرمانبرداری کی انتہا ہے اس لیے کہ سلطان کو حق حاصل ہے کہ کم درجہ کے غلام کو اونچا بٹھا دے اور اکابر کو اس کی خدمت میں بٹھا دے، اس سے مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ تمام امور اور احوال میں سلطان کی بات تسلیم کرتے ہیں کیونکہ جائز نہیں کہ یہاں معاملہ بھی اسی طرح پر ہو۔

کیا ہمارا مذہب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے اور جو چاہے فیصلہ دے، اس کے افعال کسی غرض کے تابع نہیں۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ انسان کے اندر کفر تخلیق کرے اور پھر اسے ابد الآباد تک عذاب دے، جب بات یہی ہے تو پھر یہ اعتراض کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے اعلیٰ کو ادنیٰ کیلئے سجدہ کا حکم کیوں کیا؟

دوسری دلیل کا رد

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنایا جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زمینی تمام اشیاء سے افضل ہوں تو یہ آسمانی ملائکہ سے افضل ہونے پر دلیل نہیں۔

سوال: کسی آسمانی فرشتہ کو زمین پر اپنا خلیفہ کیوں نہ بنایا؟

جواب: اس کی چند وجہ ہیں۔

۱۔ بشر، ملائکہ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

۲۔ جنس، جنس کی طرف زیادہ میلان رکھتی ہے۔

۳۔ ملائکہ نہایت ہی طہارت وعصمت کے مالک ہیں۔

یہی بات اس ارشاد الٰہی میں بیان ہوئی:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (پ۷، الانعام:۹) اور اگر ہم نبی کو فرشتہ کرتے تو بھی اسے مرد ہی بناتے

تیسری دلیل کارد

ہم حضرت آدم علیہ السلام کا ملائکہ سے زیادہ علم والا ہونا تسلیم نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت آدم لُغات کے عالم تھے اور ملائکہ انہیں نہ جانتے تھے، ممکن ہے باقی اشیاء کے ملائکہ عالم ہوں اور انہیں حضرت آدم علیہ السلام نہ جانتے ہوں، اس بات کی تائید یوں بھی ہے، ہمارا اتفاق ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آدم علیہ السلام سے افضل ہیں حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لُغات سے واقف نہیں

پھر اور دیکھئے، ابلیس اس بات کا عالم تھا کہ اس درخت کے قرب سے لازماً حضرت آدم جنت سے نکال دیے جائیں گے لیکن حضرت آدم اس سے آگاہ نہ تھے تو اس سے یہ لازم کہاں ابلیس، حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہو جائے پھر ہُدہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا:

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ (پ۱۹، النمل:۲۲) میں نے دیکھا جو آپ نے نہیں دیکھا

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے افضل ہو جائے۔

پھر اگر ان کا اعلم (زیادہ علم والا) ہونا مان لیں تو یہ قول کیوں درست نہیں ملائکہ کی طاعات میں طاعتِ آدم سے زیادہ اخلاص ہے لہٰذا ان کا ثواب بھی اکثر وزیادہ ہوگا۔

چوتھی دلیل: مذکور دلائل میں یہ نہایت ہی قوی دلیل ہے۔

پانچویں دلیل

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (پ۱۷، الانبیاء:۱۰۷) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

حضرت محمد ﷺ کا ملائکہ کیلئے رحمت ہونا آپ کی افضلیت کو لازم نہیں کرتا جیسا کہ ارشاد الٰہی

فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَةِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا — تو اللہ کی رحمت کے اثر کو دیکھو کس طرح زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مرنے کے بعد

(پ۲۱، الروم:۵۰)

اس میں کوئی استحالہ نہیں کہ آپ ﷺ ملائکہ کیلئے بعض وجوہ سے رحمت ہوں اور بعض ملائکہ آپ کے لیے رحمت ہوں۔

چھٹی دلیل: عبادت بشر اشق ہے، یہ قاعدہ اس سے ٹوٹ جاتا ہے کہ ہم ایک صوفی کو مجاہدہ میں اس قدر مشقتیں اور تکالیف برداشت کرتے پاتے ہیں کہ ان کی مثل حضور ﷺ نے نہیں اٹھائیں حالانکہ حضور ﷺ ان تمام سے افضل ہیں اور یہ افضلیت کثرتِ ثواب کی وجہ سے ہے جس کی بنیاد نیت میں اخلاص ہے تو ممکن ہے فعل آسان ہو مگر بجالانے والے کی نیت اکثر ہو تو ثواب بھی اس پر اکثر ہوگا۔

ساتویں دلیل: یہ بغیر علتِ جامع کے دو اطرف کو جمع کرنا ہے۔

آٹھویں دلیل: محفوظ کا حافظ سے اشرف و اعلیٰ ہونا ہر حال میں درست نہیں بلکہ کبھی حافظ، محفوظ سے اشرف ہوتا ہے مثلاً جرنیل کو باغی سپاہیوں پر مقرر کیا جاتا ہے۔

آخری دو وجہ

آخر دو دلیلوں کا تعلق اخبار احاد سے ہے اور یہ دونوں شدتِ تواضع رسول ﷺ سے معارض ہیں۔ اس مسئلہ کا یہاں اختتام ہو رہا ہے۔ و باللہ التوفیق۔

پانچواں مسئلہ: جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ساجدین سے مستثنیٰ کیا تو یہ گمان ممکن تھا کہ وہ ترک سجدہ میں معذور ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اس نے قدرت کے باوجود سجدہ نہ کیا اور ”اَبٰی“ (اس نے انکار کیا) نے نہایت واضح کر دیا کیونکہ اباء کا معنی، اختیار ہوتے ہوئے، رک جانا ہے اگر کوئی فعل پر قادر نہ ہو تو اسے ”ابٰی“ نہیں کہا جا سکتا۔ کبھی اباء ہوتا ہے مگر ساتھ تکبر نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے ”وَاسْتَكْبَرَ“ کے ساتھ بتا دیا اس کا انکار تکبر کے ساتھ تھا ممکن تھا انکار اور کبر ہو مگر کفر نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے ”وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ“ فرما کر بتا دیا ساتھ کفر بھی تھا۔

قاضی عبدالجبار کہتے ہیں یہ آیت مبارکہ کئی وجہ سے جبریہ کی تردید کرتی ہے۔

۱۔ جبریہ کا خیال ہے جب اس نے سجدہ کیا تو وہ سجدہ پر قادر نہ تھا کیونکہ ان کے ہاں فعل پر قدرت کی نفی ہے حالانکہ جو شئی پر قادر نہ ہو اسے یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے انکار کیا۔

۲۔ جو فعل پر قادر نہ ہو اسے نہیں کہا جاتا کہ اس نے فعل بجالانے سے تکبر کیا اس لیے کہ جب وہ فعل پر قادر ہی نہیں تو اسے استکبر عن الفعل، نہیں کہا جاسکتا، استکبار کا وصف اس وقت ہو گا جب اس نے فعل نہ کیا حالانکہ اگر ارادۂ فعل کرتا تو اس کیلئے ممکن تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ

اور کافرین میں سے ہوا

اسے کافر قرار دینا جائز نہیں کہ اس نے وہ فعل نہ کیا جس پر وہ قادر ہی نہ تھا۔

۴۔ اس کا تکبر اور سبب انکار، اس میں تخلیق الٰہی سے تھا تو اب اس کا مذموم ہونے سے معذور ہونا اولیٰ تھا اور جو اسے اپنا مذہب مان کر ابلیس کے لیے عذر بناتا تو وہ گھاٹے کا سودا کرے گا۔

جواب: اس کا جواب اہل جبر کی طرف سے یہ ہے، قاضی ویسے ہی متعدد وجوہات سے بات کرتے ہیں حالانکہ حاصل ان کا یہی ہے کہ معاملہ، امر، نہی اور ثواب وعتاب کی طرف لوٹتا ہے (یعنی ان کا عدم لازم آتا ہے)

ہم بھی قاضی سے کہتے ہیں، بتایئے ابلیس سے اس فعل کا صدور کسی قصد وداعی کی وجہ سے ہوا یا نہیں۔ اگر قصد داعی کی وجہ سے ہے تو یہ مقصد کہاں سے آیا؟ اس کا وقوع فاعل سے نہیں ہے یا فاعل سے۔ اگر فاعل سے ہے تو وہ بندہ ہے یا اللہ تعالیٰ؟ اگر اس کا وقوع فاعل سے ہے تو صانع کا ثبوت کیسے ہوگا؟ اگر وقوع بندہ سے ہے تو اس کا قصد کسی اور قصد کی بنا پر ہے تو تسلسل لازم اور اگر کوئی قصد اور نہیں تو وقوع فعل بغیر قصد ہوا جس کا ابطال آرہا ہے، اگر قصد کا وقوع فاعل اللہ تعالیٰ سے ہوا تو اب آپ کے اعتراضات ہماری طرح آپ پر بھی وارد ہوں گے۔

اگر تم کہو فعل کا وقوع قصد وداعی کے بغیر ہوا تو مرجح کے بغیر ممکن کا ترجیح پانا لازم اور یہ اثبات صانع کا دروازہ بند کرنا ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رہے اگر فعل بغیر قصد ہوا تو اب اس کا وقوع اتفاقاً ہوگا اور انسانی عمل بندے کا اختیار وقدرت میں نہیں ہوتا تو پھر اس کا حکم دیا جانا اور اس سے منع کیسے درست ٹھہرا۔ تو قاضی صاحب کا اب امر و نہی سے استدلال کا کیا فائدہ؟ یہ کثیر وجوہات اس ایک حرف کی طرف لوٹ آتی ہیں۔

پھر اسی طرح کا برہان قاطع، تمہارے پچھلوں کا قلع قمع کر دے گا اور تمہارے کلام کی جڑ کاٹ دے گا اگر اولین وآخرین اس برہان پر جمع ہو جائیں تو وہ خلاصی نہیں پاسکتے یا تو مانیں کہ ممکن کا وقوع بلا مرجح ہے اس سے اثبات صانع کا معاملہ ڈھپ یا مانیں اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے اور جو چاہے فیصلہ کرے اور یہی ہمارا جواب ہے۔

فضل قدیر

چھٹا مسئلہ، عقلاء کے دو اقوال

ارشادِ الٰہی "وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ"، میں عقلاء کے دو اقوال ہیں:

۱۔ ابلیس جب سے مشغول عبادت ہوا یہ منافق و کافر ہی تھا، اس کی تقریر ان دو وجہ سے ہے۔

وجہ اول: شیخ محمد بن عبدالکریم شہرستانی نے الملل والنحل کی ابتداء میں شارح اناجیل اربعہ ماری سے نقل کیا کہ تورات میں متفرق مقامات پہ مذکور ہے کہ حکم سجدہ کے بعد اس کے اور ملائکہ کے درمیان بصورت مناظرہ یوں گفتگو ہوئی۔

حکمت پر سات اعتراضات

ابلیس نے ملائکہ سے کہا: میں مانتا ہوں کہ میرا اللہ ہے اور وہی میرا خالق و موجد ہے اور وہی مخلوق کا خالق ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی حکمت پر سات اعتراضات ہیں۔

۱۔ خلق کی حکمت کیا ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ جانتا ہے کہ کافر بوقت تخلیق آلام کا مستحق نہیں۔

۲۔ مکلّف بنانے کا کیا فائدہ باوجودیکہ اس سے نہ کوئی ضرر ہوتا ہے اور نہ نفع، جو مکلفین کو حاصل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حصول پر بغیر مکلّف بنانے قادر ہے۔

۳۔ مجھے تسلیم ہے وہ مجھے اپنی طاعت و معرفت کا مکلّف بنائے لیکن اس نے مجھے سجودِ آدم کا مکلّف کیوں بنادیا؟

۴۔ جب میں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے اس کی نافرمانی کی تو اس نے مجھے دھتکار دیا اور مجھے سزا کا مستحق قرار دیا حالانکہ اس میں اس کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی دوسرے کا البتہ مجھے اس میں ضررِ اعظم ہے۔

۵۔ جب اس نے میرے ساتھ یہ کردیا تو مجھے دخول جنت اور آدم علیہ السلام کو وسوسہ ڈالنے پر قدرت کیوں دی؟

۶۔ جب میں نے یہ کیا تو مجھے ان کی اولاد پر مسلط اور ان کے اغواو اضلال (گمراہ کرنے) پر قدرت کیوں دی؟

۷۔ جب میں نے اس سے طویل مدت و مہلت مانگی تو اس نے مجھے مہلت کیوں دے دی؟ اور یہ مسلم حقیقت ہے اگر جہان بشر سے خالی رہتا تو یہی بہتر تھا۔

شارح انجیل لکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے سرا وقات جلال و کبریاء سے اس پر وحی کی، اے ابلیس تجھے میری معرفت نصیب ہی نہیں ہوئی، اگر تجھے میری معرفت مل جاتی تو تجھے علم ہوتا، میرے افعال پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہوسکتا، میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں جو کروں اس پہ سوال نہیں کیا جاسکتا۔

یادر ہے اگر اولین وآخرین جمع ہو کر کہیں کہ حسن وقبح کا مدار عقل پر ہے تو وہ ان اعتراضات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور تمام ان پر لازماً وارد ہوں گے۔

لیکن جب ہم وہی جواب دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا تمام شبہات ختم۔ بلکہ اعتراضات کا ازخود ازالہ ہو جائے گا اور کیسے نہ ہو۔ اللہ سبحانہ کی ذات اقدس اپنی ذات وصفات میں واجب الوجود ہے اور وہ اپنی فاعلیت میں دیگر موثرات ومرجحات سے مستغنی وبے نیاز ہے اس لیے کہ اگر وہ محتاج ہے تو وہ فقیر ہوگا نہ کہ غنی تو اللہ تعالیٰ کی ذات مقطع حاجات اور منتہی رغبات ہے اور تمام طلبات کا حصول اس سے ہوتا ہے جب حقیقت میں صورت حال یہی ہے تو اس کے افعال کیلئے لم وعلت عارض نہ ہو سکے گی اور نہ اس کی خالقیت پر کوئی اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے، کسی کا قول کس قدر خوبصورت ہے۔

جَلَّ جَنَابُ الْجَلَالِ عَنْ اَنْ یُوْزَنَ بِمِیْزَانِ الْاِعْتِزَالِ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اس سے بلند ہے کہ اسے اعتزال کی میزان سے تولا جائے

تو اس قول والوں نے ارشاد الٰہی "وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ" کو اپنے ظاہر پر رکھا اور کہا جب سے ابلیس ہے وہ کافر ومنافق ہی ہے

دوسری وجہ: ابلیس کے دائمی کافر ہونے کی بنا پر اصحاب الموافات کا قول ہے کہ ایمان، دائمی عذاب کا مستحق نہیں بننے دیتا تو دائمی ثواب اور دائمی عتاب کا جمع ہونا محال ہے، جب مکلّف کسی وقت مسلمان تھا پھر اس سے (اللہ کی پناہ) بعد میں کفر ہوا تو اب دونوں کا استحقاق اجتماعی ہوگا، یہ تو محال ہے جس طرح اوپر بیان ہو گیا یا عارض ہونا سابق کو زائل کر دے گا یہ بھی محال ہے کیونکہ احباط کا قول باطل ہے تو اب یہ باقی رہ گیا یہ مفروضہ ہی محال ہے، حصول ایمان کیلئے شرط ہے کہ کسی وقت بھی کفر کا صدور نہ ہو، جب خاتمہ کفر پر ہوا تو ہمیں علم ہو گیا جو اس سے اولاً صادر ہوا تھا وہ ایمان نہ تھا، جب یہ ثابت ہے تو اب ہم بیان کرتے ہیں جب ابلیس کا خاتمہ کفر پر ہوا تو ہمیں علم ہو گیا وہ اولاً مومن نہ تھا۔

دوسرا قول: ابلیس اولاً مومن تھا، بعد میں اس سے کفر کا صدور ہوا، ان کا 'وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ' کی تفسیر میں اختلاف ہے کچھ نے کہا کہ یہ علم الٰہی میں کافر تھا یعنی اللہ تعالیٰ ازل میں جانتا تھا یہ عنقریب کفر کرے گا تو لفظ "کَانَ" کا تعلق علم سے ہے نہ کہ معلوم سے

دوسرا قول یہ ہے کہ جب اس نے مومن ہونے کے بعد معین وقت میں کفر کیا تو یہ وقت کفر گزرنے کے بعد یہ قول درست ہے کہ یہ اس وقت کافر تھا تو اب کان من الکافرین کہنا درست ہے۔ گویا یہ، کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ فِیْ ذٰلِکَ الْوَقْتَ" کا جز ہے جب مرکب صادق ہے تو مفرد بھی صادق ہوگا

فضل قدیر

تیسرا قول یہ ہے کہ، کَانَ بمعنی صَارَ یعنی بن گیا کافر۔

چند مباحث

یہاں چند مباحث ہیں۔

پہلی بحث: کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ، کی کیا اس پر دلالت ہے اس سے پہلے کفار کی جماعت تھی تبھی مِنَ الْکَافِرِیْنَ کہنا درست ہوگا

۱۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی دلالت اس پر ہے اس لیے کہ مِنْ بعضیہ ہے تو لفظ بعض کفار کا تقاضا کرتا ہے کہ کچھ دوسرے لوگ بھی کافر تھے تا کہ ان کا یہ بعض ٹھہرے۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، اللہ تعالیٰ نے کچھ ملائکہ پیدا فرمائے۔ ان سے فرمایا: میں مٹی سے انسان پیدا کروں گا جب میں اسے تیار کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم نے اسے سجدہ کرنا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم تو ایسا نہیں کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ بھیجی اس نے انہیں جلا دیا تو ابلیس ان انکار کرنے والوں کی طرح ہی ہے۔

۲۔ کچھ کا قول یہ ہے کہ آیت کی اس پر دلالت ہی نہیں ان کے ہاں آیت کی دو طرح تفسیر ہے۔

پہلی تفسیر: معنی یہ ہے کہ ابلیس ان میں سے ہوگیا جو بعد میں اس کے کفر میں موافق ہوں گے، یہ شیخ اصم کا قول ہے اس کی مثال انہوں نے اس ارشاد الٰہی کے ساتھ دی ہے۔

وَالْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ — منافق مرد اور منافق عورتیں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں

(پ۱۰، التوبہ:۶۷)

تو یہاں دین میں موافقت کے سبب انہیں ایک دوسرے کا بعض کہا ہے تو یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے، نزولِ آیت کے وقت اہل جہاں کا کفر نہایت ہی آشکار تھا تو 'کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ' کہنا درست ہے۔

دوسری تفسیر: یہ افراد ماہیت ہی سے ایک فرد کی ماہیت کی طرف نسبت ہے تو اس اضافت کی صحت کیلئے ماہیت کا وجود ضروری نہیں۔ مثلاً وہ حیوان جسے اللہ تعالیٰ نے اولاً پیدا کیا تو اس کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ حیوان کا ایک فرد ہے لیکن اس کا یہ معنی ہرگز نہیں وہ ذہن سے خارج میں حیوانات موجودہ میں ایک حیوان ہے بلکہ معنی یہ ہے۔

کہ وہ اس ماہیت کے افراد کا ایک فرد اور اس حقیقت کے احاد میں سے ایک ہے۔ اس بحث سے یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا ابلیس، اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلا کفر کرنے والا ہے؟ اکثریت کی رائے یہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے میں اول ہے۔

دوسری بحث، معصیت اور کفر

معتزلہ اور ہمارے نزدیک معصیت وگناہ، موجب وسبب کفر نہیں۔ ہمارے نزدیک اس لیے کہ صاحب کبیرہ مومن ہی رہتا ہے اور معتزلہ کے ہاں اس لیے کہ اگرچہ وہ ایمان سے نکل جاتا ہے مگر کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ خوارج کے ہاں ہر معصیت کفر ہے اور انہوں نے اس آیت مبارکہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا اللہ تعالیٰ نے اس معصیت کی وجہ سے ابلیس کو کافر قرار دیا ہے جو واضح کررہا ہے کہ معصیت کفر ہوتی ہے۔

جواب: اگر ہم یہ کہہ دیں کہ یہ ابتداً ہی سے کافر تھا تو یہ سوال ختم، اور اگر ہم اسے ابتدأ مومن قرار دیں تو پھر اسے کافر اس لیے قرار دیا گیا کہ اس نے تکبر کرتے ہوئے اپنی سرکشی اور بغاوت کو حق جانا کیونکہ اس نے کہا ''اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' (میں اس سے بہتر ہوں) (واللہ اعلم)

ساتواں مسئلہ: تمام فرشتوں کو سجدہ کا حکم

اکثریت کا یہی قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ کا حکم تمام فرشتوں کو تھا، اس پر ان کے دو دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: لفظ 'الملائکۃ' جس میں عموم ہوتا ہے پھر اسے کامل طور پر مؤکد کر کے اس فرمان میں بھی لایا گیا ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (پ۱۴، الحجر:۳۰) تو سجدہ کیا تمام ملائکہ نے اکٹھا

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے ان سے ابلیس کو مستثنیٰ کر کے نکالا، تو ان میں سے ایک کو نکالنا واضح کررہا ہے کہ اس کے علاوہ تمام اس حکم میں داخل تھے۔

بعض کا انکار

لہٰذا یہ بعض لوگوں نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا اس حکم کا حکم اکابر ملائکہ کیلئے ہونا عجیب ہے لہٰذا یہ صرف زمینی ملائکہ کیلئے تھا

حکماء کا قول

فلاسفہ نے ملائکہ سے جواہر روحانی مراد لیتے ہوئے کہا کہ ارواح سماوی کا نفوسِ ناطقہ کیلئے جھکنا اور فرمانبردار ہونا محال ہے۔ لہٰذا ملائکہ جنہیں سجدہ کا حکم ہوا اس سے مراد وہ قویٰ بشریہ ہیں جو نفس ناطقہ کی مطیع ہیں۔ اور اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کتب عقلیات میں مذکور ہے

تفسیر کا دوسرا جز: یہاں مکمل ہوا اس کے بعد تیسرا جز ہے جس کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی سے ہو رہی ہے: وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔

فضلِ قدیر

ترجمہ

جز ۳

تفسیرِ کبیر

مُترجم

مُحقّقُ العصر

مُفتی محمد خان قادری مدظلہ العالی

تصنیف

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی علیہ الرحمۃ

مرکزِ تحقیقاتِ اسلامیہ

1- جامعہ اسلامیہ لاہور، میلاد سٹریٹ گلشن رحمان ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

نام کتاب	فضل قدیر ترجمہ تفسیر کبیر
مفاتیح الغیب جز،۳	تفسیر سورۃ البقرہ (آیت،۳۵ تا ۱۰۹)
تصنیف	امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (۶۰۶ھ)
ترجمہ	محقق العصر مفتی محمد خان قادری
اہتمام	محمد فاروق قادری
ناشر	مرکز تحقیقات اسلامیہ لاہور
حروف سازی	اسلامیہ کمپوزنگ سنٹر
صفحات	۴۸۲
اشاعت اول	2010ء

ملنے کے پتے

☆فرید بک سٹال اُردو بازار لاہور ☆ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، کراچی
☆ مکتبہ غوثیہ سبزی منڈی کراچی ☆ مکتبہ برکات المدینہ بہادر آباد کراچی
☆احمد بک کارپوریشن راولپنڈی ☆ اسلامک بک کارپوریشن راولپنڈی
☆اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ سیالکوٹ ☆ مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور
☆ مکتبہ جمال کرم دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ تنظیم المدارس جامعہ نظامیہ لاہور
☆ مکتبہ دارالعلم دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ نوریہ رضویہ گنج بخش روڈ لاہور
☆ مکتبہ قادریہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ رضوان کتب خانہ گنج بخش روڈ لاہور
☆ قادری رضوی کتب خانہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ نبویہ دربار مارکیٹ لاہور

مرکز تحقیقاتِ اسلامیہ لاہور

جامعہ اسلامیہ لاہور۔ 1، میلاد سٹریٹ گلشن رحمان ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

042,35300353...0300.4407048

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پارہ۔ ۱

(مفاتیح الغیب: جز ۳)

تفسیر سورۃ البقرۃ

آیت: ۳۵ تا ۱۰۹

رہنمائی بر مشمولات

(تفسیر کبیر جز،۳)

آیت ۳۵: وَقُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْكُنْ کی تفسیر	۳۳
حکم لازمی تھا یا نہیں؟	۳۳
اصح قول: اباحت وتکلیف دونوں	۳۳
دوسرا مسئلہ	۳۴
جنت میں حضرت حوا ؑ کی تخلیق	۳۴
حوا نام کی وجہ	۳۴
تیسرا مسئلہ: مراد حضرت حوا ہیں	۳۴
چوتھا مسئلہ: جنت زمین پر یا آسمان پر؟	۳۵
پہلا قول: مراد زمینی جنت ہے	۳۵
یہاں چھ دلائل ہیں	۳۵
دوسرا قول	۳۷
تیسرا قول: دارِثواب، یہی مراد ہے	۳۷
چوتھا قول	۳۷
پانچواں مسئلہ: رَغَدًا کا مفہوم	۳۷
چھٹا مسئلہ: عطف واؤ وفا کے ساتھ کیوں؟	۳۷
ساتواں مسئلہ: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کی تفسیر	۳۸
پہلی بحث: نہی تنزیہی ہے	۳۸
نہی تحریمی ہے	۳۹
تین دلائل ہیں	۳۹
مخالف دلائل کا رد	۳۹
دوسری بحث: قرب سے ممانعت، کھانے کی ممانعت کو لازم نہیں	۴۰
آٹھواں مسئلہ: یہ درخت کونسا تھا؟	۴۰
نواں مسئلہ: یہ ترک اولیٰ ہے	۴۱
تین اقوال	۴۱
انبیاء کو ظالم کہنا منع ہے	۴۲
آیت ۳۶: فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ کی تفسیر	۴۲
پہلا مسئلہ: عصمت انبیاء علیہم السلام	۴۳
پہلی قسم: انبیاء گمراہی سے پاک ہوتے ہیں	۴۳
دوسری قسم: کذب سے پاک	۴۳
تیسری قسم	۴۳
چوتھی قسم	۴۳

یہاں پانچ اقوال ہیں	۴۴
وقت عصمت کونسا ہے؟	۴۴
عصمت پر دلائل	۴۴
یہاں سولہ دلائل ہیں	۴۴
مخالفین کا رد	۵۰
۱-آیات اور اعتقادیات	۵۰
تین آیات سے استدلال	۵۰
استدلال کا جواب	۵۱
۲-آیات اور تبلیغ	۵۲
تین آیات سے استدلال	۵۲
۳-آیات اور فتاویٰ	۵۳
جواب	۵۳
۴-آیات اور افعال	۵۳
واقعہ سیدنا آدم علیہ السلام سے استدلال	۵۴
یہاں سات وجوہات ہیں	۵۵
سات وجوہ کا جواب	۵۶
لغزش کی کیفیت	۵۶
پہلا قول، بطور نسیان ہوا	۵۶
پہلی دلیل	۵۶
دوسری دلیل	۵۷
دونوں دلائل کا جواب	۵۷
دوسری وجہ کا جواب	۵۸
سوال و جواب	۵۸
بعض مفسرین کی رائے	۵۸
دوسرا قول: یہ فعل ان سے عمداً ہوا	۵۹
چار اقوال	۵۹
اس قول پر اعتراضات	۶۰
دو اُمور سے تائید	۶۰
حضرت آدم علیہ السلام سے خطا نہیں ہوئی	۶۰
ھٰذا کبھی نوع کے لیے آتا ہے	۶۱
عدم توجہ لاحق ہوئی	۶۱
نسیان ہو گیا	۶۱
نسیان کی وجہ سے کبیرہ نہ رہا	۶۲
ایک اور وجہ انفرادی طور پر ممانعت نہ تھی	۶۲
دوسرا مسئلہ، ابلیس نے وسوسہ کیسے ڈالا؟	۶۲
من گھڑت واقعہ	۶۲
وسوسہ خود ڈالا یا کسی خادم نے؟	۶۳
دو سوالات	۶۳
پہلا سوال	۶۳
جواب	۶۳
تحقیقی بات	۶۴
اہلِ معرفت کا قول	۶۴
دوسرا سوال، وسوسہ کیا تھا؟	۶۴
عدم توجہ اور نسیان	۶۵

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا کی تفسیر	۶۵	امام غزالی کی خوبصورت گفتگو	۷۳
پہلا مسئلہ، ھبوط کا مفہوم	۶۵	گفتگو پر اشکال	۷۵
دوسرا مسئلہ، حکم میں شمولیت ابلیس؟	۶۵	پانچواں مسئلہ: قاضی عبدالجبار کا سوال	۷۵
پہلی رائے	۶۵	شیخ ابو ہاشم کا قول	۷۶
ابلیس کو پہلے نکال دیا تھا	۶۵	چھٹا مسئلہ، لفظ توبہ کا مفہوم	۷۷
ممکن ہے وہاں دوبارہ گیا ہو	۶۶	قبول توبہ دو طرح	۷۷
دوسری رائے	۶۶	ساتواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا 'تواب' ہونا	۷۷
تیسری رائے	۶۶	آٹھواں مسئلہ	۷۷
یہ قول ضعیف ہے	۶۷	توبہ اور احادیث	۷۷
تیسرا مسئلہ: اِهْبِطُوْا امر ہے یا اباحت؟	۶۷	متعدد معانی	۷۸
چوتھا مسئلہ، عداوت کا حکم	۶۸	توبہ نصوح کا مفہوم	۷۹
پانچواں مسئلہ، مستقر کا مفہوم	۶۸	گناہ معاف کر کے نیکی لکھ دیتا ہے	۷۹
چھٹا مسئلہ، حین، کا مفہوم	۶۹	ننانوے قتل اور توبہ	۷۹
ساتواں مسئلہ، سبق حاصل کرلیں	۶۹	ماں سے زیادہ مہربان	۸۲
شیخ موصلی کا اہم قول	۷۰	بادشاہی میں کمی نہ ہو	۸۲
آیت ۳۷: فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کی تفسیر	۷۰	توبہ اور آثار	۸۳
پہلا مسئلہ، تلقی کا مفہوم	۷۰	دوسرا فائدہ، توبہ کی محتاجی	۸۳
دوسرا مسئلہ، مراد حقیقت توبہ سے آگاہی نہیں	۷۱	تیسرا فائدہ، سیدنا آدم علیہ السلام کا رونا	۸۳
تیسرا مسئلہ، وہ کلمات کیا تھے؟	۷۱	نواں مسئلہ، حضرت حوا کی توبہ	۸۳
چوتھا مسئلہ، توبہ اور تین اُمور	۷۳	آیت ۳۸: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا کی تفسیر	۸۴
		پہلا مسئلہ، تکرار حکم ھبوط کے فوائد	۸۴

دو وجوہات ہیں	۸۴	اختلاف لفظی ہے	۹۸
دوسرا مسئلہ، اُتارے جانے کے مقامات	۸۵	وجودِ صانع پر استدلال	۹۸
تیسرا مسئلہ، ہدایت کے معانی	۸۵	تیسرا مسئلہ، بنی اسرائیل پر مخصوص انعامات	۱۰۱
چار چیزوں کا حکم	۸۵	بنی اسرائیل پر انعامات	۱۰۱
چوتھا مسئلہ: جملہ مختصر مگر معانی کثیر	۸۶	نعمتوں کے تذکرہ کی وجوہات	۱۰۲
قول متکلمین	۸۶	یہ نعمتیں ان پر کیسے ہیں؟	۱۰۲
ابن زید کا قول	۸۷	اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ کی تفسیر	۱۰۲
اُخروی خوف کی نفی ہے	۸۷	دوسرا قول، رسول اللہ ﷺ کی بعثت و شانوں	
سوال و جواب	۸۷	کے بارے میں عہد	۱۰۳
پانچواں مسئلہ: قاضی کا قول	۸۸	اتباع پر دوہرا اجر	۱۰۴
آیت ۳۹: وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا کی تفسیر	۸۸	دو سوالات	۱۰۵
آیت کا ربط و تعلق	۸۸	پہلا سوال	۱۰۵
بنی اسرائیل پر مخصوص نعمتوں کے بارے میں گفتگو	۸۹	جواب	۱۰۵
آیت ۴۰: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا کی تفسیر	۹۰	دوسرا سوال	۱۰۵
پہلا مسئلہ، اسرائیل سے مراد کون؟	۹۰	جواب: نص خفی تھی نہ کہ جلی	۱۰۵
دوسرا مسئلہ، نعمت کا مفہوم	۹۰	سابقہ کتب سے انبیاء میں حضور ﷺ کا تذکرہ	
نعمت کی تین اقسام	۹۱	اور شہادتیں	۱۰۶
نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا	۹۱	دوسری بشارت	۱۰۶
سوال و جواب	۹۲	دعاء ابراہیمی اور بشارت عیسیٰ علیہما السلام	۱۰۹
بندوں پر پہلی نعمت	۹۳	فارقلیط کا معنی	۱۱۰
کافر اور نعمت	۹۴	اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ کی تفسیر	۱۱۱

اللہ تعالیٰ پہ کچھ لازم نہیں	۱۱۱
حق تفسیر دو طرح ہے	۱۱۱
وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ کی تفسیر	۱۱۲
عرفاء کا قول	۱۱۲
آیت ۴۱: وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ کی تفسیر	۱۱۳
مخاطب بنی اسرائیل ہیں	۱۱۳
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کی دو تفاسیر	۱۱۴
دوسری تفسیر	۱۱۴
وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ کی تفسیر	۱۱۴
پہلا سوال	۱۱۵
نو وجوہات ہیں	۱۱۵
دوسرا سوال	۱۱۶
متعدد جوابات	۱۱۶
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کی تفسیر	۱۱۷
آیت ۴۲: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کی تفسیر	۱۱۸
آیت کا ربط	۱۱۸
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر	۱۱۸
دو فوائد	۱۱۹
پہلا فائدہ	۱۱۹
دوسرا فائدہ، قید علم کیوں؟	۱۱۹
آیت ۴۳: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کی تفسیر	۱۱۹
آیت کا تعلق و ربط	۱۱۹
پہلا مسئلہ: تاخیر بیان اجمال جواز	۱۱۹
دوسرا مسئلہ: لفظ صلاۃ کا مفہوم	۱۲۰
لفظ زکوٰۃ کا مفہوم	۱۲۰
وجوہات مشابہت	۱۲۱
تیسرا مسئلہ	۱۲۲
وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی تفسیر	۱۲۲
آیت ۴۴: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کی تفسیر	۱۲۳
برّ سے کیا مراد ہے؟	۱۲۴
وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کی تفسیر	۱۲۴
فوائد و تعجب	۱۲۵
پہلا فائدہ	۱۲۵
دوسرا فائدہ: بے عمل وعظ کے غلط اثرات	۱۲۵
تیسرا فائدہ	۱۲۵
حضرت علی کا اہم قول	۱۲۶
پہلا مسئلہ: بے عمل کے وعظ کا حکم	۱۲۶
دو اُمور کا حکم	۱۲۶
دوسرا مسئلہ: فعل بندے کی تخلیق نہیں	۱۲۷

تیسرا مسئلہ: احادیث مبارکہ اور عمل وعظ	۱۲۷	آیت ۴۷، یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ	
اللہ کی دعوت دی	۱۲۸	کی تفسیر	۱۳۶
شیخ شبلی کا قول	۱۲۸	تاکیدی حکم	۱۳۶
آیت ۴۵: وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ کی تفسیر	۱۲۹	سوال، حضور ﷺ سے افضل ہونا	۱۳۶
آیت مبارکہ اور فوائد	۱۲۹	پہلی وجہ: کل مراد نہیں	۱۳۶
پہلا فائدہ، مخاطب کون ہیں؟	۱۲۹	دوسری وجہ: زمانہ کے لوگ مراد ہیں	۱۳۶
سوال وجواب	۱۲۹	تیسری وجہ	۱۳۷
دوسرا فائدہ	۱۳۰	چند فوائد	۱۳۷
وَاِنَّہَا کی تفسیر میں آراء	۱۳۱	یہاں دو فوائد ہیں	۱۳۸
لَکَبِیۡرَۃٌ کی تفسیر	۱۳۱	آیت ۴۸، وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ کی تفسیر	۱۳۸
آیت ۴۶: اَلَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ کی تفسیر	۱۳۲	تین چیزیں اور آخرت	۱۳۸
لفظ ظن کے بارے میں تحقیق	۱۳۲	پہلا سوال، تکرار کا مقصد کیا؟	۱۳۹
ظن بمعنی یقین	۱۳۲	جواب	۱۳۹
دوسرا قول	۱۳۳	دوسرا سوال: قبول شفاعت کے بعد اور پہلے	
یہاں تین وجوہ ہیں	۱۳۳	ذکر کی حکمت	۱۳۹
پہلا مسئلہ، جواز دیدار الٰہی پر استدلال	۱۳۳	جواب	۱۳۹
ان کا جواب	۱۳۵	الفاظ مبارکہ کی تفسیر	۱۳۹
دوسرا مسئلہ:	۱۳۵	وَلَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ کی تفسیر	۱۴۰
دو باطل فرقوں کا استدلال	۱۳۵	وَلَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ کی تفسیر	۱۴۱
اول: مجسمہ	۱۳۵	وَلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ کی تفسیر	۱۴۱
ثانی: تناسخیہ	۱۳۵	دو اہم مسائل	۱۴۲

پہلا مسئلہ، آیت میں خوف وشوق ۱۴۲
دوسرا مسئلہ، رسول اللہ ﷺ کے لیے مقامِ شفاعت ۱۴۳
شفاعت کس کے لیے؟ ۱۴۳
معتزلہ اور شفاعت ۱۴۳
اہلِ سنت اور شفاعت ۱۴۳
معتزلہ کے دلائل ۱۴۴
پہلی دلیل ۱۴۴
یہ جواب نہیں بن سکتا ۱۴۴
عموم الفاظ کا اعتبار ۱۴۴
دونوں کی تردید ۱۴۴
دوسری دلیل، کوئی شفیع مُطاع نہیں ۱۴۵
پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ کے مطیع نہ ہونے پر سب کا اتفاق ۱۴۵
دوسری دلیل: سفارشی سے مراد مقبول نہیں ۱۴۵
تیسری دلیل تمام شفاعتوں کی نفی ۱۴۵
چوتھی دلیل، ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ۱۴۶
پانچویں دلیل: ملائکہ اور شفاعت فاسق ۱۴۶
چھٹی دلیل، شفاعت کا ساقط عذاب نہیں ۱۴۶
ساتویں دلیل ۱۴۶
آٹھویں دلیل، اہلِ کبائر کے لیے شفاعت مفید نہیں ۱۴۷
نویں دلیل، اہلِ کبائر کے لیے اذن نہیں ۱۴۷
دسویں دلیل، توبہ کی قید کیوں؟ ۱۴۸
گیارہویں دلیل، عدم شفاعت پر چار احادیث ۱۴۹
پہلی حدیث، سحقًا سحقًانہ فرماتے ۱۴۹
دوسری حدیث: تین طرح استدلال ۱۴۹
حدیث سے تین طرح استدلال ۱۴۹
تیسری حدیث ۱۵۰
چوتھی حدیث: تین کے خلاف کیس لڑوں گا ۱۵۰
شفاعت پر اہلِ سنت کے دلائل ۱۵۰
پہلی دلیل: چار اقسام ہیں ۱۵۱
دوسری دلیل ۱۵۱
تیسری دلیل ۱۵۲
چوتھی دلیل ۱۵۳
صاحب کبیرہ مرتضیٰ (پسندیدہ) نہیں ۱۵۳
سوال ۱۵۳
پہلی وجہ ۱۵۳
دوسری وجہ: جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمالے ۱۵۳
پہلے کا جواب ۱۵۴
دوسرے کا جواب ۱۵۴
پانچویں دلیل ۱۵۴
چھٹی دلیل، عاصیوں کے لیے دعاء مصطفیٰ ﷺ ۱۵۴
ساتویں دلیل، دعاء مصطفیٰ رد نہیں ہوتی ۱۵۵
آٹھویں دلیل: سفارش دونوں جہاں میں مقبول ۱۵۵
نویں دلیل، رسول اللہ ﷺ کے لیے مقامِ شفاعت ہے ۱۵۶

سوال و جواب: ہم شافع نہیں بن سکتے ۱۵۶
پہلی وجہ کا جواب ۱۵۷
دسویں دلیل اہلِ کبائر اور ملائکہ کی دعا ۱۵۷
گیارہویں دلیل، احادیث اور شفاعت اہلِ کبائر ۱۵۷
معتزلہ کے تین اعتراضات ۱۵۸
پہلا اعتراض ۱۵۸
دوسرا اعتراض ۱۵۸
تیسرا اعتراض ۱۵۸
اس میں کئی احتمالات ہیں ۱۵۸
پہلا احتمال ۱۵۸
دوسرا احتمال ۱۵۹
انصاف کی بات ۱۵۹
دوسری حدیث، دعا شفاعت کے لیے محفوظ ۱۵۹
تیسری حدیث، محشر میں ان کی رسائی ہے ۱۵۹
معتزلہ کے چھ اعتراضات ۱۶۱
اہلِ سُنّت کا جواب ۱۶۲
معتزلہ کے دلائل کا رد ۱۶۲
پہلی دلیل کا جواب ۱۶۲
دوسری کا ر ۱۶۳
تیسری کا رد ۱۶۳
چوتھی کا رد ۱۶۳
پانچویں کا رد ۱۶۳
چھٹی کا رد ۱۶۳
ساتویں کا رد ۱۶۴
آٹھواں رد، مسئلہ وعید دیکھئے ۱۶۴
نویں کا رد، دلائل موجود ہیں ۱۶۴
دسویں کا رد، خصوص، مانع نہیں ۱۶۴
احادیث سے استدلال کا جواب ۱۶۴
فلاسفہ اور شفاعت ۱۶۴
بنی اسرائیل پر انعمات کی تفصیل ۱۶۵
آیت ۴۹: وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ کی تفسیر ۱۶۷
پہلے انعام کا تذکرہ ۱۶۷
لفظ آل کی تحقیق ۱۶۷
لفظ فرعون کا مفہوم ۱۶۸
سوء عذاب سے کیا مراد ہے؟ ۱۶۸
پہلی بحث، بچوں کا قتل نہ کہ لڑکیوں کا ۱۶۹
دوسری بحث: حرف عطف واؤ کا نہ ہونا ۱۷۰
تیسری بحث: مراد بچے ہیں ۱۷۱
دو جواب ۱۷۱
چوتھی بحث: ابناء کا قتل کیوں؟ ۱۷۱
یہاں تین وجوہات ہیں ۱۷۲
سوال و جواب ۱۷۲

پانچویں بحث، تذکرہ نعمتوں کے فوائد ۱۷۲
وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ کی تفسیر ۱۷۳
آیت ۵۰، وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کی تفسیر ۱۷۴
دوسرے انعام کا تذکرہ ۱۷۴
سوال وجواب ۱۷۴
بِکُمُ کا کیا معنی؟ ۱۷۴
پہلا معنی ۱۷۴
دوسرا معنی ۱۷۴
چند مباحث ۱۷۴
پہلی بحث، بنی اسرائیل کی نجات کی تفصیل ۱۷۴
پہلی حکمت ۱۷۴
دوسری حکمت ۱۷۴
دوسری بحث دینی ودنیاوی انعامات ۱۷۶
یہاں چھ نعمتوں کا ذکر ہے ۱۷۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں نعمت ۱۷۷
یہاں تین انعامات کا ذکر ہے ۱۷۷
اُمت محمدیہ پر انعامات ۱۷۷
دو سوالات ۱۷۷
جواب ۱۷۸
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ کے متعدد معانی ۱۷۸
اس کی تین طرح تفسیر کی گئی ہے
آیت ۵۱، ۵۲: وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ کی تفسیر ۱۷۹
یہ تیسرا انعام ہے ۱۷۹
لفظ موسیٰ کی تحقیق ۱۸۰
یہاں تین وجوہات ہیں ۱۸۰
اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً کی تفسیر ۱۸۰
پہلا فائدہ، تورات ملنے کا وعدہ ۱۸۰
دوسرا فائدہ ۱۸۱
تیسرا فائدہ ۱۸۱
چوتھا فائدہ، تیس اور چالیس میں موافقت کیسے؟ ۱۸۲
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ کی تفسیر ۱۸۲
پہلی وجہ ۱۸۳
دوسری وجہ ۱۸۳
پہلا فائدہ ۱۸۳
یہ واقعہ عقلاً ممکن نہیں ۱۸۳
تیسری بحث ۱۸۳
پہلا فائدہ ۱۸۴
دوسرا فائدہ ۱۸۴
تیسرا فائدہ ۱۸۴
چوتھا فائدہ ۱۸۴
پانچواں فائدہ ۱۸۴

وَاَنْتُمْ ظَالِمُوْنَ کی تفسیر ۱۸۵
پہلی بحث ۱۸۴
ظلم میں دو اقوال ۱۸۴
دوسری بحث ۱۸۵
تین وجوہات ۱۸۵
تیسری بحث ۱۸۵
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ کی تفسیر ۱۸۵
دو وجوہات ہیں ۱۸۵
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کی تفسیر ۱۸۶
آیت ۵۳، وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ کی تفسیر ۱۸۷
یہ چوتھا انعام ہے ۱۸۷
فرقان کے تین معانی ۱۸۷
یہاں تین وجوہ ہیں ۱۸۷
بعض کی غلطی ۱۸۸
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کی تفسیر ۱۸۹
آیت ۵۴، وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ
اِنَّكُمْ کی تفسیر ۱۸۹
پانچواں انعام ۱۸۹
پہلی وجہ ۱۹۰
دوسری وجہ ۱۹۰
تیسری وجہ: اُمت محمدی کے لیے آسان توبہ ۱۹۰
چوتھی وجہ ۱۹۰
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ کی تفسیر ۱۹۰
دو اقوال ۱۹۰
فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ کی تفسیر ۱۹۱
چند سوالات ۱۹۱
پہلا سوال ۱۹۱
جواب ۱۹۱
دوسرا سوال ۱۹۱
جواب ۱۹۱
تیسرا سوال ۱۹۱
جواب ۱۹۱
چوتھا سوال ۱۹۲
جواب ۱۹۲
پانچواں سوال ۱۹۲
جواب ۱۹۲
تم ایک دوسرے کو قتل کرو ۱۹۳
پہلی وجہ ۱۹۳
دوسری وجہ ۱۹۴
پہلی روایت ۱۹۴
دوسری روایت ۱۹۴
تیسری وجہ ۱۹۴
چھٹا سوال ۱۹۵

جواب	۱۹۵
ساتواں سوال	۱۹۵
جواب	۱۹۵
بادلوں میں قتل	۱۹۵
ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ کی تفسیر	۱۹۵
فَتَابَ عَلَیْکُمْ کی تفسیر	۱۹۵
آیت ۵۵، ۵۶، وَاِذْ قُلْتُمْ یَا مُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنُ کی تفسیر	۱۹۶
چھٹے انعام کا تذکرہ	۱۹۶
تفصیل چھ وجوہات سے	۱۹۶
دوسری بحث	۱۹۷
دو اقوال	۱۹۷
لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ کی تفسیر	۱۹۸
فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ کی تفسیر	۱۹۹
پہلی بحث	۱۹۹
سوال	۱۹۹
جواب	۲۰۰
معتزلہ کا رد	۲۰۰
سوال وجواب	۲۰۰
دوسری بحث، صاعقہ کی تفسیر	۲۰۱
پہلا قول	۲۰۱
یہاں چار دلائل ہیں	۲۰۱
صاعقہ، موت	۲۰۱
اس کے ضعیف ہونے پر دلائل	۲۰۲
دوسرا قول	۲۰۲
ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ کی تفسیر	۲۰۲
سوال وجواب	۲۰۲
دو وجوہ ہیں	۲۰۲
لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ کا مفہوم	۲۰۳
بعد از موت مکلف بنانا جائز نہیں	۲۰۳
آیت ۵۷، وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ کی تفسیر	۲۰۴
ساتویں انعام کا تذکرہ	۲۰۴
آیت ۵۸، ۵۹، وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَۃَ کی تفسیر	۲۰۵
آٹھویں انعام کا تذکرہ	۲۰۵
پہلی قسم	۲۰۵
یہاں دو وجوہات ہیں	۲۰۵
قریہ سے مراد	۲۰۶
تین اقوال	۲۰۶
پہلی بحث	۲۰۶
دوسری بحث	۲۰۶
وَقُوْلُوْا حِطَّۃٌ کی تفسیر	۲۰۷

پانچ اقوال	۲۰۸	دو دلائل ہیں	۲۱۷
سوال وجواب	۲۰۸	عصا کا تعارف	۲۱۷
پہلی وجہ	۲۰۸	نوٹ	۲۱۸
نَغْفِرْ لَكُمْ کی تفسیر	۲۰۸	تیسرا مسئلہ، پتھر کا تعارف	۲۱۸
پہلی بحث	۲۰۹	چوتھا مسئلہ، چند سوالات	۲۱۸
وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ کی تفسیر	۲۱۰	سات سوالات ہیں	۲۱۹
فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا کی تفسیر	۲۱۰	قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ کی تفسیر	۲۲۱
پہلا قول	۲۱۰	كُلُوا وَاشْرَبُوا کی تفسیر	۲۲۱
دوسرا قول	۲۱۰	وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ کی تفسیر	۲۲۲
فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا کی تفسیر	۲۱۲	آیت ۶۱، وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ کی تفسیر	۲۲۲
دو فوائد	۲۱۲	یہ سوال نافرمانی نہیں	۲۲۳
بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ کی تفسیر	۲۱۲	دوسرا طعام کے سوال کی چار اغراض	۲۲۳
دو وجوہات ہیں	۲۱۳	معصیت ہونے پر تین دلائل	۲۲۴
دوسری قسم	۲۱۳	جوابات کے دلائل	۲۲۴
اذکار میں تبدیلی کا حکم	۲۱۳	دوسرا مسئلہ، مراد ایک طریق ہے	۲۲۵
دس سوالات	۲۱۳	تیسرا مسئلہ، قِثَّائِهَا کی قرأت	۲۲۵
جوابات	۲۱۳	معنی فوم میں اختلاف	۲۲۵
آیت ۶۰، وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ کی تفسیر	۲۱۶	چوتھا مسئلہ	۲۲۶
نویں انعام کا تذکرہ	۲۱۶	ادنیٰ سے مراد میں اختلاف	۲۲۶
چند مسائل	۲۱۷	یقینی شے غائب سے بہتر	۲۲۶
پہلا مسئلہ، یہ واقعہ مقام تیہ میں ہوا	۲۱۷	سوال وجواب	۲۲۶

پانچواں مسئلہ، کون سا شہر مراد ہے؟	۲۲۷
آیت سے تین طرح استدلال	۲۲۸
ان دلائل کا ضعف	۲۲۸
تین دلائل	۲۲۸
مراد شہر فرعون پر دو دلائل	۲۲۹
پہلی وجہ	۲۲۹
دوسری وجہ	۲۲۹
سوال وجواب	۲۲۹
دلائل کا رد	۲۳۰
وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ کی تفسیر	۲۳۰
جزیہ مراد نہیں	۲۳۰
وَبَاءُوْا کی تفسیر	۲۳۰
ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ کی تفسیر	۲۳۱
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ کی تفسیر	۲۳۱
کفر کے بعد قتل کا ذکر	۲۳۱
ناحق کا ذکر کیوں؟	۲۳۱
دوسرا سوال	۲۳۱
تین طرح جواب	۲۳۱
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا کی تفسیر	۲۳۲
حق معرفہ ونکرہ کیوں؟	۲۳۲
آیت ۶۲: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر	۲۳۳
آیت کا ربط وتعلق	۲۳۴
مراد کون ہے؟	۲۳۴
متعدد تفاسیر	۲۳۴
پہلی تفسیر	۲۳۴
دوسری تفسیر	۲۳۵
تیسری تفسیر	۲۳۵
وَالَّذِيْنَ هَادُوْا کی تفسیر	۲۳۵
لفظ نصاریٰ کی تحقیق	۲۳۵
یہاں تین وجوہات ہیں	۲۳۶
اَلصَّابِئِيْنَ کی تفسیر	۲۳۶
دو اقوال	۲۳۶
لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کی تفسیر	۲۳۷
سوال وجواب	۲۳۷
آیت ۶۳، ۶۴، وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ کی تفسیر	۲۳۸
دسویں انعام کا تذکرہ	۲۳۸
پہلی بحث	۲۳۸
میثاق سے کیا مراد ہے؟	۲۳۸
پہلا عہد	۲۳۹
دوسرا عہد	۲۳۹
دوسری بحث: مِيْثَاقَكُمْ کہنے کی حکمتیں	۲۳۹

پہلی حکمت ۲۳۹
دوسری حکمت ۲۳۹
وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ کی تفسیر ۲۴۰
پہلی بحث: وَرَفَعْنَا کا واؤ کونسا ہے؟ ۲۴۰
دوسری بحث: طور مخصوص پہاڑ ۲۴۰
تیسری بحث: اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے ۲۴۱
چوتھی بحث، یہ جبر نہیں تھا ۲۴۱
خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ کی تفسیر ۲۴۱
وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ کی تفسیر ۲۴۱
سوال وجواب ۲۴۱
ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ کی تفسیر ۲۴۲
فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ کی تفسیر ۲۴۲
پہلی بحث ۲۴۳
دوسری بحث ۲۴۳
آیت ۶۵، ۶۶، وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا کی تفسیر ۲۴۳
پہلی تشدید وسزا ۲۴۳
پہلا مسئلہ: مچھلیاں پکڑنے میں تجاوز ۲۴۴
دوسرا مسئلہ، دو اُمور کا اظہار ۲۴۴
تیسرا مسئلہ ۲۴۵
چوتھا مسئلہ ۲۴۵
سوال وجواب ۲۴۵
قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً کی تفسیر ۲۴۵
پہلا مسئلہ ۲۴۵
دوسرا مسئلہ ۲۴۵
سوال وجواب ۲۴۵
تیسرا مسئلہ ۲۴۵
دو دلائل ۲۴۷
جواب ۲۴۷
دو سوالات ۲۴۷
جوابات ۲۴۷
چوتھا مسئلہ، خَاسِئِیْنَ کی تحقیق ۲۴۸
فَجَعَلْنٰهَا کی تفسیر ۲۴۸
نکال کا مفہوم ۲۴۹
لِمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا کی تفسیر ۲۵۰
وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر ۲۵۰
آیت ۶۷ تا ۷۳، وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ کی تفسیر ۲۵۱
دوسری تشدید، واقعہ قتل ۲۵۲
پہلا مسئلہ ۲۵۲
دوسرا مسئلہ ۲۵۲
تیسرا مسئلہ ۲۵۲

منکرین عموم کے دلائل	۲۵۲
یہاں تین وجوہات ہیں	۲۵۲
معین گائے کا حکم تھا یا نہیں؟	۲۵۳
پہلے فریق کے دلائل	۲۵۳
سوال وجواب	۲۵۴
تین وجوہات	۲۵۴
دوسرے فریق کے دلائل	۲۵۴
قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کی تفسیر	۲۵۶
پہلا مسئلہ	۲۵۶
دوسرا مسئلہ	۲۵۶
تیسرا مسئلہ	۲۵۶
چوتھا مسئلہ، یہ جملہ کفر ہے	۲۵۶
قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کی تفسیر	۲۵۷
تین وجوہات	۲۵۷
پہلا سوال	۲۵۷
پہلی بحث: سوال کی مجبوری کیا تھی؟	۲۵۸
تین وجوہات	۲۵۸
دوسری بحث: سوال وجواب میں مطابقت	۲۵۸
جواب	۲۵۸
تیسری بحث	۲۵۹
چوتھی بحث، جواز اجتہاد وظن غالب	۲۵۹
دوسوالات	۲۵۹
فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کی تفسیر	۲۵۹
دوسوالات	۲۶۰
تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ کی تفسیر	۲۶۱
پہلا مسئلہ، انشاء اللہ کہنا	۲۶۱
دوسرا مسئلہ، حوادثات اور ارادہ الٰہی	۲۶۱
تیسرا مسئلہ، معتزلہ کا استدلال	۲۶۱
دووجوہات	۲۶۱
اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا کی تفسیر	۲۶۱
اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کی چار تفاسیر	۲۶۱
مُسَلَّمَةٌ کی تفسیر	۲۶۲
لَا شِيَةَ فِيْهَا کی تفسیر	۲۶۳
فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا کی تفسیر	۲۶۳
کَادَ کی دو تفسیریں	۲۶۳
پہلی بحث، یتیم کی گائے	۲۶۴
دوسری بحث، ذبح یا نحر؟	۲۶۴
تیسری بحث، کیا وجہ ذبح پر تیار نہ تھے؟	۲۶۴
چوتھی بحث، امر سے وجوب کا ثبوت	۲۶۵
پانچویں بحث، امر کا تقاضا فی الفور عمل	۲۶۵
وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ کی تفسیر	۲۶۵
سوال وجواب	۲۶۵
فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا کی تفسیر	۲۶۶

پہلا مسئلہ، اللہ تعالیٰ فساد تخلیق نہیں کرتا	۲۶۷
دوسرا مسئلہ، عمل ضرور سامنے آجاتا ہے	۲۶۷
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تفسیر	۲۶۷
پہلا مسئلہ، ذبح گائے اور چالیس سال	۲۶۷
دوسرا مسئلہ	۲۶۷
تیسرا مسئلہ، ذبح اور مصلحت	۲۶۸
گوشت لگانے کی حکمت	۲۶۸
غیر گائے کا حکم کیوں نہیں؟	۲۶۸
ذبح گائے کے فوائد	۲۶۸
چوتھا مسئلہ: لگایا جانے والا حصہ کونسا تھا؟	۲۶۹
كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کی تفسیر	۲۶۹
پہلا مسئلہ	۲۶۹
پہلا قول، مشرکین کے خلاف استدلال	۲۷۰
دوسرا قول، بنی اسرائیل اور مشاہدہ	۲۷۰
دوسرا مسئلہ	۲۷۰
وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ کی تفسیر	۲۷۱
سوال وجواب	۲۷۱
پہلی بحث	۲۷۱
دوسری بحث	۲۷۱
قاتل کے وارث بننے کا حکم	۲۷۱
قاتل کے وارث بننے کا حکم	۲۷۱
دقیق نکتہ	۲۷۲
آیت ۷۴، ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ، کی تفسیر	۲۷۳
پہلا مسئلہ: دل کی نرمی کیا ہے؟	۲۷۳
دوسرا مسئلہ: خطاب اہلِ کتاب سے ہے	۲۷۴
تیسرا مسئلہ: قاتل بتانے کے بعد	۲۷۴
اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً کی تفسیر	۲۷۴
پہلا مسئلہ: کلمہ تشکیک اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں	۲۷۴
تیسرا مسئلہ: پتھر سے سخت قرار دینے کی حکمتیں	۲۷۶
چوتھا مسئلہ: کفر تخلیق الٰہی نہیں	۲۷۷
پانچواں مسئلہ: پتھر اور تین منافع	۲۷۷
پہلا نفع	۲۷۷
پہلا مسئلہ	۲۷۷
دوسرا نفع	۲۷۸
تیسرا نفع	۲۷۸
پتھر میں خشیت کہاں؟	۲۷۸
پہلا قول	۲۷۸
دوسرا قول	۲۷۹
کھجور کا تنا رویا	۲۷۹
تیسرا قول	۲۷۹
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی تفسیر	۲۸۱

اللہ تعالیٰ کا غفلت سے پاک ہونا	۲۸۱
سوال و جواب	۲۸۱
آیت ۷۵، اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ کی تفسیر	۲۸۲
سابقہ آیات سے ربط	۲۸۲
پہلا مقصد، صحت نبوت محمدی کا ثبوت	۲۸۲
دوسرا مقصد، بنی اسرائیل پر نعمتوں کا ذکر	۲۸۲
تیسرا مقصد، رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے لیے تسلی	۲۸۲
چوتھا مقصد، تم پر عذاب آسکتا ہے	۲۸۳
پانچواں مقصد	۲۸۳
چھٹا مقصد	۲۸۳
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اور مسائل	۲۸۳
پہلا مسئلہ، دو اقوال	۲۸۴
دوسرا مسئلہ	۲۸۴
تیسرا مسئلہ، ایمان نہ لانا کیوں؟	۲۸۴
تین وجوہات	۲۸۴
چوتھا مسئلہ	۲۸۶
جواب	۲۸۵
وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ کی تفسیر	۲۸۵
سوال و جواب	۲۸۵
ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ کی تفسیر	۲۸۵
پہلا مسئلہ	۲۸۵
دوسرا مسئلہ، تحریف لفظی یا معنوی؟	۲۸۶
تحریف لفظی اور قول ابن عباس رضی اللہ عنہما	۲۸۶
تیسرا مسئلہ	۲۸۶
چوتھا مسئلہ	۲۸۶
جواب	۲۸۶
پانچواں مسئلہ	۲۸۷
مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ کی تفسیر	۲۸۷
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ کی تفسیر	۲۸۸
سوال و جواب	۲۸۸
پہلا مسئلہ	۲۸۸
دوسرا مسئلہ	۲۸۸
آیت ۷۶، ۷۷: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر	۲۸۹
برائی کی دوسری نوع	۲۸۹
عِنْدَ رَبِّكُمْ کی تفسیر	۲۸۹
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کی تفسیر	۲۹۱
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ کی تفسیر	۲۹۱
دو اقوال	۲۹۱
آیت ۷۸۔۷۹: وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ کی تفسیر	۲۹۲
مختلف گروہوں کا ذکر	۲۹۲
پہلا مسئلہ، اُمّی کا مفہوم	۲۹۲

دوسرا مسئلہ، اَمَانِیَّ کی تحقیق	۲۹۴	خلاف وعید کرم ہے	۳۰۱
تیسرا مسئلہ	۲۹۵	سوال وجواب	۳۰۱
وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ کی تفسیر	۲۹۵	پانچواں مسئلہ	۳۰۲
فَوَیْلٌ کی تفسیر	۲۹۵	اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ کی تفسیر	۳۰۲
یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ کی تفسیر	۲۹۶	جواب	۳۰۲
ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کی تفسیر	۲۹۶	آیت ۸۱، بَلٰی مَنْ کَسَبَ کی تفسیر	۳۰۳
سوال وجواب	۲۹۶	سوال وجواب	۳۰۳
لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا کی تفسیر	۲۹۷	معتزلہ کا استدلال	۳۰۴
فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ کی تفسیر	۲۹۷	پہلا مسئلہ	۳۰۴
آیت ۸۰: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کی تفسیر	۲۹۸	دو دلائل	۳۰۵
برائیوں کی تیسری قسم	۲۹۸	کافر مراد نہیں	۳۰۵
پہلا مسئلہ، اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً کی تفسیر	۲۹۸	سوال وجواب	۳۰۵
پہلی وجہ	۲۹۸	پہلی دلیل: عموم مَنْ پر دلائل	۳۰۸
سوال وجواب	۲۹۹	مشترکہ بھی نہیں	۳۰۸
دوسری وجہ	۳۰۰	تین دلائل	۳۰۸
تیسری وجہ	۳۰۰	نوٹ	۳۰۹
دوسرا مسئلہ	۳۰۰	جمع معرف کی عموم پر دلالت	۳۱۰
تیسرا مسئلہ	۳۰۰	سوال وجواب	۳۱۰
جواب	۳۰۰	تیسری قسم: جمع متصل الذی میں عموم	۳۱۲
قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا کی تفسیر	۳۰۰	چوتھی قسم	۳۱۳
		پانچویں قسم، لفظ کل کا عموم	۳۱۳
		چھٹی قسم	۳۱۳

عمومات احادیث سے استدلال	۳۱۴	مومن اہل ذلت سے نہیں	۳۲۵
پہلی قسم، لفظ مَن کا آنا	۳۱۵	۱۰۔ وعدہ اور عمومات	۳۲۶
ناحق مال کھانے والا	۳۱۷	پہلی حجت، اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے	۳۲۷
تصویر بنانے والا	۳۱۷	عفو اسقاط عذاب ہے	۳۲۸
دوزخی حاکم	۳۱۷	دوسری حجت، اللہ تعالیٰ غافر ہے	۳۲۸
ظلماً فیصلہ کرنے والا	۳۱۷	سوال: مراد عذاب کا مؤخر کرنا ہو	۳۲۹
ذمی کے قاتل کی سزا	۳۱۷	جواب: عفو اور ازالہ	۳۲۹
دوسری: بغیر مَنْ احادیث میں عموم	۳۱۸	تیسری حجت، صاحب کبیرہ سے سقوط عذاب	۳۳۰
۱۔ محتاج متکبر دوزخی	۳۱۸	رحمت اُخروی، دنیاوی سے کہیں زائد ہے	۳۳۰
۲۔ مسلط حاکم دوزخی	۳۱۸	سوال وجواب	۳۳۰
۳۔ صلہ رحمی کا مقام	۳۱۸	چوتھی حجت، قبل از توبہ صاحب کبیرہ	۳۳۱
۴۔ اللہ کا بندوں پر حق	۳۱۹	سوال وجواب	۳۳۲
۵۔ قاتل ومقتول دونوں دوزخی	۳۱۹	پانچویں حجت، آیات عموم سے استدلال	۳۳۲
۶۔ سونے چاندی کے برتن	۳۲۰	جانب نیکی غالب ہے	۳۳۳
۷۔ اہلِ بیت نبوی کا دشمن دوزخی	۳۲۰	اضافہ کی حد نہیں	۳۳۴
۸۔ خائن کا دوزخی ہونا	۳۲۰	وعید اللہ حق نہیں فرمایا	۳۳۴
۹۔ دائمی شرابی کی سزا	۳۲۰	آیات وعید کا الفاظ واحد میں تکرار نہیں	۳۳۵
اہلِ سُنّت کا جواب	۳۲۰	جانِ عدم کی وعید پر ترجیح	۳۳۵
مَنْ اور جمع معرف عموم پر دال نہیں	۳۲۱	وعید میں تاویل احسن ہے	۳۳۵
سوال وجواب	۳۲۱	حضرت یحییٰ بن معاذ کی خوبصورت دعا	۳۳۶
سوال وجواب	۳۲۲	تخصیص تعطیل سے بہتر ہے	۳۳۶
اہل کبائر اور عذاب	۳۲۲	معتزلہ کا مؤقف	۳۳۶

اہلِسنّت کے جوابات	۳۳۷	چار اقوال	۳۴۳
چھٹی حجت، رسول اللہ کی شفاعت	۳۳۸	نہی ہونے پر دو اُمور	۳۴۴
ساتویں حجت، توبہ کے بعد معافی	۳۳۹	پانچواں قول	۳۴۴
سوال وجواب	۳۳۹	تیسرا مسئلہ، تمام ضروریات دین کا عہد	۳۴۴
اس پر دو دلائل	۳۳۹	دوسرا حکم، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک	۳۴۴
پہلی دلیل کا جواب: قید توبہ کی ضرورت نہیں	۳۳۹	پہلا مسئلہ: سوال وجواب	۳۴۴
۱۔احاطہ کے لیے عدم عفو بھی شرط ہے	۳۳۹	دوسرا مسئلہ، والدین سے حسنِ سلوک کی حکمتیں	۳۴۵
۲۔احاطہ سے مراد کبیرہ نہیں	۳۴۰	پہلی حکمت، والدین کا انعام کامل	۳۴۵
آیت۸۲، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر	۳۴۱	دوسری حکمت، ظاہری موثر کا ذکر	۳۴۵
ذکر وعدہ کے فوائد	۳۴۱	تیسری حکمت، ان کا انعام مشابہ ہے	۳۴۵
پہلا مسئلہ، ایمان اور اعمال الگ ہیں	۳۴۱	چوتھی حکمت، والدین کا کرم منقطع نہیں ہوتا	۳۴۵
جواب	۳۴۱	پانچویں حکمت، اولاد کا نفع	۳۴۵
دوسرا مسئلہ، صاحب کبیرہ کا جنتی ہونا	۳۴۱	چھٹی حکمت، ان کے انعامات قلیل	۳۴۶
صاحب کبیرہ جمیع صالحات لانے والا نہیں	۳۴۲	تیسرا مسئلہ، کافر والدین کا بھی احترام	۳۴۶
تیسرا مسئلہ، فضل الٰہی اور دخولِ جنت	۳۴۲	چوتھا مسئلہ، احسان میں یہ بھی شامل	۳۴۷
آیت۸۳: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ کی تفسیر	۳۴۲	تیسرا حکم، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک	۳۴۷
		پہلا مسئلہ، قرابت کا ضابطہ	۳۴۷
دیگر انعامات کا تذکرہ	۳۴۳	دوسرا مسئلہ، صلہ رحمی کا مقام	۳۴۸
پہلا حکم، اللہ کی ہی عبادت	۳۴۳	چوتھا حکم، الیتامیٰ	۳۴۹
پہلا مسئلہ، تَعْبُدُوْنَ کی قرأت	۳۴۳	پہلا مسئلہ، یتیم کی تعریف	۳۴۹
دوسرا مسئلہ، پانچ اقوال	۳۴۳	دوسرا مسئلہ، بچوں سے کام نہیں لیا جاسکتا	۳۵۰

پانچواں حکم، مساکین کے ساتھ حسنِ سلوک ۳۵۰
پہلا مسئلہ، لفظ مسکین کا مفہوم ۳۵۰
دوسرا مسئلہ، مسکین کا ذکر مؤخر کیوں؟ ۳۵۰
تیسرا مسئلہ ۳۵۰
چھٹا حکم، قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۳۵۰
پہلا مسئلہ، ۳۵۰
دوسرا مسئلہ، اخبار کے بعد "قُوْلُوْا" امر مخاطب کیوں؟ ۳۵۰
تین وجوہات ۳۵۰
تیسرا مسئلہ، مخاطب کون ہے؟ ۳۵۱
چوتھا مسئلہ، صرف اہلِ ایمان سے ۳۵۱
دو دلائل ۳۵۱
پانچواں مسئلہ، دعوت کا میں حسن ضروری ہے ۳۵۳
چھٹا مسئلہ: زکوٰۃ اور شدید ضرورت ۳۵۴
ساتواں و آٹھواں حکم ۳۵۴
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ سے کون مراد ہے؟ ۳۵۴
آیت ۸۴، وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ کی تفسیر ۳۵۵
انعامات کی ایک اور قسم کا تذکرہ ۳۵۵
سوال و جواب ۳۵۵
سوال و جواب ۳۵۶
آیت ۸۵، ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ کی تفسیر
حاضر و غائب کیسے؟ ۳۵۷
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ کی تفسیر ۳۵۸
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى کی تفسیر ۳۵۸
یہاں چار مسائل ہیں ۳۵۸
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ کی تفسیر ۳۵۹
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ کی تفسیر ۳۵۹
سوال و جواب ۳۵۹
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ کی تفسیر ۳۵۹
یہاں مراد کیا ہے؟ ۳۵۹
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ کی تفسیر ۳۶۱
سوال و جواب ۳۶۱
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی تفسیر ۳۶۱
دو مسائل ۳۶۱
آیت ۸۶، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا کی تفسیر ۳۶۲
لذت دنیا و آخرت کا اجتماع محال ۳۶۲
فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کی تفسیر ۳۶۲
دو مسائل ۳۶۲
وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ کی تفسیر ۳۶۳
آیت ۸۷، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ کی تفسیر ۳۶۳
ایک اور نوع کا تذکرہ ۳۶۳

وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ کی تفسیر	۳۶۴	پہلا مسئلہ	۳۷۳
تین مسائل	۳۶۴	سوال جواب	۳۷۳
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ کی تفسیر	۳۶۵	دوسرا مسئلہ: کفر کی وجوہات	۳۷۳
وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تفسیر	۳۶۵	تیسرا مسئلہ: یہاں لعنت کیوں؟	۳۷۴
دوسرا مسئلہ: حضرت جبریل کو روح کہنے کی وجوہات	۳۶۶	سوال و جواب	۳۷۴
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ کی تفسیر	۳۶۷	آیت ۹۰، بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ کی تفسیر	۳۷۴
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ کی تفسیر	۳۶۷	بِئْسَمَا کی حقیقت	۳۷۴
سوال و جواب	۳۶۷	پہلا مسئلہ	۳۷۵
آیت ۸۸، وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کی تفسیر	۳۶۸	دوسرا مسئلہ	۳۷۵
غُلْفٌ میں تین اقوال	۳۶۸	تیسرا مسئلہ	۳۷۵
قَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ اور دو مسائل	۳۶۹	چوتھا مسئلہ: نِعْمَ الرَّجُلُ زَيْدٌ کی تراکیب	۳۷۶
پہلا مسئلہ	۳۶۹	پانچواں مسئلہ	۳۷۶
دوسرا مسئلہ: قَلِيْلًا پر نصب کیوں؟	۳۷۰	پہلا مسئلہ	۳۷۷
آیت ۸۹، وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ کی تفسیر	۳۷۱	دوسرا مسئلہ: شراء کے بارے میں دو اقوال	۳۷۷
یہود کی برائیوں کی ایک نوع کا تذکرہ	۳۷۱	بغاوت کی متعدد وجوہات	۳۷۸
پہلا مسئلہ	۳۷۱	فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ کی تفسیر	۳۷۸
دوسرا مسئلہ	۳۷۱	پہلا مسئلہ	۳۷۸
سوال و جواب	۳۷۱	دوسرا مسئلہ: غضب الٰہی سے مراد؟	۳۷۸
تیسرا مسئلہ	۳۷۱	تیسرا مسئلہ	۳۷۹
وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ کی تفسیر	۳۷۳	وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ کی تفسیر	۳۷۹
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا کی تفسیر	۳۷۳	کفار ہی کا ذکر	۳۷۹

سوال وجواب	۳۷۹
دوسرا مسئلہ: عذاب اور کفار	۳۷۹
آیت ۹۱: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا کی تفسیر	۳۸۰
نوع افعال بد کا تذکرہ	۳۸۰
وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا کی تفسیر	۳۸۰
فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ کی تفسیر	۳۸۱
پہلا مسئلہ	۳۸۱
دوسرا مسئلہ	۳۸۱
تیسرا مسئلہ: خطاب پہلوں سے ہے	۳۸۱
اٰمِنُوْا اور فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ میں موافقت	۳۸۲
آیت ۹۲: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ کی تفسیر	۳۸۲
تکرار آیت میں حکمت	۳۸۲
آیت ۹۳: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ کی تفسیر	۳۸۳
دوبارہ ذکر عہد کیوں؟	۳۸۳
قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کی تفسیر	۳۸۳
دو مسائل	۳۸۴
اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ کی تفسیر	۳۸۴
قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ کی تفسیر	۳۸۴
آیت ۹۴،۹۵: قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ کی تفسیر	۳۸۵
برائیوں کی ایک اور نوع کا بیان	۳۸۵
فساد قول پر استدلال	۳۸۶
چھ اہم سوالات	۳۸۷
ان کے جوابات	۳۸۸
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کی تفسیر	۳۹۰
پہلا مسئلہ	۳۹۰
دوسرا مسئلہ: تمنا میں دو اقوال	۳۹۰
دو مقامات میں فرق کیوں؟	۳۹۱
آیت ۹۶، وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ کی تفسیر	۳۹۱
یہ زندگی پر حریص ہیں	۳۹۱
واؤ میں تین اقوال	۳۹۱
ذکر مشرکین الگ کیوں؟	۳۹۲
سوال وجواب	۳۹۲
حرص زیادہ کیوں؟	۳۹۲
سوال وجواب	۳۹۲
دوسرا مسئلہ	۳۹۳
وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ کی تفسیر	۳۹۳
پہلا مسئلہ: وَمَا هُوَ سے کیا مراد ہے؟	۳۹۳
دوسرا مسئلہ	۳۹۴
آیت ۹۷،۹۸: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا کی تفسیر	۳۹۴
یہود کی برائیوں کی ایک اور نوع کا تذکرہ	۳۹۴
پہلا مسئلہ	۳۹۴

آیات کا پسِ منظر	۳۹۴	پہلا مسئلہ	۴۰۳
دوسرا مسئلہ	۳۹۶	دوسرا مسئلہ: فسق کا مفہوم	۴۰۳
تیسرا مسئلہ	۳۹۷	صاحب صغیرہ اور فسق	۴۰۴
چوتھا مسئلہ: جبریل کا معنی	۳۹۷	سوال وجواب	۴۰۴
فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ کی تفسیر	۳۹۷	آیت ۱۰۰: اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا کی تفسیر	۴۰۴
چند سوالات	۳۹۷	رزائل یہود کی ایک اور نوع کا ذکر	۴۰۴
بِاِذْنِ اللّٰهِ کی تفسیر	۳۹۸	یہاں پانچ مسائل ہیں	۴۰۴
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کی تفسیر	۳۹۹	چوتھا مسئلہ: عہد کی صورتیں	۴۰۵
سوال وجواب	۳۹۹	آیت ۱۰۱: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	
قرآن دو ہدایت وبشارت چیزوں پر مشتمل ہے	۳۹۹	کی تفسیر	۴۰۶
چند سوالات	۴۰۰	تصدیق رسول کا مفہوم	۴۰۶
اولیاء اللہ کی عداوت اللہ سے عداوت ہے	۴۰۰	تورات پھینکنے سے مراد	۴۰۷
سیدنا جبریل امین کی فضیلت	۴۰۱	سوال وجواب	۴۰۷
یہاں چار مسائل ہیں	۴۰۱	آیت ۱۰۲: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا کی تفسیر	۴۰۷
آیت ۹۹: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ کی تفسیر	۴۰۲	افعال بد کی ایک اور نوع کا ذکر	۴۰۸
رزائل یہود کی ایک اور نوع کا بیان	۴۰۲	پہلا مسئلہ	۴۰۸
چند مسائل	۴۰۲	دوسرا مسئلہ: تَتْلُوْا کی متعدد تفاسیر	۴۰۸
پہلا مسئلہ: آیات بینات، قرآن	۴۰۲	تیسرا مسئلہ: شیاطین میں اختلاف	۴۰۸
دوسرا مسئلہ: قرآن کو آیات قرار دینے کی حکمت	۴۰۲	سوال وجواب	۴۰۹
تیسرا مسئلہ: بینات صفت کی وجہ	۴۰۳	عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کی تفسیر	۴۰۹
وَمَا يَكْفُرُ بِهَا کی تفسیر	۴۰۳	پانچواں مسئلہ: ملک سلیمان سے کیا مراد ہے؟	۴۱۰

نوٹ	۴۱۰
چھٹا مسئلہ	۴۱۰
جادو پر گفتگو	۴۱۱
پہلا مسئلہ	۴۱۱
دوسرا مسئلہ: عرف شرع اور جادو	۴۱۲
سوال وجواب	۴۱۲
تیسرا مسئلہ: اقسام جادو	۴۱۳
جادو کی پہلی قسم	۴۱۳
تین وجوہات	۴۱۵
جادو کی دوسری قسم	۴۱۵
بادشاہ کا واقعہ	۴۱۶
جادو کی تیسری قسم	۴۱۸
جادو کی چوتھی قسم	۴۱۹
دو مقدمات ہیں	۴۱۹
جادو کی پانچویں قسم	۴۲۰
موسیقار کا واقعہ	۴۲۰
جادو کی چھٹی قسم	۴۲۱
جادو کی ساتویں قسم	۴۲۱
جادو کی آٹھویں قسم	۴۲۱
چوتھا مسئلہ: کیا یہ انواع ممکن ہیں؟	۴۲۱
معتزلہ کا قول	۴۲۲
قرآنی دلائل	۴۲۲
معتزلہ کے دلائل	۴۲۲
پانچواں مسئلہ: جادو سیکھنا	۴۲۴
چھٹا مسئلہ: تکفیر جادوگر	۴۲۴
تیسری قسم کا حکم	۴۲۴
سوال وجواب	۴۲۵
ساتواں مسئلہ: جادوگر اور قتل	۴۲۵
امام ابوحنیفہ کے دلائل	۴۲۶
سوال وجواب	۴۲۷
آٹھواں مسئلہ	۴۲۸
وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ کی تفسیر	۴۲۸
مَلَکَیۡن پر نزول جادو کا انکار	۴۲۹
سوال وجواب	۴۳۰
دوسرا مسئلہ	۴۳۱
کسرہ (زیر) پر دلائل	۴۳۱
تیسرا مسئلہ: سبب نزول میں اختلاف	۴۳۲
زہرہ کون تھی؟	۴۳۲
دو اقوال	۴۳۳
بطلان پر شواہد و دلائل	۴۳۳
اسباب انزال	۴۳۳
چھ وجوہات	۴۳۳
چوتھا مسئلہ	۴۳۴

پانچواں مسئلہ	۴۳۴
وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ کی تفسیر	۴۳۵
دو مسائل	۴۳۵
وجوہات تاویل	۴۳۵
وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ کی تفسیر	۴۳۶
دوسرا مسئلہ: خلاق کا مفہوم	۴۳۷
آیت وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا کی تفسیر	۴۳۸
آمَنُوا کی تفسیر	۴۳۸
لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللهِ کی تفسیر	۴۳۸
پہلی وجہ	۴۳۸
سوال و جواب	۴۳۸
دوسری وجہ	۴۳۸
آیت ۱۰۴: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا کی تفسیر	۴۳۹
بعثت کے بعد ان کے افعال بد	۴۳۹
پہلا مسئلہ: آمَنُوا سے خطاب	۴۳۹
دوسرا مسئلہ: دونوں مترادف الفاظ	۴۳۹
جمہور مفسرین کی رائے	۴۴۰
سات وجوہات	۴۴۰
نوٹ	۴۴۰
سوال و جواب	۴۴۱
وَقُولُوا انْظُرْنَا کی تفسیر	۴۴۱
وَاسْمَعُوا کی تفسیر	۴۴۲
آیت ۱۰۵: مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا کی تفسیر	۴۴۳
سابقہ آیت سے ربط	۴۴۳
دو مسائل	۴۴۳
طعن کی دوسری نوع	۴۴۴
پہلا مسئلہ: نسخ کا معنی و مفہوم	۴۴۴
آیت ۱۰۶: مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ کی تفسیر	۴۴۴
سوال اول کا جواب	۴۴۵
دوسرے سوال کا جواب	۴۴۵
دوسرا مسئلہ	۴۴۵
قرأت امام ابن عامر	۴۴۵
تیسرا مسئلہ	۴۴۶
چوتھا مسئلہ: تناسخ اہلِ علم کے ہاں	۴۴۷
پانچواں مسئلہ: جواز نسخ	۴۴۷
جمہور کے دلائل	۴۴۷
یہود پر دو الزامی رد	۴۴۷
منکرین نسخ	۴۴۸
منکرین کے دلائل	۴۴۸
سوال و جواب	۴۴۸
ضعیف استدلال	۴۴۹

چھٹا مسئلہ: کیا قرآن میں نسخ ہے؟	۴۵۰	جمہور کے دلائل	۴۵۷
جمہور کے دلائل	۴۵۰	نواں مسئلہ: معتزلہ کا خلق قرآن پر استدلال	۴۵۸
اول کا جواب	۴۵۰	ہمارے اصحاب کا جواب	۴۵۸
دوسرے کا جواب	۴۵۰	جواب اصحاب	۴۵۸
اول پر اعتراض	۴۵۱	دسواں مسئلہ	۴۵۹
دوسرے پر اعتراض	۴۵۱	آیت ۱۰۷: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ کی تفسیر	۴۵۹
چھ دلائل	۴۵۱	سابقہ آیت سے تعلق و ربط	۴۵۹
ساتواں مسئلہ: منسوخ فقط حکم یا تلاوت؟	۴۵۳	بعض کا استدلال	۴۶۰
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ کی تفسیر	۴۵۴	آیت ۱۰۸: اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا کی تفسیر	۴۶۰
پہلے قول پر دلائل	۴۵۴	پہلا مسئلہ: اَم کی اقسام	۴۶۰
پہلے کا جواب	۴۵۴	یہاں مخاطب کون ہیں؟	۴۶۰
دوسرے کا جواب	۴۵۴	دوسرا مسئلہ	۴۶۱
دوسرا قول	۴۵۵	پہلا قول	۴۶۱
تیسرا قول	۴۵۵	دوسرا قول: مخاطب اہلِ مکہ ہیں	۴۶۱
چوتھا قول	۴۵۵	تیسرا قول: یہ یہود سے خطاب ہے	۴۶۱
دوسری رائے	۴۵۵	تیسرا مسئلہ	۴۶۲
نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا کی تفسیر	۴۵۵	چوتھا مسئلہ: سوال کیا تھا؟	۴۶۲
مسائل کا استنباط	۴۵۶	پانچواں مسئلہ: ماقبل سے ربط و تعلق	۴۶۲
تین مسائل	۴۵۶	چھٹا مسئلہ: سَوَآءَ السَّبِیْلِ کی تفسیر	۴۶۳
امام شافعی کا قول	۴۵۶		
ان تمام کا جواب	۴۵۷	آیت ۱۰۹: وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کی تفسیر	۴۶۳

مسلمانوں کے ساتھ یہود کے دھوکہ کی تیسری قسم	۴۶۴
پہلا مسئلہ: حسد کی مذمت	۴۶۴
تین اعلیٰ اعمال	۴۶۴
نعمتوں کے دشمن	۴۶۴
چھ آدمی دوزخ میں	۴۶۵
آثارِ صحابہ اور حسد کی مذمت	۴۶۵
دوسرا مسئلہ: حقیقت حسد	۴۶۶
حسد کے حرام ہونیپر دلائل	۴۶۷
رشک و مسابقت کا حکم	۴۶۹
مسابقت کی اقسام	۴۷۰
اہم نکتہ	۴۷۰
تیسرا مسئلہ: حسد کے مراتب	۴۷۰
چار مراتب	۴۷۰
چوتھا مسئلہ: شیخ غزالی کا رد، حسد کے سات اسباب	۴۷۱
پہلا سبب، عداوت و بغض	۴۷۱
دوسرا سبب، جعلی عزت	۴۷۲
تیسرا سبب، طبعًا دوسرے کو غلام جاننا	۴۷۲
چوتھا سبب: خود پسندی	۴۷۲
پانچواں سبب: فوتیدگی مقاصد کا خوف	۴۷۳
چھٹا سبب بلا مقصد منصب وحکومت سے محبت	۴۷۳
ساتواں سبب: اللہ کے بندوں پر بھلائی میں بخل کرنا	۴۷۳
پانچواں مسئلہ: حسد کی کثرت وقلت کے اسباب	۴۷۴
چھٹا مسئلہ: حسد کے علاج ودعا	۴۷۵
ساتواں مسئلہ	۴۷۹
شبہ کی دو قسمیں	۴۷۹
حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کی تفسیر	۴۷۹
پہلا مسئلہ	۴۷۹
جواب	۴۷۹
فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا کی تفسیر	۴۸۰
دو سوالات	۴۸۱
دوسرا قول	۴۸۲

[۳۵] وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۵﴾

(اور ہم نے فرمایا اے آدم تُو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے)

پہلا مسئلہ: حکم لازمی تھا یا نہیں؟

ارشاد باری تعالیٰ "اسکن" (تم ٹھہرو) کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہاں امر وجوب کیلئے ہے یا اباحت کیلئے، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرا کر اسی طرح فرمایا جیسے ملائکہ کو سجدہ کی آزمائش میں ڈالا اور انہیں اس بات کا مکلّف ٹھہرایا کہ جنت سے جو چاہیں کھائیں مگر ایک درخت سے کھانا منع کر دیا، ان پر ابتلا رہا یہاں تک کہ انہوں نے ممنوع شے سے کھایا تو ان سے جنت کا لباس چھن گیا اور انہیں جنت سے اتار کر وہاں ٹھہرایا جہاں ان کی تمنا کے مطابق حاصل ہو باوجودیکہ اس تناول کے ممنوع ہونے کے وہ شدید مکلّف تھے۔

دیگر اہل علم کی رائے یہ ہے یہ حکم بطور اباحت ہے کیونکہ ایسے مقامات پر استقرار، تعبد کے تحت داخل نہیں ہوتا جو خوبصورت و پاک ہوں اور ان میں لطف اندوز ہوا جائے جیسا کہ طیب چیزوں کا کھانا امر تعبدی کے تحت نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (پ ۸، الاعراف: ۱۶) کھاؤ ہماری دی ہوئی پاک چیزیں

حکم و تکلیف نہیں بلکہ اباحت ہے۔

اصح قول اباحت و تکلیف دونوں

اصح یہ ہے کہ ان کا جنت میں ٹھہرنا دونوں چیزوں اباحت و تکلیف پر مشتمل تھا۔ اباحت یہ تھی کہ وہ جنت کی تمام نعمتوں سے نفع حاصل کر سکتے تھے اور تکلیف یہ تھی کہ ممنوع ورفت موجود تھا اور اس کے تناول سے منع فرما دیا۔ بعض نے کہا اگر کوئی دوسرے سے کہتا ہے میں نے تجھے اپنی دار میں ٹھہرایا تو یہ دار اس کی ملکیت نہ ہوگی

اور یہ نہ فرمانے کی حکمت یہ تھی کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت زمین کے لیے پیدا فرمایا تو اب جنت میں ٹھہرانا لٹور مقدمہ تھا۔

دوسرا مسئلہ: جب اللہ تعالی نے تمام فرشتوں کو سیدنا آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ کا حکم دیا اور ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا تو وہ ملعون ٹھہرا تو حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تم اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ جنت میں ٹھہرو۔

جنت میں حضرت حوا رضی اللہ عنہا کی تخلیق

جنت میں حضرت حوا رضی اللہ عنہا کی تخلیق کب ہوئی؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام سدی نے حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جنت سے نکالا اور حضرت آدم علیہ السلام کو وہاں ٹھہرایا تو وہ اکیلے رہ گئے وہاں کوئی ان کا انیس وہ بساتھی نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نیند عطا کی اور ان کی بائیں پسلیوں میں سے ایک پسلی لی اور اس کی جگہ گوشت سے پر کر دی اور اس سے حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو پیدا فرمایا۔ جب آدم علیہ السلام بیدار ہوئے تو اپنے سراقدس کے پاس بیٹھی خاتون دیکھی۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا۔ خاتون، فرمایا تمہیں کیوں پیدا کیا گیا؟ عرض کیا تاکہ آپ میرے ساتھ سکوں پاسکیں

حوا نام کی وجہ

ملائکہ نے کہا ان کا نام کیا ہے؟ جواب ملا حوا، ان کا یہ نام رکھنے کی حکمت یہ تھی کہ انہیں زندہ سے پیدا کیا گیا ہے۔

حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا ایک گروہ بھیجا جو حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو بادشاہوں کی طرح سونے کے تخت پر اٹھا لائے۔ ان کا لباس نور تھا، ہر ایک کے سر پر سونے کا تاج جو یاقوت ونور سے مرصع تھا اور حضرت آدم علیہ السلام پر موتیوں اور یاقوت کا عمامہ تھا حتیٰ کہ انہیں جنت میں داخل کر دیا۔

یہ روایت بتلاتی ہے کہ حضرت حوا رضی اللہ عنہا کی تخلیق دخول جنت سے پہلے کی ہے جبکہ پہلی روایت کی دلالت جنت میں تخلیق پر ہے۔ حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ آگاہ ہے۔

تیسرا مسئلہ، مراد حضرت حوا ہیں

تمام کا اجماع ہے کہ زوجہ سے مراد حضرت حوا ہیں حالانکہ پہلے اس سورۂ مبارکہ اور تمام قران میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اور ان کی تخلیق سیدنا آدم علیہ السلام سے ہوئی جیسا کہ سورۂ نساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا (پ۴۔النساء،۱) جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا

سورۂ اعراف میں فرمایا:

وَجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا (پ۹۔الاعراف،۱۹۸) اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے چین پائے

امام حسن سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی اور اگر تم اسے (اپنے حال میں) چھوڑ دو گے تو اس سے نفع پاؤ گے اور یہ درست رہے گی (البخاری،۳۳۳۱)

چوتھا مسئلہ، جنت زمین پر یا آسمان پر؟

اس آیت مبارکہ میں مذکورہ جنت کے بارے میں اختلاف ہے کیا یہ زمین پر ہے یا آسمان پر؟ اگر یہ آسمانی ہے۔ کیا یہ وہی جنت ہے جو دار الثواب یا جنت الخلد ہے یا کوئی اور؟

پہلا قول: مراد زمینی جنت ہے

شیخ ابو القاسم بلخی اور شیخ ابو مسلم اصفہانی کے بقول مراد زمینی جنت ہے اور اُتارنے سے مراد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے جیسے فرمان ہے۔

اِھْبِطُوْا مِصْرًا (پ۱۔البقرہ،۶۱) اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو

اس پر ان کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: اگر یہ دار ثواب ہوتی تو وہ جنت الخلد اور دائمی ہے اور اگر حضرت آدم علیہ السلام دائمی جنت میں ہوتے تو انہیں ابلیس ان کلمات سے دھوکہ نہ دے پاتا

ھَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الْخُلْدِ وَمُلْکٍ لَّا یَبْلٰی (پ۱۶۔طہ،۱۲۰) کیا میں تمہیں بتا دوں ہمیشہ جینے کا درخت اور وہ بادشاہی کہ پرانی نہ پڑے؟

اور پھر یہ ارشاد گرامی کیسے درست ہوتا

مَا نَھٰکُمَا رَبُّکُمَا عَنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَا مَلَکَیْنِ اَوْ تَکُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ (پ۸۔الاعراف،۲۰) تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے

دوسری دلیل: جو اس جنت خلد میں داخل ہو گیا وہ وہاں سے نکلے گا نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (پ۱۴-الحجر،۴۸) نہ وہ اس میں سے نکالیں جائیں

تیسری دلیل: جب ابلیس نے سجدہ نہ کیا تو وہ ملعون بن گیا تو اب اللہ تعالیٰ کے غضب کے باوجود وہ جنت خلد تک کیسے پہنچ سکتا ہے

چوتھی دلیل: دارالثواب جنت کی نعمتیں فانی نہیں۔ ارشاد ہے:

اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (پ۱۳-الرعد،۳۵) اس کے میوے ہمیشہ اور اس کا سایہ

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (پ۱۲-ھود،۱۰۸) اور وہ جو خوش نصیب ہوئے وہ جنت میں ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا یہ بخشش کبھی ختم نہ ہو گی

غیر مجذوز، کا معنی نہ منقطع ہونے والی ہے

اگر یہ جنت جس میں حضرت آدم علیہ السلام تھے جنت الخلد ہوتی تو وہ فنا نہ ہوتی لیکن وہ فنا ہوئی، ارشاد ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (پ۲۰-القصص،۸۸) ہر چیز فانی ہے سوا اس کی ذات کے

اور اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج نہ ہوتا حالانکہ وہ وہاں سے نکلے اور تمام راحتیں ختم ہو گئیں۔

پانچویں دلیل: یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے کہ وہ مخلوق کو مکلف بنائے بغیر دائمی جنت میں تخلیق فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والوں کی جزا، عمل نہ کرنے والوں کو نہیں عطا فرماتا اور پھر وہ اپنے بندوں کو بغیر جزا و سزا کے نہیں چھوڑتا بلکہ انہیں شوق، خوف اور ان سے وعدہ و وعید فرماتا ہے۔

چھٹی دلیل: اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق زمین پر فرمائی اور اس میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ انہیں آسمان پر لے جایا گیا اگر ایسا ہوتا تو اس کا تذکرہ بطریق اولیٰ کیا جاتا کیونکہ ان کا زمین سے آسمان پر منتقل ہونا اعظم و بڑے انعامات میں سے تھا۔ یہ واضح کر رہا ہے کہ وہ آسمان پر نہیں گئے، اس بات کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ" میں جنت خلد کے علاوہ جنت مراد لی جائے۔

دوسرا قول: شیخ جبائی کہتے ہیں یہاں ساتویں آسمان والی جنت مراد ہے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا (پ ۱-البقرہ، ۳۸) تم سب جنت سے اُتر آؤ

اول اترنا ساتویں آسمان سے پہلے آسمان پر ہے اور دوسرا آسمان سے زمین پر ہے۔

تیسرا قول، دار ثواب ہی مراد ہے

جمہور اہلسنّت کا موقف ہے کہ اس سے مراد دارالثواب ہی ہے اس پر دلیل لفظ "الجنة" کا الف لام ہے۔ جو مفید عموم نہیں کیونکہ تمام جنتوں میں بیک وقت سکنٰی محال ہے اس سے سابقہ معینہ جنت ہی لی جائے گی اور وہ مسلمانوں کے ہاں معروف دارالثواب ہی ہے لہٰذا یہاں یہی مراد ہے۔

چوتھا قول: تمام کا مراد لینا ممکن ہے۔

دلائل منقولہ ضعیف اور آپس میں مخالف ومتعارض ہونے کی وجہ سے یقینی بات نہیں کہی جاسکتی بلکہ توقف لازم ہے۔

پانچواں مسئلہ، رغداً کا مفہوم

صاحب کشاف کا کہنا ہے سکنٰی سکون سے ہے اور یہ بھی ٹھہرنے اور استقرار ہی کی قسم ہے۔ "انت" اسکن میں پوشیدہ خبر کی تاکید ہے تاکہ اس پر عطف درست ہو "رغداً" مصدر کا وصف ہے۔ عبارت ہوگی "اکلا رغداً واسعًا رافهًا" (خوب خوشی سے ہر جگہ سے کھاؤ) "حیث" ظرف مبہم ہے یعنی جنت کے جس مقام سے چاہو۔

آیت سے مراد جنت میں اس طرح خوب کھانے میں اجازت ہے کہ کسی کھانے پر پابندی نہیں اور نہ کسی جگہ پر تاکہ اشجار کثیرہ میں سے کسی ایک درخت کے تناول میں عذر باقی نہ رہے۔

چھٹا مسئلہ، عطف واؤ وفا کے ساتھ کیوں؟

کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا۔ اور سورۃ الاعراف میں فرمایا: فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا تو کلا کا عطف اسکن پر سورۃ البقرہ میں واؤ اور اعراف میں فا کے ساتھ ہے اس کی حکمت کیا ہے؟

جواب یہ ہے جب کسی فعل پر شے کا عطف ہو تو فعل بمنزل شرط اور وہ شئی بمنزل جزا کے ہوتی ہے تو پھر وہاں عطف، ثانی کا اول پر فا کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ واؤ کے ساتھ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (پ۱۔ البقرۃ:۵۸) اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس قریہ میں اور کھاؤ اس سے جہاں سے تم چاہو

تو 'کُلُوا' کا عطف 'اُدْخُلوا' پر فاء کے ساتھ ڈالا کیونکہ جنت سے کھانے کا وجود، اس میں داخلہ پر موقوف ہے گویا فرمایا اگر تم اس میں داخل ہوئے تو تم اس سے کھاؤ گے تو داخلہ کھانے تک موصل ہے اور کھانے کے وجود کا تعلق وجود داخلہ سے ہے، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف میں یوں آشکار کر دیا:

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ (پ۹۔ الاعراف:۱۶۱) اور جب ان سے کہا گیا اس قریہ میں ٹھہرو اور کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو

تو یہاں، کُلُوا کا عطف، اُسْكُنُوا پر فاء کے ساتھ نہیں بلکہ واؤ کے ساتھ ہے کیونکہ اسکنوا، سکنیٰ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے وہ جگہ جہاں آدمی زیادہ ٹھہرے اور کھائے تو اب اس کا وجود اس کے وجود سے متعلق نہیں کیونکہ جو باغ میں داخل ہوتا ہے کبھی اس سے کھالیتا ہے اگر اسے اجازت ہو تو جب دوسرے کا پہلے سے تعلق جزا و شرط والا نہیں تو اب لازم ہے کہ عطف واؤ کے ساتھ ہو نہ کہ فا سے۔ جب یہ ثابت ہے تو سنیے

اُسکن، مکان میں داخل ہونے والے سے کہا جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس جگہ تو داخل ہوا ہے اسے لازم پکڑ لے اور یہاں سے منتقل نہ ہونا اور جو داخل نہیں ہوا اسے بھی اُسکن کہا جا سکتا ہے یعنی اس میں داخل ہو جا اور اس میں ٹھہر جا۔

سورۃ البقرۃ میں یہ حکم اس وقت وارد ہے جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے تو اس سے مراد استقرار اور طویل ٹھہرنا ہے اور ہم نے اوپر بیان کر دیا کہ کھانے کا تعلق اس سے نہیں لہٰذا لفظ واؤ کا آنا ضروری ہے اور سورۃ الاعراف میں یہ حکم دخول جنت سے پہلے آیا لہٰذا وہاں مراد جنت میں داخل ہونا ہے اور ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ کھانے کا تعلق اس دخول سے ہے لہٰذا لفظ فاء کا آنا ضروری ہے۔ واللہ أعلم

ساتواں مسئلہ، وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کی تفسیر

بلاشبہ یہ نہی ہے لیکن اس میں دو مباحث ہیں:

پہلی بحث، نہی تنزیہی ہے

اس نہی کے تحریمی و تنزیہی ہونے میں اختلاف ہے؟ کچھ کہتے ہیں یہ صیغہ تنزیہ کیلئے ہے کیونکہ یہ الفاظ کبھی نہی تنزیہی کیلئے آتے ہیں اور کبھی تحریمی کیلئے، اور اصل لفظ کا مشترک نہ ہونا ہے لہٰذا لفظ کو ایسی قدر و معنی کیلئے حقیقت بنانا ضروری ہے جو دونوں

اقسام میں مشترک ہو وہ یونہی ہے کہ اسے جانب فعل پر جانب ترک کی ترجیح کیلئے حقیقت بنایا جائے اس سے بالاتر ہو کر کہ اس میں فعل کے منع پر یا اس کی اجازت پر دلالت ہو، لیکن اس میں بحکم اصل اجازت و اطلاق ثابت ہو کیونکہ منافع میں اصلاً اباحت ہے، جب ہم نے مدلول لفظ کو اس اصل کے ساتھ ملا دیا تو اس کا مجموعہ تنزیہی پر دلیل ہوگا اور وہ کہتے ہیں کہ اس مقام کیلئے یہی اولیٰ ہے کیونکہ اس صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی معصیت ترک اولیٰ قرار پائے گی اور یہ اشکار و مسلم ہے کیونکہ جو مذہب و قول عصمت انبیاء علیہم السلام تک پہنچائے وہی قبولیت کیلئے اولیٰ ہوتا ہے۔

نہی تحریمی ہے

دیگر کہتے ہیں: یہ نہی، تحریمی ہے اور اس پر ان کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: ارشاد باری تعالیٰ، وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جاؤ) ان ارشاداتِ عالیہ کی طرح ہے اور ان میں نہی تحریمی ہے

۱۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (پ۲۔ البقرۃ:۲۲۲) اور نہ جاؤ ان کے قریب یہاں تک یہ پاک ہو جائیں

۲۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (پ۸۔ الانعام:۱۵۲) اور قریب نہ جاؤ مال یتیم کے مگر یہ کہ وہ احسن ہو

دوسری دلیل: ارشاد الٰہی ہے

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (پ۱۔ البقرۃ:۳۵) تم ہو جاؤ گے ظلم کرنے والے

اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے اس درخت سے کھا لیا تو تم اپنے نفوس پر ظلم کرنے والے بن جاؤ گے پھر تم نے دیکھا جب انہوں نے اس سے کھایا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض کرنے لگے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (پ۸۔ الاعراف:۲۳) اے ہمارے رب ہم نے اپنے پر ظلم کیا۔

تیسری دلیل: اگر یہ نہی، تنزیہی ہوتی تو اس عمل کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے جانے کے مستحق نہ بنتے اور نہ ان پر توبہ کرنا لازم ہوتا۔

مخالف دلائل کا رد

مخالفین کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ نہی اگرچہ اصل میں تنزیہ کیلئے ہے لیکن کبھی مستقل دلیل کی وجہ سے اسے تحریم پر محمول کیا جاتا ہے

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ ارشاد "فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے نفوس پر اپنے عمل سے ظلم کرو گے کہ اس کا ترک تمہارے لیے اولیٰ تھا کیونکہ جب تم نے وہ کیا تو تمہیں اس جنت سے نکال دیا گیا جس میں تم نہ پیاسے، نہ بھوکے اور نہ ٹھہرے دھوپ میں اور نہ ننگے ایسے مقام کی طرف کہ جس میں تمہارے لیے ان میں سے کچھ بھی نہیں۔

تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ جنت سے اخراج کا سبب یہ تھا، اسی کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ آ رہی ہے۔

دوسری بحث، قرب سے ممانعت، کھانے کی ممانعت کو لازم نہیں

کچھ کہتے ہیں ارشاد "وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کا سیاق بتا رہا ہے کہ اس درخت سے کھانے کی ممانعت ہے لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ قریب جانے سے ممانعت، کھانے سے ممانعت کا فائدہ نہیں دیتی کیونکہ بسا اوقات اس کے قریب کے ترک میں فائدہ ہوتا ہے مگر جب آدمی وہاں تک مجبوراً چلا جائے تو کھانا جائز ہو جاتا ہے بلکہ ظاہر آیت قریب جانے سے نہی کو شامل ہے، رہا کھانا کا منع ہونا تو وہ دیگر دلائل سے معلوم ہو رہا ہے اور وہ اس مقام کے علاوہ میں متعدد مقامات پر ارشادِ الٰہی ہے:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا — پھر جب انہوں نے وہ پیڑ چکھا ان پر ان کی شرم کی چیزیں کھل گئیں (پ۸-الاعراف:۲۲)

دوسری دلیل یہ ہے کہ ابتداء کلام میں، کھانے کی اباحت کے بارے میں فرمان ہے:

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا — اور کھاؤ تم اس سے جہاں سے چاہو

تو یہ دلیل کی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس درخت سے کھانے سے منع فرمایا تھا لیکن اس قول والفاظ سے نہی کھانے اور دیگر تمام منافع کو شامل ہو گی اگر کھانے کی تصریح ہوتی تو یہ تمام کو شامل نہ ہوتی تو اب مزید فائدہ بھی سامنے آ گیا۔

آٹھواں مسئلہ، یہ درخت کونسا تھا؟

۱۔ حضرت مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا یہ گندم اور اس کا سٹہ ہے۔

۲۔ منقول ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درخت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا یہ سٹہ والا مبارک درخت ہے

۳۔ امام سدی نے حضرت ابنِ عباس اور حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہم سے انگور نقل کیا۔

۴۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے فرمایا، مراد انجیر ہے۔

۵۔ حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایسا درخت تھا کہ کھانے والا حادث ہو جاتا اور جنت میں حادث ہونا مناسب نہیں

تو ظاہراً اس درخت کے تعین کے پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی اس کے بیان کی ضرورت ہے کیونکہ اس کلام سے مقصود، ہمارا اس درخت کو معین طور پر جاننا نہیں اور جو مقصود کلام نہ ہو حکیم ذات پر اس کا بیان کرنا لازم ہی نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات اس کا بیان عبث ولغو ہوتا ہے مثلاً ہم میں سے کوئی دوسرے کو اپنی تاخیر سے آنے کی وجہ یوں بیان کرے میں اپنے غلاموں کی تربیت تعلیم میں مشغول ہوگیا تھا تو اس قدر بات احسن ہے۔ اس سے کہ وہ معین غلام کا نام اور اس کے حالات بیان کرے اور یہاں کوئی بھی یہ خیال تک نہیں کرے گا کہ یہ بیان میں کوتاہی وکمی کررہا ہے۔

پھر بعض نے کہا: لفظ الشجرہ کے اقرب یہ ہے کہ وہ ایسا درخت ہو جس کا تنا اور شاخیں ہوں

بعض نے کہا اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (پ ۲۳-الصافات: ۱۴۶) اور اُگایا اس کے اُوپر ہم نے کدو کا پیڑ

حالانکہ کدو کا پودا سبزی اور تربوز کی طرح ہوتا ہے اور یہ تو زمین سے منہ ہی نہیں اٹھاتا چہ جائیکہ وہ درخت ہو۔

شیخ مبرد کہتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ جس کی شاخیں اور لکڑیاں پھیل جائیں اسے پھیلنے کے وقت عرب شجر کہتے ہیں اور اس کی اصل 'کل ما شجر' ہے یعنی کسی کا دائیں وبائیں پھیلنا۔ محاورہ ہے: رأیت فلاناً فی شجرته الرماح (میں نے فلاں کو تیروں کے جھرمٹ میں دیکھا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (پ ۵-النساء: ۶۵) حتیٰ کہ وہ آپ کو حاکم مانیں آپس کے اختلاف میں

وتشاجر الرجلان فی أمر كذا (آدمیوں نے فلاں معاملہ میں جھگڑا کیا)

نواں مسئلہ، یہ ترک اولیٰ ہے

اس پر اتفاق ہے کہ ارشادِ الٰہی 'فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' سے مراد یہ ہے کہ اگر تم نے کھالیا تو تم اپنے نفوس پر ظلم کرو گے کیونکہ درخت سے کھانا غیر پہ ظلم ہے، کبھی انسان اپنے نفس پر ظلم اور کبھی دوسرے پر ظلم کرکے ظالم بنتا ہے تو نفس کا ظلم عام واعظم ہے پھر اختلاف ہے اور یہاں تین اقوال ہیں۔

پہلا قول: حشویہ کہتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام نے کبیرہ کا ارتکاب کیا لہٰذا بلا شبہ ان کا عمل ظلم ہے

دوسرا قول: معتزلہ کہتے ہیں انہوں نے صغیرہ کا ارتکاب کیا پھر ان کے دو اقوال ہیں:

۱۔ شیخ ابو علی جبائی کا قول ہے کہ انہوں نے اپنے اُوپر یہ ظلم کیا کہ اپنے اُوپر توبہ اور تلافی کی مشقت لازم کرلی

فضل قدیر

۲-شیخ ابو ہاشم کا قول ہے کہ انہوں نے نفس پر یہ ظلم کیا کہ انہوں نے اپنا حاصل کردہ ثواب ضائع کر دیا تو اب قدرِ استحقاق میں کمی واقع ہو گی

تیسرا قول: یہ ان کا قول ہے جو انبیاء سے ہرگز کسی بھی معصیت کا صدور نہیں مانتے وہ اس ظلم کو اس فعل پر محمول کرتے ہیں جس کا ترک، اولیٰ تھا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ انسان وزارت طلب کرتا ہے پھر اسے چھوڑ کر درزی بن جاتا ہے تو اب اسے کہا جائے گا اے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے یہ تو نے کیوں کیا؟

انبیاء کو ظالم کہنا منع ہے

سوال: کیا حضرات انبیاء کو ظالم یا اپنے نفوس پر ظلم کرنے والا کہنا جائز ہے؟

جواب: یہی اولیٰ ہے کہ ایسی بات نہ کی جائے اس میں ذم کا وہم ہے۔

[۳۶] فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

(تو شیطان نے اس سے (یعنی جنت سے) انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اُترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے)

صاحب کشاف کہتے ہیں: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ کا معنی یہ ہے کہ شیطان نے انہیں درخت کی طرف پھسلایا یہاں لفظ "عن" اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (پ۱۶-الکہف:۸۲) اور یہ کچھ میں نے کیا اپنے حکم سے نہیں کیا

شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں یہ زلل سے ہے کہ انسان کسی شے پر کھڑا ہو اور وہ اس جگہ سے کسی دوسری طرف پھسل جائے جن لوگوں نے اسے "فاز الهما" پڑھا اس وقت یہ زوال عن المکان (جگہ سے پھسلنا) سے ہے شیخ ابو معاذ سے منقول ہے۔ دونوں محاورے ہیں ازلتك عن كذا، اذللتك حتى زللت دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ میں نے تجھے وہاں سے پھیر دیا۔ بعض علماء

نے فرمایا شیطان ان کے پھسلانے کا سبب بنا مثلاً جب کسی سے خطا ہو جائے تو کہا جاتا ہے-زل فی دینه اور جس کی وجہ سے دین ودنیا میں کوئی پھسلے اسے کہا جاتا ہے 'ازله غیره-اس آیت مبارکہ میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، عصمت انبیاء علیہم السلام

عصمت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اختلاف ہے تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں اختلاف چار اقسام کی طرف لوٹتا ہے۔

۱-جس کا تعلق باب اعتقاد سے ہے۔

۲-جس کا تعلق باب تبلیغ سے ہے۔

۳-جس کا تعلق احکام اور فتویٰ سے ہے۔

۴-جس کا تعلق افعال وسیرت سے ہے۔

پہلی قسم: انبیاء گمراہی سے پاک ہوتے ہیں

حضرات انبیاء علیہم السلام کے اعتقاد میں کفر وگمراہی اکثر امت کے ہاں جائز نہیں۔

خوارج میں سے فضیلیہ نے کہا۔ان سے گناہ سرزد ہوئے اور ان کے ہاں گناہ کا ارتکاب کفر وشرک ہے لہٰذا وہ لازماً ان سے کفر کا قول کریں گے۔امامیہ (شیعہ) بطور تقیہ ان سے کفر کے صدور کے قائل ہیں۔

دوسری قسم: کذب سے پاک

امت کا اس پر اجماع ہے کہ جن چیزوں کا تعلق تبلیغ سے ہے ان میں انبیاء علیہم السلام کذب وتحریف سے معصوم ہیں ورنہ ان پر اعتماد ختم ہو جائے گا اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ نہ عمداً یہاں کذب ہو سکتا ہے اور نہ سہواً کچھ لوگوں نے سہواً صدور کا قول کیا ہے کیونکہ اس سے احتراز ممکن نہیں

تیسری قسم: جن امور کا تعلق فتویٰ سے ہے۔اس پر اتفاق ہے کہ ان میں عمداً کذب کا صدور نہیں ہو سکتا البتہ بطور سہو ہو سکتا ہے۔بعض نے سہو کا انکار کیا ہے۔

چوتھی قسم: جن کا تعلق افعال سے ہے۔اس بارے میں امت کے پانچ اقوال ہیں

پہلا قول: حشویہ کا قول ہے کہ عمداً کبائر کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔

دوسرا قول: اکثر معتزلہ کا قول ہے یہ کبائر کا ارتکاب نہیں کرتے ہاں عمداً ان صغائر کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ جو قابل نفرت نہ ہوں مثلاً جھوٹ اور کم تولنا وغیرہ ان سے صادر نہیں ہو سکتا۔

تیسرا قول: شیخ جبائی کہتے ہیں عمداً نہ ان سے کبیرہ کا ارتکاب ہو سکتا ہے اور نہ صغیرہ کا البتہ بطور تاویل واجتہاد ہو سکتا ہے۔

چوتھا قول: ان سے ذنب کا صدور بطور سہو وخطا ہی ہو سکتا ہے ہاں ان پر مواخذہ ہوتا ہے اگرچہ اُمت پر ان کی وجہ سے گرفت نہیں کیونکہ ان کی معرفت اقوی اور دلائل اکثر ہیں اور وہ ان سے محفوظ رہنے پر دوسروں سے زیادہ قادر ہیں۔

پانچواں قول: حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہرگز گناہ صادر نہیں ہوتا نہ کبیرہ نہ صغیرہ نہ عمداً اور نہ سہواً اور نہ ہی بطور تاویل وخطا۔ یہ روافض کا قول ہے۔

وقت عصمت کونسا ہے؟

وقت عصمت میں تین اقوال ہیں

۱۔ یہ بوقت ولادت سے ہی معصوم ہوتے ہیں۔ یہ روافض کا قول ہے۔

۲۔ وقت بلوغت سے عصمت شروع ہوتی ہے نبوت سے پہلے ان سے کفر اور کبیرہ کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ کثیر معتزلہ کا موقف ہے

۳۔ وقت نبوت سے عصمت حاصل ہوتی ہے۔ نبوت سے پہلے صدور ہو سکتا ہے۔

ہمارے علماء اہلسنّت کی اکثریت اور شیخ ابو ھذیل اور شیخ ابو علی معتزلی کا بھی یہی قول ہے کہ حالت نبوت میں ان سے گناہ صادر نہیں ہو سکتا نہ کبیرہ اور نہ صغیرہ اور ہمارے ہاں مختار یہی ہے۔

عصمت پر دلائل

اس پر دلائل درج ذیل ہیں

پہلی دلیل: اگر ان سے گناہ کا صدور ہو تو پھر ان کا درجہ گناہگار اُمت سے کم ہو جائے گا اور یہ درست نہیں اس کی تفصیل یوں ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا درجہ انتہائی کمال وشرف ہے اور جس کی شان ایسی ہو اس سے گناہ کا صدور زیادہ فحش وغلیظ ہوتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی تمہارے سامنے نہیں

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (پ۲۲-الاحزاب:۳۰) اے نبی کی بی بیو جو تم میں سے صریح حیاء کے خلاف کوئی جرات کرے۔اس پر اوروں سے دُونا عذاب ہوگا۔

شادی شدہ کو رجم اور کنوارے کو حد لگائی جاتی ہے۔غلام کی حد آزاد کی حد کا نصف ہے لہٰذا نبی کا حال کسی صورت میں بھی امت سے کم نہیں ہوسکتا اور اس پر اجماع ہے۔

دوسری دلیل: اگر ان کا فسق مان لیا جائے تو ان کی شہادت مقبول نہیں رہے گی۔ارشاد الٰہی ہے:

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (پ۲۶-الحجرات:۶) اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کرلو۔

لیکن یہ تو تمام مقبول الشھادۃ ہیں ورنہ ان کا درجہ امت کے عادل لوگوں سے بھی کم ہو جائے گا اور ہم یہ قول کیسے نہ کریں کیونکہ نبوت و رسالت کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہ احکام ہیں اور یہ شریعت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ روز قیامت تمام پر شاہد ہوں گے۔ارشاد ربانی ہے:

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (پ۲-البقرہ:۱۴۳) کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

تیسری دلیل: اگر ان سے کبیرہ کا ارتکاب مان لیا جائے تو ان پر زجر و توبیخ جائز ہوگی اور ان کی ایذا حرام نہ ہوگی حالانکہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (پ۲۲-الاحزاب:۵۷) بیشک جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو۔اُن پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں

چوتھی دلیل: اگر نبی ﷺ سے معصیت کا ارتکاب ہو تو اقتدا میں ہم پر اس کا بجالانا لازم ہوگا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فاتبعونی (میری اتباع کرو) تو اب حرام اور وجوب دونوں کا جمع ہونا لازم ہوگا جو محال ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ایسا ہے تو باقی انبیاء کے لیے بھی ماننا لازم ہوگا کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں

پانچویں دلیل: یہ بات بداہۃً عقل میں بہت زیادہ قبیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو درجات دیئے۔اپنی وحی کا امین بنایا، بندوں اور شہروں میں اسے اپنا خلیفہ بنایا پھر اس سے یہ کہے کہ لوگوں کو کہے کہ یہ نہ کرو اور اپنی لذت کی بنا پر اپنے رب کی نہی کی طرف متوجہ

ہی نہ ہو اور نہ اس کی وعید کی پرواہ کرے۔ یہ فعل بداھۃً قبیح ہے

چھٹی دلیل: اگر انبیاء سے معصیت کا صدور ہو تو وہ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا (پ۲۹-الجن:۲۳) جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے تو بے شک ان کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔

اسی طرح وہ لعنت کے مستحق بن جائیں۔ ارشاد ربانی ہے:

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (پ۱۱-هود:۱۸) ارے ظالموں پر خدا کی لعنت

تمام اُمت کا یہ اجماع و اتفاق ہے کہ کوئی نبی ہرگز نہ لعنت کا محل ہے اور نہ عذاب کا تو ثابت ہو گیا کہ ان سے معصیت سرزد نہیں ہو سکتی۔

ساتویں دلیل: وہ لوگوں کو اطاعت الٰہی کا درس دیتے ہیں اگر وہ خود اس پر عمل نہ کریں تو وہ اس حکم باری تعالیٰ کے تحت داخل ہوں گے

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (پ۱-البقرہ:۴۴) کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (پ۱۱-هود:۸۸) اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تمہیں منع کرتا ہوں آپ اس کے خلاف کرنے لگوں

جو چیز اُمت کے کسی واعظ کیلئے مناسب نہیں اس کی نسبت حضرات انبیا علیہم السلام کی طرف کیسے درست ہو سکتی ہے؟

آٹھویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ (پ۱۷-الانبیاء:۹۰) بیشک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔

لفظ خیرات عام ہے جو تمام اعمال کو شامل ہے خواہ وہ کرنے کے ہیں یا چھوڑنے کے۔ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کرنے والے کام کرتے ہیں اور ترک کیے جانے والے کو ترک کرتے ہیں۔ یہ بات ان سے گناہ کے صدور کے منافی ہے۔

نویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ

اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چُنے ہوئے پسندیدہ ہیں

(پ۲۳-ص:۴۷)

یہ تمام افعال اور تروک کو شامل ہے کیونکہ یہاں استثناء کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے۔فلاناً من المصطفین الاخیار استثناء کلام سے اسے خارج کر دیتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا وہ کلام میں داخل ہوتا تو ثابت ہو گیا وہ تمام امور میں افضل ہیں اور یہ بات ان سے گناہ کے منافی ہے۔

ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ

اللہ چُن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے

(پ۱۷-الحج:۷۵)

ایک مقام پر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

بیشک اللہ نے چُن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی اولاد اور عمران کی آل کو سارے جہان سے

(پ۳-آل عمران:۳۳)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا

اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اُسے چُن لیا

(پ۱-البقرہ:۱۳۰)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ

میں نے تجھے لوگوں سے چُن لیا اپنی رسالتوں اور اپنی کلام سے

(پ۹-الاعراف:۱۴۴)

یہ بھی فرمایا:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۔ اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۔ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ

اور یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب قدرت اور علم والوں کو۔ بے شک ہم نے اُنہیں ایک کھری بات سے امتیاز بخشا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے پسندیدہ ہیں

(پ۲۳-ص،۴۵-۴۷)

یہ تمام آیات قرآنیہ انبیاء علیہم السلام کے منتخب اور افضل ہونے پر شاہد ہیں اور یہ چیز ان سے صدور گناہ کے منافی ہے۔

دسویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا یہ قول نقل کیا:

فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (پ ۲۳-ص،۸۲-۸۳) تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کردوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں

تو اس نے اغوا شدہ سے مخلصین کو مستثنیٰ کر دیا اور وہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم، سیدنا اسحاق اور سیدنا یعقوب علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (پ ۲۳-ص:۴۶) بیشک ہم نے انہیں ایک کھری بات سے امتیاز بخشا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (پ ۱۲-یوسف:۲۴) بیشک وہ ہمارے چُنے ہوئے بندوں میں سے ہے۔

جب ان آیات سے بعض انبیاء کی عصمت لازمی طور پر ثابت ہوئی تو یہ تمام کے حق میں ثابت ہو جائے گی کیونکہ فرق کا قائل کوئی نہیں

گیارہویں دلیل: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۲۲-سبا:۲۰) اور بیشک ابلیس نے انہیں اپنا گمان سچ کر دکھایا تو وہ اس کے پیچھے ہو لیے مگر ایک گروہ جو مسلمان تھا

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابلیس کی اتباع نہیں کی اور یہ کہنا لازم ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا ورنہ وہ ابلیس کے اتباع کرنے والے قرار پائیں گے۔ جب یہ ثابت ہو گیا یہ فریق گناہ نہیں کر سکتا تو یہ فریق انبیاء ہیں یا غیر؟ اگر انبیاء ہیں تو ثابت ہو گیا کہ ہر نبی سے گناہ صادر نہیں ہو سکتا اور اگر غیر انبیاء ہیں تو اگر انبیاء سے ذنب کا صدور ہو جائے تو ان کا درجہ دوسرے فریق سے کم ہو گا تو غیر نبی، نبی سے افضل قرار پائے گا اور یہ بالاتفاق باطل ہے تو ثابت ہو گیا ان سے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا۔

بارہویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی دو اقسام بنائیں۔ ایک قسم کے بارے میں فرمایا:

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (پ ۲۸-المجادلہ:۱۹) وہ شیطان کے گروہ ہیں۔ سنو بیشک شیطان ہی کا گروہ ہار میں ہے

دوسری قسم کے بارے میں فرمایا:

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہ اللہ کی جماعت ہے۔ سنو اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے

(پ۲۸-المجادلہ:۲۲)

بلاشبہ حزب شیطان وہی بنے گا جو شیطان کو پسند ہوگا اور اس کی پسندیدگی معصیت ہے لہٰذا جو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا وہ حزب شیطان میں سے ہوگا اگر رسول سے معصیت سرزد ہو تو اس پر حزب شیطان میں سے ہونا صادق آئے گا اور وہ نہایت ہی خاسر ٹھہرے گا اور زُھاد امت حزب اللہ اور کامیاب قرار پائیں گے تو اب ایک امتی، اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول سے کہیں بلند درجہ رکھتا ہوگا حالانکہ یہ بات کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

تیرھویں دلیل: رسول، فرشتوں سے افضل ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ رسول سے گناہ کا صدور نہ ہو۔ فرشتوں سے افضل ہونے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ بیشک اللہ نے چُن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی اولاد اور عمران کی آل کو سارے جہان سے

(پ۳-آل عمران:۳۳)

اس سے استدلال کی تفصیل پیچھے مسئلہ فضیلت "ملك علی البشر" (انسان پر فرشتہ کی فضیلت) میں گزر چکی ہے۔ جب رسول افضل ہے تو اس سے ہرگز گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے بارے میں فرمایا ہے وہ گناہ نہیں کرتے ارشاد فرمایا:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ یہ بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے

(پ۱۷-الانبیاء، ۲۷)

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ جو اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں حکم ہو وہی کرتے ہیں

(پ۲۸-التحریم:۶)

اگر رسول سے معصیت کا صدور ہوسکے تو ان کا فرشتوں سے افضل ہونا ناممکن ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اُن جیسا کردیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو شریر بے حکموں کے برابر ٹھہرادیں

(پ۲۳-ص:۲۸)

چودھویں دلیل: منقول ہے حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں شہادت دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے میرے حق میں گواہی کیوں دی؟ عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ساتویں آسمان کے اوپر سے جو وحی نازل ہوئی اس کی میں نے تصدیق کی تو یہاں کیسے نہ کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کی اور انہیں ذو الشہادتین (دو شہادتوں والے) قرار دیا۔ اگر انبیاء کیلئے معصیت جائز ہوتی تو اس شہادت کا جواز کیا بنتا ہے؟

پندرھویں دلیل: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا　(پ۱- البقرہ: ۱۲۴)　میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں

امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں پر ان کی اقتدا لازم فرمادی، اگر ان سے ذنب کا صدور ہو سکتا ہو تو پھر لوگ اس میں بھی ان کی اقتدا کریں گے اور یہ بات تناقض پیدا کردے گی

سولہویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ　(پ۱- البقرہ: ۱۲۴)　میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا

یہاں عہد سے مراد عہد نبوت ہے یا عہد امامت، اگر مراد عہد نبوت ہے تو لازم ہوگا کہ ظالم کیلئے نبوت کا ثبوت نہ ہو اور اگر مراد عہد امامت ہو تو پھر لازم ہوگا ظالم کیلئے امامت کا ثبوت نہ ہو تو جب ظالم کیلئے امامت ثابت نہیں ہوسکتی تو نبوت بطریق اولیٰ ثابت نہ ہوگی کیونکہ نبی کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایسے امام ہوں جن کی اتباع و اقتدا کی جائے تمام صورتوں میں یہ آیت مبارکہ اس پر شاہد ہے کہ نبی گناہگار نہیں ہوسکتے

مخالفین کا رد

مذکورہ چار اقسام میں مخالفت کرنے والوں نے متعدد آیات سے استدلال کیا، ہم تفسیر میں ان آیات کے تحت تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ایسی مشکلات کو حل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ پر گفتگو درج ذیل ہے۔

۱۔ آیات اور اعتقادیات

باب اعتقاد میں مخالفین نے جن آیات سے استدلال کیا وہ تین ہیں:

پہلی آیت: سیدنا آدم علیہ السلام کے اعتقاد پر طعن کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کیا:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (پ۹۔ الاعراف: ۱۸۹) وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس سے چین پائے

یہاں نفس واحدہ سے مراد حضرت آدم اور ان سے پیدا شدہ حضرت حوا علیہا السلام ہیں اور یہ تمام ضمیریں انہیں کی طرف راجع ہیں۔ تو آگے ارشاد باری تعالیٰ:

جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (پ۹۔ الاعراف: ۱۹۰) انہوں نے اس کی عطا میں اُس کے ساجھی ٹھہرائے تو اللہ تعالیٰ کو برتری ہے ان کے شرک سے

بتا رہا ہے کہ ان سے شرک سرزد ہوا

استدلال کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ نفس واحد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آیت مبارکہ میں اس پر دلیل بھی کوئی نہیں بلکہ یہ خطاب قریش سے ہے جو آل قصی میں سے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نفس قصی سے پیدا فرمایا اور اس کی جنس سے عربی خاتون پیدا کی تا کہ وہ سکون حاصل کرے۔ جب ہم نے ان کی طلب پر اولاد عطا کی تو انہوں نے چاروں کے نام یہ رکھے۔ عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد الدار اور عبد قصی اور یشرکون کی ضمیر ان دنوں اور ان کی اولاد کی طرف راجع ہے۔ یہ جواب نہایت ہی معتمد ہے

دوسری آیت: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے بارے میں معرفت نہ رکھتے تھے، اول کے بارے میں ہے ستاروں کو کہا: هٰذَا رَبِّي (یہ میرے رب ہیں) آخرت کے بارے میں کہا:

أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (پ۳۔ البقرہ: ۲۶۰) مجھے دکھلا دے تو کیونکر مردے جلائے گا فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں عرض کیا یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آ جائے

جواب یہ ہے کہ ستاروں کو رب کہنا بطور استفہام انکاری ہے اور اطمینان قلبی سے مراد یہ ہے کہ خبر، مشاہدہ کا درجہ نہیں رکھتی۔

تیسری آیت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (پ۱۱-یونس،:۹۴)

اے سننے والے اگر تجھے کچھ شبہہ ہو اس میں جو ہم نے تمہاری طرف اتارا تو ان سے پوچھ دیکھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھنے والے ہیں۔ بیشک تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا تو تُو ہرگز شک والوں میں نہ ہو

یہ آیت مبارکہ نشاندہی کررہی ہے کہ حضور سرورعالم ﷺ وحی کے بارے میں تشکیک کا شکار تھے۔

جواب یہ ہے کہ دار دنیا میں دل ایسے افکار سے الگ نہیں ہوسکتا جو شبہات پیدا کرتے ہیں البتہ آپ ﷺ نے انہیں دلائل کے ساتھ زائل فرمادیا

۲۔آیات اور تبلیغ

باب تبلیغ کے حوالے سے بھی مخالفین نے تین آیات سے استدلال کیا ہے۔

پہلی آیت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (پ۳۰-الاعلیٰ،۶،۷) اب ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم نہ بھولو گے مگر جو اللہ چاہے۔

یہاں استثناء واضح کررہا ہے۔ آپ ﷺ کو وحی میں نسیان واقع ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جس نسیان سے نفی ہے وہ یاد کی ضد نہیں کیونکہ وہ طاقت میں داخل ہی نہیں بلکہ نسیان بمعنی ترک مراد ہے اور ہم اسے ترک اولیٰ پر محمول کریں گے۔

دوسری آیت: ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ (پ۱۷-الحج:۵۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گذرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا

اس پر تفصیلی گفتگو سورۃ الحج میں آرہی ہے

تیسری آیت: فرمان باری تعالیٰ ہے:

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالٰتِ رَبِّهِمْ (پ۲۹-الجن، ۲۶-۲۸)

غیب کا جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے کہ اُن کے آگے پیچھے پہرہ مقرر کر دیتا ہے تا کہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیام پہنچا دیئے

اگر حضرات انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ میں وقوع غلطی کا خوف نہ ہوتا تو فرشتوں کو ساتھ بھیجنے کا کیا فائدہ؟

جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ تا کہ وہ شیاطین کے وساوس کو دور کر سکیں۔

۳- آیات اور فتاویٰ

یہاں بھی تین آیات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

۱۔ فرمان الٰہی ہے:

وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ (پ۱۷-الانبیاء:۷۸) اور داؤد اور سلیمان کو یاد کرو جب کھیتی کا ایک جھگڑا چکاتے تھے

ہم نے اس پر سورۃ الانبیاء میں گفتگو کی ہے۔

۲۔ بدر کے قیدیوں سے جب آپ ﷺ نے فدیہ لیا تو آیت نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (پ۱۰، الانفال:۶۷)

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے

اگر اس فیصلہ میں خطا نہ ہوتی تو یہ عتاب کیوں ہوتا؟

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (پ۱۰-التوبہ،۴۳) اللہ تمہیں معاف کرے تم نے کیوں انہیں اذن دے دیا۔

جواب: ان دونوں میں یہ ہے کہ یہاں ترک اولیٰ مراد ہے۔

نوٹ: بدر میں فدیہ کے بارے میں بندہ کے مقالہ ''بدر میں حضور کا فیصلہ ہرگز خطا نہیں'' کا مطالعہ کیجئے۔ (قادری عفی عنہ)

۴- آیات اور افعال

افعال کے حوالے سے جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے وہ کثیر ہیں

واقعہ سیدنا آدم سے استدلال

ا۔سیدنا آدم علیہ السلام کے واقعہ سے سات وجوہ سے استدلال ہے

ا۔آپ عاصی تھے اور عاصی صاحب کبیرہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی (پ۱۶-طہٰ:۱۲۱) اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

عاصی صاحب کبیرہ ہوتا ہے اس پر دو وجہ سے استدلال ہے۔

ایک یہ کہ نص کا تقاضا ہے کہ عاصی پر عتاب ہو، فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ (پ۲۹-الجن:۲۳) اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے تو بے شک ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔

اور صاحب کبیرہ میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

دوسرا یہ کہ لفظ عاصی مذمت پر دال ہے اور یہ صاحب کبیرہ پر ہی بولا جاتا ہے۔

۲۔اس واقعہ سے یوں بھی استدلال ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام غاوی ہے کیونکہ فرمان ہے فَغَوٰی (اس کی راہ نہ پائی) اور غی، رشد کی ضد ہے کیونکہ فرمان ہے:

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (پ۳-البقرہ:۲۵۶) بیشک خوب جدا ہو گئی ہے نیک راہ گمراہی سے

تو یہاں غی، رشد کے مقابل ہے۔

۳۔آپ نے توبہ کی اور تائب گناہگار ہی ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ (پ۱-البقرہ:۳۷) پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی

پھر یہ بھی فرمایا:

ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ (پ۱۶، طہٰ:۱۲۲) پھر اس کے رب نے چُن لیا تو اس پر اپنی رحمت سے رجوع فرمایا۔

تائب، گناہگار ہوتا ہے کیونکہ وہ فعل ذنب پر ندامت اختیار کرتا ہے اور اسی سے وہ اپنے فعل ذنب کی اطلاع دے رہا ہے

اگراس نے خبر دینے میں کذب بیانی کی تو وہ گناہگار ٹھہرا اور اگر اس نے سچ کہا اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

۴۔انہوں نے ممنوع شے کا ارتکاب کیا۔ارشاد ربانی ہے:

اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ (پ۸۔الاعراف:۲۲) کیا میں نے تمہیں اس پیڑ سے منع نہ کیا

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (پ۸۔الاعراف:۱۹) اور اس پیڑ کے پاس نہ جانا

اور ممنوع کا ارتکاب سراپا گناہ ہے۔

۵۔انہیں ظالم کہا گیا ارشاد فرمایا:

فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ (پ۱۔البقرہ:۳۵) کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے

انہوں نے خود بھی اپنے آپ کو ظالم قرار دیا۔

رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (پ۸۔الاعراف:۲۳) اے ہمارے رب ہم نے اپنا آپ بُرا کیا

اور ظالم ملعون ہوتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ (پ۱۲۔ھود:۱۸) ارے ظالموں پر خدا کی لعنت

اور جو لعنت کا مستحق ہو وہ صاحب کبیرہ ہی ہوتا ہے۔

۶۔ انہوں نے اعتراف کیا اگر اللہ تعالیٰ کی مغفرت نہ ہو تو میں خاسر ہوں۔

وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (پ۸۔الاعراف،۲۳) تو اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے

اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ وہ صاحب کبیرہ ہیں۔

۷۔ انہیں جنت سے بھی اس لیے نکالا گیا کہ انہوں نے شیطان کے پھسلانے پر اس کی اطاعت کی اور یہ بات بھی کبیرہ پر ہی دال ہے

مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ اگرچہ ان دلائل میں سے ہر ایک کبیرہ پر دال نہیں مگر بحیثیت مجموعی ان کی یقینی طور پر کبیرہ پر دلالت ہے یعنی اگرچہ ہر ایک کی شے پر دلالت نہیں مگر مجموعہ سے شے ضرور ثابت ہے

سات وجوہ کا جواب

ان سات وجوہ کا جواب یہ ہے کہ تمہارے استدلالات تب مکمل ہوتے ہیں جب تم ان آیات سے یہ ثابت کرو کہ ان سے یہ لغزش حالت نبوت میں ہوئی اور یہ تو ثابت نہیں کیونکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام نبی نہ تھے بعد میں نبی بنے اور ان کے اس وقت نبی ہونے پر یہاں کوئی دلیل نہیں۔ باقی ان اعتراضات کا مفصل جواب تو ہم انشاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں دیں گے۔

لغزش کی کیفیت

ہم یہاں اس لغزش کی کیفیت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ فرمان باری تعالیٰ "فازلھما الشیطان" کی مراد جانی جاسکے ہم اگر فرض کرلیں یہ لغزش سیدنا آدم علیہ السلام سے نبوت کے بعد ہوئی تو آپ سے اس کا صدور بصورت نسیان ہوا یا حالت یاد میں

بطور نسیان ہوا

پہلا قول کہ یہ بطور نسیان ہوا، یہی متکلمین کی ایک جماعت کا موقف ہے انہوں نے اس پر اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا

وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (پ۱۶-طٰہٰ:۱۱۵) اور ہم نے اس کا قصد نہ پایا

جیسے روزہ دار کسی معاملہ میں مشغول مستغرق ہو جانے کی وجہ سے بھول کر کھالے نہ کہ دانستہ۔

اور اس قول کو ان دلائل کی بنا پر باطل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (پ۸-الاعراف:۲۰-۲۱)

تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اس لیے منع فرمایا کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا تم ہمیشہ رہو اور اُن سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں

واضح کر رہا ہے کہ حالت اقدام میں ناسی نہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول روایت دلالت کرتی ہے کہ یہ عمل ان سے دانستہ ہوا کہ جب انہوں نے کھالیا اور انہیں ننگا کر دیا تو حضرت آدم علیہ السلام جنت کے درخت سے لپٹ کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ندا دی، کیا مجھ سے بھاگ رہے ہو؟ عرض کیا نہیں میں تو آپ سے حیا کر رہا ہوں۔ فرمایا کیا وہ اشیا بہتر نہ تھیں جو میں

نے تمہارے لیے حلال کی تھیں ان سے جن سے میں نے منع کیا؟ عرض کیا کیوں نہیں یارب لیکن تیری عزت کی قسم میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی تیری جھوٹی قسم کھا سکتا ہے۔ فرمایا مجھے عزت کی قسم میں تجھے یہاں سے اتار دوں گا اور تم ایسی زندگی نہ پاؤ گے۔

دوسری دلیل: اگر وہ ناسی (بھول جانے والے) ہوتے تو ان کے عمل پر عتاب نہ ہوتا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ناسی فعل پر قادر ہی نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس ارشاد گرامی کی وجہ سے مکلف نہ ہوگا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (پ۳-البقرہ:۲۸۶) اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق

نقلی دلیل کا بھی یہ تقاضا ہے حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے۔

رفع القلم عن ثلاث (سنن ابوداؤد:۴۳۹۸) تین سے قلم اٹھالیا گیا ہے

ان تین میں ناسی (بھولنے والا) بھی ہے تو جب ان پر عتاب ہوا ہے تو یہ عمل بطور نسیان نہیں ہوگا۔

دونوں دلائل کا جواب

پہلی کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام نے ابلیس کی بات کو قبول کیا اور اس کی تصدیق کی کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو ان کی یہ معصیت درخت سے کھانے سے بڑی تھی کیونکہ جب ابلیس نے انہیں کہا

مَا نَهٰکُمَا رَبُّکُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَا مَلَکَیْنِ اَوْ تَکُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ (پ۸-الاعراف:۲۰) تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے

تو اس نے انہیں باری تعالیٰ کے بارے میں سوء ظن پیدا کرتے ہوئے اس کے حکم کو تسلیم کرنے اور اس کے فیصلے پر رضامندی سے انکار کی دعوت دی اور اس کی طرف بھی دعوت تھی کہ وہ یہ اعتقاد کریں کہ ابلیس ان کا خیر خواہ ہے اور رب تعالیٰ نے ان پر یہ معاملہ مخفی رکھا ہوا تھا بلاشبہ یہ تمام اشیاء پھل کھانے سے زیادہ بد تھیں تو لازم تھا کہ ان کی وجہ سے شدید عتاب ہوتا۔

اور یہ بھی سامنے رہنا چاہئے کہ حضرت آدم علیہ السلام ابلیس کی سجدہ سے سرکشی، اس کا اپنا دشمن ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس کے حاسد ہونے کو جانتے تھے اور کسی عاقل کے لیے یہ کہاں درست ہے کہ وہ ان قرائن کے باوجود اپنے دشمن کی بات کو قبول کرلے اور آیت مبارک میں یہ کہیں نہیں کہ انہوں نے یہ عمل ابلیس کی اس گفتگو کے بعد یا پہلے کیا البتہ اس کی نشاندہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس کی دشمنی سے آگاہ تھے

فرمان باری تعالیٰ ہے

فضل قرآن

اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى — یہ تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے تم دونوں کو یہ جنت سے نہ نکالے پھر تو مشقت میں پڑے (پ۱۶-طٰہٰ:۱۱۷)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت خبر احاد میں سے ہے اسے قرآن کے مقابل کیسے لایا جاسکتا ہے؟

دوسری وجہ کا جواب

یہاں جو عتاب ہوا ہے وہ اسبابِ نسیان کے تحفظ کے ترک پر ہوا۔ سہو کی ایسی صورت مسلمانوں سے مرفوع ومعاف ہے ہاں اس پر مواخذہ کیا جاسکتا ہے البتہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے عظیم مقام کے پیش نظر ان سے یہ مرفوع نہیں، اس کی مثال یہ فرمان تعالیٰ ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ — اے نبی کی بی بیو تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

(پ۲۲ الاحزاب:۳۰)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: سب سے زیادہ ابتلاء حضرات انبیاء پھر اولیاء اور پھر ہر ایک کے حسب درجہ ہوتا ہے یہ بھی فرمایا مجھے بخار کی صورت میں تم دو مردوں کے برابر تکلیف ہوتی ہے۔

(البخاری:۵۶۴۸، سنن ترمذی:۲۳۹۸)

سوال: ان کے عظیم کمال اور بلند درجہ کو ان کے مکلف ہونے میں کیوں شرط قرار دیا حالانکہ دوسروں میں یہ شرط نہیں؟

جواب: تم نے نہیں سنا نیکوں کی نیکیاں، مقربین کے ہاں سیئات کا درجہ رکھتی ہیں لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکلف بنانے میں جو پابندیاں ہیں وہ دوسروں کیلئے نہیں۔ یہ گفتگو اس وقت ہے جب یہ عمل ان سے بطور نسیان ہو۔

بعض مفسرین کی رائے

ہم نے بعض تفاسیر میں پڑھا حضرت حوا نے وہاں شراب پی اور اس نے نشہ کردیا اور حالت نشہ میں ان سے یہ عمل ہوا۔ اہل علم نے کہا یہ بات بعید نہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو سوائے اس درخت کے سب کے تناول کی اجازت تھی اور یہ درخت گندم کا تھا لہٰذا تناول خمر کی انہیں اجازت تھی۔

لیکن اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جنتی شراب میں نشہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس شراب کا وصف یوں بیان فرمایا:

لَا فِيْهَا غَوْلٌ — نہ اس میں خمار ہے (پ۲۳-الصافات:۴۷)

دوسرا قول، یہ فعل ان سے عمداً ہوا

یہاں چار اقوال ہیں۔

۱۔ یہاں نہی تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی، اس پر گفتگو پہلے گزر چکی۔

۲۔ ان سے عمداً کام ہوا اور یہ کبیرہ ہے اور اس وقت وہ نبی تھے۔اس قول کا باطل ہونا پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔

۳۔ یہ عمداً ہی تھا مگر اس میں خوف وشرمندگی اور پریشانی تھی۔جس کی وجہ سے یہ صغیرہ ہوگا۔یہ قول بھی سابقہ دلائل کی وجہ سے باطل ہے کیونکہ عمداً واجب کا ترک یا ممنوع کا بجالانا انسان کے عاصی،لعنت وذم اور جہنمی ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔خواہ ساتھ خوف شامل بھی ہو لہٰذا ایسی بات حضرات انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہنا درست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیا ہے ان کا یہ عمل حالت نسیان میں ہے۔ارشاد فرمایا:

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (پ۱۶-طہ:۱۱۵) تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا قصد نہ پایا

اور یہ آیت اشکار کررہی ہے کہ ان کا یہ عمل عمداً ہرگز نہ تھا

۴۔ یہ اکثر معتزلہ کا قول ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام نے اجتہادی خطا کے طور پر اسے کھایا جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کبیرہ نہ ہو۔

اجتہادی خطا یوں بنی،فرمایا گیا"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ"(اس درخت کے قریب نہ جاؤ) لفظ"ھذہ" کا کبھی اشارہ شخص کی طرف اور کبھی شے کی نوع کی طرف ہوتا ہے مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ میں ریشم اور سونا لے کر فرمایا یہ دونوں میری امت کی خواتین پر حلال اور مردوں پر حرام ہیں۔

(المعجم الکبیر:۵۱۲۵)

اس سے مراد ذات نہ تھی بلکہ ان کی نوع تھی۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک دفعہ وضو کیلئے اعضاء کو دھویا اور فرمایا اس وضو کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتا۔

(سنن ابن ماجہ:۴۱۹)

تو یہاں بھی وضو کی نوع ہی مراد ہے جب حضرت آدم علیہ السلام نے"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" سنا تو خیال کیا شاید اس سے مراد یہ معین درخت ہے اسے انہوں نے چھوڑ کر اس نوع کے دوسرے سے کھالیا۔تو یہ ان سے اجتہادی خطا ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مراد ھٰذِہٖ سے یہاں نوع تھی نہ کہ معین درخت،تو جب اعمال فروعیہ میں اجتہادی خطاء ہوجائے تو اس پر عتاب اور لعن لازم نہیں ہوتا کیونکہ ممکن ہے یہ صغیرہ ہو جس کی ہماری شریعت میں معافی ہے۔

اس قول پر اعتراضات

بعض نے اس پر یہ اعتراضات وارد کئے ہیں۔

۱۔ ھٰذَا کا معنٰی معین حاضر ہوتا ہے۔

ھٰذَا، اصلاً لغت میں شے حاضر کیلئے آتا ہے اور شے حاضر معین ہی ہوتی ہے تو ھٰذَا کی وضع شے معین کیلئے ہی ہوئی، اس سے نوع کی طرف اشارہ مراد لینا خلاف اصل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اشارہ سے پاک ہے ضروری ہے کہ اس نے کسی فرشتے کو ہی حکم دیا اور اس نے معین شے کی طرف اشارہ کیا تو اب اس معین کے علاوہ نہی سے خارج قرار پائے گا جب یہ بات طے ہوگی تو اب واضح رہنا چاہیئے کہ مجتہد پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کرے تو جب سیدنا آدم علیہ السلام نے لازمی طور پر اس لفظ کو معین پر محمول کیا تو اب نوع پر وہ محمول نہیں کر سکتے۔

دو اُمور سے تائید

واضح رہے اس کی تائید دو اور اُمور سے بھی ہوتی ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا" اشارہ کر رہا ہے کہ انہیں تمام جنت سے تناول کی اجازت تھی ماسوائے جسے دلیل نے مخصوص کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے خطاء نہیں ہوئی

۲۔ اور عقل بھی تقاضا کرتی ہے۔ دلیل کے ساتھ مخصوص ہونے والے کے علاوہ تمام منافع سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے اور دلیل مخصص، معین پر ہی دال ہوتی ہے تو واضح ہو گیا سیدنا آدم علیہ السلام کو باقی اشجار سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت تھی جب یہ ثابت ہے تو اب اس عمل کی وجہ سے ان پر عتاب اور انہیں خطا کرنے والا قرار دینا ہرگز درست نہ ہوگا۔ واقعہ کو مذکورہ صورت پر محمول کرنا، لازم کر دیتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صواب پر مانا جائے نہ کہ خطا کرنے والا جب بات یوں ہے تو مذکورہ قول کہ وہ مخطی تھے فاسد ہو جائے گا۔

۲۔ دوسرا اعتراض اس قول پر یہ ہے کہ ہم مان لیتے ہیں لفظ ھٰذَا عین ذات اور نوع دونوں کے لیے ہے لیکن کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا قرینہ ذکر کیا ہے جو بتا رہا ہو کہ یہاں نوع مراد ہے نہ کہ عین ذات یا ذکر نہیں کیا؟ اگر پہلی صورت ہے تو پھر یہ پوچھا جائے گا کہ سیدنا آدم علیہ السلام نے اس طریقہ گفتگو سے آگاہی میں کوتاہی کی تو اس وقت وہ ذنب کے مرتکب ہونگے اور اگر انہوں نے کوتاہی نہیں کی بلکہ وہ جانتے تھے تو اب مراد نوع ہوگی تو ایسی نوع سے تناول اب قصداً ہوگا۔

۳۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کیلئے اجتہاد جائز ہی نہیں کیونکہ یہ ظن پر عمل کا نام ہے اور یہ اس کے لیے جائز ہوتا ہے جو تحصیل علم ویقین پر قادر نہ ہو۔ حضرات انبیاء تو تحصیل یقین پر قادر ہیں لہٰذا ان کے لیے اجتہاد جائز نہ ہوگا ورنہ تحصیل یقین کے ہوتے ہوئے ظن پر اکتفا لازم آئے گا جو عقلاً اور شرعاً جائز نہیں تو اب واضح ہو جائے گا یہاں اجتہاد کرنا معصیت ہے۔

۴۔ اس مسئلہ کا تعلق قطعیات سے ہے یا ظنیات سے۔ اگر قطعیات سے ہے تو خطا کبیرہ ہوگی اور اب اشکال وارد ہوگا اور اگر ظنیات سے ہے پھر اگر کہیں ہر مجتہد صائب الرائے ہوتا ہے تو اب خطا کا اصلاً ثبوت ہی نہ ہوگا اور اگر کہیں واحد صائب الرائے ہوتا ہے تو خطا کرنے والا بالاتفاق معذور ہوگا تو اس درجہ کی خطا حضرت آدم علیہ السلام سے لباس چھننے، جنت سے نکالنے اور زمین پر اتارنے کا کیسے سبب بن سکتی ہے؟

ان کے جوابات

ھٰذَا، کبھی نوع کے لیے آتا ہے

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ لفظ ھٰذَا اگرچہ اصل میں معین ذات کیلئے ہے لیکن کبھی نوع کیلئے بھی آجاتا ہے جیسا کہ گزر چکا اور اللہ تعالیٰ نے قرینہ ذکر فرمادیا کہ یہاں نوع مراد ہے۔

عدم توجہ تھی

دوسرے کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت آدم علیہ السلام نے اس دلیل کو نہ جانا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ فی الحال لازم نہیں یا یوں کہا جائے جب اللہ تعالیٰ نے معین سے منع فرمایا تو اس وقت دلیل سے آگاہ تھے مگر جب مدت طویل ہوگئی تو عدم توجہ لاحق ہوئی کیونکہ حدیث میں ہے حضرت آدم علیہ السلام طویل مدت جنت میں رہے اور پھر وہاں سے آئے۔

نسیان ہوگیا

تیسرے کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس بیان کی حاجت ہی نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اجتہاد سے تمسک کرتے ہیں کیونکہ ہم نے واضح کر دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام دلیل سے آگاہ نہ ہو سکے یا ہوئے مگر نسیان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں یہی مراد ہے

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (پ۱۶-طٰہٰ:۱۱۵) تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا قصد نہ پایا

نسیان کی وجہ سے کبیرہ نہ رہا

چوتھے کا جواب یہ ہے کہ دلالت ونشاندہی قطعی تھی مگر جب وہ بھول گئے تو اب عذر کی بنا پر ذنب کبیرہ نہ ہوگا۔ یا یوں کہا جائے کہ دلالت ظنی تھی مگر اس پر تشدیدات اس قدر ہوں جو باقی مجتہدین پر نہیں کیونکہ اشخاص کے احوال کے مطابق ہی تشدیدات ہوتی ہے جیسے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے بہت سی ایسی تشدیدات اور تخفیفات ہیں جو اُمت کے لیے نہیں تو یہاں بھی معاملہ اسی طرح کا ہے

ایک اور وجہ: انفرادی طور پر ممانعت نہ تھی

اس مسئلہ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ " (تم دونوں اس درخت کے قریب نہ آؤ) تو اس سے دونوں کو اکٹھا ہی منع فرمایا تو آدم علیہ السلام نے خیال فرمایا شاید تنہا تنہا قریب جانا اور اس سے تناول جائز ہے کیونکہ "وَلَا تَقْرَبَا" میں ممانعت بطور جمع ہے اور اجتماعی حالت نہی، حالت انفرادی کی نہی کو مستلزم نہیں تو ممکن ہے اجتہادی خطا اس طرح واقع ہوئی ہو۔

اس بارے میں یہی گفتگو کی جاتی ہے جو ہم نے بیان کر دی۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ، ابلیس نے وسوسہ کیسے ڈالا؟

سیدنا آدم علیہ السلام کو وسوسہ ابلیس نے کیسے ڈالا حالانکہ وہ جنت سے باہر اور آپ اس کے اندر تشریف فرما تھے۔ اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراہیں۔

من گھڑت واقعہ

۱۔ قصہ گو لوگوں کا قول جو انہوں نے حضرت وہب بن منبہ یمانی سے اور شیخ سدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے نقل کیا۔ جب ابلیس نے جنت میں داخل ہونا چاہا تو خازنِ جنت نے روک دیا۔ وہ سانپ کے پاس آیا جو ایسا جانور تھا جس کے بختی اونٹ کی طرح چار پائے اور جانوروں میں خوبصورت ہے ابلیس نے دیگر حیوانات سے بات کی مگر وہ نہ مانیں تو سانپ نے اسے نگل لیا اور خازن جنت سے چوری جنت میں داخل ہو گیا جیسے ہی سانپ جنت میں داخل ہوا ابلیس اس کے منہ سے نکلا اور وسوسہ میں مشغول ہو گیا۔ اس وجہ سے سانپ پر لعنت ہوئی۔ اس کے پائے ختم کر دیئے گئے اور وہ پیٹ کے بل چلنے لگا۔ اس کا رزق مٹی میں رکھا اور بنو آدم کا دشمن بن گیا۔

واضح رہے یہ اور اس طرح کے دیگر قصص قابل توجہ ہی نہیں اگر ابلیس سانپ میں داخل ہو کر جا سکتا ہے تو از خود سانپ بن کر داخل کیوں نہ ہو جاتا، جب یہ سارا کچھ ابلیس نے کیا تو سانپ کو کیوں سزا دی گئی حالانکہ وہ نہ صاحب عقل ہے اور نہ مکلف۔

۲- ابلیس چوپایہ کی صورت میں جنت میں داخل ہوا۔ یہ قول پہلے قول سے کم فاسد ہے۔

۳- بعض اہل اصول نے کہا ممکن ہے سیدنا آدم وحوا علیہما السلام باب جنت کے پاس آئے ہوں اور ابلیس نے وہاں قریب ہو کر وسوسہ پیدا کیا ہو۔

۴- یہ امام حسن کا قول ہے۔ ابلیس زمین پر تھا اور اس نے وسوسہ جنت میں ڈھال دیا۔ بعض نے کہا یہ بعید ہے کیونکہ وسوسہ کلام خفی ہے جس کا زمین سے آسمان تک پہنچنا ممکن نہیں۔

وسوسہ خود ڈالا یا کسی خادم نے؟

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس نے براہ راست ان سے خطاب کیا یا کسی اپنے خادم کے ذریعے وسوسہ ڈالا؟ پہلے قول پر دلیل باری تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىۡ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيۡنَۙ (پ۸-الاعراف:۲۱) اور اُن سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں

دوسرے مقام پر فرمایا:

فَدَلّٰٮهُمَا بِغُرُوۡرٍ (پ۸،الاعراف:۲۲) تو اُتار لایا انہیں فریب سے

دوسری رائے پر حجت یہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام اسے پہچانتے تھے اور اس کے حسد وعداوت سے آگاہ تھے تو عادۃً یہ محال ہے کہ وہ اس کی بات قبول کریں اور اس کی طرف متوجہ ہوں لہٰذا وسوسہ ڈالنے والا وہ خود نہیں بلکہ اس کا کوئی تابع ہے۔

دوسوالات

یہاں دوسوال باقی ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ نے پھسلانے کی نسبت ابلیس کی طرف کی ہے تو پھر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے فعل پر عتاب کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے "فَاَزَلَّهُمَا" کا معنی یہ ہے کہ وسوسہ کے بعد ان دونوں نے وہ فعل کیا، ابلیس کی طرف نسبت اس ارشاد گرامی کی طرح ہے:

فَلَمۡ يَزِدۡهُمۡ دُعَآءِىۡۤ اِلَّا فِرَارًا (پ۲۹-نوح:۶) تو میرے پکارنے سے اُن کے بھاگنے میں اضافہ ہوا

دوسرے مقام پر ابلیس سے یوں حکایت کی:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ (پ۱۳-ابراہیم:۲۲) اور میرا تم پر کچھ قابو نہ تھا مگر یہی کہ میں نے تم کو بلایا تم نے میری مان لی

تحقیقی بات

یہ معتزلہ کی رائے ہے، اس نسبت میں تحقیقی بات وہی ہے جو ہم کئی مرتبہ بیان کر چکے کہ انسان فعل اور ترک دونوں پر قادر ہے۔ جب دونوں میں مساوات ہوگی تو انسان سے ان میں سے داعیہ کے بغیر کسی کا صدور نہ ہوگا۔ بندے کے حق میں داعی سے مراد اس بات کا علم یا ظن یا اعتقاد ہے کہ یہ فعل کسی مصلحت پر مشتمل ہے۔ جب یہ علم واعتقاد کسی کی توجہ سے حاصل ہوگا تو اس فعل کی نسبت بھی اس کی طرف ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے فاعل بالقوۃ، فاعل بالفعل بن رہا ہے اس حقیقت کی وجہ سے یہاں فعل کی اضافت وسوسہ کی طرف کر دی ہے۔

اہلِ معرفت کا قول

بعض اہل معرفت نے کیا خوب کہا کہ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لغزش، وسوسہ ابلیس کی وجہ سے ہوئی مگر یہ بتایئے ابلیس کی معصیت کس کے وسوسہ کی وجہ سے ہوئی تھی؟ یہ تمام گفتگو بتا رہی ہے کہ داعی وسبب کے بغیر فعل کا حصول نہیں ہوتا اور اگرچہ دواعی کو بھی ایک دوسرے میں ترتیب حاصل ہے لیکن اس کی انتہا اس چیز پر ہوگی جسے اللہ تعالیٰ نے ابتداًء تخلیق فرمایا اور اسی کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں تصریح کی۔

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (پ۹- الاعراف:۱۵۵) وہ نہیں مگر تیرا آزمانا تو اس سے بہکائے جسے چاہے اور راہ دکھائے جسے چاہے

دوسرا سوال، وسوسہ کیا تھا؟

وہ وسوسہ کیا تھا؟ وہ یہی تھا جس کی حکایت ان الفاظ میں ہوئی ہے:

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (پ۸- الاعراف:۲۰) تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اسی لئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے۔

انہوں نے اس کی بات قبول نہ کی جب ابلیس مایوس ہو گیا پھر اس نے اللہ کی قسم اٹھاتے ہوئے کہا:

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (پ۸-الاعراف:۲۱) اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں

عدم توجہ اور نسیان

انہوں نے پھر بھی اس کی تصدیق نہ کی اور ظاہر یہی ہے کہ اس کے بعد اس نے ایک اور شے کی طرف متوجہ کیا جس سے وہ مباح اشیاء کی لذات میں ایسے گم ہو گئے کہ اس استغراق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نہی سے نسیان ہو گیا اور ان سے مذکورہ فعل سرزد ہوا۔ (اللہ تعالیٰ حقائق امور سے سب سے زیادہ آگاہ ہے)

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا کی تفسیر

اس میں درج ذیل مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ہبوط کا مفہوم

جنہوں نے آسمانی جنت مراد لی ہے۔ ان کے ہاں ھبوط کا معنی بلندی سے نیچے آنا ہے اور جن کے ہاں مراد زمینی جنت ہے ان کے ہاں ایک جگہ سے دوسری کی طرف انتقال مراد ہوگا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِهْبِطُوْا مِصْرًا (پ۱۔ البقرۃ:۶۱) اترو تم مصر میں

دوسرا مسئلہ: حکم میں شمولیتِ ابلیس

اس خطاب میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے شامل ہونے پر اتفاق ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس شامل ہے یا نہیں اس میں یہ آراء ہیں۔

پہلی رائے: اکثر کا قول ہے کہ ابلیس بھی داخل ہے کیونکہ پیچھے اس کا ذکر "فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا" یعنی اس نے ان دونوں کو پھسلایا اور ہم نے ان سے کہا نیچے اتر جاؤ، رہا باری تعالیٰ کا فرمان، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، یہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو بتایا ہے کہ ابلیس تم دونوں اور تمہاری تمام اولاد کا دشمن ہے جیسا کہ کھانے سے پہلے اس کے بارے میں فرمایا:

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (پ۱۶۔ طٰہٰ:۱۱۷) تو ہم نے فرمایا اے آدم بیشک یہ تیرا اور تیری بی بی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے پھر تو مشقت میں پڑے

ابلیس کو پہلے نکال دیا تھا

سوال: اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ابلیس نے جب سجدہ سے انکار کیا تو وہ کافر ہو گیا اور اسے جنت سے نکلنے کا حکم دیا:

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا تو یہاں سے اتر جا تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے

(پ ۸، الاعراف: ۱۳)

یہ بھی فرمایا تھا:

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (پ ۲۳-ص: ۷۷، پ ۱۴-الحجر: ۳۴) تو جنت سے نکل جا تو راندھا (لعنت کیا) گیا

تو تکبر کی وجہ سے اسے وہاں سے اتار دیا گیا۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لغزش تو طویل مدت کے بعد ہوئی جس کی وجہ سے انہیں جنت سے اتارا گیا تو جب ابلیس کو پہلے اتارا گیا تھا تو اب اِهْبِطُوْا میں وہ کیسے داخل ہو سکتا ہے؟

ممکن ہے وہاں دوبارہ گیا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر اتار دیا تھا ممکن ہے وسوسہ ڈالنے کے لئے آسمان پر دوبارہ گیا ہو، جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام جنت میں تھے تو صرف دونوں کو فرمایا: اِهْبِطَا (دونوں اترو) جب وہ جنت سے باہر آئے وہاں ابلیس بھی تھا تو تمام کو حکم دیا، اِهْبِطُوْا۔ (تم سب اترو)

بعض کی یہ رائے ہے کہ اِهْبِطُوْا کا معنی یہ نہیں کہ انہیں بیک وقت حکم دیا بلکہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اپنے وقت پر اترنے کا حکم دیا

دوسری رائے: ان سے مراد حضرت آدم و حضرت حوا علیہما السلام اور سانپ ہیں لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مکلف فقط ملائکہ، جن اور انسان ہیں، کوئی یہ کہتے ہوئے اجماع کا انکار کر سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان کے علاوہ اشیاء کو بھی مکلف جانتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ سب نے جان رکھی ہے اپنی نماز اور اپنی تسبیح

(پ ۱۸-النور: ۴۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے فرمایا:

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا (پ ۱۹-النمل: ۲۱) ضرور میں اسے سخت عذاب دوں گا

تیسری رائے: مراد حضرت آدم، حضرت حوا علیہما السلام اور ان کی اولاد ہے کیونکہ جب وہ تمام انسانوں کی اصل ہیں تو گویا انہیں سراپا تمام انسان قرار دے دیا گیا۔ اس پر دلیل یہ ارشاد گرامی ہے:

اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (پ۱-البقرہ: ۳۶ تا ۳۸)

نیچے اُترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اُتر جاؤ

یہ ارشاد ربانی بھی دال ہے:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (پ۱-البقرہ: ۳۸، ۳۹)

تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا ہے

اور یہ حکم تمام انسانوں کو شامل ہے اور بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ، سے مراد لوگوں کے درمیان عداوت، بغض، حسد اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنا ہے۔

یہ قول ضعیف ہے

لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اولاد اس وقت موجود ہی نہ تھی تو انہیں خطاب کس طرح شامل ہو سکتا ہے؟ البتہ جو آدمی یہ قول کرے کہ کم از کم جمع دو ہے تو اب اصل سے سوال ہی ختم ہو جائے گا۔

تیسرا مسئلہ: اِهْبِطُوْا امر ہے یا اباحت؟

مختار یہی ہے کہ یہ امر ہے کیونکہ اس میں مشقت شدید تھی اس لیے کہ جنت سے جدا ہو کر ایسے مقام کی طرف نکلنا یہاں مشقت کے بغیر زندگی نہ ہو اور محنت وجدوجہد نہایت دشوار عمل ہے۔

جب یہ ثابت ہے تو اسے عقوبت گمان کرنا باطل ٹھہرے گا کیونکہ تکلیف میں شدت، ثواب کا سبب ہے۔ تو یہ تکلیف عظیم نفع کے باوجود عقاب کیسے بنے گی؟

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ حدود اور بہت سے کفارات کو عقوبات کہا جاتا ہے حالانکہ ان کا تعلق باب تکلیف سے ہے۔ جواب یہ ہے کہ حدود، فعل غیر کی وجہ سے محدود پر لاگو ہوتی ہیں تو اگر آدمی مصر ہو تو یہ عقاب بنے گی، رہے کفارات تو ان میں سے بعض عقوبات کے قائم مقام ہیں کیونکہ وہ گناہوں پر ہی ہونگے کیونکہ جب وہ ثواب عظیم کا ذریعہ ہوں پھر وہ عقوبت نہیں بن سکتے۔

چوتھا مسئلہ، عداوت کا حکم

اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "اِهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ" میں اُترنے کا حکم ہے مگر عداوت کا نہیں کیونکہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے ساتھ ابلیس کی عداوت بصورت حسد، سجدہ سے انکار اور دونوں کو دھوکہ دینا تھی تا کہ وہ جنت سے نکل آئیں۔ان کی اولاد کے ساتھ اس کی عداوت وسوسہ ڈالنا اور کفر ومعصیت کی دعوت دینا ہے اور ان میں سے کسی شیٔ کا بھی حکم نہیں دیا جا سکتا۔رہی حضرت آدم علیہ السلام کی عداوت ابلیس سے تو اس کا حکم ہے:

اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا (پ۲۲-الفاطر:۶) بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو

دوسرے مقام پر فرمایا:

يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ لَا يَفۡتِنَنَّكُمُ الشَّيۡطٰنُ كَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَيۡكُمۡ مِّنَ الۡجَنَّةِ (پ۸-الاعراف:۲۷) اے آدم کی اولاد خبردار تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے جیسے تمہارے ماں باپ کو بہشت سے نکالا

اس گفتگو کے بعد مفہوم یہ ہوا، آسمان سے اُتر جاؤ اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

پانچواں مسئلہ: مستقر کا مفہوم

مستقر کبھی بمعنی استقرار (ٹھہرنا) ہوتا ہے جیسا ارشاد ربانی ہے

اِلٰى رَبِّكَ يَوۡمَئِذِ ۨالۡمُسۡتَقَرُّ (پ۲۹-القیامۃ:۱۲) اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا کر ٹھہرنا ہے

اور کبھی اس جگہ کے معنی میں جہاں استقرار ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا (پ۱۹-الفرقان:۲۴) جنت والوں کا اس دن اچھا ٹھکانہ

ایک مقام پر فرمایا:

فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ (پ۷-الانعام:۹۸) پھر کہیں تمہیں ٹھہرنا ہے اور کہیں امانت رہنا

جب معانی معلوم ہو گئے تو اکثر نے

وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ (پ۱-البقرۃ:۳۶، پ۸-الاعراف:۲۴) اور تمہارے زمین پہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

کو جگہ پر محمول کرتے ہوئے کہا یہ زمین حالت حیات وموت دونوں میں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

امام سُدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔المستقر، سے مراد قبر ہے۔اب معنٰی ہوگا تم اپنی قبور میں رہو گے۔

پہلا معنی (جگہ) اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے متاع کا ذکر فرمایا اور اس کا تعلق حیات دنیا سے ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتارنے کے وقت یہ فرمایا جس کا تقاضا بھی حیات ہی ہے، واضح رہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف کے اس واقعہ میں فرمایا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (پ۸-الاعراف:۲۴،۲۵)

فرمایا اترو تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہے اور تمہیں زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور برتنا ہے۔فرمایا اسی میں جیو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی میں اٹھائے جاؤ گے

اس میں فِيْهَا تَحْيَوْنَ...... وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ کی تفصیل و بیان بھی ہوسکتا ہے اور اول پر اضافہ بھی ممکن ہے

چھٹا مسئلہ، حین کا مفہوم

حین، بالاتفاق اسم زمان ہے مگر معنی میں اختلاف ہے۔اولیٰ یہی ہے کہ زمانہ طویل و ممتد مراد لیا جائے کیونکہ آدمی اپنے دوست کو"ما رایتك منذ حين"۔اس وقت کہتا ہے جب ملاقات عرصہ کے بعد ہو نہ کہ تھوڑی دیر کے بعد، جب لوگوں کی عمریں طویل اور ان کی ابتدا خلق سے موت دور ہوتی ہے تو اب 'متاع الی حین' کہا جاسکتا ہے۔

ساتواں مسئلہ، سبق حاصل کرلیں

ان آیات مبارکہ میں کئی طرح سے معاصی سے بچنے کا حکم شدید ہے۔

۱۔ جو آدمی سیدنا آدم علیہ السلام کی اس چھوٹی سی لغزش پر اس قدر پریشانی کا مطالعہ کرے گا وہ معاصی سے ہر وقت خوف و شرمندگی میں رہے گا کسی نے خوب کہا:

يا ناظرًا يرنو بعينى راقد — ومشاهدًا للأمر غير مشاهد
تصل الذنوب الى الذنوب و ترتجى — درك الجنان ونيل فوز العابد
أنسيت أن الله أخرج آدما — منها الى الدنيا بذنب واحد

(آنکھ کھول کر دیکھ تو گناہوں پر گناہ کیے جارہا ہے اور جنت پانے اور عابد جیسی کامیابی پانے کا امیدوار بھی ہے۔کیا تو یہ بھول گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو وہاں ایک لغزش کی وجہ سے نکال دیا)

شیخ موصلی کا اہم قول

شیخ فتح الموصلی نے فرمایا ہم جنت میں تھے۔ابلیس نے ہمیں دنیا میں گرفتار کروادیا،اب اس وقت تک ہم غمگین و پریشان ہی رہیں گے جب تک اس گھر میں واپس نہیں چلے جاتے جس سے ہمیں نکالا گیا۔

۲۔ ان آیات میں تکبر،حسداور لالچ سے بچنے کا حکم ہے۔حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد ربانی "اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ" کے تحت فرمایا: دشمن الٰہی،ابلیس نے سیدنا آدم علیہ السلام پر ہونے والے انعامات الٰہیہ کی وجہ سے حسد کیا اور کہا میں ناری ہوں اور یہ مٹی سے ہے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں ممنوع کے بجالانے کا وسوسہ ڈالا پھر قابیل کو حسد کا درس دیا حتیٰ کہ اس نے ہابیل کو قتل کرڈالا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم اور ابلیس کے درمیان عداوت شدیدہ کی نشاندہی فرمادی ہے اور یہ معاصی سے بچنے پر عظیم تنبیہہ ہے

[۳۷] فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

(پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنیوالا مہربان)

اس میں درج ذیل مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ:تلقّی کا مفہوم

شیخ قفال کہتے ہیں تلقی کا اصلاً معنی ملاقات کے درپے ہونا ہے پھر آنے والے کے استقبال کیلئے اور پھر قبول واخذ کے مفہوم میں مستعمل ہوگیا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ اور بیشک تم قرآن سکھائے جاتے ہو حکمت والے علم والے کی طرف سے (پ۱۹۔النمل:۶)

حجاج کے استقبال کے موقعہ پر کہا جاتا ہے۔تلقینا الحجاج۔جب کوئی کسی سے کچھ حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے تلقیت هذه الکلمة من فلان۔(میں نے فلاں سے یہ کلام لیا ہے)ایک آدمی جب دوسرے سے ملتا ہے تو ملاقات کی نسبت دونوں کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وصف ملاقات مشترک ہے۔یوں کہا جاتا ہے جسے تو ملا وہ تجھے ملا ہے۔

تو یہاں مفہوم یہ ہوگا سیدنا آدم علیہ السلام نے کلمات حاصل کیے انہیں محفوظ کیا اور قبولیت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

اور کلمات پر رفع (پیش) بھی پڑھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلمات کا نزول ہوا اور اس کی مثل ہے:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (پ۱- البقرہ:۱۲۴) میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں الظالمون (حالت رفعی) ہے۔

دوسرا مسئلہ، مراد حقیقت توبہ سے آگاہی نہیں

یہ تو ممکن نہیں یہاں یہ مراد ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حقیقت توبہ سے آگاہ فرمایا ہو کیونکہ ہر مکلف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماہیت توبہ سے آگاہ ہو اور اس کے ذریعے ازالہ ذنوب پر قادر ہو یہی بات اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے چہ جائیکہ حضرات انبیا علیہم السلام اس سے آگاہ نہ ہوں بلکہ یہاں درج ذیل کسی ایک مفہوم کو مراد لینا ضروری ہے۔

۱۔ واقعہ ہو جانے والی لغزش پر اس طرح تنبیہ فرمائی کہ سیدنا آدم علیہ السلام فی الفور توبہ اور رجوع کرنے والوں میں ہو گئے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے لزوم توبہ اور ہر صورت اس کے مقبول ہونے کے بارے میں آگاہ کیا جو گناہ کرے خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اگر وہ اپنے کیے پر نادم ہو جائے اور عزم کرے میں دوبارہ یہ نہیں کروں گا تو میں اسے معافی عطا کر دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ۔ یعنی انہوں نے ان کلمات کو حاصل و قبول کیا اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر عطا کردہ عظیم نعمتوں کا تذکرہ فرمایا جو توبہ کے لیے قوی دواعی اور اسباب بن گئے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کلام سکھایا اگر وہ اس کے ساتھ توبہ کریں تو وہ توبہ کے کمال کو پالیں گے۔

تیسرا مسئلہ، وہ کلمات کیا تھے؟

ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

۱۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے عرض کیا یا رب کیا آپ نے بلا واسطہ اپنے دست اقدس سے مجھے پیدا نہیں فرمایا؟ فرمایا کیوں نہیں، عرض کیا یا رب، کیا آپ نے میرے اندر اپنی روح نہیں پھونکی؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کیا: کیا آپ نے مجھے جنت میں نہیں ٹھہرایا؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کیا، کیا آپ کی رحمت آپ کے غضب پر غالب نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ عرض کیا: یا رب اگر میں توبہ کر کے اصلاح کر لوں تو کیا مجھے دوبارہ جنت مل جائے گی؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ تو فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ سے یہی مراد ہے۔

امام سدی نے یہ اضافہ بھی نقل کیا۔ یارب کیا آپ نے مجھ پر یہ ذنب نہیں لکھا تھا؟ فرمایا: ہاں۔

۲۔ امام نخعی کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کلمات کے بارے میں پوچھا تو فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو حج کا حکم دیا انہوں نے حج کیا یہی وہ کلمات ہیں جو حج میں پڑھے جاتے ہیں۔ جب یہ حج سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔

۳۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ ان سے مراد یہ دعا ہے، رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔

۴۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔ وہ کلمات یہ ہیں:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْٓءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ اَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْٓءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْٓءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں پاک ہے تیری ذات اور حمد بھی تیری ہی ہے میں نے غلط کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا میری مغفرت فرما بیشک تو بہتر بخشش فرمانیوالا ہے نہیں ہے تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق اور حمد بھی تیری ہی ہے میں نے برا کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا تو مجھ پر رحم فرما بلا شبہ تو بہتر رحم فرمانیوالا ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک اور تیری ہی حمد ہے میں نے زیادتی کی اور اپنے نفس پر ظلم کیا، میری توبہ قبول فرما بلا شبہ تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے

۵۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کی توبہ قبول فرمانے کا ارادہ کیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس وقت کعبہ سرخ ٹیلہ کی مانند تھا جب بیت اللہ کی طرف دو رکعتیں ادا کیں اور عرض کیا

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِيْ وَتَعْلَمُ حَاجَتِيْ فَاعْطِنِيْ سُؤْلِيْ وَتَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِيْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰى اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَنْ يُّصِيْبَنِيْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِيْ وَاَرْضِيْ بِمَا قَسَمْتَ بِيْ

اے اللہ تو میرا باطن و ظاہر جانتا ہے میری معافی قبول فرما اور تو میری حاجتوں سے آگاہ ہے میرا مقصود عطا فرما، تو میرے دلی رازوں سے آگاہ ہے میرے ذنوب معاف فرما اے اللہ میں تجھ سے دل میں رس بچ جانے والا ایمان اور یقین صادق مانگتا ہوں یہاں تک کہ میں جان لوں مجھے وہی ملے گا جو تو نے لکھا ہے اور تیری تقسیم پر راضی ہو جاؤں

تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: میں نے تمہاری لغزش معاف فرما دی اور تمہاری اولاد میں سے جو یہ دعا کرے گا اس کے گناہ معاف فرما دوں گا۔ اس کے غموں اور مصائب کو دور کر دوں گا۔ اس سے فقر اٹھا لوں گا اور اس کے پاس دنیا بغیر ارادے کے آئے گی

(**نوٹ**: علامہ سید محمود آلوسی (ت: ۱۲۷۰ھ) نے مفسرین کا یہ قول بھی نقل کیا)

رای مکتوبا علی ساق العرش محمد رسول اللہ فتشفع به و اذا اطلقت الکلمة علی عیسیٰ علیه السلام فلتطلق الکلمات علی الروح الاعظم والحبیب الاکرم صلی اللہ علیه وسلم فما عیسیٰ بل وما موسیٰ وما– وما الابعض من ظهور انوارہ و زهرة من ریاض انوارہ

(روح المعانی: ۲۳۷/۱)

حضرت آدم علیہ السلام نے عرش پر محمد رسول اللہ لکھا پایا تو اس کو وسیلہ بنایا، جب کلمہ کا اطلاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا ہے تو روح اعظم اور حبیب اکرم ﷺ پر کلمات کا اطلاق بطریق اولیٰ ہوسکتا ہے حضرت عیسیٰ کیا بلکہ موسیٰ یا کوئی ہو وہ تمام آپ ﷺ کے انوار کا حصہ اور آپ کے گلستان انوار کی کلی کا درجہ رکھتے ہیں

اس روایت پر تفصیلی گفتگو کے لیے بندہ کے مقالہ ''حدیث توسلِ آدم ہرگز موضوع نہیں'' کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

(قادری عفی عنہ)

چوتھا مسئلہ: توبہ اور تین اُمور

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں توبہ کے لیے ان تین اُمور کا ترتیب وار ہونا ضروری ہے۔ علم، حال اور عمل، پہلے علم پھر حال اور پھر عمل۔ پہلا دوسرے کا اور دوسرا تیسرے کا ایسا فطرتی سبب وموجب ہے کہ یہی ملک وملکوت میں سنت الٰہی کا تقاضا ہے۔

امام غزالی کی خوبصورت گفتگو

اس کی معرفت کہ گناہ میں نقصان کتنا ہے اور یہ بندے اور رحمتِ رب کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ جب بندے کو اس کا علم ہوگا تو اس سے اس کے دل کو یہ تکلیف واحساس لاحق ہو جائے گا کہ وہ اپنے محبوب کو دور کر رہا ہے کیونکہ دل کو محبوب کی جدائی پر تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی فعل کی وجہ سے یہ دوری ہوئی تو بندہ اس جدائی پر اپنے اس فعل پر تأسف وافسوس کرے گا جو اس کا سبب بنا اور یہی تأسف ندامت ہے۔ جب تکلیف میں پختگی آ جائے گی تو اس پر ارادہ جازمہ مرتب ہوگا جس کا تعلق حال، مستقبل اور ماضی سے ہے۔ حال کے ساتھ تعلق یوں ہوگا کہ آدمی اس گناہ کو ترک کر دے گا، مستقبل کے ساتھ یوں کہ آخر عمر تک اس فعل کے نہ کرنے کا عزم کرے گا جو محبوب کی جدائی کا سبب بنا اور ماضی کے ساتھ اس طرح کہ سابقہ کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کرے

گا۔ قضا کر کے ادائیگی کے سات اس نقصان کو پورا کرے گا بشرطیکہ اس کا ازالہ ممکن ہو۔ علم اول ہے کیونکہ وہی ان خیرات پر مطلع کرنے والا ہے اور یقین کامل پیدا کرتا ہے کہ یہ گناہ سراپا زہر اور ہلاکت ہیں۔ علم یقینی نور ہے، نور ندامت کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ جس سے دل الم زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ نور ایمان کے ساتھ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے محجوب ہو گیا ہے مثلاً جس پر نور شمس چمکا حالانکہ وہ ظلمت میں تھا تو وہ بادل کے پھٹنے کی وجہ سے نور طلوع ہوا، تو وہ اپنے محبوب کو قریب ہلاکت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں محبت کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے۔ تو وہ اس آگ کے سامنے آ جاتا ہے کہ میں اس کا ضرور تدارک کروں گا تو علم، ندامت اور قصد جس کا تعلق حال واستقبال اور ماضی کی تلافی سے ہے۔ یہ تینوں چیزیں توبہ پر مترتب ہوتی ہیں۔ توبہ کا اطلاق ان کے مجموعہ پر ہوتا ہے اور اکثر اوقات ندامت کو ہی توبہ کہہ دیا جاتا ہے اور علم کو بطور مقدمہ اور ترک کو بطور ثمر و تابع متاخر قرار دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا

الندم توبة ندامت سراپا توبہ ہے

(سنن ابن ماجہ: ۴۲۵۲)

کیونکہ ندامت اس علم سے جدا نہیں ہو سکتی جس کا یہ تقاضا ہے اور نہ عزم سے جو اس کے تابع ہے تو ندامت دونوں، اپنے درخت اور ثمر کے درمیان محفوظ ہے۔ شیخ غزالی نے حقیقت توبہ کا یہی خلاصہ ذکر کیا ہے اور یہ نہایت ہی خوبصورت گفتگو ہے۔

شیخ قفال کہتے ہیں توبہ میں ترک گناہ، ہو جانے والے گناہ پر ندامت اور اس بات کا آئندہ عزم کہ اسے نہیں کروں گا اور تمام احوال میں خشیت وخوف کا لاحق ہونا ضروری ہے۔

ترک گناہ ضروری اس لیے ہے اگر آدمی اسے کرتا رہتا ہے تو وہ اس کا مرتکب رہا تائب نہ ہوا۔ ندامت، اس لیے ضروری ہے اگر نادم نہیں ہوتا تو وہ اس کے بجالانے پر راضی ہوگا، شیٔ کے ساتھ خوش ہونے والا اسے کبھی بجا بھی لاتا ہے اور بجالانے والا تائب نہیں ہو سکتا اور یہ عزم کہ وہ دوبارہ یہ کام نہیں کرے گا اس لیے ضروری ہے اس کا فعل معصیت تھا اور معصیت کا عزم بھی معصیت ہی ہے۔ رہا خوف کا لاحق ہونا تو یہ اس لیے ضروری ہے کہ توبہ کا حکم ہے اور آدمی یہ کیسے جان سکتا ہے کہ اس نے جس قدر توبہ لازم تھی وہ اسے بجالایا لہٰذا خائف ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (پ ۲۳، الزمر: ۹) آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی آس لگائے

حضور ﷺ کا مبارک فرمان ہے:

لَوْ وُزِنَ خَوْفُ الْمُؤْمِنِ وَرِجَاؤُهٗ لَاعْتَدَلَا اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو ان میں برابری ہوگی (کشف الخفاء: ۲۱۳۱)

گفتگو پر اشکال

لیکن غزالی کی گفتگو نہایت ہی واضح اور تحقیقی ہے البتہ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اس کا علم کہ فلاں فعل نقصان دہ ہے اور ساتھ اس کا علم کہ اس فعل کا صدور، دل کیلئے تکلیف دہ ہوگا اور دلی تکلیف حال اور استقبال میں ترک فعل اور ماضی کی تلافی کا تقاضا کرتی ہے اور جب تمام ایک دوسرے پر بدیہی طور پر مترتب ہیں تو یہ آدمی کی قدرت میں نہ ہوئیں لہٰذا ان کے بجالانے کا حکم ناممکن ہو جائے گا۔

الغرض قدرت کے تحت صرف تحصیل علم ہی ہے۔ اس کے ماسوا پر کوئی اختیار نہ ہوگا البتہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تحصیل علم بھی قدرت میں نہیں کیونکہ بعض مجہولات کی تحصیل ان سے پہلے کچھ مقدمات کے علم کے بغیر ممکن نہیں ہوتی، وہ علوم موجودہ جو مجہول کے حصول کا ذریعہ بن رہے ہیں تو وہ اس مجہول کے علم کو مستلزم ہیں یا مستلزم نہیں اگر اول صورت ہے تو مجہول کا معلوم پر ترتب بدیہی ہوگا لہٰذا وہ قدرت و اختیار میں نہ رہا اگر دوسری صورت ہو تو مجہول کا حصول نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ مقدمات مترتبہ کے لیے ضروری ہے وہ اس طرح کے ہوں کہ ان کے تسلیم کرنے سے ذہن مطلوب کو تسلیم کرے جب وہ مقدمات یہ شان نہیں رکھتے تو ان سے مطلوب نتیجہ کیسے حاصل ہوگا۔

اگر یہ سوال اٹھایا جائے یہ کیوں ممکن نہیں اگرچہ وہ مقدمات ذہن میں موجود ہیں لیکن نتیجہ تک پہنچنے کی کیفیت وہاں موجود نہیں لہٰذا ان مقدمات کے علم پر وہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

ہم جواباً کہتے ہیں اس نتیجہ تک سمجھنے کی کیفیت بدیہی ہے یا کسبی اگر وہ بدیہیات میں سے ہے تو وہ بندے کے اختیار میں نہیں اور اگر وہ کسبی ہے تو پھر کیفیت اکتساب میں پہلے کی طرح کلام ہوگا پھر یا تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے یا وہ اس کے لوازمات میں ثابت ہو جائے گا لہٰذا مذکورہ اعتراض پھر لوٹ آئے گا۔ واللہ اعلم

پانچواں مسئلہ: قاضی عبدالجبار کا سوال

قاضی عبدالجبار نے اپنے اوپر یہ سوال اٹھایا جب یہ معصیت صغیرہ ہے تو توبہ کیوں لازم؟

جواب دیا شیخ ابو علی کہتے ہیں توبہ اس لیے لازم ہے کہ مکلف جب جان لیتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے تو وہ دہراتا نہیں بلکہ وہ مختار ہوتا ہے اب یا تو وہ نادم ہوگا یا مصر، اصرار تو قبیح ہے تو اس قبیح سے مفارقت توبہ کے سوا نہ ہوگی تو اب توبہ لازم ہوگی خواہ معصیت صغیرہ ہے یا کبیرہ۔ خواہ اس پر پہلے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔

38
38

شیخ ابو ہاشم کا قول

شیخ ابو ہاشم کہتے ہیں عاصی کا توبہ اور اصرار سے خلاصی پانا ممکن ہے کیونکہ حضرات انبیاء پر اس وجہ سے توبہ کا لازم ہونا صحیح نہیں بلکہ وہ ان میں کسی ایک نقص کی وجہ سے ہے یا تو اس لیے لازم ہوگی کہ صغیرہ سے ثواب میں جو کمی آ گئی ہے توبہ سے اس کا ازالہ ہو جائے یا اس لیے کہ توبہ قائم مقام ترک ہے جب فعل کا امکان ہو تو ترک واجب لہٰذا عدم امکان کی صورت میں توبہ واجب ہوگی

ایک اور قول

یہ بھی کہا۔ان پر توبہ بطور سمع لازم ہے اور یہ اصح ہے کیونکہ توبہ اس ثواب کے لوٹانے کا لزومی سبب نہیں بنتی جو فقط منافع کی صورت میں ہو کیونکہ کوئی بھی فعل حصول منافع کیلئے لازم نہیں ہو جاتا جیسے نوافل لازم نہیں ہوتے بلکہ حضرات انبیاؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے معصوم بنایا تو ان کی عصمت کا ایک سبب ہر حال میں توبہ کا لزوم ہے اگرچہ ان کے معاصی صغیرہ ہی ہوتے ہیں۔

چھٹا مسئلہ: لفظ توبہ کا مفہوم

شیخ قفال لکھتے ہیں توبہ،اوبۃ کی طرح بمعنی رجوع ہے کہا جاتا ہے توب جیسے اوب ،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قابل التوب،تاب یتوب توبا و توبۃ و متابا فھو تائب و تواب جیسے اب یووب اوبًا و اوبۃ فھو آیب و اواب۔

لفظ توبہ۔رب اور بندے کے درمیان مشترک ہے، جب یہ بندے کا وصف ہو تو مفہوم ہوگا اس نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا کیونکہ ہر عاصی اپنے رب سے بھاگنے والا ہوتا ہے۔جب اس نے توبہ کی تو واپس اپنے رب کی طرف لوٹ آیا۔کہا جاتا ہے "تاب الی ربہ" (وہ اپنے رب کی طرف لوٹا) اور اس حالت میں رب اپنے بندہ سے اعراض کرنے والے کی طرح ہوتا ہے جب رب کا یہ وصف ہو تو مفہوم ہوگا رب نے اپنے بندے پر اپنی رحمت وفضل سے رجوع کیا۔اسی وجہ سے صلہ میں اختلاف ہے عبد میں کہا جائے گا۔تاب الی ربہ۔رب کے بارے میں کہا جائے گا۔تاب علی عبدہ

کبھی آدمی اپنے سربراہ کی خدمت چھوڑ دیتا ہے اور وہ سربراہ اس کا وظیفہ منقطع کر دیتا ہے پھر جب وہ خدمت کے لیے لوٹ آتا ہے تو کہا جاتا ہے،فلان عاد الی الامیر والا میر عاد علیہ با حسان و معروفہ۔(وہ سربراہ کی طرف لوٹ آیا اور سربراہ نے اس پر احسان وکرم دوبارہ شروع کر دیا)

قبول توبہ دو طرح

جب یہ واضح ہو گیا تو قبول توبہ دو طرح کی ہے۔

۱۔ اس پرثواب عظیم حاصل ہو جیسا کہ قبول طاعت سے یہی مراد ہوتا ہے۔

۲۔ توبہ کے سبب اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرمادے۔

ساتواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا ''توّاب'' ہونا

توّاب، اللہ تعالیٰ کا وصف ہے یعنی وہ قبول توبہ میں مبالغہ فرماتا ہے اور یہ دوطرح سے ہے۔

۱۔ دنیاوی بادشاہوں سے جب کوئی زیادتی کرتا ہے اور پھر معذرت کرتا ہے تو وہ عذر قبول کر لیتے ہیں۔اگر وہ دوبارہ کر کے معذرت کرے تو وہ قبول نہیں کرتے کیونکہ طبع ومزاج مانع ہو جاتا ہے مگر باری تعالیٰ کی ذات کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ توبہ، رقت طبع، حصول نفع یا دفع ضرر کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ محض احسان وفضل کی بنا پر قبول فرماتا ہے اب اگر مکلّف ہر ساعت گناہ کر کے توبہ کرے اور اس کا یہ حال ساری طویل عمر رہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ معاف فرما کر توبہ قبول فرما لیتا ہے لہٰذا اس کی قبول توبہ والی صفت میں مبالغہ ہی ہے اور وہ بلاشبہ 'توّاب' ہے۔

۲۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کی تعداد کثیر ہے جب وہ تمام کی توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کا وصف یہ بطور مبالغہ ہوگا، توبہ کی قبولیت کے ساتھ ازالہ عتاب کا تقاضا حصول ثواب ہے اور اس کی طرف سے ثواب سراپا نعمت ورحمت ہے لہٰذا اس نے تواب کے ساتھ رحیم والا وصف بھی ذکر فرمایا۔

آٹھواں مسئلہ: اس آیت مبارکہ میں یہ فوائد ہیں:

۱۔ بندے پر ہر وقت وحال میں توبہ کرنا لازم ہے کیونکہ احادیث وآثار میں وارد ہے۔آیئے احادیث کا مطالعہ کریں۔

توبہ اور احادیث

۱۔ ایک آدمی نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو گناہ کرے پھر توبہ کرے پھر گناہ کر کے توبہ کرے پھر گناہ کر کے توبہ کرے تو آپ نے فرمایا وہ ہمیشہ معافی مانگتا رہے تو شیطان خاسر ہو کر کہہ دے گا یہ میری طاقت وتصرف سے باہر ہے اور فرمایا جب بھی کوئی تمہیں پانی کی موجوں میں پھینک دے اور تم میں جب تک وہاں سے نکلنے کی طاقت ہے تو اسے بروئے کار لاؤ۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَمْ یُصِرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً (شعب الایمان للبیہقی:۴۰۵)

جس نے توبہ کر لی وہ اصرار کرنے والا نہیں ہوگا اگرچہ اس نے ہر دن میں ستر دفعہ گناہ کا اعادہ کیا

۳۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے رب کے حضور توبہ کرو کیونکہ میں ہر دن میں سو دفعہ توبہ کرتا ہوں۔ (مسلم:۲۷۰۲)

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے جب آیت مبارکہ "وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ" (اپنے رشتہ داروں کو ڈراؤ) نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے قریش اپنے نفوس کو اللہ تعالیٰ سے چھڑاؤ میں تمہیں اللہ سے نہیں چھڑا سکتا۔ اے عباس بن مطلب میں تمہیں اللہ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے غنی نہیں کر سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد جو مجھ سے مانگنا ہے مانگ لو لیکن میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ (البخاری:۲۷۵۳)

(یہ دونوں روایات صحیح بخاری کی ہیں)

۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے میرے دل پر بوجھ آتا ہے تو میں دن میں سو دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں۔

(مسلم،۲۷۰۱)

واضح رہے غین اس شی کا نام ہے جو دل کو کچھ ڈھانپ دے مثلاً رقیق بادل جو فضا میں عارض ہو کر سورج کو ڈھانپ نہ سکیں مگر اس کی کمال روشنی سے مانع ہوں۔

فرمان نبوی کے متعدد معانی

اس مبارک فرمان کی متعدد توجیہات محدثین نے بیان کی ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمت کے اختلافات اور مصائب سے آگاہ فرمایا تو جیسے ہی وہ یاد آتے آپ دل میں بوجھ محسوس فرماتے اور اُمت کے لیے دعا فرماتے۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حالت سے دوسری بلند حالت کی طرف منتقل ہوتے تو اس پر استغفار فرماتے۔

۳۔ غیم وہ مستی ہے جو بطریق محبت اس قدر نصیب ہوتی ہے کہ بندہ اپنی ذات سے بالکل فانی ہو جاتا ہے۔ جب وہ حالت سکر و مستی سے حالت صحو و شعور کی طرف لوٹتا ہے تو وہ اس صحو پر استغفار ہوتی ہے۔ ارباب معرفت و حقیقت کے ہاں یہی تاویل و معنی ہے۔

۴۔ اہل ظاہر کی تاویل یہ ہے کہ دل خطرات، خواطر، خواہشات، انواع جھکاؤ واردات سے جدا نہیں ہو سکتا تو ان کے دفع کیلئے آدمی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے۔

توبہ نصوح کا مفہوم

۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد باری تعالیٰ:

تُوبُوا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا (پ۲۸-التحریم:۸) اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کو نصیحت ہو جائے۔

کی تفسیر میں کہا۔ یہ وہ بندہ ہے جس نے گناہ کیا پھر اس سے توبہ کی اور عزم کر لیا آئندہ اسے دوبارہ نہیں کرے گا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، انسان گناہ ترک کر کے ارادہ کرے آئندہ ہمیشہ ایسا نہیں کروں گا۔

۶۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے بیان کیا وہ ملائکہ سے فرماتا ہے جب بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرے تو تم اس کے لیے ایک نیکی لکھ لیا کرو پھر اگر اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھا کرو اگر وہ برائی کا ارادہ کرے اور وہ عملاً بھی اس کا ارتکاب کرے تو پھر ایک برائی لکھا کرو اور برائی ترک کر دے تو پھر نیکی لکھا کرو۔ (مسلم:۱۲۸)

گناہ معاف کر کے نیکی لکھ دیتا ہے

۷۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا، یا کریم العفو، حضرت جبریل نے عرض کیا آپ اس کا مفہوم جانتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں، انہوں نے عرض کیا وہ گناہ معاف فرما کر نیکی لکھ دیتا ہے۔

۸۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے جس نے ابتداء دن نیکی سے کی اور ختم بھی نیکی پر کیا اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے اس کے درمیان میرے بندے نے جو گناہ کئے ہیں انہیں نہ لکھو (شعب الایمان:۳۸۹)

ننانوے قتل اور توبہ

۹۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں میں ایک آدمی تھا جس نے ننانوے قتل کیے۔ اس نے سب سے بڑے عالم سے پوچھا، اس نے کہا فلاں راہب کے پاس جاؤ وہ گیا اور جا کر بتایا میں نے ننانوے قتل کیے ہیں کیا اب قاتل کے لیے توبہ ہے؟ کہنے لگا نہیں، اس نے اسے بھی قتل کر دیا حتیٰ کہ تعداد ایک صد ہو گئی پھر اس نے سب سے بڑے عالم سے پوچھا اس نے کہا فلاں عالم کے پاس جاؤ وہ گیا اور بتایا میں نے صد انسان قتل کئے ہیں کیا میرے لیے توبہ ہے؟ فرمایا ہاں، کون ہے جو تیرے اور تیری توبہ کے درمیان رکاوٹ بنے؟ تم فلاں علاقہ میں جاؤ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تم ان کے ساتھ جا کر عبادت کرو اور اپنی سرزمین پر واپس نہ آنا کیونکہ یہ ارض بد ہے۔ وہ شخص چلا ابھی راہ کے درمیان میں تھا تو موت آ گئی ملائکہ رحمت و عذاب دونوں آ گئے اور جھگڑا شروع کیا،

ملائکہ رحمت کہنے لگے اس نے دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لی ہے۔ ملائکہ عذاب نے کہا اس نے کوئی نیکی ہرگز نہیں کی، ایک فرشتہ بصورت انسان ان کے درمیان آیا اور کہا تم زمین کو ناپ لو جس کی طرف زمین کم ہو وہ اسے لے جائے جب زمین ناپی گئی تو منزل ایک بالشت دوسری راہ سے کم نکلی تو ملائکہ رحمت اسے لے گئے۔ (مسلم: ۲۷۶۶)

۱۰۔ حضرت ثابت بنانی سے ہے کہ ہمیں یہ روایت پہنچی، ابلیس نے کہا یا رب آپ نے آدم کو پیدا کر کے میرے اور اس کے درمیان عداوت کر دی تو اب مجھے اس پر اور اس کی اولاد پر مسلط کر دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے ان کے سینے تیرا مسکن بنایا، کہنے لگا یا رب اضافہ فرما۔ فرمایا آدم کے ہاں جو اولاد ہو گی اس کے ساتھ تیرے دس بیٹے پیدا ہوں گے۔ کہنے لگا یا رب اضافہ فرما فرمایا تیری ان کے اندر خون کی طرح گردش ہو گی عرض کرنے لگا اس میں اور اضافہ فرما فرمایا:

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ — اور ان پر لام باندھ (فوج چڑھا) لا اپنے سواروں اور اپنے پیادوں کا اور ان کا ساجھی ہو مالوں اور بچوں میں (پ ۱۵- الاسراء: ۶۴)

اس پر سیدنا آدم علیہ السلام نے عرض کیا یا رب آپ نے ابلیس کو پیدا فرمایا۔ میرے اور اس کے درمیان عداوت و بغض رکھا، اسے مجھ پر اور میری اولاد پر مسلط فرمایا، میں تیرے بغیر اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو بھی تمہارے ہاں اولاد ہو گی اس کی برے ساتھی سے حفاظت کے لیے دو فرشتے مقرر کروں گا، عرض کیا اس میں اضافہ فرما دے فرمایا ایک نیکی کے بدلے دس، عرض کیا اس میں اضافہ فرما دے فرمایا وقت نزع سے پہلے تیری اولاد کی توبہ کے لیے دروازہ بند نہیں کروں گا۔

۱۱۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کو دست قدرت بڑھا کر دن کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے اور دن کو رات کے یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔

(مسلم: ۲۷۵۹)

۱۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے جب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات سنتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق نفع پاتا جب کوئی صحابی بیان کرتا تو میں حلف لیتا اگر وہ حلف دیتے تو میں ان کی تصدیق کیا کرتا، حضرت ابو بکر نے مجھے بیان کیا اور انہوں نے سچ کہا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی نے گناہ کیا پھر اس نے اچھی طرح طہارت کی دو رکعتیں ادا کیں اور اللہ سے معافی مانگی تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے پھر یہ آیت تلاوت کی

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ — اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانوں پر ظلم کریں اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں (پ ۴- آل عمران: ۱۳۵)

(سنن ابو داؤد: ۱۵۲۱)

۱۳۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ہے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھا ایک آدمی نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے گناہ ہو گیا ہے مجھ پر حد قائم کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض کیا اس نے دوبارہ عرض کیا اتنے میں نماز کیلئے تکبیر کہہ دی گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے تشریف لے گئے واپس تشریف لائے میں آپ کے ساتھ چل رہا تھا پیچھے وہ آدمی بھی آ گیا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے گناہ کیا ہے لہٰذا مجھ پر حد قائم فرما دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو نے گھر سے نکلتے وقت کامل وضو نہیں کیا؟ عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟ عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے گناہ کو معاف فرما دیا ہے۔ (مسلم:۲۷۶۵)

۱۴۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا، میں شہر مدینہ کے آخری گوشہ میں ایک خاتون کے پاس گیا مجھے انزال ہوا مگر اسے چھوا نہیں تو مجھ پر اپنی مرضی کے مطابق سزا نافذ فرمائیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا جب اللہ نے تجھ پر پردہ ڈالا ہے تو تو بھی اپنی ذات کا پردہ رکھ لیکن رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہ فرمایا۔ وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا آپ نے طلب فرمایا اور یہ آیت مبارکہ پڑھی:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (پ۱۲۔ ھود:۱۱۴) اور نماز قائم رکھو دن کے دونوں کناروں اور کچھ رات کے حصوں میں بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں

ایک آدمی نے عرض کیا: یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ حکم اس کے لیے خاص ہے؟ فرمایا نہیں تمام لوگوں کیلئے ہے۔ (مسلم:۲۷۶۳)

۱۵۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک آدمی جب گناہ کر کے کہتا ہے یا رب میں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے مجھے معاف فرما دے۔ رب کریم فرماتے ہیں میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گرفت بھی فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا پھر حسب توفیق الٰہی رکا رہا پھر اس نے دوسرا گناہ کیا اور عرض کیا یا رب میں نے اور گناہ کیا ہے مجھے معاف فرما دے۔ رب اکرم فرماتا ہے میرا بندہ جانتا ہے اس کا رب ہے جو معاف بھی فرماتا ہے اور گرفت بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے پھر وہ حسب توفیق الٰہی رکا رہتا ہے اور پھر اور گناہ کرتا ہے اور عرض کرتا ہے میں نے گناہ کیا مجھے معاف فرما دے رب تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے کا عقیدہ ہے میرا رب ہے او وہ معاف بھی کرتا ہے اور گرفت بھی، رب کریم فرماتا ہے میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا جو بھی وہ عمل کرے۔

(صحیح البخاری:۷۵۰۷)

۱۶۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے ہے میں چھپا رہا تھا ایسی بات جو میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی، فرمایا اگر تم گناہ کر کے معافی نہ مانگو تو اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق پیدا فرما دے گا جو گناہ کر کے معافی مانگیں۔ (مسلم:۲۷۶۸)

ماں سے زیادہ مہربان

۱۷۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے ایک آدمی چادر اوڑھے آیا اس کے ہاتھ میں کوئی شئی تھی، عرض کرنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں درختوں کے باغیچہ سے گزرا، میں نے وہاں پرندے کے بچوں کی آواز سنی، انہیں اٹھا کر میں نے اپنی چادر میں رکھ لیا۔ ان کی والدہ نے آکر میرے سر پر چکر کاٹنے شروع کر دیئے میں نے چادر پیچھے کی تو وہ ان پر آگری، میں ان تمام کو لپیٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا ہوں۔ فرمایا انہیں چھوڑ دو میں نے انہیں چھوڑا مگر ان کی والدہ ان کے ساتھ ہی چمٹی رہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تمہیں ان بچوں کی ماں کی شفقت پر تعجب ہوا ہے؟ عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے:

اَللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَ فْرَاخِ بِفِرَاخِهَا (سنن ابوداؤد: ۳۰۸۹) اللہ جل شانہ کی ذات اقدس اپنے بندوں پر ان بچوں کی والدہ سے کہیں زیادہ رحم فرمانے والی ہے۔

جاؤ انہیں وہاں ہی چھوڑ کر آؤ جہاں سے تم نے اٹھائے تھے۔ میں نے ان بچوں اور ان کی والدہ کو واپس وہاں ہی پہنچا دیا۔

بادشاہی میں کوئی کمی نہ ہو

۱۸۔ ابو مسلم خولانی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے اور انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بیان کیا، اے میرے بندوں میں نے اپنی ذات پہ ظلم حرام فرما لیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا لہٰذا آپس میں ظلم نہ کرو، اے میرے بندوں تم دن رات خطا کرتے ہو اور میں تمہارے گناہ معاف فرماتا ہوں اور میں پرواہ نہیں کرتا تم مجھ سے معافی مانگو میں تمہیں معافی دوں گا، اے میرے بندوں تم بھوکے ہو مگر جسے میں کھلاؤں تم مجھ سے طعام مانگو میں تمہیں طعام عطا کروں گا۔ اے میرے بندوں تم ننگے ہو مگر میں جسے کپڑا دوں تم مجھ سے کپڑا مانگو میں تمہیں عطا کروں گا اے میرے بندوں اگر تم اول آخر انسان اور جنات تمام تقویٰ اختیار کر لو تو میری بادشاہی میں کچھ اضافہ نہ ہو گا اے میرے بندوں اگر تم اول و آخر جن وانس تمام فسق و فجور اختیار کر لو تو میری بادشاہی میں کچھ کمی نہ ہو گی۔ اے میرے بندوں اگر تم اول' وآخر اور انس و جن تمام اکھٹے ہو کر مجھ سے مانگو اور ہر انسان کو میں اس کی حسب خواہش عطا کر دوں تو میرے خزانوں سے اس قدر بھی کم نہ ہو گا جتنا ایک سوئی کو ایک دفعہ سمندر میں ڈبونے پر ہوتا ہے اے میرے بندوں یہ تمہارے اعمال ہیں جنہیں میں نے محفوظ کیا اگر تم اس میں خیر پاتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرو اور اگر اس کے علاوہ پاتے ہو تو اپنے نفس کو ملامت کرو۔

(مسلم: ۲۵۷۷)

اور فرمایا جب یہ روایت شیخ ابوادریس بیان کرتے تو تعظیم کی خاطر گھٹنوں کے بل ہو جاتے۔

توبہ اور آثار

ا۔ حضرت ذوالنون مصری سے توبہ کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا یہ چھ چیزوں کا مجموعہ ہے۔

ا۔ سابقہ گناہ پر ندامت۔

۲۔ مستقبل میں اسے ترک کا عزم۔

۳۔ اس فریضہ کی ادائیگی جو بندے اور اللہ کے درمیان ضائع ہوا۔

۴۔ مخلوق کے اموال اور عزتوں پر جو ظلم کیا اس کا ازالہ۔

۵۔ اس خون اور گوشت کا ختم کرنا جو حرام سے پیدا ہوا۔

۶۔ جسم کو طاعات کی تکلیف پر اس طرح پُرلذت بنانا جیسے اسے معصیت کی حلاوت حاصل تھی۔

۲۔ شیخ احمد بن حارس کہا کرتے، اے گناہوں والے ابھی توبہ کا وقت نہیں آیا؟ گناہ دیوان میں لکھے جا چکے ہیں اور تو قبر میں ان کی وجہ سے تکلیف میں ہے اور کل ان کی وجہ سے تو مطلوب بھی ہوگا۔

دوسرا فائدہ، توبہ کی محتاجی

آیت مبارکہ کے فوائد میں سے ہے کہ جب اس قدر بلند مقام کے باوجود سیدنا آدم توبہ سے بے نیاز نہیں تو ہم بطریق اولیٰ توبہ کے محتاج ہیں۔

تیسرا فائدہ: سیدنا آدم علیہ السلام کا رونا

اس لغزش پر سیدنا آدم علیہ السلام جو روئے اس میں ہمارے لیے تنبیہ ہے کہ ہم رونے کے ان سے زیادہ حقدار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اگر تمام دنیا کا رونا جمع کیا جائے تو حضرت داؤد علیہ السلام کا رونا اس سے زائد ہے اور تمام اہل دنیا کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کے رونے کو بھی شامل کر لیا جائے تو حضرت نوح علیہ السلام کا رونا اس سے زائد ہے اور اگر حضرت داؤد اور حضرت نوح علیہما السلام کا اور تمام اہل دنیا کا رونا جمع کر لیا جائے تو لغزش پر سیدنا آدم علیہ السلام کا رونا اس سے کہیں زائد ہے۔

نواں مسئلہ: حضرت حوا کی توبہ

اللہ تعالیٰ نے صرف سیدنا آدم علیہ السلام کی توبہ کا ذکر فرمایا نہ کہ سیدہ حوا علیہا السلام کی توبہ کا کیونکہ بالتبع ان کا ذکر آ ہی گیا جیسا کہ قرآن وسنت میں اکثر ایسا ہی ہے، البتہ دوسرے مقام پر اس کا ذکر بھی ہے، ارشاد فرمایا:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (پ۸-الاعراف:۲۳)

دونوں نے عرض کی اے رب ہمارے، ہم نے اپنا آپ بُرا کیا

[۳۸] قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

(ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اُتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم)

اس میں درج ذیل مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، تکرار حکم ہبوط کے فوائد

مفسرین نے تکرار حکم ھبوط (اترنے) میں دو طرح کا فائدہ ذکر کیا ہے۔

۱۔ شیخ جبائی نے کہا ھبوط اول (پہلا اترنا) دوسرے کا غیر ہے۔ اول جنت سے سماء دنیا کی طرف جبکہ دوسرا وہاں سے زمین کی طرف ہے لیکن یہ دو وجہ سے ضعیف ہے۔

پہلی وجہ: ھبوط اول میں فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ اگر زمین پر استقرار ھبوط ثانی سے ہوتا تو پھر ارشاد گرامی:

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ — اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے

(پ۱- البقرہ:۳۶)

کا ذکر ھبوط ثانی کے بعد ہونا چاہئے تھا

دوسری وجہ: ھبوط ثانی میں فرمایا: "اِهْبِطُوْا مِنْهَا" تو یہاں ضمیر جنت کی طرف ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ھبوط ثانی جنت سے ہی ہو

۲۔ یہ تکرار محض تاکید کیلئے ہے۔

لیکن میرے نزدیک تیسری وجہ ہو سکتی ہے جو ان دونوں سے زیادقوی ہے۔

۳۔ جب حضرت آدم وحواؑ سے لغزش ہوگئی اور دونوں کو اترنے کا حکم ملا تو دونوں نے اس حکم کے بعد توبہ کی اور دل میں خیال آیا کہ لغزش کی وجہ سے اترنے کا حکم تھا اب توبہ کے بعد لازمی ہے کہ یہ حکم ھبوط باقی نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ھبوط کا حکم دیا تا کہ انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ ھبوط، لغزش کے ارتکاب پر بطور سزا نہیں کہ وہ اس کے زوال سے زائل ہو جائے

بلکہ وہ تو توبہ کے بعد بھی باقی رہے گا کیونکہ اس میں پہلے وعدہ کا پورا کیا جانا ہے۔فرمان ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (پ۱-البقرہ،۳۰) میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں

اگر یہ سوال ہو کہ شرط اول کا جواب کون ہے؟ تو ہم کہیں گے شرط ثانی مع جواب، اس کا جواب ہے جیسے محاورہ ہے:

"ان جئتنی فان قدرت فاحسنت الیك" اگر تم میرے پاس آئے تو اگر مجھے قدرت ہوئی تو میں تم سے حسن سلوک کروں گا

دوسرا مسئلہ: اُتارے جانے کے مقامات

احادیث میں ہے سیدنا آدم علیہ السلام کو ہند، حضرت حوا علیہا السلام کو جدہ، ابلیس کو بصرہ سے چند میل دور اور سانپ کو اصفہان اتارا گیا

تیسرا مسئلہ: ہدایت کے معانی

یہاں ہدایت سے یہ معانی مراد ہیں۔

۱۔ اس سے مراد ہر قسم کی رہنمائی اور بیان ہے۔اس میں عقل بھی شامل ہے اور ہر وہ کلام بھی جو نبی پر نازل ہوتا ہے۔اس میں اس پر تنبیہ ہے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام پر کس قدر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے گویا یہ فرمایا اگر میں نے تمہیں جنت سے زمین کی طرف اتارا ہے تو میں نے تم پر ایسی نعمت نازل کی ہے جو تمہیں دوبارہ جنت میں داخل کر رہی ہے اور تم وہاں ہمیشہ رہو گے۔

چار چیزوں کا حکم

امام حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب سیدنا آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار چیزیں بتاتے ہوئے کہا، یہ تمام تیرے اور تیری اولاد کیلئے ہے۔ایک میرے لیے اور ایک تیرے لیے ہے، ایک میرے اور تمہارے درمیان اور ایک تیرے اور لوگوں کے درمیان مشترک ہے۔میرے لیے یہ ہے کہ تم میری عبادت کرو اور میرا کسی کو شریک نہ بناؤ۔جو تیرے لیے وہ یہ ہے کہ جب تم عمل کرو گے تو اس پر اجر پاؤ گے۔میرے اور تمہارے درمیان مشترک یہ ہے کہ دعا کرو اور میں اسے قبول کروں گا رہی تمہارے اور لوگوں کے درمیان مشترکہ چیز یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اس چیز سے محبت کرو کہ جس چیز پر تم جانتے ہو کہ وہ تم سے محبت کریں

۲۔ حضرت ابو العالیہ سے ہے یہاں ہدایت سے انبیاء مراد ہیں لیکن یہ قول تب تام ہوگا کہ اگر "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی" سے مخاطب سیدنا آدم کا غیر ہو اور وہ ان کی اولاد ہے تو یہ تاویل ہدایت کے ساتھ مخاطبین میں تخصیص کا تقاضا کرے گی اور ہدایت کو بغیر دلیل کے معین نوع (انبیاء) کے ساتھ مخصوص کرنا لازم آئے گا۔

چوتھا مسئلہ: جملہ مختصر مگر معانی کثیر

اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا جس نے حق کی ہدایت پر عقیدہ وعمل میں یوں عمل کیا کہ جولازم تھا اسے اپنالیا اور حرام سے رک گیا تو وہ اس مقام کو پالے گا کہ اسے نہ خوف ہو اور نہ غم۔ یہ جملہ مختصر ہونے کے باوجود کثیر معانی کو جامع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی (پ۱-البقرۃ:۳۸، پ۱۶-طہٰ:۱۲۳) آئے گی تمہارے پاس میری ہدایت

میں جمیع دلائل عقلیہ وشرعیہ اور زیادات بیان کے اقسام شامل ہیں اور وہ تمام شامل ہیں جن کے بغیر یہ تام نہیں ہوتیں مثلاً عقل اور تمام وجوہ تمکن اور ارشاد گرامی:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ (پ۱-البقرۃ:۳۸) تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی

تمام دلائل میں تامل، ان میں نظر وفکر، ان سے حاصل معارف، ان پر عمل اور تمام تکالیف کو شامل ہے اور ارشاد گرامی:

فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ۱-البقرۃ:۳۸) نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ ان پر کوئی غم

ان تمام نعمتوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے لیے تیار کی ہیں کیونکہ زوال خوف، تمام آفات سے سلامتی کو متضمن اور زوال حزن، تمام لذات اور مرادات کے حصول کا مقتضی ہے۔

عدم خوف کی عدم حزن پر تقدیم کی وجہ یہ ہے کیونکہ غیر مناسب اشیاء کا زوال، مناسب کی طلب سے مقدم ہوتا ہے اور یہ فرمان دلالت کررہا ہے کہ جس مکلف نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرلی اسے قبر، وہاں سے اٹھنے کے وقت، میدان محشر میں اعمال نامہ ملنے کے وقت، میزان اور پل صراط پر کوئی خوف نہ ہوگا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ هٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (پ۱۷-الانبیاء:۱۰۳) اُنہیں غم میں نہ ڈالے گی وہ سب سے بڑی گھبراہٹ اور فرشتے ان کی پیشوائی کو آئیں گے کہ یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ تھا

قول متکلمین

متکلمین میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کی ہولناکیاں جیسے کفار ومنافق کو پہنچیں گی اس طرح اہل ایمان کو بھی خوفناک کریں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ جس دن تم اُسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے کو بھول جائے گی (پ۱۷-الحج:۲)

انہوں نے یہ بھی کہا، جب یہ احوال ان سے ختم ہو جائیں گے اس کے بعد وہ اللہ کی رضا اور جنت کی طرف جائیں گے تو گویا انہوں نے ان اشیاء کو پایا ہی نہیں بلکہ اب انعامات کی لذت میں خوب اضافہ ہو جائے گا۔

لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ ارشاد گرامی، لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ خاص ہے اور يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ عام ہے اور خاص عام سے مقدم ہوتا ہے۔

ابن زید کا قول

ابن زید کہتے ہیں: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ سے مراد یہ ہے کہ انہیں آگے کا ڈر نہیں کیونکہ موت کے بعد درپیش معاملات سے اعظم کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان پر امن عطا فرمایا پھر انہیں دنیا میں پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں فرمایا انہیں کوئی حزن نہ ہوگا

اخروی خوف کی نفی ہے

سوال: اگر کوئی یہ کہے: ارشاد گرامی "فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا و آخرت کا مطلقاً خوف نہ ہو حالانکہ معاملہ ایسا نہیں کیونکہ دنیا میں جو خوف وحزن اہل ایمان کو لاحق ہوتا ہے وہ دوسروں سے زیادہ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

خص البلاء بالأنبياء ثم الأولياء ثم الأمثل فالأمثل حضرات انبیاء پر آزمائش سخت ہوتی ہے پھر اولیاء پھر اس کے بعد حسب درجہ

پھر مومن کو اس بات کا یقین نہیں ہو سکتا کہ اس نے عبادات کا حق ادا کر دیا ہے لہٰذا اسے خوف تقصیر و کوتاہی لاحق رہے گا پھر اسے خاتمہ بد کا خوف ہر وقت رہتا ہے۔

جواب: ہمارا جواب یہ ہے کہ قرائن بتاتے ہیں یہاں آخرت کے خوف وحزن کی نفی ہے نہ کہ دنیاوی کی یہی وجہ ہے کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہونگے تو وہ کہیں گے:

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ سب خوبیاں اللہ کیلئے جس نے ہمارا غم دور کیا بیشک ہمارا رب بخشنے والا قدر فرمانے والا ہے (پ۲۲-الفاطر:۳۴)

فضل قدیر

یعنی ہمیں وہ خوف ختم ہو گیا جو دنیا میں تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے قرب سے محروم نہ ہو جائیں جواب ہمیں مل گیا ہے۔

پانچواں مسئلہ: قاضی کا قول

قاضی لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" ان امور پر دال ہے:

۱۔ بعض اوقات ہدایت ہوتی ہے مگر ہدایت پانے والا نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا: فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ

۲۔ یہ قول باطل ہے کہ معارف ضروری و بدیہی ہوتے ہیں۔

۳۔ اتباع ہدایت، جنت کا مستحق بنا دیتی ہے۔

۴۔ تقلید باطل ہے کیونکہ مقلد ہدایت کے تابع نہیں ہوتا۔

[۳۹] وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

(اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا ہے)

آیت کا ربط و تعلق

جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اتباع کرنے والوں سے عذاب وحزن سے امن کا وعدہ فرمایا تو اس کے بعد ایسے لوگوں کا ذکر کیا جن کیلئے عذاب دائمی ہے تو فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا خواہ یہ منکر انسان ہوں یا جن یہ عذاب دائمی پائیں گے۔ رہی یہ گفتگو کہ اللہ کی طرف سے عذاب میں حسن ہے یا نہیں؟ اگر حسن ہے تو کیا دائمی میں حسن ہے یا نہیں؟ اس پر تفصیلی گفتگو ارشاد ربانی:

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے عذاب عظیم ہے
(پ۱-البقرۃ:۷)

کے تحت گزر چکی ہے۔

یہاں پر آخری آیات جو تمام اولاد آدم پر ہونے والی نعمتوں پر دال ہیں یہ توحید پر شاہد ہیں کیونکہ یہ تمام نعمتیں امور حادث ہیں جن کیلئے کسی پیدا کرنے والے کا ہونا ضروری ہے اور یہ نبوت پر بھی دال ہیں کیونکہ حضور ﷺ نے بغیر پڑھے اور کسی سے سیکھے کے ان کے بارے میں اسی طرح خبر دی جیسا کہ تورات اور انجیل میں تھی اور یہ آخرت پر بھی شاہد ہیں کیونکہ جو ہستی ابتداً ان کی تخلیق پر قدرت رکھتی ہے۔ وہ ان کے دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ وباللہ التوفیق۔

بنی اسرائیل پر مخصوص نعمتوں کے بارے میں گفتگو

واضح رہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے توحید، نبوت اور آخرت پر دلائل ذکر کیے پھر ان انعامات کا تذکرہ کیا جو تمام انسانوں کو حاصل ہیں، اس کے بعد ان خصوصی انعامات کا ذکر لایا جو صرف اسلاف یہود کو ملے تا کہ عطا کی ہوئی نعمتوں کے ذکر سے ان کے عناد و تکبر کو توڑ کر ان کے دلوں کو مائل کیا جا سکے اور یہ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری پر تنبیہ بھی ہے کیونکہ یہ تمام غیبی خبریں ہیں، یہ بھی ذہن نشین رہے اللہ تعالیٰ نے اولاً ان انعامات کا تذکرہ اجمالاً یوں فرمایا:

يَا بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِيٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ (پ۱-البقرہ:۴۰)

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا

اور ان کے تذکرہ پر بطور تفریع حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَآمِنُوا بِمَآ أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (پ۱-البقرہ:۴۱)

اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا۔ اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے

پھر ان امور کا تذکرہ کیا جو اس ایمان سے مانع ہیں اس کے بعد دوبارہ اجمالاً نعمتوں کا تذکرہ یوں فرمایا:

يَا بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا

تا کہ ان کی شدت غفلت پر تنبیہ ہو جائے اس کے بعد خوب ترغیبی جملہ ذکر کیا:

وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (پ۱-البقرہ:۴۷)

اور یہ کہ میں نے اس سارے زمانے پر تمہیں بڑائی دی

جس سے متصل خوب ترہیبی اور خوف والا جملہ لایا گیا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (پ۱-البقرہ:۴۸)

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ (کافر کیلئے) کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر (اس کی) جان چھوڑی جائے اور نہ اُن کی مدد ہو گی

اس کے بعد نعمتوں کا تفصیلی شمار شروع فرمایا۔ جو بھی نظر وفکر اور انصاف سے کام لے گا وہ یقین کرے گا کہ دعوت دینے اور قلب سامع میں حصول اعتقاد کیلئے کلام میں یہ حسن ترتیب، کمال کے درجہ پر ہے جب یہ گفتگو بطور مقدمہ آ گئی تو ہم اب اللہ تعالیٰ کی مدد سے تفسیر شروع کرتے ہیں۔

[۴۰] یٰبَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

(اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو)

یہاں درج ذیل مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اسرائیل سے مراد کون؟

تمام مفسرین کا اتفاق ہے اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم علیہم السلام ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں اسرائیل کا مفہوم ''عبداللہ'' ہے اسرا، ان کی زبان میں عبد اور ائیل، اللہ کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح جبریل کا معنی عبداللہ اور میکائیل کا معنی بھی عبداللہ ہی ہے۔ شیخ قفال کے بقول بعض کے نزدیک اسرا عبرانی میں انسان ہے گویا اب معنی رجل اللہ (اللہ کا مرد) ہوگا۔

یا بنی اسرائیل میں یہود کی اس جماعت سے خطاب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کی صورت میں حضور علیہ السلام کی ظاہری حیات میں سرزمین مدینہ میں تھی۔

دوسرا مسئلہ: نعمت کا مفہوم

نعمت کی تعریف یہ ہے جو منفعت بطور احسان دوسرے پر کی جائے، بعض نے اس میں حسنہ کی قید یہ کہتے ہوئے بڑھائی ہے کہ نعمت پر شکر کا استحقاق ہوتا ہے اور اگر وہ قبیح ہو تو پھر اس پر استحقاق شکر نہیں رہتا۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ قید معتبر نہیں کیونکہ ممکن ہے احسان کی وجہ سے شکر کا استحقاق ہو اگرچہ اس کا فعل ممنوع ہو کیونکہ استحقاق شکر کی جہت، استحقاق ذم وعتاب کے علاوہ ہے تو ان کے اجتماع میں کونسی رکاوٹ ہے؟ کیا یہ نہیں ہوتا فاسق اپنے انعام کی وجہ سے شکر کا مستحق اور اپنی معصیت کی وجہ سے قابل مذمت ہوگا تو یہاں یہ معاملہ کیوں نہیں ہوسکتا؟

تعریف نعمت میں اولیں قید منفعت ہے کیونکہ سراپا نقصان دہ شی نعمت نہیں بن سکتی۔ دوسری قید تھی کہ وہ بطور احسان دی گئی ہو کیونکہ اگر وہ نفع ہو مگر دینے والا اپنے لیے قصد کرے نہ کہ دیئے جانے والے کیلئے مثلاً جو لونڈی کے ساتھ احسان کرتا ہے تاکہ نفع حاصل کروں یا اس کا مقصد ضرر اور دھوکہ ہے مثلاً دوسرے کے زہر آلود حلوہ کھلا دیتا ہے تاکہ وہ ہلاک ہو جائے تو اسے نعمت نہیں کہا جائے گا ہاں جب منفعت بطور احسان دوسرے کیلئے ہوگی تو پھر وہ نعمت ہوگی جب نعمت کی تعریف واضح ہوگئی تو اب چند فروعات بیان کرتے ہیں

۱- جو کچھ ہمیں دن رات دنیا و آخرت میں بصورت نفع اور دفع ضرر مل رہا ہے یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد فرمایا:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ — اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کی طرف پناہ لینے جاتے ہو (پ۱۴-النحل:۵۳)

نعمت کی تین اقسام

پھر نعمت کی تین اقسام ہیں:

۱- وہ نعمت جس کے عطا فرمانے میں اللہ تعالیٰ یکتا و متفرد ہے مثلاً اس نے پیدا کیا، اس نے رزق عطا فرمایا۔

۲- وہ نعمت جو ہمیں اس کے غیر کے سبب ملی مثلاً اس نے اس نعمت کو پیدا کیا اور منعم کو بھی پھر اسے انعام دینے پر قدرت دیتے ہوئے اس میں قدرت انعام اور داعیہ پیدا کیا۔ اسے توفیق دیتے ہوئے اس کی رہنمائی فرمائی۔ یہ نعمت بھی حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے مگر جب اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے کسی بندے کے ہاتھ سے جاری فرمایا تو وہ بندہ بھی مشکور ٹھہرا، ہاں حقیقۃً مشکور اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی لیے فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ — شکر کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (پ۲۱-لقمان:۱۴)

تو یہاں ابتدا اپنی ذات اقدس سے فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک فرمان ہے:

لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ مَنْ لَا يَشْكُرِ النَّاس — اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کیا جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا

۳- وہ نعمت جو ہمیں ہماری طاعات کی وجہ سے ملتی ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں اگر وہ طاعات کی توفیق نہ دیتا، ان پر ہماری مدد نہ فرماتا، ہماری ان کی طرف رہنمائی نہ کرتا اور ہماری رکاوٹوں و اعذار کا ازالہ نہ فرماتا تو ہم ان میں سے کچھ بھی نہ پا سکتے۔

اس گفتگو سے آشکار ہو گیا تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں اور سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ — اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے (پ۱۴-النحل:۵۳)

نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا

۲- بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس قدر ہیں کہ ان کا حساب و شمار نہیں ہو سکتا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا — اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے (پ۱۴-النحل:۱۸)

اور یہ اس لیے ممکن نہیں کہ جو اس نے ہمارے اندر منافع اور لذات ودیعت فرمائی ہیں جن سے ہم متمتع ہوتے ہیں۔ وہ جوارح اور اعضاء جنہیں ہم حصول منافع اور دفع نقصان کیلئے بروئے کار لاتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں پر لذت اشیاء پیدا کیں اور ان سے وجود صانع پر استدلال کیا جاتا ہے اور کائنات میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی وجہ سے انسان معاصی سے رکتا ہے۔ یہ تمام اس قدر ہیں کہ ان کی تعداد احاطہ میں نہیں آتی حالانکہ یہ تمام منافع ہی ہیں کیونکہ منفعت لذت ہے یا وسیلہ لذت اور اللہ تعالیٰ نے جس کی تخلیق فرمائی اس میں یہی پہلو ہے کیونکہ جس سے بھی لذت حاصل کی جائے وہ نعمت ہے اور وہ دفع ضرر کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے بھی نعمت ہے اور جو حصول نفع اور دفع ضرر حاضر، کیلئے سبب تو نہ بنے مگر اس میں یہ صلاحیت ہو کہ صانع حکیم کے وجود پر استدلال بن سکے تو یہ اس کی معرفت اطاعت کا وسیلہ بن گئی اور یہ دونوں لذات ابدیہ کا وسیلہ ہیں۔

تو ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات، بندوں کیلئے نعمت ہیں تو جب اس کی اشیاء کے منافع اور حکمتوں کی تعداد سے عقول قاصر ہیں تو تمام جہان کے منافع وحکمتوں کا احاطہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی برحق ہے

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا — اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے

سوال وجواب

اگر کوئی یہ سوال اٹھائے جب نعمتیں غیر محدود ہیں اور غیر متناہی کا علم بندے کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا تو پھر ان کے ذکر کا حکم کیا معنی رکھتا ہے

اُذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ — یاد کرو میری نعمتیں جو میں نے تم پر کیں

اس کا جواب یہ ہے نعمتیں اپنی انواع اور ذوات کے اعتبار سے غیر متناہی مگر اجناس کے لحاظ سے متناہی ہیں اور یہ اس تذکیر کیلئے کافی ہے جو وجودِ صانع حکیم کیلئے مفید علم ہے۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ حمد، ثنا اور اطاعت کا استحقاق ایصال نعمت کی بنا پر ہی ثابت ہوتا ہے تو یہ آشکار ہو گیا کہ حمد حامدین کا مستحق اللہ تعالیٰ سے ہی ہے اسی لئے بتوں کی مذمت میں فرمایا:

هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ — کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم پکارو یا تمہارا بھلا یا برا کرتے ہیں (پ۱۹-الشعراء:۷۲،۷۳)

ایک مقام پر فرمایا:

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَ لَا یَضُرُّهُمْ — اور وہ اللہ کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کا بھلا بُرا کچھ نہیں کریں (پ-الفرقان:۵۵)

ایک مقام پر فرمایا:

اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی (پ۱۱-یونس:۳۵)

تو کیا جو حق کی راہ دکھائے اس کے حکم پر چلنا چاہئے یا اس کے جو خود ہی راہ نہ پائے جب تک راہ نہ دکھایا جائے۔

بندوں پر پہلی نعمت

۳۔ بندوں پر سب سے پہلی اللہ کی نعمت ان کو حیات وزندگی دینا ہے۔اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (پ۱-البقرہ:۲۸تا۲۹)

بھلا تم کیوں کر خدا کے منکر ہو گئے، حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے۔وہ سب کچھ جانتا ہے

یہ تصریح ہے کہ اصل نعمت حیات ہے کیونکہ باری تعالیٰ نے اولین نعمت، حیات ہی بیان فرمائی ہے اس کے بعد دیگر نعمتوں کا ذکر کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا تذکرہ کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ حیات دینوی سے مقصود حیات آخرت اور ثواب ہے اور یہ بھی بیان کیا کہ مخلوق کی تمام اقسام فقط نفع حاصل کرنے والی اور نفع دینے والی ہیں یہ معتزلہ کا قول ہے۔

اہلسنّت کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح منافع پیدا فرمائے اسی طرح اس نے نقصان دہ اشیاء بھی پیدا فرمائیں اور اس پر کوئی سوال ہی نہیں اٹھا سکتا اس لیے اس نے اپنا اسم گرامی 'النافع' (نفع دینے والا) کے ساتھ الضار (نقصان دینے والا) بھی منتخب فرمایا اور وہ جو کرے اس پر سوال نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ معتزلہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مکلفین پر دنیا اور دین کی نعمتیں کیں اور ان تمام کو دونوں میں برابر رکھا ہے۔دینی نعمتوں میں یوں کہ جس قدر وہ تمام الطاف پر قادر ہے اس نے وہ ان پر کیے اور جو اس نے نہیں کیے وہ قدرت میں داخل ہی نہ تھے کیونکہ اگر وہ لطف پر قادر ہو اور وہ مکلّف پر نہ کرے تو مکلّف کیلئے عذر ثابت ہو جائے گا، دنیا کی نعمتوں میں اہل بغداد کے قول کے مطابق دنیا میں اصلح کی رعایت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور اہل بصرہ کے ہاں لازم نہیں۔

اہلسنّت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کافر کو دوزخ اور عذاب آخرت کیلئے پیدا فرمایا ہے۔

کافر اور نعمت دینوی

اس میں اختلاف ہے کیا اللہ تعالیٰ کافر پر دینوی نعمت کرتا ہے یا نہیں؟ بعض نے کہا یہ دینوی قلیل نعمتیں جو آخرت میں عذاب دائمی کا سبب ہیں یہ کافر کے لئے دنیاوی نعمت ہی نہیں کیونکہ جس نے میٹھی شیٔ میں زہر ڈال لیا اس میٹھا کھانے کے نفع کو نعمت نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ وہ تو ضرر عظیم کا سبب بن گیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا (پ۴، آل عمران:۱۷۸)

اور ہرگز کافر اس گمان میں نہ رہیں کہ وہ جو ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں کچھ ان کے لیے بھلا ہے ہم تو اس لیے انہیں ڈھیل دیتے ہیں کہ اور گناہ میں بڑھیں

بعض کی رائے ہے اللہ تعالیٰ نے کافر پر اگر چہ دینی نعمت نہیں فرمائی مگر دنیاوی نعمت فرمائی ہے۔ قاضی ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہی ہے اور یہی زیادہ درست ہے۔ اس پر یہ دلائل ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (پ۱۔ البقرہ:۲۱،۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیز گاری ملے۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اُتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو۔ تو اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ

جس میں واضح کر دیا ہے کہ ہر ایک پر طاعت لازم ہے کیونکہ انہیں نعمتیں دی گئیں ہیں اور وہ نعمت تخلیق و رزق ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا (پ۱۔ البقرہ:۲۸) بھلا تم کیوں کر خدا کے منکر ہو گئے حالانکہ تم مُردہ تھے

یہ احسان کے طور پر دیگر نعمتوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے اگر کفار پر اللہ کی طرف سے نعمت ہی نہیں تو پھر یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے؟

۳۔ اللہ تعالیٰ کا مبارک فرمان ہے

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (پ۱۔ البقرہ:۴۷)

اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانے پر تمہیں بڑائی دی

یہ واضح نص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر نعمت فرمائی ہے کیونکہ یہاں مخاطب اہل کتاب ہیں اور وہ کافر ہی تھے۔

اس طرح ارشاد باری۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ سے لے کر وَاِذۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ اور فرمان:

وَاِذۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ (پ۱، البقرۃ:۵۳)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دی تاکہ تم ہدایت پاؤ

تک تمام میں بندوں پر انعامات کا ذکر ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَهۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّکُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَیۡهِمۡ مِّدۡرَارًا (پ۷۔ الانعام:۶)

کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی سنگتیں کھپا دیں انہیں ہم نے زمین میں وہ جماؤ دیا جو تم کو نہ دیا اور ان پر موسلا دھار پانی بھیجا

۵۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلۡ مَنۡ یُّنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ تَدۡعُوۡنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَةً ثُمَّ اَنۡتُمۡ تُشۡرِکُوۡنَ (پ۷۔ الانعام:۶۳)

تم فرماؤ وہ کون ہے جو تمہیں نجات دیتا ہے جنگل اور دریا کی آفتوں سے جسے پکارتے ہو گڑگڑا کر اور آہستہ کہ اگر وہ ہمیں اس سے بچاوے تو ہم ضرور احسان مانیں گے تم فرماؤ اللہ تمہیں نجات دیتا ہے اس سے اور ہر بے چینی سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو

۶۔ اسی طرح فرمایا:

وَلَقَدۡ مَکَّنّٰکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَجَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡهَا مَعَایِشَ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ (پ۸۔ الاعراف:۱۰)

اور بے شک ہم نے تمہیں زمین میں جماؤ (ٹھکانہ) دیا اور تمہارے لیے اس میں زندگی کے اسباب بنائے بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

اور قصہ ابلیس میں فرمایا:

وَلَا تَجِدُ اَکۡثَرَهُمۡ شٰکِرِیۡنَ (پ۸۔ الاعراف:۱۷)

اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا

اگر ان پر نعمت نہ ہوتی تو اس ارشاد گرامی کا کیا فائدہ ہوگا؟

۷۔ یہ بھی ارشاد ہے:

وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلاً فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (پ۹۔الاعراف:۸۶)

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اس نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھو فسادیوں کا کیسا انجام ہوا

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بیان ہوا:

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (پ۹۔الاعراف:۱۴۰)

کہا کیا اللہ کے سوا تمہارا اور کوئی خدا تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہیں زمانے بھر پر فضیلت دی

۸۔ ارشاد ربانی ہے

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

(پ۱۰،الانفال:۵۳)

یہ اس لیے کہ اللہ کسی قوم سے جو نعمت انہیں دی تھی بدلتا نہیں جب تک وہ خود نہ بدل جائیں اور بے شک اللہ سنتا جانتا ہے۔

اس مسئلہ میں یہ ارشاد، نص اور تصریح ہے۔

۹۔ باری تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (پ۱۱۔یونس:۵)

وہ ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا اور اس کیلئے منزلیں ٹھہرائیں کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جانو اللہ نے اسے نہ بنایا مگر حق نشانیاں مفصل بیان فرماتا ہے علم والوں کیلئے۔

۱۰۔ یہ بھی فرمایا:

وَاِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِيْ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ

اور جب کہ ہم آدمیوں کو رحمت کا مزہ دیتے ہیں کسی تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تھی۔ جبھی وہ ہماری آیات کے ساتھ داؤ لگاتے ہیں تم فرمادو اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلد ہو جاتی ہے بے شک ہمارے فرشتے تمہارے مکر لکھ رہے ہیں۔

۱۱۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوْا بِهَا جَاءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَظَنُّوْا أَنَّهُمْ أُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ فَلَمَّا أَنْجٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (پ-یونس:۲۱-۲۳)

وہی ہے کہ تمہیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہو اور وہ اچھی ہوا سے انہیں لے کر چلیں اور اس پر خوش ہوئے ان پر آندھی کا جھونکا آیا اور ہر طرف لہروں نے انہیں آ لیا اور سمجھ گئے کہ ہم گھر گئے اس وقت اللہ کو پکارتے ہیں نرے اس کے بندے ہو کر کہ اگر تو اس سے ہمیں بچالے گا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ جب انہیں بچالیتا ہے جبھی وہ زمین میں ناحق زیادتیاں کرنے لگتے ہیں

۱۲۔ ارشاد ربانی ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (پ۱۹-الفرقان:۴۷)

اور وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے پردہ کیا اور نیند کو آرام اور دن بنایا اٹھنے کیلئے

اور فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (پ۱۱-یونس:۶۷)

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا بنایا

۱۳۔فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ أَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ (پ۱۳-ابراہیم:۲۸،۲۹)

کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت ناشکری سے بدل دی اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر لا اتارا۔ وہ جو دوزخ ہے اس کے اندر جائیں گے اور کیا ہی بری ٹھہرنے کی جگہ۔

۱۴۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ (پ۱۳-ابراہیم:۳۲)

اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کو پیدا کئے اور تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا کہ اس کے حکم سے دریا میں چلے اور تمہارے لیے ندیاں مسخر کیں

۱۵۔ یہ بھی فرمان ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (پ۱۳-ابراہیم:۳۴)

اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک آدمی بڑا ظالم ناشکرا ہے

اختلاف لفظی ہے

یہ تمام آیات کفار پر نعمت کے اثبات پر شاہد ہیں۔

واضح رہنا چاہئے اس مسئلہ میں اختلاف لفظی ہے کیونکہ ان اشیاء مثلاً حیات، عقل، سمع، بصر، اقسام رزق اور منافع کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس بارے میں ہے جب ان منافع کے بعد ابدی نقصان مرتب ہوتا ہے تو کیا عرفاً اس پر نعمت کا اطلاق کیا جائے گا یا نہیں؟ اور یہ تو مسلمہ طور پر لفظی نزاع ہوا۔

وجودِ صانع پر استدلال

رہی وہ اشیاء جن سے مکلف لذت نہیں پاتا مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے صانع کے وجود اور اس کے لطف واحسان پر استدلال کے لیے پیدا کیا، اس پر یہ دلائل ہیں:

۱۔ سورۃ النحل میں ارشاد گرامی ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (پ۱۴، النحل:۲)

ملائکہ کو ایمان کی جان یعنی وحی لے کر اپنے جن بندوں پر چاہے اتارتا ہے

اس میں واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے رُسلان کرام کو بشارت دینے اور ڈرانے کے لیے اور اس کی وحدانیت اس کی توحید وعدل پر ایمان کی دعوت کیلئے مبعوث فرمایا۔ پھر ارشاد گرامی ہوا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ
اس نے آسمان اور زمین بجا بنائے۔ وہ ان کے شرک سے برتر ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (پ۱۴-النحل:۳-۴)
انسان کو اس نے نطفہ سے پیدا کیا تو وہ واضح دشمن بن جاتا ہے

یہاں بندے کا حادث ہونا اور اس کا کفر اختیار کرنا بیان ہوا اور وجود صانع پر سب سے بڑی دلیل لائی کہ بندہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منقلب ہوتا ہے مثلاً اس کا نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ یہاں تک کہ وہ اخس وگھٹیا حال (نطفہ سے) اشرف حال (خصیم مبین) تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد متعدد انعام کا تذکرہ فرمایا:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ وَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (پ۱۴-النحل:۵-۱۰)

اور چوپائے پیدا کئے ان میں تمہارے لیے گرم لباس اور منفعتیں ہیں اوران میں سے کھاتے ہو اور تمہارا ان میں تجمل ہے جب انہیں شام کو واپس لاتے ہو اور جب چرنے کو چھوڑتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں ایسے شہر کی طرف کہ اس تک نہ پہنچتے مگر ادھ مرے ہو کر۔ بیشک تمہارا رب نہایت مہربان رحم والا ہے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ ان پر سوار ہوں اور زینت کیلئے اور وہ پیدا کرے گا جس کی تمہیں خبر نہیں اور بیچ کی راہ ٹھیک اللہ تک ہے اور کوئی راہ ٹیڑھی ہے اور چاہتا تو تم سب کو راہ پر لاتا وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا اس سے تمہارا پینا ہے اور اس سے درخت ہیں جن سے چراتے ہو

یہاں دہریہ اور اصحاب طبائع کا رد فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا کہ پانی اور مٹی ایک مگر اس کے باوجود اشیاء رنگ، ذائقے اور خوشبو میں مختلف ہوتیں ہیں پھر ارشاد فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (پ۱۴-النحل:۱۲)

اور اس نے تمہارے لیے مسخر کئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے باندھے ہیں بیشک اسی میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کو

اس سے نجومیوں اور اصحاب فلکیات کا رد ہے کیونکہ ان کے حادث ہونے پر ان کی حرکات اور طریقہ واحد پر مسخر ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ ان آیات مبارکہ میں باری تعالیٰ نے ثابت کیا اس جہان میں جو کچھ پیدا ہے وہ تمام مکلفین کیلئے ہے کیونکہ جو کچھ مکلف کے علاوہ ہے اس سے مکلف لذت و آرام حاصل کر کے سرور و خوشی پاتا ہے یا اس سے کلفت اٹھاتا ہے یا اس سے اسے نصیحت حاصل ہوتی ہے مثلاً تکلیف دینے والی اشیاء مثلاً سانپ، بچھو، انہیں دیکھ کر آخرت کا عذاب یاد آتا ہے اور ان سے آدمی بچنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اور ان سے منعم اعظم پر استدلال کیا جاتا ہے تو ثابت ہو گیا مخلوقات میں سے کوئی شی بھی منافع سے خارج نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان آخری آیات میں ان اشیاء کے انعام عظیم ہونے پر توجہ دلائی۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (پ۱۴-النحل:۱۸) اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (پ۱۴-النحل:۱۱۲)

اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ایک بستی کہ امان و اطمینان سے تھی ہر طرف سے اس کی روزی کثرت سے آتی تو وہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگی تو اللہ نے اسے یہ سزا چکھائی کہ اُسے بھوک اور ڈر کا پہناوا پہنایا بدلہ ان کے کئے کا

اس پر تنبیہ ہے کہ نعمت انہیں ملی جس کا کفران تبدیلی کے سبب کا موجب بنا۔

۳۔ قصہ قارون پر فرمان مبارک ہے:

وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (پ۲۰-القصص:۷۷)

اور احسان کر جب اللہ نے تجھ پر احسان کیا اور زمین میں فساد نہ چاہ بے شک اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (پ۲۱-لقمان:۲۰)

کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور تمہیں بھرپور دیں اپنی نعمتیں ظاہر اور چھپی اور بعضے آدمی اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں یوں کہ نہ علم نہ عقل اور نہ کوئی روشن کتاب۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (پ۲۷-الواقعہ:۵۸) تو بھلا دیکھو تو وہ منی جو گراتے ہیں۔

پھر فرمایا:

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (پ۲۷-الرحمٰن:۱۶) تو اپنے رب کی کونسی نعمت جھٹلاؤ گے۔

یہ آیت تو تکرار کے ساتھ ہے اور سورۃ الرحمٰن میں جن کا بھی ذکر ہے وہ نعمت ہے خواہ وہ دینی ہے یا دینوی یہ تمام گفتگو مذکورہ مسئلہ پر تھی

تیسرا مسئلہ: بنی اسرائیل پر مخصوص انعامات

بعض عرفاء نے فرمایا: نعمتوں کے بندے کثیر مگر منعم (نعمت دینے والے) کے بندے قلیل ہیں تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا تذکرہ کیا جب معاملہ حضور ﷺ کی اُمت کا آیا تو انہیں منعم (نعمت دینے والے) کے ذکر کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ (پ۲-البقرہ:۱۵۲) تم میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا

جس سے واضح طور پر دیگر امتوں پر حضور ﷺ کی امت کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے۔

بنی اسرائیل پر انعامات

اللہ تعالیٰ کی بنی اسرائیل پر بڑی نعمتیں ہیں۔

۱۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے ظلم سے نجات عطا فرمائی اور ان کی غلامی اور عبودیت سے نکال کر زمین میں تمکن اور سلطنت عطا فرمائی، ارشاد ربانی ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ (پ۲۰-القصص:۵) اور ہم چاہتے تھے کہ ان کمزوروں پر احسان فرمائیں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کے ملک و مال کا انہیں کو وارث بنائیں

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء اور ملوک بنایا حالانکہ یہ قبطی قوم کے غلام تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ہلاک کر کے ان کی زمین، علاقوں اور اموال کا انہیں مالک بنا دیا، جیسا کہ فرمایا:

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنَاهَا بَنِيْۤ اِسْرَآئِيْلَ (پ۱۹-الشعراء:۵۹) ہم نے ایسا ہی کیا اور ان کا وارث کر دیا بنی اسرائیل کو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی عظیم کتب نازل فرمائی جو ان کے علاوہ کسی کو عطا نہ ہوئیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (پ۶-المائدہ:۲۰) اور جب موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے اے میری قوم اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو کہ تم میں سے پیغمبر کئے اور تمہیں بادشاہ کیا اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہاں میں کسی کو نہ دیا۔

۴۔ ہشام نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا، بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے کہ انہیں فرعون سے نجات دی، مقام تیہ میں بادل کا سایہ عطا کیا وہاں ہی ان پر منّ و سلویٰ نازل کیا۔ انہیں ایسا پتھر دیا (جو مرد کے سر کی طرح تھا) جتنا چاہتے اتنا پانی پاتے جب ضرورت نہ رہتی پانی رک جاتا۔ انہیں ایسا ستون عطا فرمایا جو رات کو ان کیلئے روشنی کرتا۔ ان کے سر پراگندہ نہ ہوتے اور نہ ان کے کپڑے پرانے ہوتے۔

نعمتوں کے تذکرہ کی وجوہات

اللہ تعالیٰ نے درج ذیل وجوہات کی بنا پر انہیں اپنی نعمتوں کو یاد دلایا:

۱۔ ان انعامات میں تورات، انجیل اور زبور بھی ہیں جو رسالتِ محمدی ﷺ کے حق ہونے کی تصدیق کرتی ہیں۔

۲۔ نعمتوں کی کثرت بڑی معصیت پر دال ہوتی ہیں۔ نعمتیں یاد دلائیں تاکہ حضور ﷺ اور قرآن کی دعوت کی مخالفت سے بچ جائیں

۳۔ کثیر نعمتوں کی یاد اظہار مخالفت پر حیا کا تقاضا کرتی ہیں

۴۔ کثرتِ نعمت بتا رہی ہے کہ منعم نے انہیں دوسروں سے خاص کیا ہے اور جو اس قدر نعمتوں کے لیے مخصوص ہوں ظاہر یہی ہے کہ ان سے وہ زائل نہیں ہوتیں کیونکہ محاورہ ہے ''احسان کا اتمام ابتدا کرنے سے بہتر ہوتا ہے'' گویا سابقہ نعمتوں کا تذکرہ آئندہ نعمتوں میں طمع کا سبب بن جاتا ہے اور یہی آرزو، اظہار مخالفت ومخاصمت سے مانع بنی رہتی ہے۔

یہ نعمتیں ان پر کیسے ہیں؟

اگر کوئی کہے یہ نعمتیں مخاطبین پر نہ نہیں بلکہ ان کے آباؤ اجداد پر تھیں تو انہیں ان کیلئے کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کے سبب ان کی معصیت کو عظیم کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب کئی طرح سے ہے۔

۱۔ اگر یہ نعمتیں ان کے آباء پر نہ ہوتیں تو یہ کہاں باقی رہتے، ان کی نسل کہاں ہوتی؟ تو آباء پر انعامات گویا انہی پر ہوئے۔

۲۔ آباء کی طرف نسبت ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دین اور دنیا کی وہ نعمتیں عطا کیں جو حق اولاد میں نعمت عظیمہ ہیں۔

۳۔ اولاد جب سنتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے آباء کو یہ نعمتیں دیں کیونکہ انہوں نے اپنے رب کی اطاعت کی اور کفر وانکار سے اعراض کیا تو بچے بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ اولاد فطرۃً افعال خیر میں والدین کے مشابہ ہوتی ہے لہٰذا یہ نعمتوں کا یاد دلانا نیکیوں میں رغبت اور برائیوں سے اعراض کی طرف دعوت ہے۔

''وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ'' کی تفسیر

عہد، معاہد اور معاھد دونوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اس عہد کے بارے میں دو اقوال ہیں۔

قول اول۔ اس سے مراد بغیر تخصیص تمام احکام و امور الٰہیہ ہیں۔ یہ روایات اس پر شاہد ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے تذکرہ کو ان کے لیے عہد بنایا ہے کہ جیسے عہد و میثاق کا پورا کرنا لازم ہوتا ہے اسی طرح اس کی نعمتوں کا شکر کرنا لازم ہے اور اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (میں اپنا وعدہ پورا کروں گا) سے ثواب و مغفرت مراد ہے۔ ثواب کے وعدہ کو عہد کے اس اشتراک کی وجہ سے مشابہ قرار دیا کہ دونوں میں کمی و مخالفت جائز نہیں۔

۲۔ امام حسن فرماتے ہیں وہ عہد مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے ان الفاظ میں لیا:

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (پ۶-المائدہ:۱۲)

اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار قائم کئے اور اللہ نے فرمایا بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں ضرور اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی تعظیم کرو اور اللہ کو قرض حسن دو بیشک میں تمہارے گناہ اتار دوں گا اور ضرور تمہیں باغوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں رواں پھر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے وہ ضرور سیدھی راہ سے بہکا

تو جس نے اللہ کے عہد میں وفا کی اللہ تعالیٰ اس کے لیے عہد میں وفا فرمائے گا۔

۳۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ سے مراد یہ ہے کہ تم مامور طاعات کو بجالاؤ اور ممنوع معاصی سے بچو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تم سے راضی ہو کر تمہیں جنت میں داخلہ عطا فرماؤں گا، یہی تفسیر امام ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ ان ارشادات میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (پ۱۱-التوبہ:۱۱۱)

بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لیے ہیں اس بدلے پر کہ ان کیلئے جنت، اللہ کی راہ میں لڑیں تو ماریں اور مریں اس کے ذمہ کرم پر سچا وعدہ توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ قول کا پورا کون؟ تو خوشیاں مناؤ اپنے سودے پر جو تم نے اس سے کیا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

دوسرا قول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور شانوں کے بارے میں عہد

یہاں وہ عہد مراد ہے جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور شانوں کے حوالے سے سابقہ کتب میں تھا جیسا کہ سورۃ المائدہ میں ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (پ۶، المائدہ:۱۲)

اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار قائم کئے اور اللہ نے فرمایا بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں ضرور اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی تعظیم کرو اور اللہ کو قرض حسن دو بیشک میں تمہارے گناہ اُتار دوں گا اور ضرور تمہیں باغوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں

سورۃ الاعراف میں ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ (پ ۹-الاعراف:۱۵۶،۱۵۷)

اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے تو عنقریب میں نعمتوں کو ان کیلئے لکھ دوں گا جو ڈرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توریت اور انجیل میں

رہا اللہ تعالیٰ کا عہد، وہ یہ تھا کہ ان کے بوجھ اور ان کے گلوں کے طوق ختم فرمادے گا۔ یہ بھی ارشاد الٰہی ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ (پ ۳-آل عمران:۸۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (پ ۲۸، القف:۶)

اور یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوں اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے۔

اتباع پر دُہرا اجر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اللہ تعالیٰ نے تورات میں بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ میں بنی اسماعیل میں نبی اُمی مبعوث فرماؤں گا جس نے ان کی اتباع کرتے ہوئے ان کے ساتھ آنے والے نور (قرآن) کی تصدیق کی میں اس کے گناہ معاف فرما کر اسے جنت میں داخل کروں گا اور دو اجر عطا کروں گا ایک حضرت موسیٰ اور دیگر بنی اسرائیل رسولوں کی اتباع پر اور حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کی اتباع پر دوسرا اجر عطا کروں گا اس کی تصدیق اس ارشاد عالی میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (پ ۲۰-القصص:۵۲)

جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں

شیخ علی بن عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق اس ارشاد مبارکہ میں ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ (پ۲۷-الحدید:۲۸)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ وہ اپنی رحمت کے دو حصے تمہیں عطا فرمائے گا

اس کی تصدیق اس روایت سے بھی ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ تین آدمیوں کو دو اجر ملیں گے۔ اہل کتاب میں سے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو اسے دو اجر عطا ہوں گے۔ دوسرا وہ آدمی جس نے اپنی لونڈی کو اچھی تربیت و تعلیم دی پھر اسے آزاد کر کے نکاح کروا دیا اس کے لیے دو اجر ہیں۔ تیسرا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اور اپنے مالک کی اطاعت کی تو اسے بھی دو اجر ملیں گے۔

دو سوالات

پہلا سوال: اگر معاملہ یوں ہی ہے جو تم نے بیان کیا تو پھر ان میں سے بعض نے انکار کیوں کیا؟

'س کا جواب دو طرح پر ہے

اول۔ یہ کہ علم صرف ان کے علماء کو کتب کی وجہ سے حاصل تھا اور وہ زیادہ نہ تھے، ممکن ہے ان سے کتمان ہوا ہو۔

ثانی۔ یہ کہ نص، خفی تھی نہ کہ جلی تو اس میں شکوک و شبہات کا امکان تھا۔

دوسرا سوال: جس ذات کی ان میں بشارت دی گئی تھی تو کیا ان کتب میں ان کی جائے بعثت، وقت بعثت اور دیگر اس سے متعلقہ اشیاء کا ذکر تفصیلی تھا یا ذکر نہیں تھا؟

اب اگر وہ نص جلی (پہلی صورت) تھی اور اہل علم تک تواتر سے کتب میں منقول تھی تو اس کے کتمان پر انہیں قدرت نہیں ہوگی اور اب اس کا سابقہ انبیاء کے دین کا حصہ ہونا بداہۃً لازم اور معلوم ہوگا اور اگر دوسری صورتحال ہے تو پھر یہ نص، نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر دال ہی نہیں کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کی بشارت دی گئی ہے وہ عنقریب آئیں گے اور یہی جمہور یہود کا قول ہے۔

نص خفی تھی نہ کہ جلی

اس کا جواب یہ ہے جن لوگوں نے ارشاد گرامی "وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ" کو توحید و نبوت پر دال دلائل میں غور و فکر پر محمول کیا جیسا کہ قول اول میں ہم نے بیان کیا۔ انہوں نے اس سوال کے قوی ہونے کی وجہ سے اسے اختیار کیا اور جو دوسرے قول کا معاون بننا چاہتا ہے وہ یوں جواب دے سکتا ہے کہ تعیین وقت و مکان اس طرح منصوص جلی نہ تھا کہ ہر کوئی اسے جان لیتا ہاں نص خفی تھی لہٰذا اس کا سابقہ دین انبیاء کا بداہۃً حصہ ہونا لازم نہیں آتا

فضل قدیر

سابقہ کتب انبیاء میں حضور ﷺ کا تذکرہ وشہادتیں

اب ہم سابقہ انبیاء ومرسلین کی کتب سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مذکور کچھ شہادتیں لا رہے ہیں۔

پہلی بشارت: تورات کے سفراول کی نویں فصل میں ہے۔ جب حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے حضرت سارہ ناراض ہوئیں انہوں نے اللہ کا فرشتہ دیکھا جس نے کہا ہاجرہ تمہارا کیا ارادہ ہے اور تم کہاں جاؤ گی؟ کہا میں اپنی سردار حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے بھاگی ہوں، فرشتے نے کہا اپنی آقا کے پاس واپس جاؤ اور ان کا احترام کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری کھیتی اور اولاد میں کثرت فرمائے گا۔ عنقریب ایک بچے سے تم حاملہ ہونگی جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام اسماعیل رکھنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا خشوع اور اس کی طرف متوجہ ہونا قبول فرمایا ہے اور وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارا ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب سے اوپر اور تمام کا ہاتھ خضوع کے ساتھ انہی کی طرف پھیلے گا اور تمام بھائیوں سے ان کا احترام زیادہ ہوگا۔

اس کلام سے استدلال یوں ہے۔

یہ کلام بطور بشارت ہے اور کوئی فرشتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جور وظلم یا ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہو اور یہ واضح ہے کہ حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد نے کل یعنی معظم واکثر دنیا اور معظم واکثر اُمم میں تصرف وحکمرانی نہیں کی اور وہ اسلام سے پہلے بطور غلبہ تمام سے مخلط ہی نہ تھے کیونکہ قبل الاسلام وہ دیہات تک ہی محدود تھے وہ اوائل عراق وشام میں بھی خوف کے ساتھ ہی داخل ہوا کرتے تھے، جب اسلام آیا تو اس کی برکت سے وہ شرق تا غرب غالب آئے، اُمم کے ساتھ ان کا رابطہ ہوا۔ مختلف شہروں تک ان کے پاؤں پہنچے، ان کے گھر کا لوگوں نے ارادہ کیا اور وہ مجاورت کعبہ کی وجہ سے ان کے دیہاتوں میں داخل ہوئے۔ اگر نبی اکرم ﷺ صادق نہ ہوتے تو ان کی لوگوں سے ملاقات اور لوگوں کی ان کے ساتھ ملاقات اللہ تعالیٰ کی معصیت اور اس کی اطاعت سے شیطان کی اطاعت کی طرف خروج ہوتا اور اللہ تعالیٰ ایسی بشارت عطا فرمانے سے بالاتر ہے۔

دوسری بشارت: سفر خامس کی گیارہویں فصل میں ہے۔ رب تعالیٰ معبود ہے وہ میری مثل تم سے اور تمہارے اخوان سے نبی کھڑا فرمائے گا اور اسی فصل میں ہے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے فرمایا میں تمہاری مثل ان کے اخوان میں سے نبی کھڑا کرنے والا ہوں جو آدمی میرے نام پر میرے عطا کردہ کلمات ان سے نہ سنے گا میں اس سے انتقام لوں گا۔

یہ کلام واضح کر رہا ہے جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے کھڑا فرمایا وہ بنی اسرائیل سے نہیں جیسا کہ کوئی بنو ہاشم کو کہے کہ تمہارے

بھائیوں میں سے عنقریب امام ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ ہو کہ وہ بنی ہاشم نہیں ہوگا پھر حضرت یعقوب علیہ السلام اسرائیل ہیں اور ان کا عیص کے سوا کوئی بھائی نہیں اور حضرت عیص کی حضرت ایوب علیہ السلام کے سوا کوئی اولاد نہیں اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہیں۔

تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی بشارت دی جائے حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق (والد حضرت یعقوب) کے بھائی ہیں پھر ہر نبی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے وہ اسرائیل کی اولاد سے ہے حالانکہ حضور علیہ السلام ان سے نہیں ہاں ان کے اخوان سے ہیں کیونکہ آپ اولاد اسماعیل سے ہیں جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے اخ (بھائی) ہیں اگر یہ سوال ہو کہ "من بینکم" (تمہارے درمیان سے) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں

ہم جواباً کہیں گے آپ ان کے درمیان ہی ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور حجاز میں ہوا۔ بعثت مکہ میں ہوئی اور ہجرت مدینہ کی طرف اور وہاں آپ کا معاملہ کامل ہو گیا۔ مدینہ کے اردگرد بلاد یہود تھے جیسے خیبر، بنو قینقاع اور نضیر وغیرہ۔

اور یہ بھی ہے کہ حجاز شام کے قریب ہے اور اس وقت جمہور یہود شام میں تھے جب حضور حجاز میں آئے تو ان کے درمیان ہی ہوئے۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے جب ان کے اخوان سے ہوئے تو ان کے درمیان ہی ہوئے۔

۳۔ اس سفر کی بیسویں فصل میں ہے، رب تعالیٰ طور سینا پر آیا اور ہم پر ساعیر سے طلوع ہوا اور جبال فاراں سے ظاہر ہوا اپنے دائیں طرف کو عنفوان قدسین دیا اور انہیں عزت سے نوازا اور انہیں شعوب کی محبت دی اور جمیع قدسین کے لیے برکت کی دعا کی

وجہ استدلال یوں ہے۔ جبل فاران حجاز میں ہے کیونکہ تورات میں ہے حضرت اسماعیل نے تیراندازی فاران کے جنگل میں سیکھی اور ان کا مکہ میں ہونا مسلم ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو 'انہیں عزت سے نوازا' سے مراد حضرت اسماعیل نہیں ہو سکتے کیونکہ انہیں وہاں سکنی کے بعد عزت نہیں ملی اور نہ ہی وہاں قدسین کا اجتماع ہوا۔

تو اسے ضروری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر محمول کیا جائے۔

یہود کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ جب آگ طور سینا سے ظاہر ہوگی تو ساعیر سے بھی ہوگی اور جبل فاران سے بھی تو وہ تمام مقامات پر متفرق ہوئی۔

ہم کہتے ہیں یہ صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اگر کسی جگہ آگ پیدا کی تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے اللہ آیا ہے۔

اس سے مراد نزول وحی یا نزول عذاب وغیرہ ہو سکتا ہے اور تمہارے ہاں ظہور آگ کے ساتھ طور سینا کے علاوہ وحی و کلام آتا ہی نہیں تو اب یوں کہا جائے گا کہ اس کا ظہور ساعیر اور فاران سے ہوا تو اب اس کا نزول نہیں ہوگا

جیسا کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ بادلوں سے آ گیا ہے جب ان میں آگ اور بجلی چمکتی ہے جیسا کہ موسم ربیع میں ہوتا ہے اور

پھر کتاب جقوق میں بھی ہماری بات کی تائید ملتی ہے کہ اللہ طور سینا اور جبل فاران کے قدس سے آیا۔ آسمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن سے منکشف ہوا، زمین ان کی تعریف کرنے والوں سے بھر گئی، ان کے جلوہ کی شعاع ایسے نور کی طرح ہے، اس کا شہر عزت کی بنا پر محفوظ ہو گا، منایا اس کے آگے چلیں گی، پھاڑنے والے پرندوں کے لشکر اس کے ساتھ ہوں گے، زمین پر چلیں گے، امتوں پر فکر اور ان کی تلاش کریں گے، ہوا کے پہاڑ ہل جائیں گے، رواجی اور وعدے آشکار ہو جائیں گے، رل مدین کے پردے متزلزل ہونگے، گھوڑوں پر سواری اور مدد واطاعت کی گردنوں پر بلند ہونگے۔

شیخ ابن رزین طبری نے یوں ہی نقل کیا ہے۔ رہے نصاریٰ شیخ ابوالحسین رحمۃ اللہ تعالیٰ کتاب الغرر میں کہتے ہیں میں نے ان کتب میں دیکھا، کہ وہ فاران کے پہاڑوں سے ظاہر ہوگا۔ محمد تعریف کئے گئے کے حسن سے آسمان کٹ جائے گا اور تیرے امر محمود سے تیر چلیں گے تو اپنی امت کے اخلاص اور مسیح کی کامیابی سے زمین پر غلبہ کرے گا۔

اس ہماری بات سے ظاہر ہو گیا تورات میں باری تعالیٰ کے ارشاد "ظھر الرب من جبال فاران" کا معنی ظہور نار نہیں بلکہ ایسی ذات کا ظہور ہے جو ان صفات سے متصف ہے اور وہ ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی نہیں۔

اگر وہ کہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی آمد مراد ہے اس لیے آخری کلمات میں "انقاذ مسیحك" ہے لیکن ہم کہیں گے اللہ تعالیٰ کی یہ صفات نہیں ہوسکتیں مثلاً وہ گھوڑوں پر سوار ہو یا اس کی نظر کی شعاع نور کی طرح ہو یا اس کے لیے مشاعر قدیمہ کا ثبوت ہو۔

رہے الفاظ "وانقاذ مسیحك" تو اس سے مراد یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے یہود و نصاریٰ کے کذب سے حضرت مسیح علیہ السلام کو نکالا

۴۔ کتاب اشعیاء کی بائیس فصل میں ہے۔ اٹھو چراغ جلاؤ (مراد مکہ ہے) تمہارا وقت قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرامت تجھ پر چمکے گی۔ زمین پر اندھیرے چھائے ہیں، امتوں پر ضباب کے سایئے ہیں اللہ نے تجھے نور کی روشنی دی، تجھ پر کرامت کا اظہار فرمایا، تیرے نور کی طرف امتیں چلیں گی، بادشاہ تیرے سورج کی روشنی پانے آئیں گے، اپنے ماحول کی طرف نگاہ اٹھا اور غور کر وہ تیرے ہاں جمع ہونگے، تیرا حج کریں گے، تیری اولاد دور شہروں سے تیرے پاس آئے گی کیونکہ تو تمام کا مرکز ہے۔ تمام شہروں کے لوگ اولاد مکہ کی طرح ہیں، تیرا لباس مزین اور سنورا ہوا ہے اور تو خوش ہے کیونکہ ذخائر بحر کا میلان تیری طرف ہے اور تمام لشکر تیری طرف حج کرنے آتے ہیں، کباش مدائن اور اہل سبا تیری طرف چلتے ہیں۔ وہ اللہ کی نعمتیں پا کر اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں، فاران کی بکریاں تیری طرف چلتی ہیں اور مذبح کی طرف میری رضا کے مطابق ہی انہیں لے جایا جاتا ہے، اس وقت میرے گھر کیلئے حمد یہ کلمات ہوں گے۔

وجہ استدلال اس طرح ہے، یہ تمام صفات مکہ کی ہیں کیونکہ تمام لشکر اس کا حج کرتے ہیں اور اس کی طرف ذخائر بحر کا میلان

ہے "احدث لبیت محمدتی حمدا" کا معنی یہ ہے قبل از اسلام عرب یہ تلبیہ کہا کرتے تھے:

لبیك لا شـريك لك الا شـريك هـو لك | میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک ہے تو اسکا مالک
تملكه وما ملك | ہے وہ مالک نہیں

اسلام آنے کے بعد تلبیہ یہ بنا "لبیك اللهم لبیك لا شریك لك لبیك" یہ وہ حمد یہ کلمات ہیں جو اس کے گھر کے طواف کے لئے تیار کئے گئے۔ اگر کوئی یہ کہے اس سے مراد بیت المقدس ہے اور بعد میں اسے یہ مقام ملے گا ہمارا جواب یہ ہے پھر حکیم فددنا وقتك (تمہارا وقت قریب ہے) نہ فرماتا۔ حالانکہ وہ قریب نہ ہو بلکہ جو قریب ہو وہ اس کی رضا نہ ہو۔

اور یہ بھی دلیل ہے کہ کتاب اشعیاء بادیہ کے ذکر اور اوصاف سے بھری پڑی ہے اور یہ ان کے قول کے بطلان پر شاہد ہے۔

۵۔ سمان نے تفسیر میں تورات کے سفر اول کے حوالے سے لکھا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی فرمائی میں نے اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا قبول کی اور اسے برکت دی۔ میں نے اسے بڑی عظمت دی اس کے ہاں بارہ عظیم افراد پیدا ہونگے اور میں نے اسے اُمت عظیمہ کیلئے بنایا ہے۔ اس سے استدلال یوں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جس کی امت سب سے بڑی ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہو کر ہمارے نبی کیلئے یہ دعا کی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (پ۱-البقرہ:۱۲۹)

اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انہیں خوب ستھرا فرما دے۔ بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا

دعاء ابراہیمی اور بشارت عیسیٰ علیہ السلام

اس لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا میں اپنے والد ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بشارت عیسیٰ ہوں اس کا ذکر قرآن میں یوں ہے:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (پ۲۸-الصف:۶)

اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے

احمد، حمد سے ہے اور حمد سے مشتق نام ہمارے نبی ہی کے ہیں محمد، احمد، محمود۔

بعض نے کہا تورات میں آپ کا تذکرہ یوں ہے۔ آپ کی جائے ولادت مکہ، جائے سکونت طیبہ، ملک شام اور امت حمد کرنے والی ہوگی

چھٹی بشارت: حضرت مسیح نے حواریین سے فرمایا میں جارہا ہوں تمہارے پاس حق کی روح فارقلیط آئے گا جو اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔ وہ وہی فرمائیں گے جو اسے کہا جائے گا یہ اس کی تصدیق ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ (پ۹-الانعام:۵۰) میں تو اسی کا تابع ہوں جو مجھے وحی آتی ہے

دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ (پ۱۱-یونس:۱۵) تم فرماؤ مجھے نہیں پہنچتا کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں میں تو اسی کا تابع ہوں جو میری طرف وحی آتی ہے میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے

فارقلیط کا معنی

اس کی دو تفاسیر ہیں:

۱۔ اس کا معنی۔ مقبول شفاعت کرنے والا اور یہ حضور علیہ السلام کی شان اقدس ہے۔

۲۔ بعض نصاریٰ نے کہا۔ اس کا معنی حق و باطل میں فرق کرنے والا، اصل میں یہ فاروق ہے جیسے کہ رونق دینے والے کو راووق کہا جاتا ہے۔

لیط، اس کا معنی کسی معاملہ کی تحقیق ہے جسے کہا جاتا ہے شیب اشیب ذو شیب اور یہ بھی ہماری شریعت کا وصف ہے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرتی ہے۔

ساتویں بشارت: حضرت دانیال۔ نے بخت نصر کو اس کی خواب بتائے بغیر فرمایا تو نے ہولناک منظر دیکھا ہے جس کا سر سونے کا، بازو چاندی کے پطن اور رانیں تانبے کی، پنڈلیاں لوہے کی اور بعض خذف کی ہیں تو نے پتھر دیکھا جو کاٹنے والے کے بغیر کٹ گیا ایک آدمی نے بت کو دے مارا۔ وہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اس کا لوہا، چاندی، سونا بکھر گیا اور گرد بن گیا جسے ہوا لے اڑی اس کا اثر باقی نہ رہا اور وہ پتھر بلند پہاڑ بن گیا جس سے زمین بھر گئی یہ تیرا خواب تھا اس کی تعبیر بھی سن لیجئے۔

جو سونے کا سر دیکھا اس سے تو مراد ہے تیرے بعد ایک مملکت ہو گی جو تجھ سے ادنیٰ ہو گی۔ تیسری مملکت جو تانبے کی مانند ہے تمام زمین پر پھیل جائے گی چوتھی مملکت قوت میں لوہے کی طرح ہو گی وہ آدمی جس کا بعض خذف ہے بعض مملکت عزیز اور

بعض ذلیل ہوگی، بادشاہ کا نظام متفرق ہوگا۔ آسمان کا الہ ان دنوں مملکت ابدیہ قائم فرمائے گا جس پر زوال وتغیر نہیں آئے گا، وہ ممالک کو زوال کا شکار کردے گی۔ اس کا بادشاہ تمام بادشاہوں کو ختم کردے گا اور زمانے تک قائم رہے گی۔ یہ پتھر کی تفسیر ہے جو پہاڑ سے بغیر کاٹے کٹا تھا حتیٰ کہ اس نے لوہے، تانبے اور خذف کو ختم کردیا اور اللہ ہی جانتا ہے جو آخر زمانہ میں ہوگا۔

یہ وہ بشارات ہیں جو ہمارے نبی ﷺ کے بارے میں سابقہ کتب میں وارد ہوئیں ہیں۔

اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ کی تفسیر

معتزلہ کہتے ہیں اس عہد سے وہ مراد ہے جس پر عقل دال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر مطیع کو ثواب دینا لازم ہے اور اس وصف وجوب کو عہد کہنا درست ہے کیونکہ اس کا پورا کرنا لازم ہوتا ہے بلکہ یہ اس عہد سے زیادہ مؤکد و پختہ ہوگا جو نذر و یمین کی وجہ سے لازم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پہ کچھ لازم نہیں

اہل سنت کہتے ہیں اللہ پر بندے کے حوالے سے کوئی شی لازم نہیں اور اس آیت میں بھی اس پر دلالت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے نعمتوں کا ذکر فرمایا پھر اس پر عہد کی وفا بیان فرمائی جو واضح کر رہا ہے کہ سابقہ نعمتیں عہد عبودیت کا سبب ہیں۔

جب بات یوں ہے تو اداء عبادات، سابقہ نعمتوں کے سبب لازم ہونے والے کی ادائیگی ہوگی اور ادا واجب ولازم دوسرے واجب کا سبب نہیں بنتا تو ثابت ہوگیا اداء تکالیف ثواب کی موجب نہیں لہٰذا معتزلہ کا قول باطل ہے۔

حق تفسیر دو طرح ہے

بلکہ حق تفسیر دو وجہ پر ہے۔

۱۔ جب اللہ تعالیٰ نے ثواب کا وعدہ فرمایا اور جس کا وہ وعدہ فرماتا ہے اس کا نہ پایا جانا محال ہے اگر وہ نہ پایا جائے تو خبر صادق کذب ہوجائے گی اور یہ اس پر محال ہے اور محال کی طرف پہنچانے والا بھی محال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا موجود ہونا لازم ہوگا اور یہ یمین اور نذر سے ثابت شدہ سے زیادہ مؤکد ہوگا۔

۲۔ عہد سے مراد امر ہے اور عبد مامور ہوسکتا ہے البتہ اللہ تعالیٰ مامور نہیں بن سکتا ہاں بطور مشاکلت الفاظ اس کا اجراء واستعمال ہوجاتا ہے جیسے فرمایا:

يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پ۶۔النساء:۱۴۲) وہ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا چاہتے ہیں اور وہی انہیں غافل کرکے مارے گا

پھر فرمایا:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ (پ۳،آل عمران:۵۴) اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی

وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ کی تفسیر

رھبۃ، کا معنی خوف ہے۔اہل کلام وعقائد کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کا مطلب اس کے عتاب سے خوف ہوتا ہے، مکلف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دوطرح خائف ہوسکتا ہے۔

۱۔ مع العلم۔ (یقینی صورت میں)

۲۔ مع الظن۔ (ظنی صورت میں)

جب اس بات کا یقین ہو کہ اس نے تمام مامور بجالائے اور ممنوعات سے بچا تو اس کا خوف مستقبل کے حوالے سے ہوگا اس مفہوم کے اعتبار سے ہم ملائکہ اور انبیاء کے بارے میں خوف وڈر کی بات کرتے ہیں۔ارشاد ربانی ہے:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (پ۱۴۔النحل:۵۰) اپنے اُوپر اپنے رب کا خوف کرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم ہو

اگر ظن ہو یعنی اسے تمام مامور بجالانے اور تمام ممنوعات سے بچنے کا یقین نہ ہو تو اب وہ اہل ثواب نہ ہونے پر خوف رکھے گا اور واضح رہے دنیا میں جو جس قدر خوف والا ہوگا روز قیامت اسی قدر ہی بے خوف ہوگا اور بالعکس بھی

منقول ہے روز قیامت منادی آواز دے گا مجھے میری عزت اور جلال کی قسم میں بندے پر دوخوف جمع نہیں فرماتا اور نہ دو امن، جسے میں نے دنیا میں بے خوفی دی میں اسے روز قیامت خوف دلاؤں گا اور جسے میں نے دنیا میں خوف دیا اسے روز قیامت بے خوفی دوں گا۔

عرفاء کا قول

اہل معرفت فرماتے ہیں خوف دوطرح پر ہے خوف عتاب اور خوب جلال۔اول اہل ظاہر کا جبکہ دوسرا اہل قلب کا حصہ ہے۔اول زائل ہوجاتا ہے جبکہ دوسرا زائل نہیں ہوتا۔

آیت کریمہ یہ بھی واضح کررہی ہے کہ نعمتوں کی کثرت، معصیت کو بڑا بنادیتی ہے اور عہد کی مخالفت عظیم برائی کا ارتکاب ہے۔

اور اس پر بھی دلالت ہے کہ یہ رسول جس طرح عرب کی طرف مبعوث ہیں اسی طرح بنی اسرائیل کی طرف بھی ان کی بعثت ہے ارشادگرامی "وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ" واضح کررہا ہے کہ لازم ہے بندے کو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے جس طرح خوف میں یہ لازم ہے اسی طرح اُمید اور آرزو میں بھی اسی کی طرف توجہ لازم ہے۔

یہ تمام بتا رہا ہے کہ تمام اللہ کی قضا اور تقدیر سے ہے اگر بندہ اپنے فعل میں مستقل ہوتا تو لازم تھا کہ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرح ہی ڈرا جائے اور اب وہ حصر و پابندی بھی ختم ہو جاتا جو "اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ" میں ہے بلکہ پھر تو اپنے نفس سے ہی ڈرنا لازم ہو جائے گا کیونکہ ثواب و عتاب کی چابیاں اس کے ہاتھ میں ہونگی نہ کہ اللہ کے قبضہ میں لہٰذا پھر بندے پر صرف اپنی ذات سے ڈرنا لازم ہو جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ہرگز نہیں ڈرے گا۔

اس حکم میں اس کی نشاندہی بھی ہے کہ انسان خوف و رجا سامنے رکھتے ہوئے اطاعات بجالائے اور یہ بات ان کی صحت کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔

[۴۱] وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

(اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو)

مخاطب بنی اسرائیل ہیں

وَ آمِنُوْا کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں۔ اس پر یہ دو دلیلیں ہیں:

۱۔ اس کا عطف "اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ" پر ہے گویا کہا جا رہا ہے میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں اور میرا عہد پورا کرو اور میرے نازل کردہ کلام پر ایمان لاؤ۔

۲۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے الفاظ بھی اسی پر دال ہیں۔

بِمَآ اَنْزَلْتُ کی تفسیر

بِمَآ اَنْزَلْتُ، کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ اقویٰ یہی ہے کہ مراد قرآن ہے اس پر یہ دو دلائل ہیں:

نضل قدیر

۱۔ منزل وصف بیان ہوا اور وہ قرآن کا ہے ارشادِ ربانی ہے:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (پ۳-آل عمران:۳) اس نے تم پر یہ سچی کتاب اتاری اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور اس نے اس سے پہلے توریت اور انجیل اتاری۔

۲۔ سابقہ کتب کی تصدیق کرنے والا بھی قرآن ہی ہے۔ حضرت قتادہ سے منقول ہے "اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ" سے مراد وہ کتاب اور رسول ہے جس کا ذکر تم تورات اور انجیل میں پاتے تھے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کی دو تفاسیر

پہلی تفسیر: قرآن میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حق ہیں، تورات اور انجیل حق، تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تو قرآن پر ایمان، تورات اور انجیل پر ایمان کی تائید بھی کر رہا ہے گویا کہا جا رہا ہے اگر تم تورات اور انجیل پر ایمان میں کمال و مبالغہ چاہتے ہو تو قرآن پر ایمان لے آؤ کیونکہ اس پر ایمان، تورات و انجیل پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری تفسیر: تورات و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں بشارات موجود ہیں گویا حضور اور قرآن پر ایمان تورات و انجیل کی تصدیق ہے۔ حضور اور قرآن کی تکذیب ان دونوں کتب کی تکذیب ہوگی۔

یہ دوسری تفسیر اولیٰ ہے کیونکہ پہلی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کو لازم نہیں بناتی کیونکہ تورات اور انجیل کے حق ہونے کی خبر دینا آپ کی نبوت پر ایمان کو لازم نہیں کرتا البتہ دوسری تفسیر آپ پر ایمان بھی لازم بناتی ہے کیونکہ تورات و انجیل جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جب صادق ہونے پر مشتمل ہیں تو ان دونوں پر ایمان یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضور کی ذات اقدس بہر صورت صادق ہے اور یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گفتگو اس لیے فرمائی ہے تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم ایمان کے حوالہ سے ان مخالفین پر حجت ہو لہٰذا دوسری تفسیر کا اولیٰ ہونا ثابت ہو گیا اور یہ تفسیر آپ کی نبوت پر دو طرح دال ہے۔

۱۔ حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتب کی شہادت حق ہی ہوتی ہے۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کتب کے بارے میں خبر دی اور آپ کو یہ معرفت وحی کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوئی۔

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ کی تفسیر

اس کا معنی یہ ہے کہ اول شخص کفر کرنے والا یا اول فریق یا اول لشکر یا تم میں سے کوئی بھی اولاً کفر کرنے والا نہ ہو، یہاں دو سوالات ہیں

پہلا سوال: ان کو اول کفر کرنے والا کیسے کہا حالانکہ ان سے پہلے مشرکین عرب نے کفر کیا۔

اس جواب میں چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: یہ ان پر تعریض وطعن ہے کہ ان کو چاہئے یہ تھا کہ وہ اولاً آپ کی ذات اقدس پر ایمان لانے والے بن جاتے کیونکہ انہیں آپ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل تھی، اور یہ لوگ حضور ﷺ کے زمانہ کی دوسروں کو خبر دیتے، کفار کے خلاف آپ کی ذات کو وسیلہ بناتے لیکن جب آپ کی بعثت ہوئی تو ان کا معاملہ برعکس ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (پ۱-البقرہ:۸۹) تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے

دوسری وجہ: یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ اولیں انکار کرنے والوں کی نسل نہ بنو یعنی اہل مکہ کے مشرکوں کی طرح نہ ہو جاؤ جب تم تورات وانجیل کے ذریعے آپ کو جانتے ہو تو نہ جاننے والوں کی طرح نہ ہو جاؤ وہ تو مشرک ہیں اور وہ کسی کتاب کو نہیں جانتے۔

تیسری وجہ: اہل کتاب میں سے اول انکار کرنے والے نہ بنو کیونکہ یہ بنی اسرائیل میں سے قرآن کا انکار کرنے والے پہلے ہی تھے اگرچہ قریش نے ان سے پہلے کفر اختیار کیا تھا۔

چوتھی وجہ: یہ ان کے علماء سے فرمان ہے کہ تم اپنے لوگوں میں اپنی کتاب کے اول تکذیب کرنے والے نہ بنو کیونکہ حضور ﷺ کی تکذیب تمہاری کتاب ہی کی تکذیب ہے۔

پانچویں وجہ: اس سے مراد اُن کے کفر کی شدت وتغلیظ کا بیان ہے کیونکہ جب انہوں نے آپ ﷺ کے صدق پر معجزات کا مشاہدہ کیا اور پہلے تورات وانجیل میں بشارات بھی پڑھیں تو اب ان کا کفر نہ جاننے والے سے کہیں اشد ہوگا۔

اور کفر کی طرف پہل کرنے والا بعد والے سے اعظم گناہ کا مرتکب ہوگا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے جس نے کوئی برائی ایجاد کی اس پر اس کا بوجھ بھی ہوگا اور اس پر عمل کرنے والے کا بوجھ بھی۔

جب ان کا کفر عظیم تھا اور جو پہلے کفر کرے اس کا بھی کفر عظیم ہوتا ہے تو دونوں اس فعل میں مشترک ٹھہرے تو بطور استعارہ ایک کے اسم کا اطلاق دوسرے پر ہو سکتا ہے۔

چھٹی وجہ: معرفت رکھنے کے باوجود اول کفر والے نہ بنو اور قریش کا کفر تو معرفت کے ساتھ نہیں بلکہ وہاں جہالت تھی

ساتویں وجہ: یہود میں سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو، جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں قریظہ اور نضیر تھے۔ انہوں نے آپ کا انکار کیا پھر باقی یہود نے ان کی پیروی میں کفر کیا تو گویا یہ فرمایا اہل کتاب میں سے تم پہلے انکار کرنے والے ہو۔ یہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے۔

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ (پ-البقرہ:۴۷) اور یہ کہ اس سارے زمانے پر تمہیں بڑائی دی

یعنی تمہارے معاصر لوگوں پر تمہیں فضیلت دی ہے۔

آٹھویں وجہ: آپ ﷺ کا ذکر سنتے ہی انکار نہ کرو بلکہ اس میں تحقیق سے کام لیتے ہوئے اپنی عقول کو استعمال میں لاؤ۔

نویں وجہ: لفظ اول بطور صلہ ہے اور معنیٰ ہوگا قرآن کے ساتھ کفر کرنے والے نہ بنو لیکن یہ ضعیف قول ہے۔

دوسرا سوال: اگر وہ کفر میں پہل نہ کریں تو پھر ان کے لیے کفر جائز ہونا چاہیے؟ اس کے متعدد جواب ہیں۔

پہلا جواب: کسی شیٔ کے ذکر میں یہ دلالت نہیں ہوتی کہ اس کے ماسوا میں اس کے خلاف حکم ہوگا۔

دوسرا جواب: ارشاد باری تعالیٰ وَآمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَکُمْ نشاندہی فرما رہا ہے کہ کفر اولاً اور آخراً ممنوع ہے۔

تیسرا جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (پ۱۳-الرعد:۲) اس نے آسمانوں کو بلند کیا بے ستون کے کہ تم دیکھو

کی دلالت اس پر نہیں کہ ستون ہیں مگر انہیں دکھائی نہیں دیتے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ:

وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِیَاءَ بِغَیْرِ حَقٍّ (پ-النساء:۱۵۵) اور وہ انبیاء کو ناحق شہید کرتے

کی دلالت اس پر نہیں کہ حق پر انبیاء کا شہید کرنا جائز ہے۔ اس آیت مبارکہ کے بعد والی آیت میں ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (پ-البقرہ:۴۱) اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو

تو اس کی دلالت اس پر نہیں کہ تم ثمن کثیر لیکر انہیں بیچ سکتے ہو، اس طرح کا معاملہ مذکورہ آیت میں ہے بلکہ اس سے مقصود ان کے کفر وعناد کو برا قرار دینا ہے کہ یہ ان سے سرزد ہو رہا ہے جو اپنی کتب میں حضور سرور عالم ﷺ کی نعت وصفت سے آگاہ تھے۔

چوتھا جواب: شیخ مبرد کہتے ہیں یہ ان لوگوں سے خطاب ہے جنہیں دوسروں سے پہلے مخاطب کیا گیا تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم حضور ﷺ کے ساتھ کفر نہ کرو کیونکہ تمہارے بعد بھی کفر کرنے والے ہیں تو تم اولاً انکار کرنے والے نہ بنو کیونکہ یہ اولیت

مزید گناہ کی موجب ہے یہ اس لئے کہ جب انہوں نے کفر میں پہل کی تو اب دوسرے لوگ ان کی اقتدا کریں گے یا نہیں اگر وہ ان کی اقتدا کرتے ہیں تو ان پر اپنے کفر اور بعد میں تا قیامت کفر کا بوجھ تمام ان پر آئے گا اور اگر وہ ان کی اقتدا نہیں کرتے تو ان میں دو امور جمع ہو گئے۔

۱۔ کفر میں پہل

۲۔ کفر میں انفرادیت

اور یہ بات نہایت ہی عیب ونقص ہے تو ''وَلَا تَكُونُوْا أَوَّلَ كَافِرٍ'' میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کی تفسیر

ہم نے پہلے ارشاد باری تعالیٰ:

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے لیا

(پ ۱- البقرۃ:۱۶)

کے تحت لکھا۔ لفظ اشترا، استبدال کی جگہ آتا ہے جیسے کہ ثمن کو شی کے بدل وعوض کی جگہ لایا جاتا ہے۔ جب دنیاوی کسی شی کو اللہ کے ثواب پر ترجیح دی جائے تو فاعل کے ہاں وہ ثمن ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے سرداران یہود مثلاً کعب بن اشرف، حیی بن اخطب وغیرہ غریب یہود سے ہدایا لیتے اور یہ سمجھتے اگر ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر لی تو یہ ہدایا بند ہو جائیں گے لہٰذا انہوں نے اس حقیر رقم کی وجہ سے کفر پر اصرار کیا اور یہ حقیر اس لیے ہے کہ تمام دنیا، دین کی نسبت بہت ہی قلیل ہے۔ دنیا کی نسبت دین کی طرف، متناہی کی غیر متناہی کے ساتھ ہے، پھر یہ ہدایا دنیاوی اعتبار سے بھی بہت کم تھے تو جو نہایت قلیل سے بھی نہایت قلیل ہو اس کی کثیر غیر متناہی سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟

واضح رہے یہ ممانعت صحیح ہے خواہ ان میں ایسا بدعملی والا تھا یا نہیں۔ بلکہ اگر ثابت ہو جائے کہ ان میں ایسے علماء تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کو مخفی رکھنے اور تورات میں اس بارے میں تحریف پر رشوت لیتے تھے تو کلام اور واضح ہو جائے گا۔

ارشاد ربانی وَإِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ کا مفہوم وَإِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کے قریب ہی ہے فرق یہ ہے کہ رھبت، خوف ہے اور اتقاء گویا اللہ تعالیٰ انہیں ڈرنے کا حکم فرما رہا ہے۔ اسی لیے کہ جواز عتاب قائم ہے پھر انہیں تقویٰ کا حکم دیا کیونکہ تعین عتاب قائم ہے۔

[۴۲] وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۲﴾

(اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدۂ دانستہ حق نہ چھپاؤ)

آیت کا ربط

ارشاد گرامی "وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ" ترک کفر و گمراہی کا حکم تھا اور ارشاد مبارک وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ میں ترک دھوکہ اور گمراہ کرنے سے منع فرمایا۔

دوسرے کو گمراہ کرنے کے دو طریق ہیں کیونکہ غیر دلائل حق جانتا ہو گا تو اس کی گمراہی ان دلائل کے بارے میں اسے مشوش و پریشان کر دینا ہے اور اگر وہ نہیں جانتا تو اس سے دلائل مخفی رکھنا تاکہ اسے معلوم نہ ہو سکیں اسے گمراہ کرنے کا طریقہ ہے۔

ارشاد مبارک 'وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ' قسم اول کی اشارہ ہے اور وہ دلائل میں تشویش پیدا کرنا ہے اور ارشاد گرامی 'وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ' میں دوسری قسم کی طرف اشارہ ہے اور وہ اسے دلائل تک نہ پہنچنے دینا ہے۔

بِالْبَاطِلِ' میں اظہر یہی ہے کہ با استعانت کی ہے جیسے کتبت بالقلم مفہوم یہ ہوگا حق کو ان شبہات کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو جو تم سامعین پر وارد کرتے ہو اور یہ اس لیے کہ تم پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے تورات و انجیل میں جو کچھ وارد ہے وہ نصوص خفیہ ہونے کی وجہ سے استدلال کی محتاج ہیں پھر یہ ان میں مجادلہ و جھگڑا بھی کرتے اور شبہات کے ذریعے ان میں فکر و تامل کرنے والوں کو مشوش کر دیتے ہیں یہی ارشاد گرام "وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ" سے مراد ہے اور ان الفاظ مبارکہ میں یہی مذکور ہے۔

وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (پ ۲۴- غافر: ۵) اور باطل کے ساتھ جھگڑے کہ اس سے حق کو ٹال دیں

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر

ارشاد مبارک "وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" سے مراد یہ ہے کہ تم اس بات سے آگاہ ہو کہ مخلوق کو گمراہ کرنے پر کس قدر ضرر عظیم روز قیامت تم پر عائد ہو گا یہ اس لیے کہ یہ تلبیس روز قیامت تک مخلوق کو قبول حق سے پھیر دے گی اور اس بات کی داعی و سبب ہو گی کہ روز قیامت تک وہ باطل پر قائم رہیں اور اس کے نقصان عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہ خطاب اگرچہ اہل کتاب کے بارے میں ہے لیکن باقی مخلوق کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ ایسی بد عملی سے بچنے کی کوشش میں رہے۔ اب یہ خطاب اگرچہ صورۃً خاص تھا لیکن معناً عام ٹھہرا۔

دوفوائد

یہاں دوفوائد ہیں:

پہلا فائدہ: الفاظ ''وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ''، حکم نہی کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے بمعنی، ولا تکتموا ، یا ''اِنْ'' کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

دوسرا فائدہ: قید علم کیوں؟

یہاں تلبیس وکتمان کا علم کے ساتھ مقید ہونا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اگر علم نہ ہوتو یہ جائز ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جب آدمی کسی شئی کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو اسے یہ بھی علم نہ ہوگا کہ یہ دونوں حق ہیں یا باطل اور جس شئی کے حق یا باطل ہونے کے بارے میں آدمی نہ جانتا ہو اس کی نفی یا اثبات کا فیصلہ اس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہوگا بلکہ اس پر توقف (خاموشی) لازم ہے۔ یہاں مقید کرنے کا سبب یہ ہے کہ علم کے باوجود نقصان دہ فعل پر اقدام اس صورت سے زیادہ بدتر اور فحش ہوگا جب آدمی کو اس کے نقصان دہ ہونے کا علم ہی نہ ہو۔ جب انہیں تلبیس کے مفاسد کا علم تھا تو ان کا اس پر اقدام قبیح تر ہوگا۔ آیت مبارکہ یہ بھی واضح کر رہی ہے جو آدمی حق بات جانتا ہو۔ اس کا اظہار اس پر لازم اور اس کا مخفی کرنا حرام ہوگا۔ واللہ اعلم

[۴۳] وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

(اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والے کے ساتھ رکوع کرو)

آیت کا تعلق وربط

اللہ تعالیٰ نے جب پہلے ایمان کا حکم فرمایا پھر حق کو باطل کے ساتھ ملانے اور دلائل نبوت کو چھپانے سے منع فرمایا اس کے بعد ان پر لازم احکام ارشاد فرمائے اور ان شرائع میں سے جو مقدم اور اصل کی طرح ہیں ان کا ذکر فرمایا عبادات بدنی میں سب سے بڑی عبادت نماز اور عبادات مالی میں سے زکوٰۃ ہے۔ یہاں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: تاخیر بیانِ اجمال میں جواز

جو لوگ خطاب کے موقعہ پر بیان مجمل میں تاخیر جائز نہیں سمجھتے ان کا قول یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز کے ارکان وشرائط سے آگاہ فرمادیا تھا تو اس کے بعد فرمان ہوا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ گویا یہ فرمایا وہ نماز ادا کرو جو تم جان چکے ہو۔

جو بیان مجمل میں تاخیر جائز رکھتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے یہ جائز ہے انہیں نماز کا حکم ہو حالانکہ وہ اسے نہ جانتے ہو اور مقصود یہ ہو سامع اپنے نفس کو اس مامور وحکم کو بجالانے کیلئے تیار کرے اگر چہ وہ مامور کے بارے میں نہ جانتا ہو کہ وہ کیا ہے؟ جیسے سردار اپنے غلام سے کہے میں کل تجھے کسی شی کے بارے میں حکم دوں گا جسے تو نے بجالانا ہے اور اس کی غرض یہ ہو تا کہ غلام اس کی ادائیگی کے لیے وقت ثانی میں تیار ہو۔اس حکم کے حسن وخوبی میں کوئی نزاع نہیں۔

دوسرا مسئلہ،لفظ صلاۃ کا مفہوم

معتزلہ کہتے ہیں صلوۃ اسماء شرعیہ سے ہے کیونکہ یہ شریعت میں نیا حکم تھا تو یہ ممکن نہیں کہ قبل از شرع اس کے لیے لفظ کی وضع ہو۔پھر وجہ شبہ میں اختلاف ہے بعض نے کہا لغت میں دعا کے لیے ہے۔اعشی نے کہا:

علیك مثل الذی صلیت فاعتصمی عینا فان لجنب المرء مضطجعا

ایک اور شاعر نے کہا:

وقابلها الریح فی دنها و صلی علی دنها وارتسم

بعض نے کہا لغت میں بمعنی لزوم ہے۔شاعر نے کہا:

لم أکن من جناتها علم اللّٰہ و انی بحرها الیوم صالی

دیگر کا کہنا یہ ہے کہ یہ مصلی سے ہے وہ گھوڑا جس کی دوسرے اتباع کریں۔

اقرب یہ ہے کہ یہ دعا سے ماخوذ ہے کیونکہ کوئی نماز ایسی نہیں جس میں دعا یا اس کا قائم مقام نہ ہو البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ نماز ہو مگر اس میں غیر کی متابعت نہ ہو۔جب وجہ شبہ تمام صورتوں میں پائی جاتی ہو تو اسے لینا اولیٰ ہوتا ہے اس سے جو صرف بعض صورتوں میں پائی جارہی ہو۔اہل سنت کہتے ہیں اسم جزء کا اطلاق کل پر لغت کے مجازات معروفہ میں سے ہے۔جب صلوۃ شرعیہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے تو اس پر دعا کا اطلاق بطور مجاز ہی ہوگا۔اگر معتزلہ کی مراد اسم شرعی سے یہی ہے تو حق اور اگر مراد یہ ہے کہ شرع نے ابتداء ہی اسے مسمیٰ (نماز) کے لیے وضع کیا تو یہ باطل ہے ورنہ یہ لفظ عربی نہ ہوتا اور یہ اس ارشاد گرامی کے منافی ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا (پ۱۲-یوسف:۲) بیشک ہم نے اسے عربی قرآن اتارا کہ تم سمجھو

لفظ زکوۃ کا مفہوم

زکوۃ کا لغوی معنی بڑھنا جیسے فصل بڑی ہو جائے تو کہا جاتا ہے زکا الزرع

دوسرا مفہوم اس کا تطہیر و پاک کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً (پ۱۵-الکہف:۷۴) کیا تم نے ایک ستھری جان قتل کر دی

یعنی نفس طاہرہ۔دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (پ۳۰،الاعلیٰ:۱۴) فلاح پا گیا جس نے پاکیزگی حاصل کر لی

اور یہ بھی فرمان ہے:

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا (پ۱۸-النور:۲۱) اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں کوئی بھی کبھی ستھرا نہ ہو سکتا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (پ۲۲-الفاطر:۱۸) اور جو ستھرا ہوا تو اپنے ہی بھلے کو ستھرا ہوا۔

یعنی نفس کو اطاعت الٰہی سے پاک کر لیا۔

وجوہاتِ مشابہت

بیس دینار میں سے نصف دینار کی ادائیگی کو زکوٰۃ انہی دو وجھوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ اتنی مقدار نکالنے سے باقی میں اضافہ بطور برکت ہو جاتا ہے وہ یوں کہ اس عطیہ کی ادائیگی کے سبب اللہ تعالیٰ اس مال سے بلا کو اٹھا لیتا ہے تو معنوی طور پر یہ عطا کرنا اضافہ ہے اگرچہ بظاہر نقصان ہے اس لیے آپ ﷺ کا فرمان ہے تم پر صدقہ لازم ہے کیونکہ اس میں چھ خصائل ہیں تین دنیاوی اور تین اُخروی، دنیاوی رزق میں اضافہ، مال میں کثرت اور ملک کی تعمیر و آبادی۔آخروی ستر، سایہ اور دوزخ سے آڑ۔

دوسری وجہ کی بنا پر بھی زکوٰۃ کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (پ۱۱-التوبہ:۱۰۳) اے محبوب ان کے مال سے زکوٰۃ حاصل کرو جس سے تم انہیں ستھرا اور پاکیزہ کر دو

تیسرا مسئلہ: ارشاد مبارک 'وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ' یہود سے خطاب ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ کفار فروع شرع کے بھی مخاطب ہیں۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی تفسیر

درج ذیل فوائد ہیں:

۱۔ یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا اللہ تعالیٰ نے خصوصاً رکوع کا ذکر فرما کر انہیں اس پر ابھارا کہ وہ مسلمانوں والی نماز ادا کریں۔

۲۔ یہ مراد بھی ہے کہ با جماعت نماز ادا کرو، اس مفہوم کی صورت میں آیت میں تکرار ختم ہو جائے گا پہلے ارشاد میں اقامت نماز جبکہ دوسرے میں با جماعت ادائیگی کا حکم ہے۔

۳۔ امر رکوع سے مراد خضوع ہے لغت میں رکوع وخضوع ایک ہی ہیں تو اب تکبر مذموم سے ممانعت اور عاجزی وتذلل کا حکم ہو گا۔ جیسا کہ اہل ایمان سے فرمایا:

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (پ۶-المائدہ:۵۴)

تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ اللہ کے پیارے اور اللہ ان کا پیارا مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت

اور اپنے رسول ﷺ کی تربیت کرتے ہوئے فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ۱۹-الشعراء:۲۱۵)

اور اپنی رحمت کا بازو بچھاؤ اپنے پیرو مسلمانوں کیلئے

اور آپ ﷺ کی مدح میں فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (پ۴-آل عمران:۱۵۹)

تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے

اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (پ۶-المائدہ:۵۵)

تمہارے دوست نہیں مگر اللہ اور اس کا رسول ﷺ اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں

گویا اللہ تعالیٰ نے جب نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا تو اس کے بعد اتباع، خضوع اور ترک سرکشی کا فرمایا۔

شیخ اصم رحمۃ اللہ علیہ نے بعض سے نقل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ادائیگی زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا کہ وہ اسے ادا نہ کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پ۶-المائدہ:۶۲) اور حرام خوری پر دوڑتے ہیں، بے شک بہت ہی بُرے کام کرتے ہیں

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (پ۶-النساء:۱۶۱) اور اس لیے کہ وہ سود لیتے حالانکہ وہ اس سے منع کئے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے اور ان میں جو کافر ہوئے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر ان پر جو فریضہ تھا اس کا اظہار فرمایا تاکہ انہیں اس بات کا خوف پیدا ہو کہ کہیں ہمارے باقی مخفی امور و معاصی کو سامنے لا کر ذلیل نہ کر دیا جائے تو یہ ان غیبی اخبار میں شامل ہو گی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک اہم دلیل ہیں۔

[۴۴] اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

(کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں)

اتأمرون۔ میں ہمزہ متنبہ کرنے کے ساتھ تقریر و پختگی اور ان کی حالت پر تعجب کیلئے ہے۔ البر، تمام اعمال خیر کیلئے جامع لفظ ہے مثلاً بر الوالدین (ان کی فرمانبرداری) عمل مبرور (جس پر اللہ راضی ہو) بعض اوقات بمعنی صدق جیسے کہا جاتا ہے بر فی یمینہ (اس نے قسم سچی کر دکھائی اور توڑی نہیں) 'صدقت و بررت' اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (پ۲-البقرہ:۱۸۹) ہاں بھلائی تو پرہیز گاری ہے

یہاں بتا دیا برّ تقویٰ کے لیے جامع ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر ہونے والی نعمتوں کی بنا پر انہیں ایمان اور اچھے اعمال کا حکم دیا تو ایک اور بنا پر انہیں ان کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے وہ یوں کہ لوگوں کو نیکی پر ابھارنا اور خود غفلت برتنا عقلاً نہایت ہی قبیح ہے کیونکہ لوگوں سے یہ بات کہنے کا مقصد نصیحت ہو گی یا شفقت، یہ عقل مندی نہیں کہ انسان غیر پر شفقت یا اس کی خیر خواہی کرے مگر اپنے نفس کو کچھ نہ کہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس عمل سے بچانے کے لیے ان الفاظ سے انہیں تنبیہ کی۔

بِرّ سے کیا مراد ہے؟

اس مقام پر "بِر" کے یہ معانی ہو سکتے ہیں۔

۱۔ امام سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہود لوگوں کو اللہ کی اطاعت کا حکم اور اس کی نافرمانی سے منع کرتے لیکن خود اطاعت ترک کر کے، معصیت و نافرمانی اختیار کرتے۔

۲۔ امام ابن جریج کہتے ہیں وہ لوگوں کو نماز وزکوٰۃ کا حکم دیتے مگر خود اس کے تارک تھے۔

۳۔ جب کوئی خفیہ طور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتا تو وہ کہتے یہ قول میں سچے ہیں ان کا معاملہ حق ہے لہٰذا ان کی اتباع کرلو لیکن خود آپ کی اتباع نہ کرتے تاکہ کہیں ماننے والوں کے ہدایا سے محروم نہ ہو جائیں

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جماعت یہود مشرکین عرب کو کہتی عنقریب رسول کا اظہار ہوگا اور وہ حق کی دعوت دیں گے انہیں آپ کی اتباع کا شوق دلاتے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرما دیا تو انہوں نے حسد کی بنا پر آپ سے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اس سبب سے کی کہ وہ قبل از ظہور اتباع کا کہتے جب ظہور ہو گیا تو اتباع ترک کر کے آپ سے اعراض کرلیا۔ شیخ ابو مسلم کا مختار یہی ہے۔

۵۔ امام زجاج کا کہنا ہے یہ لوگوں کو صدقہ کا حکم دیتے اور خود بخل کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی سختی، ربا اور حرام کا کھانا بیان کیا ہے۔

۶۔ ممکن ہے یہود منافقین ظاہراً آپ کی اتباع کا درس دیتے ہوں مگر ان کے دل آپ کے منکر ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس پر انہیں زجر و توبیخ فرمائی۔

۷۔ یہود دوسروں کو تورات کی اتباع کا کہتے مگر خود اس کی مخالفت کرتے کیونکہ اس میں وہ ایسی چیزیں پاتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر دال تھیں مگر ان پر ایمان نہ لاتے۔

"وَتَنسَوْنَ اَنفُسَكُمْ" کی تفسیر

نسیان ایسا سہو ہوتا ہے جو حصول علم کے بعد ہو، بھولنے والا مکلف نہیں رہتا جو مکلّف نہ ہو اس سے صادر عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذمت چہ معنی دارد؟ تو ان مبارک الفاظ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے نفوس کے حق میں غافل ہو اور انہیں نافع اعمال سے دور رکھتے ہو۔

ارشادگرامی " وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ " کا معنی یہ ہے کہ تم تورات پڑھتے پڑھاتے ہو اس میں افعال خیر کا حکم اور افعال بد سے ممانعت سے تم آگاہ ہو۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، یہ ان کے افعال پر تعجب ہے اس کی نظیر یہ ارشاد باری ہے:

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (پ۱۷-الانبیاء:۶۷) تُف ہے تم پر اور ان بُتوں پر جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں ہے

فوائد تعجب

سبب تعجب کے فوائد درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقصود دوسرے کی حصول مصلحت کی طرف رہنمائی اور نقصان وفساد میں گرنے سے اسے خوف دلانا ہے۔ اپنے نفس پر احسان دوسروں پر احسان سے اولیٰ ہوتا ہے اور یہ چیز عقل ونقل سے ثابت ہے جو دوسرے کو نصیحت کرے مگر خود نصیحت حاصل نہ کرے وہ متضاد فعل کا مرتکب ہو رہا ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی۔ اس لیے فرمایا: اَفَلَا تَعْقِلُوْن (کیا تمہیں عقل نہیں)

دوسرا فائدہ: بے عمل واعظ کے غلط اثرات

جو لوگوں کو وعظ کرے اور مخلوق پہ علم کا اظہار کرے لیکن خود نصیحت قبول نہ کرے ایسا وعظ لوگوں کی معصیت کی طرف رغبت کا سبب بن جاتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں علم کے باوجود اس کا مرتکب ہونا بتا رہا ہے کہ ان خوف دلانے والی اشیاء کی کوئی اصل نہیں ورنہ یہ خود معصیت کا ارتکاب نہ کرتا تو ایسا آدمی لوگوں کو دین میں سستی اور معصیت پر جرأت دلانے کا کام کرتا ہے چونکہ واعظ کی غرض معصیت پر زجر تھی جب خود اس نے ایسا عمل کیا جو معصیت پہ جرأت تھی تو گویا یہاں دو متضاد چیزیں جمع ہو گئیں اور یہ عقلاء کے ہاں پسند نہیں۔ اس لیے فرمایا: اَفَلَا تَعْقِلُوْن (کیا تمہیں عقل نہیں)

تیسرا فائدہ: جو آدمی وعظ کرتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کا نفوذ واثر ہو لیکن معصیت پر اقدام ان میں سے ہے جس سے دل قبولیت کے بجائے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ واعظ کی کوشش ہوتی ہے وعظ کا اثر دلوں پر ہو اور جو عصیان ونافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے اس کی غرض یہ ہوگی کہ اس کا وعظ دلوں پر اثر نہ کرے تو یہی متناقض اشیاء کا اجتماع ہے۔ جو عقلاء کی شان کے لائق نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہم قول

اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے دو آدمیوں نے میری کمر توڑ دی، وہ عالم جو دوسروں پر طعن کرے، وہ جاہل جو اپنے آپ کو بھول جائے۔

یہاں چند مسائل ابھی باقی ہیں:

پہلا مسئلہ: بے عمل کے لیے وعظ کا حکم

بعض کی رائے یہ ہے کہ عاصی، نیکی کا حکم اور برائی سے منع نہیں کر سکتا، اس آیت مبارکہ اور دیگر عقلی دلائل سے وہ استدلال کرتے ہیں۔ آیت مبارکہ "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" (کیا تم لوگوں کو نیکی کا کہتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو) یوں دلیل بناتے ہیں کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے بطور مذمت بیان فرمایا ہے اور دوسرے مقام پر یہ بھی ارشاد گرامی ہے:

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — کیوں کہتے ہو وہ جو نہیں کرتے کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو (پ۲۸-الصف:۲،۳)

عقلی استدلال یہ کہ اگر ایسا کرنا جائز ہوتا تو زانی کیلئے وقت زنا عورت کے چہرہ ننگا کرنے پر اعتراض جائز ہوتا حالانکہ اس کا ناپسند ہونا ثابت و مسلمہ ہے۔

دو اُمور کا حکم

جواب، مکلف کو دو اُمور کا حکم ہے ۱۔ ترکِ معصیت ۲۔ دوسرے کو معصیت سے منع کرنا۔

ایک میں کمی دوسرے میں کمی کا تقاضا نہیں کرتی، رہا ارشاد گرامی " اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ " تو اس میں دونوں کا جمع کرنا منع ہے اور دو چیزوں کے اجتماع سے ممانعت دو صورتوں پر محمول ہو سکتی ہے۔

- نہی سے مراد ہر حال میں نسیانِ نفس سے ممانعت ہے۔
- یا نہی سے یہ مراد ہو کہ حالت نسیان نفس میں لوگوں کو نیکی کا شوق دلانے کی ممانعت ہو۔

ارے نزدیک آیت مبارکہ سے اول معنی مراد ہے نہ کہ ثانی اس صورت میں مخالف کا قول ساقط ہو جائے گا، رہی عقل دلیل تو وہ انہیں لازم آئے گی نہ کہ ہمیں

دوسرا مسئلہ: فعل بندے کی تخلیق نہیں

معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا۔ فعلِ عبد، اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں وہ یوں کہ ارشاد ہے "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ" "یہ تبھی درست ہے جب فعل ان کا اپنا ہو اور اگر بطور اضطرار ان کے اندر یہ مخلوق و پیدا ہو تو پھر یہ درست نہ ہوگا کیونکہ کسی اسود (کالے) سے یہ نہیں کہا جا سکتا تو سفید کیوں نہیں؟ کیونکہ اس میں سواد کی تخلیق ہے۔

جواب، بندے کی قدرت میں ضدین کی صلاحیت ہے اگر ان میں سے کوئی ایک بلا مرجح حاصل ہو جاتی ہے تو محض اتفاق ہوگا اور امر اتفاقی پر زجر و توبیخ جائز نہیں اور اگر راجح کا حصول ہوتا ہے تو مرجح اگر بندے کی طرف سے ہے تو اس میں بحث لوٹ آئے گی اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوا ہے تو وہ طرف راجح اور دوسری مرجوح ہوگی اور مرجوح کا وقوع ممتنع ہوتا ہے کیونکہ جب حالت استوا کے وقت وہ ممتنع الوقوع تھی تو حالت مرجوحیت میں بطریق اولیٰ ممتنع ہوگی جب نقیضین میں سے ایک ممتنع ہے تو دوسری واجب ہوگی تو اب وہی اعتراض جو تم نے ہم پر کیا وہ تم پر بھی وارد ہو جائے گا اور حقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شان عالی ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ
اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا۔
(پ۱۷-الانبیاء:۲۳)

تیسرا مسئلہ: احادیث مبارکہ اور بے عمل واعظ

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے منہ قینچی سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا بھائی جبریل علیہ السلام یہ کون ہیں؟ عرض کیا یہ دنیا دار خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے مگر اپنے آپ کو بھول جاتے
(مسند احمد،۳:۱۲۰)

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ میں ایک آدمی ہوگا جس کی بدبو سے اہل دوزخ پریشان ہونگے، عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون ہوگا؟ فرمایا ایسا عالم جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہ کیا
(حلیۃ الاولیاء،۳:۵۹)

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے اس آدمی کی مثال جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے مگر خود عمل نہیں کرتا اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کو روشنی دے رہا ہے مگر خود اپنے آپ کو جلا رہا ہے۔

۴۔ امام شعبی سے ہے اہلِ جنت میں سے کچھ لوگ اہلِ نار پر مطلع ہو کر پوچھیں گے تم دوزخ میں کیوں گئے حالانکہ ہم تمہاری تعلیم

کی بنا پر جنت میں داخل ہوئے وہ جواباً کہیں گے ہم تحیر کا حکم دیتے تھے مگر خود نہیں کرتے تھے جیسے محاورہ ہے جس نے محض قول سے وعظ کیا اس نے کلام ضائع کیا اور جس نے عمل و کردار سے وعظ کیا اس کا تیر نشانے پر لگا۔ شاعر نے خوب کہا:

يا أيها الرجل المعلم غيره　　هلا لنفسك كان ذا التعليم

تصف الدواء لذى السقام وذى الضنا　　كيما يصح به وأنت سقيم

ابدأ بنفسك فانهها عن غيها　　فاذا انتهت عنه فأنت حكيم

فهناك يقبل ان وعظت ويقتدى　　بالرأى منك وينفع التعليم

(اے خیر کی تعلیم دینے والے پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے تو بیماروں کو دوا دیتا ہے مگر تو خود بیمار ہے، اپنے نفس سے ابتدا کرو جب تو اسے گمراہی سے نکال لے گا تو حکیم بن جائے گا۔ اب تیری بات مقبول ہوگی اگر تو وعظ کرے گا، تیری رائے کی اقتدا کی جائے گی اور تعلیم سے نفع ہوگا)

اللہ کی طرف دعوت دی

یہ بھی کہا جاتا ہے ایک شخص کا کردار ہزار آدمی کیلئے زیادہ موثر ہے اس ہزار آدمی کے قول سے جو ایک آدمی کے لیے ہو۔ البتہ جس نے وعظ کیا اور خود بھی عمل کیا اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ہی عظیم ہے۔

منقول ہے امام یزید بن ہارون فوت ہوئے اور وہ واعظ و زاہد تھے۔ خواب میں ملے پوچھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ فرمایا۔ مجھے اس نے معاف فرما دیا، منکر نکیر نے جب پہلا سوال کیا تیرا رب کون ہے؟ تو میں نے کہا، تمہیں اس بوڑھے سے یہ پوچھتے ہوئے حیا نہیں آتا جس نے اتنے سال لوگوں کو اللہ کی طرف ہی دعوت دی۔

شیخ شبلی کا قول

شیخ شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ سے نزع کے وقت کہا گیا: پڑھو۔ لا اله الا الله۔ فرمایا:

ان بيتاً أنت ساكنه　　غير محتاج إلى السرج

(جس گھر میں تو سکونت پذیر ہو وہ چراغوں کا محتاج نہیں ہوتا)

[۴۵] وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

(اور صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگران پر (نہیں) جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں)

آیت مبارکہ اور فوائد

آیت مبارکہ سے فوائد یہ ہیں:

پہلا فائدہ، مخاطب کون ہیں؟

اس ارشاد ربانی سے مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا رسول پر ایمان لانے والے مخاطب ہیں کیونکہ جو نماز کا اصلاً منکر ہے اور دین محمدی ﷺ پر اسے استقامت نہیں اسے صبر وصلوۃ سے مدد لینے کی تلقین کا کوئی مفہوم نہیں لہٰذا اس خطاب کو انہی کی طرف متوجہ سمجھا جائے جو حضور ﷺ کی تصدیق کرنے والے ہیں اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اولاً بنی اسرائیل کو خطاب ہو اور اس کے بعد حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کیا جائے لیکن اقرب یہ ہے کہ بنی اسرائیل ہی مخاطب ہوں کیونکہ کسی دوسرے کو مخاطب بنانے سے نظم میں خلل وجدائی پیدا ہو جاتی ہے۔

سوال: پھر انہیں صبر و نماز کا حکم کیسے؟ حالانکہ وہ اس کے منکر ہیں؟

جواب: ہم نہیں مانتے کہ وہ ان چیزوں کے منکر ہیں کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے یہاں صبر لازم ہے وہاں صبر ہی حسن ہے اور نماز خالق کے سامنے تواضع کا اظہار ہے اور ذکر اللہ میں مشغولیت دنیا کی کئی مشقتوں اور آفات سے بچالیتی ہے۔ اختلاف تو کیفیت میں ہے۔ نمازِ یہود کی کیفیت اور ہے اور اہل ایمان کی نماز دوسری کیفیت پر مشتمل ہے اور حکم تو اس ماھیت سے متعلق ہے جو ان کے درمیان مشترک ہے لہٰذا سوال ختم ہو جائے گا۔

اس گفتگو کی بنا پر ہم کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں جب ایمان کا حکم دیا، لوگوں کو گمراہ کرنے کو ترک کرنے کا فرمایا اور اچھے اعمال مثلاً نماز وزکوٰۃ ان پر لازم کی حالانکہ ان پر یہ شاق تھا کیونکہ اس میں ریاست کا چھوڑنا اور مال وجاہ سے اعراض تھا تو ضروری تھا اللہ تعالیٰ اس مرض کا علاج تجویز فرمائے۔ اس لیے فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ مدد حاصل کرو صبر ونماز سے

دوسرا فائدہ: صبر وصلوٰۃ کے بارے میں درج ذیل آراہیں:

۱۔ گویا کہا گیا دنیاوی محبوب اشیاء کے ترک اور دین محمدی ﷺ کے قبول (جسے تمہاری طبائع بوجھ محسوس کررہی ہیں) میں صبر سے مدد لو یعنی نفس کو لذات سے روک دو کیونکہ جب اپنے نفس کو اس کا مکلف بنالو گے تو انہیں بوجھ محسوس نہ ہوگا اور جب اس کے ساتھ نماز ملالو گے تو معاملہ کامل ہو جائے گا کیونکہ نماز میں مشغولیت، اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کے جلال وقہر اور اس کی رحمت وفضل کے ذکر میں مشغول ہونا ہے تو جب آدمی اس کی رحمت کا تذکرہ کرے گا تو اس کی اطاعت کی طرف آئے گا اور جب اس کے عتاب کا ذکر کرے گا تو معصیت سے رک جائے گا تو ایسے شخص پر اطاعت کا بجالانا اور ترک معصیت آسان ہو جائے گا۔

۲۔ یہاں صبر سے مراد روزہ ہے کیونکہ روزہ دار، کھانے اور پینے سے رکنے والا ہوتا ہے۔ جس نے نفس کو خواہش وفرج سے روک لیا اس سے حُبّ دنیا کی کدورات زائل ہوگئیں جب اس کے ساتھ نماز متصل ہوگی تو دل انوار معرفت الٰہی سے پُرنور ہو جائے گا۔ صوم کو صلوۃ سے مقدم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ صوم کی تاثیر غیر مناسب اشیاء کا ازالہ ہے اور نماز کی تاثیر مناسب اشیاء کا حصول ہے اور نفی اثبات پر مقدم ہوتی ہے۔

دوسرا یہ بھی ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے صوم، دوزخ سے ڈھال ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ — بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بری بات سے

(پ۲۱-العنکبوت:۴۵)

کیونکہ نماز دنیاوی مشغولیت سے رکاوٹ بنتی ہے اور دل میں خشوع پیدا کرتی ہے۔ اس کے سبب قرآن کی تلاوت، اس میں وعدہ، وعید، مواعظ اور آداب جمیلہ سے بھی آگاہی ہوتی ہے، مخلوق کے دار ثواب یا دار عتاب کی طرف لوٹ جانے کا ذکر آخرت کا شوق اور دنیا سے نفرت دلاتا ہے تو اس وقت انسان پہ ترک ریاست اور مخلوق سے منقطع ہو کر قبلہ خدمت خالق کی طرف متوجہ ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ — اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

(پ۲-البقرہ:۱۵۳)

وَاِنَّهَا کی تفسیر

اس ضمیر میں مختلف آراء ہیں:

۱۔ یہ نماز کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی نماز خاشعین کے علاوہ پر بھاری ہے۔

۲۔ یہ اس استعانت کی طرف راجع ہے جس پر ''وَاسْتَعِيْنُوْا'' کی دلالت ہے۔

۳۔ یہ ان تمام امور کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور ان سے روکا یعنی ''اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ'' سے لے کر ''وَاسْتَعِيْنُوْا'' تک اور عرب کبھی اختصاراً ضمیر لے آتے ہیں یا جب انہیں علم ہو کہ مخاطب جانتا ہے تو اشارہ پر اکتفا کر لیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں ''ما علیها افضل من فلان'' (یعنی تمام زمین پر فلاں سے کوئی افضل نہیں) یا کہتے ہیں ''ما بین لا بیتها اکرم من فلاں'' (یعنی شہر مدینہ میں فلاں سے کوئی افضل نہیں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (پ۱۴-سورۃ النحل:۶۱) اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر گرفت کرتا تو زمین پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑتا

اور یہاں بھی زمین کا ذکر نہیں۔ (کیونکہ مخاطب جانتا ہے)

لَكَبِيْرَةٌ کی تفسیر

ان پر شاق اور ثقیل ہے لیکن خاشعین پر آسان تو اب یہ ضروری ہے کہ ان کا ثواب زیادہ اور خاشعین کا کم ہو حالانکہ یہ بات ہی غلط ہے۔ اس کا جواب یہ ہے یہاں یہ مراد نہیں کہ انہیں ادائیگی نماز میں خاشعین سے زیادہ مشقت کرنا پڑتی ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ خشوع والا نماز میں اعضاء، دل، سمع اور بصر تمام کو بروئے کار لاتے ہوئے ذکر، تذلل، خشوع اور تدبر سے کام لیتا ہے۔ جب وعید کا تذکرہ کرتا ہے تو اسے حسرت اور غم لاحق ہوتا ہے۔ جب وعدہ پڑھتا ہے تو اس کی مثل تصور اجاگر ہوتا ہے جب خاشع کا عمل یہ ہے تو عمل صلاۃ میں اس پر ثقل بھی زیادہ ہوگا تو یہاں مراد یہ ہے کہ نماز غیر خاشع پر ثقیل اس اعتبار سے ہے کہ اس کے بجالانے پر ثواب اور ترک پر عتاب نہیں مانتا لہٰذا اس پر یہ نہایت ہی دشوار عمل ہے

حاصل یہ ہے جب ملحد اس فعل میں نفع مانتا ہی نہیں تو اس پر بجالانا ثقیل ہوگا کیونکہ لایعنی کام میں مصروفیت طبیعت پر بڑھتے بوجھ کے کچھ سوا نہیں۔ رہا موحد تو وہ اسے ترک ہی نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس عمل میں سب سے زیادہ عظیم نفع اور اس کے ترک میں سب سے زیادہ ضرر مانتا ہے تو اس پر اب یہ بوجھ نہ ہوگا کیونکہ اس کے بجالانے میں ثواب، عظیم کامیابی، نعیم عظیم حاصل کرنا ہے اور عذاب دردناک سے خلاصی پانا ہے کیا تم نے یہ ارشاد گرامی نہیں پڑھا۔

اَلَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وہ اپنے رب سے ملاقات مانتے ہیں

یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب پانے اور اس کے عتاب سے خلاصی کی توقع رکھتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے۔ مریض سے کہا جائے یہ کڑوی شی کھالے اب اگر وہ مانتا ہے کہ اس میں شفا ہے تو اس پر کھانا آسان اور اگر وہ نہیں مانتا تو اس پر معاملہ سخت مشکل ہو جائے گا۔ اسی پر آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی محمول ہے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

آپ نے نماز کا یہ وصف مذکور وجوہات کی بنا پر فرمایا نہ یہ کہ آپ پر ثقیل نہ تھی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ آپ ﷺ نماز ادا فرماتے حتیٰ کہ پاؤں مبارک سوجھ جاتے۔ خشوع سے مراد خضوع اور تذلل ہے۔

[۴۶] اَلَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

(جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا ہے)

لفظِ ظن کے بارے میں تحقیق

مفسرین کے یہاں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: ظن بمعنی یقین

یہاں ظن بمعنی یقین و علم ہے کیونکہ وہ ظن جس کی نقیض جائز ہو ایسے ظن والا تو روز قیامت کے بارے میں یقین رکھنے والا نہیں ہوگا اور یہ تو کفر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس ظن پر مدح فرمائی ہے اور مدح کفر ہرگز جائز نہیں لہٰذا یہاں ظن سے لازماً یقین ہی مراد ہے، اس مجاز کا سبب یہ ہے کہ یقین اور ظن دونوں اعتقاد راجح ہونے میں مشترک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یقین ایسا راجح ہوتا ہے جس کی نقیض جائز نہیں ہوتی اور ظن راجح ہے مگر نقیض سے مانع نہیں جب دونوں میں اشتراک ہو تو اس وجہ سے ہر ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اوس بن حجر نے کہا:

فارسلته مستيقن الظن انه مخالط ما بين الشر اسيف خائف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا

(پ۲۹-الحاقہ: ۲۰)

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ (پ۳۰-المطففین:۴) کیا ان لوگوں کو یقین نہیں کہ انہیں اٹھنا ہے

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مخالفین کا رد فرمایا اور کہا انہیں دوبارہ زندہ ہونے کا ظن رکھنا چاہئے تو یہ ایسے اعتقاد پر نہیں ہوسکتا جس کی نقیض جائز ہو لہٰذا یہاں ظن بمعنی علم و یقین ہے۔

دوسرا قول: لفظ ظن کو ظاہر پر محمول رکھتے ہوئے ظن حقیقی ہی مراد لیا جائے تو پھر یہ اسباب ہوں گے۔

پہلی وجہ: ملاقات رب کو موت سے مجاز بنایا جائے کیونکہ یہ ملاقات موت کا سبب ہے تو یہاں سبب بول کر مسبب مراد لیا ہے اور یہ مشہور مجاز ہے کیونکہ مرنے والے کو کہا جاتا ہے: انہ لقی ربہ (اس کی رب سے ملاقات ہوگی) جب یہ واضح ہوگیا اب مفہوم یہ ہوگا یہ ثقیل ہے مگر ان خاشعین پر جو ہر لمحہ موت کا ظن رکھتے ہیں، اس لیے کہ جو ہر لحظہ موت کی توقع رکھنے والے ہوں گے ان کے دل خشوع الٰہی سے خالی نہ ہوں گے لہٰذا وہ توبہ میں جلدی کرنے والے ہوں گے کیونکہ خوفِ موت، توبہ کی طرف دعوت دینے والی اشیاء میں سے نہایت ہی قوی چیز ہے اور پھر جب خشوع ہوگا تو ہر حال میں تقصیر و کوتاہی کے سرزد ہونے کا خطرہ لاحق رہے گا تو اب اس کی تلافی لازم ہوگی تو آدمی کا مذکورہ حال ہو تو یہ اسے توبہ کی طرف جلدی متوجہ کرلے گا۔

دوسری وجہ: ملاقات رب سے مراد ملاقات ثواب، رب ہے اور اس کا ظن ہے نہ کہ یقین کیونکہ عابد زاہد ثواب الٰہی ملنے کا یقین نہیں کرسکتا البتہ اس کا ظن رکھ سکتا ہے ہاں یہ ان اشیاء میں سے ہے جو انسان کو کمال خشوع کی دعوت دیتا ہے۔

تیسری وجہ: معنی یہ ہے کہ وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان کی ملاقات اپنے رب سے گناہوں کے ساتھ ہوگی کیونکہ خاشع آدمی بعض اوقات اپنے نفس اور اعمال کے بارے میں بدظن ہوتا ہے اور اس کے ظن پر اس بات کا غلبہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے رب کو گناہوں کے ساتھ ملے گا تو یہ چیز اسے توبہ کی طرف فی الفور متوجہ کردیتی ہے تو اب یہ صفات مدح میں سے ہوگا۔

لیکن ابھی دو مسائل باقی ہے۔

پہلا مسئلہ: جوازِ دیدار الٰہی پر استدلال

بعض نے "مُّلٰقُوۡا رَبِّھِمۡ" سے دیدار الٰہی کے جواز پر استدلال کیا ہے لیکن معتزلہ کہتے ہیں لفظ لقاء (ملاقات) میں دیدار پر دلالت نہیں اور اس پر آیات مبارکہ، احادیث اور عرف شاہد ہیں۔

۱۔ منافق کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ (پ۱۰-التوبہ:۷۷) تو اس کے پیچھے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا اس دن تک کہ اس سے ملیں گے

اور منافق رب کا دیدار نہیں کر سکتا۔ اس لیے دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا (پ۱۹-الفرقان:۶۸) اور جو یہ کام کرے گا وہ سزا پائے گا

یہ چیز بطور تہدید یوں فرمائی:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (پ۲، البقرہ:۲۲۳) اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تمہیں اللہ سے ملنا ہے

یہ کافر و مومن دونوں کو شامل ہے حالانکہ رؤیت و دیدار کافر کے لیے ثابت ہی نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ لقاء سے مراد رؤیت نہیں

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس نے دوسرے مسلمان کا مال غصب کرنے پر حلف اٹھایا۔

لَقِیَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَیْهِ غَضْبَانُ (البخاری، ۲۴۱۷) وہ رب سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا

یہاں مراد دیدار الٰہی نہیں کیونکہ یہ تو اہل دوزخ کا عمل ہے۔

عرف میں بھی یہی ہے۔ مرنے والے کے لیے اہل اسلام کہتے ہیں لَقِیَ اللّٰہ (اس کی اللہ سے ملاقات ہوگی) لیکن مراد دیدار الٰہی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے لقاء سے مراد ایسا قرب بھی ہوتا ہے جو بلا حجاب ہو مثلاً جب امیر اور غلام کے درمیان حجاب ہو تو وہ کہے گا میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی اگرچہ اس نے اسے دیکھا ہوتا ہے اور اگر اسے دخول کی اجازت ہو جائے تو وہ کہے گا میں اس سے ملا ہوں اگرچہ نابینا ہی کیوں نہ ہو، کہا جاتا ہے لقی فلان جھدا شدیدا، لا قنی فلان حمامہ، ان تمام مقامات پر لقاء کا معنی دیدار و رؤیت نہیں۔ اس پر یہ ارشاد ربانی بھی شاہد ہے:

فَالْتَقَی الْمَآءُ عَلٰٓی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (پ۲۷-القمر:۱۲) تو دونوں پانی مل گئے اس مقدار پر جو مقدر تھی

اور یہ جسم میں درست ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں درست نہیں۔ اہل علم کہتے ہیں اصلاً لغت میں لقاء کا مفہوم ایک جسم کا دوسرے کے ساتھ اس طرح ملنا ہے کہ اس سے مس کرے "لقی ھذا ذاك" اس وقت کہا جاتا ہے۔ جب کوئی شی دوسری کو مس کرے اور اس سے متصل ہو۔

تو جب دو مدرک اجناس کے درمیان ملاقات، حصول ادراک کا سبب ہو اور وہاں لفظ کو مس کرنے پر محمول کرنا ممتنع ہو تو اب اسے ادراک پر ہی محمول کرنا لازم ہو جاتا ہے کیونکہ اقویٰ اقسام مجاز میں سبب بول کر مسبب مراد لینا بھی ہے۔

تو یہ ثابت ہو گیا اکثر اس باب میں لفظ لقاء سے ادراک ہی مراد لینا لازم ہے۔ ہاں کسی دلیل کی بنا پر بعض صورتوں میں یہ معنی ترک کیا جا سکتا ہے لیکن باقی تمام صورتوں میں ادراک ہی معنی لیا جائے گا، اس گفتگو کی بنا پر تمام سوالات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

ان کا جواب

ارشاد گرامی:

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ (پ۱۰-التوبہ:۷۷)

تو اس کے پیچھے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا اس دن تک کہ اس سے ملیں گے

اور منافق کو دیدار نہیں ہو سکتا۔

ہم جواباً کہیں گے یہاں اس مجبوری کی وجہ سے "إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ" سے مراد اس کا حساب و فیصلہ ہے مگر عبارت مقدر ماننا خلاف اصل ہے اور ایسا مجبوری کے موقعہ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ہمیں مجبوراً عبارت مقدر ماننا پڑی۔ ارشاد گرامی "أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ" یہاں الفاظ سے ظاہری معنی کے علاوہ لینے کی کوئی مجبوری نہیں اور نہ ہی اضافی عبارت کی تو یہاں لقاء کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہے نہ کہ اس کے فیصلہ و حکم سے، اس کے بعد اگر وہ جواز رؤیت کے خلاف عقلی دلائل لائیں تو ہم ان کا ضعف واضح کر چکے لہٰذا اب اس وجہ کی بنا پر ظاہر آیت سے جواز رؤیت پر استدلال درست ہو گا۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع سے مراد ایسا جگہ رجوع ہے کہ اس کے سوا ان کا کوئی مالک نہیں اور اس کے علاوہ ان کے نفع و نقصان کا بھی کوئی مالک نہیں جیسا کہ وہ اول خلق میں ایسے ہی تھے پھر انہیں اس اولین حالت کی طرح اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا کیونکہ حالت زندگی میں غیر ان کے مالک بھی بنے اور ان کے نفع و نقصان کے بھی اگرچہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ تمام احوال میں ان کا مالک تھا۔

دو باطل فرقوں کا استدلال

دو باطل فرقوں نے اس آیت سے استدلال کیا۔

اول، مجسمہ: وہ کہتے ہیں غیر جسم کی طرف رجوع محال ہے جب اللہ کی طرف رجوع ثابت ہوا تو لازمی طور ماننا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم ہے

ثانی، تناسخیہ: ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی شی کا رجوع دلالت کرتا ہے کہ وہاں وہ چیز پہلے موجود تھی تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ ارواح قدیم ہیں اور وہ عالم روحانیات میں پہلے موجود تھے، ان دونوں کا جواب سابقہ گفتگو میں آ چکا ہے۔

[۴۷] يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانے پر تمہیں بڑائی دی)

تاکیدی حکم

اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ کلام فرمایا تا کہ ان پر حجت میں تاکید اور ترکِ اتباع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر خوب خوف دلایا جائے پھر اس کے ساتھ "وَاتَّقُوْا يَوْمًا" کے الفاظ میں وعید بھی متصل فرمائی گویا یہ فرمایا: اگر تم نے سابقہ نعمتوں کی بنا پر میری اطاعت نہیں کی تو میرے عتاب کے خوف سے مستقبل میں میری اطاعت کر لو۔

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا

"وَاِنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ" یہاں یہ سوال پیدا ہو گا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا افضل ہونا لازم آ رہا ہے حالانکہ یہ بالاتفاق باطل ہے اس کے جواب میں درج ذیل وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ: کل مراد نہیں

بعض نے کہا عالم سے لوگوں کی کثیر جماعت مراد ہے جیسے کہا جاتا ہے رأیت عالماً من الناس تو یہاں کثیر مراد ہیں نہ کہ کل۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ عالم، علم بمعنی دلیل سے مشتق ہے تو جو بھی اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے وہ عالم ہے لہٰذا وہ عالم میں شامل ہو گا۔ متکلمین کے قول

اَلْعَالَمُ كُلُّ مَوْجُوْدٍ سِوَى اللهِ — اللہ کے سوا ہر موجود عالم ہے

کا یہی مفہوم ہے لہٰذا لفظ عالم کو بعض محدثات و اشیاء تک محدود کر لینا ممکن نہیں۔

دوسری وجہ: زمانہ کے لوگ مراد ہیں

مراد یہ ہے کہ تمہیں اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے اور جو بعد میں پیدا ہونے والی شی ہے وہ ابھی موجود نہیں لہٰذا وہ حالت عدم میں عالمین میں شامل نہیں ہو گی کیونکہ عالم کے لیے موجود ہونا شرط ہے اور شی حال عدم میں موجود ہی نہیں ہوتی لہٰذا وہ

اس حال میں عالمین میں کیسے شامل ہوگی۔ حضور سرور عالم ﷺ اس وقت موجود نہ تھے لہٰذا آپ اس موقعہ پر عالمین میں شامل نہیں لہٰذا اگر اس وقت بنی اسرائیل عالمین سے افضل ہیں تو اس سے ان کی حضور ﷺ پر فضیلت ثابت نہ ہوگی۔ یہی جواب اس آیت مبارکہ کے حوالہ سے بھی ہے۔

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ آتَاكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَداً مِنَ الْعَالَمِيْنَ (پ ۶۔ المائدہ:۲۰) یاد کرو کہ تم میں سے پیغمبر کیے اور تمہیں بادشاہ کیا اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (پ ۲۵۔ الدخان:۳۲) اور بیشک ہم نے انہیں دانستہ چن لیا اس زمانہ والوں سے

یہاں ان دونوں زمانوں کے لوگ ہی مراد ہیں اور وہ دوسرے پر اس لیے افضل تھے کہ انہیں حکومت، رسالت اور کتب الٰہیہ عطا ہوئی تھیں۔

تیسری وجہ: یہ ارشاد گرامی تمام عالمین کے لیے ہے لیکن فضل میں مطلق ہے اور مطلق کے صدق کے صورت واحدہ بھی کافی ہو جاتی ہے۔ تو یہ آیت اس پر دال ہوئی کہ بنی اسرائیل کو کسی ایک امر میں دیگر جہانوں سے فضیلت ہے اس کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ تمام جہانوں سے تمام اُمور میں افضل ہیں بلکہ ممکن ہے یہ دوسروں سے کسی ایک معاملہ میں افضل ہوں وہ دوسرے اس کے علاوہ تمام امور میں ان سے افضل ہوں اس گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ ارشاد گرامی:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى آدَمَ وَنُوْحًا وَّآلَ اِبْرَاهِيْمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (پ ۳۔ آل عمران:۳۳) بیشک اللہ نے چُن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اولاد اور عمران کی آل کو سارے جہان سے

سے یہ استدلال درست نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

چند فوائد

یہاں ابھی چند فوائد ہیں۔

پہلا فائدہ: امام ابن زید کا قول ہے۔ ان میں جو اہل ایمان تھے وہ یہاں مراد ہیں کیونکہ نافرمان بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے تھے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (پ ۶۔ المائدہ:۶۰) اور ان میں سے کر دیئے بندر اور سور

دوسرے مقام پر فرمایا:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ (پ ۶۔ المائدہ:۷۸) لعنت کیے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں

فضل قدیر

دوسرا فائدہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے جتنے خطابات فرمائے ہیں ان تمام میں عرب کو تنبیہ ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وجہ سے انہیں فضیلت حاصل ہوئی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات تنبیہ اور رہنمائی ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (پ-الزمر:۱۸) جو کان لگا کر بات سنیں پھر اس کے بہتر پر چلیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ (پ۲۴-الزمر:۵۵) اور اس کی پیروی کرو جو اچھی سے اچھی تمہارے رب سے تمہاری طرف اتاری گئی۔

تیسرے مقام پر فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (پ۱۳-یوسف:۱۱۱) بیشک ان کی خبروں سے عقلمندوں کی آنکھیں کھلتی ہیں۔

[۴۸] وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

(اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو)

تین چیزیں اور آخرت

دن سے بچنے سے مراد اس دن کے اندر عذاب وشدائد سے بچنا ہے کیونکہ نفس یوم سے نہیں بچا سکتا۔ اس دن تو تمام اہلِ جنت ونار وہاں جمع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دن کی شدت اور اس کی ہولناکی بھی واضح فرما دی ہے۔ اس لیے کہ عرب میں سے کوئی جب کسی مشکل میں پھنس جاتا تو اس کے معاونین اس کی مدد کرتے ہوئے انتہائی قوت سے اس کا اس طرح دفاع کرتے جیسے والد، اپنی اولاد کا کرتا ہے۔ اور اگر اس کے معاونین نہ ہوتے تو وہ عاجزی اور شفاعت کا سہارا لیتا تو وہ سختی کے بجائے نرمی پر اتر آتا اور دونوں حالتیں سختی اور نرمی کام نہ آتیں تو وہ فدیہ ادا کرنے کیلئے تیار ہو جاتا جو بصورت مال یا غیر مال ہوتا۔ اگر یہ تینوں صورتیں اسے نہ بچا سکتیں تو وہ تمام سہاروں اور دوستوں سے مایوس و ناامید ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہی بتایا کہ آخرت میں مجرموں کو یہ تینوں چیزیں نہیں بچا سکتیں۔

ہاں اس ترتیب پر دو سوالات ہیں۔

پہلا سوال: تکرار کا مقصد کیا

"لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا" سے جو فائدہ حاصل ہو رہا ہے وہی "وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ" سے حاصل ہو رہا ہے۔تو تکرار کا مقصد کیا؟

جواب: پہلے جملہ مبارک سے مراد یہ ہے کہ مجرم پر نافذ سزا کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا اور نُصرت یہ ہے کہ حکم معاقب وانجام سے اسے بچانے کا ارادہ کیا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ ایک اور فرق بھی آرہا ہے۔

دوسرا سوال: قبول فدیہ کو شفاعت کے بعد اور پہلے ذکر کی حکمت

یہاں اللہ تعالیٰ نے قبول شفاعت کو فدیہ سے پہلے ذکر کیا اور آگے اسی سورۂ مبارکہ کی ایک سو بیس آیات کے بعد قبول فدیہ کو ذکر شفاعت سے پہلے ذکر کیا ہے تو اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: جس کا میلان حُبّ مال کی طرف، علوِ نفس کی طرف میلان سے شدید ہوگا وہ فدیہ دینے کے بجائے شفیع کو مقدم کرے گا اور جس کا میلان اس کے برعکس ہوگا وہ فدیہ کو شفاعت سے پہلے لائے گا تو ترتیب بدلنے میں فائدہ یہ ہے کہ اس سے دونوں طرح کے لوگوں کی طرف اشارہ ہوگیا۔

الفاظ مبارکہ کی تفسیر

ارشادِ گرامی "لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا" ہے، شیخ قفال کہتے ہیں اہلِ لغت کے ہاں 'جزیٰ' کا معنی قضٰی (ادا) کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہ بن یسار رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

تجزیك ولا تجزئ احداً بعدك (البخاری:۹۶۵) یہ دنبہ تمہارے لیے کافی ہے، تمہارے بعد کسی کیلئے کافی نہیں۔

اہلِ عرب سے بھی یہی منقول ہے۔

تجزیك، "تا" پر زبر اور غیر مہموز ہے یعنی تمہارا ذبح کرنا قائم مقام قربانی کے ہوگیا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ روز قیامت کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا کسی شی میں بھی قائم مقام نہیں بن سکے گا اور نہ ہی اس کی جزا و بدلہ کا اٹھانے والا ہوگا۔ بلکہ آدمی وہاں اپنے بھائی، والدہ اور باپ سے بھاگے گا۔

اس نیابت کا معنی یہ ہے کہ کسی مطیع کی اطاعت، عاصی کی سزا کے قائم مقام نہ ہوگی۔ اس دنیا میں یہ نیابت ہو جاتی ہے۔ مثلاً

کوئی آدمی اپنے رشتہ دار اور دوست کا قرض ادا کرسکتا ہے مگر آخرت میں ایسا نہیں ہوسکتا، وہاں تو حسنات ونیکیوں کے ذریعے ہی حقوق کی ادائیگی ہوسکے گی۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس شخص پر جس نے اپنے کسی بھائی پر ظلم کیا عزت، مال یا مرتبہ میں اور بدلہ سے پہلے اُسے موت آگئی تو وہاں نہ دینار ہوں گے اور نہ درہم۔اگر اس کے پاس نیکیاں ہوئیں تو اس سے لے لی جائیں گی۔اور اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو اس پر مظلوم کے گناہ ڈال دیئے جائیں گے۔ (سنن ترمذی،۲۴۱۹)

صاحبِ کشاف کہتے ہیں "شیئًا"، مفعول ہے۔البتہ مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے یعنی 'قلیلاً من الجزا' جیسے ارشاد گرامی ہے:

لَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا (پ۱۶-مریم:۶۰) ان پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی

بعض نے لا یجزی پڑھا جو اجزاء عنہ سے (اس سے بے نیاز ہونا) ہے۔اب شیئاً من الجزاء کا مفہوم یہی ہوگا اور یہ جملہ محلاً منصوب یوماً کی صفت ہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ موصوف کی طرف ضمیر کہاں ہے؟ تو ہم کہیں گے وہ مقدر ہے، عبارت یوں ہے "لَا تَجْزِیْ فِیْهِ"۔

نکرہ لانے کا مفہوم یہ ہوا کہ کوئی بھی نفس کسی دوسرے کی طرف کسی بھی شی میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا، اس میں کلی طور پر ایسی نا اُمیدی اور مایوسی ہے جو ہر قسم کی امید کو جڑ سے کاٹ دینے والی ہے۔

وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ' کی تفسیر

شفاعت، ایک آدمی کا دوسرے کیلئے شی مانگنا اور اس سے اس کی حاجت پوری کروانے کی کوشش کرنا ہے۔یہ شفع (جفت) سے ہے جو وتر (طاق) کی ضد ہے، صاحب حاجت تنہا تھا۔شفیع کی وجہ سے جوڑا بن گیا۔

'مِنْهَا' کی ضمیر دوسرے نفس عاصی کی طرف راجع ہے اور یہ وہی ہے جس سے فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور اگر وہ کسی شفیع کو لائے گا تو وہ شفاعت قبول نہ ہوگی

یہ ضمیر نفس کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔کہ اگر اس کی شفاعت کی گئی تو وہ مقبول نہ ہوگی جیسے اس کی طرف سے کوئی جزا نہیں اٹھائے گا۔

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ کی تفسیر

عدل۔(فدیہ) یہ معادلۃ الشئی (شئی کی مثل) سے ہے، کہا جاتا ہے، ما اعدل بفلان احداً (میں نے اس کی نظیر نہیں دیکھی)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (پ۷۔الانعام:۱)

پھر کافر لوگ اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں

اس کی نظیر یہ آیتِ مبارکہ بھی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (پ۶۔المائدہ:۳۶)

بیشک وہ جو کافر ہوئے جو کچھ زمین میں ہے سب اور اس کے برابر اگر ان کی ملک ہو کہ اسے دے کر قیامت کے عذاب سے اپنی جان چھڑائیں تو ان سے نہ لیا جائے گا اور ان کیلئے دکھ کا عذاب ہے

دوسرے مقام پر ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَباً وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (پ۳۔ال عمران:۹۱)

اور جو کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اگرچہ اپنی خلاصی کو دے ان کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں

تیسرے مقام پر فرمایا:

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا (پ۷۔الانعام:۷۵)

اور اگر اپنے عوض سارے بدلے دے تو اس سے نہ لیے جائیں

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ کی تفسیر

دنیا میں مدد، تعاون، دوستی اور قرابت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس دن وہاں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت اور نہ رشتے۔ وہاں آدمی اپنے بھائی، والدہ، والد اور رشتہ داروں سے بھاگے گا۔ شیخ قفال کہتے ہیں نصر سے مراد معاونت ہے جیسے فرمانِ نبوی ہے:

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً (البخاری:۲۴۴۳)

اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہے یا مظلوم

اس سے اغاثہ (مدد کرنا) مراد ہے جب بارش زمین کی مدد کرے اور وہاں فصل لہلہائے تو عرب کہتے ہیں 'ارض منصورۃ' گویا بارش نے اس کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (پ۱۷-الحج:۱۵)

جو یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ اپنے نبی کی مدد نہ فرمائے گا دنیا اور آخرت میں تو اسے چاہیے کہ اوپر کو ایک رسی تانے پھر اپنے آپ کو پھانسی دے لے، پھر دیکھے کہ اس کا یہ داؤں کچھ لے گیا اس بات کو جس کی اسے جلن ہے

کا مفہوم یہ بھی بیان ہوا کہ جو یہ خیال کرے کہ اللہ اس طرح رزق نہیں دیتا جس طرح بارش علاقوں کو رزق دیتی ہے۔

انتقام کو بھی نصرت اور انتصار کہا جاتا ہے جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا (پ۱۷-الانبیاء:۷۷)

اور ہم نے ان لوگوں پر اس کی مدد دی جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں۔

یعنی ہم نے ان سے انتقام لیا۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ میں یہ تمام مفاہیم ممکن ہیں کیونکہ روزِ قیامت ان کی فریادرسی نہیں کی جائے گی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہیں عذاب دیا جائے گا اور کوئی ایسا نہیں جو ان کی طرف سے اللہ سے انتقام لے، الغرض نصر شدائد کا دفعہ کرنا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرما دیا وہاں اس کے عذاب کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

دو اہم مسائل

ابھی یہاں دو مسائل باقی ہیں۔

پہلا مسئلہ: آیت میں خوف اور شوق ہے

اس آیتِ مبارکہ میں انسان کو معاصی پر سب سے بڑا خوف اور اسے اس بات کا شوق دلایا ہے کہ توبہ کے ذریعے معصیت پر بخشش کروائی جا سکتی ہے، جب انسان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ موت کے بعد ازالہ نہیں ہو سکتا نہ وہاں شفاعت ہے نہ مدد اور نہ فدیہ تو اسے یقین ہو جائے گا کہ اطاعت کے بغیر خلاصی نہیں۔ تو جب ہر گھڑی عبادت میں کوتاہی پر بے خوف نہ ہوگا اور توبہ سے بھی، کیونکہ اسے بقا کا کوئی یقین نہیں تو پھر ہر حال میں ڈرنے والا اور برائی سے پرہیز کرنے والا بن جائے گا۔ آیتِ مبارکہ

اگر چہ بنی اسرائیل کے حوالے سے ہے مگر معناً اس کا خطاب تمام انسانوں کیلئے ہے کیونکہ اس میں اس دن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں اور جو بھی وہاں ہوگا اس کیلئے یہ ہوں گے۔

دوسرا مسئلہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقامِ شفاعت

تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مقامِ شفاعت ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کو اس مفہوم پر محمول کیا گیا ہے۔

عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (پ ۱۵- الاسراء: ۷۹)

قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی (پ ۳۰- الضحیٰ: ۵)

اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا عطا کرے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے

شفاعت کس لیے؟

اس میں اختلاف ہے کہ شفاعت کس کیلئے ہوگی۔ مستحق ثواب اہلِ ایمان کیلئے یا مستحق عقاب اہلِ کبائر کیلئے؟

معتزلہ اور شفاعت

معتزلہ کہتے ہیں مستحق ثواب کیلئے ہوگی اور شفاعت کی وجہ سے ان کے ان منافع میں اضافہ ہو جائے گا جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔

اہلسنّت اور شفاعت

اہلِسنّت کہتے ہیں شفاعت کی وجہ سے مستحقین عقاب کا عذاب ساقط ہوگا تو میدانِ محشر میں شفاعت کی وجہ سے وہ دوزخ میں داخل ہی نہ ہوں گے اور اگر داخل ہوں گے تو شفاعت کے ذریعے انہیں وہاں سے نکال کر جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کفار کیلئے شفاعت نہیں۔

معتزلہ نے اہلِ کبائر کیلئے شفاعت کا انکار ان دلائل کی بنا پر کیا ہے۔

معتزلہ کے دلائل

پہلی دلیل: یہ آیتِ مبارکہ تین وجہ سے شفاعت کی نفی کر رہی ہے:

۱۔ ارشادِ مبارک "لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا" ہے اگر شفاعت سے کسی کا عذاب ساقط ہو جائے تو ایک نفس دوسرے کیلئے بدلہ اور جزا کا سبب بن جائے گا۔

۲۔ وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، لفظ شفاعت، نکرہ نفی کے تحت عموم پر دال ہے تو اس سے تمام اقسامِ شفاعت کی نفی ثابت ہو رہی ہے

۳۔ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ، اگر حضور ﷺ عاصیوں کے شفیع ہیں تو وہ ان کے مددگار ٹھہرے اور یہ اس کے خلاف ہے۔

یہ جواب نہیں بن سکتا

جواباً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر اس آیت پر ان دو وجہ پر گفتگو کر دی جائے تو اعتراض ختم ہو جائے گا۔

۱۔ یہود یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے آباء ہماری شفاعت کر دیں گے ان کا رد کرتے ہوئے یہ آیت نازل کی گئی۔ تو وہ اس سلسلہ میں مایوس ہو گئے۔

۲۔ آیت کا ظاہر تو ہر قسم کی شفاعت کی نفی کر رہا ہے لیکن جب ہمارا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ اطاعت کے ثواب میں اضافہ کیلئے شفاعت اس سے مخصوص اور خارج ہے تو ہم صاحبِ کبیرہ مسلمان کے حق میں بھی دلائل کی بنیاد پر شفاعت کو مخصوص مانیں گے

دونوں کی تردید

لیکن دونوں کی تردید ہو سکتی ہے۔

اول کی اس طرح کہ اعتبار عموماً لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصی سبب کا، دوسری کی یوں کہ اس آیت سے اضافہ منافع کیلئے شفاعت کی نفی مراد نہیں لی جا سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دن سے خوف دلاتے ہوئے فرمایا، اس میں شفاعت نفع نہیں دے گی، اگر نفی شفاعت نفع کو اضافۂ منافع کی طرف لوٹا دیں تو تحذیر و خوف حاصل نہ ہو گا کیونکہ اضافہ نفع، عدم حصول میں نہ کوئی خطرہ ہے اور نہ کوئی ضرر۔

اس کی تفصیل یوں سمجھو، اگر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے اس دن سے ڈرو جس میں میں کسی کی شفاعت کی بنا پر مستحق ثواب کے منافع میں اضافہ نہیں کروں گا تو اس سے عاصی پر زجر نہ ہو گا۔ ہاں! اگر یوں کہا جائے اس دن سے ڈرو جس دن میں کسی کی شفاعت پر مستحق عقاب کے عذاب کو ساقط نہیں کروں گا تو اب معاصی پر زجر یقیناً ہو گا۔

تو ثابت ہوگیا آیتِ مبارکہ میں اسقاطِ عقاب میں تاثیر شفاعت کی نفی ہے لیکن اضافۂ منافع میں اس کی تاثیر کی نفی نہیں۔

دوسری دلیل: کوئی شفیع مُطاع نہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ

اور ظالموں کا نہ کوئی دوست اور نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائے (پ۲۴۔ المؤمن: ۱۸)

ظالم، (ظلم کرنے والا)، ہر کافر اور غیر کافر سب کو شامل ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ظالمین کیلئے 'شفیع مطاع' (سفارشی مخدوم) کی نفی تو ہے مگر شفیع مقبول کی نفی نہیں فرمائی کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ وہاں شفیع مطاع (مخدوم) ہوگا ہی نہیں کیونکہ مطاع، مطیع سے فوق و بلند ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی فوق و بلند نہیں کہ وہ اس کی اطاعت کرے کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں ان دو وجہ سے آیت کا یہ مفہوم تم نہیں لے سکتے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے مطیع نہ ہونے پر سب کا اتفاق

اس پر عقلاء متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے فوق کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کا وجود مانتے ہیں وہ تمام معترف ہیں کہ وہ کسی کے تابع نہیں اور جو منکر ہیں وہ انکار کے باوجود بھی اسے غیر کا مطیع و تابعدار قرار دینے کو محال مانتے ہیں۔

جب یہ ثابت ہوگیا تو تم نے آیت کو جس نفی پر محمول کیا ہے اس پر تو یہ دلیل ہی نہیں۔

۲۔ سفارشی سے مراد مقبول نہیں

جب اللہ تعالیٰ نے شفیع مطاع (مخدوم) کی نفی کی ہے اور شفیع، مشفوع الیہ (جس سے سفارش کی جائے) سے ادنیٰ ہوتا ہے کیونکہ جو اس سے فوق ہوگا وہ آمر و حاکم ہوگا۔ اسے شفیع کہا ہی نہیں جاسکتا تو لفظ شفیع بتا رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ادنیٰ ہوگا لہٰذا ''ایطاع'' کو اس کے فوق پر محمول نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہاں شفیع سے مراد یہی ہوگا کہ وہ مقبول نہیں۔

تیسری دلیل: تمام شفاعتوں کی نفی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (پ۳۔ البقرہ: ۲۵۴)

وہ دن آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہے نہ (کافروں کیلئے) دوست اور نہ شفاعت اور کافر خود ہی ظالم ہیں

آیت کا ظاہر تمام شفاعات کی نفی پر شاہد ہے۔

چھٹی دلیل: ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (پ۳-البقرۃ:۲۷۰) اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

اگر حضور ﷺ فاسق امتی کی شفاعت کریں تو پھر فساق، منصور و کامیاب ہوں گے کیونکہ جب وہ شفاعتِ رسول کی وجہ سے عذاب سے نجات پا گئے تو ان کی مدد میں رسول اللہ ﷺ نے انتہا فرما دی۔

پانچویں دلیل: ملائکہ اور شفاعت فاسق

جب ملائکہ فاسق کی شفاعت نہیں کریں گے

اللہ پاک کا مبارک ارشاد:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (پ۱۷-الانبیاء:۲۸) اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں

یہاں ملائکہ کے بارے میں اطلاع دی کہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے مگر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور فاسق اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں۔ جب ملائکہ اس کی شفاعت نہیں کریں گے تو حضرات انبیاء علیہم السلام بھی نہیں کریں گے کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں۔

چھٹی دلیل، شفاعت ساقط عذاب نہیں

ارشادِ ربانی ہے:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (پ۲۹-المدثر:۴۸) تو انہیں سفارشیوں کی سفارش کام نہ دے گی۔

اگر شفاعت کی تاثیر، اسقاطِ عذاب ہے تو شفاعت مفید ہونی چاہیے تھی، حالانکہ آیت اس کے خلاف ہے۔

ساتویں دلیل: امت کا اجماع ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف اس معاملہ میں رجوع کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں حضور کی شفاعت کے اہل لوگوں ہی سے بنا دے۔ اس لیے دعاؤں میں عرض کیا جاتا ہے "وَاجْعَلْنَا مِنْ اَهْلِ شَفَاعَتِهٖ" (ہمیں حضور کی شفاعت کے اہل بنا دے)

اگر شفاعت کا مستحق وہ بن جاتا ہے جو دنیا سے کبائر پر مصر گیا تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ اللہ سے یہ طلب کیا جاتا کہ وہ ہمارا خاتمہ

کبائر پر اصرار کرنے والوں میں کرے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہنا کیوں جائز نہیں کہ جب کبائر پر مصروف ہوں، وہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اہلِ شفاعت میں سے بنا دے، نہ یہ کہ وہ کہیں ہمارا خاتمہ کبائر پر اصرار کرنے والوں میں ہو جیسا کہ وہ دعا میں یہ پڑھتے ہیں: "اِجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِیْنَ" (اے اللہ! ہمیں توبہ کرنے والوں میں شامل فرمادے) اس میں یہ تو نہیں کہا پہلے ہم گناہ کریں اور پھر توبہ کریں وہ تو توبہ ہی کی توفیق مانگتے ہیں جب وہ گناہگار ہوں۔ دونوں رغبتیں ایک شرط سے مشروط ہیں اور وہ ہے تقدمِ اصرار اور تقدمِ ذنب۔

کیونکہ ہم اس کا جواب دو طرح دے سکتے ہیں۔

۱۔ اگر ہم "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِیْنَ" (اے اللہ ہمیں توبہ کرنے والا بنا) میں شرط مانتے ہیں تو ہم پر کہاں لازم آتا ہے کہ "اِجْعَلْنَا مِنْ اَھْلِ الشَّفَاعَةِ" (ہمیں اہلِ شفاعت بنا) میں بھی شرط مانیں۔

۲۔ اُمت دونوں رغبتوں میں اللہ تعالیٰ سے ہی مانگتی ہے کہ وہ انہیں اپنی پسندیدگی عطا فرمائے۔ مثلاً "اجعلنا من التوابین" میں یہ مانگتی ہے کہ وہ انہیں گناہوں پر توبہ کی توفیق دے دے اور دوسرے "اِجْعَلْنَا مِنْ اَھْلِ شَفَاعَتِهٖ" میں یہ مانگتی ہے کہ وہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ شفاعت میں بنا دے۔

اب اگر اہلیت شفاعت، دنیا سے کبائر پر اصرار کے ساتھ جائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تو پھر اہلیت شفاعت کا سوال یہ سوال بن جائے گا کہ وہ انہیں کبائر پر مصر، دنیا سے موت عطا فرمائے اور یہ بالاتفاق جائز نہیں، ہاں! ہم نے جو کہا اہلیت شفاعت اسے حاصل ہوگی جو دنیا سے مستحق ثواب بن کر فوت ہوا تو اب اہلیت شفاعت کا سوال کرنا بہتر اور حسن ہوگا اب دونوں میں فرق واضح ہو گیا

آٹھویں دلیل: اہلِ کبائر کے لیے شفاعت مفید نہیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ (پ۳۰-الانفطار: ۱۴ تا ۱۶)

اور بیشک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں۔ انصاف کے دن اس میں جائیں گے اور اس سے کہیں چھپ نہ سکیں گے

یہ آیات واضح کر رہی ہیں تمام فاجر و فاسق دوزخ میں داخل اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے تو ثابت ہوا وہ اس سے نکل نہیں سکتے، تو جب معاملہ یوں ہے تو شفاعت کا کوئی فائدہ نہ ہوا، نہ عذاب کی معافی میں اور نہ دخول کے بعد آگ سے نکلنے میں۔

نویں دلیل: اہلِ کبائر کے لیے اِذن نہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (پ۱۱-یونس: ۳)

اللہ کام کی تدبیر فرماتا ہے، کوئی سفارشی نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد

یہاں ان سے شفاعت کی نفی ہے جنہیں اذن نہیں جیسے دوسرے مقام پر فرمایا:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ　(پ۳-البقرہ:۲۵۵)

وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بغیر اس کے حکم کے

ایک اور مقام پر فرمایا:

لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا　(پ۳۰-النباء:۳۸)

کوئی نہ بول سکے گا، مگر جسے رحمٰن نے اذن دیا اور اس نے ٹھیک بات کہی

تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ کبائر کے حق میں کسی کو شفاعت کا اذن عطا نہیں فرمایا، اگر یہ اذن ہوتا تو عقل کی بنا پر مشہور ومعروف ہوتا یا نقل کی بنا پر، عقل تو اس میں دخل نہیں دے سکتی۔

رہ گئی نقل تو اس کا ثبوت تواتر سے ہوگا یا احاد سے، اخبار احاد بھی یہاں کام نہیں آسکتیں کیونکہ وہ ظن کی مفید ہوتی ہے، حالانکہ مسئلہ یقینی ہے اور مسائل یقیعیہ میں دلائل ظنیہ کے ساتھ استدلال جائز نہیں۔

اگر کہو تواتر ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ اگر ایسی صورت ہوتی تو جمہور مسلمان اسے جانتے اور اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ شفاعت کا انکار کیوں کرتے تو جب اکثر انکار شفاعت پر ہیں تو واضح ہوگیا اس کا اذن نہیں۔

دسویں دلیل: توبہ کی قید کیوں؟

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ　(پ۲۴-المومن:۷)

وہ جو عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بولتے اور اس پر ایمان لاتے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں۔ اے رب ہمارے! تیری رحمت وعلم میں ہر چیز کی سمائی ہے۔ تو انہیں بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے

اگر شفاعت فاسق کو حاصل ہو سکتی تو پھر اسے توبہ اور اتباع سبیل کے ساتھ مقید کرنے کا کیا فائدہ؟

گیارہویں دلیل: عدم شفاعت پر چار احادیث

ایسی احادیث جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اہلِ کبائر کو شفاعت حاصل نہیں ہوگی، چار ہیں۔

پہلی حدیث: "سُحْقاً سُحْقاً" نہ فرماتے

حضرت علاء بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان میں تشریف لے گئے فرمایا: اے قوم مومنین! تم پر سلام ہو ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے پاس آنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ فرمایا: بلکہ تم تو میرے صحابہ ہو، میرے بھائی ابھی تک نہیں آئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں آنے والی امت کو آپ کیسے پہچانیں گے؟ فرمایا: ایک آدمی کا پانچ کلیان گھوڑا ہو، کیا وہ اسے کالے رنگ کے گھوڑوں میں پہچان نہیں لے گا۔ عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور پہچان لے گا۔ فرمایا: وہ روز قیامت وضو کی برکت سے روشن چہروں کے ساتھ آئیں گے اور میں حوض پر ان کا انتظار کروں گا، کچھ لوگوں کو میرے حوض سے دور کیا جائے گا جیسے بھکے اونٹ کو دور کیا جاتا ہے، میں آواز دوں گا آنے دو، آنے دو، اگر آپ ان کے شفیع ہوتے تو "سُحْقاً سُحْقاً" (دور ہو جاؤ) نہ فرماتے، کیونکہ شفیع ایسے نہیں کہہ سکتے، پھر وہ دائمی عذاب سے چھڑانے والے شفیع کیسے بنیں گے۔ جب کہ وہ پانی کے جام انہیں نہیں دے رہے۔ (صحیح ابن حبان: ۳، ۱۰۴۶)

دوسری حدیث: حضرت عبدالرحمٰن بن سابط، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے کعب! میں تمہیں امارت سفہاء (کم عقل) سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، عنقریب ایسے حکمران آئیں گے جو ان کے پاس جائے گا اور ان کے ظلم پر معاون ہوگا اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا، وہ میرا نہیں اور میں ان کا نہیں اور وہ میرے پاس حوض پر نہیں آئے گا اور جو ان کے پاس نہیں جائے گا نہ ان کے ظلم پر معاون ہوگا نہ ان کے جھوٹ کو سچا کہے گا وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں اور وہ میرے پاس حوض پر آئے گا۔ اے کعب بن عجرہ! نماز سراپا قُربت، روزہ ڈھال اور صدقہ، گناہ کو نکال دیتا ہے جیسے آگ کو پانی ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اے کعب بن عجرہ! حرام سے پلنے والا جسم جنت میں داخل نہ ہوگا۔

(مسند احمد: ۳، ۳۲۱)

حدیث سے تین طرح استدلال

اس حدیث سے استدلال تین طریقوں پر ہے:

۱۔ جب وہ نبی ﷺ کے نہیں اور نبی ﷺ ان کا نہیں تو شفاعت کیسے فرمائیں گے؟

۲۔ ''وہ میرے حوض پر نہیں آئیں گے'' نفی شفاعت ہے کیونکہ وہ رسول ﷺ تک نہیں پہنچ پائیں گے، یہی وجہ ہے کہ وہ حوض پر وارد نہیں ہوسکیں گے، تو اس سے واضح ہوگیا کہ رسول ﷺ بطریق اولیٰ انہیں عتاب سے چھٹکارا نہیں دلائیں گے۔

۳۔ ''حرام سے پلنے والا جسم جنت میں داخل نہیں ہوسکتا'' (صحیح ابن حبان:۱۷۲۳)

صراحت ہے اہلِ کبائر کے حق میں شفاعت کا کوئی فائدہ نہیں۔

تیسری حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، میں تمہیں قیامت کے روز ایسا نہ پاؤں کہ گردن پر بکری ہو جو فریاد کر رہی ہو اور وہ کہہ رہا ہو یارسول اللہ! میری مدد فرماؤ، تو میں کہوں گا میں یہاں اللہ سے چھڑوانے کا کسی شیٔ میں مالک نہیں، میں نے تمہیں اسلام کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ (البخاری:۳۰۷۳)

یہ ہمارے مقصود ومطلوب پر صراحت ہے جب آپ ﷺ، اللہ کی طرف سے کسی شیٔ کے مالک نہیں تو شفاعت آپ ﷺ کا حصہ کیسے ہوگی؟

چوتھی حدیث: تین کے خلاف کیس لڑوں گا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تین آدمیوں کے خلاف میں روزِ قیامت کیس لڑوں گا ایک جس نے مجھے ضامن بنایا پھر دغہ دیا، دوسرا جس نے انسان کو بیچ کر وہ رقم استعمال کی، تیسرا جس نے کسی کو مزدور بنایا، کام پورا لیا مگر مزدوری پوری نہ دی۔ (البخاری:۲۲۲۷)

اس سے استدلال یوں ہے کہ جب حضور علیہ السلام ان کے مخالف ہیں تو ان کیلئے آپ کا شفیع بننا محال ہوگا، اس مسئلہ میں معتزلہ کے یہی دلائل ہیں۔

شفاعت پر اہلسنّت کے دلائل

اہلسنّت نے شفاعت پر یہ دلائل دیئے ہیں

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر تو انہیں بخش دے تو بیشک تو ہی ہے غالب حکمت والا ہے۔ (پ۷۔المائدہ:۱۱۸)

اس سے استدلال اس طرح ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ شفاعت حقِ کفار میں ہے یا حقِ فرمانبردار مسلمان یا صاحبِ صغیرہ مسلمان یا صاحبِ کبیرہ مسلمان کی توبہ کے بعد، یا اس کی قبل از توبہ کیلئے ہے۔

پہلی قسم: باطل ہے کیونکہ یہ ارشادِ گرامی ''اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ'' کفار کے لائق ہی نہیں۔

دوسری، تیسری، چوتھی قسم: یہ بھی باطل ہیں کیونکہ مطیع مسلمان، صاحبِ صغیرہ اور صاحبِ کبیرہ مسلمان پر توبہ کے بعد مخالف کے ہاں بھی عقلاً عذاب جائز نہیں، جب معاملہ یوں ہی ہے تو ارشادِ مبارک ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ'' ان کے مناسب نہیں، جب یہ تمام باطل ٹھہرے تو اب یہی صورت باقی ہے کہ یہ شفاعت اس صاحبِ کبیرہ مسلمان کیلئے ہو جس نے توبہ نہیں کی، جب ایسی شفاعت کا عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ثابت ہے تو حضور سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں بھی یہی عقیدہ درست ہوگا کیونکہ فرق کا کوئی قائل ہی نہیں۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حکایت فرمائی:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (پ۱۳-ابراہیم ۳۶)

تو جس نے میرا ساتھ دیا وہ تو میرا ہے۔ اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو بیشک تو بخشنے والا مہربان ہے

''عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' سے مراد کافر نہیں لیا جا سکتا کیونکہ وہ بالاتفاق محلِ مغفرت نہیں نہ اس سے صاحبِ صغیرہ اور صاحبِ کبیرہ بعد از توبہ مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی مغفرت مخالف کے ہاں بھی عقلاً لازم ہے تو انہیں شفاعت کی ضرورت ہی نہیں۔ تو اب صرف وہ صاحبِ کبیرہ ہی رہ جاتا ہے جس نے توبہ نہیں کی۔ ہم نے ان آیات مبارکہ سے جو استدلال کیا ہے اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہو رہی ہے جسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد باری تعالیٰ تلاوت کیا:

عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو بیشک تو بخشنے والا مہربان ہے

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول تلاوت فرمایا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

اگر تو ان کو عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں

پھر ہاتھ اُٹھا کر روتے ہوئے عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ

اے اللہ! میری اُمت، میری اُمت

اللہ تعالیٰ نے جبریل امین سے فرمایا: میرے محمد کے پاس جاؤ، تیرا رب بہتر جانتا ہے ان سے رونے کا سبب پوچھو! جبریل امین نے آکر پوچھا اور خبر دی تو آپ ﷺ نے اُمت کے حوالے سے عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جبریل، حضور ﷺ کے پاس جا کر کہو:

اِنَّا سَنُرْضِیْكَ فِیْ اُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْئُكَ (مسلم:۲۰۲)
میں آپ کو آپ کی اُمت کے حوالے سے راضی کروں گا اور آپ کو تکلیف میں نہیں ڈالوں گا

تیسری دلیل: سورۂ مریم میں ارشاد ربانی ہے:

یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا وَلَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (پ۱۶-مریم:۸۵تا۸۷)
جس دن ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کی طرف لے جائیں گے مہمان بنا کر اور مجرموں کو جہنم کی طرف ہانکیں گے پیاسے، لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنہوں نے رحمٰن سے عہد پایا ہے۔

ظاہر آیت بتا رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ نہیں کہ مجرم، دوسروں کیلئے شفاعت کے مالک نہیں یا یہ کہ ان مجرموں کیلئے دوسرے شفاعت کے مالک نہیں، کیونکہ مصدر کی اضافت جیسے فاعل کی طرف جائز اور صحیح ہوتی ہے اسی طرح مفعول کی طرف بھی جائز ہوتی ہے۔ البتہ! ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آیتِ مبارکہ کا دوسرے معنی لینا اولیٰ ہے کیونکہ پہلا معنی لینا تو واضح چیز کی وضاحت ہی قرار پائے گا، اس لیے کہ ہر کوئی جانتا ہے مجرم جنہیں دوزخ کی طرف ہانکا جا رہا ہے وہ دوسروں کی شفاعت کے مالک نہیں ہو سکتے، لہٰذا دوسرا معنی لینا ہی متعین ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب ہم کہتے ہیں آیتِ مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ شفاعت اہلِ کبائر کیلئے ہے کیونکہ اس سے متصل فرمایا:

اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (پ۱۶-مریم:۸۷)
مگر وہی جنہوں نے رحمٰن کے پاس سے عہد پایا

صورت حال یہ ہے کہ مجرموں کا یہ استحقاق نہیں کہ کوئی غیر ان کی شفاعت کرے البتہ اس صورت میں جب اللہ کی طرف سے انہیں عہد ملا اور جسے بھی اللہ کی طرف سے عہد ملا ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا، صاحبِ کبیرہ کو اللہ سے عہد ملا ہے اور وہ توحید و اسلام ہے۔ لہٰذا وہ اس کے تحت داخل ہوں گے، زیادہ سے زیادہ آپ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ یہود کو عہد ملا ہے اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، لہٰذا وہ بھی اس کے تحت داخل ہوں؟

ہم جواباً کہیں گے کہ یہود (کافر) کیلئے عدم شفاعت پر اجماع ہے جس کے پیشِ نظر انہیں ہم یہاں شامل نہیں کر سکتے۔ ہاں! ان کے علاوہ کو ہم شامل رکھیں گے۔

چوتھی دلیل: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی صفت بیان فرمائی:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (پ۱۷-الانبیاء:۲۸) اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے

وجہ استدلال یوں ہے کہ صاحب کبیرہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے اور جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہوگا وہ اہلِ شفاعت میں سے ہے۔ پہلے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ فاسق باعتبار ایمان اور توحید کے اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور جو شخص اس وصف کے اعتبار سے وہاں پسندیدہ ہے وہ ضرور وہاں مرتضٰی و پسندیدہ ہوگا کیونکہ مرتضٰی عند اللہ "مرتضٰی عند اللہ بحسبِ ایمانه" کے مفہوم کا جز ہے، جب مرکب سچا ہے تو مفرد بھی سچا ہوگا، تو واضح ہوگیا صاحب کبیرہ اللہ کے ہاں مرتضٰی ہے جب یہ ثابت ہوگیا تو اس کا اہلِ شفاعت میں ہونا لازم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" میں یہاں شفاعت کی نفی ہے مگر مرتضٰی کیلئے نفی نہیں اور نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے، لہٰذا مرتضٰی لازمی طور پر اہلِ شفاعت میں شامل ہوگا۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ مرتضٰی، شفاعت ملائکہ میں داخل ہے تو شفاعتِ انبیاء اور شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ میں لازماً شامل ہوگا کیونکہ ان میں فرق کا کوئی قائل نہیں۔

صاحبِ کبیرہ مرتضٰی (پسندیدہ) نہیں

سوال: اگر کوئی کہے کہ اس استدلال پر دو طرح اعتراض ہے۔

پہلی وجہ: فاسق مرتضٰی نہیں، لہٰذا وہ شفاعت ملائکہ میں لازماً داخل نہیں ہوگا اور جب وہ ان کی شفاعت کا اہل نہیں تو لازماً وہ حضور ﷺ کی شفاعت میں بھی داخل نہ ہوگا۔ فاسق اپنے فسق و فجور کی وجہ سے مرتضٰی نہیں اور جو باعتبار فسق کے مرتضٰی نہیں وہ تمہارے والی دلیل کے مطابق بھی مرتضٰی نہیں ہوسکتا اور جب وہ مرتضٰی نہیں تو وہ شفاعت ملائکہ کا اہل بھی نہ ہوگا کیونکہ ارشادِ مبارک "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" تمام سے شفاعت کی نفی کر رہا ہے۔ البتہ مرتضٰی کے حق میں ثابت ہے تو جب صاحبِ کبیرہ مرتضٰی نہیں تو وہ لازماً نفی شفاعت کے تحت ہی داخل ہوگا۔

دوسری وجہ: جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمالے

آیتِ مبارکہ سے یہ استدلال تب تام ہوگا جب ارشادِ باری 'وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی' کا معنی یہ ہو کہ ملائکہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کی جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمالے اور اگر اس کا مفہوم یہ ہو کہ وہ نہیں شفاعت کریں گے مگر اللہ تعالیٰ جس کی شفاعت کو پسند فرمالے تو اب آیت کی دلالت نہ ہوگی، البتہ اس صورت میں ہوگی جب یہ ثابت ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ کبیرہ کی شفاعت پسند فرماتا ہے۔

پہلے کا جواب

علمِ منطق میں ثابت ہے کہ مہمل جملے آپس میں متناقض نہیں ہوتے مثلاً زید عالم اور زید لیس بعالم آپس میں متناقض نہیں، کیونکہ ممکن ہے زید فقہ کا عالم ہو مگر عقائد کا عالم نہ ہو، جب یہ ثابت ہے تو یہ دو جملے "صاحب الکبیرۃ مرتضٰی" (صاحب کبیرہ پسندیدہ ہے) اور صاحب الکبیرہ لیس بمرتضٰی (صاحب کبیرہ پسندیدہ نہیں) کا آپس میں کوئی تناقض نہیں، اس لیے کہ ممکن ہے وہ دین کے اعتبار سے مرتضٰی اور باعتبار فسق مرتضٰی نہ ہو اور یہ بھی سامنے رہے جب وہ اسلام کے اعتبار سے مرتضٰی ہے تو مسمّٰی کا مرتضٰی ہونا ثابت ہوگا جب مستثنیٰ محض اس کا مرتضٰی ہوتا ہے، تو صاحبِ کبیرہ کا مرتضٰی ہونا باعتبار ایمان ثابت ہے، لہٰذا وہ استثناء کے تحت داخل اور مستثنیٰ منہ سے خارج ہوگا۔ جب اس کے بارے میں یہ ثابت ہو گیا تو وہ اہلِ شفاعت میں سے ہوگا۔

دوسرے کا جواب

جواب اس کا یہ ہے کہ آیت کو اس معنی کہ وہ نہیں شفاعت کرتے مگر جسے اللہ پسند فرمائے" پر محمول کرنا بہتر ہے۔ اس سے کہ اس کا یہ معنی کیا جائے" وہ شفاعت نہیں کرتے مگر اللہ جس کی شفاعت پسند فرمائے کیونکہ پہلا معنی اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف راغب ومتوجہ اور معاصی سے احتراز پر ابھارتا ہے، دوسرے معانی کے اعتبار سے یہ فائدہ آیت سے حاصل نہیں ہوتا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی ایسی تفسیر کرنا بہتر ہوتا ہے جس میں زیادہ فائدہ ہو۔

پانچویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا کفار کے بارے میں فرمان ہے

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (پ۲۹-المدثر:۴۸) تو انہیں سفارشیوں کی سفارش کام نہ دے گی

یہاں کفار کو مخصوص کیا گیا ہے تو ضروری ہے۔ مسلمان کا حال مسئلہ خطاب کی بنا پر اس کے مخالف ہوگا۔

چھٹی دلیل: عاصیوں کیلئے دعاء مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (پ۲۶-محمد:۱۹) اور اے محبوب! اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو

یہ ارشادِ مبارک واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہل ایمان مرد اور خواتین کیلئے استغفار کا حکم دیا ہے اور ہم نے پیچھے "اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" کے تحت واضح کیا تھا کہ صاحبِ کبیرہ مومن ہے۔ جب وہ مومن ہے تو اس کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی استغفار بھی ثابت ہوگی۔ جب معاملہ یوں ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مغفرت بھی عطا فرمائے گا، ورنہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا رد فرمانے کیلئے آپ کو دعا کا حکم دے رہا ہے جو محض تحقیر اور ایذا ہے اور یہ چیز نہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے اور نہ ہی حضور ﷺ کے، تو واضح ہوگیا جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو عاصیوں اور گناہگاروں کیلئے دعا کا حکم دیا ہے تو وہ دعا قبول بھی فرمائے گا اور یہ بات تبھی پوری ہوگی جب اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے اور شفاعت سے یہی مراد ہے۔

ساتویں دلیل: دعاء مصطفیٰ ﷺ رد نہیں ہوتی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا (پ۵-النساء:۸۶)

اور جب تمہیں کوئی کسی لفظ سے سلام کرے تو تم اس سے بہتر لفظ جواب میں کہو یا وہی کہہ دو۔ بیشک اللہ ہر چیز پر حساب لینے والا ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو حکم دیا ہے جب انہیں کوئی تحیہ کہے تو اس کے بدلہ میں اس سے بہتر یا اس کی مثل لوٹائے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تحیہ پیش کرنے کا یوں حکم دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (پ۲۲-الاحزاب:۵۶)

اے ایمان والو! ان پر درود اور خوب سلام بھیجو

صلاۃ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے اور اس کے تحیہ ہونے پر کوئی شک نہیں، جب ہم اللہ تعالیٰ سے حضور ﷺ کیلئے طلب کرتے ہیں تو فرمانِ باری تعالیٰ "فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا" کا تقاضا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تمام مسلمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کریں اور یہی شفاعت کا مفہوم ہے۔

پھر ہم سب کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کی دعا رد نہیں ہوتی تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی شفاعت کو تمام مسلمانوں کے حق میں قبول فرمائے اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

آٹھویں دلیل: سفارش دونوں جہانوں میں مقبول

ارشاد باری تعالیٰ کا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (پ۵-النساء:۶۴)

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں۔ اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں

یہاں آیتِ مبارکہ میں توبہ کا ذکر ہی نہیں، حالانکہ یہ آیت بتا رہی ہے جب رسول اللہ ﷺ گناہگاروں اور ظالموں کی سفارش کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتا ہے۔ یہ بات واضح کر رہی ہے کہ دنیا میں حضور ﷺ کی شفاعت اہلِ کبائر کے حق میں مقبول ہے۔ تو اب آخرت میں بھی وہ مقبول ہوگی کیونکہ ان دونوں میں فرق کا کوئی قائل نہیں۔

نویں دلیل: رسول اللہ ﷺ کے لئے لازماً مقام شفاعت ہے

ہم سب کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کیلئے لازماً مقام شفاعت ثابت ہے، اب اس کا فائدہ بصورت اضافہ منافع ہوگا یا بصورت ازالۂ نقصان، اول صورت باطل ہے ورنہ لازم آئے گا ہم بھی حضور ﷺ کی شفاعت کرنے والے بن جائیں۔ اس لیے کہ جب ہم کہتے ہیں "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ" تو اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے آپ ﷺ کے فضل و شرف پر اضافہ مانگتے ہیں۔ جب یہ صورت باطل ہے تو دوسری ہی ہوگی اور وہی ہمارا مطلوب و مقصود ہے۔

سوال و جواب: ہم شافع نہیں بن سکتے

اگر کوئی یہ کہے کہ حضور ﷺ کیلئے شفاعت کرنے کا اطلاق دو وجہ سے ہم پر نہیں ہو سکتا۔

پہلی وجہ: شفیع کیلئے ضروری ہے کہ وہ "مشفوع لہ" (جس کیلئے شفاعت ہے) سے رُتبہ میں اعلیٰ ہو، ہم اگرچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے خیر طلب کرتے ہیں مگر چونکہ ہمارا رتبہ آپ سے ادنیٰ ہے، لہٰذا ہم پر شافع کا اطلاق درست نہیں۔

دوسری وجہ: شیخ ابوالحسین کہتے ہیں دوسرے کیلئے منافع کا سوال اس وقت شفاعت بنتا ہے جب منافع اسی سوال کی بنا پر ہوں کہ اگر سوال نہ ہوتا تو وہ منافع بھی نہ ہوتے، یا اس سوال کی فعل میں کوئی تاثیر و فائدہ ہو اور اگر وہ فعل سراپا منافع ہے، خواہ ان کا سوال ہو یا نہ ہو اور سائل کی غرض فقط مسئول کا تقرب ہو اگرچہ مسئول لہ (جس کیلئے سوال ہے) اس سوال سے منفعت زائد کا مستحق نہ بنا ہو تو یہ اس کیلئے شفاعت نہ ہوگی، مثلاً بادشاہ نے بیٹے کو حکومت دینے کا عزم کر لیا اور بعض دوستوں نے اسے اس پر اُبھارا بھی ہو لیکن اس نے یہ عمل کرنا ہی تھا، خواہ وہ اسے کہتے یا نہ کہتے تو اس وقت ان لوگوں کا مقصد اس کے ہاں فقط تقرب ہے تاکہ انہیں اس کے ہاں مقام و مرتبہ مل جائے، اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ابن سلطان کی سفارش کی ہے، یہی ہمارا حال ہے جب ہم اللہ تعالیٰ سے حقِ رسول اللہ ﷺ میں سوال کرتے ہیں، لہٰذا ہمارا شافع ہونا ہرگز درست نہیں۔

پہلی وجہ کا جواب

ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ شفاعت میں رتبہ معتبر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ شفیع کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شفع (جفت) سے ہے اور اس مفہوم میں رتبہ کا اعتبار نہیں تو ان کا قول رتبہ والا باطل ہو جائے گا اور اس وجہ سے سوال ثانی بھی ساقط ہو جاتا ہے لیکن ہم دوسرے سوال کے جواب میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اگرچہ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو اکرام و عظمت عطا فرماتا ہے۔ خواہ امت اس کا سوال کرے یا نہ کرے لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں کہ سوالِ امت کی بنا پر آپ کے اکرام میں یوں اضافہ جائز نہیں کہ اگر امت کا سوال نہ ہوتا تو وہ اضافہ حاصل نہ ہوتا تو جب یہ احتمال جائز ہے تو اب ہمارا رسول کیلئے شافع ہونے کا اعتقاد بھی جائز ہی رہے گا اور جب یہ چیز (امت کا شافع ہونا) بالاتفاق باطل ہے تو ان کا قول بھی باطل ہو گا

دسویں دلیل: اہلِ کبائر اور ملائکہ کی دعا

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی یوں صفت بیان فرمائی ہے:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا (پ۲۴-غافر:۷)

اور وہ جو عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بولتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں، اے رب ہمارے! تیرے رحمت و علم میں ہر چیز کی سمائی ہے

صاحبِ کبیرہ اہلِ ایمان میں سے ہے، لہٰذا یہ ان لوگوں میں شامل رہے گا جن کیلئے ملائکہ مغفرت طلب کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد آیا ہے۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (پ۲۴-غافر:۷)

تو انہیں بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے

لیکن یہ عام کو خاص نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اصول فقہ میں ثابت ہے جب لفظ عام کے بعد اس کے بعض اقسام کا ذکر آئے تو وہ اس عام کو تخصیص کے ساتھ خاص نہیں بناتا۔

گیارہویں دلیل: احادیث اور شفاعت اہلِ کبائر

اہلِ کبائر کیلئے شفاعت پر احادیث شاہد ہیں، ہم یہاں تین کا ذکر کر رہے ہیں۔

پہلی حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا

شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (سنن ابوداؤد: ۴۷۳۹) میری شفاعت میری اُمت کے اہلِ کبائر کیلئے ہے

معتزلہ کے تین اعتراضات

معتزلہ اس پر تین طرح اعتراض کرتے ہیں:

پہلا اعتراض: یہ خبر واحد ہے اور قرآن کے خلاف ہے۔ ہم نے متعدد آیات نفی شفاعت پر بیان کی ہیں اور جب خبر واحد قرآن کے خلاف ہو تو اس کا رد ضروری ہے۔

دوسرا اعتراض: یہ واضح کر رہی ہے کہ شفاعت صرف اہلِ کبائر کیلئے ہی ہے اور یہ درست نہیں، اس لیے کہ شفاعت آپ کا منصب عظیم ہے۔ اسے فقط اہلِ کبائر کیلئے مخصوص کرنا اور مستحق ثواب کو محروم کرنا جائز نہیں، کیونکہ اسے کم از کم برابر ہی تصور کرلیا جائے

تیسرا اعتراض: یہ مسئلہ، مسائل فرعیہ میں سے نہیں، لہٰذا اس میں ظن اور خبر واحد پر اکتفاء جائز نہیں اور خبر واحد ظن کی مفید ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں اس روایت سے استدلال درست نہیں۔

اس میں کئی احتمالات ہیں

اور اگر ہم اس کی صحت تسلیم بھی کرلیں تو اس میں پھر بھی کئی احتمالات ہیں۔

پہلا احتمال: لفظ کبیرہ لغت اور عرف شرع میں معصیت کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ یہ طاعت کو بھی شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں فرمایا: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ، جب بات یوں ہے تو آپ کے ارشاد اہل الکبائر سے ضروری نہیں کہ مراد اہلِ معاصی کبیرہ ہوں، بلکہ ممکن ہے اہلِ طاعات کبیرہ مراد ہوں۔

اگر یہ سوال ہو کہ ہم مانتے ہیں لفظ کبیرہ طاعات و معاصی دونوں کو شامل ہے لیکن اہل الکبائر جمع اور اس پر الف لام ہے جو عموم پر دال ہے، لہٰذا یہ حدیث لازماً تمام اہل کبائر کیلئے ثبوت شفاعت پر دال ہوگی، خواہ وہ اہلِ طاعات کبیرہ ہوں یا اہلِ معاصی کبیرہ

ہم جواباً کہیں گے لفظ الکبائر اگرچہ عموم کیلئے ہے مگر لفظ ''اہل'' مفرد ہے جو عموم پر دال نہیں تو صدق خبر کیلئے اہلِ کبائر میں سے شخص واحد کا ہونا کافی ہے، تو ہم اسے اس شخص پر محمول کرلیں گے جو طاعات بجالانے والا ہے، کیونکہ تقاضا حدیث پر عمل کیلئے اس پر عمل کافی ہے۔

دوسرا احتمال: ہم مان لیتے ہیں اہل الکبائر کا اطلاق اہل معاصی کبیرہ پر ہی ہے لیکن یہ عام ہیں بعد از توبہ یا قبل از توبہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ ہم حدیث کو بعد از توبہ والوں پر محمول کرتے ہیں اور شفاعت کا یہ فائدہ ہو کہ فسق سے پہلے طاعت کے ثواب پر جو کمی آئی اس کا ازالہ ہو جائے۔

چلو ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس حدیث کی دلالت تمہارے قول کے مطابق ہی ہے مگر یہ اس کے دیگر الفاظ کے منافی ہے۔ "اَشَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ" (کیا میری شفاعت اہل کبائر کے لیے ہے؟) یہاں ہمزہ استفہام ہے جو انکار پر دال ہے امام حسن نے حضور علیہ السلام سے یوں بھی نقل کیا ہے۔

مَا ادَّخَرْتُ شَفَاعَتِیْ اِلَّا لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ میں نے اپنی شفاعت اپنی امت کے اہل کبائر کیلئے ہی محفوظ رکھی ہوئی ہے (معجم ابو یعلیٰ: ۱، ۱۹۸)

انصاف کی بات

واضح رہے! انصاف کی بات یہی ہے کہ ایسے مسئلہ پر فقط اس ایک روایت سے ہی استدلال ممکن نہیں، البتہ باب شفاعت میں جو روایات مروی ہیں ان ساری روایات کے مجموعہ سے استدلال ہونا چاہیے اور وہ تمام ان تاویلات کے ساقط و باطل ہونے پر دال ہیں۔

دوسری حدیث: دعا شفاعت کے لئے محفوظ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کیلئے ایک مقبول دعا ہے اور ہر نبی نے اس میں جلدی کی ہے۔ لیکن میں نے اپنی دعا بطور شفاعت اپنی امت کیلئے محفوظ رکھی ہوئی ہے، وہ انشاء اللہ اسے ملنے والی ہے جو میری امت میں فوت ہوا اور اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا (اسے امام مسلم نے صحیح میں نقل کیا) (مسلم: ۱۹۹)

اور اس سے استدلال یہ ہے کہ یہ روایت صریح ہے کہ آپ ﷺ کی شفاعت ہر اس امتی کو ملے گی جس نے اللہ کے ساتھ کسی شی کو شریک نہیں بنایا اور صاحبِ کبیرہ بھی شرک کرنے والا نہیں تو وہ لازمی طور پر شفاعت پائے گا۔

تیسری حدیث: محشر میں ان کی رسائی ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک دن آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں دستی کا گوشت پیش کیا گیا اور اسے آپ پسند فرمایا کرتے۔ آپ نے دانتوں کے ساتھ توڑ کر کھایا، پھر فرمایا: میں روزِ قیامت سربراہ ہوں گا تم جانتے ہو کیسے؟ عرض

کیا: یارسول اللہ! نہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو ایک مقام پر جمع فرمائے گا حتیٰ کہ وہ بلانے والے کی آواز کو سنیں گے اور آنکھیں انہیں دیکھیں گی، سورج قریب ہوگا لوگ غم و اضطراب میں بے بس ہوں گے، ایک دوسرے سے کہیں گے تم اس حالت کو دیکھ نہیں رہے، تم ان کے پاس کیوں نہیں جاتے جو رب تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کریں، پھر مشورہ ہوگا کہ تمہارے والد سیدنا آدم ہیں۔ ان کے پاس آ کر عرض کریں گے اے آدم! آپ ابوالبشر ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے دستِ اقدس سے بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا۔ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کرو۔ تم ہمارا حال دیکھ رہے ہو، ہم کس حال میں ہیں؟ حضرت آدم علیہ السلام کہیں گے میرا رب آج اس قدر غضب میں ہے، نہ اس سے پہلے کبھی اتنا غضبناک ہوا اور نہ بعد میں ہوگا، اس نے مجھے درخت سے منع فرمایا مجھ سے لغزش ہوگئی، مجھے اپنی فکر ہے کسی اور کے پاس جاؤ۔ تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں آ کر عرض کریں گے، آپ زمین والوں کی طرف پہلے رسول ہیں، آپ کو اللہ نے عبد شکور فرمایا ہے۔ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری سفارش کرو تم ہمارا حال ملاحظہ کر ہی رہے ہو؟ وہ فرمائیں گے میرا رب آج اتنا غضب میں ہے، نہ اس سے پہلے اتنا غضب میں ہوا اور نہ کبھی ہوگا، میں نے اپنی قوم کے خلاف دعا کر دی تھی تم کسی دوسرے نبی کے پاس جاؤ، تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ، تمام لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ کر عرض کریں گے، آپ اللہ تعالیٰ کے نبی خلیل ہیں، اپنے رب کے حضور ہماری سفارش کرو، ہماری حالت تم دیکھ ہی رہے ہو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے میرا رب آج اس قدر غضب میں ہے، نہ پہلے کبھی اتنا غضب میں ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ مجھے اپنے معاملات یاد آ رہے ہیں، نفسی نفسی، تم کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، تمام اہلِ محشر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر عرض کریں گے آپ اللہ کے رسول ہیں آپ کو اللہ نے رسالت اور کلام کے ذریعے باقی لوگوں سے فضیلت بخشی ہے۔ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کرو، تم ہماری حالت دیکھ ہی رہے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے، بلاشبہ میرا رب آج اس قدر غضب میں ہے کہ اس طرح نہ پہلے ہوا اور نہ بعد میں ہوگا۔ میں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا، حالانکہ حکم نہ تھا۔ نفسی نفسی! تم کسی اور کے پاس جاؤ۔ تم حضرت عیسیٰ بن مریم کے پاس جاؤ، وہ ان کے پاس آ کر عرض کریں گے آپ اللہ کے رسول اور کلمہ ہیں جو حضرت مریم کو القا ہوئے اور اس کا روح، تم نے گود میں گفتگو کی، تم ہمارا حال ملاحظہ کر رہے ہو۔ ہمارے رب کے حضور سفارش کرو۔ آپ فرمائیں گے میرا رب اس قدر غضب میں ہے کہ نہ پہلے تھا اور نہ بعد میں ایسا ہوگا، البتہ اپنی کوئی لغزش بیان نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ تم کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ تم حضور سرورِ عالم ﷺ کے پاس جاؤ۔ فرمایا پھر تم میرے پاس آؤ گے اور یوں کہو گے یا محمد! آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے تمام

معاملات پر مغفرت کی بشارت عطا فرمائی ہے۔اپنے رب کے حضور ہماری سفارش کریں،تم ہمارا حال ملاحظہ کر رہے ہو۔میں حاضر ہوکر اپنے رب سے اذن طلب کروں گا مجھے اجازت مل جائے گی جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑوں گا،وہ مجھے حالت سجدہ میں جتنا چاہے گا رہنے دے گا،پھر مجھے فرمائے گا۔

يَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ اپنا سر اٹھاؤ اور کہو مانا جائے گا،مانگو عطا کیا جائے گا،شفاعت کرو قبول کی جائے گی۔

میں اپنے رب کی حمد کروں گا ایسی محامد کے ساتھ جس کی وہ مجھے تعلیم دے گا۔پھر میں شفاعت کروں گا۔میرے لیے تعداد مقرر کی جائے گی جنہیں میں جنت میں داخل کروں گا۔پھر واپس آؤں گا۔میں اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھ کر حالتِ سجدہ میں جاؤں گا۔وہ مجھے اس حال میں جتنا چاہے گا رہنے دے گا،پھر فرمائے گا سر اٹھاؤ،کہو سنی جائے گی،مانگو عطا ہوگا،شفاعت کرو قبول کی جائے گی،پھر اپنے رب کی حمد ایسے کلمات کے ساتھ کروں گا جن کی وہ مجھے تعلیم دے گا،پھر میں شفاعت کروں گا وہ میرے لیے مقدار مقرر فرمائے گا۔میں انہیں جنت میں داخل کروں گا،پھر واپس آؤں گا میں اپنے رب کو دیکھ کر حالتِ سجدہ میں گر پڑوں گا،وہ مجھے اس حالت میں جس قدر چاہے گا رہنے دے گا،پھر فرمائے گا یا محمد! سر اقدس اٹھاؤ کہو سنا جائے گا،مانگو عطا کیا جائے گا اور شفاعت کرو قبول کی جائے گی،میں اپنے رب کی حمد کروں گا ایسی محامد کے ساتھ جن کی تعلیم وہ مجھے عطا فرمائے گا،پھر شفاعت کروں گا میرے لیے ایک مقدار مقرر کی جائے گی جنہیں میں جنت میں داخل کروں گا،پھر لوٹ کر آؤں گا اور عرض کروں گا یا رب! دوزخ میں وہی ہیں جنہیں قرآن نے روک لیا ہے۔یعنی جن کیلئے دوزخ دائمی ہے۔اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ بخاری ومسلم نے نقل کیا ہے۔

(البخاری-۳۳۴۰، مسلم-۱۹۴)

معتزلہ کے اعتراضات

معتزلہ نے اس پر اور دیگر روایات پر ان اعتراضات سے گفتگو کی ہے۔

پہلا اعتراض: یہ طویل روایات ہیں،ان میں الفاظ رسول ﷺ کا ضبط ممکن نہیں،ظاہر یہی ہے کہ راوی اپنے الفاظ میں ذکر کر دیتے ہیں۔لہٰذا اس صورت میں انہیں حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسرا اعتراض: یہ واقعہ واحد کے بارے میں ہے اور یہ زیادات اور نقصانات کے ساتھ مروی ہے اس سے بھی مذکورہ اتہام کی تائید ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض: یہ روایات تشبیہ پر مشتمل ہیں جو باطل ہے اور یہ بات بھی اتہام کو پختہ کرتی ہے۔

چوتھا اعتراض: یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہیں جس کی وجہ سے ہمارے بیان کی مزید تائید ہو جاتی ہے۔

پانچواں اعتراض: یہ ایسے عظیم واقعہ کی خبر ہے جس کی نقل کے دواعی واسباب زیادہ تھے، اگر یہ درست ہوتا تو یہ بطور تواتر منقول ہوتیں، حالانکہ ایسا نہیں جو ہماری بات کو خوب تقویت دے رہا ہے۔

چھٹا اعتراض: مسائل قطعیہ میں خبر واحد سے استدلال درست نہیں، کیونکہ یہ تو ظن کا فائدہ دیتی ہے۔

اہلسنّت کا جواب

اہلسنّت نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: یہ روایات اگرچہ احاد ہیں مگر بہت زیادہ ہیں اور تمام میں قدر مشترک یہ ہے کہ شفاعت کی وجہ سے اہلِ عذاب کو دوزخ سے نکالا جائے گا، تو اس معنی کے اعتبار سے یہ متواتر قرار پاتی ہیں، لہٰذا یہ حجت ہوں گی۔ واللہ أعلم۔

معتزلہ کے دلائل کا رد

معتزلہ کے تمام دلائل کا جواب ایک جملہ میں یوں دیا جا سکتا ہے کہ تمہارے دلائل سے شفاعت کی تمام اقسام کی نفی ہو جاتی ہے اور ہمارے دلائل سے ایسی شفاعت ثابت ہوتی ہے جو شفاعت خاصہ ہے۔ خاص اور عام کے درمیان جب تعارض ہو جائے تو خاص عام پر مقدم ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے دلائل تمہارے دلائل پر مقدم ہوں گے لیکن ہم ان کی ہر دلیل کا مستقل جواب بھی ضروری دینا چاہتے ہیں۔

پہلی دلیل کا جواب

انہوں نے وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (نفس سے شفاعت قبول نہیں کی جائے گی) سے استدلال کیا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے اعتبار خصوصی سبب کا نہیں، عموم الفاظ کا ہوتا ہے لیکن ایسے عام کی سبب خاص کے ساتھ تخصیص ادنیٰ دلیل سے ہو جاتی ہے، جب ثبوت شفاعت پر کثیر دلائل موجود ہیں تو ان کی وجہ سے یہاں تخصیص ماننا لازمی ہے۔

دوسری دلیل کا رد

ارشادِ گرامی 'مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ' سے استدلال کا جواب یہ ہے اس کی نقیض ومخالف لِلظّٰلِمِيْنَ حَمِيْمٌ وَّ شَفِيْعٌ (ظالموں کیلئے دوست اور شفیع) ہے اور یہ موجبہ کلیہ ہے، جس کی نقیض سالبہ جزئیہ آتی ہے اور صدق کیلئے سلب کا تمام صورتوں میں تحقق ضروری نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں پایا جانا کافی ہوتا ہے۔

جب یہ حقیقت ہے تو ہم کہتے ہیں بعض ظالموں کیلئے نہ دوست ہوگا اور نہ مقبول شفیع اور کفار کی یہی صورت حال ہے لیکن ہر ایک سے شفیع اور دوست کا انکار ہرگز جائز نہیں۔

تیسری دلیل کا رد

ارشادِ گرامی "مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ" سے استدلال کا جواب وہی ہے جو پہلی دلیل کا ہے۔

چوتھی دلیل کا رد

ارشادِ گرامی "وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ" سے استدلال کا جواب یہ ہے اس کی نقیض سامنے لاؤ، وہ للظالمین انصار موجبہ کلیہ ہے اور "وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ" سالبہ جزئیہ ہے، اس کا مدلول سلب عموم ہے جو عموم سلب کا مفید نہیں ہوتا۔

پانچویں دلیل کا رد

ارشادِ گرامی "فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ" سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے، اس تخصیص کی بنا پر نشاندہی کر رہی ہے کہ اہلِ ایمان کے حق میں حکم اس کے برعکس ہی ہوگا یعنی انہیں شفاعت نفع دے گی۔

چھٹی دلیل کا رد

ارشادِ گرامی "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى" اس پر تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

ساتویں دلیل کا رد

اہلِ اسلام کی دعا "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ اَهْلِ شَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک شفاعت کا فائدہ امر مطلوب کا حصول ہے اور وہ استحقاق ہے، زائد منافع کے حصول اور معاصی پر استحقاق نقصان کے دفع کے درمیان قدر مشترک ہے اور یہ قدر مشترک اس پر موقوف نہیں کہ آدمی عاصی ہی ہو، لہٰذا اعتراض از خود ختم ہوگیا۔

آٹھویں دلیل کا رد

ارشادِ مبارک "وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ" سے استدلال کا جواب مسئلہ وعید میں انشاء اللہ آرہا ہے۔

نویں دلیل کا رد

ان کا یہ کہنا کہ ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جو واضح کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کبائر کی شفاعت کی اجازت دی ہے۔ غلط و ممنوع ہے۔ ہم نے سابقہ گفتگو میں اس پر کسی قدر دلائل فراہم کر دیئے ہیں۔

دسویں دلیل کا رد

ملائکہ کے بارے میں تھا "فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا"، ہم نے پہلے بیان کر دیا تھا کہ آیت کے آخری حصہ کا خصوص۔ اول حصہ کے عموم کے مانع نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے جو احادیث بطور استدلال ذکر کی ہیں ان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کچھ لوگوں کی یا بعض مواقع پر قیامت میں شفاعت نہیں فرمائیں گے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اہلِ کبائر میں سے کسی کی شفاعت نہیں کریں گے اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ تمام مواقع پر شفاعت نہیں کریں گے۔

تفصیلی گفتگو سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوگی۔ ممکن ہے بعض مقامات اور بعض اوقات میں آپ ﷺ کو اذن نہ ہو لیکن دوسرے مقامات پر آپ کو اذن شفاعت حاصل ہو۔ واللہ أعلم

فلاسفہ اور شفاعت

شفاعت کے بارے میں فلاسفہ کی رائے یہ ہے کہ ذات واجب الوجود کا فیض عام اور جود تام اس قدر ہے کہ وہ حاصل ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس قدر استعداد کسی میں کہاں؟ البتہ یہ ظاہر ہے کہ وہ فیض اسی شی سے حاصل کیا جائے جس نے واجب سے حاصل کیا ہو تو وہ شی اب واجب اور شی اول کے درمیان واسطہ بن جائے گی اس کی محسوس مثال کا بیان یوں ہے۔

سورج اپنے مدِ مقابل کو ہی روشن کرتا ہے، گھر کا اندرونی چھت اس کے مقابل نہیں۔ لہٰذا اس میں شمس سے قبول نور کی استعداد نہیں، ہاں صاف پانی سے بھر کر طشت رکھ دی جائے اور اس میں سورج کی روشنی پڑے تو اس کا عکس چھت تک جاسکتا ہے۔ تو اب صاف پانی سورج کے نور اور چھت کے درمیان رابطہ بن گیا، ارواح انبیاء کرام علیہم السلام، ارواح عامہ تک فیض واجب پہنچانے کیلئے واجب اور ارواح خلق کے درمیان واسطہ ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے اصولوں کے مطابق شفاعت کے بارے میں رائے دی ہے

بنی اسرائیل پر انعامات کی تفصیل

[۴۹] وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

(اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر بُرا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی)

پہلے انعام کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جب اجمالاً نعمتوں کا ذکر کیا تو اس کے بعد ان کی اقسام کا ذکر تفصیلاً کر دیا تا کہ تذکیر و نعمت میں مبالغہ اور حجت میں عظمت پیدا ہو گویا فرمایا میری نعمتوں کو یاد کرو، یاد کرو جب ہم نے تمہیں نجات دی، یاد کرو جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا یہ تمام انعامات ہیں اس آیت مبارکہ میں پہلے انعام کا ذکر ہے۔

و اذ نجینا کم کو انجینا کم اور نجینکم بھی پڑھا گیا۔

شیخ قفال کہتے ہیں انجاء اور تنجیہ کا معنی خلاصی پانا ہے اور شی کا دوسری شی سے جدا ہونا کہ متصل نہ ہوں ''نجی، انجی'' دونوں لغتیں ہیں بلند جگہ کو ''نجوہ'' کہتے ہیں اس لیے کہ وہاں چڑھ جانے والا نجات پاتا ہے اور اس لیے بھی کہ بلند مقام پست سے ممتاز ہوتا ہے گویا وہ اس سے خلاصی پا لیتا ہے۔

لفظ آل کی تحقیق

صاحب کشاف لکھتے ہیں۔ آل کی اصل اہل ہے کیونکہ اس کی تصیغر اُھَیْل ہے ھا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔ اس کا استعمال صاحب عزت و شان میں ہوتا ہے مثلاً ملوک وغیرہ، آل حجام اور آل سکاف نہیں کہا جاتا۔

شیخ عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اہل، ال سے عام ہے مثلاً اہل کوفہ، اہل بلاد اور اہل علم کہا جاتا ہے مگر ال کوفہ، آل علم اور ال بلد نہیں کہا جاتا۔

گویا بات یوں ہے اہل، کسی شی کے خواص باعتبار تغلیب کے اور آل کسی آدمی کے باعتبار قرابت اور صحبت کے خواص ہوتے ہیں۔

ابو عبیدہ سے ہے کہ میں نے فصیح عرب کو کہتے ہوئے سنا، اَھْلُ مَكَّةَ اٰلُ اللهِ۔ (مکہ والے آل اللہ ہیں)

لفظ فرعون کا مفہوم

فرعون، عمالقہ میں سے ہر بادشاہ مصر کا علم ہے جیسے روم کے بادشاہ کو قیصر، ملک فارس کے بادشاہ کو کسریٰ، ملک یمن کے بادشاہ کو تبع اور ترکوں کے بادشاہ کو خاقان کہا جاتا ہے۔

فرعون میں دو طرح کا اختلاف ہے۔

۱۔ اس کے نام میں اختلاف ہے۔ابن جریج نے بعض سے مصعب بن ریان اور ابن اسحاق نے ولید بن مصعب نقل کیا ہے فراعنہ میں سے اس سے بڑھ کر ظالم اور سخت دل والا کوئی نہ تھا، وھب بن منبہ نے کہا اہل کتاب کہتے ہیں فرعون کا نام قابوس اور قوم قبط سے تھا۔

۲۔ ابن وھب کہتے ہیں فرعونِ یوسف علیہ السلام فرعونِ موسیٰ علیہ السلام ہی تھا لیکن یہ درست نہیں کیونکہ مصر میں دخول یوسف علیہ السلام اور دخول موسیٰ علیہ السلام کے درمیان چار صدیوں کا عرصہ ہے، محمد ابن اسحاق کا کہنا ہے یہ فرعونِ یوسف کے علاوہ ہے۔اسی کا نام ریان بن ولید تھا۔

آل فرعون سے قوم فرعون کے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعونیوں سے نجات دے کر فضیلت عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک فرمادیا۔ارشاد گرامی "یَسُوْمُوْنَکُمْ" یہ سامہ خسفًا سے ہے یعنی ظالم کا والی بننا، عمرو بن کلثوم نے کہا:

اذا ما الملك سام الناس خسفًا أبينا أن نقر الخسف فينا

(جب بادشاہ لوگوں کا ظلمًا والی بنا تو ہم نے اس کی بادشاہی کا انکار کر دیا)

اس کا اصل 'سام السلعة' ہے جس میں طلب معنی ہے۔گویا کہا یہ تمہارے لئے برا عذاب تلاش کرتے اور تمہارا ارادہ کرتے، سُوء بمعنی سی، ساء کا مصدر ہے۔کہا جاتا ہے میں سوء خلق اور سوء فعل سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔مراد دونوں کا قبیح ہونا ہے۔سوء العذاب اور عذاب سے اس کا اشد اور قبیح ہونا ہے۔

سُوءِ عذاب سے کیا مراد ہے؟

مفسرین کا اختلاف ہے امام محمد بن اسحاق کہتے ہیں ان کو انہوں نے اپنا خادم بنا رکھا تھا۔بعض سے تعمیر کا کام لیتے بعض ان کی کھیتی باڑی کرتے، بعض پودے وغیرہ لگاتے اور جوان میں کام نہ کرتے وہ جزیہ ادا کرتے، امام سدی کہتے ہیں انہیں سخت اور گندے کاموں میں لگاتے مثلاً کیچڑ بنانا، پہاڑ کھودنا۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا:

اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (پ۹-الاعراف:۱۲۹)

جتنا ہم ستائے گئے آپ کے آنے سے پہلے اور آپ کے تشریف لانے کے بعد

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (پ۱۹-الشعراء:۲۲)

اور یہ کوئی نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتاتا ہے کہ تو نے غلام بنا کر رکھے بنی اسرائیل

کسی انسان کا دوسرے کے اسی طرح ماتحت ہونا کہ جس طرح چاہے اس پر حکم چلائے خصوصاً جب اسے وہ سخت مشکل اور گندے کاموں میں استعمال کرے تو یہ بھی سخت عذاب کی قسم ہے حتیٰ کہ اس حالت میں انسان موت کی تمنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم نعمت کا ذکر کر کے فرمایا ہم نے ان سے تمہیں نجات دی۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا جو اس سے بھی اعظم ہے "يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ" وہ اولاد میں سے بچوں کو قتل کر دیتے اور بچیوں کو چھوڑ دیتے۔

یہاں چند مباحث ہیں۔

پہلی بحث: بچوں کا قتل نہ کہ لڑکیوں کا

بچوں کو قتل کرنا نہ کہ لڑکیوں کو اس میں کئی طرح نقصان ہے۔

۱۔ لڑکوں کا قتل مردوں کو فنا کرنا ہے اور یہ انقطاع نسل ہے کیونکہ جب خواتین ہی ہوں گی تو ان کا اس حوالے سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس عمل سے آخر کار مرد و خواتین دونوں ختم ہو جائیں گے۔

۲۔ مردوں کا ختم ہو جانا خواتین کی معیشت و زندگی کو تباہ کرنا ہے۔ جب ذمہ دار مرد نہ رہیں گے تو وہ موت کی تمنا کرے گی کیونکہ بعض اوقات اس کی تنہائی سے زندگی کمزور ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ مشقت میں پڑ جاتی ہے پھر اس سے نجات حاصل کرنا ہی اس کا مقصد رہ جاتا ہے۔

۳۔ حمل طویل کی مشقتیں اور قوی امیدوں کے بعد بچے کا قتل سخت عذاب ہے۔

۴۔ والدین کو لڑکے، لڑکیوں سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے لوگ بچیوں کو بوجھ محسوس کرتے ہیں اگرچہ لڑکے زیادہ ہوں، ارشاد مبارک ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (پ ۱۴-النحل: ۵۸)
اور جب ان میں کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصہ کھاتا ہے

اس لیے عربوں کو بچی کے قتل سے منع فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (پ ۱۵-الاسراء: ۳۱)
اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مفلسی کے ڈر سے ہم انہیں بھی روزی دیں گے اور تمہیں بھی بیشک ان کا قتل بڑی خطا ہے

اور یہ لوگ لڑکیوں کو قتل کرتے نہ کہ لڑکوں کو۔

۵۔ خواتین کا مردوں کے بغیر باقی رہنے کا معنی یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے فراش بنیں گیں اور اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی کیا ہو سکتی ہے۔

دوسری بحث: حرف عطف واؤ کا نہ ہونا

اس سورت میں ''یُذَبِّحُوْنَ'' بغیر واؤ اور سورۂ ابراہیم میں واؤ کے ساتھ ہے وجہ یہ ہے اگر ''یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ'' کی تفسیر اسے بنائے جائے تو پھر واؤ کی ضرورت نہیں اور اگر اس کی تفسیر ذبح کے علاوہ باقی اشیاء کو بنایا جائے اور ذبح کو الگ کر دیا جائے تو پھر واؤ لانا ہوگا، دونوں مقامات پر دونوں احتمال موجود ہیں ہاں سورۂ ابراہیم میں حرف عطف لانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (پ ۱۳-ابراہیم: ۵)
اور بیشک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے میں لا اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا بیشک اس میں نشانیاں ہیں ہر بڑے صبر والے شکر گزار کیلئے

ایام اللہ کی تذکیر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کیے بغیر نہیں ہو سکتی لہٰذا ضروری تھا یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کو الگ اور یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ، کو الگ عذاب کی نوع و قسم بنایا جائے تاکہ دونوں سے خلاصی مستقل نعمت قرار پائے اس لیے یہاں حرف عطف لایا گیا رہا معاملہ زیر بحث آیت کا تو یہاں جنس نعمت کا تذکرہ مقصود ہے۔

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
یاد کرو میری نعمت جو میں نے تم پر کی

(پ ۱-البقرۃ: ۴۰، ۴۷، ۱۲۲)

خواہ سوءعذاب ذبح ہو یا اس کے علاوہ، ہم جنس نعمت کا تذکرہ ہے لہٰذا دونوں مقامات میں فرق ظاہر ہو گیا۔

تیسری بحث: مراد بچے ہیں

بعض نے فرمایا "یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ" سے مراد مرد ہیں نہ کہ بچے کیونکہ نساء کے مقابل ہیں اور وہ بالغہ عورتیں ہوتی ہیں اسی طرح ابناء سے مراد بھی بالغ مرد ہیں۔ انہوں نے فرمایا: فرعون ایسے مردوں کو قتل کا حکم دے دیتا جن کے خروج کا خطرہ ہوتا یا ان کے اجتماع سے اس کی حکومت کو خطرہ لاحق ہوتا۔

لیکن اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں مراد بچے ہیں نہ کہ بالغ مرد۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ تفسیر بہتر ہے:

۱۔ اس صورت میں ابناء کا اطلاق اپنے ظاہر پر ہی رہے گا

۲۔ اتنے کثیر مردوں کے ہوتے ہوئے تمام کا قتل دشوار و متعذر رہے۔

۳۔ مشقت اور مختلف کام کرنے میں وہ ان کے محتاج بھی تھے۔

۴۔ اگر بالغ مراد ہوتے تو بچپن میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو تابوت سمندر میں ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

رہا معاملہ مقابلہ لفظ نساء کا جس کی وجہ سے یہاں رجال مراد لے رہے ہیں۔

اس کے دو جواب ہیں:

دو جواب

۱۔ ابناء جب حالت بچپن میں قتل ہو گئے تو وہ مرد نہ بن سکے لہٰذا ان پر رجال کا لفظ نہیں بولا جا سکتا باقی بچیوں کو جب قتل نہ کیا جاتا اور وہ خواتین کی عمر کو پہنچتیں تو ان پر نساء کا اطلاق درست ہے۔

۲۔ بعض نے کہا "وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ" کا معنی یہ ہے کہ وہ عورت کی شرمگاہ کی تحقیق کرتے کیا اسے حمل ہے یا نہیں؟ لیکن یہ باطل ہے۔ جو کچھ ان کے شکم میں تھا جب آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا تو وہ تفتیش سے کیسے جان لیں گے اور نہ ہی وہ ہاتھ سے اسے خارج کر سکتے ہیں۔

چوتھی بحث: ابناء کا قتل کیوں؟

ابناء (بچوں) کو کیوں قتل کرتے اس کی یہ وجوہات بیان ہوئی ہیں۔

پہلی وجہ: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے فرعون اور اس کے حواریوں کو یہ بات پہنچی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم

علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ان کی اولاد میں انبیاء اور ملوک پیدا فرمائے گا انہیں اس کا خوف لاحق ہوا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کچھ ایسے لوگ ہوں جن کے پاس چھری ہو اور وہ بنی اسرائیل کا جائزہ لیتے رہیں جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوا سے وہ ذبح کر دیں جب انہوں نے دیکھا کہ بڑے مر رہے ہیں اور چھوٹے ذبح ہو رہے ہیں تو وہ ان کے ختم ہونے سے اس لیے ڈرے کہ ہمارے کام کون کرے گا؟ تو پھر ایک سال قتل کرتے اور ایک سال چھوڑ دیتے۔

دوسری وجہ: امام سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں فرعون نے خواب میں آگ دیکھی جو بیت المقدس کی طرف سے آئی اور اس نے مصر کے تمام گھروں کا احاطہ کرلیا اس نے قبطیوں کو جلایا اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیا۔ فرعون نے کاہن بلا کر پوچھا تو انہوں نے کہا: بیت المقدس سے ایسا آدمی آئے گا جو قبطیوں کو ختم کر دے گا۔

تیسری وجہ: نجومیوں نے فرعون کو اس بارے میں بتایا بلکہ انہوں نے سال کا تعین بھی کیا اس لیے اسی سال بچوں کو قتل کروایا گیا

لیکن اقرب پہلا قول ہے۔ کیونکہ علم رؤیا اور علم نجوم سے اس قدر مفصل معاملہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ مجمل حاصل ہوتا ہے ورنہ غیبی خبروں کے معجز ہونے پر اعتراض ہو جائے گا (کیونکہ ان سے امر مفصل حاصل ہوتا ہے) اور عاقل کے شایاں شاں یہی ہے کہ اس امر مجمل کی بنا پر اتنا بڑا اقدام نہیں اٹھا سکتا۔

سوال: فرعون، اللہ کا منکر ہے تو اب وہ رسولوں کا بطریق اولیٰ منکر ہوگا تو ان کا منکر ہوتے ہوئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اطلاع کی بنیاد پر اس نے اتنا بڑا اقدم کیوں اٹھالیا؟

جواب: ممکن ہے فرعون، اللہ کے بارے میں جانتا ہو اور انبیاء کو سچا جانتا ہو وہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کافر ہو یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں متحیر اور تشکیک کا شکار تھا تو ممکن ہے وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سچا جانتا ہو تو اس نے احتیاطاً یہ قدم اٹھایا ہو

پانچویں بحث: تذکرہ نعمتوں کے فوائد

ان نعمتوں کے تذکرہ میں کئی طرح سے فائدہ ہے۔

۱۔ جن اشیاء کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان میں سب سے بڑی یہ چیز ہے کہ وہ لوگ بادشاہوں اور ظالموں کے پنجے میں پس رہے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے چھٹکارا عطا فرمایا اور یہ بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جو انہیں ہلاک کرنا چاہتے تھے انہیں اللہ نے ہلاک فرما دیا جو انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل ورسوا فرما دیا تو اس کے اعظم نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور نعمت کی عظمت انسان میں اتباع اطاعت کا موجب بنتی ہے اور وہ مخالفت و معاندت کو نہایت ہی قبیح بتاتی ہے

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت عظیمہ کا ذکر فرمایا تا کہ ان پر حجت تمام اور ان کا عذر ختم ہو جائے۔

۲۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ہم نہایت ہی ذلت میں تھے اور ان کا دشمن نہایت عزت میں البتہ یہ حق پر اور دشمن باطل پر تھے ضروری تھا حق والوں کی ذلت اور باطل والوں کی عزت ختم کردی جائے تو گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے اے مخالفوں حضور ﷺ کے فی الحال ظاہری فقر اور قلت معاونین پر دھوکہ نہ کھاؤ اس لیے کہ آپ حق پر ہیں اور ضروری ہے عزت آپ کی طرف اور ذلت آپ کے دشمن کی طرف جائے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ ملک اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے عطا فرمائے، انسان عزت دنیوی کی وجہ سے غرور نہ کرے بلکہ طلب عزت اُخروی کیلئے سعی کرے۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ کی تفسیر

شیخ قفال کہتے ہیں: یہ ابتلاء سے ہے جس کا مفہوم آزمائش وامتحان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (پ۱۷-الانبیاء:۳۵)

اور ہم تمہاری آزمائش کرتے ہیں برائی اور بھلائی سے جانچنے کو اور ہماری ہی طرف تمہیں لوٹ کر آنا ہے

دوسرے مقام پر فرمایا

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (پ۹-الاعراف:۱۶۸)

اور ہم نے انہیں بھلائیوں اور برائیوں سے آزمایا کہ کہیں وہ رجوع لائیں

بلویٰ دو طرح کا ہے نعمت کو بھی بلاء اور مشقت شدیدہ کو بلاء کہا جاتا ہے اکثر طور پر خیر میں ابلاء اور شر میں بلاء کا استعمال ہوتا ہے البتہ ایک دوسرے کی جگہ بھی آتے رہتے ہیں۔ زہیر نے کہا:

جزى الله بالاحسان ما فعلا بكم و أبلاهما خير البلاء الذى يبلو

(اللہ تعالیٰ احسان کے ساتھ بدلہ دے جو تمہارے ساتھ ہوا ہے اور بلا تمہارے لیے خیر کا سبب بنے)

جب یہ جان لیا یہاں بلاء مشقت ہے اگر "ذٰلکم" سے فرعون کے ظلم وستم کی طرف اشارہ ہے اور اگر اس سے انجار کی طرف اشارہ ہو تو پھر نعمت مراد ہے اور نعمت پر محمول کرنا اولیٰ ہے کیونکہ اس کا صدور رب تعالیٰ سے ہے اور اس لیے بھی کہ یہ قوم یہود پر حجت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلاف پر یہ انعام فرمایا تھا

[۵۰] وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۰﴾

(اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبودیا)

دوسرے انعام کا تذکرہ

یہ دوسری نعمت ہے۔ "فَرَقْنَا" یعنی ہم نے پانی میں جدائی پیدا فرمادی تا کہ تمہارے لیے راستے بن جائیں، اسے مشدد بھی پڑھا گیا بمعنیٰ "فَصَّلْنَا" جس طرح دو چیزوں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح متعدد اشیاء کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ راستے ان کے قبائل کے مطابق بارہ تھے۔

سوال: بِكُمُ کا کیا معنی ہے؟

جواب: اس کے دو معانی ہوسکتے ہیں۔

پہلا معنی: جب وہ چلتے تو ان کے چلتے وقت پانی متفرق وجدا ہو جاتا گویا جس طرح کسی واسطہ کے ذریعے شی دو حصوں میں بٹ جاتی ہے ایسے ہی ان کے چلنے سے پانی ہٹ گیا۔

دوسرا معنی: تمہیں نجات دینے کے سبب پانی متفرق ہوگیا۔

چند مباحث

یہاں یہ مباحث ہیں:

پہلی بحث: بنی اسرائیل کی نجات کی تفصیل

منقول ہے جب یہ واضح ہوگیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کا فیصلہ فرمالیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا ان سے زیورات مانگ لو اس میں دو حکمتیں ہیں۔

پہلی حکمت: تا کہ حصولِ مال کیلئے ان کا پیچھا کرتے ہوئے نکلیں۔

دوسری حکمت: تا کہ ان کے اموال ان کے پاس رہیں۔

پھر جبریل علیہ السلام نے شام کو آ کر کہا: آج رات تم انہیں لے کر نکل جاؤ یہ حکم یوں بیان ہوا:

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ (پ ۱۶۔ طہ: ۷۷) اور بیشک ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے چل

ان کی تعداد چھ لاکھ تھی، بارہ قبائل تھے اور ہر ایک کی تعداد پچاس ہزار تھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر نکل گئے فرعون کو اطلاع ملی اس نے کہا مرغ بانگ تک ان کا پیچھا نہ کرو، راوی کا کہنا ہے، اللہ کی قسم اسی رات کسی مرغ نے اذان ہی نہ دی جب صبح ہوئی تو فرعون نے بکری ذبح کی اور کہا: میرے اس بکری کا جگر تناول کرنے سے پہلے چھ لاکھ قبطی جمع ہو جاؤ۔ حضرت قتادہ سے منقول ہے لاکھ دو لاکھ آدمی جمع ہوئے گھوڑوں پر سوار ہو کر انہوں نے پیچھا کیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ (پ ۱۹۔ الشعراء: ۶۰) تو فرعونیوں نے ان کا تعاقب کیا دن نکلے

یعنی طلوع شمس کے بعد۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (پ ۱۹۔ الشعراء: ۶۱) پھر جب آمنا سامنا ہوا دونوں گروہوں کا موسیٰ والوں نے کہا ہم کو انہوں نے آلیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (پ ۱۹۔ الشعراء: ۶۲) یوں نہیں بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے اب راہ دیتا ہے

جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو حضرت یوشع بن نون نے پوچھا: آپ کے رب کا حکم کیا ہے؟ سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: سامنے کی طرف۔ انہوں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور چلے یہاں تک کہ گہرائی تک پہنچے تو گھوڑا تیرنے لگا واپس آئے پوچھا: موسیٰ رب تعالیٰ نے کہاں کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: سمندر کا اور واللہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ تین دفعہ ایسے ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (پ ۱۹۔ الشعراء: ۶۳) دریا پر اپنا عصا مارو تو دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا

سمندر نے بارہ راستے بنا دیے۔ فرمایا: داخل ہو جاؤ وہاں کیچڑ تھا ہوا چلی خشک ہو گیا اور خشک راستے بن گئے جیسا کہ فرمایا:

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (پ۱۶۔ طہ:۷۷) اور ان کیلئے دریا میں سوکھا راستہ نکال دے

پھر قبیلہ نے راستہ لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے۔ آپ نے عصا مارا راستوں کے درمیان روشن دان بن گئے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ فرعون آ پہنچا جب کنارے پر آیا ابلیس نے داخلہ سے منع کیا۔ اس نے نہ داخل ہونے کا ابھی ارادہ کیا تھا حضرت جبریل گھوڑی پر آئے فرعون کا گھوڑا اس کے پیچھے سمندر میں داخل ہو گیا، فرعون کے اندر داخل ہوتے ہی حضرت میکائیل نے آواز دی، اول سے لے کر آخر تک سب کو داخل کر دو جب تمام کے تمام داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا کہ اسے غرق کر دے۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور ہم نے غرق کیا قوم فرعون کو اور تم دیکھ رہے تھے

منقول ہے یہ عاشوراء (دس محرم الحرام) کا دن تھا سیدنا موسیٰ علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس دن روزہ رکھا کرتے

دوسری بحث: دینی و دنیاوی انعامات

یہ واقعہ بہت سی دینی و دنیاوی نعمتوں پر مشتمل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں دنیاوی نعمتوں کا سبب کسی طرح سے ہے

پہلی نعمت: جب وہ اس تنگی میں تھے کہ پیچھے فرعون اور اس کا لشکر اور سامنے سمندر تھا اگر وہ رکتے ہیں تو دشمن پکڑ کر ہلاک کر دیتا اور اگر چلتے ہیں تو غرق ہو جاتے ہیں اس سے بڑھ کر خوف کیا ہو سکتا ہے تو ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے سمندر پھاڑ کر نجات عطا فرمائی اس سے بڑھ کر رہائی و خوشی کیا ہوگی؟

دوسری نعمت: اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نعمتِ عظیمہ اور معجزہ کاملہ سے نوازا تاکہ پتہ چلے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کیا مقام ہے۔

تیسری نعمت: انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ہلاک کر دیا، ایسی حالت سے چھٹکارا پانا اعظم نعمت ہے اور اس وقت کیا عالم ہوگا جب اس کے ساتھ اکرام عظیم حاصل ہو اور دشمن بھی ہلاک کر دیا جائے۔

چوتھی نعمت: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی زمین، دیار، نعمتوں اور اموال کا مالک بنا دیا

پانچویں نعمت: اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر کے بنی اسرائیل کو ان سے نجات دی اور یہ نعمت عظیمہ ہے کیونکہ یہ ان سے کمزور و خائف تھے اگر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو اس ورطہ سے نجات دیتا مگر فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک نہ فرماتا تو خطرہ باقی رہتا کہ وہ جمع ہو کر کسی بھی طریقہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو ایذا دیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر کے مکمل طور پر خوف کو جڑ سے نکال دیا۔

چھٹی نعمت: یہ ان کا غرق بنی اسرائیل کے سامنے ہوا۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (تم دیکھ رہے تھے) سے یہی مراد ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں نعمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہ کئی طرح سے دینی نعمتوں کا بھی سبب ہے۔

پہلی نعمت: جب قوم موسیٰ نے اپنی آنکھوں سے یہ عظیم معجزہ دیکھا تو ان کے دلوں سے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو گیا کیونکہ ایسے کامل معجزہ کی وجود صانع حکیم اور صدق موسیٰ پر بدیہی دلالت ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ان سے نظر دقیق اور استدلال شاقہ کا بوجھ اٹھالیا

دوسری نعمت: جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تو یہ چیز ان کیلئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق اور ان کی اتباع کی طرف داعی بنی اور قوم فرعون کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کے ترک اور فرعون کی تکذیب کے بھی داعی بن گئی۔

تیسری نعمت: انہوں نے اس حقیقت کو پالیا تمام اُمور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اس لیے کہ جو عزت فرعون کو حاصل تھی اس سے بڑھ کر دنیا میں عزت کہاں اور بنی اسرائیل پر جو سختی تھی اس سے بڑھ کر ذلت کہاں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک لحظہ میں عزیز کو ذلیل اور ذلیل کو عزیز بنادیا اور یہ چیز دل کے علائق دنیا سے انقطاع اور کامل طور پر خدمت خالق کی طرف توجہ اور تمام اُمور میں اس پر توکل کا موجب ہے۔

اُمتِ محمدیہ پر انعامات

اس واقعہ سے امتِ محمدیہ کو جو انعامات حاصل ہوئے وہ بھی کثیر ہیں۔

پہلا انعام: یہ حضور علیہ السلام کیلئے اہلِ کتاب پر حجت ہے انہیں آپ کا حال معلوم تھا کہ آپ نے نہ کسی سے پڑھا اور نہ لکھا اور نہ ہی اہلِ کتاب سے نشست و برخاست ہوئی جب آپ ﷺ نے ان کی خبریں تفصیل کے ساتھ بیان کیں جو مطالعہ کتب کے بغیر نہیں دی جاسکتیں تو انہیں علم ہوا کہ یہ وحی کے ذریعے ہی خبر دیتے ہیں اور سچے ہیں تو یہ یہود پر آپ ﷺ کی طرف سے حجت اور ہمارے لیے آپ ﷺ کی تصدیق پر حجت ہوگی۔

دوسرا انعام: جو کچھ ان کے بارے میں ہوا جب ہم ان امورِ عظیمہ کا تصور کرتے ہیں تو متعین ہو جاتا ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے گا وہ دنیا وآخرت میں بدبخت ٹھہرے گا اور جس نے اس کی اطاعت کی وہ دنیا وآخرت میں سعید ٹھہرا تو اس چیز نے ہمیں طاعت میں شوق اور معصیت سے نفرت دلائی۔

تیسرا انعام: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت نے باوجود ان معجزات ظاہرہ اور براہین کاملہ کے اپنے نبی کی کئی اُمور میں مخالفت کی حتی کہ کہا اِجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ (پ۹-الاعراف:۱۳۸) ہمیں ایک خدا بنادے جیسے ان کیلئے اتنے خدا ہیں

فضل قدیر

رہی اُمت محمدیہ ﷺ ان کے ہاں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جس کا اعجاز دلائل دقیقہ سے ہی معلوم ہوتا ہے مگر اس نے آپ کی اطاعت کی اور کسی معاملہ میں بھی اختلاف نہ کیا۔ یہ چیز واضح کر دیتی ہے کہ امت محمدیہ ﷺ امت موسوی سے افضل ہے

ابھی یہاں دو سوالات باقی ہیں:

پہلا سوال: ''سمندر کا پھٹ جانا'' اس کی دلالت وجودِ صانع قادر پر اور صدقِ موسیٰ علیہ السلام پر بدیہی کی طرح ہے اور یہ بات زمانہ تکلیف میں کیسے جائز ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک تو اس کا جواب ظاہر ہے ہاں معتزلہ میں سے کعبی نے جواب کلی یوں دیا کہ مکلفین میں کچھ لوگ ذہانت، فطانت اور ذکاوت سے دور بلکہ وہ بلید ہوتے ہیں، بنی اسرائیل میں اکثر لوگ یوں ہی تھے لہٰذا معجزات کے مشاہدہ کی ضرورت تھی مثلاً سمندر کا پھٹ جانا، کوہِ طور کا بلند ہونا، مردوں کا زندہ ہونا کیا تم نے یہ نہیں دیکھا جب وہ ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو بتوں کی پوجا کر رہی تھی تو انہوں نے کہا تھا:

یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ اے موسیٰ ہمیں ایک خدا بنا دے جیسے ان کے لیے اتنے خدا ہیں (پ۹۔الاعراف:۱۳۸)

رہے عرب تو ان کا حال اس کے مخالف ہے کیونکہ یہ عقلمندی میں کمال پر تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے دلائل دقیقہ اور معجزات لطیفہ پہ ہی اکتفاء فرمایا۔

دوسرا سوال: فرعون عاقل تھا جب اس نے سمندر پھٹا ہوا دیکھا تو یہ تو جان لیا ہوگا کہ یہ میرا عمل و دخل نہیں بلکہ یہ اس قادر عالم کا فعل ہے جو باقی قادرین سے الگ ہے تو وہ کفر پر کیسے قائم رہا؟ اگر آپ کہیں وہ رب کے بارے میں پہلے ہی جانتا تھا مگر وہ عناد اور ضد کی وجہ سے کافر تھا، ہم کہیں گے جب وہ دل سے جانتا تھا تو اس نے اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں کیوں ڈال لیا اور وہ سمندر میں داخل ہو گیا باوجودیکہ وہ اس وقت وجودِ صانع اور صدقِ موسیٰ علیہ السلام کے علم کے بارے میں مجبور کی طرح تھا۔

جواب: یہ ہے شی کی محبت جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے تو اسے جاہ و منصب کی محبت اور تلبیس نے اس ہلاکت میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا۔

وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ کے متعدد معانی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ''وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ'' اس کی متعدد تفاسیر ہیں۔

پہلی تفسیر: تم نے اپنی آنکھوں سے امواج سمندر کو فرعون اور اس کے لشکر کو نگلتے ہوئے دیکھا۔

دوسری تفسیر: قوم موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے کہا: اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے حال سے آگاہ فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب کریم سے عرض کیا تو سمندر نے لاکھوں لوگوں کو فرعون کے ساتھ باہر پھینک دیا۔ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا: ان کے کفر کی بدبختی کی وجہ سے ان میں سے کسی کو بھی سمندر نے قبول نہ کیا۔ ارشاد فرمایا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (پ۱۱-یونس:۹۲) آج ہم تیری لاش کو اتار دیں گے کہ تو اپنے پچھلوں کیلئے نشانی ہو

یعنی ہم نے سمندر کی تنگی سے کھلی فضا میں نکال دیا تا کہ لوگ تمہیں دیکھ سکیں اور تم ان کیلئے مقامِ عبرت بن جاؤ۔

تیسری تفسیر: تم ان کے قریب ہو تم ان کی طرف متوجہ اور ان کے مقابل ہو اگر چہ آنکھوں سے انہیں دیکھ نہیں رہے۔ شیخ فراء کہتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم تجھے مار رہے ہیں تمہارے اہل دیکھ رہے ہیں مگر وہ تمہاری مدد نہیں کر رہے یہ اسی وقت کہا جاتا ہے جب اہل قریب ہوں اگر چہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں تو مراد اس کا معلوم ہونا ہے۔

[۵۱-۵۲] وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۲﴾

(اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم ہو پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی کہ کہیں تم شکر کرو)

تیسرا انعام

شیخ ابوعمرو اور یعقوب نے اس سورت اور اعراف و طٰہٰ میں بغیر الف کے "وعدنا" اور باقی قراء نے تین مقامات پر الف کے ساتھ "واعدنا" پڑھا ہے۔ الف کے بغیر کی وجہ ظاہر ہے کہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن مواعدہ باب مفاعلہ ہے لہٰذا وہاں دو کا ہونا ضروری ہے اگر الف ہو تو یہ صورتیں ہیں:

۱۔ وعدہ اگر چہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے مگر قبولیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہو گی اور قبول وعدہ بھی وعدہ کے مشابہ ہے اس لیے کہ قبول کرنے والے کیلئے یہ کہنا ضروری ہوتا ہے کہ میں یہ کروں گا۔

۲۔ شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ بھی بعید نہیں کہ آدمی اللہ سے وعدہ کرے اور معنی ہو گا بندے نے اللہ سے عہد کیا۔

۳۔ چونکہ دو کے درمیان ہے لہٰذا "واعدنا" فرمایا۔

۴۔ اور یہ اقویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کا وعدہ فرمایا کہ فلاں وقت کوہِ طور پر وحی کیلئے آؤ۔

لفظِ موسیٰ کی تحقیق

اس میں کئی وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: فُعْلٰی کا وزن میم اصلی ہے "مـاس یـمـیـس" سے مشتق ہے۔ چلنے میں اکڑنہیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی چال مبارک ایسی ہی تھی

دوسری وجہ: یہ وزن مفعل میم زائدہ پر" اوسیت الشجرۃ " سے ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب درخت سے پتے جھاڑ دیے جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سراقدس کے بال نہ تھے اس وجہ سے ان کا نام ہے۔

تیسری وجہ: یہ عبرانی دو کلمات مو (پانی) اور سی (درخت) سے مرکب ہے آپ کا نام اس وجہ سے بنا کہ والدہ نے فرعون سے خوف کی بنا پر تابوت میں رکھ کر سمندر میں بہا دیا، پانی کی موجیں فرعون کے گھر کے پاس درختوں میں لے گئیں حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) کی خادمائیں وہاں نہانے کیلئے آئیں انہوں نے تابوت دیکھا اور پکڑا تو اس مکان (پانی اور درخت) کی وجہ سے آپ کا نام یہ رکھا۔

پہلی دونوں وجوہ فاسد ہیں پہلی اس لیے کہ بنی اسرائیل اور قبطی لغت عرب نہیں جانتے تھے لہٰذا ان کی مراد یہ نہیں ہوسکتی دوسری وجہ اس لیے کہ یہ اسم علم ہونے کی وجہ سے معنی ذات کا مفید نہیں ہوسکتا۔

اقرب تیسری وجہ ہے لوگوں میں یہی معروف و معتاد ہے آپ کا نسب یہ ہے۔ موسیٰ بن عمران بن یصہر بن فاھث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً کی تفسیر

اس میں چند فوائد ہیں:

پہلا فائدہ: تورات ملنے کا وعدہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا اگر ہم سمندر سے سالم و محفوظ گزر گئے تو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے

پاس سے کتاب لاؤں گا جس میں تمہارے لیے اوامر ونواہی ہوں گے جب آپ بنی اسرائیل کے ساتھ سلامتی سے گزر گئے اور فرعون کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا تو انہوں نے کہا: اپنے وعدہ کے مطابق ہمارے لیے کتاب لاؤ تو آپ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اس نے چالیس دن کا وعدہ فرمایا جس کا بیان یوں ہے:

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ (پ۹-الاعراف:۱۴۲)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ فرمایا اور ان میں دس اور بڑھا کر پوری کیں تو اس کے رب کا وعدہ پوری چالیس رات کا ہوا اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری قوم پر میرا نائب رہنا اور اصلاح کرنا اور فسادیوں کی راہ کو دخل نہ دینا

آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا ورطور پر چالیس راتیں ٹھہرے، اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات بصورت الواح (تختیاں) نازل کی اور وہ زبربد کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے سرگوشی اور بلاواسطہ کلام فرمایا اور انہیں قلم کی آواز بھی سنائی۔
حضرت ابوالعالیہ سے ہے ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ وہ چالیس راتیں بے وضو نہ ہوتے حتیٰ کہ طور سے نیچے تشریف لائے۔

دوسرا فائدہ: چالیس راتیں فرمایا کیونکہ مہینوں کی ابتدا راتوں سے ہوتی ہے۔

تیسرا فائدہ: ارشادِ گرامی "وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی" کا معنی یہ ہے ہم نے موسیٰ سے چالیس راتیں گزارنے کا وعدہ کیا جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں جب سے گیا ہے: "الیوم اربعون یوما ای تمام الاربعین" حاصل یہ کہ یہاں مضاف حذف اور مضاف الیہ اس کے قائم مقام ہے جیسا کہ فرمان ہے:

وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (پ۱۳-یوسف:۸۲)

اور اس بستی سے پوچھ دیکھیے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے اور ہم بیشک سچے ہیں

پھر یہ مراد نہیں کہ کوئی چالیس راتیں ہوں بلکہ وہ معین تھیں تیس ذوالقعدہ کی اور دس عشرہ ذوالحج کی اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں جانتے تھے۔

"وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی" میں یہ بھی احتمال ہے کہ تم چالیس راتیں پہاڑ پر آتے رہو یہاں تک کہ تم پر تورات نازل ہوگی، احادیث میں دوسرے احتمال کی تائید ملتی ہے۔

چوتھا فائدہ: تیس اور چالیس میں موافقت کیسے؟

یہ آیت مبارکہ بتا رہی ہے کہ پہلے ہی وعدہ چالیس راتوں کا ہوا تھا لیکن سورۂ اعراف کے الفاظ مبارکہ:

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (پ۹-الاعراف:۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ فرمایا اور ان میں دس اور بڑھا کر پوری کیں

بتا رہا ہے کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ تھا ان میں موافقت کیسے ہے؟

امام حسن بصری نے جواب دیا معاملہ یوں نہیں کہ پہلے تیس کا وعدہ تھا پھر دس کا ہوا، وعدہ ہی چالیس کا تھا جیسے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (پ۲-البقرۃ:۱۹۶) تو تین روزے حج کے ایام میں رکھے اور سات جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ یہ پورے دس ہوئے

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ کی تفسیر

اس میں چند مباحث ہیں:

پہلی بحث: ثُمَّ، کا لفظ لایا گیا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے میقات پر ستر افراد کے ساتھ تورات لینے کیلئے آنے کا فرمایا تو اس میں ان کا مقام اور فضیلت بنی اسرائیل کا اظہار تھا تا کہ حاضرین کو ان کے بلند درجہ، غائبین کو ان کی معرفت اور دین کی تکمیل پر تنبیہ ہو جائے اور یہ سب بڑی نعمت تھی اس کے بعد انہوں نے جو جہل و کفر جیسی بدتر انواع کا اظہار کیا تو پھر یہ عمل تعجب تھا یا ایسے ہو گیا جیسے کوئی کہے میں نے تجھ پر اتنے احسانات کیے پھر تو مجھے ایذا و تکلیف دے رہا ہے۔

دوسری بحث: اہل سیر نے لکھا ہے جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

اُخْلُفْنِىْ فِىْ قَوْمِىْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (پ۹-الاعراف:۱۴۲) میری قوم پر میرا نائب رہنا اور اصلاح کرنا اور فسادیوں کی راہ کو دخل نہ دینا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے، بنی اسرائیل کے پاس وہ کپڑے اور زیورات تھے جو انہوں نے قبطی قوم سے اُدھار لیے تھے، حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا: وہ کپڑے اور زیورات تمہارے لیے حلال نہیں انہیں جلا دو۔ انہوں

نے جمع کر کے انہیں آگ لگا دی۔ سامری جو حضرت موسیٰ کے ساتھ چل رہا تھا اس نے حضرت جبریل کی سواری کے پاؤں دیکھے جب وہ فرعون کو سمندر میں داخل کرنے کیلئے آئے تھے وہاں سے اس نے مٹھ مٹی لے لی تھی، سامری نے سونا چاندی جمع کر کے بچھڑے کی صورت بنائی اور وہ مٹی اس کے منہ میں ڈالی تو اس سے آواز نکلنا شروع ہوگئی، اس نے قوم سے کہا:

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى (پ۱۶-طٰہٰ:۸۸) یہ ہے تمہارا معبود اور موسیٰ کا معبود

قوم نے اسے اپنا خدا بنالیا۔

سائل یہ کہہ سکتا ہے کہ عقلاء کی جماعت عظیم اس پر کیسے متفق ہو سکتی ہے جسے عقل بداہۃً فاسد مانتی ہو اور مذکورہ حکایت ان وجوہات پر ایسی ہی ہے۔

پہلی وجہ: ہر عاقل بداہۃً جانتا ہے کہ سونے سے بنایا گیا بُت نہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں شعور ہے لہٰذا اس کا آسمانوں اور زمین کا الٰہ بننا محال ہوگا مان لیا اس سے گائے جیسی آواز آئی لیکن اتنی سی بات عقلاً بھی اس کے الٰہ ہونے کا شبہ کیسے پیدا کر سکتی ہے؟

دوسری وجہ: اس قوم نے اس سے پہلے ایسے معجزات ظاہرہ دیکھے ہوئے تھے جو وجودِ صانع اور صدقِ موسیٰ علیہ السلام پر انہیں مجبور کر دینے والے تھے باوجود اس قوی دلالت اور اس سونے سے بنائے گائے کی آواز پیدا ہونے کے، محال ہے کہ انہیں اس آواز والے جسم کے بارے میں الٰہ ہونے کا شبہ پیدا ہوا۔

جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کی تصحیح صرف ایک صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے سامری نے قوم سے کہا ہو موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی لانا تھا اس لیے کہ وہ قویٰ فلکیہ سے طلسمات حاصل کرتے ہیں اور اس واسطہ سے وہ معجزات پر قادر ہیں۔ میں بھی ان کے طلسم کی طرح کر سکتا ہوں اس نے آواز والا بچھڑا بنا ڈالا اور انہیں تاثر دیا خوارق میں وہ موسیٰ جیسے ہو سکتے ہیں۔

یا شاید وہ قوم اللہ تعالیٰ کیلئے جسم مانتی تھی اور حلولیت کی قائل تھی تو انہوں نے بعض اجسام میں الٰہ کا حلول تسلیم کر لیا اور اس شبہ میں واقع ہوگی۔

تیسری بحث: اس واقعہ میں متعدد فوائد ہیں۔

پہلا فائدہ: اس میں نشاندہی ہے کہ حضور ﷺ کی اُمت افضل ہے اس لیے کہ یہود ان براہین کاملہ کا مشاہدہ کرنے کے باوجود

اس قدر رادنی اور کمزور شبہ میں مبتلا ہوئے لیکن امتِ محمدیہ ﷺ باوجودیکہ وہ معرفتِ معجزہ قرآن میں دلائل دقیقہ کی محتاج ہے مگر وہ بڑے سے بڑے شبہ سے بھی دھوکہ نہیں کھاتی جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ امت ان سے افضل، عقل میں اکمل اور پاکیزگی دل میں ازکیٰ ہے۔

دوسرا فائدہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ واقعہ بیان فرمایا حالانکہ کسی سے آپ نے نہیں پڑھا جو واضح کررہا ہے کہ آپ کی رہنمائی وحی کرتی ہے۔

تیسرا فائدہ: اس میں تقلید اور دلائل سے جہالت پر تحذیر وخوف عظیم ہے اس لیے اگر وہ قوم دلائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت کاملہ کا علم رکھتی تو سامری کے شبہ میں کیوں پڑتی۔

چوتھا فائدہ: مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ کی مخالفت پر حضور علیہ السلام کیلئے تسلی ہے گویا اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے اے نبی! آپ صبر سے کام لیں جیسے موسیٰ نے اس عجیب واقعہ میں صبر کیا۔ ان کو اللہ نے فرعون سے نجات دی اور ظہور موسیٰ علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک انہوں نے کس قدر معجزات عجیبہ دیکھے تھے مگر وہ کمزور سے کمزور شبہ کا شکار ہوگئے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس پر صبر کیا تو قوم کی اذیت پر حضور علیہ السلام کا صبر کرنا اس سے اولیٰ ہوگا۔

پانچواں فائدہ: حضور ﷺ کے ساتھ مجادلہ اور عداوت میں سب سے سخت یہود تھے گویا اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے یہ اپنے آباء واجداد پر فخر کرتے ہیں جب ان کے اسلاف جہالت، بلادت اور عناد میں اس حد کو پہنچے ہوئے تھے تو ان کے اخلاف کا عالم کیا ہوگا؟

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ کی تفسیر

پہلی بحث: ظلم کی تفسیر میں دو اقوال ہیں۔

پہلا قول: شیخ ابو مسلم کہتے ہیں لغت میں ظلم کا معنی نقص ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا　　دونوں باغ اپنے پھل لائے اور اس میں کچھ کمی نہ دی

(پ ۱۵۔ الکہف: ۳۳)

تو معنی یہ ہوگا جب انہوں نے خالق، زندہ کرنے اور مارنے والے کی عبادت ترک کرکے بچھڑے کی پوجا شروع کردی تو یہ دنیا و دین کی خیرات میں ناقص ہوگئے۔

دوسرا قول: جب فعل کا یہ وصف ہے تو اسی کا فاعل ظالم ٹھہرے گا پھر جب آدمی ایسا فعل کرے جو اسے عذاب و نار تک لے جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اگرچہ فی الحال وہ نفع ولذت میں ہو جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (پ۲۱-لقمان:۱۳) بیشک شرک بڑا ظلم ہے

دوسرے مقام پر فرمایا

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (پ۲۲-فاطر:۳۲) تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے

ان کا غیر کی عبادت کرنا شرک تھا اور شرک انسان کو دوزخی بنا دیتا ہے اسی لیے انہیں ظالم کہا۔

دوسری بحث: معتزلہ نے اس سے کئی طرح سے استدلال کیا کہ معاصی، اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں۔

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے ان پر مذمت کی ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوتے تو ان کا فاعل مستحق ذم ہوتا۔

دوسری وجہ: اگر یہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ان سے ایسا ہوتا تو ان کے بجالانے پر وہ اس کے مطیع قرار پائے کیونکہ ارادہ کیے ہوئے فعل کو بجالانا طاعت ہے۔

تیسری وجہ: اگر عصیان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوتی تو اس پر مذمت ایسے ہی ہو جائے گی جیسے کسی کے کالے، گورے، طویل وکوتاہ ہونے پر مذمت ہوتی ہے۔(حالانکہ ان میں کسی کا قصور نہیں)

جواب یہ ہے کہ فعل مدح وذم سے استدلال ہے اور یہ دو۔ مسئلہ داعی اور مسئلہ علم کے مخالف ہے۔ جس کا تذکرہ متعدد بار آچکا ہے

تیسری بحث: آیت میں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ کفر سے نقصان کفار کو ہی ہوتا ہے کیونکہ اس کے سبب سے وہ اپنے نفس پر ہی ظلم کرتے ہیں باقی اللہ تعالیٰ کا جلال، اتقیاء کی طاعت سے کمال کے حصول اور اشقیاء کی معصیت سے نقص سے پاک ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ کی تفسیر

معتزلہ کہتے ہیں ''عَفَوْنَا'' سے مراد ان کی توبہ ہے جو بصورت ایک دوسرے کے قتل کے تھی لیکن یہ دو وجہ سے ضعیف ہے۔

پہلی وجہ: قبول توبہ عقلی طور پر واجب ہے اگر یہاں وہ مراد ہوتی تو اسے مقام انعام پر لانا جائز نہ ہوتا کیونکہ واجب کی ادائیگی، انعام نہیں ہوتا حالانکہ ان آیات سے مقصود انعامات الٰہیہ کا شمار ہے

دوسری وجہ: لازم عذاب کا اسقاط عفو قرار پاتا ہے، جس عذاب کا اسقاط لازم نہ ہو اس کا اسقاط عفو نہیں کہلاتا مثلاً ظالم کا مظلوم کو عذاب دینا جائز نہیں اگر وہ اسے ترک کر دیتا ہے تو اس ترک کو عفو نہیں کہا جا سکتا یہی صورت یہاں ہے جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں یہاں حصول توبہ میں کوئی شک ہی نہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَتُوبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو (پ۱-البقرۃ:۵۴)

جب بات یوں ہے تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ عقلاً قبول توبہ لازم نہیں تو جب یہ ثابت ہے تو ثابت ہو جائے گا جب اللہ تعالیٰ نے اس کا عذاب ساقط فرما دیا جو عقلاً و شرعاً جائز تھا حالانکہ یہ بھی معتزلہ کے خلاف جاتا ہے۔

جب یہ حقیقت تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے کفار سے درگزر فرمائی تو اُمت محمدیہ کے فاسقوں سے وہ بطریق اولیٰ درگزر فرمائے گا کیونکہ یہ خیر اُمت ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کی تفسیر

لفظ "لَعَلَّ" کے بارے میں پہلے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے تحت گفتگو گزر چکی ہے حقیقت و ماہیت شکر میں طویل گفتگو ہے جو عنقریب انشاء اللہ آ رہی ہیں۔ پھر معتزلہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا کہ انہیں اس نے معاف فرما دیا اور مؤاخذہ نہیں کیا تا کہ وہ شکر گزار بنیں، یہ واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے شکر کا ہی ارادہ کرتے ہیں۔

جواب: اگر اللہ تعالیٰ ان سے شکر کا ہی ارادہ فرماتا ہے تو کیا اس شرط کے ساتھ کہ شاکر کیلئے داعیہ شکر حاصل ہو یا اس کے بغیر۔ اول صورت باطل ہے اس لیے کہ اگر وہ اسی شرط کے ساتھ ارادہ فرماتے تو یہ شرط اگر داعیہ کی طرف سے ہو گی تو ایک داعیہ دوسرے داعیہ کی طرف محتاج ہو گا اور اگر وہ اللہ کی طرف سے ہے کہ اس نے داعی پیدا کر دیا تو لامحالہ شکر حاصل ہو گا اور اگر اس نے داعی پیدا نہ کیا تو حصول شکر محال ہو گا لیکن یہ معتزلہ کے قول کی ضد ہے اور اگر اس داعیہ کے بغیر حصولِ شکر کا ارادہ ہے تو وہ محال کا تقاضا ہو گا کیونکہ فعل داعی کے بغیر محال ہوتا ہے۔

تو ثابت ہو گیا کہ اشکال ان پر بھی وارد ہوتا ہے۔

[۵۳] وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

(اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کردینا کہ کہیں تم راہ پر آؤ)

چوتھا انعام

فرقان سے مراد تورات یا اس میں داخل شئ یا اس سے خارج شئ مراد ہوسکتی ہے یہاں تین ہی احتمال ہوئے پہلا احتمال یوں کہ تورات کی دو صفات ہیں وہ نازل کردہ ہے اور حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے جیسے تم کسی آدمی کی سخاوت اور خیرات بیان کرنا چاہو تو کہتے ہو: رأیت الغیث واللیث۔ اس کی نظیر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ آتَیْنَا مُوْسَی وَ ھَارُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِیَاءً وَّ ذِکْرًا (پ۱۷-الانبیاء:۴۸)

اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور نصیحت پرہیزگاروں کیلئے

فرقان کا دوسرا معنیٰ

دوسرا احتمال یوں کہ فرقان سے مراد تورات میں بیان کردہ دین ہو اس لیے کہ جب وہ سامنے آئے گا تو وہ باطل سے ممتاز ہوگا تو اب فرقان سے تورات کا بعض حصہ ہوگا اور وہ بیان اصول اور فروع دین ہے۔

فرقان کا تیسرا معنیٰ

تیسرے احتمال کی تفصیل کئی طرح سے ہے۔

پہلی وجہ: فرقان سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے مثلاً ہاتھ کا چمکنا، عصا اور دیگر نشانیاں۔ فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حق و باطل میں فرق کردیا۔

دوسری وجہ: فرقان سے مراد مدد اور وہ نجات ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قوم فرعون سے دی، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ (پ۱۰-الانفال:۴۱)

اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اُتارا جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں

یہاں وہ نصر و مدد مراد ہے جو بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی وہ یوں کہ ظہور نصرت سے پہلے دونوں فریقوں میں سے ہر

کوئی توقع کررہا تھا کہ میں غالب اور مخالف مغلوب ہو جائے گا جب مددالٰہی کا ظہور ہوا راجح، مرجوح سے ممتاز اور نمع صادق، طمع کاذب سے جدا ہوگئی۔

تیسری وجہ: شیخ قطرب کہتے ہیں فرقان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے سمندر کا پھٹ جانا ہے۔

سوال: سمندر پھٹ جانے کا ذکر پیچھے اس فرمان میں آچکا ہے:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (پ-البقرہ:۵۰)

اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا

اور دوسرا اسی آیت کے آخر میں "لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ان کا تعلق کتاب سے ہی ہے کیونکہ ان کا ذکر ہدایت کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

جواب: پہلے کا یہ ہے کہ ارشادِ گرامی "وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ" میں یہ نہیں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کیلئے ہے البتہ زیر بحث آیت میں تخصیص پر تصریح ہے کہ یہ ان کیلئے ہی ہے۔

دوسرے سے جواب یہ ہے کہ سمندر کا پھٹ جانا دلائل میں سے ہے شاید مراد یہ ہو کہ ہم نے موسیٰ کو فرقان بحر عطا کیا۔ جس سے وہ وجودِ صانع اور صدق موسیٰ علیہ السلام پر استدلال کرسکیں اور یہ بھی ہدایت ہی ہے۔

پھر ہدایت سے بھی کبھی فوز ونجات مراد ہوتا ہے جیسا کہ اس سے رہنمائی مراد ہوتی ہے گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے اس نے دین میں نعمت کتاب عطا فرمائی اور فرقان عطا کیا جس کی برکت سے انہیں دشمنوں سے بطور نعمت عاجلہ خلاصی نصیب ہوگی۔

بعض کی غلطی

بعض لوگوں نے غلطی کھائی اور کہا: اس سے مراد قرآن ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا یہ باطل ہے اس لیے کہ فرقان حق و باطل میں فرق کرنے والا ہوتا ہے اور ہر دلیل کی یہی شان ہوتی ہے لہٰذا اس لفظ کو قرآن کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ سے مراد ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرقان عطا فرمایا۔ تاکہ اے اہلِ کتاب تم اس سے ہدایت پاؤ۔ علماء نحو میں سے اس قول کی طرف شیخ فراء، ثعلب اور قطرب گئے ہیں لیکن یہ نہایت تعسف والی بات ہے اور اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کی تفسیر

"لَعَلَّ" "اور" اهتدا" کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔معتزلہ نے اس سے یوں استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام سے ہدایت کا ارادہ فرمایا۔لہٰذا یہ اس قول کو باطل قرار دے گا کہ وہ کافر کا کفر سے ارادہ کرتا ہے اور یہ بھی کہ اہلسنّت کے ہاں یہ ہے اللہ تعالیٰ ہی ہدایت یافتہ میں ہدایت اور گمراہ میں گمراہی پیدا کرنے والا ہے تو پھر کتاب اور فرقان نازل فرما کر کہنا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اس کا کیا فائدہ؟

اور یہ معلوم ہے کہ جب ہدایت اس نے تخلیق فرما دی تو انزال کتاب کا فائدہ کیا وہ اس لیے کہ اگر ہدایت کی تخلیق ہو اور کتاب نہ ہو تب بھی ہدایت ہوگی اور اگر کتاب واحد کی جگہ ہزار کتاب نازل ہو لیکن ہدایت کی ان میں تخلیق نہ ہو تو ہدایت حاصل نہ ہوگی تو یہ کہنا کیسے جائز ہے کہ میں نے کتاب نازل کی تاکہ تم ہدایت پاؤ؟ یاد رہے پہلے اس کے جواب پر کئی دفعہ گفتگو ہو چکی ہے

[۵۴] وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم تم نے اپنی جانوں پر بچھڑا بنا کر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو تو اُس میں ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں تمہارے لیے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی بلاشبہ وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان)

پانچواں انعام

بعض مفسرین نے کہا یہ اور اس کے بعد والی آیت سابقہ آیات سے منقطع ہیں کیونکہ ان میں انعامات کا تذکرہ تھا اور یہاں قتل کا حکم ہے جو نعمت نہیں لیکن یہ بات کئی دلائل کی بنا پر ضعیف ہے۔

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کا بڑا گناہ بتا کر اس سے خلاصی کی صورت بیان فرمائی جو دین میں سب سے بڑی نعمت ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیاوی نعمتوں کا شمار فرمایا تو ان پر دینی انعامات کا شمار بطریق اولیٰ ہونا چاہیے پھر یہ نعمت جو توبہ کے طریق کی صورت میں ہے اس کا بیان پہلے ذکر معصیت کے بغیر نہیں تو اس کا ذکر بھی تمام نعمت سے ہے تو اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا اس کا شمار انعامات الٰہیہ میں ہوتا ہے لہٰذا ان کے ساتھ تذکیر جائز ہے۔

فضل قدیر

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کا حکم دیا لیکن تمام کے ختم ہونے سے پہلے حکم اٹھالیا تو یہ باقی لوگوں کے اور حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں موجود لوگوں کے حق میں نعمت ٹھہرا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے آباء سے قتل کا حکم ختم نہ کرتا تو یہ ابناء و بچے کہاں ہوتے تو حضور ﷺ کے پاس موجود لوگوں کیلئے اسے بطور انعام ذکر کرنا بہت ہی خوب ہے۔

تیسری وجہ: اُمت محمدی کے لئے آسان توبہ

اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ان کی توبہ قتل کے بغیر تمام نہیں ہوسکتی لیکن سرورِ عالم ﷺ نے انہیں فرمایا اب توبہ کیلئے قتل کی ضرورت نہیں تم کفر سے رجوع کر کے ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارا ایمان قبول فرمالے گا تو سابقہ توبہ کی تشدید کا بیان اس پر تنبیہ ہے کہ یہ کس قدر بڑا انعام ہے کہ توبہ کی قبولیت اتنی آسان ہے۔

چوتھی وجہ: اس میں حضور ﷺ کی اُمت کیلئے توبہ میں خوب شوق پیدا کرنا ہے اس لیے کہ جب اُمت موسیٰ اس قدر مشقت اور شدت کے باوجود توبہ کرتے ہیں تو ہمیں تو بطریق اولیٰ شوق توبہ ہونا چاہیے کیونکہ محض ندامت اختیار کرنا توبہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان کا کسی بڑی مصلحت کی طرف راغب ہونا بھی عظیم نعمت ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ کی تفسیر

یاد کرو موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو فرمایا جب وہ اللہ تعالیٰ کے جائے وعدہ سے واپس لوٹے اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھا "یَا قَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ"

ظلم کے بارے مفسرین کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول: تم نے اس ثواب میں کمی کر لی جو تمہیں عہدِ موسیٰ علیہ السلام پر قائم رہنے سے ملنا تھا۔

دوسرا قول: ظلم یہ ہے کہ آدمی ایسی چیز پر اصرار کرے نہ وہ اس کا استحقاق رکھتا ہو نہ اس میں نفع ہو اور نہ دفع نقصان، نہ علمی طور پر اور نہ طبی طور پر۔ جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو اپنے نفوس کو نقصان پہنچایا اس لیے کہ جو دائمی ضرر کا سبب بنے وہ تو سب سے بڑا ظلم ہوا اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (پ۲۱-لقمان:۱۳) بیشک شرک بڑا ظلم ہے

لیکن اس ظلم کے ساتھ قید ہے کہ یہ اپنے حق میں ہے تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ کسی دوسرے پر ہوا کیونکہ اصل ظلم میں متعدی ہونا ہے اس لیے ارشاد فرمایا: اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

ارشادِ گرامی "بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ" میں (لفظ اللہ) حذف ہے کیونکہ انہوں نے صرف اس قدر ظلم نہیں کیا اس لیے کہ اگر وہ اسے اللہ نہ بناتے تو ان کا فعل ظلم نہ بنتا لہٰذا اس سے مراد اللہ بنانا ہے۔ جب آیت کا ابتدائی حصہ اس حذف پر دال ہے تو حذف حسن ٹھہرا۔

فَتُوبُوٓا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ کی تفسیر

یہاں چند سوالات ہیں:

پہلا سوال: اس ارشادِ گرامی کا تقاضا یہ ہے کہ توبہ کی تفسیر قتل نفس ہو جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتا حتیٰ کہ طہارت کو اپنے مقام پر لائے پھر آپ نے چہرہ دھویا اور پھر ہاتھ پھر چہرہ و بازو تو یہ "یضع الطهور مواضعه" کی تفسیر ہے لیکن یہ بات تو باطل ہے کیونکہ توبہ گزشتہ فعل قبیح پر ندامت اور آئندہ اسے نہ کرنے کا عزم ہے اور قتل نفس کے مخالف ہے اور اسے مستلزم نہیں لہٰذا اس کے ساتھ تفسیر کا کیا جواز؟

جواب: یہاں قتل نفس تفسیر توبہ نہیں بلکہ یہ بیان ہے کہ ان کی توبہ قتل نفس کے بغیر تمام و حاصل نہیں اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ ان کی توبہ کیلئے قتل شرط ہے جس طرح عمداً قاتل کی توبہ تب تمام ہوتی ہے جب وہ اپنا آپ اولیاءِ مقتول کے سپرد کردے اب وہ راضی ہوجائیں یا اسے قتل کردیں۔

یہ بھی ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں مرتد کی توبہ بغیر قتل قبول نہ ہو۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم کہتے ہیں کبھی مجازاً شرط شی پر اسم شی کا اطلاق ہوجاتا ہے۔ جیسے کہ توبہ کا ارادہ کرنے والے غاصب سے کہا جائے "ان توبتك رد ما غضبت" (تیری توبہ مغصوب شی کی واپسی ہے) یہی معاملہ یہاں ہے۔

دوسرا سوال: اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی "فَتُوبُوٓا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ" کا کیا معنی؟ کیونکہ توبہ تو باری تعالیٰ کی بارگاہ میں ہی ہوتی ہے؟

جواب: یہاں توبہ میں ریاکاری سے منع کرنا مقصود ہے گویا انہیں فرمایا اگر تم توبہ کا اظہار کرو مگر دل سے نہ کرو تو تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کررہے ہو جو تمہارے دلوں پہ مطلع ہے پھر تم لوگوں کیلئے توبہ کررہے ہو اور اس میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ تم نے گناہ بارگاہِ الٰہی میں کیے ہیں۔

تیسرا سوال: اس مقام پر ذکر باری کو کیوں مخصوص فرمایا؟

جواب: باری وہ ذات اقدس ہے جو تخلیق میں تفاوت سے بری ہو۔

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ　(پ ۲۹-الملک: ۳)　تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے

حالانکہ وہ آپس میں اشکال مختلفہ اور صور مخالفہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں گویا یہ اس بات پر تنبیہ ہے جس کا شان

یہ ہے وہی عبادت کے لائق ہے اس گائے سے جو عبادت میں ضرب المثل ہے۔

چوتھا سوال: فَتُوبُوا کی فا اور " فَاقْتُلُوا " کی فا میں کیا فرق ہے؟

جواب: پہلی فا سبب کیلئے ہے کیونکہ ظلم توبہ کا سبب ہے اور دوسری فا تعقیب کیلئے ہے کیونکہ قتل اتمام توبہ میں سے ہے تو فَتُوبُوا کا معنی ہے توبہ کے بعد قتل کروتا کہ وہ تمہاری توبہ کا تتمہ بنے۔

پانچواں سوال: " فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ " سے کیا مراد ہے کیا ہر آدمی اپنے آپ کو قتل کرے یا اور مراد ہے؟

جواب: اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: یہ مراد نہیں کہ توبہ کرنے والا ہر شخص اپنے آپ کو قتل کرے۔ یہ قاضی عبدالجبار کا مختار ہے۔ اس پر دو وجہ سے استدلال ہے

۱۔ اہلِ تفسیر نے جس پر اعتماد کیا وہ یہ ہے کہ مفسرین کا اجماع ہے انہوں نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا اگر اس کا حکم ہوتا تو یہ ترک فعل سے عاصی قرار پاتے۔

۲۔ جب حقیقت فعل قتل سامنے آگئی تو ہم کہتے ہیں یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم دے اس لیے کہ عبادات شرعیہ میں حسن، مکلف کے مصالح کی وجہ سے ہے اور مصلحت امور مستقبلہ میں ہی ہوتی ہے اور بعد از قتل حالت تکلیف نہیں رہتی کہ قتل میں مصلحت ہو بخلاف اس صورت کے جب اللہ تعالیٰ موت دیتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور یہ اس لیے حسین ہے کہ یہ دوسرے مکلف کیلئے مفید ہے اور اس مکلف کو اس کا عوض عظیم ملتا ہے اور بخلاف اس صورت کے جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے آپ کو زخمی کرنے یا کسی عضو کو کاٹنے کا حکم دے جس پر موت واقع نہ ہو اس لیے کہ جب وہ اس فعل کے بعد زندہ ہے تو ممکن ہے وہ فعل۔ افعال مستقبلہ میں اصلاح کا مفید ہو۔

سوال: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قتل فی الحال خروج روح کا نام ہے بلکہ یہ ایک ایسا فعل ہے جو خروج روح کا سبب ہے فی الحال ہو یا بعد میں۔ دلیل اس پر یہ ہے ایک آدمی حلف اٹھاتا ہے میں کسی انسان کو قتل نہیں کروں گا اب اس نے کسی کو شدید زخمی کر دیا اور وہ بندہ زخمی ہونے کے بعد ایک لحظہ زندہ رہا تو اس آدمی کی قسم ٹوٹ جائے گی اور ہر صاحب زباں اسے قتل ہی قرار دے گا اور استعمال میں اصل، حقیقت ہے تو واضح ہو گیا قتل کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جو خروج روح تک پہنچانے والا ہے۔ فی الحال یا بعد میں۔ اور تم نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ زخمی کرنے کا حکم وارد ہو سکتا ہے جس کے بعد فی الحال خروج روح نہ ہو جب یہ معاملہ درست ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہاں قتلِ نفس کے بارے میں ہی حکم ہو۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قتل خروج روح فی الحال کا نام ہے تو اس کا حکم کیوں نہیں ہو سکتا؟ ان کا قول، حکم میں مصلحت مستقبلہ

ہونا ضروری ہے۔ اس کا رد یہ ہے کہ اولاً ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حکم میں مصلحت کا ہونا لازمی ہے اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے کفر کے بارے میں جانتا ہے اسے بھی ایمان کا حکم دیتا ہے حالانکہ یہاں کوئی مصلحت نہیں بلکہ اس تکلیف کا فائدہ حصول عتاب کے سوا کچھ نہیں۔

ثانیاً اگر ہم تسلیم کر لیں کہ مصلحت کا ہونا لازمی ہے تو تم یہ پابندی کیوں لگاتے ہو کہ اس میں اس مکلّف کی ہی مصلحت ہو یہ کیوں جائز نہیں کہ اس کا اپنے آپ کو قتل کرنا کسی دوسرے کی مصلحت ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس لیے حکم دیا ہو کہ دوسرے کو اس سے نفع ہو پھر اللہ تعالیٰ اسے عوض عظیم بھی دے رہا ہے۔

ثالثاً اگر مان لیں کہ مصلحت بھی اس مکلّف کیلئے ضروری ہے تو یوں کہنا کیوں ناجائز ہوگا کہ اس مکلّف کو یہ علم کہ اس فعل کا اسے حکم ہے یہی اس کیلئے مصلحت ہے مثلاً جب اسے حکم ہوا کل تو اپنے نفس کو قتل کر دے تو اس بات کا اس کے علم میں آجانا اسے اس وقت سے لے کر کل تک برائی چھوڑنے کا سبب بن جائے گا۔

جب یہ تمام احتمالات ممکن ہیں تو قاضی صاحب کے تمام اعتراضات ختم ہو جائیں گے بلکہ وجہ اول جس پر اہلِ تفسیر نے اعتماد کیا وہی اقوی ٹھہرے گی لہٰذا اب آیت مبارکہ کا ظاہر مراد نہ لینا لازم ہوگا پھر یہاں دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ: ان توبہ کرنے والوں کو یہ حکم تھا کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو تو "اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" کا معنی ہوگا تاکہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو اور یہ دوسرے مقام پر اس ارشاد کی طرح ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا

اور اپنی جانیں قتل نہ کرو بیشک اللہ تم پر مہربان ہے

(پ۵-النساء:۲۹)

اس کا مفہوم ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔

تحقیق یہ ہے کہ اہلِ ایمان آپس میں نفس واحدہ کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے تحت مفسرین نے کہا:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ

اور آپس میں طعنہ نہ کرو اور ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔

(پ۲۶-الحجرات:۱۱)

اپنے اہلِ ایمان بھائیوں کے، اسی طرح اس ارشادِ مبارک کے تحت کہا:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا

کیوں نہ ہو جب تم نے اسے سُنا تھا کہ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنوں پر نیک گمان کیا ہوتا

(پ۱۸-النور:۱۲)

یعنی اپنی مثل اہلِ اسلام میں سے، اسی طرح ایک اور ارشادِ گرامی ہے:

فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّۃً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً (پ۱۸-النور:۶۱) تو اپنوں کو سلام کرو ملتے وقت کی اچھی دعا اللہ کے پاس سے مبارک پاکیزہ

تم ایک دوسرے کو سلام کہو۔

پھر مفسرین نے یہ بھی لکھا کہ توبہ کرنے والوں نے دوصفوں میں کھڑے ہوکر ایک دوسرے کو قتل کیا۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے ان تائبین کے علاوہ سے فرمایا ان توبہ کرنے والوں کو قتل کرو تو ارشادِ ربانی "اُقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ" سے مراد یہ ہوگی کہ تم قتل کے لئے جھک جاؤ۔

یہ وجہ ثانی اقرب ہے اس لیے کہ وجہ اول میں مشقت زیادہ ہے کیونکہ جب پوری جماعت کسی گناہ میں ملوث ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے پر، دوسروں سے زیادہ ترس کرتے ہیں تو جب ان کو حکم دیا جائے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو تو اس میں بڑی مشقت ہوگی

پھر روایات مختلف ہیں۔

پہلی روایت: جو ستر افراد کوہِ طور پر گئے تھے اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا نہ کی تھی انہیں حکم ہوا کہ اس کی پوجا کرنے والوں کو قتل کرو۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی اس لیے تیس دن تک سلسلہ قتل جاری رہا۔ یہ شیخ محمد بن اسحاق کے قول کی بنا پر ہے۔

دوسری روایت: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کا حکم دیا تو انہوں نے مان لیا تو آپ نے ان سے قتل پر صبر کا عہد لیا تو ان سے ہر قبیلہ الگ الگ جمع ہوگیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام ان بارہ ہزار افراد کے ساتھ تشریف لائے جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہ کی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ آپ نے توبہ کرنے والوں سے فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں جو تلواریں لہراتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے تو اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اس پر اللہ کی لعنت ہو جو اپنی نشست سے اٹھا یا اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا یا ہاتھ و پاؤں سے بچنے کی کوشش کی سب ہی نے آمین کہا۔ شام تک انہیں قتل کیا اس پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اُٹھے اور دعا کرنے لگے۔ اے ہمارے رب! کچھ باقی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی جو قتل ہوا میں نے اسے معاف فرمادیا اور جو باقی ہیں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں، تو ستر ہزار افراد قتل ہوئے۔ یہ امام کلبی سے روایت ہے۔

تیسری وجہ: بنی اسرائیل دو طرح کے تھے، بعض نے بچھڑے کی عبادت کی اور بعض نے عبادت تو نہیں کی مگر کرنے والوں پر اعتراض نہ کیا تو جو منع کرنے والے نہ بنے تو انہیں عبادت کرنے والوں کو قتل کا حکم دیا۔

مفسرین نے لکھا جب آدمی اپنے والد، بیٹے اور پڑوسی کو دیکھتا تو اللہ کے حکم پر عمل اس کیلئے ممکن نہ رہتا تو اللہ تعالیٰ نے کالے بادل بھیج دیئے اور پھر قتل کا حکم دیا تو شام تک قتل جاری رہا پھر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے یوں دعا کی: یا رب بنی اسرائیل تمام کو ہلاک نہ فرما بلکہ کچھ باقی رکھ۔ تو بادل ہٹ گئے، تورات نازل ہوگئی اور تلواریں ان کے ہاتھوں سے گر پڑیں۔

چھٹا سوال: جب وہ ارتداد سے توبہ کر چکے تو پھر قتل کا حکم کیوں؟ حالانکہ ایسا تائب قتل نہیں کیا جاتا۔

جواب: شریعتیں مختلف میں ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں توبہ کے بعد بھی مرتد کو قتل کا حکم ہو یا عمومی طور پر، ہم پر ایک کا ہی حکم ہو یا حکم اسی قوم سے ہی خاص ہو۔

ساتواں سوال: کیا یہ روایت درست ہے کہ ان میں کچھ ایسے لوگ تھے جو قتل نہیں ہوئے مگر ان کی توبہ قبول ہوئی؟

جواب: یہ ممکن ہے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ 'اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ' بلا واسطہ خطاب ہے یہ بعض سے بھی ہو سکتا ہے یا اگر عام ہو تو اس میں تخصیص ہو سکتی ہے۔

'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ' کی تفسیر

جس کی خاطر یہ مشقت اٹھائی جا رہی ہے یہاں اس پر تنبیہ ہے اس لیے کہ ان کی حالت، ضرر دنیا اور ضرر آخرت کے درمیان دائر تھی پہلی صورت کو قبول کر لینا اولیٰ ہے کیونکہ یہ متناہی اور ختم ہونے والی ہے مگر ضرر آخرت غیر متناہی اور نہ ختم ہونے والا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ موت تو آنی ہی ہے اور قتل میں صرف تقدم و تاخر ہی ہے البتہ عتاب سے نجات اور ثواب کا پانا غرضِ اعظم ہے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ کی تفسیر

یہاں بھی حذف ہے اور اس میں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اول یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول مقدر مانا جائے اگر تم ایسا کر لو تو تم پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے گا۔

دوسرا یہ کہ یہ خطاب بطور التفات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اگر تم نے موسیٰ کا حکم مان لیا تو تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کا مفہوم پیچھے فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کے تحت گزر چکا ہے۔

[۵۵-۵۶] وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

(اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تم پہ یقین نہ لائیں گے۔ جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر مرنے کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو)

چھٹے انعام کا تذکرہ

یہ چھٹا انعام ہے جس کی تفصیل چند وجوہ سے ہے۔

پہلی وجہ: گویا اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے میری نعمت یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا: ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ ہم اللہ تعالیٰ کو واضح طور پر دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا پھر تمہیں اس نے زندہ کیا تا کہ اپنی سرکشی سے توبہ کرلو، عتاب سے نجات اور ثواب حاصل کرو۔

دوسری وجہ: اس میں حضور ﷺ کے زمانہ نبوت کے لوگوں کو بھی خوف دلایا گیا ہے اگر انہوں نے بھی ایسا عمل کیا تو یہ سزا ہو سکتی ہے

تیسری وجہ: انہیں اس بارے میں تنبیہ دی ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کے معجزات کا انکار کیا جیسا کہ ان کے بڑوں نے بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا تھا اور اس پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام سے ان کی مثل نشانیوں کا ظہور نہیں فرمایا کیونکہ وہ جانتا ہے اگر انہیں ظاہر کیا تو یہ انکار کریں گے اور اپنے بڑوں کی طرف عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔

چوتھی وجہ: اس میں ان کی طرف سے پہنچنے والی پریشانی پر حضور علیہ السلام کو تسلی دی ہے اور آپ کے دل اقدس کو صبر پر ثابت کیا۔ جیسا کہ اُولوالعزم رسل نے صبر کیا۔

پانچویں وجہ: اس میں اس شبہ کا بھی ازالہ ہے کہ اگر حضور علیہ السلام کی نبوت سچی ہوتی تو اہلِ کتاب اس پر ایمان لانے میں پہل کرتے کیونکہ انہیں آپ کے بارے میں معلوم تھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ان کے بڑوں نے نبوت

موسیٰ علیہ السلام پر بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا لیکن ہر وقت مرتد رہے اور ان کی مخالفت کرتے ہوئے انہیں برا کہتے رہے لہٰذا حضور علیہ السلام سے ان کی مخالفت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے اگرچہ انہوں نے اپنی کتب میں آپ کے بارے میں اطلاعات پائی تھیں

چھٹی وجہ: جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو ان واقعات کی تفصیل سے آگاہ فرمایا حالانکہ آپ اُمی تھے ہرگز تعلیم حاصل نہ کی تھی تو اب ماننا پڑے گا کہ یہ آپ کو بذریعہ وحی ہی حاصل ہوئے۔

دوسری بحث: مفسرین کے اس واقعہ کے بارے میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ واقعہ بچھڑے کے پوجنے والوں کو قتل کے حکم کے بعد کا ہے، امام محمد بن اسحاق کہتے ہیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سے قوم کی طرف آئے، انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ اپنے بھائی اور سامری سے جو کہنا تھا کہا بچھڑے کو جلا کر سمندر میں پھینک دیا۔ قوم میں ستر افراد کو منتخب کر لیا جب طور کی طرف چلے تو انہوں نے کہا: موسیٰ اپنے رب سے کہو ہم اس کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ آپ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔ جب پہاڑ کے قریب ہوئے بادل آگئے اور پہاڑ کو ڈھانپ لیا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب ہوئے آپ اس میں داخل ہو گئے اور ان سے بھی فرمایا داخل ہو کر اپنی حفاظت کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب سے گفتگو کرتے تو ان کی پیشانی سے نور چمکتا جسے کوئی انسان دیکھنے کی طاقت نہ رکھتا۔ قوم نے موسیٰ علیہ السلام کے رب تعالیٰ کی گفتگو سنی جس میں ہدایات تھیں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ جب گفتگو اختتام پذیر ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بادل ہٹے تو قوم نے کہا: ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو واضح طور پر دیکھیں۔ تو انہیں کڑک نے آلیا اور وہ تمام مر گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے اللہ! میں بنی اسرائیل سے ستر افراد لایا تاکہ ان کی قبولیت توبہ پر میرے گواہ بن جائیں اب میں واپس جا رہا ہوں اور ایک بھی ساتھ نہیں اب وہ لوگ میرے بارے میں کیا کہیں گے۔ اس وقت تک دعا جاری رہی کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی ارواح لوٹا دیں پھر بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کی توبہ کے بارے میں عرض کیا: تو فرمایا: وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔

دوسرا قول: یہ واقعہ قتل کے بعد کا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں جب بنی اسرائیل نے عمل عبادت سے توبہ کی بایں طور کہ ایک دوسرے کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کچھ لوگوں کو لے کر آؤ تاکہ اس برائی پر معافی مانگیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر افراد چنے جب طور پر آئے تو انہوں نے کہا: ہم رب کو دیکھے بغیر تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ کڑک نے انہیں آلیا وہ تمام مر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر رو دیے اور عرض کیا: یا رب! میں بنی اسرائیل سے کیا کہوں گا

پہلے میں نے انہیں قتل کا حکم دیا پھر ان میں سے انہیں چن کر لایا اب میں واپس جاؤں گا ان میں سے کوئی بھی ساتھ نہیں تو میں انہیں کیا کہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: یہ ستر ان میں سے ہیں جنہوں نے بچھڑے کو خدا مانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ (پ ۹-الاعراف: ۱۵۵)

وہ نہیں مگر تیرا آزمانا تو اس سے بہکائے جسے چاہے اور راہ دکھائے جسے چاہے تو ہمارا مولا ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا: جب کھڑے ہوئے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کیسے زندہ فرمادیا؟ حضرت موسیٰ سے کہنے لگے: رب تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرماتا ہے یہ دعا کرو وہ ہمیں نبی بنادے آپ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

واضح رہے آیت مبارکہ میں ایسی کوئی دلالت نہیں جس کی بنا پر ان دو اقوال میں سے کسی کو ترجیح ہو اور اس پر بھی دلالت نہیں کہ جنہوں نے دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا تھا وہ بچھڑے کو الٰہ ماننے والے تھے یا نہ ماننے والے تھے۔

'لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ' کی تفسیر

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تمہاری تصدیق نہیں کریں گے اور نہ تمہاری نبوت کا اعتراف جب تک ہم اعلانیہ اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں۔ صاحبِ کشاف لکھتے ہیں: جهرةً مصدر ہے اور یہ جهرت بالقرأة و بالدعاء (میں نے دعا اور قرأت میں جہر کیا) سے ماخوذ ہے تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ اعلانیہ رؤیت پاتا ہے اور دل سے دیکھنے والا مخفی رکھنے والا ہوتا ہے۔ مصدر لایا گیا تاکہ رؤیت کی نوع پر دلالت ہو، فعل کی وجہ سے منصوب ہے جیسے کہ فعل جلوس کی بنا پر قرفصاء کو نصب دیا جاتا ہے یا یہ حال ہے بمعنی ذوی جهرة، اسے ھا پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اب یہ مصدر ہوگا جیسے غلبہ یا جاہر کی جمع۔

شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جهرة کا اصل معنی ظہور ہے۔ جب شئی کو منکشف کیا جائے تو کہا جاتا ہے "جهرت الشئی" اسی طرح کہا جاتا ہے جهرت البئر کیونکہ پانی مٹی کے نیچے تھا اسے کھودا تو پانی ظاہر ہوگیا جب کسی آدمی کا آواز بلند ہو تو کہا جاتا ہے صوت جهیر، رجل جهوری الصوت، روشن چہرے کو "وجه جهیر" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جهرة بطور تاکید ذکر کیا تاکہ کسی کو رؤیت علمی یا خیال و تصور (خواب) کا وہم نہ ہو۔

فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ کی تفسیر

یہاں چند مباحث ہیں

پہلی بحث: معتزلہ نے یہاں استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ممتنع ہے۔ قاضی عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر دیدار ممکن و جائز ہوتا تو انہوں نے ایک جائز امر کا مطالبہ کیا تھا تو اب لازم تھا ان پر عذاب نازل نہ ہوتا جیسا کہ کھانے اور رزق میں تبدیلی کا مطالبہ کیا تو عذاب نازل نہ ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے

لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ (پ-البقرۃ:۶۱)

ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے

شیخ ابوالحسین رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التصفح میں لکھا: اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی سوال دیدار کا تذکرہ کیا وہاں اسے عجیب و عظیم قرار دیا۔ اس پر متعدد آیات شاہد ہیں۔

۱۔ اس آیت کو دیکھ لیجئے اگر ان کا مطالبہ جائز ہوتا تو "لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً" کو دیگر امتوں کے ان مطالبات کے مطابق ہی لیا جاتا جو انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے کیسے تھے مثلاً ہم اس وقت ایمان لائیں گے جب یہ مردہ زندہ ہو تو اسے نہ عجیب و عظیم قرار دیا اور نہ ہی کڑک نے آلیا۔

۲۔ ارشادِ ربانی ہے:

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰٓى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ (پ-النساء:۱۵۳)

اے محبوب! اہلِ کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے ایک کتاب اُتار دو تو وہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے کہ بولے ہمیں اللہ کو اعلانیہ دکھا دو تو انہیں کڑک نے آلیا ان کے گناہوں پر

اس مطالبہ کو ظلم قرار دیا اور اسی وقت اس کی سزا دی اگر دیدار جائز ہوتا تو ان کے سوال کو ایک اضافی معجزہ کا مطالبہ قرار دے دیا جاتا۔

سوال: یہاں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کتاب کے اُتارنے کو بھی دیدار کے برابر قرار دیتے ہوئے اسے نافرمانی قرار دیا تو جیسے نزالِ کتاب فی نفسہٖ ممتنع نہیں اسی طرح سوال دیدار بھی ممتنع نہ ہوگا؟

فضل قدیر

جواب: ظاہر آیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ دونوں ممتنع ہوں مگر انزال کتاب بالاتفاق اس سے خارج ہے تو اب دیدار ہی ممتنع رہے گا

۳۔ ارشادِ گرامی ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا کَبِیْرًا (۱۹پ -الفرقان:۲۱)

اور بولے وہ جو ہمارے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے ہم پر فرشتے کیوں نہ اتارے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے بیشک اپنے جی میں بہت ہی اُونچی کھینچی اور بڑی سرکشی پر آئے

اگر دیدار ممکن و جائز ہوتا تو پھر اسے بطور انعام منافع اعظم میں سے ہونا چاہیے اور اس کی آرزو تکبر و نافرمانی نہیں بننی چاہیے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے دینی یا دنیاوی نعمت مانگتا ہے اس پر عتاب نہیں ہوتا تو ان کا یہ مطالبہ اس طرح ہو جانا چاہیے تھا کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ کی دعا سے اس مردہ کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔ واضح رہے ان تمام کا خلاصہ ایک جملہ ہے کہ اگر دیدار جائز ہوتا تو اس کا سوال تکبر و برائی نہ بنتا۔

معتزلہ کا رد

یہ تمام باتیں قابلِ سماعت نہیں

۱۔ ان کا یہ کہنا کہ طعام میں تبدیلی اگر ممکن نہ ہوتی تو اس پر عتاب ہوتا اسی طرح باقی معجزات کا معاملہ بھی ہے ہم جواباً کہتے ہیں تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب اس ممکن کا سائل سرکش نہیں تو کہاں لازم ہے ہر ممکن کا طالب سرکش نہ ہو اور پھر ایسے مقام پر ایسی مثالیں دینا اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں اور یہ کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے دیدار کے ساتھ ایسی اشیاء کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کے جواز کے ہم بالاتفاق قائل ہیں اور وہ آسمان سے کتاب کا انزال یا نزول ملائکہ ہے اور دونوں کے مجموعہ پر سرکشی کا حکم ہے جو قطعی طور پر واضح کر رہی ہے کہ سرکشی کا حکم اس لیے نہیں کہ مطالبہ ممتنع شی کا تھا۔

شیخ ابوالحسین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ ظاہر کا تقاضا یہی تھا کہ دونوں ممتنع ہوں لیکن ایک آیت سے خارج ہے اس لیے باقی پر عمل ہوگا۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں تم نے اس پر تو کوئی دلیل ذکر نہیں کی کہ جب ممتنع مطلوب ہو پھر ہی سرکشی اور عظیم برائی کا ثبوت ہوتا ہے چند محاورات اور مثالوں کا ذکر کیا جو اس باب میں مفید نہیں لہٰذا تمہارا قول ظاہر کا تقاضا ہے کہ یہ تمام ممتنع ہوں باطل ہو گیا۔ ہماری گفتگو سے معتزلہ کا قول ساقط ٹھہرا۔

سوال: تو سوال دیدار کو گناہ عظیم قرار دینے کا سبب کیا ہے؟

اس کا کئی طرح جواب ہے:

۱۔ دیدارالٰہی صرف آخرت میں ہی حاصل ہوگا لہٰذا دنیا میں اس کا مطالبہ منع اور منکر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اس بندے سے تکلیف ختم جو دیدارِ الٰہی پالے تو گویا اس کی آرزو وازالہ تکلیف کی طلب ٹھہری اور یہ قول معتزلہ سے بطریقِ اولیٰ ثابت ہوگا اس لیے کہ دیدار، علم ضروری و بدیہی کو متضمن ہے جو تکلیف کے منافی ہے۔

۳۔ جب صدقِ مدعی پر دلائل تام ہوں تو زائد دلائل کا مطالبہ ضد اور ہٹ دھرمی کہلاتا ہے ایسے لوگ سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں

۴۔ یہ بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ ایسی اہم مصلحت کو جانتا ہو جس کی وجہ سے اس نے دنیا میں اپنا دیدار مخلوق سے ممنوع رکھا ہے اس لیے دنیا میں اس کی طلب کو تائید قرار دیا جیسے کہ وہ آسمان سے انزال کتاب اور انزال ملائکہ میں فساد عظیم کے بارے میں جانتا ہے اور اس لیے اس کا مطالبہ ناپسند فرماتا ہے۔

دوسری بحث: صاعقہ کی تفسیر

مفسرین کے صاعقہ کے بارے میں دو اقوال ہیں۔

پہلا قول: اس سے موت مراد ہے یہ حضرت حسن اور قتادہ کا قول ہے اس پر ان کی دلیل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (پ ۲۴-الزمر: ۶۸)

تو بیہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں مگر جسے اللہ چاہے پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے

لیکن یہ دلیل ان دلائل کی بنا پر ضعیف ہے۔

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (پ ۱-البقرۃ: ۵۶)

تو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہیں کڑک نے آلیا۔

اگر صاعقہ موت ہوتی تو ان کا اسے دیکھنا ممتنع ہوتا۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۹-الاعراف: ۱۴۳)

اور موسیٰ گرا بے ہوش پھر جب ہوش ہوا بولا پاکیزگی ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں

ان کے حق میں صاعقہ کا اثبات فرمایا مگر یہ موت نہ تھی کیونکہ اس کے بعد فرمایا: فَلَمَّا اَفَاقَ (پھر جب انہیں افاقہ ہوا) تو افاقہ موت سے نہیں غشی سے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل: صاعقہ سے بے ہوش ہو گئے اور یہ سبب موت کی طرف اشارہ ہے نہ کہ موت۔

چوتھی دلیل: ان کے مشاہدہ کی صورت میں صاعقہ کا نزول باب عتاب میں اعظم ہے اس سے کہ وہ اچانک آلیتی اور انہیں علم نہ ہوتا اس لیے فرمایا: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (تم دیکھ رہے تھے) تو یہ عتاب کے بڑے ہونے پر تنبیہ ہے۔

دوسرا قول: محققین کا قول ہے "صاعقہ" سے سبب موت مراد ہے اس لیے سورۃ الاعراف میں فرمایا:

فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ — جب انہیں کڑک نے آلیا

سبب کون سی شی ہے؟ اس میں تین آراء ہیں:

۱۔ یہ آگ آسمان سے آئی تھی جس نے انہیں جلا دیا۔

۲۔ یہ چیخ تھی جو آسمان کی طرف سے نازل ہوئی۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے لشکر بھیجے انہوں نے ان کی آواز سنی تو وہ ایک دن اور رات بے ہوش مردہ پڑے رہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ کی تفسیر

بعث (زندہ کرنا) موت کے بعد ہی ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (پ۱۵-الکہف: ۱۱،۱۲)

تو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی برس تھپکا پھر ہم نے انہیں جگایا کہ دیکھیں دو گروہوں میں کون ان کے ٹھہرنے کی مدت ٹھیک بتاتا ہے

سوال: کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کلام میں شامل ہیں؟

جواب: وہ شامل نہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں

پہلی وجہ: یہ بلا واسطہ خطاب ہے تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شمولیت لازمی نہیں۔

دوسری وجہ: اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس میں شامل ہیں تو ان کی تخصیص وخروج "فَلَمَّا اَفَاقَ" (جب انہیں افاقہ ہوا) کی وجہ سے لازمی ہے کیونکہ لفظ افاقہ کا استعمال موت کیلئے نہیں ہوتا۔

امام ابن قتیبہ کہتے ہیں یہ کہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اس وقت موت آ گئی تھی دلیل مذکور کی بنا پر غلط ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کی تفسیر

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دار دنیا میں انہیں مرنے کے بعد زندہ فرمایا تاکہ انہیں مکلّف بنایا جائے انہیں ایمان لانے پر قدرت حاصل ہو اور اپنے جرائم کی تلافی کر سکیں۔ مکلّف بنانے پر "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" کے الفاظ شاہد ہیں۔ لفظ شکر تمام طاعات کو شامل ہے، ارشادِ ربانی ہے:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ — اے داؤد والو! شکر کرو اور میرے بندوں میں کم ہیں شکر والے

(پ۲۲-سبا: ۱۳)

سوال: موت کے بعد انہیں مکلّف بنانا کیسے درست ہے؟ اگر یہ درست ہے تو اہلِ آخرت کو موت کے بعد اٹھانے پر مکلّف بنانا کیوں جائز نہیں؟

جواب: آخرت میں مکلّف بنانے سے ان کا مرنا پھر زندہ ہونا مانع و رکاوٹ نہیں۔ مانع وہاں یہ ہے کہ اب وہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ جنت کی لذات اور دوزخ کے آلام وغیرہ کو ماننے پر مجبور ہو چکے ہوں گے اور ایسے علم ضروری کے بعد تکلیف باقی نہیں رہتی تو جب مانع یہ ٹھہرا تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں صاعقہ کی وجہ سے موت دی وہ ان کے ماننے پر مجبور نہیں ہوئے لہٰذا انہیں مکلّف ٹھہرانا درست ہے۔ ان کا مرنا پھر زندہ ہونا نیند یا غشی کی طرح ہے۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے اللہ تعالیٰ اس موت کے ساتھ ان کی مقدر عمریں ختم فرما دیں اور انہیں پھر دوبارہ زندگی عطا فرمائی جیسے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندگی عطا فرمائی جو بستی سے گزرے اور وہ گری پڑی تھی اپنے چھتوں پر اور انہیں زندہ فرمایا جو اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں موت کے خوف کی وجہ سے نکلے تھے۔

لیکن یہ ضعیف بات ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صاعقہ کے ساتھ موت دی وہ لکھی ہوئی تھی اور یہاں اسی کی خبر دی جا رہی ہے تو یہ ان کے اول موت کا وقت تھا اس کے بعد دوسرے وقت میں ان کی حیات ختم ہوئی ہے۔

اس سے معتزلہ کا استدلال کہ یہ "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا سب سے ایمان کا مطالبہ ہے اس کا جواب ہم پہلے متعدد دفعہ بیان کر آئے ہیں۔

46/46

[۵۷] وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

(اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من وسلویٰ اُتارا کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے کچھ ہمارا نہ بگاڑا ہاں اپنی ہی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے)

ساتویں انعام کا تذکرہ

یہاں اللہ تعالیٰ نے ساتواں انعام ذکر فرمایا ہے۔ اسی بات کا تذکرہ انہیں الفاظ سے سورۃ الاعراف میں بھی آیا ہے۔ اس آیت کا ظاہر بتاتا ہے یہ سایہ ان کے زندہ ہونے کے بعد ہوا کیونکہ فرمایا: "ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ۔ یہاں بعض کا بعض پر عطف ہے اگرچہ اس کا خلاف منع نہیں اس لیے کہ مقصد ان نعمتوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائیں۔ مفسرین فرماتے ہیں "ظَلَّلْنَا" کا معنی ہے بادلوں نے تم پر سایہ کرنا شروع کیا۔ یہ مقام تیہ میں ہوا اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو ان کے تابع فرما دیا۔ ان کے چلنے کے ساتھ وہ چل پڑتے دھوپ سے انہیں محفوظ رکھتے۔ ان پر کھانے کیلئے طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک ایک صاع 'مَنْ' کا نزول ہوتا یہ برف کی طرح ترنجبین تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سلویٰ بصورت بٹیر بھیجتا جنہیں حسبِ ضرورت آدمی ذبح کر لیتا۔ "كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا" یعنی انہوں نے ظلم کیا بایں طور کہ ان نعمتوں کا انکار کیا یا جتنی اجازت تھی اس سے زائد لیا یا ان کے علاوہ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا۔ کلام کو مختصر کر دیا گیا ہے کیونکہ وَمَا ظَلَمُوْنَا کی اس پر دلالت موجود ہے۔

[۵۸-۵۹] وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

(اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہوں اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں تو ظالموں نے وہ بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب اُتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا)

آٹھویں انعام کا تذکرہ

یہ آٹھواں انعام ہے۔ اس آیت کا سابقہ نعمتوں پہ عطف ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان دنیاوی نعمتوں مثلاً بادلوں کا سایہ اور مَنّ وسلویٰ کا نزول ذکر کیا تو ساتھ ہی دینی انعام بھی بیان فرمایا کہ انہیں ایسی بات کا حکم دیا جس سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں انہیں ایسے راستہ کی نشاندہی کی جو انہیں عذاب سے خلاصی عطا فرما دے۔ اس آیتِ مبارکہ میں دو قسم کی گفتگو ہے۔

پہلی قسم: اس کا تعلق تفسیر سے ہے۔ ارشادِ گرامی 'وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ' یہ حکم تکلیفی ہے اس پر دو وجہ سے دلالت ہے:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے حالت سجدہ میں دخول باب کا حکم دیا ہے اور یہ فعل شاق تھا لہٰذا یہ حکم تکلیفی قرار پائے گا اور حالت سجدہ میں دخول باب، دخولِ قریہ سے مشروط ہے۔ (اصول یہ ہے) کہ جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو وہ بھی واجب ہی ہوتا ہے لہٰذا دخولِ قریہ کا حکم امر تکلیفی ہوگا نہ کہ امر مباح۔

دوسری وجہ: ارشادِ گرامی

ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ (پ ۶۔ المائدۃ: ۲۱) — اس پاک زمین میں داخل ہوں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی ہے اور پیچھے نہ پلٹو

ہمارے مدعیٰ پر دلیل ہے۔

قریہ سے مراد

ظاہر قرآن تو کسی مخصوص بستی پر دال نہیں ہاں اخبار و آثار سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس میں مختلف اقوال ہیں:

پہلا قول: حضرت قتادہ، ربیع اور ابو مسلم اصفہانی بیت المقدس مراد لیتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ — داخل ہوں اس پاک زمین میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی

تو دونوں آیات میں ایک ہی قریہ مراد ہونے میں کوئی شبہ ہیں۔ (اور یہاں بیت المقدس مراد ہے)

دوسرا قول: شہر مصر مراد ہے۔

تیسرا قول: حضرت ابنِ عباس اور ابوزید رضی اللہ عنہما کے نزدیک یہ بیت المقدس کے قریب اریحا بستی ہے اور اس سے بیت المقدس مراد نہ ہونے پر انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ ارشاد گرامی ''فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا'' میں فاتعقیب پر دال ہے جو لازم کر رہی ہے کہ ان سے یہ تبدیلی حیات موسیٰ میں اس حکم کے بعد ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال تیہ میں ہو گیا وہ بیت المقدس تشریف ہی نہیں لائے۔ لہٰذا اس بستی سے مراد بیت المقدس نہیں۔

قول اول والوں کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ ہم نے اس بستی میں داخلہ کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام یا یوشع علیہ السلام کی زبان کے ذریعے دیا تھا اگر ہم یہاں حضرت یوشع علیہ السلام مراد لے لیں تو مذکورہ اشکال ختم ہو جائے گا۔ ارشادِ ربانی ''فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا''۔ اس کی تفسیر پیچھے سیدنا آدم علیہ السلام کے واقعہ میں گزر چکی کہ یہ حکم برائے اباحت ہے۔

ارشادِ مبارک ''وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'' میں دو مباحث ہیں۔

پہلی بحث: باب کے بارے میں دو آراء ہیں:

۱۔ حضرت ابنِ عباس، ضحاک، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: بیت المقدس کا باب حطہ مراد ہے۔

۲۔ شیخ اصم نے بعض سے نقل کیا باب سے قریہ کی ایک جانب اور داخلہ مراد ہے۔

دوسری بحث: سجود میں اختلاف ہے، امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے سجدہ ہی مراد ہے یعنی چہرہ کا زمین پر لگانا۔ لیکن یہ بعید

ہے اس لیے کہ ظاہر بتا رہا ہے کہ انہیں حالتِ سجدہ میں دخول کا حکم تھا اگر ہم اس سے سجدہ ہی مراد لیں تو ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ بعض نے غیر سجدہ مراد لیا آگے پھر دو آراء ہیں:

۱۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا یہاں رکوع مراد ہے اس لیے کہ دروازہ چھوٹا اور تنگ تھا، داخل ہونے والے کیلئے وہاں جھکنا ضروری تھا۔

یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ وہ باب ہی اس قدر تنگ تھا کہ گزرنے والا جھکنے پر مجبور ہو جاتا تو پھر حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۲۔ اس سے خضوع مراد ہے اور یہی اقرب ہے کیونکہ جب حقیقی سجدہ مراد لینا یہاں دشوار ہے تو اسے تواضع پر محمول کرنا لازم ہوگا اس لیے کہ جب انہوں نے توبہ کی تو گناہ پر توبہ کرنے والوں کیلئے خضوع و تواضع کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔

وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ کی تفسیر

یہاں چند اقوال ہیں:

پہلا قول: قاضی کا قول۔ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں حالت خضوع میں دخول باب کا حکم دیا تو ساتھ فرمایا: یہ الفاظ کہو جو توبہ پر دال ہوں اس لیے کہ توبہ دل کی صفت ہے اس پر دوسرا مطلع نہیں ہوسکتا۔ جب کسی آدمی کا گناہ مشہور ہو جائے اور وہ توبہ کرنا چاہے تو لازم ہے اس کی توبہ کی اطلاع بھی مشاہدہ گناہ کرنے والوں تک پہنچے کیونکہ توبہ اس کے بغیر تام نہیں ہوگی۔ گونگے کی توبہ کلام کے بغیر بھی درست ہے تاکہ غیر کو معلوم ہو جائے اس نے گناہ سے توبہ کی طرف رجوع کرلیا ہے اور اس سے تہمت کا ازالہ بھی ہو جائے اسی طرح جو مذہب کو غلط جانتا تھا جب اس پر حق آشکار ہو گیا تو لازم ہے ان لوگوں کو اطلاع پہنچے کہ اس نے غلطی سے رجوع کرلیا ہے تاکہ یہ تہمت باقی نہ رہے کہ یہ باطل پر قائم ہے اور ان تمام کی دشمنی محبت و پیار میں بدل جائے گی۔ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو حالت خضوع (جو حالت قلبی ہے) میں داخل ہونے کے ساتھ ایسے الفاظ کے تذکرہ کا حکم دیا جو ان کی توبہ پر دال ہوں اور وہ ہیں قُوْلُوْا حِطَّةٌ حاصل کلام یہ ہے کہ قوم کو باب سے حالت خضوع میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ساتھ فرمایا: زبان سے بھی گناہوں کی معافی مانگو تاکہ وہ ندامت قلبی، خضوعِ اعضاء اور استغفارِ لسانی کو جمع کرنے والے ہو جائیں اور یہ قول نہایت ہی خوبصورت اور تحقیق کے اقرب ہے۔

دوسرا قول: شیخ اصم کہتے ہیں یہ اہلِ کتاب کے الفاظ ہیں عرب ان کے مفہوم سے آگاہ نہیں۔

تیسرا قول: صاحب کشاف کہتے ہیں حطۃ، فعلۃ کے وزن پر حط سے ہے جیسے جلسۃ، رکبۃ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے،

مسالتنا حطة۔ (ہمارا سوال گناہوں کا اسقاط ہے) یا تیرا حکم "حطة" ہے۔ اصلاً اس پر نصب ہے معنی ہوگا "حط عنا ذنوبنا حطة" (ہمارے گناہوں کو ہم سے خوب ساقط فرمادے) رفع، معنی ثبات پیدا کرنے کیلئے لایا گیا جیسے:

صبر جمیل فکلانا مبتلی

اصل میں صبراً تھا "یعنی اصبر صبراً" امام ابن ابی عبلہ نے نصب ہی پڑھا ہے۔

چوتھا قول: شیخ ابو مسلم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ان کا مفہوم ہے کہ ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اس بستی میں اُتریں اور ٹھہریں۔

قاضی نے اس کا رد کیا اور کہا اگر مراد یہ ہوتی تو ان کے گناہوں کی مغفرت اس سے متعلق نہ ہوتی حالانکہ ارشادِ ربانی "وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ" کے الفاظ بتا رہے ہیں غفران ذنوب (گناہوں کی بخشش) قول حطۃ کی وجہ سے ہے۔ اس کا جواب ممکن ہے جب وہ اس قریہ میں اترے اور حالت سجدہ میں تواضع کے ساتھ داخل ہوئے تو غفران و بخشش کا تعلق اس سے بن گیا

پانچواں قول: شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ان کا مفہوم یہ ہے اے اللہ ہم سے گناہ ساقط فرمادے ہم تیری رضا کیلئے یہاں اتر رہے ہیں اور تیری بارگاہ میں ارادہ تذلل رکھتے ہیں لہٰذا ہمیں معاف فرمادے۔

سوال: کیا ان مخصوص الفاظ کا ذکر کرنا لازم تھا یا نہیں؟

جواب: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے انہیں انہی مخصوص الفاظ کے ذکر کا حکم تھا۔ اور اس کا احتمال ہے لیکن دو وجہ سے اقرب اس کے خلاف ہے۔

پہلی وجہ: یہ الفاظ عربی ہیں اور وہ عربی کے تکلم پر قدرت نہ رکھتے تھے۔

دوسری وجہ: اور یہی اقرب ہے کہ انہیں اس بات کا حکم تھا کہ وہ ایسے الفاظ کہیں جن کی توبہ، ندامت اور خضوع پر دلالت ہوتی کہ اگر وہ لفظ حطۃ کی جگہ اللّٰھم انا نستغفرک و نتوب الیک (اے اللہ ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں اور تیری طرف ہی رجوع و توبہ کرتے ہیں) کہہ دیتے تو مقصود حاصل ہو جاتا اس لیے کہ توبہ سے مقصود قلبی ہے یا لسانی، قلبی توبہ، ندامت اور لسانی توبہ ایسے لفظ بولنا ہے جو ندامت قلبی پر دال ہوں اور یہ چیز کسی مخصوص لفظ پر موقوف نہیں۔

نَّغْفِرْ لَكُمْ کی تفسیر

مغفرت پر گفتگو ہو چکی ہے، یہاں دو مباحث ہیں

پہلی بحث: اللہ تعالیٰ نے یہ کلمات بطور احسان ذکر کیے ہیں اگر عقلاً قبول توبہ اللہ پر لازم ہے جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں تو پھر یہ تذکرہ مناسب نہیں بلکہ یہ تو ادائیگی وجوب ہوگی اور ایسی ادائیگی کو بطور احسان ذکر کرنا جائز نہیں۔

دوسری بحث: یہاں متعدد قرأتیں ہیں:

۱۔ شیخ ابوعمرو اور ابنِ منادی رحمہما اللہ علیہ نے نون اور فا کے نیچے زیر پڑھی ہے۔

۲۔ امام نافع رحمۃ اللہ علیہ نے یا اور فا پر زبر پڑھی۔

۳۔ باقی قراء اہلِ مدینہ اور جبلہ نے مفضل سے تا، اس پر پیش اور فاء پر زبر پڑھی ہے۔

۴۔ امام حسن، قتادہ، ابوحیوہ اور جحدری رحمہم اللہ نے یا پر پیش اور فا پر زبر پڑھی۔

شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ان تمام صورتوں میں معنی ایک ہی ہے اس لیے کہ جب خطاء اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادی تو وہ معاف ہوگی، جب اس نے معاف فرمادی تو اللہ تعالیٰ ہی اسے معاف فرما سکتا ہے، کسی اسم مؤنث سے پہلے فعل ہو اور اس کے اور فاعل کے درمیان کوئی حائل ہو جائے تو فعل کی تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتا ہے مثلاً ارشادِ مبارک ہے

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ اور ظالموں کو چنگھاڑ نے آ لیا تو صبح اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے (پ۱۲-ہود: ۶۷)

خطیئۃ سے مراد جنس ہے نہ کہ ایک عدد، ارشادِ گرامی خَطَایَاکُمْ میں متعدد قرأتیں ہیں۔

۱۔ شیخ جحدری رحمۃ اللہ علیہ نے خطیئتکم، مدہ، ہمزہ اور اس کے بعد تا مرفوع واحد پڑھا۔

۲۔ شیخ اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے مدہ، ہمزہ، اس کے بعد الف اور تا مکسورہ۔

۳۔ امام حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یوں ہی پڑھا البتہ تا پر پیش۔

۴۔ شیخ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے خطایاکم، طا کے بعد یا سے پہلے ہمزہ ساکن۔

۵۔ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یا کے بعد ہمزہ ساکن اور کاف۔

۶۔ شیخ کسائی رحمۃ اللہ علیہ طا اور تا دونوں کے نیچے زیر اور باقی قراء نے یا میں امالہ کیا ہے۔

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ کی تفسیر

یہاں محسن سے مراد وہ شخص ہے جو مذکور حکم یا جو تمام احکام بجالایا۔ بصورت اول اضافی وعدہ یا منافع دنیا کے بارے میں ہے یا منافع دین کا، احتمال اول میں معنیٰ ہوگا جو یہ حکم بجالایا اسے دنیا میں وسعت اور اس بستی کے علاوہ بھی بستیوں کی فتح دیں گے اور احتمالِ ثانی میں معنی یہ ہوگا جو ہماری طاعت وتوبہ بجالایا اس کی خطائیں ہم معاف کریں گے اور اس لیے اضافہ یہ کہ انہیں ثوابِ عظیم سے نوازیں گے۔ جیسا کہ فرمایا

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۱پ۔یونس:۲۶)

بھلائی والوں کیلئے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

ہم احسان کے بدلے احسان اور اس پر اضافہ فرمائیں گے جیسا کہ ایک نیکی کے عوض دس اور اس سے زائد دی جاتی ہیں اور محسن سے مراد وہ ہے جو توبہ وطاعات بجالایا تو معنی ہوگا ہم تمہارے حالت سجدہ میں داخلہ اور تمہارے قول حطہ کو مغفرت ذنوب میں مؤثر کردیں گے۔ پھر جب تم دیگر طاعات بجالاؤ گے تو ہم ان طاعات زائدہ پر ثواب عطا کریں گے۔

آیت کا ایک اور معنی بھی ہوسکتا ہے، جو خاطی تھا ہم نے اس فعل کے عوض اس کے گناہ معاف فرمادیے اور جو خاطی نہ تھا بلکہ محسن تھا ہم نے اس کے احسان میں اضافہ کرتے ہوئے اس کی طاعت کو حسنات میں لکھ دیا اور اس میں ہم نے اپنی طرف سے اضافہ بھی عطا کیا تو اہلِ ایمان کیلئے مغفرت اور فرمانبرداروں کیلئے اضافہ ہوگا۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کی تفسیر

یہاں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "فَبَدَّلَ" کے الفاظ بتا رہے ہیں انہوں نے حکم پر عمل ہی نہیں کیا نہ یہ کہ وہ اس کے بدل کے طور دوسرا لفظ لائے کیونکہ تبدیلی قول کا استعمال مخالفت میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ

(پ۲۶-الفتح:۱۱تا۱۵)

اب تم سے کہیں گے جو گنوار پیچھے رہ گئے تھے کہ ہمیں ہمارے مال اور گھر والوں نے مشغول رکھا اب حضور ہماری مغفرت چاہیں اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ تم فرماؤ تو اللہ کے سامنے کسے تمہارا کچھ اختیار ہے اگر وہ تمہارا برا چاہے یا تمہاری بھلائی کا ارادہ فرمائے بلکہ اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے بلکہ تم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ رسول اور مسلمان ہرگز گھروں کو واپس نہ آئیں گے اور اسی کو اپنے دلوں میں بھلا سمجھے ہوئے تھے اور تم نے برا گمان کیا اور تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے اور جو ایمان نہ لائے اللہ اور اس کے رسول پر تو بیشک ہم نے کافروں کیلئے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اب کہیں گے پیچھے بیٹھ رہنے والے جو تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دو وہ چاہتے ہیں اللہ کا کلام بدل دیں۔

تو یہاں قول میں اختلاف نہیں بلکہ عمل مخالف تھا اسی طرح معاملہ یہاں ہے تو اب یہ معنی یہ ہوا انہیں جب تواضع اور سوال مغفرت کا حکم دیا تو انہوں نے اللہ کے حکم پر عمل نہ کیا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

دوسرا قول: جمہور مفسرین کہتے ہیں یہاں تبدیلی سے مراد بطور بدل دوسرا لفظ لانا ہے س لیے تبدیل، بدل سے مشتق ہے لہٰذا حصول بدل کا ہونا ضروری ہوگا جیسے کہا جاتا ہے "فُلَانٌ بَدَّلَ دِيْنَهُ" (یعنی وہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہو گیا) اس قول کی تائید یہ ارشادِ باری بھی کرتا ہے: "قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ"

پھر اس بارے اختلاف ہے کہ یہ قول وفعل کیا تھا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جس دروازہ سے انہیں حالت سجدہ میں گزرنے کا حکم تھا اس میں وہ گھسیٹ کر یہ کہتے ہوئے گزرے: "حِنْطَةٌ مِنْ شَعِيْرَةٍ" (جو سے گندم)

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ہے وہ پشت کر کے استہزاءً یہ کہتے ہوئے گزرے: حنطة "(گندم)

حضرت ابنِ زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مذاق کرتے ہوئے انہوں نے کہا: موسیٰ ہمارے ساتھ حطہ کی صورت میں مذاق کررہے ہیں۔ الفاظ مبارک "اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ اسی لیے فرمایا کہ وہ دنیا اور دین کی خیرات میں نقصان کیلئے کوشاں تھے یا اس لیے کہ انہوں نے اپنے نفوس کو نقصان پہنچایا اور یہ ظلم ہی ہے جیسا کہ پہلے گزرا

'فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ' کی تفسیر

یہاں دو فوائد ہیں:

پہلا فائدہ: "اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" کے تکرار سے ان کے معاملہ کی قباحت اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر نزول عذاب پر یقین کا اظہار ہے۔

دوسرا فائدہ: رجز سے مراد عذاب ہے اور اس پر دلیل یہ ارشادِ پاک ہے

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ — جب ان پر عذاب پڑتا کہتے: اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے پاس ہے

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے

لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ (پ۹-الاعراف: ۱۳۴) — بیشک اگر تم ہم پر عذاب اٹھاؤ گے تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ کر دیں گے

شیخ زجاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں رجز اور رجس دونوں بمعنیٰ عذاب ہیں۔

'بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ' کی تفسیر

فسق، بمعنٰی خروج، جب کھجور اپنی گٹھلی سے نکلے تو فسقت الرطبة کہا جاتا ہے۔ شریعت میں اللہ تعالیٰ کی طاعت سے معصیت کی طرف نکلنا۔ شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں فسق وہ ظلم ہی ہے جس کا تذکرہ "عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" میں ہے اور تکرار کا فائدہ تاکید ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ دو وجوہ کی بنا پر تکرار نہیں:

پہلی وجہ: ظلم کبھی صغائر سے ہوتا ہے اور کبھی کبائر سے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے بارے میں بھی ظلم کا لفظ آیا ہے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا اور اس لیے بھی کہ فرمایا 'اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ' اگر ظلم کبیر ہی ہوتا تو یہاں لفظ عظیم تکرار ہوتا تو فسق کبائر سے

ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً ظلم کہا ثانیاً اسے فسق فرمایا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان کا ظلم صغائر سے نہیں کبائر سے ہے۔

دوسری وجہ: ممکن ہے وہ اسم ظالم کے مستحق عمل تبدیلی کی وجہ سے ہوں اور ان پر اس تبدیلی بلکہ اس سے پہلے فسق کی وجہ سے عذاب نازل ہوا ہو تو اس صورت میں تکرار نہیں رہے گا۔

دوسری قسم: اس آیت مبارکہ پر دوسری گفتگو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہی آیت سورۃ الاعراف میں ذکر کی ہے۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۚ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (پ۹-الاعراف:۱۶۱،۱۶۲)

یاد کرو جب ان سے فرمایا گیا اس شہر میں بسو اور اس میں جو چاہو کھاؤ اور کہو گناہ اترے اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہوں ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے۔ عنقریب نیکوں کو زیادہ عطا فرمائیں گے تو ان میں سے کئی ظالموں نے بات بدل دی اس کے خلاف جس کا انہیں حکم تھا تو انہوں نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا بدلہ ان کے ظلم کا

اذکار میں تبدیلی کا حکم

کچھ اہلِ علم نے "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" سے اس پر استدلال کیا کہ جو اذکار منقول ہیں ان میں تغیر و تبدیلی جائز نہیں۔ اصحاب شافعی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نماز کی تکبیر تحریمہ کسی بھی لفظ تعظیم اور تسبیح سے ادا نہیں ہو سکتی اور نہ ہی فارسی میں قرأت جائز ہے

شیخ ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: وہ اس لیے مذمت کے مستحق بنے تھے کہ انہوں نے تبدیلی ایسے دوسرے قول کے ساتھ کی جو پہلے کے ساتھ معنیٰ میں متضاد تھا لہٰذا وہ سزا کے مستحق ٹھہرے اگر لفظ دوسرا اور ہو مگر معنی باقی ہو تو پھر مذمت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ" کا ظاہر ہر اس کو شامل جو ایک قول کو دوسرے کے ساتھ بدل ڈالے خواہ ان میں معناً اتفاق ہو یا نہ ہو۔

چند سوالات

یہاں چند سوالات ہیں:

پہلا سوال: سورۃ البقرہ میں "وَاِذْ قُلْنَا" فرمایا اور اعراف میں "وَاِذْ قِيْلَ لَهُمْ"؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ابتدا قرآن میں تصریح کر دی کہ اس کی قائل خود اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے تاکہ ازالہ وہم ہو جائے۔ اسی

لیے اول کلام میں فرمایا "اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ" پھر ہر ہر نعمت کا شمار فرمایا تو اس مقام کے مناسب "وَاِذْ قُلْنَا" (جب ہم نے فرمایا) ہی تھا اور سورۃ الاعراف میں "وَاِذْ قِيْلَ لَهُمْ" فرمایا کیونکہ اب وہم کا ازالہ ہو چکا اس لیے کہ سورۃ البقرہ میں تصریح ہو چکی (کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس قائل ہے)

دوسرا سوال: سورۃ البقرہ میں "وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا" فرمایا اور اعراف میں "اُسْكُنُوْا"

جواب: دخول، سکونت سے مقدم ہوتا ہے یہاں دونوں ہی تھے لیکن پہلی سورت میں دخول کا ذکر کر دیا اور بعد کی سورت میں بعد والی چیز کا تذکرہ فرما دیا۔

تیسرا سوال: البقرہ میں فا کے ساتھ "فَكُلُوْا" فرمایا لیکن اعراف میں واؤ کے ساتھ "وَكُلُوْا"

جواب: اس کا ذکر پیچھے "وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا" کے تحت آ چکا ہے۔

چوتھا سوال: بقرہ میں "نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ" اور اعراف میں فرمایا: "نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ"

جواب: خطایا جمع کثرت جبکہ خطیئات جمع سالم۔ قلت کیلئے ہے جب بقرہ میں اس قول کی نسبت اپنی طرف فرمائی تو فرمایا: "وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ"۔ تو ایسی چیز کا اتصال ضروری تھا جو اس کے جود و کرم پر شاہد ہو اور وہ کثیرہ ذنوب کی مغفرت ہے۔ لہٰذا جمع کا وہ لفظ لایا گیا جو کثرت پر دال ہے اور اعراف میں قول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ فرمایا: "وَاِذْ قِيْلَ لَهُمْ" تو جمع قلت کا تذکرہ ہی مناسب تھا۔ حاصل یہ ہے کہ جب فاعل کا ذکر آیا تو اس کے کرم کے شایانِ شان کثیر خطایا کی مغفرت کا ذکر ہی مناسب تھا لیکن جب فاعل کا نام نہیں لیا گیا تو کثرت کا ذکر بھی نہ کیا۔

پانچواں سوال: بقرہ میں "رَغَدًا" لیکن اعراف میں حذف کر دیا۔

جواب: یہ خطایا اور خطیئات کے طریق پر ہی ہے جب فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی تو وہاں انعام اعظم کا ذکر کیا کھاؤ بے ٹوک اور جب فعل کی نسبت اپنی طرف نہ کی تو انعام اعظم کا تذکرہ بھی نہ کیا۔

چھٹا سوال: بقرہ میں فرمایا: وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ لیکن اعراف میں موخر "قُوْلُوْا حِطَّةٌ" کو مقدم کر دیا۔

جواب: واؤ صرف جمع کیلئے آتا ہے۔ (نہ کہ ترتیب کیلئے) اور دوسری یہ بات بھی ہے یہ بھی احتمال ہے مخاطب لوگوں میں بعض گناہ گار ہوں اور بعض نہ ہوں تو گناہ گار کا اشتغالِ عبادت سے پہلے گناہوں کے اسقاط میں مشغول ہونا ضروری ہے اس لیے کہ توبہ از گناہ مستقبل میں عبادات میں مصروفیت ہونے سے پہلے ہوتی ہے۔ تو اب لوگوں کو پہلے حطہ کا مکلف بنایا گیا پھر باب سے حالت سجدہ میں گزرنے کا حکم دیا اور جو لوگ گناہ گار نہ تھے ان کیلئے اولاً عبادت اور ثانیاً توبہ کا ذکر ہی اولیٰ تھا تاکہ نفس میں عاجزی

ہو اور عبادت پر گھمنڈ نہ ہو تو ایسے لوگ اولاً حالت سجدہ میں داخل ہوں اور ثانیاً یہ حطہ کہیں۔ جب ان دونوں اقسام کا احتمال ہے تو اب ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ دونوں کا دو سورتوں میں ذکر لاتا۔

ساتواں سوال: بقرہ، میں واؤ کے ساتھ "وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ" فرمایا جبکہ اعراف میں واؤ کے بغیر "سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ" فرمایا۔

جواب: اعراف میں دو چیزوں کا تذکرہ ہے:

۱۔ قول حطہ۔ یہ توبہ کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ حالت سجدہ میں دخول باب۔ یہ عبادت کی طرف اشارہ ہے۔

پھر ان کی دو جزا کا ذکر فرمایا:

۱۔ "نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ" (ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے) یہ حطہ کے مقابل ہے۔

"سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ" (ہم نیکوں کو زیادہ دیں گے) یہ حالتِ سجدہ میں دخول باب کے مقابل ہے

تو یہاں واؤ ترک کر دیا کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ دونوں ہر ایک کے مقابل اور جزا ہیں۔ (اس صورت میں یہ الگ الگ کی جزا ہیں) لیکن بقرہ میں دو افعال کے مجموعہ کو مجموعی طور پر مغفرت اور اضافہ کو بطور جزا بیان کر دیا۔

آٹھواں سوال: بقرہ میں فرمایا: "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا" تو اعراف میں "مِنْهُمْ" کے اضافہ کی کیا حکمت ہے؟

جواب: سورۂ اعراف میں "منهم" کے اضافہ کی حکمت یہ ہے کہ یہاں واقعہ کی ابتدا یوں ہوئی۔ فرمایا:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (پ ۹۔الاعراف:۱۵۹)

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے کہ حق کی راہ بتاتا اور اسی سے انصاف کرتا

یہاں فرمایا کہ ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہوں نے یہ کہا: اس کے بعد انعامات اور اوامر کا تذکرہ آیا جب واقعہ اختتام پذیر ہونے لگا تو فرمایا: "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ" تو یہاں بھی "مِنْهُمْ" کا ذکر کیا تاکہ اول و آخر میں موافقت ہو جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ظالم، ان میں سے ہدایت پانے والے کے مقابل ہو گئے تو پہلے ذکر امت عادلہ (نیک) کا ہوا اور پھر امت جابرہ (ظالم) کا اور یہ دونوں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ہی تھے۔ یہاں لفظ "مِنْهُمْ" لانے کا سبب یہی ہے

بقرہ میں "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" سے پہلے قوم کے درمیان کسی امتیاز و تخصیص کا ذکر نہیں ہوا حتیٰ کہ واقعہ کے آخر میں تخصیص لازم ہو جاتی تو اب فرق واضح ہو گیا۔

نواں سوال: سورۂ بقرہ میں "فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا" فرمایا لیکن سورۂ اعراف میں "فَاَرْسَلْنَا"

جواب: لفظ انزال میں ابتدائی طور پر عذاب کی آمد پر دلالت ہے جبکہ ارسال میں عذاب کا ان پر تسلط اور ان کا بالکل استیصال ہے اور یہ آخرت میں ہوگا۔

دسواں سوال: بقرہ میں "يَفْسُقُوْنَ" فرمایا جبکہ اعراف میں "يَظْلِمُوْنَ"

جواب: اللہ تعالیٰ نے جب بقرہ میں ان کے ظلم کو فسق قرار دے دیا تو اعراف میں لفظ ظلم پر ہی اکتفا فرمایا کیونکہ فسق کا ذکر بقرہ میں آچکا ہے۔ واللہ اعلم۔

[۶۰] وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کیلئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا کھاؤ اور پیو اللہ کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو)

عام قراء نے اثنتا عشرۃ شین پر سکون پڑھا جبکہ شیخ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے شین کے نیچے زیر بعض نے اس پر زبر پڑھی ہے۔ وجہ اول یہی ہے یہ اخف ہے اور اکثر قراء کا موقف ہے۔

نویں انعام کا تذکرہ

یہ بنی اسرائیل پر شمار کردہ انعامات میں سے نواں ہے اور جو دنیا و دین کی نعمتوں کا جامع ہے۔ دنیاوی اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کے ذریعے ان کی حاجت شدید پوری فرمادی ورنہ وہ مقام تیہ میں مرجاتے جیسا کہ اگر ان میں منّ وسلویٰ نہ اترتا پھر بھی ہلاک ہوجاتے۔ باری تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ　　　　اور ہم نے انہیں خالی بدن نہ بنایا کہ کھانا نہ کھائیں

(پ۱۷-الانبیاء:۸)

دوسرے مقام پر پانی کے بارے میں فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (پ۱۷، الانبیاء:۳۰) اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی

بلکہ مقام تیہ میں پانی کا انعام، معمول کے مطابق پانی سے اعظم ہے کیونکہ جب انسان کو ویرانے میں پانی کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کی اُمید کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس لئے کہ وہاں پانی تو کجا سبزہ تک نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے عصا کی ضرب سے وہاں پانی نکالا تو واضح ہو گیا کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔

دینی نعمتیں اس لحاظ سے کہ یہ وجود صانع، اس کی قدرت اور علم پر نہایت ہی کامل دلائل ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدق پر بھی سب سے سچے دلائل ہیں۔

چند مسائل

پہلا مسئلہ: واقعہ تیہ میں پیش آیا

جمہور مفسرین کے رائے ہے کہ یہ استسقاء مقام تیہ پر ہوا اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے سایہ کیلئے بادل بھیجے اور ان پر منّ وسلویٰ نازل کیا۔ ان کے کپڑے نہ پرانے ہوئے اور نہ میلے۔ انہیں پیاس کا خوف لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے پانی عطا فرما دیا

شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مقام تیہ پر ایسے معجزہ کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا: یہ مستقل کلام ہے (اس کا پیچھے تعلق نہیں) اور استسقاء کا معنی بارش طلب کرنا ہے جیسا کہ قحط کے موقعہ پر لوگوں کا معمول ہے تو اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی جاری فرما کر بادل اور بارش سے بڑھ کر قبولیت فرمائی لیکن حق یہ ہے آیت مبارکہ میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ حق ہے یا وہ۔ اگرچہ اقرب یہی ہے کہ ایسا تیہ میں ہوا اور اس پر دو دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: آبادیوں میں اکثر پانی کی طلب نہیں کی جاتی البتہ شاذ و نادر۔

دوسری دلیل: یہ منقول ہے کہ وہ پتھر اپنے ساتھ اٹھائے چلتے کیونکہ وہ اسی لیے تھا جیسا کہ منّ وسلویٰ ان پر ہر سحر اُترتا اسی طرح پانی بھی ہر وقت ان کے لئے جاری رہتا اور یہ بات ایام تیہ کے ہی مناسب ہے۔

دوسرا مسئلہ: عصا کا تعارف

عصا، میں اختلاف ہے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہ عام درخت کا تھا۔ بعض نے کہا: یہ جنتی آبنوس سے تھا اس کی لمبائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد انور کے مطابق دس ہاتھ تھی۔ اس کی دو شاخیں تھیں جو تاریکی میں روشن ہوتیں۔

قرآن اس کی مقدار یہ بتاتا ہے کہ اس پر ٹیک لگائی جا سکتی تھی اور بہت بڑا اژدہا بن جاتا۔ یہ اس وقت ہے جب وہ لمبائی اور موٹائی میں کچھ بڑا ہو لیکن اس پر جو اضافہ بیان کیا جاتا ہے وہ قرآن سے ثابت نہیں۔

نوٹ: ایسے معاملات میں سکوت ہی لازم ہوتا ہے کیونکہ اس پر نہ نص قاطع ہے اور نہ اس پر کسی عمل کی بنیاد ہے حتیٰ کہ ہمیں اخبار احاد سے ظن حاصل کرنا پڑے لہٰذا ترک ہی اولیٰ ہے۔

تیسرا مسئلہ: پتھر کا تعارف

الحجر، میں الف لام اگر عہد خارجی ہے تو حجر معین کی طرف اشارہ ہوگا۔ منقول ہے کہ یہ کوہ طور کا پتھر تھا جسے ساتھ لے لیا گیا شکل میں مربع تھا۔ اس کی ہر طرف سے تین چشمے جاری ہوتے جو نہر کی صورت میں ہر قبیلہ کے پاس جاتے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ اور وسعت جگہ بارہ میل تھی۔ بعض نے کہا: یہ پتھر جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ آیا تھا وراثت میں منتقل ہوتے ہوتے حضرت شعیب علیہ السلام تک آیا انہوں نے پتھر اور عصا حضرت موسیٰ کو عطا فرمائے۔

بعض کہتے ہیں: یہ وہی پتھر ہے جس پر آپ نے غسل کے وقت کپڑے رکھے تھے جبکہ مخالفین نے آپ کو نامرد کہا تھا اور یہ کپڑے لے کر بھاگا۔ حضرت جبریل نے کہا: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے اس پتھر کو ساتھ رکھ لو، اس میں میری قدرت اور تمہارا معجزہ ہے۔ تو آپ اسے ہر سفر میں ساتھ رکھتے یا الف لام جنسی ہے یعنی اس شئی کو مارو جو حجر کہلاتی ہے۔

امام حسن سے ہے کہ کسی معین پتھر کو مارنے کا حکم نہ تھا۔ یہ قول حجت میں اظہر اور قدرت میں زیادہ واضح ہے۔

یہ بھی منقول ہے بنی اسرائیل نے کہا تھا اگر ہم ایسی جگہ جائیں جہاں پتھر نہ ہو تو ہمارا کیا بنے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سفر میں پتھر ساتھ رکھتے۔ جب وہاں ٹھہرتے تو آپ اسے رکھ دیتے اور عصا سے ضرب لگاتے تو چشمہ جاری ہو جاتا۔ ضرب لگاتے پانی بند ہو جاتا۔ کہنے لگے: اگر عصا موسیٰ گم ہو گیا تو ہم تو پیاسے مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی پتھر کو ضرب نہ لگاؤ بلکہ زبانی حکم دو یہ تمہاری فرمانبرداری کرے گا۔

پتھر کونسا تھا؟ بعض نے سنگ مرمر کہا اور ہر طرف سے وہ ہاتھ کے برابر تھا، بعض نے کہا وہ انسان کے سر کی طرح تھا، ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ ان تمام کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

چوتھا مسئلہ: "فَانْفَجَرَتْ" میں فا محذوف سے متعلق ہے یعنی فضرب فانفجرت (اس نے ضرب لگائی تو بہہ نکلا) یا عبارت یوں ہوگی "فان ضربت فقد انفجرت" (اگر تم ضرب لگاؤ گے تو پانی جاری ہو جائے گا)

یہاں چند سوالات ہیں:

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ نے عصا مارنے کا حکم دیا اگر بغیر ضرب پانی جاری ہو جائے کیا یہ جائز نہیں اور محذوف عبارت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

جواب: اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ضرب لگانے کا حکم دیں لیکن اس سے پہلے بقدر حاجت پانی عطا فرما دے۔

لیکن صحیح یہی ہے کہ انہوں نے ضرب لگائی تو پانی جاری ہو گیا اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو کوئی حکم دے اور وہ اسے بجا نہ لائے تو رسول عاصی قرار پائے گا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بغیر ضرب چشمہ جاری ہو جائے تو ضرب کا عمل عبث ہو جائے گا گویا اس کی ضرورت ہی نہ رہے

اور تیسری بات یہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ اس کی عبارت یوں ہے ''فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ'' (انہوں نے ضرب لگائی تو پانی

جیسے کہ باری تعالیٰ کے فرمان ''فَانْفَلَقَ'' میں یہی ہے ''فَضَرَبَ فَانْفَلَقَ'' (آپ نے ضرب لگائی تو سمندر پھٹ گیا)

دوسرا سوال: یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَانْفَجَرَتْ'' لیکن اعراف میں ہے فَانْبَجَسَتْ۔ ان دونوں میں تضاد ہے کیونکہ انفجار کثیر پانی اور انجاس قلیل پانی ہوتا ہے۔

جواب: اس کا جواب تین طرح پر ہے:

۱۔ الفجر، اصلاً شق ہونے کے معنی میں ہے۔ انفجار، انشقاق اس سے فاجر جو فسق کی طرف نکلنے کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرتا ہے۔ انجاس، قلیل اور تنگ شق ہونا ان میں عموم وخصوص والا اختلاف ہے نہ کہ متضاد۔

۲۔ ممکن ہے اولاً قلیل پانی جاری ہو ثانیاً کثیر جیسے چشموں میں ہوتا ہے ابتداً تھوڑا پانی ظاہر ہوتا ہے پھر دائمی طور پر نکلنے کی وجہ سے کثیر ہو جاتا ہے۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے ان کی ضرورت پہلے شدید تھی پانی کثیر آیا جیسے جیسے حاجت کم ہوئی پانی بھی قلیل ہوتا گیا۔

تیسرا سوال: چھوٹے پتھر سے اس قدر کثیر پانی کا خروج عقل کیسے مان لے؟

جواب: سائل، وجودِ فاعل مختار (اللہ تعالیٰ) کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ اگر مانتا ہے تو سوال ختم اس لیے کہ وہ قادر ہے جسم کو جیسے چاہے پیدا فرما دے جیسے کہ سمندر وغیرہ کو پیدا فرمایا ہے اور اگر نہیں مانتا تو اسے قرآن کے معانی اور تفسیر پر غور وفکر سے کیا فائدہ؟ اور یہ ان تمام معجزات کے بارے میں جواب ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور عقل انہیں بعید سمجھتا ہے۔ مثلاً مردوں کا زندہ ہونا، گونگے اور بہروں کا صحت مند ہونا وغیرہ

یہ بھی سامنے رہے کہ فلاسفہ اسے یقینی طور پر غلط نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے ہاں عناصر اربعہ میں ہیولٰی مشترک ہے وہ کہتے ہیں اس پر کون و فساد دونوں طاری ہو سکتے ہیں ہوا کا پانی بننا اور اس کا عکس صحیح ہے اسی طرح اگر ہوا کو چاندی کے کوزے میں رکھیں تو وہ منجمد ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے اردگرد سے پانی کے قطرے حاصل کرتی ہے اور وہ قطرے اس لیے ہوتے کہ ہوا پانی بن جاتی ہے لہٰذا ثابت ہوا ان کے ہاں بھی ایسا فی الجملہ ہو سکتا ہے اور حرارت سفلیہ، اتصالات فلکیہ کے تابع ہیں تو یہ کوئی بعید نہیں کہ اتصال فلکی ایسا ہو جو اس عالم میں ایسے نادر معاملہ کے وقوع کا تقاضا کرے۔ لہٰذا فلاسفہ ایسی بات کو قطعی طور پر غلط نہیں کہہ سکتے۔

رہے معتزلہ تو وہ یہ مانتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے تو ہم انہیں کہتے ہیں تو پھر بندے کا خلق جسم پر قادر ہونا کیوں جائز نہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں دو نہایت ہی ضعیف دلائل دیئے ہیں جن کا تذکرہ ہم آیت سحر کے تحت کر کے ان کا ضعف اور بطلان واضح کر دیں گے۔

جب حقیقت یہی ہے تو وہ قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے ورنہ معجزات اور کرامات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اہلِ سنت تو یہ مانتے ہیں کہ موجد اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے اور تمام خارق عادت افعال کو وہی پیدا فرماتا ہے لہٰذا ان کا یہ استدلال درست ٹھہرا کہ ان کا ظہور مدعی کے ہاتھوں ہوتا ہے تاکہ اس کا صدق ثابت ہو۔

چوتھا سوال: کیا تم یہ کہتے ہو وہ پانی پتھر میں تھا پھر ظاہر ہوا یا اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پانی بنا دیا یا ابتداً ہی پانی پیدا فرمایا؟

جواب: اول صورت باطل ہے کیونکہ جسم صغیر تداخل کے علاوہ جسم عظیم پر محیط نہیں ہو سکتا اور یہ محال ہے آخری دونوں وجہ کا احتمال ہے۔ وجہ اول کی صورت میں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اجزاء ہوا کی خشکی ختم فرمائے ان میں رطوبت پیدا فرما دی ہو اور وجہ ثانی میں اجزاء کو پیدا فرما کر ان میں رطوبت رکھ دی۔

واضح یہاں گفتگو اسی طرح کی ہے جیسے حضور ﷺ سے بعض غزوات میں معجزات کا صدور ہوا پانی کم تھا آپ ﷺ نے برتن میں ہاتھ رکھا آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے چشمے بہہ نکلے حتیٰ کہ تمام صحابہ کو وہ پانی پورا ہو گیا۔

پانچواں سوال: اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ افضل ہے یا حضور ﷺ کا؟

جواب: ہر ایک ہی کامل اور قاہر معجزہ ہے لیکن حضور ﷺ کا اقویٰ ہے اس لیے کہ پتھر سے پانی کا جاری ہونا معمول ہے لیکن انگلیوں سے چشموں کا بہہ نکلنا خلاف معمول ہے لہٰذا یہ اقویٰ ٹھہرے گا۔

چھٹا سوال: بارہ چشمے کیوں بنائے؟

جواب: لوگ کثیر تھے اور جب کثرت اور پانی کی حاجت شدید تھی تو ان کا آپس میں جھگڑنا اور تنازعہ ممکن تھا بلکہ بعض اوقات ایسا

تنازعہ فتنہ عظیم کا سبب بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس انعام کو کامل کر دیا اور ہر قبیلہ کیلئے ایک چشمہ جاری فرمایا اور معمول یہ ہے کہ دوسرے قبائل سے لڑائی کا امکان ہوتا ہے جبکہ آپس میں نہیں ہوتی۔

ساتواں سوال: پانی کا جاری ہونا، معجزہ ہونے پر کس کس طرح دال ہے؟

جواب: متعدد وجوہ سے دال ہے:

۱۔ ظہور ماء خود معجزہ ہے۔

۲۔ چھوٹے پتھر سے اس قدر کثیر پانی کا خروج۔

۳۔ ان کی ضرورت کے مطابق پانی کا نکلنا۔

۴۔ ضربِ عصا کی وجہ سے پانی کا نکلنا۔

۵۔ ضرورت نہ رہنے پر پانی کا ختم ہو جانا۔

ان پانچوں وجوہ کا حصول اسی وقت ہوگا جب تمام ممکنات میں قدرت تامہ نافذہ، جمیع معلومات کا علم اور دہر وزمانہ پر حکمتِ عالیہ ہو اور یہ شان سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ کی تفسیر

انہوں نے اپنا گھاٹ اس لیے پہچان لیا کہ ان میں سے ہر ایک کو یہی حکم تھا کہ وہ اپنی معین نہر سے پانی پیئے تاکہ حاجت ماء کے وقت ان میں تنازعہ نہ ہو جائے۔ گھاٹ کی نسبت ان کی طرف کی جانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ہر قبیلہ کیلئے ان کی جہت سے نکلنے والے پانی کو مباح فرما دیا تو ان کی ملکیت کی طرح ہو گیا لہٰذا ان کی طرف اضافت جائز ہو گئی۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ کی تفسیر

یہاں عبارت محذوف ہے ہم نے ان سے یا موسیٰ نے ان سے کہا: کھاؤ اور پیو۔ کلوا (کھاؤ) کہنے کی دو وجہ ہیں۔

پہلی وجہ: جیسے منّ وسلویٰ کا تذکرہ آیا ہے گویا فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں بصورت منّ وسلویٰ بغیر مشقت ومحنت کے تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ اور اس پانی سے پیو۔

دوسری وجہ: غذائیں پانی کے ساتھ ہی ہوتی ہیں جب انہیں پانی عطا کیا تو گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں ماکول ومشروب عطا فرما دیا۔ معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ حلال ہی رزق ہوتا ہے نہ کہ حرام اس لیے کہ "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو) کا

حکم کم از کم اباحت پر دلیل ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ رزق کا مباح ہونا ضروری ہوگا اگر حرام بھی رزق ہو تو رزق کا مباح وحرام دونوں ہونا لازم آجائے گا جو جائز نہیں۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ کی تفسیر

عثی ، سب سے بڑا فساد، ان سے کہا جا رہا ہے کہ لڑائی کے وقت فساد میں زیادہ نہ بڑھو اس لیے کہ وہ اس میں نہایت ہی تجاوز کرنے والے تھے، مقصود یہ ہے کہ پانی کی شدید حاجت کے وقت لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے تو گویا فرمایا اگر پانی کی وجہ سے لڑائی ہو جائے تو تنازعہ میں زیادتی نہ کرو۔ واللہ اعلم

[۶۱] وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

(اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اُگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے۔ یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا)

مشہور قرأت ''یُخْرِجْ لنا'' یا پر پیش اور را کے نیچے زیر ''تُنْبِتُ'' تا پر پیش، با کے نیچے زیر ہے۔ امام زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ ''یَخْرُجْ'' کی یا پر زبر اور را پر پیش اور ''تَنْبُتُ'' میں تا، پر زبر اور با پر پیش پڑھا کرتے۔

یہ سوال نافرمانی نہیں

اکثر ظاہری مفسرین کہتے ہیں کہ ان کا یہ مانگنا معصیت تھی حالانکہ ہمارے نزدیک معاملہ ایسے نہیں۔ اس پر دلیل اسی آیت سے ہے ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا'' کے الفاظ ہیں جو منّ وسلویٰ کے نزول کے وقت فرمائے اور یہ حکم ایجابی نہیں بلکہ مباح ہے جب حقیقت یہی ہے تو ان کا قول ''لَن نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ'' معصیت نہ ہوگا اس لیے کہ جس کیلئے ایک طعام مباح ہو اس کیلئے دوسرے کا مطالبہ درست ہوتا ہے خواہ وہ خود کرے یا بواسطہ رسول۔ جب ان کے ہاں یہ بات مسلمہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا زیادہ قبول ہے تو ان کا یہ عمل درست تھا اور اس میں کوئی معصیت نہیں۔

دوسرے طعام کے سوال کی مختلف اغراض

اس کی متعدد اغراض ہو سکتی ہیں:

پہلی غرض: جب ایک قسم کا طعام انہوں نے چالیس دن تک کھایا تو وہ اس سے پریشان ہو گئے لہٰذا دوسرے کی تمنا کی۔

دوسری غرض: شاید اصل خلقت کے لحاظ سے یہ کھانا ان کا معمول ہو ان کے عادت ہر قسم کے کھانے ہوں، بچپن میں جو آدمی کا معمول بن جائے، اگرچہ وہ ادنیٰ درجہ کا ہو تو اس میں اس کی رغبت وشوق غیر عادی سے زیادہ ہوگی اگرچہ وہ غیر عادی اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔

تیسری غرض: شاید وہ تیہ میں رہ رہ کر تھک گئے، انہوں نے ایسے کھانوں کا سوال اٹھایا جو شہروں میں ہی تھے تو ان کا مقصد شہر [illegible] جانے۔

چوتھی غرض: کسی ایک کھانے پر ہی ہمیشہ اکتفا کر لینا نقصان شہوت، ضعفِ ہضم اور قلت رغبت کا اور مختلف کھانوں کا تناول، تقویت شہوت اور کثرت لذت کا سبب ہوتا ہے تو ثابت ہوگا ایک قسم کی جگہ دوسری کا مطالبہ عقلاء کا مقصود ہوتا ہے تو ان میں ایسی کوئی شہادت نہیں جو بتائے کہ یہ عمل ممنوع ہے۔

تو ثابت ہو گیا یہ معصیت نہیں اور اس کی تائید اس ارشادِ ربانی سے ہو رہی ہے۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ — اچھا مصر (یا کسی شہر میں) اُترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا

یہ تو ان کی دعا کی مقبولیت کی طرح ہے اگر وہ اس میں عاصی وگنہگار ہوتے تو اس کیلئے دعا بھی معصیت ونافرمانی ٹھہرتی

حالانکہ ایسی بات حضرات انبیاء علیہم السلام سے صادر نہیں ہو سکتی۔

یہ سوال نہیں، کیا جا سکتا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ عطا کو جب قبول نہ کیا تو ان کے مطالبہ کے مطابق انہیں دے دیا گیا جیسا کہ فرمایا:

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا — اور جو دنیا کی کھیتی چاہے ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے

(پ ۲۵، الشوریٰ:۲۰)

کیونکہ ہم جواباً کہہ سکتے ہیں یہ بات خلاف ظاہر قرآن ہے۔

معصیت ہونے پر دلائل

اس سوال کو معصیت قرار دینے والوں کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل: ان کا قول "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ" واضح کر رہا ہے کہ وہ انزالِ منّ وسلویٰ کو ناپسند جانتے اور یہ ناپسندیدگی معصیت و نافرمانی ہے۔

دوسری دلیل: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمانا:

أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ — کیا تم ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو

استفہامِ انکاری ہے اس کے معصیت ہونے کو واضح کر رہا ہے۔

تیسری دلیل: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے مطلوبہ کھانے کو ادنیٰ اور پہلے کو خیر و بہتر فرمایا۔ یہ بھی ہماری تائید ہے۔

جوابات کے دلائل

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ" کی دلالت اس پر نہیں کہ وہ فقط اسے پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر ہے کہ وہ دوسری شی مانگ رہے ہیں اس لیے کہ "لَنْ نَّصْبِرَ" کی مستقبل پر دلالت ہے کیونکہ کلمہ "لَنْ" نفی مستقبل کیلئے آتا ہے تو اس کی دلالت اس پر نہیں کہ ملنے والے کھانے کو ناپسند جانتے تھے

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ استفہام انکاری کبھی اس پر ہوتا ہے کہ تم دنیا کی زیادہ نفع مندشی سے محروم ہو رہے ہو اور کبھی اس میں آخرت کے لحاظ سے انفع سے محرومی پر دلالت ہوتی ہے۔

تیسری کا جواب جو اس کے قریب ہی ہے کہ شی کو بعض اوقات خیر و شر اس لیے کہہ دیا جاتا، کہ اس سے نفع موجود اور یقینی ہے اس لحاظ سے کہ وہ فری بلا مشقت حاصل ہے جیسا کہ موجود شی کے بارے میں کہا جاتا ہے اور غائب میں ملنے کا شک ہوتا ہے لہٰذا اسے ادنیٰ کہہ دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ محنت کے بغیر حاصل نہ ہوگی اور نہ اس کا حصول یقینی ہوتا ہے تو ممکن ہے "اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ" کا مفہوم یہی ہو یا اس کا بعض ہو لہٰذا ان کا یہ سوال معصیت نہیں بلکہ مباح ہے، جب بات واضح ہوگئی تو ارشاد گرامی

وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ　　اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری اور وہ خدا کے غضب میں لوٹے

یہ ماقبل پر سزا نہیں بلکہ اس کے بعد کیلئے ہے جو فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ　　یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے

تو واضح ہوگیا ان پر ذلت و مسکنت کا تسلط اور ان کا محلِ غضب و عتاب بننا ان کے کفر کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ انہوں نے دوسرے کھانے کا سوال کیا تھا۔

دوسرا مسئلہ: مراد ایک طریق ہے

ارشادِ ربانی "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ" سے ایک ہی قسم کا کھانا مراد نہیں بلکہ ان کا ایک طریق پر ہونا مراد ہے۔ مثلاً ... کا ایک ہی طریق و نہج ہو تو کہا جاتا ہے فلاں کے دستر خوان پر طعامِ واحد ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: قرأت قِثَّائِهَا

وَقِثَّآئِهَا، میں مشہور قرأت قاف کے نیچے زیر ہے، امام اعمش اور طلحہ نے قاف پر پیش پڑھی ہے 'وَفُوْمِهَا' میں مشہور قرأت فاء کے ساتھ ہے۔ حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسے "وثومها" پڑھا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے۔ مفسرین کہتے ہیں یہ لفظ بصل کے زیادہ مناسب ہے۔

معنی فوم میں اختلاف

فوم کے بارے میں اختلاف ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک گندم مراد ہے، انہی سے منقول خبز ہے اور یہ حضرت مجاہد، عطاء اور ابن زید رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، بعض عرب سے محاورہ منقول ہے فوموا لنا۔ یعنی ہمارے لیے خبز لاؤ۔

بعض نے کہا: ثوم (لہسن) مراد ہے اور یہی حضرت ابن عباس اور مجاہد سے بھی مروی ہے۔ شیخ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہی اختیار کیا۔ اس پر دلائل یہ ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قرأت میں 'وثومھا' ہے۔

۲۔ اگر اس سے مراد گندم ہوتی تو یہ کہنا کہاں جائز ہوتا: أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ۔ اس لیے کہ گندم سب سے اعلیٰ طعام ہے۔

۳۔ ثوم، حطہ عدس اور بصل کے زیادہ موافق ہے۔

چوتھا مسئلہ: قرأت مشہور 'اَتَسْتَبْدِلُوْنَ' ہے لیکن حضرت ابی بن کعب 'اَتَبْدِلُوْنَ' باء ساکن پڑھتے۔ شیخ زہیر فرقبی "اَدنأ" "دناءۃ" سے مشتق مانتے اور ہمزہ کے ساتھ پڑھتے۔

ادنیٰ سے مراد میں اختلاف ہے

خلاصہ گفتگو یہ ہے یہ چیز دینی مصلحت میں ادنیٰ ہوگی یا منفعتِ دنیا میں۔ پہلی صورت مراد نہیں اس لیے کہ جس طعام پر وہ پہلے تھے اگر وہ دینی اعتبار سے ان کے مطلوبہ طعام سے انفع ہوتا تو ان کی سنی نہ جاتی حالانکہ سنی گئی اور فرمایا "اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ" تو اب مراد منفعت دنیا ہی ہے۔ پھر یہاں یہ مراد لینا جائز نہیں کہ جس پر تم ہو وہ تمہارے مطلوبہ طعام سے افضل ہے کیونکہ ہم پہلے واضح کر چکے کہ بعض اوقات ایک کھانا کچھ لوگوں کے ہاں لذیذ ہوتا ہے لیکن بعض کے ہاں ناپسند بلکہ مراد وہ ہی ہے جو ہم نے ذکر کیا کہ منّ وسلویٰ کا حصول یقینی ہے اور جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس کا حصول مشکوک ہے اور یقینی شی، مشکوک سے بہتر ہوا کرتی ہے یا اس لیے کہ یہ منّ وسلویٰ بغیر محنت مل رہا ہے بلکہ تمہارا مطلوب، مشقت ومحنت کے بعد ملے گا لہٰذا پہلا طعام اولیٰ ہے۔

یقینی شی غائب سے بہتر

سوال: وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو ہمیں فری بغیر محنت کے مل رہا ہے چونکہ ہماری طبع اسے ناپسند کرتی ہیں لہٰذا اس طعام کا تناول ہمارے لیے اس سے زیادہ شاق ہے جسے ہماری طبائع پسند کرتی ہیں اگرچہ ہمیں وہ مشقت کے بعد ہی ملے۔

جواب: ہم تسلیم کرتے ہیں اس اعتبار سے تعارض آسکتا ہے لیکن ہمارے قول کو اس پر ترجیح حاصل ہوسکتی ہے کہ یقینی موجود شی، غائب مشکوک پر راجح ہی ہوا کرتی ہے۔

پانچواں مسئلہ: کونسا شہر مراد ہے

اِهْبِطُوْا، کی معروف قرأت باء کے نیچے زیر ہے لیکن اس پر پیش بھی پڑھا گیا ہے۔ مِصْرًا کی قرأت مشہور تنوین کے ساتھ ہے۔ دو سبب (معرفہ اور تانیث) کے باوجود یہ منصرف ہے کیونکہ اس کا وسط ساکن ہے جیسے کہ

وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَ لُوْطًا وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (پ۷-الانعام:۸۴-۸۶)

اور ان سے پہلے نوح کو راہ دکھائی اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو یہ سب ہمارے قرب کے لائق ہیں اور اسمٰعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی

یا عجمہ اور معرفہ ہے۔

اگر اس سے مراد شہر لیا جائے تو اس میں فقط ایک ہی سبب رہے گا، مصحف حضرت عبداللہ میں اور قرأت اعمش میں یہ بغیر تنوین ہے جیسے "اُدْخُلُوْا مِصْرا"

"اِهْبِطُوْا مِصْرًا" میں مفسرین کا اختلاف ہے حضرت ابن مسعود اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہما تنوین نہیں پڑھتے تھے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ الف کا اضافہ کاتب کی طرف سے ہے۔ یہ معرفہ ہے لہٰذا اس سے مخصوص شہر ہی مراد لینا چاہیے تو وہ شہر ہے جس میں فرعون رہتا تھا۔ یہی حضرت ابو العالیہ اور ربیع سے منقول ہے۔

جن لوگوں نے تنوین پڑھی اور یہی قرأت مشہورہ ہے ان کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: مراد فرعون کا شہر ہی ہے مگر اس پر تنوین لفظ نوح ولوط کی طرح ہے۔ دوسروں کا کہنا ہے یہ کسی بھی شہر میں داخلہ کا حکم ہے گویا فرمایا تم کسی بھی شہر میں چلے جاؤ جہاں تمہیں یہ اشیاء مل جائیں۔ الغرض مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ اس مصر سے مراد وہی شہر ہے جس میں یہ پہلے رہتے تھے یا کوئی اور شہر ہے۔ اکثر نے کہا: وہ سابقہ فرعون والا شہر مراد نہیں ہو سکتا، دلیل یہ ارشادِ ربانی ہے:

اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰى اَدْبَارِكُمْ (پ۶، المائدۃ:۲۱)

اس پاک زمین میں داخل ہوں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی ہے اور پیچھے نہ پلٹو

آیت سے تین طرح استدلال

اس سے تین طرح استدلال ہے:

۱۔ ''اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ'' اس زمین پر داخلہ کا حکم ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ کسی دوسری زمین پر داخلہ منع ہے۔

۲۔ ''كَتَبَ اللّٰهُ'' کے الفاظ کا تقاضا ہے کہ ان کا یہ قیام وہاں دائمی ہو۔

۳۔ ''وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ'' اس بارے میں صریح ہے کہ تم بیت المقدس سے واپس نہیں آسکتے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدس میں داخلہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا

فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ (پ۶، المائدہ:۲۶) تو وہ زمین ان پر حرام ہے۔ چالیس برس تک بھٹکتے پھریں زمین میں

تو پہلے داخلہ کا حکم دیا پھر واضح کر دیا کہ اس مدت کے دوران وہ اس (شہر) میں داخل نہیں ہو سکتے تو جب عذر زائل ہو گیا تو ان پر داخلہ لازم ہو جائے گا جب معاملہ یوں ہے تو اب مصر سے اس شہر کے علاوہ مراد لینا ناجائز ہوگا۔

ان دلائل کا ضعف

اگر یہ کہا جائے یہ دلائل ضعیف ہیں۔

پہلی دلیل: اس لیے کہ فرمان ''اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ'' امر ہے جو یہاں ندب کیلئے ہے تو ممکن ہے ان کیلئے اس ارض مقدس کا داخلہ مندوب و مستحب ہو باوجودیکہ انہیں دخول مصر سے منع نہ کیا گیا ہو۔

دوسری دلیل: اس لیے کہ فرمان ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' اس ندبیت و استحباب کے دوام پر دال ہو۔

تیسری دلیل: فرمان ''وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ'' کا معنی یہ نہیں کہ تم مصر نہیں جا سکتے بلکہ اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔

پہلا: اوامر و احکام میں نافرمانی نہ کرو کیونکہ عرب حکم کی نافرمانی کرنے والے کے بارے میں کہتے ہیں ''اِرْتَدَّ عَلٰى عَقِبِہٖ'' (اس نے حکم عدولی کی) یہاں عصیان سے مراد یہ ہے کہ داخلہ ارضِ مقدس کے اولیٰ ہونے کا انکار کیا جائے۔

دوسرا: نہی وقت معین تک فقط مخصوص ہو۔

ہم جواباً کہتے ہیں اصول فقہ میں ثابت ہے ظاہراً امر سے وجوب ہی مراد ہوتا ہے تو اس اصل کی بنا پر ہماری دلیل تام ٹھہری۔

اگر ہم اسے ندب کیلئے بھی تسلیم کرلیں تو ترک ندب کا اذن، ترک مندوب کا اذن ہوگا جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے شایان شان نہیں معترض نے جو کہا: "وَلَا تَرْتَدُّوْا" کا معنیٰ لوٹنا نہیں۔ ہم جواباً کہتے ہیں اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دخول ارض مقدس کا حکم دیا اور پھر فرمایا: "وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِكُمْ" تو اس سے فی الفور ذہن میں یہی بات جاتی ہے کہ نہی کا تعلق اس شی کے ساتھ ہی ہوگا جس کا تعلق امر سے ہے۔ قائل کا یہ کہنا، نہی کو وقت معین تک مخصوص رکھا جائے، ہم جواباً کہتے ہیں تخصیص خلاف ظاہر ہے

مراد شہر فرعون پر دو دلائل

شیخ ابو مسلم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں شہر فرعون مراد لینا جائز ہے اس پر دو دلائل ہیں:

پہلی وجہ: اگر ہم "اِهْبِطُوْا مِصْرًا" بغیر تنوین پڑھیں تو یہ یقیناً کسی معین شہر کا علم ہوگا اور تمام عالم میں اس نام کا کوئی شہر ہی نہیں۔ لہٰذا اسے شہر مصر پر ہی محمول کریں گے اور اس لیے بھی کہ لفظ میں علم اور وصف دونوں کا احتمال ہو تو علم پر محمول کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔ مثلاً ظالم اور حادث جب یہ دونوں بطور علم ہوں تو انہیں علمیت پر محمول کرنا ہی اولیٰ ہے۔

اگر ہم اس پر تنوین پڑھیں تو اب ہم اگر اسے اسم علم بنائیں تو ہم کہیں گے اس پر تنوین سکون وسط کی وجہ سے آئی ہے جیسا کہ نوح، لوط اب بھی تقریر سابقہ ہی ہوگی۔

اور اگر ہم اسے اسم جنس قرار دیں تو یہ فرمان "اِهْبِطُوْا مِصْرًا" اختیار کا تقاضا کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "اَعْتِقْ رَقَبَةً" (غلام آزاد کرو) تو اس میں تمام دنیا کے غلاموں کے حوالے سے اختیار ہے۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ارضِ مصر کا وارث بنایا، اگر وہ زمین ان کی وراثت ہے تو پھر وہاں ان کے داخلہ کو حرام قرار دینا ممنوع ہوگا "یہ ان کی وراثت ہے" پر دلیل ارشاد ربانی ہے:

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (پ۱۹-الشعراء:۵۷،۵۹)

تو ہم نے انہیں باہر نکالا باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے ہم نے ایسا ہی کیا اور ان کا وارث کردیا بنی اسرائیل کو

تو یہ ثابت ہے کہ وہ اس زمین کے وارث ہیں تو وہاں کا داخلہ ان پر کیسے حرام کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ وارث ہونا مفید ملک ہے اور ملکیت میں تصرف کی اجازت کاملہ ہوتی ہے۔

سوال: آدمی گھر کا مالک ہوتا ہے مگر کسی اور وجہ سے اس کا داخلہ وہاں ممنوع ہوسکتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنے اُوپر چند دن مسجد میں اعتکاف لازم کرلیتا ہے تو وہ گھر کا مالک ہے مگر وہاں داخلہ حرام ہے تو یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر کا وارث بنایا۔ یعنی اس میں تصرف کی اجازت دی مگر وہاں کا داخلہ ان پر ممنوع قرار دے دیا اس لیے کہ انہیں ارض مقدس میں ٹھہرنے کا حکم تھا

جواباً ہم کہتے ہیں ملکیت، تصرف ثابت کرتی ہے اور تصرف سے ممانعت خلاف دلیل ہے۔

دلائل کا رد

فریق اول نے شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں دلائل کا رد کیا۔ پہلی دلیل کا جواب یہ ہے ہم قرأت مشہورہ لیتے ہیں اور اس میں تنوین ہے رہا تمہارا کہنا یہ اختیار کا تقاضا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے بات درست ہے لیکن ہم مذکورہ دلیل کی بنا پر اس عموم کو نہیں مانتے

دوسری وجہ کا جواب یہ ہے ہمارا اختلاف اس میں نہیں کہ ملکیت سے تصرف ثابت ہوتا ہے البتہ کسی عارضہ کی وجہ سے اس اصل کو ترک کیا جا سکتا ہے مثلاً شی رہن یا کرایہ پر ہو اور مستاجرہ، لہٰذا ہم یہاں بھی دلیل مذکورہ کی وجہ سے اصل کو ترک کر رہے ہیں

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کی تفسیر

معنیٰ یہ ہے کہ ذلت نے ان کا اسقدر احاطہ کر لیا حتیٰ کہ وہ ان پر اس طرح غالب ہے جیسے کوئی قُبہ کے اندر ہو یا یہ ان کے ساتھ اس طرح چمٹ و متصل ہو گی جیسے مٹی دیوار کے ساتھ۔ ذلت کے حوالے سے اقرب یہی ہے اس سے مراد ان کا مستحق ہو جانا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فساد پھیلانے والوں کے بارے میں فرمایا:

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا — یہ ان کے لیے ذلت ہے دنیا میں

جزیہ مراد نہیں

کچھ لوگوں نے اس سے مراد جزیہ لیا جیسے کہ فرمان ہے:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ — جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں چھوٹے بن کر

(پ۱۰، التوبہ:۲۹)

لیکن یہ قول بعید ہے کیونکہ جزیہ ابتداً ہی ان پر مقرر نہیں ہوا تھا۔

ارشادِ ربانی "وَالْمَسْكَنَةُ" اس سے مراد فقر و فاقہ اور شدید مشقت ہے، یہ جنس عقوبت کی طرح بھی ہو سکتی ہے۔

کچھ علماء نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے قرار دیا ہے کہ آپ نے ان پر ذلت و فقر کے تسلط کی اطلاع دی اور اسی طرح ہوا تو غیبی خبر قرار پانے کی وجہ سے یہ کلام معجز ٹھہرا۔

وَبَآءُوْ کی تفسیر

اس کے چند معانی ہیں:

۱۔ البوء۔ رجوع تو "بَآءُوْ" کا معنی ہے وہ غضب کے ساتھ لوٹے، بآء کا استعمال شر میں ہی ہوتا ہے۔

۲۔ البوء۔ برابر ہونا "بَآءُوْ" کا معنی ہوگا ان پر اللہ کا غضب غالب آ گیا۔

۳۔ شیخ زجاج کہتے ہیں: "بَآءُوْ" وہ مستحق ہو گئے۔ اس پر ارشادِ ربانی ہے:

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ (پ۶، المائدہ: ۲۹)

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تیرا اور میرا گناہ دونوں تیرے ہی پلہ پڑیں تو تُو دوزخی ہو جائے اور بے انصافوں کی یہی سزا ہے

یعنی تو دونوں کے گناہ کا مستحق ٹھہرے گا، غضب الٰہی سے مراد ارادہِ انتقام ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ کی تفسیر

پہلے جس ذلت، مسکنت اور غضب کا ذکر ہے یہ اس کی علت ہے، معتزلہ کا کہنا ہے اگر ان میں کفر اللہ کی تخلیق کی وجہ سے آیا ہے، ذلت و مسکنت اس کی تخلیق سے آئی تو پھر کیا وجہ ان دونوں میں سے ایک دوسرے کی جزا برعکس کیوں ہے؟

اس کا جواب ہے کہ یہ مسئلہ علم اور داعی سے معارضہ ہے اور کفر کی حقیقت کا تذکرہ پیچھے آ چکا ہے۔

وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ کی تفسیر

معنی یہ ہے کہ یہ لوگ ان بد افعالیوں کی وجہ سے ہی ان عذابوں کے مستحق بنے ہیں۔ یہاں چند سوالات ہیں:

کفر کے بعد قتل کا ذکر

پہلا سوال: فرمانِ الٰہی "یَكْفُرُوْنَ" کے تحت قتلِ انبیاء داخل ہے پھر اس کا دوبارہ ذکر کیوں؟

جواب: وہاں آیاتِ الٰہیہ سے کفر کا ذکر تھا اور وہ ان سے جہل اور ان کا انکار ہے، اس کے تحت قتل انبیاء داخل نہیں۔

ناحق کا ذکر کیوں؟

دوسرا سوال: بِغَیْرِ الْحَقِّ فرمایا۔ حالانکہ قتل انبیاء اسی کی بنا پر ہوتا ہے؟

جواب: تین طرح سے جواب ہے۔

پہلا جواب: کبھی باطل کی بجا آوری حق ہوتی ہے مثلاً اسے بجالانے والے کے دل میں شبہ ہو اور وہ اسے حق اعتقاد کرتا ہو اور کبھی اسے اس کے باطل ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ دوسری کے زیادہ قبیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں تو "یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ" کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ ان کے اعتقاد و خیال میں یہ حق تھا بلکہ وہ اس کی قباحت کو جانتے تھے اس کے باوجود انہوں نے اس کا ارتکاب کیا۔

فیض قدیر

دوسرا جواب: یہ تکرار برائے تاکید ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (پ۱۸-المؤمنون:۱۱۷) اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو پوجے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے یہاں ہے۔

حالانکہ دوسرا اللہ ماننے والے کیلئے برہان کا ہونا محال ہے۔

تیسرا جواب: اگر اللہ تعالیٰ ان کی مذمت فرماتے ہوئے محض قتل کا ذکر کرتے تو وہ کہہ سکتے تھے انہیں اللہ تعالیٰ نے قتل کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کی طرف سے قتل (موت) حق ہے اور ماسویٰ اللہ سے بغیر حق ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا کی تفسیر

یہاں تکرار برائے تاکید ہے لیکن بغیر لفظ اول ہے جیسے کوئی آدمی اپنے غلام کے بہت سے گناہ دیکھے آخر میں اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہے: هذا بما عصيتني و خالفت أمري، هذا بما تجرأت علي واغتررت بحلمي۔ (تو نے میری نافرمانی کی اور میرے حکم کی مخالفت کی تو نے مجھ پر جرأت کی اور میرے حلم کی وجہ سے تو نے دھوکہ کھایا) تو اسے خاموش کرنے کیلئے مختلف الفاظ میں گناہوں کو شمار کرے۔

"وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ" اس سے ظلم مراد ہے۔ یعنی یہ حق سے باطل کی طرف متجاوز ہوگئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر انزال عذاب کا ذکر کیا تو اس کی علت بیان کرتے ہوئے اولاً اسے واضح کیا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حق میں کیا مثلاً اس سے جہالت، اس کی نعمتوں کا انکار، اس کے بعد دوسری چیز لائی جو برائی میں اس کے بعد تھی قتل انبیاء، پھر تیسری جز میں ان کے خاص خاص معاصی، پھر چوتھی میں ان کے متعدی گناہ مثلاً تعدی و ظلم اور یہ کس قدر خوبصورت ترتیب ہے۔

حق معرفہ اور نکرہ کیوں؟

سوال: یہاں "يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" فرمایا یعنی الحق پہ الف لام لاکر معرفہ ذکر کیا اور آل عمران میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ (پ۳، آل عمران:۲۱) وہ جو اللہ کی آیتوں کے منکر ہوئے اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے

یہاں لفظ حق نکرہ ہے اسی طرح ایک اور مقام پر اسی سورت میں ہے

وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (پ ۴، آل عمران: ۱۱۲، ۱۱۳)

اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے یہ اس لیے کہ نافرمانبردار اور سرکش تھے سب ایک جیسے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں۔

تو یہ فرق کیوں؟

جواب: جس سبب کی وجہ سے قتل لازم ہوتا ہے اہلِ اسلام کے ہاں وہ معروف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا۔ سوائے تین میں سے ایک کے ساتھ۔ ایمان کے بعد کفر، شادی کے بعد زنا، قتل نفس۔ (البخاری: ۶۸۷۸)

بغیر الحق معرفہ ذکر کیا تا کہ اس تعین کی طرف اشارہ ہو جائے اور نکرہ اس لیے کہ عموم میں تاکید ہو جائے کہ وہاں کوئی حق نہ تھا نہ وہ جسے اہلِ اسلام جانتے ہیں اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی حق تھا۔

[۶۲] اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

(بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم)

هَادُوْا، میں مشہور قرأت دال پر پیش ہے: حضرت ضحاک اور مجاہد نے دال پر زبر اور واؤ ساکن پڑھا۔ صابئین اور صابئون میں قرأت مشہورہ دونوں میں ہمزہ ہے۔ امام نافع، شیبہ، زہری سے ہے کہ "صابنین" یا ساکنہ اور بغیر ہمزہ ہے اور صابئون میں بامضموم اور حذف ہمزہ ہے۔ شیخ عمری دونوں میں ہمزہ لاتے ہیں۔ ابو جعفر دونوں میں یا ہمزہ کے بدل لاتے ہیں، ترکِ ہمزہ میں دو وجہ ہو سکتی ہیں۔

اول یہ "صبا یصبو" سے ہو جب کوئی کسی شی کی طرف میلان کرے اور اسے چاہے تو یہ کہا جاتا ہے۔ ثانی، ہمزہ بدل کر پڑھا جائے "صابنین، صابنون، مختار ہمزہ ہے کیونکہ یہ اکثر کی قرأت اور معنی تفسیر سے اقرب ہے اہل علم کے ہاں اس کا معنی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف جانے والا ہے۔

آیت کا ربط

اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے جب وہ وعدہ یا وعید کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی اس کا متضاد ذکر فرما دیتا ہے تاکہ کلام تام ہو جائے، یہاں جب اس نے اہلِ کتاب کفار کا حکم اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر فرمایا تو ساتھ یہ بھی اطلاع دی کہ وہ اہلِ ایمان کو اجرِ عظیم اور ثواب کریم عطا فرماتا ہے تاکہ واضح ہو جائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نیکی کرنے والے کو انعام اور برائی کے مرتکب کو سزا دیتا ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا:

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (پ ۲۷، النجم: ۳۱)

تاکہ برائی کرنے والوں کو ان کے کیے کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے

تو یہاں بھی اسی سنت مبارکہ کی وجہ سے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

مراد کون ہے؟

مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہاں کون مراد ہے اور اس اختلاف کا سبب آیت کا آخری حصہ ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اور ہوں اور مَنْ اٰمَنَ سے اور، اشکال میں اس کی نظیر یہ ارشادِ ربانی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (پ ۵- النساء: ۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان رکھو اللہ اور اللہ کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اپنے اُن رسولوں پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو نہ مانے اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کو تو وہ ضرور دُور کی گمراہی میں پڑا

متعدد تفاسیر

اس اشکال کی وجہ سے متعدد تفاسیر سامنے آئیں۔

پہلی تفسیر: حضرت ابنِ عباس کہتے ہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی آمد سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر یہود و نصاریٰ کے اباطیل سے بری و دور رہے۔ مثلاً قس بن ساعدۃ، بُحیر اراہب، حبیب نجار، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور وفد نجاشی گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ جو لوگ حضور کی بعثت سے پہلے ایمان لائے اور جو یہود کے دین باطل اور نصاریٰ کے دین باطل پر تھے ان میں سے جو بھی حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اللہ پر، آخرت پر اور حضور پر ایمان لے آیا اس کیلئے اللہ کے ہاں اجر ہے

دوسری تفسیر: اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء میں طریقہ منافقین بیان کیا اور پھر طریقہ یہود تو اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو صرف زبانی ایمان لائے مگر دل سے نہیں اور یہ منافق ہیں تو پہلے منافقین پھر یہود اور پھر نصاریٰ وصابئین کا ذکر کیا۔ گویا فرمایا: یہ تمام باطل عقیدہ والے اگر ایمان حقیقی لے آئیں تو یہ اللہ کے ہاں اہلِ ایمان شمار ہوں گے۔ یہ حضرت سفیان ثوری کا قول ہے۔

تیسری تفسیر: اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقۃً ایمان لانے والے ہی ہیں پھر ''مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ'' کی دلالت مستقبل پر ہے تو مراد یہ ہوگی کہ ماضی میں ایمان لانے والے اگر مستقبل میں اس پر ثابت رہے اور ان کا ایمان دائمی رہا تو وہ اجر پائیں گے۔ یہ اہلِ کلام کا قول ہے

وَالَّذِیْنَ هَادُوْا کی تفسیر

هَادُوْا کے اشتقاق میں چند آراء ہیں:

۱۔ جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے توبہ کی اور کہا:

اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ (پ۹، الاعراف:۱۵۶)

بیشک ہم تیری طرف رجوع لائے۔ فرمایا میرا عذاب میں جسے چاہوں دوں اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے تو عنقریب میں نعمتوں کو ان کیلئے لکھ دوں گا جو ڈرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں

یعنی ہم تیری طرف رجوع و توبہ کرتے ہیں تو اس بنا پر ان کا نام یہ ٹھہرا۔ یہ حضرت ابنِ عباس سے مروی ہے۔

۲۔ ان کا یہ نام اس لیے پڑا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یھوذا تھا۔ عرب دال پڑھتے ہیں ان کا معمول یہ ہے کہ وہ جب کسی عجمی لفظ کو عربی کی طرف لاتے تو بعض حروف بدل دیتے ہیں۔

۳۔ شیخ ابو عمرو بن علاء کا قول ہے ان کے اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ تورات کی تلاوت کے وقت حرکت کرتے اور پھر یہود کا معنی حرکت ہے

لفظ نصاریٰ کی تحقیق

اس میں متعدد وجوہ بیان ہوئی ہیں:

پہلی وجہ: جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوا اس کا نام ناصرہ ہے تو اس کی نسبت سے یہ نصاریٰ کہلائے یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے۔

دوسری وجہ: یہ ایک دوسرے کے معاون ومددگار بنا کرتے تھے۔

تیسری وجہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا تھا: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ تو انہوں نے کہا: ہم آپ کے معاون ہیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل نصران، امرأۃ نصرانۃ، نصرانی میں یا مبالغہ کی ہے جیسے کہ احمری میں اور یہ اس لیے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معاون تھے۔

وَالصَّابِئِیْنَ کی تفسیر

یہ صبا سے ہے، کسی کا ایک دین سے دوسرے دین کی طرف جانا، عرب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے۔ کیونکہ آپ ان کے دین کے مخالف دین سامنے لائے۔ جب ستارے اپنے مقام سے طلوع ہوں تو کہا جاتا ہے۔ صبأت النجوم۔ جب ہم کسی شی کو لے کر نکلیں تو کہا جائے گا۔ صبأ نابہ۔

اس میں مفسرین کے چند اقوال ہیں:

۱۔ حضرت مجاہد اور حسن کا قول ہے یہ مجوسی اور یہود کا گروہ ہے نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے اور نہ ان سے نکاح جائز ہے۔

۲۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ ملائکہ کی عبادت کرتے اور ہر روز پانچ نمازیں سورج کی طرف ادا کرتے، انہوں نے یہ بھی کہا: ادیان پانچ ہیں چار شیطان کے اور ایک رحمٰن کیلئے ہے۔ صابئون، ملائکہ کی عبادت کرتے، مجوسی آگ کی، مشرکین بتوں کی اور یہود ونصاریٰ۔

۳۔ یہی اقرب ہے کہ ایسی قوم جو ستاروں کی عبادت کرتی، پھر ان کے دو اقوال ہیں۔

پہلا قول: عالم کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس نے ان ستاروں کی تعظیم اور انہیں نماز، دعا اور تعظیم کا قبلہ بنایا ہے۔

دوسرا قول: اللہ تعالیٰ نے افلاک اور ستارے پیدا فرمائے پھر یہ ستارے اس جہان میں تدبیر کرتے ہیں۔ خیر، شر، صحت اور مرض کے یہ ہی خالق ہیں۔ لہٰذا انسان پر ان کی تعظیم لازم ہے کیونکہ یہ اس عالم کیلئے تدبیر کرنے والے الٰہ ہیں اور اللہ کی یہ عبادت کرتے ہیں۔ یہی وہ مذہب ہے جو ان کلدانیوں کی طرف منسوب ہے جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رد فرماتے ہوئے ان کے عقیدہ کو باطل ثابت کیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان چار فرقوں کے بارے میں واضح کیا کہ اگر یہ اللہ پر ایمان لے آئے تو انہیں آخرت میں ثواب حاصل ہوگا تاکہ اصحاب گمراہی پر واضح ہوجائے کہ اگر وہ اپنی گمراہی سے رجوع کر کے دین حق پر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان وطاعت کو قبول فرمائے گا اور انہیں اپنی بارگاہ سے دور نہیں فرمائے گا۔ یاد رہے ایمان باللہ میں اس کے لوازمات یعنی

ایمان بالرسل بھی شامل ہیں۔ اسی طرح ایمان بالیوم الآخر میں آخرت کے تمام احکام پر ایمان بھی شامل ہے۔ یہ دونوں اقوال و عقائد ان تمام کو جامع ہیں جو چیزیں دین ہیں خواہ وہ حالت تکلیف میں ہوں اور حال آخرت میں بصورت ثواب و عتاب ہوں۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ سے یہاں مکان مراد نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے اور نہ ہی حفاظت مراد ہے جیسے امانتوں کی ہوتی ہے بلکہ معنی یہ ہے ان کا اس قدر اجر یقینی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی تفسیر

بعض نے کہا: ان سے دنیاوی خوف و حزن کا زوال مراد ہے۔ بعض نے آخرت میں حالت ثواب کے وقت زوال کی بات کی ہے اور یہ اصح ہے اس لیے کہ یہ نفی عام ہے اور یہ وصف دنیا میں خصوصاً مکلفین کو حاصل ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ تو ہر وقت خوف و حزن سے خالی نہیں ہو سکتے یہ اسباب دنیا کا ہوگا یا امور آخرت کا، تو گویا اللہ تعالیٰ نے ان سے آخرت میں اجر کا وعدہ فرمایا ہے پھر اس اجر کی صفت بیان کی کہ وہ خوف و حزن سے خالی ہوگا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نعمت دائمی ہو اگر اس کا انقطاع اور ختم ہو جانا ممکن ہو تو انہیں حزن عظیم لاحق ہو جائے گا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں اس فرمان کا ذکر یوں کیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (پ۶-المائدۃ:۶۹)

بیشک وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسی طرح یہودی اور ستارہ پرست اور نصرانی ان میں جو کوئی سچے دل سے اللہ اور قیامت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم

سورۃ الحج میں یوں ذکر کیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (پ۱۷-الحج:۱۷)

بیشک مسلمان اور یہودی اور ستارہ پرست اور نصرانی اور آتش پرست اور مشرک بیشک اللہ ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ کردے گا بیشک ہر چیز اللہ کے سامنے ہے۔

ان آیات میں تقدیم و تاخیر ہے صابئین پر ایک مقام پر پیش جبکہ دوسری میں زبر ہے تو اس میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: جب کلام فرمانے والی ذات اقدس احکم الحاکمین ہے تو بلاشبہ ان تبدیلیوں میں ضرور حکمتیں اور فوائد ہیں۔ اگر انہیں پالیں تو ہم نے کمال کو پالیا اور اگر ہم نہیں پا سکیں تو پھر ہماری عقول کا قصور ہوگا نہ کہ کلام حکیم کا۔ واللہ اعلم

[۶۳-۶۴] وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۶۴﴾

(اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اُونچا کیا تو پکڑو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔ پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم خسارے والوں میں ہو جاتے)

دسویں انعام کا تذکرہ

یہ دسواں انعام ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت کیلئے ان سے عہد لیا تو یہ ان کے حق میں انعام ہی ٹھہرا۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ کی تفسیر

یہاں دو مباحث ہیں:

پہلی بحث: میثاق، ایسے اُمور کی وجہ سے ہوتا ہے جو طاعت و فرمانبرداری کے موجب و سبب ہوں۔

میثاق سے کیا مراد ہے؟

لہٰذا لفظ میثاق کے بارے میں مفسرین کی یہ آراء ہیں۔

۱۔ ایسے عقلی دلائل جو وجودِ صانع اور اس کی حکمت پر دال ہیں اسی طرح جو حضرات انبیاء و رسل کے صدق پر شاہد ہیں اور تمام عہدوں اور مواثیق سے پختہ ہے اس لیے کہ اس میں تبدیلی اور خلف نہیں ہو سکتا، یہ شیخ اصم کا قول ہے۔

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام الواحِ تورات لے کر واپس آئے تو فرمایا: اس میں کتاب اللہ ہے۔ قوم نے کہا: ہم تمہارے قول کو تسلیم نہیں کرتے یہاں تک کہ اعلانیہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور وہ فرمائے یہ میری کتاب ہے اسے پکڑ لو۔ تو انہیں کڑک نے آلیا وہ مر گئے پھر انہیں زندہ فرمایا پھر کہا: کتاب اللہ کو پکڑ لو۔ انہوں نے

انکار کیا تو ان پر طور بلند کیا اور کہا: کتاب اللہ کو پکڑو ورنہ تم پر پہاڑ گرادیا جائے گا تو انہوں نے کتاب لے لی اور طور کو ہٹا دیا گیا تو یہ میثاق ہے اس لیے کہ طور کا بلند ہونا بہت کامل اور عجب نشانی تھی جو عقول کو حیران، تکذیب کرنے والے کو تصدیق پر اور شک کرنے والوں کو یقین دلاتی ہے۔

جب انہوں نے یہ دیکھا تو جان لیا یہ موسیٰ علیہ السلام کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانی تھی جو کچھ یہ لائے ہیں اس کی تصدیق کرو توبہ کرو اور عہد و پیمان کرو آئندہ تم بچھڑے کی عبادت نہیں کرو گے اور تورات کا نظام لاؤ گے تو یہی عہد تھا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بارے میں کیا، یہ شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا مختار ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد عہد لیے ہیں۔

پہلا عہد: جب انہیں پشت آدم سے نکالا اور انہیں اپنے نفوس پر گواہ بنایا۔

دوسرا عہد: لوگوں پر اپنے انبیاء کی اتباع لازم کی یہاں یہی عہد مراد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے لیکن یہ ضعیف ہے

دوسری بحث: مِیْثَاقَکُمْ کہنے کی حکمتیں

شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے "مِیْثَاقَکُمْ" فرمایا نہ کہ "مَوَاثِیْقَکُمْ" اس میں دو حکمتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی حکمت: مقصد اس پر دلالت ہے کہ یہ عہد ان میں سے ہر ایک سے لیا جیسے فرمان ہے:

ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (پ۲۴،غافر:۶۷)

پھر تمہیں نکالتا ہے بچہ پھر تمہیں باقی رکھتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو پھر اس لیے کہ بوڑھے ہو اور تم میں کوئی پہلے ہی اٹھا لیا جاتا ہے اور اس لیے کہ تم ایک مقررہ وعدہ تک پہنچو اور اس لیے کہ سمجھو

یعنی تم میں سے ہر ایک کو طفل کی صورت میں پیدا کیا۔

دوسری حکمت: یہ عہد واحد شی کا تھا جو ان میں سے ایک سے بھی اسی طرح لیا گیا جیسے دوسرے سے تو بلاشبہ میثاق واحد ہی تھا تو اگر جمع 'مَوَاثِیْقَکُمْ' کہا جاتا تو پھر وہاں زیادہ عہد کا ہونا ضروری تھا نہ کہ واحد۔

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ کی تفسیر

اس کی نظیر یہ ارشادِ گرامی ہے:

وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ‌ۚ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ (پ ۹-الاعراف: ۱۷۱)

اور ہم نے جب پہاڑ ان پر اٹھایا گویا وہ سائبان ہے اور سمجھے کہ وہ ان پر گر پڑے گا اور جو ہم نے تمہیں دیا پکڑو زور سے اور یاد کرو جو اس میں ہے کہ کہیں تم پرہیز گار ہو

اس میں درج ذیل مباحث ہیں:

پہلی بحث: وَرَفَعۡنَا کا واو کون سا ہے؟

"وَرَفَعۡنَا" میں تفسیر حضرت ابن عباس کے مطابق واوٗ عاطفہ ہے معنی یہ ہوگا اخذ میثاق پہلے تھا جب انہوں نے کتاب قبول نہ کر کے عہد توڑا تو ان پر پہاڑ بلند کیا گیا۔ تفسیر ابو مسلم کے مطابق واوٗ عاطفہ نہیں بلکہ حالیہ ہے جیسے کہا جاتا ہے "فعلت ذلك والزماں زمان" گویا فرمایا: جب ہم نے تم سے طور کے بلند کرنے کے وقت عہد لیا۔

دوسری بحث: طور مخصوص پہاڑ

طور سے بعض نے ہر پہاڑ مراد لیا ہے۔ عجاج کہتے ہیں:

دانی جناحیه من الطور فمر تقضی البازی اذا البازی کسر

شیخ خلیل رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: طور سے معین و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ یہی اقرب ہے کیونکہ الف لام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ معین ہو اور اس نام سے معروف ہو۔ یہی وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ سے مناجات کی جاتیں۔ یہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے پاس منتقل کر کے ان پر بلند کیا ہو۔ اگر چہ وہ ان سے دور تھا اس لیے کہ جو قادر مطلق ہوا میں پہاڑ کو معلق فرما سکتا ہے وہ جگہ سے اکھاڑ کر دور سے منتقل بھی فرما سکتا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اللہ تعالیٰ نے فلسطین کے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھڑنے کا حکم دیا تو وہ پہاڑ اکھڑ کر ان کے اوپر بادل کی طرح ہو گیا ان کے ٹھہرنے کی جگہ فرسخ در فرسخ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تورات قبول کرو ورنہ میں تم پر پہاڑ گرا دوں گا۔ جب انہوں نے محسوس کیا بھاگنے کی صورت نہیں تو تورات کو قبول کر لیا اور اس طرح سجدہ ریز ہوئے کہ خوف سے پہاڑ کی طرف ہی دیکھ رہے تھے یہی وجہ تھی کہ یہود نصف چہرہ پر سجدہ کرتے ہیں۔

تیسری بحث: اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے

کچھ ملحدین ہوا میں پہاڑ کے بلاستون معلق ہونے کا انکار کرتے ہیں رہی زمین تو یہ اس لیے ٹھہری ہے کہ یہ طبعاً مرکز کی طالب ہے لہٰذا یہ مرکز میں ہی ہے۔ ان کے فاسد قول پر ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور ثقیل شی کا ہوا میں معلق ہونا ممکن ہے لہٰذا بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے، ان دونوں باتوں پر تفصیلی گفتگو کتب اصول میں ہے۔

چوتھی بحث: یہ جبر نہیں تھا

بعض ملحدین نے کہا: پہاڑ کا سایہ کرنا درست نہیں۔ اگر اس کا وقوع مان لیا جائے تو وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے اور یہ مکلّف ہونے کے منافی ہے۔ شیخ قاضی نے جواب دیا اس میں جبر نہیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس کے گرنے کا ہی خوف تھا جب وہ ایک مدت اسی حال میں رہتا جیسا کہ آسمانوں کو وہ اپنے اوپر بلاستون ملاحظہ کر رہے ہیں تو ممکن ہے خوف زائل ہو جاتا لہٰذا اس کی وجہ سے جبر بھی ختم اور مکلّف ہونا باقی رہا

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ کی تفسیر

یعنی خوب محنت اور عزیمت کاملہ کے ساتھ اسے حاصل کرلو اور تغافل و تکاسل سے دور رہو۔ شیخ جبائی کہتے ہیں یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ فعل سے پہلے استطاعت ضروری ہے اس لیے کہ اگر پہلے قوت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا درست ہی نہیں کہ قوت سے پکڑو۔ جیسے قلم نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاتا قلم سے لکھو۔

اہلِ سُنّت کہتے ہیں مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اسے خوب کوشش اور عزیمت سے پکڑو اور ہمارے نزدیک عزیمت بعض اوقات فعل سے پہلے ہوتی ہے۔

وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ کی تفسیر

کتاب میں جو کچھ ہے اسے یاد کرو، آگے پڑھاؤ، اسے بھول نہ جاؤ اور نہ اس سے غفلت برتو۔

سوال: اسے تم نے نفس یاد پر کیوں محمول نہ کیا؟

جواب: وہ یاد جو ضد نسیان ہے اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تو اس کا حکم کہاں دیا جا سکتا ہے البتہ اس کو پڑھنے پڑھانے پر محمول کرنا درست ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (تا کہ تم صاحب تقویٰ ہو جاؤ)۔

شیخ جبائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے طاعت کا ارادہ فرمایا لیکن اس کا جواب پیچھے گذر چکا ہے۔

ارشادِ گرامی "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ" بتا رہا ہے کہ انہوں نے اس پر عمل کیا ورنہ وہ عہد کرنے والے قرار نہ پاتے اور نہ بعد کا ارشاد گرامی "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ" (پھر تم پھر گئے) درست رہتا تو اس فرمان سے واضح ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس عہد کو قبول کیا اور اس کا التزام بھی کیا۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ کی تفسیر

پھر تم نے عہد و وفا سے اعراض کیا۔ شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں بالجملہ یہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے قبولیت تورات اور رفع طور کے بعد تورات کے بہت سے احکام سے اعراض کرلیا۔ اس میں تحریف کردی۔ اس پر عمل چھوڑ دیا، انبیاء کو شہید کیا، ان کے ساتھ کفر کرتے ہوئے ان کی نافرمانی کی۔ ممکن ہے اس میں کچھ چیزیں بعض کے ساتھ مخصوص ہوں۔ بعض احکام پر پہلے لوگوں نے عمل نہ کیا اور بعض پر بعد والوں نے نہ کیا۔ وہ مقام تیہ میں دن رات متعدد عجائبات کا مشاہدہ کرتے رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت، ان پر اعتراضات اور انہیں ہر اذیت دیتے رہے، اپنے ٹھکانے میں اعلانیہ معاصی کا ارتکاب کرتے۔ حتیٰ کہ ان میں بعض زمین میں دھنس گئے۔ بعض کو آگ نے جلا کر راکھ کردیا۔ طاعون ان پر مسلط کردیا گیا یہ تمام تورات کے تراجم میں موجود ہے جس کا یہ اقرار کرتے ہیں پھر ان کے بعد والوں نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں حتیٰ کہ انہیں بیت المقدس کی تخریب و تباہی سے سزا دی گئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے کفر کرتے ہوئے انہیں شہید کرنے پر تل گئے۔ تو ان میں اگرچہ ان کے اعراض تورات کی تفصیل نہیں لیکن یہ معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ان کے بڑوں کے عناد کی اطلاع دی ہے، جب ان کا حال اپنے نبی اور ان کی کتاب کے ساتھ یہ ہے تو ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اور آپ کے حق ہونے کا انکار کرنا کوئی عجیب نہیں۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ کی تفسیر

یہاں دو مباحث ہیں:

پہلی بحث: شیخ قفال نے تفسیر دو وجہ پر لکھی ہیں:

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہیں مہلت نہ دیتا اور اپنا عذاب مؤخر نہ کرتا تو تم ان ہلاکت والوں میں ہو جاتے جنہوں نے جہنم کی آگ کے عوض اپنے نفوس کو بیچ ڈالا۔ یہ قول بتا رہا ہے وہ اس گھاٹے سے اس لیے بچ گئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مہلت دی۔ حتیٰ کہ توبہ کرلیں۔

۲۔ "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ" پر خبر کی انتہا ہو چکی۔ "فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ" کا تعلق اول کلام سے ہے یعنی

اگر اللہ تعالیٰ کا لطف بصورت بلندی پہاڑ تم پر نہ ہوتا تو تم ہمیشہ کتاب کو مسترد کرتے لیکن اس نے تم پر فضل و رحم کرتے ہوئے مہربانی کی حتیٰ کہ تم نے توبہ کر لی۔

دوسری بحث: سوال: کلمہ "لَوْلَا" ایک شی کے ثبوت سے دوسری کی نفی پر دلالت کرتا ہے تو یہاں اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ گھاٹے کی نفی، اللہ تعالیٰ کے فضل کو لازم ہے تو یہاں خسران ہوگا وہاں لطف الٰہی نہیں ہوگا تو اس کا تقاضا یہ ٹھہرے گا کہ کافر پر اللہ تعالیٰ کا لطف کسی صورت نہیں ہوسکتا اور یہ بات معتزلہ کے خلاف ہے۔

شیخ کعبی رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً کہا: اللہ تعالیٰ نے فضل میں تمام کو برابر بنایا مگر اس سے نفع بعض اٹھاتے ہیں اور بعض نہیں اٹھاتے جس طرح کوئی والد اپنی اولاد سے کہے تم سب برابر ہو مگر اس سے نفع بعض اٹھائیں تو اب یہ کہنا درست ہوگا "لولا ان اباك فضلك لكنت فقيراً" (اگر تجھ پر تیرے والد کا فضل نہ ہوتا تو تو فقیر ہوتا)

یہ جواب ضعیف ہے اس لیے کہ اہلِ لغت نے تصریح کی ہے "لولا" دوسری شی کے ثبوت کی وجہ سے شی کی نفی کرتا ہے جب یہ اصول مسلم ہے تو اس جوابِ کعبی کی کیا حقیقت؟

[۶۵-۶۶] وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

(اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں سے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے اُن سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے۔ تو ہم نے (اس بستی کا) یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کیلئے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت)

پہلی تشدید و سزا

جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر متعدد انعامات کا شمار کیا تو ان کا اختتام ان پر بعض تشدیدات کی تفصیل پر کیا، یہاں ان میں سے پہلی کا ذکر ہے۔ یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: مچھلیاں پکڑنے میں تجاوز

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے یہ قوم حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں مدینہ وشام کے درمیان ساحل سمندر کے مقام ایلہ پر رہتی تھی۔ پورے سال میں ایک ماہ تمام زمین کی مچھلیاں یہاں جمع ہوا کرتیں۔ حتیٰ کہ ان کی کثرت کی وجہ سے پانی دکھائی نہ دیتا اوراس ماہ کے علاوہ ہر ہفتہ کے روز ایسا ہوتا، اس قریہ کا ذکر اس ارشادِ ربانی میں ہے:

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ (پ۹، الاعراف:۱۶۳)

اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کنارے تھی جب وہ ہفتے کے بارے میں حد سے بڑھتے

انہوں نے سمندر کے پاس حوض بنالیے اوران کی طرف نہریں بنالیں، مچھلیاں وہاں چلی جاتی اور یہ اتوار کے روز انہیں شکار کر لیتے۔ یہ حوض میں ان کا انہیں قید کرنا ان کی زیادتی اور تجاوز تھا۔ وہ اس طریقہ پر مچھلیاں پکڑ کر غنا اختیار کرتے مگر عذاب سے ڈرتے رہتے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا چلا گیا ان کی اولاد نے ان کا طریقہ اپنائے رکھا اور خوب مال بنایا۔ کچھ لوگ اہلِ مدینہ سے وہاں گئے جو ہفتہ کو شکار کرنا پسند کرتے انہوں نے انہیں منع کیا لیکن انہوں نے کہا جب سے ہم یہ عمل کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے مال میں اضافہ ہی کیا ہے۔ ان سے کہا گیا مغرور نہ ہوجاؤ ممکن ہے تم پر عذاب و ہلاکت نازل ہو جائے، تو ایسی قوم پر عذاب بصورت بندر بن جانے کے آیا تین دن تک رہے پھر ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرا مسئلہ: دو اُمور کا اظہار

اس واقعہ سے مقصود دو امور ہیں۔

۱۔ سرورِ عالم ﷺ کے معجزہ کا اظہار ہے اس لیے "وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ" یہ ان یہود سے خطاب کی طرح ہے جو حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں تھے۔ آپ نے انہیں اس واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ اُمّی تھے نہ کسی سے پڑھا اور نہ لکھا اور نہ ہی اہلِ کتاب سے ملے تو واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس واقعہ کا علم وحی کے ذریعے ہی حاصل ہوا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے آگاہ فرمایا کہ اس نے اصحاب سبت کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا تو گویا وہ فرما رہا ہے کیا تمہیں خوف نہیں کہ تمہاری سرکشی کی وجہ سے تم پر وہی عذاب نازل ہو جائے جو ان پر ہوا تھا، میری لمبی مہلت کی وجہ سے مغرور نہ ہو جاؤ، اس کی نظیر یہ ارشادِ الٰہی ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰى اَدْبَارِهَا اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا اَصْحٰبَ السَّبْتِ (پ۵-النساء:۴۷)

اے کتاب والو ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اُتارا تمہارے ساتھ والی کتاب کی تصدیق فرماتا قبل اس کے کہ ہم بگاڑیں کچھ مونہوں کو تو انہیں پھیر دیں ان کی پیٹھ کی طرف یا انہیں لعنت کریں جیسی لعنت کی ہفتہ والوں پر

تیسرا مسئلہ: یہاں کلام محذوف ہے گویا فرمایا تم جانتے ہو جس نے بھی تم میں سے یوم سبت میں تجاوز کیا کہ مذکور سزا اس کی جزا ہو جائے لفظ "اعتداء" واضح کر رہا ہے کہ یوم سبت میں جو کچھ انہوں نے کیا: وہ تمام ان پر حرام تھا یہاں تو اس کی تفصیل نہیں مگر اس آیت میں ہے:

وَاسْاَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ

پوچھ ان بستی والوں سے جو سمندر کے کنارے تھی۔

پھر یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ انہون نے فقط شکار کرنے میں تجاوز کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے شکار بھی کیا اور اسے حلال بھی جانا

چوتھا مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں: السبت، سبتت الیهود (ہفتہ کے دن کا یہود احترام کرتے) سے مصدر ہے۔

سوال: ہفتہ کے روز جب اللہ تعالیٰ نے شکار سے منع کیا تو باقی دنوں کے سوا صرف اس دن میں مچھلیوں کی کثرت کیوں ہوتی جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (پ۹، الاعراف:۱۶۳)

ہفتے کے دن ان کی مچھلیاں پانی پر تیرتی ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا نہ آتیں اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے ان کی بے حکمی کے سبب

کیا یہ فتنہ کا اُبھارنا اور ارادہ گمراہی نہیں؟

جواب: اہلِ سُنّت کے مذہب پر جواب یہ ہوگا کہ ارادۂ اضلال، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز ہے۔ اور معتزلہ کے مذہب پر جواب یہ ہے کہ اضافہ ثواب کی غرض سے تکالیف میں تشدید حسن ہے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں: "قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ" خبر ہے یعنی تم بندر بننے اور دھتکار کو جمع کر لو اور یہ ذلت و دھتکار ہے۔

دوسرا مسئلہ: فرمان "كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ" امر نہیں اس لیے کہ خود وہ اپنے آپ کے بندر کی صورت میں بدلنے پر قادر نہ تھے بلکہ یہاں سرعتِ تکوین مراد ہے۔ جیسے ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَا اَمْرُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (پ۱۴۔ النحل:۴۰)

جو چیز ہم چاہیں کہ اس سے فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہو جاؤ وہ فوراً ہو جاتی ہے

دوسرے مقام پر فرمایا:

قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَاۤئِعِيْنَ (پ۲۴۔ فصلت:۱۱، پ۲۴۔ حٰم سجدة:۱۱)

دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر جس عذاب کا ارادہ فرماتے اس سے وہ عاجز نہیں بلکہ جب فرمایا "كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ" وہ اسی طرح بن گئے یعنی جب اس نے ان کے بندر ہونے کا ارادہ فرمایا تو وہ اسی وقت ہو گئے۔ یہ اس ارشادگرامی کی طرح ہے

كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (پ۵۔ النساء:۴۷)

جیسی لعنت کی ہفتہ والوں پر اور خدا کا حکم ہو کر رہے

یہ بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اس تکوین کے موقع پر کلام فرمایا ہو البتہ تکوین میں مؤثر قدرت اور ارادہ ہی ہے۔

سوال: جب اس کلام کا تکوین پر اثر ہی نہیں تو اس کا فائدہ کیا؟

جواب: اہلِ سُنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے احکام وافعال، رعایت مصالح پر ہرگز موقوف نہیں۔ رہے معتزلہ تو ان کے ہاں ممکن ہے یہ کلام لفظی بعض ملائکہ یا ان کے علاوہ کیلئے ہو۔

تیسرا مسئلہ: حضرت مجاہد سے منقول ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مہر کے ذریعے مسخ فرمادیا نہ یہ کہ ان کی صورتیں مسخ کر دیں، اس کی مثال یہ ارشادِ ربانی ہے:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (پ۲۸۔ الجمعۃ:۵)

گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے کیا ہی بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیتیں جھٹلائی اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دیتا

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ استاذ نہایت ہی کُند ذہن ناکام طالب علم سے کہے: كُنْ حِمَارًا۔ (گدھا بن جا)

انہوں نے صورتوں کے مسخ کے خلاف دو دلائل دیے ہیں

پہلی دلیل: انسان اس ڈھانچے اور بنا کا نام ہے جو شاہد و محسوس ہے اگر اسے باطل کر کے ان اجسام کو بندر کی شکل دے دی جائے تو یہ انسان کا اعدام اور بندر کی ایجاد ہوگی۔ اس قول کے مطابق مسخ کا حاصل یہ ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے ان عوارض کو معدوم فرما دیا جن کی وجہ سے وہ اجسام انسان تھے اور ان میں ایسے عوارض پیدا کر دیے جن کی وجہ سے وہ بندر ٹھہرے تو یہ معدوم کرنا اور ایجاد کرنا ہوا نہ کہ مسخ کرنا۔

دوسری دلیل: اگر ہم اسے درست مان لیں تو ہمیں یقین نہیں رہے گا جسے ہم دیکھ رہے ہیں یہ بندر وکتا ہے یا انسان عاقل، اور یہ مشاہدات میں تشکیک پیدا کر دے گا۔

جواب: پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ انسان صرف ڈھانچے وہیکل کا نام نہیں اس لیے کہ انسان بعض اوقات کمزوری کے بعد فربہ یا اس کے برعکس ہو جاتا ہے تو اجزا بدل گئے لیکن انسان معین، موجود اور باقی رہا وہ زائل نہ ہوا تو انسان اس ہیکل کے علاوہ امر کا نام ہے اور وہ امر بدن میں بطور جسم سرایت کیے ہے یا بدن کی کسی جانب میں، مثلاً قلب، دماغ یا وہ موجود مجرد ہے جیسے کہ فلاسفہ کہتے ہیں، تمام صورتوں میں اس شی کا ہیکل میں تغیر کے باوجود باقی رہنا ممکن ہے اور یہی مسخ ہے۔ اس صورت میں ایسے فرشتہ کیلئے جو جثہ عظیم رکھتا ہو حجرہ رسول ﷺ میں داخل ہونا جائز ہوگا۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ امان از عذاب تو اجماع امت کی وجہ سے حاصل ہے تو جب جواز مسخ ثابت ہو گیا تو آیت مبارکہ کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے اور اس میں حضرت مجاہد کی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ وہ بھی زیادہ بعید نہیں کیونکہ جب انسان ظہور معجزات اور روشن دلائل کے بعد بھی اپنی جہالت پر مصر رہتا ہے تو اسے عرف عام میں گدھا اور بندر کہا جاتا ہے تو جب یہ مجاز مشہورہ میں سے ہے تو ایسا معنی لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

دو سوالات

اب یہاں دو سوالات باقی ہیں:

پہلا سوال: بندر بننے کے بعد ان کا فہم، عقل اور علم زائل ہو گیا لہٰذا انہیں نازل کردہ عذاب کے بارے میں علم ہی نہ ہوگا اور محض بندر بنا دینا تکلیف دہ نہیں اس لیے کہ بندر حالت سلامتی میں آلام میں نہیں ہوتے تو عذاب کی کیا صورت تھی؟

جواب: یہ تو کہا جا سکتا ہے جس امر کی بنا پر انسان عاقل اور صاحب فہم ہوتا ہے وہ باقی رہا البتہ جب صورت اور خلقت بدل گئی تو نطق اور افعال انسانی ختم ہو گئے البتہ شومی معصیت کی وجہ سے جو تغیر و تبدل آیا اسے وہ جانتے تھے اور نہایت ہی خوف و شرمندگی

کی کیفیت ان پر طاری ہوئی، تو اعضا میں تغیر کے سبب بھی انہیں رنج والم لاحق ہوا اصلی بندر اگر تکلیف میں نہیں تو اس سے یہ لازم کہاں کہ انسان کو اس خوفناک شکل میں بدل دیا جائے تو اسے تکلیف نہ ہو۔

دوسرا سوال: یہ بندر باقی رہے یا اللہ نے انہیں ختم فرما دیا اگر ہم باقی مانیں تو کیا ہمارے دور کے بندروں کو ہم ان مسخ شدہ کی شکل قرار دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: عقلاً سب کچھ جائز ہے البتہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ وہ تین دن تک باقی رہے پھر انہیں ہلاک کر دیا گیا

چوتھا مسئلہ: ''خَاسِئًا'' کی تحقیق

اہلِ لغت کہتے ہیں ''خاسی'' کا معنی ذلیل، گھٹیا اور دھتکارا ہوا ہے مثلاً جب کتا لوگوں کے قریب جاتا ہے تو کہا جاتا ہے۔

اِخْسَأْ، دور ہو جا ذلیل ورسوا ہو کر یہاں تیرا کوئی مقام نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ　　نظر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی۔

تو اس میں احتمال ہے کہ نظر عداوت سے دیکھنا ممنوع اور ذلیل وحقیر ہے کیونکہ ارشاد ہے:

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ　　تو نگاہ اُٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نگاہ اٹھا

كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ　　نظر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی۔

(پ ۲۹-الملک: ۳،۴)

گویا فرمایا بار بار نگاہ اٹھا کر آسمان کو اس طرح دیکھو جس طرح نقص کا متلاشی دیکھتا ہے اگرچہ کثرت کے ساتھ دیکھو لیکن اس میں نقص نہیں پاؤ گے، تمہاری نظر ذلیل ہو کر لوٹ آئے گی جس طرح کوئی کسی شئی کی بڑی طلب کرنے کے باوجود کامیاب نہیں بلکہ خائب وخاسر لوٹتا ہے تو یہ نگاہ بھی خائب، ذلیل اور دھتکاری ہوئی ہوگی اس لیے کہ اس نے عداوت کا ارادہ کیا تھا۔

فَجَعَلْنٰهَا کی تفسیر

اس ضمیر کے مرجع کے بارے میں اختلاف ہے:

۱۔ شیخ فراء کہتے ہیں یہ مسخ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲۔ شیخ اخفش کہتے ہیں لفظ قردۃ (بندر) کی طرف ہے۔

۳۔ قریہ (بستی) یعنی ہم نے اصحاب سبت کی بستی کو عبرت بنایا۔

۴۔ یہ اُمت کی طرف ہے یعنی ہم نے اس اُمت کو مقام عبرت بنایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ تو اس کی دلالت اُمت وجماعت یا اس کی مثل پر ہے۔

اقرب پہلی دونوں وجہ ہیں کیونکہ جب مذکور مقدم کی طرف ضمیر لوٹانا ممکن ہو تو پھر غیر کی طرف نہیں لوٹانی چاہیے اور سابقہ آیت میں ان کا اور ان کی سزا کا ذکر ہے۔

نکال کا مفہوم

نکال کے بارے میں شیخ قفال کہتے ہیں یہ ایسی سخت سزا کو کہتے ہیں جو ایسی معصیت سے لوگوں کو جھڑک دے۔ اصلاً اس میں منع اور روکنا ہے اسی سے ہے "نکول من الیمین" (قسم سے رک جانا) بیڑی اسی طرح بھاری لگام کو بھی نکل کہا جاتا ہے کیونکہ یہ منع اور رکنے کا کام دیتی ہیں اس کی نظیر یہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا (پ۲۹-المزمل:۱۲)

بیشک ہمارے پاس بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا (پ۵-النساء:۸۴)

اور اللہ کی آنچ (جنگی طاقت) سب سے سخت تر ہے اور اس کا عذاب سب سے زبردست

معنی یہ ہوا اس قوم پر جو کچھ عذاب کی صورت میں ہوا ہے دوسروں کو روکنے کا سبب ہے یعنی ہمارا اس سے مقصد تشفی و ازالہ نہیں جو انسان کا ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد ان کا اس لیے ہوتا ہے کہ انہیں معاصی نقصان دیتے ہیں اور ان کی ملکیت میں کمی اور مؤثر ہوتے ہیں رہا ہمارا معاملہ تو ہم مصالح عباد کی وجہ سے عتاب کرتے ہیں اور ہمارا عتاب زجر اور نصیحت ہوتا ہے۔

قاضی کہتے ہیں تھوڑی سی مذمت نکال نہیں کہلاتی۔ البتہ اس وقت جب یہ عظیم، کثیر اور کثرت پا جائے تو اسے نکال کہا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سارق مصرّ پر بطور جزا و نکال قطع ید نافذ فرمائی اور ارادہ یہ فرمایا کہ یہ بطور اہانت و رسوائی ہو تو یہ بھی اسی ذلت و رسوائی کے مقام پر آ گیا جو مذمت عظیم کیلئے ہوتا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے جب ہفتہ کے روز تجاوز کرنے والے اور مچھلیوں کے شکار کو حلال، دنیا کی خاطر حرام کو حلال اور اپنے عہد توڑنے والے لوگوں پر نزول عذاب کا ذکر کیا تو واضح کر دیا یہ ان پر بطور عقوبت و سزا ہے نہ کہ بطور اپنی کسی مصلحت کیلئے ہے اس لیے کہ یہ ممکن تھا ان کا مسخ اور تبدیلی صورت بمنزل ان امراض کے ہو جائیں جو صورت بدل دیتی ہیں تو اب یہ بطور مشقت و تکلیف ہو جاتا ہے نہ کہ بطور عقوبت تو اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی: "فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا" کہ یہ ان کی بداعمالی پر بطور سزا ہے۔

لِمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا کی تفسیر

اس کی چند تفاسیر ہیں:

۱۔ ان سے پہلے، ان کے معاصر اور ان کے پیچھے آنے والی قوم اور زمانوں کیلیئے ہے کیونکہ ان کا مسخ سابقہ کتب میں مذکور تھا انہوں نے اس سے عبرت حاصل کی اور ہر شخص نے جسے بعد والوں میں اس واقعہ کی خبر پہنچی۔

۲۔ "مَابَیْنَ یَدَیْهَا" سے مراد اسی وقت موجود قومیں اور لوگ ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان تمام اور بعد میں آنے والوں کیلیئے عقوبت بنایا جنہوں نے اس فعل کا ارتکاب کیا، حضرت حسن کا یہی قول ہے

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر

اس کی دو تفسیریں ہیں۔

۱۔ جو آدمی ان کے عذاب سے آگاہ ہوگا وہ نصیحت حاصل کرتے ہوئے ڈرے گا اگر اس نے ایسا فعل کیا تو ان جیسا عذاب آسکتا ہے اگر دنیا میں نہیں تو اس عتاب سے ڈرے گا جو دیر سے آئے گا مگر دائمی اور بڑا ہوگا۔

متقین کی تخصیص کی وجہ وہی ہے جو پیچھے "هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کے تحت آئی۔ جب ایسی نصیحت اور زجر وتوبیخ سے یہی نفع حاصل کرتے ہیں تو انہی کا تذکرہ کیا۔ اس لیے کہ اس سے دوسرے نفع حاصل ہی نہیں کرتے۔

۲۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ اہلِ تقویٰ آپس میں ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں کہ دیکھو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو مَوْعِظَةٌ کی مُتَّقِیْنَ کی طرف اضافت اس لیے ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں اور یہ وصف انہی سے خاص ہے دوسروں کو حاصل نہیں۔

49

[۶۷-۷۳] وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں۔ فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہوں۔ بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے گائے کیسی ہو۔ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ ادسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے۔ بولے اپنے رب سے دُعا کیجئے ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی۔ بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لیے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے۔ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں۔ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور (ذبح) کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔ اور جب تم نے ایک خون کیا اور ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے۔ تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو۔ اللہ یونہی مُردے جلائے گا۔ اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو)

لغل قدیر

دوسری تشدید واقعہ قتل

یہ تشدید کی دوسری قسم ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین نے نقل کیا ایک اسرائیلی نے اپنے رشتہ دار کو قتل کر دیا تا کہ اس کی وراثت حاصل کرے پھر اسے چوک میں پھینک دیا اور کیس سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے گیا انہوں نے تفتیش کی مگر قاتل نہ ملا۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ سے عرض کرو۔ آپ نے عرض کیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے گائے ذبح کرو۔ انہوں نے اس پر تعجب کیا تو پھر سوال در سوال کی صورت میں اپنے آپ پر سختی بڑھاتے چلے گئے۔ جب وہ متعین ہوگئی تو یہ گائے ایک انسان کے پاس تھی اس نے کئی گنا قیمت لے کر فروخت کی۔ اسے خرید کر ذبح کیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اس کا کوئی حصہ مقتول کو لگا دو انہوں نے جب ایسا کیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا نام لیا تو وہ وہی تھا جو کیس لے آیا تھا اسے انہوں نے بطور قصاص قتل کر دیا۔

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ذبح کی صورت میں الم و تکلیف حسن ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم نہ دیتے، حسن و خوبصورت ہونے کی وجہ ہمارے ہاں یہ ہے کہ وہ مالک الملک ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا اور معتزلہ کے ہاں اعواض و اغراض کی وجہ سے حسن ہے۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے دنیا کی کسی گائے کے ذبح کا حکم دیا اور یہی واجب مخیّر ہے تو ہمارے قول (اختیاری واجب) کی صحت پر یہ دلیل ہے۔

تیسرا مسئلہ: عموم کے قائلین کا اتفاق ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً" کا مفہوم ہے کہ جو گائے چاہو ذبح کرو تو یہ الفاظ عموم کا فائدہ دے رہے ہیں۔

منکرین عموم کے دلائل

منکرین عموم کا کہنا ہے ان کی دلالت عموم پر ان وجوہ کی بنا پر نہیں:

پہلی وجہ: جب کوئی کہتا ہے "اذبح بقرۃ" (گائے ذبح کرو) تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ معین گائے ذبح کرو جس کی صفات یہ ہیں۔ دوسری یہ کہ جو گائے چاہو ذبح کرو تو ذبح کا مفہوم مشترک ہو گیا اور مشترک ان میں کسی ایک کو مستلزم نہیں تو اب "اذبحوا بقرۃ" کا حکم اسے مستلزم نہیں کہ تم جو چاہو ذبح کرو تو ثابت ہو گیا یہاں عموم نہیں اگر عموم ہوتا تو 'اذبحوا بقرۃ ای بقرۃ شئتم' تکرار بن جائے گا اور 'اذبحوا بقرۃ معینۃ' نقض ہو گا حالانکہ ایسا نہیں ہے تو عموم کا قول فاسد ٹھہرا۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی "اذبحوا بقرۃ"، لا تذبحوا بقرۃ کی نقیض اور مخالف ہے جو نفی عام کو مفید ہے لہٰذا اذبحوا بقرۃ سے عموم نفی کا رفع ہوگا اور ارتفاع عموم نفی کیلئے وجہ واحد پر خصوص کا ثبوت کافی ہوتا ہے تو اب " اذبحوا بقرۃ " فقط ایک گائے کے حکم کا مفید ہوگا رہا یہ اطلاق کہ وہ کوئی گائے ہو تو نفی کے ختم کرنے کیلئے اس کی ضرورت نہیں لہٰذا ضروری ہے یہ ان الفاظ سے مستفاد و حاصل نہ ہو۔

تیسری وجہ: ارشادِ مبارک "بقرۃ" مفرد نکرہ ہے جو ذاتی اعتبار سے فردِ معین پر دال ہوتا ہے البتہ قول دال کے اعتبار سے غیر معین اور ہر ہر فرد کا فائدہ نہیں دیتا۔ مثلاً "رأیت رجلاً" (میں نے ایک آدمی دیکھا) یہ فردِ معین پر دال ہے جب اس خبر میں ایسا ہے تو لازم ہے امر میں بھی معین ہی ہو۔

قائلین عموم کہتے ہیں اگر وہ کوئی بھی گائے ذبح کر لیتے تو وہ عہدہ برا ہو جاتے تو یہ عموم پر شاہد ہے۔

جواب، یہ تو مدعیٰ اور دلیل ایک ہو گئے اس لیے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر '' اذبح بقرۃ " کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ جو چاہو گائے ذبح کرو اور اس میں اختلاف ہے اس مسئلہ میں یہی گفتگو کی گئی ہے جب تم نے اسے سمجھ لیا تو اب آگے بڑھیے۔

معین گائے کا حکم تھا یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی (اذبحوا بقرۃ) کے بارے میں اختلاف ہے کیا یہ کسی معین گائے کے ذبح کا حکم تھا یا ہر گائے کے بارے میں تھا۔ جو وقت خطاب سے تاخیر بیان کو جائز رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے حکم معین گائے کا تھا البتہ ابھی اس کی تفصیل نہیں آئی تھی۔ جو تاخیر بیان جائز نہیں مانتے وہ کہتے ہیں حکم مطلقاً گائے کا تھا لیکن جب قوم نے سوالات کیے تو حکم تکلیف میں بدل گیا اس لیے کہ تکلیف اول میں اگر وہ اطاعت کر لیتے تو وہ کافی ہو جاتی اور اختیار جنس بقر میں تھا اور یہی بہتر تھا لیکن جب انہوں نے نافرمانی کی، حکم بجا نہ لائے اور سوالات شروع کر دیئے تو مصلحت کی تبدیلی میں کوئی ممانعت نہیں جیسا کہ عام مشاہدہ ہے کوئی مدبر اپنی اولاد کو آسان کام کا اختیار دیتا ہے اور گر وہ نہ کرے تو پھر اسے تبدیلی مصلحت کی وجہ سے مشکل کام کا حکم دیتا ہے اور یہی معاملہ یہاں ہے

پہلے فریق کے دلائل

فریق اول نے یہ دلائل دیئے ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ" اور "مَا لَوْنُهَا" اور "إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ"، "إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ"، "إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ" ان تمام کا محل اسی پر ہے۔ جس کے ذبح کا حکم تھا اور یہ تمام ضمائر و اشارات بتا رہے ہیں کہ ہر گائے کا حکم نہ تھا بلکہ معین کا حکم تھا

نقل قدیم

۲۔ دوسرے سوال کے جواب میں جو صفات آئی ہیں یہ اسی گائے کی ہیں جس کے ذبح کا اولاً حکم تھا یا یہ اس کی صفات ہیں جس کا سوال (ثانی) کے وقت ذبح لازم ہوا اور ما قبل حکم تھا وہ منسوخ ہو گیا اگر پہلی صورت ہے تو ہمارا مدعیٰ ثابت ہے۔اگر دوسری صورت ہے تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ آخر ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے اگر چہ ان کا مذکور صفات کا حصول پہلے لازم نہ تھا اور تمام اہل اسلام کا اجماع ہے کہ یہ تمام صفات معتبر ہیں لہٰذا دوسری صورت فاسد ٹھہری۔

سوال: ضمائر، بقرہ کی طرف نہیں بلکہ یہ قصہ اور شان کی طرف بھی لوٹ سکتے ہیں اور یہ عربوں میں معروف ہے۔

جواب: یہ کہنا کئی وجھوں کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ: اگر یہ ضمائر قصہ اور شان کی طرف لوٹ رہے ہوں تو ان کا مابعد مفید نہیں رہے گا اس لیے کہ "بقرہ صفراء" کا فائدہ اب کیا ہو گا بلکہ کسی اور شئ کو مضمر ماننا لازم ہو گا جو خلاف اصل ہے اور اگر ان کو پہلے حکم کی طرف مان لیں تو یہ اعتراض لازم نہیں آئے گا

دوسری وجہ: ضمائر کا قصہ اور شان کی طرف لوٹانا خلافِ اصل ہے اس لیے کہ ضمیر اس کی طرف لوٹتی ہے جس کا ذکر ہو رہا ہو اور قصہ وشان کا ذکر ہو نہیں رہا لہٰذا ان کی طرف ضمیر نہیں لوٹائی جائے گی البتہ بعض مواقع پر ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے لیکن ان کے علاوہ کو اپنے اصل پر ہی رکھا جائے گا۔

تیسری وجہ: "مَا لَوْنُهَا" اور "مَاهِيَ" کی ضمیر تو بلاشبہ مامور گائے کی طرف ہی لوٹ رہی ہے ورنہ جواب سوال کے مطابق نہیں رہے گا

۳۔ اگر انہوں نے بطور عناد سوالات کیے ہوتے تو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیان فرمایا اس سے احتمالات زائل نہیں ہوتے اس لیے کہ انہوں نے اتنا ہی بتایا اس کا رنگ زرد، عمر میں متوسط اور قوت میں کامل ہو تو اس کے بعد بھی کثیر احتمالات ہو سکتے ہیں جب انہوں نے اس پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے اکتفاء کر لیا تو معلوم ہو گیا وہ معاند نہ تھے۔(تو حکم معین گائے کا ہی ہے)

دوسرے فریق کے دلائل

۱۔ ارشادِ مبارک "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" کا معنی یہ ہے کہ تم جو گائے چاہو ذبح کر لو اور یہ عموم پر دال ہے اور اسی کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد صفات کا اعتبار کرنا حکم جدید تھا۔

۲۔ اگر مراد معین گائے کا ذبح تھا تو طلب تفصیل پر ناراضگی نہ ہوتی بلکہ وہ قابل ستائش ٹھہرتے، جب اللہ تعالیٰ نے ان پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ"۔ (تو کرو جس کا تمہیں حکم ہے) اور فرمایا: "فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ" (انہوں نے ذبح کی مگر وہ ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے) تو معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے پہلے حکم کے بجالانے میں کوتاہی برتی اور یہ اسی وقت ہو گا جب اولاً ہی حکم معین ذبح گائے کا نہ ہو۔

۳۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اگر کوئی بھی گائے ذبح کر لیتے تو وہ کافی ہو جاتی لیکن وہ اپنے اوپر شدت کرتے چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی شدت فرمائی۔

۴۔ جس وقت انہیں ذبح کا حکم دیا تھا وہ اسی کے محتاج تھے اگر حکم معین کا ہوتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا تھا تو وقت ضرورت تفصیل فراہم نہ کرنا جائز نہیں۔

پہلی کا جواب وہی ہے جو مسئلہ اولیٰ کے تحت ذکر کر آئے ہیں کہ "اِنَّ اللّٰهَ یَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" کی دلالت ہر گائے پر نہیں

دوسری کا جواب یہ ہے "وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ" کی دلالت اس پر نہیں کہ انہوں نے پہلے حکم پر عمل میں زیادتی کی البتہ انہوں نے کامل تفصیل کے بعد زیادتی کی تھی۔ الفاظ آیت میں دونوں کا احتمال ہے لیکن دوسرے پر محمول کر رہے ہیں کہ جب کامل تفصیل آ چکی تو پھر انہوں نے توقف کیا اور وہ ذبح پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔

اور تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت احاد سے ہے اگر صحیح بھی ہو تو کتاب اللہ کے مقابل نہیں آ سکتی۔

چوتھی کا جواب یہ ہے، بوقت ضرورت تفصیل میں تاخیر تب لازم آتی ہے جب حکم پر عمل فی الفور ہو اور یہاں ہم تسلیم نہیں کرتے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ معین گائے مراد نہیں تھی تو پھر یہ کہنا ہوگا کہ تکالیف (احکام) مقدر میں پہلا حکم یہ تھا کہ کوئی گائے ہو دوسرا وہ بوڑھی اور جوان نہ ہو بلکہ دونوں کے درمیان ہو۔ جب انہوں نے اس پر عمل نہ کیا فرمایا اس کا رنگ زرد ہو۔ انہوں نے جب اس پر عمل نہ کیا گویا فرمایا: اس سے خدمت نہ لی ہو کہ زمین کیلئے جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے۔ اس قول والوں میں پھر اختلاف ہے بعض نے کہا واقع میں وہ تمام صفات کے ساتھ متصف گائے کے ذبح کے مکلف تھے حتیٰ کہ وہ بوڑھی نہ ہو اور زرد رنگ والی ہو۔

بعض نے کہا اس گائے میں صرف آخری وصف کا پایا جانا ضروری تھا جب تکلیف در تکلیف ہو تو ظاہر کلام کے زیادہ مناسب یہی قول ہوتا ہے اگرچہ روایات اور حکم بجالانے میں تردد پر تشدید کی وجہ سے پہلا قول مختار ہے۔

جب یہ ثابت ہے کہ تفصیل میں تاخیر نہیں ہوتی تو یہ تکلیف در تکلیف ہی ہوگی تو اس سے واضح ہو رہا ہے کہ کبھی اسہل (بہت آسان) اشق (زیادہ بھاری) سے منسوخ ہو جاتا ہے اور عمل سے پہلے نسخ کا جواز بھی ثابت ہو رہا ہے۔ البتہ وقت فعل سے پہلے جواز نسخ پر دلالت نہیں ہے۔

اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں وقوع نسخ کا ثبوت بھی مل رہا ہے۔ اس کا اس مسئلہ سے بھی تعلق ہے کہ نسخ پر زیادتی و اضافہ نسخ ہوگا یا نہیں اور یہاں اس پر بھی دلالت ہے جب آدمی پہلے حکم پر عمل نہ کر کے نافرمان قرار پائے تو اس کیلئے دوبارہ حکم کا وقوع بھی درست و حسین ہے۔

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: هُزُوًا، زا پر پیش یا سکون جیسے کفواً اور کف۔ امام حفص نے واؤ اور دونوں پر پیش پڑھا ہے جیسے کفوا۔

دوسرا مسئلہ: شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ استفہام انکاری ہے۔ ھزء بمعنی مھزوء ہے جیسے کان ھذا فی علم اللّٰہ (یہ اللہ کے علم میں ہے) میں علم بمعنی معلوم اور واللّٰہ رجاؤنا (اللہ ہماری امید ہے) رجاء بمعنی مرجو ہے، اس کی نظیر یہ ارشادِ ربانی ہے:

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ — تو تم نے انہیں ٹھٹھا بنالیا یہاں تک کہ انہیں بنانے کے شغل میں میری یاد بھول گئے اور تم اُن سے ہنسا کرتے (۱۸پ-المؤمنون: ۱۱۰)

صاحب کشاف کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کیا تم نے ہمیں تمسخر کی جگہ یا اہلِ تمسخر سمجھا ہے یا ہمارے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے اور ھزء کا معنی زیادہ تمسخر کرنا ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: ان کے یہ بات کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعین قاتل کے بارے میں بات کی تو فرمایا گائے ذبح کرو تو انہوں نے اپنے سوال اور جواب میں مناسبت محسوس نہ کی تو گمان کیا شاید ہمارے ساتھ ہنسی فرما رہے ہیں کیونکہ ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذبح بقرہ کا حکم دیا ہو اور انہیں یہ نہ بتایا ہو کہ اس کا ایک حصہ مقتول کو لگانے سے یہ زندہ ہو کر بتلائے گا تو یہ بات ان سے بطور استہزا صادر ہوئی ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے انہیں تمام صورت حال بتا دی ہو مگر اس پر تعجب کیا یہ کیسے ہوسکتا ہے گوشت لگانے سے مقتول زندہ ہو جائے تو انہوں نے اسے استہزاء ٹھہرا لیا۔

چوتھا مسئلہ: یہ جملہ کفر ہے

بعض مفسرین نے لکھا انہوں نے اس جملہ کے ساتھ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا اس لیے کہ اگر انہوں نے یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قدرت مردہ کو زندہ کرنے میں شک کیا تو یہ سراسر کفر ہے اور اگر انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں شک کیا کہ کیا انہوں نے یہ بات اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہی ہے تو انہوں نے آپ کو وحی الٰہی میں خائن قرار دیا اور یہ بھی کفر ہے

بعض نے کہا یہ کفر کا سبب نہیں اس کی تفصیل پر دو دلائل ہیں:

۱۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہنسی وخوش طبعی فرمانا جائز ہے شاید انہوں نے یہ محسوس کیا کہ آپ بطور حق بات خوش طبعی فرما رہے ہیں اور یہ کفر کا موجب نہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی کا معنی یہ ہے کہ آپ کا یہ جواب بڑا عجیب ہے گویا تم استہزا فرما رہے ہو نہ یہ کہ انہوں نے واقعۃً آپ کو استہزا کرنے والا قرار دیا۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ کی تفسیر

اس کی تفسیر میں چند وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: استہزا جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا منصب نبوت اس کا محل نہیں بن سکتا تو آپ نے اس سے پناہ نہیں مانگی جس کی نسبت انہوں نے آپ کی طرف کی البتہ اس سبب سے مانگی جو استہزا کا سبب بنتا ہے جیسے کہ آدمی ایسے موقع پر کہتا ہے اعوذ باللہ من عدم العقل و غلبة الهوی۔ (میں عدم عقل اور غلبہ خواہش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں) حاصل یہ ہے کہ سبب پر مسبب کا مجازاً اطلاق ہوسکتا ہے یہی وجہ اقویٰ ہے۔

دوسری وجہ: میں تو جاہل ہونے سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں یعنی میں جانتا ہوں کہ دین کے معاملہ میں استہزا پر عتاب شدید اور وعید عظیم ہے تو جب یہ میرے علم میں ہے تو میرے قدم استہزا کی طرف بڑھنے سے رک جائیں گے۔

تیسری وجہ: بعض نے کہا کبھی استہزا کو بھی جہالت وجہل کہہ دیا جاتا ہے بعض اہلِ لغت سے ہے جہل، حلم کی ضد ہے جیسے کہ بعض کے نزدیک یہ ضدِ علم ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی واضح کر رہا ہے کہ استہزا کبائر میں سے ہے اس پر تفصیلی گفتگو ارشادِ ربانی "قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" کے تحت گزر چکی ہے۔

واضح رہے قوم نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے بقرہ (گائے) کے بارے میں تین سوالات کیے تھے۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ نے ان سے نقل کیا انہوں نے کہا: "اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ"

تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: "اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ"

یہاں چند مباحث ہیں:

پہلی بحث: سوال کی مجبوری کیا تھی

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ارشادِ ربانی "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" واضح کر رہا ہے یہ حکم ذات کے اعتبار سے معین گائے پر دال ہے البتہ موقع حسن سوال کی وجہ سے اس کی تفصیل نہیں کی جب حکم مجہول تھا تو سوال واستفسار جائز ودرست ہوگا۔ لیکن جنہوں نے کہا: اصل لغت کے اعتبار سے عموم ہے تو ان پر یہ بیان کرنا لازم ہے کہ اس استفسار پر انہیں کس نے مجبور کیا؟

اس میں چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اطلاع دی کہ وہ گائے ذبح کر کے گوشت مقتول سے لگائیں تو وہ زندہ ہو جائے گا تو انہوں نے اس گائے کے بارے میں تعجب کیا اور خیال کیا کہ جس گائے کا یہ خاصہ ہے وہ تو معین ہی ہوگی لہٰذا انہوں نے اس کی صفات کے بارے میں خوب تحقیق سے کام لیا جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا عصا مبارک دیگر سے خصوصیت کا حامل تھا البتہ قوم نے اس میں خطا کی اس لیے کہ یہ عجیب نشانی اس گائے کا خاصہ نہیں بلکہ یہ معجزہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا۔

دوسری وجہ: شاید قوم کی مراد ہر گائے ہو مگر قاتل اپنی رسوائی سے ڈر گیا اس نے تفصیل میں شبہ ڈالا اور کہا حکم معین گائے کا ہے نہ کہ مطلق کا ان کے درمیان تنازعہ ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔

تیسری وجہ: خطاب اول سے اگرچہ عموم سمجھ آرہا ہے مگر قوم نے احتیاط کا ارادہ کیا اور انہوں نے مزید تفصیل اور باقی احتمالات کے ازالہ کیلئے سوال کیا مگر مصلحت تبدیل ہوتی چلی گئی جس کا تقاضا حکم معین گائے بن گیا۔

دوسری بحث: سوال وجواب میں مطابقت

"مَاهِيَ" کے ساتھ کسی کی ماہیت وحقیقت کے بارے میں سوال ہوتا ہے اس لیے کہ ما سوالیہ ہے اور ھی کا اشارہ حقیقت کی طرف ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں حقیقت مطلوب ہو اور ماہیت وحقیقت کی تعریف کیلئے شی کے اجزا اور مقدمات کا ذکر لازمی ہے نہ کہ اس کی صفاتِ خارجی کا اور یہ مسلّم ہے کہ وصف عمر، ماہیت کے امور خارجی سے ہوتا ہے لہٰذا یہاں جواب سوال کے مطابق نہ ہوگا۔

جواب: معاملہ اسی طرح ہے جو تم نے کہا مگر قرینہ بتا رہا ہے کہ ان کا مقصود گائے کی طلب حقیقت اور تعریف ماہیت نہیں بلکہ مقصود ایسی صفات ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو جائے اسی لیے سوال کے جواب میں صفات خارجی کا تذکرہ حسن ٹھہرا

تیسری بحث: صاحب کشاف لکھتے ہیں: فارض (بوڑھی) فارض کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ عمر کاٹ چکی اور آخر عمر کو پہنچ چکی۔ بکر، جوان۔ عوان، درمیان، قاضی کہتے ہیں بکر، چھوٹی، بعض نے کہا جو نہ جنے۔ بعض نے کہا جس کا ایک بچہ ہو۔ مفضل بن سلمہ الضبی کہتے ہیں فارض، بوڑھی، بکر جوان یہ ایسی خاتون جس سے وطی نہ ہو۔ اونٹنیوں میں سے جس نے ایک بچہ جنا ہو۔ شیخ قفال کہتے ہیں بکر کی اول پر دلالت ہے جیسے پہلے پھل کو باکورۃ اور ابتداء دن کو بکرۃ النهار کہتے ہیں یہ محاورہ ہے بکرت علیها البارحة اذا جاء فی اول اللیل۔ گویا اظہر یہی ہے کہ مراد نہ جننے والی ہے کیونکہ بکر سے مراد وہ خواتین ہوتی ہیں جن سے وطی نہ ہو۔ بعض نے کہا عوان، جس نے یکے بعد دیگرے بچہ جنا ہو جب یکے بعد دیگرے جنگ ہو تو 'حرب عوان' کہا جاتا ہے اسی طرح جب بار بار حاجت پوری کردی جائے تو 'حاجة عوان' کہا جاتا ہے۔

چوتھی بحث: جوازِ اجتہاد وظن غالب

اہلِ علم نے ارشادِ ربانی "عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ" سے احکام میں جوازِ اجتہاد اور استعمال غالبِ ظن پر استدلال کیا ہے کیونکہ فارض اور بکر کے درمیان کا فیصلہ بطریق اجتہاد ہی ہوگا۔

یہاں دو سوالات ہیں:

پہلا سوال: لفظ "بین" دو یا اس سے زائد اشیاء کا تقاضا کرتا ہے تو یہاں اس کا لانا کیسے جائز ہے؟

جواب: یہاں یہ دو اشیاء کے مفہوم میں ہے اس کا اشارہ مذکور فارض اور بکر دونوں کی طرف ہے۔

دوسرا سوال: دو مؤنثوں کی طرف "ذلك" سے اشارہ کیسے درست ہے جبکہ یہ واحد مذکر کیلئے ہے؟

جواب: تاویل مذکور یا ماتقدم کی وجہ سے ہے۔

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کی تفسیر

اس کی دو تفاسیر ہیں:

۱۔ وہ کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا۔ یہ "امرتك الخير" (میں نے تمہیں خیر کا حکم دیا ہے) سے ہے۔

۲۔ مراد فَافْعَلُوْا اَمْرَكُمْ بمعنی "مامور کم" تو یہاں مصدر بمعنی مفعول ہے جیسے ضرب الامیر۔

واضح رہے اس جواب سے مقصود اصلی، بقرہ کا اکمل احوال میں ہونا ہے اس لیے کہ صغیرہ ناقص ہوتی ہے بعد میں کمال تک پہنچتی ہے بوڑھی ناقص ہو چکی ہوتی ہے اور حد کمال سے گزر گئی ہوتی ہے ہاں درمیانی عمر والی حالت کمال پر ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان کا سوال ثانی لایا گیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا۔ جب انہوں نے عمر کے بارے میں جان لیا تو رنگ کے حوالے سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا۔ فقوع، شدید اور خالص زردی، تاکیداً کہا جاتا ہے۔ اصفر فاقع

یہاں دو سوالات ہیں:

پہلا سوال: لفظ فاقع یہاں لون سے خبر ہے لہٰذا یہ صفراء کی تاکید کیسے بن سکتا ہے؟

جواب: یہ لون سے خبر نہیں یہ صفراء کی تاکید ہی ہے لون کا رفع بطور فاعل ہونے کے ہے۔ اور لون اس کا سبب اور اس سے متصل ہے تو اب ان دو جملوں صفراء فاقعة اور صفراء فاقع لونها میں کوئی فرق نہیں۔

دوسرا سوال: پھر صفراء فاقعة کیوں نہ کہا لون کے ذکر میں کیا فائدہ؟

جواب: اس کے ذکر میں تاکید کا فائدہ ہے کیونکہ لون حالت کا نام ہے اور وہ زرد ہی ہے گویا کہا جا رہا ہے کہ اس کی زردی شدید ہو جیسے کہا جاتا ہے جد جده۔ جنون مجنون۔

حضرت وہب سے ہے جب تم اس گائے کی طرف دیکھو تو یوں محسوس ہو جیسے سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے خارج ہو رہی ہیں

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ کی تفسیر

معنی یہ ہے کہ اس گائے کا رنگ اس قدر خوبصورت ہو کہ دیکھنے والا خوش ہو جائے۔ امام حسن کہتے ہیں یہاں صفراء کا معنی سوداء (کالی) ہے اس لیے کہ عرب اسود (کالے) کو اصفر کہتے ہیں دھوئیں کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (پ۲۹، المرسلات: ۳۳) گویا کہ وہ زرد رنگ کے اُونٹ ہیں

یعنی سیاہ، اس معنی پر اعتراض ہے کہ اصفر (زرد) سے اسود (کالا) ہرگز مفہوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ اس کا حقیقی معنی نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہ کہ سواد فقوع کی صفت نہیں بنتا بلکہ یوں کہا جاتا ہے اصفر فاقع و اسود حالك۔ والله اعلم۔

سرور، نفس کی وہ حالت ہے جو اسے کسی لذیذ یا نافع شی کے حصول کے ساتھ اعتقاد، علم یا ظن سے عارض و لاحق ہوتی ہے۔

پھر ان کا تیسرا سوال باری تعالیٰ نے ذکر فرمایا: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اِنْشَاءَ اللّٰہُ کہنا

حضرت حسن، رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو تو ان کے اور گائے کے درمیان پردہ ہمیشہ حائل رہتا۔

واضح رہے اس مبارک کلمہ کا ہر مقصد کے حصول کیلئے پڑھنا مستحب ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (پ۱۵-الکہف: ۲۳) اور ہرگز کسی بات کو نہ کہنا کہ میں کل یہ کردوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے مدد اور معاملہ کو اس کے سپرد کرنا اس کی قدرت کا اعتراف اور اس کی مشیت کے نفاذ کا عقیدہ ہے۔

دوسرا مسئلہ: حوادثات اور ارادہ الٰہی

اہلِ سُنّت نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام حوادثات کا تعلق ارادۂ الٰہی سے ہے کیونکہ معتزلہ کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعے ان کی رہنمائی کا ہی ارادہ فرمایا تو اب ان کے انشاء اللہ کہنے کا کیا فائدہ؟ لیکن ہمارے نزدیک کبھی اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے مگر اس کا ارادہ نہیں فرماتا تو اب انشاء اللہ کا ضرور فائدہ ہوگا۔

تیسرا مسئلہ: معتزلہ کا استدلال

معتزلہ نے انشاء اللہ سے دو وجہ سے استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت حادث ہے۔

پہلی وجہ: کلمہ "اِنْ" کا تقاضا حدوث ہے۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے حصول ہدایت کو حصول مشیت ہدایت کے ساتھ معلق فرمایا جب حصول ہدایت ازلی نہیں تو لازم ہے اس کی مشیت بھی ازلی نہ ہو۔

ارشادِ گرامی "یُبَیِّنْ لَّنَا مَاهِیَ" یہاں بھی وہی سوال وارد ہوتا ہے جو پہلے گزرا کہ مَا هُوَ۔ طلب حقیقت کیلئے آتا ہے حالانکہ جواب میں صفات خارجی عارض کا ذکر ہے تو جواب سوال کے مطابق نہیں اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔

"اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا" کی تفسیر

مفہوم یہ ہے کہ درمیانی عمر اور زرد رنگ والی متعدد گائیں ہیں اس لیے ہم پر اشتباہ ہوگیا ہے کہ کونسی ذبح کی جائے؟ اس کی تا کو گرا کر اور شین میں ادغام کر کے تشابہ بمعنی متشابہ بھی پڑھا گیا اسے تشابہت بمعنی تشابہ بھی پڑھا گیا ہے۔

ارشادِ ربانی وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ کی شیخ قفال نے متعدد تفاسیر کی ہیں۔

پہلی تفسیر: ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حکم کردہ گائے کو پالیں گے جب ہم ان اوصاف پر مشتمل گائے کو حاصل کرلیں گے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

دوسری تفسیر: اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی مزید تفصیل بیان فرمادی تو ہم اسے ضرور حاصل کرلیں گے۔

تیسری تفسیر: ہم اللہ کی توفیق سے گائے کے اوصاف کے بارے میں سوالات کرنے میں حق پر تھے، یعنی ہم امید کرتے ہیں ہم اس بحث اور معاملہ میں گمراہی پر نہ تھے۔

چوتھی تفسیر: ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت سے قاتل کو پالیں گے جب ہمارے لیے اس گائے کو اوصاف کے ذریعے ممتاز کردیا جائے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے فرمایا: "اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ" لاذول، یہ بقرہ کی صفت ہے، وہ ایسی گائے ہو جو ذلول نہ ہو یعنی وہ کاشت کے کام نہ آئی ہو اور نہ ایسی گائے ہو جو پانی کیلئے استعمال کی گئی ہو پہلا لا نفی کیلئے ہے اور دوسرا تاکید اولیٰ کیلئے ہے تو معنی ہوگا لا ذلول تثیر و تسقی۔ (وہ زمین کی کاشت اور پانی کیلئے استعمال نہ کی گئی ہو) تو یہ دونوں فعل ذلول کی صفت ہیں گویا فرمایا نہ وہ بصورت زمین پھاڑنے اور بصورت پانی لانے والی ہو۔ خلاصہ یہ ٹھہرا کہ کام سے وہ ناقص ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ وہ زمین کی کاشت اور کھیت کو پلانے کیلئے استعمال نہ ہوئی ہو کیونکہ یہ دونوں عمل نقص پیدا کرتے ہیں۔

مُسَلَّمَةٌ کی تفسیر

اس کی چند تفاسیر ہیں:

پہلی، تمام عیوب سے مطلقاً محفوظ ہو۔ دوسری، اعمال مذکورہ سے محفوظ ہو۔ تیسری، حبس وقید سے آزاد و وحشی ہو۔ چوتھی، وہ ایسے داغ سے محفوظ ہو جو اس رنگ کے خلاف ہو یعنی اس زرد رنگ میں کسی دوسرے رنگ کا اختلاط نہ ہو لیکن یہ چوتھی تفسیر ضعیف ہے۔ ورنہ 'لَاشِيَةَ فِيْهَا' غیر مفید اور تکرار بن جائے گا بلکہ اس لیے اولیٰ یہ ہے کہ اسے عیوب سے سلامتی پر محمول کیا جائے اور لفظ کا تقاضا بھی یہی ہے اس لیے کہ یہ علل اور عیوب سے کامل سلامتی پر دلالت کرتا ہے، علماء نے اسی سے اس پر استدلال کیا کہ ظاہر پر عمل جائز ہے باوجودیکہ باطن اس کے خلاف ہو کیونکہ کلمہ "مُسَلَّمَةٌ" کی تفسیر جب ہم نے کی کہ وہ عیوب سے محفوظ ہو تو ہم یہ بات بطور حقیقت نہیں جان سکتے ہاں بطریق ظاہر ہی جان سکتے ہیں۔

لَا شِيَةَ فِيهَا کی تفسیر

مراد یہ ہے کہ وہ خالص زرد رنگ کی ہو دوسرے کسی رنگ کی ملاوٹ واختلاط نہ ہو اس لیے کہ بقرۃ صفراء کا یہ وصف اس وقت ہی بیان کیا جاتا ہے جب اکثر رنگ اس کا زرد ہو تو اللہ تعالیٰ نے لا شية فيها فرما کر اس میں عموم واضح کیا کہ اس کا تمام رنگ زرد ہو۔ منقول ہے اس کے ناخن اور اس کے سینگ بھی زرد تھے۔ الوشی ایک رنگ کا دوسرے کے ساتھ ملنا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا کہ اس تفصیل کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کی اور کہنے لگے "الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" بلاشبہ ان کی طرف سے کفر کا بیان ہے۔ اس لیے کہ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ پہلے حکم کو وہ حق نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ احتمال ہے ان کی مراد یہ ہو کہ اب ہمارے لیے حکم کی وضاحت ہوئی ہے حتی کہ وہ گائے دوسروں سے ممتاز ہو گی لہٰذا یہ کفر نہ ہوا

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ کی تفسیر

معنی یہ ہے کہ انہوں نے گائے ذبح کی حالانکہ وہ ذبح کیلئے تیار نہ تھے۔ یہاں ایک بحث ہے اہلِ نحو نے "كَادَ" کی دو تفسیریں لکھی ہیں:

کاد کی دو تفاسیر

پہلی تفسیر: اس کی نفی اثبات اور اس کا اثبات نفی ہوتا ہے مثلاً كَادَ يَفْعَلُ كَذَا کا معنیٰ ہے کہ قریب ہے وہ کام کرے لیکن اس نے کیا نہیں اسی طرح مَا كَادَ يَفْعَلُ كَذَا قریب ہے کہ وہ نہ کرے مگر کرتا ہے۔

دوسری تفسیر: شیخ عبدالقاہر جرجانی نحوی کا مختار یہ ہے کہ کاد کا معنی مقاربت ہے۔ کاد یفعل (فعل قریب) وما کاد یفعل (وہ قریب میں نہیں کرے گا)

اول قول والوں نے دوسرے معنیٰ کے فساد پر اس آیت سے استدلال کیا ہے اس لیے ارشادِ باری تعالیٰ وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قریب میں ذبح نہ کرنے والے تھے فعل قریب کی نفی اثبات فعل کے مخالف ہے اور اگر یہ مقاربت پر دلالت کرے تو اس آیت میں تناقض آجائے گا۔

یہاں چند مباحث ہیں:

پہلی بحث: یتیم کی گائے

منقول ہے بنی اسرائیل میں نیک آدمی تھا اسی کی گائے تھی موت کے وقت اس نے کہا' یا اللہ اسے میں یہ اپنے بیٹے کیلئے تیرے حوالے کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جائے اور وہ اپنے والدین کا خادم تھا۔ وہ پلتی رہی حتیٰ کہ سب سے خوبصورت اور موٹی ہوگئی۔ اس یتیم اور اس کی ماں نے اس کی خوب قیمت مانگی حتیٰ کہ لوگوں نے ان سے کھال بھر سونا دے کر خریدی حالانکہ اس وقت گائے کی قیمت تین دینار تھی اور انہوں نے یہ گائے چالیس سال میں تلاش کی۔

دوسری بحث: ذبح یا نحر

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ہے گائے ذبح ہوئی نہ کہ نحر۔ حضرت عطا کہتے ہیں وہ نحر ہوئی تھی۔ فرمایا ذبح اور نحر ایک ہی ہیں۔ حضرت قتادہ اور زہری سے ہے چاہو نحر کہہ دو چاہو ذبح۔ ظاہر آیت کی دلالت اس پر ہے کہ انہیں ذبح کا حکم ملا۔ انہوں نے وہ طریقہ اپنایا جسے ذبح کہا جاتا ہے۔ نحر اگرچہ ذبح کیلئے کافی ہے لیکن وہ صورۃً ذبح کے مخالف ہے اور ظاہر ہمارے قول کی تائید کرتا ہے حتیٰ کہ اگر انہوں نے نحر کیا تو کوئی دلیل ایسی نہیں جو اسے قائم مقام ذبح قرار دے لہٰذا وہ کافی نہ ہوگا۔

تیسری بحث: کیا وجہ وہ ذبح پر تیار نہ تھے

اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا قیمت بہت زیادہ تھی جبکہ کچھ کا کہنا ہے انہیں رسوائی اور شہرت کا خوف تھا۔ دونوں صورتوں میں حکم پر عمل نہ کرنا جائز نہیں۔

پہلی میں اس لیے کہ جب انہیں معین گائے کا حکم تھا تو یہ فعل ثمن کثیر کے بغیر تام نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا ان پر اس کی ادائیگی لازم تھی اس لیے کہ جس پر واجب کی تکمیل موقوف ہوتی ہے وہ بھی واجب ہوتا ہے۔ البتہ اس صورت میں جب اس کے مخالف دلیل موجود ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر پانی بہت مہنگا ہو تو شریعت نے نمازی کو تیمم کی اجازت دی ہے اگر اجازت نہ ہوتی تو پانی کا خریدنا لازم ہوتا اس کے بغیر وضو ہی نہ ہوسکتا۔

دوسری صورت میں اس لیے کہ رسوائی کے خوف سے تکلیف کا ارتفاع نہیں ہوجاتا مثلاً جب قصاص لازم ہوجاتا ہے تو ولی قصاص کے مطالبہ پر تسلیم نفس ضروری ہوتا ہے بعض اوقات اعلان ضروری ہوجاتا ہے تاکہ شر و فتنہ ختم ہوجائے اور بعض اوقات اس لیے اعلان ضروری ہوتا ہے تاکہ اس قوم سے تہمت ختم ہوجائے جن کے قریب مقتول کو پھینکا گیا تھا کیونکہ وہاں ان پر تہمت کیلئے ایسا کیا تھا لہٰذا اس کا ازالہ نہایت ضروری تھا لہٰذا اس عمل کو بوجھ بنا کر رک جانا کہاں جائز ہے؟

چوتھی بحث: امر سے وجوب کا ثبوت

امر، وجوب کیلئے ہوتا ہے اس کے قائلین نے اس پر اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا یہاں امر ہی ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے بوجھ سمجھنے اور اس عمل میں تکاسل پر ان کی مذمت کی، اس تمام کی دلالت اسی پر ہے کہ امر وجوب کیلئے ہے۔

قاضی کہتے ہیں جب حکم سے غرض ازالہ شر وفتنہ ہو اسی وقت یہ وجوب کیلئے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ذبح کا حکم دیا تاکہ قاتل معلوم ہو اور اس شر وفتنہ کا ازالہ ہو جائے جس کا وہاں اندیشہ تھا اور ایسے نقصان سے بچنا نہایت ہی لازم ہے جب اس کا ازالہ اس فعل سے ہی ہوسکتا تھا لہٰذا یہ لازم ٹھہرا

اور یہ بھی امکان ہے کہ اس شریعت میں قربانی کا حکم لازم ہو اور وہ اسے پہلے ہی جانتے تھے لہٰذا وہاں محض امر کافی ہوگیا۔

ہم کہتے ہیں ان دونوں سوالات کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ امر وجوب پر دال ہوتا ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وجوب کے منافی ہوتا ہے شاید یہاں فہم وجوب، امر کے علاوہ کسی اور سبب سے ہو اور وہ سبب متصل قرینہ حالیہ ہے کہ یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ نقصان کا ازالہ لازم ہے یا قرینہ مقالیہ ہو وہ یہ ہے ان کے ہاں قربانی کا حکم بطور وجوب ہو۔

جواب: مذکور یہاں صرف یہ ارشادِ گرامی ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" جب ترک ذبح پر مذمت اور زجر ہوا تو معلوم ہو گیا اس کا منشاء محض ذکر امر ہے اس لیے کہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ ہے کہ حکم کا کسی وصف پر مرتب ہونا بتا رہا ہوتا ہے کہ اس حکم کی علت وہ وصف ہی ہے۔

پانچویں بحث: امر کا تقاضا فی الفور عمل

امر کی دلالت اس پر ہوتی ہے کہ اس حکم پر فی الفور عمل کیا جائے، اس کے قائلین نے اسی آیت سے اس پر استدلال کیا ہے جب انہوں نے ذکر امر کے باوجود اس عمل میں تاخیر کی تو ان پر ناراضگی کا اظہار ہوا جو واضح کر رہا ہے کہ اس کی دلالت فی الفور عمل پر ہوتی ہے

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا کی تفسیر

واضح رہے اس قتل کے وقوع کا باری تعالیٰ کے حکمِ ذبح سے پہلے ہونا ضروری ہے البتہ اس کی خبر دینا اور ذبح کے بعد اس مقتول کو گوشت لگانا ان کا تذکرہ ضروری نہیں کہ قصہ گائے سے پہلے ہو لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ اس واقعہ کا تلاوت میں بھی پہلے ہونا لازم تھا غلط ہے اس لیے کہ باعتبار ذات کے اس قصہ کا وجود میں پہلے ہونا ضروری ہے رہا ذکر میں تقدم تو یہ لازم نہیں اس لیے کبھی سبب، ذکر حکم سے پہلے ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس گویا جب واقعہ پیش آیا اللہ تعالیٰ نے انہیں ذبح گائے کا حکم دیا جب انہوں

قتل قدیر

نے ذبح کیا تو فرمایا، یاد کرو جب تم نے آدمی کو قتل کیا اور تمہارے اندر اختلاف ونزاع کھڑا ہو گیا تو میں نے اس قاتل کو ظاہر کر دیا جسے تم چھپا رہے تھے بایں طور کہ تم نے مذبوحہ گائے کا گوشت مقتول کو لگایا اور یہ درست ہے۔

سوال: تسلیم کہ اس نظم میں کوئی خلل نہیں لیکن دوسری نظم مستحسن ضرور ہے اس نظم کو ترجیح دینے میں کیا فائدہ؟

جواب: ذبح گائے کا ذکر، قصہ قتل سے پہلے کیا اس لیے اگر اس کے برعکس کیا جاتا تو قصہ واحد بن جاتا تو اس سے تفریع واضح ہونے کی وجہ سے غرض فوت ہو جاتی۔

فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا کی تفسیر

اس کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ تم نے اس مقتول نفس کے بارے میں اختلاف و جھگڑا کیا اس لیے کہ آپس میں متخاصم ومخالف اپنے آپ کو بچا کر بات دوسرے پر ڈالتے ہیں۔

۲۔ ہر ایک اپنے سے قتل کی نفی کر کے دوسرے پر ڈال رہا تھا۔

۳۔ تم ایک دوسرے سے برأت اور تہمت کا دفاع کر رہے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دراء کا معنی دور کرنا ہے جب لوگ آپس میں جھگڑا کرتے ہیں تو ہر آدمی اپنے سے تہمت کو دور، دوسرے کی دلیل کا رد اور ہر ایک دوسرے کی دلیل خواہ وہ تہمت ہو یا برأت پر رد کرتا ہے۔

شیخ قفال کہتے ہیں: "فِيۡهَا" میں ضمیر نفس کی طرف ہے یعنی تم نے نفس میں اختلاف کیا لیکن قتل کی طرف بھی ہو سکتی ہے اس لیے کہ لفظ قَتَلۡتُمۡ اس پر دلیل ہے۔

ارشادِ باری "وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ یقیناً اس قتل کے معاملہ کو ظاہر فرمانے والا ہے جو تم چھپا رہے ہو۔

سوال: مُخۡرِجٌ معنی ماضی میں ہے وہ یہاں کیسے مناسب ہے؟

جواب: کبھی مستقبل کے حوالے سے حکایت ہوتی ہے جو بوقت تدافع وازالہ ہوتی ہے جیسا کہ کبھی حاضر سے حکایت ہوتی ہے۔ فرمایا: بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ (وہ بازو بچھائے ہوئے ہے) اور یہ معطوف (اِدّٰرَءۡتُمۡ) اور معطوف علیہ (فَقُلۡنَا) کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ فساد تخلیق نہیں کرتا

معتزلہ کہتے "وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" بتا رہا ہے کہ یہ عمل لازم ہے اس لیے باب قتل میں اختلاف اور تنازع، فتنہ اور فساد کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں فرماتے اس لیے ضروری ہے کہ کتمان کو زائل کیا جائے تا کہ فساد کا ازالہ ہو تو یہ بات شاہد ہے کہ اللہ سبحانہ نہ فساد کا ارادہ فرماتا ہے نہ اس سے راضی ہوتا ہے اور نہ ہی اسے تخلیق فرماتا ہے۔

دوسرا مسئلہ: عمل ضرور سامنے آجاتا ہے

یہ آیت اس کی بھی نشاندہی کر رہی ہے کہ بندہ خواہ خیر کو مخفی کرے یا شر کو اگر وہ اس پر دوام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ظاہر فرما دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ عَبْدًا لَّوْ اَطَاعَ اللّٰهَ مِنْ وَّرَاءِ سَبْعِيْنَ حِجَابًا لَاَظْهَرَ اللّٰهُ ذٰلِكَ عَلٰى اَلْسِنَةِ النَّاسِ (حلیۃ الاولیاء، ۵، ۳۷)

اگر کوئی بندہ ستر پردوں کے پیچھے اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی زبان پر اسے جاری فرما دیتا ہے۔

معصیت کا بھی یہی حال ہے، مروی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا، بنی اسرائیل سے کہو، وہ اپنے اعمال میری رضا کیلئے مخفی کریں اور میں ان کو ظاہر کروں گا

چوتھا مسئلہ: آیت بتا رہی ہے کہ عام سے خاص مراد ہوتا ہے اس لیے کہ "مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" کے الفاظ تمام مخفی اُمور کو شامل ہیں حالانکہ مراد خاص واقعہ ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ذبح گائے اور چالیس سال

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اس گائے کے صاحب کی تلاش میں چالیس سال گذر گئے اس کے بعد ذبح کی گئی مگر یہ روایت ظاہراً ان کے خلاف ہے اس لیے کہ فَقُلْنَا کی فاء تعقیب کیلئے ہے جو واضح کر رہی ہے "اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا" اس کے ایک حصہ کو مقتول کے ساتھ لگایا۔ "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" کے بعد متصلاً اور جلدی ہوا۔

دوسرا مسئلہ: "اِضْرِبُوْهُ" میں ضمیر یا تو نفس کی طرف ہے تو اب نفس کا مذکر ہونا بتا دیل شخص وانسان ہے یا اس کا مرجع مقتول ہے جس پر "مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" دلیل ہے۔

لعل قدیر

تیسرا مسئلہ: ذبح اور مصلحت

ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ذبح بقرۃ کا حکم کسی ایسی مصلحت کی بنا پر دیا جو اس کے بغیر حاصل نہ ہو پاتی اور یہ بھی ممکن ہے وہ گائے اور دوسری برابر ہو لیکن اقرب پہلی بات ہے اس لیے کہ اگر دوسری اس کی جگہ لے سکتی تو وہ معین طور پر واجب نہ ہوتی بلکہ اس کے اور دوسری کے درمیان اختیار دے دیا جاتا۔

یہاں دو سوالات ہیں:

گوشت لگانے کی حکمت

پہلا سوال: مقتول کو گوشت لگانے میں کیا فائدہ حالانکہ اللہ تعالیٰ زندہ کرنے پر اس کے بغیر بھی قادر ہے؟

جواب: فائدہ یہ تھا تاکہ ان پر حجت پختہ ہو اور ان کا مکر وفریب نہ چل سکے کیونکہ کوئی بھی ملحد کہہ سکتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بذریعہ جادو اور حیلہ کے اسے زندہ کر دیا لیکن جب مذبوحہ گائے کے گوشت کی وجہ سے وہ زندہ ہوا تو یہ شبہ ختم ہو گیا کہ کوئی چیز اس کے جسم میں منتقل ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ زندہ ہوا۔

جب بات یوں ہے تو جب ان کے فعل سے وہ زندہ ہوا تو اس سے یہ نشاندہی بھی ہوگئی کہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہوتی ہے نہ کہ بندوں کی جعل سازی سے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تقدیم قربانی کی وجہ سے حکم قربانی کو عظمت حاصل ہوتی ہے۔

غیر گائے کا حکم کیوں نہیں

دوسرا سوال: غیر گائے کے ذبح کا حکم کیوں نہ دیا؟

جواب: یہ ہے کہ اس صورت میں بھی یہی سوال اٹھتا جو ذبح گائے میں ہوا۔ ہاں اس کے فوائد یہ ہیں:

ذبح گائے کے فوائد

۱۔ اس قربانی سے تقرب ملا جس کا معمول تھا۔

۲۔ ان کے ہاں گائے کی قربانی اعظم سمجھی جاتی تھی۔

۳۔ اس میں ثواب زیادہ تھا کہ اس لیے کہ اس کی بڑی تلاش کرنا پڑی پھر اس کا نہایت ہی قیمتی ہونا۔

۴۔ اس میں مالک گائے کیلئے مال عظیم کا بھی حصول ہے۔

چوتھا مسئلہ: لگایا جانے والا حصہ کونسا تھا؟

اس میں اختلاف ہے۔اقرب یہی ہے کہ انہیں اختیار تھا کہ وہ جو حصہ بھی اسے لگائیں وہ زندہ ہو جائے گا۔اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم "اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا" پر عمل کرنے والے بن جائیں گے۔اصول فقہ میں یہ ضابطہ ہے کہ مامور بہ کے بجالانے سے انسان عہدہ برا ہو جاتا ہے اور یہ بات اختیار ہی کی مقتضی ہے۔

البتہ انہوں نے کونسا حصہ لگایا؟ بعض نے زبان، بعض کے نزدیک دایاں ران، بعض کے نزدیک دُم اور بعض نے کہا وہ نرم ہڈی جو کان کی اصل ہے بعض نے کہا دونوں کاندھوں کا درمیانی حصہ۔

بلاشبہ قرآن میں اس کی نشاندہی نہیں اگر کسی صحیح حدیث میں اس کی نشاندہی مل جائے تو اسے قبول کرنا لازم ہے ورنہ سکوت لازم

پانچواں مسئلہ: یہاں کلام محذوف ہے ہم نے کہا اس کا حصہ لگاؤ انہوں نے لگایا تو وہ زندہ ہو گیا اور حذف پر ارشادِ باری تعالیٰ 'كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى' کی دلالت موجود ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ (پ۱-البقرۃ:۶۰) اپنا عصا پتھر پر مارو تو جاری ہو گئے

تو یہاں بھی یہ محذوف ہے کہ انہوں نے عصا مارا تو چشمہ جاری ہو گیا۔

یہ بھی منقول ہے کہ جب انہوں نے گوشت لگایا تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو گیا اور اس کی رگوں سے خون جاری تھا۔ پھر اس نے بتایا مجھے میرے چچازاد فلاں فلاں بھائی نے قتل کیا اس کے بعد پھر مردہ ہو گیا۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اس آیت میں دو وجہ ہیں:

۱۔ یہ اشارہ اس مخصوص میت کی طرف ہے۔

۲۔ دوبارہ زندگی کی صحت پر استدلال ہے پھر یہ استدلال مشرکین کے خلاف ہو گا یا کسی دوسرے کے خلاف؟

اس میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: مشرکین کے خلاف استدلال

شیخ اصم کہتے ہیں یہ مشرکین کے خلاف ہے اس لیے کہ اگر اسی طرح زندہ ہونا بطور تواتر ان تک پہنچا ہے تو وہ دوبارہ زندگی کے بارے میں جان لیں گے اور اگر ان کے ہاں بطور تواتر نہیں پہنچا تو کم از کم وہ اس میں غور وفکر سے کام لیں گے۔

قاضی کہتے ہیں یہ قول اقرب ہے کیونکہ اس سے پہلے گوشت لگانے اور میت کے زندہ ہونے کے سبب کا ذکر آیا ہے اس کے بعد فرمایا: "كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى" "مَوْتٰى" جمع ہے اگر مراد مخصوص میت ہوتی تو جمع کا کلمہ نہ لایا جاتا گویا یہ فرمایا جارہا ہے کہ دوبارہ زندہ کرنا اللہ کی قدرت میں ابتداً پیدا کرنے کی طرح ہی ہے۔

دوسرا قول: بنی اسرائیل اور مشاہدہ

شیخ قفال کہتے ہیں ظاہر کلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسرے مردوں کو زندہ فرمانا اسی زندہ کرنے کی طرح ہے جو تم مشاہدہ کر رہے ہو اس لیے کہ اگرچہ وہ اس پر ایمان رکھتے تھے لیکن پہلے بطور استدلال ہی مانتے تھے انہوں نے اس کا مشاہدہ نہ کیا تھا جب مشاہدہ کرلیا دلوں کو اطمینان مل گیا اور وہ شبہات ختم ہوگئے جن سے کوئی مستدل بھی خالی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا:

رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ (پ۳-البقرہ:۲۶۰)

اے رب میرے مجھے دکھادے تو کیونکر مردے جلائے گا فرمایا کیا تجھے یقین نہیں عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے

تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے مردہ کو زندہ کر کے فرمایا:

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى

ایسے ہی اللہ زندہ کرتا ہے مردوں کو

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں زندہ فرمایا وہ آخرت میں بھی زندہ فرما سکتا ہے، اُسے ایجاد کیلئے کسی مادہ، مدت اور مثال وآلہ کی احتیاجی نہیں۔

دوسرا مسئلہ: بعض لوگوں نے "كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى" سے مقتول کے میت ہونے پر استدلال کیا، لیکن یہ ضعیف ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کی زندگی سے موتی کے احیاء کا بیان فرمایا ہے تو اس سے مقتول کا میت ہونا لازم نہیں آتا۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ کی تفسیر

سوال: جب یہ نشانی واحدہ ہے تو آیات فرمانے کی حکمت؟

جواب: یہ نشانی واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس، صانع، تمام مقدورات پر قادر، تمام معلومات کی عالم اور ایجاد و تخلیق میں مختار ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صدق، غیر قاتلوں کا بری ہونا، قاتل کا متعین ہوجانا یہ اگرچہ واحد نشانی ہے مگر جب یہ اس قدر کثیر مدلولات وحقائق پر دال ہے تو یہ آیات کثیرہ کے مقام پر ہوئی۔

ارشادِ الٰہی 'لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ' میں دو مباحث ہیں:

پہلی بحث: لعلّ کی تفسیر پہلے 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ' کے تحت گزر چکی ہے۔

دوسری بحث: ان آیات کے سامنے آنے سے پہلے بھی وہ لوگ اہل عقل تھے۔ جب انہیں عقل حاصل تھی تو اب انہیں یہ کہنا کیسے درست ہے کہ میں نے تمہیں یہ آیات دکھائی ہیں تاکہ تم عقل والے بن جاؤ۔ لہٰذا یہ الفاظ اپنے ظاہر پر نہیں ہوں گے بلکہ ان کی تاویل کرنا ہوگی اور وہ یہ ہے۔

تم اپنی عقول کے مطابق عمل کرو اور دوبارہ زندگی کا انکار نہ کرو اس لیے کہ جو ذاتِ اقدس ایک نفس کے زندہ کرنے پر قادر ہے وہ تمام کو بھی زندہ کرسکتی ہے کیونکہ اس نفس کی کوئی خصوصیت نہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ آخری بات ہے۔

قاتل کے وارث بننے کا حکم

متعدد مفسرین نے یہاں یہ گفتگو کی ہے کہ آیت سے ثابت احکام میں سے یہ ہے کہ کیا قاتل وارث بنے گا یا نہیں؟ نہیں بن سکتا اس لیے کہ حضرت عبیدہ سلمانی سے ہے اس واقعہ میں قاتل کو قتل کی وجہ سے وراثت سے محروم کردیا گیا۔

قاضی کہتے ہیں اس مسئلہ کو اس آیت سے منتج کرنا مناسب نہیں اس لیے ظاہراً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قاتل اس کا وارث تھا یا نہیں؟ اگر وہ اس کا وارث تھا تو کیا وہ وراثت سے محروم ٹھہرایا نہیں؟ اور حضرت ابوعبید سے جو مروی ہے کہ وہ محروم رہا تو اس سے اسے احکام قرآن میں شامل کرلینا کہاں درست ہے کیونکہ قرآن کی اس پر نہ اجمالاً دلالت ہے اور نہ تفصیلاً۔

اور یہ ثابت نہیں کہ ان کی شریعت ہماری شریعت کی طرح تھی اور نہ ہی ان کی اقتداء ہم پر لازم ہے تو ایسے کلام کو احکام قرآن میں شامل کرنا سوائے تعسف کے کچھ نہیں۔

نقل قدیم

قاضی کی بات ہی حق ہے لیکن مسئلہ ذکر کیے دیتے ہیں۔

قاتل کے وارث بننے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔امام شافعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں وہ وارث نہیں خواہ وہ قتل بغیر استحقاق سے عمداً ہو یا خطاء یا وہ مستحق تھا جیسے عادل حکمران نے باغی کو قتل کروادیا۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں قتل عمد وخطا میں وارث نہیں بنتا۔البتہ اس صورت میں وارث بنے گا جب عادل نے باغی کو قتل کیا اسی طرح جب قاتل صبی یا مجنون ہو نہ اس کی دیت سے وارث ہوگا اور نہ اس کے بقیہ اموال سے۔حضرت علی، حضرت عمر، ابن عباس اور سعید بن میسب رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔شیخ عثمان البتی کہتے ہیں خطأ قاتل وارث بنے گا لیکن عمداً قاتل وارث نہیں بنے گا۔امام مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں دیت کا وارث نہ ہوگا البتہ بقیہ مال کا ہوگا۔حضرت حسن، مجاہد، زہری اور اوزاعی کا یہی قول ہے۔امام شافعی رضی اللہ عنہ کا استدلال مشہور حدیث ہے۔فرمایا: قاتل کو وراثت سے کوئی شی نہیں ملے گی البتہ اس حدیث سے استدلال اس وقت درست ہوگا جب ہم خبر واحد کے ساتھ عمومِ قرآن میں تخصیص جائز مانیں اور اس پر تفصیلی کلام اصول فقہ میں ہے۔

دقیق نکتہ

یہاں ایک دقیق نکتہ ہے، عام کو تخصیص کا عارض ہونا ضعف ہوتا ہے اگر ہم اس روایت کو بعض صورتوں کے ساتھ مخصوص کرلیں تو اس پر مسلسل اسباب ضعف وارد ہوں گے۔اس کا خبر واحد ہونا سبب ضعف ہے۔اس کا قرآن کے خلاف ہونا دوسرا ضعف ہے اور اس کا کسی سبب مخصوص ضعف پیدا کرے گا تو اگر ہم اس روایت کے ساتھ قرآن کو مخصوص کریں گے تو بہت قوی پر بہت ہی ضعیف کی ترجیح لازم آئے گی لیکن اگر ہم اس روایت کو مخصوص نہیں کرتے تو بعض اسباب ضعف از خود ختم ہوجائیں گے تو پھر عموم قران میں اس سے تخصیص بعید نہ ہوگی۔

شیخ ابوبکر رازی نے اس پر دلیل دیتے ہوئے کہ عادل باغی کو قتل کردے گا تو وہ وراثت سے محروم نہ ہوگا۔لکھا کہ ہمارے علم میں اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جس کا کسی انسان پر قصاص ہو اور وہ اسے قصاص میں قتل کردے تو وہ اس کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا لیکن واضح رہے شوافع اس صورت کو تسلیم نہیں کرتے۔واللہ اعلم۔

[۷۴] ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

(پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھروں میں سے تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ کی تفسیر

اس میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: دل کی نرمی کیا ہے؟

جو شئی اپنی اصل ذات کے اعتبار سے دوسری شئی سے اثر قبول کرنے والی ہو لیکن کسی عارضہ کی وجہ سے وہ اثر قبول نہ کرے تو اسے سخت، غلیظ اور قاسی کہا جاتا ہے مثلاً جسم، غیر کا اثر قبول کرتا ہے لیکن اگر اسے صفت حجریت (پتھر) عارض ہو جائے تو وہ اثر قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح دل، مطالعہ دلائل، آیات اور عبرتوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا متاثر ہونا یہ ہے کہ وہ تکبر، سرکشی اور غرور ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی طاعت اس کیلئے خوف اور خشوع اختیار کر لیتا ہے جب دل کو کوئی ایسا عارضہ لاحق ہو جائے تو وہ تاثر قبول نہ کرنے میں پتھر کے مشابہ ہو جاتا ہے پھر کہا جاتا ہے قسا القلب و غلظ۔ (دل سخت ہو گیا) یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کا وصف، دل کا نرم ہونا بیان فرمایا:

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (پ۲۳-الزمر: ۲۳)

اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں

دوسرا مسئلہ: خطاب اہل کتاب سے ہے

شیخ قفال کہتے ہیں ممکن ہے "قُلُوْبُکُمْ" سے خطاب حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے اہل کتاب سے ہو یعنی تمہارے دل ان بینات کے بعد سخت ہو گئے جو تمہارے اوائل لائے اور ان امور کے بعد جو ان پر جاری ہوئے۔ اس عتاب کے بعد جو معصیت پر اصرار کرنے والے تھے۔ ان آیات کے بعد جو ان کے پاس انبیاء علیہم السلام لائے، ان معاہدوں کے بعد جو تم سے اپنے بارے میں لئے گئے اور ان کے بارے میں جو تورات ماننے والے تھے تو اس کے ذریعے ان کی سرکشی اور جفا کی اطلاع دی ہے حالانکہ انہیں ایسی آیات و معجزات کا علم تھا جو دلوں کو نرم کر دیتے ہیں۔

یہ بات اولیٰ ہے اس لیے کہ ارشادِ ربانی "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ" بالمشافہ خطاب ہے لہٰذا اس کا موجود لوگوں پر محمول کرنا ہی اولیٰ ہے ممکن ہے وہ مخصوص یہود مراد ہوں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ سابقہ مراد ہوں۔

تیسرا مسئلہ: قاتل بتانے کے بعد

ارشادِ ربانی "مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ"، ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ انہوں نے جب مقتول کو گوشت لگایا اور اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کو زندہ کر دیا اور اس نے اپنے قاتل کے بارے میں بتایا تو اس کے بعد، اس لیے کہ منقول ہے جب مقتول نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی تو اس نے انکار کرتے ہوئے مقتول کو جھوٹا کہا اور کچھ لوگوں سے مل کر فتنہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں بیان کیا اس قدرت کی نشانی کے اظہار کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ" سے اس طرف اشارہ ہو کہ شمار کردہ تمام عظیم نعمتوں اور ان معجزات کے ظہور کے بعد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر ہوئے تمہارے دل سخت ہو گئے اس لیے کثرت مشاہدات کے باوجود یہود کے دل عناد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراضات ختم نہ ہوئے۔ مقام تیہ میں ان کے بارے میں مطالعہ رکھنے والا اس سے بخوبی آگاہ ہے

اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً کی تفسیر

اس میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: کلمہ تشکیک اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں

کلمہ اَو، تردید و تشکیک کیلئے آتا ہے جو علاّم الغیوب کے لائق نہیں لہٰذا تاویل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ واؤ کے معنی میں ہے، جیسے ارشادِ ربانی ہے:

اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ (پ۲۳-الصافات:۱۴۷) لاکھ آدمیوں کی طرف بھیجا بلکہ زیادہ

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِھِنَّ اَوْ آبَآئِھِنَّ اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر اور اپنے باپ پر

(پ۱۸-النور:۳۱)

تیسرے مقام پر فرمایا:

اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ آبَآئِکُمْ کہ کھاؤ اپنی اولاد کے گھر اور اپنے باپ کے گھر

(پ۱۸-النور:۶۱)

اس کے نظائر اور بھی ملتے ہیں مثلاً ارشاد فرمایا:

لَعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (پ۱۶،طہٰ:۴۴) اس اُمید پر کہ وہ دھیان کرے اور کچھ ڈرے

فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (پ۲۹ ،المرسلات:۵،۶) پھر ان کی قسم جو ذکر کا القا کرتی ہیں حجت تمام کرنے اور ڈرانے کو

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ بندوں کیلئے ابہام ہے یہ ایسے ہی ہے مثلاً کوئی آدمی کہتا ہے میں نے روٹی یا کھجور کھائی، اب کھانے والے کو تشکیک نہیں

۳۔ اس سے مراد ''فَھِیَ کَالْحِجَارَةِ'' ہو یعنی ان میں بعض ایسے ہیں جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

۴۔ جب لوگوں نے ان کے دلی احوال سنے تو کہنے لگے وہ پتھر کی طرح تھے یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ یہی اس آیت میں مراد ہے

فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (پ۲۷،النجم:۹) تو اس جلوے (اور اس محبوب میں) دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم

یعنی تمہاری نگاہ اور اعتقاد میں ایسا ہے۔

۵۔ أو بمعنی،بل (بلکہ) ہے کسی کا شعر ہے:

فو اللّٰه ما أدری أسلمی تغولت   أم القوم أو کل الی حبیب

یہاں أو بمعنی،بل ہے۔

۶۔ ہم کہتے ہیں، ہم میٹھا یا کھٹا کھانا کھائیں گے، اب ہمارا کھانا انہی دو کے اندر محدود ہے یہاں غرض تردد نہیں بلکہ ان دونوں کے علاوہ کی نفی ہے

۷۔ او، حرف اباحت ہے گویا فرمایا ان دونوں میں سے جس کے ساتھ بھی ان کے دلوں کی مشابہت بنائیں درست ہے مثلاً کہا جاتا ہے، ''جالس الحسن او ابن سیرین'' یعنی تم ان میں سے جس کی بھی صحبت اختیار کرلوگے درست ہے اگر تم دونوں کے ساتھ مل بیٹھو تو بہت ہی خوب۔

دوسرا مسئلہ: صاحبِ کشاف کہتے ہیں اشد کا عطف کاف پر ہے یعنی او مثل اشد قسوۃ تو یہاں مضاف حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے مقام پر ذکر کر دیا یا عبارت یوں ہے: او ھی انفسھا اشد قسوۃ۔

تیسرا مسئلہ: پتھر سے سخت قرار دینے کی حکمتیں

پتھر سے بھی زیادہ سخت قرار دینے کی حکمتیں ہیں۔

۱۔ پتھر اگر صاحب عقل ہوتا اور یہ نشانی وہ پاتا تو پگھل جاتا جیسا کہ فرمان ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (پ۲۸، الحشر: ۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تُو اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے

۲۔ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر اللہ تعالیٰ جو بھی اس میں چاہے کرے وہ اس میں رکاوٹ نہیں بلکہ وہ اپنے میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق تسخیر کرنے میں مانع نہیں اور ان لوگوں پر اس قدر آیات اور نشانیوں کے اظہار اور اللہ تعالیٰ کے مسلسل نعمتوں کے باوجود یہ اس کی طاعت نہیں کرتے اور اس کے حق معرفت کیلئے ان کے دل نرم نہیں ہوتے اور یہ اسی طرح ہیں جس طرح فرمانِ الٰہی ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (پ۷- الانعام: ۳۸، ۳۹)

اور نہیں کوئی زمین پر چلنے والا اور نہ کوئی پرند کہ اپنے پروں پر اڑتا ہے مگر تم جیسی اُمتیں ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا پھر اپنے رب کی طرف اٹھائے جائیں گے اور جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں بہرے ہیں گونگے ہیں اندھیروں میں اللہ جسے چاہے گمراہ کردے اور جسے چاہے سیدھے رستے پہ ڈال دے

مفہوم یہ ہے کہ اولادِ آدم کے علاوہ تمام حیوانات اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق اطاعت کرتے ہیں مگر یہ کفار اللہ تعالیٰ کے مطالبہ کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔

۳- یا یہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اس لیے کہ پتھروں سے متعدد طریقوں سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے مثلاً ان سے پانی جاری ہوتا ہے لیکن ان کے دلوں سے ہرگز کوئی نفع نہیں، یہ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیلئے نرم نہیں ہوتے۔

چوتھا مسئلہ: کفر تخلیق الٰہی نہیں

قاضی کہتے ہیں اگر ان کے اندر دائمی کفر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو وہ ان کی اس طرح مذمت کیسے فرما رہا ہے اگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تو وہ کہیں گے جس نے پتھر میں صلابت اور سختی پیدا کی اسی نے ہمارے دلوں میں سختی پیدا کی ہے۔ جو پتھر میں نہر جاری کرنے پر قادر ہے وہ ہی اس پر قادر ہے کہ ہمارے دلوں کے کفر کو دور کر کے ان میں ایمان پیدا فرما دے۔ جب اس نے ایسا نہیں کیا تو ہمارا عذر واضح ہے لہٰذا یہ ان کی طرف سے خدا کے خلاف، خدا کی حجت سے بڑھ کر حجت بن جائے گی لیکن اس طرح کی گفتگو پہلے کئی دفعہ گزری اور اس کا جواب بھی۔

پانچواں مسئلہ: اَشَدُّ قَسْوَةً فرمایا۔ اَقْسٰی، نہ فرمایا اس لیے کہ ان الفاظ کی دلالت زیادہ سختی پر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ معنی اَقْسٰی نہیں بلکہ "قسوۃً" کی شدت کے ساتھ متصف کرنا مقصود ہے گویا کہا جا رہا ہے پتھر کی سختی شدید ہے لیکن دل اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، قساوۃ بھی قرأت ہے۔ ضمیر منفصل، عدمِ التباس کی وجہ سے ترک کر دی مثلاً۔ زید کریم و عمرو أکرم۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دلوں پر پتھر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا ان سے تین منافع حاصل ہوتے ہیں لیکن ان دلوں سے ہرگز کوئی نفع نہیں۔

پتھر اور تین منافع

پہلا نفع: اول نفع یہ ہے: "وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ" (بعض پتھروں سے ندیاں بہتیں ہیں)

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ان، کو مخفف بھی پڑھا گیا ہے ایسی صورت میں فرق کیلئے لام لانا لازم ہے جیسے ارشادِ باری ہے:

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ — اور جتنے بھی ہیں سب کے سب ہمارے حضور حاضر لائے جائیں گے (پ۲۳ یٰسین: ۳۲)

دوسرا مسئلہ: التفجر، وسیع و کثیر کھلنا، محاورہ ہے انفجرت قرحۃ فلاں۔ (فلاں کا زخم کھل گیا) اسی سے فجر اور فجور ہے۔

حضرت مالک بن دینار کی قرأت یتفجر ہے۔ مفہوم یہ ہے بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں اور ان سے اس قدر پانی بہتا ہے کہ نہریں بن جاتی ہیں۔

فلاسفہ کہتے ہیں انہار ان بخارات سے بنتی ہیں جو زمین کے اندر جمع ہوتے ہیں اگر ظاہر ارض نرم ہو تو وہ ان بخارات کی وجہ سے پھٹ جاتی ہے اور وہ بکھر جاتے ہیں اور اگر وہ سخت پتھریلی ہو تو وہ بخارات جمع رہتے ہیں اور وہ دائما بڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کثرت اور طویل مدت کی وجہ سے زمین پھٹ جاتی ہے اور اس پانی سے نالے اور نہریں بن کر جاری ہو جاتی ہیں۔

دوسرا نفع: دوسرے نفع کے بارے میں فرمایا: وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ (بعض ایسے پتھر ہیں وہ پھٹتے ہیں تو پانی نکل آتا ہے) نہر جاری نہیں ہوتی مگر چشمہ بن جاتا ہے یعنی پتھر اپنے اندر تری رکھتے ہیں کبھی زیادہ اور کبھی کم، اس سے ان میں رطوبت وتری کے تفاوت کی بھی نشاندہی ہو رہی ہے کہ کبھی وہ اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور کبھی کم ہوتی ہیں لیکن ان کے دل اس قدر شدید ہیں وہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کیلئے نرمی نہیں رکھتے نہ وہ اس کیلئے سینہ کھلا رکھتے ہیں اور نہ ہی ہدایت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ "يَشَّقَّقُ" اصل میں "يتشقق" تھا تا کو مدغم کر دیا ہے جیسے يَذَّكَّرُ اصل میں يتذكر تھا۔ اسی طرح "يَا اَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ" اور "يَا اَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ" کا معاملہ ہے۔

تیسرا نفع: تیسرا نفع یہ ہے وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ۔ (کچھ پتھر اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں)

پتھر میں خشیت کہاں؟

یہاں اشکال ہے۔ خشیت الٰہی سے گرنا عقلاء اور زندوں کی صفت ہے پتھر جماد ہے اس میں یہ کہاں؟

اس اشکال کی وجہ سے اس آیت کی متعدد تفاسیر ہیں:

پہلا قول: شیخ ابو مسلم خصوصا کہتے ہیں کہ ارشاد ربانی "وَاِنَّ مِنۡهَا" میں ضمیر قلوب کی طرف ہے اور ان پر خشیت طاری ہو سکتی ہے البتہ پتھر پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور پہلے پتھر اور دلوں دونوں کا ذکر ہے زیادہ سے زیادہ کوئی یہی کہہ سکتا ہے کہ پتھر، ذکر میں اقرب ہے لیکن جب خشیت دلوں کی صفت بنتی ہے اور پتھروں کی بن ہی نہیں سکتی تو ضمیر کو قلوب کی طرف لوٹانا ہی لازم ہوگا نہ کہ پتھر کی طرف

اس قول پر دو طرح اعتراض ہیں:

۱۔ ارشاد ربانی "فَهِيَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً" جملہ کامل ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پتھر کے احوال شروع کیے۔ فرمایا:

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ"تو"اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" میں ضمیر کا حجارۃ (پتھر) کی طرف لوٹنا ہی لازم ہوگا۔

۲۔ ہبوط (گرنا) پتھروں میں ہوتا ہے نہ کہ دلوں میں۔تو ہبوط میں تاویل کرنا تاویل خشیت سے اولیٰ نہیں۔

دوسرا قول: مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: ضمیر حجارہ کی طرف ہی ہے اور ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ پتھر زندہ و عاقل نہیں ہوتے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس سے مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام والا پہاڑ ہے۔رب تعالیٰ کی تجلی پر جب وہ پھٹا اور ریزہ ریزہ ہوگیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں حیات، عقل اور شعور رکھا تھا اور یہ قدرتِ الٰہی سے بعید بھی نہیں۔اس کی نظیر یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (پ۲۴-فصلت:۲۱)

اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی وہ کہیں گی ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی

تو جس طرح انسان کا چہرہ و جسم بول وسن اور دیکھ سکتا ہے اسی طرح پہاڑ میں بھی صفت خشیت ہوسکتی ہے یہ بھی ارشادِ باری ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (پ۲۸، الحشر:۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اُتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے اور یہ مثالیں لوگوں کیلئے ہم بیان فرماتے ہیں تا کہ وہ سوچیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ اگر اسے عقل وفہم عطا فرماتا تو وہ ایسا ہو جاتا۔

کھجور کا تنا رُویا

مروی ہے جب رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو کھجور کا تنا آپ کے فراق میں زار و قطار رو پڑا۔

یہ بھی مروی ہے جب آپ ﷺ پر وحی قرآنی کا نزول اور اعلانِ نبوت کا حکم ہوا اور آپ واپس گھر پلٹے تو پتھر اور درخت تمام کے تمام عرض کرنے لگے: السلام عليك يا رسول الله۔

اہلِ علم کہتے ہیں ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں میں عقل وفہم پیدا فرمایا ہو اور انہیں خشیت حاصل ہو۔

معتزلہ اس تاویل کا انکار کرتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں حیات اور عقل کیلئے جسم اور اعتدالِ مزاج ضروری ہے اور اس شرط جسم پر ان کے ہاں کوئی دلیل نہیں محض یہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر معاملہ بعید ہے لہٰذا ان کی طرف نہ متوجہ ہونا ہی لازم ہے۔

تیسرا قول: اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ضمیر حجارہ (پتھر) کی طرف ہے اور اس میں عقل وفہم نہیں۔اس قول پر یہ تاویلیں ہیں

۱۔ بعض پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتے ہیں لیکن یہ کفار عناد و تکبر پر مصر ہیں اور اوپر سے گرنے کو انقیاد و طاعت قرار دیا۔

''من خشیة اللّٰہ'' سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ ہبوط کسی عاقل مختار سے ہوتا تو یہ خشیت الٰہی کی وجہ سے ہوتا جیسے فرمایا:

فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (پ۱۶، الکہف: ۷۷)

پھر دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار پائی کہ گرا چاہتی ہے اس بندہ نے اسے سیدھا کر دیا

یعنی دیوار میں اس قدر جھکاؤ تھا کہ اگر اس طرح کا معاملہ کسی میں ہوتا تو وہ گرنے کا ارادہ کرتا اسی کی مثل یہ شعر ہے:

بخیل تضل البلق من حجراته — تری الأکم فیه سجدًا للحوافر

اور جریر نے کہا:

لما أتی خبر الزبیر تضعضعت — سور المدینة والجبال الخشع

یہی تاویل اہلِ نظر نے اس ارشادِ ربانی کی کی ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا (پ۱۵، الاسراء: ۴۴)

اس کی پاکیزگی بولتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اسے سراہتی ہوتی اس کی پاکیزگی نہ بولے ہاں تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک وہ علم والا بخشنے والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (پ۱۴، النحل: ۴۹)

اور اللہ ہی کیلئے سجدہ کرتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں

تیسرے مقام پر فرمایا:

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (پ۲۷۔ الرحمٰن: ۶)

اور سبزے اور پیڑ سجدہ کرتے ہیں

۲۔ ارشادِ ربانی ''مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ'' ہے یعنی کچھ پتھر زلزلوں کے وقت گرتے پھٹتے اور آپس میں ٹکراتے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں خشیت الٰہی پیدا ہو اور وہ دعا و توبہ کے ساتھ اس کی طرف رجوع کریں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ زلزلوں کی وجہ سے پتھروں کے گرنے سے مقصود اصلی یہ ہے کہ بندوں کے دلوں میں خشیت پیدا ہو تو یہ خشیت اس ہبوط کیلئے علت موثرہ ہے تو کلمہ من ابتدا غایت کیلئے ہے تو ''خشیة اللّٰہ'' کا معنی ہوا کہ اس سبب سے دلوں میں خشیت الٰہی پیدا ہوگی۔

۳۔ شیخ جبائی کہتے ہیں حجارہ سے مراد وہ اولے ہیں جو اس لیے بادلوں سے گرتے ہیں کہ بندوں کو اللہ کا خوف پیدا ہو اور ان پر زجر ہو "مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" کا معنی ہوگا بندوں کو خوف دلانے کیلئے وہ اولے گرتے ہیں یا وہ ایسی چیز ہے جو خشیت الٰہی کو لازم ہے جیسے کہا جاتا ہے: نزل القرآن بتحریم کذا و تحلیل کذا یعنی قرآن لوگوں پر حلال وحرام لازم کرنے کیلئے نازل ہوا ہے

قاضی کہتے ہیں اس تاویل میں بلاضرورت ترک ظاہر ہے اس لیے کہ اولے پتھر نہیں ہوتے اگرچہ وہ بوقت نزول کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں وہ تو پانی ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے ان کا یہ نام بھی مناسب نہیں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی تفسیر

یعنی اللہ تعالیٰ ان سخت دل والوں کو جانتا ہے، ان کے اعمال کو جمع وشمار کر رہا ہے وہ انہیں دنیا وآخرت میں ان پر سزا دے گا جیسے ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (پ۱۶، مریم:۶۴) اور حضور کا رب بھولنے والا نہیں

اس میں ان کیلئے وعید اور خوف کبیر ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کا غفلت سے پاک ہونا

سوال: کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے وہ غافل نہیں ہوتا؟

جواب: قاضی کہتے ہیں ایسا کہنا درست نہیں اس لیے کہ اس سے اس پر غفلت کا وہم ہوسکتا ہے حالانکہ معاملہ یوں نہیں کیونکہ کسی شی سے صفت کی نفی اسے مستلزم نہیں کہ اس کا اس کیلئے ثبوت ہوتا ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (پ۳، البقرۃ:۲۵۵) اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند

دوسرے مقام پر ہے:

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (پ۷، الانعام:۱۴) اور وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے

واللہ اعلم

[۷۵] اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

(تو اے مسلمانو! کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہ (یہودی) تم پر یقین کریں گے اور اُن میں تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے)

سابقہ آیات سے ربط

پہلے اللہ تعالیٰ نے گزشتہ یہود کے بداعمال ذکر کیے اب یہاں حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں موجود یہود کے قبائح کا بیان ہے شیخ قفال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ مبارکہ میں بنی اسرائیل کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان سے کئی مقاصد ہیں

پہلا مقصد: صحت نبوتِ محمدی کا ثبوت

حضور ﷺ کی نبوت کی صحت پر دلالت اس لیے کہ آپ ﷺ نے تمام کی خبر بے پڑھے عطا فرمائی اور یہ وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس نفع میں اہلِ کتاب اور عرب دونوں مشترک ہیں۔ اہلِ کتاب اس لیے کہ وہ ان واقعات کا علم رکھتے تھے انہوں نے جب بغیر کسی تفاوت کے من وعن آپ سے سنے تو انہیں یقین ہو گیا یہ وحی کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔

عرب کے لیے اس طرح نفع ہوا کہ انہوں نے اہلِ کتاب کو دیکھا وہ ان واقعات کی تصدیق کرتے جو حضور ﷺ نے بیان فرمائے

دوسرا مقصد: بنی اسرائیل پر نعمتوں کا ذکر

یہ بنی اسرائیل اور ان کے اسلاف پر ہونے والی نعمتوں اور احسانات کا ذکر وشمار ہے مثلاً یہ یہود غلام تھے اللہ تعالیٰ نے فرعون سے انہیں نجات عطا فرمائی اور ان کی مدد کی، ان میں سے انبیاء اور ملوک بنائے۔ زمین میں انہیں تمکن عطا کیا، ان کیلئے سمندر پھاڑا، ان کے دشمن کو ہلاک کر ڈیا، تورات کی صورت میں ان پر نور و بیان کا نزول ہوا، ان کے گناہوں مثلاً بچھڑے کی پوجا، عہد کا توڑنا اور اللہ تعالیٰ کا اعلانیہ دیکھنے کا مطالبہ وغیرہ سے درگزر فرمایا، مقامِ تیہ میں پتھر سے میٹھا پانی جاری کیا، منّ وسلویٰ نازل کیا، بادلوں کے سایہ سے سورج کی گرمی سے محفوظ رکھا تو اللہ تعالیٰ نے یہاں پرانی اور نئی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

تیسرا مقصد: رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کیلئے تسلی

حضور ﷺ کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کے کیے کفر، مخالفت، شقاق اور عناد و تعصب کی اطلاع دی کہ اس میں

یہ اس قدر آگے بڑھے کہ وہاں تک کوئی سابقہ امت نہیں گئی اس لیے کہ معجزات کاملہ کے مشاہدہ کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام ان سے تھوڑے دور گئے تو انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کردی یہ تمام ان کے بلید اور غبی ہونے پر دلیل ہے پھر جب انہیں حکم ملا دروازہ سے سجدہ کرتے اور حطہ کہتے ہوئے گزرو اور وعدہ کیا کہ ان کے گناہ معاف اور ان کی نیکیوں پر ثواب میں اضافہ کردیا جائے گا تو انہوں نے قول بدل ڈالا اور نافرمانی کی۔ پھر منّ وسلویٰ کی جگہ تھوم اور پیاز کا مطالبہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور یہ عہد کرنے کہ آپ کتاب لائیں ہم اس پر ایمان لاکر اتباع کریں گے، کے بعد بھی تورات قبول کرنے سے انکار کردیا حتیٰ کہ ان پر پہاڑ اٹھایا گیا۔

پھر انہوں نے ہفتہ کے روز شکار کرکے تجاوز کیا۔ جب انہیں گائے کے ذبح کا حکم دیا تو کہنے لگے تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو، پھر جب مقتول زندہ دیکھا تو ان کے دل کی سختی میں اضافہ ہوگیا۔

تو گویا اللہ تعالیٰ فرمار ہا ہے جب یہ ان کے آپس کے اور اپنے نبی کے ساتھ معاملات ہیں جن کی وجہ سے انہیں غلامی و عذاب سے نجات ملی تو ان کے اخلاف کے حضور ﷺ کے ساتھ ایسے معاملات کوئی نئی چیز نہیں لہٰذا اے نبی اور اہلِ ایمان تم جو کچھ ان سے دیکھ رہے ہو کہ یہ حق سے اعراض وعناد کررہے ہیں اس سے پریشان نہ ہوں

چوتھا مقصد: تم پر عذاب آسکتا ہے

حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں موجود اہلِ کتاب کو ڈرانا ہے کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب آسکتا ہے جیسے تمہارے پچھلوں پر ان کے شمار کردہ کرتوتوں کی وجہ سے آیا۔

پانچواں مقصد: مشرکین عرب کو خوف دلانا ہے کہ جیسے یہود پر عذاب آیا تم پر بھی آسکتا ہے۔

چھٹا مقصد: یہ ان مشرکین کے خلاف استدلال ہے جو دوبارہ زندگی کے قائل نہیں حالانکہ وہ ابتداءِ تخلیق کو مانتے ہیں۔ ارشادِ گرامی "كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى" سے یہی مراد ہے۔

جب تم نے تمام جان لیا تو واضح رہے حضور ﷺ انہیں دعوت حق اور ان کے ایمان پر نہایت ہی حریص تھے، ان کے عناد اور تکبر سے آپ پریشان ہوجاتے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا عناد کبیر سامنے لایا جو انہوں نے معجزات دیکھنے کے بعد اختیار کیا تھا تاکہ حضور ﷺ کو موجود اہلِ کتاب کے عناد اور آپ کی دعوت کو کم قبول کرنے پر تسلی ہو۔ تو ارشاد فرمایا: "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ"

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ارشادِ باری تعالیٰ: "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: حضرت ابنِ عباس کہتے ہیں یہ حضور ﷺ سے خطاب ہے کیونکہ داعی آپ ہیں اور یہی قبولیت سے مقصود ہے۔ اگر چہ الفاظ عام مگر قرینہ کی وجہ سے ہم خاص مراد لے رہے ہیں۔ روایت ہے جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہود کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دی اور انہوں نے تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

دوسرا قول: حضرت حسن کہتے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان سب سے خطاب ہے۔ قاضی کہتے ہیں ظاہراً یہ زیادہ مناسب ہے آپ ﷺ اگر چہ دعوت میں اصل ہیں لیکن صحابہ میں سے بھی ایسے تھے جنہوں نے یہود کو ایمان کی طرف بلایا اور اس پر دلائل دیئے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" بہت خوب ہے اس سے مراد رسول اللہ ﷺ اور اسی وصف والے صحابہ بھی ہیں جب یہ تاویل صحیح ہے تو ترک ظاہر کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسرا مسئلہ: "اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" (وہ تم پر ایمان لائیں) سے مراد یہود ہیں جو حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں تھے کیونکہ انہیں کے بارے طمع ایمان یا عدم ایمان ہو سکتا ہے اس لیے کہ طمع مستقبل کے حوالے سے ہوتا ہے نہ کہ واقع و ماضی کے حوالہ سے۔

تیسرا مسئلہ: ایمان نہ لانا کیوں؟

ان کا ایمان لانا کیوں بعید ہے؟ اس کی متعدد وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ ایمان لے آئیں گے حالانکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے حالانکہ ان کی ذات اس بات کا سبب بنی کہ انہیں ذلت سے نجات اور انہیں تمام سے افضل قرار دیا جائے۔ ان کے ہاتھوں پر مسلسل معجزات کا ظہور ہوا اور سرکشوں پر مختلف قسم کے عذاب بھی آئے۔

دوسری وجہ: کیا تم ان سے ایمان کی امید رکھتے ہو حالانکہ ان میں سے جس نے بھی حق جان لیا اس نے اعتراف کے بجائے اسے بدلنے اور اس میں تحریف کی کوشش کی۔

تیسری وجہ: کیا تم ان سے ایمان کی طمع اس بنیاد پر کرتے ہو کہ یہ بطریق نظر و استدلال ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان کے اسلاف میں ایسا فریق تھا جس نے کلام اللہ سنا اور جانا کہ حق ہے مگر پھر بھی عناد اختیار کر لیا۔

چوتھا مسئلہ: **سوال:** لوگ تو اللہ پر ایمان کے مکلّف ہیں تو یہ کہنا کہ "وہ تم پر ایمان لائیں" میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: یہاں بھی اللہ پر ایمان لانا مراد ہے بایں طور کہ وہ اس کا اقرار کرلیں جس کی طرف مسلمان انہیں دعوت دے رہے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (پ۲۰-العنکبوت: ۲۶)

تو لوط اس پر ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں بیشک وہی عزت و حکمت والا ہے

اس لیے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کا اقرار اور اس کی تصدیق کی۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمہاری وجہ سے اور اللہ کی طرف تمہاری خوب دعوت کی وجہ سے ایمان لائیں۔ تو یہ معنی اضافت کی وجہ سے ہے۔

وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ کی تفسیر

فریق میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں تھے اس لیے کہ ان کے بارے میں بیان ہوا کہ انہوں نے کلام سنا تھا اور وہ پہاڑ پر جانے والے بھی تھے۔

بعض نے کہا اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کے لوگ ہیں، یہ اقرب ہے کیونکہ ضمیر ماقبل کی طرف ہے اور وہی ہیں جن کا تذکرہ "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" میں ہے اور ہم نے بیان کیا کہ ایمان کے طمع کا تعلق انہی موجود سے ہے۔

سوال: کلامِ الٰہی سننے والے تو اہلِ میقات (طور) تھے۔

جواب: ہم یہ نہیں تسلیم کرتے اس لیے کہ جنہوں نے تورات سنی ان کے بارے میں یہ کہنا جائز ہے کہ انہوں نے کلامِ الٰہی ہی سنا جیسے ہم پر قرآن پڑھا جائے تو ہم کہتے ہیں ہم نے کلام اللہ سنا۔

ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: شیخ قفال کہتے ہیں: تحریف، تبدیلی اور تغیر ہے اور یہ اصل میں کسی شی سے انحراف کرنا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:

اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ (پ۹، الانفال: ۱۶)

مگر لڑائی کا ہنر کرنے یا اپنی جماعت میں جا ملنے کو

تو تحریف، شی کا اپنے حق سے اعراض کرنا ہے، جب قلم کا سر بالکل غلط طرف مائل ہوجائے تو کہا جاتا ہے، قلم محرف۔

دوسرا مسئلہ: تحریف لفظی یا معنوی؟

قاضی کہتے ہیں تحریف لفظی ہوگی یا معنوی، یہاں تغیر معنوی کے بجائے تحریف لفظی مراد لینا اولیٰ ہے اس لیے کہ جب کلام الٰہی کے الفاظ باقی ہوں لیکن اس کی تاویل میں تبدیلی کریں تو نفس کلام مسموع میں تبدیلی کرنے والے نہ ہوئے بلکہ معنی میں تبدیلی کرنے والے ٹھہریں گے۔

تحریف لفظی اور قول ابن عباس رضی اللہ عنہما

البتہ لفظی پر حمل اگر ممکن ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ انہوں نے کلامِ الٰہی میں اضافہ اور کمی کردی تو یہ حمل اولیٰ ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تبدیلی تاویل (معنی) پر حمل لازم ہے۔ اگرچہ کلام الٰہی محفوظ ہے اور یہ لفظی تحریف اس وقت ممتنع ہوگی جب کلام اللہ کا ظہور متواتر ہو مثلاً ثبوت قرآن اور متواتر ہونے سے پہلے نفس کلام میں تحریف ہوسکتی ہے لیکن اس میں غور کیا جائے گا اگر ان کی یہ تبدیلی اس کلام کے ساتھ قیام حجت میں مؤثر ہے تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے منع و محفوظ فرمائے اور اگر وہ مؤثر نہیں تو اس کا وقوع درست ہوگا تو جو تحریف کلام میں درست ہے اس کی تقسیم ہمارے بیان کے مطابق ہی لازم ہے۔

تیسرا مسئلہ: اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں تحریف والوں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے لوگ ہیں تو اقرب و مختار یہی ہے کیونکہ انہوں نے جس میں تحریف کی اس کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں۔

اس لیے کہ مروی ہے طور پر جن ستر منتخب افراد نے کلام الٰہی سنا جب اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرماتے ہوئے انہیں کچھ اوامر اور کچھ نواہی عطا فرمائے تو انہوں نے آ کر کہا: ہم نے اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنا اگر تم طاقت رکھو تو ان پر عمل کرلو اگر تم چاہو تو انہیں نہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔

اور اگر کہیں تحریف والوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کے لوگ ہیں تو اقرب یہی ہے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں تحریف کا ارتکاب کیا وہ یوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و صفات میں تحریف کردی یا یہ کہ انہوں نے احکامِ شرع میں تبدیلی کردی جیسا کہ آیت رجم کا معاملہ ہے۔ ظاہر قرآن یہ نہیں بتاتا کہ انہوں نے کس میں تحریف کی تھی۔

چوتھا مسئلہ: سوال: بعض نے تحریف کا ارتکاب کیا اس سے باقی لوگوں سے ایمان کی ناامیدی کیسے لازم آگئی؟ اس لیے کہ بعض کا عناد باقیوں کے اقرار کے منافی نہیں؟

جواب: شیخ قفال نے جواب دیا، ممکن ہے معنی یہ ہو کہ یہ لوگ ایمان کیسے لاسکتے ہیں جبکہ انہوں نے اس قوم سے دین سیکھا اور حاصل کیا جنہوں نے عناداً تحریف کی ہے تحریف کے بعد جو کچھ ان کے سامنے آیا یہ تو اس کو مانتے ہیں۔ یہ تقلید کنندہ اسی کو قبول کریں گے اور اہلِ حق کی بات کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں گے جیسے محاورہ ہے: کیف تفلح و أستاذك فلان۔ (جب تمہارا استاذ فلاں ہے تو تم فلاح کیسے پاسکو گے) یعنی جب تم انہیں سے استفادہ کرتے ہو نہ کہ دوسروں سے۔

پانچواں مسئلہ: "أَفَتَطْمَعُوْنَ" میں اختلاف ہے کچھ کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس فریق سے ایمان کی نامیدی ظاہر کی ہے وہ معین افراد ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں ایمان سے نامیدی ان لوگوں سے ہے جو تحریف، تبدیلی اور عناد پر قائم رہیں۔ جس طرح ہم اپنے خدام اور غلاموں کے بارے میں طمع نہیں رکھتے کہ ہمارے علاقوں کے مالک بن جائیں گے پھر صرف ہم ان کے نہ مالک ہونے کا یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ اسے بعید از عقل مانتے ہیں۔

سوال: ارشادِ ربانی "أَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" بطور استفہام انکاری ہے تو یہ اس جزم کا اعلان ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے جس کے عدمِ ایمان کی اللہ تعالیٰ اطلاع دیدے اس کا ایمان لانا محال ہوتا ہے لہٰذا اس خبر کے بارے میں ماقبل کی وجوہ پیش نظر رکھی جائیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ کی تفسیر

مراد یہ ہے کہ وہ اس کی صحت اور جو انہوں نے گھڑا اس کے فاسد ہونے سے آگاہ تھے تو واضح ہو گیا وہ جان بوجھ کر عناد کرنے والے تھے لہٰذا ضروری ہے کہ کلام سے ان کے اہلِ علم مراد لیے جائیں اور یہ سب کچھ انہوں نے مفادات کی خاطر کیا جیسا کہ باری تعالیٰ نے اس کے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا (پ۴، آل عمران:۱۸۷) اور اس کے بدلے قلیل دام حاصل کیے

دوسرے مقام پر فرمایا:

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے (پ۲، البقرۃ:۱۴۶، پ۷، الانعام:۲۰)

اور ضروری ہے کہ وہ تعداد میں بہت کم ہوں اس لیے کہ عظیم اکثریت پر اپنے اعتقادات کا مخفی رکھنا ممکن نہیں اگر ہم اسے جائز رکھیں تو پھر حق باطل سے ممتاز نہ ہوگا اگرچہ تعداد کثیر ہو۔

وَهُمْ يَعْلَمُونَ کی تفسیر

سوال: عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ میں تکرار ہے۔ (دونوں کا معنی ایک ہی ہے) تو فائدہ کیا ہے؟

جواب: شیخ قفال نے دوطرح سے اس کا جواب دیا ہے۔

۱۔ "عَقَلُوهُ" وہ اللہ تعالیٰ کی مراد سے آگاہ تھے مگر انہوں نے اس کی ایسی تاویل فاسد کی جس کے بارے میں "يَعْلَمُونَ" جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔

۲۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد سے آگاہ تھے اور یہ جانتے تھے کہ تاویل فاسد سے گناہ اور اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا تو گناہ کے علم کے باوجود انہوں نے عمداً تحریف کی تو ان کے دلوں کی سختی اشد اور ان کی ڈھٹائی اعظم قرار پائی۔ جب اس سے مقصود رسول اللہ ﷺ کو تسلی اور ان کے عناد پر صبر کی تلقین ہے جب ان کا عناد اعظم ہے تو تسلی بھی اقویٰ ہوگی۔

اس آیت میں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: قاضی کہتے ہیں: ارشادِ مبارک "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" کی تفسیر نشاندہی کررہی ہے کہ ان کا ایمان اپنی طرف سے تھا اگر اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہوتا تو اس فریق کا حال مختلف نہ ہوتا جس کا ذکر آیا اور نہ ہی یہ حضور ﷺ اور اہلِ ایمان کیلئے تسلی ہوتی اس لیے کہ اس قول کے مطابق ان کے ایمان کا وجود اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر اور اس کا زوال اس کے پیدا نہ کرنے پر موقوف ہوگا۔

دوسرے طریق پر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذنب کو بہت بڑا قرار دیا کہ انہوں نے حجت جانتے ہوئے اس میں تحریف کی، اگر یہ سارا کچھ تخلیقِ الٰہی سے ہے تو ان کے جاننے یا نہ جاننے کا حکم مختلف نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا تحریف کی نسبت ان کی طرف بطور مذمت کرنا بھی اس پر دلیل ہے (کہ یہ تخلیق الٰہی نہیں)۔

واضح رہے اس کا جواب ہم متعدد بار کئی مقامات پر دے چکے ہیں یہاں اعادہ مناسب نہیں

دوسرا مسئلہ: شیخ ابوبکر رازی کہتے ہیں عنادی، علم والا ہدایت سے بہت دور اور جاہل سے مایوسی میں زیادہ قریب ہے اس لیے کہ ارشادِ ربانی "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" ایسے اہلِ علم کے رشد و ہدایت کی طمع کے زوال پر دال ہے اس لیے کہ یہ حق جاننے کے بعد تکبر اختیار کرتے ہیں۔

[۷۶-۷۷] وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

(اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کیے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں کیا تمہیں عقل نہیں۔ کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں)

برائی کی دوسری نوع

یہاں جس برائی کی دوسری نوع کا ذکر آیا ہے یہ ان یہود کے افعالِ بد تھے جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات میں موجود تھے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اہلِ کتاب منافق جب اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تو کہتے ہم اس ذات پر ایمان لائے جس پر تم لائے ہو اور ہم اعلان کرتے ہیں تمہارے صاحب سچے ہیں۔ ان کا قول حق اور ہم نے ان کی نعت و اوصاف اپنی کتاب میں پڑھی ہے۔ پھر جب ایک دوسرے سے ملتے تو ان کے سربراہ ان سے کہتے تم ان مسلمانوں کو جا کر بتاتے ہو جو تمہاری کتاب میں، ان کے نبی کی نعت و اوصاف ہیں تاکہ وہ تمہارے خلاف اسے حجت بنائیں اس لیے کہ مخالف جب صحت تورات کا اعتراف کرے اور تورات کو نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر شہادت کا بھی اعتراف کرے تو اس سے بڑھ کر حجت کیا ہو سکتی ہے لہٰذا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے پاس ایسے اعتراف سے لازماً منع کرتے۔

امام قفال کہتے ہیں الفاظ "فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ" ان کے اس محاورہ سے ہیں: "قد فتح علی فلان فی علم کذا" یعنی اس نے مجھے علم دیا اور اس کا حصول آسان کر دیا۔

عِنْدَ رَبِّكُمْ کی تفسیر

ارشادِ ربانی "عِنْدَ رَبِّكُمْ" کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ وہ یہ کہتے ہوئے دلیل بنائیں گے کہ یہ تمہاری کتاب میں ہے اور یہ عِنْدَ اللّٰه ہی ہے اس لیے یہ کہنا کہ کتاب اللہ میں یوں یا

اس طرح ہی ہے کہ اللہ کے ہاں یوں ہے یعنی دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

۲۔ حضرت حسن کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمہارے رب کے بارے میں حجت بنائیں گے اس لیے کہ اس میں حجت بنانا جیسے اللہ تعالیٰ نے اتباعِ رسل کی صورت میں لازم فرمایا ہے اسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ رب کے بارے میں حجت ہے کیونکہ یہ اس کے دین کے بارے میں حجت ہوئی

۳۔ شیخ اصم کہتے ہیں مراد قیامت اور پرسش کے وقت حجت پکڑنا ہے تو یہ روزِ قیامت تمام مخلوق کے سامنے ان کی رسوائی اور زجر وتوبیخ میں بطور اضافہ ہوگا اس لیے کہ جس حق کا اعتراف کیا اور پھر اسے چھپایا وہ اسی کی طرح نہیں ہوتا جو انکار پر قائم رہا تو وہ جانتے تھے کہ اس کا ظہور آخرت میں ذلت ورسوائی میں اضافہ کردے گا۔

۴۔ قاضی ابوبکر کہتے ہیں کبھی کسی شی سے استدلال کرنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ مخالف پر غلبہ کے سبب اس حجت کے اظہار سے سرور حاصل ہو اور کبھی فقط دیانت ونصیحت مقصود ہوتا ہے تاکہ دشمنی کا عذر ختم اور اللہ تعالیٰ کی حجت اس پر ثابت ہوجائے یہ لوگ خلوت میں کہتے تم مسلمانوں سے وہ حجت بیان کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں تم پر قائم کی تو تم انہیں بطور دیانت ونصیحت استدلال پر قادر کر رہے ہو اس لیے کہ جو اس طریق پر حجت بیان کرے گا وہ اپنے صاحب سے کہہ رہا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے تم پر یہ لازم کر رہا ہوں اور اپنے اور اپنے رب کے درمیان میں اسے بطور حجت تجھ پر پیش کر رہا ہوں اگر تو اسے قبول کرے تو تیرے لیے بہتری اگر تو انکار کرے تو خائب وخاسر ہوگا۔

۵۔ شیخ قفال کہتے ہیں محاورہ ہے: فلاں عندی عالم۔ یعنی میرے اعتقاد وحکم میں وہ عالم ہے۔ ھذا عند الشافعی حلال و عند ابی حنیفۃ حرام۔ (یعنی ان دونوں کے حکم کے مطابق یہ حلال وحرام ہیں) "لِيُحَآجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ" کا مفہوم یہ ہے کہ تم اللہ کے حکم میں انہیں اپنے خلاف حجت فراہم کر رہے ہو۔

بعض علماء نے فرمایا اس آیت مبارکہ:

فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ — تو جب وہ گواہ نہ لائے تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں

(پ۱۸، النور:۱۳)

کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے حکم وقضا میں وہ جھوٹے ہیں اس لیے کہ قاذف جب گواہ نہ لاسکے تو وہ لازماً حکم کاذب میں ہوگا اگرچہ وہ ذاتی طور پر سچا ہی ہو۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کی تفسیر

اس کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ یہ اہلِ ایمان کے بارے میں ہے گویا اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے تمہیں اس کا شعور نہیں جو میں نے ان کے بارے میں واضح کیا ہے کہ ان کے ایمان کی طمع نہ کرو یہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

۲۔ یہ یہود کی بارے میں ہے گویا جب وہ خلوت میں ملتے تو کہتے تم مسلمانوں سے ایسی بات بیان کرتے ہو جس کا وبال تمہیں پر ہے اور وہ تمہارے خلاف اسے حجت بنائیں گے تمہیں عقل نہیں کہ تمہارا عمل ہرگز درست نہیں یہ قول اظہر و اولیٰ ہے اس لیے کہ یہ انہی کی بات کا حصہ ہے لہٰذا کسی دوسرے کی طرف لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ کی تفسیر

یہاں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: اکثر کا کہنا یہ ہے کہ یہود اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ مخفی و ظاہر کو جانتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی سے خوف دلایا ہے۔

دوسرا قول: وہ نہ جانتے تھے لہٰذا انہیں اس بات میں تفکر کی رغبت دلائی گئی کہ ان کا رب ہے جو ان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور وہ اپنے نفاق کی وجہ سے نزول عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

دونوں اقوال میں، یہ ان کے نفاق پر اور ایک دوسرے پر دلائل نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپانے پر زجر و توبیخ ہے۔

اقرب یہی ہے اس سے مخاطب یہود ہیں جو اس کی معرفت رکھتے تھے اس لیے کہ یہ طریق کلام "اَوَلَا یَعْلَمُ" وہاں ہی ہوتا ہے۔ یہاں مخاطب اس شی کو جانتا ہو اور پھر اس کے فعل پر تب ہی زجر بنتا ہے۔

بعض کہتے ہیں (مفہوم یہ ہے) کہ یہ یہود مخفی طور پر دلائل نبوت محمدی سے اپنے ساتھیوں کو منع کرنا کیسے جائز سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان لوگوں کی طرح نہیں جو نہ اللہ کو جانتے ہیں اور نہ اس کے مخفی و ظاہر کو جاننے کے بارے میں علم رکھتے ہیں تو ان کا حال اس اعتبار سے نہایت ہی عجیب ہے۔

قاضی کہتے ہیں آیتِ مبارکہ کی ان امور پر دلالت ہے:

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے تو ان اقوال و افعال پر انہیں زجر کرنا کیسے درست ہوگا؟

۲۔ طریقہ نظر و استدلال درست ہے، صحابہ اور اہلِ ایمان کا یہی طریق ہے، یہود کے ہاں بھی یہ رائج تھا اسی وجہ سے انہوں نے یہ بات کہی۔

۳۔ آیت بتا رہی ہے کہ کبھی حجت الزامی ہوتی ہے اس لیے کہ جب انہوں نے صحت تورات اور اس کے نبوت محمد ﷺ پر مشتمل ہونے کا اعتراف کرلیا تو اب ان پر اعتراف نبوت محمدی ﷺ لازم ہوگا اگر وہ ان دونوں مقدموں میں سے کسی ایک کا انکار کرتے تو دلیل تمام نہ ہوئی۔

۴۔ آدمی معصیت کو معصیت سمجھ کر کرے تو اس کا جرم اور عذاب زیادہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

[۷۸-۷۹] وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

(اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں۔ تو خرابی ہے ان کیلئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کیلئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کیلئے اس کمائی سے)

مختلف گروہوں کا ذکر

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ سے مراد یہود ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کا عناد اور ان کے ایمان سے عدم طمع بیان کیا تو اب ان کے مختلف گروہوں کا ذکر فرمایا۔

۱۔ جو خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے تھے وہ ہی کلام الٰہی میں تحریف و تبدیلی کرنے والے تھے۔

۲۔ منافقین۔

۳۔ جو منافقین سے مجادلہ کرتے۔

۴- جن کا اس آیت میں ذکر ہے وہ عام ان پڑھ جو قرأت و کتابت نہیں جانتے۔ وہ تقلید اختیار کرتے اور سن کر قبول کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ایمان قبول نہ کرنے کا ایک ہی سبب نہیں بلکہ ہر فرقہ کا سبب مختلف ہے جو آدمی اس فرمان میں مذکور یہود کے فرقوں پر غور کرے گا وہ بعینہ یہی چیز اس امت میں بھی پائے گا اس لیے کہ یہاں بھی ایسے ہیں جو حق کے دشمن ہیں۔ دوسروں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ کچھ اعتدال پر ہیں اور کچھ عوام محض تقلید کرنے والے ہیں۔

یہاں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: اُمی کا مفہوم

اُمی میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا جو نہ کتاب کا اقرار کرے اور نہ رسول کا۔

دوسروں کی رائے یہ ہے کہ جو آدمی لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو یہ دوسرا معنی نہایت ہی درست ہے اس لیے کہ آیت میں یہود کا تذکرہ ہے اور وہ کتاب و رسول ماننے والے ہیں اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے ہم اُمی امت ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب کرنا۔ اس سے بھی اس کی تائید ہو رہی ہے اور الفاظ مبارک "لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ" بھی اس کے مناسب ہیں۔ (البخاری، ۱۹۱۳)

دوسرا مسئلہ: اَمَانِي کی تحقیق

امانی، امنیۃ کی جمع ہے یہ بہت سارے معانی میں مشترک ہے۔

۱- انسان جس کا خیال کرے اور اپنے دل میں اس کے وقوع و وجود کو محقق جانے مثلاً کہا جاتا ہے: فلان یعد فلان و یمینہ۔ (فلاں نے فلاں کو وعدہ کرتے ہوئے آرزو (دلائی) اسی سے ارشاد ربانی ہے:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (پ۵، النساء: ۱۲۰)

شیطان انہیں وعدے دیتا ہے اور آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انہیں وعدے نہیں دیتا مگر فریب کے۔

اگر یہاں امانی کا یہ معنی لیں تو "الامانی" کا مفہوم ہوگا مگر وہ جو آرزوئیں اپنے دلوں میں رکھے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں پر گرفت نہیں فرمائے گا اور ان کے آباء انبیاء ہیں جو ان کی شفاعت کر دیں گے اور ان کے علماء نے جو انہیں آرزوئیں دلائی ہیں کہ آگ انہیں محض چند دن ہی مس کرے گی۔

۲- "الامانی" مگر وہ مختلف جھوٹ جو انہوں نے اپنے پادریوں سے سنے اور انہیں بطور تقلید قبول کیا۔ کسی نے بات بیان کی تو اعرابی نے کہا جو تو بیان کر رہا ہے۔ أمر تمنیته أمر اختلقته۔ (کیا تیری یہ آرزو ہے یا جھوٹا خیال ہے)

الا امانی۔ کا معنی ہے مگر جوانہوں نے پڑھا ہے۔ تمنیٰ کتاب اللّٰہ اول لیلۃ (اس نے اول حصہ رات میں کتاب پڑھی) سے ماخوذ ہے، صاحب کشاف کہتے ہیں کہ منیٰ، اذا قدر سے ہے کیونکہ تمنا کرنے والا اپنے دل میں اندازہ لگاتا ہے اور اپنی تمنا کو جائز مانتا ہے، اسی طرح گھڑنے والا اور پڑھنے والا اندازہ رکھتا ہے کہ اس کلمہ کے بعد یہ کلمہ آئے گا۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں اس سے تمنا قلب لینا اولیٰ ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (پ۱، البقرۃ:۱۱۱)

اور اہلِ کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی خیال بندیاں ہیں

یعنی یہ ان کی فقط خالی آرزوئیں ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (پ۵، النساء:۱۲۳)

کام نہ کچھ تمہارے خیالوں پر ہے اور نہ کتاب والوں کی ہوس پر جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا

تیسرے مقام پر ہے:

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (پ۱، البقرۃ:۱۱۱)

یہ ان کی خیال بندیاں ہیں تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔

چوتھے مقام پر ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (پ۲۵، الجاثیۃ:۲۴)

اور بولے وہ تو نہیں مگر یہی ہماری دنیا کی زندگی مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ اور انہیں اس کا علم نہیں وہ تو نرے گمان دوڑاتے ہیں

یعنی وہ اندازہ اور قیافہ لگاتے ہیں۔

اکثر کی رائے یہ ہے کہ اسے زبانی پڑھنے پر محمول کرنا اولیٰ ہے جیسے فرمانِ ربانی ہے:

اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (پ۱۷، الحج:۵۲)

جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا

دوسرا یہ ہے کہ قرأت پر محمول کرنا استثناء کے مناسب ہے اس لیے کہ اس صورت میں اس کے ساتھ تعلق ہو گا گویا فرمایا وہ

کتاب نہیں جانتے مگر اس قدر جوان پر پڑھی جاتی ہے اور وہ سن لیتے ہیں اور جس قدر ان پر بیان کیا جاتا ہے وہ اسے قبول کرتے ہیں پھر وہ نہ تدبر پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ تامل پر۔

اور اگر اسے باتوں، جھوٹ یا ظن و اندازہ اور خیالات پر محمول کیا جائے تو استثناء نادر ہو جائے گا۔

تیسرا مسئلہ: الفاظ "اِلَّا اَمَانِیَّ" میں استثناء منقطع ہے۔ نابغہ نے کہا:

حلفت یمیناً غیر ذی مثنویة

ولا علم الا حسن ظن بغالب

اسے مخفف بھی پڑھا گیا ہے۔

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ کی تفسیر

جو کچھ ہم نے پیچھے کہا یہ اس کا ثبوت ہے کہ اَمَانِیَّ سے مراد اگر ایسے مختلف امور کا فکر و اندازہ لیں جن کی کوئی حقیقت نہیں تو یہ ظن ہے اور اب تکرار ہو گا۔

سوال: حدیث نفس اور ہے اور ظن اور۔ لہٰذا تکرار نہ ہوا لیکن جب اسے تلاوت پر محمول کرتے ہیں تو معنی خوب ہو گا گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو کتاب نہیں جانتے مگر جو ان پر تلاوت کی جائے وہ سنتے ہیں اور وہ جو معنی بھی بتا دیا جائے اسے گمان کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے واضح کیا یہ طریقہ حق تک پہنچانے والا نہیں۔

آیت میں چند مسائل ہیں:

۱۔ معارف کسبی ہوتے ہیں نہ کہ بدیہی اس لیے نہ جاننے والے اور ظن والے کی مذمت کی۔

۲۔ ہر تقلید باطل ہے لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ ہمارے ہاں فروع میں تقلید جائز ہے۔

۳۔ گمراہ کرنے والا اگرچہ مذموم ہے مگر دھوکہ کھانے والا بھی قابلِ مذمت ہے اس لیے کہ وہ اسی حال پر تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی۔

۴۔ اصول دین میں ظن پر اکتفا ہرگز جائز نہیں۔ واللہ اعلم

وَيْلٌ کی تفسیر

"ویل" یہ کلمہ ہر مصیبت زدہ کہتا ہے۔ حضرت ابنِ عباس کے نزدیک یہ دردناک عذاب ہے۔

حضرت سفیان ثوری کے نزدیک اہل دوزخ کی بہنے والی پیپ ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ہے دوزخ میں ایک وادی کا نام ہے جس میں کسی کافر کو ڈالا جائے گا اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں چالیس سال لگیں گے۔ (سنن ترمذی:۳۱۶۴)

قاضی کہتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں۔

انتہا کی وعید وتہدید پر مشتمل ہے خواہ ویل جہنم کی وادی ہو یا عذاب عظیم۔

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ کی تفسیر

اس کی دو تفاسیر ہیں:

۱۔ بعض اوقات آدمی کسی کو لکھنے کا کہے تو کہہ دیا جاتا ہے۔ میں نے لکھا: یہاں "بِأَيْدِيهِمْ" کا فائدہ یہ ہے کہ انہوں نے خود ہی لکھا

۲۔ یہ تاکید ہے اور ایسے مقام پر یہ حسین ہے جیسے کوئی آدمی کتابت سے انکار کر رہا ہو تو تم کہو اسے فلاں کتبته بيمينك (یہ تو نے ہی تو لکھا ہے)

ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کی تفسیر

مراد یہ ہے کہ جو لوگ لکھتے ہیں اور اسے ذریعہ کاروبار بناتے ہیں وہ نہایت کمینے ہیں اس لیے کہ یہ دین سے گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کر رہے ہیں اور انہوں نے آخرت، دنیا کے عوض بیچ دی۔ لہٰذا ان کا گناہ دوسروں کی نسبت بڑا ہے اس لیے کہ یہ مسلمہ حقیقت ہے جو آدمی کسی دوسرے کو نقصان دینے کیلئے جھوٹ بولتا ہے اس پر گناہ عظیم ہے تو ان کا حال کیا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کذب بیانی کرے اور اس کذب کے ساتھ گمراہ کرنا بھی شامل ہو پھر ان دونوں کے ساتھ محبت دنیا اور اس کے حصول پر حیلہ ومکر بھی ہو پھر اس کے ذریعے ایسا راستہ بنایا جا رہا ہو جو رہتی دنیا تک لوگوں کو گمراہ کرتا رہے گا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گناہ کو بہت بڑا قرار دیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے دو عمل بیان فرمائے:

۱۔ کتاب کا خود لکھنا۔

۲۔ پھر اس کی نسبت بطور کذب اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا۔

یہ وعید، ان کے لکھنے پر ہے یا اس تحریر کی اللہ کی طرف نسبت کرنے پر ہے یا دونوں پر ہے؟

جواب: گمراہی کی خاطر باطل اشیاء کا لکھنا منکر وحرام ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی نسبت کرنا بھی، لیکن دونوں کا جمع کر دینا تو بہت زیادہ اور بڑا منکر وگناہ ہے

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا کی تفسیر

یہ ان امور پر توجہ دلاتا ہے۔

۱۔ ان کی انتہائی شقاوت پر تنبیہ ہے اس لیے کہ عقلمند پر لازم ہے کہ وہ دنیا کے اجر عظیم کی خاطر بھی آخرت میں قلیل سا بوجھ بھی قبول نہ کرے تو اس کے یہ شایانِ شان کہاں کہ دنیا کے حقیر نفع کی خاطر آخرت میں عذاب عظیم پر راضی ہو جائے۔

۲۔ یہ نشاندہی ہے کہ انہوں نے یہ تحریف نیک نیتی سے نہیں کی بلکہ مال وجاہ کیلئے کی اس سے معلوم ہوا باطل پر مال لینا خواہ رضا سے ہو حرام ہے اس لیے کہ مال دینے والے بطور محبت ورضا ہی دیں گے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کے حرام ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ کی تفسیر

مراد یہ ہے کہ ان کا لکھنا ہی گناہ عظیم ہے۔اسی طرح اس پر مال لینا، اسی لیے "کتبت" کے ساتھ لفظ ویل کا دوبارہ ذکر فرمایا۔اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کہنا ممکن ہو جاتا کہ ان دونوں کا مجموعہ تو وعید عظیم کا تقاضا کرتا ہے لیکن ہر ایک کا تقاضا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ فرما دیا۔

ارشادِ ربانی "مِمَّا يَكْسِبُونَ" کی تفسیر میں اختلاف ہے کہ یہاں ان کا فقط کتابت اور تحریف پر مال لینا ہی مراد ہے یا ان کے تمام معاصی مراد ہیں۔نظمِ کلام بتا رہا ہے کہ مذکورہ صورت پر مال ہی مراد لینا اقرب ہے اگر چہ باعتبار عموم تمام کو شامل ماننا اقرب ہے لیکن اول مراد کو اسی لیے ترجیح ملتی ہے۔جب ان کے کسب کو اس قید سے مقید نہیں کیا تو اس پر وعید درست نہ رہے گی اس لیے کہ کسب میں حلال وحرام دونوں شامل ہیں لہٰذا اسے بیان کردہ قید (کتابت وتحریف پر حصول مال) کے ساتھ مقید کرنا ہی اولیٰ ہے

قاضی کہتے ہیں آیت بتا رہی ہے ان کی کتابت اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں اس لیے کہ اگر وہ تخلیقِ الٰہی ہوتی تو ان کا یہ کہنا "هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" درست اور حقیقت ہوتا اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان میں کتابت پیدا فرمائی اور ہم تسلیم کرلیں بندہ کاسب ہے لیکن فعل کا اکتساب کاسب کی بجائے خالق کی طرف کرنا اولیٰ ٹھہرا اب لازم ہے کہ وہ اپنے قول "هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰه" پر مستحق حمد ہوتے جب ایسا نہیں ہے تو واضح ہو گیا یہ کتابت مخلوق الٰہی نہیں۔

[۸۰] وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ
اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

(اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے۔ جب تو اللہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں)

برائیوں کی تیسری قسم

یہ ان کے بد افعال واقوال کی تیسری نوع کا بیان ہے ان کا یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صرف چند دن ہی عذاب دے گا حالانکہ اس یقین کا حصول عقلاً ہو بھی نہیں سکتا۔

اہلسنّت کے ہاں تو یوں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے اور جو ارادہ کرے فیصلہ فرمائے کوئی اس کے فعل پر اعتراض نہیں کر سکتا تو اس کے حصول کا ذریعہ فقط دلیل سمعی (شریعت) ہی ہوگی۔

معتزلہ کے ہاں یوں کہ عقل نشاندہی کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاصی پر فاسق کو عذاب دائمی ہوتا ہے جب عقل یہ بتا رہی ہے تو کچھ مدت کیلئے عذاب پر استدلال درست ہے مگر بعد میں اس کے زوال پر دلیل سمعی ضروری ہے۔

تو دونوں مذاہب پر ثابت ہو گیا کہ عذاب نہ ہونے کا یقین دلیل سمعی کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے اور ایسی دلیل سمعی ہرگز کوئی نہیں تو اب یہ یقین ہرگز ہرگز جائز نہ رہا۔

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کی تفسیر

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کی تفسیر میں دو احتمال ہیں:

پہلی وجہ: لفظ ایام یا تو عشرۃ (دس) کی طرف یا اس سے کم کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ اس سے اُوپر کی طرف مضاف نہیں ہو سکتا مثلاً ایام خمسة (پانچ دن) ایام عشرة (دس دن) تو کہا جا سکتا ہے مگر ایام احد عشر (گیارہ دن) نہیں کہا جا سکتا البتہ اس ارشادِ گرامی کی وجہ سے اشکال پیدا ہوگا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (پ۲-البقرۃ:۱۸۳، ۱۸۴) تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمہیں پرہیزگاری ملے گنتی کے دن ہیں

یہاں پورا ماہ مراد ہے اور یہ دس سے زائد ہے۔

پھر قاضی کہتے ہیں جب ثابت ہو گیا کہ ایام کا اطلاق دس یا اس سے کم پر ہی ہوتا ہے تو یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ اس کا اقل اور یہ اس کا اکثر درجہ ہے اس لیے کہ جو تین مراد لے گا وہ کہے گا میں اقل حقیقت پر محمول کر رہا ہوں جو دس مراد لے گا وہ کہے گا میں اکثر لے رہا ہوں تو دونوں کے پاس دلیل ہے لیکن جو واسطہ پر محمول کرے گا مثلاً دس سے کم مگر تین سے زائد لیتا ہے تو اس کے پاس کوئی دلیل نہیں اس لیے کہ کوئی عدد دوسرے سے اولیٰ نہیں البتہ جب کسی روایت صحیحہ میں اس کا تعین ہو جائے تو پھر اسی کو قبول کیا جائے گا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں سات دن مراد لیے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہود کہا کرتے، دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے تو اللہ تعالیٰ ہر سال کے عوض ایک دن عذاب دے گا تو اسی طرح ہمیں صرف سات دن عذاب ہوگا۔

شیخ اصم نے بعض یہود سے نقل کیا چونکہ انہوں نے سات دن بچھڑے کی پوجا کی اس لیے وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سات دن عذاب دے گا۔

یہ دونوں وجہ ضعیف ہیں۔

پہلی اس لیے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال اور عذاب سات دن ہونے میں کوئی مناسبت اور ملازمت نہیں۔

دوسری اس لیے کہ معصیت سات دن کرنے سے عذاب کا سات دن ہونا کہاں لازم ہے؟

ہمارے مذہب پر یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر شئی میں حسن ہے کیونکہ وہ مالک ہے۔

اور معتزلہ کہتے ہیں جب تک عاصی توبہ نہ کرے یا معافی نہ ہو وہ دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ نے زیادتی سے خود منع نہیں کیا۔ فرمایا:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (پ۲۵، الشوریٰ:۴۰) اور برائی کا بدلہ اسی کی برابر برائی ہے

تو ضروری ہے عذاب معصیت سے زائد نہ ہو۔

جواب: معصیت میں اضافہ بقدر نعمت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے انعامات بندوں پر بلا حد و شمار ہیں تو ان کی معصیت بھی بہت ہی بڑی ہوگی۔

دوسری وجہ: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے ان ایام سے مراد چالیس دن ہیں اور یہ بچھڑے کی پوجا کے دن ہیں لیکن اس پر بھی سات دن والا کلام ہوگا۔

تیسری وجہ: بعض نے کہا: معدودۃ کا معنی قلیل ہے جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ اور بھائیوں نے اسے کھوٹے داموں گنتی کے روپوں پر بیچ ڈالا (پ۱۲، یوسف:۲۰)

دوسرا مسئلہ: حنفی کہتے ہیں کم از کم مدت حیض تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: خاتون اپنے ایام حیض میں نماز ترک کردے۔ (البخاری:۲۲۸)

تو اس مدت کو ایام قرار دیا جس کا اقل تین اور اکثر دس ہے جیسے پیچھے ہم نے بیان کیا تو اب ضروری ہے کہ اس کی مدت مذکورہ ہی ہو لیکن اس پر سابقہ اشکال وارد ہوگا۔

تیسرا مسئلہ: یہاں ہے وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً، اور آلِ عمران میں ہے: اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔ تو سوال ہوسکتا ہے کہ موصوف دونوں جگہ واحد "ایام" ہے لیکن صفت الگ کیوں؟

جواب: اسم اگر مذکر ہو تو اس کی جمع کی صفت میں تا لازم ہے مثلاً "کوز کیزان مکسورۃ، ثیاب مقطوعۃ" اور اگر وہ مؤنث ہے تو صفت جمع الف تا کے ساتھ ہوگی؟ مثلاً "جرۃ، جرار مکسورات خابیۃ، خوابی مکسورات" البتہ بعض صورتوں میں مذکر کی جمع میں الف تا آجاتا ہے۔ مثلاً "حمام، حمامات جمل سبطر و سبطرات" اسی طریق پر ہے "فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ" اور "فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ"، تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں اصل کے مطابق اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً اور آل عمران میں فرع کے مطابق فرمایا ہے

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: یہاں عہد، خبر اور وعدہ کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کو عہد کہنا اس وجہ سے ہے کہ اس کی خبر ان وعدوں سے کہیں پختہ ہوتی ہے جو قسم و نذر کے ساتھ مؤکد ہوں تو اللہ کے عہد کی یہی شان ہوتی ہے۔

دوسرا مسئلہ: صاحب کشاف لکھتے ہیں: فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ کا تعلق محذوف سے ہے۔ عبارت یوں ہے ان اتخذتم عند اللہ عهداً فلن يخلف اللہ عهده۔ (اگر تم سے اللہ کا عہد ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرتا)

تیسرا مسئلہ: ارشادِ مبارک "اَتَّخَذْتُمْ" استفہام نہیں بلکہ انکار ہے اس لیے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے قول کے بطلان پر حجت رسول کو بطور استفہام ذکر کرے بلکہ یہاں طریق استدلال پر تنبیہ ہے کہ اس کی معرفت سوائے دلیل سمعی (شریعت) کے نہیں ہو سکتی اور وہ تو یہاں موجود نہیں لہٰذا ایسی بات پر جزم ہرگز جائز نہیں۔

چوتھا مسئلہ: ارشادِ ربانی "فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ" نشاندہی کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے وعدہ اور وعید میں کذب سے پاک ہے۔ اہلسنّت کہتے ہیں کہ جھوٹ نقص ہے اور نقص اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ قبیح کے قبح سے آگاہ ہے اور اس سے بھی آگاہ ہے کہ وہ اس سے مستغنی ہے اور کذب قبیح ہے جب اللہ تعالیٰ اس شان کا مالک ہے تو اس سے ایسا فعل محال ہے لہٰذا اس سے کذب محال ہے اسی لیے فرمایا: "فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ"

خلافِ وعید کرم ہے

سوال: عہد، وعدہ ہے جب کسی شی کا ذکر ہو تو وہ اپنے ماسوا کی نفی پر دال ہوتا ہے۔ جب وعدہ میں کہا اللہ اس کے خلاف نہیں فرماتا تو واضح ہو گیا وعید میں خلاف جائز ہے پھر عقل بھی یہی کہتا ہے اس لیے کہ وعدہ میں خلاف بُرا ہے جبکہ وعید میں کرم ہے۔

جواب: دلالت مذکورہ تمام اقسام کذب میں قائم ہے۔

پانچواں مسئلہ: شیخ جبائی کہتے ہیں آیت نشاندہی کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ نہیں فرمایا کہ اہلِ معاصی و کبائر کو عذاب کے بعد دوزخ سے نکالا جائے گا اس لیے کہ اگر یہ وعدہ ہوتا تو یہود کے اس قول کی تردید نہ ہوتی۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی دلیل نہیں البتہ یہ ثابت ہے کہ عاصیوں پر اس کی وعید ہے جب گناہوں پر زجر موجود ہے تو لازم ہے ان پر عذاب دائمی ہو جیسا کہ وعید پر قول ہے جب باقی امتوں کا معاملہ یہی ہے تو اس امت کا حکم بھی یہی ہوگا کیونکہ وعدہ اور وعید میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ امتوں میں مختلف نہیں اس لیے کہ تمام میں معصیت مختلف نہیں

لیکن یہ قول نہایت ہی ضعیف ہے اس لیے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اہلِ کبائر کو دوزخ سے نکالنے کا وعدہ نہیں فرمایا اور یہ کہنا کہ اگر اس نے وعدہ فرمایا ہوتا تو پھر قولِ یہود کی تردید نہ فرماتا۔ ہم کہتے ہیں ممکن ہے ان وجوہ کی بنا پر ان کی تردید کی ہو۔

۱۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید اس لیے فرمائی ہو کہ انہوں نے ایام عذاب کو قلیل کہا ان کا قول "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً" بہت کم دنوں پر دال ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جزمِ قلت کی تردید فرمائی نہ یہ کہ اس نے انقطاع عذاب کی تردید کی ہے

۲۔ فرقہ مرجئہ کہتا ہے کہ لوگوں کی معافی یقینی ہے لیکن ہر شخص معین کے بارے میں قطعی بات نہیں کہی جاسکتی تو جب انہوں نے اپنے بارے میں تخفیف میں جزم کا اظہار کیا تو اب اللہ تعالیٰ کا ان کا تردید فرمانا ضروری تھا۔

۳۔ وہ کافر تھے اور ہمارے نزدیک عذابِ کافر دائمی اور غیر منقطع ہے۔

اگر ہم تسلیم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دوزخ سے اہلِ کبائر کو نکالنے کا وعدہ نہیں کیا لیکن تم یہ کیوں نہیں کہہ سکتے کہ وہ انہیں دوزخ سے نہیں نکالے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کہنا اللہ تعالیٰ نے انہیں دوزخ سے نکالنے کا وعدہ نہیں کیا اور یہ کہنا کہ اس نے اطلاع دی ہے کہ وہ انہیں دوزخ سے نہیں نکالنے گا میں فرق ہے۔ اول میں مضرت نہیں اس لیے کہ بعض اوقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس نے فرمایا ہوتا مگر روزِ قیامت وہ کردے۔ یہود کی تردید کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بغیر دلیل یقین کرلیا حالانکہ ان پر توقف لازم تھا نہ تو وہ قطعی طور پر اس کی نفی کرتے اور نہ اثبات، اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی امت کے گناہ گاروں کو دوزخ سے نہیں نکالے گا تو اس سے یہ کیسے تم کہہ سکتے ہو کہ اس امت کے گناہ گاروں کو بھی نہیں نکالا جائے گا۔

شیخ جبائی کا قول کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ وعدو وعید میں مختلف نہیں محض سینہ زوری و ڈھٹائی ہے۔ اس لیے کہ عتاب، اللہ تعالیٰ کا حق ہے لہٰذا وہ فضل فرماتے ہوئے کسی سے ساقط فرمادے لیکن باقیوں سے ساقط نہ فرمائے لہٰذا اس دلیل کا ضعف واضح ہوگیا۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر

یہ تمام حجت مذکور کا بیان ہے کہ اس عقیدہ کے ثبوت کیلئے دلیل شرعی چاہیے اور وہ ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسا قول کرنا یقیناً جاہلانہ ہے۔ یہ آیت مبارکہ ان فوائد پر دال ہے:

۱۔ ان کے بغیر دلیل قول کی اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی جس سے واضح ہوگیا بغیر دلیل قول باطل ہوتا ہے۔

۲۔ جس شئی کا وجود وعدم عقلاً جائز ہو اس کے اثبات ونفی کیلئے دلیل سمعی (شریعت) کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ منکرین قیاس وخبر واحد نے اسی آیت سے یوں استدلال کیا یہ دونوں مفید یقین نہیں لہٰذا ان سے تمسک جائز نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ اور یہ مقام انکار ہی ہے۔

جواب: جب قیاس اور خبر واحد بوقت حصول ظن وجوب عمل پر دال ہوتے ہیں تو اس وقت وجوب عمل یقینی ہوگا گویا اسی صورت میں معلوم پر ہی عمل ہے نہ کہ غیر معلوم پر۔

[۸۱] بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

(ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اُسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے)

صاحبِ کشاف کہتے ہیں حرف نفی کے مابعد کے لیے "بَلٰى" اثبات ہوتا ہے اور وہ یہ ارشاد ہے جس میں نفی ہے "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ" یعنی ارشاد هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کی بنا پر تمہیں آگ ہمیشہ مس کرے گی۔ سیئۃ، تمام معاصی کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (پ ۲۵- الشوریٰ: ۴۰) اور برائی کا بدلہ اسی کی برابر برائی ہے

دوسرے مقام پر فرمایا:

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (پ ۵- النساء: ۱۲۳) جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا

چونکہ یہ خیال کرنا جائز تھا کہ خواہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا وہ اس معاملہ میں برابر ہے کہ اس کا مرتکب دائمی دوزخ میں جائے تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ واضح کردے کہ دائمی دوزخ کا مستحق وہ ہوگا۔ گناہ جس کا احاطہ کرلیں اور یہ واضح ہے کہ حقیقت میں احاطہ اجسام میں ہوتا ہے۔ مثلاً دیواروں نے شہر کا احاطہ کرلیا۔ کوزہ نے پانی کا احاطہ کیا اور یہاں ایسا نہیں ہوسکتا لہٰذا ہم "سیئۃ" کو ان دووجہ سے کبیرہ پر حمل کریں:

۱۔ محیط، محاط کو ڈھانپ لیتا ہے تو کبیرہ گناہ بھی طاعات کے ثواب کا احاطہ کرلیتا ہے یعنی انہیں ڈھانپ لیتا ہے تو اس اعتبار سے مشابہت یہاں موجود ہے۔

۲۔ کبیرہ جب ثواب طاعات کو ختم کردیتا ہے تو گویا اس نے ان پر غلبہ پاتے ہوئے احاطہ کرلیا جس طرح دشمن لشکر انسان کا احاطہ کرلیتا ہے کہ وہ اس سے خلاصی نہیں پاسکتا گویا اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے ہاں جس نے کبیرہ کا ارتکاب کیا اور اس نے اس کی طاعات کا احاطہ کرلیا وہ دوزخی ہے اور وہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

سوال: یہ آیت تو یہود کے بارے میں ہے؟

جواب: اعتبار خاص سبب کا نہیں بلکہ عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔

معتزلہ کا استدلال

اس سے معتزلہ نے اہلِ کبائر کیلئے وعید وسزا کا اثبات کیا ہے اور یہ بڑے مسائل میں سے ہے لہٰذا ہم یہاں ذکر کیے دیتے ہیں اہلِ کبائر کیلئے وعید پر اہلِ قبلہ کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ قطعی وعید مانتے ہیں ان کے دو فریق ہیں:

۱۔ جو دائمی وعید مانتے ہیں یہ جمہور معتزلہ اور خوارج کا قول ہے۔

۲۔ وعید منقطع مانتے ہیں۔ شیخ بشر مریسی اور خالد کا یہی قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قطعی طور پر ان کیلئے وعید نہیں یہ شاذ قول ہے اور یہ مفسر قرآن شیخ مقاتل بن سلیمان کی طرف منسوب ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بعض معاصی پر معافی عطا فرمائے گا لیکن ہر ایک کے بارے میں توقف کریں گے کہ اسے معافی ملے گی یا نہیں اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ایک مدت تک عذاب دے گا نہ کہ ہمیشہ بلکہ عذاب منقطع فرمائے گا۔ یہ اکثر صحابہ، تابعین، اہلِسنّت وجماعت اور اکثر امامیہ کا یہی موقف ہے۔

یہ بحث دو مسائل پر مشتمل ہے۔

۱۔ وعید قطعی۔

۲۔ اگر وعید ثابت ہے تو دائمی یا غیر دائمی۔

پہلا مسئلہ: وعید، پہلے ہم معتزلہ کے دلائل پھر مرجئہ خالصہ کے اور پھر اہلسنّت۔ رحمہم اللہ کے دلائل لائیں گے۔

معتزلہ اس بارے میں وارد عموم سے استدلال کرتے ہیں اور وہ دو طرح کے ہیں۔ بعض لفظ 'مَنْ' مقام شرط سے ہیں اور بعض بصورت جمع ہیں۔ اول قسم یہ آیات ہیں:

۱۔ آیت میراث میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(پ۴-النساء:۱۳،۱۴)

یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو حکم مانے اللہ کا اور اللہ کے رسول کا اللہ اسے باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی کل حدوں سے بڑھ جائے اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کیلئے خواری کا عذاب ہے

اور ہم پر واضح ہے جس نے نماز، زکوۃ، روزہ، حج، جہاد ترک کر دیا، شراب، زنا اور محترم نفس کو قتل کیا وہ اللہ تعالیٰ کی حدود توڑنے والا ہے اور اس کا اہلِ عذاب میں ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ کلمہ "مَـــنْ" مقام شرط میں عموم کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ اصول فقہ میں مسلم ہے تو اب ہمارا مخالف اگر اس سے مراد کافر لے نہ کہ مومن تو یہ خلافِ دلیل ہے۔

اور اس قول مخالف کو یہ دو دلائل بھی باطل قرار دیتے ہیں:

پہلی دلیل: یہاں اللہ تعالیٰ نے میراث کی حدود بیان فرمائیں پھر ان حدود کی حفاظت کرنے والے سے وعدہ اور نافرمانی کرنے والے پر وعید فرمائی۔ تو جو اللہ تعالیٰ پر ایمان و تصدیق رکھنے والا ہے وہ ان میں طاعت زیادہ کرے گا۔ بنسبت اس کی جو رب کا منکر، اس کے رسل اور شرائع کی تکذیب کرنے والا ہوگا۔ لہٰذا ترغیب طاعت اس کیلئے خصوصاً ہوگا جو طاعت کے زیادہ قریب ہے اور وہ مومن ہے۔ اول حصہ آیت میں مومن مراد ہے تو آخری میں بھی وہی مراد ہوگا۔

دوسری دلیل: ارشادِ گرامی ہے: "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ"۔ اس سے مراد مذکورہ حدود ہی ہیں اس کے بعد ان کی طاعت پر وعدہ اور نافرمانی پر وعید ہے تو سیاقِ آیت بتا رہا ہے فقط ان حدود کی نافرمانی پر وعید ہے اگرچہ ان کے ساتھ دوسری حدود کے توڑنے کو ملایا جائے اور اس لیے کہ فقط ان حدود سے تجاوز پر اس وعید سے زجر ہے اگر مراد یہی وعید نہ ہوتی تو زجر نہ ہوتا تو جب ثابت ہو گیا یہ مومن، کافر کی طرح مراد ہے تو فقط کافر مراد لینا باطل ٹھہرا۔

کافر مراد نہیں

سوال: ارشادِ گرامی "وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ" جمع مضاف ہے جو عموم کا مفید ہے۔ جیسے کہا جائے ضَرَبْتُ عَبِيْدِىْ (میں نے اپنے غلاموں کو مارا) تو یہ تمام کو شامل ہے جب یہ ثابت ہے کہ یہ آیت اس کیلئے ہے جس نے تمام حدود کی خلاف ورزی کی تو وہ کافر ہے نہ کہ مومن

جواب: معاملہ اسی طرح ہے جیسا کہ تم نے ذکر کیا لیکن یہ الفاظ کی بنسبت ہے مگر یہاں قرائن موجود ہیں جو بتا رہے ہیں کہ جمیع حدود کی خلاف ورزی مراد نہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کو یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ سے پہلے ذکر فرمایا۔ لہٰذا یہاں سابقہ حدود ہی مراد ہیں۔

۲۔ تمام امت کا اتفاق ہے، اس آیت میں مومن کو معاصی پر زجر ہے اگر تمہاری بات مان لی جائے تو یہاں مومن پر زجر نہیں ہوگا

۳۔ اگر آیت میں تمام حدود کی خلاف ورزی مراد ہو تو پھر وعید کا فائدہ کچھ نہ ہوگا اس لیے کہ کوئی مکلف بھی تمام حدود الٰہیہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا کیونکہ ایسی حدود بھی ہیں جن میں تضاد ہے اور وہ جمع نہیں ہو سکتیں مثلاً یہ ممکن نہیں کہ ایک آدمی ایک حالت میں مذہب مجوسیہ اور نصرانیہ رکھتا ہو اور مکلفین میں ایسا کوئی شخص نہیں جو تمام معاصی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔

۴۔ مومن کے عمداً قاتل کے بارے میں فرمایا:

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (پ۵، النساء:۹۳)

اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اُس میں رہے

آیت بتا رہی ہے کہ یہ سزا اسی قتل کی ہے کیونکہ ارشادِ باری ہے:

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (پ۵، النساء:۱۲۳)

جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (پ۹، الانفال:۱۵، ۱۶)

اے ایمان والو! جب کافروں کے لشکر سے تمہارا مقابلہ ہو تو انہیں پیٹھ نہ دو اور جو اس دن انہیں پیٹھ دے گا مگر لڑائی کا ہنر کرے یا اپنی جماعت میں جا ملنے کو تو وہ اللہ کے غضب میں پلٹا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور کیا بری جگہ ہے پلٹنے کی

۶۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (پ۳۰، الزلزلۃ:۷، ۸)

تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا۔

۷۔ ارشادِ ربانی ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (پ۵، النساء:۲۹، ۳۰)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو اور اپنی جانیں قتل نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے اور جو ظلم و زیادتی سے ایسا کرے گا تو عنقریب ہم اُسے آگ میں داخل کریں گے اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

۸۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى (پ۱۶، طٰہٰ:۷۴، ۷۵)

بیشک جو اپنے رب کے حضور مجرم ہو کر آئے تو ضرور اس کیلئے جہنم ہے۔ جس میں نہ مرے اور نہ جئے اور جو اس کے حضور ایمان کے ساتھ آئے کہ اچھے کام کئے ہوں تو انہیں کے درجے اُونچے

۹۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا (پ۱۶-طہٰ:۱۱۱) اور بیشک نامراد رہا جس نے ظلم کا بوجھ لیا

۱۰۔ شمارِ معاصی کے بعد فرمایا:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (پ۱۹-الفرقان:۶۸،۶۹) اور جو یہ کام کرے وہ سزا پائے گا بڑھایا جائے گا اس پر عذاب قیامت کے دن اور ہمیشہ اس میں ذلت سے رہے گا

یہاں واضح کردیا کہ فاسق کیلئے کافر کی طرح دائمی عذاب ہے البتہ اگر فاسق نے توبہ کرلی یا کافر ایمان لے آیا تو پھر عذاب نہ ہوگا۔

یہاں واضح کردیا کہ فاسق کیلئے کافر کی طرح دائمی عذاب ہے البتہ اگر فاسق نے توبہ کرلی یا کافر ایمان لے آیا تو پھر عذاب نہ ہوگا۔

۱۱۔ ارشادِ ربانی ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (پ۲۰-النمل:۸۹،۹۰) اور جو نیکی لائے اس کیلئے اس سے بہتر صلہ ہے اور ان کو اس دن کی گھبراہٹ سے امان ہے اور جو بدی لائے تو ان کے منہ اوندھائے گئے آگ میں تمہیں کیا بدلہ ملے گا مگر اسی کا جو تم کرتے تھے

یہ ارشاد واضح کررہا ہے کہ تمام معاصی پر وعید ہے جیسے کہ تمام طاعات پر وعدہ ہے۔

۱۲۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (پ۳۰،النازعات:۳۷-۳۹) تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو بیشک جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے

۱۳۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (پ۲۹،الجن:۲۳) اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے تو بیشک ان کیلئے جہنم کی آگ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔

یہاں کافر و فاسق میں کوئی فرق نہیں رکھا۔

۱۴- ارشادِ ربانی ہے:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ — ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اُسے گھیر لے۔

اس سے پہلے مرجئہ یہود کا قول نقل کیا:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً — اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن

(پ۱،البقرۃ:۸۰)

پھر انہیں جھوٹا قرار دیتے ہوئے فرمایا:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (پ۱ البقرۃ:۸۱) — ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے

ان تمام آیات میں کلمہ "مَنْ" مقام شرط میں واقع ہے جو لفظ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

اس پر درج ذیل دلائل ہیں:

پہلی دلیل: عموم مَنْ پر دلائل

اگر یہ عموم کیلئے موضوع نہیں تو پھر خصوص کیلئے اس کی وضع ہوگی یا دونوں (عموم وخصوص) میں مشترک ہوگا یہ دونوں صورتیں باطل ہیں لہٰذا اس کی وضع عموم کیلئے ہی ہوگی۔

خصوص کیلئے اس لیے نہیں اگر ایسا ہوتا تو متکلم کے لئے یہ درست نہ ہوتا کہ شرط پر ہر عمل کرنے والے کو وہ جزا دے کیونکہ ایسی صورت میں جزا اس شرط پر مرتب نہ ہوگی حالانکہ اس جملہ پر سب کا اتفاق ہے جس نے کہا: مَنْ دخل داری أکرمته۔ (جو میرے گھر داخل ہوا اس کی میں عزت کروں گا) تو اب ہر داخل ہونے والے کا احترام درست ہے تو اب معلوم ہوگیا کہ اس کی وضع خصوص کے لیے نہیں۔

مشترک بھی نہیں

۱۔ اشتراک خلاف اصل ہے۔

۲۔ اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو جزا شرط پہ تمام اقسام کے سوال کے بعد مرتب کیوں ہوتی ہے مثلاً کسی نے کہا 'من دخل داری اکرمته۔ تو اس سے پوچھا جائے گا مراد مرد ہیں یا خواتین۔ اگر وہ مراد مرد لے تو پوچھ لیا جائے گا عرب مراد ہیں یا عجم۔ اگر مراد عرب ہے تو سوال ہوگا ربیعہ مراد ہیں یا مضر۔ اسی طرح تمام اقسام کے بارے میں سوال ہوگا۔ جب ہم پر واضح ہوگیا

دوسری دلیل: من دخل داری أکرمته'' سے ہر صاحب عقل کا استثناء ہوسکتا ہے اور استثناء کلام سے اسے خارج کیا جانا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ کلام میں داخل ہوتا اس لیے کہ اس میں کوئی نزاع نہیں کہ مستثنیٰ کسی جنس سے تب ہی ہوگا جب وہ مستثنیٰ منہ کے تحت داخل ہو تو اب صحت وجوب کا اعتبار ہوگا یا نہیں ہوگا۔ پہلی صورت باطل ہے۔

اولاً اس لیے کہ لازم آئے گا جمع منکّر اور جمع معرّف سے استثناء میں فرق نہ رہے۔ مثلاً جاءنی فقہاء الا زیداً اور جاءنی الفقہاء الا زیداً۔ کیونکہ زید دونوں میں داخل ہے حالانکہ ان کے درمیان فرق مسلم اور لازمی ہے۔

ثانیاً عدد سے استثناء ایسی شی کو نکالنا ہوگا جو داخل تھی تو یہ فائدہ استثناء تمام مقامات پر لازم ہوگا کیونکہ اہلِ لغت میں سے کسی نے استثناء مشتمل علی العدد اور غیر میں فرق نہیں کیا تو ثابت ہوگیا کہ استثناء کلام سے ایسی شی کو نکالنا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ داخل ہی رہتی اور یہ بات واضح کر رہی ہے کہ لفظ مَنْ مقام شرط میں عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

تیسری دلیل: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (پ۱۷،الانبیاء:۹۸) بیشک تم اور جو کچھ اللہ کے سوا تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہو

تو ابن زبعریٰ نے کہا: میں محمد سے مناظرہ کروں گا۔ کہنے لگا یا محمد! کیا فرشتوں کی عبادت نہیں کی گئی؟ کیا عیسیٰ بن مریم کی عبادت نہیں کی گئی؟ تو اس نے عموم سے ہی استدلال کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا انکار نہ فرمایا تو یہ واضح کر رہا ہے کہ یہ الفاظ عموم پر دال ہیں۔

نوٹ: مشہور روایت یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا تو اپنی زبان بھی نہیں جانتا۔ لفظ ''ما'' عقل والوں کیلئے نہیں آتا یعنی یہ پتھروں اور دیگر حیوانات کیلئے آتا ہے۔ (قادری غفرلہ)

دوسری قسم: معتزلہ، جمع معرف بالالف واللام کے ساتھ وعید سے بھی استدلال کرتے ہیں اور وہ درج ذیل آیات میں ہے:

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (پ۳۰،الانفطار:۱۴) اور بیشک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں

قاضی، جبائی اور ابوالحسن کہتے ہیں یہ صیغہ عموم کیلئے ہے۔ ابوہاشم اسے نہیں مانتے مگر ہمارے نزدیک اس کے مفیدِ عموم پر یہ دلائل ہیں:

جمع معرّف کی عموم پہ دلالت

۱۔ انصار نے جب خلافت کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشادِ گرامی سنایا: "اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ قُرَیْشٍ" (امام قریش میں سے ہوں گے) انصار نے اس دلیل کو تسلیم کیا اگر جمع معرف بلام جنس استغراق (عموم) پر دال نہ ہوتی تو یہ دلیل درست نہ ہوتی اس لیے کہ "بَعْضُ الْاَئِمَّۃِ مِنْ قُرَیْشٍ" دوسروں سے امام بننے کے منافی نہیں۔ البتہ تمام آئمہ کا قریش سے ہونا دوسروں سے امام کے منافی ہے۔

روایات میں ہے جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں: اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ کلمۂ اسلام اور توحید مان لیں) تو انہوں نے عموم لفظ سے ہی استدلال کیا اس کا نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور نہ ہی کسی دوسرے صحابی نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان میں عموم نہیں بلکہ استثناء کی بات کی اور کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اِلَّا بِحَقِّھَا" (اور زکوٰۃ اس کا حق ہے)

۲۔ اس جمع کی مفیدِ استغراق کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے لہٰذا اس کا مفیدِ استغراق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ (پ۲۳-ص:۷۳) تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا ایک ایک نے کہ کوئی باقی نہ رہا

اب تاکید کے بعد تو بالاتفاق مفیدِ استغراق ہے تو تاکید سے پہلے بھی اصلاً اس پر دلالت ضروری ہے اس لیے کہ ان الفاظ کو بالاتفاق تاکید کہا جاتا ہے اور تاکید اصل میں موجود حکم کو تقویت دینا ہے۔ اگر اصل میں استغراق ہی نہ ہو بلکہ ان الفاظِ تاکید سے وہ پیدا ہو تو ان کی تقویت حکم میں تاثیر نہیں بلکہ ان سے ایک نیا حکم سامنے آجائے گا تو یہ مجمل کا بیان تو بن جائیں گے نہ کہ تاکید، حالانکہ ان کے تاکید ہونے میں اجماع ہے تو ماننا پڑے گا اصل میں استغراق کا موجود ہونا ضروری ہے۔

۳۔ اہلِ لغت سے منقول ہے، الف لام سے اسم معرفہ ہو جاتا ہے تو اس کا حمل اسی پر کیا جائے جس سے معرفت حاصل ہو اور معرفت کیلئے کل پر حمل ضروری ہے اس لیے کہ وہ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے۔ بعض پر حمل مفید معرفت نہیں اس لیے کہ بعض افرادِ جمع، بعض سے اولیٰ نہیں ہوتے تو وہ مجہول ہی رہے گا۔

سوال: جب جنس سے مخصوص جماعت کا افادہ ہو گیا تو اس جنس کا افادہ ہو گیا۔

جواب: یہ فائدہ تو بغیر الف لام کے بھی حاصل ہو جاتا ہے مثلاً رأیت رجالًا۔ (میں نے رجال کو دیکھا) تو جنس کو متعارف اور اسے دوسرے سے ممتاز کر رہا ہے لہٰذا واضح ہوا الف لام کا فائدہ زائد ہوتا ہے اور وہ استغراق ہی ہے۔

۴- اس کی جنس کا استثناء اس سے درست ہوتا ہے اور یہ مفید عموم ہے۔

۵- جمع معرفہ میں منکر سے زیادہ کثرت ہوتی ہے اس لیے کہ منکر کا انتزاع معرف سے ہوتا ہے لیکن اس کا عکس نہیں ہوتا اس لیے۔ رأیت رجالا من الرجال کہنا درست ہے۔ لیکن رأیت الرجال من رجال نہیں کہا جا سکتا اور یہ واضح ہے کہ متنزع منہ (جس سے نکالا جائے)، متنزع (نکالا گیا) سے اکثر ہوتا ہے جب یہ ثابت ہو گیا اب ہم پوچھتے ہیں جمع معرف سے مفہوم کل ہے یا اس سے کم دوسری صورت باطل ہے اس لیے کہ جو عدد کل سے کم ہے اس کا انتزاع جمع معرف سے درست ہے تو جب معلوم ہو چکا کہ متزع منہ اکثر ہوتا ہے تو جمع معرفت مفید کل ہوگا۔ واللہ اعلم۔

طریقہ ابو ہاشم پر گفتگو یوں ہے، جمع معرف مفید عموم نہیں آیت سے ان کا استدلال ان دو طریقوں پر ہے:

۱- کسی حکم کا وصف پر مرتب ہونا علت ہونے پر دال ہوتا ہے۔ مثلاً اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ میں فجور علت ہے جب یہ ثابت ہے تو عمومِ علت کی وجہ سے عموم حکم لازم ہوگا اور یہی مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں نحویوں نے تیسرا طریقہ بھی بیان کیا ہے کہ "ان الفجار" میں لام تعریف نہیں بلکہ یہ اَلَّذِیْ کے معنی میں ہے اس پر دو چیزیں دلیل ہیں:

۱- اس کے جواب میں فا آتی ہے مثلاً ارشادِ ربانی ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا۔ الذی یلقانی فلہ درھم

۲- جس پر یہ لام داخل ہو اس پر فعل کا عطف درست ہوتا ہے۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (پ۲۶، الحدید:۱۸) اگر یہاں اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ بمعنی "اِنَّ الَّذِیْنَ اَصَّدَّقُوْا"، نہ ہوتا تو "اَقْرَضُوا اللّٰہَ" کا اس پر عطف نہ ہو سکتا۔

اب ثابت ہو گیا، اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ" کا معنی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَجَرُوْا فَھُمْ فِی الْجَحِیْمِ اور یہ مفیدِ عموم ہے۔ اس باب میں تیسری آیت یہ ہے: یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ وِرْدًا (پ۱۶، مریم:۸۶،۸۵) یہاں مجرمین جمع معرف ہے۔

۳- ارشادِ ربانی ہے:

وَنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا (پ۱۶، مریم:۷۲) اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے گھٹنوں کے بل گرے

۴- باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلْمِھِمْ مَّا تَرَکَ عَلَیْھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ (پ۱۴، النحل:۶۱) اور اگر اللہ ان کے ظلم پر گرفت کرتا تو زمین پر کوئی چلنے والا نہیں چھوڑتا لیکن انہیں ایک ٹھہرائے وعدے تک مہلت دیتا ہے

واضح کیا کہ ان کا عذاب یوم آخر تک مؤخر ہے اور یہ بات تب صادق ہے کہ اگر انہیں عذاب اسی دن حاصل ہو۔

تیسری قسم: جمع متصل الَّذِیْ میں عموم

جو جمع "الذی" کے ساتھ متصل ہو وہ بھی عموم کا فائدہ دیتی ہے مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ (پ۳۰-المطففین:۲،۱)

کم تولنے والوں کی خرابی ہے۔ وہ کہ جب اوروں سے ماپ لیں پورا لیں

۲۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (پ۴، النساء:۱۰)

وہ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔ وہ تو اپنے پیٹ میں نری آگ بھرتے ہیں

۳۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (پ۱۴، النحل:۲۸)

وہ کہ فرشتے ان کی جان نکالتے ہیں اس حال پر کہ وہ اپنا بُرا کر رہے تھے

یہاں واضح کیا کہ آدمی ترک ہجرت اور ترک تعاون پر کس قدر عذاب کا مستحق ہوگا اگر چہ وہ اللہ ورسول کا معترف ہے۔

۴۔ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (پ۱۱، یونس:۲۷)

اور جنہوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اسی جیسا اور ان پر ذلت چڑھے گی

یہاں وعید میں کافر اور غیر کافر کی تفریق نہیں ہے۔

۵۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (پ۱۰، التوبۃ:۳۴)

اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے

۶۔ ارشادِ مبارک ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ

اور وہ توبہ ان کی نہیں جو گناہوں میں لگے رہتے ہیں

(پ۴، النساء:۱۸)

اگر فاسق اہل وعید وعذاب نہ ہو تو اس ارشاد کا کیا معنی؟ بلکہ اسے توبہ کی ضرورت ہی نہ ہو۔

۷۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا

وہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ یہی ہے کہ گن گن کر قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں

(پ۶، المائدۃ:۳۳)

فاسق پر دنیا و آخرت میں ہونے والے عذاب کا ذکر ہے۔

۸۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں

(پ۳-آل عمران:۷۷)

چوتھی قسم: ارشادِ ربانی ہے:

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہوگا

(پ۴، آل عمران:۱۸۰)

یہاں مانعین زکوٰۃ پر وعید ہے۔

پانچویں قسم: لفظ کُل اور عموم

لفظ "کُل" ارشاد مبارک ہے:

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ

(پ۱۱، یونس:۵۴)

اور اگر ہر ظالم جان زمین میں جو کچھ ہے سب کی مالک ہوتی تو ضرور اپنی جان چھڑانے میں دیتی

چھٹی قسم: جو چیز اس پر دال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر وعید فرمائی ہے، ارشادِ مبارک ہے:

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْكُمْ بِالْوَعِیْدِ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (پ۲۶، ق:۲۸،۲۹)

فرمائے گا میرے پاس نہ جھگڑو میں تمہیں پہلے ہی عذاب کا ڈر سنا چکا تھا میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور نہ میں بندوں پر ظلم کروں

یہاں واضح کیا کہ وعید میں اس کا قول تبدیل نہ ہوگا۔

آیت سے استدلال دو طرح پر ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیم وعید کو ازالہ عذر کی علت قرار دیا ہے یعنی تقدیم وعید کے بعد اب کسی کا عذر اور عذاب سے خلاصی نہیں۔

۲۔ ارشاد "مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ" یہ صراحت ہے کہ جن پر لفظ دال ہیں اللہ تعالیٰ اس کے مطابق کرے گا۔

یہ تمام عمومات قرآن سے ان کا استدلال ہے۔

عموم احادیث سے استدلال

عمومات احادیث بھی بہت زیادہ ہیں۔

پہلی قسم: یہاں لفظ "مَن" آیا ہے۔

۱۔ حضرت وقاص بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، حضرت مسور بن شداد رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس آدمی نے اپنے بھائی سے لقمہ چھینا اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ کھلائے گا۔ جس نے اپنے بھائی سے کپڑا چھینا اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ کا لباس پہنائے گا جس نے ریاکاری اور دکھاوا کیا اللہ تعالیٰ روز قیامت اسے ریاء و دکھاوے کی جزا دے گا۔ یہ وعید فاسق پر نص ہے۔ (المعجم الاوسط، ۲۶۴۱)

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جس کی دو زبانیں اور دو چہرے ہوں وہ دوزخ میں بھی دو زبانوں اور دو چہرے والا ہوگا۔ (ایضاً، ۸۸۸۵)

اس باب میں منافق اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں کیا۔

۳۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک بالشت زمین کسی کی ظلم سے لی روزِ قیامت اس پر سات زمینیں لاد دی جائیں گے۔ (البخاری، ۱۲۵۲)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن وہ ہے جس سے لوگ امن میں ہوں۔ مسلمان وہ ہے جس کے

ہاتھ وزبان سے مسلمان محفوظ ہوں۔ مہاجر وہ ہے جس نے برائی کو چھوڑ دیا ہو، مجھے قسم اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے شر سے ہمسایہ محفوظ نہ ہو۔

یہ حدیث بتارہی ہے فاسق ظالم پر وعید ہے اور یہ بھی بتارہی ہے ایسا شخص نہ مومن ہے اور نہ مسلم جیسا کہ معتزلہ کا قول ہے کہ یہ دونوں کے درمیان حالت ہے۔

۵۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزِ قیامت جو تین سے بری ہوا وہ جنتی ہے۔ تکبر، غبن، قرض، یہ حدیث واضح کررہی ہے کہ جس میں یہ تین باتیں ہوں گی وہ جنتی نہ ہوگا ورنہ اس کلام کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا، قرض سے مراد وہ گناہگار ہے جو قرض ادا نہ کرنا چاہتا تھا اور نہ توبہ کا ارادہ کیا اور نہ توبہ کی۔

۶۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے طلب علم میں سفر کیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا اور جس نے عمل نہ کیا اس کا نسب کام نہیں آئے گا۔

(صحیح ابن حبان، ۱:۸۴)

یہ تصریح ہے کہ ثواب، طاعت پر ملتا ہے اور دوزخ سے خلاصی عمل صالح کی وجہ سے ہے۔

۷۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نشہ آور حرام ہے، ہر شراب حرام ہے جس نے دنیا میں شراب پی اور توبہ نہ کی اسے آخرت میں شراب نصیب نہ ہوگی۔

(مسلم، ۳:۲۰۰۳)

یہ فاسق پر صراحت سے وعید ہے اور دائمی دوزخی ہونا ثابت ہورہا ہے۔ اس لیے کہ اسے شراب نہیں ملے گی یعنی وہ جنت میں نہیں جائے گا اس لیے کہ جنت میں ہر آرزو کی تکمیل اور آنکھوں کی لذت وٹھنڈک ہے۔

۸۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہاری طرح انسان ہوں ممکن ہے تم مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے بعض دوسرے سے چرب لسان ہوتو میں فیصلہ اس کے بھائی کا اس کے حق میں کردوں تو میں نے یہ اس کیلئے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دیا۔

(البخاری: ۲۶۸۰)

9- حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اسلام کے علاوہ کسی دین پر جھوٹا اور دانستہ حلف اٹھایا وہ اپنے حلف کے مطابق ہوگا جس نے اپنے نفس کو کسی شئی سے قتل کیا اسے دوزخ میں اسی کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔

(البخاری: ۱۳۶۴)

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارے میں فرمایا: جس نے نماز کی حفاظت کی روزِ قیامت اس کیلئے یہ نور، دلیل اور نجات کا سبب ہوگی اور جس نے حفاظت نہ کی اس کیلئے نہ نور ہوگا نہ برہان نہ نجات اور ثواب اور وہ روز قیامت قارون، ہامان، فرعون اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

(مسند احمد، ۲:۱۶۹)

فضل قدیر

یہ نص ہے نماز کا ترک اعمال کو ضائع کردیتا ہے اور یہ دائمی وعید کا سبب ہے۔

۱۱۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے، حضورﷺ نے فرمایا: جو اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ملا کہ دائمی شرابی تھا وہ اس سے بُت پرست کی طرح ملاقات کرے گا۔ (سنن ابنِ ماجہ:۳۳۷۵)

جب یہ ثابت ہے کہ وہ کافر نہیں تو واضح ہے کہ یہاں مراد اعمال کا ضیاع ہے۔

۱۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے لوہے کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کیا اسے جہنم میں وہ لوہا دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس سے بطن پھاڑتا رہے گا۔ جس نے عمداً پہاڑ سے اپنے آپ کو گرایا اور وہ مرگیا تو اسے دائمی طور پر جہنم میں گرنے کی سزا ہوگی (البخاری:۵۷۷۸)

۱۳۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا: تین افراد سے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نہ کلام فرمائے گا اور نہ ان پر نظر رحمت کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا۔ عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون ہیں جو خائب وخاسر ہوگئے؟ فرمایا: کپڑا لٹکا کے چلنے والا، احسان جتلانے والا، جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچنے والا۔ (مسلم،۱۰۶)

مُسبِل سے تکبر کے ساتھ تہہ بند لٹکا کر چلنے والا مراد ہے، واضح رہے جس سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا اور اس پر رحم نہ کرے گا اور اس پر دردناک عذاب ہوگا وہ دوزخی ہی ہوگا۔ یہ فاسق کے بارے میں نص ہے۔

۱۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جس نے رضائے الٰہی کی خاطر علم سیکھنا تھا اور اس نے دنیا کی خاطر سیکھا تو وہ روزِ قیامت جنت کی خوشبو نہیں پائے گا (سنن ابوداؤد:۳۶۶۴)

اور جو جنت کی خوشبو نہ پائے وہ بلاشبہ دوزخی ہے اس لیے کہ مکلّف یا جنتی ہوگا یا جہنمی۔

۱۵۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، جس نے علم چھپایا اسے روزِ قیامت آگ کی لگام دی جائے گی۔

(سنن ابوداؤد:۳۶۶۸)

۱۶۔ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے کسی بھائی کا مال حاصل کرنے کیلئے جھوٹی قسم کھائی وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات اس حال میں کرے گا کہ وہ ناراض ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (پ۳-آل عمران:۷۷)

جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے

یہ وعید پرنص ہے اور یہ فُساق کے بارے میں کفار کی طرح ہی ہے۔

۱۷۔ناحق مال کھانے والا

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے بغیر حق کے کسی بھائی کا مال حاصل کرنے کیلئے جھوٹی قسم کھائی اس پر جنت حرام اور دوزخ لازم۔عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اگرچہ شی تھوڑی ہو۔فرمایا: اگرچہ وہ پیلوں کی شاخ ہو۔

(مسلم:۱۳۷)

۱۸۔تصویر بنانے والا

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں حضرت ابنِ عباس کے پاس تھا ایک آدمی نے پوچھا: میرا کاروبار تصاویر بنانا ہے۔فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس نے تصویر بنائی اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح ڈال دے حالانکہ وہ نہ ڈال سکے گا، جس نے بات پھیلانے کیلئے بات سنی اس کے کانوں میں سیسہ پگلا کر ڈالا جائے گا اور جس نے وہ خواب بیان کیا جو نہ دیکھا اسے دو بالوں کو جوڑنے کا کہا جائے گا۔

(سنن ترمذی:۱۵۱۷)

۱۹۔دوزخی حاکم

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جس کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے رعایا کی ذمہ داری لگائی مرنا تو اس نے اپنے وقت پر ہے اگر اس نے رعیت سے دھوکہ کیا تو اس پر اللہ جنت حرام فرمادے گا۔

(البخاری:۱۵۱۷)

۲۰۔ظلماً فیصلہ کرنے والا

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس موقعہ پر جب وہ انہیں قضا کا منصب دینے لگے کہا تھا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: جو قاضی جہالت سے فیصلہ کرے گا وہ دوزخی ہوگا جس نے ظلماً فیصلہ کیا وہ بھی دوزخی ہوگا۔

(سنن ترمذی:۱۳۲۲)

۲۱۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے اسلام میں کسی کو اپنا باپ کہا حالانکہ والد اور تھا تو اس پر جنت حرام ہوگئی۔

(البخاری:۴۲۲۷)

۲۲۔ذمی کے قاتل کی سزا

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہ پاسکے گا۔ (سنن ابوداؤد:۲۷۶۰)

جب یہ کفار کے بارے میں ہے تو قتلِ اولاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

۲۳۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے دنیا میں ریشم پہنا آخرت میں نہیں پہنے گا۔

(البخاری:۵۸۳۲)

جب آخرت میں نہیں پہنے گا تو یہ جنتی نہ ہوگا اس باری تعالیٰ کے فرمان کی وجہ سے: وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ۔ (نفوس کی تمنا جنت میں ہی ہے)

دوسری قسم: بغیر مَنْ احادیث میں عموم

عموم احادیث یہاں "مَن" نہیں لیکن وہ بھی کثیر ہیں:

۱۔محتاج متکبر دوزخی

حضرت نافع رضی اللہ عنہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسکین متکبر، بوڑھا زانی اور اللہ پر عمل سے احسان جتلانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (کشف الخفاء،۳۱۱۸)

اور جو آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا وہ بالاتفاق دوزخی ہوگا۔

۲۔مسلط حاکم دوزخی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: تین آدمی جنتی ہیں: شہید، وہ غلام جو اپنے آقا کا خیر خواہ اور اپنے رب کا عبادت گزار رہا ہو اور پاکیزہ وعفیف آدمی۔ تین آدمی دوزخی ہیں: امیر مسلط، صاحب دولت جو اللہ کا حق ادا نہ کرے اور فقیر متکبر۔

(صحیح ابن حبان:۳۶۵۶)

۳۔صلہ رحمی کا مقام

انہی سے مروی ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا فرمایا، جب اس سے فارغ ہوا تو رحم نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یہ قطع تعلقی سے بچنے والے کا مقام ہے۔ فرمایا: ہاں۔ کیا تو راضی نہیں میں اسے ملاؤں گا جو تجھے ملائے گا اور میں اسے کاٹ

دوں گا جو تجھے کاٹ دے گا۔عرض کیا: کیوں نہیں؟ فرمایا: پھر اسی طرح ہوگا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم چاہو یہ آیت پڑھو:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ (پ۲۶-محمد:۲۳)

تو کیا یہ تمہارے لچھن (انداز) نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور انہیں حق سے بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں پھوڑ دیں

قاطعِ رحم کے بارے میں آیت کی تفسیر میں وعید پر یہ نص ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: میں رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے جو اسے ملائے گا میں اسے ملاؤں گا اور جو اسے قطع کرے گا میں اسے قطع کر دوں گا۔ (سنن ابوداؤد:۱۶۹۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: بغاوت اور قطع رحم سے بڑھ کر کوئی ایسا گناہ نہیں جس کے ارتکاب کرنے والے پر اللہ تعالیٰ بہت جلدی عذاب دیتا ہے اور آخرت میں بھی۔ (سنن ابوداؤد،۴۹۰۲)

۴-اللہ کا بندوں پر حق

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے پوچھا: اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔فرمایا: وہ اس کی عبادت کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں۔ پوچھا: جب وہ یہ کریں تو اللہ پر ان کا کیا حق ہے؟ فرمایا: وہ انہیں معاف فرمادے اور عذاب نہ دے۔

(البخاری،۲۸۵۶)

اور واضح ہے کہ شرط سے معلق، عدم شرط کی صورت میں معدوم ہو جائے گا۔لہٰذا لازم ہوگا اگر وہ عبادت نہیں کرتے وہ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔

۵-قاتل ومقتول دونوں دوزخی

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو مسلمان تلواروں سے لڑیں ایک دوسرے کو قتل کر دیں تو قاتل ومقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے۔عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! قاتل تو درست مگر مقتول کیوں؟ فرمایا: وہ بھی مسلمان کے قتل پر حریص تھا۔

(مسلم،۲۸۸۸)

۶۔سونے چاندی کے برتن

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے سونے چاندی کے برتنوں میں پیا اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ جلائی جائے گی۔ (البخاری،۵۶۳۴)

۷۔اہلِ بیت کا دشمن دوزخی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اہلِ بیت کے ساتھ جو بغض رکھے گا اسے اللہ تعالیٰ دوزخ میں داخل فرمائے گا۔

جب ان سے بغض کی وجہ سے آدمی دوزخی بن جاتا ہے تو ان کا قاتل بطریق اولیٰ دوزخی ہوگا۔

۸۔خائن کا دوزخی ہونا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، ہم خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔وادی قریٰ میں تھے ایک تیر آیا آدمی کو لگا اور وہ قتل ہوگیا۔صحابہ نے کہا: اسے جنت مبارک ہو۔فرمایا: ہرگز نہیں مجھے قسم اللہ کی یوم حنین میں وہ شملہ (چادر) جو اس نے بغیر تقسیم کے لیا تھا اس کی وجہ سے اس پر آگ جل رہی ہے۔جب لوگوں نے سنا تو کوئی ایک اور کوئی دو تسمے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آرہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک تسمہ اور دو تسمے بھی دوزخ کی آگ ہیں۔ (البخاری،۴۲۳۴)

۹۔دائمی شرابی کا حکم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی جنتی نہیں۔دائمی شرابی، قاطع رحم اور جادو کی تصدیق کرنے والا۔

۱۰۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس کا مال تھا لیکن اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی اللہ تعالیٰ روزِ قیامت دوزخ کی آگ سے چاندی پگھلا کر اس کی پیشانی اور پشت پر داغ دے گا۔یہاں تک کہ تمام لوگوں کا فیصلہ ہوجائے اور اس دن کی تعداد پچاس ہزار کے برابر ہے۔ (مسلم،۹۸۷)

یہ قرآنی اور احادیث کے عمومات سے معتزلہ کے استدلال تھے۔

اہلسنّت کا جواب

اہلسنّت نے کئی طریقوں سے ان کا جواب دیا ہے:

مَنْ اور جمع معرّف عموم پر دال نہیں

۱۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ کلمہ "مَــن" مقام شرط میں مفید عموم ہوتا ہے اور اسی طرح ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جمع معرف عموم پر دال ہوتی ہے، اس پر یہ اُمور شاہد ہیں:

۱۔ ان دونوں پر کل اور بعض کا دخول درست ہے۔ مثلاً کل من دخل داری اکرمته۔ بعض من دخل داری اکرمته یہ بھی کہنا درست ہے۔ کل الناس کذا، بعض الناس کذا، اگر مَنْ شرطیہ استغراق کا فائدہ دیتا تو لفظ کل کا اس پر دخول تکرار اور بعض کا دخول نقص بن جاتا۔ یہی معاملہ جمع معرف کا ہے تو ثابت ہوا یہ الفاظ مفید عموم نہیں۔

۲۔ یہ الفاظ قرآن میں آئے ہیں۔ کہیں ان سے استغراق مراد ہے اور کہیں بعض کیونکہ اکثر عموماتِ قرآن مخصوص ہیں۔ مجاز اور اشتراک خلاف اصل ہیں لہٰذا عموم وخصوص کے درمیان حقیقت مشترکہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں افادہ اکثر پر محمول کرلیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ مفید استغراق ہے یا نہیں۔

۳۔ اگر یہ الفاظ عموم قطعی کا فائدہ دیتے تو

کسی لفظ کا بطور تاکید ان پر داخلہ محال ہوتا اس لیے کہ تحصیل حاصل محال ہے تو ان پر الفاظ تاکید کا داخلہ درست ہے تو واضح ہوا یہ عموم کا فائدہ ہر صورت میں نہیں دیتے۔

اگر ہم افادہ عموم مان لیں تو کیا قطعی ہوگا یا ظنی۔ اول صورت ممنوع ہے اس لیے کہ یہ واضح ہے اکثر اوقات لفظ کل اور جمیع کو بطور مبالغہ بول کر اکثر مراد لیتے ہیں مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (پ ۱۹-النمل:۲۳) اور اسے ہر چیز میں سے ملا اور اس کا بڑا تخت ہے

جب یہ الفاظ معنی عموم پر ظنی طور پر دال ہیں اور مذکورہ مسئلہ مسائل ظنیہ سے نہیں۔ لہٰذا ان عمومات کے ساتھ اس پر استدلال درست نہیں۔ ہاں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معنی عموم پر قطعی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہاں مخصص نہ ہو اس لیے کہ عام میں تخصیص کا کوئی مخالف نہیں۔

سوال: تم نے یہ کیوں کہا کہ وہاں مخصص موجود نہ ہو؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم نے تلاش کیا مگر مخصص نہ پایا۔ لیکن آپ جانتے ہیں عدمِ وجدان، عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا تو ان کا افادہ عموم، نفی مخصصات پر موقوف ٹھہرا اور یہ شرط غیر معلوم ہے تو ان کی دلالت بھی غیر معلوم شرط پر موقوف ہوگی۔ لہٰذا یہ دلالت حاصل نہ ہوگی جو اس مقام میں پختگی پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (پ۱، البقرۃ:۶) بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں

یہاں کفار کا حکم عام ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ بہت سارے لوگ ایمان لائے تو ہم پر واضح ہوتا ہے کہ یہاں دو امور میں سے ایک ہے یا تو ان الفاظ کی شمول کیلئے وضع نہیں یا وضع ہے مگر حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں قرینہ تھا جس کی وجہ سے لوگ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سے مراد مخصوص ہے۔

سوال: اگر وہاں قرینہ ہے تو یہاں کیوں نہیں؟

جواب: ہم مانتے ہیں کہ مخصص کا ہونا ضروری ہے اور آیاتِ عفو ومعافی مخصص ہیں۔ ترجیح ہمارے قول کو ہے اس لیے کہ آیات عفو، آیات وعید کی نسبت خاص ہیں، خاص عام پر یقیناً مقدم ہوتا ہے۔ چلو مان لیتے ہیں یہاں مخصص نہیں لیکن عمومات وعید، عمومات وعدہ کے معارض ہے وہاں ترجیح ضروری ہے اور وہ ہمارے قول کو ان وجوہ کی بنا پر ترجیح حاصل ہے۔

۱۔ وعدہ کی وفا وعید سے کہیں بڑھ کر کرم پر مشتمل ہوتا ہے۔

۲۔ احادیث مشہورہ میں ہے، اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب وسابق ہے لہٰذا عموماتِ وعدہ کو بطریق اولیٰ ترجیح ہوگی۔

۳۔ وعید، اللہ تعالیٰ کا حق اور وعدہ بندے کا حق ہے اور حقِ عبد کا حصول، حقِ الٰہی سے اولیٰ ہے۔ ہم تسلیم کرلیں کہ ان عمومات کا معارض کوئی نہیں لیکن یہ تمام کفار کے حق میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا یہ عموم میں قطعی نہ ہوئیں۔

سوال: اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا؟

جواب: ہم یہ اصول مانتے ہیں لیکن جب مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے الفاظ عام ہیں لیکن وہ اسباب خاصہ میں وارد ہیں اور وہاں مراد بھی خاص ہی ہیں تو ہم جان لیتے ہیں کہ ان کا افادۂ عموم، قوی نہیں۔ واللہ اعلم

اہلِ کبائر اور عذاب

قائلین اہل کبائر پر عذاب نہیں، کا استدلال ان دلائل سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ آج ساری رسوائی اور برائی کافروں پر ہے

(پ۱۴، النحل:۲۷)

ایک اور جگہ فرمایا:

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (پ۱۶، طٰہٰ:۴۸) بیشک ہماری طرف وحی ہوئی ہے کہ عذاب اس پر ہے جو جھٹلائے اور منہ پھیرے

یہ آیات آگاہ کر رہی ہیں کہ ماہیتِ خزی اور عذاب، کافر کے ساتھ مختص ہے لہٰذا اس ماہیت کا کوئی فرد بھی غیر کافر میں نہیں پایا جائے گا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ گرامی ہے:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (پ۲۴، الزمر:۵۳) تم فرماؤ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہوں بیشک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے

اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ وہ تمام گناہ معاف فرمادے گا نہ توبہ کا اعتبار ہے اور نہ غیر توبہ کا اور یہ قطعی طور پر تمام گناہوں کی بخشش پر دال ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ (پ۱۳، الرعد:۶) اور بیشک تمہارا رب تو لوگوں کے ظلم پر بھی انہیں ایک طرح کی معافی دیتا ہے

لفظ علیٰ حال کا فائدہ دے رہا ہے۔ مثلاً رأیت الملک علی اکلہ (میں نے اسے کھانے میں مشغول پایا) تو یہاں بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم میں مشغول کو معاف فرمادے اور حالت ظلم میں توبہ محال ہے۔ لہٰذا واضح ہو گیا بخشش بغیر توبہ ہو سکتی ہے اور اس آیت کا تقاضا ہے کہ کافر کو بھی معافی مل جائے۔ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (پ۲۱، لقمان:۱۳) بیشک شرک بڑا ظلم ہے

لیکن کافر کے بارے میں یہ حکم نہیں البتہ باقی پر عمل ہوگا اور فرق واضح ہے کہ کفر سب سے بڑی معصیت ہے۔

۴۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (پ۳۰، اللیل:۱۴-۱۶) تو میں تمہیں ڈراتا ہوں اس آگ سے جو بھڑک رہی ہے نہ جائے گا اس میں مگر بڑا بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا

ہر آگ یقیناً بھڑکتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ آگ اس بڑے بد بخت کو ملے گی جس نے تکذیب کی اور منہ پھیرا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا مبارک فرمان ہے:

كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ قَالُوا بَلَى قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ (پ ۲۹، الملک: ۸، ۹)

جب کبھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا اس کے داروغہ ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا نہ آیا تھا کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پاس ڈر سنانے والے تشریف لائے پھر ہم نے جھٹلایا اور کہا کہ اللہ نے کچھ نہیں اتارا تم تو نہیں مگر بڑی گمراہی میں

آیت نشاندہی کر رہی ہے کہ تمام اہلِ دوزخ تکذیب کرنے والے ہوں گے۔ یہ سوال نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کفار کے ساتھ خاص ہے۔ کیا اس سے پہلے یہ نہیں۔

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (پ ۲۹، الملک: ۶-۸)

اور جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور کیا ہی بُرا انجام ہے جب اس میں ڈالے جائیں گے اس کا چنگھاڑ نا سنیں گے کہ جوش مارتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شدت غضب میں پھٹ جائے گی

یہ بتا رہی ہے کہ بعض کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ یہ ہیں:

بَلَى قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَٰلٍ كَبِيرٍ (پ ۲۹، الملک: ۶-۹)

کیوں نہیں بیشک ہمارے پاس ڈر سنانے والے تشریف لائے پھر ہم نے جھٹلایا اور کہا کہ اللہ نے کچھ نہیں اتارا تم تو نہیں مگر بڑی گمراہی میں

اور یہ تمام کفار کا قول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے اس آیت کے ماقبل کی کفر پر دلالت مابعد کے عموم کے منافی نہیں ہو سکتی اور یہ کہنا یہ کفار کا قول نہیں ہم اسے تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ یہود و نصاریٰ کہا کرتے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر کچھ نازل نہیں کیا جب معاملہ ایسا تھا تبھی ان پر یہ صادق آیا کہ وہ کہتے تھے۔ مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ (اللہ تعالیٰ نے کوئی شی نازل نہیں کی)

۶۔ ارشاد ربانی ہے:

وَهَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (پ ۲۲، سبأ: ۱۷) اور ہم کسے سزا دیتے ہیں اسی کو جو ناشکرا ہے

یہ مبالغہ کے طور پر ہے لہٰذا اسے کافر اصلی کے ساتھ ہی مخصوص رکھا جائے گا۔

۷۔ ارشادِ باری تعالیٰ میں ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں، سفید چہرے اور سیاہ چہرے والے۔ فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ (پ ۴، آل عمران: ۱۰۶) تو وہ جن کے منہ کالے ہوئے کیا تم ایمان لا کر کافر ہوئے تو اب عذاب چکھو اپنے کفر کا بدلہ

واضح کر رہا ہے کہ یہ کفار ہیں۔

۸۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ لوگ تین قسم کے ہیں: سابقون، اصحاب المیمنۃ، اصحاب المشئمۃ۔ سابقین اور اصحاب میمنہ جنتی لیکن اصحاب مشئمہ دوزخی ہوں گے اور انہیں کفار قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَكَانُوْا یَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا اَئِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (پ ۲۷، الواقعہ: ۴۷) اور کہتے تھے کیا جب ہم مر جائیں اور ہڈیاں مٹی ہو جائیں تو کیا ضرور ہم اٹھائے جائیں گے

۹۔ صاحب کبیرہ ذلیل نہ ہوگا حالانکہ دوزخی ذلیل ہوگا لہٰذا صاحب کبیرہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا، ذلیل اس لیے نہیں کہ وہ مومن ہے اور مومن اہلِ ذلت سے نہیں اس کے مومن ہونے پر دلیل، اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی تفسیر میں آ چکی کہ صاحبِ کبیرہ مومن ہے۔

مومن اہل ذلت سے نہیں

مومن کے ذلیل نہ ہونے پر یہ دلائل ہیں:

۱۔ ارشادِ ربانی ہے:

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (پ ۲۸، التحریم: ۸) جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا نبی اور ان کے ساتھ کے ایمان والوں کو

۲۔ فرمایا:

اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ آج ساری رسوائی اور برائی کافروں پر ہے

(پ ۱۴، النحل: ۲۷)

۳۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ — جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور پہلو کے بل

(پ۴، آل عمران:۱۹۱)

یہاں تک کہ وہ دعا کرتے ہیں:

وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (پ۴، آل عمران:۱۹۴) — اور ہمیں قیامت کے دن رُسوا نہ کرنا

اس کے بعد فرمایا:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (پ۴، آل عمران:۱۹۵) — تو ان کی دعا سن لی ان کے رب نے

اور یہ معلوم ہے کہ بیٹھے کھڑے اور پہلوں پر ذکر اور تخلیق آسمان وزمین میں فکر کرنے والوں میں عاصی، زانی اور شارب خمر بھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا نقل کی۔ ''ہمیں روزِ قیامت ذلیل نہ کرنا'' پھر فرمایا اس نے ان کی دعا قبول فرمالی۔ تو ثابت ہوگیا اہلِ قبلہ عاصیوں کو اللہ تعالیٰ ذلیل نہیں فرمائے گا۔ اہلِ دوزخ ذلیل ہیں اس پر یہ آیت دلیل ہے:

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (پ۴، آل عمران:۱۹۲) — اے رب ہمارے بیشک جسے تو دوزخ میں لے جائے اُسے ضرور تو نے رُسوائی دی اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

تو ان دو مقدمات سے ثابت ہوگیا صاحبِ کبیرہ دوزخی نہیں۔

۱۰۔ وعدہ اور عمومات

وعدہ میں کثیر عمومات ہیں مثلاً فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پ۱، البقرۃ:۴،۵) — اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے۔

تو یہاں فلاح وکامیابی کا حکم ہر ایمان والے کیلئے ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ۱، البقرۃ:۶۲) — بیشک ایمان والے نیز یہودی، نصارٰی اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

وَعَمِلَ صَالِحًا، مثبت نکرہ ہے لہٰذا اس کیلئے ایک عمل بھی کافی ہے۔

تیسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (پ۵، النساء:۱۲۴)

اور جو کوئی بھلے کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان تو وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے

اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر مفصل رسالہ تحریر کیا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

ان دلائل کا جواب یہ ہے کہ یہ عمومات وعید سے معارض ہیں، ان آیات کی تفسیر میں اپنی اپنی جگہ گفتگو انشاء اللہ آئے گی۔

اہلسنّت بعض کے حق میں یقیناً عفو و معافی مانتے ہیں اور بعض کے بارے میں توقف کرتے ہیں اور قرآن کی متعدد آیات سے ان کا استدلال ہے۔

پہلی حجت: اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے

وہ آیات جو اللہ تعالیٰ کے عفو و غفور ہونے پر دال ہیں مثلاً فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (پ۲۵، الشوریٰ:۲۵)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور گناہوں سے درگزر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

ارشاد رب العزت ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ (پ۲۵، الشوریٰ:۳۰)

اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو معاف فرما دیتا ہے

ایک مقام پر ہے:

وَمِنْ اٰيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (پ۲۵، الشوریٰ:۳۲-۳۴)

اور اس کی نشانیوں سے ہے دریا میں چلنے والیاں جیسے پہاڑ وہ چاہے تو ہوا تھمارے کہ اس کی پیٹھ پر ٹھہری رہ جائیں بیشک اس میں ضرور نشانیاں ہیں ہر بڑے صابر شاکر کیلئے

اُمت کا اس پر اجماع بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو معاف فرماتا ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ عفو (معاف فرمانے والا) اس کا ایک اسم گرامی ہے۔

عفو اسقاط عذاب ہے

اب ہم پوچھتے ہیں عفو کس کا نام ہے؟ جس کو عذاب ہونا تھا کیا اس سے عذاب ساقط کرنا ہے یا جسے عذاب نہ ہونا تھا اس سے سقوط کا نام ہے؟ دوسری صورت باطل ہے اس لیے کہ جسے عذاب نہ ہونا ہو اسے عذاب دینا قبیح و بد ہے اور جس نے یہ فعل ترک کیا ہو اسے یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے معاف کر دیا، کیا تمہیں علم نہیں جب انسان کسی پر ظلم نہ کرے تو اسے یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے اس کو معاف کر دیا یہ تو اس وقت ہی کہا جاتا ہے جب آدمی کو عذاب دیا جا سکتا تھا (یعنی وہ مستحق عذاب تھا) لیکن اس نے عذاب نہ دیا۔ اسی لیے فرمایا:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (پ۲، البقرۃ:۲۳۷) اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے

اور یہ بھی ارشادِ ربانی ہے:

وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (پ۲۵، الشوریٰ:۲۵) اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور گناہوں سے درگزر فرماتا ہے

اب اگر اسقاطِ عذاب تائب سے ہی ہوتا تو یہاں بغیر فائدہ تکرار ہوگا تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عفو، مستحق عذاب سے اسقاط عذاب ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے۔

دوسری حجت: اللہ تعالیٰ غافر ہے

متعدد آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ غافر، غفور اور غفار ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (پ۲۴، غافر:۳) گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا

دوسری جگہ ہے:

وَرَبُّکَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَۃِ (پ۱۵، الکہف:۵۸) تمہارا رب بخشنے والا مہر والا ہے

تیسرے مقام پر ہے:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (پ۱۶، طٰہٰ:۸۲) اور بیشک میں بہت بخشنے والا ہوں اسے جس نے توبہ کی۔

چوتھے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (پ۳، البقرۃ:۲۸۵) تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیری ہی طرف پھرنا ہے

مغفرت یہ نہیں ہوتی کہ جو عذاب کا مستحق نہ ہو اس سے عذاب ساقط کر دیا جائے بلکہ یہ مستحق سے عذاب کو ساقط کرنا ہوتا ہے۔ پہلی صورت باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا تذکرہ بندوں پر بطور نعمت فرمایا ہے۔ اگر اول صورت ہے تو یہ احسان نہیں رہے گا اس لیے کہ ترک قبیح بندوں پر احسان نہیں ہوتا بلکہ گویا اس نے اپنی ذات پر احسان کیا اس لیے کہ اگر وہ یہ فعل کرتا تو وہ مستحق ملامت وذم اور حدِ الوہیت سے خارج ہو جاتا۔ لہٰذا وہ ترکِ قبح کی وجہ سے بندے کی ثناء کا مستحق نہیں۔ جب اول صورت باطل ٹھہری تو دوسری صورت پر حمل متعین ہوگا اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

سوال: مراد عذاب کا موخر کرنا ہو

عفو اور مغفرت سے دنیا سے آخرت تک عذاب کا مؤخر کرنا کیوں مراد نہیں لیا جا سکتا؟ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ لفظ عفو تاخیر عذاب دنیا کیلئے مستعمل ہے۔ قصہ یہود میں ارشادِ ربانی ہے:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (پ البقرۃ: ۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی

یہاں اسقاطِ عذاب نہیں بلکہ عذاب کو آخرت تک مؤخر کرنا مراد ہے، اسی طرح ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ (پ ۲۵، الشوریٰ: ۳۰) اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو معاف فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا، وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے دنیوی مشقت میں یا سزا میں جلدی نہیں فرماتا تو بہتوں پر عذاب ومشقت جلدی نہیں بھیجتا۔ اسی طرح ارشاد فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِى الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (پ ۲۵، الشوریٰ: ۳۲-۳۴) اور اس کی نشانیوں سے ہیں دریا میں چلنے والیاں جیسے پہاڑیاں وہ چاہے تو ہوا تمہارے کہ اس کی پیٹھ پر ٹھہری رہ جائیں بیشک اس میں ضرور نشانیاں ہیں ہر بڑے صابر شاکر کیلئے۔

اگر ہم ان کی ہلاکت چاہتے تو ہلاک کر دیتے لیکن بہت سے ذنوب پر ہم نے ہلاک نہیں کیا۔

جواب: عفو اور ازالہ

عفو اصلاً "عفا اثرہ" سے ہے یعنی اثر کا زائل کرنا۔ تو اب جس کام میں عفو ہوگا اس میں ازالہ لازم ہوگا۔ اسی لیے فرمایا:

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (پ ۲، البقرۃ: ۲۳۷) اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے

یہاں بھی وقت مقرر تک تاخیر نہیں بلکہ اسقاط مطلق ہے، عفو کی کسی تاخیر پر دلالت نہیں۔

اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرض خواہ جب مطالبہ مؤخر کرتا ہے تو یہ نہیں کہا جاتا اس نے معاف کر دیا البتہ اگر وہ قرض ساقط کر دے تو پھر کہا جائے گا عفا عنہ۔ تو ثابت ہوا عفو کی تفسیر تاخیر کرنا ممکن نہیں۔

تیسری حجت: صاحب کبیرہ سے سقوط عذاب

متعدد آیات، اللہ تعالیٰ کے رحمٰن و رحیم ہونے پر دال ہیں۔ ان سے استدلال یوں ہوگا کہ رحمت باری تعالیٰ کا اظہار، مستحق ثواب اور فرمانبردار لوگوں کی نسبت ہوگا یا مستحق عتاب گناہ گاروں کی نسبت۔ اول صورت باطل ہے اس لیے کہ ان کیلئے رحمت یا تو اس لیے حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان کے حق کے طور پر انہیں ثواب عطا فرمائے گا یا ان پر فضل فرماتے ہوئے ان کے حق سے زائد عطا فرمائے گا۔ اول باطل ہے اس لیے کہ ادائیگی واجب کا نام رحمت نہیں مثلاً ایک آدمی کے دوسرے نے سو دینار دینے ہیں وہ اس سے زور سے لے لیتا ہے تو اب دینے والے کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے دے کر رحمت کا اظہار کیا ہے۔

دوسری صورت بھی باطل ہے۔ کیونکہ ثواب بندے کا حق بن گیا تھا اب وہ گویا فضل سے مستغنی تھا اسی وجہ سے اس اضافہ کو انعام کہا جاتا ہے نہ کہ رحمت، مثلاً سلطان اعظم کی خدمت میں ایسا امیر ہو جو صاحب ثروت اور عظیم مملکت کا مالک ہو اب سلطان اس کے ملک کے ساتھ ایک اور مملکت کا اضافہ کر دے تو اب یہ نہیں کہا جائے گا کہ سلطان نے اس پر رحمت کی بلکہ کہا جائے گا اس نے اس کے انعام میں اضافہ کیا یہاں بھی صورت حال یہی ہے۔

دوسری صورت لیجئے کہ رحمت کا اظہار بنسبت مستحق عذاب کے ہو۔ اب یہ رحمت اس لیے بنے گی کہ اللہ تعالیٰ نے استحقاق عذاب سے زائد عذاب ترک کر دیا، یہ باطل ہے اس لیے کہ یہ ترک واجب ہے جسے رحمت نہیں کہا جا سکتا، اور اس سے ہر کافر و ظالم کا ہم پر رحیم ہونا بھی لازم آئے گا کہ انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔

اب باقی یہ صورت رہ جاتی ہے کہ باری تعالیٰ اس لیے رحیم ہے کہ اس نے مستحق عذاب کو عذاب نہ دیا اور یہ بات صاحب صغیرہ میں نہیں پائی جا سکتی اور نہ ہی توبہ کے بعد صاحب کبیرہ میں اس لیے کہ ان کیلئے ترک عذاب لازم ہے تو اب واضح ہو گیا اس کی رحمت کا حصول اس وقت ہے جب قبل از توبہ صاحب کبیرہ کا عذاب ساقط فرمائے۔

رحمتِ اُخروی: دنیاوی سے کہیں زیادہ ہے

سوال: یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی رحمت بطور فضل یہ ہو کہ اس نے تخلیق فرمائی، مکلف بنایا اور رزق دیا اور وہ صاحب کبیرہ کے عذاب میں تخفیف فرماتا ہے؟

جواب: اول صورت سے معلوم ہورہا ہے کہ وہ دنیا میں رحیم ہے اُخروی رحمت کہاں گئی؟ حالانکہ امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اخروی رحمت دنیاوی رحمت سے کہیں عظیم ہے۔

دوسری صورت میں تمہارے نزدیک تخفیف جائز نہیں۔ معتزلہ وعیدیہ کا یہی مذہب ہے اور اگر اس آیت مبارکہ سے تخفیفِ عذاب ثابت ہورہا ہے تو جوازِ عفواز خود ثابت ہوگا کیونکہ جوان میں سے ایک کا قول کرتا ہے وہ دوسرے کو بھی مانتا ہے۔

چوتھی حجت: قبل از توبہ صاحب کبیرہ

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ (پ۵، النساء:۴۸)

بیشک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرمادیتا ہے

"لِمَنْ يَّشَاءُ" نہ صاحبِ صغیرہ کیلئے ہے اور نہ ہی بعد از توبہ صاحبِ کبیرہ کیلئے لہٰذا یہاں مراد قبل از توبہ صاحبِ کبیرہ ہے۔ ان دلائل کی بنا پر پہلے لوگوں پر اس کا حمل جائز نہیں۔

۱۔ اس ارشادِ ربانی کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بطور فضل معاف نہیں فرمائے گا یہ مفہوم نہیں کہ وہ بطوراستحقاق معاف نہیں کرے گا اس پر دلیل شرعی اور عقلی شاہد ہیں۔ جب معاملہ یہ ہے تو اب "يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ" کا معنی ہوگا وہ اپنے فضل سے شرک سے کم گناہ کو معاف فرمادے گا تو اب نفی واثبات، شئی واحد پر ہی وارد ہوں گے مثلاً آدمی کہتا ہے **فلان لا یتفضل بمائۃ دینار ویعطی ما دونها لمن استحق** (فلاں بطور فضل سو دینار نہیں دے گا اور اس سے کم استحقاق والے کو دے گا) تو اب کلام میں نظم نہ رہا تو جب صاحبِ صغیرہ اور تائب صاحبِ کبیرہ۔ مستحق مغفرت ہیں تو ان کا مراد لینا ممتنع ہوگا۔

۲۔ اگر "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ" سے مراد یہ ہو کہ وہ مستحقین عذاب کو بھی توبہ کرنے والے اور صاحبِ صغیرہ کی طرح معاف کردے گا تو اب شرک اور شرک سے کم میں کیا فرق رہے گا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ استحقاق کی بناء پر جیسے شرک سے کم گناہ پر معافی دیتا ہے اور عدم استحقاق پر معاف نہیں فرماتا اسی طرح وہ استحقاق کے وقت شرک معاف فرماتا ہے اور عدم استحقاق میں معاف نہیں فرماتا تو اب ان دونوں میں امتیاز وفرق نہیں رہے گا۔

۳۔ توبہ کرنے والوں اور اصحاب صغائر کی مغفرت لازمی ہے اور لازم مشیت سے معلق نہیں ہوتا کیونکہ اس سے معلق وہ ہوسکتا ہے کہ فاعل چاہے اسے کرے چاہے نہ کرے لیکن واجب کا ہونا ضروری ہے وہ چاہے یا نہ چاہے۔ آیتِ مذکورہ میں مغفرت مشیت سے معلق ہے تو اب ایسی مغفرت توبہ کرنے والوں اور اصحابِ صغائر کیلئے نہیں ہوگی۔

۱؎ قدیر

واضح رہے یہ تمام دلائل معتزلہ کے اس قول پر ہیں کہ صاحب صغیرہ اور تائب صاحب کبیرہ کی مغفرت لازمی ہے۔ لیکن ہم ایسا قول نہیں کرتے۔

۴۔ الفاظ مبارک "وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ" قطعی طور پر نشاندہی کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ ہر گناہ معاف فرمادے گا اور اس میں صغیرہ اور کبیرہ خواہ توبہ ہوئی یا نہیں سب شامل ہیں البتہ ان تینوں کی مغفرت میں دو طرح کا احتمال ہے ہر ایک کے تمام معاف ہو جائیں یا بعض کے تمام معاف لیکن بعض کے تمام معاف نہ ہوں۔ ارشاد "وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ" واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں کو معاف فرمائے گا۔ پھر "لِمَنْ یَّشَاءُ" واضح کر رہا ہے اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے گا مگر کل کے نہیں بلکہ بعض کے، یہ صورت ہمارے اصول کے مطابق ہے۔

سوال: ہم نہیں مانتے کہ مغفرت اس پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں عاصیوں کو عذاب نہیں دے گا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مغفرت اسقاطِ عذاب ہے اور یہ عام ہے دائمی ساقط ہو یا غیر دائمی، جب یہ لفظ مشترک ہے تو اس میں ان دونوں میں سے کسی ایک پر شہادت نہیں ہے تو اب اس کی دلالت اسقاطِ دائمی پر نہیں ہوگی۔

جب یہ ثابت ہے تو ہم یہ کیوں نہیں کہہ سکتے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کی سزا دنیا سے مؤخر نہیں کرتے شرک سے کم کی سزا جس کیلئے چاہیں دنیا سے مؤخر فرمادیں۔

اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوسکتا کہ یہ قول کیسے درست ہے حالانکہ ہم اہلِ ایمان سے زائد عذاب کفار دنیا میں نہیں دیکھتے اس لیے کہ جواباً یہ کہا جائے گا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہے شرک کا عذاب دنیوی مؤخر نہیں فرماتا اور جس کیلئے چاہے شرک سے کم کا عذاب دنیا سے مؤخر فرمادیتا ہے تو اس سے دونوں کو تخویف و دھمکی یوں حاصل ہوگی کہ ان کفار و فساق کو جلدی عذاب ملے جو جلدی چاہے اگرچہ اکثر پر ایسا نہیں ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مغفرت سے مراد اسقاطِ عذاب دائمی ہے پھر تم یہ کیوں کہتے ہو کہ اس سے مغفرت تائب اور صاحب صغیرہ مراد نہیں لی جاسکتی؟

پہلی تین وجوہ اس اصل پر ہیں جس کا قائل نہیں اور وہ یہ ہے کہ صاحب صغیرہ اور تائب کبیرہ کی مغفرت لازمی ہے رہی چوتھی وجہ تو "مَادُوْنَ ذٰلِكَ" میں عموم تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ اس پر لفظ کل اور بعض کا دخول درست ہے۔ مثلاً وَیَغْفِرُ كُلَّ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ یَغْفِرُ بَعْضَ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ۔ اگر اس میں عموم ہوتا تو یہ داخلہ درست نہ ہوتا۔

اگر ان میں عموم تسلیم کرلیں تو ہم صاحبِ صغیرہ اور تائب صاحبِ کبیرہ کو اس سے مخصوص کرلیں گے وہ اس لیے کہ وعیدی آیات میں سے ہر کوئی کسی نوع کبیرہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مثلاً قتل وزنا لیکن یہ آیت تمام معاصی کو شامل ہے۔ خاص، عام سے مقدم ہوتا ہے تو آیاتِ وعید اس آیت پر مقدم ٹھہریں۔

تو اول کا جواب یہ ہے اگر ہم مغفرت سے تاخیر عذاب مراد لیں تو آیت کی وجہ سے لازم ہوگا کہ دنیا میں مشرکین کا عذاب اہلِ ایمان سے زائد ہو ورنہ اس فرق کا فائدہ کیا؟ اور حالانکہ مسلم ہے کہ ایسا نہیں اس لیے ارشادِ ربانی ہے:

وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (پ۲۵، الزخرف:۳۳)

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک دین پر ہوجائیں تو ہم ضرور رحمٰن کے منکروں کیلئے چاندی (سونے) کی چھتیں اور سیڑھیاں بناتے جن پر چڑھتے

پھر معترض نے کہا: "مَادُوْنَ ذٰلِكَ" میں عموم ہے تم کیوں نہیں مانتے؟

جواب: "ما" کا اشارہ اس ماہیت کی طرف ہے جو دون الشرک سے موصوف ہے اور یہ واحد ہے۔

پانچویں حجت: آیاتِ عموم سے استدلال

ہم (آیات) عموماتِ وعدہ سے استدلال کرتے ہیں اور وہ قرآن میں کثیر ہیں تو جب تعارض ہوجائے تو ترجیح یا موافقت ضروری ہے ان دلائل کی بنا پر ہمارے موقف کی ترجیح ہے۔

۱۔ عموماتِ وعدہ بہت زیادہ ہیں اور شریعت میں دلائل کی کثرت وجہِ ترجیح ہے اور اس اصول کی صحت پر اصول فقہ میں گفتگو موجود ہے

جانب نیکی غالب ہے

ارشادِ ربانی:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (پ۱۲، ھود:۱۱۴)

بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں

نشاندہی کررہا ہے کہ نیکی، برائی کو ختم کردیتی ہے اس لیے کہ وہ حسنہ ہے، جیسا کہ اصول فقہ میں ثابت ہے۔

اب اس پر حسنات کفار میں عمل نہیں ہوگا اس لیے کہ وہ ان کی سیئات ختم نہیں کرتیں لہٰذا باقی حسنات میں اس پر عمل ہوگا۔

۲۔ ارشادِ ربانی ہے

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا (پ۸-الانعام:۱۶۵)

جو ایک نیکی لائے تو اس کیلئے اس جیسی دس ہیں اور جو برائی لائے تو اُسے بدلہ نہ ملے گا مگر اس کے برابر

پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر اضافہ فرمایا:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (پ۳-البقرۃ:۲۶۱)

اس دانہ کی طرح جس نے اگائیں سات بالیں ہر بال میں سو دانے

اضافہ کی حد ہی نہیں

پھر اس پر بھی اضافہ فرمایا

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (پ۳-البقرہ:۲۶۱)

اور اس سے بھی زیادہ بڑھائے جس کیلئے چاہے

برائی کے حوالے سے فرمایا:

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا

اور جو برائی لائے تو اسے بدلہ نہ ملے گا مگر اس کے برابر

ان تمام کی اس پر بہت واضح دلالت ہے کہ جانب نیکی وحسنہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں جانب برائی وسیئہ سے راجح ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت وعدہ میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (پ۵-النساء:۱۲۲)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے عنقریب ہم انہیں باغوں میں لے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہیں ہمیشہ ان میں رہیں اللہ کا سچا وعدہ اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی

وعید اللہ حق۔نہیں فرمایا

"وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا" کے الفاظ بطور تاکید ہیں اور مقاماتِ وعید میں کسی بھی جگہ "وَعِيْدُ اللّٰهِ حَقًّا" نہیں فرمایا اور ارشادِ ربانی:

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَىَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (پ۲۶،ق:۲۹)

میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور نہ میں بندوں پر ظلم کروں

وعدہ اور وعید دونوں کو ہی شامل ہے۔

۵۔ ارشادِ گرامی ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (پ۵ النساء: ۱۱۰-۱۱۱)

اور جو کوئی برائی یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہے تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا اور جو گناہ کمائے تو اس کی کمائی اسی کی جان پر پڑے اور اللہ علم و حکمت والا ہے

استغفار، طلب مغفرت ہے اور یہ توبہ کے علاوہ ہے یہاں تصریح ہے توبہ ہو یا نہ ہو، استغفار پر اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا اور یہ نہیں فرمایا جس نے گناہ کا ارتکاب کیا وہ اللہ تعالیٰ کو عذاب و سزا دینے والا پائے گا بلکہ فرمایا: "فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ"۔ تو یہاں سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ جانبِ حسنہ ہی غالب و راجح ہے اس کی نظیر یہ ارشادِ ربانی ہے

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (پ۱۵ الاسراء: ۷)

اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا

یہ نہیں فرمایا: "اِنْ اَسَاْتُمْ اَسَاْتُمْ لَهَا" گویا اللہ تعالیٰ اپنے احسان کا۔ تکرار کے ذریعہ اعادہ فرما رہا ہے لیکن برائی پر پردہ ڈالتے ہوئے صرف ایک ہی دفعہ ذکر کیا۔ یہ تمام جانب حسنہ کے راجح ہونے پر شاہد ہے۔

۶۔ آیات وعید کا الفاظ واحد سے تکرار نہیں

ہم نے واضح کیا ارشادِ ربانی "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" صاحب کبیرہ کے عفو کیلئے ہی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسی صورت میں اس کا اعادہ فرمایا اور یہ تاکید کے علاوہ درست نہیں حالانکہ آیات وعید کا الفاظ واحد کے ساتھ کہیں تکرار نہیں نہ ایک صورت میں اور نہ دو میں۔ تو اس سے واضح ہو جاتا ہے حسنات پر وعدہ اور سئیات پر عفو کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی عنایات اکمل اور اتم ہیں۔

۷۔ وعید میں تاویل احسن ہے

جب آیات وعدہ و وعید میں تعارض ہے تو دونوں میں سے ایک کی تاویل ضروری ہے اور تاویل، وعدہ کے بجائے وعید میں احسن ہے اس لیے کہ عرف میں عفوِ وعید مستحسن اور وعدہ میں بے وفائی قبیح ہے لہٰذا وعید میں تاویل کر لینا، وعدہ میں تاویل سے اولیٰ ہے

۸۔ جانب وعد کی وعید پر ترجیح

قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کی ان شانوں سے مالا مال ہے۔ غافر، غفور، غفار، صاحب غفران و مغفرت، رحیم، کریم، صاحب عفو و احسان اور صاحب فضل و افضال ہے اور اس پر دال احادیث حدِ تواتر پر ہیں تو یہ تمام جانب وعدہ کو پختہ کرتی ہیں اور قرآن میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ رحمت، کرم اور عفو سے دور ہے تو ان تمام سے جانب وعد کی جانب وعید پر ترجیح ثابت ہو رہی ہے۔

فضل قدیر

۹۔ (صاحبِ کبیرہ) انسان سب سے اعلیٰ خیر ''ایمان'' لایا اور سب سے بدتر ''کفر'' سے بچا۔ ہاں اس نے ایسے شر کا ارتکاب کیا جو طبقہ قبائح سے سب سے بڑا نہیں۔ ایک مالک کا غلام ہو اور اس کی سب سے بڑی خدمت بجالائے لیکن متوسط نافرمانی کا مرتکب ہو جائے، اب اگر مالک اس کی متوسط غلطی کو اعظم طاعت پر ترجیح دے تو ایسے مالک کو کمینہ اور موذی کہا جاتا ہے یہاں بھی معاملہ اسی طرح ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بات ہرگز ثابت نہیں لہٰذا جانب وعدہ کی ترجیح ثابت ہو جائے گی۔

۱۰۔ حضرت یحییٰ بن معاذ کی خوبصورت دعا

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کرتے، اے میرے اللہ جب ایک گھڑی کی توحید پچاس سالہ کفر ختم کردیتی ہے تو پچاس سالہ توحید ایک گھڑی کے گناہ کیسے نہ ختم کرے گی؟ اے میرے اللہ! جب حالت کفر میں کوئی طاعت نافع نہیں تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ حالت ایمان میں کوئی گناہ نقصان دہ نہ ہو ورنہ کفر کا ایمان سے اعظم ہونا لازم آئے گا اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم اس حالت میں معافی کی امید تو ہے، یہ گفتگو نہایت خوبصورت ہے۔

۱۱۔ تخصیص، تعطیل سے بہتر

پیچھے دلائل سے بیان کیا، ارشادِ ربانی ''وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ'' کا حمل صغیرہ اور تائب صاحبِ کبیرہ پر نہیں ہوسکتا، اب اگر ہم اسے قبل از توبہ صاحب کبیرہ پر محمول نہ کریں تو آیت کا بے معنی ہونا لازم آئے گا اور اگر ہم وعیدی عمومات کی وجہ سے گناہ کو حلال جاننے والے کے ساتھ مخصوص کرلیں تو اس سے تخصیص عموم لازم آئے گی اور مسلّم ہے کہ تخصیص، تعطیل سے بہتر و آسان ہے۔

معتزلہ کا مؤقف

جانب وعید کو ان دلائل کی بنا پر ترجیح حاصل ہے:

۱۔ امت کا اتفاق ہے کہ فاسق پر بطور سزا و عبرت لعنت وحد درست ہے تو وہ اہلِ ذلت میں سے ٹھہرا اور یہ چیز اس کے مستحقِ عتاب پر دال ہے اور اب اس کا اس حال میں مستحق ثواب ہونا محال ہوگا تو اب جانب وعید، جانب وعدہ پر راجح ہوگی۔ اس پر لعنت کے لیے قرآن اور اجماع شاہد ہیں۔ قرآن میں قاتل مومن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ (پ۵، النساء: ۹۳) اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی

اسی طرح فرمایا:

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (پ۸ الاعراف:۴۴) کہ اللہ کی لعنت ظالموں پر

اب اجماع تو ظاہر ہے، اس پر بطور عبرت حد نافذ کی جاتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (پ۶ المائدۃ:۳۸) اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کیے کا بدلہ اللہ کی طرف سے سزا!

بطور عذاب اس پر حد کا نفاذ ہوتا ہے، زانی کے بارے میں فرمایا:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ۱۸، النور:۲) اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ حاضر ہو

یہ اہلِ ذلت میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے راہزنوں کے بارے میں فرمایا:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (پ۶، المائدۃ:۳۳) وہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ یہی ہے کہ گن گن کر قتل کیے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹے جائیں یا زمین سے دور کر دیئے جائیں یہ دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کیلئے بڑا عذاب۔

جب فاسق میں یہ چیزیں ہوتی ہیں تو وہ مستحق عذاب و ذم بھی ہوگا، جو آدمی ان کا دائمی مستحق ہو جائے تو اس وقت وہ اہلِ ثواب میں سے نہیں رہے گا اس لیے کہ ثواب و عتاب متضاد چیزیں ہیں اور ان کے استحقاق میں اجتماع محال تو جب وہ مستحق ثواب نہ رہا تو جانب وعید کا وعد پر راجح ہونا واضح ہو گیا۔

۲۔ آیات وعدہ عام اور وعید خاص ہیں اور خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔

۳۔ انسانی جبلت فساد و ظلم ہے تو زجر کی ضرورت زیادہ ہے تو جانب وعید اولیٰ ٹھہری۔

اہلسنّت کے جوابات

پہلی دلیل کے کئی جوابات ہیں

۱۔ جیسے آیات میں فُساق کے معاصی کی وجہ سے دنیا میں ان پر لعنت اور عذاب ہے اسی طرح آیات میں ان کے ایمان کے سبب ان کی تعظیم واکرام بھی ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے

وَاِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (پ۷،الانعام:۵۴) اور جب وہ تمہارے حضور حاضر ہوں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے فرماؤ تم پر سلام تمہارے رب نے اپنے ذمہ کرم پر رحمت لازم کرلی ہے

۲۔ جیسے آیات وعدہ، اخروی وعیدی آیات کے مخالف ہیں اسی طرح وہ دنیوی وعیدی آیات کے بھی معارض ہیں تو وعید دنیاوی والی آیات کی وعید اُخروی والی آیات پر ترجیح اس کے برعکس پر اولیٰ کیوں نہیں؟

۳۔ ہمارا اتفاق ہے کہ چور اگرچہ توبہ کرے پھر بھی اس کا ہاتھ کٹے گا البتہ بطور سزا نہیں بلکہ بطور امتحان تو ثابت ہوا "جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا" عدم توبہ کے ساتھ مشروط ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ وہ عدمِ عفو سے بھی مشروط ہو۔

۴۔ جزا، جو کافی ووافی ہو، جب سزا کافی ہے تو اب آخرت میں عتاب جائز نہ ہوگا ورنہ اس کا کافی ہونا ختم ہوجائے گا تو ثابت ہوا یہ اُخروی عذاب کے منافی ہے۔

جب جانب وعید کی ترجیح کا فساد واضح ہوگیا تو ہماری سنیے۔

ان دونوں طرف کی آیات میں وعد و وعید کا ذکر ہے ان کے درمیان تطبیق ضروری ہے۔

اب یا تو یہ کہا جائے پہلے بندے کو ثواب حاصل ہوگا اور پھر اسے دارِ عذاب میں منتقل کردیا جائے گا اس قول کے باطل ہونے پر امت کا اجماع ہے یا یوں کہا جائے بندے پر پہلے عذاب ہوگا پھر اسے دارِ ثواب میں منتقل کردیا جائے گا اور وہ وہاں ہمیشہ رہے گا یہی مطلوب ہے۔

رہی ترجیح ثانی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ ارشادِ ربانی "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ" کفر کو شامل نہیں اور ارشادِ مبارک "وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" تمام کو شامل ہے لہٰذا ہمارا قول خاص ٹھہرا۔ واللہ اعلم۔

چھٹی حجت: رسول اللہ ﷺ کی شفاعت

ہم نے پہلے واضح کیا کہ حضور ﷺ کی شفاعت سے عذاب ساقط ہوگا اور یہ چیز اس مسئلہ میں ہماری تائید میں ہے۔

ساتویں حجت: توبہ کے بعد معافی

ارشادِ ربانی "اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا" (اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کرے گا) اس مسئلہ میں نص وتصریح ہے۔

سوال: یہ آیت دال ہے کہ تمام گناہگاروں کی مغفرت قطعی ہے حالانکہ تم بھی یہ بات نہیں کہتے تو جس پر آیت دال ہے وہ تمہارا مذہب نہیں اور جو تمہارا مذہب ہے اس پر آیت دال نہیں۔

جواب: ہم یہ تسلیم کرتے ہیں لیکن مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کے بعد تمام گناہ معاف کردے گا۔

اس پر دو دلائل

اس مفہوم پر آیت کا حمل ان دو وجہ سے اولیٰ ہے:

۱۔ جب ہم آیت کا یہ معنی کرتے ہیں تو اسے بغیر تخصیص تمام گناہوں پر محمول کرتے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد فرمایا:

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ (پ ۲۴، الزمر: ۵۴)

اور اپنے رب کی طرف رجوع لاؤ اور اس کے حضور گردن رکھو قبل اس کے کہ تم پر عذاب آئے

انابت، (رجوع کرنا) توبہ ہی ہے تو واضح ہو گیا توبہ شرط ہے۔

پہلی دلیل کا جواب: قیدِ توبہ کی ضرورت نہیں

ارشادِ ربانی "یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا" اللہ تعالیٰ کا مستقبل میں وعدہ ہے کہ وہ گناہوں کو ساقط فرمادے گا اور ہم قطعی طور پر اس کے پورے ہونے پر یقین رکھتے ہیں اس لیے کہ ہمارا ایمان ہے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو دوزخ سے ضرور نکالے گا اور وہ بلاشبہ مغفرت ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیت کو ظاہر پر ہی رکھنے میں قیدِ توبہ کی حاجت نہیں۔

اس مسئلہ پر یہ تفصیلی گفتگو تھی، وباللہ التوفیق۔

اب تفسیر آیت کی طرف آتے ہیں۔ معتزلہ کہتے ہیں خطا کا محیط ہونا یہ ہے کبیرہ گناہ، ثواب آدمی کو ختم کردیتا ہے، اس پر متعدد اعتراضات ہیں۔

۱۔ احاطہ کیلئے عدم عفو بھی شرط ہے

جس طرح احاطہ کیلئے گناہ کا کبیرہ ہونا شرط ہے اسی طرح احاطہ کیلئے عدم عفو بھی شرط ہے اس لیے کہ اگر عفو ثابت ہو جائے تو

انسان کا احاطہ، سیئۃ (برائی) نہیں کرسکتی تو اب سیئۃ کا محیط انسان ہونا، ثبوتِ عدم عفو کے بغیر نہیں ہوسکتا یہ پہلا مسئلہ ہے اور اس آیت سے اس مطلوب پر استدلال باطل ہے۔

۲۔احاطہ سے مراد کبیرہ نہیں

ہم احاطہِ خطا کی تفسیر کبیرہ نہیں کرتے بلکہ تفسیر یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن نافرمان ہو اور یہ بات کافر میں ہی ہوسکتی ہے۔ وہی دل، زبان اور اعضاء سے اللہ تعالیٰ کا عاصی و نافرمان ہوتا ہے۔ رہا مسلمان تو یہ دل و زبان سے اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوتا ہے، ہاں بعض اعضاء سے نافرمان ہے لہٰذا یہاں احاطہ خطا نہیں۔

ہماری تفسیر احاطہ اولیٰ ہے کیونکہ جب ایک جسم دوسرے جسم کے بعض سے مس ہو تو نہیں کہا جاتا کہ اس نے اس کا احاطہ کرلیا۔ اس سے آشکار ہوگیا احاطہ خطا کافر میں ہی ہوسکتا ہے۔

تو اب ہم کہتے ہیں "فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ" کا تقاضا یہی ہے کہ یہ کافر ہیں، اور اسی کا یہ تقاضا ہے کہ صاحبِ کبیرہ دوزخی نہ ہو

۳۔ ارشادِ مبارک "فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ" کا معنی کہ یہ اس وقت دوزخی ہیں، باطل ہے، یہ مفہوم لینا ہوگا کہ یہ مستحق نار ہیں اور ہم بھی یہی قول کرتے ہیں لیکن اس میں کسی کا نزاع نہیں کیا اللہ تعالیٰ اس حق کو معاف کرسکتا ہے؟

اور یہ اول مسئلہ ہے، ہم اپنی گفتگو قاعدہ فقہی پر ختم کرتے ہیں۔ یہاں شرط دو امور ہیں:

۱۔ برائی کا ارتکاب۔

۲۔ برائی کا احاطہ انسان۔

جو جزا دو شرائط سے معلق ہو وہ ایک کے حصول پر نہیں پائی جاسکتی، یہ بات بتا رہی ہے کہ جس نے طلاق یا عتاق کیلئے دو شرائط پر حلف اٹھایا وہ ایک موجود ہونے کی بنا پر حانث نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

[۸۲] وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

(اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے)

ذکر وعدہ کے فوائد

اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی قرآن میں آیت وعید ذکر کی وہاں آیت وعد بھی ذکر کی، اس کے متعدد فوائد ہیں:

۱۔ اس کا عدل ظاہر ہو اس لیے کہ جب کفر پر مُصر لوگوں کا انجام دائمی عذاب بتایا تو ضروری تھا ایمان پر قائم لوگوں کیلئے دائمی انعام کا ذکر کیا جاتا۔

۲۔ مومن کیلئے خوف و رجا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے اگر مومن کے خوف و رجا کا وزن کیا جائے تو وہ برابر ہوں گے اور راہ اعتدال اسی طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ وعدہ کے ساتھ کمال رحمت اور وعید سے کمال حکمت کا اظہار ہے تا کہ یہ معرفت کا سبب بن جائیں۔

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اعمال اور ایمان الگ ہیں

عمل صالح، ایمان سے الگ ہے اس لیے کہ فرمایا: "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"۔ اگر ایمان کی دلالت عمل صالح پر بھی ہوتی تو یہ تکرار ہوتا۔ قاضی نے جواباً کہا: ایمان میں اگرچہ تمام اعمال صالح داخل ہیں لیکن لفظ "امن" اس وقت مفید ہوتا ہے جب افعال ایمان میں سے کوئی ایک بجالائے اس لیے یہ فرمان بہت خوب ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"۔

جواب: فعل ماضی کی دلالت مصدر کے زمانہ ماضی میں حصول پر ہوتی ہے۔ ایمان مصدر ہے اگر اس کی دلالت تمام اعمال صالحہ پر ہے تو لفظ امن تو یہ بتائے گا کہ ان اعمال کا صدور اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ: صاحب کبیرہ کا جنتی ہونا

یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ صاحب کبیرہ جنت میں جائے گا اس لیے کہ ہماری گفتگو اس شخص کے بارے میں ہے جو ایمان لایا اور اس نے اعمال صالحہ کیے اس کے بعد اس نے ارتکاب کبیرہ کیا مگر توبہ نہ کی تو اس پر ارتکاب کبیرہ سے پہلے یہ صادق آرہا ہے کہ یہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ بجالانے والا ہے جب یہ صادق آرہا ہے تو یہ "اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ"

کے تحت داخل ہو۔

صاحب کبیرۃ جمیع صالحات بجالانے والا نہیں

سوال: صاحب کبیرہ پر ارشاد "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" صادق نہیں آرہا۔ کیونکہ اس کیلئے تو جمیع صالحات کا بجالانا ضروری ہے اور ان میں توبہ بھی ہے جب اس نے توبہ نہیں کی تو وہ صالحات کہاں بجالایا؟ لہٰذا وہ آیت کے تحت داخل نہ ہوگا۔

جواب: کبیرہ کے ارتکاب سے پہلے اس پر یہ صادق تھا تو جب مرکب صادق ہے تو مفرد بھی صادق ہوگا بلکہ جب اس نے کبیرہ کیا تو اب اس پر تمام اوقات میں یہ صادق نہیں۔ لیکن ہمارا قول "وہ ایمان لایا اور اعمال صالحہ کیے" عام ہے کہ وہ تمام اوقات میں بجالایا ہو یا بعض میں تو آیت میں قدر مشترک ہے تو ثابت ہوا یہ وعدہ کے تحت ہے۔

رہا ان کا قول فاسق کے ثواب طاعت کو اس کے عتاب کی معصیت ضائع کر دیتی ہے۔ لہٰذا ترجیح جانب وعید کو ہوگی۔ اس پر پہلے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

تیسرا مسئلہ: فضل الٰہی اور دخولِ جنت

شیخ جبائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا۔ کوئی جنتی، جنت میں فضل کی بنا پر داخل نہ ہوگا اس لیے کہ "اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ" میں حصر ہے جو واضح کررہا ہے اصحاب جنت وہی ہوں گے جو ایمان اور اعمال صالحہ والے ہی ہوں گے۔

جواب: یہ کیوں جائز نہیں کہ یہاں مستحقِ جنت مراد ہوں اور جسے بطور فضل جنت ملنی ہے وہ اس حکم کے تحت نہ ہو۔ واللہ اعلم

[۸۳] وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

(اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم روگردان ہو)

دیگر انعامات کا تذکرہ

یہ اور قسم کے انعامات ہیں جو انہیں عطا کیے گئے وہ اس لیے کہ ان کا نبھانا سب سے بڑی نعمت (جنت) کا سبب ہے، نعمت کا موصل بھی نعمت ہوتا ہے لہٰذا انہیں مکلف بنانا بھی نعمت ہے اس کے بعد احکام کی تفصیل ہے کہ وہ یہ ہیں۔

پہلا حکم: اللہ کی ہی عبادت

ارشادِ گرامی "لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ"۔ (اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: تَعۡبُدُوۡنَ کی قرأت

ابنِ کثیر، حمزہ اور کسائی رحمۃ اللہ علیہم کی قرأت "یعبدون" ہے اور باقی نے تا پڑھی ہے، یا کی وجہ کہ یہ غیبی خبر انہیں دی اور تا اس لیے کہ وہ مخاطب ہیں۔ مختار تاء ہے۔ شیخ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ارشادِ ربانی "وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا" واضح کر رہا ہے کہ یہاں بھی تا کے ساتھ صیغہ مخاطب ہے۔

دوسرا مسئلہ: پانچ اقوال

تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ کے محل میں پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: مرفوع ہے اصل میں "أن لا یعبدوا" ہے گویا فرمایا: ہم نے ان سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ عبادت اللہ ہی کی کریں گے پھر ان کو حذف کر کے فعل کو مرفوع کر دیا جیسا کہ طرفہ نے کہا:

ألا أیھذا اللائمی أحضر الوغی وأن أشھد اللذات ھل أنت مخلدی

اصل میں أن احضر ہے اس لیے اس پر أن اشھد کا عطف ہے۔

اور اسے اخفش، فراء، زجاج، قطرب، علی بن عیسیٰ اور ابو مسلم نے جائز رکھا ہے۔

دوسرا قول: یہ جواب قسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ گویا فرمایا: جب ہم نے ان سے قسم لی کہ وہ نہیں عبادت کریں گے، مگر اللہ کی اسی وجہ کو مبرد، کسائی، فراء، زجاج اور ایک قول میں اخفش نے جائز رکھا۔

تیسرا قول: قطرب اسے منصوب، محل حال میں رکھتے ہیں گویا فرمایا: ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے۔

چوتھا قول: فراء کہتے ہیں یہ نہی ہے البتہ لفظاً خبر ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا (پ۲، البقرۃ: ۲۳۳) ماں کو ضرر نہ دیا جائے اس کے بچہ سے

نہی ہونے پر دو امور

یہ مرفوع اور نہی ہے، اس کے نہی ہونے پر یہ امور دلیل ہیں:

۱۔ "اَقِیْمُوْا" امر ہے۔ (مقابل نہی ہے)

۲۔ حضرت عبداللہ اور حضرت اُبی رضی اللہ عنہما کی قرأت "لَا تَعْبُدُوْا" کی بھی تائید حاصل ہے۔

۳۔ صراحۃً امر و نہی کے بجائے خبر کا معنی نہی وامر میں ہونا زیادہ تاکید پیدا کرتا ہے گویا بجا آوری اور رک جانے میں جلدی کی جائے اور اس ذریعہ سے اس کی خبر بن گئی۔

پانچواں قول: عبارت یوں ہے: ان لا تعبدوا، "ان" مع فعل، میثاق سے بدل ہے گویا فرمایا: ہم نے بنی اسرائیل سے توحید کا عہد لیا۔

تیسرا مسئلہ: تمام ضروریاتِ دین کا عہد

یہ عہد تمام ضروریات دین پر دال ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عبادت الٰہی کا حکم اور غیر کی عبادت سے منع فرمایا اور ان دونوں چیزوں سے پہلے ذاتِ باری کا علم بھی لازمی ہے اور کونسی چیز اس کیلئے لازم، جائز اور محال ہے۔ اس کی وحدانیت کا شرکاء اور اضداد سے پاک ہونا، بیوی اور اولاد سے پاک ہونے کا علم بھی ضروری ہے پھر اس بات کا علم کہ عبادت کا طریقہ کیا ہے جو وحی اور رسالت کے علاوہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ تو ارشادِ گرامی "لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ" علم توحید، علم فقہ اور تمام احکام کو شامل ہے اس لیے کہ ان کے بغیر عبادت کا کوئی تصور نہیں

دوسرا حکم: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

فرمایا: وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: **سوال:** یہاں با کا تعلق کس سے اور احسان پر نصب کی کیا حکمت ہے؟

جواب: اس میں تین اقوال ہیں:

۱۔ زجاج کہتے ہیں اصل یوں ہے: أحسنوا بالوالدین احسانًا

۲۔ مفہوم یہ ہے، وصیناھم بالوالدین احسانًا۔ اس صورت میں باء کا اتصال احسن ہے۔ اول صورت میں "أحسنوا الی الوالدین" بھی ہوسکتا ہے۔

۳۔ یہ خبر ہے اور معنی اول پر معطوف ہے یعنی "ان تعبدوا و تحسنوا" (عبادت کرو اور حسن سلوک کرو)

دوسرا مسئلہ: عبادتِ الٰہی کے بعد والدین سے حسنِ سلوک کی حکمتیں

عبادتِ الٰہی کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا ذکر ان وجوہات کی بنا پر ہے:

پہلی حکمت: اللہ تعالیٰ کی بندے پر نعمتیں بہت بڑی ہیں لہٰذا اللہ کا شکر دوسروں سے پہلے ہے، اللہ کی نعمت کے بعد والدین کی نعمت زیادہ عام ہے، اس لیے کہ والدین، اولاد اور اس کے وجود کا سبب اور اصل ہیں جیسا کہ وہ دونوں بطور مربی بھی منعم ہیں۔ غیرِ والدین سے اصل وجود میں انعام نہیں بلکہ فقط تربیت میں ہوتا ہے تو واضح ہوگیا اللہ تعالیٰ کے انعام کے بعد والدین کا انعام سب سے کامل ہے۔

دوسری حکمت: ظاہری موثر کا ذکر

وجودِ انسان کیلئے مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے اور والدین عرف ظاہر کے اعتبار سے مؤثر ہیں، جب مؤثر حقیقی کا ذکر کیا تو عرف ظاہر میں مؤثر کا بھی تذکرہ کر دیا۔

تیسری حکمت: ان کا انعام مشابہ ہے

اللہ تعالیٰ بندے سے اپنے انعام کا معاوضہ ہرگز نہیں مانگتا بلکہ وہ محض انعام ہوتا ہے اور والدین کا معاملہ بھی اسی طرح ہے وہ بھی اولاد سے مال اور ثواب کی طلب بطور معاوضہ نہیں مانگتے اس لیے کہ جو قیامت کے منکر ہیں وہ بھی اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرتے ہیں، اس وجہ سے والدین کا انعام، انعام الٰہی کے مشابہ قرار پاتا ہے۔

چوتھی حکمت: والدین کا کرم منقطع نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ بندوں پر انعام فرمانے میں ملال نہیں کرتا اگرچہ وہ اعظم جرائم کا ارتکاب کریں کیونکہ اس سے اس کی نعمتوں کے مواد اور کرم کی بارشیں منقطع نہیں ہوتیں اسی طرح والدین، اولاد سے نہ ملال کرتے ہیں اور نہ ان سے سخاوت و کرم منقطع کرتے ہیں اگرچہ اولاد کس قدر والدین سے زیادتی کرے۔

فضل قدیر

پانچویں حکمت: اولاد کا نفع

جس طرح مشفق والد اپنی اولاد کے مال میں نفع اور طلب اضافہ کیلئے تصرف کرتا ہے اور اسے نقصان اور گھاٹے سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ طاعت بندہ میں تصرف فرماتے ہوئے اسے ضیاع سے بچاتا ہے پھر اس کے باقی نہ رہنے والے افعال کو ابدالا باد تک باقی بنا دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اُس دانہ کی طرح جس نے اگائیں سات بالیں ہر بال میں سو دانے

(پ۳، البقرۃ:۲۶۱)

چھٹی حکمت: ان کے انعامات قلیل

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگرچہ والدین کے انعام سے اعظم و بڑی ہیں مگر ان کا علم استدلال سے حاصل ہوتا ہے مگر والدین کا انعام بدیہی طور پر ہوتا ہے حالانکہ انعامات الٰہیہ کے اعتبار سے یہ قلیل ہے تو اس جہت سے دونوں میں توازن ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بہر صورت ترجیح ہے اس لیے والدین کے انعامات کو انعاماتِ الٰہی کے بعد لایا گیا۔

تیسرا مسئلہ: کافر والدین کا بھی احترام

اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ والدین کی تعظیم لازم وفرض ہے اگرچہ وہ کافر ہوں، اس پر دلائل یہ ہیں:

۱۔ ارشادِ ربانی "وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا" میں قید نہیں کہ وہ اہلِ ایمان ہوں یا نہ ہوں اور اس لیے بھی کہ اصول فقہ میں ضابطہ ہے جب حکم وصف پر ہو تو وصف علت بنتا ہے تو یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ تعظیم والدین کا حکم محض والدین ہونے کی وجہ سے ہے اور اس میں عموم ہے۔

اسی طرح ارشادِ ربانی:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

(پ۱۵، بنی اسرائیل:۲۳)

اور تمہارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

سے بھی استدلال ہے۔

۲۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا تو ان سے ہُو نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا (پ۱۵، بنی اسرائیل: ۲۳)

ان مبارک الفاظ میں انہیں اذیت نہ دینے میں خوب مبالغہ ہے پھر آگے فرمایا:

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا اور عرض کر کہ اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے بچپن میں پالا (پ۱۵، الاسراء: ۲۴)

یہاں تعظیم کے لازم ہونے کے سبب کا بیان ہے۔

۳۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نقل کیا کہ وہ اپنے اب (چچا) کو کفر سے ایمان کی طرف دعوت کس طرح دیتے تھے۔

يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا اے میرے باپ کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ تیرے کام آئے (پ۱۶، مریم: ۴۲)

آگے سے وہ آپ کو اذیت دیتا اور سخت جواب دیتا تو آپ علیہ السلام خوب برداشت کرتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں یہ ثابت ہے تو اس امت کے حق میں بطریق اولیٰ ثابت ہوگا کیونکہ ارشادِ ربانی ہے

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا پھر ہم نے تمہیں وحی بھیجی کہ دین ابراہیم کی پیروی کرو جو ہر باطل سے الگ تھا (پ۱۴، النحل: ۱۲۳)

چوتھا مسئلہ: احسان میں یہ بھی شامل ہے

ان کے ساتھ احسان یہ ہے کہ انہیں ہرگز اذیت نہ دی جائے اور جس قدر انہیں ضرورت ہو اسے پورا کیا جائے اس میں ایمان کی دعوت بھی شامل ہے اگر وہ کافر ہوں اور اگر وہ فاسق ہوں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی طرف راغب کرنا بھی ذمہ داری ہے۔

تیسرا حکم: رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

ارشادِ ربانی ہے "وَذِي الْقُرْبٰى"۔ یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: قرابت کا ضابطہ

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر زید نے اقارب کیلئے وصیت کی تو اس میں وارث محرم اور غیر محرم دونوں شامل ہوں گے البتہ والد اور بیٹا داخل نہ ہوں گے اس لیے کہ یہ عرفاً اقربا میں شامل نہیں ہاں اس میں احفاد و اجداد شامل ہوں گے، بعض نے کہا:

55/55

اس میں اصول وفروع داخل نہ ہوں گے، بعض نے کہا: تمام شامل وداخل ہوں گے۔

یہاں باریک نکتہ ہے۔عرب اجداد عالیہ کی حفاظت کرتے تھے لہٰذا ان کی نسل، وسعت کی وجہ سے وہ تمام اقارب ہوں گے اگر ہم جد عالی تک جائیں اور اولاد کو شمار کریں تو وہ زیادہ ہوگی اس لیے امام شافعی رضی اللہ عنہ کی نسبت جد اقرب کی طرف ہی معروف ہے اگر چہ وہ کافر ہے، علماء نے مثال یوں دی۔اگر امام شافعی نے اقارب کیلئے وصیت کی تو ہم اسے بنوشافع پر محمول کریں گے تو بنو مطلب اور بنوعبد مناف شامل نہ ہوں گے اگر چہ وہ بھی اقارب ہیں کیونکہ وہ معروف شافع کے ساتھ ہیں نہ کہ عبد مناف کے ساتھ۔

شیخ غزالی نے لکھا، یہ زمانۂ امام شافعی کی بات ہے۔ ہمارے دور میں اس کا حمل صرف اولاد شافعی رضی اللہ عنہ پر ہوگا، بنو شافع بھی شامل نہ ہوں گے اس لیے کہ ہمارے دور میں وہی اقرب ہوں گے جو اقارب معروف ہوں گے۔قرابت اُم، مختار قول پر عجمی کی وصیت میں شامل مگر عربی کی وصیت میں شامل نہ ہوگی اس لیے کہ وہ اسے قرابت نہیں مانتے لیکن اگر اس نے وصیت میں ارحام کا ذکر کیا تو اس میں قرابت اب اور اُم دونوں شامل ہوں گی۔

دوسرا مسئلہ: صلہ رحمی کا مقام

رشتہ دار کا حق، حقِ والدین کے تابع ہے اس لیے کہ انسان انہی کے واسطہ سے رشتہ داروں سے متصل ہوتا ہے تو والدین کا اتصال ان سے مقدم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے والدین سے انہیں مؤخر فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: رحم رحمٰن سے نکلا ہے، روز قیامت عرض کرے گا میرے رب میں نے ظلم کیا۔میں نے اپنے ساتھ برا کیا اور مجھے قطع کر دیا گیا رب اکرم فرمائے گا کیا تو اس پر خوش نہیں میں نے اسے کاٹ دیا جس نے تجھے کاٹا اور تجھ سے ملانے والے کو میں نے ملا دیا پھر یہ آیتِ مبارکہ پڑھی:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (پ۲۶ محمد:۲۲)

تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو

اس حق کی رعایت میں تاکید کا سبب یہ ہے۔قرابت، اتحاد، محبت، رعایت اور نصرت کا محل ہے اگر اس سے یہ حاصل نہ ہو تو دل پر شاق ہوگا۔وحشت، نفرت، تکلیف اور مجبوری میں خوب اضافہ ہوگا۔جس قدر اس میں قوت زیادہ ہوگی اس کا رفع کرنا لازم ہوتا جائے گا اس لیے حقوق اقارب کی نگہداشت لازم قرار دی ہے۔

چوتھا حکم: ارشادِ گرامی ہے "وَالْيَتَامٰى"

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: یتیم کی تعریف

یتیم، بلوغ سے پہلے جس کا والد فوت ہو جائے۔ اس کی جمع ایتام اور یتامیٰ ہے جیسے ندیم، ندامیٰ، ماں فوت ہو جائے تو یتیم نہیں کہتے۔ شیخ زجاج کا کہنا ہے کہ یہ ضابطہ انسان کے بارے میں ہے۔ غیر انسان میں ماں کی وفات پر یتیم کہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ: بچوں سے کام نہیں لیا جا سکتا

یتیم کا حق بھی اقارب کی طرح ہے۔ اس لیے کہ بچہ ہونے کی وجہ سے اس سے نفع نہیں اٹھایا جا سکتا اور کوئی اس کا نگہبان نہیں ہوتا لہٰذا وہ کسی سے نفع میں محتاج ہوتا ہے اور پھر ایسی صورت میں کم ہی کسی کی طرف انسان رغبت کرتا ہے، جب یہ حکم نفس پر سخت ہے تو اب اس کا درجہ بھی دین میں عظیم ہے۔

پانچواں حکم: مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک

فرمایا: "وَالْمَسَاكِيْنِ"۔ اس میں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: لفظ مسکین کا مفہوم

مساکین، واحد مسکین ہے سکون سے ہے گویا فقر نے اسے ساکن کر دیا، اکثر اہلِ لغت کے ہاں مسکین، فقر میں فقیر سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے ان کا استدلال اس ارشادِ ربانی سے ہے

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (پ۳۰، البلد:۱۶) یا خاک نشین مسکین کو

امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں فقیر اس سے زیادہ بد حال ہوتا ہے اس لیے کہ فقیر کا اشتقاق 'فقار الظھر' سے ہے گویا شدت حاجت نے اس کی پشت توڑ دی۔ ابن انباری کا بھی یہی قول ہے اس پر استدلال اس ارشادِ ربانی سے ہے:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (پ۱۶، الکہف:۷۹) وہ جو کشتی تھی وہ کچھ محتاجوں کی تھی کہ دریا میں کام کرتے تھے

انہیں مساکین کہا حالانکہ وہ کشتی کے مالک تھے۔

دوسرا مسئلہ: مسکین کا ذکر موخر کیوں؟

اسے یتامیٰ کے بعد ذکر کیا اس لیے کہ مسکین سے بصورت خدمت، بنسبت یتیم کے زیادہ مخالطت ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ مسکین محنت کر کے اپنی معیشت بہتر کر سکتا ہے لیکن یتیم میں یہ پہلو نہیں لہٰذا یتیم کا ذکر مسکین سے پہلے کیا۔

تیسرا مسئلہ: رشتہ دار اور یتامیٰ کے ساتھ احسان، زکوٰۃ کے علاوہ ہوگا کیونکہ عطف غریت چاہتا ہے۔

چھٹا حکم: ارشادِ ربانی ہے: "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا"

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: شیخ حمزہ اور کسائی کی قرأت حا اور سین پر زبر ہے گویا فرمایا: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ قَوْلاً حَسَنًا (لوگوں سے خوبصورت بات کرو) باقی نے حا پر پیش اور سین ساکن پڑھا اور اس پر دلیل یہ ارشادِ ربانی ذکر کیا۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا (پ۲۰، العنکبوت:۸) اور ہم نے آدمی کو تاکید کی اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کی

دوسرے مقام پر فرمایا:

ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْءٍ (پ۱۴، النحل:۱۱) پھر برائی کے بعد بھلائی سے بدلے

اس کی چند تفاسیر ہیں:

۱۔ اخفش کے نزدیک، حسن والا قول مراد ہے

۲۔ خوبصورت قول جیسے، رجل عدل (آدمی سراپا عدل)

۳ چاہیے تمہارا قول حسن ہو تو یہ بطور مصدر فعل منصوب ہو جس پر کلام اول دال ہے۔

۴۔ یعنی وہ قول جو فی نفسہٖ افراطِ حسن کی وجہ سے حسین ہو۔

دوسرا مسئلہ: اخبار کے بعد "قُوْلُوْا" امر مخاطب کیوں؟

تین وجوہ ہو سکتی ہیں؟

پہلی وجہ: یہ بطور التفات ہو مثلاً باری تعالیٰ کا فرمان ہے

حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (پ۱۱، یونس:۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوں اور وہ اچھی ہوا سے انہیں لے کر چلیں

دوسری وجہ: یہاں حذف ہے یعنی قُلْنَا لَھُمْ قُوْلُوْا (ہم نے ان سے کہا تم کہو)

تیسری وجہ: یثاق کیلئے کلام کا ہونا ضروری ہے گویا فرمایا، میں نے کہا: لَا تَعْبُدُوْا وَقُوْلُوْا (نہ عبادت اللہ کے سوا کسی کی اور کہو)

تیسرا مسئلہ: مخاطب کون ہے؟

۱۔ ممکن ہے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور یہ کہ وہ لوگوں سے اچھی گفتگو کریں گے

۲۔ یہ بھی ممکن ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے غیر اللہ کی عبادت نہ کرنے کا عہد لیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی اُمت سے فرمایا: "قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا"

الفاظ سے دونوں مراد لینا ممکن ہے اگر چہ اول اقرب ہے تا کہ واقعہ ایک ہی رہے جو محاسنِ عادات اور مکارمِ اخلاق کی تمام اقسام پر مشتمل ہے۔

چوتھا مسئلہ: صرف اہلِ ایمان سے

بعض نے کہا: قول حسن صرف اہلِ ایمان کے ساتھ ہے۔ رہے کفار وفساق تو ان کے ساتھ یہ نہیں اس پر دو دلائل دیئے:

پہلی دلیل: ان پر لعنت، مذمت اور ان کے ساتھ جنگ لازم ہے تو اب ان کے ساتھ قول حسن کا کیا معنیٰ؟

دوسری دلیل: ارشادِ ربانی ہے

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ — اللہ پسند نہیں کرتا بری بات کا اعلان کرنا مگر مظلوم سے

(پ۶، النساء:۱۴۸)

تو یہاں مظلوم کیلئے ظالم کی برائی اعلانیہ جائز قرار دی گئی ہے۔

پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ آیت قتال سے یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ بعض نے کہا: منسوخ تو نہیں البتہ اس میں تخصیص آچکی ہے تو اب دو احتمال ہیں۔

۱۔ یہاں تخصیص بحسب مخاطب مراد ہے کہ اہلِ ایمان سے قول حسن کرو۔

۲۔ یہاں تخصیص الفاظ میں ہو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور امر بالمعروف میں کلام حسن سے کام لو۔

تو اول صورت میں تخصیص مخاطب میں ہے نہ کہ خطاب میں اور ثانی میں مخاطب میں نہیں خطاب میں تخصیص ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن علی باقر رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں اس کا عموم ظاہری باقی ہے اور تخصیص کی ضرورت نہیں یہی قول اقویٰ ہے اس پر دلیل یہ ہے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام منصب جلیل پر فائز ہیں انہیں بھی فرعون کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کا حکم ہوا

اسی طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نرمی اور ترکِ سختی کی تعلیم تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ
(پ۱۴، النحل:۱۲۵)
اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ
(پ۷، الانعام:۱۰۸)
اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے

تیسرے مقام پر ہے:

وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا
(پ۱۹، الفرقان:۷۲)
اور جب بے ہودہ پر گزرتے ہیں اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں

چوتھے مقام پر ہے

وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ
(پ۹، الاعراف:۱۹۹)
اور جاہلوں سے منہ پھیرلو

جن لوگوں نے کہا: ان پر لعنت و مذمت لازم ہے لہٰذا ان کے ساتھ قولِ حسن ممکن نہیں۔ جواب یہ ہے کہ ہم نہیں تسلیم کرتے ہمارے اوپر ان کی لعنت و مذمت لازم ہے اس پر دلیل یہ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ
(پ۷، الانعام:۱۰۸)
اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں

اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ لعنت لازم ہے تو یہ تسلیم نہیں کرتے کہ لعنت قولِ حسن نہیں، تفصیل یہ ہے قولِ حسن سے مراد یہ نہیں جسے وہ چاہیں اور وہ اس سے محبت کریں بلکہ مراد یہ ہے اس میں ان کا نفع ہو اور ہم جب ان کی مذمت و لعنت کرتے ہیں تا کہ وہ فعلِ بد سے لوٹ آئیں تو یہ ان کے حق میں نافع ہے لہٰذا لعنت قولِ حسن و نافع ٹھہرا جیسا کہ والد کی سختی حسین و نافع ہوتی ہے کہ اولاد فعلِ بد سے محتاط ہو جاتی ہے۔

اگر یہ بھی تسلیم کرلیں کہ لعنت قولِ حسن نہیں تو ہم یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ لزومِ لعنت لزومِ قولِ حسن کے منافی ہے۔ مثلاً کسی شخص کے ہم پر احسان کی وجہ سے تعظیم کا استحقاق اور اس کی کفر کی وجہ سے تحقیر کے استحقاق میں کوئی منافات نہیں جب صورتِ حال یہ ہے تو اب ان کے ساتھ قولِ حسن کا لزوم کیوں جائز نہیں ہوسکتا؟

ایسے دوسرے لوگ جنہوں نے ارشاد ربانی "لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ" سے استدلال کیا ان کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ کیوں نہیں ہوسکتی کہ ظالم کا حال واضح کیا جائے تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ یہی آپ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی سے مراد ہے فاسق کی برائیاں بیان کروتا کہ لوگ اس سے بچ جائیں۔ (کشف الخفاء:۲۱۵۱)

پانچواں مسئلہ: دعوت میں قول حسن ضروری ہے

محققین لکھتے ہیں لوگوں کے ساتھ گفتگو امور دینی میں ہوگی یا امور دنیوی میں۔ اگر امور دینیہ میں ہو تو اگر ایمان کی دعوت ہوگی تو یہ کافر کے ساتھ ہے اور اگر نیکی کی ہوئی تو فاسق کے ساتھ ہوگی۔ ایمان کی دعوت میں قول حسن ضروری ہے جیسا کہ سیدنا موسیٰ وہارون علیہما السلام سے ارشاد ہوا:

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (پ۱۶، طٰہٰ:۴۴)

تو اس سے نرم بات کہنا اس امید پر کہ وہ دھیان کرے یا کچھ ڈرے

ان کی جلالت اور فرعون کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر، سرکشی اور بغاوت اپنے انتہا کو تھی مگر اس کے باوجود اس کے ساتھ نرمی کا حکم ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا:

وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ (پ۴، آل عمران:۱۵۹)

اور اگر تم تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہوجاتے تو تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو

دعوت فُساق میں بھی قول حسن معتبر ہے، ارشادِ ربانی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (پ۱۴، النحل:۱۲۵)

اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (پ۲۴، فصلت:۳۴)

اے سننے والے برائی کو بھلائی سے ٹال دے جبھی وہ کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی ایسا ہوجائے گا جیسا کہ گہرا دوست

رہے امور دینوی تو ان میں بھی یہاں تک ممکن ہو حصول غرض نرمی سے حاصل کی جائے۔ سختی جائز نہیں تو واضح ہوگیا تمام دین و دنیا کے آداب ارشادِ ربانی "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" کے تحت داخل ہیں۔

چھٹا مسئلہ: زکوٰۃ اور شدید ضرورت

ظاہر آیت نشاندہی کر رہا ہے کہ رشتہ دار، یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ احسان بنی اسرائیل کے دین میں ان پر لازم تھا اور اسی طرح لوگوں کے ساتھ قول حسن بھی۔ کیونکہ اخذ میثاق کی لزوم پر دلالت ہے اور یہ اس لیے کہ ظاہراً امر لزوم کیلئے ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اعراض پر مذمت فرمائی ہے جو مفید لزوم ہے اور ہماری شریعت میں بھی امر بعض صورتوں میں وجوب کیلئے ہوتا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے زکوٰۃ نے دیگر حق کو منسوخ کر دیا ہے لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ تمام امت کا اتفاق ہے کہ اگر ہم کسی کی شدید ضرورت دیکھیں تو ہم پر صدقہ لازم ہوگا اگرچہ زکوٰۃ ہم پر نہ ہو حتیٰ کہ اگر زکوٰۃ سے لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو صدقہ لازم ہوگا اور لوگوں سے اسی طرح مکالمہ کرنا لازم ہے جس سے انہیں ضرر اور سختی نہ ہو۔

ساتواں اور آٹھواں حکم

ارشادِ ربانی ہے: "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" ان دونوں کی تفسیر گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب اس کی تفصیل بیان کی کہ ان سے آٹھ احکام کے بارے میں عہد لیا گیا اور انعامات کے ساتھ اخذ عہد اس لیے تھا کہ یہ قبول کر کے اپنے رب کے ہاں منزلت عظمیٰ پا سکیں، انہوں نے اعراض برتا اور اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہوئے تاکیدی دلائل اور وعدوں کے باوجود اپنے رب کی نعمت کو قبول نہ کیا۔ یہ چیز ان کے اعراض اور منہ پھیرنے میں قباحت میں اضافہ کر رہی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت انتہائی تفصیل وعید کے بعد کرنا، اس مخالفت سے بدتر ہے جو جہالت کی بنا پر ہو۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ سے کون مراد ہے؟

تین آراء ہیں:

۱۔ سابقہ بنی اسرائیل۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات میں موجود یہود یعنی تم نے بھی ظہور معجزات کے بعد اپنے پچھلوں کی طرح اعراض کیا۔

۳۔ اس سے سابقہ یہود اور اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ سے موجودہ مراد ہیں۔

قول اول کی دلیل یہ ہے کہ جب کلام اول میں سابقہ مراد ہیں تو آخر کلام سے بھی وہی مراد ہوں گے بشرطیکہ کوئی اس سے مانع نہ ہو، تو پہلے اللہ تعالیٰ نے اقامت دلائل کے ساتھ انعامات کا اظہار فرمایا پھر واضح کیا کہ انہوں نے اعراض برتا ہاں بہت قلیل نے استقامت اختیار کی۔

قول ثانی کی دلیل یہ ہے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ خطاب ہے جو حاضرین کے زیادہ مناسب ہے اور سابقہ حکایت تھی جو پچھلوں کے مناسب ہے گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے عہد اور وعدے جیسے ان پر لازم تھے تم پر بھی لازم ہیں کیونکہ تم تورات کے حوالے سے حضور ﷺ کے احوال اور صحت نبوت کو جانتے ہو تو تم پر وہ حجت ہوں گے جیسے کہ وہ پہلوں پر تھے اس کے باوجود تم نے منہ پھیرتے ہوئے اعراض کیا۔ البتہ بہت ہی تھوڑے تھے جو ایمان و اسلام لائے تو اس قول کا بھی احتمال ہے۔

تیسرے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر انعامات کا تذکرہ کیا اور انہوں نے اس سے اعراض کیا تو یہ ان کا انتہائی گھٹیا فعل تھا لہٰذا "أَنْتُمْ مُعْرِضُونَ" سے حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں موجود یہود مخاطب ہیں کہ تم بمنزل ان سابقہ لوگوں کے ہو جنہوں نے اتنے وعدوں کے باوجود اعراض کیا اور تم نے صدق محمد ﷺ پر دلائل سے آگاہ ہونے کے باوجود ان سے اعراض و کفر کیا تو تم اس اعراض میں ان پچھلوں کی طرح ہی ہو۔ واللہ اعلم

[۸۴] وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿۸۴﴾

(اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو)

انعامات کی ایک اور قسم کا تذکرہ

یہ آیت مبارکہ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ایک اور قسم پر دلیل ہے وہ یہ کہ اس نے انہیں اس کا پابند بنایا انہوں نے اسی کی صحت کا اقرار کیا مگر اس کی مخالفت کی۔ ارشادِ مبارک "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ" میں یہ اقوال ہیں:

۱۔ یہ عہدِ نبوی ﷺ کے علماء یہود سے خطاب ہے۔

۲۔ یہ ان کے اسلاف سے خطاب ہے یعنی جب ہم نے تمہارے آباء سے عہد لیا۔

۳۔ یہ خطاب اسلاف کیلئے ہے اور اخلاف کیلئے زجر ہے مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہیں حکم دیا اور اسے پختہ کیا، تم نے قبول کرتے ہوئے اس کے لزوم و وجوب کا اقرار کیا۔

سوال: ارشادِ ربانی "لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ" یہاں اشکال ہے انسان تو مجبوراً اپنے نفس کو قتل نہیں کرتا جب معاملہ ایسا ہے تو اس

سے منع کا کیا فائدہ؟

جواب:

ا۔ یہ مجبوری بدل جاتی ہے جیسا کہ اہلِ ہندوستان کہتے ہیں کہ انسان خودکشی کے ذریعے عالم فساد سے خلاصی پا کر عالم نور وآرام میں چلا جاتا ہے یا بہت سے ایسے لوگ جن پر زمانہ تنگ ہو جائے اور وہ بوجھ برداشت نہ کر سکیں تو وہ خودکشی کر جاتے ہیں تو جب انسان کے اپنے آپ کو قتل نہ کرنے کی نفی ہے تو یہ اس حکم کا مکلف بن سکتا ہے۔

۲۔ مراد یہ ہے ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، دوسرے کو نسب و دین میں اتصال کی وجہ سے نفس قرار دے دیا جیسا کہ فرمان ہے: فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنے آپ کو قتل کرو)

۳۔ جب کسی نے دوسرے کو قتل کیا تو گویا اس نے اپنے آپ کو قتل کیا کیونکہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔

۴۔ جو تمہیں قتل کرے اس سے مقاتلہ نہ کرو ورنہ تم اپنے آپ کو قتل کرو گے۔

۵۔ مصالح دنیا کی خاطر اپنے ہم قوم کو قتل نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

ارشادِ ربانی "وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ" کی دو تفاسیر ہو سکتی ہیں۔

ا۔ ایسے کام نہ کرو جس سے تم وطن سے نکالے جانے کے مستحق ٹھہرو۔

۲۔ ایک دوسرے کو نہ نکالو کیونکہ اس میں مشقت اور شدت، ہلاکت کے قریب ہے۔

ارشادِ مبارک "ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" کی چند تفاسیر ہیں:

ا۔ یہ اقویٰ ہے کہ تم نے میثاق کا اقرار کیا اور اپنے پر لزوم کا اعتراف کرتے ہوئے تم گواہ بنے جیسے محاورہ ہے: فلان مقر علی نفسه (یعنی وہ نفس پر شاہد بنا)

۲۔ تم نے قبولیت کا اعتراف کیا اور تم ایک دوسرے پر گواہ بنے اور ان کے ہاں شائع و معروف تھا۔

۳۔ اے یہود آج تم گواہ ہو کہ تمہارے اسلاف نے میثاق کو قبول کیا تھا۔

۴۔ اقرار، کسی امر پر راضی اور اس پر صبر ہے مثلاً کہا جاتا ہے فلان لا یقر علی الضیم۔ مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو اس پر راضی ہوتے ہوئے قائم ہوئے اور تم اس کے لزوم وصحت پر گواہ بنے۔

سوال: "اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" کیوں فرمایا: حالانکہ معنی ایک ہی ہے؟

جواب: اس میں تین اقوال ہیں:

ا۔ تمہارے اسلاف نے اقرار کیا تو تم تو اب ان کے اقرار پر گواہ ہو۔

۲۔ بوقت میثاق تم نے اقرار کیا اور اس کے بعد تم گواہ ہو۔

۳۔ یہاں تاکید مقصود ہے۔

[۸۵] ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

(پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو ان پر مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہو اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو تو جو تم میں ایسا کرے اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رُسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں)

حاضر، غائب کیسے؟

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ۔ یہاں اشکال ہے۔ اَنْتُمْ حاضر جبکہ ھٰؤلاء غائب کیلئے ہے تو حاضر، غائب کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب متعدد ہیں

۱۔ مقدر عبادت یوں ہے ثُمَّ اَنْتُمْ یَا ھٰؤُلَاء

۲۔ ثُمَّ اَنْتُمْ أعني ھٰؤلاء الحاضرين

۳۔ ھٰؤلاء بمعنی الذین ہے اور تقتلون صلہ ہے۔ محل رفع میں ہے اگر یہ خبر ہو اور اگر صلہ ہو تو پھر محل اعراب نہیں ہوگا۔ شیخ زجاج کہتے ہیں اس ارشادِ ربانی میں بھی صلہ اسی طرح ہے وما تلك بيمينك يموسى یعنی وما تلك التي بيمينك۔

۴۔ ھٰؤلَاء، اَنْتُمْ کی تاکید اور تقتلون خبر ہے۔

ارشادِ ربانی "تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ" میں متعدد تفاسیر پہلے گزریں، اصح یہ ہے کہ تم نے ایک دوسرے کو قتل کیا اور اسے قتل نفس کہا جاتا ہے کہ یہ تمام نفس واحد کی مانند تھے اور دیار سے نکالنے سے کیا مراد ہے اس پر گفتگو آچکی ہے۔

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: شیخ حمزہ، عاصم اور کسائی کی قرأت ظا مخفف سے اور باقی اسے مشدد پڑھتے ہیں۔ وجہ تخفیف ایک تاء کا حذف ہے جیسے وَلَا تَعَاوَنُوْا تشدید کی وجہ تاء کا ظاء میں ادغام ہے۔ جیسے اِثَّاقَلْتُمْ، حذف اخف اور ادغام اصل پر زیادہ شاہد ہے۔

دوسرا مسئلہ: تظاہر، تعاون، دیار سے نکالنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا عظیم فتنہ کا سبب ہے اور اس میں غلبہ اور اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ انہوں نے ظلم و زیادتی میں دوسروں کی مدد کرتے ہوئے ایسا کیا۔

تیسرا مسئلہ: آیت واضح کر رہی ہے کہ جس طرح ظلم حرام ہے اسی طرح ظلم کی اعانت بھی حرام ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ ظالم کو ظلم پر قدرت دے کر تمام موانع اور رکاوٹیں دور فرما کر اور ظالم کے دل میں ظلم کی خواہشیں مسلط نہیں کر دیتا؟ تو گویا اس نے ظلم پر اعانت کی اگر اس پر اعانت قبیح ہوتی تو لازم ہے اس کا صدور اللہ تعالیٰ سے نہ ہو۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ظالم کو قدرت دی ہے مگر اس نے ظلم سے منع کیا اور اس پر زجر و تہدید فرمائی ہے بخلاف ظالم کے معاون کے وہ تو ظلم پر رغبت دلاتا ہے اور اسے حسین بنا کر پیش کر کے اس کی دعوت دیتا ہے لہٰذا فرق واضح ہو گیا۔

چوتھا مسئلہ: آیت کی اس پر دلالت نہیں کہ معاون کا گناہ، مرتکب کے برابر ہوتا ہے بلکہ دلیل بتاتی ہے کہ اس کا گناہ کم ہے اس لیے کہ اگر اعانت بغیر مرتکب کے حاصل ہو جائے تو اس کا حصولِ ظلم میں اثر ہی نہ ہو گا اور اگر ارتکاب بغیر اعانت کے ہو تو ضرور ظلم حاصل ہو گا تو واضح ہو جاتا کہ ارتکاب کی حرمت، اعانت سے زیادہ ہے۔

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: امام نافع، عاصم اور کسائی نے دونوں میں الف پڑھا اور شیخ حمزہ نے بغیر الف کے باقی نے اساریٰ میں الف اور تفدوھم کو بغیر الف پڑھا۔ اُسارٰی، اسیر کی جمع ہے جیسے جریح، جرحیٰ، اسارٰی میں دو اقوال ہیں:

۱۔ اسریٰ کی جمع ہے جیسے سکریٰ، سکاریٰ۔

۲۔ اسیر کی جمع ہے شیخ ابو عمرو نے اسریٰ اور اسارٰی میں فرق کرتے ہوئے کہا: اسارٰی بیڑیوں والے اور اسریٰ ہتھکڑیوں والے

ہوتے ہیں گویا اسارٰی میں مبالغہ ہے، ثعلب نے اس کا انکار کیا۔ علی بن عیسیٰ نے کہا: اساریٰ، الف کے ساتھ مختار ہے کیونکہ اکثر ائمہ اسی پر ہیں، دوسرا یہ جمع پر زیادہ دال ہے کیونکہ اس میں کثرت ہے اور واحد میں قلیل ہے مثلاً شکاعی تیسرے یہ کہ یہ اہلِ حجاز کی لغت ہے۔

دوسرا مسئلہ: تفدوھم، تفادوھم دونوں طرح معروف ہے۔ تُفْدُوْھُم ، فدا سے ہے، کسی شی کی حفاظت کا عوض فداہ فدیۃ تفادوھم، تفاداۃ سے ہے۔

تیسرا مسئلہ: جمہور مفسرین کہتے ہیں یہ ان کی طاعت والا وصف ہے کہ مال وغیرہ دے کر قیدی چھڑاتے ہیں۔

شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ضد ذکر کی ہے، مراد یہ ہے کہ تم قتل واخراج کے ساتھ ساتھ اگر قیدی تمہارے ہاتھ آجائے تو تم مال کے بغیر راضی نہیں ہوتے اگرچہ وہ تم پر حرام ہو اور پھر تم اسے چھوڑتے ہو، شیخ ابو مسلم کہتے ہیں مفسرین نے یہ بات اس ارشاد گرامی کی وجہ سے کہی ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ — تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو

لیکن یہ ضعیف ہے اس لیے کہ یہ تو سابقہ ذکر نبوی اور آپ پر نازل شدہ کلام کے بارے میں ہے اور مراد یہ ہے کہ جب تمہاری کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خبر موجود ہے اور تم اس کا انکار کر رہے ہو تو تم بعض کتاب پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کر رہے ہو۔ لفظ ''فدیہ ادا کرنے'' میں دونوں اقوال کا احتمال ہے اس لیے کہ اسیر کی طرف سے خرچ کرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے اس نے فدیہ دیا اور چھوڑنے کیلئے اس سے فدیہ لینے والے کو بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مفسرین کی اجماعی بات اقرب ہے اس لیے کہ ''اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ'' سے اسی آیت میں مذکورہ شی کا مراد لینا اس سے اولیٰ ہے کہ سابقہ مراد لیا جائے۔

چوتھا مسئلہ: بعض نے کہا: نکالنے والے اور فدیہ دینے والے فریق واحد ہی ہے کیونکہ قریظہ اور نضیر بھائی تھے جیسے اوس اور خزرج، افتراق کی وجہ سے نضیر، خزرج کے اور قریظہ، اوس کے ساتھ ہو گئے ہر فریق اپنے حلیفوں کے ساتھ جنگ کرتا۔ جب غالب آتے تو شہروں کو برباد کرتے اور وہاں کے باشندوں کو نکال دیتے، جب دونوں فریقوں کا آدمی قید ہو جاتا اکٹھے اس کے فدیہ دیتے رب نے انہیں شرم دلائی کہ تم خود ان سے لڑتے ہو پھر ان کا فدیہ بھی دیتے ہو تو کہنے لگے ہمیں فدیہ کا حکم ہے اور قتال ہم پر حرام ہے لیکن ہم اپنے حلیف کو کمزور کرنے میں حیا کرتے ہیں۔

نضل قدیر

دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ نکالنے والے فدیہ نہیں دیتے تھے بلکہ دوسرے لوگ تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔

وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ کی تفسیر

هُوَ، میں دو اقوال ہیں:

۱۔ یہ ضمیر قصہ وشان ہو یعنی واقعہ یہ ہے کہ تم پر ان کا نکالنا حرام تھا۔

۲۔ یہ اخراج کی طرف راجع ہے بطور تاکید تکرار ہوا ہے اس لیے کہ دونوں کے درمیان فاصلہ آگیا تھا اب یہ مرفوع ہے گویا فرمایا: ان کا نکالنا تم پر حرام تھا تو پھر اس کی وضاحت کیلئے اخراج کا ذکر کیا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کی تفسیر

اس بارے میں علماء کی دو آراء ہیں:

۱۔ ان کا نکالنا کفر اور فدیہ دینا ایمان ہے یہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے فدیہ پر ان کی مذمت نہیں بلکہ تضاد پر ہے کیونکہ بعض فرائض نبھاتے اور بعض ترک کر دیتے اور تضاد مذمت پر زیادہ دال ہے۔

سوال: ہم تسلیم کرتے ہیں نکالنا معصیت ہے لیکن اسے کفر کیوں قرار دیا حالانکہ عاصی کافر نہیں ہوتا؟

جواب: ممکن ہے وہ یہ کہتے ہوں کہ اخراج غیر لازم ہے حالانکہ تورات میں لزوم کی تصریح ہے۔

۲۔ اس پر تنبیہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت مانتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں حالانکہ حجت دونوں جگہ ایک ہی ہے تو یہ اپنے اسلاف کے پیچھے چلے بعض پر ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا اور میثاق میں تمام برابر ہیں۔

اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر

خزی، اصل میں ذلت وغضب ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو دھتکار دے اور ناراض ہو جائے تو کہا جاتا ہے اخزا اللہ، بعض نے کہا: اس کا اصل معنی حیا کرنا ہے جب ''اخزا اللہ'' کہا جاتا ہے تو مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی جگہ ڈال دیا جس سے حیا کی جائے الغرض اس سے ذم عظیم مراد ہے۔

یہاں مراد کیا ہے؟

اس میں مختلف اقوال ہیں:

۱۔ حضرت حسن کہتے ہیں یہاں جزیہ دینا اور حقیر ہونا مراد ہے یہ ضعیف ہے کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں کہ ان کی شریعت میں

جزیہ تھا بلکہ اگر ہم آیت سے حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے لوگ مراد لیں تو یہ قول صحیح ہوگا اس لیے کہ اہلِ ذمہ کو جو ذلتیں ملیں ان میں جزیہ لینا بھی ہے۔

۲۔ بنو نضیر کا ان کے علاقوں سے نکالنا اور بنو قریظہ کا قتل اور ان کی اولاد کی گرفتاری مراد ہے یہ قول تب صحیح ہوگا جب ہم آیت کو حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے یہود پر محمول کریں۔

۳۔ یہ قول اولیٰ ہے کہ بغیر کسی تخصیص مذکور کے ذم عظیم اور تحقیر بلیغ مراد ہے "خِزْیٌ" کی تنکیر واضح کر رہی ہے کہ مذمت انتہائی درجہ کی ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ کی تفسیر

سوال: دہریہ جو منکر خدا ہیں لازم ہے ان پر عذاب یہود سے زیادہ ہو تو یہود کے بارے میں یہ کیسے فرمایا کہ انہیں سب سے زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا؟

جواب: مراد یہ ہے کہ دنیا میں حاصل ذلت اشد ہوگی اگرچہ لفظ اشد مطلق ہے مگر مراد اس جہت سے ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: امام ابنِ کثیر، نافع اور عاصم نے تا خطاب سے اور باقی نے یا کے ساتھ پڑھا۔ پہلے قول کی دلیل اول کلام "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" ہے دوسرے کی دلیل آخر کلام "يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ" ہے۔

مختار قول (تاء) مخاطب ہے کیونکہ یہ اکثریت کا قول ہے اور اس لیے بھی کہ مفہوم پر زیادہ واضح دال ہے اس لیے کہ جب غیب اور خطاب جمع ہوں تو خطاب کو غلبہ ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ: ارشادِ ربانی "وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" معصیت پر تہدید شدید، زجر عظیم اور طاعت پر بشارت عظیم ہے اس لیے کہ غفلت باری تعالیٰ پر محال ہے اور وہ تمام سے بڑھ کر قادر بھی ہے تو بہر صورت مستحقین کو ان کے حقوق ضرور ملیں گے۔

[۸۶] أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۸۶﴾

(یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی تو نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ان کی مدد کی جائے)

لذت دنیا و آخرت کا اجتماع محال

حصول لذات دنیا ولذات آخرت کا اجتماع محال و ناممکن ہے، اللہ تعالیٰ نے آدمی کو اختیار دیا ہے وہ ان سے جسے چاہے حاصل کرلے جب وہ ایک کے حصول میں لگے گا تو دوسرا اس نے اپنے لیے ختم کردیا۔ یہود نے اپنی کتب کی تعلیمات سے اعراض کر کے کفر و لذات دنیا کو حاصل کیا اسے اللہ تعالیٰ نے بیع وشرا قرار دیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی انتہائی مذمت ہے اس لیے کہ خرید و فروخت میں غبن کرنے والا دنیا میں مذموم ہوتا ہے حتیٰ کہ اسے لوگ بے وقوف کہتے ہیں تو جو متاعِ دنیا کی خاطر آخرت کا سودا کردے وہ بطریق اولیٰ مذموم ٹھہرے گا۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: فَلَا يُخَفَّفُ کی فاء میں دو اقوال ہیں:

۱۔ یہ اِشْتَرَوُا پر عطف کیلئے ہے۔

۲۔ جواب امر کی بنا پر ہے مثلاً أُولَٰئِكَ الضلال فلا خیر فیھم۔

پہلا قول مختار ہے اس لیے کہ عبارت مقدر کی حاجت نہیں پڑتی۔

دوسرا مسئلہ: بعض نے تخفیف کا معنی کیا کہ عذاب منقطع نہ ہوگا بلکہ دائمی ہوگا اس لیے کہ انقطاع کی صورت میں تخفیف ہوگی دیگر نے اس سے شدت مراد لی ہے نہ کہ دوام، اولیٰ یہ کہنا ہے کہ عذاب میں کبھی تخفیف، انقطاع سے آتی ہے اور کبھی کمی سے تمام اوقات میں یا بعض میں، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی تو یہاں ان تمام صورتوں کی نفی ہوگی۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ کی تفسیر

اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ اکثر نے اس سے آخرت میں مدد کی نفی مراد لی ہے یعنی کوئی ان سے عذاب نہ دور کر سکے گا اور نہ عذاب دینے والے کے خلاف ان کی کوئی مدد کرے گا۔

۲۔ بعض نے دنیوی مدد کی نفی مراد لی ہے۔ اول قول اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے اعمال پر بطور جزا بیان کیا ہے۔ فرمایا: فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ اور یہ جزا آخرت کے ہی مناسب ہے اس لیے کہ عذاب دنیا اگرچہ ہے لیکن وہ برائی کے مرتکب پر قیام حدود کی طرح ہوگا اور اس لیے بھی کہ بعض اوقات کافر اہلِ ایمان پر غالب بھی آ جاتے ہیں۔

[۸۷] وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

(اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی جس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا کیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو)

ایک اور نوع کا تذکرہ

یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ایک اور نوع کا ذکر ہے جس کا جواب انہوں نے کفر اور اعمال قبیحہ سے دیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: یہ قتل نفوس اور اخراج میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کا طریقہ دنیا کو آخرت کے عوض بیچ دینا ہے، اس آیت میں ان کی ایک اور برائی بیان کی، کتاب سے مراد تورات ہے، جو بیک وقت نازل ہوئی تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے جب تورات نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے کا حکم

دیا تو نہ اٹھا سکے تو اللہ تعالیٰ نے ہر حرف کے عوض فرشتہ بھیجا لیکن وہ بھی اسے نہ اٹھا سکے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسے ہلکا کر دیا تو انہوں نے اٹھالیا۔

وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: قَفَّيْنَا (ہم نے پیچھے بھیجا ان کے بعد) یہ الشئ یأتی فی قفا الشئ (ایک شی کا دوسری کے بعد آنا) سے ماخوذ ہے۔ أی بعد نحو ذنبه من الذنب، اس کی نظیر پر ارشادِ باری ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرٰی (پ ۱۸، المؤمنون: ۴۴) پھر ہم نے اپنے رسول بھیجے ایک پیچھے دوسرا

دوسرا مسئلہ: روایات میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مسلسل پے در پے رسول آتے رہے اور ایک بعد دوسرے آجاتے اور شریعت ایک ہی تھی البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئی شریعت لائے اس قول کی صحت پر اس آیت سے استدلال ہے "وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ" کہ اس کا تقاضا ہے کہ شریعت واحد پر ہوں اور اس میں وہ ایک دوسرے کے تابع ہوں۔

قاضی کہتے ہیں: رسول ثانی، رسول اول کی شریعت پر نہیں ہوسکتا۔ حتیٰ کہ وہ اس شریعت کو بغیر اضافہ اور نقصان کے بعینہٖ نہیں پاتا باوجودیکہ وہ شریعت محفوظ ہوتی ہے اور اول سے تواتر کے ساتھ اس کی معرفت ممکن ہوتی ہے جب رسول کا یہ مقام ہے تو ممکن نہیں کہ وہ پہلے جانی گئی چیز ہی کا علم رکھتا ہو اور اس کے علم میں اضافہ نہ ہو۔

تو جس طرح یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر شریعت کے رسول مبعوث کر دیے عقلی دلائل اس پر واضح ہیں اسی طرح زیر بحث مسئلہ کا معاملہ بھی ہے تو ثابت ہوا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو رسول آئے وہ شریعت جدیدہ لے کر آئے اگرچہ سابقہ شریعت محفوظ تھی یا اس میں جو چیزیں مٹ گئی تھیں انہیں وہ زندہ کر دیتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یوں کیوں نہیں ہوسکتا کہ ان رسولان کرام کی بعثت کا مقصد سابقہ شریعت کی اُمت پر تنفیذ ہو یا لطف ومہربانی کی کوئی اور نوع وصورت مقصود ہو جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

الغرض قاضی نے بطور دلیل، دعویٰ ہی ذکر کر دیا انہوں نے یہ کیوں کہا کہ رسل کی بعثت شریعت جدیدہ یا مٹی ہوئی شریعت کے زندہ کرنے کیلئے ہوتی ہے حالانکہ اسی میں تو نزاع تھا۔

تیسرا مسئلہ: وہ رُسل کرام یہ ہیں۔حضرت یوشع،حضرت شمویل،حضرت شمعون،حضرت داؤد،حضرت سلیمان،حضرت شعیاء، حضرت ارمیا،حضرت عزیر،حضرت حزقیل،حضرت یسع،حضرت یونس،حضرت زکریا و حضرت یحییٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ کی تفسیر

یہاں متعدد مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اجمالاً رسول کا ذکر کیا پھر ذکر عیسیٰ سے تفصیل فرمائی اس لیے کہ ان سے پہلے رسل شریعت موسوی لے کر آئے اور وہ تمام اس شریعت کے تابع تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ یوں نہیں کیونکہ ان کی شریعت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اکثر شریعت کو منسوخ کر دیا۔

دوسرا مسئلہ: عیسیٰ کا معنی سریانی میں ایشوع اور مریم کا معنیٰ خادم ہے،بعض نے کہا عبرانی میں مریم کا معنی خاتون جیسے زیر کا معنی مرد کے ہیں۔

رؤبہ کے قول کی یہی تفسیر ہے۔

قلت لزير لم تصله مريمة

تیسرا مسئلہ: بَیِّنَات کی تفاسیر

بینات، کی متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنھما سے ہے مراد معجزات ہیں مثلاً مردے زندہ کرنا وغیرہ۔

۲۔ اس سے مراد انجیل ہے۔

۳۔ اقویٰ یہ ہے تمام اس میں داخل ہیں اس لیے کہ معجزہ صحتِ نبوت پر شاہد ہوتا ہے جس طرح انجیل نے کیفیت شریعت بیان کی ہے لہٰذا تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں

پہلا مسئلہ: ابنِ کثیر نے القدس کو مخفف پڑھا۔باقی نے شد جیسے رعُب، رعْب۔

فضل قدیر

دوسرا مسئلہ: جبریل کو روح کہنے کی حکمتیں

روح کے بارے میں اختلاف ہے:

۱۔ حضرت جبریل علیہ السلام۔ یہ نام کیوں؟ اس کی متعدد وجہیں بیان ہوئی ہیں:

۱۔ اس سے مراد روح مقدسہ ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے حاتم جود، رجل صدق، حضرت جبریل کو اللہ تعالیٰ کے ہاں جو بلند مرتبہ حاصل ہے اس کے بیان و شرف کی بنا پر ان کا یہ نام ہے

۲۔ جس طرح روح کی وجہ سے بدن زندہ ہے اسی طرح حضرت جبریل امین علیہ السلام کی وجہ سے دین زندہ ہے یہی وہ فرشتہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام پر وحی لے کر آئے۔

۳۔ ان پر بلکہ تمام ملائکہ پر روحانیت کا غلبہ ہے البتہ ان کی روحانیت اتم اور اکمل ہے۔

۴۔ کیونکہ ان کے لئے مردوں کی پشتیں اور ماؤں کے ارحام کا اتصال نہیں ہوا۔

۲۔ روح القدس سے مراد انجیل ہے جیسا کہ قرآن میں ہے "رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا"۔ اسے یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انجیل کے ذریعے دین زندہ ہوا اور اس کی وجہ سے مصالح دنیا منظم ہوئے۔

۳۔ حضرت ابنِ عباس اور حضرت سعید بن جبیر سے ہے اس سے مراد وہ نام ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ فرمایا کرتے۔

۴۔ روح جو ان کے اندر پھونکی گئی اور قدس، ذات الٰہی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو اپنی طرف تعظیم و شان کی وجہ سے منسوب فرمایا۔ جیسے کہا جاتا ہے "بیت اللہ، ناقۃ اللہ، حضرت ربیع کہتے ہیں تو اب روح سے مراد روح انسانی ہے۔ واضح رہے روح کا اطلاق حضرت جبریل، انجیل اور اسمِ اعظم پر مجازاً ہے۔ اس لیے کہ روح انسان کے اعضاء اور منافذ میں چلنے والی ہوا ہے اور مذکور تینوں یہ نہیں البتہ روح کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے یہ اطلاق ہے۔ جس طرح روح سبب حیات ہے اسی طرح حضرت جبریل علیہ السلام علوم کے ذریعے حیاتِ قلوب کا سبب ہیں۔ انجیل ظہور شریعت اور اس کی حیات کا سبب ہے۔ اسمِ اعظم متعدد مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے البتہ روح اور جبریل کے درمیان ان دلائل کی وجہ سے مشابہت کاملہ ہے۔

۱۔ حضرت جبریل علیہ السلام ہوا نورانی لطیف سے پیدا ہوئے تو مشابہت تام ہوئی تو اسمِ روح کا اطلاق حضرت جبریل علیہ السلام پر اولیٰ ہوگا۔

۲۔ دوسروں کی نسبت ان میں وجہ زیادہ ظاہر ہے۔

۳۔ الفاظ مبارک "وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" (ہم نے تقویت دی روح القدس کے ذریعے)۔اس تقویت سے مراد اعانت ہے اور اس کی نسبت حضرت جبریل کی طرف حقیقی اور انجیل واسم اعظم کی طرف مجازی ہے لہٰذا حضرت جبریل پر اطلاق اولیٰ ہوگا۔

۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت جبریل کا اختصاص بھی اسی کی تائید وتاکید کرتا ہے کیونکہ ان کے علاوہ یہ چیز کسی نبی میں نہیں۔انہوں نے ہی حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو ولادت کی خبر دی اور یہ جبریل کی پھونک سے ہی پیدا ہوئے، انہوں نے ان کی تمام احوال میں تربیت کی۔ان کے ساتھ ہی رہتے حتیٰ کہ ان کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر تشریف لے گئے۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ کی تفسیر

یہ ان کی انتہائی مذمت ہے۔بنی اسرائیل کے یہود کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا اور اس نے ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف بات کی تو انہوں نے ان کی تکذیب کی اور اگر ممکن ہوا تو انہیں شہید کر دیا یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ دنیاوی چودھراہٹ، حصول لذات دنیا، عوام پر ظلم اور ان سے ناجائز مال حاصل کرتے تھے۔حضرات انبیاء کرام، اسے غلط قرار دیتے تو اسی وجہ سے یہ ان کی تکذیب کرتے اور عوام کو مغالطہ دیتے ہوئے کہتے یہ جھوٹے ہیں اور اس میں تحریف اور غلط تاویلات کا سہارا لیتے، ان میں سے بعض حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قدر تکبر سے پیش آتے جیسے ابلیس، سیدنا آدم علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ کی تفسیر

سوال: یہ نہ فرمایا: "وَفَرِيْقًا قَتَلْتُمْ"؟

جواب:

۱۔ حالِ ماضی مراد لیا کیونکہ معاملہ نہایت ہی گھٹیا وقبیح ہے تو نفوس میں اس کا استحضار اور دلوں میں اس تصویر کو سامنے لانا مقصود ہے۔

۲۔ تم نے اس کے بعد شہید کیے اس لیے کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر میں نے انہیں محفوظ رکھا اس لیے تم نے ان پر جادو کیا، بکری کے گوشت میں زہر ملایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے وقت فرمایا: خیبر کا زہر آلود لقمہ بار بار مجھے تکلیف دے رہا ہے اب اس نے میرا جگر کاٹ دیا۔ واللہ اعلم۔

(البخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

[۸۸] وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

(اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں)

غُلف میں تین اقوال

غُلف میں تین اقوال ہیں:

۱۔ یہ اغلف" کی جمع ہے جو غلاف میں ہو، ہمارے دل ایسے پردوں میں ہیں جو تمہاری دعوت کے اثرات کو ان تک نہیں پہنچنے دیتے

۲۔ شیخ اصم نے بعض سے نقل کیا، ہمارے دل علم کے غلاف اور حکمت سے مالا مال ہیں اس لیے ہمیں شریعتِ محمدی صلی اللہ علیٰ صاحبھا کی ضرورت ہی نہیں۔

۳۔ ہمارے دل خالی غلاف کی طرح ہیں ان میں کوئی ایسی شئی نہیں جو تمہارے اقوال کی صحت پر دال ہو۔

معتزلہ نے وجہِ اول اختیار کی ہے اور دلیل یہ دی کہ یہ آیت اس پر دال ہے کفار کے دلوں میں ایسی کوئی شئی نہیں جس کی وجہ سے ایمان ممکن ہو نہ غلاف اور نہ رکاوٹ جیسے جبریہ کا قول ہے، اگر ایسا ہوتا تو یہود اپنے اسی قول میں سچے قرار پاتے اور اللہ تعالیٰ "بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ" کے الفاظ سے ان کی تکذیب نہ فرماتا اس لیے کہ اللہ باطل اور جھوٹے کی مذمت فرماتا ہے نہ کہ سچے معذور کی، یہاں سے اُن آیات کا معنی بھی واضح ہو گیا، ارشاد مبارک ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (پ۱۵، الکہف:۵۷)

ہم نے ان کے دلوں پر غلاف کر دیے ہیں کہ قرآن نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِىَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (پ۲۲، یٰسین ۹،۸)

ہم نے ان کی گردنوں میں طوق کر دیے ہیں کہ وہ ٹھوڑیوں تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے دیوار بنادی اور ان کے پیچھے ایک دیوار بنادی اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور انہیں اوپر سے ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا

یہاں یہ مراد نہیں کہ ان پر ایمان ممنوع تھا بلکہ مراد الطاف کا ممنوع ہونا ہے یا کفر پر ان کے اصرار کی کفر پر یہود کے ساتھ تشبیہ ہے اور اس کی نظیر یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ کے ساتھ یہود کی مذمت کی ہے انہی کے ساتھ کفار کی مذمت کی ارشاد فرمایا:

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ

اور بولے ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اور ہمارے کانوں میں روئی ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان روک ہے تو تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں

(پ ۲۴ فصلت: ۵)

اگر معاملہ قولِ جبریہ کے مطابق ہوتا تو یہ لوگ اپنے قول میں صادق ہوتے اگر صادق ہوتے تو ان کی مذمت کیوں؟ بلکہ ان کا یہ قول ان کی طرف سے اظہارِ عذر اور ان سے ملامت کے سقوط کا ذریعہ بنتا۔ ہم نے غلف کی تین تفاسیر ذکر کیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بغیر دلیل جزم لازم نہیں۔

ہم مان لیتے ہیں مراد معتزلہ والی وجہ ہے مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ آیت مبارکہ اس قول کے مذموم ہونے پر دال ہے۔

ارشادِ ربانی "بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ" میں متعدد جواب ہیں:

۱۔ یہ واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی، تم نے یہ کیوں کہا کہ اس قول کی وجہ سے ان پر لعنت ہوئی ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول نقل کر کے ان کے بارے میں بتایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ کفر کے سبب ملعون ہیں

۲۔ "وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ" پر انہوں نے بطور استفہام انکاری کہا۔ یعنی ہمارے دل پردوں اور غلافوں میں نہیں بلکہ قوی اور روشن ہیں ہم نے دلوں اور اذہان کے ساتھ اے محمد تمہارے دلائل میں غور کیا ان میں کوئی قوت نہیں جب انہوں نے یہ سراسر جھوٹ کہا تو اب ضروری تھا کہ ان کے اس قوی کفر کی وجہ سے لعنت کی جائے۔

۳۔ ممکن ہے ان کے دلوں پر غلاف نہ ہوں بلکہ وہ صحتِ نبوت محمدیہ سے واقف ہوں جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ

وہ نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے

(پ ۲، البقرۃ: ۱۴۶، پ ۷، الانعام: ۲۰)

اور انہوں نے اس معرفت کا انکار کر کے دعویٰ کیا ہو کہ ان کے دلوں پر پردے ہیں اور وہ اس سے واقف نہیں تو ان کا کفر، عنادی کفر ٹھہرا لہٰذا اس کفر پہ لعنت ضروری تھی۔

فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ اور دو مسائل

ارشادِ ربانی "فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ" میں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اس کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

۱۔ حضرت قتادہ، اصم اور ابو مسلم کہتے ہیں قلیل مومن کی صفت ہے یعنی ان سے قلیل لوگ ایمان لائیں گے۔

۲۔ یہ ایمان کی صفت ہے یعنی جن اشیاء کا انہیں پابند کیا گیا تھا ان میں سے تھوڑی پر ایمان لائے مثلاً وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے مگر رسولوں کے ساتھ کفر کرتے۔

۳۔ وہ بالکل ایمان لاتے ہی نہیں نہ قلیل اور نہ کثیر جیسے محاورہ ہے۔ قَلِیْلًا مَا یَفْعَلُ (یعنی کام کیا ہی نہیں)

کسائی کہتے ہیں:

جب زمین کچھ نہ اُگائے تو عرب کہتے ہیں ہم وہاں سے گزرے قلیلا ما تنبت (جو زمین کچھ نہیں اگاتی)

پہلی تفسیر اولیٰ ہے اس لیے کہ اس کی یہ نظیر ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (پ۵ النساء:۱۵۵) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے تو ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جملہ اولیٰ میں قوم کا ذکر ہے تو اب استثناء بھی بعض قوم کا ہی ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: "قلیلاً" پر نصب کیوں؟

۱۔ یہ ایمان کی صفت ہے اصل یوں ہے: ایماناً قلیلاً ما یؤمنون، ما زائدہ ہے اور ان کا بعض کتاب پر ایمان لانا مراد ہوگا۔

۲۔ منصوب بنزع الخافض ہے یعنی "بقلیل یؤمنون"

۳۔ صاروا قلیلاً۔ (یعنی صار کی خبر ہے)

[۸۹] وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

(اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن پاک) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (تورات) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اس نبی کے وسیلے سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر)

یہود کی برائیوں کی ایک نوع کا تذکرہ

یہ یہود کی برائیوں کی ایک نوع ہے، کتاب سے قرآن مجید مراد ہونے پر اتفاق ہے اس لیے "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ" کے الفاظ واضح کر رہے ہیں کہ یہ یہود کی کتاب نہیں تو اب قرآن ہی مراد ہوگا۔ "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ" کے بارے میں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: قرآن نے بلاشبہ ان کی کتاب کی ان تعلیمات کی تصدیق کی ہے جس کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے صدقِ نبوت کے ساتھ تھا اور مناسب بھی یہ تھا کہ وہ دلائل نبوت کی تصدیق کرے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ بقیہ شرعی احکام میں یہ ان کے موافق نہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ادلہ قرآن کے حوالے سے بھی موافقت مراد نہیں اس لیے کہ تمام کتب الٰہیہ اسی طرح ہیں جب یہ تمام احتمالات باطل ٹھہرے تو واضح ہو گیا قرآن کی موافقت ان کتب کے ساتھ نبوت اور اس پر دال علامات، نعوت وصفات میں ہوگی

دوسرا مسئلہ: مُصَدِّقًا، کی بطور حال بھی قرأت ہے۔

سوال: یہ نکرہ (کتاب) سے حال کیسے بن سکتا ہے؟

جواب: وصف سے نکرہ، مخصوصہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے حال بن جائے گا اس لیے کہ یہاں کتاب کی صفت۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ موجود ہے۔

تیسرا مسئلہ: جواب "لَمَّا" میں تین اقوال ہیں:

۱۔ یہ محذوف ہے جیسے ارشادِ ربانی میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ (پ ۱۳، الرعد:۳۱) اور اگر کوئی ایسا قرآن آتا جس سے پہاڑ ٹل جاتے

تو جواب محذوف ہے وہ ہے: لکان ھذا القرآن۔ یہ اخفش اور زجاج کی رائے ہے۔

۲۔ مبرد کہتے ہیں: کفروا بہ۔ اس کا جواب ہے جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ — کیا تمہیں یہ وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے اس کے بعد پھر نکالے جاؤ گے (پ ۱۸، المؤمنون:۳۵)

۳۔ فراء کا کہنا ہے لَمَّا اولیٰ کا جواب پہلی فاء ہے اور دوسرے "لَمَّا" کا جواب وَكَفَرُوْا بِهٖ ہے اس ارشادِ ربانی کی طرح ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ — پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کچھ اندیشہ اور نہ کچھ غم

(پ۱۔ البقرۃ:۳۸، پ۱۶۔ طہٰ:۱۲۳)

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کی تفسیر

اس کے شان نزول متعدد بیان ہوئے ہیں:

۱۔ حضور ﷺ کی آمد اور نزول قرآن سے پہلے یہودیوں فتح ونصرت کی دعا کرتے:

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ عَلَيْنَا وَانْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ — اے اللہ! ہمیں مخالفین پر نبی اُمی کے وسیلہ سے فتح ونصرت عطا فرما

۲۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ جنگ کے موقعہ پر اپنے مخالفین سے کہا کرتے یہ نبی ہمارے زمانے میں سایہ فگن ہوں گے اور وہ تمہارے خلاف ہماری مدد کریں گے۔

۳۔ شیخ ابومسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں عرب ان سے آپ کی جائے ولادت کے بارے میں پوچھتے تو یہ حضور ﷺ کی صفات کا تذکرہ کرتے اور مشرکین عرب پر آپ کے ذریعے فخر کرتے۔

۴۔ حضرت ابنِ عباس، قتادہ اور سدی رضی اللہ عنہم سے ہے یہ بنونضیر اور قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور کی بعثت سے پہلے اوس وخزرج پر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے فتح مانگا کرتے تھے۔

۵۔ علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ تورات میں آپ کا تذکرہ، بعثت اور عربوں میں مبعوث ہونے کا پڑھتے اور اس کا ذکر کرتے تو وہ مشرکین عرب سے ان صفات کے بارے میں پوچھتے کیا ان کے اندر ایسی صفات والا آیا ہے؟

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: آیت واضح کر رہی ہے کہ وہ آپ کی نبوت سے آگاہ تھے۔

سوال: تورات کا نقل تواتر سے تھا تو اب پوچھا جائے گا کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تفصیلی اوصاف تھے مثلاً آپ کی صورت، سیرت، سال و جائے ولادت کا تعین تھا یا ان کی تفصیل نہ تھی اگر اول صورت ہے تو پھر یہ تمام لوگ صدق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر شہادت تورات کی معرفت پر مجبور ہوتے تو اب اہلِ تواتر کا کذب پر اتفاق کیسے ممکن ہوا؟ اور اگر اوصاف تفصیلاً نہ تھے تو تورات میں مذکور اوصاف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا لازم نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرما دیا: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ؟ (جب پہچانا ہوا آیا تو انہوں نے انکار کر دیا)

جواب: تورات میں اوصاف اجمالی تھے تو ان اوصاف کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ نبی نہ جانتے تھے بلکہ ظہورِ معجزات نے ان اوصاف میں تاکید پیدا کر کے وضاحت و تفصیل کر دی تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار پر ان کی مذمت کی۔

دوسرا مسئلہ: کفر کی وجوہات

انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اس کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوں گے اس لیے کہ اکثر انبیاء علیہم السلام انہی میں سے تھے تو اسی بنا پر لوگوں کو آپ کے دین کا شوق اور اس کی دعوت دیتے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب نسلِ حضرت اسماعیل علیہ السلام میں مبعوث کیا تو ان پر یہ گراں گزرا انہوں نے تکذیب شروع کر دی اور اپنے پہلے طریق سے ہٹ گئے۔

۲۔ آپ کی نبوت کا اعتراف، ان کی ریاستوں اور اموال کے زوال کا سبب تھا لہٰذا انہوں نے انکار کر دیا اور اس پر ڈٹ گئے۔

۳۔ ممکن ہے ان کا یہ خیال ہو کہ آپ کی بعثت صرف عرب کی طرف ہی ہوگی (چونکہ آپ کی بعثت تمام مخلوق کیلئے تھی) لہٰذا انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

تیسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا آپ کی نبوت سے آگاہ ہونے کو بیان کر کے پھر ان کو (انکار پر) کافر کہا جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو نہ ماننا ہی کفر نہیں۔

ارشادِ ربانی "فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت کی خیرات و وعدہ سے محروم ہیں اس لیے کہ خیرات دنیا سے محروم ملعون نہیں ہوتا۔

یہاں لعنت کیوں؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں فرمایا:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (پ۱، البقرۃ:۸۳) اور لوگوں سے اچھی بات کہو

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (پ۷، الانعام:۱۰۸) اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

(تو یہاں لعنت کیوں؟)

جواب: عام کو تخصیص عارض ہوتی رہتی ہے علاوہ ازیں ہم نے پیچھے تفصیلاً بیان کیا کہ مستحق لعنت کیلئے لعنت، قولِ حسن ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

[۹۰] بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

(کس بُرے بھاؤ انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے نازل کردہ کے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کیلئے ذلت کا عذاب ہے)

بِئْسَمَا کی حقیقت

بِئْسَمَا کی حقیقت سے آگاہی کیلئے چند مسائل کا جاننا ضروری ہے:

پہلا مسئلہ: نِعْمَ اور بِئْسَ کا اصل عَلِمَ کے وزن پر نَعِمَ، بَئِسَ ہے البتہ جس کا دوسرا حرف حلقی ہو وہ مکسور ہوگا، اس میں چار لغتیں ہیں

۱۔ اصل پر، اول پر زبر اور دوسرے کے نیچے زیر۔

۲۔ اول، ثانی کے تابع یعنی نون سین دونوں کے نیچے زیر جیسے فخذ، فا اور خا دونوں کے نیچے زیر، اگرچہ اہلِ لغت دو زیروں سے بھاگتے ہیں مگر حرف حلقی کی اتباع کی وجہ سے اسے جائز رکھتے ہیں۔

۳۔ حرف حلقی مکسور کو ساکن اور ماقبل اصل پر نَعْم، بئس (اول پر زبر اور دوسرا ساکن) جیسے فَخْذ، فا پر زبر اور خا، ساکن۔

۴۔ حرف حلقی ساکن اور اس کا کسرہ ماقبل کو دیا جائے۔ نِعْم (نون کے نیچے زیر اور سین ساکن) جیسے فِخذ، فاء کے نیچے زیر اور خاء ساکن۔

واضح رہے ان میں آخری تبدیلی اگرچہ جائز تھی مگر علماء نے اسے ان کے ساتھ لازم قرار دے دیا اس لیے کہ یہ دونوں اسی معنی ماضی سے نکل چکے ہیں جس کی خاطر ان کی وضع تھی وہ تھا وجود مصدر کا زمانہ ماضی میں ہونا پھر یہ دونوں کلمہ مدح وذم بن چکے ہیں اور ان سے مدح وذم میں مبالغہ ہوتا ہے تا کہ ان الفاظ کو لازم تبدیلی، اصل معنی میں تبدیلی پر دال ہو مثلاً نعم الرجل زید۔ (زید خوب آدمی ہے) اب ضرورت شعری کے علاوہ یہ اصل میں استعمال نہیں، مبرد کہتے ہیں:

ففداء لبنی قیس علی ما أصاب الناس من شر وضر

ما أقلت قدمای انهم نعم الساعون فی الأمر المبر

دوسرا مسئلہ: یہ دونوں نعم ینعم اور بئس یبأس سے فعل ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ان پر علامت تانیث تا، داخل ہوتی ہے مثلاً نعمت و بئست، شیخ فراء نے انہیں بمنزل اسماء قرار دیتے ہوئے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا:

ألسنا بنعم الجار یؤلف بیته من الناس ذا مال کثیر و معدما

اور اعرابی کے قول سے، جب اسے بیٹی پر بشارت دی گئی تو اس نے کہا: "وَاللّٰه ما هی بنعم المولودة"

علماء بصرہ نے جواباً کہا یہ بطور حکایت استعمال ہوا ہے۔

تیسرا مسئلہ: نعم اور بئس اصل میں تعریف اور مذمت کیلئے ہے، ان کا فاعل ایسا اسم ہوگا جو جنس کا احاطہ کیے ہو یا وہ بصورت ظاہر ہوگا یا بصورت ضمیر، ظاہر کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نعم الرجل زید۔ یہاں مطلق مرد مراد ہے نہ کہ معین۔

۲۔ نعم غلام الرجل زید۔

رہا شاعر کا قول:

فنعم صاحب قوم لا سلاح لهم   وصاحب الركب عثمان بن عفانا

تو یہ شاذ و نادر ہے۔

بعض نے توجیہہ کرتے ہوئے کہا: صاحب الرکب سے مراد واحد ہے جب اس پر الف لام آیا تو گویا قوم مراد ہو گی۔

جب اس کا فاعل ضمیر ہو مثلاً نعم رجلاً زید۔ اب اصل یوں ہے: نعم الرجل رجلاً زید۔ اول کو ترک کیا اس لیے کہ نکرہ منصوب (رجلاً) اس پر دال تھا اور اس کا نصب بطور تمیز ہے مثلاً عشرون رجلاً اور ممیز نکرہ ہوتا ہے مثلاً کوئی نہیں کہتا عشرون الدرهم۔ اگر اس پر الف لام داخل ہو تو یوں پڑھا جائے گا۔ نعم الرجلَ۔ (زبر کے ساتھ) تو اب غرض فوت ہو جائے گی۔ اس لیے اگر وہ الف لام لانا چاہیں تو اس پر پیش لائیں گے۔ نعم الرجلُ اور ضمیر کی تکلیف سے بچیں گے۔ فاعل ضمیر کو بنانا اختصار کی وجہ سے ہے کیونکہ نعم رجلاً اُس جنس پر دال ہے جس پر فضیلت دی گئی۔

چوتھا مسئلہ: نعم الرجل زید کی دو تراکیب ہیں

۱۔ زید مبتدا مؤخر ہو گویا زید نعم الرجل ہے زید کو مؤخر کیا مگر نسبت میں مقدم ہے جیسے مررت به المسكين سے مراد المسكين مررت به ہے رہا مبتدا کی طرف ضمیر کا لوٹنا تو لفظ الرجل مشہور طور پر جنس کو شامل ہے گویا زید اس کے تحت داخل ہے لہٰذا یہ بمنزل ذکر ہے جس کی طرف ضمیر لوٹ رہی ہے۔

۲۔ اس میں زید مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ جب کہا: نعم الرجل۔ (اچھا مرد) تو سوال اٹھا کون؟ جواب دیا: زید۔ یعنی هو زيد

پانچواں مسئلہ: نعم اور بئس کے بعد، جس کی مدح و ذم کی جائے گی وہ جنس مذکور سے ہوگا مثلاً زید، مردوں میں سے ہے جب ضابطہ یہ ہے تو ارشادِ باری تعالیٰ:

سَاءَ مَثَلًاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا   کیا بری کہاوت ہے ان کی جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں

(پ۹، الاعراف:۱۷۷)

میں قوم کی طرف مضاف محذوف ہوگا۔ "سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" ان مسائل کی تحقیق کے بعد اب ہم تفسیر کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ما نکرہ منصوبہ بئس کی فاعل کی تفسیر کر رہا ہے۔ بئس الشئ شیئاً اشتروا به انفسهم (وہ شی بہت بری ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے نفوس کو بیچ دیا) ان یکفروا، مخصوص بالذم ہے۔

دوسرا مسئلہ: شراء کے بارے میں دو اقوال

یہاں شراء کے بارے میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: بمعنی بیع ہے۔ تفصیل یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایمان لانے پر قدرت دی جو اسے جنتی بنا دے اور کفر کا اختیار دیا جو اسے دوزخی بنا دے۔ تو اب بندے کا اختیار اس طرح ہوا جیسے وہ سودے میں ایک شی دے کر دوسری کا مالک بنتا ہے، اگر اس نے ایمان اختیار کیا جس میں کامیابی اور نجات ہے تو کہا جائے گا اس نے خوب سودا کیا ہے۔ بیع و شراء سے غرض ایک ملکیت کو دوسری ملکیت سے بدلنا ہے یہ چیز چونکہ دونوں طرف سے صادر ہوتی ہے لہٰذا ہر ایک کو بائع اور مشتری کہا جا سکتا ہے لہٰذا ارشادِ ربانی ''بِئْسَمَا اشْتَرَوْا'' کا معنی یہ کیا جا سکتا ہے انہوں نے نفوس کو کفر کے عوض بیچ دیا جو انہیں بطور نفع حاصل ہوا وہ کفر ہے تو لہٰذا یہ نفوس کا سودا کرنے والے ٹھہرے۔

دوسرا قول: ہمارے نزدیک اصح یہی ہے، آدمی جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے تو وہ ایسے اعمال کرتا ہے جو اس عذاب سے خلاصی کا ذریعہ بنیں گویا اس نے ان اعمال کے ذریعے اپنے نفس کو خرید لیا۔ یہود اپنے عقائد کو عذاب سے خلاصی اور ثواب دلانے والے قرار دیتے تو انہوں نے گمان کیا ہم نے اپنے نفوس کو ان کی بنا پر خرید لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا

لفظ و معنی کے اعتبار سے یہ قول، اول سے اقرب ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر فرما دی۔ "اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ" بلاشبہ یہاں قرآن سے، ان کا کفر مراد ہے اس لیے کہ خطاب یہود سے ہے اور وہ قرآن کے علاوہ پر ایمان رکھتے تھے۔

پھر اس انکار و کفر کی وجہ بیان کی ''حسداً'' اس سے غرض کفر کی طرف اشارہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: یعادی فلان فلاناً حسداً (فلاں، فلاں کے ساتھ بطور حسد عداوت رکھتا ہے) یہ اس کی غرض پر تنبیہ ہے، اگر یہ لفظ نہ ہوتے تو کہہ سکتے تھے یہ انکار بطور جہالت تھا نہ کہ بطور سرکشی۔

بغاوت کی متعدد وجوہات

یہ آیت مبارکہ نشاندہی کر رہی ہے کہ حسد حرام ہے۔ بغاوت وسرکشی کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں یہاں کونسی وجہ ہے؟ اسے ان الفاظ میں ذکر کیا: "اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ" جو کچھ ہم نے پہلے ذکر کیا انہوں نے یہ گمان کر رکھا کہ منتظر نبوت کی صورت میں فضل عظیم ہماری قوم کو ملے گا جب انہوں نے عرب کو اس نعمت سے مالا مال دیکھا تو وہ حسد وبغاوت پر اتر آئے۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: غضبین (دونوں غضب) کی تفسیر متعدد طریق سے ہے:

۱۔ ان دونوں کے دو اسباب کا اثبات ضروری ہے:

۱۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل شدہ تعلیمات کا انکار کیا۔

۲۔ انہوں نے حضور ﷺ اور آپ پر نازل شدہ شریعت کا انکار کیا تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے غضب در غضب اور عذاب در عذاب میں داخل ہوگئے اس لیے کہ انکار در انکار میں داخل تھے۔ امام حسن، شعبی، عکرمہ، ابو العالیہ اور قتادہ کا یہی قول ہے۔

۲۔ یہاں فقط دو غضب کا اثبات مقصود نہیں بلکہ پے در پے غضب کی متعدد انواع مراد ہیں کیونکہ ان سے پے در پے متعدد انواعِ کفر کا صدور ہوا مثلاً حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ (پ۱۰، التوبہ: ۳۰) اللہ تعالیٰ کو بخیل کہا۔ (پ۶ المائدہ ۶۴) اور کہا: اللہ محتاج ہے اور ہم غنی۔ (پ۴، ال عمران: ۱۸۱) یہ عطا اور عبید بن عمیر کا قول ہے۔

۳۔ اس سے تاکید وکثرت غضب مراد ہے اس لیے کہ کفر اگرچہ واحد تھا مگر بہت بڑا تھا، یہ شیخ ابو مسلم کا قول ہے۔

۴۔ پہلا عذاب ان پر بچھڑے کی پوجا کی وجہ سے جبکہ دوسرا حضور ﷺ کی صفات چھپانے اور آپ کی نبوت کے انکار کی وجہ سے ہوا۔ امام سدی کا یہی قول ہے۔

دوسرا مسئلہ: غضب الٰہی سے مراد

ناپسند کام کے مشاہدہ کے بعد جوش خون دل کی وجہ سے انسان کو جو حالت عارض ہوتی ہے وہ غضب کہلاتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے لہٰذا یہاں اس کا وہ ارادہ اور حکم مراد ہے جو بطور لعنت وعذاب کسی نافرمان کیلئے ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: غضب، باری تعالیٰ کا وصف بن سکتا ہے اور اس میں اضافہ وکثرت صحتِ عذاب کی طرح ہی ہے لہٰذا اس کا غضب ایک کفر اختیار کرنے والے پر اس طرح نہیں ہوگا جو زیادہ کفر اختیار کرتا ہے۔

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: کفار ہی کا ذکر

یہ الفاظ "وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ" سے سخت ہیں اس لیے کہ پہلی عبارت میں کفار کے علاوہ بھی شامل تھے لیکن دوسری میں فقط کفار ہی داخل ہیں۔

دوسرا مسئلہ: عذاب درحقیقت رسوا کرنے والا نہیں ہوتا جبکہ مہین کا معنی دوسرے کو رسوا کرنے والا ہے اور یہ وصف صاحبِ عقل کا ہی ہو سکتا ہے تو یہاں اصلاً اللہ تعالیٰ عذابِ کثیر کے ساتھ کفار کو رسوا فرمانے والا ہے چونکہ رسوائی عذاب سے حاصل ہے تو اسے عذاب کا وصف بنا دیا۔

سوال: ہر عذاب میں رسوائی ہے پھر مہین کا کیا فائدہ؟

جواب: عذاب کا اہانت کے ساتھ متصل ہونا ایسا معاملہ ہے جس پر دلیل ضروری ہے تو اللہ تعالیٰ نے مہیـــن فرما کر اس پر دلیل قائم فرما دی۔

تیسرا مسئلہ: عذاب اور کفار

بعض لوگوں نے اس سے استدلال کیا کہ عذاب صرف کفار کیلئے ہے۔ اس کے بعد دو گروہوں نے اس آیت سے استدلال کیا۔

۱۔ خوارج نے کہا دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق پر بھی عذاب ہے لیکن یہ آیت بتا رہی ہے کہ عذاب کافر کیلئے ہی ہے تو لازم ٹھہرا کہ فاسق بھی کافر ہے۔

۲۔ مُرجہ نے کہا: اس آیت نے واضح کیا کہ عذاب کافر کیلئے ہی ہے اور فاسق کافر نہیں ہوتا لہٰذا ضروری ہے کہ فاسق کو عذاب نہ ہو۔

لیکن ان دونوں اقوال کا فساد واضح ہے۔

[۹۱] وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۹۱﴾

(اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اُتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اُس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا)

نوع افعال بد کا تذکرہ

یہ بھی ان کے افعالِ بد کی ایک نوع کا بیان ہے۔ "وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ" سے مراد یہود ہیں۔ "آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ" یعنی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام تعلیمات پر ایمان لاؤ۔ قائلین عموم نے اس آیت سے استدلال کیا کہ لفظ ما عموم پر دال ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نازل کردہ تعلیمات پر ایمان لانے کا فرمایا لیکن یہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی۔ اگر "ما" میں عموم نہ ہوتا تو یہ مذمت درست نہیں۔

اس کے بعد ان کا قول نقل کیا۔ "قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا" یعنی ہم تورات پر اور باقی ان انبیاء کی کتاب کو مانتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تائید میں آئے پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ انہوں نے انجیل و قرآن کا انکار کیا اور سارا کچھ بطور مذمت ذکر ہوا ہے۔ اگر ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کی معرفت کا طریقہ نہ ہوتو انہیں ان پر ایمان لانے کا حکم دینا ہی جائز نہیں ورنہ یہ تکلیف مالا یُطاق ہوگی جو درست نہیں تو جب دلیل سے واضح ہو جائے کہ یہ سماوی تعلیمات ہیں تو پھر ان پر ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے لہٰذا ثابت ہو گیا کہ بعض پر ایمان اور بعض کے انکار میں تضاد ہے۔

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ کی تفسیر

هُوَ، حضور ﷺ پر لزوم ایمان کے دلائل کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل دو طرح ہے:

۱۔ اس پر الفاظ "وَهُوَ الْحَقُّ" دلیل ہیں جب حضور ﷺ کی نبوت، معجزات سے ثابت ہو چکی ہے تو آپ نے بتایا یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہے اور اس پر ایمان لانا فرض فرمایا تو اب اس پر ایمان لانا ہر صورت فرض ہوگا، اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ بعض انبیاء اور بعض کتب پر ایمان لانے اور بعض کے ساتھ کفر کرنے میں تضاد ہے۔

۲۔ اس پر "مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ" کی دلالت ہے اس کی تفصیل دو طرح ہے:

۱۔ آپ ﷺ نے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کسی استاذ سے پڑھا تو جب آپ نے تمام واقعات بغیر کسی اختلاف کے تورات کے موافق بیان فرمائے تو واضح ہو گیا آپ ﷺ کی رہنمائی وحی و قرآن نے کی ہے۔

۲۔ قرآن حضور ﷺ کی نبوت پر دال ہے جب اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی کہ یہ تورات کی تصدیق کرتا ہے تو ضروری ہے تورات میں حضور ﷺ کی نبوت کے بارے میں تعلیمات ہوں ورنہ قرآن تورات کا مصدق ہونے کے بجائے مکذب ہوگا، جب تورات حضور ﷺ کے ذکر نبوت پر مشتمل ہے اور وہ تورات پر ایمان کے لزوم کو تسلیم کرتے ہیں تو اسی وجہ سے ان پر قرآن اور نبوت محمدی ﷺ پر ایمان لانا لازم ہو جائے گا۔

فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ ایک اور طریق سے واضح کر رہے ہیں کہ ان کا تورات پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کئی وجوہ سے بھی متضاد ہے اس لیے کہ تورات واضح کرتی ہے کہ معجزہ کی دلالت صدق پر ہے اور جو دعویٰ نبوت میں صادق ہو اس کا قتل کفر ہے جب معاملہ یوں ہے تو حضرت یحییٰ، ذکریا اور عیسیٰ علیہم السلام کے قتل میں سعی کفر ہوئی، اگر تم تورات پر دعویٰ ایمان کرتے ہو تو بتاؤ تم نے ایسی سعی کیوں کی؟

دوسرا مسئلہ: یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ دین میں مجادلہ "مناظرہ" انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور مخالف پر نقض و اعتراض وارد کرنا جائز ہے۔

تیسرا مسئلہ: خطاب پہلوں سے ہے

"فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ" اگرچہ بالمشافہ خطاب ہے لیکن اسلاف سے ہے اس پر متعدد دلائل ہیں:

۱۔ اس دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام موجود نہ تھے۔

۲۔ اس دور میں انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

ماضی کا مراد ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس پر قرینہ دال ہے۔

اٰمِنُوْا اور فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ میں موافقت

سوال: اٰمِنُوْا۔ موجود لوگوں سے خطاب ہے۔ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ۔ اسلاف کی حکایت ہے ان کے درمیان مطابقت نہیں ہے؟

جواب: معنی یہ ہے تم اس تکذیب کے سبب اپنے لائے ہوئے ایمان سے خارج ہو چکے جیسا کہ تمہارے اسلاف بعض انبیاء کے قتل کی وجہ سے باقی پر ایمان سے خارج ہوئے۔

چوتھا مسئلہ: ''تم نے پہلے قتل کیے'' کہنا جائز ہے تو، أنا أضربك أمس (میں تجھے گذشتہ کل ماردوں گا) کیوں جائز نہیں؟

اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ صفت لازمہ میں یہ کہنا جائز ہے مثلاً تم کسی برائی کرنے والے کو جانتے ہو تو کہو: افسوس تم کذب بیانی کیوں کرتے ہو گویا تم کہنا چاہتے ہو کہ یہ تمہارے لیے بہتر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ" ہے۔ ما تلت نہیں فرمایا۔ اس لیے مراد یہی ہے کہ اس کی شان تلاوت ہے۔

۲۔ گویا فرمایا: اگر تم تورات پر ایمان رکھتے تھے تو اس سے پہلے انبیاء کے قتل پر تم راضی کیوں ہوئے؟ واللہ اعلم

[۹۲] وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

(اور بیشک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آیا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم تھے)

تکرارِ آیت میں حکمت

یہ آیت چونکہ دوسری دفعہ آئی ہے اس کی تفسیر گزر چکی۔ تکرار کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے یہود، ان کا عناد و تکذیب اور ان کے اسلاف کا انبیاء کو شہید کرنا بیان کیا جو ان کی تکذیب بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قبیح عمل ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات کا ذکر دوبارہ لایا گیا۔ پھر ان کے کھلے عمل کہ انہوں نے بچھڑے کو الہ بنایا کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں دعا اور اس کے دین و شریعت پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے۔ فرمایا: اسی طرح کا حال تمہارے ساتھ میرا بھی ہے اگرچہ تم تکذیب و انکار میں تجاوز کر چکے ہو۔

[۹۳] وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِهٖ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

(اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہِ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو بولے ہم نے سنا اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرما دو برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو)

دوبارہ ذکرِ عہد کیوں؟

دوبارہ عہد کے ذکر میں متعدد حکمتیں ہیں:

۱۔ یہاں اور دیگر مقامات پر تکرار تاکید اور طریقہ عرب کے مطابق مخالف پر حجت کا لزوم ہے۔

۲۔ یہاں اضافہ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) بھی ہے جو ان کی انتہائی لجاجت اور ضد پر شاہد ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: پہاڑ کا سایہ کی طرح اُوپر اٹھانا اعظم مخلوق ہے اس کے باوجود انہوں نے کفر پر اصرار کرتے ہوئے کہا: "ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی" جو واضح کر رہا ہے خوف جتنا بھی کیوں نہ ڈالا جائے یہ تابع نہیں بنا سکتا۔

دوسرا مسئلہ: اکثر مفسرین نے مانا ہے کہ یہ ان کا قول ہے لیکن شیخ ابو مسلم کہتے ہیں ممکن ہے انہوں نے سنا اور ان سے نافرمانی ہوگئی اور اسے قول کہہ دیا گیا اگرچہ انہوں نے یہ بات کہی نہیں جیسے ارشادِ ربانی ہے:

اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (پ ۱، البقرۃ: ۱۱۷) تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتی ہے

دوسرے مقام پر فرمایا:

قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (پ ۲۴ فصلت: ۱۱) دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے

لیکن پہلا قول اولیٰ ہے کیونکہ بغیر دلیل کلام کو ظاہر پر محمول نہ کرنا جائز نہیں ہوتا۔

أُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ کی تفسیر

یہاں متعدد مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت رچا دی گئی تھی۔ یہاں دو وجہ سے استعارہ ہے:

۱۔ ان کے اندر بچھڑے کی محبت اور اس کی عبادت کا شوق یوں تھا جیسے کپڑے میں رنگ "فِيْ قُلُوْبِهِمْ" یہ بیان مکان قرب ہے۔ جیسے فرمان ہے:

اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (پ۴، النساء:۱۰) وہ تو اپنے پیٹ میں نری آگ بھرتے ہیں

۲۔ جس طرح زمین کا پانی پینا، نباتات کیلئے حیات کا ذریعہ ہے اسی طرح بچھڑے کی محبت ان سے افعالِ بد کے صدور کا ذریعہ ہے

دوسرا مسئلہ: وَاُشْرِبُوْا" بتا رہا ہے کہ فاعل ان کے علاوہ کوئی اور ہے اور یہ واضح ہے کہ یہ قدرت اللہ کے سوا کسی میں نہیں۔ معتزلہ نے دو طرح جواب دیا۔

۱۔ یہاں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیر کے ذریعہ کام کروایا البتہ ان کی فرطِ الفت و عبادت کو ان کے دلوں میں محبت پلا دی گئی قرار دیا اس لیے مجہول کا صیغہ لایا گیا جیسا کہا جائے، فلان معجب بنفسه (فلاں اپنے کو اعلیٰ سمجھتا ہے)

۲۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس نے مزین کر کے اس کی انہیں دعوت دی مثلاً سامری ابلیس یا جن وانس میں سے کسی شیطان نے کہا

اہل سنت نے ان دونوں کا رد کرتے ہوئے کہا، یہ الفاظ کو ظاہر سے ہٹانا ہے اور یہ مستقل دلیل کے بغیر جائز نہیں۔ جب ہم نے دلائل عقلیہ قطعیہ سے ثابت کر دیا کہ ہر شی کا پیدا فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے تو یہاں ترکِ ظاہر کی کیا ضرورت ہے؟

"بِكُفْرِهِمْ" یہاں کفر سے اللہ تعالیٰ سے تشبیہ اور اس کے علاوہ کی عبادت کو جائز سمجھنا مراد ہے۔

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: یہاں تورات پر ایمان مراد ہے اور تورات میں بچھڑے کی عبادت کا حکم نہیں اس پر ایمان کی اضافت بطور تحکم ہے جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے ہے اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ (کیا تمہیں تمہاری نماز حکم دیتی ہے) اسی طرح یہاں ایمان کی اضافت ان کی طرف ہے۔

دوسرا مسئلہ: ایمان عرض ہے اس سے امر ونہی کا صدور نہیں ہوتا لیکن کبھی فعل کی طرف داعی، امر کے مشابہ ہوتا ہے مثلاً فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ — بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے

(پ۲۱،العنکبوت:۴۵)

اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ مراد ان کے ایمان میں تشکیک اور ان کے صحتِ دعویٰ پر طعن ہے۔

[۹۴-۹۵] قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْہُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۵﴾

(تم فرماؤ اگر پچھلا گھر (آخرت) خالص تمہارے لیے ہو نہ اوروں کیلئے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو)

بُرائیوں کی ایک اور نوع کا بیان

یہ ان کی قباحتوں کی ایک اور قسم کا بیان ہے وہ یہ کہا کرتے کہ آخرت صرف ہماری ہے اس پر یہ دلائل شاہد ہیں:

۱۔ مخالف کے خلاف یوں استدلال درست نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ یوں ہے تو تم ایسا کرو مگر اس صورت میں جب اول اس کا مذہب ہوتا کہ دوسرے کا لزوم درست ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے یہ اقوال ذکر کیے ہیں:

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی — اور اہلِ کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو

(پ۱،البقرۃ:۱۱۱)

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں

(پ۶، المائدۃ:۱۸)

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً تو بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن

(پ۱، البقرۃ:۸۰)

۳۔ اپنے بارے میں ان کا یہ عقیدہ کہ ہم ہی حق پر ہیں اس لیے کہ ہماری شریعت میں نسخ نہیں اور باقی فرقے باطل ہیں۔

۴۔ ہماری اکابر انبیاء علیہم السلام سے نسبت ہے۔ مثلاً حضرت یعقوب، حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہم السلام، تو اللہ تعالیٰ عذاب سے ہمیں بچا کر مستحقِ ثواب کر دیں گے۔

ان چیزوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا حتیٰ کہ وہ عربوں پر فخر کرتے اور پھر اسے اپنے حق میں دلیل بناتے کہ جس نبی کی بشارت و انتظار کی بات تورات میں ہے وہ ہم میں سے ہوگا نہ کہ عرب سے اور اس شبہ کی بنا پر لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے گمراہ کرتے۔

فسادِ قول پر استدلال

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے فسادِ قول پر یوں استدلال فرمایا۔ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ۔ ملازمہ کی تفصیل یہ ہے، دنیوی نعمتیں، اُخروی کے مقابل نہایت ہی حقیر ہیں پھر یہ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و غلبہ اور ان کے ساتھ جنگ و جدال کی وجہ سے انہیں ناپسند بھی ہیں۔ جو آدمی قلیل اور کڑوی نعمتوں میں ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ موت کے بعد عظیم انعام حاصل ہو جائیں گے تو اسے موت کا شوق ضرور ہوگا اس لیے کہ مطلوب عظیم انعامات ہیں اور ان کے حصول کی صورت موت کے سوا کوئی نہیں تو جس پر مطلوب موقوف ہو وہ بھی مطلوب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے ایسا انسان موت پر خوش اور اس کا متمنی ہو۔

تو ثابت ہوا اگر دارِ آخرت صرف انہی کی ہے تو پھر لازم تھا کہ وہ موت کی تمنا کرتے پھر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ وہ موت کی تمنا نہیں بلکہ ہمیشہ ہرگز نہیں کریں گے لہٰذا لازماً ان کا قول ''دارِ آخرت صرف ہمارے لیے ہے'' باطل ٹھہرے گا۔

چھ اہم سوالات

پہلا سوال: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اگر دارِ آخرت صرف انہی کیلئے ہو تو ان پر موت کی آرزو لازم ہو جاتی ہے اس لیے کہ جس پر مطلوب موقوف ہے ممکن ہے وہ وسیلہ بننے کی وجہ سے مطلوب ہو مگر ذات کے اعتبار سے غیر مطلوب ہو اور موت تو آلام عظیم کا سبب ہے جس کی ان میں طاقت نہ تھی لہٰذا وہ ہر صورت موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

دوسرا سوال: وہ اُلٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کر سکتے ہیں تم کہتے ہو آخرت میری اُمت کیلئے ہی ہے مخالفین کیلئے نہیں تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ ہم آپ کو اور اُمت کو قتل کر دیں کیونکہ ہم جنگ و جدال کے سبب تمہیں اور تمہاری اُمت کو شدید نقصان اور بلاء عظیم میں مبتلا پا رہے ہیں لیکن موت کے بعد تم جنت پا لو گے لہٰذا تمہارا اپنے قتل پر خوش ہونا ضروری ہے۔

تیسرا سوال: ممکن ہے ان کا قول یہ ہو، دار آخرت ہمارے دین والوں کو ملے گی بشرطیکہ وہ کبائر سے بچنے والے ہوں رہا صاحبِ کبیرہ تو وہ دائماً دوزخی ہے اس لیے کہ وہ وعید یہ تھے یا یہ کہ وہ صاحبِ کبیرہ کے بارے میں عذاب مانتے تھے اس وجہ سے انہوں نے موت کی تمنا نہ کی۔

کوئی اس کے رد میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ ہمیں آگ چند دن ہی مس کرے گی اور ہر روزِ قیامت ہزار سال کے برابر ہے تو یہ ایام اگرچہ مقدار میں قلیل تھے مگر باعتبار مدت طویل تھے اس خوف کی بنا پر انہوں نے موت کی تمنا نہ کی۔

چوتھا سوال: حضور علیہ السلام نے موت کی تمنا سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔ کسی تکلیف کی بنا پر موت کی تمنا نہ کرو البتہ یہ کہو اے اللہ اگر حیات میرے لیے بہتر ہے تو مجھے زندگی عطا فرما اور وفات میرے لیے بہتر ہے تو مجھے موت عطا فرما۔ (البخاری، ۶۳۵۱)

اللہ کا ارشاد گرامی ہے:

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا (پ ۲۵، الشوریٰ: ۱۸)

اس کی جلدی مچا رہے ہیں وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور جنہیں اس پر ایمان ہے وہ اس سے ڈر رہے ہیں

تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ موت میں جلدی سے منع کرے اور پھر لوگوں کو اس بارے میں چیلنج بھی دے۔

پانچواں سوال: تمنا دلی آرزو اور قول قائل لیتنی مت۔ (کاش میں مر گیا ہوتا) کے درمیان مشترک ہے۔ یہود کہہ سکتے ہیں تم نے ہم سے تمنا کا مطالبہ کیا ہے اور یہ مشترک ہے، اگر ہم زبان سے اس کا ذکر کریں تو متکلم کہہ سکتا ہے میری مراد یہ نہیں۔ بلکہ دلی آرزو مراد ہے اور اگر دلی آرزو کریں تو وہ کہہ سکتا ہے تم جھوٹے ہو تم دلوں میں یہ آرزوئیں رکھتے ہو جب یہود کو مشترک لفظ کا علم ہو گیا تو اب ان پر اعتراض ممکن نہ رہا اور اب وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔

چھٹا سوال: ہم تسلیم کر لیتے ہیں اگر دار آخرت انہی کیلئے ہے تو ان پر موت کی تمنا لازم ہے لیکن تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ انہوں نے موت کی تمنا نہیں کی اور ارشادِ ربانی "وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا" (وہ ہرگز ہمیشہ اس کی تمنا نہیں کریں گے) سے استدلال ضعیف ہے کیونکہ یہ تب درست وقوی ہوگا جب قرآن کو حق مانا جائے حالانکہ اسی میں ان کا نزاع ہے۔

ان کے جوابات

۱۔ معترض کا یہ کہنا ''موت آلام کو متضمن ہونے کی وجہ تمنا سے روک دے گی''، ہم کہتے ہیں انسان کو پچھنے لگوانے (اور آپریشن) سے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر وہ اسے لگوانے سے روک نہیں پاتی اس لیے کہ انسان کو علم ہے کہ ان سے عظیم فائدہ حاصل ہوتا ہے تو یہاں بھی معاملہ ایسا ہی ہے۔

۲۔ ان کا کہنا حضور ﷺ کو کہنا کہ پھر تمہیں اپنے قتل پر خوش ہونا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ اور ان کے درمیان فرق ہے۔ آپ ﷺ فرما سکتے ہیں میری بعثت انسانیت کی طرف شرائع کی تبلیغ کیلئے ہے اور یہ مقصود ابھی تک حاصل نہیں ہوا اس لیے میں قتل پر خوش نہیں، رہا تمہارا معاملہ وہ بلاشبہ ایسا نہیں لہٰذا فرق واضح ہو گیا۔

۳۔ وہ کبائر سے خائف ہونے کی وجہ سے تمنا نہ کرتے ہوں۔

جواب: ان کا دعویٰ کہ آخرت ہماری ہے بتا رہا ہے کہ وہ وہاں ثواب کے علاوہ کسی بھی عتاب سے بے خوف تھے۔

۴۔ موت کی تمنا ممنوع ہے۔

جواب: یہ ممانعت ہماری شریعت میں ہے۔ مختلف اوقات کی وجہ سے حال مختلف ہو سکتا ہے۔ روایات میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ دشمنوں کی صفوں کے درمیان حالتِ وجد میں چکر لگا رہے تھے تو آپ کے صاحبزادے امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یہ دشمن کے سامنے ایسا کیوں؟ فرمایا: بیٹے تیرے والد کو اس کی کوئی پرواہ نہیں وہ موت پر گرتے ہیں یا موت ان پر گرتی ہے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین میں (وصال کے وقت) کہا تھا:

الآن ألاقی الأحبة　　　　محمداً وحزبه

(میں آج اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ اور آپ کے دوستوں سے ملاقات کرنے والا ہوں)

متعدد انبیاء علیہم السلام سے موت کی تمنا ثابت ہے پھر یہ ممانعت سبب مخصوص سے موت کی تمنا پر ہے کیونکہ آپ نے فرمایا: شدائد کے وقت انسان پر تمنا موت حرام ہے اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر رضا سے خروج اور شکوہ ہو جائے گا تو اس میں وہ تمنا کیسے آ سکتی ہے جو صحت نبوت پر دال ہے۔

۵۔ ان کو یہ علم نہ ہوا کہ تمنا قلبی ہے یا زبانی۔

جواب، لغت عرب میں تمنا کا اطلاق اظہار پر ہی ہوتا ہے جس طرح خبر کا تعلق بھی اظہار سے ہی ہے دلی آرزو پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا اور پھر یہ بھی محال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں موت کی تمنا کا کہیں اور مراد ایسی لے جس پر اطلاع ممکن نہ ہو علاوہ ازیں مقصد، اظہار کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

۶۔ تمنا نہ کرنے پر کیا دلیل ہے؟

جواب: متعدد دلائل ہیں:

۱۔ اگر وہ تمنا کرتے تو اس کی نقل میں تواتر ہوتا اسی لیے کہ معاملہ بہت اہم ہے اس لیے کہ عدم تمنا کی صورت میں صحت نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ثبوت اور تمنا کی صورت میں اس کا بطلان ہوتا ہے۔ جو بات اس پایہ کی ہو وہ نہایت ہی اہم ہے لہٰذا اس کی نقل تواتر سے ضروری تھی جب یہ منقول نہیں تو واضح ہو گیا کہ ایسا نہیں ہوا

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رائے، احتیاط، انجام کے اعتبار سے حسنِ تدبیر، دینی و دنیاوی منصب، مملکت عظیمہ کے ایسے سربراہ ہیں کہ مخالف جبراً اور موافق طوعاً تابع ہونے میں سب سے مقدم ہیں تو آپ سے ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ تائید وحی الٰہی کے بغیر ایسے معاملہ کا چیلنج دے دیں جس کے انجام کے اعتبار سے بے خوف نہ ہوں اور یہ ڈر ہو کہ کہیں مخالف دلیل سے غالب نہ آجائے اس لیے کہ ہر صاحب عقل ایسے امور میں بات نہیں کرتا جس کا اسے تجربہ نہ ہو تو پھر سب سے بڑے اعقل العقلاء (عقلمند) کا مقام وشان کیا ہوگا؟ تو ثابت ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دلائل بیان نہیں کیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے آگاہ فرمایا یہ موت کی تمنا نہیں کریں گے

۳۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو مر جاتے اور اپنے دوزخی ٹھکانے دیکھ لیتے، اگر وہ مباہلہ کیلئے نکلتے تو واپسی پر نہ اہل کو پاتے اور نہ مال۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو تمام مر جاتے۔

الغرض تواتر کے ساتھ روایات سے ثابت ہے کہ انہوں نے تمنا موت نہیں کی تو حجت ثابت ہوگئی، اس استدلال کے خلاف یہ ہماری آخری گفتگو ہے اب آیئے تفسیر کرتے ہیں۔

ارشادِ ربانی "قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ" میں جنت مراد ہے کیونکہ دارِ آخرت میں مطلوب وہی ہے نہ کہ دوزخ اس لیے کہ وہ کہتے جنت ہماری ہے۔

عنداللہ۔ سے مراد مکان نہیں بلکہ مرتبہ ہے اسے جگہ پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے ممکن ہے یہود مشبہ (خالق کو مخلوق کے مشابہ ماننے والے) ہوں اور اللہ رب العزت کے لیے مقام وجگہ مانتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمادی۔

"خَالِصَةً" دار آخرت سے حال کی وجہ سے منصوب ہے وہ سالم کی سالم تمہارے لیے ہے تمہارے سوا اس میں کسی کا حق نہیں یعنی اگر تمہارا یہ قول درست ہے کہ جنتی صرف یہود ونصاریٰ ہیں۔ الناس سے جنس مراد ہے یا عہدی۔ مسلمان، جنس اولیٰ ہے اس لیے کہ الفاظ، اِلَّامَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ہیں۔

دوسرا یہ کہ یہاں معبود بھی کوئی نہیں۔ "مِنْ دُوْنِ النَّاسِ" یہاں دون بمعنی سوا نہ کہ بمعنی مکان جیسے کسی کو ہبہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ھذا لك من دون الناس (یہ فقط تیرے لیے ہے نہ کہ لوگوں کیلئے)

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کی تفسیر

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: یہ امر شرط مفقود (ان کا سچا ہونا) سے معلق ہے یعنی امر موجود نہیں اور اس سے غرض چیلنج اور ان کے دعویٰ میں جھوٹے ہونے کا اظہار ہے۔

دوسرا مسئلہ: تمنا میں دو اقوال ہیں

۱۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے یہ چیلنج ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بارے میں تمنا کریں جو جھوٹا ہے وہ مرجائے۔

۲۔ یہ کہیں کاش ہم مرجائیں۔

ثانی اولیٰ ہے کیونکہ الفاظ۔ سے اقرب ہے۔

ارشادِ ربانی "وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ" سے یقینی خبر ہے کہ یہ مستقبل میں بھی تمنا نہیں کریں گے اور یہ غیبی خبر ہے اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر کثرت، دواعی اور اس کلمہ کا بجالانا نہایت ہی آسان ہونے کے باوجود خبر دی کہ یہ اسے نہیں بجالائیں گے تو اس معاملہ کی یہ حتمی خبر ہے جس کی ضد پر امارات قائم ہیں لہٰذا اس کا حصول وحی کے بغیر ممکن نہیں۔

"اَبَدًا" یہ دوسری غیبی خبر ہے بتادیا اب بھی یہ نہیں کریں گے اور آئندہ بھی نہیں بلاشبہ عدمِ تمنا کی خبر تمام اوقات کے حوالے سے ہے اور لہٰذا یہ دونوں غیب ہوئے۔

"بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ" یہ علت کا بیان ہے کہ جس کی وجہ سے وہ تمنا نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ وہ اپنے طریقِ بد اور کثرت ذنوب سے آگاہ ہیں جو انہیں موت کی تمنا نہیں کرنے دیتے۔

"وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ" یہ زجر و تہدید ہے اس لیے کہ وہ راز اور سرگوشی جانتا ہے اور اس سے کوئی شی مخفی نہیں اگر انسان یہ تصور و عقیدہ بنالے تو اسے معاصی سے روکنے کا اعظم ذریعہ نصیب ہو جائے۔ "ظّٰلِمِیْنَ" فرمایا اس لیے کہ ہر کافر ظالم لیکن ہر ظالم کافر نہیں ہوتا جب ظالم عام تھا تو اس کا ذکر اولیٰ ٹھہرا۔

دو مقامات میں فرق کیوں؟

سوال: یہاں فرمایا: "وَلَنْ یَّتَمَنَّوْہُ اَبَدًا" لیکن سورۃ الجمعہ میں فرمایا: "وَلَا یَتَمَنَّوْنَہٗ اَبَدًا" یہاں "لَنْ" اور سورۂ جمعہ میں "لا" کی کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

جواب: یہاں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ دارِ آخرت ہماری ہی ہے اور سورۂ جمعہ میں دعویٰ ہے کہ ہم ہی اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو باطل فرمایا۔ بایں طور کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ موت کی تمنا کرتے۔ پہلا دعویٰ، دوسرے سے بڑا ہے اس لیے کہ انتہائی سعادت دار ثواب (جنت) کا حصول ہے اور مرتبہ ولایت اگرچہ اچھا ہے مگر یہ بھی جنت کا ذریعہ ہے تو جب پہلا دعوی اعظم ہے تو اس کا فاسد ہونا اللہ تعالیٰ نے لفظ "لَنْ" سے کیا۔ کیونکہ یہ لفظ نفی میں اقویٰ ہے جبکہ دوسرے دعویٰ کا درجہ یہ نہیں لہٰذا اس کے رد کیلئے لفظ "لا" پر اکتفا کیا اس لیے کہ یہ معنی نفی میں انتہائی قوت نہیں رکھتا۔ واللہ اعلم

[۹۶] وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ ۚ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِہٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

(اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہ کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے)

یہ زندگی پر حریص ہیں

جب اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں واضح کیا کہ یہ موت کی تمنا نہیں کریں گے تو یہاں فرمایا یہ زندگی پر نہایت ہی حریص ہیں

اس لیے کہ تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو نہ موت کی تمنا کرے اور نہ ہی زندگی کی تو فرمایا: "وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ" (تم انہیں سب لوگوں سے جینے میں زیادہ حریص پاؤ گے)

"لَتَجِدَنَّهُمْ" وجد بمعنی علم ہے جو دو مفاعیل چاہتا ہے مثلاً وجدت زیدا ذا حفاظ۔ یہاں اس کے "هُمْ" اور "اَحْرَصَ" مفعول ہیں "عَلٰى حَيٰوةٍ" نکرہ ہے اس لیے کہ یہ خاص طویل حیات مراد ہے اس لیے یہ قرأت حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی قرأت "علی الحیاۃ" سے وقیع ہے۔

واو میں تین اقوال

"وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا" میں واو کے بارے میں تین اقوال ہیں:

۱۔ شیخ فراء اور اصم کے نزدیک یہ عاطفہ ہے معنی یہ ہوگا یہود دیگر لوگوں سے اور مشرکین سے حیات و دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص ہیں جیسے هو أسخى الناس ومن حاتم۔ (وہ دیگر لوگوں حتیٰ کہ حاتم سے بھی زیادہ سخی ہے)

ذکرِ مشرکین الگ کیوں؟

سوال: کیا مشرکین، الناس کے تحت داخل نہیں؟

جواب: داخل ہیں لیکن ان کا ذکر الگ اس لیے کیا کہ ان کی حرص شدید ہے، اس میں عظیم زجر ہے کہ مشرکین جو آخرت و معاد پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو صرف اسی دنیا کو ہی جانتے ہیں ان کی دنیا کے ساتھ حرص بعید نہیں اس لیے کہ یہ ان کی جنت ہے، جب حرص میں ان سے ایسے لوگ بڑھ گئے جو کتاب رکھتے تھے اور وہ آخرت وجزا کا اقرار کرتے تھے تو اب وہ زجر اعظم کے ہی لائق تھے۔

حرص زیادہ کیوں؟

سوال: ان کی حرص، مشرکین سے کیوں زیادہ تھی؟

جواب: یہ جانتے تھے ہم سیدھے اور یقیناً دوزخ میں جائیں گے لیکن مشرکین یہ نہ جانتے تھے۔

۲۔ یہ واو استئنافیہ ہے "علی حیاۃ" پر پہلا جملہ مکمل ہے مقدر عبارت یوں ہے۔ ومن الذين اشركوا أناس يود أحدهم۔ یعنی موصوف حذف ہے جیسے ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (پ۲۳، الصافات:۱۶۴) اور فرشتے کہتے ہیں ہم میں ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے

۳۔ یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ ولتجدنهم وطائفة من الذين أشركوا أحرص الناس على حياة (یہ اور ایک مشرکین کا گروہ

زندگی پر دوسروں سے زیادہ حریص ہیں) پھر محبت کی تفسیر کی "یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ" یہ شیخ ابو مسلم کا قول ہے۔
پہلا قول اولیٰ ہے اس لیے کہ اس واقعہ کا تعلق صرف یہود سے ہے تو ظاہر اً مراد یہی ہے کہ یہود تمام لوگوں اور مشرکین سے زیادہ حریص ہیں تاکہ ان کے اس دعویٰ کا بُطلان اور اظہار کذب کا خوب رد ہو کہ دارِ آخرت ہماری ہے نہ کہ غیر کی۔ واللہ اعلم۔

دوسرا مسئلہ: "وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا" کی مراد میں تین اقوال ہیں:

۱۔ مجوس، یہ اپنے بادشاہوں سے کہا کرتے ہزار نیروز اور ہزار مہر جان زندہ رہو۔ حضرت ابن عباس سے ہے کہ یہ عجمی لوگوں کا قول ہے کہ ہزار سال جیو۔

۲۔ مشرکینِ عرب۔

۳ ہر مشرک جو آخرت نہیں مانتا ہم نے پیچھے بیان کیا یہ لوگ دنیا پر زیادہ حریص ہوں گے، "الف سنة" (ہزار سال) سے مراد عجمی لوگوں کا قول ہزار سال مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے جو کہ عربوں کے ہاں معروف ہے۔

یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ۔ اللہ تعالیٰ نے تمنا موت سے ان کا بُعد بیان کیا اور فرمایا وہ تو اس قدر زندگی و بقا چاہتے ہیں اور اس پر حرص شدید رکھتے ہیں۔ جن کا یہ حال ہو ان سے موت کی تمنا کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ کی تفسیر

اس میں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: وَمَا هُوَ سے کیا مراد ہے؟

تین اقوال ہیں:

۱۔ احدھم ہے یعنی ان میں سے کسی ایک کا بھی اس قدر عمر پانا عذاب نار سے نہیں بچا سکتا۔

۲۔ یعمر جس مصدر "عمر" پر دال ہے اور ان یعمر اس کا بدل ہے۔

۳۔ وہ مبھم ہے اور ان یعمر اس کی وضاحت ہے۔

دوسرا مسئلہ: زحزحة، دور ہونا اور بچنا۔ قاضی کہتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ازالہ عذاب میں کمی کی کوئی تاثیر ہی نہیں اگر اللہ تعالیٰ فرماتے: "وما هو بمبعده وبمنجيه" تو اس کی قلت تاثیر پر دلالت نہ ہوتی جیسے اس قول کی ہے۔

"وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ" بصر سے مراد کبھی علم ہوتا ہے۔ محاورہ ہے فلاں کی اس معاملہ میں نظر ہے یعنی وہ معرفت رکھتا ہے، کبھی یہ مراد ہوتا ہے کہ اس میں ایسی صفت ہے اگر مبصرات موجود ہوں تو وہ انہیں دیکھ لے، دونوں اوصاف اللہ تعالیٰ کے ہو سکتے ہیں اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ بعض اعمال دیکھے ہی نہیں جا سکتے تو ان کے ہاں بہر صورت بصر کا یہاں اطلاق علم پر ہی ہوگا۔ واللہ اعلم

[۹۷-۹۸] قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

(تم فرمادو جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اُتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا)

یہود کی برائیوں کی ایک اور نوع کا تذکرہ

یہ بھی یہود کے قبائح اور ان کے بداقوال وافعال کی نوع کا بیان ہے، یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: فرمان "قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ" کیلئے یہود کی طرف سے کسی ایسے معاملہ کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کہنے کا حکم دیا اور وہ امر قائم مقام ضرورت کے ہوگا اور اگر ان سے ایسا کوئی معاملہ ظاہر نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہرگز نہ ہوتا لہٰذا مفسرین نے متعدد امور ذکر کیے ہیں۔

آیات کا پسِ منظر

۱۔ حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ عبداللہ بن صوریا نے پوچھا: یا محمد! تمہاری نیند کیسی ہے؟ ہمیں آخر الزماں نبی کی نیند کے بارے میں اطلاع ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری آنکھیں سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ کہنے لگا: تم نے سچ کہا۔ مجھے بچے کے بارے میں بتائیں، وہ مرد سے ہوتا ہے یا عورت سے؟ فرمایا: ہڈیاں، پٹھے اور رگیں مرد سے اور گوشت، خون، ناخن و بال عورت سے ہوتے ہیں۔ کہنے لگا: تم نے سچ کہا، کیا وجہ مرد چچوں کے مشابہ نہ کہ ماموں کے یا ماموں کے مشابہ ہوتا ہے نہ کہ چچوں کے؟ فرمایا: جس کا نطفہ غالب آجائے اس کی مشابہت ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا: تم نے سچ کہا۔ کونسا طعام تھا جسے اسرائیل نے اپنے اُوپر حرام کیا اور تورات میں ہے نبی اُمی اس کی خبر دے گا؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: تمہیں اللہ کی قسم! جس نے تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی کیا تم جانتے ہو اسرائیل شدید اور طویل بیمار ہوگئے تو

اللہ کیلئے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے بیماری سے شفاء دی تو وہ اپنے اوپر محبوب کھانا اور پینا حرام ٹھہرالیں گے اور وہ اونٹ کا گوشت اور دودھ تھا۔ کہنے لگا: ہاں۔ ایک بات رہ گئی ہے اگر تم نے بتادی تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ کونسا فرشتہ تم پر اللہ کی وحی لاتا ہے؟ فرمایا: جبریل امین۔ کہنے لگا: یہ تو ہمارا دشمن ہے جو قتال اور عذاب لے کر آتا ہے۔ ہمارا رسول تو میکائیل ہے جو بشارت اور آسانی لاتا ہے اگر وحی لانے والے یہ ہوتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: حضرت جبریل سے تمہاری عداوت کی ابتدا کیسے ہوئی؟ کہنے لگا: عداوت کی ابتدا یوں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کو اطلاع دی عنقریب ایک شخص بیت المقدس کو تباہ کردے گا اس کا نام بُخت نصر ہے، اس کا تمام حلیہ بیان کیا ہم نے اسے تلاش کر کے قتل کیلئے آدمی بھیجے تو جبریل نے اس کا دفاع کیا اور کہا: جس پر تمہیں قتل کیلئے مسلط کیا ہے یہ بیت المقدس برباد کرنے والا نہیں۔ لہٰذا اس کے قتل میں کوئی فائدہ نہیں؟ پھر وہی آدمی جواں ہوا، بادشاہ بنا اور ہمارے خلاف لڑ کر بیت المقدس تباہ کیا اور ہمیں قتل کیا۔ اسی وجہ سے ہم اسے دشمن رکھتے ہیں۔ رہے حضرت میکائیل تو وہ حضرت جبریل کے دشمن ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں بتاتا ہوں جو جبریل کا دشمن ہے وہ میکائیل کا بھی دشمن ہے اور یہ دونوں بھی اس کے دشمن ہیں۔ ابن صوریا نے اس کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیات نازل فرمادئیں

۲۔ روایات میں ہے اعلیٰ مدینہ کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زمین تھی ان کا گزر مدارسِ یہود پر ہوتا ان کے ہاں کبھی بیٹھ کر گفتگو سنتے، وہ کہنے لگے، عمر ہم تم سے محبت کرتے ہیں اور ہمیں تمہاری فکر ہے۔ فرمایا: میں تمہارے پاس تمہاری محبت کی وجہ سے نہیں آیا اور نہ مجھے اپنے دین میں کوئی شبہ ہے جس کے ازالہ کیلئے آتا ہوں۔ میں تو اس لیے آتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرے ایمان میں اور اضافہ و بصیرت ہو اور تمہاری کُتب میں آپ کا تذکرہ دیکھ سکوں۔ انہوں نے آپ سے جبریل کے بارے میں پوچھا اور کہا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اسرار سے آگاہ کرتا ہے اور یہ عذاب وخسف لے کر آتا ہے۔ ہاں میکائیل سلامتی اور ہریالی لاتے ہیں۔ فرمایا: ان کا اللہ کے ہاں کیا درجہ ہے؟ کہنے لگے: بہت قرب والے ہیں۔ جبریل دائیں طرف اور میکائیل اس کے بائیں جانب ہے اور میکائیل، جبریل کے دشمن ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہارا قول درست ہے تو وہ دونوں دشمن نہیں ہو سکتے تم تو گدھے سے بھی زیادہ بے وقوف ہو اور جو ایک کا دشمن ہے وہ دوسرے کا بھی دشمن ہے اور جو ان دونوں کا دشمن وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس لوٹے تو حضرت جبریل امین پہلے وحی لے کر آچکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر تمہارے رب نے تمہاری موافقت کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس کے بعد میں دین میں پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔

فضل قدیر

۳۔ مقاتل کہتے ہیں: یہود نے کہا: جبریل ہمارا دشمن ہے اسے ہمارے اندر نبوت لانے کا حکم ہوا مگر غیر کے پاس چلا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں۔

واضح رہے اقرب یہی ہے کہ ان کی عداوتِ جبریل کا سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" بتا رہا ہے کہ نزول کو عداوت کا سبب نہیں بنانا چاہیے کیونکہ یہ تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا۔ لہٰذا اسے سببِ عداوت بنانا مناسب نہیں۔ اس کی تائید ان وجوہ سے ہوتی ہے:

۱۔ جبریل نے قرآن لایا جس میں فرمانبرداروں کیلئے ثواب اور عاصیوں کیلئے عذاب اور حرب وقتال کا حکم ہے وہ اس کے اختیاری عمل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کا وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس سے نہ تو خلاصی ہے اور نہ ہی مخالفت کی گنجائش۔ تو ایسی راہ پر چلنے والی شخصیت کے ساتھ عداوت، اللہ تعالیٰ کی عداوت کا سبب ہے اور یہ عداوت کفر ہے لہٰذا لازم آیا اس شخصیت کی عداوت بھی کفر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو اگر اس کتاب کی مثل لے کر آنے کا حکم دیا تو اس نے سرکشی کردی یا حکم الٰہی ماننے سے انکار کردیا تو یہ ملائکہ معصومین کے لائق ہی نہیں یا انہوں نے اسے قبول کر کے اس کے حکم کے مطابق پیغام پہنچا دیا تو اب حضرت میکائیل علیہ السلام پر بھی وہ اعتراض ہوں گے جو حضرت جبریل پر تھے تو عداوت کے ساتھ حضرت جبریل علیہ السلام کو ہی مخصوص کرنے کی کیا وجہ؟

۳۔ حضور پر نزول قرآن جیسا کہ یہود پر شاق ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نزول تورات دوسرے لوگوں پر شاق تھا اگر بعض لوگوں کی نفرت نزول قرآن کی قباحت کا تقاضا کرتی ہے تو پہلوں کی نفرت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر انزال تورات کی قباحت کا تقاضا کرنا چاہیے تھا تو اس کا باطل ہونا واضح ہے لہٰذا ان وجوہ سے ان کے اقوال کا فساد ثابت ہو گیا۔

دوسرا مسئلہ: کچھ لوگ یہود سے یہ قول نہیں مانتے کہ جبریل ان کے دشمن ہیں اس لیے کہ موجود یہود انکار کرتے ہوئے اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی کا قول یہ نہیں لیکن یہ باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قول نقل فرمایا ہے اور وہ سب سے بڑا صادق ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ شدید جاہل تھے انہوں نے ہی کہا تھا:

اِجْعَل لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (پ۹، الاعراف:۱۳۸) ہمیں ایک خدا بنا دے جیسے ان کیلئے اتنے خدا ہیں

تیسرا مسئلہ: شیخ ابنِ کثیر نے جبریل، جیم پر زبر، را کے نیچے زیر ہمزہ کے بغیر پڑھا۔امام حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے عاصم سے جیم اور را پر زبر اور ہمزہ، باقی نے جیم اور را کے نیچے زیر اور غیر ہمزہ بروزن قندیل پڑھا۔اس میں سات لُغات ہیں۔تین ہم نے ذکر کیں۔جبریل بروزن جراعل، جبرائیل بروزن جراعیل، جبرائیل بروزن جراعل، جبرین (نون) یہ معرفہ اور عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

چوتھا مسئلہ: جبریل کا معنی

بعض نے جبریل کا معنی عبداللہ کیا تو جبر ، عبد اور ایل ، اللہ اور میکائیل، عبداللہ، یہ حضرت ابن عباس اور اہلِ علم کی جماعت کا قول ہے۔

شیخ ابوعلی السوسی کہتے ہیں یہ دو وجہ سے درست نہیں:

۱۔ اسماءِ الٰہیہ میں "ایل" نہیں ہے۔

۲۔ اگر بات یوں ہوتی تو آخر اسم مجرور ہوتا۔

"فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ" کی تفسیر

اس میں چند سوالات ہیں:

پہلا سوال: "اِنَّہٗ" اور "نَزَّلَہٗ" میں ضمیر کس طرف ہے؟

جواب: اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ پہلی ضمیر سیدنا جبریل امین کی طرف ہے۔

۲۔ قرآن کی طرف ہے اگرچہ پہلے ذکر نہیں مگر معروف ہے، جیسے فرمان ہے:

وَمَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (پ۲۲، فاطر:۴۵) تو زمین کی پیٹھ پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑا

یہاں ضمیر "ارض" کی طرف ہے۔

یہ حضرت ابنِ عباس اور اکثر اہلِ علم کا قول ہے یعنی اگر ان کی عداوت اسی لیے ہے کہ جبریل قرآن لاتے ہیں تو ان پر واضح ہو جانا چاہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لاتے ہیں۔صاحبِ کشاف کہتے ہیں ایسی شیٔ کی طرف ضمیر لوٹانا جس کا پیچھے ذکر نہ ہو اس کی عظمتِ شان کو واضح کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی معروف ہے گویا وہ اپنی ذات پر شاہد ہے اور اسی کے نام کے بجائے اس کی صفت کا ذکر کر دیا ہے۔

۲۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو نازل کیا وہ خود نازل نہیں ہوئے۔

دوسرا سوال: قرآن، حضور ﷺ پر نازل ہوا حالانکہ فرمایا "نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِكَ" اس میں کیا حکمت؟ جواب: ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ شعراء کی آیت:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ (پ۱۹، الشعراء: ۱۹۳) اسے روح الامین لے کر اترا تمہارے دل پر

کے تحت کی ہے اکثر اُمت کا موقف یہی ہے کہ نزول قرآن آپ پر ہوا نہ کہ قلب انور پر البتہ قلب کا ذکر اس لیے ہے کہ نازل کرنے والے نے اسے آپ کے قلب انور میں محفوظ کر دیا تاکہ آپ امت تک پہنچا سکیں جب امت تک ادائیگی کے لئے قلب میں محفوظ کرنا ضروری تھا تو اب کہا جا سکتا ہے: "نزله علی قلبك" اگرچہ حقیقتاً نزولِ آپ پر ہوا نہ کہ آپ کے قلب انور پر۔

تیسرا سوال: کلام کا تقاضا "عَلٰی قَلْبِیْ" (میرے دل پر) ہے؟

جواب: بطور حکایت کلامِ الٰہی ہے گویا فرمایا گیا میرے قول کو نقل کرو اور کہو: "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ"

چوتھا سوال: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ، جزا شرط کیسے بن سکتا ہے؟

جواب: دو وجہ سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا یہ عداوت غلط ہے اس لیے کہ وہ کتاب جس میں بشارت و ہدایت ہے اس کے لانے کا انہیں حکم ہوا جب وہ مامور ہیں تو معذور ٹھہرے بلکہ جب وہ ہدایت اور بشارت لائے تو ان کا مشکور ہونا لازم تھا تو اب ان کے ساتھ عداوت کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اگر وہ ان کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں تو انہیں حق ہے کیونکہ یہ تم پر کتاب لے کر آئے جو تمہاری نبوت پر برہان اور تمہارے صدق کی تصدیق کرنے والی ہے اور یہ اسے ناپسند کرتے ہیں تو یہ اسے کیوں ناپسند نہیں کریں گے جو آپ کے معاملہ کو پختہ کرے گا۔

بِاِذْنِ اللہ کی تفسیر

"بِاِذْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے حکم سے) تو علم کے بجائے حکم سے تفسیر کرنا تین وجوہات سے اولیٰ ہے۔

۱۔ اذن کا حقیقی معنی امر ہے اور علم مجازی معنی ہے جہاں تک ممکن ہو لفظ کو حقیقی معنی پر رکھنا لازم ہوتا ہے۔

۲۔ انزال، فرائض میں سے ہے اور یہ امر و حکم سے ثابت ہے نہ کہ علم سے۔

۳۔ جب یہ انزال امر لازم کی بنا پر ہوگا تو حجت میں زیادہ مؤکد ہوگا۔

"مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" کی تفسیر

اکثر مفسرین کا اجماع ہے مراد سابقہ کتب ہیں، کسی مخصوص کو مراد نہ لیا جائے بعض نے تورات مراد لی اور کہا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نبوت محمدی ﷺ پر دلالت میں قرآن کے موافق ہے۔

سوال: کیا احکامِ قرآن باقی کتب کے احکام کے مخالف نہیں؟ تو جب یہ ان احکام کی تصدیق نہیں کرتا تو صرف دلائل توحید اور نبوت میں موافق ہونے کی وجہ سے مصدق کہنا کیسے اولیٰ ہوسکتا ہے؟ یعنی اسے غیر مصدق بھی کہا جاسکتا ہے۔

جواب: ان کتب میں جو احکام تھے وہ انہی اوقات کیلئے تھے موجود حالات کیلئے نہیں تھے اس لیے کہ نسخ مدت عبادت کی انتہا کا بیان ہوتا ہے تو اب شرائع کا اختلاف قرآن اور دیگر کتب میں نہ رہا۔

قرآن دو چیزوں ہدایت و بشارت پر مشتمل ہے

۱۔ اس میں ان اعمال قلبی اور اعمال اعضاء کا بیان ہے جس کا انسان کو پابند کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ ہدایت ہے۔

۲۔ یہ بیان کہ ان اعمال کی بجا آوری پر ثواب کس قدر حاصل ہوگا اسی اعتبار سے یہ بشارت ہے۔

جب اول، دوسرے پر وجود میں مقدم ہے تو اللہ تعالیٰ نے لفظ ھدیٰ کو بشریٰ سے مقدم فرمایا۔

سوال: اس کی ہدایت اور بشارت کو اہلِ ایمان کے ساتھ مخصوص کیوں کیا؟ حالانکہ یہ شان تمام کے اعتبار سے ہے۔

جواب: اس کے متعدد جوابات ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے مخصوص فرمایا کہ وہی اس سے ہدایت پاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ"

۲۔ یہ بشارت فقط اہلِ ایمان کیلئے ہے کیونکہ بشارت وہ خبر ہے جو خیر عظیم کے حصول پر دال ہو اور یہ صرف اہلِ ایمان کا ہی حصہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں مخصوص فرمایا۔

دوسری آیت "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ" کے بارے میں واضح رہے کہ جب پہلی آیت میں فرمایا: "جو جبریل کا دشمن ہے" اس لیے کہ وہ قلب محمدی ﷺ پر قرآن لے کر نازل ہوئے تو اب لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہو اور اس آیت میں واضح کیا جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے وہ جبریل کا بھی دشمن ہے تو واضح کیا ان کی عداوت پر انہیں عظیم ضرر بصورت عداوتِ الٰہی مل رہا ہے اس لیے کہ ان کی عداوت نہ مؤثر، نہ نافع اور نہ نقصان دہ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ان سے عداوت دائمی تکلیف دہ عذاب کی صورت میں ہے جس سے بڑھ کر کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔

چند سوالات

پہلا سوال: یہ اللہ کے دشمن کیسے ہوسکتے ہیں جب عداوت کیلئے دشمن کی طرف سے نقصان کا خدشہ ہونا چاہیے اور یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہے؟

اولیاء اللہ کی عداوت اللہ سے عداوت ہے

جواب: حقیقی طور پر معنی عداوت ہمارے اندر ہی پایا جاتا ہے اس لیے کہ دشمن دوسرے کو نقصان دینا چاہتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہے لہٰذا یہاں ان دو میں سے ایک مراد ہوسکتا ہے۔

۱۔ ان کی عداوت اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے ہو تو اسے عداوتِ الٰہی قرار دے دیا، جیسے فرمان ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ — وہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں ان کی جزا یہ ہے

(پ ۶، المائدۃ: ۳۳)

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (پ ۲۲، الاحزاب: ۵۷) — بیشک جو ایذاء دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو

ان دونوں مقامات پر اولیاء اللہ سے عداوت مراد ہے اس لیے کہ محاربت اور اذیت اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔

۲۔ ان کا طاعت و عبادت الٰہی کو ناپسند کرنا اور اس سے دور رہنا مراد ہوسکتا ہے اس لیے کہ دشمن اپنے دشمن کی مخالفت کرتا ہے نہ کہ طاعت تو اسی وجہ سے ان کے عمل کو عداوت قرار دیا گیا البتہ حضرت جبریل علیہ السلام اور رسلان کرام کے ساتھ ان کی عداوت ہوسکتی ہے کیونکہ ان کا نقصان ممکن ہے البتہ ان کی عداوت ان پر بھی مؤثر نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ امور موثرہ سے عاجز ہیں لیکن ان کی عداوت یہود میں مؤثر ہے جو دنیا میں بصورت ذلت و مسکنت اور آخرت میں دائمی عذاب ہے۔

دوسرا سوال: جب حضرت جبریل اور میکائیل ملائکہ میں شامل ہیں تو ان کا ذکر بعد میں کیوں ہوا؟

جواب: اس کا جواب کئی طرح ہے

۱۔ ان کی فضیلت کی وجہ سے ہوا گویا وہ اپنے کمالِ فضل کی بنا پر ملائکہ کے علاوہ دوسری جنس بن چکے ہیں۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان انہی دونوں کا تذکرہ ہوا تھا اور آیات بھی انہی کی وجہ سے نازل ہوئیں لہٰذا ان کے ناموں کی تصریح ضروری تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں دیگر ملائکہ سے افضل ہیں ورنہ یہ تاویل درست نہ ہوگی۔

سیدنا جبریل امین کی فضیلت

جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم یہ واضح کرنا چاہ رہے ہیں کہ حضرت جبریل، حضرت میکائیل سے افضل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کا ذکر مقدم کیا اور مفضول کا ذکر فاضل پر مقدم کرنا عرفی طور پر قبیح ہے لہٰذا یہ شرعاً بھی قبیح ہوگا حضور علیہ السلام کا فرمان ہے جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھا ہوتا ہے۔

۲۔ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن، وحی اور علم لے کر نازل ہوئے جو بقاء ارواح کا مادہ ہے اور حضرت میکائیل علیہ السلام، سبزہ (رزق) اور بارش لاتے ہیں جو مادہ اجسام ہے جب علم، غذا سے افضل ہے تو حضرت جبریل علیہ السلام بھی حضرت میکائیل علیہ السلام سے افضل ٹھہرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کی یہ شان بیان کی:

مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ (پ ۳۰، التکویر: ۲۱) اس کا حکم مانا جاتا ہے امانت دار ہے

یہاں صفت ''مُطاع'' ان کی اطاعت مطلق بیان ہوئی جو ظاہراً تقاضا کر رہی ہے کہ اطاعت کرنے والوں میں حضرت میکائیل علیہ السلام بھی ہیں لہٰذا حضرت جبریل علیہ السلام کا ان سے افضل ہونا ضروری ہے۔

دوسرا مسئلہ: شیخ ابوعمرو، حفص نے عاصم سے میکال بروزن قنطار نقل کیا۔ امام نافع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ہمزہ کے بعد یا نہیں یہ بروزن میکاعل ہے باقی نے میکائیل بروزن میکاعیل پڑھا ہے۔ اس میں یہ بھی لغات ہیں میکئیل بروزن میکعیل، میکئیل بروزن کمیکعیل،۔ ابن جنی کہتے ہیں جب عرب عجمی لفظ بولتے ہیں تو اختلاط ہو جاتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: جبریل و میکائیل کے درمیان واؤ کو بعض نے عاطفہ اور بعض نے بمعنیٰ ''اَوْ'' قرار دیا یعنی ان میں سے کس ایک کا بھی دشمن، اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے۔

چوتھا مسئلہ: ''عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ'' یہاں ضمیر کے بجائے اسم ظاہر لایا گیا تا کہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے دشمن ہے اور ملائکہ کی عداوت کفر ہے۔

[۹۹] وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

(اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اُتاریں اوران کے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ)

رزائل یہود کی ایک اورنوع کا بیان

یہ ان کے قبائح اور رزائل کی ایک اورنوع کا بیان ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔ یہود حضور ﷺ کی آمد سے پہلے اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے فتح مانگتے تھے۔ جب آپ کی بعثت عربوں میں ہوئی تو انہوں نے اپنے قول کا انکار کرتے ہوئے کفر کیا، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہنے لگے یہود، اللہ سے ڈرو اور اسلام لاؤ تم ہم پر حضور ﷺ کے وسیلہ سے فتح کی دعا کیا کرتے، ہم مشرک تھے اور تم ہمیں آپ کی بعثت اور شانوں سے آگاہ کیا کرتے تھے تو بعض نے کہا یہ ایسے معجزات لے کر نہیں آئے جن کا بیان ہم تم سے کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

چند مسائل

پہلا مسئلہ: آیات بینات-قرآن

مختار یہ ہے کہ آیات بینات سے مراد قرآن ہے جس کی مثل جن وانس نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے معاون بن جائیں۔ بعض نے کہا: قرآن کے ساتھ ساتھ دیگر دلائل بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ان کا مباہلہ نہ کرنا، موت کی تمنا نہ کرنا اور دیگر معجزات مثلاً قلیل طعام سے کثیر کا سیر ہو جانا، مقدس انگلیوں سے چشموں کا بہہ جانا اور قمر کا پھٹنا۔

قاضی کہتے ہیں اولیٰ یہی ہے کہ قرآن مراد لیا جائے اس لیے کہ آیات کے ساتھ جب نزول کا ذکر آئے تو قرآن ہی مراد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

دوسرا مسئلہ: قرآن کو آیات قرار دینے کی حکمت

قرآن کو آیات (دلائل) قرار دینے کی چند وجوہ ہیں:

۱۔ آیت دلالت رکھتی ہے تو جب قرآن کا بعض اپنی فصاحت کی وجہ سے صدقِ مدعیٰ پر دال ہے تو قرآن آیات ٹھہرے گا۔

۲۔ بعض آیات غیبی اخبار پر دال ہیں تو یہ قرآن ان غیوب پر دال ہے۔

۳۔ یہ دلائل توحید، نبوت اور شرائع پر دال ہیں تو یہ اس جہت سے آیات ہیں۔

بینات صفت کی وجہ

سوال: ہر دلیل بین ہوتی ہے تو پھر آیات کی صفت بینات کیوں؟

جواب: اس کا جواب یہ نہیں دیا جا سکتا کہ بعض دلائل دوسروں سے زیادہ بین ہوتے ہیں اس لیے کہ یہ تب درست ہو جب علوم میں بعض کا دوسروں پر اقوی ہونا ممکن ہو اور یہ محال ہے کیونکہ کسی شی کے عالم کو اپنے اعتقاد کے مخالف جانب کا جواز حاصل ہوگا یا نہ ہوگا اگر جانب مخالف کا جواز حاصل ہے تو وہ اعتقاد علم نہیں اور اگر حاصل نہیں تو محال کہ دوسری شی اس سے مؤکد ہو۔

لہٰذا ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ نفس علم میں تفاوت نہیں ہوتا البتہ طریق علم میں ہوسکتا ہے کیونکہ علوم کی باعتبار طریق حصول تقسیم ہوتی ہے تو جس دلیل کے مقدمات زیادہ ہوں گے اس کی طرف وصول مشکل ہوگا اور جس کے مقدمات کم ہوں گے اسی کی طرف وصول اقرب ہوگا اور یہی دلیل بین کہلائے گی۔

تیسرا مسئلہ: انزال، اُوپر سے شی کا نیچے کی طرف حرکت کرنا ہے یہ چیز جسم میں ہوتی ہے کلام میں محال ہے لیکن جب حضرت جبریل علیہ السلام اُوپر سے نیچے آئے اور اس کی خبر دی تو اسے انزال قرار دے دیا۔

"وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُوْنَ" کی تفسیر

اس میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: آیات سے کفر کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ انہیں درست جانتے ہوئے ان کا انکار۔

۲۔ جہالت، عدمِ تدبر اور دلائل سے اعراض کی وجہ سے ان کا انکار۔

ظاہراً کسی کی تخصیص نہیں لہٰذا تمام صورتیں ہوسکتی ہیں۔

دوسرا مسئلہ: فسق کا مفہوم

لغۃً فسق انسان کا مقرر حد سے نکلنا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ — سوا ابلیس کے قوم جن سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے نکل گیا

(پ۱۵، الکہف:۵۰)

جب تر کھجور سے گٹھلی نکلے تو عرب "فسقت النواۃ" کہتے ہیں فجور کا معنی بھی اسی کے قریب ہے کیونکہ وہ "فجور السد" سے ہے جو پانی کو فاسد ہونے کی جگہ سے بچائے۔

صاحب صغیرہ اور فسق

سوال: کیا صاحبِ صغیرہ اللہ کے حکم سے تجاوز نہیں کرتا لیکن اسے فاسق وفاجر نہیں کہا جاتا؟

جواب: ان دونوں کا اطلاق اس معاملہ پر ہوتا ہے جو بڑا ہو کیونکہ جس نے نہر سے چھوٹا سوراخ کیا اسے نہر کھودنے والا نہیں کہا جاتا۔اسی طرح فاسق تب کہیں گے جب زیادتی بڑی ہو۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو "اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ" میں دو وجہ ہیں:

۱۔ ہر کافر فاسق ہے لیکن برعکس نہیں گویا فاسق کا اطلاق کافر اور غیر کافر دونوں پر ہوتا ہے لہٰذا اس کا ذکر اولیٰ ہے۔

۲۔ وہ کافر مراد ہو جو کفر کی ہر حد سے متجاوز ہو تو اب معنی یہ ہوگا جب یہ آیات ظاہر و بین ہیں تو ان کے ساتھ کفر کرنے والا کافر، کفر کی آخری اور ہر اس حد سے متجاوز ہوتا ہے جو عقل وشرع کی نظر میں مستحسن تھی۔

[۱۰۰] اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

(اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں ان میں ایک فریق اُسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں اکثر کا ایمان نہیں)

رزائل یہود کی ایک اور نوع کا تذکرہ

یہ بھی ان کے قبائح کی ایک اور نوع کا بیان ہے۔یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: "اَوَ کُلَّمَا" میں واؤ عاطفہ اور اس پر ہمزہ استفہام داخل ہے بعض نے واؤ کو زائد قرار دیا لیکن یہ صحیح نہیں اس لیے کہ جب معنی درست ہے تو پھر زائدہ قرار دینا درست نہیں ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: صاحب کشاف کہتے ہیں واؤ عاطفہ اور محذوف پر عطف ہے کہ انہوں نے آیاتِ بینات سے بھی کفر کیا اور جب بھی عہد کیا،ابو سماک نے واؤ کو ساکن پڑھا۔"فاسقون"،"الذین فسقوا" کے مفہوم میں ہے۔گویا فرمایا: نہیں ان کے ساتھ کفر کیا مگر جنہوں نے فسق اختیار کیا اور اللہ کا عہد کئی بار توڑا۔اسے "عوھدوا وعھدوا" بھی پڑھا گیا

تیسرا مسئلہ: اس استفہام سے انکار اور ان کے اقدام کو بڑا قرار دینا مقصود ہے اس لیے کہ اس لفظ کا استعمال نہایت ہی برا قرار دینے اور خاموش کر دینے میں مبالغہ کیلئے ہے۔

اور "اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا" واضح کر رہا ہے کہ انہوں نے لگا تار عہد توڑے اور انہیں پس پشت ڈال دیا بلکہ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ گویا یہ ان کی عادت بن گئی تھی تو گویا ان آیات سے کفر پر حضور ﷺ کو تسلی دی یہ کوئی انہوں نے نیا کام نہیں کیا بلکہ یہ تو ان کی طبیعت، ان کے اور ان کے سلف کی عادت ہے جیسا کہ اوپر آیات میں بیان ہوا کہ انہوں نے عہد در عہد توڑ ڈالے اس لیے کہ جن کا طریقہ ہی یہی ہو تو اس کی مخالفت نفس پر شاق نہیں گزرتی۔ جس قدر اس کی مخالفت جس کی عادت نہ ہو۔

چوتھا مسئلہ: عہد کی صورتیں

۱۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبوت محمدی ﷺ اور آپ کی شریعت کی صحت پر دلائل دیے تو گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہد تھا اور ان کا ان دلائل کو قبول کرنا ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کی طرح تھا۔

۲۔ وہ عہد جو حضور ﷺ کی آمد سے پہلے تھا کہ جب ان کی بعثت ہوگئی ہم ان پر ایمان لائیں گے اور مشرکین کو یہاں سے نکال دیں گے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے انہوں نے متعدد عہد کیے اور پھر انہیں توڑ ڈالا۔

۴۔ یہود نے عہد کیا تھا کہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کافر کی مدد نہیں کریں گے لیکن انہوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے غزوہ خندق کے موقع پر قریش کی مدد کی۔

دلائل عقلیہ پر اگر یہ روایت درست ہے تو یہ آیت کے تحت داخل ہوگی لیکن اس کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے بلکہ اقرب یہ ہے کہ وہی مراد ہو جس کا تعلق آیات اللہ سے کفر کے ساتھ ہے۔ جب معاملہ یوں ہے تو اسے ہر اس نقضِ عہد پر محمول کرنا اقوی ہوگا جو سابقہ کتب اور صحت قول اور نبوت محمدی ﷺ پر مشتمل ہے۔

پانچواں مسئلہ: "نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ" (ایک فریق نے پھینک دیا) فرمایا: اس لیے کہ جن سے عہد لیا ان میں ایمان دار بھی تھے یا آئندہ ایمان لانے والے بھی تھے تو جب یہ تمام کی صفت نہ تھی تو فریق کا ذکر کیا۔ پھر اس گمان کا امکان تھا کہ وہ کم ہوں۔ تو فرمایا:

"بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ اکثر فُساق، حسد اور سرکشی کی وجہ سے کبھی بھی آپ کی تصدیق نہیں کریں گے۔

۲۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ یہ اپنی کتاب کی تصدیق کرنے والے نہیں کیونکہ یہ تو اپنی قوم میں رسول کے ساتھ منافقین کی طرح ہیں ان کے سامنے کتاب و رسول پر ایمان کی بات کرتے ہیں مگر اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے کیلئے تیار ہی نہیں۔

[۱۰۱] وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

(اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے)

تصدیقِ رسول کا معنیٰ

''رسول ان کی تصدیق کرتے ہیں'' کا معنی یہ ہے کہ وہ نبوت موسیٰ اور صحت تورات کے معترف ہیں یا یوں کہ تورات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی جب آپ تشریف لے آئے تو محض آپ کی آمد نے ہی تورات کی تصدیق کر دی۔ ''نَبَذَ فَرِیْقٌ'' یہ ان کے ترک و اعراض کی مثال ہے کہ اس شئی کی طرح جسے بطور بے نیازی اور قلتِ التفات پشت پیچھے پھینک دیتا ہے۔

''مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' میں دو اقوال ہیں:

۱۔ مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب کا علم تھا وہ اسی کا درس لیتے اور یاد کرتے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فریق کا وصف علم بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ''

۲۔ جو لوگ کتاب سے تمسک کا دعویٰ کرتے تھے خواہ انہیں اس کا علم تھا یا نہ تھا جیسے اہلِ ایمان کو اہل قرآن کہہ دیا جاتا ہے اس سے مراد اس کے علوم کے ماہر نہیں ہوتے بلکہ اس پر ایمان لانے اور اس کے حکم پر چلنے والے مراد ہوتے ہیں۔

''كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ'' بعض نے تورات اور بعض نے قرآن مراد لیا تورات دو وجہ سے اقرب ہے:

۱۔ پھینکنا وہاں ہوتا ہے جب پہلے تمسک ہو اگر اس کی طرف وہ متوجہ ہی نہ ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے اسے پھینک دیا اور یہ بات تورات میں تھی۔

۲۔ فرمایا: ''نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' اگر قرآن مراد ہوتا تو پھر ایک فریق کی تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ ان تمام نے قرآن کی تصدیق نہیں کی۔

۲۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ یہ اپنی کتاب کی تصدیق کرنے والے نہیں کیونکہ یہ تو اپنی قوم میں رسول کے ساتھ منافقین کی طرح ہیں ان کے سامنے کتاب ورسول پر ایمان کی بات کرتے ہیں مگر اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے کیلئے تیار ہی نہیں۔

[۱۰۱] وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

(اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے)

تصدیقِ رسول کا معنیٰ

''رسول ان کی تصدیق کرتے ہیں'' کا معنی یہ ہے کہ وہ نبوت موسیٰ اور صحت تورات کے معترف ہیں یا یوں کہ تورات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی جب آپ تشریف لے آئے تو محض آپ کی آمد نے ہی تورات کی تصدیق کردی۔ ''نَبَذَ فَرِيْقٌ'' یہ ان کے ترک واعراض کی مثال ہے کہ اس شیٔ کی طرح جسے بطور بے نیازی اور قلتِ التفات پشت پیچھے پھینک دیتا ہے۔

''مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' میں دو اقوال ہیں:

۱۔ مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب کا علم تھا وہ اسی کا درس لیتے اور یاد کرتے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فریق کا وصف علم بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ''

۲۔ جو لوگ کتاب سے تمسک کا دعویٰ کرتے تھے خواہ انہیں اس کا علم تھا یا نہ تھا جیسے اہلِ ایمان کو اہل قرآن کہہ دیا جاتا ہے اس سے مراد اس کے علوم کے ماہر نہیں ہوتے بلکہ اس پر ایمان لانے اور اس کے حکم پر چلنے والے مراد ہوتے ہیں۔

''كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ'' بعض نے تورات اور بعض نے قرآن مراد لیا تورات دو وجہ سے اقرب ہے:

۱۔ پھینکنا وہاں ہوتا ہے جب پہلے تمسک ہو اگر اس کی طرف وہ متوجہ ہی نہ ہوں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اسے پھینک دیا اور یہ بات تورات میں تھی۔

۲۔ فرمایا: ''نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' اگر قرآن مراد ہوتا تو پھر ایک فریق کی تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ ان تمام نے قرآن کی تصدیق نہیں کی۔

تورات پھینکنے سے مراد

سوال: تورات کے ساتھ تو وہ تمسک کرتے تھے تو پھر پھینکنے کا کیا معنی؟

جواب: جب اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، نعت اور شان کا ذکر اور لزوم ایمان کی بات آتی تو اس سے اعراض کر لیتے ہیں تو یہ ان کا تورات کو پھینکنا ہے "كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔ یہ الفاظ واضح کر رہے ہیں انہوں نے جاننے کے بعد پھینکا کیونکہ یہ بات عالم سے کہی جاسکتی ہے اس اعتبار سے آیت بتا رہی ہے یہ فریق حضور کی نبوت کی صحت کو جانتا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور یہ ثابت ہے کہ عظیم تعداد نے انکار نہیں کیا تو یہ جان بوجھ کر انکار کرنے والے تعداد میں کم تھے جن سے مکابرہ جائز ہے۔

[۱۰۲] وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

(اور اس کی پیروی کی جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں اور وہ (جادو) جو دو فرشتوں ہارون اور ماروت پر بابل میں اُترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش (میں) ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو وہ ان سے سیکھتے جس سے وہ مرد اور اس کی عورت میں جدائی ڈالیں اور اس سے خدا کے حکم کے بغیر کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا نفع نہ دے گا اور یقیناً ضرور انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور یقیناً بہت بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کاش انہیں علم ہوتا)

تورات پھینکنے سے مراد

سوال: تورات کے ساتھ تو وہ تمسک کرتے تھے تو پھر پھینکنے کا کیا معنی؟

جواب: جب اس میں حضور ﷺ کی نبوت، نعت اور شان کا ذکر اور لزومِ ایمان کی بات آتی تو اس سے اعراض کر لیتے ہیں تو یہ ان کا تورات کو پھینکنا ہے "کَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔ یہ الفاظ واضح کر رہے ہیں انہوں نے جاننے کے بعد پھینکا کیونکہ یہ بات عالم سے کہی جا سکتی ہے اس اعتبار سے آیت بتا رہی ہے یہ فریق حضور کی نبوت کی صحت کو جانتا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور یہ ثابت ہے کہ عظیم تعداد نے انکار نہیں کیا تو یہ جان بوجھ کر انکار کرنے والے تعداد میں کم تھے جن سے مکابرہ جائز ہے۔

[۱۰۲] وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

(اور اس کی پیروی کی جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں اور وہ (جادو) جو دو فرشتوں ہاروں اور ماروت پر بابل میں اُترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش (میں) ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو وہ ان سے سیکھتے جس سے وہ مرد اور اس کی عورت میں جدائی ڈالیں اور اس سے خدا کے حکم کے بغیر کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا نفع نہ دے گا اور یقیناً ضرور انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور یقیناً بہت بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کاش انہیں علم ہوتا)

افعالِ بد کی ایک اور نوع کا تذکرہ

یہ ان کے افعال بد کی ایک اور نوع کا تذکرہ ہے اور وہ ان کا جادوگر ہونا، اسی کی طرف متوجہ ہونا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینا ہے ارشادِ ربانی "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" میں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: "وَاتَّبَعُوْا" کا فاعل یہود ہیں جن کا تذکرہ چلا آ رہا ہے۔ پھر یہاں چند اقوال ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کے یہود مراد ہیں۔

۲۔ گذشتہ یہود مراد ہیں۔

۳۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے جادوگر مراد ہیں کیونکہ اکثر یہود ان کی نبوت کے منکر اور انہیں دنیاوی بادشاہ ہی جانتے تھے اور ممکن ہے وہ لوگ یہ تصور رکھتے ہوں کہ یہ ملک عظیم بھی انہیں جادو کی وجہ سے ملا ہے۔

۴۔ یہ تمام کو شامل ہے اور یہی اولیٰ ہے جب تخصیص پر دلیل کوئی نہیں تو اب بعض مراد لینا اور بعض کو ترک کرنا اولیٰ نہیں ہوگا۔

شیخ سدی کہتے ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی تو انہوں نے تورات کے ساتھ معارضہ کیا لیکن تورات اور قرآن کا اتفاق تھا تو انہوں نے تورات پھینک دی اور کتاب آصف اور ہاروت و ماروت کا جادو پکڑ لیا جو قرآن کے موافق نہ تھے اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کا یہی مفہوم ہے: "وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ" اور اس کے بعد بتایا انہوں نے جادو کی اتباع کرلی۔

دوسرا مسئلہ: "تَتْلُوْا" کی متعدد تفاسیر

۱۔ اس سے مراد تلاوت و اخبار ہے۔

۲۔ امام ابو مسلم کہتے ہیں، انہوں نے ملک سلیمان پر جھوٹ باندھا جھوٹ کیلئے تلا علیہ اور سچ کیلئے تلا عنہ اور مبہم بات میں دونوں طرح جائز ہے۔ اقرب اول معنی ہے کیونکہ تلاوت حقیقی خبر ہوتی ہے ہاں خبر دینے والا امتیاز کیلئے مذکورہ محاورات کہہ سکتا ہے لیکن جب روی عن فلان اخبر عن فلان تلا عن فلان کہا جائے گا تو خبر و تلاوت ہی مراد ہوگی اور یہ بھی امکان ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں جو انہوں نے خبر دی اس میں یہ تمام اوصاف ہوں۔

تیسرا مسئلہ: شیاطین میں اختلاف ہے

۱۔ اکثر کے نزدیک شیاطین سے جن مراد ہیں۔

۲۔ متکلمین معتزلہ کے ہاں شیاطین سے انسان مراد ہیں۔

۳۔ دونوں مراد ہیں۔

اول کی دلیل یہ ہے کہ شیاطین، سن کر باتیں چوری کرتے، پھر ان کے ساتھ متعدد جھوٹ ملا کر کاہنوں اور نجومیوں کو بتاتے جو اپنی کتب میں لکھ کر لوگوں کو سکھاتے اور یہ چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں خوب مشہور تھی حتیٰ کہ ان کا عقیدہ تھا جنات غیب جانتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم بھی یہی ہے اور اسی کی وجہ سے ان کا ملک قائم ہے اور ان کی وجہ سے جن وانس اور ہوا ان کے حکم کے تابع ہے۔

دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو خصوصی علوم عطا فرمائے تھے انہوں نے اپنے تخت کے نیچے دفن کیے تھے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ اگر ظاہر میں یہ ختم ہو گئے تو مدفون تو باقی رہ جائیں گے۔ جب ان پر مدت گزر گئی تو وہ منافقین کے ہاتھ لگ گئے۔ انہوں نے ان کے مناسب دیگر جادو کی اشیاء شامل کر دیں آپ کے وصال کے بعد انہوں نے لوگوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا وظیفہ تھا اور انہیں سب کچھ اسی کی وجہ سے حاصل تھا یہ معنیٰ "وَمَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ" کا ہے۔

اس قول والوں نے اول قول کے فساد پر یوں استدلال کیا اگر جنات کتب وشرائع انبیاء کی تبدیلی پر اسی طرح قادر ہوتے کہ وہ لوگوں کے درمیان محرف صورت میں باقی رہیں تو پھر تمام شرائع سے اعتماد اٹھ جائے گا اور اسی وجہ سے تمام ادیان پر طعن ہوگا

سوال: جب تم نے انسانوں سے مان لیا تو شیطان جنات سے کیوں نہیں مانتے؟

جواب: فرق ہے اگر انسان کرے گا تو اس کا کسی نہ کسی طریق سے اظہار ہو جاتا ہے لیکن جنات سے اگر مان لیں کہ انہوں نے خط سلیمان علیہ السلام کی طرح خط کا اضافہ کر دیا تو وہ ظاہر نہ ہوگا بلکہ مخفی ہوگا لہٰذا تمام ادیان پر طعن کا سبب بن جائے گا۔

چوتھا مسئلہ: "عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ" کی تفسیر

۱۔ ابن جریج کے بقول علیٰ بمعنیٰ 'فِی' ہے۔

۲۔ لفظ عہد مقدر ہے "علی عهد ملك سليمان" اقرب یہی ہے مراد یہ ہو کہ انہوں نے شیاطین کی باتوں کی اتباع میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک پر افتراء باندھا کیونکہ وہ کتب سحر پڑھتے اور کہتے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی علم کی وجہ سے یہ سب کچھ پایا تو ان کتب کی تلاوت ملکِ سلیمان پر افترا کی طرح ہے۔

۲۔ متکلمین معتزلہ کے ہاں شیاطین سے انسان مراد ہیں۔

۳۔ دونوں مراد ہیں۔

اول کی دلیل یہ ہے کہ شیاطین، سن کر باتیں چوری کرتے، پھر ان کے ساتھ متعدد جھوٹ ملا کر کاہنوں اور نجومیوں کو بتاتے جو اپنی کتب میں لکھ کر لوگوں کو سکھاتے اور یہ چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں خوب مشہور تھی حتیٰ کہ ان کا عقیدہ تھا جنات غیب جانتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم بھی یہی ہے اور اسی کی وجہ سے ان کا ملک قائم ہے اور ان کی وجہ سے جن وانس اور ہوا ان کے حکم کے تابع ہے۔

دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو خصوصی علوم عطا فرمائے تھے انہوں نے اپنے تخت کے نیچے دفن کیے تھے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ اگر ظاہر میں یہ ختم ہوگئے تو مدفون تو باقی رہ جائیں گے۔ جب ان پر مدت گزر گئی تو وہ منافقین کے ہاتھ لگ گئے۔ انہوں نے ان کے مناسب دیگر جادو کی اشیاء شامل کر دیں آپ کے وصال کے بعد انہوں نے لوگوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا وظیفہ تھا اور انہیں سب کچھ اسی کی وجہ سے حاصل تھا یہ معنیٰ "وَمَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ" کا ہے۔

اس قول والوں نے اول قول کے فساد پر یوں استدلال کیا اگر جنات کتب وشرائع انبیاء کی تبدیلی پر اسی طرح قادر ہوتے کہ وہ لوگوں کے درمیان محرف صورت میں باقی رہیں تو پھر تمام شرائع سے اعتماد اٹھ جائے گا اور اسی وجہ سے تمام ادیان پر طعن ہوگا

سوال: جب تم نے انسانوں سے مان لیا تو شیطان جنات سے کیوں نہیں مانتے؟

جواب: فرق ہے اگر انسان کرے گا تو اس کا کسی نہ کسی طریق سے اظہار ہو جاتا ہے لیکن جنات سے اگر مان لیں کہ انہوں نے خط سلیمان علیہ السلام کی طرح خط کا اضافہ کر دیا تو وہ ظاہر نہ ہوگا بلکہ مخفی ہوگا لہٰذا تمام ادیان پر طعن کا سبب بن جائے گا۔

چوتھا مسئلہ: "عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" کی تفسیر

۱۔ ابن جریج کے بقول علی بمعنیٰ فِی ہے۔

۲۔ لفظ عہد مقدر ہے "علی عهد ملك سليمان" اقرب یہی ہے مراد یہ ہو کہ انہوں نے شیاطین کی باتوں کی اتباع میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک پر افتراء باندھا کیونکہ وہ کتب سحر پڑھتے اور کہتے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی علم کی وجہ سے یہ سب کچھ پایا تو ان کتب کی تلاوت ملکِ سلیمان پر افترا کی طرح ہے۔

پانچواں مسئلہ: ملک سلیمان سے کیا مراد ہے؟

۱۔ قاضی کہتے ہیں، نبوت یا اس میں نبوت داخل ہے اور نبوت کے تحت نازل کردہ کتاب اور شریعت ہے۔

نوٹ: آگے عبارت مکمل نہیں محشی و مصحح نے بھی یہی بات کہی ہے۔ (قادری غفرلہ)

پھر قوم نے صحیفہ نکالا جس میں انواعِ جادو تھیں جسے انہوں نے تخت کے نیچے دفن کیا ہوا تھا اسے ان کی موت کے بعد نکالا اور لوگوں کو وہم پیدا کیا کہ اس کی وجہ سے حکومت تھی، میرے نزدیک اصح یہی ہے کہ قوم نے جب یہ دعویٰ کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس علم کے سبب حکومت پائی گویا دعویٰ حکومت سلیمانی پر افترا کی راہ ٹھہرا۔

چھٹا مسئلہ: انہوں نے کس وجہ سے جادو کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کی؟ متعدد وجوہ ہیں:

۱۔ آپ کی تعظیم و شان کی وجہ سے تا کہ لوگوں کو اس کی قبولیت میں ترغیب ہو۔

۲۔ یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت تسلیم نہ کرتے تھے بلکہ کہتے یہ ساری حکومت جادو کی وجہ سے ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جب جنّات کو آپ کے تابع کیا تو وہ آپ کے پاس آتے جاتے اور ان سے متعدد اسرار کا استفادہ کرتے تو انہیں گماں ہوا کہ آپ نے ان کا جادو سیکھا ہے۔

ارشادِ ربانی "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ" سے آپ کی کفر سے برأت کا اعلان ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ قوم نے آپ کی طرف کفر و سحر کی نسبت کی تھی۔ یہاں چند اشیاء ہیں:

۱۔ بعض روایاتِ یہود میں ہے کہ وہ کہتے محمد پر تعجب ہے کہ کہتے ہیں سلیمان نبی تھے حالانکہ وہ تو ساحر تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ یہودی ساحر کہتے تھے ہم نے جادو حضرت سلیمان علیہ السلام سے سیکھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی برأت بیان کی۔

۳۔ لوگوں کا خیال تھا ان کا ملک جادو کی وجہ سے تھا تو اللہ تعالیٰ نے بری قرار دیتے ہوئے واضح کیا وہ نبی تھے لہٰذا ان کا جادوگر ہونا اس کے منافی ہے پھر فرمایا: جس سے وہ بری ہیں وہ ان کے غیر کے ساتھ متصل ہے۔ فرمایا: "وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا" انہوں نے جادو کو اپنا پیشہ بنایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا پھر واضح کیا کہ انہوں نے کیا کفر کیا؟ کیونکہ یہ وہم ممکن تھا کہ انہوں نے اولاً جادو کے ساتھ کفر نہ کیا ہو۔ فرمایا: "يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ"

جادو پر گفتگو

جادو پر کئی طرح گفتگو ہے:

پہلا مسئلہ: لغوی بحث، اہلِ لغت کے ہاں وہ چیز جو لطیف ہو اور اس کا سبب مخفی ہو، سحر (حا پر زبر) مخفی غذا اور جس کی گزرگاہ آسان ہو، لبید کہتے ہیں۔

ونسحر بالطعام وبالشراب

اس کے دو مفہوم بیان ہوئے ہیں:

۱۔ ہم مسحور ومخدوع کی طرح دھوکہ اور بیماری میں آئے۔

۲۔ ہم نے طعام وشراب کو غذا بنایا، دونوں صورتوں میں خفا موجود ہے اور کہا:

فان تسألينا فيم نحن فاننا
عصافير من هذا الأنام المسحر

اس میں معنی اول کا احتمال ہے لیکن دوسرے کا بھی احتمال یوں ہو سکتا ہے کہ مسحر سے مراد صاحب جادو ہو۔ یہ بھی خفا کی طرف راجع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال میرے سحر (حلقوم) اور نحر (سینہ) کے درمیان ہوا۔ (البخاری، ۱۳۸۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (پ۱۹، الشعراء:۱۵۳) تم پر تو جادو ہوا ہے

یعنی اس مخلوق میں سے جو کھاتی پیتی ہے اس پر یہ قول دال ہے:

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (پ۱۹، الشعراء:۱۵۴) تم تو ہمیں جیسے آدمی ہو

ممکن ہے یہ مفہوم ہو کہ تم ہماری طرح جادوگر ہو، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نقل فرمایا کہ انہوں نے جادوگروں سے کہا:

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (پ۱۱-یونس:۸۱) یہ جو تم لائے یہ جادو ہے اللہ اسے باطل کر دے گا۔

اور فرمایا:

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (پ۹-الاعراف:۱۱۶) جب انہوں نے ڈالا لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں ڈرایا

دوسرا مسئلہ: عرفِ شرع اور جادو

واضح ہو عرف شرع میں سحر ہر اس امر کے ساتھ مخصوص ہے جس کا سبب مخفی ہو اور اسے خلاف حقیقت خیال کیا جائے اور دھوکہ و بناوٹ سمجھا جائے۔ جب اس کا ذکر بغیر قید ہو تو وہاں فاعل کی مذمت مقصود ہوتی ہے۔ جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

سَحَرُوٓا اَعۡيُنَ النَّاسِ (پ۹، الاعراف:۱۱۶) انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا

یعنی انہوں نے لوگوں کو ایسا چکر دیا حتیٰ کہ انہوں نے خیال کیا کہ رسیاں اور لکڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ ارشاد ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى (پ۱۶، طہٰ:۶۶) جادو کے زور سے ان کے خیال میں دوڑتی ہوئی معلوم ہوئیں

کبھی لفظ سحر مقید ہو کر بطور مدح و تعریف آتا ہے، روایت میں ہے زبرقان بن بدر اور عمرو بن اہتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو سے کہا: زبرقان کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا: یہ اپنے علاقہ میں مقتدا، شدید جنگجو۔

زبرقان کہنے لگا: اللہ کی قسم یہ جانتا ہے کہ میں اس سے افضل ہوں تو عمرو نے بڑے فصیح الفاظ میں اس کی مذمت کی کہ یہ بے وقوف باپ کا بیٹا اور اس کا خالو نہایت ہی کمینہ ہے۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من البیان لسحراً (البخاری، ۵۱۴۶) کچھ بیان جادو ہوتے ہیں

یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیانات کو سحر فرمایا۔ کیونکہ ایسا آدمی اپنے حسنِ بیان اور بلیغ عبارت کے ذریعے مشکل شی کی حقیقت سے پردہ اٹھا کر اسے واضح کر دیتا ہے۔

سوال: جو حق کو واضح اور آشکار کر دے اسے سحر کیسے کہا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہاں تو مخفی کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ ظاہر کا اخفاء حالانکہ لفظ سحر میں ظاہر کا اخفاء ہوتا ہے۔

جواب: اسے دو وجہ سے سحر کہا گیا ہے:

۱۔ یہ اپنے لطف و حسن کی وجہ سے دلوں کو مائل کر لیتا ہے تو اسے سحر کے ساتھ مشابہت ہوگئی کیونکہ وہ بھی دلوں کو مائل کر لیتا ہے تو اس وجہ سے اسے سحر قرار دیا نہ کہ اس وجہ سے جو تم سمجھ رہے ہو۔

۲۔ بیان پر قادر آدمی بد کو حسین اور حسین کو بد کرنے پر قادر ہوتا ہے تو اس وجہ سے بھی اس کی جادو کے ساتھ مشابہت ہے۔

تیسرا مسئلہ: اقسامِ جادو

سحر کی چند اقسام ہیں:

جادو کی پہلی قسم

کلدانی اور کسدانی کا جادو جو قدیم زمانہ میں تھے، ستاروں کی پوجا کرتے اور انہیں عالم میں متصرف مانتے اور کہتے خیر، شر، سعادت اور نحوست ان کی وجہ سے ہے، ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ ان کے عقائد اور مذہب کا رد کریں۔

تمام معتزلہ اس پر متفق ہیں۔ غیر اللہ، جسم، حیات، رنگ اور ذائقہ کی خلقت پر قادر نہیں۔ قاضی نے تفسیر میں ان کے دلائل کا خلاصہ ذکر کیا ہے ہم انہیں نقل کر کے ان کی کمزوری واضح کر دیتے ہیں۔

۱۔ عقلی دلیل جس پر ان کا مدار ہے وہ یہ ہے ہر ماسویٰ اللہ متحیز ہوگا یا قائم با متحیز۔ اگر غیر اللہ فاعل جسم وحیات ہو تو وہ غیر ضرور متحیز ہوگا اور وہ متحیز یقیناً قادر بالقدرت ہوگا کیونکہ اگر وہ قادر لذاتہ ہوگا تو ہر جسم کی یہ شان ہوتی کیونکہ تمام اجسام آپس میں متماثل ہیں لیکن قادر بالقدرت سے جسم وحیات کا فعل درست نہیں اس پر دو دلائل ہیں:

۱۔ بداہۃً واضح ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ابتداً جسم وحیات پر قادر نہیں۔ اس کے امتناع میں ہماری قدرت مشترک ہے تو یہ امتناع حکم مشترک ہے۔ لہٰذا یہاں علت مشترکہ ہوگی اور یہاں سوائے اس کے کوئی اشتراک نہیں کہ ہم قادر بالقدرت ہیں جب یہ مسلم وثابت ہے تو جو قادر بالقدرت ہوگا اس کیلئے فعل جسم وحیات متعذر رہوگا۔

۲۔ ہماری قدرت ایک دوسرے سے مخالف ہے اگر ہمیں خلق جسم وحیات پر قدرت صالحہ ہوتی تو بعض کی بعض میں مخالفت نہ ہوتی اور اگر خلق جسم وحیات کی صلاحیت کیلئے اس قدر مخالفت کافی ہوتی تو ضروری ہے یہ قدرت ایک دوسرے کے مخالف ہو اور خلق جسم وحیات کیلئے صالح ہو جب معاملہ یوں نہیں تو ہم جان لیں قادر بالقدرت خلق جسم وحیات پر قادر نہیں۔

۲۔ اگر ہم اسے جائز مانیں تو معجزات سے نبوات پر استدلال متعذر رہو جائے گا۔ اس لیے کہ اگر ہم خوارق کا حدوث قوی سماوی اور ارضی کے اتصال سے جائز مان لیں تو قطعی نہیں رہے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر صادر ہونے والے خوارق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں بلکہ جائز ہوگا کہ وہ بطور جادو انہیں کر دیں تو اب ہر طرح نبوات کا قول باطل ٹھہرے گا۔

۳۔ اگر ہم مان لیں کہ لوگوں میں خلق جسم، حیات اور الوان پر قدرت ہے تو ایسا انسان اموال عظیمہ کے حصول پر بغیر مشقت

تیسرا مسئلہ: اقسامِ جادو

سحر کی چند اقسام ہیں:

جادو کی پہلی قسم

کلدانی اور کسدانی کا جادو جو قدیم زمانہ میں تھے، ستاروں کی پوجا کرتے اور انہیں عالم میں متصرف مانتے اور کہتے خیر، شر، سعادت اور نحوست ان کی وجہ سے ہے، ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ ان کے عقائد اور مذہب کا رد کریں۔

تمام معتزلہ اس پر متفق ہیں۔ غیر اللہ، جسم، حیات، رنگ اور ذائقہ کی خلقت پر قادر نہیں۔ قاضی نے تفسیر میں ان کے دلائل کا خلاصہ ذکر کیا ہے، ہم انہیں نقل کر کے ان کی کمزوری واضح کر دیتے ہیں۔

۱۔ عقلی دلیل جس پر ان کا مدار ہے وہ یہ ہے ہر ماسویٰ اللہ متحیز ہوگا یا قائم با متحیز۔ اگر غیر اللہ فاعل جسم وحیات ہو تو وہ غیر ضرور متحیز ہوگا اور وہ متحیز یقیناً قادر بالقدرت ہوگا کیونکہ اگر وہ قادر لذاتہ ہوگا تو ہر جسم کی یہ شان ہوتی کیونکہ تمام اجسام آپس میں متماثل ہیں لیکن قادر بالقدرت سے جسم وحیات کا فعل درست نہیں اس پر دو دلائل ہیں:

۱۔ بداہۃً واضح ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ابتداً جسم وحیات پر قادر نہیں۔ اس کے امتناع میں ہماری قدرت مشترک ہے تو یہ امتناع حکم مشترک ہے۔ لہٰذا یہاں علت مشترکہ ہوگی اور یہاں سوائے اس کے کوئی اشتراک نہیں کہ ہم قادر بالقدرت ہیں جب یہ مسلم وثابت ہے تو جو قادر بالقدرت ہوگا اس کیلئے فعل جسم وحیات متعذر رہوگا۔

۲۔ ہماری قدرت ایک دوسرے سے مخالف ہے اگر ہمیں خلق جسم وحیات پر قدرت صالحہ ہوتی تو بعض کی بعض میں مخالفت نہ ہوتی اور اگر خلق جسم وحیات کی صلاحیت کیلئے اس قدر مخالفت کافی ہوتی تو ضروری ہے یہ قدرت ایک دوسرے کے مخالف ہو اور خلق جسم وحیات کیلئے صالح ہو جب معاملہ یوں نہیں تو ہم جان لیں قادر بالقدرت خلق جسم وحیات پر قادر نہیں۔

۲۔ اگر ہم اسے جائز مانیں تو معجزات سے نبوات پر استدلال متعذر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اگر ہم خوارق کا حدوث قوی سماوی اور ارضی کے اتصال سے جائز مان لیں تو قطعی نہیں رہے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر صادر ہونے والے خوارق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں بلکہ جائز ہوگا کہ وہ بطور جادو انہیں کر دیں تو اب ہر طرح نبوات کا قول باطل ٹھہرے گا۔

۳۔ اگر ہم مان لیں کہ لوگوں میں خلق جسم، حیات اور الوان پر قدرت ہے تو ایسا انسان اموال عظیمہ کے حصول پر بغیر مشقت

قادر ہوگا لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ جادوگر شدید جدوجہد کے باوجود حقیر مال حاصل کرسکتا ہے لہٰذا ہم اس کے کذب سے آگاہ ہو گئے اس طریقہ سے ہم جان لیں گے کہ کیمیا کا دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ بھی باطل ہے کیونکہ اگر وہ غیر سونے کو سونا بنانے پر قادر ہوتے تو یا تو قلیل مال سے ایسا ہو جاتا تو اب لازمی طور پر وہ اپنے آپ کو مشقت وذلت سے محفوظ کر لیتے۔ یا وہ آلات عظیمہ اور اموال خطیرہ سے کام بنتا تو پھر لازماً وہ اس کا اظہار بڑے بڑے بادشاہوں کیلئے کرتے بلکہ بادشاہ پر اسے سیکھنا لازم تھا کیونکہ یہ ان کیلئے علاقے فتح کرنے سے انفع ہے۔

اور ہمارے علم میں ہے کہ ایسا کرنے سے وہ بھاگتے ہیں جو اس قول کے فساد پر شاہد ہے۔

قاضی کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا، ساحر اس میں سے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ واضح رہے یہ دلائل ضعیف ہیں

پہلی وجہ: اس پر کیا دلیل ہے کہ ماسویٰ اللہ یا تو متحیز ہے یا قائم بالمتحیز۔ کیا تمہیں علم نہیں فلاسفہ عقل، نفوس فلکیہ اور نفوس ناطقہ کے اثبات پر مصر ہیں اور ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ فی نفسہٖ نہ متحیز ہیں اور نہ اس کے ساتھ قائم ہیں تو اس کے فساد پر کونسی دلیل ہے؟ اگر سوال اٹھے وہ اسی طرح موجود ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے مثل ہو جائیں گے۔ ہم کہتے ہیں ہم اسے نہیں مانتے کیونکہ اسلوب میں اشتراک ماہیت میں اشتراک کا تقاضا نہیں کرتا اگر ہم اسے مان لیں تو یہ کیوں جائز نہیں کہ بعض اجسام اس پر لذاتہ قادر ہوں؟ ان کا یہ کہنا کہ اجسام متماثل ہیں اگر ایک جسم ایسا ہوا تو دوسرا بھی ایسے ہوگا؟ ہم کہتے ہیں تماثل اجسام پر کونسی دلیل ہے؟ اگر وہ سوال اٹھائیں جسم کا مفہوم ممتد فی الجہات اور مشاغل لاحیاز ہے اور اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں۔ ہم کہتے ہیں: یہ ان کی صفت ہے اور لازم ہے یہ بعید نہیں کہ اشیاء ماہیت میں مختلف اور لوازم میں مشترک ہوں، اگر ہم مان لیں کہ قادر بالقدرت ہونا لازم ہے تو تم کیوں کہتے ہو کہ ایسا قادر خلق جسم وحیات پر قادر نہیں؟ یہ کہنا قدرت اس امتناع میں مشترک ہے اور امتناع حکم مشترک ہے۔ لہٰذا علت مشترکہ ضروری اور سوائے قادر بالقدرت ہونے کے اشتراک کوئی نہیں۔ ہم کہتے ہیں: یہ تمام مقدمات ہم نہیں مانتے۔ ہم امتناع کو حکم معلل نہیں مانتے اس لیے کہ یہ عدمی ہے اور عدم معلل نہیں بن سکتا۔ اگر مان لیں یہ وجودی ہے لیکن ان کا مذہب یہ ہے کہ اکثر احکام معلل نہیں ہوتے تو کیوں جائز نہیں کہ یہاں بھی معاملہ یہی ہو۔ اگر مان لیں یہ معلل ہے تو کیا وجہ تم کہتے ہو کہ حکم مشترک کیلئے علت مشترکہ ضروری ہے۔ کیا: ظلم میں قبح بحیث ظلم ہونے کے بطور معلل حاصل نہیں۔ اسی طرح کذب میں بھی اور جہل میں بھی؟ ہم مان لیتے ہیں علت مشترکہ ضروری ہے لیکن ہم یہ نہیں مانتے کہ ان کا فقط قادر بالقدرت ہونا ہی مشترک ہے۔ یہ کیوں جائز نہیں کہ ان کی قدرت مشترکہ کسی معین وصف میں ہو اور قدرت الٰہی ہو جو تخلیق جسم کی صالح ہو اور اس وصف سے خارج ہو اور معاملہ کے ایسا نہ ہونے پر کیا دلیل ہے؟

پہلی وجہ: تو ہوسکتا ہے کہ اس قدرت کی مخالفت بعض قدر سے اس قدر شدید نہ ہو جو اس بعض کی دوسرے بعض کے ساتھ ہے۔

ہم کہتے ہیں: یہ ضعیف ہے کیونکہ ہم اس قدر کی مخالفت کو خلق جسم کی صلاحیت کا معلل قرار نہیں دے رہے بلکہ اس کو معین خصوصیت قرار دے رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ دیگر کے مخالف ہے اور اس خصوصیت کے بارے میں آشکار ہے کہ یہ باقی قدر میں حاصل نہیں اس کی نظیر یوں ہے کہ صوت کی مخالفت بیاض سے، مخالفت سواد کی بیاض سے زیادہ شدید نہیں اگر یہ مخالفت مانع ہے اس سے کہ صورت کو دیکھا جائے تو لازم ہے سواد مخالف بیاض ہو کہ اس کے دیکھنے میں مانع ہو، جب یہ کلام فاسد ہے تو جو کچھ انہوں نے کہا وہ بھی فاسد ہوگا۔ قاضی پر تعجب جب انہوں نے مسئلہ رؤیت (دیدارِ الٰہی) میں یہ وجوہ اشاعرہ سے نقل کر کے انہی سوالات سے انہیں کمزور ثابت کیا، پھر خود ہی انہی سے استدلال کیا اس مسئلہ پر جو اثباتِ نبوت میں اصل ہے اور رد ہے ان لوگوں کا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان واسطہ ثابت کیا۔

دوسری وجہ: کہ اس اصل کے جواز پر صحت نبوات کا قول باقی نہیں رہے گا۔ ہم کہتے ہیں صحت نبوات کا قول اس قاعدہ کے فساد پر متفرع ہے یا نہیں؟ اگر اول صورت ہے تو صحت نبوات کی بنا پر اس اصل کا فساد نہیں ہوگا ورنہ دور لازم اور اگر وہ دوسری صورت ہے تو یہ کلام بالکلیہ ساقط ہو جائے گا۔

تیسری وجہ: سائل کہہ سکتا ہے کہ کلام امکان میں ہے۔

اور ہم نہیں کہتے کہ یہ حالت ہر ایک کو حاصل ہے بلکہ یہ حالت انسان کو دور کے زمانوں میں حاصل ہوگی لہٰذا تمہارے بات ہمیں لازم نہیں آتی۔ یہ جادو کی نوع اول میں گفتگو تھی۔

جادو کی دوسری قسم

جادو کی دوسری قسم یہ ہے۔ اصحاب اوہام اور نفس قوی جادو کرے۔ جب کہا جاتا ہے: انہ ما ھو؟ تو اس کے مفہوم پر اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں اس سے باڈی مراد ہے، بعض نے کہا وہ جسم جو اس باڈی میں حلول کیے ہے بعض نے کہا وہ موجود ہے لیکن نہ جسم اور نہ جسمانی، جب ہم کہتے ہیں انسان باڈی کا نام ہے تو یہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے یہ کیوں ممکن نہیں کہ بعض ٹھنڈے اوقات میں اتفاق ہو کہ نواحی میں ایسا مزاج ہو کہ خلق جسم پر قدرت اور ہم سے امور غائبہ ومتعذرہ کا علم رکھتا ہو۔

اسی طرح اس صورت میں گفتگو ہے جب انسان اس باڈی میں جسم ساری ہو، لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان، نفس ہے تو یہ کہنا جائز کیوں نہیں کہ نفوس مختلف ہیں تو کسی نفس میں یہ اتفاق ہوسکتا ہے کہ وہ لذاتہ ان حوادثات عجیبہ کے قادر اور اسرار غائبہ پر مطلع

پہلی وجہ: تو ہوسکتا ہے کہ اس قدرت کی مخالفت بعض قدر سے اس قدر شدید نہ ہو جو اس بعض کی دوسرے بعض کے ساتھ ہے۔

ہم کہتے ہیں: یہ ضعیف ہے کیونکہ ہم اس قدر کی مخالفت کو خلق جسم کی صلاحیت کا معلل قرار نہیں دے رہے بلکہ اس کو معین خصوصیت قرار دے رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ دیگر کے مخالف ہے اور اس خصوصیت کے بارے میں آشکار ہے کہ یہ باقی قدر میں حاصل نہیں اس کی نظیر یوں ہے کہ صوت کی مخالفت بیاض سے، مخالفت سواد کی بیاض سے زیادہ شدید نہیں اگر یہ مخالفت مانع ہے اس سے کہ صورت کو دیکھا جائے تو لازم ہے سواد مخالف بیاض ہو کہ اس کے دیکھنے میں مانع ہو، جب یہ کلام فاسد ہے تو جو کچھ انہوں نے کہا وہ بھی فاسد ہوگا۔ قاضی پر تعجب جب انہوں نے مسئلہ رؤیت (دیدار الٰہی) میں یہ وجوہ اشاعرہ سے نقل کر کے انہی سوالات سے انہیں کمزور ثابت کیا، پھر خود ہی انہی سے استدلال کیا اس مسئلہ پر جو اثباتِ نبوت میں اصل ہے اور رد ہے ان لوگوں کا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان واسطہ ثابت کیا۔

دوسری وجہ: کہ اس اصل کے جواز پر صحت نبوات کا قول باقی نہیں رہے گا۔ ہم کہتے ہیں صحت نبوات کا قول اس قاعدہ کے فساد پر متفرع ہے یا نہیں؟ اگر اول صورت ہے تو صحت نبوات کی بنا پر اس اصل کا فساد نہیں ہوگا ورنہ دور لازم اور اگر وہ دوسری صورت ہے تو یہ کلام بالکلیہ ساقط ہو جائے گا۔

تیسری وجہ: سائل کہہ سکتا ہے کہ کلام امکان میں ہے۔

اور ہم نہیں کہتے کہ یہ حالت ہر ایک کو حاصل ہے بلکہ یہ حالت انسان کو دور کے زمانوں میں حاصل ہوگی لہٰذا تمہارے بات ہمیں لازم نہیں آتی۔ یہ جادو کی نوع اول میں گفتگو تھی۔

جادو کی دوسری قسم

جادو کی دوسری قسم یہ ہے۔ اصحاب اوہام اور نفس قوی جادو کرے۔ جب کہا جاتا ہے: انا ما ھو؟ تو اس کے مفہوم پر اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں اس سے باڈی مراد ہے، بعض نے کہا وہ جسم جو اس باڈی میں حلول کیے ہے بعض نے کہا وہ موجود ہے لیکن نہ جسم اور نہ جسمانی، جب ہم کہتے ہیں انسان باڈی کا نام ہے تو یہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے یہ کیوں ممکن نہیں کہ بعض ٹھنڈے اوقات میں اتفاق ہو کہ نواحی میں ایسا مزاج ہو کہ خلق جسم پر قدرت اور ہم سے امور غائبہ ومتعذرہ کا علم رکھتا ہو۔

اسی طرح اس صورت میں گفتگو ہے جب انسان اس باڈی میں جسم ساری ہو، لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان، نفس ہے تو یہ کہنا جائز کیوں نہیں کہ نفوس مختلف ہیں تو کسی نفس میں یہ اتفاق ہوسکتا ہے کہ وہ لذاتہ ان حوادثات عجیبہ کے قادر اور اسرار غائبہ پر مطلع

ہواوراس احتمال کے فساد پر سوائے سابقہ وجوہ کے کوئی دلیل نہیں اوران وجوہ کا بطلان ثابت ہو چکا ہے۔

پھراس احتمال میں یہ دلائل تاکید پیدا کرتے ہیں۔

۱۔ لکڑی کا ٹکڑا اگرزمین پر ہوتو اس پر انسان کا چلنا ممکن ہے لیکن آگ پر پل کی صورت میں ہوتو اس پر چلنا دشوار ہوگا۔ یہاں صرف گر جانے کا خیال قوی ہوجانے کی وجہ سے گرادیتا ہے۔

۲۔ اطباء کا اتفاق ہے کہ صاحب نکسیر، سرخ اشیاء نہ دیکھے اور صاحب مرگی زیادہ چمک والی اشیاء نہ دیکھے اوراس کی وجہ نفوس کا اوہام کے تابع ہونا ہے۔

۳۔ صاحب شفاء نے طبائع حیوان کے بارے میں ارسطو سے نقل کیا مرغی جب آواز میں اور لڑنے میں مرغ کے زیادہ مشابہ ہو تواس کی پنڈلی پر وہی چیز اُگ آتی ہے جو مرغ کی پنڈلی پر ہوتی ہے اس کے بعد صاحب شفاء نے لکھا یہ بات دلالت کرتی ہے کہ احوال جسمانی، نفسانی احوال کے تابع ہوتے ہیں۔

۴۔ اُمتوں کا اتفاق ہے زبانی دعا جو طلب دل سے خالی ہو وہ قلیل العمل اور غیر مؤثر ہوتی ہے۔

یہ دلالت کررہی ہے کہ ارادوں اور نفوس کے اثرات ہوتے ہیں اور یہ اتفاق کسی معین مسئلہ اور مخصوص حکمت کے ساتھ مخصوص نہیں۔

اب اگرآپ انصاف سے کام لیں تو معلوم ہورہا ہے کہ افعال حیوانیہ کے مبادی قریبہ محض تصورات نفسانیہ ہی ہیں اس لیے کہ پٹھوں میں قوت محرکہ غریزہ فعل یااس کے ترک یااس کی ضد کے صالح ہوتے ہیں اورایک کو دوسرے پر کسی مرجح کی وجہ سے ترجیح ہوگی اور وہ فعل کا جمیل یالذیذ یا یہ تصور کہ فعل قبیح یا تکلیف دہ ہے، یہ تصورات ہی ایسے مبادی ہیں جوان افعال کے مبادی کیلئے ہیں تو یہ مبادی افعال کا خود بھی مبادی بننا کونسا بعید ہے واسطہ درمیان سے ختم ہوجائے گا۔

۵۔ تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہیں کہ تصورات، ابدان میں حدوث کیفیات کیلئے مبادی قریبہ ہیں۔ کیونکہ غضب سختی طبیعت سے سخت ہوتا ہے حتیٰ کہ سختی اسے بہت زیادہ تقویت دیتی ہے۔

بادشاہ کا واقعہ

منقول ہے کسی بادشاہ کو فالج ہوا، اطباء علاج سے عاجز آگئے تو ایک حاذق حکیم اچانک اس پر داخل ہوااوراس نے اسے خوب سنائیں، گالیاں دیں اورعزت پر حملہ آور ہوا، بادشاہ غضب میں آگیا تو وہ اپنے موت کے بستر سے جوش میں آکر اٹھنے لگا تو اس کی بیماری اور مرض مہلک اس سے ختم ہوگئی تو جب تصورات بدن میں حدوث حوادث کیلئے تصورات مبادی ہیں تو خارج بدن

ہو اور اس احتمال کے فساد پر سوائے سابقہ وجوہ کے کوئی دلیل نہیں اور ان وجوہ کا بطلان ثابت ہو چکا ہے۔

پھر اس احتمال میں یہ دلائل تاکید پیدا کرتے ہیں۔

۱۔ لکڑی کا ٹکڑا اگر زمین پر ہو تو اس پر انسان کا چلنا ممکن ہے لیکن آگ پر پل کی صورت میں ہو تو اس پر چلنا دشوار ہوگا۔ یہاں صرف گر جانے کا خیال قوی ہو جانے کی وجہ سے گرا دیتا ہے۔

۲۔ اطباء کا اتفاق ہے کہ صاحب نکسیر، سرخ اشیاء نہ دیکھے اور صاحب مرگی زیادہ چمک والی اشیاء نہ دیکھے اور اس کی وجہ نفوس کا اوہام کے تابع ہونا ہے۔

۳۔ صاحبِ شفاء نے طبائع حیوان کے بارے میں ارسطو سے نقل کیا مرغی جب آواز میں اور لڑنے میں مرغ کے زیادہ مشابہ ہو تو اس کی پنڈلی پر وہی چیز اُگ آتی ہے جو مرغ کی پنڈلی پر ہوتی ہے اس کے بعد صاحب شفاء نے لکھا یہ بات دلالت کرتی ہے کہ احوال جسمانی، نفسانی احوال کے تابع ہوتے ہیں۔

۴۔ اُمتوں کا اتفاق ہے زبانی دعا جو طلب دل سے خالی ہو وہ قلیل العمل اور غیر مؤثر ہوتی ہے۔

یہ دلالت کر رہی ہے کہ ارادوں اور نفوس کے اثرات ہوتے ہیں اور یہ اتفاق کسی معین مسئلہ اور مخصوص حکمت کے ساتھ مخصوص نہیں۔

اب اگر آپ انصاف سے کام لیں تو معلوم ہو رہا ہے کہ افعال حیوانیہ کے مبادی قریبہ محض تصورات نفسانیہ ہی ہیں اس لیے کہ پٹھوں میں قوت محرکہ غریزہ فعل یا اس کے ترک یا اس کی ضد کے صالح ہوتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر کسی مرجح کی وجہ سے ترجیح ہوگی اور وہ فعل کا جمیل یا لذیذ یا یہ تصور کہ فعل قبیح یا تکلیف دہ ہے، یہ تصورات ہی ایسے مبادی ہیں جو ان افعال کے مبادی کیلئے ہیں تو یہ مبادی افعال کا خود بھی مبادی بننا کونسا بعید ہے واسطہ درمیان سے ختم ہو جائے گا۔

۵۔ تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہیں کہ تصورات، ابدان میں حدوث کیفیات کیلئے مبادی قریبہ ہیں۔ کیونکہ غضب سختی طبیعت سے سخت ہوتا ہے حتیٰ کہ سختی اسے بہت زیادہ تقویت دیتی ہے۔

بادشاہ کا واقعہ

منقول ہے کسی بادشاہ کو فالج ہوا، اطباء علاج سے عاجز آ گئے تو ایک حاذق حکیم اچانک اس پر داخل ہوا اور اس نے اسے خوب سنائیں، گالیاں دیں اور عزت پر حملہ آور ہوا، بادشاہ غضب میں آ گیا تو وہ اپنے موت کے بستر سے جوش میں آ کر اٹھنے لگا تو اس کی بیماری اور مرض مہلک اس سے ختم ہو گئی تو جب تصورات بدن میں حدوث حوادث کیلئے تصورات مبادی ہیں تو خارج بدن

حدوثِ حوادث کے مبادی ہونے میں کوئی بُعد نہیں۔

۶۔ نظر بدلگ جانے پر عقلاء متفق ہیں تو یہ دلیل بھی ہماری بات ہی کو تقویت دے رہی ہے۔

جب تم نے جان لیا تو اب ہم کہتے ہیں جونفوس یہ افعال کرتے ہیں کبھی وہ بہت قوی ہوتے ہیں تو وہ ان افعال میں آلات و ادوات کے محتاج نہیں ہوتے اور کبھی خفیف ہونے کی وجہ سے آلات سے مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ نفس کو جب بدن پر غلبہ حاصل ہو تو اس کا تعلق عالم سماء کی طرف شدید ہوتا ہے گویا وہ ارواح سماویہ میں سے ایک روح ہے لہٰذا اس جہان کے مواد میں تاثیر میں قوی ہوتا ہے، اور اگر نفس ضعیف ہو اور اس کا تعلق لذات بدنیہ سے شدید ہو تو اب اس کا تصرف صرف اس بدن تک ہی ہوگا، تو اگر انسان چاہے کہ میرے بدن کی تاثیر دوسرے بدن میں ہو تو وہ غیر کی تمثال لے کر حس کے سامنے رکھے اور حس کو اس میں مشغول کر دے اور خیال کو اس پر مرکوز رکھے، نفس ناطقہ اس طرف متوجہ ہوگا تو تاثیرات نفسانیہ اور تصرفات روحانیہ قوی ہو جائیں گی، اسی لیے تمام امتوں کا اس پر اجماع ہے ایسے اعمال میں مشق کیلئے بُعد دوری اشیاء مالوفات، قلت غذا اور انقطاع از خلق ضروری ہے، یہ امور جس قدر تام ہوں گے تاثیر بھی اسی قدر اقوی ہوگی اور پھر اگر نفس اپنی ماہیت اور خاصیت میں بھی اسی امر کے مناسب ہو تو تاثیر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

سبب متعین بھی ہے کہ نفس جب پہلے فعل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ تمام قوت سے اس میں مشغول ہوتا ہے اور جب وہ افعالِ کثیرہ میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی قوت بٹ جاتی ہے اور وہ ان افعال پر منقسم ہو کر رہ جاتا ہے لہٰذا ان میں سے ہر فعل کو قوت سے کچھ حصہ اور نہر سے کچھ پانی ہی ملتا ہے، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں قوت خاطر میں برابر دو انسانوں میں سے ایک واحد فن پر کام کرتا ہے جبکہ دوسرا دو میں تو فن واحد والا دو فنون والے سے قوی ہوتا ہے، جب آدمی کسی بھی مسئلہ کی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو وہ اس وقت غور و فکر صرف اسی کی طرف متوجہ ہو کر دماغ کو دوسری سے فارغ کرتا ہے کیونکہ اس میں فراغت کی صورت میں ہی دل کی تمام توجہ اسی مسئلہ کی طرف ہوگی تو اب فعل زیادہ آسان اور احسن ہوگا، جب معاملہ یونہی ہے تو جب انسان لذات و شہوات کے حصول میں اپنی توجہات کو لگا دیتا ہے تو قوتِ نفسانیہ بھی ان میں مستغرق ہو جاتی ہے تو اس میں فعل غریب کی قوی کشش نہیں رہ جاتی خصوصاً یہاں تو ایک اور آفت بھی ہے کہ ایسا نفس اول تا آخر ان لذات میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور وہ کبھی بھی افعال غریبہ کے حدوث کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو یہ طبعاً اول پر قربان اور دوسرے سے متنفر ہو جاتا ہے، جب اس نے مطلوب اول پالیا تو اب وہ جانب آخر کیسے متوجہ ہوگا؟ اس سے واضح ہوگیا کہ ان اعمال کی مشق صرف احوال جسمانیہ سے جدائی، مخالطتِ مخلوق سے علیحدگی اور تمام توجہ کا عالمِ صفا و ارواح کی طرف ہونے سے ہوتا ہے۔

حدوثِ حوادث کے مبادی ہونے میں کوئی بُعد نہیں۔

۶۔ نظر بدلگ جانے پر عقلاء متفق ہیں تو یہ دلیل بھی ہماری بات ہی کو تقویت دے رہی ہے۔

جب تم نے جان لیا تو اب ہم کہتے ہیں جو نفوس یہ افعال کرتے ہیں کبھی وہ بہت قوی ہوتے ہیں تو وہ ان افعال میں آلات و ادوات کے محتاج نہیں ہوتے اور کبھی خفیف ہونے کی وجہ سے آلات سے مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ نفس کو جب بدن پر غلبہ حاصل ہو تو اس کا تعلق عالم سماء کی طرف شدید ہوتا ہے گویا وہ ارواح سماویہ میں سے ایک روح ہے لہٰذا اس جہان کے مواد میں تاثیر میں قوی ہوتا ہے، اور اگر نفس ضعیف ہو اور اس کا تعلق لذات بدنیہ سے شدید ہو تو اب اس کا تصرف صرف اس بدن تک ہی ہوگا، تو اگر انسان چاہے کہ میرے بدن کی تاثیر دوسرے بدن میں ہو تو وہ غیر کی تمثال لے کر حس کے سامنے رکھے اور حس کو اس میں مشغول کردے اور خیال کو اس پر مرکوز رکھے، نفس ناطقہ اس طرف متوجہ ہوگا تو تاثیرات نفسانیہ اور تصرفات روحانیہ قوی ہو جائیں گی، اسی لیے تمام امتوں کا اس پر اجماع ہے ایسے اعمال میں مشق کیلئے بجرب دوری اشیاء مالوفات، قلت غذا اور انقطاع از خلق ضروری ہے، یہ امور جس قدر تام ہوں گے تاثیر بھی اسی قدر اقوی ہوگی اور پھر اگر نفس اپنی ماہیت اور خاصیت میں بھی اسی امر کے مناسب ہوا تو تاثیر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

سبب متعین بھی ہے کہ نفس جب پہلے فعل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ تمام قوت سے اس میں مشغول ہوتا ہے اور جب وہ افعالِ کثیرہ میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی قوت بٹ جاتی ہے اور وہ ان افعال پر منقسم ہو کر رہ جاتا ہے لہٰذا ان میں سے ہر فعل کو قوت سے کچھ حصہ اور نہر سے کچھ پانی ہی ملتا ہے، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں قوت خاطر میں برابر دو انسانوں میں سے ایک واحد فن پر کام کرتا ہے جبکہ دوسرا دو میں تو فن واحد والا دو فنون والے سے قوی ہوتا ہے، جب آدمی کسی بھی مسئلہ کی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو وہ اس وقت غور و فکر صرف اسی کی طرف متوجہ ہو کر دماغ کو دوسری سے فارغ کرتا ہے کیونکہ اس میں فراغت کی صورت میں ہی دل کی تمام توجہ اسی مسئلہ کی طرف ہوگی تو اب فعل زیادہ آسان اور احسن ہوگا، جب معاملہ یونہی ہے تو جب انسان لذات و شہوات کے حصول میں اپنی توجہات کو لگا دیتا ہے تو قوتِ نفسانیہ بھی ان میں مستغرق ہو جاتی ہے تو اس میں فعل غریب کی قوی کشش نہیں رہ جاتی خصوصاً یہاں تو ایک اور آفت بھی ہے کہ ایسا نفس اول تا آخر ان لذات میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور وہ کبھی بھی افعال غریبہ کے حدوث کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو یہ طبعاً اول پر قربان اور دوسرے سے متنفر ہو جاتا ہے، جب اس نے مطلوب اول پا لیا تو اب وہ جانب آخر کیسے متوجہ ہوگا؟ اس سے واضح ہو گیا کہ ان اعمال کی مشق صرف احوال جسمانیہ سے جدائی، مخالطتِ مخلوق سے علیحدگی اور تمام توجہ کا عالمِ صفا و ارواح کی طرف ہونے سے ہوتا ہے۔

یہاں دو اور انواع بھی ہیں:

۱۔ نفوس جب ابدان سے جدا ہو جاتے ہیں تو ان میں قوت اور تاثیر کے لحاظ سے دوسرے نفوس کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے تو یہ نفوس، صافی ہو گئے تو بعید نہیں کہ مشابہت کی وجہ سے دیگر نفوس کے ساتھ ان کا تعلق بن جائے اور انہیں بدن کی طرح تعلق نوعی بن جائے تو اب فعل پر کثیر نفوس آپس میں معاون ہوں گے جب قوت کامل اور قوی ہوگی تو تاثیر بھی قوی ہوگی۔

۲۔ نفوس ناطقہ جب کدورات نفسانیہ سے صاف ہو جاتے ہیں تو یہ ارواح سماویہ اور نفوس فلکیہ کے فیضانِ انوار کے قابل ہو جاتے ہیں، تو یہ نفوس ان ارواح کے انوار سے قوی ہو جاتے ہیں پھر یہ امور غریبہ مخالفِ عادت پر قوت پا لیتے ہیں یہ اصحاب اوہام اور رقی کے جادو کی شرح ہے۔

جادو کی تیسری قسم

تیسری قسم ارواح ارضیہ سے مدد کا حصول ہے، کچھ متاخرین فلاسفہ اور معتزلہ نے جنات کا انکار کیا ہے ورنہ اکابر فلاسفہ ان کے وجود کے منکر نہ تھے البتہ ان کا نام ان کے ہاں ارواح ارضیہ ہے اور یہ مختلف ہیں بعض اچھے اور بعض شریر، اچھے مومن جن اور شریر کافر و شیاطین۔ پھر کچھ متاخرین فلاسفہ نے کہا یہ ارواح جواہر اور بذاتہا قائم ہیں نہ یہ محل کے محتاج ہیں اور نہ ان کا اس میں حلول ہے۔ یہ جزئیات کے عالم قادر اور مدرک ہیں اور ان کا اتصال نفوسِ ناطقہ کے ساتھ آسمانی ارواح سے زیادہ آسان ہے البتہ یہ بات اصولی ہے کہ نفوس ناطقہ کو جو قوت ارواحِ ارضیہ کے اتصال سے ہوگی وہ ارواح سماویہ کے اتصال کی قوت سے نہایت ضعیف ہوگی۔

اتصال آسان ہونے کی وجہ یہ ہے کیونکہ ہمارے نفوس اور ارواح ارضیہ میں مناسبت آسان ہے دوسرا یہ کہ ان میں ارواحِ سماویہ کی نسبت مشابہت و مشاکلت کامل اور شدید ہے۔

ارواحِ سماویہ کے اتصال سے قوت اقوی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ارواح سماویہ کی نسبت ارواح ارضیہ سے ایسی ہی ہے جیسے سورج کو شعلہ، سمندر کو قطرہ اور سلطان کو رعایا سے ہے۔ انہوں نے کہا اگرچہ ان کے وجود پہ برہان تامہ تو قائم نہیں مگر ان کا امکان واحتمال تو ہے۔ اصحاب سحر اور ارباب تجربہ شاہد ہیں کہ ارواحِ ارضیہ سے اتصال آسان اعمال رقی، دخن اور تجرید سے حاصل ہو جاتا ہے اس نوع کو عزائم اور عمل تسخیر جن کہا جاتا ہے۔

جادو کی چوتھی قسم

جادو کی چوتھی قسم تخیلات اور نظر بندی ہے اور یہ ان مقدمات پر مبنی ہے:

پہلا مقدمہ: آنکھوں کی غلطیاں کثیر ہیں مثلاً کشتی سوار جب کنارہ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ ٹھہری ہوئی اور کنارے کو متحرک پاتا ہے واضح ہے وہ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن دیکھ رہا ہے۔ قطرہ نازلہ کو خط مستقیم، شعلہ جوالہ کو دائرہ۔ چھوٹا انگور پانی میں اور چھوٹا شخص ضباب میں بڑا، بوقت طلوع قرص شمس بخارات ارض بڑے اور سورج کے بلند ہونے کے بعد چھوٹے نظر آتے ہیں۔ عظیم کو دور سے حقیر دیکھنا۔ تو واضح ہے یہ اشیاء رہنمائی کررہی ہیں کہ قوتِ باصرہ، اسباب عارضہ کی وجہ سے بعض اوقات نفس الامر کے خلاف دیکھتی ہے۔

دوسرا مقدمہ: قوت باصرہ، محسوسات سے کامل واقف تب ہوتی ہے جب محسوس کو اسے دیکھنے کا خوب موقعہ ملا ہو اگر ایک محسوس کو وہ نہایت ہی قلیل وقت میں دیکھے پھر اسی طرح دوسرے کو پھر تیسرے کو تو اختلاط ہو جائے گا اور محسوسات ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوں گے مثلاً چکی کے مرکز سے محیط کی طرف مختلف رنگوں میں خطوط کثیرہ بنائے جائیں پھر وہ چلے تو حس صرف ایک رنگ میں دیکھے گی گویا وہ تمام کا مرکب ہے سوایسے ہی نفس کسی معاملہ میں مشغول ہو تو اس کے سامنے دوسری چیز آتی ہے مگر وہ اسے محسوس ہی نہیں کرتا مثلاً انسان بادشاہ کے پاس جاتا ہے وہاں کوئی دوسرا آدمی ملا اس سے گفتگو بھی کی مگر یہ نہ اس کو جانتا ہے اور نہ اس کے کلام کو کیونکہ دل کسی اور طرف متوجہ تھا، اسی طرح آئینہ دیکھنے والا اپنی آنکھ میں پڑنے والے تنکا دیکھنے کا ارادہ کرتا ہے مگر اس سے بڑی شی نہیں دیکھتا اگرچہ وہ چہرے، پیشانی یا دیگر اعضاء میں جو مقابل آئینہ ہیں، بعض اوقات انسان آئینہ کی سطح بھی دیکھتا ہے کہ یہ ہموار ہے یا نہیں تو اس وقت وہ آئینہ میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ یہ مقدمات کو جان لینے کے بعد اس نوع سحر کا جاننا آسان ہو گیا۔ اس لیے کہ ماہر شعبدہ باز کوئی عمل کرتا ہے تو وہ ناظرین کو اس عمل کی طرف اس قدر متوجہ کر لیتا ہے کہ آنکھ اس میں مشغول رہتی ہے اور وہ تیزی سے دوسرا عمل کر دیتا ہے، اس کا عمل دو متفاوت اشیاء کی وجہ سے مخفی رہتا ہے۔

۱۔ لوگوں کا پہلی چیز میں مشغول ہو جانا۔

۲۔ دوسرے عمل کو نہایت ہی پھرتی سے کر لینا

تو اب ایسی شی دیکھے گا جس کو وہ دیکھ نہ رہے تھے تو اس پر بہت ہی متعجب ہوں گے، اگر شعبدہ باز خاموش رہتا اور خواطر کو ضد مراد کی طرف پھیرنے کیلئے گفتگو نہ کرتا تو نہ نفوس اور نہ اوہام اس ضد کی طرف حرکت کرتے اور اہلِ نظر اس کے عمل سے

جادو کی چوتھی قسم

جادو کی چوتھی قسم تخیلات اور نظر بندی ہے اور یہ ان مقدمات پر مبنی ہے:

پہلا مقدمہ: آنکھوں کی غلطیاں کثیر ہیں مثلاً کشتی سوار جب کنارہ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ ٹھہری ہوئی اور کنارے کو متحرک پاتا ہے واضح ہے وہ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن دیکھ رہا ہے۔ قطرہ نازلہ کو خط مستقیم، شعلہ جوالہ کو دائرہ۔ چھوٹا انگور پانی میں اور چھوٹا شخص ضباب میں بڑا، بوقت طلوع قرص شمس بخارات ارض بڑے اور سورج کے بلند ہونے کے بعد چھوٹے نظر آتے ہیں۔ عظیم کو دور سے حقیر دیکھنا۔ تو واضح ہے یہ اشیاء رہنمائی کر رہی ہیں کہ قوتِ باصرہ، اسباب عارضہ کی وجہ سے بعض اوقات نفس الامر کے خلاف دیکھتی ہے۔

دوسرا مقدمہ: قوت باصرہ، محسوسات سے کامل واقف تب ہوتی ہے جب محسوس کو اسے دیکھنے کا خوب موقعہ ملا ہو اگر ایک محسوس کو وہ نہایت ہی قلیل وقت میں دیکھے پھر اسی طرح دوسرے کو پھر تیسرے کو تو اختلاط ہو جائے گا اور محسوسات ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوں گے مثلاً چکی کے مرکز سے محیط کی طرف مختلف رنگوں میں خطوط کثیرہ بنائے جائیں پھر وہ چلے تو حس صرف ایک رنگ میں دیکھے گی گویا وہ تمام کا مرکب ہے سو ایسے ہی نفس کسی معاملہ میں مشغول ہو تو اس کے سامنے دوسری چیز آتی ہے مگر وہ اسے محسوس ہی نہیں کرتا مثلاً انسان بادشاہ کے پاس جاتا ہے وہاں کوئی دوسرا آدمی ملا اس سے گفتگو بھی کی مگر یہ نہ اس کو جانتا ہے اور نہ اس کے کلام کو کیونکہ دل کسی اور طرف متوجہ تھا، اسی طرح آئینہ دیکھنے والا اپنی آنکھ میں پڑنے والے تنکا دیکھنے کا ارادہ کرتا ہے مگر اس سے بڑی شی نہیں دیکھتا اگرچہ وہ چہرے، پیشانی یا دیگر اعضاء میں جو مقابل آئینہ ہیں، بعض اوقات انسان آئینہ کی سطح بھی دیکھتا ہے کہ یہ ہموار ہے یا نہیں تو اس وقت وہ آئینہ میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ یہ مقدمات کو جان لینے کے بعد اس نوع سحر کا جاننا آسان ہو گیا۔ اس لیے کہ ماہر شعبدہ باز کوئی عمل کرتا ہے تو وہ ناظرین کو اس عمل کی طرف اس قدر متوجہ کر لیتا ہے کہ آنکھ اس میں مشغول رہتی ہے اور وہ تیزی سے دوسرا عمل کر دیتا ہے، اس کا عمل دو متفاوت اشیاء کی وجہ سے مخفی رہتا ہے۔

۱۔ لوگوں کا پہلی چیز میں مشغول ہو جانا۔

۲۔ دوسرے عمل کو نہایت ہی پھرتی سے کر لینا

تو اب ایسی شی دیکھے گا جس کو وہ دیکھ نہ رہے تھے تو اس پر بہت ہی متعجب ہوں گے، اگر شعبدہ باز خاموش رہتا اور خواطر کو ضد مراد کی طرف پھیرنے کیلئے گفتگو نہ کرتا تو نہ نفوس اور نہ اوہام اس ضد کی طرف حرکت کرتے اور اہلِ نظر اس کے عمل سے

آگاہ ہو جاتے، اس قول ''شعبدہ باز نظر بندی کرتا ہے'' کا یہی معنی ہے کہ وہ نظر کو اس سے غیر متوجہ کر دیتا ہے جو وہ دکھانا چاہتا ہے، جس قدر وہ لوگوں کی نظر کو اپنے مقصود کے مخالف میں متوجہ کرنے میں ماہر ہوگا اس قدر وہ اپنے عمل کا ماہر ہوگا، جس قدر احوال حس کے متعدد انواع کو نوع واحد بنانے میں شدید ہوں گے اس قدر عمل احسن ہوگا۔ مثلاً شعبدہ باز بہت زیادہ چمک، روشنی میں بیٹھے، تو اب نظر میں خلل و کمی ہوگی اسی طرح جب وہ نہایت ہی تاریکی میں ہو، اسی طرح چمکدار رنگ بھی عقل میں خلل واقع کر دیتے ہیں، اسی طرح الوان ظلمانی سے بھی آگاہی کم ہوتی ہے، اس نوع سحر میں یہی جامع گفتگو ہے۔

جادو کی پانچویں قسم

وہ اعمالِ عجیبہ جو کبھی آلات مرکبہ کی ترکیب سے نسب ہندسہ پر ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی گھوڑوں کی صورت میں مثلاً وہ دو گھوڑے ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں اور مثلاً گھوڑ سوار کے ہاتھ دھوتا ہوتا ہے جب وہ ایک گھنٹہ گزرتا ہے تو بغیر مس کیسے بولتا ہے، اسی طرح وہ صُور جنہیں رومی اور ہندی لوگ بناتے ہیں کہ دیکھنے والا ان میں اور انسان میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ انہیں ہنسنے والا اور رونے والا تصور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں خوشی کی مسکراہٹ اور شرمندگی کی مسکراہٹ میں فرق کیا جا سکتا ہے، یہ نہایت ہی باریک خیالی امور ہیں، فرعون کے جادوگروں کا جادو اسی قسم سے تھا، اسی باب سے صندوق الساعات کا تعلق ہے، اسی کے تحت بھاری اشیاء کو کھینچنے کا علم بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بھاری شی کو نہایت ہی ہلکی پھلکی شی سے کھینچ لیا جائے۔ حقیقتاً اسے باب جادو میں شامل کرنا مناسب نہیں کیونکہ ان کے اسباب نفسیہ معلوم ہیں جو بھی ان سے مطلع ہوگا وہ یہ عمل کر سکے گا ہاں ان سے اطلاع نہایت ہی مشکل ہے۔ اس لیے انہیں کوئی ہی پا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ ظاہر اسے جادو ہی میں شامل مانتے ہیں۔ اسی باب سے عمل ارجعیانوس موسیقار کا تعلق بھی ہے جو اس نے پرانے ہیکل یروشلم کی تجدید کے وقت کیا۔

موسیقار کا واقعہ

ہوا یوں کہ وہ اتفاقاً کسی جنگل سے گزر رہا تھا وہاں اس نے براصل کا بچہ پایا، یہ ایسا پرندہ ہے جو غمگین آواز نکالتا ہے اور براصل اس کے پاس زیتون ڈالتے تو وہ کچھ کھالیتا ہے اور کچھ چھوڑ دیتا ہے یہ موسیقار وہاں سے گذرا اور وہاں کھڑا ہوگیا اور اس بچے کے احوال پر غور کرنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں درد اور سوز اس قدر ہے کہ پرندے سن کر آ جاتے ہیں اور وہ زیتون وغیرہ کھانے کیلئے اس کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ اس نے بھی ایک آلہ کے ذریعے اس کی آواز نکالنے کی کوشش کی کہ جب بھی اس میں ہوا آئے تو وہ اسی طرح سیٹی کی آواز نکالے۔ یہاں تک کہ وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔ براصل نے وہاں زیتون لانا

شروع کردیا جیسا کہ وہ اس بچے کے پاس لا رہے تھے اور یہ گمان کیا شاید یہاں ہمارا ہی بچہ ہے، جب اس پر اعتماد ہوگیا تو وہ اپنا آلہ لے کر ہیکل یروشلم آیا۔ اس نے اس رات کے بارے میں پوچھا جس میں اس کا ناظم و مہتمم اسطرخس دفن ہوا تھا۔ اسے بتایا گیا وہ آب کی پہلی رات تھی تو اس نے شیشہ کا خول بصورت براصیل اس ہیکل پر نصب کیا اور اس پر قبہ تعمیر کروایا اور کہا کہ اسے پہلی آب کھولا کریں تو اس صورت میں ہوا کی وجہ سے براصیل کی آواز پیدا ہوتی اور اس پر براصیل زیتون لے کر آجاتے حتیٰ کہ وہ قبہ ہر روز زیتون سے بھر جاتا، لوگ اسے مدفون کی کرامت گردانتے۔ اس قسم میں اسی طرح کی متعدد اشیاء شامل ہیں جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

جادو کی چھٹی قسم

خاص ادویات سے معاونت حاصل کر لینا مثلاً طعام میں بعض ایسی ادویات شامل کرنا جو عقل زائل کر دیں، نشہ اور دھواں مثلاً دماغ الحمار، جب انسان کھائے تو اس کا عقل منجمد اور فطانت کم ہو جاتی ہے اور ان خواص کا انکار ممکن نہیں کیونکہ مقناطیس کا اثر عیاں و ظاہر ہے البتہ لوگ اس میں خلط ملط کر کے صدق کو کذب اور باطل کو حق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جادو کی ساتویں قسم

دل کا مسخر کر لینا، کہ جادوگر دعویٰ کرے میں اسم اعظم جانتا ہوں یا جن میرے تابع ہو کر کام بجالاتے ہیں، ممکن ہے سامع ضعیف العقل اور کم علم ہونے کی وجہ سے اسے صحیح مان لے اور دل کو اس سے متعلق کر لے تو اب اس پر اس کا خوف اور رعب پیدا ہو جائے گا، جب خوف آ گیا تو حواس کمزور ہو گئے تو اب ساحر جو چاہے کرے، جو لوگ تجربہ رکھتے ہیں اور اہلِ علم کے احوال سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ قلب کا نفاذِ عمل اور اخفاءِ اسرار پر کس قدر اثر عظیم ہوتا ہے؟

جادو کی آٹھویں قسم

نمیمہ اور تضریب سے نہایت ہی خفیف انداز میں عمل کرنا اور یہ لوگوں میں معروف ہے۔

یہ جادو کی اقسام اور ان کی تفصیل میں گفتگو تھی۔

چوتھا مسئلہ: کیا یہ انواع ممکن ہیں

کیا یہ انواع سحر ممکن ہیں یا نہیں؟ اس میں اہلِ اسلام کے مختلف اقوال ہیں۔

شروع کر دیا جیسا کہ وہ اس بچے کے پاس لا رہے تھے اور یہ گمان کیا شاید یہاں ہمارا ہی بچہ ہے، جب اس پر اعتماد ہو گیا تو وہ اپنا آلہ لے کر ہیکل یروشلم آیا۔ اس نے اس رات کے بارے میں پوچھا جس میں اس کا ناظم و مہتمم اسطرخس دفن ہوا تھا۔ اسے بتایا گیا وہ آب کی پہلی رات تھی تو اس نے شیشہ کا خول بصورت براصیل اس ہیکل پر نصب کیا اور اس پر قبہ تعمیر کروایا اور کہا کہ اسے پہلی آب کھولا کریں تو اس صورت میں ہوا کی وجہ سے براصیل کی آواز پیدا ہوتی اور اس پر براصیل زیتون لے کر آجاتے حتیٰ کہ وہ قبہ ہر روز زیتون سے بھر جاتا، لوگ اسے مدفون کی کرامت گردانتے۔ اس قسم میں اسی طرح کی متعدد اشیاء شامل ہیں جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

جادو کی چھٹی قسم

خاص ادویات سے معاونت حاصل کر لینا مثلاً طعام میں بعض ایسی ادویات شامل کرنا جو عقل زائل کر دیں، نشہ اور دھواں مثلاً دماغ الحمار، جب انسان کھائے تو اس کا عقل منجمد اور فطانت کم ہو جاتی ہے اور ان خواص کا انکار ممکن نہیں کیونکہ مقناطیس کا اثر عیاں و ظاہر ہے البتہ لوگ اس میں خلط ملط کر کے صدق کو کذب اور باطل کو حق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جادو کی ساتویں قسم

دل کا مسخر کر لینا، کہ جادوگر دعویٰ کرے میں اسم اعظم جانتا ہوں یا جن میرے تابع ہو کر کام بجا لاتے ہیں، ممکن ہے سامع ضعیف العقل اور کم علم ہونے کی وجہ سے اسے صحیح مان لے اور دل کو اس سے متعلق کر لے تو اب اس پر اس کا خوف اور رعب پیدا ہو جائے گا، جب خوف آ گیا تو حواس کمزور ہو گئے تو اب ساحر جو چاہے کرے، جو لوگ تجربہ رکھتے ہیں اور اہلِ علم کے احوال سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ قلب کا نفاذِ عمل اور اخفاءِ اسرار پر کس قدر اثر عظیم ہوتا ہے؟

جادو کی آٹھویں قسم

نمیمہ اور تضریب سے نہایت ہی خفیف انداز میں عمل کرنا اور یہ لوگوں میں معروف ہے۔

یہ جادو کی اقسام اور ان کی تفصیل میں گفتگو تھی۔

چوتھا مسئلہ: کیا یہ انواع ممکن ہیں

کیا یہ انواع سحر ممکن ہیں یا نہیں؟ اس میں اہلِ اسلام کے مختلف اقوال ہیں۔

معتزلہ کا قول

معتزلہ کہتے ہیں، جونوع، تخیل، ادویات اور تضریب کی طرف منسوب ہیں یہ ممکن ہیں باقی پانچ کا وہ انکار کرتے ہیں، ان کا وجود ماننے اور ان کا قول کرنے والوں کی تکفیر کرتے ہیں۔

اہلسنّت مانتے ہیں کہ ساحر قدرت رکھتا ہے کہ وہ ہوا میں اڑے، انسان کو حمار اور حمار کو انسان بنادے مگر وہ کہتے ہیں جب ساحر مخصوص عمل کرتا و پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کو پیدا کرنے والا ہوتا ہے، اس میں فلک و نجوم ہرگز مؤثر نہیں ہوتے۔

فلاسفہ، اہلِ نجوم اور صابئہ کا مؤقف پیچھے گزر چکا ہے۔

ہمارے اصحاب نے صابئہ کے اس قول سے یوں استدلال کیا ہے کہ عالم کا حدوث ثابت ہے لہٰذا اس کے موجِد کا قادر ہونا ضروری ہے۔ عقل جب کسی شئ کو مقدور مانتی ہے تو اس لیے مقدور ہے کہ ممکن ہے اور امکان، تمام ممکنات میں قدر مشترک ہے تو اب تمام ممکنات اللہ تعالیٰ کے مقدور ہوں گے، اگر ان مقدورات میں سے کوئی بھی کسی اور سبب سے موجود ہو تو ضروری ہے کہ وہ سبب اسی مقدور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق زائل کردے تو اب حادث اللہ تعالیٰ کے عجز کا سبب بنے گا جو محال ہے لہٰذا ثابت ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بغیر کسی ممکن کا وقوع محال ہوگا۔ اب صابئہ کا قول باطل ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں جب یہ ثابت ہے تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ان خوارق کا وقوع بوقت جادو حسب عادت محال ہے۔

انہوں نے جادو کی وجہ سے ان کے وقوع پر قرآن و احادیث سے استدلال کیا ہے۔

قرآنی دلائل

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ — اس سے نقصان نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے

استثنا واضح کررہی ہے یہ اثر جادو کے سبب ہے۔

احادیث اس سلسلہ میں متواتر و احاد مروی ہے۔

۱۔ حضور ﷺ پر جادو کردیا گیا جب اس حالت میں آپ ﷺ کوئی عمل کرتے تو فرماتے، مجھے احساس ہوتا ہے میں نے یہ بات کہی یا یہ کام کیا مگر نہ کہا نہ کیا ہوتا ہے۔

(البخاری: ۵۷۶۶)

۲۔ یہودی عورت نے جادو کر کے کنوئیں کی تہہ میں رکھ دیا تھا جب اسے نکالا گیا تو آپ سے تکلیف دور ہوگئی اور معوذتین کا نزول ہوا۔

۳۔ جادوگرنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور پوچھا: کیا میرے لیے توبہ ہے؟ پوچھا: تو نے کب جادو کیا؟ کہنے لگی: میں ہاروت و ماروت کے مقام بابل گئی تاکہ جادو سیکھوں۔ انہوں نے مجھے کہا: اللہ کی بندی امر دنیا سے عذاب آخرت حاصل نہ کرو۔ میں نے انکار کیا انہوں نے کہا جاؤ اس راکھ پر پیشاب کرو میں پیشاب کرنے کیلئے چلی اور سوچا ایسا نہیں کروں گی۔ ان کے پاس آئی اور کہا میں نے کر دیا ہے۔ کہنے لگے: تو نے وہاں کیا دیکھا؟ کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے تو ابھی بہتر راہ پر ہے، اللہ سے ڈرو اور نہ سیکھو۔ میں نے انکار کیا۔ کہنے لگے: جاؤ پھر پیشاب کرو۔ میں گئی اور پیشاب کیا۔ میں نے دیکھا لگام والا گھوڑا میرے فرج سے نکل کر آسمان کی طرف چلا گیا۔ میں نے واپس آکر انہیں بتایا تو کہنے لگے: وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے خارج ہو گیا اور اب تو جادوگرنی ہے۔ میں نے کہا: کیسے؟ کہنے لگے: جو چاہتی ہے اس کا تصور کرو۔ میں نے دل میں گندم کے دانہ کا تصور کیا تو میرے سامنے دانہ آ گیا میں نے اسے بونے کا سوچا اسی وقت اس سے پودا و خوشہ سامنے آ گئے، میں نے پیسنے کا خیال کیا تو وہ پس گیا پھر روئی بن گیا بس میں جو بھی تصور کرتی وہ ہو جاتا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: تیرے لیے توبہ نہیں ہے۔

۴۔ اس سلسلہ میں متعدد و کثیر حکایات منقول ہیں جو بہت ہی مشہور ہیں۔

معتزلہ کے دلائل

معتزلہ نے انکار پر یہ دلائل دیے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ (پ۱۶، طٰہٰ: ۶۹) اور جادوگر کا بھلا نہیں ہوتا کہیں آدے

۲۔ حضور ﷺ کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (پ۱۹، الفرقان: ۸) اور ظالم بولے تم تو پیروی نہیں کرتے مگر ایسے مرد کی جس پر جادو ہوا

اگر آپ ﷺ مسحور ہو گئے تھے (جادو چل گیا تھا) تو ان کے قول کی مذمت نہ ہوتی۔

۳۔ اگر جادو ہو سکتا ہے تو پھر معجزہ اور جادو میں امتیاز کہاں؟

فضل قدیر

۲۔ یہودی عورت نے جادو کر کے کنوئیں کی تہہ میں رکھ دیا تھا جب اسے نکالا گیا تو آپ سے تکلیف دور ہوگئی اور معوذتین کا نزول ہوا۔

۳۔ جادوگرنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور پوچھا: کیا میرے لیے توبہ ہے؟ پوچھا: تو نے کب جادو کیا؟ کہنے لگی: میں ہاروت و ماروت کے مقام بابل گئی تا کہ جادو سیکھوں۔ انہوں نے مجھے کہا: اللہ کی بندی امر دنیا سے عذاب آخرت حاصل نہ کرو۔ میں نے انکار کیا انہوں نے کہا جاؤ اس راکھ پر پیشاب کرو میں پیشاب کرنے کیلئے چلی اور سوچا ایسا نہیں کروں گی۔ ان کے پاس آئی اور کہا میں نے کر دیا ہے۔ کہنے لگے: تو نے وہاں کیا دیکھا؟ کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے تو ابھی بہتر راہ پر ہے، اللہ سے ڈرو اور نہ سیکھو۔ میں نے انکار کیا۔ کہنے لگے: جاؤ پھر پیشاب کرو۔ میں گئی اور پیشاب کیا۔ میں نے دیکھا لگام والا گھوڑا میرے فرج سے نکل کر آسمان کی طرف چلا گیا۔ میں نے واپس آکر انہیں بتایا تو کہنے لگے: وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے خارج ہو گیا اور اب تو جادوگرنی ہے۔ میں نے کہا: کیسے؟ کہنے لگے: جو چاہتی ہے اس کا تصور کرو۔ میں نے دل میں گندم کے دانہ کا تصور کیا تو میرے سامنے دانہ آگیا میں نے اسے بونے کا سوچا اسی وقت اس سے پودا و خوشہ سامنے آگئے، میں نے پیسنے کا خیال کیا تو وہ پس گیا پھر روئی بن گیا بس میں جو بھی تصور کرتی وہ ہو جاتا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: تیرے لیے توبہ نہیں ہے۔

۴۔ اس سلسلہ میں متعدد و کثیر حکایات منقول ہیں جو بہت ہی مشہور ہیں۔

معتزلہ کے دلائل

معتزلہ نے انکار پر یہ دلائل دیے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى (پ ۱۶، طٰہٰ: ۶۹) اور جادوگر کا بھلا نہیں ہوتا کہیں آدے

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (پ ۱۹، الفرقان: ۸) اور ظالم بولے تم تو پیروی نہیں کرتے مگر ایسے مرد کی جس پر جادو ہوا

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسحور ہو گئے تھے (جادو چل گیا تھا) تو ان کے قول کی مذمت نہ ہوتی۔

۳۔ اگر جادو ہو سکتا ہے تو پھر معجزہ اور جادو میں امتیاز کہاں؟

ہمارے دلائل یقینی ہیں اور جو تم نے احادیث نقل کی ہیں وہ احاد ہیں اور وہ ہمارے ان دلائل کے مقابل نہیں آسکتیں۔

پانچواں مسئلہ: جادو سیکھنا

جادو سیکھنا نہ قبیح ہے اور نہ ممنوع۔ تمام محققین کا اتفاق ہے کہ ہر علم اپنی ذات کے اعتبار سے اعلیٰ و معزز ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان میں عموم بھی ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ تم فرماؤ کیا برابر ہیں جاننے والے اور نہ جاننے والے؟

(پ ۲۳، الزمر: ۹)

اور اس لیے بھی کہ اگر جادو سیکھا نہ جاتا تو اس کے اور معجزہ میں فرق کیسے ہوتا، حالانکہ معجزہ کو معجزہ جاننا لازم ہے اور جس پر کسی واجب کا مدار ہو اس کا حصول بھی واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا تحصیلِ جادو لازم ہوگی اور جو خود لازم ہو وہ مذموم و قبیح کیسے ہوسکتا ہے؟

چھٹا مسئلہ: تکفیر جادوگر

جادوگر کافر ہے یا نہیں؟ فقہاء کا اختلاف ہے کہ اسے کافر کہا جائے یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

من أتی کاھناً أو عرافاً فصدقھما بقول فقد کفر بما أنزل علی محمد علیه السلام جو کسی کاہن اور کھوجی کے پاس گیا اور ان کے قول پر ایمان لے آیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ تعلیمات کے ساتھ کفر کیا

(سنن ابوداؤد: ۳۹۰۴)

اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ جو یہ مانے کہ ستارے ہی تدبیر کرتے ہیں اور یہی حوادث، خیر و شر کے خالق ہیں وہ ہر حال میں کافر ہے اور یہ جادو کی پہلی قسم تھی۔

رہی دوسری قسم کہ یہ اعتقاد کرے کہ روحِ انسانی تصفیہ اور قوت میں یہاں تک چلی جاتی ہے کہ وہ ایجادِ اجسام، حیات، قدرت اور جسم و شکل کی تبدیلی پر قادر ہو جاتی ہے تو اظہر یہی ہے کہ اسی کی تکفیر پر اُمت کا اجماع ہے۔

تیسری قسم کا حکم

ساحر یہ اعتقاد رکھے کہ وہ تصفیہ، دم پڑھنے اور بعض ادویہ کی وجہ سے یہاں تک کرسکتا ہے کہ ان افعال کے بعد بطور عادت اجسام، حیات، عقل اور شکل میں تبدیلی لاسکتا ہے، معتزلہ اس کی بھی تکفیر کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ اس اعتقاد کے بعد انبیاء و رسل کا صدق کیسے معلوم ہوگا؟

لیکن یہ قول کمزور ہے۔کوئی کہہ سکتا ہے انسان اگر نبوت کا دعویٰ کرے اور دعویٰ بھی جھوٹا ہوتو اللہ تعالیٰ ایسے بندے کے ہاتھ پر ایسی اشیاء کا اظہار ہی نہیں فرمائے گا تاکہ التباس نہ ہو اور اگر جھوٹ کا دعویٰ نہیں اور اس کے ہاتھ پر ان اشیاء کا اظہار ہوا تو اس پر التباس نہیں ہوگا کیونکہ حق باطل سے یوں ممتاز ہوگا کہ حق کیلئے دعویٰ نبوت کے ساتھ ان اشیاء کا حصول ہوگا جبکہ باطل کا دعویٰ ہوگا مگر ان کا حصول نہ ہوگا۔باقی انواعِ جادو بلاشبہ کفر نہیں۔

سوال: یہود نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت کا اعلان کیا:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ (سلیمان نے کفر نہیں کیا)

یہ واضح کررہا ہے کہ ہر جادو کفر ہے۔پھر یہ بھی فرمایا:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھایا

اس سے بھی ہر جادو کا کفر ہونا ثابت ہورہا ہے۔ملکین (فرشتوں) کے بارے میں ہے کہ وہ کسی کو جادو نہ سکھاتے حتیٰ کہ کہتے:

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کرو

ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ہر جادو کفر ہے۔

جواب: حکایتِ حال کے صدق کیلئے جادو کی صورتِ واحد ہی کافی ہے اور اس سے مراد ستاروں کو خدا ماننا ہے۔

ساتواں مسئلہ: جادوگر اور قتل

کیا جادوگر کو قتل کردیا جائے یا نہیں؟

نوع اول، یہ اعتقاد کہ ستارے خدا اور مؤثر حقیقی ہیں، اسی طرح نوع ثانی کہ ساحر اعتقاد کرے کہ میں اجسام، حیات، قدرت، عقل اور مختلف اشکال پر قادر ہو چکا ہوں ان دونوں صورت کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔اگر مسلمان ایسا عقیدہ اختیار کرے تو وہ مرتد ہے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا اگر توبہ نہ کرے مصر رہے تو اسے قتل کردیا جائے گا۔

حضرت امام مالک اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: اس کی توبہ مقبول نہیں۔ہم (شوافع) کہتے ہیں اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے تو اس کا اسلام معتبر ہوگا۔حضور ﷺ کا فرمان ہے:

نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ ہم ظاہر پر ہی فیصلہ کرتے ہیں

رہی قسم ثالث یہ اعتقاد ہو کہ دم کرنے اور ادویات کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے طریقہ پر خلق اجسام و حیات اور تبدیلی شکل و صورت پیدا کردیتا ہے۔یعنی اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے اس طریق سے اجسام، حیات اور تبدیلی خلقت تک وہ پہنچ جاتا ہے، معتزلہ

لیکن یہ قول کمزور ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے انسان اگر نبوت کا دعویٰ کرے اور دعویٰ بھی جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے بندے کے ہاتھ پر ایسی اشیاء کا اظہار ہی نہیں فرمائے گا تاکہ التباس نہ ہو اور اگر جھوٹ کا دعویٰ نہیں اور اس کے ہاتھ پر ان اشیاء کا اظہار ہوا تو اس پر التباس نہیں ہوگا کیونکہ حق باطل سے یوں ممتاز ہوگا کہ حق کیلئے دعویٰ نبوت کے ساتھ ان اشیاء کا حصول ہوگا جبکہ باطل کا دعویٰ ہوگا مگر ان کا حصول نہ ہوگا۔ باقی انواعِ جادو بلاشبہ کفر نہیں۔

سوال: یہود نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت کا اعلان کیا:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ (سلیمان نے کفر نہیں کیا)

یہ واضح کررہا ہے کہ ہر جادو کفر ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھایا

اس سے بھی ہر جادو کا کفر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ ملکین (فرشتوں) کے بارے میں ہے کہ وہ کسی کو جادو نہ سکھاتے حتیٰ کہ کہتے:

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کرو

ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ہر جادو کفر ہے۔

جواب: حکایتِ حال کے صدق کیلئے جادو کی صورتِ واحد ہی کافی ہے اور اس سے مراد ستاروں کو خدا ماننا ہے۔

ساتواں مسئلہ: جادوگر اور قتل

کیا جادوگر کو قتل کر دیا جائے یا نہیں؟

نوعِ اول، یہ اعتقاد کہ ستارے خدا اور مؤثر حقیقی ہیں، اسی طرح نوعِ ثانی کہ ساحر اعتقاد کرے کہ میں اجسام، حیات، قدرت، عقل اور مختلف اشکال پر قادر ہو چکا ہوں ان دونوں صورت کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر مسلمان ایسا عقیدہ اختیار کرے تو وہ مرتد ہے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا اگر توبہ نہ کرے مصر رہے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

حضرت امام مالک اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: اس کی توبہ مقبول نہیں۔ ہم (شوافع) کہتے ہیں اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے تو اس کا اسلام معتبر ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ ہم ظاہر پر ہی فیصلہ کرتے ہیں

رہی قسم ثالث یہ اعتقاد ہو کہ دم کرنے اور ادویات کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے طریقہ پر خلق اجسام و حیات اور تبدیلی شکل و صورت پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے اس طریق سے اجسام، حیات اور تبدیلی خلقت تک وہ پہنچ جاتا ہے، معتزلہ

کہتے ہیں یہ بھی کفر ہے کیونکہ اس اعتقاد کی موجودگی میں صدق انبیاء پر معجزہ سے استدلال ممکن نہ ہوگا۔لیکن یہ بات کمزور ہے۔ جواباً کہا جاسکتا ہے فرق ہے یوں کہ مدعی نبوت اگر دعویٰ میں سچا ہوا تو ان اشیاء کا ظہور ہوگا اور اگر کاذب ہوا تو ان کا حصول مشکل تو اس سے سحر اور معجزہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ جب واضح ہوا یہ کافر نہیں اور ممکن الوقوع ہے اگر ساحر نے ان میں سے کچھ کہا اور اس کا اعتقاد تھا کہ اس کا لانا مباح ہے تو کافر کیونکہ اس نے ممنوع کو مباح قرار دیا اور اگر اس کی حرمت کا قائل تھا تو امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں اس کا حکم جنایت والا ہے۔ مثلاً کہتا ہے میرے جادو سے اغلب قتل ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا اور اگر کہتا ہے کہ بعض اوقات قتل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں تو یہ شبہ عمد ہے اگر کہے میں نے دوسرے پر جادو کیا مگر ہوا اس پر گیا تو یہ خطا ہے جس کی وجہ سے دیت مخففہ لازم ہوگی۔ کیونکہ ثبوت اقرار سے ہوا اور اگر قبیلہ تصدیق کرتا ہے تو ان پر ہوگی یہ مذہب شافعی کی تفصیل ہے

شیخ حسن بن زیاد، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں ساحر کو قتل کر دیا جائے نہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے اور نہ اس کا قول قبول کیا جائے کہ میں نے جادو ترک کر کے توبہ کر لی ہے، جب اس نے اقرار کر لیا تو اس کا خون مباح، اگر دو آدمی گواہی دیں یہ جادوگر ہے یا اس کا وصف بیان کریں جس سے جادوگر ہونا معلوم ہو تو اسے قتل کیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر یہ اقرار کرے میں نے ایک دفعہ جادو کیا اور کافی عرصہ سے اسے ترک کر دیا تو اس کی بات قبول کی جائے اور قتل نہ کیا جائے۔

شیخ محمد بن شجاع نے امام علی رازی سے نقل کیا۔ میں نے امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ کی رائے جادوگر کے بارے میں پوچھی تو فرمایا: اسے قتل کیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے یہ بمنزل مرتد نہیں اور فرمایا: ساحر کفر کے ساتھ زمین پر فساد بھی پھیلاتا ہے اور جس کی یہ حالت ہو اسے قتل پر قتل ہی کیا جاتا ہے، ہمارے اصحاب کہتے ہیں:

۱۔ جب ثابت ہو گیا کہ یہ نوع کفر نہیں بلکہ فسق ہے تو اگر حق غیر میں جنایت نہیں ہوتی تو اس میں حق وہی ہے جو تفصیلاً گزرا ہے

۲۔ یہودی ساحر کو قتل نہ کیا گیا، اس کا نام لبید بن اعصم تھا اس نے حضور ﷺ پر جادو کیا۔ خیبر کی یہودی جادوگر عورت زینب کو بھی قتل نہ کروایا لہٰذا اہل ایمان کو بھی قتل نہ کیا جائے۔ آپ کا فرمان ہے:

لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَ عَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ — ان غیر مسلموں کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں اور ان کے فرائض وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں

(سنن ابوداؤد: ۲۶۴۱)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل

امام ابوحنیفہ کے دلائل یہ روایات ہیں:

۱۔ امام نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی نے جادو کیا، پکڑی گئی۔ اعتراف پر اسے

کہتے ہیں یہ بھی کفر ہے کیونکہ اس اعتقاد کی موجودگی میں صدق انبیاء پر معجزہ سے استدلال ممکن نہ ہوگا۔ لیکن یہ بات کمزور ہے۔ جواباً کہا جاسکتا ہے فرق ہے یوں کہ مدعی نبوت اگر دعویٰ میں سچا ہوا تو ان اشیاء کا ظہور ہوگا اور اگر کاذب ہوا تو ان کا حصول مشکل تو اس سے سحر اور معجزہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ جب واضح ہوا یہ کافر نہیں اور ممکن الوقوع ہے اگر ساحر نے ان میں سے کچھ کہا اور اس کا اعتقاد تھا کہ اس کا لانا مباح ہے تو کافر کیونکہ اس نے ممنوع کو مباح قرار دیا اور اگر اس کی حرمت کا قائل تھا تو امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں اس کا حکم جنایت والا ہے۔ مثلاً کہتا ہے میرے جادو سے اغلب قتل ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا اور اگر کہتا ہے کہ بعض اوقات قتل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں تو یہ شبہ عمد ہے اگر کہے میں نے دوسرے پر جادو کیا مگر ہوا اس پر گیا تو یہ خطا ہے جس کی وجہ سے دیت مخففہ لازم ہوگی۔ کیونکہ ثبوت اقرار سے ہوا اور اگر قبیلہ تصدیق کرتا ہے تو ان پر ہوگی یہ مذہب شافعی کی تفصیل ہے

شیخ حسن بن زیاد، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں ساحر کو قتل کر دیا جائے نہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے اور نہ اس کا قول قبول کیا جائے کہ میں نے جادو ترک کر کے توبہ کر لی ہے، جب اس نے اقرار کر لیا تو اس کا خون مباح، اگر دو آدمی گواہی دیں یہ جادوگر ہے یا اس کا وصف بیان کریں جس سے جادوگر ہونا معلوم ہو تو اسے قتل کیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر یہ اقرار کرے میں نے ایک دفعہ جادو کیا اور کافی عرصہ سے اسے ترک کر دیا تو اس کی بات قبول کی جائے اور قتل نہ کیا جائے۔

شیخ محمد بن شجاع نے امام علی رازی سے نقل کیا۔ میں نے امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ کی رائے جادوگر کے بارے میں پوچھی تو فرمایا: اسے قتل کیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے یہ بمنزل مرتد نہیں اور فرمایا: ساحر کفر کے ساتھ زمین پر فساد بھی پھیلاتا ہے اور جس کی یہ حالت ہو اسے قتل پر قتل ہی کیا جاتا ہے، ہمارے اصحاب کہتے ہیں:

۱۔ جب ثابت ہو گیا کہ یہ نوع کفر نہیں بلکہ فسق ہے تو اگر حق غیر میں جنایت نہیں ہوتی تو اس میں حق وہی ہے جو تفصیلاً گزرا ہے

۲۔ یہودی ساحر کو قتل نہ کیا گیا، اس کا نام لبید بن اعصم تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا۔ خیبر کی یہودی جادوگر عورت زینب کو بھی قتل نہ کروایا لہٰذا اہل ایمان کو بھی قتل نہ کیا جائے۔ آپ کا فرمان ہے:

لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِينَ (سنن ابوداؤد: ۲۶۴۱)

ان غیر مسلموں کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں اور ان کے فرائض وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل

امام ابوحنیفہ کے دلائل یہ روایات ہیں:

۱۔ امام نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی نے جادو کیا، پکڑی گئی۔ اعتراف پر اسے

حضرت عبدالرحمٰن بن زید رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بات پہنچی تو ناراض ہوئے تو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے حاضر ہوکر تمام معاملہ بتایا گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ناراضگی کا سبب ان کی اجازت کے بغیر قتل تھا۔

۲۔ حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمال کے نام تحریراً لکھا ہر جادوگر مرد وعورت کو قتل کر دو تو ہم نے تین جادوگروں کو قتل کر دیا۔

(سنن ابوداؤد:۳۰۴۳)

۳۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نجومی قسم کے لوگ عجم کے کاہن ہیں جو ان کے پاس گیا اور ان کے قول پر ایمان لے آیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ تعلیمات کا منکر ٹھہرا۔

جواب: ممکن ہے یہ جادوگر کافر ہوں اور حکایت حال کے صدق کیلئے صورت واحد بھی کافی ہوتی ہے۔

جادو کی باقی انواع مثلاً شعبدہ بازی، آلات عجیبہ خواہ وہ گھوڑے ہوں یا ہندسے، اسی طرح خوف وغیرہ دلا کر اعتقاد دلانا، تضریب ونمیمہ اختیار کرنا، فرقت پیدا کرنا وہم پیدا کرنا کہ یہ تحریر اسم اعظم سے ہے تو یہ تمام کفر نہیں۔ اسی طرح لوگوں کے گھروں میں میلی اشیاء دفن کرنا۔ اسی طرح کہنا کہ جنات تابع ہیں، اسی طرح ادویات کھانوں میں ملا دینا کیونکہ یہ چیزیں حدِ کفر تک نہیں پہنچ پاتیں اور نہ ان میں قتل ہے، یہ سحر وجادو میں تفصیلی گفتگو تھی۔ اللّٰہ الکافی والوافی

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

ظاہر آیت بتا رہا ہے ان کے کفر کی وجہ لوگوں کو جادو سکھانا ہے اس لیے کہ حکم کا کسی وصف پر مترتب ہونا بتاتا ہے کہ یہ وصف علت ہے، جو کفر نہیں اسکی تعلیم سبب کفر نہ ہوگی لہٰذا آیت بتا رہی ہے تعلیم جادو کفر ہے اور خود جادو بھی کفر ہے اس سے منکر کہہ سکتا ہے ہم نہیں مانتے حکم کا وصف پر مرتب ہونا علت پر دال ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے لوگوں کو جادو کی تعلیم دی۔

سوال: یہ معاملہ مشکل ہے اللہ تعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا: دونوں فرشتوں نے سحر کی تعلیم دی اگر تعلیم سحر کفر ہے تو ان دونوں سے کفر لازم آئے گا اور یہ درست نہیں کیونکہ ثابت ومسلم ہے ملائکہ تمام معصوم ہیں۔ پھر یہ بھی گذرا کہ جس پر سحر کا اطلاق آتا ہے اس کا کفر ہونا ضروری نہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں۔ لفظ مشترک تمام مسمیات کو شامل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم اسے اس جادو پر محمول کریں جو کفر ہے اور وہ نوع اول ہے۔ یعنی ستاروں کو خدا ماننا اور ان سے اظہارِ معجزات وخوارق میں مدد طلب کرنا یہ جادو کفر ہے۔ شیاطین کا کفر بھی یہی جادو تھا نہ کہ باقی اقسام۔

باقی دونوں فرشتوں کے بارے میں ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے جادو کی یہی قسم سکھائی بلکہ ممکن ہے انہوں نے

حضرت عبدالرحمٰن بن زید رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بات پہنچی تو ناراض ہوئے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حاضر ہو کر تمام معاملہ بتایا گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ناراضگی کا سبب ان کی اجازت کے بغیر قتل تھا۔

۲۔ حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمال کے نام تحریراً لکھا ہر جادوگر مرد و عورت کو قتل کر دو تو ہم نے تین جادوگروں کو قتل کر دیا۔

(سنن ابوداؤد:۳۰۴۳)

۳۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نجومی قسم کے لوگ عجم کے کاہن ہیں جو ان کے پاس گیا اور ان کے قول پر ایمان لے آیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ تعلیمات کا منکر ٹھہرا۔

جواب: ممکن ہے یہ جادوگر کافر ہوں اور حکایت حال کے صدق کیلئے صورت واحد بھی کافی ہوتی ہے۔

جادو کی باقی انواع مثلاً شعبدہ بازی، آلات عجیبہ خواہ وہ گھوڑے ہوں یا ہندسے، اسی طرح خوف وغیرہ دلا کر اعتقاد دلانا، تضریب ونمیمہ اختیار کرنا، فرقت پیدا کرنا وہم پیدا کرنا کہ یہ تحریر اسم اعظم سے ہے تو یہ تمام کفر نہیں۔ اسی طرح لوگوں کے گھروں میں میلی اشیاء دفن کرنا۔ اسی طرح کہنا کہ جنات تابع ہیں، اسی طرح ادویات کھانوں میں ملا دینا کیونکہ یہ چیزیں حدِ کفر تک نہیں پہنچ پاتیں اور نہ ان میں قتل ہے، یہ سحر و جادو میں تفصیلی گفتگو تھی۔ اللّٰہ الکافی والوافی

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ
ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

ظاہر آیت بتا رہا ہے ان کے کفر کی وجہ لوگوں کو جادو سکھانا ہے اس لیے کہ حکم کا کسی وصف پر مترتب ہونا بتاتا ہے کہ یہ وصف علت ہے، جو کفر نہیں اسکی تعلیم سبب کفر نہ ہوگی لہٰذا آیت بتا رہی ہے تعلیم جادو کفر ہے اور خود جادو بھی کفر ہے اس سے منکر کہہ سکتا ہے ہم نہیں مانتے حکم کا وصف پر مرتب ہونا علت پر دال ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے لوگوں کو جادو کی تعلیم دی۔

سوال: یہ معاملہ مشکل ہے اللہ تعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا: دونوں فرشتوں نے سحر کی تعلیم دی اگر تعلیم سحر کفر ہے تو ان دونوں سے کفر لازم آئے گا اور یہ درست نہیں کیونکہ ثابت و مسلم ہے ملائکہ تمام معصوم ہیں۔ پھر یہ بھی گذرا کہ جس پر سحر کا اطلاق آتا ہے اس کا کفر ہونا ضروری نہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں۔ لفظ مشترک تمام مسمیات کو شامل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم اسے اس جادو پر محمول کریں جو کفر ہے اور وہ نوع اول ہے۔ یعنی ستاروں کو خدا ماننا اور ان سے اظہارِ معجزات وخوارق میں مدد طلب کرنا یہ جادو کفر ہے۔ شیاطین کا کفر بھی یہی جادو تھا نہ کہ باقی اقسام۔

باقی دونوں فرشتوں کے بارے میں ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے جادو کی یہی قسم سکھائی بلکہ ممکن ہے انہوں نے

دوسری انواع کی تعلیم دی ہو، جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ — وہ سیکھتے ہیں ان سے جو جدائی پیدا کردے آدمی اور اس کی بیوی کے درمیان

اگر یہ کہا جائے کہ وہ اسی نوع کی تعلیم دیتے تو یاد رہے ان کی تعلیم کفر تب بنتی ہے جب معلم اس کو حق مانے اور اسے صواب و درست جانے اگر وہ سکھاتا ہے کہ اس سے احتراز کرو تو یہ کفر نہیں اور تعلیمِ ملائکہ کا مقصد یہی تھا کہ لوگ اس سے بچیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ — اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں تم اپنا ایمان نہ کھوؤ۔

البتہ شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے ان کا مقصد ہی ان اشیاء کو حق جاننا تھا لہٰذا فرق واضح ہو گیا۔

آٹھواں مسئلہ: امام نافع، ابنِ کثیر، عاصم اور ابوعمرو نے "لکنّ" پر شد اور شیاطین کو اس کا اسم بنا کر منصوب پڑھا باقی نے اسے مخفف اور شیاطین پر رفع پڑھا۔ معنی ایک ہی ہے، اسی طرح سورۂ انفال میں ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى — بلکہ اللہ نے پھینکیں

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ — بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا (پ۹، الانفال:۱۷)

مختار یہ ہے کہ جب ساتھ واؤ ہو تو تشدید احسن اور واؤ نہ ہو تو تخفیف احسن، وجہ یہ ہے کہ تخفیف کی صورت میں عطف کیلئے آتا ہے تو اتصالِ کلام کی وجہ سے واؤ کی ضرورت نہیں۔ مشدد عاطفہ نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت یہ اِنَّ والا عمل کرتا ہے۔

"وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ" کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: مَاۤ اُنْزِلَ، کے ما کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ یہ بمعنی الذی ہو ہے، اسی میں پھر تین اقوال ہیں:

پہلا قول: اس کا سحر پر عطف ہے یعنی لوگوں کو جادو سکھاتے اور انہیں ملکین پر نازل ہونے والا بھی سکھاتے ہیں۔

دوسرا قول: اس کا عطف "مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ" پر ہے۔ یعنی وہ اتباع کرتے ہیں جو شیاطین نے پڑھا وہ افترا ہے ملک سلیمان علیہ السلام پر اور جو نازل ہوا ملکین پر کیونکہ ایک جادو کفر ہے اور اسی کو شیاطین پڑھتے تھے دوسرے جادو کی تاثیر خاوند و بیوی میں تفریق پیدا کرنا تھی اور یہی ملکین پر نازل کیا گیا تھا گویا اللہ تعالیٰ یہود کے بارے میں مطلع فرما رہا ہے کہ انہوں نے دونوں جادوؤں کی اتباع کی اور صرف کسی ایک پر اکتفا نہیں کیا۔

تیسرا قول: اس کا عطف "ملکِ سلیمان" پر ہونے کی وجہ سے یہ محل جر میں ہے، یعنی جو شیاطین نے پڑھا بطور افترا ملک سلیمان پر اور نازل کردہ ملکین پر۔

مَلَکَیْن پر نزول جادو کا انکار

شیخ ابو مسلم کا یہی مختار ہے اور انہوں نے کہا: ملکین پر نازل کردہ جادو نہیں اس پر ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ اگر یہ جادو ہے تو نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ جائز نہیں اس لیے کہ جادو کفر و بدعت ہے لہٰذا اس کا انزال اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں۔

۲۔ ارشاد مبارک:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ — ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

واضح کر رہا ہے کہ جادو کی تعلیم کفر ہے اگر ثابت ہو جائے ملائکہ بھی اسی کی تعلیم دیتے ہیں تو ان کا کفر لازم آئے گا اور یہ باطل ہے۔

۳۔ جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت تعلیمِ سحر کیلئے نہیں تو ملائکہ کیلئے یہ بات بطریق اولیٰ نہ ہو گی۔

۴۔ جادو کی نسبت کفار، فساق اور شیاطین کی طرف ہی ہوتی ہے تو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور اس پر عذاب کی وعید فرمائی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا مناسب ہی نہیں، جادو محض باطل اور بناوٹ ہوتی ہے اور سنتِ الٰہیہ اس کا ابطال ہے۔

جیسے واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ہے:

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (پ۱۱، یونس:۸۱) — جو تم لائے یہ جادو ہے اللہ اسے باطل کر دے گا

پھر شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مبارکہ کی ایسی تفسیر کی ہے جو مفسرین کی اکثریت کے مخالف ہے تو لکھا۔

جیسا کہ شیاطین نے جادو کی نسبت ملکِ سلیمان کی طرف کر دی حالانکہ ملک سلیمان اس سے بری ہے اسی طرح انہوں نے جو کچھ ملائکہ پر نازل ہوا اسے جادو کہہ دیا حالانکہ ان پر نازل شدہ جادو ہرگز نہ تھا بلکہ وہ شریعت، دین اور خیر کی دعا تھی اور وہ

دوسرا قول: اس کا عطف "مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ" پر ہے۔ یعنی وہ اتباع کرتے ہیں جو شیاطین نے پڑھا وہ افترا ہے ملک سلیمان علیہ السلام پر اور جو نازل ہوا ملکین پر کیونکہ ایک جادو کفر ہے اور اسی کو شیاطین پڑھتے تھے دوسرے جادو کی تاثیر خاوند و بیوی میں تفریق پیدا کرنا تھی اور یہی ملکین پر نازل کیا گیا تھا گویا اللہ تعالیٰ یہود کے بارے میں مطلع فرما رہا ہے کہ انہوں نے دونوں جادوؤں کی اتباع کی اور صرف کسی ایک پر اکتفا نہیں کیا۔

تیسرا قول: اس کا عطف ''ملکِ سلیمان'' پر ہونے کی وجہ سے یہ محل جر میں ہے، یعنی جو شیاطین نے پڑھا بطور افترا ملک سلیمان پر اور نازل کردہ ملکین پر۔

مَلَكَيْن پر نزول جادو کا انکار

شیخ ابو مسلم کا یہی مختار ہے اور انہوں نے کہا: ملکین پر نازل کردہ جادو نہیں اس پر ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ اگر یہ جادو ہے تو نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ جائز نہیں اس لیے کہ جادو کفر و بدعت ہے لہٰذا اس کا انزال اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں۔

۲۔ ارشاد مبارک:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

واضح کر رہا ہے کہ جادو کی تعلیم کفر ہے اگر ثابت ہو جائے ملائکہ بھی اسی کی تعلیم دیتے ہیں تو ان کا کفر لازم آئے گا اور یہ باطل ہے۔

۳۔ جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت تعلیمِ سحر کیلئے نہیں تو ملائکہ کیلئے یہ بات بطریق اولیٰ نہ ہوگی۔

۴۔ جادو کی نسبت کفار، فساق اور شیاطین کی طرف ہی ہوتی ہے تو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور اس پر عذاب کی وعید فرمائی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا مناسب ہی نہیں، جادو محض باطل اور بناوٹ ہوتی ہے اور سنتِ الٰہیہ اس کا ابطال ہے۔

جیسے واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ہے:

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (پ۱۱ یونس:۸۱) جو تم لائے یہ جادو ہے اللہ اسے باطل کر دے گا

پھر شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مبارکہ کی ایسی تفسیر کی ہے جو مفسرین کی اکثریت کے مخالف ہے تو لکھا۔

جیسا کہ شیاطین نے جادو کی نسبت ملکِ سلیمان کی طرف کر دی حالانکہ ملک سلیمان اس سے بری ہے اسی طرح انہوں نے جو کچھ ملائکہ پر نازل ہوا اسے جادو کہہ دیا حالانکہ ان پر نازل شدہ جادو ہرگز نہ تھا بلکہ وہ شریعت، دین اور خیر کی دعا تھی اور وہ

لوگوں کو یہی سکھاتے اور ساتھ کہتے: اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ۔ تاکہ لوگ ان کی بات کو قبول کر کے اس پر ہی چلیں۔ کچھ لوگ بات مان لیتے اور کچھ نہ مانتے بلکہ مخالفت کرتے ہوئے ان سے کچھ فتنہ اور کفر کی اتنی مقدار سیکھ لیتے جس سے خاوند اور بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے۔ یہ شیخ ابو مسلم کے مذہب کی تفصیل تھی۔

۲۔ ما بمعنی جحد (انکار) ہے اور اس کا عطف "مَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ" پر ہے۔ گویا فرمایا: نہ سلیمان نے کفر کیا اور نہ ملکین پر جادو نازل ہوا کیونکہ جادوگر، جادو کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کرتے اور کہتے یہی جادو بابل میں ہاروت و ماروت پر نازل ہوا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ارشادات میں ان کا رد فرمایا ہے۔ "وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ" میں بھی انکار ہے یعنی انہوں نے یہ چیز کسی کو نہیں سکھائی بلکہ وہ تو اس سے سختی کے ساتھ منع کرتے۔

ارشادِ مبارک حَتّٰى يَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ۔ یعنی ہم آزمائش و ابتلاء ہیں فَلَا تَكۡفُرۡ (تو کفر نہ کرو، ایمان بچاؤ) یہ اس محاورہ کی طرح ہے۔ امرت فلانا بکذا حتٰی قلت له ان فعلت کذا نالك کذا۔ یعنی میں نے فعل کرنے کو نہیں کہا بلکہ اس سے بچنے کا کہا ہے۔

یاد رہے یہ اقوال اگرچہ حسن ہیں مگر قولِ اول ان سے احسن ہے۔ اس لیے کہ "مَاۤ اُنۡزِلَ" کا عطف متصل پر، دور والے سے اولیٰ ہے البتہ کوئی اور دلیل ہو تو الگ معاملہ ہوگا۔

پھر شیخ ابو مسلم کا اولاً یہ کہنا اگر وہ نازل کردہ جادو ہے تو وہ اللہ تعالیٰ نازل فرمانے والا ہے اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں شی کی معرفت بعض اوقات اسے وجود میں لانے کیلئے ہوتی ہے اور بعض اوقات اس سے احتراز کیلئے جیسے شاعر نے کہا:

عرفت الشر لا للشر لکن لتوقیه

(میں نے شر کو پہچانا محض شر کیلئے نہیں ہاں اس سے بچنے کیلئے)

ان کا ثانیاً یہ کہنا کہ تعلیم سحر کفر ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ كَفَرُوۡا يُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ — ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

تو جواب یہ ہے یہ حال کی حکایت ہے اس کے صدق کیلئے فقط ایک صورت کا پایا جانا کافی ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی ایسے جادو کی تعلیم دے جو ستاروں کو خدا قرار دے اور اس کی تعلیم سے مقصد اس مذہب کو حق ثابت کرنا ہو۔

ان کا ثالثاً کہنا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی آمد تعلیم سحر کیلئے نہیں اور یہی حکم ملائکہ کا ہے۔

جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس کی تعلیم کیلئے بعثتِ انبیاء جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے ان کی یہ تعلیم سحر اس کے مقابلہ اور ابطال کیلئے ہو

ان کا قول رابعاً کہ جادو کی نسبت کفار اور باقی لوگوں کی طرف ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیسے ہوگی حالانکہ اس نے اسے منع کردیا ہے۔

جواب: اس پر عمل اور اس کی تعلیم میں فرق ہے یہ کیوں ممکن نہیں کہ اس پر عمل منع ہو؟ اور اس کی تعلیم سے غرض اس کا فساد دور کرنا ہو تو اس وقت یہ مامور ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: حضرت حسن نے "ملکین" میں لام کے نیچے زیر پڑھی ہے اور یہی حضرت ضحاک اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے پھر ان کا اختلاف ہے، حضرت حسن کہتے ہیں یہ دو معالج تھے جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے۔ بعض نے کہا: یہ دو صالح بادشاہ تھے، مشہور قرأت لام پر زبر ہے اور یہ دونوں آسمان سے نازل ملائکہ تھے ان کا نام ہاروت و ماروت ہے بعض حضرت جبریل اور حضرت میکائیل اور بعض ان کے علاوہ مراد لیتے ہیں

کسرہ (زیر) پر دلائل

جن لوگوں نے زیر پڑھی ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ تعلیمِ سحر ملائکہ کے شان کے لائق نہیں۔

۲۔ ملائکہ کا نزول کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ جب کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ — اور اگر ہم فرشتہ اُتارتے تو کام تمام ہوگیا ہوتا پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی (پ، الانعام:۸)

۳۔ اگر وہ ملائکہ تھے تو کیا وہ انسان کی صورت میں تھے یا نہیں اگر انسان کی شکل میں تھے حالانکہ وہ انسان نہ تھے تو پھر یہ لوگوں کیلئے تجہیل اور تلبیس ہوگی اور یہ جائز نہیں اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کیوں جائز نہیں کہ ہر نظر آنے والا انسان حقیقت میں انسان نہ ہو بلکہ فرشتہ ہو اور اگر وہ انسانی شکل میں نہ تھے اور اس پر اس آیت سے اعتراض ہوگا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا — اگر ہم نبی فرشتہ بناتے تو اسے مرد بناتے

جواب: اول کا جواب یہ ہے کہ ہم عنقریب اس حکمت کو بیان کرنے والے ہیں جس کی خاطر ملائکہ کو تعلیم سحر کیلئے اتارا گیا۔

دوسرے کا جواب ہے کہ یہ آیت عام اور زبر کے ساتھ متواتر اور خاص ہے اور خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔

تیسرے کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی صورت میں اتارا، انبیاء کے ادوار میں لوگوں پر یہ لازم تھا کہ وہ کسی بھی انسان کو قطعی طور پر انسان نہ سمجھے جیسا کہ حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ انہیں دیکھنے والوں پر لازم تھا کہ وہ انہیں انسان یقین نہ کریں بلکہ توقف لازم تھا۔

ان کا قول رابعاً کہ جادو کی نسبت کفار اور باقی لوگوں کی طرف ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیسے ہوگی حالانکہ اس نے اسے منع کر دیا ہے۔

جواب: اس پر عمل اور اس کی تعلیم میں فرق ہے یہ کیوں ممکن نہیں کہ اس پر عمل منع ہو؟ اور اس کی تعلیم سے غرض اس کا فساد دور کرنا ہو تو اس وقت یہ مامور ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: حضرت حسن نے "ملکین" میں لام کے نیچے زیر پڑھی ہے اور یہی حضرت ضحاک اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے پھر ان کا اختلاف ہے، حضرت حسن کہتے ہیں یہ دو معالج تھے جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے۔ بعض نے کہا: یہ دو صالح بادشاہ تھے، مشہور قرأت لام پر زبر ہے اور یہ دونوں آسمان سے نازل ملائکہ تھے ان کا نام ہاروت و ماروت ہے بعض حضرت جبریل اور حضرت میکائیل اور بعض ان کے علاوہ مراد لیتے ہیں

کسرہ (زیر) پر دلائل

جن لوگوں نے زیر پڑھی ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ تعلیمِ سحر ملائکہ کے شان کے لائق نہیں۔

۲۔ ملائکہ کا نزول کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جب کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ — اور اگر ہم فرشتہ اُتارتے تو کام تمام ہو گیا ہوتا پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی (پ۷، الانعام:۸)

۳۔ اگر وہ ملائکہ تھے تو کیا وہ انسان کی صورت میں تھے یا نہیں اگر انسان کی شکل میں تھے حالانکہ وہ انسان نہ تھے تو پھر یہ لوگوں کیلئے تجہیل اور تلبیس ہوگی اور یہ جائز نہیں اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کیوں جائز نہیں کہ ہر نظر آنے والا انسان حقیقت میں انسان نہ ہو بلکہ فرشتہ ہو اور اگر وہ انسانی شکل میں نہ تھے اور اس پر اس آیت سے اعتراض ہوگا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا — اگر ہم نبی فرشتہ بناتے تو اسے مرد بناتے

جواب: اول کا جواب یہ ہے کہ ہم عنقریب اس حکمت کو بیان کرنے والے ہیں جس کی خاطر ملائکہ کو تعلیم سحر کیلئے اتارا گیا۔

دوسرے کا جواب ہے کہ یہ آیت عام اور زبر کے ساتھ متواتر اور خاص ہے اور خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔

تیسرے کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی صورت میں اتارا، انبیاء کے ادوار میں لوگوں پر یہ لازم تھا کہ وہ کسی بھی انسان کو قطعی طور پر انسان نہ سمجھے جیسا کہ حضور ﷺ کی ظاہری حیات میں حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ انہیں دیکھنے والوں پر لازم تھا کہ وہ انہیں انسان یقین نہ کریں بلکہ توقف لازم تھا۔

تیسرا مسئلہ: سببِ نزول میں اختلاف

جب ہم انہیں ملائکہ قرار دیتے ہیں تو اب ان کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے جب ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بتایا اور انہوں نے عرض کیا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کیا تو بنائے گا زمین میں فساد کرنے والا اور خون بہانے والا

تو اللہ تعالیٰ سے جواباً فرمایا:

اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (پ۱، البقرہ:۳۰) مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے

پھر ان میں سے ایک جماعت ملائکہ (کرام کاتبین) کو انسانوں کے اعمال پر مقرر کیا تو وہ ان کے اعمال خبیثہ لے کر جاتے تو ملائکہ ان پر تعجب کرتے اور ان کے ان اعمال بد کے باوجود انہیں اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے پر بھی متعجب ہوتے پھر ان ملائکہ نے ان کی طرف جادو کی نسبت کی تو ملائکہ اور متعجب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آزمائش میں ڈالا اور فرمایا: تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو علم، زہد اور دیانت میں اعلیٰ ہیں تا کہ میں انہیں زمین پر اتار کر آزماؤں۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو منتخب کیا اور ان پر انسانی شہوت سوار کردی انہیں اتارا اور شرک، قتل، زنا اور شراب سے منع کردیا۔ جب وہ زمین پر آئے تو زہرہ نامی خاتون آئی جو بڑی حسین تھی، انہوں نے اسے اپنے ساتھ محبت کا کہا مگر اس نے انکار کیا اور کہا: تم دونوں بتوں کی عبادت کرو اور شراب پیو تو پھر تمہارے ساتھ معاملہ ہوسکتا ہے۔ اولاً انہوں نے انکار کیا پھر شہوت نے غلبہ کرلیا تو انہوں نے اس کی شرط مان لی۔ انہوں نے شراب پی بُت کی پوجا کی۔ اتنے میں سائل آگیا۔ عورت نے کہا اگر اس نے لوگوں کو بتا دیا تو ہمارا معاملہ بگڑ جائے گا، اگر تم میرے ساتھ کامل تعلق چاہتے ہو تو اسے قتل کردو۔ پہلے تو کچھ رُکے پھر قتل کردیا۔ قتل سے فارغ ہو کر عورت کو دیکھنے لگے تو وہ غائب ہوچکی تھی۔ دونوں نے حسرت وندامت کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں گڑگڑائے تو انہیں اختیار دیا تم آخرت کا عذاب لے لو یا دنیا کا عذاب۔ انہوں نے عذابِ دنیا کو ترجیح دی تو ان دونوں کو آسمان وزمین کے درمیان بابل میں معلق کردیا گیا اور دونوں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

زُہرہ کون تھی؟

مفسرین کے زُہرہ کے بارے میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ملائکہ کی آزمائش کیلئے ان میں انسانی شہوت کو پیدا کیا اور زہرہ ستارے کو خوبصورت شکل میں خاتون بنا کر اتارا۔ پھر وہ زہرہ اپنے فلک سمیت اپنے آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور یہ ان کے عمل پر توبیخ تھی۔

دوسرا قول: یہ زمانہ کی بدنام عورت تھی، انہوں نے شراب، قتل اور عبادت بُت کے بعد اس کے ساتھ غلط کام کیا پھر انہوں نے اسے وہ نام بتایا جس کے واسطہ سے وہ آسمان پر جاتے۔ اس نے نام پڑھا اور آسمان کی طرف بلند ہو گئی اس کا نام ''بیدخت'' تھا اللہ تعالیٰ نے اسے مسخ فرما کر زہرہ ستارہ بنا دیا۔

یاد رہے یہ روایت فاسد، مردود اور غیر مقبول ہے کیونکہ کتاب اللہ میں اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے جھوٹ ہونے پر شواہد ہیں

بُطلان پر شواہد

پہلی دلیل: جو دلائل گزر چکے کہ ملائکہ تمام معاصی سے معصوم ہوتے ہیں۔

دوسری دلیل: یہ بات کہ انہیں عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں اختیار ملا فاسد ہے بلکہ اولیٰ یہ تھا کہ انہیں توبہ اور عذاب میں اختیار ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ساری عمر شرک کرنے والے کو انہی دو (توبہ و عذاب) میں اختیار دیتا ہے تو ان ملائکہ کے بارے میں بخل کیسے ہو سکتا ہے؟

تیسری دلیل: تعجب خیز ہے یہ بات کہ وہ عذاب کی حالت میں جادو سکھاتے اور اس کی دعوت دیتے رہے

جب اس قول کا فساد واضح ہو گیا اب انزال کی وجوہ سنیے۔

اسباب انزال

تو یہ اسباب ہو سکتے ہیں:

پہلی وجہ: اس دور میں کثیر جادوگر تھے انہوں نے اس سلسلہ میں عجیب معاملات کے دروازے کھول رکھے تھے وہ نبوت کا دعویٰ کر کے لوگوں سے مقابلہ اور تحدی کرتے اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو بھیجا تا کہ یہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیں اور وہ ان جھوٹے نبوت کے دعوے داروں کا مقابلہ کر سکیں اور یہ اعلیٰ مقصد اور احسن غرض ہے۔

دوسری وجہ: اس بات کا علم کہ معجزہ، سحر کے مخالف ہے اور یہ معجزہ اور جادو کی حقیقت و ماہیت جاننے پر موقوف ہے اور لوگ

پہلا قول: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ملائکہ کی آزمائش کیلئے ان میں انسانی شہوت کو پیدا کیا اور زہرہ ستارے کو خوبصورت شکل میں خاتون بنا کر اتارا۔ پھر وہ زہرہ اپنے فلک سمیت اپنے آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور یہ ان کے عمل پر توبیخ تھی۔

دوسرا قول: یہ زمانہ کی بدنام عورت تھی، انہوں نے شراب، قتل اور عبادت بُت کے بعد اس کے ساتھ غلط کام کیا پھر انہوں نے اسے وہ نام بتایا جس کے واسطہ سے وہ آسمان پر جاتے۔ اس نے نام پڑھا اور آسمان کی طرف بلند ہو گئی اس کا نام ''بیدخت'' تھا اللہ تعالیٰ نے اسے مسخ فرما کر زہرہ ستارہ بنا دیا۔

یاد رہے یہ روایت فاسد، مردود اور غیر مقبول ہے کیونکہ کتاب اللہ میں اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے جھوٹ ہونے پر شواہد ہیں

بُطلان پر شواہد

پہلی دلیل: جو دلائل گزر چکے کہ ملائکہ تمام معاصی سے معصوم ہوتے ہیں۔

دوسری دلیل: یہ بات کہ انہیں عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں اختیار ملا فاسد ہے بلکہ اولیٰ یہ تھا کہ انہیں توبہ اور عذاب میں اختیار ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ساری عمر شرک کرنے والے کو انہی دو (توبہ و عذاب) میں اختیار دیتا ہے تو ان ملائکہ کے بارے میں بخل کیسے ہو سکتا ہے؟

تیسری دلیل: تعجب خیز ہے یہ بات کہ وہ عذاب کی حالت میں جادو سکھاتے اور اس کی دعوت دیتے رہے

جب اس قول کا فساد واضح ہو گیا اب انزال کی وجوہ سنیے۔

اسباب انزال

تو یہ اسباب ہو سکتے ہیں:

پہلی وجہ: اس دور میں کثیر جادوگر تھے انہوں نے اس سلسلہ میں عجیب معاملات کے دروازے کھول رکھے تھے وہ نبوت کا دعویٰ کر کے لوگوں سے مقابلہ اور تحدی کرتے اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو بھیجا تاکہ یہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیں اور وہ ان جھوٹے نبوت کے دعوے داروں کا مقابلہ کر سکیں اور یہ اعلیٰ مقصد اور احسن غرض ہے۔

دوسری وجہ: اس بات کا علم کہ معجزہ، سحر کے مخالف ہے اور یہ معجزہ اور جادو کی حقیقت و ماہیت جاننے پر موقوف ہے اور لوگ

ماہیت سحر سے جاہل تھے لہٰذا ان پر ماہیت معجزہ کی معرفت دشوار تھی، اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو بھیجا تاکہ اس فائدہ وغرض کی وجہ سے لوگوں کو ماہیت سحر سے آگاہ کریں۔

تیسری وجہ: یہ کہنا بھی غلط نہیں، ایسا جادو جو اعداء الٰہی کے درمیان عداوت اور اولیاء اللہ میں اُلفت پیدا کرے وہ مفسرین کے نزدیک مباح یا مستحب ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس غرض کیلئے ملائکہ کو تعلیمِ سحر کیلئے نازل فرمایا۔ پھر لوگوں نے ان سے سیکھا لیکن اسے بطور شر استعمال کیا جس سے اولیاء اللہ میں عداوت اور اعداء اللہ میں الفت پیدا ہوئی۔

چوتھی وجہ: ہر شئی کے علم کا حصول حسن وخوب ہوتا ہے، اگر جادو ممنوع ٹھہرا تو لازم کہ وہ متصور ومعلوم ہو کیونکہ جس کا تصور ہی نہ ہو اس سے ممانعت ممتنع ہو گی۔

پانچویں وجہ: ممکن ہے جنات انواع جادو سے واقف تھے لیکن انسان ان کا مقابلہ نہ کر پاتا تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو ایسے امور کی تعلیم دیں جس سے وہ جنات کا مقابلہ کر سکیں۔

چھٹی وجہ: ممکن ہے یہ عمل ذمہ داری میں شدت پیدا کرنے کیلئے ہو جب کوئی اسے سیکھ لے گا تو لذاتِ دنیا اور عاجلہ میں مشغول ہوگا تو اس کے استعمال سے روکا تو اب اس کیلئے یہ رکنا نہایت ہی مشکل ہوگا اور اسے ثواب بھی زائد حاصل ہوگا جیسا کہ قومِ حضرت طالوت کو نہر کے پانی سے آزمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ — تو جواس کا پانی پیئے وہ میرا نہیں اور جو نہ پیئے وہ میرا ہے

(پ۲، البقرۃ:۲۴۹)

ان تمام وجوہات سے ثابت ہو رہا ہے کہ تعلیمِ سحر کیلئے اللہ تعالیٰ کا ملائکہ کو نازل فرمانا کوئی بعید از قیاس نہیں۔ واللہ اعلم

چوتھا مسئلہ: بعض نے کہا: یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے کیونکہ جب دونوں بصورت بشر نازل ہوئے تو اس دور میں کسی رسول کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ ان کا معجزہ بنے یہ دونوں رسول نہیں ہو سکتے کیونکہ ثابت ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی طرف کسی فرشتہ کو رسول نہیں بناتے۔

پانچواں مسئلہ: ہاروت وماروت، ملکین کیلئے عطف بیان ہے یہ ان کا عَلم اور عجمی الفاظ ہیں، اس پر دلیل ان کا غیر منصرف ہونا ہے اگر یہ ہرت ومرت (بمعنی توڑنا) سے ہوتے جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو پھر، منصرف تھے۔ شیخ زہری نے ہاروت وماروت کو بطور خبر مرفوع پڑھا یعنی "هما هاروت و ماروت"

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: تفریق کی تفسیر دو طرح سے ہے:

۱۔ تفریق یوں کہ یہ اعتقاد ہو کہ یہ جادو میں تفریق میں مؤثر ہے تو کافر ہو جائے گا، جب آدمی کافر ہوا بیوی سے نکاح ختم اور وہ جدا ہو جائے لہٰذا ان میں تفریق آجائے گی۔

۲۔ یہ کہ ان دونوں کے درمیان جعلسازی، چغلخوری اور دیگر وجوہ سے علیحدگی پیدا کردی جائے۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں تفریق کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان سے صرف اس قدر سیکھتے بلکہ اس صورت کا تذکرہ باقی صورتوں پر تنبیہ ہے کیونکہ، خاوند کا بیوی کی طرف مائل ہونا اور محبت کرنا دیگر محبتوں سے معروف زائد و ممتاز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جادو کی یہ صورت بیان فرما کر تنبیہ کی ہے کہ جب اس شدید تعلق و معاملہ میں یہ تفریق کر دیتا ہے تو دیگر میں بطریق اولیٰ کردے گا۔

ارشاد مبارک "وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ" ہمارے مذکور موقف پر دلیل ہے کہ مطلقاً ضرر کا ذکر ہے نہ کہ صرف خاوند و بیوی میں تفریق کا تو یہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس تفریق کا ذکر اس کے بڑا حادثہ اور اعلیٰ مرتبہ کی وجہ سے کیا ہے۔

وجوہات تاویل

وجوہ تاویل متعدد ہیں:

۱۔ حضرت حسن کہتے ہیں یہاں تخلیہ مراد ہے یعنی اگر کسی نے جادو کیا تو اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کا اثر روک دے اور اگر چاہے تو اس جادو اور اس بندے کو چھوڑ دے۔ یعنی اثر ہونے دے۔

۲۔ شیخ اصم کہتے ہیں باذن اللّٰہ سے مراد "بعلم اللّٰہ" ہے، اذان کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ نماز کے وقت کا لوگوں کے علم کیلئے ذریعہ ہے۔ اذان کو اذن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اسی حاسہ (سمع) سے اذان کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ (پ۱۰، التوبۃ:۳)

اور منادی پکار دیتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں میں بڑے حج کے دن

یعنی لوگوں کیلئے اطلاع ہے۔

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: تفریق کی تفسیر دو طرح سے ہے:

۱۔ تفریق یوں کہ یہ اعتقاد ہو کہ یہ جادو میں تفریق میں مؤثر ہے تو کافر ہو جائے گا، جب آدمی کافر ہوا بیوی سے نکاح ختم اور وہ جدا ہو جائے لہٰذا ان میں تفریق آ جائے گی۔

۲۔ یہ کہ ان دونوں کے درمیان جعلسازی، چغلخوری اور دیگر وجوہ سے علیحدگی پیدا کر دی جائے۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں تفریق کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان سے صرف اس قدر سیکھتے بلکہ اس صورت کا تذکرہ باقی صورتوں پر تنبیہ ہے کیونکہ، خاوند کا بیوی کی طرف مائل ہونا اور محبت کرنا دیگر محبتوں سے معروف زائد و ممتاز ہے۔
اللہ تعالیٰ نے جادو کی یہ صورت بیان فرما کر تنبیہ کی ہے کہ جب اس شدید تعلق و معاملہ میں یہ تفریق کر دیتا ہے تو دیگر میں بطریق اولیٰ کر دے گا۔

ارشاد مبارک "وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ" ہمارے مذکور موقف پر دلیل ہے کہ مطلقاً ضرر کا ذکر ہے نہ کہ صرف خاوند و بیوی میں تفریق کا تو یہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس تفریق کا ذکر اس کے بڑا حادثہ اور اعلیٰ مرتبہ کی وجہ سے کیا ہے۔

وجوہات تاویل

وجوہ تاویل متعدد ہیں:

۱۔ حضرت حسن کہتے ہیں یہاں تخلیہ مراد ہے یعنی اگر کسی نے جادو کیا تو اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کا اثر روک دے اور اگر چاہے تو اس جادو اور اس بندے کو چھوڑ دے۔ یعنی اثر ہونے دے۔

۲۔ شیخ اصم کہتے ہیں باذن اللہ سے مراد "بعلم اللہ" ہے، اذان کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ نماز کے وقت کا لوگوں کے علم کیلئے ذریعہ ہے۔ اذان کو اذن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اسی حاسہ (سمع) سے اذان کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ (پ۱۰، التوبۃ: ۳)

اور منادی پکار دیتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں میں بڑے حج کے دن

یعنی لوگوں کیلئے اطلاع ہے۔

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ (پ ۳، البقرہ: ۲۷۹) تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا

اس کا معنی ہے، جان لو۔

ایک اور جگہ ہے:

فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ (پ ۱۷، الانبیاء: ۱۰۹) تو فرمادو میں نے تمہیں لڑائی کا اعلان کر دیا برابری پر

یعنی میں نے تمہیں بتادیا ہے۔

۳۔ عمل جادو سے جو کچھ مرتب ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق، ایجاد اور پیدا کرنے سے ہوتا ہے جس کا معاملہ یوں ہی ہو اس کو اذن اللہ کی طرف منسوب کرنا درست ہے جیسا کہ فرمانِ مقدس ہے:

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (پ ۱۴، النحل: ۴۰) جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے

۴۔ یہاں اذن سے امر مراد ہے اور یہ وجہ اسی وقت باری تعالیٰ کے لائق ہے جب خاوند بیوی کی تفریق کی تفسیر یوں ہو اعتقاد رکھنے والا کافر ہو جائے گا اور کفر کا تقاضا تفریق ہے اور یہ حکم شرعی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہی ہوگا۔

"وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: لفظ شرا کا بطور مجاز ان وجوہات کی بنا پر ذکر ہوا۔

۱۔ جب انہوں نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈالا اور شیطان کی تعلیم پر چلنا شروع کر دیا تو گویا انہوں نے کتاب اللہ کے عوض جادو خرید لیا۔

۲۔ ملائکہ نے تعلیمِ سحر کے ذریعے اس سے بچنے کا قصد کیا تاکہ لوگ اس سے بچ کر اُخروی منافع حاصل کریں لیکن انہوں نے اس کا استعمال کیا گویا منافعِ آخرت کے عوض منافع دنیا کو خرید لیا۔

۳۔ جب انہوں نے سحر کو استعمال کیا۔

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (پ ۳، البقرہ: ۲۷۹) تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا

اس کا معنی ہے، جان لو۔

ایک اور جگہ ہے:

فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ (پ ۱۷، الانبیاء: ۱۰۹) تو فرمادو میں نے تمہیں لڑائی کا اعلان کردیا برابری پر

یعنی میں نے تمہیں بتادیا ہے۔

۳۔ عمل جادو سے جو کچھ مرتب ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق، ایجاد اور پیدا کرنے سے ہوتا ہے جس کا معاملہ یوں ہی ہو اس کو اذن اللہ کی طرف منسوب کرنا درست ہے جیسا کہ فرمانِ مقدس ہے:

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے (پ ۱۴، النحل: ۴۰)

۴۔ یہاں اذن سے امر مراد ہے اور یہ وجہ اسی وقت باری تعالیٰ کے لائق ہے جب خاوند بیوی کی تفریق کی تفسیر یوں ہو اعتقاد رکھنے والا کافر ہو جائے گا اور کفر کا تقاضا تفریق ہے اور یہ حکم شرعی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہی ہوگا۔

"وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: لفظ شرا کا بطور مجاز ان وجوہات کی بنا پر ذکر ہوا۔

۱۔ جب انہوں نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈالا اور شیطان کی تعلیم پر چلنا شروع کردیا تو گویا انہوں نے کتاب اللہ کے عوض جادو خرید لیا۔

۲۔ ملائکہ نے تعلیمِ سحر کے ذریعے اس سے بچنے کا قصد کیا تاکہ لوگ اس سے بچ کر اُخروی منافع حاصل کریں لیکن انہوں نے اس کا استعمال کیا گویا منافعِ آخرت کے عوض منافع دنیا کو خرید لیا۔

۳۔ جب انہوں نے سحر کو استعمال کیا۔

دوسرا مسئلہ، خلاق کا مفہوم

اکثر کا قول ہے خلاق کا معنی حصہ ہے۔ شیخ قفال کہتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس کا اصل خلق ہے جس کا معنی تقدیر ہے اس سے خلق الادیم، قدر للرجل کذا درھما رزقا علی عمل کذا۔ کچھ نے کہا: خلاق، خلاصی، امیہ بن ابی ملت نے کہا:

یدعون بالویل فیھا لاخلاق لھم　　　　الاسرابیل قطران وأغلال

(انہیں دوزخ میں لے جایا جائے گا وہاں خلاصی نہ ہوگی یہ وہاں سنگل اور بیڑیوں میں جکڑے جائیں گے)

سوال: آیت میں یہ سوال باقی ہے "لَقَدْ عَلِمُوْا" میں ان کیلئے علم کیسے مانا جبکہ "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" سے علم کی نفی کی

۱۔ یہاں علم والے اور غیر علم والے ایک نہیں، علم والوں سے مراد وہ ہیں جنہوں نے جادو سیکھا اور لوگوں کو اس کی تعلیم کیلئے بلایا۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

رہے جہال جو جادو سیکھنے کی طرف راغب ہوتے یہ علم والے نہ تھے یہ شیخ اخفش اور قطرب کا جواب ہے۔

۲۔ ہم مانتے ہیں دونوں ایک ہی تھے مگر فرق یہ ہے کہ جانا انہوں نے کچھ اور تھا اور جاہل کسی اور سے تھے۔ انہوں نے یہ جانا تھا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن وہ اس سے جاہل تھے کہ وہ کس قدر منافع آخرت فوت کر چکے ہیں اور انہیں کس قدر نقصان اور عقوبات حاصل ہوں گی۔

۳۔ ہم مانتے ہیں لوگ بھی ایک اور ان کا معلوم بھی ایک ہی تھا لیکن انہوں نے اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اس سے منہ پھیر لیا تو ان کا علم کالعدم قرار دیا گیا جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کو فرمایا:

صُمًّا وَّبُكْمًا وَّعُمْيًا　　(پ۱۵، الاسراء:۹۷)　　اندھے اور گونگے اور بہرے

کیونکہ انہوں نے حواس سے نفع و فائدہ حاصل نہ کیا جیسا کہ کوئی آدمی کام کرے لیکن موقعہ ومحل کے مطابق نہ کرے تو کہا جاتا ہے:
"تو نے کیا مگر نہ کرنے کے برابر"

دوسرا مسئلہ، خلاق کا مفہوم

اکثر کا قول ہے خلاق کا معنی حصہ ہے۔ شیخ قفال کہتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس کا اصل خلق ہے جس کا معنی تقدیر ہے اس سے خلق الادیم، قدر للرجل کذا درهما رزقا علی عمل کذا۔ کچھ نے کہا: خلاق، خلاصی، امیہ بن ابی ملت نے کہا:

یدعون بالویل فیها لاخلاق لهم الاسرابیل قطران وأغلال

(انہیں دوزخ میں لے جایا جائے گا وہاں خلاصی نہ ہوگی یہ وہاں سنگل اور بیڑیوں میں جکڑے جائیں گے)

سوال: آیت میں یہ سوال باقی ہے "لَقَدْ عَلِمُوْا" میں ان کیلئے علم کیسے مانا جبکہ "لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ" سے علم کی نفی کی

۱۔ یہاں علم والے اور غیر علم والے ایک نہیں، علم والوں سے مراد وہ ہیں جنہوں نے جادو سیکھا اور لوگوں کو اس کی تعلیم کیلئے بلایا۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ کِتَابَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

رہے جہال جو جادو سیکھنے کی طرف راغب ہوتے یہ علم والے نہ تھے یہ شیخ اخفش اور قطرب کا جواب ہے۔

۲۔ ہم مانتے ہیں دونوں ایک ہی تھے مگر فرق یہ ہے کہ جانا انہوں نے کچھ اور تھا اور جاہل کسی اور سے تھے۔ انہوں نے یہ جانا تھا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن وہ اس سے جاہل تھے کہ وہ کس قدر منافع آخرت فوت کر چکے ہیں اور انہیں کس قدر نقصان اور عقوبات حاصل ہوں گی۔

۳۔ ہم مانتے ہیں لوگ بھی ایک اور ان کا معلوم بھی ایک ہی تھا لیکن انہوں نے اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اس سے منہ پھیر لیا تو ان کا علم کالعدم قرار دیا گیا جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کو فرمایا:

صُمًّا وَّبُکْمًا وَّعُمْیًا (پ۱۵، الاسراء: ۹۷) اندھے اور گونگے اور بہرے

کیونکہ انہوں نے حواس سے نفع و فائدہ حاصل نہ کیا جیسا کہ کوئی آدمی کام کرے لیکن موقعہ و محل کے مطابق نہ کرے تو کہا جاتا ہے:

''تونے کیا مگر نہ کرنے کے برابر''

[۱۰۳] وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

(اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کاش انہیں علم ہوتا)

اَنَّهُمْ ، کی ضمیر یہود کی طرف ہے جن کا ذکر پہلے آیا۔ اللہ تعالیٰ نے "وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ" میں ان پر وعید کی تو اب ان کیلئے وعدہ کا ذکر ہے تاکہ شوق وخوف کا اجتماع ہوجائے کیونکہ یہ اجتماعیت طاعت کی دعوت اور نافرمانی سے اعراض کا اعلیٰ سبب بنتی ہے

اٰمَنُوْا کی تفسیر

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ — تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دی (پ۱، البقرۃ:۱۰۱)

پھر ان کے بارے میں بتایا: "اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ" اور انہوں نے جادو کو اپنالیا، اس کے بعد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا یعنی کتاب اللہ کو انہوں نے پھینک دیا تھا اس پر کاش ایمان لاتے، اگر اس سے مراد قرآن لیا جائے تو جائز ہے اور اگر مراد ان کی کتاب ہو جس کی تصدیق قرآن نے کی تو پھر بھی درست، اگر دونوں مراد ہوں تب بھی درست۔ تقویٰ سے مراد فعلِ ممنوعات اور ترکِ مامورات سے بچنا ہے۔

لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ کی تفسیر

اس میں چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: 'وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَاُثِيْبُوْا' (اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو انہیں ثواب دیا جاتا) لیکن جملہ فعلیہ ترک کرکے اسمیہ لایا گیا تاکہ ثباتِ ثواب اور اس کے دوام پر دلالت ہو۔

سوال: یوں کیوں نہ کہہ دیا: لَمَثُوْبَةُ اللّٰهِ خَيْرٌ (اللہ کا ثواب بہتر ہے)

جواب: یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ کے ثواب کا جز بھی ان کیلئے کہیں بہتر ہے۔

دوسری وجہ: یہ بھی ممکن ہے ارشاد پاک "وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا" اللہ تعالیٰ کا ان کے ارادۂ ایمان سے بطور آرزو بیان ہو گویا فرمایا: کاش وہ ایمان لے آتے۔ پھر یہی بات فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کہیں بہتر ہے۔

[۱۰۴] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾

(اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے)

بعثت کے بعد ان کے افعالِ بد

اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ قبائح بیان فرمائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے کے تھے، اب ان کے ان افعال بد کا تذکرہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد و بعثت کے بعد کے ہیں جن میں آپ پر طعن و افترا اور دینِ محمدی کی مخالفت بھی شامل ہے۔ اس باب کی نوع اول یہی ہے تو یہاں بھی چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، اٰمَنُوْا سے خطاب

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مومنین کو اٹھاسی مقامات پر یوں خطاب فرمایا: "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تورات میں خطاب "یَا اَیُّھَا الْمَسَاکِیْن" تھا گویا جب اللہ تعالیٰ نے اولاً ہی انہیں لفظ مساکین سے خطاب فرمایا تو ان کیلئے آخر میں مسکنت ثابت کر دی۔ ارشادِ مبارک ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (پ۱، البقرہ:۶۱) اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری

تو یہ آیت مبارکہ بتا رہی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اولاً ہی لفظ ایمان سے خطاب کیا تو اللہ تعالیٰ انہیں روزِ قیامت دوزخ کے عذاب سے امن عطا فرمائے گا۔ پھر اسم مومن، اسماء وصفات باری میں اعلیٰ نام ہے جب دنیا میں اس نے ہمیں اسماء وصفات میں اشرف و افضل نام سے مخاطب فرمایا تو ہم اس کے فضل پر بھروسہ کر کے کہتے ہیں وہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ معاملہ احسن فرمائے گا۔

دوسرا مسئلہ، دونوں مترادف الفاظ

یہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مترادف کلمات میں سے ایک سے منع اور دوسرے کی اجازت عطا فرما دے اسی وجہ سے امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک نماز ترجمہ فاتحہ پڑھنے سے ادا نہ ہوگی خواہ عبرانی ہو یا فارسی تو کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رَاعِنَا سے منع فرمایا اور اُنْظُرْنَا کی اجازت دے دی حالانکہ دونوں مترادف ہیں۔

فضل قدیر

[۱۰۴] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۰۴)

(اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے)

بعثت کے بعد ان کے افعالِ بد

اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ قبائح بیان فرمائے جو حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے کے تھے، اب ان کے ان افعال بد کا تذکرہ ہے جو حضور ﷺ کی آمد و بعثت کے بعد کے ہیں جن میں آپ پر طعن وافترا اور دینِ محمدی کی مخالفت بھی شامل ہے۔ اس باب کی نوع اول یہی ہے تو یہاں بھی چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، اٰمَنُوْا سے خطاب

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مومنین کو اٹھاسی مقامات پر یوں خطاب فرمایا: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تورات میں خطاب "يَا أَيُّهَا الْمَسَاكِينُ" تھا گویا جب اللہ تعالیٰ نے اولاً ہی انہیں لفظ مساکین سے خطاب فرمایا تو ان کیلئے آخر میں مسکنت ثابت کردی۔ ارشادِ مبارک ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (پ۱، البقرہ:۶۲) اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری

تو یہ آیت مبارکہ بتارہی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اولاً ہی لفظ ایمان سے خطاب کیا تو اللہ تعالیٰ انہیں روزِ قیامت دوزخ کے عذاب سے امن عطا فرمائے گا۔ پھر اسم مومن، اسماء وصفات باری میں اعلیٰ نام ہے جب دنیا میں اس نے ہمیں اسماء وصفات میں اشرف وافضل نام سے مخاطب فرمایا تو ہم اس کے فضل پر بھروسہ کر کے کہتے ہیں وہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ معاملہ احسن فرمائے گا۔

دوسرا مسئلہ، دونوں مترادف الفاظ

یہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مترادف کلمات میں سے ایک سے منع اور دوسرے کی اجازت عطا فرمادے اسی وجہ سے امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک نماز ترجمہ فاتحہ پڑھنے سے ادا نہ ہوگی خواہ عبرانی ہو یا فارسی تو کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رَاعِنَا سے منع فرمایا اور اُنْظُرْنَا کی اجازت دے دی حالانکہ دونوں مترادف ہیں۔

فضل قدیر

جمہور مفسرین کی رائے

لیکن جمہور مفسرین فرماتے ہیں: رَاعِنَا سے منع کی وجہ اس کا نوع فساد پر مشتمل ہونا ہے پھر اس میں ان چند وجوہ کا تذکرہ کیا

پہلی وجہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو علمی بات بتاتے تو وہ عرض کرتے:

رَاعِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ — اے اللہ کے رسول ہماری رعایت فرمائیے

یہود کے ہاں اسی طرح کا کلمہ تھا جس سے وہ ایک دوسرے کو سب وشتم کرتے اور وہ "رَاعِیْنَا" تھا جس کا معنی ہے:

اِسْمَعْ لَا سُمِعْتَ — سنیں اور تو سنا نہ جائے

جب انہوں نے اہلِ اسلام کو رَاعِـنَـا کہتے سنا تو انہوں نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح مخاطب کرنا شروع کیا اور مقصد گالی دینا تھا تو مسلمانوں کو اس لفظ سے منع کر دیا گیا اور حکم اس لفظ "انـظـرنـا" کا دیا گیا۔ اس تاویل آیت کی صحت پر سورۃ النساء میں یہ ارشادِ باری تعالیٰ شاہد ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ (پ۵، النساء:۴۶)

اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا اور سنیئے آپ سنائے نہ جائیں اور راعنا کہتے ہیں زبانیں پھیر کر اور دین میں طعنہ کیلئے۔

یہ بھی مروی ہے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ کلمہ سنا تو فرمایا: اللہ کے دشمنو! تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ قسم مجھے اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں نے تم میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کلمہ سنا تو میں اس کی گردن اڑادوں گا۔ وہ کہنے لگے: کیا تم رَاعِنَا نہیں کہتے؟ تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوگئی:

تیسری وجہ: یہودیوں کہتے:

رَاعِنَا اَیْ اَنْتَ رَاعِیْ غَنَمِنَا — تم ہماری بکریاں چرانے والے (چرواہا) ہو

تو اللہ تعالیٰ نے اس لفظ سے منع فرمادیا۔

نوٹ: اس مسئلہ پر بندہ کے مقالہ ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُجرت پر بکریاں چرائیں'' کا مطالعہ مفید رہے گا (قادری عفی عنہ)

چوتھی وجہ: راعنامدعی سے باب مفاعلہ ہے اس میں فعل جانبین سے ہوتا ہے تو گویا یہ لفظ مخاطبین میں مساوات کا موہم ہے۔ گویا انہوں نے کہا:

ہم تمہاری بات سننے میں رعایت کرتے ہیں تم ہماری بات سننے کی رعایت کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع ہی کر دیا اور واضح کیا کیونکہ مخاطبت میں بھی تعظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا (پ ۱۸، النور: ۶۳) رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو

پانچویں وجہ: لفظ "رَاعِنَا" میں اپنے کو بلند سمجھ کر خطاب ہے گویا سامع کہتا ہے میرے کلام کا خیال کرو۔ اس سے غفلت نہ کرو اور نہ ہی کسی اور طرف متوجہ ہوں لیکن "اُنْظُرْنَا" میں محض انتظار کا سوال ہوتا ہے گویا یہ کہنا ہوتا ہے اپنی گفتگو میں اتنی مقدار توقف کرو کہ اسے اچھی طرح سمجھ لوں۔

چھٹی وجہ: لفظ "رَاعِنَا" بروزن عاطنا، معاطاۃ سے اور "رَاعِنَا" مراعاۃ سے ہے۔ پھر انہوں نے اس کے نون کو اصلی قرار دیتے ہوئے رعونت سے مشتق بنالیا اور یہی درست ہے تو رعونت سے اسم فاعل راعن ہے۔ ممکن ہے انہوں نے بطور مصدر ہی مانا ہو جیسا محاورہ ہے: عیاذاً بك۔ یعنی آپ کی پناہ چاہتا ہوں تو راعنا سے مراد فعلت رعونۃ۔ (یہ کام تم نے بطور رعونت کیا) ممکن ہے ان کی مراد "صرت راعنا" ہو۔ (یعنی تم صاحب رعونت ہو) جب انہوں نے یہ وجوہ فاسد، مراد لیں تو اللہ تعالیٰ کا اس سے منع فرمانا ضروری ہوگیا۔

ساتویں وجہ: مراد یہ ہو کہ تم ایسا قول نہ کرو جو رعونت کی طرف منسوب ہے۔ بمعنی راعن جیسے تامر (کھجور والا) لابن (اینٹ والا)

وَقُوْلُوا انْظُرْنَا کی تفسیر

اس کے چند معانی ہیں:

۱۔ یہ بمعنی انتظرہ ہے یعنی ٹھہرو اور انتظار کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ (پ ۲۷، الحدید: ۱۳) ہمیں ایک نگاہ دیکھو کہ ہم تمہارے نور سے کچھ حصہ لیں

اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھہرنے کا کہیں تاکہ ان سے نقل کرسکیں تو وہ لوٹانے کے محتاج نہ ہوں گے۔

سوال: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کلام میں جلدی کرتے تھے کہ یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی؟

جواب: دو طرح سے ہے:

۱۔ یہ الفاظ دوران کلام کہے جاسکتے ہیں اگرچہ کلام میں عجلت وتیزی نہ ہو جیسے دوران کلام کہا جاتا ہے، اسمع (اچھی طرح سنو) اسمعت (کیا تم سن رہے ہو)

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا (۱۸پ، النور:۶۳) رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو

پانچویں وجہ: لفظ "رَاعِنَا" میں اپنے کو بلند سمجھ کر خطاب ہے گویا سامع کہتا ہے میرے کلام کا خیال کرو۔اس سے غفلت نہ کرو اور نہ ہی کسی اور طرف متوجہ ہوں لیکن "اُنۡظُرۡنَا" میں محض انتظار کا سوال ہوتا ہے گویا یہ کہنا ہوتا ہے اپنی گفتگو میں اتنی مقدار توقف کرو کہ اسے اچھی طرح سمجھ لوں۔

چھٹی وجہ: لفظ "رَاعِنَا" بروزن عاطنا، معاطاۃ سے اور "رَاعِنًا" مراعاۃ سے ہے۔پھر انہوں نے اس کے نون کو اصلی قرار دیتے ہوئے رعونت سے مشتق بنالیا اور یہی درست ہے تو رعونت سے اسم فاعل راعن ہے۔ممکن ہے انہوں نے بطور مصدر ہی مانا ہو جیسا محاورہ ہے: عیاذاً بك۔یعنی آپ کی پناہ چاہتا ہوں تو راعنا سے مراد فعلت رعونۃ۔(یہ کام تم نے بطور رعونت کیا) ممکن ہے ان کی مراد "صرت راعنا" ہو۔(یعنی تم صاحب رعونت ہو) جب انہوں نے یہ وجوہ فاسد، مراد لیں تو اللہ تعالیٰ کا اس سے منع فرمانا ضروری ہو گیا۔

ساتویں وجہ: مراد یہ ہو کہ تم ایسا قول نہ کرو جو رعونت کی طرف منسوب ہے۔بمعنی راعن جیسے تامر (کھجور والا) لابن (اینٹ والا)

وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا کی تفسیر

اس کے چند معانی ہیں:

ا۔ یہ بمعنی انتظرہ ہے یعنی ٹھہرو اور انتظار کرو۔اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

اُنۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِكُمۡ (۲۷پ، الحدید:۱۳) ہمیں ایک نگاہ دیکھو کہ ہم تمہارے نور سے کچھ حصہ لیں

اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ حضور ﷺ کو ٹھہرنے کا کہیں تاکہ ان سے نقل کرسکیں تو وہ لوٹانے کے محتاج نہ ہوں گے۔

سوال: کیا حضور ﷺ کلام میں جلدی کرتے تھے کہ یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی؟

جواب: دو طرح سے ہے:

ا۔ یہ الفاظ دوران کلام کہے جاسکتے ہیں اگرچہ کلام میں عجلت و تیزی نہ ہو جیسے دوران کلام کہا جاتا ہے، اسمع (اچھی طرح سنو) اسمعت (کیا تم سن رہے ہو)

۲۔ مفسرین نے ارشادِ الٰہی "لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ" (اپنی زبان کو حرکت نہ دو کہ تم اسے جلدی پالو) کے تحت لکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب حضرت جبریل وحی القا کرتے تو آپ حصول وحی اور اخذِ قرآن میں جلدی فرماتے تو حکم ہوا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم امورِ دین میں صحابہ سے گفتگو جلدی کرتے ہوں تا کہ وہ انہیں جلدی پالیں تو وہ اسی حالت میں عرض کرتے ہوں آپ تھوڑا وقفہ فرمائیں تا کہ ہم کلام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

۳۔ اُنظرنا کا معنی "اُنظر الینا" (ہم پر شفقت فرمائیں) ہے۔ مگر "الی" کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشادِ الٰہی میں ہے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (پ ۹، الاعراف:۱۵۵) موسیٰ نے اپنی قوم سے مرد چنے

قَوْمَهٗ ، سے پہلے من محذوف ہے اصل 'من قومه' تھا۔ مقصد یہ کہ جب معلم، طالب علم کی طرف دیکھے گا تو اس کا کلام بطور افہام و اظہار اظہر و اقویٰ ہوگا۔

۴۔ حضرت اُبی بن کعب کی روایت میں "انظرنا" نظرۃ سے ہے یعنی ہمیں مہلت دیجیے۔

وَاسْمَعُوْا کی تفسیر

سلامتی حاسہ کے وقت حصول سماع ایسا ضروری امر ہے کہ وہ طاقت بشر سے خارج ہے لہٰذا اس کے لیے امر کا جواز کہاں؟ اس لیے یہاں تین امور سے ایک مراد ہے۔

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے لیے اپنے کانوں کو فارغ کرو حتیٰ کہ تمہیں گفتگو لوٹانے کی ضرورت نہ پڑے۔

۲۔ اسے بطور قبول و اطاعت سنو نہ کہ یہود کی طرح سنو جنہوں نے کہا تھا: سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا (ہم نے سنا مگر نافرمانی کی)

۳۔ جس کا حکم ہے اسے اچھی طرح سنو تا کہ تم ممنوعات کا مرتکب نہ ہوں، یہ ان کیلئے تاکید ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اگر یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعظیم و تکریم سے نہ چلے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو توجہ سے نہ سنا اور اس میں غور و فکر نہ کیا تو ان کفار کیلئے دردناک عذاب ہے اور عذاب الیم کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

61

[۱۰۵] مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

(وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی نازل ہو تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

سابقہ آیت سے ربط

اللہ تعالیٰ نے یہود اور کفار کی عداوت اور معاندت کی تفصیل بیان کی تو اب اہلِ ایمان کو ان سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا"۔ ان کے دلوں سے ہر قسم کی محبت ویگانگت کی نفی کی جس سے مسلمانوں کی فضیلت کا اظہار ہوتا۔

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: پہلا "من" بیانیہ ہے کیونکہ کفار جنس اور اس کے نیچے دو انواع ہیں: اہلِ کتاب اور مشرکین، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ (پ۳۰، البینۃ:۱) کتابی کافر اور مشرک اپنا دین چھوڑنے کو نہ تھے

۲ دوسرا زائد ہے بطور استغراق واحاطہ خیر ہے۔

۳۔ تیسرا ابتداغایت کیلئے ہے۔

دوسرا مسئلہ: الخیر، وحی، اسی طرح رحمت، اس پر شاہد یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ (پ۲۵، الزخرف:۳۲) کیا تمہارے رب کی رحمت وہ بانٹتے ہیں

مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے کو نزول وحی کا زیادہ اہل وحقدار سمجھتے ہیں اور تم پر نزولِ وحی سے محبت نہیں کرتے بلکہ حسد کرتے ہیں اس کے بعد واضح کیا اس حسد سے وحی کا زوال نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور احسان کیلئے جسے چاہے مخصوص فرمالے۔

[۱۰۵] مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

(وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی نازل ہو تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

سابقہ آیت سے ربط

اللہ تعالیٰ نے یہود اور کفار کی عداوت اور معاندت کی تفصیل بیان کی تو اب اہلِ ایمان کو ان سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا"۔ ان کے دلوں سے ہر قسم کی محبت و یگانگت کی نفی کی جس سے مسلمانوں کی فضیلت کا اظہار ہوتا۔

یہاں دو مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: پہلا "من" بیانیہ ہے کیونکہ کفار جنس اور اس کے نیچے دو انواع ہیں: اہلِ کتاب اور مشرکین، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ کتابی کافر اور مشرک اپنا دین چھوڑنے کو نہ تھے
(پ۳۰، البینۃ: ۱)

۲ دوسرا زائد ہے بطور استغراق و احاطہ خیر ہے۔

۳۔ تیسرا ابتدا غایت کیلئے ہے۔

دوسرا مسئلہ: الخیر، وحی، اسی طرح رحمت، اس پر شاہد یہ ارشادِ الٰہی ہے:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ (پ۲۵، الزخرف: ۳۲) کیا تمہارے رب کی رحمت وہ بانٹتے ہیں

مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے کو نزولِ وحی کا زیادہ اہل و حقدار سمجھتے ہیں اور تم پر نزولِ وحی سے محبت نہیں کرتے بلکہ حسد کرتے ہیں اس کے بعد واضح کیا اس حسد سے وحی کا زوال نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور احسان کیلئے جسے چاہے مخصوص فرما لے۔

[۱۰۶] مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

(جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے)

طعن کی دوسری نوع

یہ یہود کی طرف سے اسلام پر طعن کی نوع ثانی ہے، کہتے ہیں دیکھو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابہ کو ایک حکم دیتے ہیں پھر اس سے منع کر کے اس کے برخلاف کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ کہتے ہیں آج یہ حکم ہے مگر کل اس سے رجوع کر لیتے ہیں تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوگئی، اس پر گفتگو چند مسائل کے عنوان سے کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ، نسخ کا معنی ومفہوم

نسخ، لغت میں کسی شی کو باطل کرنا ہے، شیخ قفال کہتے ہیں کہ نسخ، نقل اور تحویل ہے۔ جب ہوا، آثار ونشانات فنا کر دے تو کہا جاتا ہے: نسخت الریح آثار القوم۔ جب سایہ ختم ہو تو کہتے ہیں نسخت الشمس الظل۔ کیونکہ وہ سایہ کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ گمان کر لیا جائے کہ وہ منتقل ہو گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ (پ۱۷، الحج:۵۲)

اس پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو

یعنی اسے زائل اور باطل فرما دیتا ہے۔

چونکہ کلام میں اصل حقیقی معنی ہوتا ہے جب لفظ نسخ کا معنی حقیقی ابطال ثابت ہو گیا تو اب ضروری ہے کہ اس کا حقیقی معنی نقل نہ ہوتا کہ اشتراک کسی طرح لازم نہ آئے۔

سوال: ہوا کو کہنا یہ آثار کی ناسخ اور شمس ظل کا ناسخ ہے یہ بطور مجاز ہے کیونکہ آثار وظل کا زائل فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے تو یہ مجاز ہے تو اس سے لفظ کے حقیقی معنی پہ دلالت پہ استدلال ممتنع ہوگا، ہم آپ کی مذکورہ گفتگو کے ساتھ معارضہ کرتے ہوئے کہتے ہیں بلکہ

نسخ، نقل وتحویل ہے اسی سے نسخ الکتاب الی کتب آخر ہے گویا اس نے اس کی طرف نقل کیا یا اس کی حکایت نقل کی، اس سے تناسخ ارواح اور تناسخ قرآن، تناسخ مواریث میں بھی ایک سے دوسرے کی طرف اول کے بدل کے طور وارث بن جاتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہمارا یہ نوشتہ تم پر حق بولتا ہے ہم لکھتے رہے تھے جو تم نے کیا (پ۲۵، الجاثیۃ: ۲۹)

لہٰذا ضروری ہے کہ اس لفظ کا حقیقی معنی نقل ہو تو لازم ہے ابطال اس کا حقیقی معنی نہ ہو ورنہ اشتراک لازم

پہلے سوال کا جواب

جواب: اول سے دو طرح ہے:

۱۔ کوئی امتناع نہیں کہ ناسخ اللہ تعالیٰ ہو کیونکہ وہی شمس اور ہوا کو اس ازالہ کیلئے مؤثر بناتا ہے اور یہ بھی ناسخ ہوں کیونکہ یہ تاثیر ان کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۔ اہلِ لغت نے نسخ کی شمس اور ہوا کی طرف نسبت میں خطا کی ہے بات اسی طرح ہے لیکن ہماری دلیل ان کا لفظ نسخ کا ازالہ پہ اطلاق ہے کہ اس فعل کی نسبت انہوں نے ہوا و شمس کی طرف کی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یوں ہے کہ نقل، ابطال سے خاص ہے اس لیے کہ جب نقل ہوگی تو صفت معدوم اور اس کے بعد دوسری صفت حاصل ہو جائے گی کیونکہ مطلق عدم ایسے عدم سے اہم ہوتا ہے جس کے بعد دوسری شی حاصل ہو جائے جب لفظ سے خاص وعام دونوں مراد لیے جا سکتے ہوں تو اسے عام کیلئے حقیقت بنانا اولیٰ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسرا مسئلہ: امام ابن عامر نے "ما ننسخ" نون پر پیش، سین کے نیچے زیر اور باقی قراء دونوں پر زبر پڑھتے ہیں۔

قرأت ابنِ عامر

امام ابن عامر کی قرأت کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نسخ اور انسخ دونوں کا معنی ایک ہی ہے

۲۔ انسختہ یعنی میں نے اسے صاحب نسخ بنایا جیسے لوگوں نے حجاج سے کہا: جب اس نے ایک آدمی کو پھانسی دیا: اقبروا فلانا یعنی اسے صاحب قبر بنائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نسخ نقل وتحویل ہے اسی سے نسخ الکتاب الی کتب آخر ہے گویا اس نے اس کی طرف نقل کیا یا اس کی حکایت نقل کی، اس سے تناسخ ارواح اور تناسخ قرآن، تناسخ مواریث میں بھی ایک سے دوسرے کی طرف اول کے بدل کے طور وارث بن جاتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے

هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ہمارا یہ نوشتہ تم پر حق بولتا ہے ہم لکھتے رہے تھے جو تم نے کیا

(پ۲۵، الجاثیۃ:۲۹)

لٰہذا ضروری ہے کہ اس لفظ کا حقیقی معنی نقل ہو تو لازم ہے ابطال اس کا حقیقی معنی نہ ہو ورنہ اشتراک لازم

پہلے سوال کا جواب

جواب: اول سے دو طرح ہے:

۱۔ کوئی امتناع نہیں کہ ناسخ اللہ تعالیٰ ہو کیونکہ وہی شمس اور ہوا کو اس ازالہ کیلئے مؤثر بنا تا ہے اور یہ بھی ناسخ ہوں کیونکہ یہ تاثیر ان کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۔ اہلِ لغت نے نسخ کی شمس اور ہوا کی طرف نسبت میں خطا کی ہے بات اسی طرح ہے لیکن ہماری دلیل ان کا لفظ نسخ کا ازالہ پہ اطلاق ہے کہ اس فعل کی نسبت انہوں نے ہوا و شمس کی طرف کی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یوں ہے کہ نقل، ابطال سے خاص ہے اس لیے کہ جب نقل ہوگی تو صفت معدوم اور اس کے بعد دوسری صفت حاصل ہو جائے گی کیونکہ مطلق عدم ایسے عدم سے اہم ہوتا ہے جس کے بعد دوسری شی حاصل ہو جائے جب لفظ سے خاص وعام دونوں مراد لیے جا سکتے ہوں تو اسے عام کیلئے حقیقت بنانا اولیٰ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسرا مسئلہ: امام ابن عامر نے "ما ننسخ" نون پر پیش، سین کے نیچے زیر اور باقی قراء دونوں پر زبر پڑھتے ہیں۔

قرأت ابنِ عامر

امام ابن عامر کی قرأت کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نسخ اور انسخ دونوں کا معنی ایک ہی ہے

۲۔ انسخته یعنی میں نے اسے صاحب نسخ بنایا جیسے لوگوں نے حجاج سے کہا: جب اس نے ایک آدمی کو پھانسی دیا: اقبروا فلانا یعنی اسے صاحب قبر بنائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فضل قدیر

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (پ ۳۰ عبس: ۲۱) پھر اسے موت دی پھر قبر میں رکھوادیا

امام ابن کثیر اور ابوعمرو نے "ننساھا" پڑھا۔ نون اور ہمزہ پر زبر، شرط کی وجہ سے مجزوم، امام ابوعمرو ایسی جگہ سے ہمزہ نہیں گراتے کیونکہ اس کا سکون علامت جزم ہوتا ہے اب یہ النسیٔ بمعنی تاخیر سے ہے، اس سے ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (پ ۱۰، التوبۃ: ۳۷) ان کا مہینے پیچھے ہٹانا نہیں مگر اور کفر میں بڑھنا

بیع مؤجل کو نسیئہ کہا جاتا ہے۔ اہلِ لغت کہتے ہیں، انسأ اللّٰه أجله ونسأ فی أجله کا معنی اللہ نے اس میں اضافہ وموخر کردیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

مَنْ سَرَّهُ النَّسْءُ فِی الْاَجَلِ وَالزِّیَادَةَ فِی الرِّزْقِ فَلْیَصِلْ رَحِمَهٗ (البخاری، ۲۰۶۷) جو آدمی عمر لمبی اور رزق میں اضافہ چاہتا ہے وہ صلہ رحمی سے کام لے

باقی قراء نے نون پر پیش اور سین کے نیچے زیر پڑھی تو یہ نسیان سے ہوگا، پھر اکثر نے اسے نسیان پر محمول کیا جس کی ضد ذکر (یاد) ہے۔ بعض نے نسیان کا معنی ترک لیا، ارشادِ الٰہی ہے:

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (پ ۱۶، طٰہٰ: ۱۱۵) انہوں نے ترک کیا اور ہم ان کیلئے عزم نہیں پاتے

فرمایا:

فَالْیَوْمَ نَنْسَاهُمْ کَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا (پ ۸، الاعراف: ۵۱) تو آج ہم انہیں چھوڑ دیں گے جیسا انہوں نے اس دن کے ملنے کا خیال چھوڑا تھا۔

یعنی ہم نے ان کو چھوڑ دیا جیسا کہ انہوں نے ہمیں چھوڑا تھا۔

مختار یہی ہے کہ نسیان کو بطور مجاز ترک پر محمول کیا جائے کیونکہ منسی (بھلا دیا گیا) متروک ہی ہوتا ہے چونکہ ترک لوازم نسیان سے تھا اس لیے ملزوم کا اطلاق لازم پر کردیا۔

ننسها مشدد و تنسها بطور خطاب رسول بھی پڑھا گیا۔ حضرت عبداللہ کی قرأت ما ننسک من آیة او ننسخها۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پڑھا: ما ننسخ من آیة أو ننسکها۔

تیسرا مسئلہ: ما یہاں جزائیہ ہے جیسے ما تصنع اصنع، اس کا عمل شرط وجزا میں جزم ہے بشرطیکہ دونوں مضارع ہوں ننسخ شرط اور نأت جزا۔ دونوں مجزوم ہیں۔

marfat.com

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (پ۳۰ عبس:۲۱) پھر اسے موت دی پھر قبر میں رکھوا دیا

امام ابن کثیر اور ابو عمرو نے "ننساھا" پڑھا۔ نون اور ہمزہ پر زبر، شرط کی وجہ سے مجزوم، امام ابو عمرو ایسی جگہ سے ہمزہ نہیں گراتے کیونکہ اس کا سکون علامت جزم ہوتا ہے اب یہ النسئ بمعنی تاخیر سے ہے، اس سے ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ (پ۱۰، التوبۃ:۳۷) ان کا مہینے پیچھے ہٹانا نہیں مگر اور کفر میں بڑھنا

بیع مؤجل کو نسیئہ کہا جاتا ہے۔ اہلِ لغت کہتے ہیں، انسأ اللّٰہ أجله ونسأ فی أجله کا معنی اللہ نے اس میں اضافہ و موخر کر دیا۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ سَرَّهُ النَّسْءُ فِي الْأَجَلِ وَالزِّيَادَةَ فِي الرِّزْقِ فَلْيَصِلْ رَحْمَهُ (البخاری، ۲۰۶۷) جو آدمی عمر لمبی اور رزق میں اضافہ چاہتا ہے وہ صلہ رحمی سے کام لے

باقی قراء نے نون پر پیش اور سین کے نیچے زیر پڑھی تو یہ نسیان سے ہوگا، پھر اکثر نے اسے نسیان پر محمول کیا جس کی ضد ذکر (یاد) ہے۔ بعض نے نسیان کا معنی ترک لیا، ارشادِ الٰہی ہے:

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (پ۱۶، طٰہٰ:۱۵۵) انہوں نے ترک کیا اور ہم ان کیلئے عزم نہیں پاتے

فرمایا:

فَالْیَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا (پ۸، الاعراف:۵۱) تو آج ہم انہیں چھوڑ دیں گے جیسا انہوں نے اس دن کے ملنے کا خیال چھوڑا تھا۔

یعنی ہم نے ان کو چھوڑ دیا جیسا کہ انہوں نے ہمیں چھوڑا تھا۔

مختار یہی ہے کہ نسیان کو بطور مجاز ترک پر محمول کیا جائے کیونکہ منسی (بھلا دیا گیا) متروک ہی ہوتا ہے چونکہ ترک لوازم نسیان سے تھا اس لیے ملزوم کا اطلاق لازم پر کر دیا۔

ننسها مشدد و تنسها بطور خطاب رسولؐ بھی پڑھا گیا۔ حضرت عبداللہ کی قرأت ما ننسك من آية او ننسخها۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پڑھا: ما ننسخ من آية أو ننسكها۔

تیسرا مسئلہ: مایہاں جزائیہ ہے جیسے ما تصنع اصنع، اس کا عمل شرط و جزا میں جزم ہے بشرطیکہ دونوں مضارع ہوں ننسخ شرط اور نأتِ جزا۔ دونوں مجزوم ہیں۔

چوتھا مسئلہ، تناسخ اہلِ علم کے ہاں

اہلِ علم کے ہاں تناسخ اس طریق شرعی کا نام ہے جو واضح کرے کہ جو پہلے بطریق شرعی حکم ثابت تھا وہ اس کے بعد باقی نہیں رہا پھر دوسرا اس کے بعد ہو گا یوں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو پہلا ثابت ہی رہتا۔ طریق شرعی، سے مراد یہ ہے کہ خواہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا دونوں میں سے کسی کا فعل ہو۔

ایک قول کے مطابق اس سے اجماع امت خارج ہو گیا کیونکہ اس تفسیر کے مطابق وہ طریق شرعی نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ شرع حکم عقلی کی ناسخ ہو کیونکہ عقل طریق شرعی نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ معجزہ حکم شرعی کا ناسخ ہو کیونکہ معجزہ طریق شرعی نہیں اور حکم کو غایت یا شرط یا استثناء کے ساتھ مقید کرنا لازم نہیں کیونکہ یہ تراخی نہیں ہوتا۔ یہ بھی لازم نہیں جب اللہ تعالیٰ نے فعل واحد کا ہمیں حکم دیا تو اس کی مثل سے ہمیں منع فرمائے کیونکہ اگر اس طرح کا ناسخ نہ ہوگی تو مثل حکم امر بھی ثابت نہ ہوگا۔

پانچواں مسئلہ، جواز نسخ

ہمارے مذہب میں نسخ عقلاً جائز اور نقلاً واقع ہے، یہود کا اس میں اختلاف ہے، ان میں سے بعض عقلاً اس کے منکر اور بعض عقلاً قائل ہیں لیکن نقلاً نہیں مانتے، بعض اہلِ اسلام سے بھی انکارِ نسخ منقول ہے۔

جمہور کے دلائل

جواز و وقوع نسخ پر جمہور امت مسلمہ نے خوب دلائل دیے ہیں اس لیے کہ یہ دلائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی دال ہیں، آپ کی صحت نبوت تبھی ثابت ہوگی جب ماقبل شرائع کا نسخ مانا جائے تو نسخ کا ماننا قطعی ٹھہرا۔

یہود پر دو الزامی رد

ہم یہ بھی کہیں گے کہ یہود پر دو الزامی باتیں ہیں:

۱۔ تورات میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کشتی سے نکلتے وقت فرمایا: میں نے ہر چوپائے کو تیری اور تیری اولاد کی ملکیت میں دیا اور تمہارے لیے اجازت ہے مثلاً پٹھوں کا کھانا لیکن خون کے علاوہ تو اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوانات کا کھانا حرام فرما دیا۔

۲۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بہن کے بھائی کے ساتھ نکاح کا حکم تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسے حرام فرما دیا۔

چوتھا مسئلہ، تناسخ اہلِ علم کے ہاں

اہلِ علم کے ہاں تناسخ اس طریق شرعی کا نام ہے جو واضح کرے کہ جو پہلے بطریق شرعی حکم ثابت تھا وہ اس کے بعد باقی نہیں رہا پھر دوسرا اس کے بعد ہو گا یوں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو پہلا ثابت ہی رہتا۔ طریق شرعی، سے مراد یہ ہے کہ خواہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو یا رسول اللہ ﷺ کا یا دونوں میں سے کسی کا فعل ہو۔

ایک قول کے مطابق اس سے اجماع امت خارج ہو گیا کیونکہ اس تفسیر کے مطابق وہ طریق شرعی نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ شرع حکم عقلی کی ناسخ ہو کیونکہ عقل طریق شرعی نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ معجزہ حکم شرعی کا ناسخ ہو کیونکہ معجزہ طریق شرعی نہیں اور حکم کو غایت یا شرط یا استثناء کے ساتھ مقید کرنا لازم نہیں کیونکہ یہ تراخی نہیں ہوتا۔ یہ بھی لازم نہیں جب اللہ تعالیٰ نے فعل واحد کا ہمیں حکم دیا تو اس کی مثل سے ہمیں منع فرمائے کیونکہ اگر اس طرح کا ناسخ نہ ہو گی تو مثل حکم امر بھی ثابت نہ ہو گا۔

پانچواں مسئلہ، جواز نسخ

ہمارے مذہب میں نسخ عقلاً جائز اور نقلاً واقع ہے، یہود کا اس میں اختلاف ہے، ان میں سے بعض عقلاً اس کے منکر اور بعض عقلاً قائل ہیں لیکن نقلاً نہیں مانتے، بعض اہلِ اسلام سے بھی انکارِ نسخ منقول ہے۔

جمہور کے دلائل

جواز ووقوع نسخ پر جمہور امت مسلمہ نے خوب دلائل دیے ہیں اس لیے کہ یہ دلائل حضور ﷺ کی نبوت پر بھی دال ہیں، آپ کی صحت نبوت تبھی ثابت ہو گی جب ماقبل شرائع کا نسخ مانا جائے تو نسخ کا ماننا قطعی ٹھہرا۔

یہود پر دو الزامی رد

ہم یہ بھی کہیں گے کہ یہود پر دو الزامی باتیں ہیں:

۱۔ تورات میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کشتی سے نکلتے وقت فرمایا: میں نے ہر چوپائے کو تیری اور تیری اولاد کی ملکیت میں دیا اور تمہارے لیے اجازت ہے مثلاً پٹھوں کا کھانا لیکن خون کے علاوہ تو اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوانات کا کھانا حرام فرما دیا۔

۲۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بہن کے بھائی کے ساتھ نکاح کا حکم تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسے حرام فرما دیا۔

منکرین نسخ

منکرین نسخ کہتے ہیں: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضور ﷺ کی صحت نبوت کیلئے نسخ کا ماننا ضروری ہے کیونکہ یہ کہنا جائز ہے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اپنی امتوں سے فرمایا ہو: یہ شریعت، ظہور شرع محمد ﷺ تک ہی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی شریعت کی اتباع کا حکم دیا ہو، تو ظہور شرع محمدی کے وقت سے ان کی شریعت پر عمل کا حکم ختم اور آپ کی شرع پر عمل لازم ہو گیا لیکن یہ نسخ نہیں بلکہ اس فرمان کی طرح جاری ہے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (پ۲، البقرۃ:۱۸۷) پھر رات آنے تک روزے پورے کرو

بالکل نسخ کا انکار کرنے والے مسلمانوں نے اس دلیل پر بنیاد رکھی ہے، قرآن میں ہے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے تورات و انجیل میں حضرت محمد ﷺ کی آمد کی بشارت دی۔ جب ان کا ظہور ہو گیا تو آپ کی شریعت پر عمل لازم، جب بات اسی طرح ہے تو اس احتمال کی وجہ سے وقوع نسخ کا یقین ممتنع ٹھہرا اور یہی مذکور الزامات پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔

منکرین کے دلائل

جب اللہ تعالیٰ نے شریعت حضرت عیسیٰ بیان کی، اس شریعت پر دال الفاظ وہ ان کے دوام پر دال ہیں یا دوام پر دال نہیں۔ یا دوام ولا دوام دونوں پر دال نہیں۔ اگر وہاں ان کے ثبوت میں دوام تھا اب کہا جا رہا ہے ان میں دوام نہیں تو خبر اول کذب ہوگا اور یہ شرع میں جائز نہیں پھر یہ بھی ہے اگر ہم جواز نسخ مان لیں پھر ہمارے پاس کوئی طریق علمی نہیں جس سے یہ جان لیں کہ ہماری شرع منسوخ نہ ہوگی اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ شریعت یہ کہے گی یہ دائمی شریعت ہے اور ہر گز منسوخ نہ ہوگی لیکن اسی طرح کا معاملہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی شریعت میں پاتے ہیں حالانکہ وہ دائمی نہ رہیں تو اب ہر شریعت پر وثوق ختم ہو گیا

سوال: جواباً یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ الفاظ دوام پر دال تھے مگر ان کا اتصال ایسے الفاظ سے تھا جو منسوخ کے مقتضی تھے یا ان کا اتصال نہ تھا مگر اس پر نص تھی جو ہم تک نقل نہیں ہوئی۔

جواب: یہ متعدد وجوہ سے ضعیف ہے۔

۱۔ صراحۃً الفاظ کا دوام پر دلالت کرنا اور صراحۃً دوام پر دلالت نہ کرنا تو متضاد کو جمع کرنا ہے اور یہ کم عقلی اور عبث ہے۔

۲۔ یہ مان لیا اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا تھا کہ ان دونوں کی شریعت عنقریب منسوخ ہو جائے گی، جب ان کی نقل ہوئی تو اس کا یہ پہلو و کیفیت بھی منقول ہوگی۔

اس لیے کہ اگر اس پہلو کے بغیر نقل شرع جائز رکھیں تو ایسا ہماری شریعت میں بھی جائز ہوگا۔ تو اب ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یقیناً ہماری شریعت منسوخ نہیں ہو سکتی کیونکہ منسوخ ہونا عظیم چیز ہے جس کا نقل ضروری ہے اور جس کا یہ مقام ہو اس کا مشہور ہونا اور حد تواتر تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تو قرآن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے معارضہ کیا گیا لیکن منقول نہ ہو سکا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے ممکن ہے حضرت محمد ﷺ نے اس کے اصل کو بدل ڈالا ہو لیکن وہ نقل نہ ہو سکا تو اس کیفیت کا نسخ کا تواتر کے ساتھ منقول ہونا ضروری ہے۔

تو اب ہم کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے زمانہ میں اسی پر تصریح کی ان کی شریعتیں عنقریب منسوخ ہو جائیں گی تو اس بات کا اہل تواتر تک مشہور ہونا اور انہیں بداہۃً معلوم ہونا ضروری ہے اور اگر معاملہ یوں ہوتا تو جمع عظیم کا اس قدر تنازعہ کرنا محال ہوتا حالانکہ ہم یہود و نصاریٰ کو اس کے انکار پر متفق پاتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر کوئی نص نہ تھی کہ ان دونوں کی شریعتیں عنقریب منسوخ ہونے والی ہیں۔

دوسری قسم: یوں کہا جائے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی پر نص کی کہ یہ منقطع اور غیر دائم ہے گویا باطل ہے اگر یہ ثابت تھا تو اس کا اہل تواتر کیلئے یقیناً معلوم ہونا ضروری تھا اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو یہ نسخ نہ ہوگا بلکہ یہ انتہاء حکم ہوگا۔

تیسری قسم: اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی کے بارے میں نص فرمائی۔ لیکن اس کا دائم یا غیر دائم ہونا بیان نہ فرمایا تو اب کہتے ہیں اصول فقہ میں ثابت ہے مطلق امر، تکرار کا فائدہ نہیں دیتا وہ صرف ایک دفعہ کیلئے ہوتا ہے جب مکلّف اسے ایک مرتبہ بجا لایا تو اب اس کی ذمہ داری ختم ہوگی تو اب اس کے بعد دوسرا امر، اول امر کا نسخ نہیں ہوتا تو اس تقسیم سے معلوم ہو رہا ہے کہ قول نسخ محال ہے

ضعیف استدلال

یاد رہے ہم نے ''المحصول فی اصول الفقه'' میں یہ تمام گفتگو نقل کی اور وقوع نسخ پر ارشادِ گرامی:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

جب ہم کوئی آیت منسوخ کریں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے

سے استدلال کیا لیکن اس سے استدلال بھی ضعیف ہے کیونکہ ما شرط و جزا پر دال ہے جیسے کہا جائے من جاءك فاکرمه (جو تمہارے پاس آئے اس کا احترام کرو) تو اس کی دلالت آمد پر نہیں بلکہ اس پر ہے کہ اگر اس کی آمد ہو تو اکرام لازم ہوگا تو اسی طرح یہ آیت بھی حصول نسخ پر دال نہیں بلکہ اس پر ہے کہ جب نسخ ہوا تو لازم ہے کہ ناسخ اس سے بہتر ہو لہٰذا اقویٰ یہ ہے کہ ثبوت نسخ کیلئے اس ارشادِ الٰہی سے استدلال کیا جائے۔

فضل قدیر

اس لیے کہ اگر اس پہلو کے بغیر نقل شرع جائز رکھیں تو ایسا ہماری شریعت میں بھی جائز ہوگا۔ تو اب ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یقیناً ہماری شریعت منسوخ نہیں ہوسکتی کیونکہ منسوخ ہونا عظیم چیز ہے جس کا نقل ضروری ہے اور جس کا یہ مقام ہو اس کا مشہور ہونا اور حد تواتر تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تو قرآن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس سے معارضہ کیا گیا لیکن منقول نہ ہوسکا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے ممکن ہے حضرت محمد ﷺ نے اس کے اصل کو بدل ڈالا ہو لیکن وہ نقل نہ ہوسکا تو اس کیفیت کا نسخ کا تواتر کے ساتھ منقول ہونا ضروری ہے۔

تو اب ہم کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے زمانہ میں اسی پر تصریح کی ان کی شریعتیں عنقریب منسوخ ہوجائیں گی تو اس بات کا اہل تواتر تک مشہور ہونا اور انہیں بداہۃً معلوم ہونا ضروری ہے اور اگر معاملہ یوں ہوتا تو جمع عظیم کا اس قدر تنازعہ کرنا محال ہوتا حالانکہ ہم یہود و نصاریٰ کو اس کے انکار پر متفق پاتے ہیں جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس پر کوئی نص نہ تھی کہ ان دونوں کی شریعتیں عنقریب منسوخ ہونے والی ہیں۔

دوسری قسم: یوں کہا جائے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی پر نص کی کہ یہ منقطع اور غیر دائم ہے گویا باطل ہے اگر یہ ثابت تھا تو اس کا اہل تواتر کیلئے یقیناً معلوم ہونا ضروری تھا اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو یہ نسخ نہ ہوگا بلکہ یہ انتہاء حکم ہوگا۔

تیسری قسم: اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی کے بارے میں نص فرمائی۔ لیکن اس کا دائم یا غیر دائم ہونا بیان نہ فرمایا تو اب کہتے ہیں اصول فقہ میں ثابت ہے مطلق امر، تکرار کا فائدہ نہیں دیتا وہ صرف ایک دفعہ کیلئے ہوتا ہے جب مکلف اسے ایک مرتبہ بجالایا تو اب اس کی ذمہ داری ختم ہوگی تو اب اس کے بعد دوسرا امر، اول امر کا نسخ نہیں ہوتا تو اس تقسیم سے معلوم ہو رہا ہے کہ قول نسخ محال ہے

ضعیف استدلال

یاد رہے ہم نے ''المحصول فی اصول الفقہ'' میں یہ تمام گفتگو نقل کی اور وقوع نسخ پر ارشادِ گرامی:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

جب ہم کوئی آیت منسوخ کریں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے

سے استدلال کیا لیکن اس سے استدلال بھی ضعیف ہے کیونکہ ماشرط و جزا پر دال ہے جیسے کہا جائے من جاءك فاکرمہ (جو تمہارے پاس آئے اس کا احترام کرو) تو اس کی دلالت آمد پر نہیں بلکہ اس پر ہے کہ اگر اس کی آمد ہو تو اکرام لازم ہوگا تو اسی طرح یہ آیت بھی حصول نسخ پر دال نہیں بلکہ اس پر ہے کہ جب نسخ ہوا تو لازم ہے کہ ناسخ اس سے بہتر ہو لہٰذا اقویٰ یہ ہے کہ ثبوت نسخ کیلئے اس ارشادِ الٰہی سے استدلال کیا جائے۔

فضل قدیر

وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ (پ۱۴، النحل:۱۰۱) اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں

اور اس سے:

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَاۗءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (پ۱۳، الرعد:۳۹) اللہ جو چاہے مٹاتا ہے اور ثابت کرتا ہے اور اصل لکھا ہوا اسی کے پاس ہے

واللہ تعالیٰ اعلم

چھٹا مسئلہ: کیا قرآن میں نسخ ہے؟

تمام اہلِ علم متفق ہیں کہ قرآن میں نسخ ہے، امام ابومسلم بن بحر اسے تسلیم نہیں کرتے

جمہور کے دلائل

قرآن میں وقوع نسخ پر جمہور کے یہ دلائل ہیں:

پہلی دلیل: یہی آیت مبارکہ:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے

شیخ ابومسلم نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں:

۱۔ یہاں آیات منسوخہ سے مراد کتب قدیمہ تورات وانجیل کی شریعتیں ہیں۔ مثلاً سبت، مشرق ومغرب کی طرف نماز جو اللہ تعالیٰ نے ہم سے ساقط کردیں اور ہمیں دیگر عبادات کا حکم دیا کیونکہ یہود ونصاریٰ ایک دوسرے سے کہتے تھے: "لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ" تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارک سے ان کا ابطال فرمایا۔

۲۔ یہاں نسخ سے شریعت کا لوح محفوظ سے دیگر کتب کی طرف نقل کرنا ہے جیسے کہا جاتا۔ نسخت الکتاب۔ (میں نے کتاب نقل کی)

۳۔ پیچھے ہم نے بیان کیا کہ یہ وقوع نسخ پر دلیل نہیں بلکہ اس پر دلیل ہے کہ اگر نسخ ہوا تو بہتر سے ہوگا۔

اول کا جواب

بعض نے اول کا جواب یہ دیا کہ جب آیات کا لفظ مطلقاً آتا ہے تو اس سے آیاتِ قرآن مراد ہوتی ہیں کیونکہ وہی ہمارے ہاں معروف ومتعین ہیں۔

دوسرے کا جواب

لوح محفوظ سے قرآن کا منتقل ہونا کچھ قرآن کا خاصہ نہیں بلکہ تمام کا ہے حالانکہ نسخ کا تعلق تو کچھ قرآن سے ہے۔

اول پر اعتراض

اول جواب پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہم قرآن کے ساتھ آیات کی تخصیص تسلیم نہیں کرتے بلکہ آیات کا لفظ جمیع دلائل کو شامل ہے

دوسرے پر اعتراض

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ نسخ مذکور کا تعلق بعض قرآن سے ہے بلکہ تقدیر (واللہ اعلم) یوں ہے کہ ہم لوح سے منسوخ نہیں فرماتے کہ بعد میں اس سے بہتر لے آتے ہیں۔

دوسری دلیل: قرآن میں وقوع نسخ ماننے والوں کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیوہ کو ایک سال کامل مدت کا حکم دیتے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ (پ۲، البقرۃ:۲۴۰)

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کیلئے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی۔

پھر اسے منسوخ فرما کر چار ماہ اور دس دن کا حکم دیا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (پ۲، البقرۃ:۲۳۴)

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں سال عدت بسر کرنا بالکل ہی ختم نہیں ہوگیا اس لیے کہ اگر وہ حاملہ ہے تو اس کی عدت کامل سال ہوگی تو اس آیت کا بعض صورتوں میں حکم باقی ہے تو اسے تخصیص کہو نہ کہ نسخ۔

جواب: اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حمل کی سورت میں عدت، وضع حمل سے ختم ہو جائے گی خواہ وہ سال ہو یا اس سے زیادہ مدت میں ہو تو ایک سال مدت تو بالکلیہ زائل ہوگئی۔

تیسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (پ۲۸، المجادلۃ:۱۲)

اے ایمان والو جب تم رسول سے کوئی آہستہ بات کرنا چاہو تو اپنی عرض سے پہلے کچھ صدقہ دے لو

دوسرے کا جواب

لوح محفوظ سے قرآن کا منتقل ہونا کچھ قرآن کا خاصہ نہیں بلکہ تمام کا ہے حالانکہ نسخ کا تعلق تو کچھ قرآن سے ہے۔

اول پر اعتراض

اول جواب پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہم قرآن کے ساتھ آیات کی تخصیص تسلیم نہیں کرتے بلکہ آیات کا لفظ جمیع دلائل کو شامل ہے

دوسرے پر اعتراض

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ نسخ مذکور کا تعلق بعض قرآن سے ہے بلکہ تقدیر (واللہ اعلم) یوں ہے کہ ہم لوح سے منسوخ نہیں فرماتے کہ بعد میں اس سے بہتر لے آتے ہیں۔

دوسری دلیل: قرآن میں وقوع نسخ ماننے والوں کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیوہ کو ایک سال کامل مدت کا حکم دیتے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ (پ۲، البقرۃ:۲۴۰)

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کیلئے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی۔

پھر اسے منسوخ فرما کر چار ماہ اور دس دن کا حکم دیا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (پ۲، البقرہ:۲۳۴)

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں سال عدت بسر کرنا بالکل ہی ختم نہیں ہوگیا اس لیے کہ اگر وہ حاملہ ہے تو اس کی عدت کامل سال ہوگی تو اس آیت کا بعض صورتوں میں حکم باقی ہے تو اسے تخصیص کہو نہ کہ نسخ۔

جواب: اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حمل کی سورت میں عدت، وضع حمل سے ختم ہوجائے گی خواہ وہ سال ہو یا اس سے زیادہ مدت میں ہو تو ایک سال مدت تو بالکلیہ زائل ہوگئی۔

تیسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (پ۲۸، المجادلۃ:۱۲)

اے ایمان والو جب تم رسول سے کوئی آہستہ بات کرنا چاہو تو اپنی عرض سے پہلے کچھ صدقہ دے لو

پھر اس صدقہ کو منسوخ کر دیا۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں: یہ حکم اس لیے ختم و ساقط ہوا کہ اس کا سبب ختم ہو گیا۔ سبب صدقہ یہ تھا کہ منافق اہلِ ایمان سے الگ ہو جائیں کیونکہ وہ صدقہ نہیں کرتے تھے، جب یہ غرض پوری ہو گئی تو صدقہ کا حکم ختم۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اگر معاملہ یوں ہی تھا تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ جو صدقہ نہ کرے وہ منافق ٹھہرے حالانکہ یہ باطل ہے کیونکہ منقول یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی صدقہ نہ کرتا اور اس پر یہ ارشادِ الٰہی شاہد ہے۔

فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (پ ۲۸، المجادلہ: ۱۳) — پھر جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمائی

چوتھی دلیل: اللہ تعالیٰ نے ایک مومن کو دس کفار سے مقابلہ کا حکم دیا۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (پ ۱۰، الانفال: ۶۵) — اگر تم میں سے بیس صبر والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے

پھر اس ارشادِ عالی سے اسے منسوخ فرمایا:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (پ ۱۰، الانفال: ۶۶) — اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کی اور وہ جانتا ہے تمہارے ضعف کو اگر تم میں سو ہوں تو کافروں کے ہزار پر غالب آئیں گے

پانچویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (پ ۲، البقرۃ: ۱۴۲) — اب کہیں گے بے وقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلے سے جس پر وہ تھے

پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کرتے ہوئے فرمایا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (پ ۲، البقرۃ: ۱۴۴) — ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں: اس قبلہ (بیت المقدس) کا حکم بالکل ہی زائل نہیں ہو گیا، کیونکہ عدمِ علم کی صورت یا علم کے باوجود عذر کی صورت میں اس کی طرف منہ کیا جا سکتا ہے۔

جواب: آپ کے مطابق بیت المقدس اور دیگر جہات میں کوئی فرق نہیں تو ایسی خصوصیات جس کی بنا پر بیت المقدس دیگر

جہات سے ممتاز تھا وہ اب بالکلیہ ختم۔ لہٰذا نسخ ہے۔

چھٹی دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

وَاِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ (پ۱۴، النحل:۱۰۱)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے کافر کہیں تم تو دل سے بنا لاتے ہو

لفظ تبدیل، رفع و اثبات دونوں کو شامل ہے، مرفوع یا تلاوت ہوگی یا حکم، جو بھی ہو یہ رفع و نسخ ہوگا۔

ہم نے طویل اور تفصیلاً لکھا کیونکہ ان میں سے ہر ایک دلیل وقوعِ نسخ پر فی الجملہ دلیل ہے۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی یہ شان بیان کی ہے:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

جھوٹ اس کے آگے اور نہ پیچھے سے داخل ہو سکتا ہے

اگر نسخ مان لیا جائے تو باطل کا شامل ہونا لازم آتا ہے۔

جواب: مراد یہ ہے کہ اس کتاب سے پہلے ایسی کوئی کتاب الٰہی نہیں جو اسے باطل کہے اور نہ ہی بعد میں کوئی کتاب الٰہی ہے جو اسے باطل قرار دے۔

ساتواں مسئلہ: منسوخ فقط حکم ہوگا یا فقط تلاوت یا دونوں

حکم منسوخ لیکن تلاوت منسوخ نہیں کی مثال اوپر مذکورہ آیات ہیں، منسوخ فقط تلاوت کی مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ہم آیت رجم "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" پڑھا کرتے تھے۔

(سنن ابن ماجہ:۲۵۵۳)

اسی طرح مروی ہے: "لو کان لابن آدم و ادیان من مال لابتغی الیھما ثالثًا ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب و یتوب اللہ علی من تاب"

نوٹ: اس پر بندہ کے مقالہ "تلاوت قرآن کا نسخ محال" کا مطالعہ مفید رہے گا (قادری عفی عنہ)

حکم اور تلاوت دونوں منسوخ کی مثال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ رضاعت کے بارے قرآن میں نازل تھا کہ دس گھونٹ دودھ ہو اور وہ پانچ کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ (مسلم،۱۴۵۲)

تو دس بطور تلاوت و حکم دونوں طرح منسوخ ہے اور خمس کی تلاوت منسوخ لیکن حکم باقی ہے، یہ بھی مروی ہے سورۃ الاحزاب سبع طوال کی طرح یا اس سے زائد تھی پھر اس میں کمی آ گئی۔

جہات سے ممتاز تھا وہ اب بالکلیہ ختم۔لہٰذا نسخ ہے۔

چھٹی دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

وَاِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ (پ۱۴، النحل:۱۰۱)
اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے کافر کہیں تم تو دل سے بنالاتے ہو

لفظ تبدیل، رفع واثبات دونوں کو شامل ہے، مرفوع یا تلاوت ہوگی یا حکم، جو بھی ہو یہ رفع ونسخ ہوگا۔

ہم نے طویل اور تفصیلاً لکھا کیونکہ ان میں سے ہر ایک دلیل وقوعِ نسخ پر فی الجملہ دلیل ہے۔

شیخ ابو مسلم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی یہ شان بیان کی ہے:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ
جھوٹ اس کے آگے اور نہ پیچھے سے داخل ہوسکتا ہے

اگر نسخ مان لیا جائے تو باطل کا شامل ہونا لازم آتا ہے۔

جواب: مراد یہ ہے کہ اس کتاب سے پہلے ایسی کوئی کتاب الٰہی نہیں جو اسے باطل کہے اور نہ ہی بعد میں کوئی کتاب الٰہی ہے جو اسے باطل قرار دے۔

ساتواں مسئلہ: منسوخ فقط حکم ہوگا یا فقط تلاوت یا دونوں

حکم منسوخ لیکن تلاوت منسوخ نہیں کی مثال اوپر مذکورہ آیات ہیں، منسوخ فقط تلاوت کی مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ہم آیت رجم "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" پڑھا کرتے تھے۔

(سنن ابن ماجہ:۲۵۵۲)

اسی طرح مروی ہے:"لو كان لابن آدم و اديان من مال لابتغى اليهما ثالثًا ولا يملأ جوف ابن آدم الا التراب و يتوب الله على من تاب"

نوٹ: اس پر بندہ کے مقالہ ''تلاوت قرآن کا نسخ محال'' کا مطالعہ مفید رہے گا (قادری عفی عنہ)

حکم اور تلاوت دونوں منسوخ کی مثال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔رضاعت کے بارے قرآن میں نازل تھا کہ دس گھونٹ دودھ ہو اور وہ پانچ کے ساتھ منسوخ ہوگیا۔ (مسلم،۱۴۵۲)

تو دس بطور تلاوت و حکم دونوں طرح منسوخ ہے اور خمس کی تلاوت منسوخ لیکن حکم باقی ہے، یہ بھی مروی ہے سورۃ الاحزاب سبع طوال کی طرح یا اس سے زائد تھی پھر اس میں کمی آگئی۔

آٹھواں مسئلہ: مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا کی تفسیر

اس کی تفسیر میں اہلِ علم کا اختلاف ہے بعض نے نسخ کی تفسیر ازالہ سے، بعض نے نقل سے کی ہے مثلاً نسخت الکتاب۔ یہ حضرت عطاء اور حضرت سعید بن المسیب کا قول ہے۔

پہلے قول پر دلائل

قول اول پر یہ دلائل دیے گئے ہیں:

۱۔ معنی یہ ہے کہ ہم نہیں منسوخ کرتے کسی آیت کو جس کی تم تلاوت کرتے ہو یا نہیں بھلاتے قرآن کو جو تم پڑھ رہے ہوتے ہو پھر تم بھلا دیے جاتے ہو، یہ حضرت حسن، اصم اور اکثر متکلمین کا قول ہے یہ "ما ننسخ" کو فقط نسخ حکم (تلاوت نہیں) اور ننسھا کو نسخ حکم اور تلاوت دونوں پر محمول کرتے ہیں۔

سوال: وقوع نسیان عقلاً و شرعاً ممنوع ہے عقلاً اس لیے کہ قرآن کا اہلِ تواتر تک پہنچنا ضروری ہے جبکہ تمام اہلِ تواتر سے نسیان محال ہے، شرعاً اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (پ۱۴، الحجر:۹) ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں

پہلے کا جواب

پہلے کا جواب دو طرح ہے:

۱۔ نسیان ہوسکتا ہے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ حکم دیدے کہ اسے قرآن نہ مانو اور اسے نماز میں تلاوت اور استدلال سے خارج کردو جب اس پر عمل ساقط ہوگیا اور وقت بھی کافی گزر گیا تو نسیان ثابت اور اگر وہ کہیں یاد بھی ہے تو بطور خبر واحد ہی ہوگی تو اس طرح وہ صدور سے محو ہوجائے گی۔

۲۔ یہ بطور معجزہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوا جیسا کہ احادیث میں ہے صحابہ رات سورت کی تلاوت کرتے بوقت صبح تمام کو بھول جاتی۔

دوسرے کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ دوسری آیت سے معارض ہے

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (پ۳۰، الاعلیٰ:۶،۷) ہم آپ کو عنقریب پڑھائیں گے کہ تم بھولو گے نہیں مگر جو اللہ چاہے

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (پ ۱۵، الکہف: ۲۴) اور یاد کرو اپنے رب کو جب تم بھولو

دوسرا قول: ما ننسخ من آیۃ، کا معنی یہ ہے کہ ہم اسے بدل دیتے ہیں یا اس کا حکم فقط یا تلاوت فقط یا دونوں کو او ننسھا ہم اسے اپنے حال پر رہنے دیتے ہیں اس میں تبدیلی نہیں کرتے، پیچھے آچکا نسیان بمعنی ترک آتا ہے۔ حاصل آیات یہ ہے کہ جسے ہم بدلتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مثل لاتے ہیں۔

تیسرا قول: ما ننسخ من آیۃ۔ یعنی ہم نے آیت کو انزال کے بعد مرفوع (اُٹھایا) نہیں کیا او ننسأھا۔ (ہمزہ کے ساتھ قرأت) یا ہم نے اس کے انزال کو لوح محفوظ سے موخر نہیں کیا یا مراد یہ ہے کہ ہم نے اس کا نسخ مؤخر کر دیا کہ فی الحال اسے منسوخ نہیں کر رہے ہاں ہم اس کا بدل کریں گے جو مصلحت میں اس کے قائم مقام ہو۔

چوتھا قول: ما ننسخ من آیۃ یہ وہ آیت ہے جو حکم و تلاوت دونوں میں منسوخ ہے۔ "او ننسھا" (یا ہم نے اسے چھوڑ دیا) یہ وہ آیت ہے جو حکم میں منسوخ لیکن تلاوت میں منسوخ نہیں بلکہ وہ تلاوت میں باقی ہے۔

دوسری رائے

دوسری رائے والوں کے ہاں ما ننسخ من آیۃ کا معنی یہ ہے ہم اسے لوح محفوظ سے منتقل کر دیں گے "او ننسھا" یا ہم اسے مؤخر کر دیں گے۔ ننسھا قرات کی صورت میں معنی ہوگا ہم نے اسے ترک کر دیا یعنی ہم نے اس کا نسخ ترک کر کے اسے منسوخ نہیں کیا۔ من آیۃ، تمام مفسرین نے آیت قرآن پر ہی محمول کیا ہے، بخلاف امام ابو مسلم وہ تورات و انجیل پر محمول کرتے ہیں، اس پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا کی تفسیر

اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ وہ دوسری آسانی پیدا کرنے والی ہوگی۔

۲۔ اس دوسری میں مصلحت زیادہ ہوگی۔

یہ دوسرا قول اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکلف کی مصلحت کو دیکھتا ہے نہ کہ اس کی طبیعت کی آسانی۔

سوال: اگر دوسری میں اول سے زیادہ مصلحت تھی تو اول ناقص الاصلاح ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم کیسے دے دیا؟

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (پ ۱۵، الکہف:۲۴) اور یاد کرو اپنے رب کو جب تم بھولو

دوسرا قول: ما ننسخ من آیۃ، کا معنی یہ ہے کہ ہم اسے بدل دیتے ہیں یا اس کا حکم فقط یا تلاوت فقط یا دونوں کو او ننسھا ہم اسے اپنے حال پر رہنے دیتے ہیں اس میں تبدیلی نہیں کرتے، پیچھے آ چکا نسیان بمعنی ترک آتا ہے۔ حاصل آیات یہ ہے کہ جسے ہم بدلتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مثل لاتے ہیں۔

تیسرا قول: ما ننسخ من آیۃ۔ یعنی ہم نے آیت کو انزال کے بعد مرفوع (اُٹھایا) نہیں کیا او ننسأھا۔ (ہمزہ کے ساتھ قرأت) یا ہم نے اس کے انزال کو لوح محفوظ سے موخر نہیں کیا یا مراد یہ ہے کہ ہم نے اس کا نسخ مؤخر کر دیا کہ فی الحال اسے منسوخ نہیں کر رہے ہاں ہم اس کا بدل کریں گے جو مصلحت میں اس کے قائم مقام ہو۔

چوتھا قول: ما ننسخ من آیۃ۔ یہ وہ آیت ہے جو حکم و تلاوت دونوں میں منسوخ ہے۔ "او ننسھا" (یا ہم نے اسے چھوڑ دیا) یہ وہ آیت ہے جو حکم میں منسوخ لیکن تلاوت میں منسوخ نہیں بلکہ وہ تلاوت میں باقی ہے۔

دوسری رائے

دوسری رائے والوں کے ہاں ما ننسخ من آیۃ کا معنی یہ ہے، ہم اسے لوح محفوظ سے منتقل کر دیں گے "او ننسھا" یا ہم اسے مؤخر کر دیں گے۔ ننسھا قرات کی صورت میں معنی ہوگا ہم نے اسے ترک کر دیا یعنی ہم نے اس کا نسخ ترک کر کے اسے منسوخ نہیں کیا۔ من آیۃ، تمام مفسرین نے آیت قرآن پر ہی محمول کیا ہے، بخلاف امام ابو مسلم وہ تورات و انجیل پر محمول کرتے ہیں، اس پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کی تفسیر

اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ وہ دوسری آسانی پیدا کرنے والی ہوگی۔

۲۔ اس دوسری میں مصلحت زیادہ ہوگی۔

یہ دوسرا قول اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکلف کی مصلحت کو دیکھتا ہے نہ کہ اس کی طبیعت کی آسانی۔

سوال: اگر دوسری میں اول سے زیادہ مصلحت تھی تو اول ناقص الاصلاح ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم کیسے دے دیا؟

جواب: اول میں وقت کے حوالہ سے دوسری سے مصلحت تھی جبکہ دوسرے وقت میں دوسری میں زیادہ ہے۔ لہٰذا سوال ختم۔

مسائل کا استنباط

اہلِ علم نے اس آیت مبارکہ سے بہت سارے مسائل نسخ کا استنباط کیا ہے۔

پہلا مسئلہ: بعض لوگوں نے کہا: حکم کا نسخ بدل کے بغیر جائز نہیں ہوگا انہوں نے اس آیت سے یوں استدلال کیا: یہ آیت بتا رہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو منسوخ کرے گا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل ضرور عطا کرے گا اور یہ لزومِ بدل پر نص ہے۔

جواب: یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اس وقت اس حکم کی نفی اور اس پر عمل کے ساقط ہونے کو بہتر قرار دیا گیا ہے تو اب دلالت وقوع نسخ پر ہے مگر بدل پر نہیں مثلاً بوقت حاضری بارگاہ رسول ﷺ صدقہ منسوخ ہوا مگر اس کا بدل نہیں قرار دیا۔

دوسرا مسئلہ: بعض نے کہا کسی شئ کا نسخ، اس سے زیادہ ثقیل سے نہ ہوگا۔ انہوں نے استدلال یوں کیا، ارشادِ الٰہی ہے:

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لائیں گے

تو یہ اس شی کے زیادہ ثقیل ہونے کے منافی ہے اس لیے کہ اثقل نہ اس سے بہتر ہوگی اور نہ ہی مثل

جواب: یہ کیوں جائز نہیں کہ یہاں خیر سے مراد، آخرت میں اکثر ثواب والی شی ہو۔ پھر اثقل (زیادہ ثقیل) سے وقوع نسخ بھی ہوا ہے مثلاً زانیات کے بارے میں اولاً حکم تھا کہ انہیں گھروں میں قید کر دو پھر ان کے رجم اور کوڑوں کا حکم آ گیا۔ صومِ عاشورا کو صوم رمضان سے منسوخ۔ بعض کے نزدیک نماز اصلاً دو رکعت تھی گھر میں چار سے منسوخ ہوگی۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو اب سنیئے تو ان صورتوں میں اثقل سے نسخ ہوا ہے۔ رہا اخف کے ساتھ نسخ مثلاً سال کی عدت کا چار ماہ دس دن سے، نسخ نماز تہجد میں اختیار کے ساتھ نسخ، مثل کے ساتھ نسخ کی مثال بیت المقدس سے کعبہ کا قبلہ بننا ہے۔

تیسرا مسئلہ: امام شافعی رضی اللہ عنہ کا قول

حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کتاب اللہ، سنت متواترہ سے بھی منسوخ نہیں ہوسکتی، ان کا استدلال متعدد طریقوں سے ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی آیت کو اس سے بہتر سے منسوخ فرمائے گا اور یہ نشاندہی کر رہی ہے کہ بعد میں آنے والی آیت اس کی جنس سے ہوگی جیسے کہ انسان کہے: ما اخذ منك من ثواب آتيك بخير منه (میں تجھ سے اجر نہیں لوں گا جب تک اس سے بہتر نہ دے) تو اس میں اس کی جنس سے ہونا لازمی ہے تو اب ضروری ہوگا کہ ناسخ جنس سے ہو تو جنس قرآن، قرآن ہی ہے۔

جواب: اول میں وقت کے حوالہ سے دوسری سے مصلحت تھی جبکہ دوسرے وقت میں دوسری میں زیادہ ہے۔ لہٰذا سوال ختم۔

مسائل کا استنباط

اہلِ علم نے اس آیت مبارکہ سے بہت سارے مسائل نسخ کا استنباط کیا ہے۔

پہلا مسئلہ: بعض لوگوں نے کہا: حکم کا نسخ بدل کے بغیر جائز نہیں ہوگا انہوں نے اس آیت سے یوں استدلال کیا: یہ آیت بتا رہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو منسوخ کرے گا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل ضرور عطا کرے گا اور یہ لزومِ بدل پر نص ہے۔

جواب: یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اس وقت اس حکم کی نفی اور اس پر عمل کے ساقط ہونے کو بہتر قرار دیا گیا ہے تو اب دلالت وقوع نسخ پر ہے مگر بدل پر نہیں مثلاً بوقت حاضری بارگاہ رسول ﷺ صدقہ منسوخ ہوا مگر اس کا بدل نہیں قرار دیا۔

دوسرا مسئلہ: بعض نے کہا کسی شی کا نسخ، اس سے زیادہ ثقیل سے نہ ہوگا۔ انہوں نے استدلال یوں کیا، ارشادِ الٰہی ہے:

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا　　ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لائیں گے

تو یہ اس شی کے زیادہ ثقیل ہونے کے منافی ہے اس لیے کہ اثقل نہ اس سے بہتر ہوگی اور نہ ہی مثل

جواب: یہ کیوں جائز نہیں کہ یہاں خیر سے مراد، آخرت میں اکثر ثواب والی شی ہو۔ پھر اثقل (زیادہ ثقیل) سے وقوع نسخ بھی ہوا ہے مثلاً زانیات کے بارے میں اولاً حکم تھا کہ انہیں گھروں میں قید کر دو پھر ان کے رجم اور کوڑوں کا حکم آ گیا۔ صومِ عاشورا کو صوم رمضان سے منسوخ، بعض کے نزدیک نماز اصلاً دو رکعت تھی گھر میں چار سے منسوخ ہوگی۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو اب سنیے تو ان صورتوں میں اثقل سے نسخ ہوا ہے۔ رہا اخف کے ساتھ نسخ مثلاً سال کی عدت کا چار ماہ دس دن سے، نسخ نماز تہجد میں اختیار کے ساتھ نسخ، مثل کے ساتھ نسخ کی مثال بیت المقدس سے کعبہ کا قبلہ بننا ہے۔

تیسرا مسئلہ: امام شافعی رضی اللہ عنہ کا قول

حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کتاب اللہ، سنت متواترہ سے بھی منسوخ نہیں ہو سکتی، ان کا استدلال متعدد طریقوں سے ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی آیت کو اس سے بہتر سے منسوخ فرمائے گا اور یہ نشاندہی کر رہی ہے کہ بعد میں آنے والی آیت اس کی جنس سے ہوگی جیسے کہ انسان کہے: ما اخذ منك من ثواب آتيك بخير منه۔ (میں تجھ سے اجر نہیں لوں گا جب تک اس سے بہتر نہ دے) تو اس میں اس کی جنس سے ہونا لازمی ہے تو اب ضروری ہوگا کہ ناسخ جنس سے ہو تو جنس قرآن، قرآن ہی ہے۔

۲۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا ہم اس سے بہتر لائیں گے۔

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے بہتر لانے میں وہ ہی یکتا ہے اور وہ قرآن یہی کلام اللہ ہے نہ کہ سنت وہ تو رسول اللہ کا کلام ہے۔

۳۔ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا کے الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ بعد والا پہلے سے بہتر ہوگا تو سنت، قرآن سے بہتر کہاں؟

۴۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کیا تم نہیں جانتے اللہ ہر شی پر قادر ہے

یہ الفاظ نشاندہی کررہے ہیں کہ یہ خیر (بہتر) وہی ذات لاسکتی ہے جو تمام خیرات پر قادر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ان تمام کا جواب

اس آیت میں یہ کہیں نہیں کہ وہ خیر و بہتر ہی لازماً ناسخ ہوگی بلکہ ممکن ہے وہ خیر، ناسخ کا مغایر اور حصول نسخ کے بعد خاص ہو، اس احتمال کے ثابت ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صراحت ہے کہ اس خیر کا لانا، آیت اول کے نسخ پر مرتب ہوگا اب اگر اس اول کا نسخ، خیر پر مرتب ہو تو دور لازم آئے گا جو باطل ہے۔

جمہور کے دلائل

سنت، کتاب اللہ کیلئے ناسخ بن سکتی ہے اس پر جمہور کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ آیت وصیت (رشتہ داروں کیلئے وصیت والی آیت) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے منسوخ ہے:

اَلَا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ (سنن ابوداود، ۳۵۶۵) سنو ورثاء کیلئے وصیت جائز نہیں

۲۔ آیت جلد (کوڑوں کا حکم) حدیث رجم سے منسوخ ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: اول دلیل ضعیف ہے کیونکہ میراث ورثاء کا حق ہے یہی بات ان کیلئے وصیت سے مانع ہے تو ثابت ہوا آیت میراث ہی اس وصیت سے مانع ہے۔

دوسری بھی ضعیف ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: الشیخ والشیخۃ قرآن تھا تو اس کے ساتھ نسخ ہوا نہ کہ حدیث سے۔ تفصیلی گفتگو کیلئے اصول فقہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ واللہ اعلم

ارشاد مبارک

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کیا تم نہیں جانتے بلاشبہ اللہ ہر شی پر قادر ہے؟

فضل قدیر

۲۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ ہم اس سے بہتر لائیں گے۔

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے بہتر لانے میں وہ ہی یکتا ہے اور وہ قرآن یہی کلام اللہ ہے نہ کہ سنت وہ تو رسول اللہ کا کلام ہے۔

۳۔ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ کے الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ بعد والا پہلے سے بہتر ہوگا تو سنت، قرآن سے بہتر کہاں؟

۴۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کیا تم نہیں جانتے اللہ ہر شی پر قادر ہے

یہ الفاظ نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ خیر (بہتر) وہی ذات لاسکتی ہے جو تمام خیرات پر قادر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ان تمام کا جواب

اس آیت میں یہ کہیں نہیں کہ وہ خیر و بہتر ہی لازماً ناسخ ہوگی بلکہ ممکن ہے وہ خیر، ناسخ کا مغایر اور حصول نسخ کے بعد خاص ہو، اس احتمال کے ثابت ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صراحت ہے کہ اس خیر کا لانا، آیت اول کے نسخ پر مرتب ہوگا اب اگر اس اول کا نسخ، خیر پر مرتب ہو تو دور لازم آئے گا جو باطل ہے۔

جمہور کے دلائل

سنت، کتاب اللہ کیلئے ناسخ بن سکتی ہے اس پر جمہور کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ آیت وصیت (رشتہ داروں کیلئے وصیت والی آیت) حضور ﷺ کے اس فرمان سے منسوخ ہے:

اَلَا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ (سنن ابوداود، ۳۵۶۵) سنو ورثاء کیلئے وصیت جائز نہیں

۲۔ آیت جلد (کوڑوں کا حکم) حدیث رجم سے منسوخ ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: اول دلیل ضعیف ہے کیونکہ میراث ورثاء کا حق ہے یہی بات ان کیلئے وصیت سے مانع ہے تو ثابت ہوا آیت میراث ہی اس وصیت سے مانع ہے۔

دوسری بھی ضعیف ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: الشیخ والشیخۃ قرآن تھا تو اس کے ساتھ نسخ ہوا نہ کہ حدیث سے۔ تفصیلی گفتگو کیلئے اصول فقہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ واللہ اعلم

ارشاد مبارک

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کیا تم نہیں جانتے بلاشبہ اللہ ہر شی پر قادر ہے؟

فضل قدیر

یہ حضور ﷺ اور دیگر تمام کو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر متوجہ کرنا ہے کہ مکلف اس کی مشیت، حکم اور حکمت کے تحت ہے جس کا وہ ارادہ فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ پسند کرلے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

نواں مسئلہ، معتزلہ کا خلق قرآن پر استدلال

معتزلہ نے اسی آیت سے کئی وجوہ سے استدلال کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔

۱۔ کلام اللہ اگر قدیم ہوتا تو ناسخ ومنسوخ بھی قدیم ہوتے لیکن یہ محال ہے کیونکہ نسخ کا منسوخ سے مؤخر ہونا ضروری ہے اور شی سے مؤخر ہونے والے کا قدیم ہونا محال ہے اور منسوخ کا زائل اور مرتفع ہونا ضروری ہے، زائل ہونے والے کا قدیم ہونا بالاتفاق محال ہے۔

۲۔ آیت بتارہی ہے کہ کچھ حصہ قرآن دوسرے سے خیر وافضل ہے اور جس کی صفت یہ ہو وہ قدیم نہیں ہوسکتا

۳۔ ارشادِ گرامی 'اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' نشاندہی کررہا ہے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض کے نسخ پر اور اول سے بہتر لانے پر قادر ہے اور جو قدرت کے تحت ہو وہ فعل حادث ہوگا۔

ہمارے اصحاب کا جواب

اہلِ علم نے اس کا جواب یوں دیا کہ ناسخ ومنسوخ، الفاظ، عبارات اور لغات کا مدلول ہے لہٰذا اس کے حادث ہونے میں کوئی نزاع ہی نہیں۔ وہ معنی حقیقی جو ان عبارات اور اصطلاحات کا مدلول ہے تم اسے کیوں حادث کہتے ہو؟

معتزلہ کہتے ہیں جو معنی عبادات ولغات کا مدلول ہے بلاشبہ اس کا تعلق اول زائل ہوگیا اور اسے دوسرا تعلق لاحق ہوا تو تعلق اول حادث کیونکہ وہ زائل ہوگیا اور قدیم زائل نہیں ہوتا، تعلق ثانی بھی حادث کیونکہ عدم کے بعد ہوا اور کلام حقیقی ان تعلقات سے جدا نہیں اور جو ان تعلقات سے جدا نہیں وہ محدث اور جو حادث سے جدا نہ ہو وہ حادث جو کلام اس سے متعلق ہے وہ لازماً حادث ہی ہوگی۔

جواب اصحاب

اصحاب نے یہ جواب دیا اللہ تعالیٰ کی قدرت ازل میں ایجاد عالم سے متعلق ہوئی، عالم کے دخول وجود کے بعد وہ تعلق باقی رہا یا نہیں؟ اگر باقی ہے تو لازم کہ قادر ایجاد موجود پر قادر ہو اور یہ محال ہے اور اگر تعلق باقی نہیں تو تمہاری بیان کردہ وجہ کے مطابق قدرتِ الٰہیہ کا حادث ہونا لازم، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم اس سے متعلق تھا کہ عنقریب عالم معرض وجود میں آئے گا جب عالم وجود

میں آ گیا تو اب اگر تعلق اول باقی ہے تو یہ جہالت ہے اور اگر باقی نہیں تو تعلق اول حادث اس لیے کہ اگر وہ قدیم ہوتا تو زائل نہ ہوتا جو اس کے بعد متعلق ہو گا وہ حادث ہی ہو گا تو اب اللہ تعالیٰ کی عالمیت، تعلقات حادثہ سے جدا نہیں، جو محدث سے جدا نہ ہو وہ حادث ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عالمیت، حادث ہو گی تو جو جواب اللہ تعالیٰ کی عالمیت وقدرت پر تمہارا ہے وہی جواب کلام کے بارے میں ہمارا ہے۔

دسواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ معدوم بھی شی ہوتا ہے اس پر گفتگو گزر چکی ہے ہم اسے لوٹانا مناسب نہیں سمجھتے۔ قدیر بروزن فعیل بمعنی قادر ہے اور یہ وزن مبالغہ کیلئے ہے۔

[۱۰۷] اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾

(کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ کے لیے ہی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا نہ مددگار)

سابقہ آیت سے تعلق

جب اللہ تعالیٰ نے جوازِ نسخ کا فیصلہ سنایا تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ آسمان وزمین کی حکومت اسی کی ہے نہ کہ غیر کی، یہ اس پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوامر ونواہی کا ہونا ہی احسن ہے کیونکہ وہی مخلوق کا مالک ہے یہی ہمارے اصحاب کا مذہب ہے اور اس کا مخلوق کو مکلف و ذمہ دار بنانا محض اس لیے حسین ہے کہ وہ مخلوق کا مالک اور ان کا والی ہے نہ کہ اس سے کے حصول ثواب یا دفع عتاب ہو، شیخ قفال کہتے ہیں: ممکن ہے یہ معاملہ قبلہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس نے بتایا میں آسمانوں اور زمین کا مالک ہوں۔ تمام مکانات اور جہات اسی کی ہیں اور بعض جہات کو بعض پر حرمت وفضیلت بھی نہیں البتہ جسے اللہ تعالیٰ حرمت عطا فرمائے تو جب صورت حال یہی ہے تو استقبال قبلہ کا حکم محض تشریف کی خاطر تخصیص ہے تو اب ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف تبدیلی میں کوئی مانع نہیں۔ لفظ ولی ونصیر فعیل بمعنی فاعل مبالغہ کیلئے ہے۔

میں آ گیا تو اب اگر تعلق اول باقی ہے تو یہ جہالت ہے اور اگر باقی نہیں تو تعلق اول حادث اس لیے کہ اگر وہ قدیم ہوتا تو زائل نہ ہوتا جو اس کے بعد متعلق ہو گا وہ حادث ہی ہو گا تو اب اللہ تعالیٰ کی عالمیت، تعلقات حادثہ سے جدا نہیں، جو محدث سے جدا نہ ہو وہ حادث ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عالمیت، حادث ہو گی تو جو جواب اللہ تعالیٰ کی عالمیت وقدرت پر تمہارا ہے وہی جواب کلام کے بارے میں ہمارا ہے۔

دسواں مسئلہ: اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ معدوم بھی شی ہوتا ہے اس پر گفتگو گزر چکی ہے ہم اسے لوٹانا مناسب نہیں سمجھتے۔ قدیر بروزن فعیل بمعنی قادر ہے اور یہ وزن مبالغہ کیلئے ہے۔

[۱۰۷] اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾

(کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ کے لیے ہی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا نہ مددگار)

سابقہ آیت سے تعلق

جب اللہ تعالیٰ نے جوازِ نسخ کا فیصلہ سنایا تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ آسمان وزمین کی حکومت اسی کی ہے نہ کہ غیر کی، یہ اس پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوامر ونواہی کا ہونا ہی احسن ہے کیونکہ وہی مخلوق کا مالک ہے یہی ہمارے اصحاب کا مذہب ہے اور اس کا مخلوق کو مکلّف وذمہ دار بنانا محض اس لیے حسین ہے کہ وہ مخلوق کا مالک اور ان کا والی ہے نہ کہ اس سے کے حصول ثواب یا دفع عتاب ہو، شیخ قفال کہتے ہیں: ممکن ہے یہ معاملہ قبلہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس نے بتایا میں آسمانوں اور زمین کا مالک ہوں۔ تمام مکانات اور جہات اسی کی ہیں اور بعض جہات کو بعض پر حرمت وفضیلت بھی نہیں البتہ جسے اللہ تعالیٰ حرمت عطا فرمائے تو جب صورت حال یہی ہے تو استقبال قبلہ کا حکم محض تشریف کی خاطر تخصیص ہے تو اب ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف تبدیلی میں کوئی مانع نہیں۔ لفظ ولی ونصیر فعیل بمعنی فاعل مبالغہ کیلئے ہے۔

62
62

بعض کا استدلال

بعض نے اس آیت سے یہ استدلال کیا کہ ملک، قدرت کے علاوہ ہے کیونکہ اولاً فرمایا:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ — کیا تمہیں خبر نہیں بلاشبہ اللہ ہر شی پر قادر ہے

پھر بعد میں فرمایا:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — کیا تمہیں خبر نہیں کہ اللہ کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی

[۱۰۸] اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾

(کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ درست راستہ سے بہک گیا)

یہاں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: اَم کی اقسام

اَم کی دو قسمیں ہیں، متصلہ اور منقطعہ، متصلہ، الف کی طرح ہے اور یہ اَی سے لیا گیا ہے۔ جیسے اَو، اس محاورہ سے ہے اضرب ایھم شئت زیداً ام عمراً، جب تم کہو اضرب احدھم تو معنی ہوگا، زید یا عمر کو مارو۔

اَم منقطعہ، کلام تام کے بعد آتا ہے کیونکہ یہ بمعنی بل اور الف ہوتا ہے جیسے محاورہ ہے انھا ابل ام شاۃ گویا کہا بلکہ یہ بکری ہے۔ اس سے ارشادِ الٰہی ہے:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ (پ۲۶، الاحقاف:۸) — بلکہ وہ کہتے ہیں یہ انہوں نے گھڑا ہے

یعنی بلکہ وہ کہتے ہیں، اخطل نے کہا:

كذبتك عينك ام رأيت بواسط — غلس الظلام من الرباب خيالاً

دوسرا مسئلہ: یہاں مخاطب کون ہیں؟

یہاں مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول: مسلمان مخاطب ہیں، یہ شیخ اصم، جبائی اور ابو مسلم کا قول ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

ا۔ آخر آیت میں ہے:

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ جس نے کفر، ایمان کے بدلے لیا

تو یہ بات اہلِ ایمان کے حق میں ہی درست ہو سکتی ہے۔

۲۔ ارشاد ”اَمْ تُرِيْدُوْنَ“ کا تقاضا ہے کہ اس کا کسی پر عطف ہو اور وہ ارشاد ’لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا‘ ہے گویا فرمایا کہو ہم پر نظر کرم کرو اور بغور سنو تو کیا تم اس حکم کے مطابق کرو گے یا اپنے رسول سے سوالات کا ارادہ رکھتے ہو؟

۳۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات پوچھتے جن میں تجسس کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایسے سوالات کیے جن میں کوئی فائدہ ہی نہ تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا تھا، ذات انواط ہمارے لیے مقرر کیجیے جیسے مشرکین کے لیے ذات انواط ہے اور یہ ایک درخت تھا جس کی وہ عبادت کرتے اور اس کے ساتھ اپنے ماکولات و مشروبات معلق کرتے جیسے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے لیے الٰہ بناؤ جیسے ان کے لیے الٰہ ہے۔

دوسرا قول، مخاطب اہلِ مکہ ہیں

یہ اہلِ مکہ سے خطاب ہے یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے، ہوا یوں کہ عبداللہ بن امیہ المخزومی گروہ قریش کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا، اے محمد اللہ کی قسم میں تم پر ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دو یا تمہارے لیے جنت سے کھجور اور انگور آئیں یا تمہارا گھر سونے چاندی کا ہو یا تم آسمانوں پر چڑھو، پھر ہم تمہارے اس چڑھنے پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم پر اللہ کی طرف سے عبداللہ بن اُمیہ کی طرف یہ تحریر لاؤ کہ محمد رسول ہے تم اس کی اتباع کرو۔

اور باقی لوگوں نے کہا اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دفعۃً کتاب لے آؤ جس میں حلال و حرام اور حدود و فرائض ہوں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف تختیوں کی صورت میں کتاب لائے اور اس میں یہ تمام چیزیں

دوسرا مسئلہ: یہاں مخاطب کون ہیں؟

یہاں مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول: مسلمان مخاطب ہیں، یہ شیخ اصم، جبائی اور ابو مسلم کا قول ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ آخر آیت میں ہے:

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ جس نے کفر، ایمان کے بدلے لیا

تو یہ بات اہلِ ایمان کے حق میں ہی درست ہوسکتی ہے۔

۲۔ ارشاد "اُمْ تُرِيْدُوْنَ" کا تقاضا ہے کہ اس کا کسی پر عطف ہو اور وہ ارشاد 'لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا' ہے گویا فرمایا کہو ہم پر نظر کرم کرو اور بغور سنو تو کیا تم اس حکم کے مطابق کرو گے یا اپنے رسول سے سوالات کا ارادہ رکھتے ہو؟

۳۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ سے ایسے سوالات پوچھتے جن میں تجسس کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایسے سوالات کیے جن میں کوئی فائدہ ہی نہ تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا تھا، ذات انواط ہمارے لیے مقرر کیجیے جیسے مشرکین کے لیے ذات انواط ہے اور یہ ایک درخت تھا جس کی وہ عبادت کرتے اور اس کے ساتھ اپنے ماکولات و مشروبات معلق کرتے جیسے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے لیے الہ بناؤ جیسے ان کے لیے الہ ہے۔

دوسرا قول، مخاطب اہلِ مکہ ہیں

یہ اہلِ مکہ سے خطاب ہے یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے، ہوا یوں کہ عبداللہ بن امیہ المخزومی گروہ قریش کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا، اے محمد اللہ کی قسم میں تم پر ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کردو یا تمہارے لیے جنت سے کھجور اور انگور آئیں یا تمہارا گھر سونے چاندی کا ہو یا تم آسمانوں پر چڑھو، پھر ہم تمہارے اس چڑھنے پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم پر اللہ کی طرف سے عبداللہ بن اُمیہ کی طرف یہ تحریر لاؤ کہ محمد رسول ہے تم اس کی اتباع کرو۔

اور باقی لوگوں نے کہا اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دفعۃً کتاب لے آؤ جس میں حلال و حرام اور حدود و فرائض ہوں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف تختیوں کی صورت میں کتاب لائے اور اس میں یہ تمام چیزیں

تھیں تو تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کیا تم اپنے رسول اللہ سے آیات لانے کا اسی طرح سوال کرتے ہو جو ستر آدمیوں نے کیا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ اپنا آپ دکھائے۔

حضرت مجاہد کہتے ہیں قریش نے سیدنا محمد ﷺ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کیلئے کوہِ صفا کو سونے چاندی کا بنا دیں تو فرمایا ہاں لیکن وہ تمہارے لیے بنی اسرائیل کے دسترخوان کی طرح ہوگا وہ انکار کرتے ہوئے بھاگ گئے۔

تیسرا قول، یہ یہود سے خطاب ہے

یہاں مراد یہود ہیں اور یہی قول اصح ہے کیونکہ یہ صورت ابتدا 'یَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ' سے لے کر تمام انہی کے احوال سے حکایت اور انہی کے خلاف دلیل ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ سورت مدنی ہے پھر ذکر بھی یہود کا ہی ہے کسی دوسرے کا تذکرہ نہیں پھر رسول پر ایمان لانے والے کہاں ان سے سوال کریں گے جو سوال کرے گا وہ ایمان کو کفر سے بدل لے گا۔

تیسرا مسئلہ: ارشادِ الٰہی:

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ کیا تم اپنے رسول سے سوال کا ارادہ کرتے ہو جیسے موسیٰ سے پہلے سوال کیا گیا

ظاہراً اس پر دال نہیں کہ انہوں نے سوال کیا چہ جائیکہ اس میں کیفیتِ سوال پہ دلالت ہو بلکہ اس میں ان روایات کی طرف رجوع ضروری ہے کہ جن میں ان کے سوال کا تذکرہ ہے۔ واللہ اعلم

چوتھا مسئلہ: سوال کیا تھا؟

اگر ان کا سوال طلب معجزات تھا تو یہ کفر کیسے ہو گیا؟ کیونکہ واضح ہے کہ کسی شیٔ پر دلیل طلب کرنا کفر نہیں ہوتا اور یہ اگر سوال نو احکام کی تفصیل کے بارے میں تھا تو یہ بھی کفر نہیں کیونکہ ملائکہ نے خلقتِ بشر کی تفصیلی حکمت پوچھی تھی اور یہ کفر نہیں۔

تو اولیٰ یہی ہے کہ آیت مبارکہ کو اس پر محمول کیا جائے کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے لیے الٰہ بنا دیجیے جیسے ان مشرکین کیلئے الٰہ ہے اور اگر انہوں نے معجزات کا سوال کیا تو ممکن ہے اس سے مقصد ضد، ہٹ دھرمی ہو اسی لیے سوال کفر قرار پایا۔

پانچواں مسئلہ: ماقبل سے ربط و تعلق

اس آیت کا ماقبل سے ربط کئی طرح سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جب بتایا کہ شرائع میں نسخ ہو سکتا ہے تو شاید انہوں نے اس حکم کی تفاصیل مانگی ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع

کرتے ہوئے واضح کیا کہ ایسے سوالات میں مشغول نہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو غلط سوالات کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ جب پہلے احکام ونواہی گزرے تو فرمایا اگر تم نے میرے احکام کو قبول نہ کیا اور طاعت سے سرکشی کی تو تم ان لوگوں کی طرح ہو جاؤ گے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ سوالات کیے جو نہیں کیے جانے چاہئیں تھے۔

یہ شیخ ابو مسلم کا قول ہے۔

۳۔ جب اوامر ونواہی فرمائے تو فرمایا کیا تم ان پر عمل کرو گے یا اس طرح کرو گے جیسے تم سے پہلے قوم نے کیا؟

چھٹا مسئلہ: سواء السبیل کی تفسیر

سواء السبیل، راستہ کا وسط، ارشادِ الٰہی ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَاۗءِ الْجَحِيْمِ　　(پ ۲۳ - الصافات:۵۵)　　پھر جھانکا تو اسے بھڑکتی آگ میں دیکھا

یہاں مراد وسط دوزخ ہے۔

مقصد تشبیہ ہے نہ کہ نفس حقیقت، وجہ تشبیہ یوں ہے کہ جو طریق ایمان پر چلے گا وہ اس پر استقامت وسیدھے راستے پر ہے جو کامیابی اور ثواب وانعام کی راہ ہے اور اس کو کفر کے ساتھ بدلنے والا اس سیدھے راہ سے ہٹ جانے والا ہے تو اسے کہا جائے گا کہ وہ راہ اعتدال سے گمراہ ہو گیا۔

[۱۰۹] وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

(بہت اہلِ کتاب نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑ واور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بلاشبہ اللہ ہر شی پر قادر ہے)

کرتے ہوئے واضح کیا کہ ایسے سوالات میں مشغول نہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو غلط سوالات کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ جب پہلے احکام ونواہی گزرے تو فرمایا اگر تم نے میرے احکام کو قبول نہ کیا اور طاعت سے سرکشی کی تو تم ان لوگوں کی طرح ہو جاؤ گے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ سوالات کیے جو نہیں کیے جانے چاہئیں تھے۔
یہ شیخ ابو مسلم کا قول ہے۔

۳۔ جب اوامر ونواہی فرمائے تو فرمایا کیا تم ان پر عمل کرو گے یا اس طرح کرو گے جیسے تم سے پہلے قوم نے کیا؟

چھٹا مسئلہ: سواء السبیل کی تفسیر

سواء السبیل، راستہ کا وسط، ارشادِ الٰہی ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ (پ۲۳-الصافات:۵۵) پھر جھانکا تو اسے بھڑکتی آگ میں دیکھا

یہاں مراد وسط دوزخ ہے۔

مقصد تشبیہ ہے نہ کہ نفس حقیقت، وجہ تشبیہ یوں ہے کہ جو طریق ایمان پر چلے گا وہ اس پر استقامت وسیدھے راستے پر ہے جو کامیابی اور ثواب وانعام کی راہ ہے اور اس کو کفر کے ساتھ بدلنے والا اس سیدھے راہ سے ہٹ جانے والا ہے تو اسے کہا جائے گا کہ وہ راہ اعتدال سے گمراہ ہو گیا۔

[۱۰۹] وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۹﴾

(بہت اہلِ کتاب نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بلاشبہ اللہ ہر شی پر قادر ہے)

مسلمانوں کے ساتھ یہود کے دھوکہ کی تیسری قسم

یہ مسلمانوں کے ساتھ یہود کے دھوکہ کی تیسری نوع ہے۔ منقول ہے کہ فحاص بن عاز وراء، زید بن قیس اور کچھ یہود نے حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے واقعہ احد کے بعد کہا، تم نے اپنی شکست دیکھ لی، اگر تم حق پر ہوتے تو تم پر یہ آفت نہ آتی تم اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ آؤ تمہارے لیے یہی بہتر و افضل ہے اور ہم تم سے زیادہ راستہ ہدایت پر ہیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا بتاؤ تم نقض عہد کو کیسا مانتے ہو؟ کہنے لگے، بہت ہی برا، فرمایا میں نے عہد کرلیا ہے کہ زندگی بھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر نہیں کروں گا، تو کہنے لگے یہ تو بے دین ہو گیا ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اللہ کے رب، اسلام کے دین، قرآن کے رہبر، کعبہ کے قبلہ اور اہلِ ایمان کے بھائی ہونے پر ہی مطمئن وخوش ہوں۔

پھر یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ سنایا۔ فرمایا تم خیر پانے والے اور کامیاب ہو تو یہ آیت نازل ہوگئی۔ پہلے ہم حسد پر گفتگو کریں گے اور اس کے بعد تفسیر۔

پہلا مسئلہ: حسد کی مذمت

حسد کی مذمت میں کثیر احادیث ہیں

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحَسَدُ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَب — حسد نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے

(سنن ابوداؤد، ۴۹۰۳)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے۔ فرمایا: ابھی تم پر اس راستہ سے جنتی آدمی آئے گا تو ایک انصاری صحابی آئے ان کی داڑھی وضو سے تر تھی اور انہوں نے جوتے بائیں ہاتھ میں تھامے تھے۔ سلام عرض کیا، دوسرے دن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا تو وہی آدمی آیا، اسی طرح تیسرے دن بھی فرمایا تو وہی آدمی آیا۔ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے گئے تو اس سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے والد کی ناراضگی کی وجہ سے حلف اٹھایا ہے کہ تین دن تک اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر تم مجھے اپنے گھر ساتھ لے جاؤ تو بہتر رہے گا، کہنے لگا ہاں تو وہ اس کے ہاں تین دن رہے، انہیں رات کو شب بیدار نہ پایا ہاں جب بھی پہلو بدلتے تو اللہ کا نام لیتے حتیٰ کہ نماز فجر کے لئے اٹھے۔ ان اچھے کلمات کے علاوہ میں نے ان سے کچھ نہ سنا۔ جب تین دن گزر گئے قریب تھا کہ ان کے اعمال کو حقیر جانتا، میں نے کہا اے اللہ کے بندے میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی ناراضگی اور انقطاع نہ تھا لیکن میں نے

تمہارے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جب یہ سنا تو چاہا تمہارے اعمال دیکھوں لیکن میں نے تمہارے اعمال کو کثیر نہیں پایا تو نے یہ مرتبہ کیسے پایا ہے؟ کہنے لگے جو کچھ ہیں وہ تم نے دیکھ ہی لیے ہیں۔ جب میں پلٹا تو بلا کر کہنے لگے اعمال تو وہی ہیں جو تم نے دیکھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں جب بھی کسی مسلمان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و نعمت دیکھتا ہوں تو میرے دل میں اس کے بارے میں حسد و عیب نہیں ہوتا تو حضرت عبداللہ نے کہا اسی عمل کی وجہ سے یہ درجہ تم نے پایا اور یہ عمل نہایت ہی دشوار ہے

۳۔ سیدنا محمد ﷺ نے فرمایا تم میں پہلی قوموں کی بیماریاں آئیں گی حسد و بغض اور بغض و عداوت حالقہ (اُسترہ) ہے میری مراد بالوں کا مونڈھنا نہیں بلکہ دین ختم کرنے والا ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۵۱۰)

۴۔ ارشادِ نبوی ہے میری امت میں سابقہ امتوں کی بیماریاں آئیں گی۔ عرض کیا: امتوں کی وہ بیماریاں کون سی ہیں؟ فرمایا: شر پھیلانا، تکبر کرنا، حصولِ دنیا اور کثرت میں سبقت کرنا، حسد و بغض حتیٰ کہ بغاوت اور پھر فتنہ برپا کرنا۔ (المستدرک، ۷/۳۱۱)

۵۔ تین اعلیٰ اعمال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب کے ہاں حاضر ہوئے تو سایہ عرش میں آدمی دیکھا اور اس پر رشک کیا اور کہا یہ تو اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا ہے۔ رب کریم سے عرض کیا اس کا نام مجھے بتایا جائے، اللہ تعالیٰ نے نام نہیں بتایا اور فرمایا میں اس کے تین اعمال بتا دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جو دیا ہے اس پر یہ حاسد نہیں، یہ والدین کا نافرمان نہیں، اور یہ چغلخور نہیں۔

۶۔ نعمتوں کے دشمن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ کون ہیں؟ فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دیا ہے اس پر وہ حسد کرتے ہیں۔

۷۔ چھ آدمی دوزخ میں

رسالتماب ﷺ نے فرمایا، چھ آدمی قبل از حساب دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ ظالم حکمران، متعصب عرب، متکبر کسان، بددیانت تاجر، جاہل اہل دیہات، حاسد علماء۔

آثارِ صحابہ اور مذمت حسد

۱۔ منقول ہے حضرت عوف بن عبداللہ، فضل بن ہلبہ سے ملے جبکہ وہ واسط کے گورنر تھے۔ فرمایا میں تمہیں کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں، تکبر سے بچو کیونکہ یہ پہلا گناہ ہے جس سے ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی پھر یہ آیت پڑھی:

تمہارے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جب یہ سنا تو چاہا تمہارے اعمال دیکھوں لیکن میں نے تمہارے اعمال کو کثیر نہیں پایا تو نے یہ مرتبہ کیسے پایا ہے؟ کہنے لگے جو کچھ ہیں وہ تم نے دیکھ ہی لیے ہیں۔ جب میں پلٹا تو بلا کر کہنے لگے اعمال تو وہی ہیں جو تم نے دیکھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں جب بھی کسی مسلمان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و نعمت دیکھتا ہوں تو میرے دل میں اس کے بارے میں حسد و عیب نہیں ہوتا تو حضرت عبداللہ نے کہا اسی عمل کی وجہ سے یہ درجہ تم نے پایا اور یہ عمل نہایت ہی دشوار ہے

۳۔ سیدنا محمد ﷺ نے فرمایا تم میں پہلی قوموں کی بیماریاں آئیں گی حسد و بغض اور بغض و عداوت حالقہ (اُسترہ) ہے میری مراد بالوں کا مونڈھنا نہیں بلکہ دین ختم کرنے والا ہے۔ (سنن ترمذی:۲۵۱۰)

۴۔ ارشادِ نبوی ہے میری امت میں سابقہ امتوں کی بیماریاں آئیں گی۔ عرض کیا: امتوں کی وہ بیماریاں کون سی ہیں؟ فرمایا: شر پھیلانا، تکبر کرنا، حصولِ دنیا اور کثرت میں سبقت کرنا، حسد و بغض حتیٰ کہ بغاوت اور پھر فتنہ برپا کرنا۔ (المستدرک،۷۳۱۱)

۵۔ تین اعلیٰ اعمال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب کے ہاں حاضر ہوئے تو سایہ عرش میں آدمی دیکھا اور اس پر رشک کیا اور کہا یہ تو اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا ہے۔ رب کریم سے عرض کیا اس کا نام مجھے بتایا جائے، اللہ تعالیٰ نے نام نہیں بتایا اور فرمایا میں اس کے تین اعمال بتا دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جو دیا ہے اس پر یہ حاسد نہیں، یہ والدین کا نافرمان نہیں، اور یہ چغلخور نہیں۔

۶۔ نعمتوں کے دشمن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ کون ہیں؟ فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دیا ہے اس پر وہ حسد کرتے ہیں۔

۷۔ چھ آدمی دوزخ میں

رسالتمآب ﷺ نے فرمایا، چھ آدمی قبل از حساب دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ ظالم حکمران، متعصب عرب، متکبر کسان، بددیانت تاجر، جاہل اہل دیہات، حاسد علماء۔

آثارِ صحابہ اور مذمت حسد

۱۔ منقول ہے حضرت عوف بن عبداللہ، فضل بن ہلبہ سے ملے جبکہ وہ واسط کے گورنر تھے۔ فرمایا میں تمہیں کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں، تکبر سے بچو کیونکہ یہ پہلا گناہ ہے جس سے ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی پھر یہ آیت پڑھی:

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (پ ۱، البقرہ:۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ منکر ہوا اور تکبر کیا

حرص سے بچو کیونکہ اس نے حضرت آدم کو جنت سے نکلوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں ٹھہرایا تھا جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو انہوں نے وہاں سے کھالیا تو اللہ تعالیٰ نے وہاں سے نکال دیا پھر یہ آیت پڑھی:

اِهْبِطَا مِنْهَا (پ۱۶، طہ:۱۲۳) تم اتر جاؤ اس سے

حسد سے بچنا کیونکہ حسد کی وجہ سے ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا پھر یہ آیت پڑھی:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ (پ ۶، المائدہ:۲۷) انہیں آدم کے بیٹوں کا حق واقعہ سناؤ

۲۔ حضرت ابن زبیر نے فرمایا۔ میں نے کسی پر امر دنیا میں حسد نہیں کیا اس لیے کہ اگر وہ اہل جنت سے ہے، تو میں اس کی دنیا پر کیسے حسد کر سکتا ہوں کیونکہ یہ تو جنت کی نسبت بہتر ہے اور اگر وہ اہلِ دوزخ میں سے ہے تو میں اس کی دنیا پر کیوں حسد کروں جو اسے دوزخی بنا رہی ہے۔

۳۔ ایک آدمی نے امام حسن بصری سے پوچھا کیا مومن حسد کرتا ہے؟ فرمایا کیا تمہیں اولادِ یعقوب یاد نہیں؟ ہاں کرتا ہے مگر اس کا غم تمہارے سینے میں ہی ہوگا جب تک تم ہاتھ یا زبان سے زیادہ نہ کرو۔

۴۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمام لوگ تمام رضا پر قادر ہوتے ہیں مگر حاسد کیونکہ یہ زوال نعمت سے ہی خوش ہوتا ہے۔

۵۔ حاسد، مجالس سے مذمت و ذلت ہی پاتا ہے، ملائکہ سے لعنت و عداوت، مخلوق سے غم و جزع، نزع کے وقت شدت و خوف اور قیامت میں ذلت و عبرت پاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ، حقیقت حسد

اللہ تعالیٰ نے کسی تمہارے بھائی کو نعمت عطا کی ہو اور تم چاہو یہ اس کے پاس نہ رہے یہی حسد ہے۔ اگر تم اس کی مثل کی تمنا اپنے لیے کرو تو یہ رشک وجذبہ مسابقت ہے، پہلی چیز ہر حال میں حرام ہے مگر جبکہ وہ نعمت کسی فاسق یا کافر کے پاس ہو اور وہ اسے شر و فساد کیلئے معاون بنا رہا ہو تو تمہارا اس کے زوال کی تمنا کرنا ہرگز برا نہیں کیونکہ اب اس کا زوال بحیثیت نعمت نہیں بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ اسے شر، فساد اور فتنہ کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

marfat.com

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (پ ۱، البقرہ:۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ منکر ہوا اور تکبر کیا

حرص سے بچو کیونکہ اس نے حضرت آدم کو جنت سے نکلوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں ٹھہرایا تھا جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو انہوں نے وہاں سے کھالیا تو اللہ تعالیٰ نے وہاں سے نکال دیا پھر یہ آیت پڑھی:

اِهْبِطَا مِنْهَا (پ۱۶، طٰہٰ:۱۲۳) تم اتر جاؤ اس سے

حسد سے بچنا کیونکہ حسد کی وجہ سے ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا پھر یہ آیت پڑھی:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ (پ ۶، المائدہ:۲۷) انہیں آدم کے بیٹوں کا حق واقعہ سناؤ

۲۔ حضرت ابن زبیر نے فرمایا۔ میں نے کسی پر امر دنیا میں حسد نہیں کیا اس لیے کہ اگر وہ اہل جنت سے ہے، تو میں اس کی دنیا پر کیسے حسد کر سکتا ہوں کیونکہ یہ تو جنت کی نسبت بہتر ہے اور اگر وہ اہل دوزخ میں سے ہے تو میں اس کی دنیا پر کیوں حسد کروں جو اسے دوزخی بنا رہی ہے۔

۳۔ ایک آدمی نے امام حسن بصری سے پوچھا کیا مومن حسد کرتا ہے؟ فرمایا کیا تمہیں اولاد یعقوب یاد نہیں؟ ہاں کرتا ہے مگر اس کا غم تمہارے سینے میں ہی ہوگا جب تک تم ہاتھ یا زبان سے زیادہ نہ کرو۔

۴۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمام لوگ تمام رضا پر قادر ہوتے ہیں مگر حاسد کیونکہ یہ زوال نعمت سے ہی خوش ہوتا ہے۔

۵۔ حاسد، مجالس سے مذمت و ذلت ہی پاتا ہے، ملائکہ سے لعنت و عداوت، مخلوق سے غم و جزع، نزع کے وقت شدت و خوف اور قیامت میں ذلت و عبرت پاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ، حقیقت حسد

اللہ تعالیٰ نے کسی تمہارے بھائی کو نعمت عطا کی ہو اور تم چاہو یہ اس کے پاس نہ رہے یہی حسد ہے۔ اگر تم اس کی مثل کی تمنا اپنے لیے کرو تو یہ رشک و جذبہ مسابقت ہے، پہلی چیز ہر حال میں حرام ہے مگر جبکہ وہ نعمت کسی فاسق یا کافر کے پاس ہو اور وہ اسے شر و فساد کیلئے معاون بنا رہا ہو تو تمہارا اس کے زوال کی تمنا کرنا ہرگز برا نہیں کیونکہ اب اس کا زوال بحیثیت نعمت نہیں بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ اسے شر، فساد اور فتنہ کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

حسد کے حرام ہونے پر دلائل

حسد کے حرام ہونے پر دلائل کئی آیات ہیں:

۱۔ زیر مطالعہ آیت:

لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ

تمہیں لوٹائیں ایمان کے بعد کفر کی طرف اپنے دلوں کی جلن کی وجہ سے

تو اس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہود کا نعمتِ ایمان کے زوال کی تمنا کرنا حسد ہے

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (پ۵ النساء:۸۹)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جیسے وہ کافر ہیں تو تم سب ایک ہو جاؤ

۳۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (پ۴، ال عمران:۱۲۰)

اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں۔

یہ خوشی دشمنی ہے، حسد اور دشمنی آپس میں بھائی ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حسد بیان کرتے ہوئے ان کے دلوں کی بابت یوں واضح کی:

قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِاطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (پ۱۲، یوسف:۸،۹)

جب کہا کہ ضرور یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں اور ہم ایک جماعت ہیں بلاشبہ ہمارے باپ ان کی محبت میں ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ یوسف کو قتل کر دو یا کہیں زمین میں پھینک دو کہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ان کا حسد حضرت یوسف علیہ السلام کی نعمت پر اظہار ناپسندیدگی تھا۔

۵۔ ارشاد رب العزت ہے:

حسد کے حرام ہونے پر دلائل

حسد کے حرام ہونے پر دلائل کئی آیات ہیں:

۱۔ زیر مطالعہ آیت:

لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ — تمہیں لوٹائیں ایمان کے بعد کفر کی طرف اپنے دلوں کی جلن کی وجہ سے

تو اس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہود کا نعمتِ ایمان کے زوال کی تمنا کرنا حسد ہے

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً (پ۵ النساء:۸۹) — وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جیسے وہ کافر ہیں تو تم سب ایک ہو جاؤ

۳۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَۃٌ تَسُؤْھُمْ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَۃٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا (پ۴، آل عمران:۱۲۰) — اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں۔

یہ خوشی دشمنی ہے، حسد اور دشمنی آپس میں بھائی ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حسد بیان کرتے ہوئے ان کے دلوں کی بات یوں واضح کی:

قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَاَخُوْہُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَۃٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِاطْرَحُوْہُ اَرْضًا یَّخْلُ لَکُمْ وَجْہُ اَبِیْکُمْ (پ۱۲، یوسف:۸،۹) — جب کہا کہ ضرور یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں اور ہم ایک جماعت ہیں بلاشبہ ہمارے باپ ان کی محبت میں ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ یوسف کو قتل کر دو یا کہیں زمین میں پھینک دو کہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ان کا حسد حضرت یوسف علیہ السلام کی نعمت پر اظہار ناپسندیدگی تھا۔

۵۔ ارشاد رب العزت ہے:

وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا (پ۲۸، الحشر: ۹)

اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی حاجت اس کی جو دیئے گئے ہیں

یعنی ان کے سینے تنگ نہیں ہوتے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے عدم حسد پر ان کی مدح کی ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے رد کرتے ہوئے فرمایا:

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (پ۵، النساء: ۵۴)

یا لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا

۷۔ فرمانِ الٰہی ہے:

کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ (پ۲، البقرہ: ۲۱۳)

لوگ ایک دین پر تھے پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دینے اور ڈر سنانے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافات کا فیصلہ کردے اور کتاب میں اختلاف نہیں ڈالا جن کو دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن حکم آچکے آپس میں حسد کی وجہ سے

یہاں بغیاً کی تفسیر حسداً کی گئی ہے۔

۸۔ یہ بھی فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ

اور انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا آپس میں حسد کی وجہ سے

اللہ تعالیٰ نے علم نازل کیا تاکہ اس کی فرمانبرداری کرتے ہوئے آپس میں محبت کریں لیکن انہوں نے حسد و اختلاف کیا اور ہر ایک نے اپنی حکومت اور رواج چلانے کو منزل بنایا۔

۹۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہود جب کسی قوم سے جنگ کرتے تو کہتے:

نَسْأَلُكَ بِالنَّبِیِّ الَّذِیْ وَعَدْتَّنَا اَنْ تُرْسِلَهٗ وَ بِالْكِتَابِ الَّذِیْ تُنْزِلُهٗ اِلَّا تَنْصُرُنَا فَكَانُوْا یُنْصَرُوْنَ

ہم اللہ تجھے اس نبی کا وسیلہ دیتے ہیں جس کے بھیجنے کا تو نے وعدہ کیا ہے اور اس کتاب کا جو تو نازل کرے گا ہماری مدد کا تو ان کی مدد کی جاتی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولادِ اسمٰعیل میں سے آئے انہوں نے پہچان بھی لیا مگر معرفت کے بعد آپ کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا (پ ۱، البقرہ: ۹۰)

اور اسی لیے پہلے وہ اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو گئے تو اللہ کی لعنت منکروں پر کس برے مول انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے۔

یعنی حسد کی بنا پر انکار کیا۔

حضرت صفیہ بنت حی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میرے والد اور چچا آپ کے پاس سے واپس لوٹے تو والد نے چچا سے پوچھا تمہاری ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہنے لگے یہ وہی نبی ہے جس کی بشارت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ والد نے کہا پھر کیا کیا جائے؟ کہنے لگا میں تو زندگی بھر ان کی مخالفت ہی کروں گا۔

یہ حسد کا حکم اور اس کی تفصیل تھی۔

رشک و مسابقت کا حکم

رشک و منافست حرام نہیں اور یہ لفظ نفاست سے مشتق ہے اس کی عدمِ حرمت پر یہ دلائل ہیں۔

۱۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

اس پر چاہیے کہ للچائیں للچانے والے

(پ ۳۰، المطففین: ۲۶)

۲۔ ارشاد رب العزت ہے:

سَابِقُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (پ ۲۷، الحدید: ۲۱) دوڑ اپنے رب کی مغفرت کی طرف

مسابقت، خوف فوت شی کے وقت ہوتی ہے اور یہ ان دو غلاموں کی طرح ہے جو اپنے مولیٰ کی خدمت میں جذبہ مسابقت سے کام لیں اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہو تا کہ مولیٰ کے ہاں وہ ایسا درجہ پالے جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے دو آدمیوں پر حسد (رشک) جائز ہے وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے دوسرا وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم دیا اور وہ اس پر عمل کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

(البخاری، ۷۳)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولادِ اسمٰعیل میں سے آئے انہوں نے پیمان بھی لیا مگر معرفت کے بعد آپ کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا (پ۱، البقرہ:۹۰)

اور اسی لیے پہلے وہ اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو گئے تو اللہ کی لعنت منکروں پر کس برے مول انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے۔

یعنی حسد کی بنا پر انکار کیا۔

حضرت صفیہ بنت حی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میرے والد اور چچا آپ کے پاس سے واپس لوٹے تو والد نے چچا سے پوچھا تمہاری ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہنے لگے یہ وہی نبی ہے جس کی بشارت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ والد نے کہا پھر کیا کیا جائے؟ کہنے لگا میں تو زندگی بھر ان کی مخالفت ہی کروں گا۔

یہ حسد کا حکم اور اس کی تفصیل تھی۔

رشک ومسابقت کا حکم

رشک ومنافست حرام نہیں اور یہ لفظ نفاست سے مشتق ہے اس کی عدمِ حرمت پر یہ دلائل ہیں۔

۱۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ — اس پر چاہیے للچائیں للچانے والے

(پ۳۰، المطففین:۲۶)

۲۔ ارشاد رب العزت ہے:

سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (پ۲۷، الحدید:۲۱) — دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف

مسابقت، خوف فوت شی کے وقت ہوتی ہے اور یہ ان دو غلاموں کی طرح ہے جو اپنے مولیٰ کی خدمت میں جذبہ مسابقت سے کام لیں اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہوتا کہ مولیٰ کے ہاں وہ ایسا درجہ پالے جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے دو آدمیوں پر حسد (رشک) جائز ہے وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے دوسرا وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم دیا اور وہ اس پر عمل کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

(البخاری،۷۳)

یہ روایت بتارہی ہے کہ کبھی حسد کا لفظ رشک کیلئے بولا جاتا ہے۔

مسابقت کی اقسام

مسابقت کبھی فرض، کبھی مستحب اور کبھی مباح ہوتی ہے، لازم، جب وہ نعمت، دینی فریضہ ہو مثلاً ایمان، نماز، زکوۃ تو اس صورت میں لازم ہے کہ مکلف میں اس کی مثل موجود ہو کیونکہ اگر یہ لازم نہ ہو تو وہ معصیت پر خوش ہوگا جو حرام ہے۔

اگر وہ نعمت، فضائل و مستحبات میں سے ہے مثلاً راہِ خدا میں خرچ کرنا، علم سیکھنے کیلئے جدوجہد کرنا تو یہاں مسابقت مستحب ہے

اگر وہ نعمت مباحات میں سے ہے تو مسابقت مباح ہوگی۔

الغرض مذموم یہ ہے کہ انسان دوسرے سے زوالِ نعمت کی تمنا کرے لیکن اگر کوئی یہ تمنا رکھتا ہے کہ مجھے یہ حاصل ہو اور دوسرے میں کمی نہ ہو تو یہ مذموم نہیں۔

اہم نکتہ

لیکن یہاں ایک اہم دقیق نکتہ ہے کہ اس سے زوال نقصان کی دوسرے کے اعتبار سے دو صورتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ اسے اسی طرح حاصل ہو جیسے وہ دوسرے کو حاصل ہے۔

۲۔ دوسرے سے اس کا زوال ہو جب تک مجھے وہ حاصل نہیں۔

جب ان میں سے ایک سے مایوسی ہو تو دل دوسرا راستہ ضرور اختیار کرتا ہے تو اب اگر دل میں یہ ہو کہ اگر اسے اس شخص سے زوال پر قدرت ہے تو وہ اس شخص سے اسے زائل کر دے تو یہ صاحب حسد مذموم ہے اور اگر اس کے دل میں تقویٰ الٰہی ہے جو اسے دوسرے سے زوال نعمت کو روکتا ہے تو اب اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید ہے شاید رسالتمآب ﷺ کے اس فرمان میں یہی مراد ہے کہ مومن تین باتوں سے الگ نہیں ہوسکتا، حسد، ظن، بدفالی۔ پھر فرمایا اس سے نکلنے کا طریق یہ ہے کہ جب حسد آئے تو عمل نہ کرے

یہ حسد کی حقیقت پر گفتگو تھی اور یہ تمام شیخ غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو سے لیا ہے۔

تیسرا مسئلہ: حسد کے مراتب

شیخ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حسد کے مراتب چار ہیں۔

پہلا مرتبہ: انسان دوسرے سے زوالِ نعمت کی تمنا کرے خواہ خود اسے حاصل نہ ہو یہ حسد کا آخری درجہ ہے۔

دوسرا مرتبہ: دوسرے سے اس کا زوال ہو مثلاً اچھا مکان، خوبصورت عورت یا کوئی منصب اور وہ چاہے کہ یہ مجھے حاصل ہو۔ تو یہاں مطلوب بالذات اس کا حصول ہے دوسرے سے اس کا زوال بالذات مقصود نہیں۔

تیسرا مرتبہ: بعینہ وہ نعمت اپنے لیے نہیں چاہتا بلکہ اس کی مثل چاہے اگر اس کی مثل نہ پا سکے تو دوسرے سے زوال کی تمنا کرے تا کہ ان دونوں کے درمیان تفاوت کا ظہور نہ ہو۔

چوتھا مرتبہ: اپنے اس کی مثل نعمت کا متمنی ہو اگر حاصل نہ ہو تو دوسرے سے زوال کا متمنی نہ ہو۔

اس آخری درجہ حسد میں معافی کی امید ہے اگر دنیا سے متعلق ہو اور اگر اس کا تعلق دین سے ہو تو یہ مستحب ہے تیسرا درجہ حسد دونوں طرح کا ہو سکتا ہے مذموم بھی اور غیر مذموم، دوسرا درجہ، تیسرے سے کم اور ہلکا ہے جبکہ پہلا مذموم ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ (پ۵، النساء: ۳۲)

نہ تمنا کرو اس کی جو فضیلت اللہ نے تم میں سے ایک دوسرے کو دی ہے

تو مثل کی تمنا مذموم نہیں ہاں بعینہ کی تمنا مذموم ہے۔

چوتھا مسئلہ: شیخ غزالی اور حسد کے سات اسباب

شیخ غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حسد کے یہ سات اسباب ذکر کیے ہیں:

پہلا سبب: عداوت و بغض

اگر کسی نے انسان کو اذیت دی ہوتی وہ انسان اس پر غضبناک اور ناراض ہوتا ہے، تو اس غصہ سے دل میں کینہ اور حسد پیدا ہوتا ہے جو انتقام اور ازالہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ ناراض ہونے والا انسان خود بدلہ سے عاجز ہو تو وہ چاہتا ہے اس سے زمانہ بدلہ لے۔ جب اس کے دشمن کو کوئی پریشانی اور مصیبت لاحق ہو اور اسے کوئی اذیت عارض ہو جائے جو اس کے مقصود کے مخالف و ضد ہو تو یہ انسان خوش ہوتا ہے تو حسد، عداوت و بغض کے لوازمات میں سے ہے، ان میں جدائی نہیں ہو سکتی، انتہائی امکان یہ ہے کہ انسان اس عداوت کا اظہار نہ کرے اور اس حالت کو اپنے لیے پسند نہ کرے لیکن یہ کہ انسان کسی سے بغض رکھتا ہو اور پھر اس کے ہاں دشمن کی خوشی وغمی برابر ہو یہ ممکن نہیں، یہی حسد کی قسم ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے حوالہ سے بیان کی۔

وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا (پ۴، ال عمران: ۱۱۹، ۱۲۰)

اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور تنہا ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرما دو کہ مر جاؤ اپنی گھٹن میں اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات اگر تمہیں بھلائی آئے تو انہیں برا لگے اور اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں

تیسرا مرتبہ: بعینہ وہ نعمت اپنے لیے نہیں چاہتا بلکہ اس کی مثل چاہے اگر اس کی مثل نہ پا سکے تو دوسرے سے زوال کی تمنا کرے تاکہ ان دونوں کے درمیان تفاوت کا ظہور نہ ہو۔

چوتھا مرتبہ: اپنے اس کی مثل نعمت کا متمنی ہو اگر حاصل نہ ہو تو دوسرے سے زوال کا متمنی نہ ہو۔

اس آخری درجہ حسد میں معافی کی امید ہے اگر دنیا سے متعلق ہو اور اگر اس کا تعلق دین سے ہو تو یہ مستحب ہے تیسرا درجہ حسد دونوں طرح کا ہوسکتا ہے مذموم بھی اور غیر مذموم، دوسرا درجہ، تیسرے سے کم اور ہلکا ہے جبکہ پہلا مذموم ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (پ ۵، النساء: ۳۲)

نہ تمنا کرو اس کی جو فضیلت اللہ نے تم میں سے ایک دوسرے کو دی ہے

تو مثل کی تمنا مذموم نہیں ہاں بعینہٖ کی تمنا مذموم ہے۔

چوتھا مسئلہ: شیخ غزالی اور حسد کے سات اسباب

شیخ غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حسد کے یہ سات اسباب ذکر کیے ہیں:

پہلا سبب: عداوت و بغض

اگر کسی نے انسان کو اذیت دی ہوتی وہ انسان اس پر غضبناک اور ناراض ہوتا ہے، تو اس غصہ سے دل میں کینہ اور حسد پیدا ہوتا ہے جو انتقام اور ازالہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ ناراض ہونے والا انسان خود بدلہ سے عاجز ہو تو وہ چاہتا ہے اس سے زمانہ بدلہ لے۔ جب اس کے دشمن کو کوئی پریشانی اور مصیبت لاحق ہو اور اسے کوئی اذیت عارض ہو جائے جو اس کے مقصود کے مخالف وضد ہو تو یہ انسان خوش ہوتا ہے تو حسد، عداوت و بغض کے لوازمات میں سے ہے، ان میں جدائی نہیں ہوسکتی، انتہائی امکان یہ ہے کہ انسان اس عداوت کا اظہار نہ کرے اور اس حالت کو اپنے لیے پسند نہ کرے لیکن یہ کہ انسان کسی سے بغض رکھتا ہو اور پھر اس کے ہاں دشمن کی خوشی وغمی برابر ہو یہ ممکن نہیں، یہی حسد کی قسم ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے حوالہ سے بیان کی۔

وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ؁ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا (پ ۴، ال عمران: ۱۱۹، ۱۲۰)

اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور تنہا ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرما دو کہ مر جاؤ اپنی گھٹن میں اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات اگر تمہیں بھلائی آئے تو انہیں برا لگے اور اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں

اسی طرح اس آیت میں فرمایا:

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (پ۴، آل عمران:۱۱۸) جس قدر ایذا تمہیں پہنچے، ان کی باتوں سے چھلک اٹھا اور جو سینوں میں چھپائے ہیں وہ اور بڑا ہے

واضح رہے حسد بعض اوقات لڑائی و جنگ برپا کروا دیتا ہے۔

دوسرا سبب، جعلی عزت

کسی ہم مثل کو بلند مرتبہ و منصب مل گیا جو آدمی سے اونچا ہے اور اسے برداشت نہیں کرتا تو اس سے اس منصب کے زوال کی تمنا کرتا ہے اور اس کی غرض تکبر نہیں بلکہ غرض یہ ہوگی یہ دوسرے کا کبر دور کر سکے کیونکہ بعض اوقات مساوی درجہ پر خوش ہو جاتا ہے مگر دوسرے کی بلندی پر خوش نہیں ہوتا۔

تیسرا سبب، طبعاً دوسرے کو غلام جاننا

ایسی طبیعت کا مالک ہو کہ دوسروں کو اپنا غلام و خادم جانے تو دوسرے سے زوال نعمت کا متمنی ہوتا کہ اس مقصد کو حاصل کر سکے اکثر کفار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد اس بات سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ وہ کہتے تھے یہ یتیم نوجوان ہم سے آگے کیسے بڑھ سکتا ہے۔اور ہم اس کے سامنے اپنے سر کیوں جھکائیں؟ وہ کہتے تھے:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (پ۲۵، الزخرف:۳۱) کیوں نہ یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی بڑے پر نازل کیا جاتا

اللہ تعالیٰ نے قریش کا قول نقل فرمایا:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا (پ۷، الانعام:۵۳) کیا انہی پر ہمارے اندر اللہ نے احسان کیا ہے

یہ صحابہ سے ان کا حقارت و نفرت کا اظہار ہے۔

چوتھا سبب، خود پسندی

جیسے اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں کے بارے میں نقل کیا کہ انہوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام سے کہا:

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (پ۱۳، ابراہیم:۱۰) تم تو ہماری طرح کے بشر ہو

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (پ۱۸، المومنون:۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لائیں

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخَاسِرُوْنَ (پ ۱۸، المومنون: ۳۴)

کہا تم اپنے جیسے بشر کی طاعت کرو گے تو پھر نقصان والے بن جاؤ گے

انہوں نے بطور تعجب کہا:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (پ ۱۵، الاسراء: ۹۴)

کیا اللہ نے بشر کو رسول بنایا ہے

انہوں نے یہ بھی کہا:

لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ

ہم پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟

فرمانِ الٰہی ہے:

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ (پ ۸، الاعراف: ۶۳)

اور کیا تمہیں اس کا اچنبا ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت آئی۔ تم میں کہ ایک مرد کی معرفت کہ وہ تمہیں ڈرائے

پانچوں سبب، فوتیدگی مقاصد کا خوف

یہ سبب مقصود دامہ کے حصول میں جھگڑا کرنے والوں کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی ہر اس نعمت میں جھگڑتا ہے جو اس کے حصول انفرادیت میں معاون ہو، سوکنوں کا مقاصد زوجیت ہی میں جھگڑنا، بھائیوں کا والد کا قرب پانے میں جھگڑنا تاکہ مال و عزت پا سکیں، اسی طرح واعظین کا کسی بہتر والوں کے بارے میں جھگڑنا تاکہ مال و قبولیت زیادہ پائیں۔ اسی مد سے تعلق رکھتا ہے۔

چھٹا سبب، بلا مقصد منصب و حکومت سے محبت

مثلاً کوئی آدمی چاہتا ہے کہ کسی فن میں میری مثال نہ ہو اگر وہ سنے کہ جہاں کے فلاں گوشے میں اس کی مثل آدمی موجود ہے اسے برا لگے، اس کی موت چاہے اور اس سے اس نعمت کے زوال کی تمنا کرے جس میں اس کے ساتھ شریک ہے مثلاً شجاعت، علم، زہد اور دولت اور اپنی انفرادیت کو ہی پسند کرے۔

ساتواں سبب، اللہ کے بندوں پر بھلائی میں بخل کرنا

تم دیکھو گے جو حکومت، تکبر اور طلب مال میں مشغول نہیں ہوتا لیکن اس کے سامنے کسی اللہ کے بندے کا اچھا حال بیان کیا

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخَاسِرُوْنَ (پ۱۸،المومنون:۳۴)

کہاتم اپنے جیسے بشر کی طاعت کرو گے تو پھر نقصان والے بن جاؤ گے

انہوں نے بطور تعجب کہا:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (پ۱۵،الاسراء:۹۴)

کیا اللہ نے بشر کو رسول بنایا ہے

انہوں نے یہ بھی کہا:

لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ

ہم پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟

فرمانِ الٰہی ہے:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ (پ ۸،الاعراف:۶۳)

اور کیا تمہیں اس کا اچنبا ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت آئی۔تم میں کہ ایک مرد کی معرفت کہ وہ تمہیں ڈرائے

پانچوں سبب،فوتیدگی مقاصد کا خوف

یہ سبب مقصود دامہ کے حصول میں جھگڑا کرنے والوں کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی ہر اس نعمت میں جھگڑتا ہے جو اس کے حصول انفرادیت میں معاون ہو،سوکنوں کا مقاصد زوجیت ہی میں جھگڑنا، بھائیوں کا والد کا قرب پانے میں جھگڑنا تا کہ مال وعزت پاسکیں،اسی طرح واعظین کا کسی بہتر والوں کے بارے میں جھگڑنا تا کہ مال وقبولیت زیادہ پائیں۔اسی مد سے تعلق رکھتا ہے۔

چھٹا سبب،بلا مقصد منصب وحکومت سے محبت

مثلاً کوئی آدمی چاہتا ہے کہ کسی فن میں میری مثال نہ ہو اگر وہ سنے کہ جہاں کے فلاں گوشے میں اس کی مثل آدمی موجود ہے اسے برا لگے،اس کی موت چاہے اور اس سے اس نعمت کے زوال کی تمنا کرے جس میں اس کے ساتھ شریک ہے مثلاً شجاعت، علم،زہد اور دولت اور اپنی انفرادیت کو ہی پسند کرے۔

ساتواں سبب،اللہ کے بندوں پر بھلائی میں بخل کرنا

تم دیکھو گے جو حکومت،تکبر اور طلب مال میں مشغول نہیں ہوتا لیکن اس کے سامنے کسی اللہ کے بندے کا اچھا حال بیان کیا

جائے تو اس پر یہ شاق گزرتا ہے۔لیکن جب اس کے سامنے لوگوں کی پریشانی، پستی، شکست اور زندگی کا اجیرن ہونا بیان کیا جائے تو وہ اس پر خوش ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ لوگوں کا نقصان چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر انعام میں بخل کرتا ہے گویا وہ اس کے خزانے اور ملک سے حاصل کررہے ہیں۔منقول ہے بخیل وہ جو اپنے مال میں بخل سے کام لے اور شحیح وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے مال میں بخل کرے اور یہ شخص بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر بخل کرتا ہے۔حالانکہ ان کے اور اس کے درمیان نہ کوئی عداوت ہے اور نہ تعلق و واسطہ تو یہاں حسد کا سبب ظاہری خبث نفس اور طبعی کمینگی ہے کیونکہ باقی تمام اقسام حسد کا ازالہ ان کے اسباب کے ازالہ کی وجہ سے ممکن ہے لیکن یہ تو جبلی حسد ہے اس کا سبب عارضی نہیں لہٰذا اس کا ازالہ مشکل و دشوار ہے۔

یہ اسبابِ حسد ہیں، بعض اوقات کسی ایک ہی شخص میں ان سے کچھ، اکثر یا تمام پائے جاسکتے ہیں۔اس میں حسد بڑے درجہ پر ہوگا اور وہ اتنا قوی کہ ایسا بندہ اسے مخفی نہیں رکھ سکتا بلکہ خفا کا پردہ ختم اور عداوت و دشمنی کا اظہار ہوجاتا ہے۔اکثر حاسدین میں یہ تمام اسباب جمع ہوتے ہیں، بہت کم ہیں کسی میں ایک سبب ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ، حسد کی کثرت وقلت کے اسباب

حسد میں کثرت، قلت، قوت وضعف کے اسباب یہ ہیں، جن لوگوں کے درمیان ہمارے ذکر کردہ اسباب موجود ہوں گے وہاں حسد کثرت کے ساتھ ہوگا ممکن ہے ایک آدمی حسد کرے کہ بڑا نہ بن سکا یا بطور تکبر حسد کرتا ہے یا دوسرے کا یہ دشمن ہے، یہ اسباب ان لوگوں میں زیادہ ہوسکتے ہیں جن کے درمیان رابطہ ہوتا ہے جن کے باعث وہ آپس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ان کے ایک دوسرے سے مقاصد ہوتے ہیں اور تنازع نفرت کی بنیاد ہے اور نفرت حسد تک لے جاتی ہے تو یہاں میل جول ہی نہ ہو وہاں حسد نہیں ہوتا جب دو افراد دو شہروں میں رہتے ہیں ان کے درمیان رابطہ ہی نہیں تو یقیناً ان میں حسد بھی نہیں ہوگا اس لیے تم دیکھو گے عالم کا حسد عالم سے نہ کہ عابد سے، عابد کا حسد عابد سے نہ کہ عالم سے ہوگا، تاجر کا حسد تاجر سے۔بلکہ موچی کا حسد موچی سے ہوگا نہ کہ کپڑا بیچنے والے سے، آدمی اپنے بھائی اور چچازاد سے حسد، غیروں سے زیادہ کرتا ہے، اسی طرح عورت، اپنی سوکن سے اور خاوند سے لونڈی، حسد، خاوند کی ماں اور بیٹی سے زیادہ کرتی ہے کیونکہ مقصد کپڑے والے کا موچی کے مقصد کے علاوہ ہے ان میں ٹکراؤ نہیں پھر قریبی تاجر سے حسد دور والے تاجر سے زیادہ ہوتا ہے۔

الغرض حسد کی اصل عداوت ہے اور عداوت کی وجہ ایک غرض پر ٹکراؤ اور غرض واحد دو دور رہنے والوں کے درمیان نہیں ہوتی بلکہ دونوں میں مناسبت ضروری ہے اسی لیے ان کے درمیان حسد اکثر ہوتا ہے۔ہاں جو لمبے چوڑے مناصب اور اطراف عالم میں شہرت کا متمنی ہو وہ ہر اس شخص پر حسد کرے گا جو اس کے ساتھ ہر اس خصلت میں شریک ہے جس پر فخر کیا جاتا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، حسد کا سبب حقیقی یہ ہے کہ کمال بالذات محبوب اور محبوب کی ضد ناپسند ہوتی ہے۔ انواع کمال میں اس کمال میں یکتا ہونا ہی ہے لہٰذا کمال میں شریک ناپسند ہوتا ہے کیونکہ بندے کی انفرادیت پہ جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے جو باب کمال میں اعظم ہے ہاں اگر وہ کمال کی ایسی نوع ہو جس کا حصول محال ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے اور اس کے حصول سے مایوسی ہو تو پھر حسد نہیں ہو سکتا تو حسد امور دنیا سے خاص سے ہے کیونکہ دنیا جھگڑا کرنے والوں کے لیے کافی نہیں ہوتی رہی آخرت وہاں کمی ہی نہیں۔ آخرت کی مثال نعمت علم کی ہے تو جو اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی صفات کی اور اس کے ملائکہ کی معرفت چاہتا ہے اس پر کوئی حسد نہیں کرے گا، جب یہ معلوم ہے کہ معرفت، عرفاء، کے لیے تنگی نہیں کرتی بلکہ معلوم واحد کی لاکھوں معرفت حاصل کریں اور اس کی معرفت سے لذات وخوشی پائیں ایک دوسرے کی وجہ سے لذت میں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ کثرت عرفاء کی وجہ سے اُنس میں خوب اضافہ ہوگا اس لیے علماء دین میں حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مقصود معرفت الٰہی ہے اور ایسا وسیع سمندر ہے کہ جس میں کمی ہی نہیں، ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام پانا ہے اور وہاں کوئی کمی ہی نہیں ہاں اگر علماء کا مقصود حصول مال و جاہ ہو تو پھر حسد پیدا ہوگا کیونکہ مال ایک معین شی ہے جب وہ ایک ہاتھ میں آئے گا تو دوسرا اس سے بالیقین خالی ہوگا، جاہ کا مغنی دلوں کا محبت کرنا ہے جب کوئی شخص ایک عالم کا احترام و تعظیم کرے گا تو وہ دوسرے کی تعظیم سے اعراض کرے گا لیکن جب دل معرفت الٰہی سے معمور ہوگا تو وہ دوسرے کے دل کو معمور سے مانع نہ ہوگا اور نہ ہی دوسرے کی خوشی میں رکاوٹ بنے گا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کا یہ وصف بیان کیا۔

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ (پ۱۴، الحجر:۴۷)

اور ہم ان دلوں سے حسد نکال لیں گے تاکہ وہ بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں

چھٹا مسئلہ، حسد کا علاج ودوا

حسد کا ازالہ کرنے والی دوا دو امور ہیں۔ علم اور عمل۔ علم میں دو مقام ہیں، اجمالی و تفصیلی۔ اجمالی علم یہ ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت سے ہوتا ہے کیونکہ ممکن کی انتہا واجب پر ہی ہوتی ہے ورنہ وہ ٹھہرتا ہی نہیں جب صورت حال یہ ہے تو اس موجود سے نفرت کا فائدہ ہی نہیں اور جب قضاء الٰہی پر رضا حاصل ہو جائے تو حسد از خود زائل ہو جاتا ہے۔

تفصیلی کچھ یوں ہے کہ حسد دین و دنیا کے حوالہ سے نقصان دہ ہے لیکن محسود (جس پر حسد ہے) کے لیے دین و دنیا کا کوئی نقصان نہیں بلکہ اس کے لیے دین و دنیا میں نفع، حاسد کے لیے نقصان دہ ہونے پر دلائل یہ ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، حسد کا سبب حقیقی یہ ہے کہ کمال بالذات محبوب اور محبوب کی ضد ناپسند ہوتی ہے۔ انواع کمال میں اس کمال میں یکتا ہونا ہی ہے لہٰذا کمال میں شریک ناپسند ہوتا ہے کیونکہ بندے کی انفرادیت پہ جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے جو باب کمال میں اعظم ہے ہاں اگر وہ کمال کی ایسی نوع ہو جس کا حصول محال ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے اور اس کے حصول سے مایوسی ہو تو پھر حسد نہیں ہو سکتا تو حسد امور دنیا سے خاص سے ہے کیونکہ دنیا جھگڑا کرنے والوں کے لیے کافی نہیں ہوتی رہی آخرت وہاں کمی ہی نہیں۔ آخرت کی مثال نعمت علم کی ہے تو جو اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی صفات کی اور اس کے ملائکہ کی معرفت چاہتا ہے اس پر کوئی حسد نہیں کرے گا، جب یہ معلوم ہے کہ معرفت، عرفاء، کے لیے تنگی نہیں کرتی بلکہ معلوم واحد کی لاکھوں معرفت حاصل کریں اور اس کی معرفت سے لذات وخوشی پائیں ایک دوسرے کی وجہ سے لذت میں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ کثرت عرفاء کی وجہ سے اُنس میں خوب اضافہ ہوگا اس لیے علماء دین میں حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مقصود معرفت الٰہی ہے اور ایسا وسیع سمندر ہے کہ جس میں کمی ہی نہیں، ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام پانا ہے اور وہاں کوئی کمی ہی نہیں ہاں اگر علماء کا مقصود حصول مال وجاہ ہو تو پھر حسد پیدا ہوگا کیونکہ مال ایک معین شی ہے جب وہ ایک ہاتھ میں آئے گا تو دوسرا اس سے بالیقین خالی ہوگا، جاہ کا معنی دلوں کا محبت کرنا ہے جب کوئی شخص ایک عالم کا احترام وتعظیم کرے گا تو وہ دوسرے کی تعظیم سے اعراض کرے گا لیکن جب دل معرفت الٰہی سے معمور ہوگا تو وہ دوسرے کے دل کو معمور سے مانع نہ ہوگا اور نہ ہی دوسرے کی خوشی میں رکاوٹ بنے گا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کا یہ وصف بیان کیا۔

وَنَزَعْنَا مَافِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (پ۱۴، الحجر: ۴۷)

اور ہم ان دلوں سے حسد نکال لیں گے تاکہ وہ بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں

چھٹا مسئلہ، حسد کا علاج ودوا

حسد کا ازالہ کرنے والی دوا دو امور ہیں۔ علم اور عمل۔ علم میں دو مقام ہیں، اجمالی وتفصیلی۔ اجمالی علم یہ ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت سے ہوتا ہے کیونکہ ممکن کی انتہا واجب پر ہی ہوتی ہے ورنہ وہ ٹھہرتا ہی نہیں جب صورت حال یہ ہے تو اس موجود سے نفرت کا فائدہ ہی نہیں اور جب قضاء الٰہی پر رضا حاصل ہو جائے تو حسد از خود زائل ہو جاتا ہے۔

تفصیلی کچھ یوں ہے کہ حسد دین ودنیا کے حوالہ سے نقصان دہ ہے لیکن محسود (جس پر حسد ہے) کے لیے دین ودنیا کا کوئی نقصان نہیں بلکہ اس کے لیے دین ودنیا میں نفع، حاسد کے لیے نقصان دہ ہونے پر دلائل یہ ہیں۔

۱۔ تم نے حسد کی وجہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو ناپسند جانا اور اس کی اس تقسیم سے تنازعہ کیا جو اس نے اپنے بندوں پر کر رکھی ہے اور اس نے مخفی حکمت کے تحت اپنے بندوں پر جو عدل قائم کر رکھا ہے اور یہ توحید کی آنکھ کو اذیت دینا اور ذاتِ ایمان میں کانٹا ہے

۲۔ اگر تم اہلِ ایمان میں سے کسی سے بغض رکھتے ہو تو تم اللہ کے بندوں سے محبت رکھنے والے اولیاء اللہ سے جدا ہو کر ابلیس اور دیگر کفار کے شامل ہو گے جو اہلِ ایمان کے لیے مصائب کی تمنا رکھتے ہیں۔

۳۔ آخرت میں اس پر عذاب عظیم مرتب ہوگا۔

دنیاوی اعتبار سے نقصان دہ یوں ہے کہ حسد کی وجہ سے تم دائماً غم اور جلن میں رہو گے اور تمہارے دشمن سے اللہ تعالیٰ نعمت کا زوال نہیں فرمائے گا تو ان کی ہر نعمت پر عذاب اور ان سے دور ہونے والی مصیبت پر تکلیف پاؤ گے لہٰذا ہمیشہ ہی غم واندوہ میں رہو گے تو تمہارے لیے وہ حاصل جو تم اپنے دشمنوں کے لیے چاہ رہے تھے اور تمہارے دشمن تمہارے لیے چاہتے تھے تو وہ مشقت جو تم اپنے دشمنوں کے لیے حاصل کرنا چاہ رہے تھے وہ تم نے خود اپنے لیے حاصل کر لی، پھر یہ غم تم پر غالب آجائے گا تو تمہارا بدن مریض اور اس سے صحت زائل ہو جائے گی تو اب وہ وساوس میں ڈال دے گا اور تم پر کھانا پینا کڑوا ہو جائے گا۔

محسود کو دین و دنیا کا کوئی نقصان نہیں، یہ واضح ہے کیونکہ تمہارے حسد سے اس کی نعمت زائل نہ ہوگی کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وہ بخت و نعمت مقدر کی ہے وہ اس مقرر وقت تک اس کے پاس ہی رہے گی کیونکہ ہر شئی اس کی تقدیر سے ہے اور ہر ایک کے لیے مدت مقرر ہے تو جب حسد سے نعمت کا زوال کیا تو محسود کی دنیاوی نقصان تو نہ ہوگا اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی گناہ ہے

شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ نعمت مجھے مل جائے گی اور میرے دشمن سے میرے حسد کی وجہ سے چھن جائے گی تو یہ انتہائی جہالت ہے کیونکہ یہ ایسی مصیبت ہے جو تم نے اولاً ہی اپنے لیے چاہی ہے کیونکہ کوئی تمہارا دشمن تم پر حاسد ہوگا اگر حسد سے نعمت کا زوال ہو جائے تو تم پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت باقی ہی نہ رہے نہ اپنی اور نہ دنیاوی، اگر تم چاہو کہ تمہارے حسد کی وجہ سے مخلوق سے نعمت کا زوال ہو جائے مگر تم پر دوسرے کے حسد سے نعمت کا زوال نہ ہو تو یہ بھی جہالت ہے کیونکہ حاسدین پاگل پن کی وجہ سے ہی چاہیں گے کہ یہ حضرمیت مجھے ہی حاصل رہے حالانکہ وہ دوسرے سے بہتر نہیں تو اللہ تعالیٰ کی تم پر نعمت ہے کہ وہ حسد کی وجہ سے زائل نہیں ہو رہی تو اس پر شکر لازم لیکن تم اپنی جہالت کی وجہ سے اسے ناپسند کر رہے ہو۔

محسود کا دینی و دنیاوی نفع

محسود کا دینی و دنیاوی نفع پانا واضح ہے۔ دینی نفع یوں کہ وہ تمہاری وجہ سے مظلوم ہے۔ خصوصاً جب حسد قول و فعل میں غیبت اس پر طعن اور بے عزتی کی صورت اختیار کرلے اور اس کا تذکرہ برائی سے ہو تو یہ تحائف ہیں جو اللہ تعالیٰ اسے عطا کرتا ہے یعنی تم

۱۔ تم نے حسد کی وجہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو ناپسند جانا اور اس کی اس تقسیم سے تنازعہ کیا جو اس نے اپنے بندوں پر کر رکھی ہے اور اس نے مخفی حکمت کے تحت اپنے بندوں پر جو عدل قائم کر رکھا ہے اور یہ توحید کی آنکھ کو اذیت دینا اور ذاتِ ایمان میں کانٹا ہے

۲۔ اگر تم اہلِ ایمان میں سے کسی سے بغض رکھتے ہو تو تم اللہ کے بندوں سے محبت رکھنے والے اولیاء اللہ سے جدا ہو کر ابلیس اور دیگر کفار کے شامل ہو گے جو اہلِ ایمان کے لیے مصائب کی تمنا رکھتے ہیں۔

۳۔ آخرت میں اس پر عذاب عظیم مرتب ہوگا۔

دنیاوی اعتبار سے نقصان دہ یوں ہے کہ حسد کی وجہ سے تم دائماً غم اور جلن میں رہو گے اور تمہارے دشمن سے اللہ تعالیٰ نعمت کا زوال نہیں فرمائے گا تو ان کی ہر نعمت پر عذاب اور ان سے دور ہونے والی مصیبت پر تکلیف پاؤ گے لہٰذا ہمیشہ ہی غم واندوہ میں رہو گے تو تمہارے لیے وہ حاصل جو تم اپنے دشمنوں کے لیے چاہ رہے تھے اور تمہارے دشمن تمہارے لیے چاہتے تھے تو وہ مشقت جو تم اپنے دشمنوں کے لیے حاصل کرنا چاہ رہے تھے وہ تم نے خود اپنے لیے حاصل کر لی، پھر یہ غم تم پر غالب آجائے گا تو تمہارا بدن مریض اور اس سے صحت زائل ہو جائے گی تو اب وہ وساوس میں ڈال دے گا اور تم پر کھانا پینا کڑوا ہو جائے گا۔

محسود کو دین و دنیا کا کوئی نقصان نہیں، یہ واضح ہے کیونکہ تمہارے حسد سے اس کی نعمت زائل نہ ہوگی کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وہ بخت ونعمت مقدر کی ہے وہ اس مقرر وقت تک اس کے پاس ہی رہے گی کیونکہ ہر شئی اس کی تقدیر سے ہے اور ہر ایک کے لیے مدت مقرر ہے تو جب حسد سے نعمت کا زوال کیا تو محسود کی دنیاوی نقصان تو نہ ہوگا اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی گناہ ہے

شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ نعمت مجھے مل جائے گی اور میرے دشمن سے میرے حسد کی وجہ سے چھن جائے گی تو یہ انتہائی جہالت ہے کیونکہ یہ ایسی مصیبت ہے جو تم نے اولاً ہی اپنے لیے چاہی ہے کیونکہ کوئی تمہارا دشمن تم پر حاسد ہوگا اگر حسد سے نعمت کا زوال ہو جائے تو تم پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت باقی ہی نہ رہے نہ اپنی اور نہ دنیاوی، اگر تم چاہو کہ تمہارے حسد کی وجہ سے مخلوق سے نعمت کا زوال ہو جائے مگر تم پر دوسرے کے حسد سے نعمت کا زوال نہ ہو تو یہ بھی جہالت ہے کیونکہ حاسدین پاگل پن کی وجہ سے ہی چاہیں گے کہ یہ حضرمیت مجھے ہی حاصل رہے حالانکہ وہ دوسرے سے بہتر نہیں تو اللہ تعالیٰ کی تم پر نعمت ہے کہ وہ حسد کی وجہ سے زائل نہیں ہو رہی تو اس پر شکر لازم لیکن تم اپنی جہالت کی وجہ سے اسے ناپسند کر رہے ہو۔

محسود کا دینی و دنیاوی نفع

محسود کا دینی و دنیاوی نفع پانا واضح ہے۔ دینی نفع یوں کہ وہ تمہاری وجہ سے مظلوم ہے۔ خصوصاً جب حسد قول وفعل میں غیبت اس پر طعن اور بے عزتی کی صورت اختیار کر لے اور اس کا تذکرہ برائی سے ہو تو یہ تحائف ہیں جو اللہ تعالیٰ اسے عطا کرتا ہے یعنی تم

اسے اپنی نیکیوں کا تحفہ اسے دیے ہو، جب تم اس کی برائیاں ذکر کرتے ہو تو تم اس کے اعمال میں اپنی نیکیاں منتقل کر رہے ہو اور اپنی برائیوں میں اضافہ کر رہے ہو گویا تم اس سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زوال چاہ رہے تھے تو تم سے نعمتوں کا زوال شروع ہو گیا تو ہر وقت اور ہر گھڑی تمہاری شقاوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دنیاوی نفع کی صورتیں

اس کے دنیاوی نفع کی یہ صورتیں ہیں:

۱۔ مخلوق کی اہم غرض دشمنوں کا برائی اور ان کا عذاب وغم میں رہنا ہے تو اس عذاب حسد سے بڑھ کر کوئی بڑا عذاب نہیں جس میں تم ہو بلکہ کوئی عاقل آدمی اپنے دشمن کی موت نہیں چاہتا بلکہ اس کی طویل زندگی مانگتا ہے تا کہ وہ حسد میں جل کر اس پر ہونے والی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھے اور اس کا دل پارہ پارہ ہوتا رہے۔ اسی لیے کسی نے کہا:

لا مات اعداؤك بل خلدوا حتی یروا منك الذی یکمد

لا زلت محسودا علی نعمة فانما الکامل من یحسد

(تمہارے دشمن نہ مریں بلکہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں تا کہ تمہاری نعمتیں دیکھ کر جلتے رہیں اور تم نعمتوں پر محسود رہو کامل وہی ہوتا ہے جس پر حسد کیا جائے)

۲۔ لوگ جانتے ہیں کہ محسود کا صاحب نعمت ہونا ضروری ہے تو وہ حاسد کے حسد سے اس پر استدلال کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضائل ومناقب کے لیے خاص ہے اور بڑی فضیلت پر ہے کہ اس کے ازالہ کی طاقت نہ ہو اور یہ چیز حسد پیدا کرتی ہے تو خود حسد اس پر بڑی؟؟ ہے کہ محسود متعدد انواع فضائل سے متصف ہے۔

۳۔ حاسد، مخلوق کے ہاں مذموم اور خالق کے ہاں ملعون ہو جاتا ہے اور یہ محسود کے لیے اعظم مقصود غرض ہے۔

۴۔ یہ ابلیس کی خوشی میں اضافہ کا سبب ہے کیونکہ حاسد جو محسود کے مخصوص فضائل سے خالی ہے تو اگر اس پر خوش ہوتا تو وہ عظیم ثواب کا مستحق قرار پاتا تو ابلیس اس سے پریشان ہوتا ہے کہ یہ راضی ہو کر ایسا ثواب حاصل کر لے گا جب وہ شخص اس پر خوش نہ ہوا بلکہ اس نے حسد کا اظہار کر دیا تو اس کا ثواب ضائع بلکہ وہ عتاب کا مستحق بن گیا تو اب یہ ابلیس کی خوشی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب ٹھہرا۔

۵۔ جب تم کسی اہلِ علم سے حسد کرو گے تو تم چاہو گے اس سے اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی خطا ہو جائے اور تم اس خطا و غلطی کی وجہ سے اسے ذلیل ورسوا کرو، اسی طرح تم چاہو کہ یہ گونگا ہو جائے تا کہ گفتگو نہ کر سکے یا بیمار ہو جائے حتیٰ کہ نہ مطالعہ کرتے

اسے اپنی نیکیوں کا تحفہ اسے دیے ہو، جب تم اس کی برائیاں ذکر کرتے ہو تو تم اس کے اعمال میں اپنی نیکیاں منتقل کر رہے ہو اور اپنی برائیوں میں اضافہ کر رہے ہو گویا تم اس سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زوال چاہ رہے تھے تو تم سے نعمتوں کا زوال شروع ہو گیا تو ہر وقت اور ہر گھڑی تمہاری شقاوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دنیاوی نفع کی صورتیں

اس کے دنیاوی نفع کی یہ صورتیں ہیں:

۱۔ مخلوق کی اہم غرض دشمنوں کا برائی اور ان کا عذاب وغم میں رہنا ہے تو اس عذاب حسد سے بڑھ کر کوئی بڑا عذاب نہیں جس میں تم ہو بلکہ کوئی عاقل آدمی اپنے دشمن کی موت نہیں چاہتا بلکہ اس کی طویل زندگی مانگتا ہے تاکہ وہ حسد میں جل کر اس پر ہونے والی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھے اور اس کا دل پارہ پارہ ہوتا رہے۔ اسی لیے کسی نے کہا:

لا مات اعداؤك بل خلدوا حتی یروا منك الذی یکمد

لا زلت محسودا علی نعمة فانما الکامل من یحسد

(تمہارے دشمن نہ مریں بلکہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں تاکہ تمہاری نعمتیں دیکھ کر جلتے رہیں اور تم نعمتوں پر محسود رہو کامل وہی ہوتا ہے جس پر حسد کیا جائے)

۲۔ لوگ جانتے ہیں کہ محسود کا صاحب نعمت ہونا ضروری ہے تو وہ حاسد کے حسد سے اس پر استدلال کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضائل ومناقب کے لیے خاص ہے اور بڑی فضیلت پر ہے کہ اس کے ازالہ کی طاقت نہ ہو اور یہ چیز حسد پیدا کرتی ہے تو خود حسد اس پر بڑی؟؟ ہے کہ محسود متعدد انواعِ فضائل سے متصف ہے۔

۳۔ حاسد، مخلوق کے ہاں مذموم اور خالق کے ہاں ملعون ہو جاتا ہے اور یہ محسود کے لیے اعظم مقصود غرض ہے۔

۴۔ یہ ابلیس کی خوشی میں اضافہ کا سبب ہے کیونکہ حاسد جو محسود کے مخصوص فضائل سے خالی ہے تو اگر اس پر خوش ہوتا تو وہ عظیم ثواب کا مستحق قرار پاتا تو ابلیس اس سے پریشان ہوتا ہے کہ یہ راضی ہو کر ایسا ثواب حاصل کر لے گا جب وہ شخص اس پر خوش نہ ہوا بلکہ اس نے حسد کا اظہار کر دیا تو اس کا ثواب ضائع بلکہ وہ عتاب کا مستحق بن گیا تو اب یہ ابلیس کی خوشی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب ٹھہرا۔

۵۔ جب تم کسی اہلِ علم سے حسد کرو گے تو تم چاہو گے اس سے اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی خطا ہو جائے اور تم اس خطا وغلطی کی وجہ سے اسے ذلیل ورسوا کرو، اسی طرح تم چاہو کہ یہ گونگا ہو جائے تاکہ گفتگو نہ کر سکے یا بیمار ہو جائے حتیٰ کہ نہ مطالعہ کرتے

اور نہ پڑھا ہے تو بتایئے اس سے بڑھ کر کون سا گناہ ہے اور اس سے بڑھ کر گھٹیا پن کیا ہو سکتا ہے؟

ان دلائل سے آشکار ہو جاتا ہے کہ حسد کرنے والا اسی شخص کی طرح ہوتا ہے کہ وہ دشمن کی طرف پتھر پھینکتا ہے تا کہ وہ قتل ہو جائے اور اسے نہیں لگتا بلکہ لوٹ کر اسی کی دائیں آنکھ پھوڑ دیتا ہے جو باہر آ جاتی ہے جو اس کے غضب وغصہ میں خوب اضافہ کر دیتا ہے پھر وہ دوبارہ پہلے سے زیادہ سخت پتھر پھینکتا ہے تو وہ لوٹ کر دوسری آنکھ پھوڑ دیتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے تو اس کے غصہ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے پھر وہ تیسری دفعہ پتھر مارتا ہے جو واپس لوٹ کر اس کے سر پر لگتا ہے اور دشمن تمام احوال میں محفوظ وسالم ہی رہتا ہے تو وبال اس حاسد کی طرف لوٹ آیا اور اس کے دشمن خوش اور بغلیں بجاتے رہے بلکہ حاسد کا حال اس شخص سے بھی بدتر ہے کیونکہ لوٹنے والے پتھر نے اس کی فقط آنکھ ضائع کر دی اگر وہ باقی رہتی تو موت سے ختم ہو جاتی لیکن حسد تو آدمی کو اللہ تعالیٰ کے غضب اور دوزخ تک لے جاتا ہے تو کیا یہی آنکھ کا ختم ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ باقی ہو اور اس کی وجہ سے آدمی دوزخ میں چلا جائے تو غور کر لیجیے حاسد سے اللہ تعالیٰ کیسے بدلہ لیتا ہے جب وہ کسی دوسرے سے ازالہ نعمت چاہتا ہے تو وہ اس سے ازالہ نہیں کرتا ہاں حاسد سے نعمت کا ازالہ فرما دیتا ہے۔اپنے اس ارشاد کی تصدیق کرتے ہوئے۔

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (پ۲۲،الفاطر:۴۳) اور برا داؤ (فریب) اپنے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے

یہ علمی ادویات وعلاج ہے جب بھی کوئی انسان صاف ذہن اور متوجہ دل لے کر ان میں غور کرے گا تو اس کے دل سے حسد کی آگ بجھ جائے گی۔

عملِ نافع یہ ہے کہ آدمی ایسے اعمال بجالائے جو حسد کے تقاضوں سے متضاد ہیں کیونکہ حسد کی آگ دوسرے پر طعن کیلئے کہتی ہے تو انسان اس کی مدح کرے، اگر اس پر تکبر کیلئے کہے تو اپنے نفس کو تواضع کی تلقین کرے، اگر اس سے اسباب خیر میں تعلق کے انقطاع کا کہے تو خیر کے پہلوں میں تعاون سے اتصال چاہے تو جیسے جیسے محسود کو یہ معلوم ہو گا اس کا دل خوش، حاسد سے محبت کرے گا اور اس سے دو طرح زوال حسد ہو سکتا ہے۔

۱۔ محسود جب حاسد سے پیار کرے گا تو وہ حاسد کے مطابق کرے گا تو اب حاسد، محسود سے پیار کرنے لگے گا جس سے حسد کا زوال ہو گا۔

۲۔ جب حاسد بطور تکلف حسد کے تقاضوں کے متضاد کرے گا تو وہ اس کے لیے طبعی امر بن جائے گا تو اب بھی حسد زائل ہو جائے گا۔

ساتواں مسئلہ: حاسد کے دل میں محسود سے نفرت ایسا معاملہ ہے جو اس کی طاقت میں ہی نہیں تو اب اس پر عذاب کیوں؟ جو اس کی وسعت و طاقت میں ہیں وہ دو امور ہیں۔

۱۔ حاسد کا اس نفرت پر خوش ہونا۔

۲۔ اس نفرت کے آثار مثلاً طعن کرنا اور اس سے نعمت کا زوال اور اسباب چاہت پر لگ جانا یہ انسان کی طاقت ہیں۔

اب ہم تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا — بہت کتابیوں نے چاہا، کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں (پ ۱، البقرہ:۱۰۹)

مراد یہ ہے کہ یہود چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان، اپنے ایمان سے رجوع کر لیں جبکہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ ایمان صواب و حق ہے، جب کسی کے بارے میں علم ہو کہ یہ حق پر ہے تو اسے شبہ میں ڈال کر ہی لوٹایا جا سکتا ہے کیونکہ حق والا، حق سے شبہ کے بغیر اعراض نہیں کرتا۔

شبہ کی دو قسمیں

شبہ کی دو اقسام ہیں:

۱۔ شبہ جو دنیاوی اعتبار سے ہو مثلاً یوں کہا جائے تم نے دیکھا تمہیں وطن سے نکال دیا گیا، زندگی تنگ کر دی گئی۔ ہر وقت خوف پیدا کر رہا ہے تو اس ایمان کو چھوڑ دو جس کی وجہ سے یہ سارا کچھ ہوا۔

۲۔ شبہ اس کا تعلق دین سے ہو مثلاً معجزات میں شبہ ڈالنا یا تورات میں تحریف کر کے شبہ پیدا کرنا۔

حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے آشکار فرمایا کہ وہ حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان اپنے ایمان کو چھوڑ دیں۔

شیخ جبائی ارشادِ مبارک:

كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم — کفار اپنے دلوں کی جلن سے اس کے بعد

ساتواں مسئلہ: حاسد کے دل میں محسود سے نفرت ایسا معاملہ ہے جو اس کی طاقت میں ہی نہیں تو اب اس پر عذاب کیوں؟ جو اس کی وسعت و طاقت میں ہیں وہ دو امور ہیں۔

۱۔ حاسد کا اس نفرت پر خوش ہونا۔

۲۔ اس نفرت کے آثار مثلاً طعن کرنا اور اس سے نعمت کا زوال اور اسباب چاہت پر لگ جانا یہ انسان کی طاقت ہیں۔

اب ہم تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّاراً (پ ۱، البقرہ:۱۰۹) بہت کتابیوں نے چاہا، کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں

مراد یہ ہے کہ یہود چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان، اپنے ایمان سے رجوع کر لیں جبکہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ ایمان صواب و حق ہے، جب کسی کے بارے میں علم ہو کہ یہ حق پر ہے تو اسے شبہ میں ڈال کر ہی لوٹایا جا سکتا ہے کیونکہ حق والا، حق سے شبہ کے بغیر اعراض نہیں کرتا۔

شبہ کی دو قسمیں

شبہ کی دو اقسام ہیں:

۱۔ شبہ جو دنیاوی اعتبار سے ہو مثلاً یوں کہا جائے تم نے دیکھا تمہیں وطن سے نکال دیا گیا، زندگی تنگ کر دی گئی۔ ہر وقت خوف پیدا کر رہا ہے تو اس ایمان کو چھوڑ دو جس کی وجہ سے یہ سارا کچھ ہوا۔

۲۔ شبہ اس کا تعلق دین سے ہو مثلاً معجزات میں شبہ ڈالنا یا تورات میں تحریف کر کے شبہ پیدا کرنا۔

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کی تفسیر

یہاں چند مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے آشکار فرمایا کہ وہ حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان اپنے ایمان کو چھوڑ دیں۔

شیخ جبائی ارشادِ مبارک:

كُفَّاراً حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کفار اپنے دلوں کی جلن سے اس کے بعد

کے تحت کہتے ہیں کہ یہ کلمات بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، ان کا کفران کا اپنا فعل ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں تخلیق کیا ہے۔

جواب: ارشادِ الٰہی "مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" میں دو صورتیں ہیں:

۱۔ اس کا تعلق "ود" سے ہو، معنی یہ ہوگا وہ چاہتے ہیں تم اپنے دین سے مرتد ہو جاؤ اور ان کی یہ آرزو ان خواہشات کی وجہ سے ہے نہ کہ دین اور حق کی طرف میلان کی وجہ سے کیونکہ یہ اس کے بعد تمنا کر رہے ہیں جب ان پر انکار ہو چکا کہ تم حق پر ہو تو اب ان کی یہ آرزو طلب حق کی بنا پر کیسے ہو سکتی ہے؟

۲۔ اس کا تعلق حسداً سے ہو، معنی ہوگا کہ یہ تمنا ان کی اپنے نفوس کے بڑے حسد کی وجہ سے ہے۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا کی تفسیر

یہ الفاظ آشکار کر رہے ہیں کہ یہود نے اہلِ ایمان کو ایمان سے لوٹانے کیلئے شبہات پیدا کیے جیسے اوپر آیا تو اب جیسے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان شبہات کو پسند کرنے والے کیلئے گزروعفو کا حکم دے کیونکہ یہ تو کفر ہے لہٰذا ان دو امور میں سے ایک مراد ہوگا۔

۱۔ مراد ترک مقابلہ اور جواب سے اعراض ہے کیونکہ فی الفور فتنہ ختم کرنے کیلئے یہی اقرب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو یہود سے درگزر اور اعراض کا حکم دے رہا ہے جیسے مشرکین عرب سے اسی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

قُلْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ (پ۲۵، الجاثیہ:۱۴) ایمان والوں سے فرماؤ درگزریں ان سے جو اللہ کے دنوں کی اُمید نہیں رکھتے

دوسرے مقام پر ہے:

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (پ۲۹، المزمل۱۰) اور انہیں اچھی طرح چھوڑ دو

اس لیے یہ حکم دائمی نہیں بلکہ آخر میں معلق کرتے ہوئے فرمایا:

حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے

اس کی متعدد تفاسیر ہیں

۱۔ یہ کہ روز قیامت اس کی سزا ہوگی یہ امام حسن بصری کا قول ہے۔

۲۔ مراد قوت رسول اور کثرت اُمت ہے۔

۳۔ اکثر صحابہ اور تابعین اس سے مراد، حکم قتال لیتے ہیں کیونکہ اس وقت دو امور میں سے ایک لازم ہے اسلام یا اطاعت برائے جزیہ وحقارت۔

اس لیے حضرت عطاء نے فرمایا یہ آیت اس ارشادِ الٰہی سے منسوخ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ — لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر

(پ۱۰، التوبہ: ۲۹)

امام باقر رضی اللہ عنہ سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتال کا حکم نہ تھا حتیٰ کہ جبریل امین یہ آیت لے کر آئے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا — پروانگی عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہو

(پ۱۷، الحج: ۳۹)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلوار پہنائی سب سے پہلا جہاد وقتال حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے وادی نخل میں کیا پھر غزوہ بدر رہوا۔

دو سوالات

یہاں دو سوالات ہیں:

پہلا سوال: یہ آیت منسوخ کیسے ہو سکتی ہے جبکہ یہ ایک غایت سے متعلق ہے جیسے:

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ — (پ۲، البقرہ: ۱۸۷) — پھر رات آنے تک روزے پورے کرو

تو یہاں رات کا آنا اس کا ناسخ نہیں۔ یہی صورت حال یہاں ہوگی۔

جواب: جب غایت ایسی ہو جو شرعاً ہی معلوم ہو تو وہ شرعی حکم ناسخ ہونے خارج نہیں ہوتا تو ارشاد "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا" کا معنی ہوگا کہ درگزر کرو یہاں تک کہ میں یہ حکم منسوخ کردوں۔

دوسرا سوال: درگزر اور اعراض مسلمانوں سے کیسے جبکہ کفار غلبہ وقوت میں تھے حالانکہ درگزر قدرت میں ہوتی ہے؟

جواب: اس وقت ایک مسلمان بڑی تکالیف پاتا تھا کہ وہ اس حالت میں دشمنوں کے اجتماع سے پہلے پہلے اپنا دفاع کر سکتا اور اپنے دوستوں سے مدد لے سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے مواقع پر درگزر اور اعراض کا فرمایا تاکہ فتنہ اور جنگ نہ چھڑ جائے۔

۳۔ اکثر صحابہ اور تابعین اس سے مراد، حکم قتال لیتے ہیں کیونکہ اس وقت دو امور میں سے ایک لازم ہے اسلام یا اطاعت برائے جزیہ و حقارت۔

اس لیے حضرت عطاء نے فرمایا یہ آیت اس ارشادِ الٰہی سے منسوخ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر

(پ۱۰،التوبہ:۲۹)

امام باقر رضی اللہ عنہ سے ہے رسول اللہ ﷺ کو قتال کا حکم نہ تھا حتیٰ کہ جبریل امین یہ آیت لے کر آئے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا پروانگی عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہو (پ۱۷،الحج:۳۹)

اور رسول اللہ ﷺ کو تلوار پہنائی سب سے پہلا جہاد و قتال حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے وادی نخل میں کیا پھر غزوہ بدر رہوا۔

دو سوالات

یہاں دو سوالات ہیں:

پہلا سوال: یہ آیت منسوخ کیسے ہو سکتی ہے جبکہ یہ ایک غایت سے متعلق ہے جیسے:

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (پ۲،البقرہ:۱۸۷) پھر رات آنے تک روزے پورے کرو

تو یہاں رات کا آنا اس کا ناسخ نہیں۔ یہی صورت حال یہاں ہوگی۔

جواب: جب غایت ایسی ہو جو شرعاً ہی معلوم ہو تو وہ شرعی حکم ناسخ ہونے خارج نہیں ہوتا تو ارشاد "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا" کا معنی ہوگا کہ درگزر کرو یہاں تک کہ میں یہ حکم منسوخ کردوں۔

دوسرا سوال: درگزر اور اعراض مسلمانوں سے کیسے جبکہ کفار غلبہ و قوت میں تھے حالانکہ درگزر قدرت میں ہوتی ہے؟

جواب: اس وقت ایک مسلمان بڑی تکالیف پاتا تھا کہ وہ اس حالت میں دشمنوں کے اجتماع سے پہلے پہلے اپنا دفاع کرسکتا اور اپنے دوستوں سے مدد لے سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے مواقع پر درگزر اور اعراض کا فرمایا تاکہ فتنہ اور جنگ نہ چھڑ جائے۔

دوسرا قول: ارشاد فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا ۔" یہ حسن استدعا ہے۔اس کا استعمال وہاں ہوتا ہے جس میں خیر خواہی،خوف اور سختی لازم ہو۔اس تفسیر کے مطابق اس کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہوگا ہاں تفسیر اول پر اس کا نسخ جائز ہے۔

ارشادِ الٰہی: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ، یہ وعید کے ساتھ ان کو ڈرسنانا ہے خواہ حکم قتال ہو یا ان کے علاوہ کا حکم ہو۔

اگر ملک،قدرت ہی ہوتی تو یہ بے فائدہ تکرار ہے باقی ملک اور قدرت کی حقیقت پر تفصیلی گفتگو "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ارشادِ الٰہی "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" یہ یہود کے لیے بذریعہ وعید،تحذیر و دھمکی ہے خواہ لفظِ امر سے قتال مراد ہو یا غیر قتال

یہاں تیسرا جز مکمل ہو گیا، چوتھا ارشادِ الٰہی "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ" سے شروع ہو رہا ہے۔

بحمد اللہ اس کا ترجمہ جامع رحمانیہ شادمان لاہور میں، 7 ذوالحج 1425ھ/ 18 جنوری 2005ء بروز منگل بوقت 7:15 عشاء کو مکمل ہوا۔



یہ جلد محترم فرید احمد کی ہمشیرہ سعیدہ خاتون کے تعاون سے طبع ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا کرے

امیر کاروانِ اسلام

مُفتی محمد خان قادری

کا دینی، علمی اور تحقیقی لٹریچر



- شرح اج سک متراں دی
- حضور ﷺ کے آباء کی شانیں
- والدین مصطفےٰ ﷺ کا زندہ ہوکر ایمان لانا
- علماء نجد کے نام اہم پیغام
- جسم نبوی ﷺ کی خوشبو
- کیا سگ مدینہ کہلوانا جائز ہے؟
- ہر مکاں کا اُجالا ہمارا نبی ﷺ
- سب رسولوں سے اعلیٰ ہمارا نبی ﷺ
- صحابہ اور بوسہ جسم نبوی ﷺ
- محبت اور اطاعت نبوی ﷺ
- نعل پاک حضور ﷺ
- صحابہ اور علم نبوی ﷺ
- امام احمد رضا اور مسئلہ ختم نبوت ﷺ
- قصیدہ بردہ پر اعتراضات کا جواب
- خواب کی شرعی حیثیت
- علم نبوی ﷺ اور امور دنیا
- معراج حبیبِ خدا
- محافل میلاد اور شاہ اربل
- حضور ﷺ کی رضاعی مائیں
- ترک روزہ پر شرعی وعیدیں
- عورت کی امامت کا مسئلہ
- عورت کی کتابت کا مسئلہ

- معارف الاحکام
- ترجمہ فتاویٰ رضویہ جلد پنجم
- ترجمہ فتاویٰ رضویہ جلد ششم
- ترجمہ فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم
- ترجمہ فتاویٰ رضویہ جلد ہشتم
- ترجمہ فتاویٰ رضویہ جلد دہم
- فتاویٰ رضویہ جلد چہاردم
- ترجمہ فتاویٰ جلد پانزدہم
- ترجمہ اشعۃ اللمعات جلد ششم
- ترجمہ اشعۃ اللمعات جلد ہفتم
- صحابہ اور محافلِ نعت
- صحابہ کے معمولات
- علم نبوی ﷺ اور منافقین
- حضور ﷺ رمضان کیسے گزارتے ہیں؟
- سدرہ تیری راہ گزر
- منہاج اصول الفقہ
- ذخائرِ محمدیہ ﷺ
- مسلک صدیق اکبرؓ عشق رسول ﷺ
- شرح سلام رضا
- نورِ خدا سیدہ حلیمہ کے گھر
- اسلام اور تحدید ازواج
- اسلام میں مُجسمّے کا تصور
- فضائلِ نعلین حضور ﷺ

- شبِ قدر اور اسکی فضیلت
- اسلام اور تصورِ رسول پاک ﷺ
- اسلام اور احترام والدین
- والدین مصطفےٰ ﷺ جنتی ہیں
- نسب نبوی ﷺ کا مقام
- وسعت علم نبوی ﷺ
- اسلام اور احترام نبوت
- اسلام اور خدمت خلق
- نظام حکومت نبوی ﷺ
- فضیلت درود و سلام
- شان نبوت ﷺ
- تفسیر سورۃ الضحیٰ والم نشرح
- شاہکار ربوبیت ﷺ
- ایمانِ والدین مصطفےٰ ﷺ
- حضور ﷺ کا سفرِ حج
- امتیازات مصطفےٰ ﷺ
- درِ رسول ﷺ کی حاضری
- صحابہ کی وصیتیں
- رفعتِ ذکرِ نبوی ﷺ
- مزاحِ نبوی ﷺ
- تبسم نبوی ﷺ
- منہاج النحو

- امام احمد رضا بحیثیت قاطع بدعات
- برکات محافل سے محرومی کیوں؟
- زوال امت کا ازالہ کیسے؟
- آیئے قرب مصطفیٰ ﷺ پائیں
- اساس ایمان۔ محبت الٰہی
- جماعت نماز تسبیح
- ٹخنے ننگے کرنے کا حکم
- قرآنی الفاظ کے صحیح مفاہیم
- سرما اور روزہ
- کیا اولیاء اللہ اور رب ایک ہیں
- یارسول اللہ ﷺ کہنا ایمان یا شرک
- اسلام اور ایصال ثواب
- منہاج المنطق
- مقصد اعتکاف
- تفسیر سورۃ الکوثر
- تفسیر سورۃ القدر
- امامت اور عمامہ
- عصمت انبیاء
- روح ایمان، محبت نبوی ﷺ
- علم نبوی ﷺ اور متشابہات
- Why Did The BELOVED PROPHET (SAW) Perform Many Nikkahs?

- کیا رسول اللہ ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائیں؟
- آنکھوں میں بس گیا سراپا حضور ﷺ کا
- رسول اللہ ﷺ کے کسی عمل کو ترک فرمانے کی حکمتیں مسئلہ ترک
- حضور ﷺ کے والدین کے بارے میں اسلاف کا مذہب
- بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضور کا فیصلہ خطا نہیں
- علمی مقالات جلد اول، دوم، سوم
- ارض خدا ملکیت مصطفےٰ

- حضور ﷺ نے متعدد نکاح کیوں فرمائے؟
- نماز میں خشوع و خضوع کیسے حاصل کیا جائے؟
- حدیث شریک پر اعتراضات کی حقیقت
- احوال و آثار۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی
- والدین مصطفےٰ ﷺ کے بارے میں صحیح عقیدہ
- تحریک تحفظ ناموس رسالت کی تاریخی کامیابی

- محفل میلاد پر اعتراضات کا علمی محاسبہ
- اللہ اللہ حضور کی باتیں ایک ہزار احادیث کا مجموعہ
- میلاد النبی اور شیخ ابوالخطاب ابن دحیہ
- مشتاقان جمال نبوی ﷺ کی کیفیات جذب و مستی
- تفسیر کبیر (آخری بائیس سورتوں کا ترجمہ)
- حضور ﷺ کے ظاہر اور باطن پر فیصلے